جلد سوم

سورۃ النّحل تا سورۃ یٰسٓ

پیش لفظ

سیدنا حضرت مرزا غلام احمد قادیانی مسیح موعود و مہدی معہود علیہ السلام نے اپنی تصانیف اور تقاریر میں قرآن کریم کی جن آیات کی تفسیر بیان فرمائی ہے ہم اُسے یکجا کر کے احباب کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔

ناشر

الفهرس

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ — نَحۡمَدُهٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِهِ الۡکَرِيۡمِ

فہرست آیات جن کی تفسیر بیان ہوئی ہے

فہرست آیات سورۃ النحل

فہرست آیات سورۃ الحج

فہرست آیات سورۃ الشعراء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ——— نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

تفسیر سورۃ النحل

بیان فرمودہ

سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

۲ اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡہُ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ۝

اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡہُ .... خدا کا امر آیا ہے سو تم جلدی مت کرو۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم ص۵۱۹ حاشیہ درحاشیہ نمبر۳ طبع اوّل)

۶ وَالۡاَنۡعَامَ خَلَقَہَا ۚ لَکُمۡ فِیۡہَا دِفۡءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنۡہَا تَاۡکُلُوۡنَ۝

(عیسائیوں کے مناظر ڈپٹی عبد اللہ آتھم صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے حضورؑ فرماتے ہیں)

آپ کے رحم بلا مبادلہ کا بجز اِس کے میں کوئی اور خلاصہ نہیں سمجھتا کہ عدل سزا کو چاہتا ہے۔ رحم عفو اور درگذر کو چاہتا ہے لیکن جبکہ رحم اور عدل اپنے مظہروں میں مساوی اور ایک درجہ کے نہ ٹھہرے اور یہ ثابت ہو گیا کہ خدا تعالیٰ کے رحم نے کسی کی راستبازی کی ضرورت نہیں سمجھی اور ہر ایک نیکوکار اور بدکار پر اسکی رحمانیت قدیم سے اثر ڈالتی چلی آئی ہے تو پھر یہ کیونکر ثابت ہوا کہ خدا تعالیٰ بدکاروں کو ایک ذرہ

رحم کا مزہ چکھانا نہیں چاہتا۔ کیا قانون قدرت جو ہماری نظر کے سامنے پکار پکار کر شہادت نہیں دے رہا کہ اِس رحم کے لئے گناہ اور غفلت اور تقصیر داری بطور روک کے نہیں ہو سکتی اور اگر ہو تو ایک دم بھی انسان کی زندگی مشکل ہے۔ پھر جبکہ یہ سلسلہ رحم کا بغیر شرط راستبازی اور معصومیت اور نیکوکاری انسانوں کے دنیا میں پایا جاتا ہے اور صریح قانون قدرت اس کی گواہی دے رہا ہے تو پھر کیونکر اس سے انکار کر دیا جاوے اور اس نئے اور خلاف صحیفہ فطرت کے عقیدہ پر کیونکر ایمان لایا جاتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا رحم انسانوں کی راستبازی سے وابستہ ہے۔ اللہ جلشانہٗ نے قرآن شریف کے کئی مقامات میں نظیر کے طور پر وہ آیات پیش کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کیونکر سلسلہ رحم کا نہایت وسیع دائرہ کے ساتھ تمام مخلوقات کو مستفیض کر رہا ہے چنانچہ اللہ جلشانہٗ فرماتا ہے اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا[۱] پھر فرماتا ہے وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ اور پھر فرماتا ہے وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا[۲] اور پھر فرماتا ہے وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا[۳]۔ ان تمام آیات سے خدا تعالیٰ نے اپنی کلام کریم میں صاف قانون قدرت کا ثبوت دے دیا ہے کہ اس کا رحم بلا شرط ہے کسی کی راستبازی کی شرط نہیں ہاں جرائم کا سلسلہ قانون الٰہی کے نکلنے سے شروع ہوتا ہے جیسا کہ آپ خود مانتے ہیں اور اسی وقت عدل کی صفت کے ظہور کا زمانہ آتا ہے گو عدل ایک ازلی صفت ہے مگر آپ ذرہ زیادہ غور کریں گے تو سمجھ جائیں گے کہ صفات کے ظہور میں حادثات کی رعایت سے ضرور تقدیم تاخیر ہوتی ہے پھر جبکہ گناہ اس وقت سے شروع ہوا کہ جب کتاب الٰہی نے دنیا میں نزول فرمایا اور پھر اس نے خوارق و نشانوں کے ساتھ اپنی سچائی بھی ثابت کی تو پھر رحم بلا مبادلہ کہاں رہا کیونکہ رحم کا سلسلہ تو پہلے ہی سے بغیر شرط کسی کی راستبازی کے جاری ہے اور جو گناہ خدا تعالیٰ کی کتاب نے پیش کئے وہ مشروط بشرائط ہیں یعنی یہ کہ جس کو وہ احکام پہنچائے گئے ہیں اس پر وہ بطور حجت کے وارد ہوں اور وہ دیوانہ اور مجنون بھی نہ ہو۔ (جنگ مقدس پرچہ ۳۱ مئی ۱۸۹۳ء صفحہ ۱۴-۱۵)

وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا (النحل: ۲۱)

---

[۱] ابراہیم آیت ۳۳-۳۵ ؛ [۲] النحل آیت ۱۵ ؛ [۳] النحل آیت ۶۶ ؛

وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ؕ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝

جو لوگ بغیر اللہ کے پرستش کئے جاتے اور پکارے جاتے ہیں وہ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے بلکہ آپ پیدا شدہ ہیں۔ مر چکے ہیں زندہ بھی تو نہیں ہیں اور نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔

دیکھو یہ آیتیں کس قدر صراحت سے مسیح اور اُن سب انسانوں کی وفات پر دلالت کر رہی ہیں جن کو یہود اور نصاریٰ اور بعض فرقے عرب کے اپنا معبود ٹھہراتے تھے اور اُن سے دعائیں مانگتے تھے۔ اگر اب بھی آپ لوگ مسیح ابن مریم کی وفات کے قائل نہیں ہوتے تو سیدھے یہ کیوں نہیں کہہ دیتے کہ ہمیں قرآن کریم کے ماننے میں کلام ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۶۱۳-۶۱۴ طبع اوّل)

جو لوگ بغیر اللہ کے معبود بنائے جاتے ہیں اور پکارے جاتے ہیں وہ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے بلکہ وہ آپ ہی پیدا شدہ ہیں اور وہ تمام لوگ مر چکے ہیں زندہ بھی تو نہیں ہیں اور نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے اب بتلاؤ کہ اگر کوئی عیسائی اس جگہ تم پر اعتراض کرے کہ یہ بیان قرآن کا بموجب معتقدات تمہارے خلاف واقعہ ہے کیونکہ قرآن مسیح ابن مریم کو مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ سمجھتا ہے اور کل مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ معبود کو بغیر کسی استثناء کے مُردہ قرار دیتا ہے اور تم مسیح ابن مریم کو زندہ قرار دیتے ہو حالانکہ قرآن کہتا ہے کہ کوئی مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ معبود زندہ نہیں ہے۔ پس اگر تم سچے ہو تو قرآن حق پر نہیں ہے اور اگر قرآن حق پر ہے تو تم دعویٰ حیات مسیح میں سچے نہیں، تو اس اعتراض کا کیا جواب ہے۔ اور ظاہر ہے کہ قرآن شریف کا یہ فرمانا کہ تمام معبود غیر اللہ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ہیں۔ اس کا اوّل مصداق حضرت عیسیٰ ہی ہیں کیونکہ زمین پر سب انسانوں سے زیادہ وہی پوجے گئے ہیں اور تمام انسانی پرستاروں کی نسبت ان کا گروہ کثرت میں قوت میں شوکت میں سرگرمی میں دعوتِ شرک میں آگے بڑھا ہوا ہے۔ دیکھو کہ عیسیٰ پرست دنیا میں چالیس کروڑ ہیں اور اس قدر جماعت انسان پرستوں کی کوئی اور نہیں ہے۔ سو اگر قرآن نے اُن کو اس آیت سے مستثنیٰ رکھا ہے تو نعوذ باللہ اس سے پایا جاتا ہے کہ منزل قرآن کے نزدیک وہ غیر اللہ نہیں ہے اور اگر مستثنیٰ نہیں ہے تو یہ تمہارے عقیدے کے مخالف ہے کیونکہ تمہارے نزدیک عیسیٰ ابن مریم اموات میں داخل نہیں بلکہ آسمان پر بحیات جسمانی زندہ موجود ہے۔ اب بتلاؤ کہ اگر عیسائیوں کی طرف سے یہ سوال پیش ہو تو تمہارے پاس کیا جواب ہے؟

(ایام الصلح صفحہ ۱۴۱-۱۴۲ طبع اوّل)

جو لوگ بغیر اللہ کے پرستش کئے جاتے ہیں وہ کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے بلکہ آپ پیدا شدہ ہیں اور وہ سب لوگ مر چکے ہیں زندہ نہیں ہیں اور نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے پس اس مقام پر غور سے دیکھنا چاہیئے کہ یہ آیتیں کس قدر صراحت سے حضرت مسیح اور ان تمام انسانوں کی وفات کو ظاہر کر رہی ہیں جن کو یہود اور نصاریٰ اور بعض فرقے عرب کے اپنے معبود ٹھیراتے تھے اور اُن سے دعائیں مانگتے تھے۔ یاد رکھو کہ یہ خدا کا بیان ہے اور خدا تعالیٰ اس بات سے پاک اور بلند تر ہے کہ خلاف واقعہ باتیں کہے۔ پس جس حالت میں وہ صاف اور صریح لفظوں میں فرماتا ہے کہ جس قدر انسان مختلف فرقوں میں پُوجا کئے جاتے ہیں اور خدا بنائے گئے ہیں وہ سب مر چکے ہیں۔ ایک بھی اُن میں سے زندہ نہیں ہے تو پھر کس قدر سرکشی اور نافرمانی اور خدا کے حکم کی مخالفت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو زندہ سمجھا جائے۔ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جن کو خدا بنایا گیا ہے یا جن کو اپنی مشکل کشائی کے لئے پکارا جاتا ہے بلکہ وہ ان سب لوگوں میں سے اوّل نمبر پر ہیں کیونکہ جس اصرار اور غلو کے ساتھ حضرت عیسیٰ کے خدا بنانے کے لئے چالیس کروڑ انسان کوشش کر رہا ہے اس کی نظیر کسی اور فرقہ میں ہرگز نہیں پائی جاتی۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۲۲-۲۲۳ طبع اوّل)

ایک اور آیت ہے جو بڑی صراحت سے حضرت عیسیٰ کی موت پر دلالت کر رہی ہے اور وہ یہ ہے کہ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ یعنی جس قدر باطل معبودوں کی لوگ زمانہ حال میں پرستش کر رہے ہیں وہ سب مر چکے ہیں ان میں کوئی زندہ باقی نہیں۔ اب بتلاؤ کیا اب بھی کچھ خدا کا خوف پیدا ہوا یا نہیں۔ یا نعوذ باللہ خدا نے غلطی کی جو سب باطل معبودوں کو مُردہ قرار دیا۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۳-۴ طبع اوّل)

خدا تعالیٰ ان آیات مندرجہ عنوان میں حضرت مسیح ابن مریم اور ان تمام انسانوں کو جو محض باطل اور ناحق کے طور پر معبود قرار دئے گئے تھے مار چکا۔ درحقیقت یہ ایک ہی دلیل مخلوق پرستوں کی ابطال کے لئے کروڑ دلیل سے بڑھ کر ہے کہ جن بزرگوں یا اور لوگوں کو وہ خدا بنائے بیٹھے ہیں وہ فوت ہو چکے ہیں اور اب وہ فوت شدہ ہیں زندہ نہیں ہیں۔ اگر وہ خدا ہوتے تو ان پر موت وارد نہ ہوتی۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۲ صفحہ ۱۲)

(۲۹) اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

تفسیر معالم کے صفحہ ۱۶۲ میں زیر تفسیر آیت یَا عِیْسٰی اِنِّی مُتَوَفِّیْكَ وَرَافِعُكَ اِلَیَّ[1] لکھا ہے کہ علی بن طلحہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ اِنِّی مُمِیْتُكَ یعنی میں تجھ کو مارنے والا ہوں اس پر دوسرے اقوال اللہ تعالیٰ کے دلالت کرتے ہیں قُلْ یَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ[2]، اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَیِّبِیْنَ[3]، اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ۔ غرض حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اعتقاد یہی تھا کہ حضرت عیسٰی فوت ہو چکے ہیں اور ناظرین پر واضح ہو گا کہ حضرت ابن عباس قرآن کریم کے سمجھنے میں اوّل نمبر والوں میں سے ہیں اور اس بارے میں اُن کے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا بھی ہے۔

(ازالہ اوہام حصہ اوّل صفحہ ۲۴۷ طبع اوّل)

[۳] وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝

اگر تمہیں ان بعض امور کا علم نہ ہو جو تم میں پیدا ہوں تو اہل کتاب کی طرف رجوع کرو اور ان کی کتابوں کے واقعات پر نظر ڈالو تا اصل حقیقت تم پر منکشف ہو جاوے۔ سو جب ہم نے موافق حکم اِس آیت کے اہل کتاب یعنی یہود اور نصاریٰ کی کتابوں کی طرف رجوع کیا اور معلوم کرنا چاہا کہ کیا اگر کسی نبی گذشتہ کے آنے کا وعدہ دیا گیا ہو تو وہی آ جاتا ہے یا ایسی عبارتوں کے کچھ اَور معنے ہوتے ہیں تو معلوم ہوا کہ اِسی امر متنازعہ فیہ کا ہم شکل ایک مقدمہ حضرت مسیح ابن مریم آپ ہی فیصل کر چکے ہیں اور اُن کے فیصلہ کا ہمارے فیصلہ کے ساتھ اتفاق ہے۔ دیکھو کتاب سلاطین و کتاب ملاکی نبی اور انجیل جو ایلیا کا دوبارہ آسمان سے اُترنا کس طور سے حضرت مسیح نے بیان فرمایا ہے۔

(ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۶۱۶-۶۱۷ طبع اوّل)

مسلمانوں کو حضرت عیسٰی کے نزول کے بارے میں اُسی خطرناک انجام سے ڈرنا چاہیئے کہ جو یہودیوں کو ایلیا کے بارے میں ظاہر نص پر زور دینے سے پیش آیا جس بات کی پہلے زمانوں میں کوئی بھی نظیر نہ ہو بلکہ اس کے باطل ہونے پر نظیریں موجود ہوں۔ اُس بات کے پیچھے پڑ جانا نہایت درجہ کے بے وقوف کا کام ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی خدا کی سنتوں اور عادات کا نمونہ یہود اور نصاریٰ سے پوچھ لو اگر تمہیں معلوم نہیں۔

(کتاب البریہ صفحہ ۲۳-۲۴ طبع اوّل)

---

[1] آل عمران آیت ۵۶ ۔ [2] السجدہ آیت ۱۲ ۔ [3] النحل آیت ۳۳ ۔

اَیَنْتَظِرُوْنَ عِیْسٰی وَقَدْ ثَارَتْ بِسَبَبِہٖ فِتَنٌ وَّ ھُوَ فِی السَّمَآءِ۔ فَمَا بَالُ یَوْمٍ اِذَا نَزَلَ فِی الْغَبْرَآءِ وَکَانَتِ الْیَھُوْدُ قَبْلَ ذٰلِکَ یَنْتَظِرُوْنَ کَمِثْلِ قَوْمِنَا اِلْیَاسَ فَمَا کَانَ مَآلُ اَمْرِھِمْ اِلَّا یَاْسٌ۔ فَمِنْ عَقْلِ الْمَرْءِ اَنْ یَّعْتَبِرَ بِالْغَیْرِ۔ وَیَجْتَنِبَ سُبُلَ الضَّیْرِ۔ وَقَدْ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فَسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ فَلْیَسْئَلُوا النَّصَارٰی ھَلْ نَزَلَ اِلْیَاسُ قَبْلَ عِیْسٰی مِنَ السَّمَآءِ کَمَا کَانُوْا یَزْعَمُوْنَ۔ وَلْیَسْئَلُوا الْیَھُوْدَ ھَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا فَقَدْتُّمْ اَیُّھَا الْمُنْتَظِرُوْنَ۔ فَثَبَتَ مِنْ ھٰذَا اَنَّ ھٰذِہِ الْعَقَآئِدَ لَیْسَتْ اِلَّا الْاَھْوَآءَ وَلَا یَجِیْٓئُ اَحَدٌ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا جَآءَ۔ فَمَنْ کَانَ یَبْنِیْٓ اَمْرَہٗ عَلَی الْعَادَۃِ الْمُسْتَمِرَّۃِ وَالسُّنَّۃِ الْجَارِیَۃِ ھُوَ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ مِنْ رَّجُلٍ یَّاْخُذُ طَرِیْقًا غَیْرَ سَبِیْلٍ مُّتَوَارَثٍ مِّنَ السَّابِقِیْنَ۔ وَلَا یُوْجَدُ نَظِیْرُہٗ فِی الْاَوَّلِیْنَ۔
(مواہب الرحمٰن صفحہ ۹۳،۹۲)

اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں ہمیں حث اور ترغیب دیتا ہے کہ تم ہر ایک واقعہ اور ہر ایک امر کی جو تمہیں بتلایا گیا ہے پہلی امتوں میں نظیر تلاش کرو کہ وہاں سے تمہیں نظیر ملے گی۔ اب ہم اس عقیدے کی نظیر کہ انسان دنیا سے جا کر پھر آسمان سے دوبارہ دُنیا میں آسکتا ہے کہاں تلاش کریں اور کس کے پاس جا کر رودیں کہ خدا کی گذشتہ عادات میں اس کا کوئی نمونہ بتلاؤ؟ ہمارے مخالف مہربانی کر کے آپ ہی بتلاویں کہ اس قسم کا واقعہ کبھی پہلے بھی ہوا ہے اور کبھی پہلے بھی کوئی انسان ہزار دو ہزار برس تک آسمان پر رہا

(ترجمہ از مرتب) کیا یہ لوگ عیسیٰ کے منتظر ہیں حالانکہ ان کی وجہ سے بہت سے فتنے پیدا ہو چکے ہیں جبکہ وہ ان کے زعم میں آسمان پر ہیں۔ پس اس دن کیا حال ہوگا جب وہ زمین پر اُتر آئیں گے۔ اس سے پہلے یہود ہماری قوم کی طرح حضرت الیاس کے منتظر تھے لیکن ان کے معاملے کا انجام بجز مایوسی کے کچھ نہ ہوا۔ انسان کے لئے عقل کا طریق یہ ہے کہ وہ دوسروں سے عبرت حاصل کرے اور ضرر اور نقصان کے راستوں سے بچے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ ذکر سے پُوچھ لو۔ پس مسلمان عیسائیوں سے دریافت کریں کہ کیا ان کے خیال کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے الیاس آسمان سے اُترے۔ اور یہودیوں سے بھی سوال کریں کہ اے انتظار کرنے والو! کیا تم نے اپنی گمشدہ چیز کو پا لیا۔ پس اس سے ثابت ہُوا کہ یہ عقائد محض خواہشات اور خیالات ہیں۔ نہ کوئی آسمان سے آئے گا اور نہ کوئی آسمان سے آیا۔ پس جو شخص اپنے عقیدہ اور عمل کی بنیاد عادتِ مستمرہ اور سُنّتِ جاریہ پر رکھتا ہے وہ اس شخص سے زیادہ امن کا حقدار ہے جو ایسے راستہ کو اختیار کرتا ہے جو پہلے لوگوں سے ورثہ میں نہیں ملا اور نہ اس کی کوئی نظیر سابقین میں پائی جاتی ہے ۔

اور پھر فرشتوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے اترا۔ اگر یہ عادت اللہ ہوتی تو کوئی نظیر اس کی گذشتہ قرون میں ضرور ملتی کیونکہ دُنیا تھوڑی رہ گئی ہے اور بہت گزر گئی اور آیندہ کوئی واقعہ دنیا میں نہیں جس کی پہلے نظیر نہ ہو حالانکہ جو امر سنت اللہ میں داخل ہے اس کی کوئی نظیر ہونی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صاف فرماتا ہے فَسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی ہر ایک نئی بات جو تمہیں بتلائی جائے تم اہل کتاب سے پوچھ لو وہ تمہیں اسکی نظیریں بتلائیں گے لیکن اس واقعہ کی یہود و نصاریٰ کے ہاتھ میں بجز ایلیا کے قصے کے کوئی اور نظیر نہیں۔ اور ایلیا کا قِصہ اس عقیدہ کے برخلاف شہادت دیتا ہے اور دوبارہ آنے کو بروزی رنگ میں بتلاتا ہے۔

(ایام الصلح صفحہ ۱۴۳-۱۴۴)

کتبِ سابقہ میں جو بنی اسرائیلی نبیوں پر نازل ہوئی تھیں صاف اور صریح طور پر معلوم ہوتا ہے بلکہ نام لے کر بیان کیا ہے کہ یاجوج ماجوج سے مراد یورپ کی عیسائی قومیں ہیں اور یہ بیان ایسی صراحت سے ان کتابوں میں موجود ہے کہ کسی طرح اس سے انکار نہیں ہوسکتا۔ اور یہ کہنا کہ وہ کتابیں محرّف مبدّل ہیں ان کا بیان قابلِ اعتبار نہیں۔ ایسی بات وہی کہے گا جو خود قرآن شریف سے بے خبر ہے کیونکہ اللہ جلّشانہٗ مومنوں کو قرآن شریف میں فرماتا ہے فَسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی فلاں فلاں باتیں اہلِ کتاب سے پُوچھ لو اگر تم بے خبر ہو۔ پس ظاہر ہے کہ اگر ہر ایک بات میں پہلی کتابوں کی گواہی ناجائز ہوتی تو خدا تعالیٰ کیوں مومنوں کو فرماتا کہ اگر تمہیں معلوم نہیں تو اہل کتاب سے پوچھ لو بلکہ اگر نبیوں کی کتابوں سے کچھ فائدہ اُٹھانا حرام ہے تو اس صورت میں یہ بھی ناجائز ہوگا کہ ان کتابوں میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بطور استدلال پیشگوئیاں پیش کریں حالانکہ خود صحابہ رضی اللہ عنہم اور بعد اُن کے تابعین بھی اُن پیشگوئیوں کو بطور حجت پیش کرتے رہے ہیں۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۸۳ حاشیہ طبع اوّل)

اگرچہ ہم ان کتابوں کی بابت تو یہی کہتے ہیں کہ فَلَا تُصَدِّقُوْا وَلَا تُکَذِّبُوْا لیکن یہ بھی ساتھ ہی ضروری بات ہے کہ قرآن شریف میں یہ آیا ہے فَسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۵ مورخہ ۷ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

ہر ایک امر میں نظائر ضروری ہیں جس چیز میں نظیر نہیں وہ چیز خطرناک ہے۔ آج کل جس طرح کا ہمارا جھگڑا ہے اسی قسم کا ایک جھگڑا پہلے بھی اہل کتاب میں گذر چکا ہے اور وہ الیاس کا معاملہ تھا۔ ان کی کتابوں میں لکھا تھا کہ مسیح آسمان سے نہیں نازل ہوگا جب تک ایلیا آسمان سے دوبارہ نہ آلے۔ اسی بنا پر جب حضرت مسیح آئے اور انہوں نے یہود کو ایمان کی دعوت دی تو انہوں نے صاف انکار کیا کہ ہمارے ہاں مسیح کی علامت یہ ہے کہ اس سے پہلے ایلیا آسمان سے دوبارہ نازل ہوگا مگر حضرت مسیح نے اس کی یہی

تعبیر کی تھی کہ یہی شخص یعنی یوحنا (یحیٰ) ہی الیاس ہے اور یہ اس (الیاس) کی خُو بُو لے کر آیا ہے اسی کو ایلیا مان لو۔ وہ آسمان سے دوبارہ نہیں آوے گا جس نے آنا تھا وہ آچکا۔ چاہو مانو چاہو نہ مانو۔ غرض حضرت عیسٰیؑ پر بھی ایک مصیبت پڑ چکی تھی اور ان کا فیصلہ ہمارے اس مقدمہ کے لئے ایک دلیل ہو سکتا ہے۔ اگر حضرت عیسٰیؑ یہود کے مقابل میں حق پر تھے تو ہمارا معاملہ بھی صاف ہے ورنہ پہلے حضرت عیسٰیؑ کی نبوت کا انکار کریں بعد میں ہمارا معاملہ آئے گا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۶)

یَخَافُوْنَ رَبَّھُمْ مِّنْ فَوْقِھِمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ۝ [1]

دس ہزار صحابہ کو پہلی کتابوں میں ملائکہ لکھا ہے اور حقیقت میں اُن کی شان ملائکہ ہی کی سی تھی۔ انسانی قویٰ بھی ایک طرح پر ملائکہ ہی کا درجہ رکھتے ہیں کیونکہ جیسے ملائکہ کی یہ شان ہے کہ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ اسی طرح پر انسانی قویٰ کا خاصہ ہے کہ جو حکم اُن کو دیا جائے اُس کی تعمیل کرتے ہیں۔ ایسا ہی تمام قویٰ اور جوارح حکم انسانی کے نیچے ہیں۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

کمال عابد انسان کا یہی ہے کہ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ اللہ تعالیٰ کے اخلاق میں رنگین ہو جاوے جبتک اس مرتبہ تک نہ پہنچ جائے نہ تھکے نہ ہارے۔ اس کے بعد خود ایک کشش اور جذب پیدا ہو جاتا ہے جو عبادت الٰہی کی طرف اُسے لئے جاتا ہے اور وہ حالت اُس پر وارد ہو جاتی ہے جو یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ کی ہوتی ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

ہماری طرف سے تو یہی نصیحت ہے کہ اپنے آپ کو عمدہ اور نیک نمونہ بنانے کی کوشش میں لگے رہو جب تک فرشتوں کی سی زندگی نہ بن جاوے تب تک کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کوئی پاک ہو گیا۔ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ [1] فنا فی اللہ ہو جانا اور اپنے سب ارادوں اور خواہشات کو چھوڑ کر محض اللہ کے ارادوں اور احکام کا پابند ہو جانا چاہیئے کہ اپنے واسطے بھی اور اپنی اولاد بیوی بچوں۔ خویش و اقارب اور ہمارے واسطے بھی باعث رحمت بن جاؤ۔ مخالفوں کے واسطے اعتراض کا موقع ہرگز ہرگز نہ دینا چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مِنْھُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ وَ مِنْھُمْ مُّقْتَصِدٌ وَ مِنْھُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ [2] پہلے دونوں صفات ادنیٰ ہیں سابق بالخیرات بننا چاہیئے ایک ہی مقام پر ٹھیر جانا کوئی اچھی صفت نہیں ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۶ مورخہ ۲ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

خدا تعالیٰ نے جو ملائکہ کی تعریف کی ہے وہ ہر ایک ذرہ ذرہ پر صادق آسکتی ہے جیسے فرمایا اِنْ مِّنْ شَیْءٍ

---

[1] النحل آیت ۵۱ ۔ [2] الفاطر آیت ۳۳ ۔

اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ[1] ویسے ملائکہ کی نسبت فرمایا يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ[2] اس کی تشریح نسیم دعوت میں خوب کر دی ہے۔ ہر ایک ذرہ ملائکہ میں داخل ہے اگر ان اعلیٰ کی سمجھ نہیں آتی تو پہلے ان چھوٹے چھوٹے ملائک پر نظر ڈال کر دیکھو ملائکہ کا انکار انسان کو دہریہ بنا دیتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

اہل اللہ کہتے ہیں کہ جب انسان عابد کامل ہوجاتا ہے اس وقت اس کی ساری عبادتیں ساقط ہوجاتی ہیں پھر خود ہی اس جملہ کی شرح کرتے ہیں کہ اس سے یہ مطلب نہیں ہے کہ نماز روزہ معاف ہوجاتا ہے نہیں بلکہ اس سے یہ مطلب ہے کہ تکالیف ساقط ہوجاتی ہیں یعنی عبادات کو وہ ایسے طور پر ادا کرتا ہے جیسے دونوں وقت روٹی کھاتا ہے۔ وہ تکالیف مدرک الحلاوت اور محسوس اللذت ہوجاتی ہیں۔ پس ایسی حالت پیدا کرو کہ تمہاری تکالیف ساقط ہوجائیں اور پھر خدا تعالیٰ کے اوامر کی تعمیل اور نہی سے بچنا فطرتی ہوجاوے۔ جب انسان اس مقام پر پہنچتا ہے تو گویا ملائکہ میں داخل ہوجاتا ہے جو يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ کے مصداق ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۵)

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ وَلَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ ۝

بعض لوگ کہتے ہیں کہ خدا بیٹیاں رکھتا ہے حالانکہ وہ ان سب نقصانوں سے پاک ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۳۵ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳ طبع اوّل)

يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝

يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ یعنی مشرک اپنی لڑکی کو زندہ درگور کرتا ہے اور فرماتا ہے وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ[3] یعنی قیامت کو زندہ درگور لڑکیوں سے سوال ہوگا کہ وہ کس گناہ سے قتل کی گئیں۔ یہ اشارہ ملک کی موجودہ حالت کی طرف کیا کہ ایسے ایسے بُرے کام ہو رہے ہیں۔

(نور القرآن نمبر ۱ صفحہ ۶ حاشیہ طبع اوّل)

---

[1] بنی اسرائیل آیت ۴۵ ٭ [2] النحل آیت ۵۱ ٭ [3] التکویر آیت ۹، ۱۰ ٭

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○

ہم کو اپنی ذات الوہیت کی قسم ہے جو مبدءِ فیضانِ ہدایت و پرورش اور جامع تمام صفاتِ کاملہ ہے جو ہم نے تجھ سے پہلے دنیا کے کئی فرقوں اور قوموں میں پیغمبر بھیجے پس وہ لوگ شیطان کے دھوکا دینے سے بگڑ گئے اور بُرے کام اُن کو اچھے دکھائی دینے لگے۔ سو وہی شیطان آج ان سب کا رفیق ہے جو ان کو جادہ استقامت سے منحرف کر رہا ہے۔

(براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۵۲۳-۵۲۴ طبع اوّل۔ نیز حصّہ دوم صفحہ ۱۲۳ حاشیہ نمبر ۱۰ طبع اوّل

وَ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○

اور یہ کتاب اس لئے نازل کی گئی کہ تا ان لوگوں کا رفع اختلافات کیا جائے اور جو امر حق ہے وہ کھول کر سنایا جائے۔ (براہین احمدیہ حصّہ دوم صفحہ ۱۲۳ حاشیہ نمبر ۱۰ طبع اوّل)

ہم نے اس لئے کتاب کو نازل کیا ہے تا جو اختلافاتِ عقولِ ناقصہ کے باعث سے پیدا ہو گئے ہیں یا کسی عمدًا افراط و تفریط کرنے سے ظہور میں آئے ہیں اُن سب کو دور کیا جائے اور ایمانداروں کے لئے سیدھا راستہ بتلایا جاوے۔ اس جگہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جو فساد بنی آدم کے مختلف کلاموں سے پھیلا ہے اس کی اصلاح بھی کلام ہی پر موقوف ہے یعنی اس بگاڑ کے درست کرنے کے لئے جو بیہودہ اور غلط کلاموں سے پیدا ہوا ہے ایسے کلام کی ضرورت ہے جو تمام عیوب سے پاک ہو کیونکہ یہ نہایت بدیہی بات ہے کہ کلام کا رہزدہ کلام ہی کے ذریعہ سے راہ پر آسکتا ہے۔ صرف اشاراتِ قانونِ قدرت تنازعات کلامیہ کا فیصلہ نہیں کر سکتے اور نہ گمراہ کو اُس کی گمراہی پر بصفائی تمام ملزم کر سکتے ہیں جیسے اگر جج نہ مدعی کی وجوہات بہ تصریح قلمبند کرے نہ مدعا علیہ کے عذرات کو بدلائل قاطعہ توڑے تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ صرف اُس کے اشارات سے فریقین اپنے اپنے سوالات و اعتراضات و وجوہات کا جواب پالیں اور کیونکر ایسے مبہم اشارات پر جن سے کسی فریق کا باطمینانِ کامل رفع عذر نہیں ہوا حکمِ اخیر مترتب ہو سکتا ہے۔ اسی طرح خدا کی حجت بھی بندوں پر تب ہی پوری ہوتی ہے کہ جب اس کی طرف سے یہ التزام ہو کہ جو لوگ غلط تقریروں کے اثر سے طرح طرح کی بدعقیدگی میں پڑ گئے ہیں ان کو بذریعہ

اپنی کامل و صحیح تقریر کے غلطی پر مطلع کرے اور مدلل اور واضح بیان سے ان کا گمراہ ہونا اُن کو جتلا دے تا اگر اطلاع پاکر پھر بھی وہ باز نہ آویں اور غلطی کو نہ چھوڑیں تو سزا کے لائق ہوں۔ خدائے تعالیٰ ایک کو مجرم ٹھہرا کر پکڑلے اور سزا دینے کو طیار ہو جائے مگر بیان واضح سے اُس کے دلائل بریّت کا غلط ہونا ثابت نہ کرے اور اس کے دلی شبہات کو اپنی کھلی کلام سے نہ مٹادے کیا یہ اُس کا منصفانہ حکم ہوگا؟

(براہین احمدیہ حصّہ سوم صفحہ ۲۰۴-۲۰۵ حاشیہ نمبر ۱۱ طبع اوّل)

اور یہ کتاب اس لئے نازل کی گئی ہے کہ تا ان لوگوں کا رفع اختلافات کیا جائے اور تا مومنوں کے لئے وہ ہدایتیں جو پہلے کتابوں میں ناقص رہ گئی تھیں کامل طور پہ بیان کی جائیں تا وہ کامل رحمت کا موجب ہو۔

(براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۵۲۴ طبع اوّل)

۶۶۔ وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝

اور حقیقت حال یہ ہے کہ زمین ساری کی ساری مرگئی تھی۔ خدا نے آسمان سے پانی اتارا اور نئے سرے اُس مُردہ زمین کو زندہ کیا۔ یہ ایک نشانِ صداقت اس کتاب کا ہے پر ان لوگوں کے لئے جو سنتے ہیں یعنی طالبِ حق ہیں۔

اب غور سے دیکھنا چاہیئے کہ وہ تینوں مقدمات متذکرہ بالا کہ جن سے ابھی ہم نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سچے ہادی ہونے کا نتیجہ نکالا تھا کس خوبی اور لطافت سے آیات ممدوحہ (۶۴ تا ۶۶) میں درج ہیں۔ اوّل گمراہوں کے دلوں کو جو صدہا سال کی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ زمین خشک اور مُردہ سے تشبیہ دے کر اور کلامِ الٰہی کو مینہ کا پانی جو آسمان کی طرف سے آتا ہے ٹھہرا کر اُس قانونِ قدیم کی طرف اشارہ فرمایا جو امساکِ باراں کی شدّت کے وقت میں ہمیشہ رحمتِ الٰہی بنی آدم کو برباد ہونے سے بچالیتی ہے اور یہ بات جتلا دی کہ یہ قانونِ قدرت صرف جسمانی پانی میں محدود نہیں بلکہ روحانی پانی بھی شدّت اور صعوبت کے وقت میں جو پھیل جانا عام گمراہی کا ہے ضرور نازل ہوتا ہے اور اُس جگہ بھی رحمتِ الٰہی آفتِ قلوب کا غلبہ توڑنے کے لئے ضرور ظہور کرتی ہے اور پھر انہیں آیات میں یہ دوسری بات بھی بتلا دی کہ آنحضرتؐ کے ظہور سے پہلے تمام زمین گمراہ ہو چکی تھی اور اسی طرح اخیر پر یہ بھی ظاہر کر دیا کہ اُن روحانی مُردوں کو اُس کلام پاک نے زندہ کیا اور آخر یہ بات کہہ کر کہ اِس میں اس کتاب کی صداقت کا نشان ہے۔ طالبینِ حق کو اس نتیجہ نکالنے کی طرف توجہ دلائی کہ فرقان مجید خدا کی کتاب ہے۔

اور جیسا کہ اس دلیل سے حضرت خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کا نبی صادق ہونا ثابت ہوتا ہے ایسا ہی اس سے آنحضرتؐ کا دوسرے نبیوں سے افضل ہونا بھی ثابت ہوتا ہے کیونکہ آنحضرت کو تمام عالم کا مقابلہ کرنا پڑا اور جو کام حضرتِ ممدوح کو سپرد ہوا وہ حقیقت میں ہزار دو ہزار نبی کا کام تھا لیکن چونکہ خدا کو منظور تھا جو بنی آدم ایک ہی قوم اور ایک ہی قبیلہ کی طرح ہو جائیں اور غیریّت اور بیگانگی جاتی رہے اور جیسے یہ سلسلہ وحدت سے شروع ہوا ہے وحدت پر ہی ختم ہو۔ اس لئے اُس نے آخری ہدایت کو تمام دنیا کے لئے مشترک بھیجا اور اس وقت زمانہ بھی وہ آپہنچا تھا کہ بباعث کُھل جانے راستوں اور مطلع ہونے ایک قوم کے دوسری قوم سے اور ایک ملک کے دوسرے ملک سے اتحاد سلسلہ نوعی کی کاروائی شروع ہو گئی تھی اور بوجہ میل ملاپ دائمی کے خیالات بعض ملکوں کے بعض ملکوں میں اثر کرنے لگے تھے چنانچہ یہ کاروائی اب تک ترقی پر ہے اور سارے سامان جیسے ریل تار اور جہاز وغیرہ ایسے ہی دن بدن نکلتے آتے ہیں کہ جن سے یقیناً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قادر مطلق کا یہی ارادہ ہے کہ کسی دن تمام دنیا کو ایک قوم کی طرح بنا دے۔ بہرحال پہلے نبیوں کی محدود کوشش تھی کیونکہ ان کی رسالت بھی ایک قوم میں محدود ہوتی تھی اور آنحضرت کی غیر محدود اور وسیع کوشش تھی کیونکہ ان کی رسالت عام تھی۔ یہی وجہ ہے جو فرقان مجید میں دنیا کے تمام مذاہب باطلہ کا ردّ موجود ہے اور انجیل میں صرف یہودیوں کی بدچلنی کا ذکر ہے پس آنحضرت کا دوسرے نبیوں سے افضل ہونا ایسی غیر محدود کوشش سے ثابت ہے۔ ماسوا اس کے یہ بات اجلیٰ بدیہیات ہے کہ شرک اور مخلوق پرستی کو دور کرنا اور وحدانیت اور جلال الٰہی کو دلوں پر جمانا سب نیکیوں سے افضل اور اعلیٰ نیکی ہے۔ پس کیا کوئی اس سے انکار کر سکتا ہے کہ یہ نیکی جیسی آنحضرتؐ سے ظہور میں آئی ہے کسی اور نبی سے ظہور میں نہیں آئی۔ آج دنیا میں بجز فرقانِ مجید کے اور کونسی کتاب ہے کہ جس نے کروڑہا مخلوقات کو توحید پر قائم کر رکھا ہے اور ظاہر ہے کہ جس کے ہاتھ سے بڑی اصلاح ہوئی وہی سب سے بڑا ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ دوم صفحہ ۱۲۳ - ۱۲۶ حاشیہ نمبر ۱۰ طبع اوّل)

۹۴۔ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِىْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ۝

یہ امر ضروری ہے کہ وحی شریعت اور وحی غیر شریعت میں فرق کیا جاوے بلکہ اس امتیاز میں تو جانوروں کو جو وحی ہوتی ہے اس کو بھی مدنظر رکھا جاوے۔ بھلا آپ بتلاویں کہ قرآن شریف میں جو یہ لکھا ہے وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ تو اب آپ کے نزدیک شہد کی مکھی کی وحی ختم ہو چکی ہے یا جاری ہے.... جب مکھی کی وحی اب تک منقطع نہیں ہوئی تو انسانوں پر جو وحی ہوتی ہے وہ کیسے منقطع ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ فرق ہے کہ آں کی خصوصیت سے

اس وحی شریعت کو الگ کیا جاوے ورنہ یوں تو ہمیشہ ایسے لوگ اسلام میں ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے جن پر وحی کا نزول ہو۔ حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ صاحب بھی اس وحی کے قائل ہیں اور اگر اس سے یہ مانا جاوے کہ ہر ایک قسم کی وحی منقطع ہو گئی ہے تو یہ لازم آتا ہے کہ امور مشہودہ اور محسوسہ سے انکار کیا جاوے۔ اب جیسے کہ ہمارا اپنا مشاہدہ ہے کہ خدا کی وحی نازل ہوتی ہے پس اگر ایسے شہود اور احساس کے بعد کوئی حدیث اس کے مخالف ہو تو کہا جاوے گا کہ اس میں غلطی ہے۔ خود غزنوی والوں نے ایک کتاب حال میں لکھی ہے جس میں عبداللہ غزنوی کے الہامات درج کئے ہیں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۵۸)

ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝

(شہید) یہ لفظ شہد سے بھی نکلا ہے۔ عبادت شاقہ جو لوگ برداشت کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں ہر ایک تلخی اور کدورت کو جھیلتے ہیں اور جھیلنے کے لئے طیار ہو جاتے ہیں۔ وہ شہد کی طرح ایک شیرینی اور حلاوت پاتے ہیں اور جیسے شہد فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ کا مصداق ہے یہ لوگ بھی ایک تریاق ہوتے ہیں۔ اُن کی صحبت میں آنے والے بہت سے امراض سے نجات پا جاتے ہیں۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ سے معلوم ہوتا ہے کہ دواؤں میں خدا تعالیٰ نے خواص شفاء مرض بھی رکھے ہوئے ہیں اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ دواؤں میں تاثیرات ہوتی ہیں اور امراض کے معالجات ہوا کرتے ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

شہد کے تذکرے پر آپ نے فرمایا کہ

دوسری تمام شیرینیوں کو تو اطباء نے عفونت پیدا کرنے والی لکھا ہے مگر یہ اُن میں سے نہیں ہے۔ آب وغیرہ اور دیگر پھل اس میں رکھ کر تجربے کئے گئے ہیں کہ وہ بالکل خراب نہیں ہوتے سالہا سال ویسے ہی پڑے رہتے ہیں۔

فرمایا کہ

ایک دفعہ مَیں نے انڈے پر تجربہ کیا تو تعجب ہوا کہ اس کی زردی تو ویسی ہی رہی مگر سفیدی اکھڑ کر مثل پتھر کے سخت ہو گئی جیسے پتھر نہیں ٹوٹتا ویسے ہی وہ بھی نہیں ٹوٹتی تھی۔

خدا تعالیٰ نے اسے شفاء للناس کہا ہے۔ واقعی میں عجیب اور مفید شے ہے تو کہا گیا ہے یہی تعریف قرآن شریف کی فرمائی ہے۔ ریاضت کش اور مجاہدہ کرنے والے لوگ اکثر اسے استعمال کرتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ہڈیوں... وغیرہ کو محفوظ رکھتا ہے۔

اس میں اَل جو ناس کے اوپر لگایا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو اس کے اپنے (یعنی خدا تعالیٰ کے) ناس (بندے) ہیں اور اس کے قرب کے لئے مجاہدے اور ریاضتیں کرتے ہیں ان کے لئے شفا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ تو ہمیشہ خواص کو پسند کرتا ہے عوام سے اُسے کیا کام۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۷ مورخہ ۱۶ر فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

ذیابیطس کی مرض کا ذکر حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ

اس سے مجھے سخت تکلیف تھی۔ ڈاکٹروں نے اس میں شیرینی کو سخت مضر بتلایا ہے۔ آج مَیں اس پر غور کر رہا تھا تو خیال آیا کہ بازار میں جو شکر وغیرہ ہوتی ہے اسے تو اکثر فاسق فاجر لوگ بناتے ہیں اگر اس سے ضرر ہوتا ہو تو تعجب کی بات نہیں مگر عسل (شہد) تو خدا کی وحی سے طیار ہوا ہے اس لئے اس کی خاصیت دوسری شیرینیوں کی سی ہرگز نہ ہوگی۔ اگر یہ ان کی طرح ہوتا تو پھر سب شیرینی کی نسبت شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ فرمایا جاتا مگر اس میں صرف عسل ہی کو خاص کیا ہے۔ پس یہ خصوصیت اس کے نفع پر دلیل ہے اور چونکہ اس کی طیاری بذریعہ وحی کے ہے اِس لئے مکھی جو پھولوں سے رس چوستی ہوگی تو ضرور مفید اجزاء کو ہی لیتی ہوگی۔ اس خیال سے مَیں نے تھوڑے سے شہد میں کیوڑا ملا کر اُسے پیا تو تھوڑی دیر کے بعد مجھے بہت فائدہ حاصل ہوا حتّٰی کہ مَیں نے چلنے پھرنے کے قابل اپنے آپ کو پایا اور پھر گھر کے آدمیوں کو لے کر باغ تک چلا گیا اور وہاں دس رکعت اشراق نماز کی ادا کیں۔

(البدر جلد ۳ صفحہ ۴۴-۴۵ مورخہ ۲۴ نومبر و یکم دسمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

۷۱۔ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ۝

ہم بالکل سمجھ نہیں سکتے کہ وہ ہماری روح جو جسم کے ادنیٰ ادنیٰ خلل کے وقت بیکار ہو کر بیٹھ جاتی ہے وہ اس روز کیونکر کامل حالت پر رہے گی جبکہ بالکل جسم کے تعلقات سے محروم کی جائے گی۔ کیا ہر روز ہمیں تجربہ نہیں سکھاتا کہ روح کی صحت کے لئے جسم کی صحت ضروری ہے۔ جب ایک شخص ہم میں سے پیر فرتوت ہو جاتا ہے تو ساتھ ہی اس کی رُوح بھی بڈھی ہو جاتی ہے۔ اس کا تمام علمی سرمایہ بڑھاپے کا چور چُرا کر لے جاتا ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے

لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا

یعنی انسان بڈھا ہو کر ایسی حالت تک پہنچ جاتا ہے کہ پڑھ پڑھا کر پھر جاہل بن جاتا ہے پس ہمارا یہ تمام مشاہدہ اس بات پر کافی دلیل ہے کہ روح بغیر جسم کے کچھ چیز نہیں۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۹۶-۹۷ طبع اوّل)

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○

قرآن شریف .... فرماتا ہے کہ خدا دیکھتا۔ سنتا۔ جانتا۔ بولتا۔ کلام کرتا ہے اور پھر مخلوق کی مشابہت سے بچانے کے لئے یہ بھی فرماتا ہے

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ[1] ۔ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ

یعنی خدا کی ذات اور صفات میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس کے لئے مخلوق سے مثالیں مت دو۔ سو خدا کی ذات کو تشبیہ اور تنزیہ کے بین بین رکھنا یہی وسط ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۶۹ طبع اوّل)

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ○

جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے اور خدا کی راہ سے روکتے ہیں ان پر ہم آخرت کے علاوہ اِسی دنیا میں عذاب نازل کریں گے اور ان کے فساد کا انہیں بدلہ ملے گا۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۲۹ حاشیہ نمبر ۱۱ طبع اوّل)

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ○

یہ کتاب ہم نے اِس لئے تجھ پر نازل کی کہ تا ہر یک دینی صداقت کو کھول کر بیان کر دے اور تا یہ بیانِ کامل

---

[1] الشوریٰ آیت ۱۲

ہمارا ان کے لئے جو اطاعت الٰہی اختیار کرتے ہیں موجبِ ہدایت و رحمت ہو۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم ص۲۰۵ حاشیہ نمبر ۱ اطبع اوّل)

ہم نے یہ کتاب (قرآن شریف) تمام علوم ضروریہ پر مشتمل نازل فرمائی ہے۔

(سرمہ چشم آریہ ص۱۳ حاشیہ طبع اوّل، ص۱ طبع سوم)

اب مکرر باواز بلند کے ساتھ آپ پر کھولتا ہوں کہ سلسلۂ تعامل کی حدیثیں یعنی سُنن متوارثہ متعاملہ جو عاملین اور آمرین کے زیر نظر چلی آئی ہیں اور علیٰ قدر مراتب تاکید مسلمانوں کی عملیات دین میں قرناً بعد قرنٍ وعصراً بعد عصرٍ داخل رہی ہیں وہ ہرگز میری آویزش کا مورد نہیں اور نہ قرآن کریم کو ان کا معیار ٹھیرانے کی ضرورت ہے اور اگر ان کے ذریعہ سے کچھ زیادت تعلیم قرآن پر ہو تو اس سے مجھے انکار نہیں۔ ہرچند میرا مذہب یہی ہے کہ قرآن اپنی تعلیم میں کامل ہے اور کوئی صداقت اس سے باہر نہیں کیونکہ اللہ جلّشانہٗ فرماتا ہے وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ[1] یعنی ہم نے تیرے پر وہ کتاب اُتاری ہے جس میں ہر ایک چیز کا بیان ہے اور پھر فرماتا ہے مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتٰبِ مِنْ شَيْءٍ[2] یعنی ہم نے اس کتاب سے کوئی چیز باہر نہیں رکھی لیکن ساتھ اس کے یہ بھی میرا اعتقاد ہے کہ قرآن کریم سے تمام مسائل دینیہ کا استخراج واستنباط کرنا اور اس کی مجملات کی تفاصیل صحیحہ پر حسب منشاء الٰہی قادر (ہونا) ہر ایک مجتہد اور مولوی کا کام نہیں بلکہ یہ خاص طور پر ان کا کام ہے جو وحی الٰہی سے بطور نبوت یا بطور ولایت عظمٰے مدد دئے گئے ہوں۔ سو ایسے لوگوں کے لئے جو استخراج و استنباط معارف قرآنی پر بعلّت غیر ملہم ہونے کے قادر نہیں ہوسکتے یہی سیدھی راہ ہے کہ وہ بغیر قصد استخراج و استنباط قرآن کے ان تمام تعلیمات کو جو سُنن متوارثہ متعاملہ کے ذریعہ سے ملی ہیں بلا تامل وتوقف قبول کرلیں اور جو لوگ وحی ولایت عظمٰے کی روشنی سے منور ہیں اور اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ[3] کے گروہ میں داخل ہیں ان سے بلاشبہ عادت اللہ یہی ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً دقائق مخفیہ قرآن کے ان پر کھولتا رہتا ہے اور یہ بات ان پر ثابت کر دیتا ہے کہ کوئی زائد تعلیم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرگز نہیں دی بلکہ احادیث صحیحہ میں مجملات واشارات قرآن کریم کی تفصیل ہے۔ سو اس معرفت کے پانے سے اعجاز قرآن کریم ان پر کھل جاتا ہے اور نیز ان آیات بیّنات کی سچائی ان پر روشن ہو جاتی ہے جو اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے جو قرآن کریم سے کوئی چیز باہر نہیں۔ اگرچہ علماء ظاہر بھی ایک قبض کی حالت کے ساتھ ان آیات پر ایمان لاتے ہیں تا ان کی تکذیب لازم نہ آوے۔ لیکن وہ کامل یقین اور سکینت اور اطمینان جو ملہم کامل کو بعد معائنہ ومطابقت وموافقت احادیث صحیحہ اور قرآن کریم اور بعد معلوم کرنے اس احاطہ تام کے جو درحقیقت قرآن کو تمام احادیث پر ہے ملتی ہے وہ علماء ظاہر کو کسی طرح مل نہیں سکتی۔

---

[1] النحل آیت ۹۰ [2] الانعام آیت ۳۹ [3] الواقعہ آیت ۸۰

بلکہ بعض تو قرآن کریم کو ناقص و ناتمام خیال کر بیٹھتے ہیں اور جن غیر محدود صداقتوں اور حقائق اور معارف پر قرآن کریم کے دائمی اور تمام تر اعجاز کی بنیاد ہے اس سے وہ منکر ہیں اور نہ صرف منکر بلکہ اپنے انکار کی وجہ سے ان تمام آیات بیّنات کو جھٹلاتے ہیں جن میں صاف صاف اللہ جلّ شانہٗ نے فرمایا ہے کہ قرآن جمیع تعلیمات دینیہ کا جامع ہے !!!
(الحق لدھیانہ صفحہ ۷۸-۷۹ طبع اوّل)

اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ وَاِیۡتَآیِٔ ذِی الۡقُرۡبٰی وَیَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ وَالۡبَغۡیِ ۚ یَعِظُکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ○

خدا حکم فرماتا ہے کہ تم عدل اور احسان اور ایتاءِ ذی القربیٰ اپنے اپنے محل پر کرو سو جاننا چاہئے کہ انجیل کی تعلیم اس کمال کے مرتبہ سے جس سے نظامِ عالم مربوط و مضبوط ہے متنزل و فروتر ہے اور اس تعلیم کو کامل خیال کرنا بھی بھاری غلطی ہے ایسی تعلیم ہرگز کامل نہیں ہو سکتی۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۳۵۷-۳۵۸ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۲ طبع اوّل)

خدا کا تمہیں یہ حکم ہے کہ تم اُس سے اور اس کی خلقت سے عدل کا معاملہ کرو یعنی حق اللہ اور حق العباد بجا لاؤ۔ اور اگر اس سے بڑھ کر ہو سکے تو (نہ) صرف عدل بلکہ احسان کرو یعنی فرائض سے زیادہ اور ایسے اخلاص سے خدا کی بندگی کرو کہ گویا تم اُس کو دیکھتے ہو اور حقوق سے زیادہ لوگوں کے ساتھ مروّت و سلوک کرو اور اگر اس سے بڑھ کر ہو سکے تو ایسے بے علّت و بے غرض خدا کی عبادت اور خلق اللہ کی خدمت بجا لاؤ کہ جیسے کوئی قرابت کے جوش سے کرتا ہے۔
(شحنۂ حق صفحہ ۲۵ طبع دوم)

پہلے طور پر اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ تم اپنے خالق کے ساتھ اس کی اطاعت میں عدل کا طریق مرعی رکھو ظالم نہ ہو پس جیسا کہ درحقیقت بجز اُس کے کوئی بھی پرستش کے لایق نہیں۔ کوئی بھی محبت کے لایق نہیں۔ کوئی بھی توکّل کے لایق نہیں کیونکہ بوجہ خالقیت اور قیومیت و ربوبیت خاصّہ کے ہر یک حق اُسی کا ہے اِسی طرح تم بھی اس کے ساتھ کسی کو اُس کی پرستش میں اور اُس کی محبت میں اور اُس کی ربوبیت میں شریک مت کرو۔ اگر تم نے اِس قدر کر لیا تو یہ عدل ہے جس کی رعایت تم پر فرض تھی۔

پھر اگر اس پر ترقی کرنا چاہو تو احسان کا درجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ تم اس کی عظمتوں کے ایسے قایل ہو جاؤ اور اُس کے آگے اپنی پرستشوں میں ایسے متادب بن جاؤ اور اُس کی محبت میں ایسے کھوئے جاؤ کہ گویا تم نے اُس کی عظمت اور جلال اور اس کے حُسنِ لازوال کو دیکھ لیا ہے۔

بعد اس کے اِیۡتَآیِٔ ذِی الۡقُرۡبٰی کا درجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ تمہاری پرستش اور تمہاری محبت اور تمہاری

فرماں برداری سے بالکل تکلف اور تصنّع دُور ہو جائے اور تم اُس کو ایسے جگری تعلق سے یاد کرو کہ جیسے مثلاً تم اپنے باپوں کو یاد کرتے ہو اور تمہاری محبت اُس سے ایسی ہو جائے کہ جیسے مثلاً بچہ اپنی پیاری ماں سے محبت رکھتا ہے۔

اور دوسرے طور پر جو ہمدردی بنی نوع سے متعلق ہے اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ اپنے بھائیوں اور بنی نوع سے عدل کرو اور اپنے حقوق سے زیادہ اُن سے کچھ تعرض نہ کرو اور انصاف پر قایم رہو۔

اور اگر اس درجہ سے ترقی کرنی چاہو تو اس سے آگے احسان کا درجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ تُو اپنے بھائی کی بدی کے مقابل نیکی کرے اور اُس کی آزار کی عوض میں تُو اس کو راحت پہنچاوے اور مروّت اور احسان کے طور پر دستگیری کرے۔

پھر بعد اس کے اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی کا درجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ تُو جس قدر اپنے بھائی سے نیکی کرے یا جس قدر بنی نوع سے خیر خواہی بجا لاوے اُس سے کوئی اور کسی قسم کا احسان منظور نہ ہو بلکہ طبعی طور پر بغیر پیش نہاد کسی غرض کے وہ تجھ سے صادر ہو جیسی شدت قرابت کے جوش سے ایک خویش دوسرے خویش کے ساتھ نیکی کرتا ہے۔ سو یہ اخلاقی ترقی کا آخری کمال ہے کہ ہمدردی خلایق میں کوئی نفسانی مطلب یا مدعا یا غرض درمیان نہ ہو بلکہ اخوت و قرابت انسانی کا جوش اس اعلیٰ درجہ پر نشوونما پا جائے کہ خود بخود بغیر کسی تکلف کے اور بغیر پیش نہاد رکھنے کسی قسم کے شکر گزاری یا دعا یا اور کسی قسم کی پاداش کے وہ نیکی فقط فطرتی جوش سے صادر ہو۔

(ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۸۳۲-۸۲۵ طبع اوّل)

اللہ تعالیٰ حکم کرتا ہے کہ تم عدل کرو اور عدل سے بڑھ کر یہ ہے کہ باوجود رعایت عدل کے احسان کرو اور احسان سے بڑھ کر یہ ہے کہ تم ایسے طور سے لوگوں سے مروّت کرو کہ جیسے کہ گویا وہ تمہارے پیارے اور ذو القربٰی ہیں۔ اب سوچنا چاہئے کہ مراتب تین ہی ہیں۔ اوّل انسان عدل کرتا ہے یعنی حق کے مقابل حق کی درخواست کرتا ہے پھر اگر اس سے بڑھے تو مرتبہ احسان ہے اور اگر اس سے بڑھے تو احسان کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے اور ایسی محبت سے لوگوں کی ہمدردی کرتا ہے جیسے ماں اپنے بچہ کی ہمدردی کرتی ہے یعنی ایک طبعی جوش سے نہ کہ احسان کے ارادہ سے۔ (جنگِ مقدس صفحہ ۴۲ پرچہ ۲۵ رمئی ۱۸۹۳ء طبع اوّل)

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی یعنی خدا کا حکم یہ ہے کہ تم عام لوگوں کے ساتھ عدل کرو اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ تم احسان کرو اور اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ تم بنی نوع سے ایسی ہمدردی بجا لاؤ جیسا کہ ایک قریبی کو اپنے قریبی کے ساتھ ہوتی ہے۔ (سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب صفحہ ۴۳-۴۴)

اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ نیکی کے مقابل پر نیکی کرو اور اگر عدل سے بڑھ کر احسان کا موقعہ اور محل ہو تو وہاں احسان کرو اور اگر احسان سے بڑھ کر قریبیوں کی طرح طبعی جوش سے نیکی کرنے کا محل ہو تو وہاں طبعی ہمدردی

سے نیکی کرو اور اس سے خدا تعالیٰ منع فرماتا ہے کہ تم حدودِ اعتدال سے آگے گذر جاؤ یا احسان کے بارے میں مُنکرانہ حالت تم سے صادر ہو جس سے عقل انکار کرے یعنی یہ کہ تم بے محل احسان کرو یا برمحل احسان کرنے سے دریغ کرو یا یہ کہ تم محل پر اِیۡتَآئِ ذِی الۡقُرۡبٰی کے خلق میں کچھ کمی اختیار کرو یا حد سے زیادہ رحم کی بارش کرو۔ اس آیت کریمہ میں ایصالِ خیر کے تین درجوں کا بیان ہے۔

اوّل یہ درجہ کہ نیکی کے مقابل پر نیکی کی جائے۔ یہ تو کم درجہ ہے اور ادنیٰ درجہ کا بھلا مانس آدمی بھی یہ خلق حاصل کر سکتا ہے کہ اپنے نیکی کرنے والوں کے ساتھ نیکی کرتا رہے۔

دوسرا درجہ اس سے مشکل ہے اور وہ یہ کہ ابتداءً آپ ہی نیکی کرنا اور بغیر کسی کے حق کے احسان کے طور پر اس کو فائدہ پہنچانا۔ اور یہ خُلق اوسط درجہ کا ہے۔ اکثر لوگ غریبوں پر احسان کرتے ہیں اور احسان میں ایک یہ مخفی عیب ہے کہ احسان کرنے والا خیال کرتا ہے کہ مَیں نے احسان کیا ہے اور کم سے کم وہ اپنے احسان کے عوض میں شکریہ یا دعا چاہتا ہے اور اگر کوئی ممنونِ منّت اس کا اس کے مخالف ہو جائے تو اس کا نام احسان فراموش رکھتا ہے بعض وقت اپنے احسان کی وجہ سے اس پر فوق الطاقت بوجھ ڈال دیتا ہے اور اپنا احسان اس کو یاد دلاتا ہے جیسا کہ احسان کرنے والوں کو خدا تعالیٰ نے متنبہ کرنے کے لئے فرمایا ہے

لَا تُبۡطِلُوۡا صَدَقٰتِکُمۡ بِالۡمَنِّ وَالۡاَذٰی[1]

یعنی اے احسان کرنے والو اپنے صدقات کو جن کی صِدق پر بِنا چاہیئے احسان یاد دلانے اور دُکھ دینے کے ساتھ برباد مت کرو یعنی صدقہ کا لفظ صِدق سے مشتق ہے پس اگر دِل میں صِدق اور اخلاص نہ رہے تو وہ صدقہ صدقہ نہیں رہتا بلکہ ایک ریاکاری کی حرکت ہو جاتی ہے۔ غرض احسان کرنے والے میں یہ ایک خامی ہوتی ہے کہ کبھی غصہ میں آکر اپنا احسان یاد بھی دلا دیتا ہے اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے احسان کرنے والے کو ڈرایا۔

تیسرا درجہ ایصالِ خیر کا خدا تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ بالکل احسان کا خیال نہ ہو اور نہ شکر گذاری پر نظر ہو بلکہ ایک ایسے ہمدردی کے جوش سے نیکی صادر ہو جیسا کہ ایک نہایت قریبی مثلاً والدہ محض ہمدردی کے جوش سے اپنے بیٹے سے نیکی کرتی ہے۔ یہ وہ آخری درجہ ایصالِ خیر کا ہے جس سے آگے ترقی کرنا ممکن نہیں۔ لیکن خدا تعالیٰ نے ان تمام ایصالِ خیر کی قسموں کو محل اور موقع سے وابستہ کر دیا ہے اور آیت موصوفہ میں صاف فرما دیا ہے کہ اگر یہ نیکیاں اپنے اپنے محل پر مستعمل نہیں ہوں گی تو پھر یہ بدیاں ہو جائیں گی۔ بجائے عدل فحشاء بن جائے گا یعنی حد سے اتنا تجاوز کرنا کہ ناپاک صورت ہو جائے اور ایسا ہی بجائے احسان کے مُنکر کی صورت نکل آئے گی یعنی وہ صورت جس سے عقل اور کانشنس انکار کرتا

---

[1] البقرۃ آیت ۲۶۵

ہے اور بجائے اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی کے بغی بن جائے گا یعنی وہ بے محل ہمدردی کا جوش ایک بُری صورت پیدا کرے گا اصل میں بغی اس بارش کو کہتے ہیں جو حد سے زیادہ برس جائے اور کھیتوں کو تباہ کر دے۔ اور حق واجب میں کمی رکھنے کو بغی کہتے ہیں اور یا حق واجب سے افزونی کرنا بھی بغی ہے۔ غرض ان تینوں میں سے جو محل پر صادر نہیں ہوگا وہی خراب سیرت ہو جائے گی۔ اسی لئے ان تینوں کے ساتھ موقع اور محل کی شرط لگا دی ہے۔ اس جگہ یاد رہے کہ مجرّد عدل یا احسان یا ہمدردی ذی القربٰی کو خُلق نہیں کہہ سکتے بلکہ انسان میں یہ سب طبعی حالتیں اور طبعی قوتیں ہیں کہ جو بچوں میں بھی وجودِ عقل سے پہلے پائی جاتی ہیں مگر خُلق کے لئے عقل شرط ہے اور نیز یہ شرط ہے کہ ہر ایک طبعی قوت محل اور موقع پر استعمال ہو۔

اور پھر احسان کے بارے میں اَور بھی ضروری ہدایتیں قرآن شریف میں ہیں اور سب کو الف لام کے ساتھ جو خاص کرنے کے لئے آتا ہے استعمال فرما کر موقع اور محل کی رعایت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۴۴-۴۷ طبع اوّل)

خدا حکم کرتا ہے کہ تم عدل کرو اور اِس سے بڑھ کر یہ کہ تم احسان کرو اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تم لوگوں کی ایسے طور سے خدمت کرو کہ جیسے کوئی قرابت کے جوش سے خدمت کرتا ہے یعنی بنی نوع سے تمہاری ہمدردی جوش طبعی سے ہو کوئی ارادہ احسان رکھنے کا نہ ہو جیسا کہ ماں اپنے بچّہ سے ہمدردی رکھتی ہے۔

(کتاب البریّہ صفحہ ۹۲ طبع اوّل)

یہ آیت حق اللہ اور حق العباد پر مشتمل ہے اور اس میں کمال بلاغت یہ ہے کہ دونوں پہلو پر اللہ تعالیٰ نے اس کو قائم کیا ہے۔ حق العباد کا پہلو تو ہم ذکر کر چکے ہیں اور حق اللہ کے پہلو کی رُو سے اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ انصاف کی پابندی سے خدا تعالیٰ کی اطاعت کر کیونکہ جس نے تجھے پیدا کیا اور تیری پرورش کی اور ہر وقت کر رہا ہے۔ اس کا حق ہے کہ تو بھی اس کی اطاعت کرے اور اگر اس سے زیادہ تجھے بصیرت ہو تو نہ صرف رعایت حق سے بلکہ احسان کی پابندی سے اس کی اطاعت کر کیونکہ وہ محسن ہے اور اس کے احسان اس قدر ہیں کہ شمار میں نہیں آ سکتے اور ظاہر ہے کہ عدل کے درجہ سے بڑھ کر وہ درجہ ہے جس میں اطاعت کے وقت احسان بھی ملحوظ رہے اور چونکہ ہر وقت مطالعہ اور ملاحظہ احسان کا محسن کی شکل اور شمائل کو ہمیشہ نظر کے سامنے لے آتا ہے۔ اس لئے احسان کی تعریف میں یہ بات داخل ہے کہ ایسے طور سے عبادت کرے کہ گویا خدا تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے اور خدا تعالیٰ کی اطاعت کرنے والے درحقیقت تین قسم پر منقسم ہیں۔ اوّل وہ لوگ جو بباعث محجوبیت اور رویت اسباب کے احسان الٰہی کا اچھی طرح ملاحظہ نہیں کرتے اور نہ وہ جوش ان میں پیدا ہوتا ہے جو احسان کی عظمتوں پر نظر ڈال کر پیدا ہوا کرتا ہے اور نہ وہ محبت ان میں حرکت کرتی ہے جو محسن کی عنایات عظیمہ کا تصوّر کر کے جنبش میں آیا کرتی ہے بلکہ صرف ایک اجمالی نظر سے خدا تعالیٰ کے

حقوق خالقیت وغیرہ کو تسلیم کر لیتے ہیں اور احسانِ الٰہی کی ان تفصیلات کو جن پر ایک باریک نظر ڈالنا اس حقیقی محسن کو نظر کے سامنے لے آتا ہے ہرگز مشاہدہ نہیں کرتے کیونکہ اسباب پرستی کا گرد وغبار مسبّب حقیقی کا پورا چہرہ دیکھنے سے روک دیتا ہے اس لئے ان کو وہ صاف نظر میسّر نہیں آتی جس سے کامل طور پر معطی حقیقی کا جمال مشاہدہ کر سکتے سو ان کی ناقص معرفت رعایت اسباب کی کدورت سے ملی ہوئی ہوتی ہے اور بوجہ اس کے جو وہ خدا کے احسانات کو اچھی طرح دیکھ نہیں سکتے خود بھی اس کی طرف وہ التفات نہیں کرتے جو احسانات کے مشاہدہ کے وقت کرنی پڑتی ہے جس سے محسن کی شکل نظر کے سامنے آ جاتی ہے بلکہ ان کی معرفت ایک دھندلی سی ہوتی ہے وجہ یہ کہ وہ کچھ تو اپنی محنتوں اور اپنے اسباب پر بھروسہ رکھتے ہیں اور کچھ تکلّف کے طور پر یہ بھی مانتے ہیں کہ خدا کا حق خالقیت اور رزّاقیت ہمارے سر پر واجب ہے اور چونکہ خدا تعالیٰ انسان کو اُس کے وسعتِ فہم سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا اس لئے ان سے جب تک کہ وہ اس حالت میں ہیں یہی چاہتا ہے کہ اس کے حقوق کا شکر ادا کریں اور آیت اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ میں عدل سے مراد یہی اطاعت برعایت عدل ہے مگر اس سے بڑھ کر ایک اور مرتبہ انسان کی معرفت کا ہے اور وہ یہ ہے کہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں انسان کی نظر رویت اسباب سے بالکل پاک اور منزّہ ہو کر خدا تعالیٰ کے فضل اور احسان کے ہاتھ کو دیکھ لیتی ہے اور اس مرتبہ پر انسان اسباب کے حجابوں سے بالکل باہر آ جاتا ہے اور یہ مقولہ کہ مثلاً میری اپنی ہی آبپاشی سے میری کھیتی ہوئی اور یا میرے اپنے ہی بازو سے یہ کامیابی مجھے ہوئی یا زید کی مہربانی سے فلاں مطلب میرا پورا ہوا اور بکر کی خبر گیری سے میں تباہی سے بچ گیا یہ تمام باتیں ہیچ اور باطل معلوم ہونے لگتی ہیں اور ایک ہی ہستی اور ایک ہی قدرت اور ایک ہی محسن اور ایک ہی ہاتھ نظر آتا ہے تب انسان ایک صاف نظر سے جس کے ساتھ ایک ذرہ شرک فی الاسباب کی گرد وغبار نہیں خدا تعالیٰ کے احسانوں کو دیکھتا ہے اور یہ رویت اس قسم کی صاف اور یقینی ہوتی ہے کہ وہ ایسے محسن کی عبادت کرنے کے وقت اس کو غائب نہیں سمجھتا بلکہ یقیناً اس کو حاضر خیال کر کے اس کی عبادت کرتا ہے اور اس عبادت کا نام قرآن شریف میں احسان ہے اور صحیح بخاری اور مُسلم میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کے یہی معنے بیان فرمائے ہیں۔

اور اس درجہ کے بعد ایک اور درجہ ہے جس کا نام اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی ہے اور تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب انسان ایک مدّت تک احساناتِ الٰہی کو بلا شرکت اسباب دیکھتا ہے اور اس کو حاضر اور بلا واسطہ محسن سمجھ کر اس کی عبادت کرتا رہے تو اس تصوّر اور تخیّل کا آخری نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک ذاتی محبّت اس کو جناب الٰہی کی نسبت پیدا ہو جائے گی کیونکہ متواتر احسانات کا دائمی ملاحظہ بالضرورت شخص ممنون کے دل میں یہ اثر پیدا کرتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ اس شخص کی ذاتی محبت سے بھر جاتا ہے جس کے غیر محدود احسانات اُس پر محیط ہو گئے۔ پس اس صورت میں وہ صرف احسانات کے تصوّر سے اس کی عبادت نہیں کرتا بلکہ اس کی ذاتی محبت اس کے دل میں بیٹھ جاتی ہے جیسا کہ بچّہ کو ایک ذاتی محبّت

اپنی ماں سے ہوتی ہے پس اس مرتبہ پر وہ عبادت کے وقت صرف خدا تعالیٰ کو دیکھتا ہی نہیں بلکہ دیکھ کر سچے عشاق کی طرح لذت بھی اٹھاتا ہے اور تمام اغراض نفسانی معدوم ہو کر ذاتی محبت اس کی اندر پیدا ہو جاتی ہے اور یہ وہ مرتبہ ہے جس کو خدا تعالیٰ نے لفظ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی سے تعبیر کیا ہے اور اسی کی طرف خدا تعالیٰ نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا[1]

غرض آیت اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی کی یہ تفسیر ہے اور اس میں خدا تعالیٰ نے تینوں مرتبے انسانی معرفت کے بیان کر دئے اور تیسرے مرتبہ کو محبت ذاتی کا مرتبہ قرار دیا اور یہ وہ مرتبہ ہے جس میں تمام اغراض نفسانی جل جاتے ہیں اور دل ایسا محبت سے بھر جاتا ہے جیسا کہ ایک شیشہ عطر سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ اسی مرتبہ کی طرف اشارہ اس آیت میں ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ[2] یعنی بعض مومن لوگوں میں سے وہ بھی ہیں کہ اپنی جانیں رضاء الٰہی کے عوض میں بیچ دیتے ہیں اور خدا ایسوں ہی پر مہربان ہے اور پھر فرمایا بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ[3] یعنی وہ لوگ نجات یافتہ ہیں جو خدا کو اپنا وجود حوالہ کر دیں اور اس کی نعمتوں کے تصور سے اس طور سے اس کی عبادت کریں کہ گویا اس کو دیکھ رہے ہیں سو ایسے لوگ خدا کے پاس سے اجر پاتے ہیں اور نہ ان کو کچھ خوف ہے اور نہ وے کچھ غم کرتے ہیں یعنی ان کا مدعا خدا اور خدا کی محبت ہو جاتی ہے اور خدا کے پاس کی نعمتیں اُن کا اجر ہوتا ہے۔ اور پھر ایک جگہ فرمایا يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا[4] یعنی مومن وہ ہیں جو خدا کی محبت سے مسکینوں اور یتیموں اور قیدیوں کو روٹی کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس روٹی کھلانے سے تم سے کوئی بدلہ اور شکر گزاری نہیں چاہتے اور نہ ہماری کچھ غرض ہے ان تمام خدمات سے صرف خدا کا چہرہ ہمارا مطلب ہے۔ اب سوچنا چاہئے کہ ان تمام آیات سے کس قدر صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف نے اعلیٰ طبقہ عبادت الٰہی کا اور اعمال صالحہ کا یہی رکھا ہے کہ محبت الٰہی اور رضاء الٰہی کی طلب سچے دل سے ظہور میں آوے۔

(نور القرآن نمبر ۲ صفحہ ۴۱-۴۴)

مرتبہ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی متواتر احسانات کے ملاحظہ سے پیدا ہوتا ہے اور اس مرتبہ میں کامل طور پر عابد کے دل میں محبت ذات باری تعالیٰ کی پیدا ہو جاتی ہے اور اغراض نفسانیہ کا رائحہ اور بقیہ بالکل دور ہو جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ محبت ذاتی کا اصل اور منبع دو ہی چیزیں ہیں (۱) اوّل کثرت سے مطالعہ کسی کے حسن کا اور اسکے

---

[1] البقرۃ آیت ۲۰۱ ۞ [2] البقرہ آیت ۲۰۸ ۞ [3] البقرہ آیت ۱۱۳ ۞ [4] الدھر آیت ۸ و ۹ ۞

نقوش اور خال وخط اور شمائل کو ہر وقت ذہن میں رکھنا اور بار بار اس کا تصوّر کرنا (۲) دوسرے کثرت سے تصور کسی کے متواتر احسانات کا کرنا اور اس کے انواع اقسام کے مروّتوں اور احسانوں کو ذہن میں لاتے رہنا اور ان احسانوں کی عظمت اپنے دل میں بٹھانا۔ (نورالقرآن ۲ صفحہ ۴۳ حاشیہ)

خدا تم سے کیا چاہتا ہے بس یہی کہ تم تمام نوع انسان سے عدل کے ساتھ پیش آیا کرو۔ پھر اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اُن سے بھی نیکی کرو جنہوں نے تم سے کوئی نیکی نہیں کی۔ پھر اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ تم مخلوقِ خدا سے ایسی ہمدردی کے ساتھ پیش آؤ کہ گویا تم اُن کے حقیقی رشتہ دار ہو جیسا کہ مائیں اپنے بچوں سے پیش آتی ہیں کیونکہ احسان میں ایک خودنمائی کا مادہ بھی مخفی ہوتا ہے اور احسان کرنے والا کبھی اپنے احسان کو جتلا بھی دیتا ہے لیکن وہ جو ماں کی طرح طبعی جوش سے نیکی کرتا ہے وہ کبھی خودنمائی نہیں کرسکتا پس آخری درجہ نیکیوں کا طبعی جوش ہے جو ماں کی طرح ہو اور یہ آیت نہ صرف مخلوق کے متعلق ہے بلکہ خدا کے متعلق بھی ہے۔ خدا سے عدل یہ ہے کہ اس کی نعمتوں کو یاد کرکے اُسکی فرماں برداری کرنا اور خدا سے احسان یہ ہے کہ اس کی ذات پر ایسا یقین کرلینا کہ گویا اس کو دیکھ رہا ہے۔ اور خدا سے اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی یہ ہے کہ اس کی عبادت نہ تو بہشت کے طمع سے ہو اور نہ دوزخ کے خوف سے بلکہ اگر فرض کیا جائے کہ نہ بہشت ہے اور نہ دوزخ ہے تب بھی جوشِ محبت اور اطاعت میں فرق نہ آوے۔ (کشتی نوح صفحہ ۲۸ طبع اوّل)

خدا تمہیں حکم دیتا ہے کہ انصاف کرو اور عدل پر قائم ہو جاؤ اور اگر اس سے زیادہ کامل بننا چاہو تو پھر احسان کرو یعنی ایسے لوگوں سے سلوک اور نیکی کرو جنہوں نے تم سے کوئی نیکی نہیں کی۔ اور اگر اس سے بھی زیادہ کامل بننا چاہو تو محض ذاتی ہمدردی سے اور محض طبعی جوش سے بغیر نیت کسی شکر یا ممنونِ منت کرنے کے بنی نوع سے نیکی کرو جیسا کہ ماں اپنے بچہ سے فقط اپنے طبعی جوش سے نیکی کرتی ہے اور فرمایا کہ خدا تمہیں اس سے منع کرتا ہے کہ کوئی زیادتی کرو یا احسان جتلاؤ یا سچی ہمدردی کرنے والے کے کافر نعمت بنو۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۹ طبع اوّل)

اس آیت میں ان تین مدارج کا ذکر کیا ہے جو انسان کو حاصل کرنے چاہئیں۔ پہلا مرتبہ عدل کا ہے اور عدل یہ ہے کہ انسان کسی سے کوئی نیکی کرے بشرط معاوضہ اور یہ ظاہر بات ہے کہ ایسی نیکی کوئی اعلیٰ درجہ کی بات نہیں بلکہ سب سے ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ عدل کرو اور اگر اس پر ترقی کرو تو پھر وہ احسان کا درجہ ہے یعنی بلا عوض سلوک کرو لیکن یہ امر کہ جو بدی کرتا ہے اس سے نیکی کی جاوے کوئی ایک گال پر طمانچہ مارے دوسری پھیر دی جاوے۔ یہ صحیح نہیں یا یہ کہو کہ عام طور پر یہ تعلیم عمل درآمد میں نہیں آسکتی۔ چنانچہ سعدی کہتا ہے ؎

نکوئی با بدان کردن چنان است ❊ کہ بد کردن بجائے نیک مردان

اس لئے اسلام نے انتقامی حدود میں جو اعلیٰ درجہ کی تعلیم دی ہے کوئی دوسرا مذہب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا اور وہ یہ ہے جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ الآیۃ[۱] یعنی بدی کی سزا اسی قدر بدی ہے اور جو معاف

[۱] الشوریٰ آیت ۴۱

کر دے مگر ایسے محل اور مقام پر کہ وہ عفو اصلاح کا موجب ہو۔ اسلام نے عفو خطا کی تعلیم دی لیکن یہ نہیں کہ اس سے شر بڑھے۔

غرض عدل کے بعد دوسرا درجہ احسان کا ہے یعنی بغیر کسی معاوضہ کے سلوک کیا جاوے لیکن اس سلوک میں بھی ایک قسم کی خود غرضی ہوتی ہے کسی نہ کسی وقت انسان اس احسان یا نیکی کو جتا دیتا ہے اس لئے اس سے بھی بڑھ کر ایک تعلیم دی اور وہ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی کا درجہ ہے۔ ماں جو اپنے بچّہ کے ساتھ سلوک کرتی ہے وہ اس سے کسی معاوضہ اور انعام واکرام کی خواہشمند نہیں ہوتی۔ وہ اس کے ساتھ جو نیکی کرتی ہے محض طبعی محبت سے کرتی ہے۔ اگر بادشاہ اس کو حکم دے کہ تو اس کو دودھ مت دے اور اگر یہ تیری غفلت سے مر بھی جاوے تو تجھے کوئی سزا نہیں دی جاوے گی بلکہ انعام دیا جاوے گا اس صورت میں وہ بادشاہ کا حکم ماننے کو طیار نہ ہوگی بلکہ اس کو گالیاں دے گی کہ یہ میری اولاد کا دشمن ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ ذاتی محبت سے کر رہی ہے اُس کی کوئی غرض درمیان نہیں۔ یہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم ہے جو اسلام پیش کرتا ہے اور یہ آیت حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں پر حاوی ہے۔ حقوق اللہ کے پہلو کے لحاظ سے اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ انصاف کی رعایت سے اللہ تعالےٰ کی اطاعت اور عبادت کر جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور تمہاری پرورش کرتا ہے اور جو اطاعتِ الٰہی میں اس مقام سے ترقی کرے تو احسان کی پابندی سے اطاعت کرے کیونکہ وہ محسن ہے اور اس کے احسانات کو کوئی شمار نہیں کر سکتا اور چونکہ محسن کے شمائل اور خصائل کو مدنظر رکھنے سے اس کے احسان تازہ رہتے ہیں اس لئے احسان کا مفہوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا ہے کہ ایسے طور پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے گویا دیکھ رہا ہے یا کم از کم یہ کہ اللہ تعالیٰ اُسے دیکھ رہا ہے۔ اس مقام تک انسان میں ایک حجاب رہتا ہے لیکن اس کے بعد جو تیسرا درجہ ہے اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی کا یعنی اللہ تعالیٰ سے اُسے ذاتی محبت پیدا ہو جاتی ہے اور حقوق العباد کے پہلو سے مَیں اس کے معنے پہلے بیان کر چکا ہوں اور یہ بھی مَیں نے بیان کیا ہے کہ یہ تعلیم جو قرآن شریف نے دی ہے کسی اور کتاب نے نہیں دی اور ایسی کامل ہے کہ کوئی نظیر اس کی پیش نہیں کر سکتا۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۷ صفحہ ۳ مورخہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۰۶ء)

سچا مذہب وہی ہے جو انسانی قویٰ کا مربّی ہو نہ کہ اُن کا استیصال کرے۔ رجولیّت یا غضب جو خدا تعالےٰ کی طرف سے فطرتِ انسانی میں رکھے گئے ہیں ان کو چھوڑنا خدا کا مقابلہ کرنا ہے جیسے تارک الدنیا ہونا یا راہب بن جانا۔ یہ تمام حق العباد کو تلف کرنے والے ہیں۔ اگر یہ امر ایسا ہی ہوتا تو گویا اُس خدا پر اعتراض ہے جس نے یہ قویٰ ہم میں پیدا کئے۔ سو ایسی تعلیمیں جو انجیل میں ہیں اور جن سے قویٰ کا استیصال لازم آتا ہے ضلالت تک پہنچاتی ہیں اللہ تعالیٰ تو اُس کی تعدیل کا حکم دیتا ہے ضائع کرنا پسند نہیں کرتا جیسے فرمایا اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ الخ (النحل: ۹۱) عدل ایک ایسی چیز ہے جس سے سب کو فائدہ اٹھانا چاہئے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۷-۴۸ طبع اوّل)

نیکی یہ ہے کہ خدا سے پاک تعلقات قائم کئے جاویں اور اس کی محبت ذاتی رگ و ریشہ میں سرایت کر جاوے جیسے خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى خدا کے ساتھ عدل یہ ہے کہ اسکی نعمتوں کو یاد کر کے اس کی فرماں برداری کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھیراؤ اور اُسے پہچانو اور اس پر ترقی کرنا چاہو تو درجہ احسان کا ہے اور وہ یہ ہے کہ اُس کی ذات پر ایسا یقین کر لینا کہ گویا اس کو دیکھ رہا ہے اور جن لوگوں نے تم سے سلوک نہیں کیا ان سے سلوک کرنا اور اگر اس سے بڑھ کر سلوک چاہو تو ایک اور درجہ نیکی کا یہ ہے کہ خدا کی محبت طبعی محبت سے کرو نہ بہشت کی طمع نہ دوزخ کا خوف ہو۔ بلکہ اگر فرض کیا جاوے کہ نہ بہشت ہے نہ دوزخ ہے تب بھی جوشِ محبت اور اطاعت میں فرق نہ آوے۔ ایسی محبت جب خدا سے ہو تو اس میں ایک کشش پیدا ہو جاتی ہے اور کوئی فتور واقع نہیں ہوتا۔

اور مخلوق خدا سے ایسے پیش آؤ کہ گویا تم ان کے حقیقی رشتہ دار ہو یہ درجہ سب سے بڑھ کر ہے کیونکہ احسان میں ایک مادہ خودنمائی کا ہوتا ہے اور اگر کوئی احسان فراموشی کرتا ہو تو محسن جھٹ کہہ اٹھتا ہے کہ مَیں نے تیرے ساتھ فلاں احسان کئے لیکن طبعی محبت جو کہ ماں کو بچے کے ساتھ ہوتی ہے اس میں کوئی خودنمائی نہیں ہوتی بلکہ اگر ایک بادشاہ ماں کو یہ حکم دیوے کہ تو اس بچہ کو اگر مار بھی ڈالے تو تجھ سے کوئی بازپرس نہ ہو گی تو وہ کبھی یہ بات سننی گوارا نہ کرے گی اور اس بادشاہ کو گالی دے گی حالانکہ اسے علم بھی ہو کہ اس کے جوان ہونے تک مَیں نے مر جانا ہے مگر پھر بھی محبت ذاتی کی وجہ سے وہ بچہ کی پرورش کو ترک نہ کرے گی۔ اکثر دفعہ ماں باپ بوڑھے ہوتے ہیں اور ان کو اولاد ہوتی ہے تو اُن کی کوئی امید بظاہر اولاد سے فائدہ اٹھانے کی نہیں ہوتی لیکن باوجود اس کے پھر بھی وہ اس سے محبت اور پرورش کرتے ہیں یہ ایک طبعی امر ہوتا ہے۔ جو محبت اس درجہ تک پہنچ جاوے اسی کا اشارہ اِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى میں کیا گیا ہے کہ اس قسم کی محبت خدا کے ساتھ ہونی چاہئے نہ مراتب کی خواہش نہ ذلّت کا ڈر۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴۳ مورخہ ۱۶؍ نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۳۵)

اخلاق دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو وہ ہیں جو آج کل کے نوتعلیم یافتہ پیش کرتے ہیں کہ ملاقات وغیرہ میں زبان سے چاپلوسی اور مداہنہ سے پیش آتے ہیں اور دلوں میں نفاق اور کینہ بھرا ہوا ہوتا ہے یہ اخلاق قرآن شریف کے خلاف ہیں۔ دوسری قسم اخلاق کی یہ ہے کہ سچی ہمدردی کرے۔ دل میں نفاق نہ ہو اور چاپلوسی اور مداہنہ وغیرہ سے کام نہ لے جیسے خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ وَإِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى تو یہ کامل طریق ہے اور ہر ایک کامل طریق اور ہدایت خدا کے کلام میں موجود ہے جو اس سے روگردانی کرتے ہیں وہ اور جگہ ہدایت نہیں پا سکتے۔ اچھی تعلیم اپنی اثر اندازی کے لئے دل کی پاکیزگی چاہتی ہے۔ جو لوگ اس سے دُور ہیں اگر عمیق نظر سے اُن کو دیکھو گے تو اُن میں ضرور گند نظر آئے گا۔ زندگی کا اعتبار نہیں ہے نماز، صدق و صفا میں ترقی کرو۔ (البدر جلد ۲

۲۶ مورخہ ۸ر دسمبر ۱۹۰۳ء (صفحہ ۳۶۳)

مَیں تمہیں بار بار یہی نصیحت کرتا ہوں کہ تم ہرگز ہرگز اپنی ہمدردی کے دائرہ کو محدود نہ کرو اور ہمدردی کے لئے اس تعلیم کی پیروی کرو جو اللہ تعالیٰ نے دی ہے یعنی اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی یعنی اوّل نیکی کرنے میں تم عدل کو ملحوظ رکھو جو شخص تم سے نیکی کرے تم بھی اس کے ساتھ نیکی کرو۔

اور پھر دوسرا درجہ یہ ہے کہ تم اس سے بھی بڑھ کر اس سے سلوک کرو یہ احسان ہے۔ احسان کا درجہ اگرچہ عدل سے بڑھا ہوا ہے اور یہ بڑی بھاری نیکی ہے لیکن کبھی نہ کبھی ممکن ہے احسان والا اپنا احسان جتلا دے مگر ان سب سے بڑھ کر ایک درجہ ہے کہ انسان ایسے طور پر نیکی کرے جو محبت ذاتی کے رنگ میں ہو جس میں احسان نمائی کا بھی کوئی حصّہ نہیں ہوتا ہے جیسے ماں اپنے بچہ کی پرورش کرتی ہے وہ اس پرورش میں کسی اجر اور صلے کی خواستگار نہیں ہوتی بلکہ ایک طبعی جوش ہوتا ہے جو بچے کے لئے اپنے سارے سُکھ اور آرام قربان کر دیتی ہے یہاں تک کہ اگر کوئی بادشاہ کسی ماں کو حکم دیدے کہ تو اپنے بچّہ کو دودھ مت پلا اور اگر ایسا کرنے سے بچہ ضائع بھی ہو جاوے تو اس کو کوئی سزا نہیں ہوگی تو کیا ماں ایسا حکم سُن کر خوش ہوگی۔ اور اس کی تعمیل کرے گی؟ ہرگز نہیں بلکہ وہ تو اپنے دل میں ایسے بادشاہ کو کوسے گی کہ کیوں اس نے ایسا حکم دیا۔ پس اس طریق پر نیکی ہو کہ اسے طبعی مرتبہ تک پہنچایا جاوے کیونکہ جب کوئی شئے ترقی کرتے کرتے اپنے طبعی کمال تک پہنچ جاتی ہے اس وقت وہ کامل ہوتی ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ر جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

باہمی ہمدردی کے اللہ تعالیٰ نے تین مراتب رکھے ہیں جن کا ذکر آیت اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی میں ہے۔ سب سے چھوٹی نیکی اس میں عدل کو قرار دیا گیا ہے کہ اگر کوئی تم سے نیکی کا معاملہ کرے تو تم بھی اس سے ویسا ہی کرو۔ اس کے بعد پھر احسان کا درجہ ہے اور اگرچہ یہ عدل سے اعلیٰ ہے لیکن اس میں بھی ایک نقص ہے کہ احسان کرنے والے کے دل میں ریا اور خودی آسکتی ہے اور کسی موقعہ پر جتلا سکتا ہے کہ مَیں نے تیرے ساتھ فلاں نیکی (احسان) کیا ہے مگر اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی میں ریاء اور خودی کا نام و نشان نہیں ہوتا جیسے ماں اپنے بچے کو طبعی طور سے پرورش کرتی ہے اور اس کو کوئی علم اس کی موت اور زندگی کا نہیں ہوتا اور نہ اُس سے فایدے اور ضرر کی امید ہو سکتی ہے لیکن خدا تعالیٰ نے جوش اُس کے دل میں ڈالا ہوا ہوتا ہے اور وہ بے اختیار اپنے ہر ایک قسم کے سُکھ اور آرام کو اس بچے کے لئے قربان کر دیتی ہے اسی طرح طبعی جوش سے نوع انسان کی ہمدردی کا نام اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی ہے اور اس ترتیب سے خدا تعالیٰ کا یہ منشاء ہے کہ اگر تم پورا نیک بننا چاہتے ہو تو اپنی نیکی کو اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی یعنی طبعی درجہ تک پہنچاؤ جب تک کوئی شئے ترقی کرتی کرتی اپنے اس طبعی مرکز تک نہیں پہنچتی تب تک وہ کمال کا درجہ حاصل نہیں کرتی۔

(البدر جلد ۴ نمبر ۲ مورخہ ۱۰ر جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

ہماری لڑکی کو ایک دفعہ ہیضہ ہوگیا تھا ہمارے گھر سے اس کی تمام قے وغیرہ اپنے ہاتھ پر لیتی تھیں۔ ماں سب تکالیف میں بچہ کی شریک ہوتی ہے۔ یہ طبعی محبت ہے جس کے ساتھ کوئی دوسری محبت مقابلہ نہیں کر سکتی۔ خدا تعالیٰ نے اسی کی طرف قرآن شریف میں اشارہ کیا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ وَ اِیْتَآیِٔ ذِی الْقُرْبٰی۔

ادنیٰ درجہ عدل کا ہوتا ہے۔ جتنا لے اُتنا دے۔ اس سے ترقی کرے تو احسان کا درجہ ہے جتنا لے وہ بھی دے اور اس سے بڑھ کر بھی دے۔ پھر اُس سے بڑھ کر اِیْتَآیِٔ ذِی الْقُرْبٰی کا درجہ ہے یعنی دوسروں کے ساتھ اس طرح نیکی کرے جس طرح ماں بچہ کے ساتھ بغیر نیت کسی معاوضہ کے طبعی طور پر محبت کرتی ہے۔ قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اللہ ترقی کر کے ایسی محبت کو حاصل کر سکتے ہیں۔ انسان کا ظرف چھوٹا نہیں۔ خدا کے فضل سے یہ باتیں حاصل ہو جاتی ہیں بلکہ یہ وسعت اخلاق کے لوازمات میں سے ہے۔ مَیں تو قائل ہوں کہ اہل اللہ یہاں تک ترقی کرتے ہیں کہ مادری محبت کے اندازہ سے بھی بڑھ کر انسان کے ساتھ محبت کرتے ہیں۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۹ مورخہ یکم جون ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

بیشک اللہ تعالیٰ عدل کا حکم دیتا ہے اور پھر اس سے ترقی کرو تو احسان کا حکم دیتا ہے اور پھر اس سے بھی ترقی کرو تو اِیْتَآیِٔ ذِی الْقُرْبٰی کا حکم ہے۔

عدل کی حالت یہ ہے جو متقی کی حالت نفس امّارہ کی صورت میں ہوتی ہے۔ اس حالت کی اصلاح کے لئے عدل کا حکم ہے۔ اس میں نفس کی مخالفت کرنی پڑتی ہے مثلاً کسی کا قرضہ ادا کرنا ہے لیکن نفس اس میں یہی خواہش کرتا ہے کہ کسی طرح سے اس کو دبا لُوں اور اتفاق سے اس کی میعاد بھی گذر جاوے اس صورت میں نفس اور بھی دلیر اور بے باک ہوگا کہ اب تو قانونی طور پر بھی کوئی مؤاخذہ نہیں ہو سکتا مگر یہ ٹھیک نہیں۔ عدل کا تقاضا یہی ہے کہ اس کا دَینِ واجب ادا کیا جاوے اور کسی حیلے اور عُذر سے اس کو دبایا نہ جاوے۔

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض لوگ ان امور کی پروا نہیں کرتے اور ہماری جماعت میں بھی ایسے لوگ ہیں جو بہت کم توجہ کرتے ہیں اپنے قرضوں کے ادا کرنے میں۔ یہ عدل کے خلاف ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو ایسے لوگوں کی نماز نہ پڑھتے تھے۔ پس تم میں سے ہر ایک اس بات کو خوب یاد رکھے کہ قرضوں کے ادا کرنے میں سُستی نہیں کرنی چاہئے اور کسی قسم کی خیانت اور بے ایمانی سے دُور بھاگنا چاہئے کیونکہ یہ امرِ الٰہی کے خلاف ہے جو اس نے اس آیت میں دیا ہے۔

اس کے بعد احسان کا درجہ ہے۔ جو شخص عدل کی رعایت کرتا ہے اور اس کی حدبندی کو نہیں توڑتا اللہ تعالیٰ اسے توفیق اور قوت دے دیتا ہے اور وہ نیکی میں اَور ترقی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ عدل ہی نہیں کرتا بلکہ تھوڑی سی نیکی کے بدلے بہت بڑی نیکی کرتا ہے لیکن احسان کی حالت میں بھی ایک کمزوری ابھی باقی ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی نہ کسی وقت اس نیکی کو جتا بھی دیتا ہے مثلاً ایک شخص دس برس تک کسی کو روٹی کھلاتا ہے اور وہ کبھی ایک

بات اس کی نہیں مانتا تو اُسے کہہ دیتا ہے کہ دس برس کا ہمارے ٹکڑوں کا غلام ہے اور اس طرح پر اس نیکی کو بے اثر کر دیتا ہے۔ دراصل احسان کرنے والے کے اندر بھی ایک قسم کی مخفی ریا ہوتی ہے لیکن تیسرا مرتبہ ہر قسم کی آلائش اور آلودگی سے پاک ہے اور وہ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی کا درجہ ہے۔

اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی کا درجہ طبعی حالت کا درجہ ہے یعنی جس مقام پر انسان سے نیکیوں کا صدور ایسے طور پر ہو جیسے طبعی تقاضا ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ماں اپنے بچّے کو دودھ دیتی ہے اور اس کی پرورش کرتی ہے کبھی اس کو خیال بھی نہیں آتا کہ بڑا ہو کر کمائی کرے گا اور اس کی خدمت کرے گا یہاں تک کہ اگر کوئی بادشاہ اسے یہ حکم دے کہ تو اگر اپنے بچّے کو دودھ نہ دے گی اور اس سے وہ مر جاوے تو بھی تجھ سے مؤاخذہ نہ ہوگا۔ اس حکم پر بھی اس کو دُودھ دینا وہ نہیں چھوڑ سکتی بلکہ ایسے بادشاہ کو دو چار گالیاں ہی سُنا دے گی اس لئے کہ وہ پرورش اس کا ایک طبعی تقاضا ہے۔ وہ کسی امید یا خوف پر مبنی نہیں۔ اسی طرح پر جب انسان نیکی میں ترقی کرتے کرتے اس مقام پر پہنچتا ہے کہ وہ نیکیاں اس سے ایسے طور پر صادر ہوتی ہیں گویا ایک طبعی تقاضا ہے تو یہی وہ حالت ہے جو مطمئنہ کہلاتی ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

پہلے فرمایا کہ عدل کرو۔ پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر فرمایا احسان کا بھی خدا نے تم کو حکم کیا ہے یعنی صرف اسی سے نیکی نہ کرو جس نے تم سے نیکی کی ہو بلکہ احسان کے طور پر بھی جو کہ کوئی حق نہ رکھتا ہو کہ اس سے نیکی کی جاوے اس سے بھی نیکی کرو مگر احسان میں بھی ایک قسم کا باریک نقص اور مخفی تعلق اس شخص سے رہ جاتا ہے جس سے احسان کیا گیا ہے کیونکہ کبھی کسی موقع پر اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جائے جو اس محسن کے خلاف طبیعت ہو یا نافرمانی کر بیٹھے تو محسن ناراض ہو کر اس کو احسان فراموش یا نمک حرام وغیرہ کہہ دے گا اور اگرچہ وہ شخص اس بات کو دبانے کی کوشش بھی کرے گا مگر پھر اس میں ایک ایسا مخفی اور باریک رنگ میں نقص باقی رہ جاتا ہے کہ کبھی نہ کبھی ظاہر ہو ہی جاتا ہے اسی واسطے اس نقص اور کمی کی تلافی کرنے کے واسطے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ احسان سے بھی آگے بڑھو اور ترقی کر کے ایسی نیکی کرو کہ وہ اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی کے رنگ میں رنگین ہو یعنی جس طرح سے ایک ماں اپنے بچے سے نیکی کرتی ہے۔ ماں کی اپنے بچّے سے محبت ایک طبعی اور فطری تقاضا پر مبنی ہے نہ کہ کسی طمع پر۔ دیکھو بعض اوقات ایک ماں ۶۰ برس کی بڑھیا ہوتی ہے۔ اس کو کوئی توقع خدمت کی اپنے بچّے سے نہیں ہوتی کیونکہ اس کو کہاں یہ خیال ہوتا ہے کہ میں اس کے جوان اور لائق ہونے تک زندہ بھی رہوں گی۔ غرض ایک ماں کا اپنے بچّے سے محبت کرنا بلا کسی خدمت یا طمع کے خیال کے فطرت انسانی میں رکھا گیا ہے۔ ماں خود اپنی جان پر دُکھ برداشت کرتی ہے مگر بچّے کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتی ہے۔ خود گیلی جگہ لیٹتی ہے اور اُسے خشک حصہ بستر پر جگہ دیتی ہے۔ بچہ بیمار ہو جائے تو راتوں جاگتی اور طرح طرح کی تکالیف برداشت کرتی ہے۔ اب بتاؤ کہ ماں جو کچھ اپنے بچّے کے واسطے کرتی ہے اس میں تصنّع اور بناوٹ کا کوئی بھی شعبہ

پایا جاتا ہے؟

پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ احسان کے درجہ سے بھی آگے بڑھو اور اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی کے مرتبہ تک ترقی کرو اور خلق اللہ سے بغیر کسی اجر یا نفع و خدمت کے خیال کے طبعی اور فطری جوش سے نیکی کرو تمہاری خلق اللہ سے ایسی نیکی ہو کہ اس میں تصنع اور بناوٹ ہرگز نہ ہو۔ ایک دوسرے موقع پر یوں فرمایا ہے لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا[1] یعنی خدارسیدہ اور اعلیٰ ترقیات پر پہنچے ہوئے انسان کا یہ قاعدہ ہے کہ اس کی نیکی خالصاً للہ ہوتی ہے اور اس کے دل میں بھی یہ خیال نہیں ہوتا کہ اس کے واسطے دعا کی جاوے یا اس کا شکریہ ادا کیا جاوے نیکی محض اس جوش کے تقاضا سے کرتا ہے جو ہمدردی بنی نوع کے واسطے اس کے دل میں رکھا گیا ہے۔ ایسی پاک تعلیم نہ ہم نے توریت میں دیکھی ہے اور نہ انجیل میں۔ ورق ورق کرکے ہم نے پڑھا ہے مگر ایسی پاک اور مکمل تعلیم کا نام ونشان نہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۴؍جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۱)

احسان ایک نہایت عمدہ چیز ہے۔ اس سے انسان اپنے بڑے بڑے مخالفوں کو زیر کرلیتا ہے چنانچہ سیالکوٹ میں ایک شخص تھا جو کہ تمام لوگوں سے لڑائی رکھتا تھا اور کوئی ایسا آدمی نہ ملتا تھا جس سے اس کی صلح ہو یہاں تک کہ اس کے بھائی اور عزیز اقارب بھی اس سے تنگ آچکے تھے۔ اُس سے مَیں نے بعض دفعہ معمولی سا سلوک کیا اور وہ اسکے بدلہ میں کبھی ہم سے بُرائی سے پیش نہ آتا بلکہ جب ملتا تو بڑے ادب سے گفتگو کرتا۔ اسی طرح ایک عرب ہمارے ہاں آیا اور وہ وہابیوں کا سخت مخالف تھا یہاں تک کہ جب اس کے سامنے وہابیوں کا ذکر بھی کیا جاتا تو گالیوں پر اُتر آتا۔ اُس نے یہاں آکر بھی سخت گالیاں دینی شروع کیں اور وہابیوں کو بُرا بھلا کہنے لگا ہم نے اس کی کچھ پرواہ نہ کرکے اس کی خدمت خوب کی اور اچھی طرح سے اس کی دعوت کی اور ایک دن جبکہ وہ غصہ میں بھرا ہوا وہابیوں کو خوب گالیاں دے رہا تھا کسی شخص نے اس کو کہا کہ جس کے گھر تم مہمان ٹھہرے ہو وہ بھی تو وہابی ہے۔ اس پر وہ خاموش ہوگیا اور اس شخص کا مجھ کو وہابی کہنا غلط نہ تھا کیونکہ قرآن شریف کے بعد صحیح احادیث پر عمل کرنا ہی ضروری سمجھتا ہوں۔ خیر وہ شخص چند دن کے بعد چلا گیا۔ اس کے بعد ایک دفعہ لاہور میں مجھ کو پھر ملا۔ اگرچہ وہ وہابیوں کی صورت دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا مگر چونکہ اس کی تواضع اچھی طرح سے کی تھی اس لئے اس کا وہ تمام جوش وخروش دب گیا اور وہ بڑی مہربانی اور پیار سے مجھ کو ملا چنانچہ بڑے اصرار کے ساتھ مجھ کو ساتھ لے گیا اور ایک چھوٹی سی مسجد میں جس کا کہ وہ امام مقرر ہوا تھا مجھ کو بٹھلایا۔ اور خود نوکروں کی طرح پنکھا کرنے لگا اور بہت خوشامد کرنے لگا۔ کہ کچھ چائے وغیرہ پی کر جاویں۔ پس دیکھو کہ احسان کس قدر دلوں کو مسخر کرلیتا ہے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۲۷ مورخہ ۴؍جولائی ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

---

[1] الدھر آیت ۱۰

خدا تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ عدل کرو اور عدل سے بڑھ کر یہ کہ احسان کرو جیسے بچہ سے اس کی والدہ یا کوئی اور شخص محض قرابت کے جوش سے کسی کی ہمدردی کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۳ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۳ ستمبر ۱۸۹۹ء صفحہ ۲)

خدا حکم فرماتا ہے کہ تمام دُنیا کے ساتھ تم عدل کرو یعنی جس قدر حق ہے اُسی قدر لو اور انصاف سے بنی نوع کے ساتھ پیش آؤ اور اس سے بڑھ کر یہ حکم ہے کہ تم بنی نوع سے احسان کرو یعنی وہ سلوک کرو جس سلوک کا کرنا تم پر فرض نہیں محض مروّت ہے۔ مگر چونکہ احسان میں بھی ایک عیب مخفی ہے کہ صاحب احسان کبھی ناراض ہو کر اپنے احسان کو یاد بھی دلا دیتا ہے اِس لئے اِس آیت کے آخر میں فرمایا کہ کامل نیکی یہ ہے کہ تم اپنے بنی نوع سے اس طور سے نیکی کرو کہ جیسے ماں اپنے بچہ سے نیکی کرتی ہے کیونکہ وہ نیکی محض طبعی جوش سے ہوتی ہے نہ کسی پاداش کی غرض سے۔ یہ دل میں ارادہ ہی نہیں ہوتا کہ یہ بچہ اس نیکی کے مقابل مجھے بھی کچھ عنایت کرے پس وہ نیکی جو بنی نوع سے کی جاتی ہے کامل درجہ اُس کا یہ تیسرا درجہ ہے جس کو اِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی کے لفظ سے بیان فرمایا گیا ہے۔ (لیکچر چشمہ معرفت صفحہ ۱۱)

۹۸ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

ہماری یہی عادت اور یہی سنّت ہے کہ جو شخص عمل صالح بجا لاوے۔ مرد ہو یا عورت ہو اور وہ مومن ہو ہم اس کو ایک پاک زندگی کے ساتھ زندہ رکھا کرتے ہیں اور اس سے بہتر جزا دیا کرتے ہیں جو وہ عمل کرتے ہیں۔ اب اگر اس آیت کو صرف زمانہ مستقبلہ سے وابستہ کر دیا جائے تو گویا اُس کے یہ معنے ہوں گے کہ گذشتہ اور حال میں تو نہیں مگر آیندہ اگر کوئی نیک عمل کرے تو اُس کو یہ جزاء دی جائے گی۔ اس طور کے معنوں سے یہ ماننا پڑتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے آیت کے نزول کے وقت تک کسی کو حیٰوۃ طیبہ عنایت نہیں کی تھی فقط یہ آیندہ کے لئے وعدہ تھا لیکن جس قدر ان معنوں میں فساد ہے وہ کسی عقلمند پر مخفی نہیں۔ (الحق دہلی صفحہ ۲۴ طبع اوّل)

۱۰۴ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ؕ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ۝

یہ تو ان لوگوں کا حال تھا جو عیسائیوں اور یہودیوں میں اہل علم اور صاحب انصاف تھے کہ جب وہ ایک طرف آنحضرت کی حالت پر نظر ڈال کر دیکھتے تھے کہ محض اُمّی ہیں کہ تربیت اور تعلیم کا ایک نقطہ بھی نہیں سیکھا اور

نہ کسی مہذب قوم میں بود و باش رہی اور نہ مجالسِ علمیہ دیکھنے کا اتفاق ہوا اور دوسری طرف وہ قرآن شریف میں صرف پہلی کتابوں کے قصّے نہیں بلکہ صدہا باریک صداقتیں دیکھتے تھے جو پہلی کتابوں کی مکمل اور متمم تھیں تو آنحضرت کی حالتِ اُمّیت کو سوچنے سے اور پھر اُس تاریکی کے زمانہ میں ان کمالاتِ علمیہ کو دیکھنے سے اور نیز انوارِ ظاہری و باطنی کے مشاہدہ سے نبوت آنحضرتؐ کی اُن کو اظہر من الشمس معلوم ہوتی تھی اور ظاہر ہے کہ اگر اُن مسیحی فاضلوں کو آنحضرت کے اُمّی اور مؤید من اللہ ہونے پر یقین کامل نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ وہ ایک ایسے دین سے جس کی حمایت میں ایک بڑی سلطنت قیصرِ رُوم کی قائم تھی اور جو نہ صرف ایشیا میں بلکہ بعض حصّوں یورپ میں بھی پھیل چکا تھا اور بوجہ اپنی مشرکانہ تعلیم کے دنیا پرستوں کو عزیز اور پیارا معلوم ہوتا تھا صرف شک اور شُبہ کی حالت میں الگ ہو کر ایسے مذہب کو قبول کر لیتے جو بباعث تعلیم توحید کے تمام مشرکین کو بُرا معلوم ہوتا تھا اور اس کے قبول کرنے والے ہر وقت چاروں طرف سے معرضِ ہلاکت اور بلا میں تھے۔ پس جس چیز نے اُن کے دلوں کو اسلام کی طرف پھیرا وہ یہی بات تھی جو انہوں نے آنحضرتؐ کو محض اُمّی اور سراپا مؤید من اللہ پایا اور قرآن شریف کو بشری طاقتوں سے بالاتر دیکھا اور پہلی کتابوں میں اس آخری نبی کے آنے کے لئے خود بشارتیں پڑھتے تھے۔ سو خدا نے اُن کے سینوں کو ایمان لانے کے لئے کھول دیا اور ایسے ایماندار نکلے جو خدا کی راہ میں اپنے خونوں کو بہایا۔ اور جو لوگ عیسائیوں اور یہودیوں اور عربوں میں سے نہایت درجہ کے جاہل اور شریر اور بدباطن تھے اُن کے حالات پر بھی نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی بہ یقینِ کامل آنحضرتؐ کو اُمّی جانتے تھے اور اسی لئے جب وہ بائیبل کے بعض قصّے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بطورِ امتحانِ نبوّت پوچھ کر اُن کا ٹھیک ٹھیک جواب پاتے تھے تو یہ بات ان کو زبان پر لانے کی مجال نہ تھی کہ آنحضرت کچھ پڑھے لکھے ہیں۔ آپ ہی کتابوں کو دیکھ کر جواب بتلا دیتے ہیں بلکہ جیسے کوئی لاجواب رہ کر اور گھسیانا بن کر کچھ عذر پیش کرتا ہے ایسا ہی نہایت ندامت سے یہ کہتے تھے کہ شاید درپردہ کسی عیسائی یا یہودی عالم بائبل نے یہ قصّے بتلا دئے ہوں گے پس ظاہر ہے اگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اُمّی ہونا اُن کے دلوں میں بہ یقینِ کامل متمکن نہ ہوتا تو اِسی بات کے ثابت کرنے کے لئے نہایت کوشش کرتے کہ آنحضرت اُمّی نہیں ہیں۔ فلاں مکتب یا مدرسہ میں انہوں نے تعلیم پائی ہے۔ واہیات باتیں کرنا جن سے ان کی حماقت ثابت ہوتی تھی کیا ضرور تھا کیونکہ یہ الزام لگانا کہ بعض عالم یہودی اور عیسائی درپردہ آنحضرت کے رفیق اور معاون ہیں بدیہی البطلان تھا اِس وجہ سے کہ قرآن تو جا بجا اہلِ کتاب کی وحی کو ناقص اور ان کی کتابوں کو محرّف اور مبدّل اور ان کے عقائد کو فاسد اور باطل اور خود ان کو بشرطیکہ بے ایمان مریں ملعون اور جہنّمی بتلاتا ہے اور اُن کے اصولِ مصنوعہ کو دلائلِ قویّہ سے توڑتا ہے تو پھر کس طرح ممکن تھا کہ وہ لوگ قرآن شریف سے اپنے مذہب کی آپ ہی مذمت کرواتے اور اپنی کتابوں کا آپ ہی ردّ لکھاتے اور اپنے مذہب کی بیخکنی کے آپ ہی موجب بن جاتے۔ پس یہ سست اور نادرست باتیں اِس لئے دُنیا پرستوں کو بکنی پڑیں

کہ اُن کو عاقلانہ طور پر قدم مارنے کا کسی طرف راستہ نظر نہیں آتا تھا اور آفتاب صداقت کا ایسی پُر زور روشنی سے اپنی کرنیں چاروں طرف چھوڑ رہا تھا کہ وہ اُس سے چمگادر کی طرح چھپتے پھرتے تھے اور کسی ایک بات پر ان کو ہرگز ثبات و قیام نہ تھا بلکہ تعصب اور شدت عناد نے اُن کو سودائیوں اور پاگلوں کی طرح بنا رکھا تھا۔ پہلے تو قرآن کے قصّوں کو سن کر جن میں بنی اسرائیل کے پیغمبروں کا ذکر تھا اس وہم میں پڑے کہ شاید ایک شخص اہل کتاب میں سے پوشیدہ طور پر یہ قصّے سکھاتا ہوگا جیسا ان کا یہ مقولہ قرآن شریف میں درج ہے اِنَّمَا یُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ (سورۃ النحل الجزو نمبر ۱۴) اور پھر جب دیکھا کہ قرآن شریف میں صرف قصّے ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے حقائق ہیں تو پھر یہ دوسری رائے ظاہر کی وَ اَعَانَهٗ عَلَیْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ (سورۃ الفرقان[1] الجزو ۱۸) یعنی ایک بڑی جماعت نے متفق ہو کر قرآن شریف کو تالیف کیا ہے ایک آدمی کا کام نہیں۔ پھر جب قرآن شریف میں اُن کو یہ جواب دیا گیا کہ اگر قرآن کو کسی جماعتِ علما فضلا اور شعرا نے اکٹھے ہو کر بنایا ہے تو تم بھی کسی ایسی جماعت سے مدد لے کر قرآن کی نظیر بنا کر دکھلاؤ تا تمہارا سچا ہونا ثابت ہو تو پھر لاجواب ہو کر اس رائے کو بھی جانے دیا اور ایک تیسری رائے ظاہر کی اور وہ یہ کہ قرآن کو جنّات کی مدد سے بنایا ہے۔ یہ آدمی کا کام نہیں۔ پھر خدا نے اِس کا جواب بھی ایسا دیا کہ جس کے سامنے وہ چُون چرا کرنے سے عاجز ہو گئے۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صـ۴۸۶ تا صـ۴۹۱)

فصاحت بلاغت کے بارہ میں فرمایا هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ $\frac{19}{15}$ اور پھر اس کی نظیر مانگی اور کہا کہ اگر تم کچھ کر سکتے ہو اس کی نظیر دو۔ پس عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ کے لفظ سے فصاحت بلاغت کے سوا اَور کیا معنے ہو سکتے ہیں؟ خاص کر جب ایک شخص کہے کہ میں یہ تقریر ایسی زبان میں کرتا ہوں کہ تم اس کی نظیر پیش کرو تو بجز اس کے کیا سمجھا جائے گا کہ وہ کمال بلاغت کا مدعی ہے اور مبین کا لفظ بھی اسی کو چاہتا ہے۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۳ صـ۶)

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

---

[1] الفرقان آیت ۵

کافر عذاب میں ڈالے جائیں گے مگر ایسا شخص جس پر زبردستی کی جائے یعنی ایمانی شعار کے ادا کرنے سے کسی فوق الطاقت عذاب کی وجہ سے روکا جائے اور دل اس کا ایمان سے تسکین یافتہ ہے وہ عند اللہ معذور ہے مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ اگر کوئی ظالم کسی مسلمان کو سخت دردناک اور فوق الطاقت زخموں سے مجروح کرے اور وہ اس عذاب شدید میں کوئی ایسے کلمات کہہ دے کہ اس کافر کی نظر میں کفر کے کلمات ہوں مگر وہ خود کفر کے کلمات کی نیت نہ کرے بلکہ دل اس کا ایمان سے لبالب ہو اور صرف یہ نیت ہو کہ وہ اس ناقابل برداشت سختی کی وجہ سے اپنے دین کو چھپاتا ہے مگر نہ عمداً بلکہ اس وقت جبکہ فوق الطاقت عذاب پہنچنے سے بے حواس اور دیوانہ سا ہو جائے تو خدا اس کی توبہ کے وقت اس کے گناہ کو اس کی شرائط کی پابندی سے جو نیچے کی آیت میں مذکور ہیں معاف کر دے گا کیونکہ وہ غفور رحیم ہے اور وہ شرائط یہ ہیں۔ (دیکھئے آیت ۱۱۱ نیچے)

النحل ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

ایسے لوگ جو فوق الطاقت دکھ کی حالت میں اپنے اسلام کا اخفاء کریں ان کا اس شرط سے گناہ بخشا جائیگا کہ دکھ اٹھانے کے بعد پھر ہجرت کریں یعنی ایسی عادت سے یا ایسے ملک سے نکل جائیں جہاں دین پر زبردستی ہوتی ہے۔ پھر خدا کی راہ میں بہت ہی کوشش کریں اور تکلیفوں پر صبر کریں۔ ان سب باتوں کے بعد خدا اُن کا گناہ بخش دے گا کیونکہ وہ غفور رحیم ہے۔ (نور القرآن ص۲۳)

البقرہ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

دیکھو سود کا کس قدر سنگین گناہ ہے۔ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں سور کا کھانا تو بحالت اضطرار جائز رکھا ہے چنانچہ فرماتا ہے فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ[1] یعنی جو شخص باغی نہ ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اللہ غفور رحیم ہے مگر سود کے لئے نہیں فرمایا کہ بحالت اضطرار

---

[1] البقرہ آیت ۱۷۴

جائز ہے بلکہ اس کے لئے تو ارشاد ہے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ o فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ[1] اگر سود کے لین دین سے باز نہ آؤ گے تو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کا اعلان ہے۔ ہمارا تو یہ مذہب ہے کہ جو خدا تعالیٰ پر توکل کرتا ہے اسے حاجت ہی نہیں پڑتی مسلمان اگر ابتلاء میں ہیں تو یہ ان کی اپنی ہی بدعملیوں کا نتیجہ ہے۔ ہندو اگر یہ گناہ کرتے ہیں تو مالدار ہو جاتے ہیں مسلمان یہ گناہ کرتے ہیں تو تباہ ہو جاتے ہیں خَسِرَ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃَ کے مصداق پس کیا ضروری نہیں کہ مسلمان اس سے باز آئیں۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۵ مورخہ ۶ فروری ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُکُمُ الْکَذِبَ ھٰذَا حَلٰلٌ وَّ ھٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ اِنَّ الَّذِیْنَ یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ o

یاد رکھو کہ دین میں صرف قیاس کرنا سخت منع ہے۔ قیاس وہ جائز ہے جو قرآن و حدیث سے مستنبط ہو۔ ہمارا دین منقولی طور سے ہمارے پاس پہنچا ہے۔ پس اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ایسی حدیث ثابت ہو جائے تو خیر ورنہ کیا ضرورت ہے دو چار آنے کے لئے ایمان میں خلل ڈالنے کی۔ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُکُمُ الْکَذِبَ ھٰذَا حَلٰلٌ وَّ ھٰذَا حَرَامٌ۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۱۹-۲۰ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

اِنَّ اِبْرٰھِیْمَ کَانَ اُمَّۃً قَانِتًا لِّلّٰہِ حَنِیْفًا وَّ لَمْ یَکُ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ[2] o

وَ اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا انْسَلَخَ عَنْ اِرَادَاتِہٖ وَ تَجَرَّدَ عَنْ جَذَبَاتِہٖ وَ فَنَا فِی اللّٰہِ وَ فِیْ طُرُقِہٖ وَ

(ترجمہ از مرتب) بندہ جب اپنے ارادوں سے علیحدہ ہو جائے اور اپنے جذبات سے خالی ہو جائے اور اللہ تعالےٰ کی

[1] البقرہ آیت ۲۷۹-۲۸۰ [2] النحل آیت ۱۲۱

عِبَادَاتِهٖ وَعَرَفَ رَبَّهُ الَّذِیْ رَبَّاهُ بِعِنَایَاتِهٖ۔ حَمِدَهٗ فِیْ سَائِرِ اَوْقَاتِهٖ وَاَحَبَّهٗ بِجَمِیْعِ قَلْبِهٖ بَلْ بِجَمِیْعِ ذَرَّاتِهٖ فَعِنْدَ ذٰلِكَ هُوَ عَالَمٌ مِنَ الْعَالَمِیْنَ وَلِذٰلِكَ سُمِّیَ اِبْرَاهِیْمُ اُمَّةً فِیْ كِتَابِ اَعْلَمِ الْعَالِمِیْنَ۔ (اعجاز المسیح صفحہ ۱۳۴)

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ۝

آیت جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ کا یہ منشاء نہیں ہے کہ ہم اس قدر نرمی کریں کہ مداہنہ کر کے خلاف واقعہ بات کی تصدیق کر لیں۔ کیا ہم ایسے شخص کو جو خدائی کا دعویٰ کرے اور ہمارے رسول کو پیشگوئی کے طور پر کذّاب قرار دے اور حضرت موسیٰ کا نام ڈاکو رکھے راست باز کہہ سکتے ہیں۔ کیا ایسا کرنا مجادلہ حسنہ ہے؟ ہرگز نہیں بلکہ منافقانہ سیرت اور بے ایمانی کا ایک شعبہ ہے۔ (تریاق القلوب صفحہ ۷ حاشیہ طبع اوّل)

اس کے معنے یہی ہیں کہ نیک طور پر اور ایسے طور پر جو مفید ہو عیسائیوں سے مجادلہ کرنا چاہیئے اور حکیمانہ طریق اور ایسے ناصحانہ طور کا پابند ہونا چاہیئے کہ ان کو فائدہ بخشے۔ (میموریل (مشمولہ کتاب البریہ) صفحہ ۳)

خدا جانتا ہے کہ کبھی ہم نے جواب کے وقت نرمی اور آہستگی کو ہاتھ سے نہیں دیا اور ہمیشہ نرم اور ملائم الفاظ سے کام لیا ہے بجز اُس صورت کے کہ بعض اوقات مخالفوں کی طرف سے نہایت سخت اور فتنہ انگیز تحریریں پا کر کسی قدر سختی مصلحت آمیز اس غرض سے ہم نے اختیار کی کہ تا قوم اس طرح سے اپنا معاوضہ پاکر وحشیانہ جوش کو دبائے رکھے اور یہ سختی نہ کسی نفسانی جوش سے اور نہ کسی اشتعال سے بلکہ محض آیت وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ پر عمل کر کے ایک حکمت عملی کے طور پر استعمال میں لائی گئی اور وہ بھی اُس وقت کہ مخالفوں کی توہین اور تحقیر اور بدزبانی انتہا

ذات اس کے طریقوں اور اس کی عبادات میں فنا ہو جائے اور اپنے اس رب کو پہچان لے جس نے اپنی عنایات کے ساتھ اس کی پرورش کی اور وہ اس کی تمام اوقات حمد کرتا رہے اور اس سے پورے دل بلکہ اپنے تمام ذرات سے محبت کرے تو اس وقت وہ عالموں میں سے ایک عالم ہو جائے گا۔ اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نام اَعلم العالمین کی کتاب میں اُمّت رکھا گیا ہے۔

تک پہنچ گئی اور ہمارے سید و مولیٰ سرور کائنات فخر موجودات کی نسبت ایسے گندے اور پُر شر الفاظ اُن لوگوں نے استعمال کئے کہ قریب تھا کہ اُن سے نقض امن پیدا ہو تو اُس وقت ہم نے اس حکمت عملی کو برتا۔

(البلاغ (فریاد درد) صـ۱ طبع اوّل)

جب تو عیسائیوں سے مذہبی بحث کرے تو حکیمانہ طور پر معقولی دلائل کے ساتھ کر اور چاہئے کہ تیرا وعظ پسندیدہ پیرایہ میں ہو۔ (البلاغ (فریاد درد) صـ۲۳ طبع اوّل)

(اِس آیت سے) یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہمیشہ کے لئے جب تک اسلام پر حملے کرنے والے حملے کرتے رہیں اِس طرف سے بھی سلسلہ مدافعت جاری رہنا چاہیئے۔ (البلاغ (فریاد درد) صـ۱۴ طبع اوّل)

جب تو کسی عیسائی معلم کے ساتھ بحث کرے تو حکمت اور نیک نصیحتوں کے ساتھ بحث کر جو نرمی اور تہذیب سے ہو۔ ہاں یہ سچ ہے کہ بہتیرے اس زمانہ کے جاہل اور نادان مولوی اپنی حماقت سے یہی خیال رکھتے ہیں کہ جہاد اور تلوار سے دین کو پھیلانا نہایت ثواب کی بات ہے اور وہ درپردہ اور نفاق سے زندگی بسر کرتے ہیں لیکن وہ ایسے خیال میں سخت غلطی پر ہیں اور ان کی غلط فہمی سے الٰہی کتاب پر الزام نہیں آسکتا۔ واقعی سچائیاں اور حقیقی صداقتیں کسی جبر کی محتاج نہیں ہوتیں بلکہ جبر اس بات پر دلیل ٹھہرتا ہے کہ روحانی دلایل کمزور ہیں۔ کیا وہ خدا جس نے اپنے پاک رسول پر یہ وحی نازل کی کہ فَاصۡبِرۡ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الۡعَزۡمِ[1] یعنی تو ایسا صبر کر کہ جو تمام اولوالعزم رسولوں کے صبر کے برابر ہو یعنی اگر تمام نبیوں کا صبر اکٹھا کر دیا جائے تو وہ تیرے صبر سے زیادہ نہ ہو۔ اور پھر فرمایا کہ لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ[2] یعنی دین میں جبر نہیں چاہیئے۔ اور پھر فرمایا کہ اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ یعنی عیسائیوں کے ساتھ حکمت اور نیک وعظوں کے ساتھ مباحثہ کرنہ سختی سے۔ اور پھر فرمایا وَالۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَالۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ[3] یعنی مومن وہی ہیں جو غصہ کو کھا جاتے ہیں اور یاوہ گو اور ظالم طبع لوگوں کے حملوں کو معاف کر دیتے ہیں اور بیہودگی کا بیہودگی سے جواب نہیں دیتے۔ کیا ایسا خدا یہ تعلیم دے سکتا تھا کہ تم اپنے دین کے منکروں کو قتل کر دو اور اُن کے مال لُوٹ لو اور ان کے گھروں کو ویران کر دو بلکہ اسلام کی ابتدائی کاروائی جو حکم الٰہی کے موافق تھی صرف اتنی تھی کہ جنہوں نے ظالمانہ طور سے تلوار اٹھائی وہ تلوار ہی سے مارے گئے۔ اور جیسا کیا ویسا اپنا پاداش پالیا۔ یہ کہاں لکھا ہے کہ تلوار کے ساتھ منکروں کو قتل کرتے پھرو۔ یہ تو جاہل مولویوں اور نادان پادریوں کا خیال ہے جس کی کچھ بھی اصلیت نہیں۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۳ صـ۱۹۴ تا ۱۹۶ حاشیہ)

جسے نصیحت کرنی ہو اُسے زبان سے کرو۔ ایک ہی بات ہوتی ہے وہ ایک پیرایہ میں ادا کرنے سے ایک

---

[1] الاحقاف آیت ۳۶ ؛ [2] البقرہ آیت ۲۵۷ ؛ [3] آل عمران آیت ۱۳۵ ؛

شخص کو دشمن بنا سکتی ہے اور دوسرے پیرایہ میں دوست بنا دیتی ہے پس جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ کے موافق اپنا عمل درآمد رکھو۔ اسی طرز کلام ہی کا نام خدا نے حکمت رکھا ہے چنانچہ فرماتا ہے یُؤْتِی الْحِکْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ[1]۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ[2] یہ تعلیم اس لئے تھی کہ اگر دشمن بھی ہو تو وہ اس نرمی اور حسن سلوک سے دوست بن جاوے اور ان باتوں کو آرام اور سکون کے ساتھ سُن لے۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

(۱۲۷) وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ ۝

اگر تم ان کا تعاقب کرو تو اُسی قدر کرو جو انہوں نے کیا ہو وَ لَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ اور اگر صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے لئے اچھا ہے۔ (جنگِ مقدس صفحہ ۱۵۱ پرچہ ۲ جون ۱۸۹۳ء طبع اوّل)

(۱۲۹) اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝

انسان جب فرطِ تعصب سے اندھا ہو جاتا ہے تو صادق کی ہر ایک بات اُس کو کذب ہی معلوم ہوتی ہے لیکن خدائے تعالیٰ صادق کا انجام بخیر کرتا ہے اور کاذِب کے نقشِ ہستی کو مٹا دیتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۳۰۷ طبع اوّل)

خدا ان کے ساتھ ہے جو اس سے ڈرتے ہیں اور وہ جو نیکی کرنا ان کا اصول ہے۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۶ صفحہ ۷۵)

خدا تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ہے جو نیکی کرنے والے ہیں۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۸ صفحہ ۱۰۳)

تقویٰ کے بہت سے اجزاء ہیں۔ عُجب۔ خود پسندی۔ مال حرام سے پرہیز اور بداخلاقی سے بچنا بھی تقویٰ ہے جو شخص اچھے اخلاق ظاہر کرتا ہے اس کے دشمن بھی دوست ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ[2]۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۸۳)

---

[1] البقرۃ آیت ۲۷۰ ۔ [2] حٰمٓ السجدۃ آیت ۳۵ ۔

اللہ تعالیٰ لاف گزاف اور لفظوں کو نہیں چاہتا وہ تو حقیقی تقویٰ کو چاہتا اور سچی طہارت کو پسند کرتا ہے جیسا کہ فرمایا ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّ الَّذِیۡنَ ہُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ ۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۶۹ طبع اوّل)

متقی کے معنی ہیں ڈرنے والا۔ ایک ترکِ شر ہوتا ہے اور ایک اِفاضۂ خیر۔ متقی ترکِ شر کا مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے اور مُحسن افاضۂ خیر کو چاہتا ہے .... متقی کا کام یہ ہے کہ بُرائیوں سے باز آوے۔ اس سے آگے دوسرا درجہ افاضۂ خیر کا ہے جس کو یہاں مُحۡسِنُوۡنَ کے لفظ سے ادا کیا گیا ہے کہ نیکیاں بھی کرے۔ پورا راست باز انسان تب ہوتا ہے جب بدیوں سے پرہیز کرکے یہ مطالعہ کرے کہ نیکی کونسی کی ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۸ مورخہ ۳۱؍جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا خدا ان کے ساتھ ہوتا ہے جو متقی ہوتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ قرآن شریف میں تقویٰ کا لفظ بہت مرتبہ آیا ہے۔ اس کے معنے پہلے لفظ سے کئے جاتے ہیں۔ یہاں مَعَ کا لفظ آیا ہے یعنی جو خدا کو مقدم سمجھتا ہے خدا اس کو مقدم رکھتا ہے اور دُنیا میں ہر قسم کی ذلتوں سے بچا لیتا ہے۔ میرا ایمان یہی ہے کہ اگر انسان دُنیا میں ہر قسم کی ذلّت اور سختی سے بچنا چاہے تو اس کے لئے ایک ہی راہ ہے کہ متقی بن جائے پھر اس کو کسی چیز کی کمی نہیں۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۳ مورخہ ۲۴؍جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

یاد رکھو کہ حقائق اور معارف کے دروازوں کے کھلنے کے لئے ضرورت ہے تقویٰ کی۔ اس لئے تقویٰ اختیار کرو کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّ الَّذِیۡنَ ہُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ ۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۷؍جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

خدا اُن کے ساتھ ہوتا ہے یعنی اُن کی نصرت کرتا ہے جو متقی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی معیت کا ثبوت اس کی نصرت ہی سے ملتا ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴؍مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں اور جو تقویٰ سے بھی بڑھ کر کام کرتے ہیں یعنی محسنین ہوتے ہیں۔

تقویٰ کے معنے ہیں بدی کی باریک راہوں سے پرہیز کرنا مگر یاد رکھو نیکی اتنی نہیں ہے کہ ایک شخص کہے کہ میں نیک ہوں اس لئے کہ میں نے کسی کا مال نہیں لیا۔ نقب زنی نہیں کی چوری نہیں کرتا۔ بدنظری اور زنا نہیں کرتا۔ ایسی نیکی عارف کے نزدیک ہنسی کے قابل ہے کیونکہ اگر وہ ان بدیوں کا ارتکاب کرے اور چوری یا ڈاکہ زنی کرے تو وہ سزا پائیگا پس یہ کوئی نیکی نہیں کہ جو عارف کی نگاہ میں قابل قدر ہو بلکہ اصلی اور حقیقی نیکی یہ ہے کہ نوعِ انسان کی خدمت کرے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں کامل صدق اور وفاداری دکھلائے اور اس کی راہ میں جان تک دے دینے کو طیار ہو۔ اسی لئے یہاں فرمایا ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا وَّ الَّذِیۡنَ ہُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے جو بدی

سے پرہیز کرتے ہیں اور ساتھ ہی نیکیاں بھی کرتے ہیں۔ (الحکم جلد ۸ ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۴ء صـ۳)

تقویٰ وہی ہے جس کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا خدا تعالیٰ کی معیّت بتا دیتی ہے کہ یہ متقی ہے۔ (بدر جلد ۶ صـ۱۷ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۰۷ء صـ۸)

اللہ تعالیٰ ان کی حمایت اور نصرت میں ہوتا ہے جو تقویٰ اختیار کریں۔ تقویٰ کہتے ہیں بدی سے پرہیز کرنے کو۔ اور محسنون وہ ہوتے ہیں جو اتنا ہی نہیں کہ بدی سے پرہیز کریں بلکہ نیکی بھی کریں۔ اور پھر یہ بھی فرمایا لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی[1] یعنی ان نیکیوں کو بھی سنوار سنوار کرتے ہیں۔ مجھے یہ وحی بار بار ہوئی اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ اور اتنی مرتبہ ہوئی ہے کہ مَیں گن نہیں سکتا۔ خدا جانے دو ہزار مرتبہ ہوئی ہو اس سے غرض یہی ہے کہ تا جماعت کو معلوم ہو جاوے کہ صرف اس بات پر ہی فریفتہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہم اس جماعت میں شامل ہو گئے ہیں یا صرف خشک خیالی ایمان سے راضی ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ کی معیّت اور نصرت اسی وقت ملے گی جب سچی تقویٰ ہو اور پھر نیکی ساتھ ہو۔ (الحکم جلد ۱۰ ۲۲ مورخہ ۲۴ جون ۱۹۰۶ء صـ۲و۳)

تقویٰ، طہارت اور پاکیزگی اختیار کرنے والے خدا کی حمایت میں ہوتے ہیں اور وہ ہر وقت نافرمانی کرنے سے ترساں و لرزاں رہتے ہیں۔ (الحکم جلد ۱۲ ۳۲ مورخہ ۸ مئی ۱۹۰۸ء صـ۲)

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ خدا تعالیٰ بھی انسان کے اعمال کا روزنامچہ بناتا ہے پس انسان کو بھی اپنے حالات کا ایک روزنامچہ تیار کرنا چاہیئے اور اس میں غور کرنا چاہیئے کہ نیکی میں کہاں تک آگے قدم رکھا ہے۔ انسان کا آج اور کل برابر نہیں ہونے چاہئیں جس کا آج اور کل اس لحاظ سے کہ نیکی میں کیا ترقی کی ہے برابر ہو گیا وہ گھاٹے میں ہے۔ انسان اگر خدا کو ماننے والا اور اسی پر کامل ایمان رکھنے والا ہو تو کبھی ضائع نہیں کیا جاتا بلکہ اس ایک کی خاطر لاکھوں جانیں بچائی جاتی ہیں۔

ایک شخص جو اولیاء اللہ میں سے تھے ان کا ذکر ہے کہ وہ جہاز میں سوار تھے سمندر میں طوفان آگیا قریب تھا کہ جہاز غرق ہو جاتا اس کی دعا سے بچا لیا گیا اور دعا کے وقت اس کو الہام ہوا کہ تیری خاطر ہم نے سب کو بچا لیا مگر یہ باتیں نرا زبانی جمع خرچ کرنے سے حاصل نہیں ہوتیں۔ دیکھو ہمیں بھی اللہ تعالیٰ نے ایک وعدہ دیا ہے اِنِّیْ اُحَافِظُ کُلَّ مَنْ فِی الدَّارِ مگر دیکھو ان میں غافل عورتیں بھی ہیں مختلف طبائع اور حالات کے انسان ہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ ۱۶ مورخہ ۲ مارچ ۱۹۰۸ء صـ۵-۶)

میں پھر جماعت کو تاکید کرتا ہوں کہ تم لوگ ان کی مخالفتوں سے غرض نہ رکھو تقویٰ طہارت میں ترقی کرو تو اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہوگا اور ان لوگوں سے وہ خود سمجھ لیوے گا۔ وہ فرماتا ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا

---

[1] یونس آیت ۲۷۔

وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۶ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۱)

تقویٰ کیا ہے؟ ہر قسم کی بدی سے اپنے آپ کو بچانا پس خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ابرار کے لئے پہلا انعام شربت کافوری ہے۔ اس شربت کے پینے سے دل بُرے کاموں سے ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اس کے بعد ان کے دلوں میں برائیوں اور بدیوں کے لئے تحریک اور جوش پیدا نہیں ہوتا۔ ایک شخص کے دل میں یہ خیال تو آ جاتا ہے کہ یہ کام اچھا نہیں یہاں تک کہ چور کے دل میں بھی یہ خیال آ ہی جاتا ہے مگر جذبہ دل سے وہ چوری بھی کر ہی لیتا ہے لیکن جن لوگوں کو شربت کافوری پلا دیا جاتا ہے ان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ ان کے دل میں بدی کی تحریک ہی پیدا نہیں ہوتی بلکہ دل بُرے کاموں سے بیزار اور متنفر ہو جاتا ہے۔ گناہ کی تمام تحریکوں کے مواد دبا دیئے جاتے ہیں۔ یہ بات خدا کے فضل کے سوا میسر نہیں آتی۔ جب انسان دعا اور عقدِ ہمت سے خدا تعالیٰ کے فضل کو تلاش کرتا ہے اور اپنے نفس کو جذبات پر غالب آنے کی سعی کرتا ہے تو پھر یہ سب باتیں فضل الٰہی کو کھینچ لیتی ہیں اور اسے کافوری جام پلایا جاتا ہے۔ ... اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ[1] یعنی بیشک اللہ تعالیٰ متقیوں ہی کی عبادات کو قبول فرماتا ہے۔ یہ بالکل سچی بات ہے کہ نماز روزہ بھی متقیوں ہی کا قبول ہوتا ہے ... پس پہلی منزل اور مشکل اس انسان کے لئے جو مومن بننا چاہتا ہے یہی ہے کہ بُرے کاموں سے پرہیز کرے۔ اسی کا نام تقویٰ ہے۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۲)

---

[1] المائدۃ آیت ۲۸

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ——— نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

تفسیر سورۃ بنی اسرائیل

بیان فرمودہ

سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ۝ (۲)

پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندہ کو رات کے وقت میں سیر کرایا یعنی ضلالت اور گمراہی کے زمانہ میں جو رات سے مشابہ ہے مقاماتِ معرفت اور یقین تک لدنی طور سے پہنچایا۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم ص۵۰۲ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندہ کو ایک ہی رات میں تمام سیر کرا دیا۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۸۵)

سیر معراج اس جسم کثیف کے ساتھ نہیں تھا بلکہ وہ نہایت اعلیٰ درجہ کا کشف تھا جس کو درحقیقت بیداری کہنا چاہیئے۔ ایسے کشف کی حالت میں انسان ایک نوری جسم کے ساتھ حسب استعداد نفس ناطقہ اپنے کے آسمانوں کی سیر

کرسکتا ہے پس چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نفس ناطقہ کی اعلیٰ درجہ کی استعداد تھی اور انتہائی نقطہ تک پہنچی ہوئی تھی اس لئے وہ اپنی معراجی سیر میں معمورہ عالم کے انتہائی نقطہ تک جو عرش عظیم سے تعبیر کیا جاتا ہے پہنچ گئے۔ سو درحقیقت یہ سیر کشفی تھا جو بیداری سے اشد درجہ پر مشابہ ہے بلکہ ایک قسم کی بیداری ہی ہے میں اس کا نام خواب ہرگز نہیں رکھتا اور نہ کشف کے ادنیٰ درجوں میں سے اس کو سمجھتا ہوں بلکہ یہ کشف کا بزرگ ترین مقام ہے جو درحقیقت بیداری بلکہ اس کثیف بیداری سے یہ حالت زیادہ اصفیٰ اور اجلیٰ ہوتی ہے اور اس قسم کے کشفوں میں مؤلف خود صاحب تجربہ ہے۔

(ازالہ اوہام حصہ اوّل ص۴۷-۴۸ حاشیہ)

وَاَمَّا مِعْرَاجُ رَسُوْلِنَا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَکَانَ اَمْرًا اِعْجَازِیًّا مِنْ عَالَمِ الْیَقْظَۃِ الرُّوْحَانِیَّۃِ اللَّطِیْفَۃِ الْکَامِلَۃِ فَقَدْ عُرِجَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِجِسْمِہٖ اِلَی السَّمَآءِ وَھُوَ یَقْظَانُ لَا شَکَّ فِیْہِ وَلَا رَیْبَ وَلٰکِنْ مَّعَ ذٰلِکَ مَا فَقَدَ جِسْمُہٗ مِنَ السَّرِیْرِ کَمَا شَھِدَ عَلَیْہِ بَعْضُ اَزْوَاجِہٖ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُنَّ وَکَذٰلِکَ کَثِیْرٌ مِّنَ الصَّحَابَۃِ فَاَنْتَ تَعْلَمُ وَتَفْھَمُ اَنَّ قِصَّۃَ الْمِعْرَاجِ شَیْءٌ اٰخَرُ لَا یُضَاھِیْہِ قِصَّۃُ صُعُوْدِ عِیْسٰی عَلَیْہِ السَّلَامُ اِلَی السَّمَآءِ وَاِنْ کُنْتَ تَشُکُّ فِیْہِ فَارْجِعْ اِلَی الْبُخَارِیِّ وَمَا اَظُنُّ اَنْ تَبْقٰی بَعْدَہٗ مِنَ الْمُرْتَابِیْنَ۔ (حمامۃ البشریٰ ص۳۴)

قرآن شریف کی یہ آیت ... معراج مکانی اور زمانی دونوں پر مشتمل ہے اور بغیر اس کے معراج ناقص رہتا ہے۔ پس جیسا کہ سیر مکانی کے لحاظ سے خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مسجد الحرام سے بیت المقدس تک پہنچا دیا تھا ایسا ہی سیر زمانی کے لحاظ سے آنجناب کو شوکتِ اسلام کے زمانہ سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تھا برکات اسلامی کے زمانہ تک جو مسیح موعود کا زمانہ ہے پہنچا دیا پس اس پہلو کے رُو سے جو اسلام کے انتہا زمانہ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سیر کشفی ہے مسجد اقصیٰ سے مراد مسیح موعود کی مسجد ہے جو قادیان میں واقع ہے جس کی نسبت براہین احمدیہ

(ترجمہ از مرتب) ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج لطیف اور کامل روحانی بیداری کے عالم کا ایک اعجازی واقعہ ہے۔ آپ جسم سمیت آسمان کی طرف اٹھائے گئے درانحالیکہ آپ بیدار تھے اس میں کوئی شک وشبہ نہیں لیکن بایں ہمہ حضور کا جسم مبارک چارپائی پر موجود رہا جیسا کہ آپ کی بعض ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن اور ایسا ہی بہت سے صحابہ نے شہادت دی ہے پس تو خوب جانتا اور سمجھتا ہے کہ معراج کا واقعہ اور چیز ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمانوں پر چڑھنے کے واقعہ کی اس سے کوئی مشابہت نہیں۔ اور اگر تمہیں اس بارے میں کوئی شک ہو تو صحیح بخاری کی طرف رجوع کرو اور میں خیال کرتا ہوں کہ اس کے بعد تم شک کرنے والوں میں نہیں رہو گے۔

ہیں خدا کا کلام یہ ہے مُبَارَكٌ وَّمُبَارِكٌ وَّكُلُّ اَمْرٍ مُّبَارَكٍ يُّجْعَلُ فِيْهِ اور یہ مبارک کا لفظ جو بصیغہ مفعول اور فاعل واقع ہوا قرآن شریف کی آیت بَارَكْنَا حَوْلَهٗ کے مطابق ہے۔ پس کچھ شک نہیں جو قرآن شریف میں قادیان کا ذکر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِيْ بٰرَكْنَا حَوْلَهٗ اس آیت کے ایک تو وہی معنے ہیں جو علماء میں مشہور ہیں یعنی یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مکانی معراج کا یہ بیان ہے مگر کچھ شک نہیں کہ اس کے سوا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک زمانی معراج بھی تھا جس سے یہ غرض تھی کہ تا آپ کی نظر کشفی کا کمال ظاہر ہو اور نیز ثابت ہو کہ مسیحی زمانہ کے برکات بھی درحقیقت آپ ہی کے برکات ہیں جو آپ کی توجہ اور ہمت سے پیدا ہوئی ہیں اسی وجہ سے مسیح ایک طور سے آپ ہی کا رُوپ ہے اور وہ معراج یعنی بلوغ نظر کشفی دنیا کی انتہا تک تھا جو مسیح کے زمانہ سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس معراج میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر فرما ہوئے وہ مسجد اقصیٰ یہی ہے جو قادیان میں بجانب مشرق واقع ہے جس کا نام خدا کے کلام نے مبارک رکھا ہے۔ یہ مسجد جسمانی طور پر مسیح موعود کے حکم سے بنائی گئی ہے اور روحانی طور پر مسیح موعود کے برکات اور کمالات کی تصویر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بطور موہبت ہیں اور جیسا کہ مسجد الحرام کی روحانیت حضرت آدم اور حضرت ابراہیم کے کمالات ہیں اور بیت المقدس کی روحانیت انبیاء بنی اسرائیل کے کمالات ہیں ایسا ہی مسیح موعود کی یہ مسجد اقصیٰ جس کا قرآن شریف میں ذکر ہے اس کے روحانی کمالات کی تصویر ہے۔

پس اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج میں زمانہ گذشتہ کی طرف صعود ہے اور زمانہ آیندہ کی طرف نزول ہے اور ماحصل اس معراج کا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خیر الاوّلین والآخرین ہیں معراج جو مسجد الحرام سے شروع ہوا اِس میں یہ اشارہ ہے کہ صفی اللہ آدم کے تمام کمالات اور ابراہیم خلیل اللہ کے تمام کمالات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود تھے اور پھر اس جگہ سے قدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکانی سیر کے طور پر بیت المقدس کی طرف گیا اور اس میں یہ اشارہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں تمام اسرائیلی نبیوں کے کمالات بھی موجود ہیں اور پھر اس جگہ سے قدم آنجناب علیہ السلام زمانی سیر کے طور پر اس مسجد اقصیٰ تک گیا جو مسیح موعود کی مسجد ہے یعنی کشفی نظر اس آخری زمانہ تک جو مسیح موعود کا زمانہ کہلاتا ہے پہنچ گئی۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ جو کچھ مسیح موعود کو دیا گیا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں موجود ہے۔ اور پھر قدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آسمانی سیر کے طور پر اوپر کی طرف گیا اور مرتبہ قاب قوسین کا پایا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مظہر صفات الٰہیہ اتم اور اکمل طور پر تھے۔ غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس قسم کا معراج یعنی مسجد الحرام سے مسجد اقصیٰ تک جو زمانی مکانی دونوں رنگ کی سیر تھی اور نیز خدا تعالیٰ کی طرف ایک سیر تھا جو مکان اور زمان دونوں سے پاک تھا۔ اس جدید طرز کی معراج سے غرض یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

خیر الاوّلین والآخرین ہیں اور نیز خدا تعالیٰ کی طرف سیر ان کا اس نقطہ ارتفاع پر ہے کہ اس سے بڑھ کر کسی انسان کو گنجائش نہیں۔ مگر اس حاشیہ میں ہماری صرف یہ غرض ہے کہ جیسا کہ آج سے بیس برس پہلے براہین احمدیہ میں کشفی طور پر لکھا گیا تھا کہ قرآن شریف میں قادیان کا ذکر ہے۔ یہ کشف نہایت صحیح اور درست تھا کیونکہ زمانی رنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج اور مسجد اقصیٰ کی طرف سیر مسجد الحرام سے شروع ہو کر یہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا جب تک ایسی مسجد تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سیر تسلیم نہ کیا جائے جو باعتبار بُعد زمانہ کے مسجد اقصیٰ ہو اور ظاہر ہے کہ مسیح موعود کا وہ زمانہ ہے جو اسلامی سمندر کا بمقابلہ زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرا کنارہ ہے ابتدا سیر کا جو مسجد الحرام سے بیان کیا گیا اور انتہا سیر کا جو اس بہت دور مسجد تک مقرر کیا گیا جس کے ارد گرد کو برکت دی گئی یہ برکت دینا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں شوکت اسلام ظاہر کی گئی اور حرام کیا گیا کہ کفار کا دست تعدی اسلام کو مٹا دے جیسا کہ آیت وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا[1] سے ظاہر ہے لیکن زمانہ مسیح موعود میں جس کا دوسرا نام مہدی بھی ہے تمام قوموں پر اسلام کی برکتیں ثابت کی جائیں گی اور دکھلایا جائے گا کہ ایک اسلام ہی بابرکت مذہب ہے جیسا کہ بیان کیا گیا کہ وہ ایسا برکات کا زمانہ ہوگا کہ دُنیا میں صلحکاری کی برکت پھیلے گی اور آسمان اپنے نشانوں کے ساتھ برکتیں دکھلائے گا اور زمین میں طرح طرح کے پھلوں کے دستیاب ہونے اور طرح طرح کے آراموں سے اس قدر برکتیں پھیل جائیں گی جو اس سے پہلے کبھی نہیں پھیلی ہوں گی۔ اسی وجہ سے مسیح موعود اور مہدی معہود کے زمانہ کا نام احادیث میں زمان البرکات ہے جیسا کہ تم دیکھتے ہو کہ ہزارہا نئی ایجادوں نے کیسی زمین پر برکتیں اور آرام پھیلا دئے ہیں کیونکہ ریل کے ذریعہ سے مشرق اور مغرب کے میوے ایک جگہ اکٹھے ہو سکتے ہیں اور تار کے ذریعہ سے ہزاروں کوسوں کی خبریں پہنچ جاتی ہیں۔ سفر کی وہ تمام مصیبتیں یک دفعہ دور ہوگئیں جو پہلے زمانوں میں تھیں۔

غرض اس زمانہ کا نام جس میں ہم ہیں زمان البرکات ہے لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ زمان التائیدات اور دفع الآفات تھا اور اس زمانہ میں خدا تعالیٰ کا بھاری مقصد دفع شر تھا چنانچہ خدا تعالیٰ نے اُس زمانہ میں اسلام کو اپنے قوی ہاتھ سے دشمنوں سے بچایا اور دشمنوں کو یوں ہانک دیا جیسا کہ ایک مرد مضبوط اپنی لاٹھی سے کتوں کو ہانک دیتا ہے پس چونکہ مسیح اور مہدی موعود کا زمانہ زمان البرکات تھا اسی لئے خدا تعالیٰ نے اس کے حق میں فرمایا بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ یعنی مسیح موعود کی فرودگاہ کے ارد گرد جہاں نظر ڈالو گے ہر طرف سے برکتیں نظر آئیں گی چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ زمین کیسی آباد ہو گئی۔ باغ کیسے بکثرت ہو گئے۔ نہریں کیسی بکثرت جاری ہو گئیں۔ تمدنی آرام کی چیزیں کیسی کثرت سے موجود ہو گئیں پس یہ زمینی برکات ہیں اور جیسے اس زمانہ میں زمینی اور آسمانی برکتیں بکثرت ظاہر ہو گئی ہیں ایسا

---

[1] آل عمران آیت ۹۸ ۔

ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تائیدات کا بھی ایک دریا چل رہا تھا۔

فَحَاصِلُ الْبَیَانِ اَنَّ الزَّمَانَ زَمَانَانِ۔ زَمَانُ التَّائِیْدَاتِ وَدَفْعُ الْاٰفَاتِ وَ زَمَانُ الْبَرَکَاتِ وَالطَّیِّبَاتِ۔ وَاِلَیْهِ اَشَارَ عَزَّ اسْمُهٗ بِقَوْلِهٖ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ۔ فَاعْلَمْ اَنَّ لَفْظَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ فِیْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی یَدُلُّ عَلٰی زَمَانٍ فِیْهِ ظَهَرَتْ عِزَّةُ حُرُمَاتِ اللّٰهِ بِتَائِیْدٍ مِّنَ اللّٰهِ وَظَهَرَتْ عِزَّةُ حُدُوْدِهٖ وَاَحْکَامِهٖ وَفَرَائِضِهٖ وَتَرَاءَتْ شَوْکَةُ دِیْنِهٖ وَرُعْبُ مِلَّتِهٖ۔ وَهُوَ زَمَانُ نَبِیِّنَا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَ الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ الْبَیْتُ الَّذِیْ بَنَاهُ اِبْرَاهِیْمُ عَلَیْهِ السَّلَامُ فِیْ مَکَّةَ وَهُوَ مَوْجُوْدٌ اِلٰی هٰذَا الْوَقْتِ حَرَسَهُ اللّٰهُ مِنْ کُلِّ اٰفَةٍ۔ وَ اَمَّا قَوْلُهٗ عَزَّ اسْمُهٗ بَعْدَ هٰذَا الْقَوْلِ اَعْنِی الْمَسْجِدَ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ فَیَدُلُّ عَلٰی زَمَانٍ فِیْهِ یَظْهَرُ بَرَکَاتٌ فِی الْاَرْضِ مِنْ کُلِّ جِهَةٍ کَمَا ذَکَرْنَاهُ اٰنِفًا وَّ هُوَ زَمَانُ الْمَسِیْحِ الْمَوْعُوْدِ وَ الْمَهْدِیِّ الْمَعْهُوْدِ وَ الْمَسْجِدُ الْاَقْصٰی هُوَ الْمَسْجِدُ الَّذِیْ بَنَاهُ الْمَسِیْحُ الْمَوْعُوْدُ فِی الْقَادِیَانِ سُمِّیَ اَقْصٰی لِبُعْدِهٖ مِنْ زَمَانِ النُّبُوَّةِ وَلِمَا وَقَعَ فِیْ اَقْصٰی طَرَفٍ مِّنْ زَمَنِ ابْتِدَاءِ الْاِسْلَامِ فَتَدَبَّرْ هٰذَا الْمُقَامَ فَاِنَّهٗ اُوْدِعَ اَسْرَارًا مِنَ اللّٰهِ الْعَلَّامِ۔

(ترجمہ از مرتب) خلاصہ بیان یہ ہے کہ زمانہ کے دو حصے ہیں (۱) تائیدات اور آفات کے دور کرنے کا زمانہ (۲) برکات اور پاکیزہ تعلیمات کے پھیلانے کا زمانہ۔ اس کی طرف خداوند تعالیٰ نے اپنے قول سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ میں اشارہ فرمایا ہے۔ سو جاننا چاہیئے کہ اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا لفظ اِس آیت میں اس زمانہ پر دلالت کرتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی محرمات کی عزت و احترام اللہ کی تائید سے ظاہر ہوئی اور اس کے مقرر کردہ حدود۔ احکام اور فرائض کا جلال ظاہر ہوا اور اس کے دین کی شوکت اور اس کی ملّت کا رُعب صاف نظر آ گیا اور یہ زمانہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ ہے۔ اور اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وہ گھر ہے جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ شریف میں تعمیر کیا اور وہ اِس وقت تک موجود ہے اللہ تعالیٰ اسے ہر آفت سے محفوظ رکھے۔ آیت میں اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کے بعد کا حصہ یعنی اَلْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ اس زمانہ پر دلالت کرتا ہے جس میں زمین پر ہر جہت سے برکات کا ظہور ہوگا جیسا کہ ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں اور یہ مسیح موعود اور مہدی معہود کا زمانہ ہے۔ اور مسجد اقصیٰ وہ مسجد ہے جس کو مسیح موعود نے قادیان میں بنایا۔ اسے اقصیٰ (یعنی دُور والی) مسجد اِس لئے قرار دیا گیا کہ وہ زمانہ نبوت سے دور ہے اور ابتدائے اسلام کے زمانہ سے ایک طرف واقع ہے پس تو اس مقام پر غور کر کیونکہ اس میں خدائے علّام الغیوب کی طرف سے بہت سے راز ودیعت کئے گئے ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معراج تین قسم پر منقسم ہے۔ سیر مکانی[1] اور سیر زمانی[2] اور سیر لا مکانی[3] و لا زمانی۔ سیر مکانی میں اشارہ ہے طرف غلبہ اور فتوحات کے یعنی یہ اشارہ کہ اسلامی ملک مکہ سے بیت المقدس تک پھیلے گا اور سیر زمانی میں اشارہ ہے طرف تعلیمات اور تاثیرات کے یعنی یہ کہ مسیح موعود کا زمانہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاثیرات سے تربیت یافتہ ہوگا جیسا کہ قرآن میں فرمایا ہے وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ[له] اور سیر لا مکانی و لا زمانی میں اشارہ ہے طرف اعلیٰ درجہ کے قرب اللہ اور دنانات کی جس پر دائرہ امکانِ قرب کا ختم ہے۔

(ضمیمہ خطبہ الہامیہ صفحہ د اور اس کا عنوان ہے "اشتہار چندہ منارۃ المسیح")

وَاِنَّ فِیْ لَفْظِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَلَفْظِ الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی الَّذِیْ جُعِلَ مِنْ وَصْفِہٖ جُمْلَۃُ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ اِشَارَۃً لَطِیْفَۃً لِّلْمُتَفَکِّرِیْنَ وَھُوَ اَنَّ لَفْظَ الْحَرَامِ یَدُلُّ عَلٰی اَنَّ الْکَافِرِیْنَ قَدْ حُرِّمَ عَلَیْھِمْ فِیْ زَمَنِ النَّبِیِّ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَنْ یَّضُرُّوا الدِّیْنَ بِالْمَکَائِدِ اَوْ یَاْتُوْہُ کَالصَّائِدِ وَعَصَمَ اللّٰہُ نَبِیَّہٗ وَدِیْنَہٗ وَبَیْتَہٗ مِنْ صَوْلِ الصَّائِلِیْنَ وَجَوْرِ الْجَائِرِیْنَ۔ وَمَا اسْتَاْصَلَ اللّٰہُ فِیْ ذٰلِکَ الزَّمَنِ اَعْدَاءَ الدِّیْنِ حَتَّی الْاِسْتِیْصَالِ۔ وَلٰکِنْ حَفِظَ الدِّیْنَ مِنْ صَوْلِھِمْ وَحَرَّمَ عَلَیْھِمْ اَنْ یَّغْلِبُوْا عِنْدَ الْقِتَالِ فَبُدِئَ اَمْرُ تَاْئِیْدِ الدِّیْنِ مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ اَعْنِیْ مِنْ ذَبِّ اللِّئَامِ۔ ثُمَّ یَتِمُّ ھٰذَا الْاَمْرُ عَلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ یَبْلُغُ فِیْہِ نُوْرُ الدِّیْنِ اِلٰی اَقْصَی الْمَقَامِ کَالْبَدْرِ التَّامِّ۔ وَیَلْزَمُہٗ کُلُّ بَرَکَۃٍ یُّتَوَقَّعُ وَیُتَصَوَّرُ عِنْدَ کَمَالٍ لَیْسَ فَوْقَہٗ کَمَالٌ وَھٰذَا وَعْدٌ مِّنَ اللّٰہِ الْعَلَّامِ۔ فَکَانَ الْمَسْجِدُ الْحَرَامُ یُبَشِّرُ بِدَفْعِ الشَّرِّ وَالْحِفْظِ مِنَ الْمَکْرُوْھَاتِ۔ وَاَمَّا الْمَسْجِدُ الْاَقْصٰی فَیُبَشِّرُ

(ترجمہ از کتاب) مسجد حرام کے لفظ میں اور مسجد اقصیٰ کے لفظ میں جس کے وصف میں بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ مذکور ہوا ہے لطیف اشارہ ہے اُن کے لئے جو فکر کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ لفظ حرام ظاہر کرتا ہے کہ کافروں پر یہ بات حرام کی گئی تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دین کو فریب اور حیلوں سے ضرر پہنچائیں یا شکاریوں کی طرح اس پر برس پڑیں اور خدا نے اپنے نبی کو اور اپنے دین اور اپنے گھر کو حملہ آوروں کے حملہ سے اور بیداد گروں کے بیداد سے بچائے رکھا اور اس زمانہ میں دین کے دشمنوں کو جیسا کہ چاہیئے تھا جڑ سے نہیں اکھاڑا لیکن دین کو اُن کے حملہ سے محفوظ رکھا اور حرام کر دیا کہ وہ لڑائی میں غالب رہیں پس دین کی تائید کا امر مسجد حرام سے یعنی لئیموں کے دفع کرنے سے شروع ہوا پھر یہ امر مسجد اقصیٰ پر تمام ہوگا۔ یہ وہ مسجد ہے جس میں دین کا نور اقصیٰ کے مقام تک پورے چاند کی طرح پہنچے گا اور ہر ایک برکت جو ایسے کمال کے وقت میں جس کے اوپر کوئی کمال نہ ہو تصور میں آوے اُس کے لازم حال ہوتی ہے اور یہ خدائے علیم کا وعدہ ہے پس مسجد حرام شر کے دور ہونے اور مکروہات سے محفوظ رہنے کا مژدہ دیتی ہے لیکن مسجد اقصیٰ کا مفہوم اس بات کی طرف اشارہ کرتا

له الجمعة آیت ۴ ۞

مَفْهُوْمُهٗ اِلٰی تَحْصِیْلِ الْخَیْرَاتِ وَ اَنْوَاعِ الْبَرَکَاتِ وَالْوُصُوْلِ اِلٰی اَعْلَی التَّرَقِّیَاتِ۔ فَبُدِیَٔ اَمْرُ دِیْنِنَا مِنْ دَفْعِ الضَّیْرِ وَیَتِمُّ عَلَی اسْتِکْمَالِ الْخَیْرِ وَاِنَّ فِیْهِ اٰیَاتٍ لِّلْمُتَدَبِّرِیْنَ۔ ثُمَّ اِنَّ اٰیَةَ الْاِسْرَآءِ تَدُلُّ عَلٰی نُکْتَةٍ وَّجَبَ ذِکْرُهَا لِلْاَصْدِقَآءِ لِیَزْدَادُوْا عِلْمًا وَّ یَقِیْنًا وَّاِنَّ خَیْرَ الْاَمْوَالِ الْعِلْمُ وَالْیَقِیْنُ۔ وَهُوَ اَنَّ الْاِسْرَآءَ مِنْ حَیْثُ الزَّمَانِ کَانَ وَاجِبًا کَوُجُوْبِ الْاِسْرَآءِ مِنْ حَیْثُ الْمَکَانِ لِیَتِمَّ سَیْرُ نَبِیِّنَا زَمَانًا وَّ مَکَانًا وَّ لِیَکْمُلَ اَمْرُ مِعْرَاجِ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ۔ وَلَا شَکَّ اَنَّ اَقْصَی الزَّمَانِ لِلْمِعْرَاجِ الزَّمَانِیِّ هُوَ زَمَانُ الْمَسِیْحِ الْمَوْعُوْدِ وَهُوَ زَمَانُ کَمَالِ الْبَرَکَاتِ وَیَقْبَلُهٗ کُلُّ مُؤْمِنٍ مِّنْ غَیْرِ الْجُحُوْدِ وَلَا شَکَّ اَنَّ مَسْجِدَ الْمَسِیْحِ الْمَوْعُوْدِ هُوَ اَقْصَی الْمَسَاجِدِ مِنْ حَیْثُ الزَّمَانِ مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ وَقَدْ مُلِیَٔ مِنْ کُلِّ جَنْبٍ بَرَکَةً وَّ نُوْرًا کَالْبَدْرِ التَّآمِّ لِیَکْمُلَ بِهٖ دَآئِرَةُ الدِّیْنِ۔ فَاِنَّ الْاِسْلَامَ بُدِیَٔ کَالْهِلَالِ مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ثُمَّ صَارَ قَمَرًا تَآمًّا عِنْدَ بُلُوْغِهٖ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصٰی وَلِذٰلِکَ ظَهَرَ الْمَسِیْحُ فِیْ عِدَّةِ الْبَدْرِ اِشَارَةً اِلٰی هٰذَا الْمَقَامِ۔ ثُمَّ هُنَا دَلِیْلٌ اٰخَرُ عَلٰی وُجُوْبِ الْاِسْرَآءِ الزَّمَانِیِّ مِنَ الْاَمْرِ الرَّبَّانِیِّ وَهُوَ اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَدْ اَشَارَ فِیْ قَوْلِهٖ وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ[1] اِلٰی اَنَّ جَمَاعَةَ الْمَسِیْحِ الْمَوْعُوْ

ہے کہ رنگ برنگ کے برکات اور خیرات اور ترقیات عالیہ حاصل ہوں۔ پس ہمارے دین کا امر دفع ضرر سے شروع ہوا اور خیر کی تکمیل پر تمام ہوگا اور اس بیان میں غور کرنے والوں کے لئے نشان ہیں۔ پھر اسریٰ کی آیت ایک عجیب نکتہ رکھتی ہے کہ اس کا ذکر دوستوں کے لئے ضروری ہے تا علم اور یقین زیادہ ہو اور خوب ظاہر ہے کہ سب سے بہتر مال و دولت علم اور یقین ہے اور وہ یہ کہ اسریٰ زمان اور مکان کی حیثیت سے دونوں طرح واجب اور لازم تھا اس جہت سے کہ ہمارے نبی کا سیر زمان اور مکان کے رُو سے تمام ہو اور معراج کا امر کامل ہو اور اس میں شک نہیں کہ نبی کریم کے زمانی معراج کے لئے انتہائی زمانہ مسیح موعود کا زمانہ ہے اور وہ برکات کے کمال کا زمانہ ہے اور اس کو ہر ایک مومن بغیر انکار کے قبول کر سکتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ مسیح موعود کی مسجد مسجد حرام کی نسبت سے زمانہ کی حیثیت سے اقصیٰ مساجد ہے اور یقیناً اس مسجد کا ہر ایک پہلو برکت اور نور سے پورے چاند کی طرح بھر گیا ہے تا کہ اس کے وسیلہ سے دین کا دائرہ کامل ہو جائے کیونکہ اسلام ہلال کی مانند مسجد حرام سے ظاہر ہوا پھر جب مسجد اقصیٰ تک پہنچا بدر کامل ہو گیا اسی لئے مسیح موعود بدر کے شمار میں ظاہر ہوا۔ پھر دوسری دلیل اسراء زمانی کے وجوب پر یہ ہے کہ حق تعالیٰ اٰخَرِیْنَ

---

[1] الجمعۃ آیت ۴

عِنْدَ اللّٰهِ مِنَ الصَّحَابَةِ مِنْ غَيْرِ فَرْقٍ فِي التَّسْمِيَةِ وَلَا يَتَحَقَّقُ هٰذِهِ الْمَرْتَبَةُ لَهُمْ مِنْ غَيْرِ اَنْ يَّكُوْنَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَهُمْ بِقُوَّتِهِ الْقُدْسِيَّةِ وَ الْاِفَاضَةِ الرُّوْحَانِيَّةِ كَمَا كَانَ فِي الصَّحَابَةِ اَعْنِيْ بِوَاسِطَةِ الْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ الَّذِيْ هُوَ مَظْهَرٌ لَّهٗ اَوْ كَالْحُلَّةِ فَقَدْ ثَبَتَ مِنْ هٰذَا النَّصِّ الصَّرِيْحِ مِنَ الصُّحُفِ الْمُطَهَّرَةِ اَنَّ مِعْرَاجَ نَبِيِّنَا كَمَا كَانَ مَكَانِيًّا كَذٰلِكَ كَانَ زَمَانِيًّا وَّلَا يُنْكِرُهٗ اِلَّا الَّذِيْ فَقَدَ بَصَرَهٗ وَصَارَ مِنَ الْعَمِيْنَ وَلَا شَكَّ وَلَا رَيْبَ اَنَّ الْمِعْرَاجَ الزَّمَانِيَّ كَانَ وَاجِبًا تَحْقِيْقًا لِمَفْهُوْمِ هٰذِهِ الْاٰيَةِ۔ وَلَوْ لَمْ يَكُنْ لَبَطَلَ مَفْهُوْمُهَا كَمَا لَا يَخْفٰى عَلٰى اَهْلِ الْفِكْرِ وَالدِّرَايَةِ فَثَبَتَ مِنْ هٰذَا اَنَّ الْمَسِيْحَ الْمَوْعُوْدَ مَظْهَرٌ لِّلْحَقِيْقَةِ الْمُحَمَّدِيَّةِ وَنَازِلٌ فِي الْحُلَلِ الْجَلَالِيَّةِ۔ فَلِذٰلِكَ عُدَّ ظُهُوْرُهٗ عِنْدَ اللّٰهِ ظُهُوْرَ نَبِيِّهِ الْمُصْطَفٰى وَعُدَّ زَمَانُهٗ مُنْتَهَى الْمِعْرَاجِ الزَّمَانِيِّ لِلرَّسُوْلِ الْمُجْتَبٰى۔ وَمُنْتَهٰى تَجَلِّيْ رُوْحَانِيَّةِ سَيِّدِنَا خَيْرِ الْوَرٰى۔ وَكَانَ هٰذَا وَعْدًا مُّؤَكَّدًا مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

(خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۹۴ تا ۲۰۰)

معراج کے لئے رات اس لئے مقرر کی گئی کہ معراج کشف کی قسم تھا اور کشف اور خواب کے لئے رات موزوں ہے۔ اگر یہ بیداری کا معاملہ ہوتا تو دن موزوں ہوتا۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۲۶ حاشیہ)

مِنْهُمْ کے قول میں اشارہ فرماتا ہے کہ مسیح موعود کی جماعت خدا کے نزدیک صحابہ میں کی ایک جماعت ہے اور اس نام رکھنے میں کچھ فرق نہیں اور یہ مرتبہ مسیح کی جماعت کو ہرگز حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے درمیان قوتِ قدسی اور اپنے روحانی افاضہ کے ساتھ موجود نہ ہوں جیسا کہ صحابہ کے اندر موجود تھے یعنی مسیح موعود کے واسطہ سے کیونکہ وہ نبی کریم کا مظہر یا آنجناب کے لئے حلہ کی مانند ہے۔ پس اس نص صریح سے ظاہر ہوا کہ ہمارے نبی کا معراج مکانی اور زمانی دونوں طرح سے تھا اور اس نکتہ کا سوائے اندھے کے اور کوئی انکار نہیں کرتا اور شک نہیں کہ اس آیت کا مفہوم واجباً معراج زمانی کو چاہتا تھا اور اگر وہ متحقق نہ ہوتا تو اس آیت کا مفہوم باطل ہو جاتا چنانچہ اس نکتہ کو اہلِ فکر اور غور سمجھتے ہیں۔ پس یہاں سے ثابت ہوا کہ مسیح موعود محمدی حقیقت کا مظہر ہے اور جلالی حلوں میں نازل ہوا ہے اسی لئے خدا کے نزدیک اس کا ظہور نبی مصطفٰے کا ظہور مانا گیا ہے اور اُس کا زمانہ رسول کریم کے زمانی معراج کا منتہا اور خیر الوریٰ کی روحانی تجلی کا آخری سرا شمار کیا گیا ہے اور جہان کے پروردگار کا یہ پختہ وعدہ تھا۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۹۴ تا ۲۰۰)

فَاِنَّ الْمِعْرَاجَ عَلَى الْمَذْهَبِ الصَّحِيْحِ كَانَ كَشْفًا لَطِيْفًا مَّعَ الْيَقْظَةِ الرُّوْحَانِيَّةِ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلَى الْعَقْلِ الْوَهَّاجِ۔ وَمَا صَعِدَ اِلَى السَّمَآءِ اِلَّا رُوْحُ سَيِّدِنَا وَنَبِيِّنَا مَعَ جِسْمٍ نُوْرَانِيٍّ اِلَّذِيْ هُوَ غَيْرُ الْجِسْمِ الْعُنْصُرِيِّ الَّذِيْ مَا خُلِقَ مِنَ التُّرْبَةِ۔ وَمَا كَانَ لِجِسْمٍ اَرْضِيٍّ اَنْ يُّرْفَعَ اِلَى السَّمَآءِ۔ وَعْدٌ مِّنَ اللّٰهِ ذِى الْجَبْرُوْتِ وَالْعِزَّةِ۔ وَاِنْ كُنْتَ فِىْ رَيْبٍ فَاقْرَءْ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا اَحْيَآءً وَّ اَمْوَاتًا[1] (الهدیٰ ص۱۱۳)

معراج انقطاع تام تھا اور سِرّ اس میں یہ تھا کہ تا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقطہ نفسی کو ظاہر کیا جاوے آسمان پر ہر ایک روح کے لئے ایک نقطہ ہوتا ہے اس سے آگے وہ نہیں جاتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نقطہ نفسی عرش تھا اور رفیق اعلیٰ کے معنے بھی خدا ہی کے ہیں پس رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر اور کوئی معزز و مکرم نہیں ہے۔ (الحکم جلد ۵ ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۱ء ص۴)

معراج ہوئی تھی مگر یہ فانی بیداری اور فانی اشیاء کے ساتھ نہ تھی بلکہ وہ اَور رنگ تھا۔ جبرئیل بھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا تھا اور نیچے اترتا تھا جس رنگ میں اس کا اترنا تھا اسی رنگ میں آنحضرتؐ کا چڑھنا ہوا تھا۔ نہ اُترنے والا کسی کو اُترتا نظر آتا تھا اور نہ چڑھنے والا کوئی چڑھتا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ حدیث شریف میں جو بخاری میں آیا ہے کہ ثُمَّ اسْتَيْقَظَ یعنی پھر جاگ اُٹھے۔

(الحکم جلد ۵ ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۱ء ص۳)

سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ سے یہی پایا جاتا ہے کہ جب کامل معرفت ہوتی ہے تو پھر اس کو عجیب و غریب مقامات کی سیر کرائی جاتی ہے اور یہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو ادب سے اپنی خواہشوں کو مخفی رکھتے ہیں۔ تمام منہاج نبوت اسی پر دلالت کرتا ہے۔ پہلے نشان بھی ظاہر نہیں ہوتے بلکہ ابتلا ہوتے ہیں۔ (الحکم جلد ۷ مورخہ

(ترجمہ از مرتب) معراج کے بارے میں صحیح مذہب یہ ہے کہ وہ ایک لطیف کشف تھا جو روحانی بیداری کی حالت میں ہوا جیسا کہ روشن عقل کے لئے واضح ہے۔ اور آسمان کی طرف صرف ہمارے آقا اور نبی صلعم کی روح نورانی جسم کے ساتھ صعود فرما ہوئی تھی۔ نورانی جسم وہ ہے جو مادی جسم کے علاوہ ہے جو مٹی سے پیدا نہیں ہوا اور مادی اور جسمانی جسم کے لئے روا نہیں کہ اسے آسمان کی طرف اٹھایا جائے۔ یہ خدائے قادر و عزیز کا وعدہ ہے اور اگر تمہیں اس بارے میں شک ہو تو آیت کریمہ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا اَحْيَآءً وَّ اَمْوَاتًا کو پڑھو۔

---

[1] المرسلات آیت ۲۶-۲۷

۱۷ار جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

ہماری اس مسجد کا نام بھی اللہ تعالیٰ نے مسجد اقصیٰ رکھا ہے کیونکہ اقصیٰ یا باعتبار بُعد زمانہ کے ہوتا ہے اور یا بُعد مکان کے لحاظ سے اور اس الہام میں اَلْمَسْجِدُ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاثیرات زمانی کو لیا ہے اور اس کی تائید وَ اٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ[1] سے بھی ہوتی ہے اور بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ کا اس زمانہ کی برکات سے ثبوت ملتا ہے جیسے ریل اور جہازوں کے ذریعہ سفروں کی آسانی اور تار اور ڈاک خانہ کے ذریعہ سلسلہ رسل و رسائل کی سہولت اور ہر قسم کے آرام و آسائش قسم قسم کی کلوں کے اجرا سے ہوتے جاتے ہیں اور سلطنت بھی ایک امن کی سلطنت ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۲ مورخہ ۱۰ ار نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام عبد بھی ہے اور اس لئے خدا نے عبد نام رکھا کہ اصل عبودیت کا خضوع اور ذُلّ ہے اور عبودیت کی حالت کاملہ وہ ہے جس میں کسی قسم کا غلوّ اور بلندی اور عُجب نہ رہے اور صاحب اس حالت کا اپنی عملی تکمیل محض خدا کی طرف سے دیکھے اور کوئی ہاتھ درمیان نہ دیکھے۔ عرب کا محاورہ ہے کہ وہ کہتے ہیں مَوْرٌ مُّعَبَّدٌ وَطَرِیْقٌ مُّعَبَّدٌ جہاں راہ نہایت درست اور نرم اور سیدھا کیا جاتا ہے اس راہ کو طریق معبد کہتے ہیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے عبد کہلاتے ہیں کہ خدا نے محض اپنے تصرف اور تعلیم سے ان میں عملی کمال پیدا کیا اور اُن کے نفس کو راہ کی طرح اپنی تجلیات کے گذر کے لئے نرم اور سیدھا اور صاف کیا اور اپنے تصرف سے وہ استقامت جو عبودیت کی شرط ہے ان میں پیدا کی۔ پس وہ علمی حالت کے لحاظ سے مہدی ہیں اور عملی کیفیت کے لحاظ سے جو خدا کے عمل سے ان میں پیدا ہوئی عبد ہیں کیونکہ خدا نے ان کی رُوح پر اپنے ہاتھ سے وہ کام کیا ہے جو کوٹنے اور ہموار کرنے کے آلات سے اس سڑک پر کیا جاتا ہے جس کو صاف اور ہموار بنانا چاہتے ہیں اور چونکہ مہدی موعود کو بھی عبودیت کا مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے حاصل ہوا اس لئے مہدیٔ موعود میں عبد کے لفظ کی کیفیت غلام کے لفظ سے ظاہر کی گئی یعنی اس کے نام کو غلام احمد کر کے پکارا گیا۔ یہ غلام کا لفظ اس عبودیت کو ظاہر کرتا ہے جو ظلّی طور پر مہدیٔ موعود میں بھی ہونی چاہیئے۔ فتدبّر (ایام الصلح صفحہ ۱۴۵ حاشیہ)

یہ مرتبہ عبودیت کاملہ جو انسان اپنی عملی تکمیل محض خدا تعالیٰ کی طرف سے دیکھے بجز اُس مہدیٔ کامل کی جس کی عملی تکمیل تمام و کمال محض خدا تعالیٰ کے ہاتھ سے ہوئی ہو دوسرے کو میسّر نہیں آسکتا کیونکہ اپنی جہد اور کوشش کا اثر ضرور ایک ایسا خیال پیدا کرتا ہے کہ جو عبودیّت تامہ کے منافی ہے اس لئے مرتبہ عبودیت کاملہ بھی بوجہ اسکے

---

[1] الجمعۃ آیت ۴

جو مرتبہ مہدویت کاملہ کے تابع ہے بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی دوسرے کو بوجہ کمال حاصل نہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ[1] فَاشْهَدُوْا اَنَّا نَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ۔

(ایام الصلح ص۱۲۱ حاشیہ۔ نوٹ)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی رات اسی جسم کے ساتھ آسمان پر گئے ہیں مگر وہ نہیں دیکھتے کہ قرآن شریف اس کو رد کرتا ہے اور حضرت عائشہؓ بھی رویا کہتی ہیں۔

حقیقت میں معراج ایک کشف تھا جو بڑا عظیم الشان اور صاف کشف تھا اور اتم اور اکمل تھا کشف میں اس جسم کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ کشف میں جو جسم دیا جاتا ہے اس میں کسی قسم کا حجاب نہیں ہوتا بلکہ بڑی بڑی طاقتیں اس کے ساتھ ہوتی ہیں اور آپ کو اسی جسم کے ساتھ جو بڑی طاقتوں والا ہوتا ہے معراج ہوا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

ہمارا ایمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوا تھا مگر اس میں جو بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ صرف ایک معمولی خواب تھا سو یہ عقیدہ غلط ہے اور جن لوگوں کا عقیدہ ہے کہ معراج میں آنحضرت اسی جسد عنصری کے ساتھ آسمان پر چلے گئے تھے سو یہ عقیدہ بھی غلط ہے بلکہ اصل بات اور صحیح عقیدہ یہ ہے کہ معراج کشفی رنگ میں ایک نورانی وجود کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ ایک وجود تھا مگر نورانی۔ اور ایک بیداری تھی مگر کشفی اور نورانی جس کو اس دنیا کے لوگ نہیں سمجھ سکتے مگر وہی جن پر وہ کیفیت طاری ہوئی ہو ورنہ ظاہری جسم اور ظاہری بیداری کے ساتھ آسمان پر جانے کے واسطے تو خود یہودیوں نے معجزہ طلب کیا تھا جس کے جواب میں قرآن شریف میں کہا گیا تھا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا[2] کہہ دے میرا رب پاک ہے مَیں تو ایک انسان رسول ہوں انسان اس طرح اڑ کر کبھی آسمان پر نہیں جاتے۔ یہی سنت اللہ قدیم سے جاری ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۱ مورخہ ۱۷ر جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۱)

۵۔ وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِي الْكِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِي الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا۝

---

[1] المائدہ آیت ۵۵ ۞ [2] بنی اسرائیل آیت ۹۴ ۞

وَقَالَ اللّٰہُ وَقَضَیْنَآ اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ فِی الْکِتَابِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا کَبِیْرًا۔ فَہَلْ اَنْتُمْ تَتَذَکَّرُوْنَ وَکَانَ الْمَفْسَدَۃُ الْاٰخِرَۃُ الْمُوْجِبَۃُ لِغَضَبِ الرَّبِّ تَکْفِیْرَ الْمَسِیْحِ وَاِرَادَۃَ صَلْبِہٖ۔

(خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۲۹ طبع اوّل)

فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا بَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ ؕ وَکَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا ۝

بخت نصر یہودیوں پر مسلط ہوا تھا مگر خدا نے اسے کہیں ملعون نہیں کہا ہے بلکہ عباداً لنا ہی کہا ہے۔ یہ خدا کا دستور ہے کہ جب ایک قوم فاسق فاجر ہوتی ہے تو اس پر ایک اور قوم مسلط کر دیتا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱ و ۲ مورخہ ۲۳ - ۳۰ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۴)

عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ ۚ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا ۘ وَجَعَلْنَا جَہَنَّمَ لِلْکٰفِرِیْنَ حَصِیْرًا ۝

خدائے تعالیٰ کا ارادہ اس بات کی طرف متوجہ ہے جو تم پر رحم کرے اور اگر تم نے گناہ اور سرکشی کی طرف رجوع کیا تو ہم بھی سزا اور عقوبت کی طرف رجوع کریں گے اور ہم نے جہنّم کو کافروں کے لئے قید خانہ بنا رکھا ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۰۵ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

اِنَّ ہٰذَا الْقُرْاٰنَ یَہْدِیْ لِلَّتِیْ ہِیَ اَقْوَمُ وَیُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمْ اَجْرًا کَبِیْرًا ۝

(ترجمہ از کتاب) خدا تعالیٰ فرماتا کہ ہم نے کتاب میں بنی اسرائیل سے کہا کہ تم دو دفعہ زمین میں فساد کرو گے اور حد سے نکل جاؤ گے کیا تمہیں یہ یاد ہے اور وہ دوسروں کا فساد جو خدا کے غضب کا باعث ہوا مسیح کو کافر کہنا اور اس کو سولی دینے کا ارادہ تھا۔

(خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۲۹ طبع اوّل)

یہ قرآن اس راہ کی طرف ہدایت کرتا ہے جو نہایت سیدھی ہے۔ (ازالہ اوہام صہ ۶۵۵)

یہ قرآن اُس تعلیم کی ہدایت کرتا ہے جو بہت سیدھی اور بہت کامل ہے۔
(جنگِ مقدس صہ ۲ تقریر ۲۲ رمئی ۱۸۹۳ء)

یہ قرآن ایک سیدھے اور کامل راہ کی طرف رہبری کرتا ہے یعنی رہبری میں کامل ہے اور رہبری میں جو لوازم ہونے چاہئیں دلائل عقلیہ اور برکات سماویہ میں سے وہ سب اس میں موجود ہیں۔
(جنگِ مقدس صہ ۱۵ بیان مورخہ ۲۳ رمئی ۱۸۹۳ء)

وہ سب سے زیادہ سیدھی راہ بتلاتا ہے۔ (الحق لدھیانہ صہ ۲۸)

یہ قرآن اُس سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے جس میں ذرا کجی نہیں اور انسانی سرشت سے بالکل مطابقت رکھتی ہے اور درحقیقت قرآن کی خوبیوں میں سے یہ ایک بڑی خوبی ہے کہ وہ ایک کامل دائرہ کی طرح بنی آدم کی تمام قویٰ پر محیط ہو رہا ہے۔ اور آیت موصوفہ میں سیدھی راہ سے وہی راہ مراد ہے کہ جو راہ انسان کی فطرت سے نہایت نزدیک ہے یعنی جن کمالات کے لئے انسان پیدا کیا گیا ہے اُن تمام کمالات کی راہ اس کو دکھلا دینا اور وہ راہیں اس کے لئے میسّر اور آسان کر دینا جن کے حصول کے لئے اُس کی فطرت میں استعداد رکھی گئی ہے اور لفظ اَقْوَمُ سے آیت یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ میں یہی راستی مراد ہے۔ (کرامات الصادقین صہ ۱۱-۱۲)

۱۳ وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ۝

ہم نے رات اور دن دو نشانیاں بنائی ہیں یعنی انتشارِ ضلالت جو رات سے مشابہ ہے اور انتشارِ ہدایت جو دن سے مشابہ ہے۔ رات جب اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے تو دن کے چڑھنے پر دلالت کرتی ہے اور دن جب اپنے کمال کو پہنچ جاتا ہے تو رات کے آنے کی خبر دیتا ہے سو ہم نے رات کا نشان محو کر کے دن کا نشان رہنما بنایا یعنی جب دن چڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے اندھیرا تھا سو دن کا نشان ایسا روشن ہے کہ رات کی حقیقت بھی اُسی سے کھلتی ہے اور رات کا نشان یعنی ضلالت کا زمانہ اس لئے مقرر کیا گیا کہ دن کے نشان یعنی انتشارِ ہدایت کی خوبی اور زیبائی اُسی سے ظاہر ہوتی ہے کیونکہ خوبصورت کا قدر و منزلت بدصورت سے ہی معلوم ہوتا ہے اِس لئے حکمتِ

الٰہیّہ نے یہی چاہا کہ ظلمت اور نور علی السبیل التبادل دنیا میں دَور کرتے رہیں جب نور اپنے کمال کو پہنچ جائے تو ظلمت قدم بڑھا دے اور جب ظلمت اپنے انتہائی درجہ تک پہنچ جائے تو پھر نور اپنا پیارا چہرہ دکھاوے۔ سو استیلا ظلمت کا نور کے ظہور پر ایک دلیل ہے اور استیلا نور کا ظلمت کے آنے کا ایک سبیل ہے۔ ہر کمال را زوالے مثل مشہور ہے سو اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب ظلمت اپنے کمال کو پہنچ گئی اور برّ و بحر ظلمت سے بھر گئے تو ہم نے مطابق اپنے قانونِ قدیم کے نور کے نشان کو ظاہر کیا تا دانشمند لوگ قادرِ مطلق کی قدرتِ نمایاں کو ملاحظہ کر کے اپنے یقین اور معرفت کو زیادہ کریں۔ (براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۵۳۰-۵۳۲)

وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا الجزو نمبر ۱۵ یعنی اس کتاب میں ہر یک علمِ دین کو بہ تفصیل تمام کھول دیا ہے اور اس کے ذریعہ سے انسان کی جزئی ترقی نہیں بلکہ یہ وہ وسائل بتلاتا ہے اور ایسے علومِ کاملہ تعلیم فرماتا ہے جن سے کُلّی طور پر ترقی ہو۔ (براہین احمدیہ حصّہ سوم صفحہ ۲۰۵ حاشیہ نمبر ۱۱)

اور ہر یک شے کی تفصیل اس میں موجود ہے۔ (کرامات الصادقین صفحہ ۱۰)

۱۴. وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ۝

قرآن شریف بار بار یہی فرماتا ہے کہ عالمِ آخرت کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے تمام نظارے اسی دنیوی زندگی کے اظلال و آثار ہیں جیسا کہ وہ فرماتا ہے .... ہم نے اسی دنیا میں ہر ایک شخص کے اعمال کا اثر اس کی گردن سے باندھ رکھا ہے اور انہیں پوشیدہ اثروں کو ہم قیامت کے دن ظاہر کر دیں گے اور ایک کُھلے کُھلے اعمال نامہ کی شکل پر دکھا دیں گے۔ اس آیت میں جو طَائِر کا لفظ ہے تو واضح ہو کہ طائر اصل میں پرندہ کو کہتے ہیں پھر استعارہ کے طور پر اس سے مراد عمل بھی لیا گیا ہے کیونکہ ہر یک عمل نیک ہو یا بد ہو وہ وقوع کے بعد پرندہ کی طرح پرواز کر جاتا ہے اور مشقّت یا لذّت اس کی کالعدم ہو جاتی ہے اور دل پر اس کی کثافت یا لطافت باقی رہ جاتی ہے۔

یہ قرآنی اصول ہے کہ ہر ایک عمل پوشیدہ طور پر اپنے نقوش جماتا رہتا ہے۔ جس طور کا انسان کا فعل ہوتا ہے اسی کے مناسبِ حال ایک خدا تعالیٰ کا فعل صادر ہوتا ہے اور وہ فعل اس گناہ کو یا اس کی نیکی کو ضائع ہونے نہیں دیتا بلکہ اس کے نقوش دل پر، منہ پر، آنکھوں پر، کانوں پر، ہاتھوں پر، پیروں پر لکھے جاتے ہیں اور یہی پوشیدہ طور پر ایک اعمال نامہ ہے جو دوسری زندگی میں کُھلے طور پر ظاہر ہو جائے گا۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۹۳)

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۗ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۗ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝

قرآن کوئی لعنتی قربانی پیش نہیں کرتا بلکہ ہرگز جائز نہیں رکھتا کہ ایک کا گناہ یا ایک کی لعنت کسی دوسرے پر ڈالی جائے چہ جائیکہ کروڑہا لوگوں کی لعنتیں اکٹھی کرکے ایک کے گلے میں ڈال دی جائیں۔ قرآن شریف صاف فرماتا ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی یعنی ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھائے گا۔

(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب صـ۲)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے کسی نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے ماتم کرنے سے مُردہ کو تکلیف ہوتی ہے تو انہوں نے یہی کہا کہ قرآن میں تو آیا ہے لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۰۲ء صـ۵)

کسی کے گناہ سے خدائے تعالیٰ کا کوئی حرج نہیں ہوتا اور گناہ پہلے قانون نازل ہونے کے کچھ وجود نہیں رکھتا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۱۵/۲ یعنی ہم گناہوں پر عذاب نہیں کیا کرتے جب تک رسول نہیں بھیجتے اور جب رسول آیا اور خیر وشر کا راہ بتلایا تو اس قانون کے وعدوں اور وعیدوں کے موافق عمل درآمد ہوگا۔ کفارہ کی تلاش میں لگنا ہنسی کی بات ہے کیا کفارہ وعدوں کو توڑ سکتا ہے بلکہ وعدہ وعدہ سے بدلتا ہے اور نہ کسی اور تدبیر سے۔

(جنگِ مقدس صـ۷ پرچہ ۵ جون ۱۸۹۳ء)

ہم کسی قوم پر عذاب نازل نہیں کرتے جب تک ایک رسول بھیج نہ لیں۔ (شہادت القرآن صـ۵۹)

اصل بات یہ ہے کہ نبی عذاب کو نہیں لاتا بلکہ عذاب کا مستحق ہو جانا اتمام حجت کے لئے نبی کو لاتا ہے اور اُس کے قائم ہونے کے لئے ضرورت پیدا کرتا ہے اور سخت عذاب بغیر نبی قائم ہونے کے آتا ہی نہیں جیسا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔ (تجلیاتِ الٰہیہ صـ۸)

ہم کسی بستی پر غیر معمولی عذاب نازل نہیں کرتے جب تک ہم اُن پر اتمام حجت کے لئے ایک رسول نہ بھیج دیں۔

(تجلیاتِ الٰہیہ صـ۹)

عادت اللہ ہمیشہ سے اس طرح پر جاری ہے کہ جب دنیا ہر ایک قسم کے گناہ کرتی ہے اور بہت سے گناہ انکے جمع ہو جاتے ہیں تب اُس زمانہ میں خدا اپنی طرف سے کسی کو مبعوث فرماتا ہے اور کوئی حصہ دنیا کا اس کی تکذیب کرتا ہے تب اس کا مبعوث ہونا دوسرے شریر لوگوں کی سزا دینے کے لئے بھی جو پہلے مجرم ہو چکے ہیں ایک محرّک

ہو جاتا ہے اور جو شخص اپنے گذشتہ گناہوں کی سزا پاتا ہے اُس کے لئے اس بات کا علم ضروری نہیں کہ اس زمانہ میں خدا کی طرف سے کوئی نبی یا رسول بھی موجود ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا

(حقیقۃ الوحی صـ ۱۶۰-۱۶۱)

خدا تعالیٰ دنیا میں عذاب نازل نہیں کرتا جب تک پہلے اس سے کوئی رسول نہیں بھیجتا۔ یہی سنّت اللہ ہے۔

(تتمہ حقیقۃ الوحی صـ ۵۳)

اگر مَیں نہ آیا ہوتا تو ان بلاؤں میں کچھ تاخیر ہو جاتی پر میرے آنے کے ساتھ خدا کے غضب کے وہ مخفی ارادے جو ایک بڑی مدت سے مخفی تھے ظاہر ہو گئے جیسا کہ خدا نے فرمایا وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔ اور توبہ کرنے والے امان پائیں گے اور وہ جو بلا سے پہلے ڈرتے ہیں اُن پر رحم کیا جائے گا۔ (حقیقۃ الوحی صـ ۲۵۶)

اس سے مسیح موعود کی نسبت پیشگوئی کھلے کھلے طور پر قرآن شریف میں ثابت ہوتی ہے کیونکہ جو شخص غور اور ایمانداری سے قرآن شریف کو پڑھے گا اُس پر ظاہر ہوگا کہ آخری زمانہ کے سخت عذابوں کے وقت جبکہ اکثر حصے زمین کے زیر و زبر کئے جائیں گے اور سخت طاعون پڑے گی اور ہر ایک پہلو سے موت کا بازار گرم ہوگا اُس وقت ایک رسول کا آنا ضروری ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا یعنی ہم کسی قوم پر عذاب نہیں بھیجتے جبتک عذاب سے پہلے رسول نہ بھیج دیں۔ پھر جس حالت میں چھوٹے چھوٹے عذابوں کے وقت میں رسول آئے ہیں جیسا کہ زمانہ کے گذشتہ واقعات سے ثابت ہے تو پھر کیونکر ممکن ہے کہ اس عظیم الشان عذاب کے وقت میں جو آخری زمانہ کا عذاب ہے اور تمام عالم پر محیط ہونے والا ہے جس کی نسبت تمام نبیوں نے پیشگوئی کی تھی خدا کی طرف سے رسول ظاہر نہ ہو اس سے تو صریح تکذیب کلام اللہ کی لازم آتی ہے۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی صـ ۶۴)

آیت قرآنی وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا سے صاف ظاہر ہے کہ اس قسم کے قہری عذاب کے نازل ہونے سے پہلے خدا کی طرف سے کوئی رسول ضرور مبعوث ہوتا ہے جو خلقت کو آنے والے عذاب سے ڈراتا ہے اور یہ عذاب اس کی تصدیق کے واسطے قہری نشانات ہوتے ہیں۔ اس وقت بھی خدا کا ایک رسول تمہارے درمیان ہے جو مدت سے تم کو ان عذابوں کے آنے کی خبر دے رہا ہے۔ پس سوچو اور ایمان لاؤ تا کہ نجات پاؤ۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۱۰ صـ ۸۹ حاشیہ)

ہم عذاب نازل نہیں کیا کرتے مگر اس حالت میں کہ جب پہلے رسول آجاوے یعنی دنیا پر عذاب شدید نازل ہونا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ رسول آ گیا ہے۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۱۰ صـ ۱۳)

ہم عذاب نہیں کیا کرتے جب تک کوئی رسول نہ بھیج دیویں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۸ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۳ء صـ ۲۱۸)

صاف ایک رسول کی نسبت پیشگوئی معلوم ہوتی ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ رسول کا آنا اس زمانہ میں ضروری ہے۔ یہ کہنا کہ فلاں فلاں رسول کے زمانہ میں یہ یہ عذاب آئے۔ ان لوگوں کے خیال کے بموجب تو جب کل دنیا میں عذاب شروع ہوگیا اس وقت کوئی رسول نہ آیا تو اس بات کا کیا اعتبار رہا کہ پہلے زمانہ میں جو عذاب آئے تھے اُن رسولوں کے انکار سے ہی آئے تھے۔ کیسی صاف بات تھی کہ آخری زمانہ میں سخت عذاب آئیں گے اور ساتھ ہی لکھا تھا کہ جبتک رسول مبعوث نہ کرلیں عذاب نہیں بھیجتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر صاف پیشگوئی اور کیا ہوسکتی ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

قرآن شریف سے تو ثابت ہے کہ کسی ایک گاؤں پر بھی عذاب نہیں آتا جب تک کہ اس سے پہلے خدا کا کوئی رسول نہ آوے۔ تعجب ہے کہ ایسا عالمگیر عذاب زمین پر پڑ رہا ہے اور ہنوز ان لوگوں کے نزدیک خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی نذیر نہیں آیا اور نہ ان کے نزدیک کسی نذیر کی ضرورت ہے۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۴۲ مورخہ ۳ر اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا اس میں حکمت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ غنی بے نیاز ہے اس کو کسی کی پرواہ نہیں پس جب نبی پیدا ہوتا ہے اور وہ دعائیں کرتا ہے تب ان دعاؤں کے اثر سے عذاب نازل ہوتا ہے اور وہ عذاب اگرچہ گذشتہ گناہوں کی شامت سے ہو مگر نبی کی دعاؤں سے ہوتا ہے اسی طرح اگرچہ کوئی مجھ سے ناواقف اور بے خبر ہو یورپ میں یا امریکہ میں مگر میری دعائیں اُس کے عذاب کا موجب ہو جاتی ہیں اور وہ عذاب نہیں آتا ہے جب تک میری دعائیں اس کو ظاہر نہ کریں یہی معنے ہیں اس آیت کے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔

(الفضل جلد ۱ نمبر ۲۹ مورخہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۹)

۱۷ وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا۝

قدیم سے الٰہی سنت اسی طرح پر ہے کہ جب تک کوئی کافر اور منکر نہایت درجہ کا بے باک اور شوخ ہو کر اپنے ہاتھ سے اپنے لئے اسباب ہلاکت پیدا نہ کرے تب تک خدا تعالیٰ تعذیب کے طور پر اس کو ہلاک نہیں کرتا اور جب کسی منکر پر عذاب نازل ہونے کا وقت آتا ہے تو اس میں وہ اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے اس پر حکم ہلاکت لکھا جاتا ہے۔ عذاب الٰہی کے لئے یہی قانون قدیم ہے اور یہی سنت مستمرہ اور یہی غیر متبدل قاعدہ کتاب الٰہی نے بیان کیا ہے۔ (انوار الاسلام صفحہ ۳)

دنیوی عذاب کا موجب کفر نہیں ہے بلکہ شرارت ہے اور تکبر میں حد سے زیادہ بڑھ جانا موجب ہے اور ایسا آدمی خواہ مومن ہی کیوں نہ ہو جب ظلم اور ایذا اور تکبر میں حد سے بڑھے گا اور عظمت الٰہی کو بھلا دے گا تو عذاب الٰہی ضرور اس کی طرف متوجہ ہوگا۔ اور جب ایک کافر مسکین صورت رہے گا اور اس کو خوف دامنگیر ہوگا تو گو وہ اپنی مذہبی ضلالت کی وجہ سے جہنم کے لائق ہے مگر عذاب دنیوی اس پر نازل نہیں ہوگا پس دنیوی عذاب کے لئے یہی ایک قدیم اور مستحکم فلاسفی ہے اور یہی وہ سنت اللہ ہے جس کا ثبوت خدا کی تمام کتابوں سے ملتا ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ قرآن کریم میں فرماتا ہے وَإِذَآ أَرَدْنَآ أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيرًا یعنی جب ہمارا ارادہ اس بات کی طرف متعلق ہوتا ہے کہ کسی بستی کے لوگوں کو ہلاک کریں تو ہم بستی کے منعم اور عیاش لوگوں کو اس طرف متوجہ کرتے ہیں کہ وہ اپنی بدکاریوں میں حد اعتدال سے نکل جاتے ہیں پس ان پر سنت اللہ کا قول ثابت ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے ظلموں میں انتہا تک پہنچ جاتے ہیں تب ہم ان کو ایک سخت ہلاکت کے ساتھ ہلاک کر دیتے ہیں۔ (انوار الاسلام ص۱۳-۱۴)

عذاب الٰہی جو دنیا میں نازل ہوتا ہے وہ تبھی کسی پر نازل ہوتا ہے کہ جب وہ شرارت اور ظلم اور تکبر اور علو اور غلو میں نہایت کو پہنچ جاتا ہے یہ نہیں کہ ایک کافر خوف سے مرا جاتا ہے اور پھر بھی عذاب الٰہی کے لئے اس پر صاعقہ پڑے اور ایک مشرک اندیشہ عذاب سے جاں بلب ہو اور پھر بھی اس پر پتھر برسیں۔ خداوند تعالیٰ نہایت درجہ کا رحیم اور حلیم ہے عذاب کے طور پر صرف اسی کو اس دنیا میں پکڑتا ہے جو اپنے ہاتھ سے عذاب کا سامان تیار کرے۔

(انوار الاسلام ص۱۵)

جب کسی بستی کے ہلاک کرنے کا ارادۂ الٰہی ہوتا ہے تو اس وقت ضرور وہاں کے لوگ بدکاریوں میں حد اعتدال سے نکل جاتے ہیں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۴ مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۶۶)

۲۳ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُومًا مَّخْذُولًا ۝

خدائے تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا خدا مت ٹھہرا۔ اگر تونے ایسا کیا تو مذموم اور مخذول ہو کر بیٹھے گا۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور اُن کے جوابات ص۲)

۲۴ وَقَضٰى رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا إِلَّآ إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَآ أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَآ أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل

لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝

تیرے خدا نے یہ چاہا ہے کہ تو فقط اسی کی بندگی کر اور اپنے ماں باپ سے احسان کرتا رہ۔

(براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۴۳۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

اور تیرے خدا نے یہی چاہا ہے کہ تم اُس کی بندگی کرو اُس کے سوا کوئی اور دوسرا تمہارا معبود نہ ہو اور ماں باپ سے احسان کر۔ اگر وہ دونو یا ایک اُن میں سے تیرے سامنے بڑی عمر تک پہنچ جائیں تو تو ان کو اُف نہ کہہ اور نہ اُن کو جھڑک بلکہ ان سے ایسی باتیں کہہ کہ جن میں ان کی بزرگی اور عظمت پائی جائے۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات صفحہ ۴)

خدا نے یہ چاہا ہے کہ کسی دوسرے کی بندگی نہ کرو اور والدین سے احسان کرو حقیقت میں کیسی ربوبیت ہے کہ انسان بچہ ہوتا ہے اور کسی قسم کی طاقت نہیں رکھتا اُس حالت میں ماں کیا کیا خدمات کرتی ہے اور والد اس حالت میں ماں کی مہمات کا کیسا متکفل ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے ناتوان مخلوق کی خبر گیری کے لئے دو محل پیدا کر دئے ہیں اور اپنی محبت کے انوار سے ایک پرتو محبت کا اُن میں ڈال دیا ہے مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ماں باپ کی محبت عارضی ہے اور خدا تعالیٰ کی محبت حقیقی ہے اور جب تک قلوب میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا القا نہ ہو کوئی فرد بشر خواہ دوست ہو یا کوئی برابر درجہ کا ہو یا کوئی حاکم ہو کسی سے محبت نہیں کر سکتا اور یہ خدا کی کمال ربوبیت کا راز ہے کہ ماں باپ بچوں سے ایسی محبت کرتے ہیں کہ ان کے تکفل میں ہر قسم کے دُکھ شرح صدر سے اٹھاتے ہیں یہاں تک کہ اُن کی زندگی کے لئے مرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ (روئیداد جلسہ دعا صفحہ ۱۱)

فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا یعنی اپنے والدین کو بیزاری کا کلمہ مت کہو اور ایسی باتیں اُن سے نہ کر جن میں اُن کی بزرگواری کا لحاظ نہ ہو۔ اس آیت کے مخاطب تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں لیکن دراصل مرجع کلام امّت کی طرف ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والد اور والدہ آپ کی خوردسالی میں ہی فوت ہو چکے تھے اور اس حکم میں ایک راز بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس آیت سے ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ تو اپنے والدین کی عزّت کر اور ہر ایک بول چال میں اُن کے بزرگانہ مرتبہ کا لحاظ رکھ تو پھر دوسروں کو اپنے والدین کی کس قدر تعظیم کرنی چاہیئے اور اسی کی طرف یہ دوسری آیت اشارہ کرتی ہے وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا یعنی تیرے رب نے چاہا ہے کہ تو فقط اُسی کی بندگی کر اور والدین سے احسان کر۔ اس آیت میں بُت پرستوں کو جو بُت کی پُوجا کرتے ہیں سمجھایا گیا ہے کہ بُت کچھ چیز نہیں ہیں اور بُتوں کا تم پر کچھ احسان نہیں ہے انہوں نے تمہیں پیدا نہیں کیا اور تمہاری خوردسالی میں

وہ تمہارے متکفل نہیں تھے اور اگر خدا جایز رکھتا کہ اُس کے ساتھ کسی اور کی بھی پرستش کی جائے تو یہ حکم دیتا کہ تم والدین کی بھی پرستش کرو کیونکہ وہ بھی مجازی رب ہیں اور ہر ایک شخص طبعاً یہاں تک کہ درندچرند بھی اپنی اولاد کو ان کی خوردسالی میں ضایع ہونے سے بچاتے ہیں پس خدا کی ربوبیت کے بعد اُن کی بھی ایک ربوبیت ہے اور وہ جوش ربوبیت کا بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۰۴-۲۰۵)

تیرے رب نے یہ حکم کیا ہے کہ تم فقط میری ہی پرستش کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور اگر تیرے سامنے اُن میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں پس تو اُن کی نسبت کوئی بیزاری کا لفظ مونہہ پر مت لا اور اُن کو مت جھڑک اور سخت لفظ مت بول اور جب تو اُن سے بات کرے تو تعظیم اور ادب سے کر۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۰۱)

۲۵ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيرًا۝

اور تذلل اور رحمت سے ان کے سامنے اپنا بازو جھکا اور دعا کر کہ اے میرے رب تو ان پر رحم کر جیسا انہوں نے میرے بچپن کے زمانے میں میری پرورش کی۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات صفحہ ۱۲)

اور مہربانی کی راہ سے اُن دونوں کے آگے اپنے بازو جھکا دے اور دعا کرتا رہ کہ اے میرے پروردگار ان دونوں پر رحم کر جیسا کہ انہوں نے بچپن کے زمانہ میں رحم کر کے میری پرورش کی۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۰۱)

۲۶ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا۝

اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔ اگر تم صالح ہو تو وہ اپنی طرف جھکنے والوں کے واسطے غفور ہے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی بعض ایسے مشکلات آگئے تھے کہ دینی مجبوریوں کی وجہ سے ان کی ان کے والدین سے نزاع ہوگئی تھی۔ بہرحال تم اپنی طرف سے ان کی خیریت اور خبر گیری کے واسطے ہر وقت تیار رہو جب کوئی موقع ملے اسے ہاتھ سے نہ دو۔ تمہاری نیت کا ثواب تم کو مل رہے گا۔ اگر محض دین کی وجہ سے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کو مقدم کرنے کے واسطے والدین سے الگ ہونا پڑا ہے تو یہ ایک مجبوری ہے۔ اصلاح کو مدنظر رکھو اور نیت کی صحت کا لحاظ رکھو اور ان کے حق میں دعا کرتے رہو۔ یہ معاملہ کوئی آج نیا نہیں پیش آیا حضرت ابراہیمؑ کو بھی ایسا ہی واقعہ پیش

آیا تھا بہرحال خدا کا حق مقدم ہے پس خدا کو مقدم کرو اور اپنی طرف سے والدین کے حقوق ادا کرنے کی کوشش میں لگے رہو اور اُن کے حق میں دعا کرتے رہو اور صحت نیت کا خیال رکھو۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۶ مورخہ ۲ر مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

بنی اسرائیل ۲۷ وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ○

عزیزوں کا حق ادا کرو مسکینوں کو دو مسافروں کی خدمت کرو اور فضولیوں سے اپنے تئیں بچاؤ یعنی بیاہوں شادیوں میں اور طرح طرح کی عیاشی کی جگہوں میں اور لڑکا پیدا ہونے کی رسوم میں جو اسراف سے مال خرچ کیا جاتا ہے اس سے اپنے تئیں بچاؤ۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۵۰)

بنی اسرائیل ۳۲ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ○

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ .... اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۲۶)

بنی اسرائیل ۳۳ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ○

زنا کے قریب مت جاؤ یعنی ایسی تقریبوں سے دُور رہو جن سے یہ خیال بھی دل میں پیدا ہو سکتا ہو اور ان راہوں کو اختیار نہ کرو جن سے اس گناہ کے وقوع کا اندیشہ ہو۔ جو زنا کرتا ہے وہ بدی کو انتہا تک پہنچا دیتا ہے۔ زنا کی راہ بہت بُری راہ ہے یعنی منزل مقصود سے روکتی ہے اور تمہاری آخری منزل کے لئے سخت خطرناک ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۳۳)

بنی اسرائیل ۳۶ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ○

جب تم ماپو تو پورا ماپو جب تم وزن کرو تو پوری اور بے خلل ترازو سے وزن کرو۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صہ ۳۹)

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْــُٔوْلًا

طریق تقویٰ یہ ہے کہ جب تک فراست کاملہ اور بصیرت صحیحہ حاصل نہ ہو تب تک کسی چیز کے ثبوت یا عدم ثبوت کی نسبت حکم نافذ نہ کیا جاوے۔ (الحق لدھیانہ صہ ۱۴)

بدظنی اور بدگمانی میں حد سے زیادہ مت بڑھو ایسا نہ ہو کہ تم اپنی باتوں سے پکڑے جاؤ۔

(ازالہ اوہام حصہ اول صہ ۳)

خدا تعالیٰ نے صرف قرآن کریم میں ہاتھ پیر کے گناہوں کا ذکر نہیں کیا بلکہ کان اور آنکھ اور دل کے گناہوں کا بھی ذکر کیا ہے جیسا کہ وہ اپنے پاک کلام میں فرماتا ہے اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْــُٔوْلًا یعنی کان اور آنکھ اور دل جو ہیں ان سب سے باز پرس کی جائے گی۔ اب دیکھو جیسا کہ خدا تعالیٰ نے کان اور آنکھ کے گناہ کا ذکر کیا ایسا ہی دل کے گناہ کا بھی ذکر کیا مگر دل کا گناہ خطرات اور خیالات نہیں ہیں کیونکہ وہ تو دل کے بس میں نہیں ہیں بلکہ دل کا گناہ پختہ ارادہ کر لینا ہے صرف ایسے خیالات جو انسان کے اپنے اختیار میں نہیں گناہ میں داخل نہیں۔ ہاں اس وقت داخل ہو جائیں گے جب ان پر عزیمت کرے اور ان کے ارتکاب کا ارادہ کر لیوے۔

(نور القرآن نمبر ۲ صہ ۳۳)

اسلام ایک ایسا مذہب ہے کہ جو کسی قوم کے پیشوا کو گالی دینا اس کا اصول نہیں کیونکہ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ ہم اُن پیمبروں پر ایمان لائے ہیں جن کا ذکر قرآن میں ہے۔ اور یہ بھی ہمارا عقیدہ ہے کہ ہر یک قوم میں کوئی نہ کوئی مصلح گذرا ہے۔ اور ہمیں یہ بھی تعلیم دی گئی ہے کہ ہم پورے علم کے بغیر کسی کی نسبت کوئی رائے ظاہر نہ کریں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْــُٔوْلًا۔ سو یہ پاک عقائد ہمیں بیجا بد زبانیوں اور متعصبانہ نکتہ چینیوں سے محفوظ رکھتے ہیں مگر ہمارے مخالف چونکہ تقویٰ کی راہوں سے بالکل دور اور بے قید اور خلیع الرسن ہیں اور قرآن کریم جو سب سے پیچھے آیا اُن کو طبعاً بُرا معلوم ہوتا ہے لہٰذا وہ جلد فحش گوئی اور بدزبانی اور توہین کی طرف مایل ہو جاتے ہیں اور سچی باتوں کے مقابل پر افتراؤں سے کام لیتے ہیں۔ (آریہ دھرم صہ ۲ خطوط بنام مسلمانان طبع اول)

جس بات کا تجھ کو یقینی علم نہیں دیا گیا اس بات کا پیرو کار مت بن۔ اور یاد رکھ کہ کان اور آنکھ اور دل جس قدر اعضا ہیں ان سب اعضا سے باز پُرس ہوگی۔ (آریہ دھرم ص۲ حاشیہ خطوط بنام مسلمانان طبع اوّل)

جمیع اعضا کی وضع استقامت پر چلانے کے لئے ایک ایسا کلیہ جامع بطور تہدید بطور تنبیہ و انذار فرمایا جو غافلوں کو متنبہ کرنے کے لئے کافی ہے اور کہا اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا الجزو ۱۵ یعنی کان اور آنکھ اور دل اور ایسا ہی تمام اعضا اور قوتیں جو انسان میں موجود ہیں اُن سب کے غیر محل استعمال کرنے سے باز پُرس ہوگی اور ہر یک کمی بیشی اور افراط اور تفریط کے بارہ میں سوال کیا جائے گا۔ اب دیکھو اعضا اور تمام قوتوں کو مجاریٔ خیر اور صلاحیت پر چلانے کے لئے کس قدر تصریحات و تاکیدات خدا کے کلام میں موجود ہیں اور کیسے ہر یک عضو کو مرکزِ اعتدال اور خطِ استوا پر قائم رکھنے کے لئے بکمال وضاحت بیان فرمایا گیا ہے جس میں کسی نوع کا ابہام و اجمال باقی نہیں رہا۔ کیا یہ تصریح و تفصیل صحیفۂ قدرت کے کسی صفحہ کو پڑھ کر معلوم ہو سکتی ہے۔ ہر گز نہیں۔

(براہین احمدیہ حصّہ سوم ص۱۹۳ حاشیہ نمبر ۱۱)

جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے مت پڑ۔ (براہین احمدیہ حصّہ چہارم ص۵۱۱ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

کسی کی نسبت وہ بہتان یا الزام مت لگاؤ جس کا تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں اور یاد رکھو کہ ہر ایک عضو سے مواخذہ ہوگا اور کان، آنکھ، دل ہر ایک سے پوچھا جائے گا۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی ص۴۲)

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ یہاں علم سے مراد یقین ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر۵ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۳ء ص۳۶)

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ مراد از علم یقین است ظنون را علم نمے گویند۔ ایشان اتباع ظن میکنند۔[1]

(الحکم جلد ۷ نمبر۵ مورخہ ۷ فروری ۱۹۰۳ء ص۱۴)

جس بات کا تجھے علم نہیں اس کے متعلق اپنی زبان نہ کھول۔

(بدر جلد ۱ نمبر۳۶ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء ص۴)

مخالفوں کا تو یہ فرض تھا کہ وہ حُسن ظنی سے کام لیتے اور لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ پر عمل کرتے مگر انہوں نے جلد بازی سے کام لیا۔ یاد رکھو پہلی قومیں اسی طرح ہلاک ہوئیں عقلمند وہ ہے جو مخالفت کر کے بھی جب اسے معلوم ہو کہ وہ غلطی پر تھا اُسے چھوڑ دے۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر۴۱ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۶ء ص۵)

---

[1] (ترجمہ از مرتب) علم سے مراد یقین ہے ظنون کو علم نہیں کہتے۔ یہ لوگ ظن کی اتباع کرتے ہیں۔
(ترجمہ از فارسی)

جس بات کا علم نہیں خواہ اس کی پیروی مت کرو کیونکہ کان، آنکھ، دل اور ہر ایک عضو سے پوچھا جاوے گا۔ بہت سی بدیاں صرف بدظنی سے ہی پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک بات کسی کی نسبت سنی اور جھٹ یقین کر لیا یہ بہت بری بات ہے جس بات کا قطعی علم اور یقین نہ ہو اس کو دل میں جگہ مت دو۔ یہ اصل بدظنی کو دور کرنے کے لئے ہے۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۲ مورخہ ۲۴ جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

تم قال اللہ اور قال الرسول پر عمل کرو اور ایسی باتیں زبان پر نہ لاؤ جن کا تمہیں علم نہیں۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۳)

اگر ان میں خوفِ خدا ہوتا اور یہ تقویٰ سے کام لیتے اور لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ پر عمل کرتے اور میری باتوں کو غور سے سنتے اور پھر ان پر فکر کرتے اس کے بعد حق تھا جو چاہتے کہتے مگر انہوں نے اس کی پروا نہ کی اور خدا کے خوف سے نہ ڈرے جو منہ میں آیا کہہ گذرے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

۴۵ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ۗ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۗ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝

ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے خدا کی تقدیس کرتے ہیں اور کوئی چیز نہیں جو اس کی تقدیس نہیں کرتی پر تم اُن کی تقدیسوں کو سمجھتے نہیں۔ یعنی زمین آسمان پر نظر غور کرنے سے خدا کا کامل اور مقدس ہونا اور بیٹوں اور شریکوں سے پاک ہونا ثابت ہو رہا ہے مگر ان کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۳۴ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ..... اور کوئی چیز نہیں جو خدا کی حمد و ثنا میں مشغول نہیں ہر یک چیز اُس کے ذکر میں لگی ہوئی ہے۔ (ست بچن صفحہ ۸۳)

ہر یک چیز اس کی پاکی اور اس کے محامد بیان کر رہی ہے۔ اگر خدا ان چیزوں کا خالق نہیں تھا تو ان چیزوں میں خدا کی طرف کشش کیوں پائی جاتی ہے۔ ایک غور کرنے والا انسان ضرور اس بات کو قبول کرے گا کہ کسی مخفی تعلق کی وجہ سے یہ کشش ہے۔ (ست بچن صفحہ ۱۵۱)

وہ خدا جس کا پتہ قرآن شریف بتلاتا ہے اپنی موجودات پر فقط قہری حکومت نہیں رکھتا بلکہ موافق آیہ کریمہ

اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی[1] کے ہر یک ذرہ ذرہ اپنی طبیعت اور روحانیت سے اس کا حکم بردار ہے۔ اس کی طرف جھکنے کے لئے ہر یک طبیعت میں ایک کشش پائی جاتی ہے اس کشش سے ایک ذرّہ بھی خالی نہیں اور یہ ایک بڑی دلیل اس بات پر ہے کہ وہ ہر یک چیز کا خالق ہے کیونکہ نور قلب اس بات کو مانتا ہے کہ وہ کشش جو اس کی طرف جھکنے کے لئے تمام چیزوں میں پائی جاتی ہے وہ بلاشبہ اسی کی طرف سے ہے جیسا کہ قرآن شریف نے اس آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ یعنی ہر یک چیز اس کی پاکی اور اس کے محامد بیان کر رہی ہے۔ اگر خدا ان چیزوں کا خالق نہیں تھا تو ان چیزوں میں خدا کی طرف کشش کیوں پائی جاتی ہے۔ ایک غور کرنے والا انسان ضرور اس بات کو قبول کر لے گا کہ کسی مخفی تعلق کی وجہ سے یہ کشش ہے۔

(رسالہ معیار المذاہب (مشمولہ نور القرآن ۲/۱) صفحہ ۲۰-۲۱)

ذرہ ذرہ زمین کا اور آسمان کا خدا کی تحمید اور تقدیس کر رہا ہے اور جو کچھ ان میں ہے وہ تحمید اور تقدیس میں مشغول ہے۔ پہاڑ اس کے ذکر میں مشغول ہیں۔ دریا اس کے ذکر میں مشغول ہیں۔ درخت اس کے ذکر میں مشغول ہیں اور بہت سے راست باز اس کے ذکر میں مشغول ہیں۔ اور جو شخص دل اور زبان کے ساتھ اس کے ذکر میں مشغول نہیں اور خدا کے آگے فروتنی نہیں کرتا اُس سے طرح طرح کے شکنجوں اور عذابوں سے قضا و قدر الٰہی فروتنی کرا رہی ہے اور جو کچھ فرشتوں کے بارے میں خدا کی کتاب میں لکھا ہے کہ وہ نہایت درجہ اطاعت کر رہے ہیں۔ یہی تعریف زمین کے پات پات اور ذرّہ ذرّہ کی نسبت قرآن شریف میں موجود ہے کہ ہر ایک چیز اُس کی اطاعت کر رہی ہے۔ ایک پتّہ بھی بجز اس کے امر کے گر نہیں سکتا اور بجز اس کے حکم کے نہ کوئی دوا شفا دے سکتی ہے اور نہ کوئی غذا موافق ہو سکتی ہے اور ہر ایک چیز غایت درجہ کی تذلّل اور عبودیت سے خدا کے آستانہ پر گری ہوئی ہے اور اس کی فرماں برداری میں مستغرق ہے۔ پہاڑوں اور زمین کا ذرّہ ذرّہ اور دریاؤں اور سمندروں کا قطرہ قطرہ اور درختوں اور بوٹیوں کا پات پات اور ہر ایک جُز اُن کا اور انسان اور حیوانات کے کُل ذرّات خدا کو پہچانتے ہیں اور اس کی اطاعت کرتے ہیں اور اس کی تحمید و تقدیس میں مشغول ہیں۔ (کشتی نوح صفحہ ۲۹-۳۰)

خدا تعالیٰ نے جو ملائکہ کی تعریف کی ہے وہ ہر ایک ذرہ ذرہ پر صادق آسکتی ہے جیسے فرمایا اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ .... ہر ایک ذرّہ ملائکہ میں داخل ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

یہ ہوا۔ پانی۔ آگ وغیرہ بھی ایک طرح کے ملائکہ ہی ہیں۔ ہاں بڑے بڑے ملائکہ وہ ہیں جن کا اللہ تعالیٰ نے نام لیا۔ مگر اس کے سوا باقی اشیاء مفید بھی ملائکہ ہی ہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کے کلام سے اس کی تصدیق ہوتی ہے

---

[1] الاعراف آیت ۱۷۳

جہاں فرماتا ہے کہ وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ الخ یعنی کُل اشیاء خدا تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہیں۔ تسبیح کے معنے یہی ہیں کہ جو خدا ان کو حکم کرتا ہے اور جس طرح اُس کا منشا ہوتا ہے وہ اسی طرح کرتے ہیں اور ہر ایک امر اس کے ارادے اور منشا سے واقع ہوتا ہے۔ اتفاقی طور سے دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کا ذرہ ذرہ پر تصرف تام اور اقتدار نہ ہو تو وہ خدا ہی کیا ہوا اور دعا کی قبولیت کی اس سے کیا امید ہو سکتی ہے اور حقیقت یہی ہے کہ وہ ہوا کو جدھر چاہے اور جب چاہے چلا سکتا ہے اور جب ارادہ کرے بند کر سکتا ہے۔ اُسی کے ہاتھ میں پانی اور پانیوں کے سمندر ہیں جب چاہے جوش زن کر دے اور جب چاہے ساکن کر دے وہ ذرہ ذرہ پر قادر اور مقتدر خدا ہے اس کے تصرف سے کوئی چیز باہر نہیں۔ وہ جنہوں نے دعا سے انکار ہی کر دیا ہے ان کو بھی یہی مشکلات پیش آئے ہیں کہ انہوں نے خدا کو ہر ذرہ پر قادر مطلق نہ جانا اور اکثر واقعات کو اتفاقی مانا۔ اتفاق کچھ بھی نہیں بلکہ جو ہوتا ہے اور اگر پتہ بھی درخت سے گرتا ہے تو وہ بھی خدا کے ارادے اور حکمت سے گرتا ہے اور یہ سب ملائکہ ہیں کہ خدا تعالیٰ کے حکم کے اشارے سے کام کرتے ہیں اور ان کی خدمت میں لگائے جاتے ہیں جو خدا کے سچے فرماں بردار اور اس کی رضا کے خواہاں ہوتے ہیں۔ جو خدا کا بن جاتا ہے اُسے خدا سب کچھ عطا کرتا ہے ؎

جے توں میرا ہو رہیں سب جگ تیرا ہو

مَنۡ کَانَ لِلّٰہِ کَانَ اللّٰہُ لَہٗ پھر ایسے مرتبے کے بعد انسان کو وہ رعیت ملتی ہے کہ باغی نہیں ہوتی۔ دنیوی بادشاہوں کی رعیت تو باغی بھی ہو جاتی ہے مگر ملائکہ کی رعیت ایک ایسی رعیت ہے کہ وہ باغی نہیں ہوتی۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۶،۷)

جو لوگ ملائک سے انکار کرتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں ان کو اتنا معلوم نہیں کہ در اصل جس قدر اشیا دنیا میں موجود ہیں ذرّہ ذرّہ پر ملائکہ کا اطلاق ہوتا ہے اور میں یہی سمجھتا ہوں کہ بغیر اس کے اِذن کے کوئی چیز اپنا اثر نہیں کر سکتی یہاں تک کہ پانی کا ایک قطرہ بھی اندر نہیں جا سکتا اور نہ وہ مؤثر ہو سکتا ہے وَ اِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ کے یہی معنے ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲)

۴۸ نَحۡنُ اَعۡلَمُ بِمَا یَسۡتَمِعُوۡنَ بِہٖۤ اِذۡ یَسۡتَمِعُوۡنَ اِلَیۡکَ وَ اِذۡ ہُمۡ نَجۡوٰۤی اِذۡ یَقُوۡلُ الظّٰلِمُوۡنَ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا ۝

ایسی بات، کہ آنحضرت صلعم پر (معاذ اللہ) جادو کا اثر ہو گیا تھا اس سے تو ایمان اُٹھ جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِذۡ یَقُوۡلُ الظّٰلِمُوۡنَ اِنۡ تَتَّبِعُوۡنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسۡحُوۡرًا ایسی ایسی باتیں کہنے والے تو ظالم ہیں نہ کہ

مسلمان۔ یہ تو بے ایمانوں اور ظالموں کا قول ہے کہ آنحضرت صلعم پر (معاذ اللہ) سحر اور جادو کا اثر ہو گیا تھا۔ اتنا نہیں سوچتے کہ جب (معاذ اللہ) آنحضرتؐ کا یہ حال ہے تو پھر امت کا کیا ٹھکانا وہ تو پھر غرق ہو گئی۔ معلوم نہیں ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جس معصوم نبی صلعم کو تمام انبیاء مس شیطان سے پاک سمجھتے آئے ہیں یہ ان کی شان میں ایسے ایسے الفاظ بولتے ہیں۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

۵۷۔ قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا۝

مشرکین اور منکرین وجود حضرت باری کو کہہ کہ اگر خدا کے کارخانہ میں کوئی اور لوگ بھی شریک ہیں یا اسباب موجودہ ہی کافی ہیں تو اس وقت کہ تم اسلام کے دلائل حقیت اور اس کی شوکت اور قوت کے مقابلہ پر مقہور ہو رہے ہو اُن اپنے شرکاء کو مدد کے لئے بلاؤ اور یاد رکھو کہ وہ ہرگز تمہاری مشکل کشائی نہ کریں گے اور نہ بلا کو تمہارے سر پر سے ٹال سکیں گے۔ اے رسول ان مشرکین کو کہہ کہ تم اپنے شرکاء کو جن کی پرستش کرتے ہو میرے مقابلہ پر بلاؤ اور جو تدبیر میرے مغلوب کرنے کے لئے کر سکتے ہو وہ سب تدبیریں کرو اور مجھے ذرہ مہلت مت دو اور یہ بات سمجھ رکھو کہ میرا حامی اور ناصر اور کارساز وہ خدا ہے جس نے قرآن کو نازل کیا ہے اور وہ اپنے سچے اور صالح رسولوں کی آپ کارسازی کرتا ہے مگر جن چیزوں کو تم لوگ اپنی مدد کے لئے پکارتے ہو وہ ممکن نہیں ہے جو تمہاری مدد کر سکیں اور نہ کچھ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۴۲ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۲)

۵۹۔ وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا۝

فَالْحَاصِلُ اَنَّ الطَّاعُوْنَ قَدْ لَازَمَ هٰذِهِ الدِّيَارَ مُلَازَمَةَ الْغَرِيْمِ اَوِ الْكَلْبِ لِاَصْحَابِ الرَّقِيْمِ۔ وَمَا اَظُنُّ اَنْ يُّعْدَمَ قَبْلَ سِنِيْنَ۔ وَقَدْ قِيْلَ عُمْرُ هٰذِهِ الْاٰفَةِ اِلٰى سَبْعِيْنَ

(ترجمہ از مرتب) حاصل کلام یہ ہے کہ طاعون اس ملک کو اس طرح چمٹ گئی ہے جس طرح ایک قرض خواہ قرض دار کو چمٹ جاتا ہے یا جس طرح اصحاب کہف کا کتا ان کے ساتھ چمٹ گیا تھا۔ اور میں خیال کرتا ہوں کہ یہ وبا چند سال تک چلتی چلی جائے گی لیعض

وَ اِنَّهَا هِيَ النَّارُ الَّتِيْ جَآءَ ذِكْرُهَا فِيْ قَوْلِ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ وَ فِي الْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَ اِنَّهَا خَرَجَتْ مِنَ الْمَشْرِقِ كَمَا رُوِيَ عَنْ خَيْرِ الْمُرْسَلِيْنَ۔ وَ سَتُحِيْطُ بِكُلِّ مَعْمُوْرَةٍ مِّنَ الْاَرَضِيْنَ وَ كَذٰلِكَ جَآءَ فِيْ كُتُبِ الْاَوَّلِيْنَ فَانْتَظِرْ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ۔ فَلَا تَسْئَلْ عَنْ اَمْرِهَا فَاِنَّهٗ عَسِيْرٌ وَّ غَضَبُ الرَّبِّ كَبِيْرٌ وَ فِيْ كُلِّ طَرَفٍ صُرَاخٌ وَّ زَفِيْرٌ وَ لَيْسَ هُوَ مَرَضٌ بَلْ سَعِيْرٌ وَّ تِلْكَ هِيَ دَآبَّةُ الْاَرْضِ الَّتِيْ تُكَلِّمُ النَّاسَ فَهُمْ يُجَرَّحُوْنَ۔ وَ اشْتَدَّ تَكْلِيْمُهَا فَيُغْتَالُ النَّاسُ وَ يُقْعَصُوْنَ بِمَا كَانُوْا بِاٰيَاتِ اللّٰهِ لَا يُؤْمِنُوْنَ كَمَا قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ وَ اِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا فَكَذٰلِكَ تُشَاهِدُوْنَ وَ ذٰلِكَ بِاَنَّ النَّاسَ كَانُوْا لَا يَتَّقُوْنَ۔ وَ كَانُوْا يُشِيْعُوْنَ الْفِسْقَ فِيْ اَرْضِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ وَ يَزْدَادُوْنَ اِثْمًا وَّ فَحْشَآءَ وَ لَا يَنْتَهُوْنَ وَ اِذَا قِيْلَ اسْمَعُوْا مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ لَكُمْ نَكَانُوْا عَلٰى اَعْقَابِهِمْ يَنْكُصُوْنَ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِعِقَابِهٖ هٰذَا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔ (مواہب الرحمٰن صفحہ ۲۷-۲۸)

لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس وبا کا زمانہ ستّر سال تک لمبا ہو سکتا ہے۔ اور یہ وہ آگ ہے جس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں اور اللہ تعالیٰ کے کلام قرآن مجید میں آیا ہے۔ اور یہ آگ مشرق سے نکلی ہے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اور عنقریب یہ ساری معمورہ زمین پر محیط ہو جائے گی اور ایسا ہی پہلی کتابوں میں بھی آیا ہے۔ پس انتظار کر یہاں تک کہ تجھے یقین پیدا ہو جائے اور اس کے متعلق بحث نہ کر کیونکہ بحث باعثِ مشکلات ہے۔ اور اللہ کا غضب بہت سخت ہے اور ہر طرف نالہ و فریاد ہو رہی ہے۔ درحقیقت طاعون بیماری نہیں بلکہ بھڑکتی ہوئی آگ ہے۔ اور یہی وہ دابۃ الارض ہے جو لوگوں کو زخمی کر رہا ہے اور لوگ مجروح ہو رہے ہیں اور دابۃ الارض کا کاٹنا سخت ہو گیا ہے اور لوگ ناگہاں ہلاک اور تباہ ہو رہے ہیں کیونکہ وہ اللہ کے نشانات پر ایمان نہیں لاتے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَ اِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا یعنی رُوئے زمین پر کوئی ایسی بستی نہیں ہوگی جسے ہم قیامت کے دن سے پہلے ہلاک نہ کر دیں یا اسے بہت سخت عذاب نہ دیں۔ پس تم اِس آیت کے مطابق تباہی کو دیکھ رہے ہو اور یہ اِس وجہ سے ہے کہ لوگ تقویٰ اختیار نہیں کرتے اور اللہ تعالیٰ کی زمین میں فسق و فجور پھیلا رہے ہیں اور خدا سے نہیں ڈرتے اور گناہوں اور بے حیائی میں بڑھتے جا رہے ہیں اور باز نہیں آ رہے۔ اور جب انہیں کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے اُتارا ہے اُسے سُنو تو وہ ایڑیوں کے بل پھر جاتے ہیں پس اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے عذاب کے ساتھ پکڑ لیا تا کہ وہ باز آ جائیں ۔

طاعون کی خبر قرآن شریف میں صریح لفظوں میں موجود ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا یعنی قیامت سے کچھ دن پہلے بہت سخت مری پڑے گی اور اس سے بعض دیہات تو بالکل نابود ہو جاویں گے اور بعض ایک حد تک عذاب اٹھا کر بچ رہیں گے۔

(لیکچر سیالکوٹ ص۴۸)

کوئی ایسی بستی نہیں جس کو ہم قیامت سے کچھ مدت پہلے ہلاک نہیں کریں گے یا کسی حد تک اس پر عذاب وارد نہیں کریں گے سو یہی وہ زمانہ ہے کیونکہ طاعون اور زلزلوں اور طوفان اور آتش فشاں پہاڑوں کے صدمات اور باہمی جنگوں سے لوگ ہلاک ہو رہے ہیں اور اس قدر اسباب موت کے اس زمانہ میں جمع ہوئے ہیں اور اس شدت سے وقوع میں آئے ہیں کہ اس مجموعی حالت کی نظیر کسی پہلے زمانہ میں پائی نہیں جاتی۔ (حقیقۃ الوحی ص۱۹۹)

قرآن شریف میں یہ بھی پیشگوئی ہے وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا یعنی کوئی ایسی بستی نہیں جس کو ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں گے یا اُس پر شدید عذاب نازل نہ کریں گے یعنی آخری زمانہ میں ایک سخت عذاب نازل ہوگا اور دوسری طرف یہ فرمایا وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا[1] پس اِس سے بھی آخری زمانہ میں ایک رسول کا مبعوث ہونا ظاہر ہوتا ہے اور وہی مسیح موعود ہے۔

(تتمہ حقیقۃ الوحی ص۶۵)

کوئی بستی ایسی نہیں ہوگی جس کو ہم کچھ مدت پہلے قیامت سے یعنی آخری زمانہ میں جو مسیح موعود کا زمانہ ہے ہلاک نہ کر دیں یا عذاب میں مبتلا نہ کریں۔ (نزول المسیح ص۱)

کوئی بستی اور کوئی گاؤں ایسا نہ ہوگا کہ جسے ہم قیامت سے پہلے خطرناک عذاب میں مبتلا نہ کر دیں گے یا ہلاک نہ کر دیں گے۔

غرضکہ یہ منذر نشان ہے۔ کسوف و خسوف کا نشان لوگوں نے ہنستے ہوئے دیکھا اور طاعون کا نشان روتے ہوئے بعض نادان اعتراض کرتے ہیں کہ تمہارے آدمی کیوں مرتے ہیں۔ ان نادانوں کو اتنا معلوم نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں بھی جب لوگ عذاب کا معجزہ مانگتے تھے تو ان کو تلوار کا معجزہ ملا اور یہ بھی ایک قسم کا عذاب تھا۔ چنانچہ کئی صحابہ بھی تلوار سے شہید ہوئے مگر کیا ابوبکر و عمر جیسے بھی ہلاک ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے جس جس انسان کے دماغ یا ہاتھ سے کوئی اپنا کام لینا ہے وہ تو بچ ہی رہے اور بالمقابل جتنے رئیس کفار تھے اُن سب کا ٹھکانا جہنم ہوا اور ان کے صغیر و کبیر سب کے سب ہلاک ہو گئے۔

---

[1] بنی اسرائیل آیت ۱۶

اگر ایک شخص کا ایک پیسہ چوری ہوگیا ہے اور دوسرے کا تمام گھربار لُوٹا گیا ہے تو کیا وہ آدمی جس کا تمام گھربار لُوٹا گیا پیسے والے کو کہہ سکتا ہے کہ تم اور مَیں برابر ہیں۔ بھلا سوچو تو سہی کہ اگر ستّر برس تک ہمارا کوئی آدمی ہلاک نہ ہو تو ایسا کوئی آدمی ہے جو ہمارے سلسلہ میں داخل ہونے سے رُکا رہے۔

مگر اللہ تعالیٰ کو یہ امر منظور نہیں ہے اور نہ کبھی ایسا ہوا۔ ایمان کی حالت ہی کا پوشیدہ ہونا ضروری ہے جبتک ہماری جماعت تقویٰ اختیار نہ کرے نجات نہیں پا سکتی۔ خدا تعالیٰ اپنی حفاظت میں نہ لے گا یہی سبب ہے کہ بعض ان صحابہ میں سے جن جن سے بڑے بڑے کام لینے تھے وہ سب سخت سے سخت خطروں میں بھی بچائے گئے دوسروں کو خدا نے جلد اٹھا کر بہشت میں داخل کیا۔ جاہل کو حقیقت معلوم نہیں ہوتی جو بات منہ میں آئی کہہ دی۔ ہر ایک نبی کے ساتھ ایسا ہوتا رہا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۷ر جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۸)

یہ اسی زمانہ کے لئے ہے کیونکہ اس میں ہلاکت اور عذاب مختلف پیرایوں میں ہے کہیں طوفان ہے کہیں زلزلوں سے کہیں آگ کے لگنے سے۔ اگرچہ اس سے پیشتر بھی یہ سب باتیں دنیا میں ہوتی رہی ہیں مگر آج کل ان کی کثرت خارق عادت کے طور پر ہو رہی ہے جس کی وجہ سے یہ ایک نشان ہے۔ اس آیت میں طاعون کا نام نہیں ہے صرف ہلاکت کا ذکر ہے خواہ کسی قسم کی ہو۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس قوت اور پوری توجہ سے لوگوں نے دنیا اور اس کے ناجائز وسائل کو مقدم رکھا ہوا ہے اور عظمت الٰہی کو دلوں سے اٹھا دیا ہے۔ اب صرف وعظوں کا کام نہیں ہے کہ اس کا علاج کر سکیں عذاب الٰہی کی ضرورت ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۵ مورخہ ۱۰ر فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

پھر مسیح موعود کے وقت کا ایک نشان طاعون کا تھا۔ انجیل توریت میں بھی یہ نشان موجود تھا اور قرآن شریف سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ نشان مسیح موعود کا خدا تعالیٰ نے ٹھیرایا تھا چنانچہ فرمایا وَ اِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا یہ باتیں معمولی نہیں ہیں بلکہ غور سے سمجھنے کے لائق ہیں اور اب دیکھ لو کہ کیا طاعون ملک میں پھیلی ہوئی ہے یا نہیں؟ اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۶ مورخہ ۱۷ر جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

پھر قرآن شریف میں ایک اور نشان بتایا گیا تھا کہ اس زمانہ میں طاعون کثرت سے پھیلے گا۔ احادیث میں بھی یہ پیشگوئی تھی۔ قرآن مجید میں لکھا تھا اِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا اور دوسری جگہ صاف طور پر بتایا گیا تھا کہ وہ ایک زمینی کیڑا ہوگا (دابۃ الارض) آخری زمانہ میں بہت سے لوگ اس سے مریں گے۔ اب کوئی بتائے کہ کیا اس نشان کے پورا ہونے میں کوئی شک و شبہ باقی رہ گیا ہے؟

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ر جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جب قیامت قریب آجائے گی تو عام طور پر موت کا دروازہ کھولا

جاوے گا۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۷ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

اس کے یہی معنے ہیں کہ طاعون آخری زمانہ میں تمام جہان میں دورہ کرے گی۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۱ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۲)

طاعون کے ذکر پر فرمایا کہ اس عذاب کی اللہ کریم نے پہلے ہی سے قرآن مجید میں خبر دے رکھی ہے جیسے فرمایا وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا اور پھر ساتھ ہی قرآن مجید میں یہ بھی لکھا ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا۔[1]

اگر ان دونوں آیتوں کو ملا کر پڑھا جاوے تو صاف ایک رسول کی نسبت پیشگوئی معلوم ہوتی ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ رسول کا آنا اس زمانہ میں ضروری ہے۔ یہ کہنا کہ فلاں فلاں رسول کے زمانہ میں یہ یہ عذاب آئے۔ ان لوگوں کے خیال کے بموجب تو جب کُل دُنیا میں عذاب شروع ہو گیا اس وقت کوئی رسول نہ آیا تو اس بات کا کیا اعتبار رہا کہ پہلے زمانہ میں جو عذاب آئے تھے اُن رسولوں کے انکار سے ہی آئے تھے۔ کیسی صاف بات تھی کہ آخری زمانہ میں سخت عذاب آئیں گے اور ساتھ ہی لکھا تھا کہ جب تک رسول مبعوث نہ کر لیں عذاب نہیں بھیجتے ہیں اس سے بڑھ کر صاف پیشگوئی اور کیا ہو سکتی ہے۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

طاعون کا عذاب دو طرح پر ہوگا کوئی بستی اس سے خالی نہیں رہے گی بعض تو ایسی ہوں گی کہ جن کو ہم بالکل ہلاک کر دیں گے یعنی وہ اُجڑ کر بالکل غیر آباد ہو جائیں گی اور ویرانہ اور تھہ (اجڑے ہوئے کھنڈرات) ہو جائیں گی۔ ان کا کوئی نشان بھی نہ رہے گا لوگ تلاش کرتے پھریں گے کہ اس جگہ فلاں بستی آباد تھی لیکن پھر بھی پتہ نہ ملے گا۔ گویا طاعون وہاں جاروب دے کر اس کو دنیا سے صاف کر دے گی اور کوئی آثار اس کے نہ چھوڑے گی۔ بعض قریئے ایسے ہوں گے کہ جن کو کم وبیش عذاب کر کے چھوڑ دیا جائے گا اور صفحۂ دنیا سے اُن کا نام نہ مٹایا جائے گا صرف سرزنش کے طور پر کچھ عذاب اُن میں نازل کیا جائے گا اور تازیانہ کر کے عذاب ہٹا لیا جائے گا۔ دوسرے بہت سے شہر فنا ہوں گے مگر وہ فنا نہ ہوں گے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قادیان کو اسی قسم میں شامل کیا ہے اور اس الہام اِنَّهٗ اٰوَى الْقَرْيَةَ سے مراد یہی ہے کہ اور بستیوں کی طرح ہمارے گاؤں کو طاعون جارف بالکل تباہ نہ کرے گی کہ لوگ تلاش کرتے پھریں کہ کہاں قادیان واقع تھی۔ اللہ تعالیٰ نے وعدہ کیا ہے کہ ان بستیوں کی طرح خدا اس کو تباہ نہ کرے گا بلکہ یہ بچی رہے گی اِلّا بطور تازیانہ کچھ سزا دے کر اُس کو بچا لیا جائے گا۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۲۵ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

یوں تو قیامت سے پہلے ہر ایک بستی کو ہم نے ہی ہلاک کرنا ہے یا عذاب شدید نازل کرنا ہے۔ یہی کتاب میں

---

[1] بنی اسرائیل آیت ۱۶

مندرج ہو چکا ہے۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور اُن کے جوابات صہ۱۳)

وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ اِلَّآ اَنْ كَذَّبَ بِهَا الْاَوَّلُوْنَ ۭ وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا ۭ وَمَا نُرْسِلُ بِالْاٰيٰتِ اِلَّا تَخْوِيْفًا

ہم بعض ان گذشتہ قہری نشانوں کو (جو عذاب کی صورت میں پہلی اُمتوں پر نازل ہو چکے ہیں) اس لئے نہیں بھیجتے جو پہلی امت کے لوگ اس کی تکذیب کر چکے ہیں چنانچہ ہم نے ثمود کو بطور نشان کے جو مقدمہ عذاب کا تھا ناقہ دیا جو حق نما نشان تھا (جس پر انہوں نے ظلم کیا یعنی وہی ناقہ جس کی بسیار خوری اور بسیار نوشی کی وجہ سے شہر حجر کے باشندوں کے لئے جو قوم ثمود میں سے تھے پانی تالاب وغیرہ کا پینے کے لئے باقی رہا تھا اور نہ اُن کے مویشی کے لئے کوئی چراگاہ رہی تھی اور ایک سخت تکلیف اور رنج اور بلا میں گرفتار ہو گئی تھی) اور قہری نشانوں کے نازل کرنے سے ہماری غرض یہی ہوتی ہے کہ لوگ ان سے ڈریں یعنی قہری نشان تو صرف تخویف کے لئے دکھلائے جاتے ہیں پس ایسے قہری نشانوں کے طلب کرنے سے کیا فائدہ جو پہلی امتوں نے دیکھ کر انہیں جھٹلا دیا اور ان کے دیکھنے سے کچھ بھی خائف و ہراساں نہ ہوئے۔

اس جگہ واضح ہو کہ نشان دو قسم کے ہوتے ہیں ۱۔ نشان تخویف و تعذیب جن کو قہری نشان بھی کہہ سکتے ہیں ۲۔ نشان تبشیر و تسکین جن کو نشان رحمت سے بھی موسوم کر سکتے ہیں۔ تخویف کے نشان سخت کافروں اور کج دلوں اور نافرمانوں اور بے ایمانوں اور فرعونی طبیعت والوں کے لئے ظاہر کئے جاتے ہیں تا وہ ڈریں اور خدائے تعالیٰ کی قہری اور جلالی ہیبت اُن کے دلوں پر طاری ہو اور تبشیر کے نشان اُن حق کے طالبوں اور مخلص مومنوں اور سچائی کے متلاشیوں کے لئے ظہور پذیر ہوتے ہیں جو دل کی غربت اور فروتنی سے کامل یقین اور زیادت ایمان کے طلبگار ہیں اور تبشیر کے نشانوں سے ڈرانا اور دھمکانا مقصود نہیں ہوتا بلکہ اپنے ان مطیع بندوں کو مطمئن کرنا اور ایمانی اور یقینی حالات میں ترقی دینا اور ان کے مضطرب سینہ پر دست شفقت و تسلّی رکھنا مقصود ہوتا ہے سو مومن قرآن شریف کے وسیلہ سے ہمیشہ تبشیر کے نشان پاتا رہتا ہے اور ایمان اور یقین میں ترقی کرتا جاتا ہے تبشیر کے نشانوں سے مومن کو تسلّی ملتی ہے اور وہ اضطراب جو فطرتاً انسان میں ہے جاتا رہتا ہے اور سکینت دل پر نازل ہوتی ہے مومن برکت اتباع کتاب اللہ اپنی عمر کے آخری دن تک تبشیر کے نشانوں کو پاتا رہتا ہے اور تسکین اور آرام بخشنے والے نشان اس پر

نازل ہوتے رہتے ہیں تا وہ یقین اور معرفت میں بے نہایت ترقیاں کرتا جائے اور حق الیقین تک پہنچ جائے اور تبشیر کے نشانوں میں ایک لطف یہ ہوتا ہے کہ جیسے مومن اُن کے نزول سے یقین اور معرفت اور قوتِ ایمان میں ترقی کرتا ہے ایسا ہی وہ بوجہ مشاہدہ آلاء و نعماء الٰہی و احسانات ظاہرہ و باطنہ و جلیہ و خفیہ حضرت باری عزّ اسمہٗ جو تبشیر کے نشانوں میں بھرے ہوئے ہوتے ہیں محبت اور عشق میں بھی دن بدن بڑھتا جاتا ہے سو حقیقت میں عظیم الشان اور قوی الاثر اور مبارک اور موصل الی المقصود تبشیر کے نشان ہی ہوتے ہیں جو سالک کو معرفت کاملہ اور محبت ذاتیہ کی اس مقام تک پہنچا دیتے ہیں جو اولیاء اللہ کے لئے منتہی المقامات ہے اور قرآن شریف میں تبشیر کے نشانوں کا بہت کچھ ذکر ہے یہاں تک کہ اُس نے اُن نشانوں کو محدود نہیں رکھا بلکہ ایک دائمی وعدہ دے دیا ہے کہ قرآن شریف کے سچے متبع ہمیشہ اُن نشانوں کو پاتے رہیں گے جیسا کہ وہ فرماتا ہے لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝[1] یعنی ایماندار لوگ، دنیوی زندگی اور آخرت میں بھی تبشیر کے نشان پاتے رہیں گے جن کے ذریعے سے وہ دنیا اور آخرت میں معرفت اور محبت کے میدانوں میں ناپیدا کنار ترقیاں کرتے جائیں گے۔ یہ خدا کی باتیں ہیں جو کبھی نہیں ٹلیں گی اور تبشیر کے نشانوں کو پالینا یہی فوز عظیم ہے (یعنی یہی ایک امر ہے جو محبت اور معرفت کے منتہی مقام تک پہنچا دیتا ہے) .... اگر خدائے تعالیٰ کے کل نشانوں کو قہری نشانوں میں ہی محصور سمجھ کر اس آیت کے یہ معنے کئے جائیں کہ ہم تمام نشانوں کو محض تخویف کی غرض سے ہی بھیجا کرتے ہیں اور کوئی دوسری غرض نہیں ہوتی تو یہ معنی بہ بداہت باطل ہیں جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا ہے کہ نشان دو غرضوں سے بھیجے جاتے ہیں یا تخویف کی غرض سے یا تبشیر کی غرض سے۔ انہیں دو قسموں کو قرآن شریف اور بائبل بھی جابجا ظاہر کر رہی ہے پس جبکہ نشان دو قسم کے ہوئے تو آیت ممدوحہ بالا میں جو لفظ الاٰیٰت ہے (جس کے معنے وہ نشانات) بہر حال اسی تاویل پر بصحت منطبق ہوگا کہ نشانوں سے قہری نشان مراد ہیں کیونکہ اگر یہ معنی نہ لئے جائیں تو پھر اس سے یہ لازم آتا ہے کہ تمام نشانات جو تحت قدرت الٰہی داخل ہیں تخویف کے قسم میں ہی محصور ہیں حالانکہ فقط تخویف کی قسم میں ہی سارے نشانوں کا حصر سمجھنا سراسر خلاف واقعہ ہے کہ جو نہ کتاب اللہ کی رُو سے اور نہ عقل کی رُو سے اور نہ کسی پاک دل کے کانشنس کی رُو سے درست ہو سکتا ہے۔

اب چونکہ اس بات کا صاف فیصلہ ہو گیا کہ نشانوں کے دو قسموں میں سے صرف تخویف کے نشانوں کا آیات موصوفہ بالا میں ذکر ہے تو یہ دوسرا امر تنقیح طلب باقی رہا کہ کیا اس آیت کے (جو مَا مَنَعَنَآ الخ ہے) یہ معنے سمجھنے چاہئیں کہ تخویف کا کوئی نشان خدائے تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ظاہر نہیں کیا یا یہ معنی سمجھنے چاہئیں کہ تخویف

---

[1] یونس آیت ۶۵ ؎

کے نشانوں میں سے وہ نشان ظاہر نہیں کئے گئے جو پہلی امتوں کو دکھلائے گئے تھے اور یا یہ تیسرے معنی قابل اعتبار ہیں کہ دونو قسم کے تخویف کے نشان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے ظاہر ہوتے رہے ہیں بجز اُن خاص قسم کے بعض نشانوں کے جن کو پہلی اُمتوں نے دیکھ کر جھٹلایا تھا اور ان کو معجزہ نہیں سمجھا تھا۔

سو واضح ہو کہ آیات متنازعہ فیہا پر نظر ڈالنے سے یہ تمام تر صفائی کھل جاتا ہے کہ پہلے اور دوسرے معنی کسی طرح درست نہیں کیونکہ آیت ممدوحہ بالا کے (معنی) یہ سمجھ لینا کہ تمام انواع و اقسام کے وہ تخویفی نشان جو ہم بھیج سکتے ہیں اور تمام وہ وراء الورا تعذیبی نشان جن کے بھیجنے پر غیر محدود طور پر ہم قادر ہیں اس لئے ہم نے نہیں بھیجے کہ پہلی امتیں اس کی تکذیب کر چکی ہیں یہ معنی سراسر باطل ہیں کیونکہ ظاہر ہے کہ پہلی امتوں نے انہیں نشانوں کی تکذیب کی جو انہوں نے دیکھے تھے۔ وجہ یہ کہ تکذیب کے لئے یہ ضرور ہے کہ جس چیز کی تکذیب کی جائے اوّل اس کا مشاہدہ بھی ہو جائے جس نشان کو ابھی دیکھا ہی نہیں اس کی تکذیب کیسی۔ حالانکہ نادیدہ نشانوں میں سے ایسے اعلیٰ درجے کے نشان بھی تحت قدرت باری تعالیٰ ہیں جن کی کوئی انسان تکذیب نہ کر سکے اور سب گردنیں اُن کی طرف جُھک جائیں کیونکہ خدائے تعالیٰ ہر ایک رنگ کا نشان دکھلانے پر قادر ہے۔ اور پھر چونکہ نشانہائے قدرت باری غیر محدود اور غیر متناہی ہیں تو پھر یہ کہنا کیونکر درست ہو سکتا ہے کہ محدود زمانہ میں وہ سب دیکھے بھی گئے اور ان کی تکذیب بھی ہو گئی۔ وقت محدود میں تو وہی چیز دیکھی جائے گی جو محدود ہو گی۔ بہر حال اس آیت کے یہی معنے صحیح ہوں گے کہ جو بعض نشانات پہلے کفار دیکھ چکے تھے اور ان کی تکذیب کر چکے تھے اُن کا دوبارہ بھیجنا عبث سمجھا گیا جیسا کہ قرینہ بھی انہی معنوں پر دلالت کرتا ہے یعنی اس موقعہ پر جو ناقہ ثمود کا خدائے تعالیٰ نے ذکر کیا وہ ذکر ایک بھاری قرینہ اس بات پر ہے کہ اس جگہ گذشتہ اور رد کردہ نشانات کا ذکر ہے جو تخویف کے نشانوں میں سے تھے اور یہی تیسرے معنی ہیں جو صحیح اور درست ہیں۔

پھر اس جگہ ایک اور بات منصفین کے سوچنے کے لائق ہے جس سے اُن پر ظاہر ہو گا کہ آیت وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ الخ سے ثبوت معجزات ہی پایا جاتا ہے نہ نفی معجزات کیونکہ الْاٰیٰتِ کے لفظ پر جو الف لام واقعہ ہے وہ بموجب قواعد نحو کے دو صورتوں سے خالی نہیں یا کُل کے معنی دے گا یا خاص کے۔ اگر کُل کے معنی دے گا تو یہ معنی کئے جائیں گے کہ ہمیں کُل معجزات کے بھیجنے سے کوئی امر مانع نہیں ہوا مگر اگلوں کا اُن کو جھٹلانا اور اگر خاص کے معنی دیگا تو یہ معنی ہوں گے کہ ہمیں ان خاص نشانیوں کے بھیجنے سے (جنہیں منکر طلب کرتے ہیں) کوئی امر مانع نہیں ہوا مگر یہ کہ ان نشانیوں کو اگلوں نے جھٹلایا بہر حال ان دونوں صورتوں میں نشانوں کا آنا ثابت ہوتا ہے کیونکہ اگر یہ معنی ہوں کہ ہم نے ساری نشانیاں بوجہ تکذیب اُمم گزشتہ نہیں بھیجیں تو اس سے بعض نشانوں کا بھیجنا ثابت ہوتا ہے جیسے مثلاً اگر کوئی کہے کہ میں نے اپنا سارا مال زید کو نہیں دیا تو اُس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اُس نے کچھ حصہ اپنے مال کا زید کو ضرور دیا ہے۔ اور اگر یہ معنی لیں کہ بعض خاص نشان ہم نے نہیں بھیجے تو بھی بعض دیگر کا بھیجنا ثابت ہے مثلاً اگر

کوئی کہے کہ بعض خاص چیزیں مَیں نے زید کو نہیں دیں تو اس سے صاف پایا جائے گا کہ بعض دیگر ضرور دی ہیں بہرحال جو شخص اوّل اس آیت کے سیاق و سباق کی آیتوں کو دیکھے کہ کیسی وہ دونو طرف سے عذاب کے نشانوں کا قصہ بتلا رہی ہیں اور پھر ایک دوسری نظر اُٹھاوے اور خیال کرے کہ کیا یہ معنی صحیح اور قرین قیاس ہیں کہ خدائے تعالیٰ کے تمام نشانوں اور عجائب کاموں کی جو اُس کی بے انتہا قدرت سے وقتاً فوقتاً پیدا ہونے والے اور غیر محدود ہیں پہلے لوگ اپنے محدود زمانہ میں تکذیب کر چکے ہوں اور پھر ایک تیسری نظر منصفانہ سے کام لے کر سوچے کہ کیا اس جگہ تخویف کے نشانوں کا ایک خاص بیان ہے یا تبشیر اور رحمت کے نشانوں کا بھی کچھ ذکر ہے۔ اور پھر ذرا چوتھی نگاہ الآیت کے ال پر بھی ڈال دیوے کہ وہ کن معنوں کا افادہ کر رہا ہے تو اس چار طور کی نظر کے بعد بجز اس کے کہ کوئی تعصب کے باعث حق پسندی سے بہت دور جا پڑا ہو۔ ہر ایک شخص اپنے اندر سے نہ ایک شہادت بلکہ ہزاروں شہادتیں پائے گا کہ اس جگہ نفی کا حرف صرف نشانوں کے ایک قسم خاص کی نفی کے لئے آیا ہے جس کا دوسرے اقسام پر کچھ اثر نہیں بلکہ اُس سے اُن کا متحقق الوجود ہونا ثابت ہو رہا ہے اور ان آیات میں نہایت صفائی سے اللہ جلّ شانہٗ بتلا رہا ہے کہ اس وقت تخویفی نشان جن کی یہ لوگ درخواست کرتے ہیں صرف اس وجہ سے نہیں بھیجے گئے کہ پہلی امتیں ان کی تکذیب کر چکی ہیں۔ سو جو نشان پہلے ردّ کئے گئے اب بار بار انہی کو نازل کرنا کمزوری کی نشانی ہے اور غیر محدود قدرتوں والے کی شان سے بعید۔ پس ان آیات میں یہ صاف اشارہ ہے کہ عذاب کے نشان ضرور نازل ہوں گے مگر اور رنگوں میں۔ یہ کیا ضرورت ہے کہ وہی نشان حضرت موسیٰؑ کے یا وہی نشان حضرت نوحؑ اور قوم لوطؑ اور عاد اور ثمود کے ظاہر کئے جائیں۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات صفحہ ۱۴-۱۵)

۶۱ وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ؕ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ؕ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۝

بخاری میں جوامع الکتب بعد کتاب اللہ الباری ہے تمام معراج کا ذکر کر کے اخیر میں فَاسْتَيْقَظَ لکھا ہے اب تم خود سمجھ لو کہ وہ کیا تھا۔ قرآن مجید میں بھی اس کے لئے رُءْیَا کا لفظ ہے وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ۔

[بدر جلد ۷، نمبر ۱۹-۲۰ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵]

۶۵ وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ؕ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ۝

دُنیا میں بچے دو قسم کے پیدا ہوتے ہیں (۱) ایک جن میں نفخ رُوح القدس کا اثر ہوتا ہے اور ایسے بچے وہ ہوتے ہیں جب عورتیں پاک دامن اور پاک خیال ہوں اور اسی حالت میں استقرار نطفہ ہو وہ بچے پاک ہوتے ہیں اور شیطان کا ان میں حصہ نہیں ہوتا (۲) دوسری وہ عورتیں ہیں جن کے حالات اکثر گندے اور ناپاک رہتے ہیں پس انکی اولاد میں شیطان اپنا حصہ ڈالتا ہے جیسا کہ آیت وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ اسی کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس میں شیطان کو خطاب ہے کہ ان کے مالوں اور بچوں میں حصہ دار بن جا یعنی وہ حرام کے مال اکٹھا کریں گی اور ناپاک اولاد جنیں گی۔ (تحفہ گولڑویہ ص۱۱۹)

یاد رکھو ولادت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک ولادت تو وہ ہوتی ہے کہ اُس میں رُوحِ الٰہی کا جلوہ ہوتا ہے اور ایک وہ ہوتی ہے کہ اس میں شیطانی حصہ ہوتا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں بھی آیا ہے کہ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ یہ شیطان کو خطاب ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

فاسقوں فاجروں کی ارواح کو بسبب اُن کے فسق وفجور اور شرک کی گندگی کے رُوحٌ مِّنْهُ نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ رُوحُ الشَّيْطَانِ ہوتے ہیں جیسے فرمایا اللہ تعالیٰ (نے) وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ اور اس طرح سے ہم مانتے ہیں کہ بعض رُوحُ الشَّيْطَانِ ہوتے ہیں اور بعض رُوحٌ مِّنْهُ ہوتے ہیں۔

بعض آدمی ایسے خراب ہوتے ہیں کہ وہ نہایت ہی خبیث الفطرت اور شیطان خصلت ہوتے ہیں ان سے توقع ہی نہیں ہوسکتی کہ وہ کبھی رجوع الی اللہ کرسکیں۔ ایسے لوگوں پر رُوحٌ مِّنْهُ کا لفظ نہیں بولا جاتا بلکہ وہ رُوحُ الشَّيْطَانِ ہوتے ہیں۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

۶۶ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا ۝[1]

---

[1] مزید تفصیل کے لئے دیکھیں سورۃ الحجر آیت ۴۳

حدیثوں میں آیا ہے کہ عیسیٰ اور اُس کی ماں مسِ شیطان سے پاک ہیں۔ جاہل مولویوں نے اِس کے یہ معنے کر لئے کہ بجز حضرت عیسیٰ اور اُن کی ماں کے اَور کوئی نبی ہو یا رسول ہو مسِ شیطان سے پاک نہیں یعنی معصوم نہیں اور آیت اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ کو بھول گئے..... بات صرف اتنی تھی کہ اس حدیث میں بعض یہودیوں کا ذبّ اور دفع اعتراض منظور تھا۔ چونکہ وہ لوگ طرح طرح کے ناگفتنی بہتان حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ پر لگاتے تھے اِس لئے خدا کے پاک رسول نے گواہی دی کہ یہودیوں میں سے مسِ شیطان سے کوئی پاک نہ تھا اگر پاک تھے تو صرف حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ تھی۔ نعوذ باللہ اس حدیث کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ایک حضرت عیسیٰ اور اُن کی والدہ ہی معصوم ہیں اور اُن کے سوا کوئی نبی ہو یا رسول ہو مسِ شیطان سے معصوم نہیں ہے۔

(ایام الصلح صفحہ ۱۱۶-۱۱۷)

قرآن..... نے تو مسِ شیطان کی نسبت بھی تمام نبیوں اور رسولوں کو عصمت کے بارے میں مساوی حصّہ دیا ہے جبکہ کہا اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۲۵)

صحیح بخاری میں جو یہ حدیث ہے کہ بغیر عیسیٰ بن مریم کے کوئی مسِ شیطان سے محفوظ نہیں رہا اس جگہ فتح الباری میں اور نیز علّامہ زمخشری نے یہ لکھا ہے کہ اس جگہ تمام نبیوں میں سے صرف عیسیٰ کو ہی معصوم ٹھہرانا قرآن شریف کے نصوص صریحہ کے مخالف ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں یہ کہہ کر کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ تمام نبیوں کو معصوم ٹھہرایا ہے پھر عیسیٰ بن مریم کی کیا خصوصیت ہے اس لئے اس حدیث کے یہ معنے ہیں کہ تمام وہ لوگ جو بروزی طور پر عیسیٰ بن مریم کے رنگ میں ہیں یعنی رُوح القدس سے حصّہ لینے والے اور خدا سے پاک تعلق رکھنے والے وہ سب معصوم ہیں اور سب عیسیٰ بن مریم ہی ہیں اور حضرت عیسیٰ کی معصومیت کو خاص طور پر اس لئے ذکر کیا گیا ہے کہ یہودیوں کا یہ بھی اعتراض تھا کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت مسِ شیطان کے ساتھ ہے یعنی مریم کا حمل نعوذ باللہ حلال طور پر نہیں ہوا تھا جس سے حضرت عیسیٰ پیدا ہوئے۔ سو ضرور تھا کہ اس گندے الزام کو دفع کیا جاتا۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۲۵ حاشیہ)

روح القدس کے فرزند وہ تمام سعادت مند اور راست باز ہیں جن کی نسبت اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ وارد ہے اور قرآن کریم سے دو قسم کی مخلوق ثابت ہوتی ہے۔ اوّل وہ جو روح القدس کے فرزند ہیں اور بن باپ پیدا ہونا تو کوئی خصوصیت نہیں۔ دوئم شیطان کے فرزند۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۲ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳ نیز الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ مورخہ ۱/۳۰ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

قرآن شریف میں لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے شیطان کو کہا کہ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطٰنٌ میرے بندوں پر تجھے کوئی غلبہ نہیں۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۴۳ مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

ولقد كرمنا بني آدم وحملنهم في البر والبحر ورزقنهم من الطيبت وفضلنهم على كثير ممن خلقنا تفضيلا ○

وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ یعنی اٹھایا ہم نے ان کو جنگلوں میں اور دریاؤں میں۔ اب کیا اس کے یہ معنے کرنے چاہئیے کہ حقیقت میں خدائے تعالیٰ اپنی گود میں لے کر اٹھائے پھرا سو اسی طرح ملایک کے پروں پر ہاتھ رکھنا حقیقت پر محمول نہیں۔
(ازالہ اوہام حصہ دوم ص۶۹۸)

فرشتے تو ہر ایک انسان کے ساتھ رہتے ہیں اور بموجب حدیث صحیح کے طالب العلموں پر اپنے پروں کا سایہ ڈالتے ہیں۔ اگر مسیح کو فرشتے اٹھائیں تو کیوں نرالے طور پر اس بات کو مانا جائے۔ قرآن شریف سے تو یہ بھی ثابت ہے کہ ہر ایک شخص کو خدا تعالیٰ اٹھائے پھرتا ہے حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ مگر کیا خدا کسی کو نظر آتا ہے؟ یہ سب استعارات ہیں۔
(کتاب البریۃ ص۱۹۳ حاشیہ)

ہم نے انسانوں کو زمین پر اور دریاؤں پر خود اٹھایا۔ ایسا ہی زمین بھی ہر ایک چیز کو اٹھاتی ہے اور ہر ایک خاکی چیز کی سکونت مستقل زمین میں ہے وہ جس کو چاہے عزت کے مقام پر بٹھادے اور جس کو چاہے ذلت کے مقام میں پھینک دے۔
(نسیم دعوت ص۵۱)

یہ خیال مت کرو کہ زمین تمہیں اٹھاتی ہے یا کشتیاں دریا میں تمہیں اٹھاتی ہیں بلکہ ہم خود تمہیں اٹھا رہے ہیں۔
(نسیم دعوت ص۵۹)

يوم ندعوا كل أناس بإمامهم فمن أوتي كتبه بيمينه فأولئك يقرءون كتبهم ولا يظلمون فتيلا ○

اور ایک تاگے کے برابر کسی پر زیادتی نہیں ہوگی۔ (ست بچن ص۹۱)

ومن كان في هذه أعمى فهو في الآخرة أعمى وأضل سبيلا ○

جو شخص اِس جہان میں اندھا ہے وہ اُس دوسرے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا بلکہ اندھوں سے بدتر۔

(براہین احمدیہ حصہ دوم ص۱۰۱ حاشیہ نمبر ۵)

جو شخص اس جہان میں اندھا رہا اور علمِ الٰہی میں بصیرت پیدا نہ کی وہ اس دوسرے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا بلکہ اندھوں سے بدتر ہوگا۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم ص۴۱۹-۴۲۰)

جو شخص اس جہان میں اندھا ہے وہ اُس جہان میں بھی اندھا ہوگا بلکہ اندھوں سے بھی گیا گذرا۔

(سُرمہ چشم آریہ ص۱۰۹)

اس جگہ .... روحانی نابینائی مراد ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم ص۵۰۱)

جو اس جہان میں اندھا ہوگا وہ اُس جہان میں بھی اندھا ہوگا۔

(تریاق القلوب ص۱۴۱ حاشیہ نیز آئینہ کمالاتِ اسلام ص۱۴۹)

باوا صاحب کا ایک شعر یہ ہے

جہاں درشن اِت ہے اُنہاں درشن اُت ۞ جہاں درشن اِت نا اُنہاں اِت نہ اُت

ترجمہ یہ ہے کہ جو لوگ اِس جہان میں خدا کا درشن پالیتے ہیں وہ اُس جہان میں بھی پالیتے ہیں اور جو یہاں نہیں پاتے وہ دونوں جہانوں میں اس کے درشن سے بے نصیب رہتے ہیں اور یہ شعر بھی اس آیت قرآن کا ترجمہ ہے مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔ (ست بچن ص۱۲)

جو یہاں اندھا ہے وہ وہاں بھی اندھا ہی ہوگا یعنی جس کو اِس دُنیا میں خدا کا درشن حاصل ہے اُس کو اُس جہان میں بھی درشن ہوگا اور جو شخص اُس کو اِس جگہ نہیں دیکھتا آخرت میں بھی اس عزت اور مرتبہ سے محروم ہوگا۔

(ست بچن ص۸۵)

جو شخص اِس جہان میں اندھا رہا وہ آنے والے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا بلکہ اندھوں سے بدتر۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نیک بندوں کو خدا کا دیدار اسی جہان میں ہوجاتا ہے اور وہ اسی جگ میں اپنے اس پیارے کا درشن پالیتے ہیں جس کے لئے وہ سب کچھ کھوتے ہیں۔ غرض مفہوم اس آیت کا یہی ہے کہ بہشتی زندگی کی بنیاد اِسی جہان سے پڑتی ہے اور جہنمی نابینائی کی جڑ بھی اِسی جہان کی گندی اور کورانہ زلیست ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی ص۸۱-۸۲)

جو شخص اِس جہان میں اندھا ہوگا وہ دوسرے جہان میں بھی اندھا ہوگا۔ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ اس جہان کی روحانی نابینائی اُس جہان میں جسمانی طور پر مشہود اور محسوس ہوگی۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی ص۱۰۱)

جو شخص اِس دُنیا میں خدا کے دیکھنے سے بے نصیب ہے وہ قیامت میں بھی تاریکی میں گرے گا۔ (کتاب البریہ ص۴۲)

جو شخص اس جہان میں اندھا ہو وہ اس دوسرے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا بلکہ اندھوں سے بدتر یعنی خدا کے دیکھنے کی آنکھیں اور اس کے دریافت کرنے کے حواس اسی جہان سے ملتے ہیں جس کو اس جہان میں نہیں ملے اُس کو دوسرے جہان میں بھی نہیں ملیں گے۔ راست باز جو قیامت کے دن خدا کو دیکھیں گے وہ اسی جگہ سے دیکھنے والے حواس ساتھ لے جائیں گے اور جو شخص اس جگہ خدا کی آواز نہیں سُنے گا وہ اُس جگہ بھی نہیں سُنے گا۔ خدا کو جیسا کہ خدا ہے بغیر کسی غلطی کے پہچاننا اور اسی عالم میں سچّے اور صحیح طور پر اُس کی ذات اور صفات کی معرفت حاصل کرنا ہی تمام روشنی کا مبدء ہے۔ (کتاب البریّہ ص۵۱)

تم دیکھتے ہو کہ جب آفتاب کی طرف کی کھڑکی کھولی جائے تو آفتاب کی شعاعیں ضرور کھڑکی کے اندر آجاتی ہیں ایسا ہی جب انسان خدا تعالیٰ کی طرف بالکل سیدھا ہو جائے اور اس میں اور خدا تعالیٰ میں کچھ حجاب نہ رہے تب فی الفور ایک نورانی شعلہ اُس پر نازل ہوتا ہے اور اس کو منوّر کر دیتا ہے اور اس کی تمام اندرونی غلاظت دھو دیتا ہے تب وہ ایک نیا انسان ہو جاتا ہے اور ایک بھاری تبدیلی اس کے اندر پیدا ہوتی ہے تب کہا جاتا ہے کہ اس شخص کو پاک زندگی حاصل ہوئی۔ اس پاک زندگی کے پانے کا مقام یہی دُنیا ہے۔ اسی کی طرف اللہ جلّ شانہٗ اس آیت میں اشارہ فرماتا ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا یعنی جو شخص اس جہان میں اندھا رہا اور خدا کے دیکھنے کا اُس کو نور نہ ملا وہ اس جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ غرض خدا کے دیکھنے کے لئے انسان اسی دُنیا سے حواس لے جاتا ہے جس کو اس دُنیا میں یہ حواس حاصل نہیں ہوئے اور اس کا ایمان محض قصوں اور کہانیوں تک محدود رہا وہ ہمیشہ کی تاریکی میں پڑے گا۔ (سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب ص۱۹)

طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ چونکہ نجات بجز حق الیقین کے ممکن نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ اَضَلُّ سَبِيْلًا یعنی جو شخص اس جہان میں اندھا ہے وہ اُس دوسرے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا بلکہ اس سے بھی بدتر۔ تو بغیر یقین کامل کے کیونکر نجات ہو اور اگر ایک مذہب کی پابندی سے نجات نہیں تو اس مذہب سے حاصل کیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں تو یقین کے چشمے جاری تھے اور وہ خدائی نشانوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے اور انہیں نشانوں کے ذریعہ سے خدا کی کلام پر انہیں یقین ہو گیا تھا اس لئے ان کی زندگی نہایت پاک ہو گئی تھی لیکن بعد میں جب وہ زمانہ جاتا رہا اور اس زمانہ پر صدہا سال گذر گئے تو پھر ذریعہ یقین کا کونسا تھا۔ سچ ہے کہ قرآن شریف اُن کے پاس تھا اور قرآن شریف اس ذوالفقار تلوار کی مانند ہے جس کے دو طرف دھاریں ہیں۔ ایک طرف کی دھار مومنوں کی اندرونی غلاظت کو کاٹتی ہے اور دوسری طرف کی دھار دشمنوں کا کام تمام کرتی ہے مگر پھر بھی وہ تلوار اس کام کے لئے ایک بہادر کے دست و بازو کی محتاج ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ[1] پس قرآن سے جو تزکیہ حاصل ہوتا ہے اُس کو

[1] الجمعۃ آیت ۳

اکیلا بیان نہیں کیا بلکہ وہ نبی کی صفت میں داخل کرکے بیان کیا۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا کلام یوں ہی آسمان پر سے کبھی نازل نہیں ہوا بلکہ اس تلوار کو چلانے والا بہادر ہمیشہ ساتھ آیا ہے جو اس تلوار کا اصل جوہر شناس ہے۔ لہٰذا قرآن شریف پر سچا اور تازہ یقین دلانے کے لئے اور اس کے جوہر دکھلانے کے لئے اور اُس کے ذریعہ سے اتمامِ حجت کرنے کے لئے ایک بہادر کے دست و بازو کی ہمیشہ حاجت ہوتی رہی ہے اور آخری زمانہ میں یہ حاجت سب سے زیادہ پیش آئی کیونکہ دجّالی زمانہ ہے اور زمین و آسمان کی باہمی لڑائی ہے۔ غرض جب خدا تعالیٰ نے فرمادیا کہ جو شخص اس جہان میں اندھا ہے وہ دوسرے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا تو ہر ایک طالبِ حق کے لئے ضروری ہوا کہ اسی جہان میں آنکھوں کا نور تلاش کرے اور اس زندہ مذہب کا طالب ہو جس میں زندہ خدا کے انوار نمایاں ہوں۔ وہ مذہب مُردار ہے جس میں ہمیشہ کے لئے یقینی وحی کا سلسلہ جاری نہیں کیونکہ وہ انسانوں پر یقین کی راہ بند کرتا ہے اور ان کو قصّوں کہانیوں پر چھوڑتا ہے اور اُن کو خدا سے نومید کرتا اور تاریکی میں ڈالتا ہے۔ اور کیونکر کوئی مذہب خدا نما ہو سکتا ہے اور کیونکر گناہوں سے چھڑا سکتا ہے جب تک کوئی یقین کا ذریعہ اپنے پاس نہیں رکھتا اور جب تک سورج نہ چڑھے کیونکر دن چڑھ سکتا ہے۔ پس دُنیا میں سچّا مذہب وہی ہے جو بذریعہ زندہ نشانوں کے یقین کی راہ دکھلاتا ہے باقی لوگ اسی زندگی میں دوزخ میں گرے ہوئے ہیں۔ بھلا بتلاؤ کہ ظن بھی کچھ چیز ہے جس کے دوسرے لفظوں میں یہ معنے ہیں کہ شائد یہ بات صحیح ہے یا غلط۔ یاد رکھو کہ گناہ سے پاک ہونا بجز یقین کے کبھی ممکن نہیں۔ فرشتوں کی سی زندگی بجز یقین کے کبھی ممکن نہیں۔ دُنیا کی بے جا عیاشیوں کو ترک کرنا بجز یقین کے کبھی ممکن نہیں۔ ایک پاک تبدیلی اپنے اندر پیدا کر لینا اور خدا کی طرف ایک خارق عادت کشش سے کھینچے جانا بجز یقین کے کبھی ممکن نہیں۔ زمین کو چھوڑنا اور آسمان پر چڑھ جانا بجز یقین کے کبھی ممکن نہیں۔ خدا سے پورے طور پر ڈرنا بجز یقین کے کبھی ممکن نہیں تقویٰ کی باریک راہوں پر قدم مارنا اور اپنے عمل کو ریاکاری کی ملونی سے پاک کر دینا بجز یقین کے کبھی ممکن نہیں۔ ایسا ہی دُنیا کی دولت اور حشمت اور اس کی کیمیا پر لعنت بھیجنا اور بادشاہوں کے قرب سے بے پروا ہو جانا اور صرف خدا کو اپنا ایک خزانہ سمجھنا بجز یقین کے ہرگز ممکن نہیں۔ اب بتلاؤ اے مسلمان کہلانے والو کہ ظلماتِ شک سے نورِ یقین کی طرف تم کیونکر پہنچ سکتے ہو یقین کا ذریعہ تو خدا کا کلام ہے جو یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ[1] کا مصداق ہے سو چونکہ عہدِ نبوت پر تیرہ سو برس گذر گئے اور تم نے وہ زمانہ نہیں پایا جبکہ صدہا نشانوں اور چمکتے ہوئے نوروں کے ساتھ قرآن اُترتا تھا اور وہ زمانہ پایا جس میں خدا کی کتاب اور اس کے رسول اور اس کے دین پر ہزارہا اعتراض عیسائی اور دہریہ اور آریہ وغیرہ کر رہے ہیں اور تمہارے پاس بجز لکھے ہوئے چند ورقوں کے جن کی اعجازی طاقت سے

---

[1] البقرۃ آیت ۲۵۸

تمہیں خبر نہیں اور کوئی ثبوت نہیں۔ اور جو معجزات پیش کرتے ہو وہ محض قصوں کے رنگ میں ہیں تو اب بتلاؤ کہ تم کس راہ سے اپنے تئیں یقین کے بلند مینار تک پہنچا سکتے ہو اور کس طریق سے دشمن کو بتلا سکتے ہو کہ تمہارے پاس خدا پر یقین لانے کے لئے اور گناہ سے بچنے کے لئے ایک ایسی چیز ہے جو دشمن کے پاس نہیں تا وہ انصاف کر کے تمہارے مذہب کا طالب ہو جائے۔ اس حرکت سے ایک عقلمند کو کیا فائدہ کہ ایک گوبر کو چھوڑ دے اور دوسرے گوبر کو کھالے سچائی کو ہر یک سعید دل لینے کو طیار ہے بشرطیکہ سچائی اپنے نور کو ثابت کر کے دکھلا دے جس اسلام کو آج یہ مخالف مولوی اور اُن کا گروہ غیر مذہب کے لوگوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں وہ صرف پوست ہے نہ مغز۔ اور محض افسانہ ہے نہ حقیقت پھر کوئی کیونکر اُس کو قبول کرے۔ اور جس بیماری سے نجات حاصل کرنے کے لئے ایک شخص مذہب کو تبدیل کرنا چاہتا ہے اگر وہی بیماری اُس دوسرے مذہب میں بھی ہے تو اس تبدیلی سے بھی کیا فائدہ۔ یوں تو برہمو بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم ایک خدا کے قائل ہیں مگر خدا کا قائل وہی ہے جس کی یقین کی آنکھیں کُھل گئی ہیں اور وہی گناہ سے بچ سکتا ہے کہ جو یقین کی آنکھ سے خدا کو دیکھتا ہے باقی سب قصّے جھوٹ ہیں اور سب کفّارے باطل ہیں۔ سو وہی زندہ خدا اس آخری زمانہ میں اپنے تئیں پیش کرتا ہے تا لوگ ایمان لاویں اور ہلاک نہ ہوں۔ قرآن شریف خدا کا کلام تو ہے بلکہ سب سے بڑا کلام مگر وہ تم سے بہت دور ہے تمہاری آنکھیں اس کو دیکھ نہیں سکتیں۔ اب وہ تمہارے ہاتھ میں ایسا ہی ہے جیساکہ توریت یہودیوں کے ہاتھ میں۔ اسی وجہ سے اگر تم انصاف کرو تو گواہی دے سکتے ہو کہ بباعث اس کے کہ اس پاک کلام کے یقینی انوار تمہاری آنکھوں سے پوشیدہ ہیں تم اس سے باطنی تقدس کا کچھ بھی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اور اگر واقعات خارجیہ کی شہادت کچھ چیز ہے تو تم انصافاً آپ ہی شہادت دے سکتے ہو کہ اس موجودہ زمانہ میں تمہاری کیا حالتیں ہیں۔ سچ کہو کہ کیا تم گناہوں سے اور تمام ان حرکات سے جو تقویٰ کے برخلاف ہیں ایسے ڈرتے ہو جیساکہ ایک زہر ہلاہل کے استعمال سے انسان ڈرتا ہے۔ سچ کہو کہ کیا تم اُس تقویٰ پر قائم ہو جس تقویٰ کے لئے قرآن شریف میں ہدایت کی گئی تھی۔ سچ کہو کہ وہ آثار جو سچّے یقین کے بعد ظاہر ہوتے ہیں وہ تم میں ظاہر ہیں۔ تم اس وقت جھوٹ نہ بولو اور بالکل سچ کہو کہ کیا وہ محبت جو خدا سے کرنی چاہیئے اور وہ صدق و ثبات جو اس کی راہ میں دکھلانا چاہیئے وہ تم میں موجود ہے۔ تم خدائے عزّوجل کی قسم کھا کر کہو کہ اس مردار دُنیا کو جس صفائی سے ترک کرنا چاہیئے کیا تم اُسی صفائی سے ترک کر چکے ہو۔ اور جس اخلاص اور توحید اور تفرید سے خدائے واحد لاشریک کی طرف دوڑنا چاہیئے کیا تم اُسی اخلاص سے اس کی راہ میں دوڑ رہے ہو۔ ریاکاری سے بات مت کرو اور لاف زنی سے لوگوں کو خوش کرنا مت چاہو کہ وہ خدا درحقیقت موجود ہے جو تمہارے ہر ایک قول اور فعل کو دیکھ رہا ہے۔ تم بات کرتے وقت اس قادر کا خیال کر لو جس کا غضب کھا جانے والی آگ ہے۔ وہ جھوٹی شیخیوں کو ایک دم میں جہنّم کا ہیزم کر سکتا ہے۔ سو تم سچ سچ کہو کہ تمہارے قدم دُنیا کی

خواہشوں یا دُنیا کی آبروؤں یا دُنیا کے مال و متاع میں پھنسے ہوئے ہیں یا نہیں۔ پس اگر تمہیں خدا پر یقین حاصل ہوتا تو تم اس زہر کو ہرگز نہ کھاتے اور قریب تھا کہ دُنیا اس زہر سے مر جاتی اگر خدا یہ آسمانی سلسلہ اپنے ہاتھ سے قائم نہ کرتا اور اگر تم چالاکی سے کہو کہ ہم ایسے ہی ہیں جیسا کہ بیان کیا گیا اور ہم میں گناہ کی کوئی تاریکی نہیں اور پورے یقین کے انجن سے ہم کھینچے جا رہے ہیں تو تم نے جھوٹ بولا ہے اور آسمان اور زمین کے بنانے والے پر تہمت لگائی ہے اس لئے قبل اس کے جو تم مرو خدا کی لعنت تمہاری پردہ دری کرے گی۔ یقین اپنے نوروں کے سمیت آتا ہے۔ کوئی آسمان تک نہیں پہنچا سکتا ہے مگر وہی جو آسمان سے آتا ہے۔ اگر تم جانتے کہ خدا کا تازہ بتازہ اور یقینی اور قطعی کلام تمہاری بیماریوں کا علاج ہے تو تم اس سے انکار نہ کرتے جو عین صدی کے سر پر تمہارے لئے آیا۔ اے غافلو یقین کے بغیر کوئی عمل آسمان پر جا نہیں سکتا اور اندرونی کدورتیں اور دل کی مہلک بیماریاں بغیر یقین کے دور نہیں ہو سکتیں جس اسلام پر تم فخر کرتے ہو یہ اسم اسلام ہے نہ حقیقتِ اسلام۔ حقیقی اسلام سے شکل بدل جاتی ہے اور دل میں ایک نور پیدا ہو جاتا ہے اور سفلی زندگی مر جاتی ہے اور ایک اور زندگی پیدا ہوتی ہے جس کو تم نہیں جانتے یہ سب کچھ یقین کے بعد آتا ہے اور یقین اُس یقینی کلام کے بعد جو آسمان سے نازل ہوتا ہے۔ خدا خدا کے ذریعہ سے ہی پہچانا جاتا ہے نہ کسی اور ذریعہ سے۔ تم میں سے کون ہے جو اپنے ہم کلام کو شناخت نہیں کر سکتا۔ پس اسی طرح مکالمات کی حالت میں معرفت میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔ بندہ کا دعا کرنا اور خدا تعالیٰ کا لطف اور رحم سے اس دعا کا جواب دینا نہ ایک دفعہ نہ دو دفعہ بلکہ بعض موقعہ پر بیس بیس دفعہ یا تیس تیس دفعہ یا پچاس پچاس دفعہ یا قریباً تمام رات یا قریباً تمام دن اسی طرح ہر ایک دعا کا جواب پانا اور جواب بھی فصیح تقریریں۔ اور بعض دفعہ مختلف زبانوں میں اور بعض دفعہ ایسی زبانوں میں جن کا علم بھی نہیں اور پھر اس کے ساتھ نشانوں کی بارش اور معجزات اور تائیدوں کا سلسلہ۔ کیا یہ ایسا امر ہے کہ اس قدر مسلسل مکالمات اور مخاطبات اور آیات بیّنات کے بعد پھر خدا کی کلام میں شک رہے۔ نہیں نہیں بلکہ یہ ایسا امر ہے کہ اس کے ذریعہ سے بندہ اسی عالم میں اپنے خدا کو دیکھ لیتا ہے اور دونوں عالم اس کے لئے بلا تفاوت یکساں ہو جاتے ہیں اور جس طرح نورہ کے استعمال سے یک دفعہ بال گر جاتے ہیں ایسا ہی اس نُور کے نزول جلال سے وحشیانہ زندگی کے بال جو جرائم اور معاصی سے مراد ہے کالعدم ہو جاتے ہیں اور انسان مُردوں سے بیزار ہو کر اس دلآرام زندہ کا عاشق ہو جاتا ہے جس کو دُنیا نہیں جانتی۔ اور جیسا کہ تم دُنیا کی چیزوں سے بے صبر ہو ویسا ہی وہ خدا کی دُوری پر صبر نہیں کر سکتا۔ غرض تمام برکات اور یقین کی کُنجی وہ کلام قطعی اور یقینی ہے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر نازل ہوتا ہے۔ جب خدائے ذوالجلال کسی اپنے بندہ کو اپنی طرف کھینچنا چاہتا ہے تو اپنا کلام اس پر نازل کرتا ہے اور اپنے مکالمات کا اس کو شرف بخشتا ہے اور اپنے خارق عادت نشانوں سے اُس کو تسلی دیتا ہے اور ہر ایک پہلو سے اُس پر ثابت کر دیتا ہے کہ وہ اس کا کلام ہے تب وہ

کلام قائم مقام دیدار کا ہو جاتا ہے اُس روز انسان سمجھتا ہے کہ خدا ہے کیونکہ انا الموجود کی آواز سُنتا ہے خدا تعالیٰ کی کلام سے پہلے اگر انسان کا خدا تعالیٰ کے وجود پر ایمان ہوتا ہے تو بس اسی قدر کہ وہ مصنوعات پر نظر کر کے یہ خیال کر لیتا ہے کہ اس ترکیب محکم ابلغ کا کوئی صانع ہونا چاہئے لیکن یہ کہ درحقیقت وہ صانع موجود بھی ہے۔ یہ مرتبہ ہرگز بجز مکالمات الٰہیہ کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور گندی زندگی جو تحت الثریٰ کی طرف ہر لحظہ کھینچ رہی ہے وہ ہرگز دور نہیں ہوتی۔ اسی جگہ سے عیسائیوں کے خیالات کا بھی باطل ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ وہ خیال کرتے ہیں کہ ابن مریم کی خودکشی نے اُن کو نجات دے دی ہے حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ تنگ و تاریک دوزخ میں پڑے ہوئے ہیں جو محجوبیت اور شکوک اور شبہات اور گناہ کا دوزخ ہے پھر نجات کہاں ہے نجات کا سرچشمہ یقین سے شروع ہو جاتا ہے۔ سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ انسان کو اس بات کا یقین دیا جائے کہ اس کا خدا درحقیقت موجود ہے جو مجرم اور سرکش کو بے گناہ نہیں چھوڑتا اور رجوع کرنے والے کی طرف رجوع کرتا ہے۔ یہی یقین تمام گناہوں کا علاج ہے۔ بجز اس کے دُنیا میں نہ کوئی کفارہ ہے نہ کوئی خون ہے جو گناہ سے بچاوے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ ہر یک جگہ تمہیں یقین ہی ناکردنی باتوں سے روک دیتا ہے۔ تم آگ میں ہاتھ نہیں ڈال سکتے کہ وہ تمہیں جلا دے گی۔ تم شیر کے آگے اپنے تئیں کھڑا نہیں کرتے کیونکہ تم یقین رکھتے ہو کہ وہ تمہیں کھالے گا۔ تم کوئی زہر نہیں کھاتے کیونکہ تم یقین رکھتے ہو کہ وہ تمہیں ہلاک کر دے گی۔ پس اس میں کیا شک ہے کہ بے شمار تجارب سے تم پر ثابت ہو چکا ہے کہ جس جگہ تمہیں یقین ہو جاتا ہے کہ یہ فعل یا یہ حرکت بلاشبہ تمہیں ہلاکت تک پہنچائے گی تم فی الفور اس سے رُک جاتے ہو اور پھر وہ گناہ تم سے سرزد نہیں ہوتا۔ پھر خدا تعالیٰ کے مقابل پر کیوں اس ثابت شدہ فلسفہ سے کام نہیں لیتے۔ کیا تجربہ نے اب تک گواہی نہیں دی کہ بجز یقین کے انسان گناہ سے رُک نہیں سکتا۔ ایک بکری یقین کی حالت میں اس مرغزار میں چر نہیں سکتی جس میں شیر سامنے کھڑا ہے۔ پس جبکہ یقین لایعقل حیوانات پر بھی اثر ڈالتا ہے اور تم تو انسان ہو۔ اگر کسی دل میں خدا کی ہستی اور اس کی ہیبت اور عظمت اور جبروت کا یقین ہے تو وہ یقین ضرور اُسے گناہ سے بچالے گا اور اگر وہ نہیں بچ سکا تو اُسے یقین نہیں۔ کیا خدا پر یقین لانا اس یقین سے کم تر ہے کہ جو شیر اور سانپ اور زہر کے وجود کا یقین ہوتا ہے۔ سو وہ گناہ جو خدا سے دور ڈالتا ہے اور جہنمی زندگی پیدا کرتا ہے اس کا اصل سبب عدم یقین ہے۔ کاش میں کس دف کے ساتھ اس کی منادی کروں کہ گناہ سے چھوڑانا یقین کا کام ہے۔ جھوٹی فقیری اور شیخت سے توبہ کرانا یقین کا کام ہے۔ خدا کو دکھلانا یقین کا کام ہے۔ وہ مذہب کچھ بھی نہیں اور گندہ ہے اور مُردار ہے اور ناپاک ہے اور جہنمی ہے اور خود جہنم ہے جو یقین کے چشمہ تک نہیں پہنچا سکتا۔ زندگی کا چشمہ یقین سے ہی نکلتا ہے اور وہ پر جو آسمان کی طرف اڑاتے ہیں وہ یقین ہی ہے۔ کوشش کرو کہ اس خدا کو تم دیکھ لو جس کی طرف تم نے جانا ہے اور وہ مرکب یقین ہے جو تمہیں خدا تک پہنچائے گا۔ کس قدر اس کی تیز رفتار ہے کہ وہ روشنی جو سورج

سے آتی اور زمین پر پھیلتی ہے وہ بھی اس کی سرعت رفتار کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اے پاکیزگی کے ڈھونڈنے والو اگر تم چاہتے ہو کہ پاک دل بن کر زمین پر چلو اور فرشتے تم سے مصافحہ کریں تو تم یقین کی راہوں کو ڈھونڈو۔ اور اگر تمہیں اس منزل تک ابھی رسائی نہیں تو اس شخص کا دامن پکڑو جس نے یقین کی آنکھ سے اپنے خدا کو دیکھ لیا ہے اور یہ کہ کیونکر یقین کی آنکھ سے خدا کو دیکھا جاوے۔ اس کا جواب کوئی مجھ سے سُنے یا نہ سُنے مگر مَیں یہی کہوں گا کہ اُس یقین کے حاصل کرنے کا ذریعہ خدا کا زندہ کلام ہے جو زندہ نشان اپنے اندر اور ساتھ رکھتا ہے۔ جب وہ آسمان پر سے اُترتا ہے تو نئے سرے مُردوں کو قبروں میں سے نکالتا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ باوجود آنکھوں کے بینا ہونے کے تم آسمانی آفتاب کے محتاج ہو اسی طرح خداشناسی کی بینائی محض اپنی اٹکلوں سے حاصل نہیں ہو سکتی وہ بھی ایک آفتاب کی محتاج ہے اور وہ آفتاب بھی آسمان پر سے اپنی روشنی زمین پر نازل کرتا ہے یعنی خدا کا کلام کوئی معرفت خدا کے کلام کے بغیر کامل نہیں ہو سکتی۔ خدا کا کلام بندہ اور خدا میں ایک دلّالہ ہے۔ وہ اترتا ہے اور خدا کا نُور اُس کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جس پر وہ اپنے پورے کرشمہ اور پوری تجلّی اور پوری خدائی عظمت اور قدرت اور برہنہ کرشمہ کے ساتھ اترتا ہے اُس کو وہ آسمان پر لے جاتا ہے۔ غرض خدا تک پہنچنے کے لئے بجُز خدا تعالیٰ کے کلام کے اور کوئی سبیل نہیں۔ (نزول المسیح صـ ۹۰-۹۷)

جو اِس جہان میں اندھا ہے وہ دوسرے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ اب ایک ایسا معترض جس کو خدا کے کلام کا منشاء معلوم نہیں یہ اعتراض کرے گا کہ دیکھو مسلمانوں کے مذہب میں لکھا ہے کہ اندھوں کو نجات نہیں غریب اندھے کا کیا قصور ہے مگر جو تعصّب دور کر کے غور سے قرآن شریف کو پڑھے گا وہ سمجھ لے گا کہ اس جگہ پر آنکھوں سے اندھے مراد نہیں ہیں بلکہ دل کے اندھے مراد ہیں۔ غرض یہ ہے کہ جن کو اسی دُنیا میں خدا کا درشن نہیں ہوتا انہیں دوسرے جہان میں بھی درشن نہیں ہوگا۔ اسی طرح صدہا خدا کے کلام میں مجاز اور استعارے ہوتے ہیں۔ ایک نفسانی جوش والا آدمی جلدی سے سب کو بجائے اعتراض بنا دے گا۔ مَیں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہی سچ بات ہے کہ خدا کا کلام سمجھنے کے لئے اوّل دل کو ایک نفسانی جوش سے پاک بنانا چاہیئے تب خدا کی طرف سے دل پر روشنی اترے گی بغیر اندرونی روشنی کے اصل حقیقت نظر نہیں آتی۔ (سناتن دھرم صـ ۶)

جس کو اس جہان میں اس کا درشن نہیں ہوا اُس کو اس جہان میں بھی اُس کا درشن نہیں ہوگا اور وہ دونوں جہانوں میں اندھا رہے گا۔ خدا کے دیکھنے کے لئے اسی جہان میں آنکھیں طیار ہوتی ہیں اور بہشتی زندگی اسی جہان سے شروع ہوتی ہے۔ (نسیم دعوت صـ ۸)

جو شخص اس دنیا میں اندھا رہے گا اور اُس ذات بیچون کا اس کو دیدار نہیں ہوگا وہ مرنے کے بعد بھی اندھا ہی ہوگا اور تاریکی اس سے جُدا نہیں ہوگی کیونکہ خدا کے دیکھنے کے لئے اسی دُنیا میں حواس ملتے ہیں اور جو

شخص ان حواس کو دنیا سے ساتھ نہیں لے جائے گا وہ آخرت میں بھی خدا کو دیکھ نہیں سکے گا۔ اس آیت میں خدا تعالیٰ نے صاف سمجھا دیا ہے کہ وہ انسان سے کس ترقی کا طالب ہے اور انسان اس کی تعلیم کی پیروی سے کہاں تک پہنچ سکتا ہے۔
(لیکچر لاہور صٰ ۸)

مَیں اس بات کو بالکل سمجھ نہیں سکتا کہ ایک شخص خدا تعالیٰ پر ایمان لاوے اور اس کو واحد لاشریک سمجھے اور خدا اس کو دوزخ سے تو نجات دے مگر نابینائی سے نجات نہ دے۔ حالانکہ نجات کی جڑھ معرفت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی وَ اَضَلُّ سَبِیْلًا یعنی جو شخص اِس جہان میں اندھا ہے وہ دوسرے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا یا اس سے بھی بدتر۔ یہ بات بالکل سچ ہے کہ جس نے خدا کے رسولوں کو شناخت نہیں کیا اُس نے خدا کو بھی شناخت نہیں کیا۔ خدا کے چہرے کا آئینہ اُس کے رسول ہیں۔ ہر ایک جو خدا کو دیکھتا ہے اسی آئینہ کے ذریعہ سے دیکھتا ہے۔ پس یہ کس قسم کی نجات ہے کہ ایک شخص دُنیا میں تمام عمر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکذب اور منکر رہا اور قرآن شریف سے انکاری رہا اور خدا تعالیٰ نے اُس کو آنکھیں نہ بخشیں اور دل نہ دیا اور وہ اندھا ہی رہا اور اندھا ہی مرگیا اور پھر نجات بھی پا گیا۔ یہ عجیب نجات ہے۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ جس شخص پر رحمت کرنا چاہتا ہے پہلے اُس کو آنکھیں بخشتا ہے اور اپنی طرف سے اُس کو علم عطا کرتا ہے۔ صدہا آدمی ہمارے سلسلہ میں ایسے ہوں گے کہ وہ محض خواب یا الہام کے ذریعہ سے ہماری جماعت میں داخل ہوئے ہیں اور خدا تعالیٰ کی ذات وسیع الرحمت ہے اگر کوئی ایک قدم اس کی طرف آتا ہے تو وہ دو قدم آتا ہے اور جو شخص اُس کی طرف جلدی سے چلتا ہے تو وہ اس کی طرف دوڑتا آتا ہے اور نابینا کی آنکھیں کھولتا ہے پھر کیونکر قبول کیا جائے کہ ایک شخص اُس کی ذات پر ایمان لایا اور سچے دل سے اُس کو وحدہٗ لاشریک سمجھا اور اُس سے محبت کی اور اس کے اولیا میں داخل ہوا پھر خدا نے اُس کو نابینا رکھا اور ایسا اندھا رہا کہ خدا کے نبی کو شناخت نہ کر سکا۔ اسی کی موید یہ حدیث ہے کہ مَنْ مَّاتَ وَلَمْ یَعْرِفْ اِمَامَ زَمَانِہٖ فَقَدْ مَاتَ مِیْتَۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ یعنی جس شخص نے اپنے زمانہ کے امام کو شناخت نہ کیا وہ جاہلیت کی موت پر مرگیا اور صراط مستقیم سے بے نصیب رہا۔
(حقیقۃ الوحی صٰ ۱۶۳)

اس آیت کے یہ معنے ہیں کہ جو شخص اس جہان میں اندھا ہے وہ دوسرے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا یعنی جس کو خدا کا دیدار اس جگہ نہیں اُس جگہ بھی نہیں۔ اس آیت کے یہ معنے نہیں ہیں کہ جو بیچارے جسمانی طور پر اس جہان میں اندھے ہیں وہ دوسرے جہان میں بھی اندھے ہی ہوں گے۔ پس یہ استعارہ ہے کہ جاہل کا نام اندھا رکھا گیا۔
(ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صٰ ۸ حاشیہ)

جو شخص اس دُنیا میں اندھا ہوگا وہ دوسرے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ یہ بھی ایک پیشگوئی ہے مگر

اس کے وہ معنی نہیں ہیں جو ظاہر الفاظ سے سمجھے جاتے ہیں۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۹۴)

انسان .... تمنا رکھے کہ وہ بھی ان لوگوں میں سے ہوجاوے جو ترقی اور بصیرت حاصل کرچکے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس جہان سے بے بصیرت اور اندھا اٹھایا جاوے چنانچہ فرمایا مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی الآیہ کہ جو اس جہان میں اندھا ہے وہ اُس جہان میں بھی اندھا ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء ص۳۹)

جب تک انسان پوری روشنی اسی جہان میں نہ حاصل کرلے وہ کبھی خدا کا منہ نہ دیکھے گا۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء ص۴۴)

مومن کا معراج اور کمال یہی ہے کہ وہ علماء کے درجہ پر پہنچے اور وہ حق الیقین کا مقام اُسے حاصل ہو جو علم کا انتہائی درجہ ہے لیکن جو شخص علوم حقہ سے بہرہ ور نہیں ہیں اور معرفت اور بصیرت کی راہیں اُن پر کھلی ہوئی نہیں ہیں وہ خود عالم کہلائیں مگر علم کی خوبیوں اور صفات سے بالکل بے بہرہ ہیں اور وہ روشنی اور نور جو حقیقی علم سے ملتا ہے اُن میں پایا نہیں جاتا بلکہ ایسے لوگ سراسر خسارہ اور نقصان میں ہیں۔ یہ اپنی آخرت دُخان اور تاریکی سے بھر لیتے ہیں۔ انہیں کے حق میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی جو اس دنیا میں اندھا ہوتا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا اٹھایا جاوے گا جس کو یہاں علم و بصیرت اور معرفت نہیں دی گئی اُسے وہاں کیا علم ملے گا۔ اللہ تعالیٰ کو دیکھنے والی آنکھ اِسی دنیا سے لے جانی پڑتی ہے جو یہاں ایسی آنکھ پیدا نہیں کرتا اسے یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھے گا۔ (الحکم جلد ۹ ۱۰ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۵ء ص۵)

وہ جو اس دنیا میں کچھ نہیں پاتا اور آئندہ جنّت کی امید کرتا ہے وہ طمع خام کرتا ہے اصل میں وہ مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی کا مصداق ہے۔

(الحکم جلد ۶ ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء ص۹)

جو شخص اس جہان میں اندھا ہو وہ اس دوسرے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا بلکہ اندھوں سے بھی بدتر اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو دیکھنے کی آنکھیں اور اُس کے دریافت کرنے کے حواس اِسی جہان سے انسان اپنے ساتھ لے جاتا ہے جو یہاں اُن حواس کو نہیں پاتا وہاں وہ اُن حواس سے بہرہ ور نہیں ہوگا۔ یہ ایک دقیق راز ہے جس کو عام لوگ سمجھ بھی نہیں سکتے۔ اگر اس کے یہ معنی نہیں تو یہ تو پھر بالکل غلط ہے کہ اندھے اُس جہان میں بھی اندھے ہوں گے۔ اصل بات یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کو بغیر کسی غلطی کے پہچاننا اور اسی دنیا میں صحیح طور پر اُس کی صفات و اسماء کی معرفت حاصل کرنا آئندہ کی تمام راحتوں اور روشنیوں کی کلید ہے اور یہ آیت اس امر کی طرف صاف اشارہ کر رہی ہے کہ اسی دنیا سے ہم عذاب اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور اِس دنیا کی کورانہ زلیست اور ناپاک افعال ہی اُس دوسرے عالَم میں عذابِ جہنّم کی صورت میں نمودار ہو جائیں گے اور وہ کوئی نئی بات نہ ہوں گے۔ (الحکم

جلد ۶ نمبر ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

جو اس جہان میں اندھا ہے وہ اُس جہان میں بھی اندھا ہے جس کی منشا یہ ہے کہ اُس جہان کے مشاہدہ کے لئے اسی جہان سے ہم کو آنکھیں لے جانی ہیں۔ آیندہ جہان کو محسوس کرنے کے لئے حواس کی تیاری اسی جہان میں ہوگی پس کیا یہ گمان ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وعدہ کرے اور پورا نہ کرے۔ اندھے سے مراد وہ ہے جو روحانی معارف اور روحانی لذات سے خالی ہے۔ ایک شخص کورانہ تقلید سے مسلمانوں کے گھر پیدا ہو گیا مسلمان کہلاتا ہے دوسری طرف اسی طرح ایک عیسائی عیسائیوں کے ہاں پیدا ہو کر عیسائی ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے شخص کو خدا رسول اور قرآن کی کوئی عزت نہیں ہوتی اُس کی دین سے محبت بھی قابلِ اعتراض ہے خدا اور رسول کی ہتک کرنے والوں میں سے اُس کا گذر ہوتا ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ایسے شخص کی روحانی آنکھ نہیں اس میں محبتِ دین نہیں۔ ورنہ محبت والا اپنے محبوب کے برخلاف کیا کچھ پسند کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۷ جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

جو شخص اس دنیا میں خدا کے دیکھنے سے بے نصیب ہے وہ قیامت کو بھی محروم ہی ہوگا جیسے خدا نے خود فرمایا ہے مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى اس سے یہ مراد تو نہیں ہوسکتی کہ جو اس دنیا میں اندھے ہیں وہ قیامت کو بھی اندھے ہی ہوں گے بلکہ اس کا مفہوم یہی ہے کہ خدا کو ڈھونڈنے والوں کے دل نشانات سے ایسے منور کئے جاتے ہیں کہ وہ خدا کو دیکھ لیتے ہیں اور اس کی عظمت و جبروت کا مشاہدہ کرتے ہیں یہاں تک کہ دنیا کی ساری عظمتیں اور بزرگیاں اُن کی نگاہ میں ہیچ ہو جاتی ہیں۔ اور اگر خدا کو دیکھنے کی آنکھیں اور اس کے دریافت کرنے کے حواس سے اِس دنیا میں اس کو حصہ نہیں ملا تو اُس دوسرے عالم میں بھی نہیں دیکھ سکے گا۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۴۲ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۲ و الحکم جلد ۵ نمبر ۴۵ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

گناہ کے آثار تاریکی اور ظلمت تو اِس دنیا ہی میں شروع ہو جاتی ہے جیسے فرمایا مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔ (الحکم جلد ۲ نمبر ۲۴-۲۵ مورخہ ۲۰-۲۷ اگست ۱۸۹۸ء صفحہ ۱۱)

اگر انسان اندریں عالم تکمیل معرفت نکند چہ دلیل دارد کہ در روزِ آخرت خواہد کرد بجز ایں صورت کہ ما پیش مے کنیم دیگر صورت نیست مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۵-۶ مورخہ ۲۸ نومبر، ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۶)

(ترجمہ از مرتب) اگر انسان اِس عالم میں معرفت کی تکمیل نہیں کرتا تو اُس کے پاس کیا دلیل ہے کہ آخرت میں (اپنی معرفت کی تکمیل) کر لے گا سوائے اس صورت کے جو ہم پیش کرتے ہیں اور کوئی صورت نہیں۔ مَنْ كَانَ فِي هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔

عالمِ آخرت درحقیقت دُنیوی عالم کا ایک عکس ہے اور جو کچھ دنیا میں روحانی طور پر ایمان اور ایمان کے نتائج اور کُفر اور کُفر کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ عالمِ آخرت میں جسمانی طور پر ظاہر ہو جائیں گے۔ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى یعنی جو اس جہان میں اندھا ہے وہ اُس جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ (الحکم جلد ۷ ۲۲ مورخہ ۱۷ جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

جو اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا کیا مطلب کہ خدا تعالیٰ اور دوسرے عالم کے لذّات کے دیکھنے کے لئے اسی جہان میں حواس اور آنکھیں ملتی ہیں جس کو اس جہان میں نہیں ملیں اس کو وہاں بھی نہیں ملیں گی۔ اب یہ امر انسان کو اس طرف متوجہ کرتا ہے کہ انسان کا فرض ہے کہ وہ اِن حواس اور آنکھوں کے حاصل کرنے کے واسطے اسی عالم میں کوشش اور سعی کرے تاکہ دوسرے عالم میں بینا اٹھے۔

(الحکم جلد ۶ ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

خدا پر یقین بڑی دولت ہے پس اندھا وہی ہے جس کو اس دنیا میں خدا پر پورا یقین حاصل نہیں ہُوا۔

(الحکم جلد ۶ ۳۸ مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ ہر اندھا اور نابینا قیامت کو بھی اندھا اور نابینا اٹھے بلکہ اس سے مراد معرفت اور بصیرت کی نابینائی ہے۔ (الحکم جلد ۷ ۴ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى سے ظاہر ہے کہ دیدار کا وعدہ یہاں بھی ہے مگر ہم اسے جسمانیات پر نہیں حمل کر سکتے۔ (البدر جلد ۲ ۵ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۸)

خدا تعالیٰ نے انسان کے نفس میں معرفت کی پیاس رکھ دی ہے اور خود ہی فرمایا ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔ ادھر یہ کہا ادھر مکالمہ کا دروازہ بند ہوا تو پھر تو خدا نے دیدہ دانستہ اعمٰی رکھنا چاہا اور پھر وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا[1] کے کیا معنی ہوئے۔

(البدر جلد ۲ ۱۳ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹۹)

نجات کا اثر یہ ہے کہ اِسی دنیا میں اُس شخص کو بہشتی زندگی نصیب ہو۔ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔ (البدر جلد ۲ ۲۹ مورخہ ۷ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۲۶)

کوئی بات سوائے خدا تعالیٰ کے فضل کے حاصل نہیں ہو سکتی اور جسے اس دنیا میں فضل (حاصل) ہوگا اسے ہی آخرت میں بھی ہوگا جیسے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔ اسلئے

---

[1] العنکبوت آیت ۷۰

یہ ضروری ہے کہ ان حواس کے حصول کی کوشش اسی جہان میں کرنی چاہیئے کہ جس سے انسان کو بہشتی زندگی حاصل ہوتی ہے اور وہ حواس بلا تقویٰ کے نہیں مل سکتے۔ اِن آنکھوں سے انسان خدا کو نہیں دیکھ سکتا لیکن تقویٰ کی آنکھوں سے انسان خدا کو دیکھ سکتا ہے۔ اگر وہ تقویٰ اختیار کرے گا تو وہ محسوس کرے گا کہ خدا مجھے نظر آ رہا ہے اور ایک دن آویگا کہ خود کہہ اٹھے گا کہ مَیں نے خدا کو دیکھ لیا۔ (البدر جلد ۲ ۴۳ مورخہ ۱۶ ر نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۳۴)

جو تعلق عبودیت کا ربوبیت سے ہے وہ بہت گہرا اور انوار سے پُر ہے جس کی تفصیل نہیں ہوسکتی۔ جب وہ نہیں ہے تب تک انسان بہائم ہے۔ اگر دو چار دفعہ بھی لذّت محسوس ہوجائے تو اس چاشنی کا حصّہ مل گیا لیکن جسے دو چار دفعہ بھی نہ ملا وہ اندھا ہے۔ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔

(البدر جلد ۳ ۱۰ مورخہ ۸ ۔ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

جو یہاں خدا نہیں دیکھتا وہ وہاں بھی نہیں دیکھ سکے گا۔

(البدر جلد ۳ ۲۵ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

سچ ہے جس اندھے کے پاس روشنی موجود نہیں وہ کیسے دعویٰ کرسکتا ہے کہ مَیں روشنی رکھتا ہوں اور تقسیم کرسکتا ہوں۔ دیکھو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا انبیاء تو علیٰ وجہ البصیرۃ ہوتے ہیں پس جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ بصیرت کسی کو نہیں ملے گی تو گویا یہ خود اس دنیا سے اندھے ہی جاویں گے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۸-۳۹ مورخہ ۱۰/۱۷ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس جہان کے لئے انسان اسی عالَم سے حواس لے جاتا ہے۔ اسی جگہ سے وہ بصارت لے جاتا ہے جو وہاں کی اشیاء اور عجائبات کو دیکھے اور یہاں ہی سے وہ شنوائی لے جاتا ہے جو سُنے۔ گویا جو اس جہان میں وہاں کی باتیں دیکھتا اور سُنتا نہیں وہ وہاں بھی نہیں دیکھ سکے گا۔

(الحکم جلد ۹ ۲۹ مورخہ ۱۷ ر اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

قرآن شریف کی تعلیم کا خلاصہ مغز کے طور پر یہی بتایا ہے کہ خدا تعالیٰ کی محبت اس قدر استیلا کرے کہ ماسوی اللہ جل جاوے۔ یہی وہ عمل ہے جس سے گناہ جلتے ہیں اور یہی وہ نسخہ ہے جو اِس عالَم میں انسان کو وہ حواس اور بصیرت عطا کرتا ہے جس سے وہ اس عالَم کی برکات اور فیوض کو اس عالَم میں پاتا ہے اور معرفت اور بصیرت کے ساتھ یہاں سے رخصت ہوتا ہے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو اس زمرہ سے الگ ہیں۔ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔ (الحکم جلد ۹ ۳۵ مورخہ ۱۰ ر اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

اس کے یہ معنے نہیں کہ جو لوگ یہاں نابینا اور اندھے ہیں وہ وہاں بھی اندھے ہوں گے۔ نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ دیدار الٰہی کے لئے یہاں سے حواس اور آنکھیں لے جاوے اور ان آنکھوں کے لئے ضرورت ہے تبتّل کی۔

تزکیہ نفس کی اور یہ کہ خدا تعالیٰ کو سب پر مقدم کرو اور خدا تعالیٰ کے ساتھ دیکھو، سُنو اور بولو! اسی کا نام فنافی اللہ ہے اور جب تک یہ مقام اور درجہ حاصل نہیں ہوتا نجات نہیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۱)

جب یہ یقین کر لیا گیا کہ اللہ تعالیٰ سے مکالمہ کا شرف ملنے کا ہی نہیں اور خوارق اب دیئے ہی نہیں جا سکتے تو پھر مجاہدہ اور دعا جو اس کے لئے ضروری ہیں محض بیکار ہوں گے اور اس کے لئے کوئی جرأت نہ کرے گا اور اس امت کے لئے نعوذ باللہ مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى صادق آئے گا اور اس سے خاتمہ کا بھی پتہ لگ جائے گا کہ وہ کیسا ہوگا کیونکہ اس میں تو کوئی شک وشبہ ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ جہنمی زندگی ہے پھر آخرت میں بھی جہنم ہی ہوگا اور اسلام ایک جھوٹا مذہب ٹھیرے گا اور نعوذ باللہ خدا نے بھی اس امت کو دھوکا دیا کہ خیر الامت بنا کر پھر کچھ بھی اسے نہ دیا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۸ مورخہ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

اِس نابینائی سے یہی مراد ہے کہ انسان خدا تعالیٰ کی تجلّی اور ان امور کو جو حالت غیب میں ہیں اسی عالم میں مشاہدہ نہ کرے اور یہ نابینائی کا کچھ حصہ غیب والے میں پایا جاتا ہے لیکن هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ کے موافق جو شخص ہدایت پا لیتا ہے اس کی وہ نابینائی دور ہو جاتی ہے اور وہ اس حالت سے ترقی کر جاتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ر جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)

ظاہرا تو اس کے معنے یہی ہیں کہ جو اس جگہ اندھے ہیں وہ آخرت کو بھی اندھے ہی رہیں گے مگر یہ معنے کون قبول کرے گا جبکہ دوسری جگہ پر صاف طور پر لکھا ہے کہ خواہ کوئی سوجاکھا ہو خواہ اندھا جو ایمان اور اعمالِ صالحہ کے ساتھ جاوے گا وہ تو بینا ہوگا لیکن جو اس جگہ ایمانی روشنی سے بے نصیب رہے گا اور خدا کی معرفت حاصل نہیں کرے گا وہ آخر کو بھی اندھا ہی رہے گا کیونکہ یہ دنیا مزرعہ آخرت ہے جو کچھ کوئی یہاں بوئے گا وہی کاٹے گا اور جو اس جگہ سے بینائی لے جائے گا وہی بینا ہوگا۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱ مورخہ ۲ر جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

جو شخص اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا یعنی خدا کے دیکھنے کے حواس اور نجات ابدی کا سامان اسی دنیا سے انسان ساتھ لے جاتا ہے۔ (لیکچر چشمہ معرفت صفحہ ۴۲)

اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا۝

اگر یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پر کچھ جھوٹ باندھتا تو ہم اس کو زندگی اور موت سے دو چند عذاب چکھاتے

اس سے مراد یہ ہے کہ نہایت سخت عذاب سے ہلاک کرتے۔ (اربعین ۲ ص ۱ حاشیہ)

﴿أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ إِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴾

نماز کیا چیز ہے وہ دعا ہے جو تسبیح۔ تحمید۔ تقدیس اور استغفار اور درود کے ساتھ تضرّع سے مانگی جاتی ہے۔ سو جب تم نماز پڑھو تو بیخبر لوگوں کی طرح اپنی دعاؤں میں صرف عربی الفاظ کے پابند نہ رہو کیونکہ ان کی نماز اور ان کا استغفار سب رسمیں ہیں جن کے ساتھ کوئی حقیقت نہیں لیکن تم جب نماز پڑھو تو بجز قرآن کے جو خدا کا کلام ہے اور بجز بعض ادعیہ ماثورہ کے کہ وہ رسول کا کلام ہے باقی اپنی تمام عام دعاؤں میں اپنی زبان میں ہی الفاظ متضرعانہ ادا کر لیا کرو تا ہو کہ تمہارے دلوں پر اُس عجز و نیاز کا کچھ اثر ہو۔ پنجگانہ نمازیں کیا چیز ہیں وہ تمہارے مختلف حالات کا فوٹو ہے تمہاری زندگی کے لازم حال پانچ تغیر ہیں جو بلا کے وقت تم پر وارد ہوتے ہیں اور تمہاری فطرت کے لئے اُن کا وارد ہونا ضروری ہے (۱) پہلے جبکہ تم مطلع کئے جاتے ہو کہ تم پر ایک بلا آنے والی ہے مثلاً جیسے تمہارے نام عدالت سے ایک وارنٹ جاری ہوا یہ پہلی حالت ہے جس نے تمہاری تسلّی اور خوشحالی میں خلل ڈالا سو یہ حالت زوال کے وقت سے مشابہ ہے کیونکہ اس سے تمہاری خوشحالی میں زوال آنا شروع ہوا اس کے مقابل پر نماز ظہر متعین ہوئی جس کا وقت زوال آفتاب سے شروع ہوتا ہے۔

(۲) دوسرا تغیر اُس وقت تم پر آتا ہے جبکہ تم بلا کے محل سے بہت نزدیک کئے جاتے ہو مثلاً جبکہ تم بذریعہ وارنٹ گرفتار ہو کر حاکم کے سامنے پیش ہوتے ہو۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب تمہارا خوف سے خون خشک ہو جاتا ہے اور تسلّی کا نور تم سے رخصت ہونے کو ہوتا ہے سو یہ حالت تمہاری اُس وقت سے مشابہ ہے جبکہ آفتاب سے نور کم ہو جاتا ہے اور نظر اس پر جم سکتی ہے اور صریح نظر آتا ہے کہ اب اس کا غروب نزدیک ہے اس روحانی حالت کے مقابل پر نماز عصر مقرر ہوئی۔

(۳) تیسرا تغیر تم پر اُس وقت آتا ہے جو اس بلا سے رہائی پانے کی بکلّی اُمید منقطع ہو جاتی ہے مثلاً جیسے تمہارے نام فرد قرارداد جرم لکھی جاتی ہے اور مخالفانہ گواہ تمہاری ہلاکت کے لئے گذر جاتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب تمہارے حواس خطا ہو جاتے ہیں اور تم اپنے تئیں ایک قیدی سمجھنے لگتے ہو۔ سو یہ حالت اُس وقت سے مشابہ ہے جبکہ آفتاب غروب ہو جاتا ہے اور تمام امیدیں دن کی روشنی کی ختم ہو جاتی ہیں اس روحانی حالت کے مقابل پر نماز مغرب مقرر ہے۔

(۴) چوتھا تغیر اس وقت تم پر آتا ہے کہ جب بلا تم پر وارد ہی ہو جاتی ہے اور اس کی سخت تاریکی تم پر احاطہ کر لیتی ہے مثلاً جبکہ فرد قرارداد جرم اور شہادتوں کے بعد حکم سزا تم کو سُنایا جاتا ہے اور قید کے لئے ایک پولیس مین کے تم حوالہ کئے جاتے ہو سو یہ حالت اس وقت سے مشابہ ہے جبکہ رات پڑ جاتی ہے اور ایک سخت اندھیرا پڑ جاتا ہے اس روحانی حالت کے مقابل پر نماز عشا مقرر ہے۔

(۵) پھر جبکہ تم ایک مدّت تک اس مصیبت کی تاریکی میں بسر کرتے ہو تو پھر آخر خدا کا رحم تم پر جوش مارتا ہے اور تمہیں اُس تاریکی سے نجات دیتا ہے مثلاً جیسے تاریکی کے بعد پھر آخر کار صبح نکلتی ہے اور پھر وہی روشنی دن کی اپنی چمک کے ساتھ ظاہر ہو جاتی ہے سو اس روحانی حالت کے مقابل پر نماز فجر مقرر ہے اور خدا نے تمہارے فطرتی تغیرات میں پانچ حالتیں دیکھ کر پانچ نمازیں تمہارے لئے مقرر کیں اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ نمازیں خاص تمہارے نفس کے فائدہ کے لئے ہیں پس اگر تم چاہتے ہو کہ ان بلاؤں سے بچے رہو تو تم پنجگانہ نمازوں کو ترک نہ کرو کہ وہ تمہاری اندرونی اور روحانی تغیّرات کا ظلّ ہیں۔ نماز میں آنے والی بلاؤں کا علاج ہے تم نہیں جانتے کہ نیا دن چڑھنے والا کس قسم کے قضاء و قدر تمہارے لئے لائے گا پس قبل اس کے جو دن چڑھے تم اپنے مولیٰ کی جناب میں تضرّع کرو کہ تمہارے لئے خیر و برکت کا دن چڑھے۔ (کشتی نوح صفحہ ۶۳ تا صفحہ ۶۵ طبع اوّل)

یاد رکھو کہ یہ جو پانچ وقت نماز کے لئے مقرر ہیں یہ کوئی تحکّم اور جبر کے طور پر نہیں بلکہ اگر غور کرو تو یہ دراصل روحانی حالتوں کی ایک عکسی تصویر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ یعنی قائم کرو نماز کو دلوك الشّمس سے۔ اب دیکھو اللہ تعالیٰ نے یہاں قیام صلوٰۃ کو دلوك الشّمس سے لیا ہے دلوك کے معنوں میں گو اختلاف ہے لیکن دوپہر کے ڈھلنے کے وقت کا نام دلوك ہے۔ اب دلوك سے لے کر پانچ نمازیں رکھ دیں۔ اس میں حکمت اور سرّ کیا ہے قانون قدرت دکھاتا ہے کہ روحانی تذلّل اور انکسار کے مراتب بھی دلوك ہی سے شروع ہوتے ہیں اور پانچ ہی حالتیں آتی ہیں پس یہ طبعی نماز بھی اُس وقت سے شروع ہوتی ہے جب حُزن اور ہمّ و غم کے آثار شروع ہوتے ہیں۔ اُس وقت جبکہ انسان پر کوئی آفت یا مصیبت آتی ہے کو کس قدر تذلّل اور انکساری کرتا ہے۔ اب اُس وقت اگر زلزلہ آوے تو تم سمجھ سکتے ہو کہ طبیعت میں کیسی رقت اور انکساری پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پر سوچو کہ اگر مثلاً کسی شخص پر نالش ہو تو سمن یا وارنٹ آنے پر اُس کو معلوم ہوگا کہ فلاں دفعہ فوجداری یا دیوانی میں نالش ہوئی ہے۔ اب بعد مطالعہ وارنٹ اس کی حالت میں گویا نصف النّہار کے بعد زوال شروع ہوا کیونکہ وارنٹ یا سمن تک تو اُسے کچھ معلوم نہ تھا۔ اب خیال پیدا ہوا کہ خدا جانے ادھر وکیل ہو یا کیا ہو؟ اس قسم کے تردّدات اور تفکّرات سے جو زوال پیدا ہوتا ہے یہ وہی حالت دلوک ہے اور یہ پہلی حالت ہے جو نماز ظہر کے قائم مقام ہے اور اس کی عکسی حالت نماز ظہر ہے۔ اب دوسری حالت اس پر وہ آتی ہے جبکہ وہ

کمرۂ عدالت میں کھڑا ہو۔ فریق مخالف اور عدالت کی طرف سے سوالات جرح ہو رہے ہیں اور وہ ایک عجیب حالت ہوتی ہے۔ یہ وہ حالت اور وقت ہے جو نماز عصر کا نمونہ ہے کیونکہ عصر گھونٹنے اور نچوڑنے کو کہتے ہیں۔ جب حالت اور بھی نازک ہو جاتی ہے اور فرد قرارداد جرم لگ جاتی ہے تو یاس اور ناامیدی بڑھتی ہے کیونکہ اب خیال ہوتا ہے کہ سزا مل جاوے گی یہ وہ وقت ہے جو مغرب کی نماز کا عکس ہے۔ پھر جب حکم سُنایا گیا اور کنسٹیبل یا کورٹ انسپکٹر کے حوالہ کیا گیا تو وہ روحانی طور پر نماز عشاء کی عکسی تصویر ہے۔ یہاں تک کہ نماز کی صبح صادق ظاہر ہوئی اور اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ يُسْرًا[1] کی حالت کا وقت آگیا تو روحانی نماز فجر کا وقت آگیا اور فجر کی نماز اس کی عکسی تصویر ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۶۶-۱۶۷)

۸۰۔ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ○

عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا خدا تجھے اس مقام پر اٹھائے گا جس میں تو تعریف کیا جائے گا۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دوم صفحہ ۹۳)

عنقریب وہ مقام تجھے ملے گا جس میں تیری تعریف کی جائے گی یعنی گو اوّل میں احمق اور نادان لوگ بدباطنی اور بدظنی کی راہ سے بدگوئی کرتے ہیں اور نالائق باتیں منہ پر لاتے ہیں لیکن آخر خدائے تعالیٰ کی مدد کو دیکھ کر شرمندہ ہوں گے اور سچائی کے کھلنے سے چاروں طرف سے تعریف ہوگی۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد اوّل صفحہ ۱۱۱)

وہ وقت قریب ہے کہ میں ایسے مقام پر تجھے کھڑا کروں گا کہ دنیا تیری حمد و ثنا کرے گی۔

(دافع البلاء صفحہ ۸)

۸۱۔ وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ○

---

[1] الم نشرح آیت ۷

قُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ .... خدا سے اپنے صدق کا ظہور مانگ۔

(بحوالہ تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۶ صفحہ ۵۴)

کہہ کہ خدایا پاک زمین میں مجھے جگہ دے۔ (دافع البلاء صفحہ ۲۱)

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ○

کئی مقام قرآن شریف میں اشارات و تصریحات سے بیان ہوا ہے کہ آنحضرت صلعم مظہر اتم الوہیت ہیں اور اُن کا کلام خدا کا کلام اور اُن کا ظہور خدا کا ظہور اور اُن کا آنا خدا کا آنا ہے چنانچہ قرآن شریف میں اِس بارے میں ایک یہ آیت بھی ہے قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا کہ حق آیا اور باطل بھاگ گیا اور باطل نے بھاگنا ہی تھا۔ حق سے مراد اس جگہ اللہ جلّ شانہٗ اور قرآن شریف اور آنحضرت صلعم ہیں اور باطل سے مراد شیطان اور شیطان کا گروہ اور شیطانی تعلیمیں ہیں۔ سو دیکھو اپنے نام میں خدائے تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو کیونکر شامل کر لیا اور آنحضرت کا ظہور فرمانا خدا تعالیٰ کا ظہور فرمانا ہوا۔ ایسا جلالی ظہور جس سے شیطان معہ اپنے تمام لشکروں کے بھاگ گیا اور اس کی تعلیمیں ذلیل اور حقیر ہو گئیں اور اُس کے گروہ کو بڑی بھاری شکست آئی۔ اسی جامعیت تامہ کی وجہ سے سورہ آل عمران جزو تیسرے میں مفصل یہ بیان ہے کہ تمام نبیوں سے عہد و اقرار لیا گیا کہ تم پر واجب و لازم ہے کہ عظمت و جلالیت شان ختم الرسل پر جو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ایمان لاؤ اور ان کی اس عظمت اور جلالیت کی شان اشاعت کرنے میں بدل و جان مدد کرو۔ اسی وجہ سے حضرت آدم صفی اللہ سے لے کر تا حضرت مسیح کلمۃ اللہ جس قدر نبی و رسول گزرے ہیں وہ سب کے سب عظمت و جلالیت آنحضرت صلعم کا اقرار کرتے آئے ہیں۔ (سرمہ چشم آریہ صفحہ ۲۲۹-۲۳۲ حاشیہ)

حق آیا اور باطل بھاگ گیا اور باطل بھاگنے والا ہی ہے۔ (آسمانی فیصلہ ٹائیٹل پیج)

حق آیا اور باطل بھاگ گیا اور باطل کب حق کے مقابل ٹھہر سکتا ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۷)

حق آیا اور باطل بھاگ گیا اور باطل نے ایک دن بھاگنا ہی تھا۔ (تریاق القلوب صفحہ ۶۱ حاشیہ)

کہہ حق آیا اور باطل بھاگ گیا۔ (ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۲۴)

آیا حق اور بھاگ گیا باطل بہ تحقیق باطل ہے بھاگنے والا۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد اوّل صفحہ ۹۹)

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ [1] پر سوچتے سوچتے مجھے

[1] الصّف آیت ۱۰

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں دو لفظ ہدیٰ اور حق کے رکھے ہیں۔ ہدیٰ تو یہ ہے کہ اندر روشنی پیدا کرے معمہ نہ رہے یہ گویا اندرونی اصلاح کی طرف اشارہ ہے جو مہدی کا کام ہے اور حق کا لفظ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ خارجی طور پر باطل کو شکست دیوے چنانچہ دوسری جگہ آیا ہے جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اور خود اس آیت میں بھی فرمایا ہے لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ[1] یعنی اُس رسول کی آمد کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ حق کو غلبہ دے گا یہ غلبہ تلوار اور تفنگ سے نہیں ہوگا بلکہ وجوہ عقلیہ سے ہوگا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ..... قرآن شریف میں بھی یہ آیت بتوں کے ٹوٹنے اور اسلام کے غلبہ کے واسطے آئی ہے۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۳ مورخہ ۲۰ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

۸۵ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ۟

كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ یعنی ہر یک شخص اپنی فطرت کے موافق عمل کرتا ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۲۵۹ حاشیہ)

ہر ایک اپنے قویٰ اور اشکال کے موافق عمل کرنے کی توفیق دیا جاتا ہے۔

(جنگ مقدس صفحہ ۴ پرچہ ۵ رجون ۱۸۹۳ء)

ہر شخص اپنے مادہ اور فطرت کے مطابق عمل کر رہا ہے۔

(مکتوبات جلد ۵ نمبر ۵ صفحہ ۲۰ (مکتوب نمبر ۸ بنام حضرت منشی عبداللہ سنوری)

یہ سچ ہے کہ سب انسان ایک مزاج کے نہیں ہوتے اسی لئے قرآن شریف میں آیا ہے كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ بعض آدمی ایک قسم کے اخلاق میں اگر عمدہ ہیں تو دوسرے قسم میں کمزور۔ اگر ایک خُلق کا رنگ اچھا ہے تو دوسرے کا بُرا لیکن تاہم اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اصلاح ناممکن ہے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۳۴ مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

ہر شخص اپنے قویٰ کے موافق کام کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۴۳ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

۸۶ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ

[1] الصّف آیت ۱۰

اَلعِلمِ اِلاَّ قَلِیلاً ○

ہر یک جسم میں جتنے ذرات ہیں اُسی قدر روحوں کا اس سے تعلق ہے۔ اگر ایک قطرہ پانی کو خوردبین سے دیکھا جائے تو ہزاروں کیڑے اُس میں نظر آتے ہیں ویسا ہی پھلوں میں اور بوٹیوں میں اور ہوا میں بھی کیڑے مشہود و محسوس ہیں بہر حال ہر یک جسم دار چیز کیڑوں سے بھری ہوئی ہے مگر کبھی وہ کیڑے مخفی ہوتے ہیں یا یُوں کہو کہ بالقوہ پائے جاتے ہیں اور کبھی مکمن قوہ سے حیز فعل میں آجاتے ہیں۔ مثلاً جس اناج کو دیکھو تو بظاہر ایسا معلوم ہوگا کہ اُس میں کوئی کیڑا نہیں اور پھر خود بخود اُس کے اندر میں ہی سے کچھ تغیر پیدا ہو کر اِس قدر کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں کہ گویا وہ سب جسم کیڑے ہی کیڑے ہیں۔ اِس سے ظاہر ہے کہ ارواح کو اجسام سے لازمی اور دائمی تعلق پڑا ہوا ہے۔

(سرمہ چشم آریہ صفحہ ۸۶-۸۷ حاشیہ)

روحوں اور اجزاء صغار عالم کا غیر مخلوق اور قدیم اور انادی ہونا اصول آریہ سماج کا ہے اور یہ اصول صریح خلافِ عقل ہے اگر ایسا ہو تو پرمیشر کی طرح ہر ایک چیز واجب الوجود ٹھہر جاتی ہے اور خدائے تعالیٰ کے وجود پر کوئی دلیل قائم نہیں رہتی بلکہ کاروبار دین کا سب کا سب ابتر اور خلل پذیر ہو جاتا ہے کیونکہ اگر ہم سب کے سب خدائے تعالیٰ کی طرح غیر مخلوق اور انادی ہی ہیں تو پھر خدائے تعالیٰ کا ہم پر کونسا حق ہے اور کیوں وہ ہم سے اپنی عبادت اور پرستش اور شکر گذاری چاہتا ہے اور کیوں گناہ کرنے سے ہم کو سزا دینے کو طیار ہوتا ہے اور جس حالت میں ہماری روحانی بینائی اور روحانی تمام قوتیں خود بخود قدیم سے ہیں تو پھر ہم کو فانی قوتوں کے پیدا ہونے کے لئے کیوں پرمیشر کی حاجت ٹھہری۔

(سرمہ چشم آریہ صفحہ ۶۲)

آریہ صاحبوں کا اعتقاد ہے کہ پرمیشر نے کوئی روح پیدا نہیں کی بلکہ کُل ارواح انادی اور قدیم اور غیر مخلوق ہیں۔ ایسا ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مُکتی یعنی نجات ہمیشہ کے لئے انسان کو نہیں مل سکتی بلکہ ایک مدت مقررہ تک مُکتی خانہ میں رکھ کر پھر اُس سے باہر نکالا جاتا ہے۔ اب ہمارا اعتراض یہ ہے کہ یہ دونوں اعتقاد ایسے ہیں کہ ایک کے قائم ہونے سے تو خدائے تعالیٰ کی توحید بلکہ اُس کی خدائی ہی دُور ہوتی ہے اور دوسرا اعتقاد ایسا ہے کہ بندہ وفادار پر ناحق کی سختی ہوتی ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ اگر تمام ارواح کو اور ایسا ہی اجزائے صغار اجسام کو قدیم اور انادی مانا جائے۔ تو اس میں کئی قباحتیں ہیں منجملہ اُن کے ایک تو یہ کہ اِس صورت میں خدائے تعالیٰ کے وجود پر کوئی دلیل قائم نہیں ہوسکتی کیونکہ جس حالت میں بقول آریہ صاحبان ارواح یعنی جیو خود بخود موجود ہیں اور ایسا ہی اجزائے صغار اجسام بھی خود بخود ہیں تو پھر صرف جوڑنے جاڑنے کے لئے ضرورت صانع کی ثابت نہیں ہوسکتی بلکہ ایک دہریہ جو خدائے تعالیٰ کا مُنکر ہے عذر پیش کرسکتا ہے کہ جس حالت میں تم نے کُل چیزوں کا وجود خود بخود

بغیر ایجاد پرمیشر کے آپ ہی مان لیا ہے تو پھر اس بات پر کیا دلیل ہے کہ ان چیزوں کے باہم جوڑنے جاڑنے کے لئے پرمیشر کی حاجت ہے۔ دوسری یہ قباحت کہ ایسا اعتقاد خود خدائے تعالیٰ کو اُس کی خدائی سے جواب دے رہا ہے کیونکہ جو لوگ علم نفس اور خواص ارواح سے واقف ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں کہ جس قدر ارواح میں عجائب وغرائب خواص بھرے ہوئے ہیں وہ صرف جوڑنے جاڑنے سے پیدا نہیں ہو سکتے۔ مثلاً رُوحوں میں ایک قوت کشفی ہے جس سے وہ پوشیدہ باتوں کو بعد مجاہدات دریافت کر سکتی ہیں اور ایک قوت ان میں عقلی ہے جس سے وہ امور عقلیہ کو معلوم کر سکتی ہیں ایسا ہی ایک قوت محبت بھی اُن میں پائی جاتی ہے جس سے وہ خدائے تعالیٰ کی طرف جھکتی ہیں۔ اگر ان تمام قوتوں کو خود بخود بغیر ایجاد کسی موجد کے مان لیا جائے تو پرمیشر کی اس میں بڑی ہتک عزت ہے۔ گویا یہ کہنا پڑے گا کہ جو عمدہ اور اعلیٰ کام تھا وہ تو خود بخود ہے اور جو ادنیٰ اور ناقص کام تھا وہ پرمیشر کے ہاتھ سے ہوا ہے۔ اور اس بات کا اقرار کرنا ہوگا کہ جو خود بخود عجائب حکمتیں پائی جاتی ہیں وہ پرمیشر کے کاموں سے کہیں بڑھ کر ہیں ایسا کہ پرمیشر بھی اُن سے حیران ہے۔ غرض اس اعتقاد سے آریہ صاحبوں کے خدا کی خدائی پر بڑا صدمہ پہنچے گا یہاں تک کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہوگا اور اس کے وجود پر کوئی عقلی دلیل قائم نہ ہو سکے گی اور نیز وہ مبدء کُل فیوض کا نہیں ہو سکے گا بلکہ اس کا صرف ایک ناقص کام ہوگا اور جو اعلیٰ درجہ کے عجائب کام ہیں اُن کی نسبت یہی کہنا پڑے گا کہ وہ سب خود بخود ہیں لیکن ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ اگر فی الحقیقت ایسا ہی ہے تو اس سے اگر فرضی طور پر پرمیشر کا وجود مان بھی لیا جائے تب بھی وہ نہایت ضعیف اور نکمّا سا وجود ہوگا جس کا عدم و وجود مساوی ہوگا یہاں تک کہ اگر اس کا مرنا بھی فرض کیا جائے تو رُوحوں کا کچھ بھی حرج نہ ہوگا اور وہ اس لائق ہرگز نہیں ہوگا کہ کوئی روح اس کی بندگی کرنے کے لئے مجبور کی جائے کیونکہ ہر ایک رُوح اُس کو جواب دے سکتی ہے کہ جس حالت میں تم نے مجھے پیدا ہی نہیں کیا اور نہ میری طاقتوں اور قوتوں اور استعدادوں کو تم نے بنایا تو پھر آپ کس استحقاق سے مجھ سے اپنی پرستش چاہتے ہیں اور نیز جبکہ پرمیشر رُوحوں کا خالق ہی نہیں تو اُن پر محیط بھی نہیں ہو سکتا۔ اور جب احاطہ نہ ہو سکا تو پرمیشر اور رُوحوں میں حجاب ہو گیا۔ اور جب حجاب ہوا تو پرمیشر سرب گیانی نہ ہو سکا یعنی علم غیب پر قادر نہ ہوا۔ اور جب قادر نہ رہا تو اُس کی سب خدائی درہم برہم ہو گئی تو گویا پرمیشر ہی ہاتھ سے گیا اور یہ بات ظاہر ہے کہ علم کامل کسی شئے کا اُس کے بنانے پر قادر کر دیتا ہے اس لئے حکما کا مقولہ ہے کہ جب علم اپنے کمال تک پہنچ جائے تو وہ عین عمل ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں بالطبع سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا پرمیشر کو رُوحوں کی کیفیت اور گُنہ کا پورا پورا علم بھی ہے یا نہیں۔ اگر اُس کو پورا پورا علم ہے تو پھر کیا وجہ کہ باوجود پورا پورا علم ہونے کے پھر ایسی ہی روح بنا نہیں سکتا سو اس سوال پر غور کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف یہی نہیں کہ پرمیشر روحوں کے پیدا کرنے پر قادر نہیں بلکہ اُن کی نسبت پورا پورا علم بھی نہیں رکھتا۔ دوسرا ٹکڑا ہمارے سوال کا حق العباد سے متعلق ہے یعنی یہ کہ آریہ صاحبان

کے اعتقاد مذکورہ بالا کے رُو سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ پرمیشر اپنے بندوں سے بھی ناحق کا ایک بخل رکھتا ہے کیونکہ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ مکتی اور نجات کی اصل حقیقت یہی ہے کہ انسان ماسوائے اللہ کی محبت سے منہ پھیر کر پرمیشر کی محبت میں ایسا محو ہو جائے کہ جس طرح عاشق اپنے محبوب کے دیکھنے سے لذت اٹھاتا ہے ایسا ہی اپنے محبوب حقیقی کے تصور سے لذت اٹھائے اور محبت بجز معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ اور قاعدہ کی بات ہے کہ موجب محبت کے دو ہی امر ہیں یا حُسن یا احسان پس جب انسان بہ باعث اپنی کامل معرفت کے خدائے تعالیٰ کے حُسن و احسان پر اطلاع کامل طور پر پاتا ہے تو لامحالہ اُس سے کامل محبت پیدا ہو جاتی ہے اور کامل محبت سے لذت ملتی ہے پس اسی جہان سے بہشتی زندگی عارف کی شروع ہو جاتی ہے اور وہی معرفت اور محبت عالمِ آخرت میں سرور دائمی کا موجب ہو جاتی ہے جس کو دوسرے لفظوں میں نجات سے تعبیر کرتے ہیں۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ جب ایک شخص کو پورا پورا سامان نجات کا میسر آ گیا اور پرمیشر کی کرپا اور فضل سے مکتی پا گیا تو پھر کیوں پرمیشر اس کو ناکردہ گناہ مکتی خانہ سے باہر نکالتا ہے کیا وہ اِس بات سے چڑتا ہے کہ کوئی عاجز بندہ ہمیشہ کے لئے آرام پا سکے۔ جس حالت میں ابدی بقا کی رُوحوں میں قوت رکھی گئی ہے تو کیا پرمیشر اپنے بندوں کو ابدی سرور نہیں دے سکتا۔ (سرمہ چشم آریہ صفحہ ۹۱-۹۴)

اگر سب ارواح اور اجسام خود بخود پرمیشر کی طرح قدیم اور انادی ہیں اور اپنے اپنے وجود کے آپ ہی خدا ہیں تو پرمیشر اِس دعویٰ کا ہرگز مجاز نہیں رہا کہ مَیں اِن چیزوں کا ربّ اور پیدا کنندہ ہوں کیونکہ جب کہ اِن چیزوں نے پرمیشر کے ہاتھ سے وجود ہی نہیں لیا تو پھر ایسا پرمیشر ان کا ربّ اور مالک کیونکر ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی بچہ بنا بنایا آسمان سے گرے یا زمین کے خمیر سے خود بخود پیدا ہو جائے تو کسی عورت کو یہ دعویٰ ہرگز نہیں پہنچتا کہ یہ میرا بچہ ہے بلکہ اس کا بچہ وہی ہوگا جو اس کے پیٹ سے نکلا ہے۔ سو جو خدا کے ہاتھ سے نکلا ہے وہی خدا کا ہے اور جو اس کے ہاتھ سے نہیں نکلا وہ اُس کا کسی طور سے نہیں ہو سکتا۔ کوئی صالح اور بھلا مانس ایسی چیزوں پر ہرگز قبضہ نہیں کرتا جو اُس کی نہ ہوں تو پھر کیونکر آریوں کے پرمیشر نے ایسی چیزوں پر قبضہ کر لیا جن پر قبضہ کرنے کا اُس کو کوئی استحقاق نہیں۔

(سرمہ چشم آریہ صفحہ ۹۸)

عیسائیوں نے جب اپنی نادانی سے یہ کہنا شروع کیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کلمۃ اللہ ہیں یعنی ان کی رُوح کلمہ الٰہی ہے جو متشکل بروح ہو گئی ہے تو خدائے تعالیٰ نے اس کا یہ حقّانی جواب دیا کہ کوئی بھی ایسی رُوح نہیں جو کلمۃ اللہ نہ ہو اور مجرّد الٰہی حکم سے نہ نکلی ہو۔ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہ بات جو کلمات اللہ بصورت ارواح و دیگر مخلوق جلوہ گر ہو جاتی ہیں یہ خالقیت کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے اور یہ اسرار الٰہیہ میں سے ایک باریک نکتہ ہے جس کی طرف کسی انسانی عقل کو خیال نہیں آیا اور خدائے تعالیٰ کے پاک اور کامل کلام نے اُس کو اپنے الٰہی نور سے منکشف کیا ہے اور اگر ایسا نہ مانا جائے کہ خدائے تعالیٰ اپنے ہی کلمہ اور امر سے ارواح

اور اجسام کو وجود پذیر کر لیتا ہے تو پھر آخر یہ ماننا پڑے گا کہ جب تک باہر سے اجسام اور رُوحیں نہ آویں پرمیشر کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ (سُرمہ چشم آریہ صلا)

ارواح کا حادث اور مخلوق ہونا قرآن شریف میں بڑی بڑی قوی اور قطعی دلائل سے بیان کیا گیا ہے چنانچہ برعایت ایجاز و اجمال چند دلائل اُن میں سے نمونہ کے طور پر اس جگہ لکھے جاتے ہیں۔

اوّل یہ بات بہ بداہت ثابت ہے کہ تمام رُوحیں ہمیشہ اور ہر حال میں خدائے تعالیٰ کے ماتحت اور زیر حکم ہیں اور بجز مخلوق ہونے کے اور کوئی وجہ موجود نہیں جس نے رُوحوں کو ایسے کامل طور پر خدائے تعالیٰ کے ماتحت اور زیر حکم کر دیا ہو سو یہ روحوں کے حادث اور مخلوق ہونے پر اوّل دلیل ہے۔

دوم۔ یہ بات بھی بہ بداہت ثابت ہے کہ تمام رُوحیں خاص خاص استعدادوں اور طاقتوں میں محدود اور محصور ہیں جیسا کہ بنی آدم کے اختلاف روحانی حالات و استعدادات پر نظر کر کے ثابت ہوتا ہے اور یہ تحدید ایک محدّد کو چاہتی ہے جس سے ضرورت مُحدِث کی ثابت ہو کر (جو محدّد ہے) حدوث روحوں کا بہ پایہ ثبوت پہنچتا ہے۔

سوم۔ یہ بات بھی کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ تمام روحیں عجز و احتیاج کے داغ سے آلودہ ہیں اور اپنی تکمیل اور بقا کے لئے ایک ایسی ذات کی محتاج ہیں جو کامل اور قادر اور عالم اور فیاض مطلق ہو اور یہ امر اُن کی مخلوقیت کو ثابت کرنے والا ہے۔

چہارم۔ یہ بات بھی ایک ادنیٰ غور کرنے سے ظاہر ہوتی ہے کہ ہماری رُوحیں اجمالی طور پر اُن سب متفرق الٰہی حکمتوں اور صنعتوں پر مشتمل ہیں جو اجرام علوی و سفلی میں پائے جاتے ہیں۔ اِسی وجہ سے دنیا باعتبار اپنے جزئیات مختلفہ کے عالم تفصیلی ہے اور انسان عالم اجمالی کہلاتا ہے یا یوں کہو کہ یہ عالمِ صغیر اور وہ عالمِ کبیر ہے پس جبکہ ایک جزئی عالم کے بوجہ پائے جانے پُرحکمت کاموں کے ایک صانع حکیم کی صنعت کہلاتی ہے تو خیال کرنا چاہئے کہ وہ چیز کیونکر صنعت الٰہی نہ ہوگی جس کا وجود اپنے عجائبات ذاتی کے رُو سے گویا تمام جزئیات عالم کی عکسی تصویر ہے اور ہر ایک جزئی کے خواص عجیبہ اپنے اندر رکھتی ہے اور حکمتِ بالغہ ایزدی پر بوجہ اتم مشتمل ہے۔

ایسی چیز جو مظہر جمیع عجائبات صنعت الٰہی ہے مصنوع اور مخلوق ہونے سے باہر نہیں رہ سکتی بلکہ وہ سب چیزوں سے اوّل درجہ پر مصنوعیت کی مُہر اپنے وجود پر رکھتی ہے اور سب سے زیادہ تر اور کامل تر صانع قدیم کے وجود پر دلالت کرتی ہے۔ سو اِس دلیل سے رُوحوں کی مخلوقیت صرف نظری طور پر ثابت نہیں بلکہ درحقیقت اجلیٰ بدیہات ہے۔ ماسوا اس کے دوسری چیزوں کو اپنی مخلوقیت کا علم نہیں مگر رُوحیں فطرتی طور پر اپنی مخلوقیت کا علم رکھتی ہیں۔ ایک جنگلی آدمی کی رُوح بھی اس بات پر راضی نہیں ہو سکتی کہ وہ خود بخود ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى[1] یعنی رُوحوں سے مَیں نے سوال کیا کہ کیا میں تمہارا رب (پیدا کنندہ) نہیں ہوں؟

---

[1] الاعراف آیت ۱۷۳

تو انہوں نے جواب دیا کہ کیوں نہیں۔ یہ سوال و جواب حقیقت میں اُس پیوند کی طرف اشارہ ہے جو مخلوق کو اپنے خالق سے قدرتی طور پر متحقق ہے جس کی شہادت رُوحوں کی فطرت میں نقش کی گئی ہے۔

پنجم۔ جس طرح بیٹے میں باپ اور ماں کا کچھ کچھ حلیہ اور خوبُو پائی جاتی ہے اسی طرح رُوحیں جو خدائے تعالیٰ کے ہاتھ سے نکلی ہیں اپنے صانع کی سیرت و خصلت سے اجمالی طور پر کچھ حصہ رکھتی ہیں۔ اگرچہ مخلوقیت کی ظلمت و غفلت غالب ہو جانے کی وجہ سے بعض نفوس میں وہ رنگ الٰہی کچھ پھیکا سا ہو جاتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ہر ایک رُوح کسی قدر وہ رنگ اپنے اندر رکھتی ہے اور پھر بعض نفوس میں وہ رنگ بد استعمالی کی وجہ سے بدنما معلوم ہوتا ہے مگر یہ اُس رنگ کا قصور نہیں بلکہ طریقۂ استعمال کا قصور ہے۔ انسان کی اصلی قوتوں اور طاقتوں میں سے کوئی بھی بُری قوت نہیں صرف بد استعمالی سے ایک نیک قوت بُری معلوم ہونے لگتی ہے۔ اگر وہی قوت اپنے موقع پر استعمال کی جائے تو وہ سراسر نفع رساں اور خیر محض ہے۔ اور حقیقت میں انسان کو جس قدر قوتیں دی گئی ہیں وہ سب الٰہی قوتوں کے اظلال و آثار ہیں۔ جیسے بیٹے کی صورت میں کچھ کچھ باپ کے نقوش آجاتے ہیں ایسا ہی ہماری رُوحوں میں اپنے رب کے نقوش اور اس کی صفات کے آثار آگئے ہیں جن کو عارف لوگ خوب شناخت کرتے ہیں اور جیسے بیٹا جو باپ سے نکلا ہے اُس سے ایک طبعی محبت رکھتا ہے نہ بناوٹی اسی طرح ہم بھی جو اپنے رب سے نکلے ہیں اُس سے فی الحقیقت طبعی محبت رکھتے ہیں نہ بناوٹی۔ اور اگر ہماری رُوحوں کو اپنے رب سے یہ طبعی و فطرتی تعلق نہ ہوتا تو پھر سالکین کو اُس تک پہنچنے کے لئے کوئی صورت اور سبیل نہ تھی۔ سو اگرچہ دلائل مخلوقیت ارواح جن کو اللہ جلّ شانہٗ نے آپ قرآن شریف میں معقولی طور پر بیان کیا ہے اس کثرت سے ہیں کہ اگر وہ سب اس جگہ لکھے جائیں تو خود انہیں دلائل کی ایک بڑی کتاب ہو جائیگی مگر ہم بالفعل اسی قدر پر کفایت کرتے ہیں۔ (سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۱۹-۱۲۱)

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ الخ... اور کفار تجھ سے (اے محمدؐ) پوچھتے ہیں کہ روح کیا ہے اور کس چیز سے اور کیونکر پیدا ہوئی ہے۔ ان کو کہہ دے کہ رُوح میرے رب کے امر میں سے ہے اور تم کو (اے کافرو) علم رُوح اور علمِ اسرارِ الٰہی نہیں دیا گیا مگر کچھ تھوڑا سا.... لفظ مَآ اُوْتِيْتُمْ جس کا ترجمہ یہ ہے کہ تم کو نہیں دیا گیا جمع کا صیغہ ہے جو صاف دلالت کر رہا ہے جو اس آیت کے مخاطب کفار ہیں کیونکہ ان آیات میں جمع کے صیغہ سے کسی جگہ آنحضرت کو خطاب نہیں کیا گیا بلکہ جابجا واحد کے صیغہ سے خطاب کیا گیا ہے اور جمع کے صیغہ سے کفار کی جماعت کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایسا سوال کرتے ہیں۔ سو اگر کوئی نرا اندھا نہ ہو تو سمجھ سکتا ہے کہ ان دونوں آیتوں میں دو جمع کے صیغے وارد ہیں اوّل يَسْـَٔلُوْنَ یعنی سوال کرتے ہیں دوم مَآ اُوْتِيْتُمْ یعنی تم نہیں دئے گئے اور جیسا کہ ظاہر ہے کہ يَسْـَٔلُوْنَ کے صیغہ جمع سے مراد کافر ہیں جنہوں نے رُوح کی کیفیت کے بارے میں سوال کیا تھا ایسا ہی ظاہر ہے کہ مَآ اُوْتِيْتُمْ کے صیغہ جمع سے بھی مراد کافر ہی ہیں مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تو کسی جگہ جمع کے صیغہ سے خطاب نہیں کیا گیا ہے

بلکہ اوّل مجرّد کاف سے جو واحد پر دلالت کرتا ہے خطاب کیا گیا ہے یعنی یہ کہا گیا کہ تجھ سے کفار پوچھتے ہیں یہ نہیں کہا گیا کہ تم سے کفار پوچھتے ہیں۔ پھر بعد اس کے ایسا ہی لفظ واحد سے فرمایا کہ ان کو کہہ دے یہ نہیں فرمایا کہ ان کو کہہ دو۔ برخلاف بیان حال کفّار کے کہ اُن کو دونوں موقعوں پر جمع کے صیغہ سے بیان کیا ہے سو آیت کے سیدھے سیدھے معنے جو سیاق سباق کلام سے سمجھے جاتے ہیں اور صاف صاف عبارت سے نکلتے ہیں یہی ہیں کہ اے محمد کفار تجھ سے رُوح کی کیفیت پوچھتے ہیں کہ رُوح کیا چیز ہے اور کس چیز سے پیدا ہوئی ہے۔ سو ان کو کہہ دے کہ رُوح امر ربّی ہے یعنی عالم امر میں سے ہے اور تم اے کافرو کیا جانو کہ رُوح کیا چیز ہے؟ کیونکہ علمِ رُوح حاصل کرنے کے لئے ایماندار اور عارف باللہ ہونا ضروری ہے مگر ان باتوں میں سے تم میں کوئی بھی بات نہیں....

غور کرنا چاہئے کہ ان آیات شریفہ متذکرہ بالا کا کیسا مطلب صاف صاف تھا کہ کفار کی ایک جماعت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رُوح کے بارے میں سوال کیا کہ رُوح کیا چیز ہے تب ایسی جماعت کو جیسا کہ صورت موجود تھی بصیغۂ جمع مخاطب کر کے جواب دیا گیا کہ رُوح عالم امر میں سے ہے یعنی کلمۃ اللہ یا ظلّ کلمہ ہے جو حکمت و قدرت الٰہی رُوح کی تشکل پر وجود پذیر ہو گیا ہے اور اس کو خدائی سے کچھ حصّہ نہیں بلکہ وہ درحقیقت حادث اور بندۂ خدا ہے اور یہ قدرت ربّانی کا ایک بھید دقیق ہے جس کو تم اے کافرو سمجھ نہیں سکتے مگر کچھ تھوڑا سا (جس کی وجہ سے تم مکلّف بایمان ہو) تمہاری عقلیں بھی دریافت کر سکتی ہیں.... یہ ایک بڑی بھاری صداقت کا بیان ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ ربوبیت الٰہی دو طور سے ناپیدا چیزوں کو پیدا کرتی ہے اور دونوں طور کے پیدا کرنے میں پیداشدہ چیزوں کے الگ الگ نام رکھے جاتے ہیں جب خدائے تعالیٰ کسی چیز کو اس طور سے پیدا کرے کہ پہلے اُس چیز کا کچھ بھی وجود نہ ہو تو ایسے پیدا کرنے کا نام اصطلاح قرآنی میں امر ہے اور اگر ایسے طور سے کسی چیز کو پیدا کرے کہ پہلے وہ چیز کسی اور صورت میں اپنا وجود رکھتی ہو تو اس طرز پیدائش کا نام خلق ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ بسیط چیز کا عدم محض سے پیدا کرنا عالم امر میں سے ہے اور مرکّب چیز کو کسی شکل یا ہیئت خاص سے متشکل کرنا عالمِ خلق سے ہے جیسے اللہ تعالیٰ دوسرے مقام میں قرآن شریف میں فرماتا ہے اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ[1] یعنی بسائط کا عدم محض سے پیدا کرنا اور مرکبات کو ظہور خاص میں لانا دونوں خدا کے فعل ہیں اور بسیط اور مرکّب دونوں خدائے تعالیٰ کی پیدائش ہے۔ (سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۲۴-۱۲۸)

ستیارتھ پرکاش میں پنڈت دیانند صاحب نے لکھا ہے کہ رُوح انسانی اوس کی طرح کسی گھاس پات وغیرہ پر گرتی ہے پھر اُسکو کوئی عورت کھا لیتی ہے۔ اُس سے بچّہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ کس قدر عقل کے برخلاف اور تمام اطبا اور فلاسفہ

[1] الاعراف آیت ۵۵

کی تحقیق کے مخالف ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ بچہ صرف عورت ہی کی منی سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ عورت اور مرد دونوں کی منی سے پیدا ہوتا ہے اور اُس کے اخلاق روحانی بھی صرف ماں سے مشابہت نہیں رکھتے بلکہ ماں اور باپ دونوں سے مشابہت رکھتے ہیں تو پھر یہ اعتقاد کس قدر نامعقول اور خلافِ عقل ہے کہ گویا ایک عورت کی غذا میں ہی وہ رُوح مخلوط ہو کر کھائی جاتی ہے اور مرد اس سے محروم رہ جاتا ہے۔ پھر سوچنا چاہئے کہ کیا رُوح کوئی جسم کی قسم ہے کہ جسم سے مخلوط ہو جاتی ہے۔ دیکھو کس قدر یہ اصول بعید از عقل ہے ماسوا اس کے زمین کے نیچے سے ہزاروں جانور زندہ نکلتے ہیں اور بہت سی چیزوں میں سینکڑوں برسوں کے بعد کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ ان چیزوں میں کہاں سے اور کس راہ سے رُوح آ جاتی ہے۔ (سرمہ چشم آریہ صفحہ ۶۴-۶۵)

رُوح ہرگز جسم نہیں ہے جسم قسمت کو قبول کرتا ہے اور رُوح قابل انقسام نہیں۔ اور اگر یہ کہو کہ وہ جزو لایتجزّا ہے یعنی پرمانو (پرکرتی) ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ کئی رُوحوں کو باہم جوڑ کر ایک بڑا جسم تیار ہو جائے جس کو دیکھ سکیں اور ٹٹول سکیں کیونکہ جزو لایتجزّی جس کو آریہ لوگ پرکرتی یا پرمانو کہتے ہیں یہی خاصیت رکھتی ہے۔

(سرمہ چشم آریہ صفحہ ۷۶ حاشیہ)

بجز انسان کے اور کسی حیوان اور کیڑے مکوڑے کی رُوح کو بقا نہیں ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۹۴۳)

رُوح ایک لطیف نُور ہے جو اس جسم کے اندر ہی سے پیدا ہو جاتا ہے جو رِحم میں پرورش پاتا ہے۔ پیدا ہونے سے مُراد یہ ہے کہ اوّل مخفی اور غیر محسوس ہوتا ہے پھر نمایاں ہو جاتا ہے اور ابتداءً اس کا خمیر نطفہ میں موجود ہوتا ہے۔ بے شک وہ آسمانی خُدا کے ارادہ سے اور اس کے اِذن اور اس کی مشیّت سے ایک مجہول الکُنہ علاقہ کے ساتھ نُطفہ سے تعلق رکھتا ہے اور نُطفہ کا وہ ایک روشن اور نورانی جوہر ہے نہیں کہہ سکتے کہ وہ نُطفہ کی ایسی جُز ہے جیسا کہ جسم جسم کی جُز ہوتا ہے مگر یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ باہر سے آتا ہے یا زمین پر گر کر نطفہ کے مادہ سے آمیزش پاتا ہے بلکہ وہ ایسا نُطفہ میں مخفی ہوتا ہے جیسا کہ آگ پتھر کے اندر ہوتی ہے۔ خُدا کی کتاب کا یہ منشا نہیں ہے کہ رُوح الگ طور پر آسمان سے نازل ہوتی ہے یا فضا سے زمین پر گرتی ہے اور پھر کسی اتّفاق سے نُطفہ کے ساتھ مل کر رحم کے اندر چلی جاتی ہے بلکہ یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں ٹھہر سکتا۔ اگر ہم ایسا خیال کریں تو قانونِ قدرت ہمیں باطل پر ٹھہراتا ہے ہم روز مشاہدہ کرتے ہیں کہ گندے اور باسی کھانوں میں اور گندے زخموں میں ہزارہا کیڑے پڑ جاتے ہیں۔ میلے کپڑوں میں صدہا جوئیں پڑ جاتی ہیں۔ انسان کے پیٹ کے اندر بھی کدو دانے وغیرہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اب کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ باہر سے آتے ہیں یا آسمان سے اُترتے کسی کو دکھائی دیتے ہیں۔ سو صحیح یہی بات ہے کہ رُوح جسم میں سے ہی نکلتی ہے اور اِسی دلیل سے اس کا مخلوق ہونا بھی ثابت ہوتا ہے۔

اب اس وقت ہمارا مطلب اس بیان سے یہ ہے کہ جس قادرِ مطلق نے رُوح کو قُدرتِ کاملہ کے ساتھ جسم میں سے

ہی نکلا ہے۔ اس کا یہی ارادہ معلوم ہوتا ہے کہ رُوح کی دوسری پیدائش کو بھی جسم کے ذریعہ سے ہی ظہور میں لاوے۔ رُوح کی حرکتیں ہمارے جسم کی حرکتوں پر موقوف ہیں جس طرف ہم جسم کو کھینچتے ہیں رُوح بھی بالضرور پیچھے پیچھے کھنچی چلی آتی ہے اس لئے انسان کی طبعی حالتوں کی طرف متوجہ ہونا خدا تعالیٰ کی سچی کتاب کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف نے انسان کی طبعی حالتوں کی اصلاح کے لئے بہت توجہ فرمائی ہے اور انسان کا ہنسنا، رونا، کھانا، پینا، پہننا، سونا، بولنا، چُپ ہونا، بیوی کرنا، مجرّد رہنا، چلنا، ٹھہرنا اور ظاہری پاکیزگی غسل وغیرہ کی شرائط بجالانا اور بیماری کی حالت اور صحت کی حالت میں خاص خاص امور کا پابند ہونا۔ ان سب باتوں پر ہدایتیں لکھی ہیں اور انسان کی جسمانی حالتوں کو رُوحانی حالتوں پر بہت ہی مؤثر قرار دیا ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۲۔۱۳)

خدا نے انسان کی جان کو پیدا کرکے اُس کا نام رُوح رکھا کیونکہ اس کی حقیقی راحت اور آرام خدا کے اقرار اور اس کی محبت اور اس کی اطاعت میں ہے۔ (سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب صفحہ ۳)

قرآن شریف یہ نہیں سکھلاتا کہ انسانی ارواح اپنی ذات کے تقاضا سے ابدی ہیں بلکہ وہ یہ سکھلاتا ہے کہ یہ ابدیت انسانی رُوح کے لئے محض عطیہ الٰہی ہے ورنہ انسانی رُوح بھی دوسرے حیوانات کے رُوحوں کی طرح قابل فنا ہے۔

(نسیم دعوت صفحہ ۱۹ حاشیہ)

جس حالت میں روحیں قدیم سے خود بخود اور اپنے وجود کی آپ خدا ہیں تو اس صورت میں گویا وہ تمام روحیں کسی علیحدہ محلہ میں مستقل قبضہ کے ساتھ رہتی ہیں اور پرمیشر علیحدہ رہتا ہے۔ کوئی تعلق درمیان نہیں اور اس امر کی وجہ کچھ نہیں بتلا سکتے کہ تمام روحیں اور تمام ذرّات باوجود انادی اور قدیم اور خود بخود ہونے کے پرمیشر کے ماتحت کیونکر ہوگئیں۔ کیا کسی لڑائی اور جنگ کے بعد یہ صورت ظہور میں آئی یا خود بخود روحوں نے کچھ مصلحت سوچ کر اطاعت قبول کرلی۔ (چشمہ مسیحی صفحہ ۴۵)

قرآن شریف کہتا ہے کہ روحیں انادی اور غیر مخلوق نہیں اور دو نطفوں کی ایک خاص ترکیب سے وہ پیدا ہوتی ہیں اور یا دوسرے کیڑوں مکوڑوں میں ایک ہی مادہ سے پیدا ہو جاتے ہیں اور یہی سچ ہے کیونکہ مشاہدہ اس پر گواہی دیتا ہے جس کے ماننے کے بغیر چارہ نہیں اور امور محسوسہ مشہودہ سے انکار کرنا سراسر جہالت ہے اور جب ہم کہتے ہیں کہ روح نیست سے ہست ہوتا ہے تو اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اوّل وہ کچھ بھی نہیں تھا بلکہ اس کے یہ معنے ہیں کہ اس کے لئے کوئی ایسا مادّہ نہیں تھا کہ انسان اپنی قوت سے اُس میں سے روح نکال سکتا اور اُس کی پیدائش صرف اس طور سے ہے کہ محض الٰہی قوت اور حکمت اور قدرت کسی مادہ میں سے اس کو پیدا کر دیتی ہے اسی واسطے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ رُوح کیا چیز ہے تو خدا نے فرمایا کہ تو ان کو جواب دے کہ رُوح میرے رب کے امر میں سے ہے۔ اس بارے میں آیۃ قرآنی یہ ہے کہ یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ

وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا۔ یعنی یہ لوگ پوچھتے ہیں کہ روح کیا چیز ہے اور کیونکر پیدا ہوتی ہے۔ اُن کو جواب دے کہ رُوح میرے رب کے امر سے پیدا ہوتی ہے یعنی وہ ایک رازِ قدرت ہے اور تم لوگ روح کے بارے میں کچھ علم نہیں رکھتے مگر تھوڑا سا یعنی صرف اس قدر کہ تم رُوح کو پیدا ہوتے دیکھ سکتے ہو اس سے زیادہ نہیں جیسا کہ ہم بچشم خود دیکھ سکتے ہیں کہ ہماری آنکھ کے سامنے کسی مادہ میں سے کیڑے مکوڑے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور انسانی روح کے پیدا ہونے کے لئے خدا تعالیٰ کا قانونِ قدرت یہ ہے کہ دو نطفوں کے ملنے کے بعد جب آہستہ آہستہ قالب تیار ہو جاتا ہے تو جیسے چند ادویہ کے ملنے سے اُس مجموعہ میں ایک خاص مزاج پیدا ہو جاتی ہے کہ جو ان دواؤں میں فرد فرد کے طور پر پیدا نہیں ہوتی اسی طرح اس قالب میں جو خون اور دو نطفوں کا مجموعہ ہے ایک خاص جوہر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ ایک فاسفرس کے رنگ میں ہوتا ہے اور جب تجلّی الٰہی کی ہوا اُن کے امر کے ساتھ اس پر چلتی ہے تو یک دفعہ وہ افروختہ ہو کر اپنی تاثیر اس قالب کے تمام حصّوں میں پھیلا دیتا ہے تب وہ جنین زندہ ہو جاتا ہے پس یہی افروختہ چیز جو جنین کے اندر تجلّی ربّی سے پیدا ہو جاتی ہے اُسی کا نام رُوح ہے اور وہی کلمۃ اللہ ہے اور اس کو امر ربّی سے اس لئے کہا جاتا ہے کہ جیسے ایک حاملہ عورت کی طبیعت مدبرہ بحکم قادرِ مطلق تمام اعضا کو پیدا کرتی ہے اور عنکبوت کے جالے کی طرح قالب کو بناتی ہے۔ اس رُوح میں اس طبیعت مُدبرہ کو کچھ دخل نہیں بلکہ رُوح محض خاص تجلّی الٰہی سے پیدا ہوتی ہے اور گو روح کا فاسفرس اُس مادہ سے ہی پیدا ہوتا ہے مگر وہ روحانی آگ جس کا نام رُوح ہے وہ بجز مسِ نسیم آسمانی کے پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ سچا علم ہے جو قرآن شریف نے ہمیں بتلایا ہے۔ تمام فلاسفروں کی عقلیں اس علم تک پہنچنے سے بیکار ہیں اور وید بھی بید بے ثمر کی طرح اِس علم سے محروم رہا۔ وہ قرآن شریف ہی ہے جو اس علم کو زمین پر لایا۔ سو اس طور سے ہم کہتے ہیں کہ روح نیست سے ہست ہوتی ہے یا عدم سے وجود کا پیرایہ پہنتی ہے یہ نہیں ہم کہتے کہ عدم محض سے روح کی پیدایش ہوتی ہے کیونکہ تمام کارخانہ پیدایش سلسلہ حکمت اور علل معلولات سے وابستہ ہے۔

اور یہ کہنا کہ اگر روح مخلوق ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ فنا بھی ہو جائے تو اس کا جواب یہ ہے کہ روح بیشک فنا پذیر ہے۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ جو چیز اپنی صفات کو چھوڑتی ہے اس حالت میں اس کو فانی کہا جاتا ہے۔ اگر کسی دوا کی تاثیر بالکل باطل ہو جائے تو اس حالت میں ہم کہیں گے کہ وہ دوا مر گئی۔ ایسا ہی روح میں یہ امر ثابت ہے کہ بعض حالات میں وہ اپنی صفات کو چھوڑ دیتی ہے بلکہ اس پر جسم سے بھی زیادہ تغیرات وارد ہوتے ہیں انہیں تغیرات کے وقت کہ جب وہ روح کو اُس کی صفات سے دور ڈال دیتے ہیں کہا جاتا ہے کہ روح مر گئی کیونکہ موت اسی بات کا نام ہے کہ ایک چیز اپنی لازمی صفات کو چھوڑ دیتی ہے تب کہا جاتا ہے کہ وہ چیز مر گئی اور یہی بھید ہے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں فقط اُنہیں انسانی روحوں کو بعد مفارقت دنیا زندہ قرار دیا ہے۔ جن میں وہ صفات موجود تھے جو اصل غرض اور علت غائی اُن کی پیدائش کی تھی یعنی خدا تعالیٰ کی کامل محبت اور اُس کی کامل اطاعت جو انسانی

روح کی جان ہے اور جب کوئی روح خداؑ کی محبت سے پُر ہو کر اور اُس کی راہ میں قربان ہو کر دنیا سے جاتی ہے تو اُسی کو زندہ روح کہا جاتا ہے باقی سب مُردہ روحیں ہوتی ہیں۔ غرض روح کا اپنی صفات سے الگ ہونا ہی اس کی موت ہے چنانچہ حالت خواب میں بھی جب جسم انسانی مرتا ہے تو روح بھی ساتھ ہی مرجاتی ہے یعنی اپنی صفات موجودہ کو جو بیداری کے حالت میں تھیں چھوڑ دیتی ہے اور ایک قسم کی موت اُس پر وارد ہو جاتی ہے کیونکہ خواب میں وہ صفات اُس میں باقی نہیں رہتیں جو بیداری میں اُس کو حاصل ہوتی ہیں۔ سو یہ بھی ایک قسم موت کی ہے کیونکہ جو چیز اپنی صفات سے الگ ہو جائے اُس کو زندہ نہیں کہہ سکتے۔ اکثر لوگ موت کے لفظ پر بہت دھوکہ کھاتے ہیں۔ موت صرف معدوم ہونے کا نام نہیں بلکہ اپنی صفات سے معطل ہونے کا نام بھی موت ہے۔ ورنہ جسم جو مر جاتا ہے بہرحال مٹی اُسکی تو موجود رہتی ہے اسی طرح روح کی موت سے بھی یہی مراد ہے کہ وہ اپنی صفات سے معطل کی جاتی ہے جیساکہ عالم خواب میں دیکھا جاتا ہے کہ جیسے جسم اپنے کاموں سے بیکار ہو جاتا ہے ایسا ہی روح بھی اپنی اُن صفات سے جو بیداری میں رکھتے تھے بکلّی معطل ہو جاتی ہے مثلاً ایک زندہ کی روح کسی میت سے خواب میں ملاقات کرتی ہے اور نہیں جانتی کہ وہ میّت ہے اور سونے کے ساتھ ہی بکلّی اس دُنیا کو بھول جاتی ہے اور پہلا چولہ اتار کر نیا چولہ پہن لیتی ہے اور تمام علوم جو رکھتی تھی سب کے سب بیکبارگی فراموش کر دیتی ہے اور کچھ بھی اس دنیا کا یاد نہیں رکھتی بجز اس صورت کے کہ خدا یاد دلاوے اور اپنے تصرفات سے بکلّی معطل ہو جاتی ہے اور سچ مچ خدا کے گھر میں جا پہنچتی ہے اور اس وقت تمام حرکات اور کلمات اور جذبات اس کے خدا تعالیٰ کے تصرفات کے نیچے ہوتے ہیں اور اس طور سے خدا تعالیٰ کے تصرفات کے نیچے وہ مغلوب ہوتی ہے کہ نہیں کہہ سکتے کہ جو کچھ عالم خواب میں کرتی یا کہتی یا سنتی یا حرکت کرتی ہے وہ اپنے اختیار سے کرتی ہے بلکہ تمام اختیاری قوت اس کی مسلوب ہو جاتی ہے اور کامل طور پر موت کے آثار اُس پر ظاہر ہو جاتے ہیں۔ سو جس قدر جسم پر موت آتی ہے اس سے بڑھ کر روح پر موت وارد ہو جاتی ہے۔ مجھے ایسے لوگوں سے سخت تعجب آتا ہے کہ وہ اپنی حالت خواب پر بھی غور نہیں کرتے اور نہیں سوچتے کہ اگر روح موت سے مستثنیٰ رکھی جاتی تو وہ ضرور عالم خواب میں بھی مستثنیٰ رہتی۔ ہمارے لئے خواب کا عالم موت کے عالم کی کیفیت سمجھنے کے لئے ایک آئینہ کے حکم میں ہے۔ جو شخص روح کے بارے میں سچّی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے اُس کو چاہئے کہ خواب کے عالم پر بہت غور کرے کہ ہر ایک پوشیدہ راز موت کا خواب کے ذریعہ سے کُھل سکتا ہے۔ اگر تم عالم خواب کے اسرار پر جیساکہ چاہئے توجہ کرو گے اور جس طور سے عالم خواب میں روح پر ایک موت وارد ہوتی ہے اور اپنے علوم اور صفات سے وہ الگ ہو جاتی ہے اسی طور پر نظر تدبّر ڈالو گے تو تمہیں یقین ہو جائے گا کہ موت کا معاملہ خواب کے معاملہ سے ملتا جلتا ہے۔ پس یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ روح مفارقت بدن کے بعد اُسی حالت پر قائم رہتی ہے جو حالت دُنیا میں وہ رکھتی تھی بلکہ خدا تعالیٰ کے حکم سے ایسی ہی موت اس پر وارد ہو جاتی ہے جیساکہ خواب کی حالت میں وارد ہوئی تھی بلکہ وہ حالت اِس سے بہت زیادہ

ہوتی ہے اور ہر ایک صفت اس کی ہستی کی چکی کے اندر پیسی جاتی ہے اور وہی روح کی موت ہوتی ہے۔ اور پھر جو لوگ زندہ ہونے کے کام کرتے تھے وہی زندہ کئے جاتے ہیں کسی روح کی مجال نہیں کہ آپ زندہ رہ سکے۔ کیا تم اختیار رکھتے ہو کہ نیند کی حالت میں تم اپنے اُن صفات اور حالات اور علوم کو اپنے قبضہ میں رکھ سکو جو بیداری میں تم کو حاصل ہیں؟ نہیں بلکہ آنکھ بند کرنے کے ساتھ ہی روح کی حالت بدل جاتی ہے اور ایک ایسی نیستی اس پر وارد ہوتی ہے کہ تمام کارخانہ اس کی ہستی کا اُلٹ پُلٹ ہو جاتا ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۵۰-۱۸۴)

قرآن شریف روحوں کو ازلی ابدی نہیں ٹھہراتا ہے ان کو مخلوق بھی مانتا ہے اور فانی بھی جیسا کہ وہ روحوں کے مخلوق ہونے کے بارے میں صاف طور پر فرماتا ہے کہ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ[1] یعنی جب قالب تیار ہو جاتا ہے تو اس کی تیاری کے بعد اسی قالب میں سے ہم ایک نئی پیدائش کر دیتے ہیں یعنی رُوح۔ اور ایسا ہی قرآن شریف میں ایک اور جگہ فرمایا قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا یعنی روح میرے رب کے امر سے پیدا ہوتی ہے اور تم کو اس کا بہت تھوڑا علم ہے اور کئی محل میں خدا تعالیٰ نے یہ بھی اشارہ فرمایا ہے کہ جس مادہ سے رُوح پیدا ہوتی ہے اسی مادّہ کے موافق روحانی اخلاق ہوتے ہیں جیسا کہ تمام درندوں چرندوں پرندوں اور حشرات الارض پر غور کرکے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جیسا کہ نطفہ کا مادہ ہوتا ہے اسی کے مناسب حال روحانی اخلاق اس جانور کے ہوتے ہیں۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۵۶)

قبور کے ساتھ جو تعلق ارواح کا ہوتا ہے یہ ایک صداقت تو ہے مگر اس کا پتہ دینا اس آنکھ کا کام نہیں یہ کشفی آنکھ کا کام ہے کہ وہ دکھلاتی ہے۔ اگر محض عقل سے اس کا پتہ لگانا چاہو تو کوئی عقل کا پُتلا اتنا ہی بتلائے کہ روح کا وجود بھی ہے یا نہیں؟ ہزار اختلاف اس مسئلہ پر موجود ہیں اور ہزارہا فلاسفر دہریہ مزاج موجود ہیں جو منکر ہیں۔ اگر نری عقل کا یہ کام تھا تو پھر اختلاف کا کیا کام؟ کیونکہ جب آنکھ کا کام دیکھنا ہے تو مَیں نہیں کہہ سکتا کہ زید کی آنکھ تو سفید چیز کو دیکھے اور بکر کی ویسی ہی آنکھ اس سفید چیز کا ذائقہ بتلائے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ نری عقل رُوح کا وجود بھی یقینی طور پر نہیں بتلا سکتی چہ جائیکہ اس کی کیفیت اور تعلقات کا علم پیدا کر سکے۔ فلاسفر تو روح کو ایک سبز لکڑی کی طرح مانتے ہیں اور روح فی الخارج ان کے نزدیک کوئی چیز ہی نہیں۔ یہ تفاسیر روح کے وجود اور اس کے تعلق وغیرہ کی چشمۂ نبوت سے ملی ہیں اور نرے عقل والے تو دعویٰ ہی نہیں کر سکتے۔ اگر کہو کہ بعض فلاسفروں نے کچھ لکھا ہے تو یاد رکھو کہ انہوں نے منقولی طور پر چشمۂ نبوت سے کچھ لے کر کہا ہے پس جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ روح کے متعلق علوم چشمہ نبوت سے ملتے ہیں تو یہ امر کہ ارواح کا قبور کے ساتھ تعلق ہوتا ہے اُسی چشم سے دیکھنا چاہیئے

---

[1] المؤمنون آیت ۱۵

اور کشفی آنکھ نے بتلایا ہے کہ اس تودۂ خاک سے روح کا ایک تعلق ہوتا ہے اور اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَھْلَ الْقُبُوْرِ کہنے سے جواب ملتا ہے پس جو آدمی ان قوٰی سے کام لے جن سے کشف قبور ہو سکتا ہے وہ اُن تعلقات کو دیکھ سکتا ہے۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۸۹۹ء صفحہ ۲-۳)

یاد رکھو ہر انسان کلمۃ اللہ ہے کیونکہ اس کے اندر رُوح ہے جس کا نام قرآن شریف میں اَمْرِ رَبِّیْ رکھا گیا ہے لیکن انسان نادانی اور ناواقفی سے روح کی کچھ قدر نہ کرنے کے باعث اُس کو انواع و اقسام کی سلاسل اور زنجیروں میں مقید کر دیتا ہے اور اس کی روشنی اور صفائی کو خطرناک تاریکیوں اور سیاہ کاریوں کی وجہ سے اندھا اور سیاہ کر دیتا ہے اور اُسے ایسا دھندلا بنا تا ہے کہ پتہ بھی نہیں لگتا۔ لیکن جب توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے اور اپنی ناپاک اور تاریک زندگی کی چادر اتار دیتا ہے تو قلب منور ہونے لگتا ہے اور پھر اصل جلاء کی طرف رجوع شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ تقویٰ کے انتہائی درجہ پر پہنچ کر سارا میل کچیل اتر کر پھر وہ کلمۃ اللہ ہی رہ جاتا ہے۔ یہ ایک باریک علم اور معرفت کا نکتہ ہے ہر شخص اس کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۱)

دہریہ رُوح کا ہی انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ اور پھر کہتے ہیں کہ حشر اجساد کوئی چیز نہیں یہاں روح تعلیم پا کر آئندہ کیا کرے گا۔ یہ خیالی باتیں ہیں ان میں معقولیت نہیں ہے۔ اگر رُوح کوئی چیز نہیں ہے تو پھر یہ کیا بات ہے کہ جسم پر جو فعل واقع ہوتے ہیں اُن کا اثر اندرونی قوتوں پر بھی پڑتا ہے۔ مثلاً اگر مقدم الراس پر چوٹ لگ جائے تو اس فساد کے ساتھ انسان مجنون ہو جاتا ہے یا حافظہ جاتا رہتا ہے۔ مجنونوں کی روح تو وہی ہیں نقص تو جسم میں ہے جسم کا اگر اچھا انتظام نہ رہے تو روح بیکار ہو جاتا ہے وہ بدون جسم کسی کام نہیں ہے اسلئے ہمیشہ جسم کا محتاج ہے جس کا انتظام عمدہ ہو روحانی حالت بھی اچھی ہو گی۔ چھوٹے بچے میں کیوں اتنی سمجھ نہیں ہوتی کہ وہ عواقب الامور کو سمجھ سکے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اُن میں ابھی قوٰی کا نشوونما کامل نہیں ہوا ہوتا۔

اسی طرح پیٹ میں جو نطفہ جاتا ہے کسی کو کچھ معلوم نہیں کہ روح اس کے ساتھ کہاں سے چلی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی دراصل ایک مخفی قوت چلی جاتی ہے جو انبساط اور نشاط کا باعث ہوتی ہے۔ اسی طرح اناج میں بھی وہی کیفیت چلی آتی ہے۔ اسی کی طرف مولوی رومی نے اشارہ کر کے کہا ہے

ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام
ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام

نافہم اور کوڑ مغز لوگوں نے اس شعر کو تناسخ پر حمل کر لیا ہے اور کہتے ہیں اس سے تناسخ ثابت ہوتا ہے مگر ان کو معلوم نہیں کہ یہ دراصل تغیرات نطفہ کی طرف ایماء ہے یعنی جن جن تغیرات سے نطفہ تیار ہوتا ہے۔ اس کو اس شعر میں ظاہر کیا گیا ہے۔ شاید بہت تھوڑے آدمی ایسے ہوں گے جن کو یہ معلوم ہو کہ نطفہ بہت سے تغیرات

سے بنتا ہے جس اناج سے نطفہ بنا ہے نطفہ کی حالت میں آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اس کو بہت سے تغیرات میں ڈالا ہے اور پھر اس کو محفوظ رکھا ہے کیونکہ وہ درحقیقت نطفہ ہے اپنے وقت پر وہ پیسا بھی جاتا ہے اور اس سے روٹی بھی تیار کی جاتی ہے لیکن وہ محفوظ کا محفوظ چلا آتا ہے۔ آجکل نطفہ کے متعلق جو تحقیقات ہوئی ہے تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس میں کیڑے ہوتے ہیں۔ یہ ایک الگ امر ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اصل میں وہ ایک قوت ہے جو برابر محفوظ چلی آتی ہے۔ ممکن ہے کہ جو کچھ ڈاکٹروں نے سمجھا ہو وہ اسی قوت کو سمجھا ہو۔ ہر اناج کے ساتھ انسانیت کا خاصہ نہیں بلکہ وہ جوہر قابل الگ ہی ہے اور اس کو وہی کھاتا ہے جس کے لئے وہ مقدر ہوتا ہے اور وہ اسی دن کے لئے مقدر ہوتا ہے۔ وہ نطفہ جس میں روحانیت کی جُز ہے بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ مضغہ علقہ وغیرہ چھ حالتوں میں سے گذرتا ہے اور ان چھ تغیرات کے بعد ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ[1] کا وقت آتا ہے۔ اب اس آخری تبدیلی کو نشاء اُخریٰ کہا ہے یہ نہیں کہا ثُمَّ اَنْزَلْنَاهُ رُوْحًا اٰخَرَ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ باہر سے کوئی چیز نہیں آتی۔ اب اس کو خوب غور سے سوچو تو معلوم ہوگا کہ رُوح کا جسم کے ساتھ کیسا ابدی تعلق ہے پھر یہ کیسی بیہودگی ہے جو کہا جاوے کہ جسم کا روح کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کس قدر زبردست ثبوت رُوح کی ہستی کا ہے۔ اس کو کوئی معمولی نگاہ سے دیکھے تو اَور بات ہے لیکن معقولیت اور فلسفہ سے سوچے تو اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

اسی طرح ایک اَور بات بھی قابل غور ہے کہ دُنیا میں کبھی کوئی شخص کامیاب نہیں ہوا جو جسم اور رُوح دونوں سے کام نہ لے۔ اگر روح کوئی چیز نہیں تو ایک مُردہ جسم سے کوئی کام کیوں نہیں ہو سکتا۔ کیا اس کے سارے اعضاء اور قویٰ موجود نہیں ہوتے۔ اب یہ بات کیسی صفائی کے ساتھ سمجھ میں آتی ہے کہ روح اور جسم کا تعلق جبکہ ابدی ہے پھر کیوں کسی ایک کو بیکار قرار دیا جاوے۔ دعا کے لئے بھی یہی قانون ہے کہ جسم تکالیف اٹھائے اور رُوح گداز ہو اور پھر صبر اور استقلال سے اللہ تعالیٰ کی ہستی پر ایمان لا کر حُسن ظن سے کام لیا جاوے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

یاد رکھو کہ عقل رُوح کی صفائی سے پیدا ہوتی ہے جس جس قدر انسان رُوح کی صفائی کرتا ہے اُسی اُسی قدر عقل میں تیزی پیدا ہوتی ہے اور فرشتہ سامنے کھڑا ہو کر اس کی مدد کرتا ہے مگر فاسقانہ زندگی والے کے دماغ میں روشنی نہیں آ سکتی۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

خدا تعالیٰ ہمیشہ سے خالق ہے مگر اس کے تمام صفات کو دیکھنا چاہیئے۔ وہ مُحی ہے اور مُمیت بھی ہے۔ اثبات بھی کرتا ہے تو محو بھی کرتا ہے۔ پیدا بھی کرتا ہے فنا بھی کرتا ہے۔ اس بات کی کیا دلیل ہے کہ روح کو فنا نہیں اور کبھی

---

[1] المؤمنون آیت ۱۵

روح ہمیشہ سے چلے آتے ہیں۔ وہ جب تک کسی کو چاہے رکھے۔ ہر ایک چیز فنا ہو جانے والی ہے باقی رہنے والی ذات صرف خدا کی ہی ہے۔ روح میں جبکہ ترقی بھی ہوتی ہے اور تنزل بھی ہوتا ہے تو پھر اس کو ہمیشہ کے واسطے قیام کس طرح ہو سکتا ہے۔ جب تک روح کا قیام ہے وہ امر الٰہی کے قیام کے نیچے ہے۔ خدا کے امر کے ماتحت ہی کسی کا قیام ہو سکتا ہے اور وہی فنا بھی کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ خالق بھی ہے اور ہمیشہ خلق کو مٹاتا بھی ہے۔ مسلمان قدامت کا قائل ہے مگر قدامت نوعی کا نہ کہ قدامت شخصی کا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہم نہیں جانتے کہ پہلے کیا چیزیں تھیں اور کیا نہ تھیں۔ اگر اس کے برخلاف قدامت شخصی کا عقیدہ رکھا جاوے تو وہ دہریت میں داخل ہونا ہوتا ہے۔

(بدر جلد ۲ ۵۲ مورخہ ۲۷ دسمبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)

خدا جب سے خالق ہے تب سے اس کی مخلوق ہے گو ہمیں یہ علم نہ ہو کہ وہ مخلوق کس قسم کی تھی۔ غرض نوعی قدم کے ہم قائل ہیں۔ ایک نوع فنا کرکے دوسری بنا دی مگر یہ نہیں کہ جیسے آریہ مانتے ہیں۔ روح مادہ ویسا ہی ازلی ابدی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ۔ ہمارا ایمان ہے کہ رُوح ہو یا مادہ غرض خواہ کچھ ہی ہو اللہ کی مخلوق ہے۔

(بدر جلد ۶ ۱۷ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

یہ بات ممکن تو ہے کہ کشفی طور سے روحوں سے انسان مل سکتا ہے مگر اس امر کے حصول کے واسطے ریاضات شاقہ اور مجاہدات سخت کی اشد ضرورت ہے۔ ہم نے خود آزمایا ہے اور تجربہ کیا ہے اور بعض اوقات روحوں سے ملاقات کرکے باتیں کی ہیں۔ انسان ان سے بعض مفید مطلب امور اور دوائیں وغیرہ بھی دریافت کر سکتا ہے۔ ہم نے خود حضرت عیسیٰؑ کی روح اور آنحضرتؐ اور بعض صحابہ کرامؓ سے بھی ملاقات کی ہے اور اس معاملہ میں صاحبِ تجربہ ہیں لیکن انسان کے واسطے مشکل یہ ہے کہ جب تک اس راہ میں مشق اور قاعدہ کی پابندی سے مجاہدات نہیں کرتا یہ امر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور چونکہ ہر ایک کو یہ امر میسر بھی نہیں آسکتا اس واسطے اس کے نزدیک یہ ایک قصہ کہانی ہی ہوتی ہے اور اس میں حقیقت نہیں ہوتی۔

(الحکم جلد ۱۲ ۳۶ مورخہ ۲ جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

روح ایک مخلوق چیز ہے اسی عنصری مادے سے خدا اُسے بھی پیدا کرتا ہے ..... روح انسانی باریک اور مخفی طور سے نطفۂ انسانی میں ہی موجود ہوتی ہے اور وہ بھی نطفہ کے ساتھ ساتھ ہی آہستگی سے نشوونما کرتی اور ترقی پاتی پاتی چوتھے مہینے کے انجام اور پانچویں مہینے کے ابتدا میں ایک بیّن تغیر اور نشوونما پا کر ظہور پذیر ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ اپنی پاک کلام میں فرماتا ہے کہ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ[1]

یہ درست نہیں جیسا کہ جو آریہ بتاتے ہیں کہ رُوح بھی خدا کی طرح ازلی ابدی ہے۔ اس اعتقاد پر اتنے شبہات

---

[1] المؤمنون آیت ۱۵

پڑتے ہیں کہ پھر غذا اغذا ہی نہیں رہتا۔ روح ایک لطیف جوہر ہوتا ہے جو مخفی طور سے انسان کی پیدائش کے ساتھ ساتھ پیدا ہوتا اور نشوونما پاتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک گولر کے پھل کو لو جب وہ کچا ہوگا تو اس میں ایک قسم کے نامکمل حالت میں زندہ جانور پائے جاویں گے مگر جونہی کہ وہ پک کر تیار ہوگا اس میں سے جانور چلتے پھرتے نظر آویں گے اور یہاں تک کہ پَر لگ کر اُڑنے بھی لگ جاویں گے۔ اس کے سوا اور بھی کئی درختوں کے پھل ہیں جن میں اس قسم کے مشاہدات پائے جاتے ہیں۔

غرض ہمارے پاس تو ہمارے دعوے کا ثبوت ہے۔ ثابتہ سچائی سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اصل میں ان پھلوں میں ایک قسم کا مادہ اندر ہی اندر موجود ہوتا (ہے) جو پھل کے نشوونما کے ساتھ ساتھ نشوونما کرتا اور ترقی پاتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۵ مورخہ ۳۰ رمئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵، ۶)

روح تین قسم کی ہوتی ہے روح نباتی۔ روح حیوانی۔ روح انسانی۔ ان تینوں کو ہم برابر نہیں مانتے۔ ان میں سے حقیقی زندگی کی وارث اور جامع کمالات صرف انسانی روح ہے باقی حیوانی اور نباتی روح میں بھی ایک قسم کی زندگی ہے مگر وہ انسانی روح کی برابری نہیں کر سکتی۔ نہ ویسے مدارج حاصل کر سکتی ہے۔ نہ کمالات میں انسانی روح کی برابری کر سکتی ہے۔ کچھ تشابہ ہو تو اس باریک بحث میں ہم پڑنا مناسب نہیں سمجھتے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض خاص خاص صفات میں یہ رُوحیں انسانی روح سے مشابہت رکھتی ہوں مگر جس طرح انسان میں اور ان میں ظاہری اختلاف اور فرق ہے اسی طرح اختلاف روحانی بھی پایا جاتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۵ مورخہ ۳۰ رمئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

نظر کشفی میں کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام ارواح اور اجسام کلمات اللہ ہی ہیں جو بحکمتِ کاملہ الٰہی پیرایۂ حدوث و مخلوقیت سے متلبس ہوگئے ہیں مگر اصل محکم جس پر قدم مارنا اور قائم رہنا ضروری ہے یہ ہے کہ ان کشفیات و معقولات سے قدر مشترک لیا جائے یعنی یہ کہ خدائے تعالیٰ ہر ایک چیز کا خالق اور محدث ہے اور کوئی چیز کیا ارواح اور کیا اجسام بغیر اس کے ظہور پذیر نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے کیونکہ کلام الٰہی کی عبارت اس جگہ درحقیقت ذوالوجوہ ہے اور جس قدر قطع اور یقین کے طور پر قرآن شریف ہدایت کرتا ہے وہ یہی ہے کہ ہر ایک چیز خدا تعالیٰ سے ظہور پذیر و وجود پذیر ہوئی ہے اور کوئی چیز بغیر اس کے پیدا نہیں ہوئی اور نہ خود بخود ہے۔

(سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۲۶۔۱۲۷ حاشیہ)

روحوں کی پیدائش پر انسان کیوں تعجب کرے۔ اسی دنیا میں صاحبِ کشف پر ایسے ایسے اسرار ظاہر ہوتے ہیں کہ ان کی کنہ کو سمجھنے میں بکلی عقل عاجز رہ جاتی ہے۔ بعض اوقات صاحبِ کشف صدہا کوسوں کے فاصلہ سے باوجود حائل ہونے بے شمار حجابوں کے ایک چیز کو صاف صاف دیکھ لیتا ہے بلکہ بعض اوقات عین بیداری میں باذنہٖ تعالیٰ اس کی آواز بھی سُن لیتا ہے اور اس سے زیادہ تر تعجب کی یہ بات ہے کہ بعض اوقات وہ شخص بھی اس کی آواز سُن لیتا ہے جس کی

صورت اس پر منکشف ہوئی ہے بعض اوقات صاحب کشف اپنے عالم کشف میں جو بیداری سے نہایت مشابہ ہے ارواح گذشتہ سے ملاقات کرتا ہے اور عام طور پر ملاقات ہر ایک نیک بخت روح یا بدبخت روح کے کشف قبور کے طور پر ہو سکتی ہے چنانچہ خود اس میں مؤلف رسالہ ہذا صاحب تجربہ ہے۔

(سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۲۹-۱۳۰ حاشیہ)

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۝

اُن کو کہہ کہ اگر تمام جنّ اور آدمی اس بات پر اتفاق کریں کہ قرآن جیسی کوئی اور کتاب بنالاویں تو وہ کبھی بنا نہیں سکیں گے اگرچہ بعض بعض کے مددگار بھی ہوں۔ (براہین احمدیہ حصّہ سوم صفحہ ۲۱۹-۲۲۰ حاشیہ نمبر ۱۱)

ان کو کہہ دے کہ اگر تمام جنّ اور آدمی اِس بات پر اتفاق کر لیں کہ قرآن کی مثل کوئی کلام لاویں تو یہ بات اُن کے لئے ممکن نہیں۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بھی بن جاویں۔

(براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۲۹۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

ان کو کہہ دے کہ اگر تمام جنّ متفق ہو جائیں اور ساتھ ہی بنی آدم بھی اتفاق کر لیں اور سب مل کر یہ چاہیں کہ مثل اس قرآن کے کوئی اَور قرآن بناویں تو اُن کے لئے ہرگز ممکن نہیں ہوگا۔ اگرچہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔ (براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۴۹۲)

اِن منکرین کو کہہ دے کہ اگر تمام جنّ و انس یعنی تمام مخلوقات اِس بات پر متفق ہو جائے کہ اِس قرآن کی کوئی مثل بنانی چاہیئے تو وہ ہرگز اس بات پر قادر نہیں ہوں گے کہ ایسی ہی کتاب اِنہیں ظاہری باطنی خوبیوں کی جامع بنا سکیں۔ اگرچہ وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں۔ (سرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۳ حاشیہ)

ان کو کہہ دے کہ اگر سب جنّ و انس اس بات پر متفق ہو جائیں کہ قرآن کی کوئی نظیر پیش کرنی چاہیئے تو ممکن نہیں کہ کر سکیں اگرچہ بعض بعضوں کی مدد بھی کریں۔ اور جو کچھ قرآن شریف کے ذاتی معجزات اس جگہ ہم نے تحریر کئے ہیں اگر کسی آریہ وغیرہ کو اپنے دل میں کچھ گھمنڈ یا سر میں کچھ غرور ہو اور خیال ہو کہ یہ معجزہ نہیں ہے بلکہ وید یا اس کی کوئی اور کتاب جس کو وہ الہامی سمجھتا ہے اس کا مقابلہ کر سکتی ہے تو اُسے اختیار ہے کہ آزما کر دیکھ لے اور ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر کوئی مخالف ممتاز اور ذی علم لوگوں میں سے ان معجزات قرآنیہ میں سے کسی معجزہ کا انکاری ہو اور اپنی کتاب الہامی میں زور مقابلہ خیال کرتا ہو تو ہم حسب فرمائش اُس کے کوئی قسم اقسام معجزات ذاتیہ قرآن شریف میں

سے تحریر کرکے کوئی مستقل رسالہ شایع کردیں گے پھر اگر اس کی الہامی کتاب قرآن شریف کا مقابلہ کرسکے تو اُسے حق پہنچتا ہے کہ تمام معجزات قرآنی سے منکر ہو جائے اور جو شرط قرار دی جائے ہم سے پوری کرلے۔

(سرمہ چشم آریہ ص ۲۲۶-۲۲۷)

علاوہ اس کمال خاص قرآن کے کہ وہ وحی متلو ہے محفوظیت کی رو سے بھی حدیثوں کو قرآن کریم سے کیا نسبت ہے۔ قرآن کریم کی جیسا کہ اُس کی بلاغت و فصاحت و حقایق و معارف کی رو سے کوئی چیز مثل نہیں ٹھہر سکتی ایسا ہی اس کی صحت کاملہ اور محفوظیت اور لا ریب فیہ ہونے میں کوئی چیز اس کی مثیل نہیں کیونکہ اس کے الفاظ و ترتیب الفاظ اور محفوظیت تامہ کا اہتمام خدائے تعالیٰ نے اپنے ذمہ لے لیا ہے اور ماسوا اس کے حدیث ہو یا قول کسی صحابی کا ہو ان سب کا اہتمام انسانوں نے کیا ہے جو سہو اور نسیان سے بری نہیں رہ سکتے اور ہرگز وہ لوگ محفوظیت تامہ اور صحت کاملہ میں احادیث اور اقوال کو مثل قرآن نہیں بنا سکتے تھے اور یہ عجز اُن کا اس آیت کریمہ کے اعجازات پیشگوئی میں داخل ہے قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا جب ہر ایک بات میں مثل قرآن ممتنع ہے تو کیونکر وہ لوگ احادیث کو صحت اور محفوظیت میں مثل قرآن بنا سکتے ہیں۔ (ازالہ اوہام ص ۹۳۶-۹۳۷ حصہ دوم حاشیہ متعلقہ ص ۸۹۲)

اَلَسْتَ تَعْلَمُ اَنَّ الْقُرْاٰنَ مَا ادَّعٰى اِعْجَازَ الْبَلَاغَةِ اِلَّا فِي الرِّيَاغَةِ فَاِنَّ الْعَرَبَ فِيْ زَمَانِهٖ كَانُوْا فُصَحَاءَ الْعَصْرِ وَ بُلَغَاءَ الدَّهْرِ وَكَانَ مَدَارُ تَفَاخُرِهِمْ عَلٰى غُرَرِ الْبَيَانِ وَ دُرَرِهٖ وَ ثِمَارِ الْكَلَامِ وَ زَهْرِهٖ وَكَانُوْا يُنَاضِلُوْنَ بِالْقَصَائِدِ الْمُبْتَكَرَةِ وَالْخُطَبِ الْمُحَبَّرَةِ وَلٰكِنْ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّتَكَلَّمُوْا فِي اللَّطَائِفِ الْحِكَمِيَّةِ وَمَا مَسَّتْ بَيَانَهُمْ رَائِحَةُ الْمَعَارِفِ الْاِلٰهِيَّةِ بَلْ كَانَ مَسْرَحُ اَفْكَارِهِمْ اِلَى الْاَبْيَاتِ الْعِشْقِيَّةِ وَالْاَضَاحِيْكِ الْمُلْهِيَةِ وَمَا كَانُوْا عَلٰى تَرْصِيْعِ مَضَامِيْنِ الْحِكَمِ قَادِرِيْنَ وَكَانُوْا قَدْ مَرَنُوْا مِنْ سِنِيْنَ عَلٰى اَنْوَاعِ النَّظْمِ وَالنَّثْرِ وَلَطَائِفِ الْبَيَانِ

ترجمہ:۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ قرآن نے اعجاز بلاغت کا دعویٰ کشتی گاہ کے میدان میں کیا ہے کیونکہ عرب اس کے زمانہ میں فصحاء عصر اور بلغاء دہر تھے اور ان کے باہم فخر کرنے کا مدار فصیح اور با آب و تاب تقریروں پر تھا اور نیز کلام کے پھلوں اور پھولوں پر ناز کرتے تھے اور ان کی لڑائیاں نو ایجاد قصیدوں اور پاکیزہ خطبوں کے ساتھ ہوتی تھیں مگر ان کو لطائف حکمیہ میں بات کرنے کا سلیقہ نہ تھا اور ان کے بیان کو معارف الٰہیہ کی بُو بھی نہیں پہنچتی تھی بلکہ ان کے فکروں کا چراگاہ صرف عشقیہ شعروں اور ہنسانے والے اور غافل کرنے والے بیتوں تک تھا اور مضامین حکمیہ کی مرصع نگاری پر وہ قادر نہ تھے حالانکہ وہ ایک زمانہ سے نظم اور نثر اور لطائف بیان کے مشتاق تھے اور اپنے ہم جنسوں

وَسُلِّمُوْا وَ قُبِلُوْا فِی الْاَقْرَانِ وَ کَانُوْآ اَھْلَ اللِّسَانِ وَسَوَابِقَ الْمَیَادِیْنِ۔ فَخَاطَبَھُمُ اللّٰہُ وَقَالَ اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ[1] فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَ قُوْدُھَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَۃُ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ[2] وَقَالَ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِہٖ وَ لَوْکَانَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ ظَھِیْرًا فَعَجِزَ الْکُفَّارُ عَنِ الْمُقَابَلَۃِ وَ وَلَّوُا الدُّبُرَ کَالْمَغْلُوْبِیْنَ۔ (نورالحق حصہ اول صفحہ ۱۰۸-۱۰۹)

اگر جن اور انس سب اس بات پر اتفاق کریں کہ اگر اور کتاب جو کمالات قرآنی کا مقابلہ کرسکے پیش کرسکیں تو نہیں پیش کرسکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں۔ (جنگِ مقدس صفحہ ۲۔ تقریر ۲۲ مئی ۱۸۹۳ء)

اگر جن و انس اس بات پر اتفاق کرلیں کہ اِس قرآن کی نظیر بناویں تو ہرگز بنا نہیں سکیں گے اگرچہ وہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں۔ بعض نادان مُلّا اخزاہم اللہ کہا کرتے ہیں کہ یہ بے نظیری صرف بلاغت کے متعلق ہے لیکن ایسے لوگ سخت جاہل اور دِلوں کے اندھے ہیں اس میں کیا کلام ہے کہ قرآن کریم اپنی بلاغت اور فصاحت کے رو سے بھی بے نظیر ہے لیکن قرآن کریم کا یہ منشاء نہیں ہے کہ اُس کی بے نظیری صرف اسی وجہ سے ہے بلکہ اُس پاک کلام کا یہ منشاء ہے کہ جن جن صفات سے وہ متصف کیا گیا ہے اُن تمام صفات کے رو سے وہ بے نظیر ہے مگر یہ حاجت نہیں کہ وہ تمام صفات جمع ہو کر بینظیری پیدا ہو بلکہ ہر یک صفت جداگانہ بینظیری کی حد تک پہنچی ہوئی ہے۔

(کرامات الصادقین صفحہ ۹،۸)

ان کو کہہ دے کہ اگر جن و انس اس کی نظیر بنانا چاہیں یعنی وہ صفاتِ کاملہ جو اس کی بیان کی گئی ہیں اگر کوئی ان کی مثل بنی آدم اور جنات میں سے بنانا چاہیں تو یہ اُن کے لئے ممکن نہ ہوگا اگرچہ ایک دوسرے کی

ہیں مسلّم اور مقبول تھے اور اہل زبان اور میدانوں میں سبقت کرنے والے تھے پس خدا تعالیٰ نے اُن کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اگر تمہیں اس کلام میں شک ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر اتارا ہے تو تم بھی کوئی سورت اس کی مانند بنا کر لاؤ اور اگر بنا نہ سکو اور یاد رکھو کہ ہرگز بنا نہیں سکو گے سو اس آگ سے ڈرو جس کے ہیزم افروختنی آدمی اور پتھر ہیں اور وہ آگ کافروں کے لئے طیار کی گئی ہے اور فرمایا کہ اگر تمام جن و انس اس بات کے لئے اکٹھے ہوجائیں کہ اس قرآن کی کوئی مثل بنالاویں تو ہرگز نہیں لاسکیں گے اگرچہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں پس کفار مقابلہ سے عاجز آگئے اور مغلوب ہو کر پیٹھیں پھیر لیں۔ (نورالحق حصہ اوّل صفحہ ۱۰۸-۱۰۹)

---

[1] البقرہ آیت ۲۴ ۔ [2] البقرہ آیت ۲۵ ۔

مدد بھی کریں۔ (کرامات الصادقین ص۱)

بنیٓ ۹۰ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا۝

اور البتہ طرح طرح بیان کیا ہم نے واسطے لوگوں کے قرآن میں ہر ایک مثال سے پس انکار کیا اکثر لوگوں نے مگر کفر کرنا یعنی ہم نے ہر ایک طور سے دلیل اور حجت کے ساتھ قرآن کو پورا کیا مگر پھر بھی لوگ انکار سے باز نہ آئے۔ (جنگِ مقدس ص۱ تقریر ۲۲ مئی ۱۸۹۳ء)

بنیٓ ۹۴ اَوْ یَكُوْنَ لَكَ بَیْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِی السَّمَآءِؕ وَ لَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِیِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَیْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗؕ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۝

یہی معجزہ کفار مکہ نے ہمارے سید و مولیٰ حضرت خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم سے مانگا تھا کہ آسمان پر ہمارے روبرو چڑھیں اور روبرو ہی اُتریں اور انہیں جواب ملا تھا کہ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ یعنی خدائے تعالیٰ کی حکیمانہ شان اس سے پاک ہے کہ ایسے کُھلے کُھلے خوارق اس دار الابتلا میں دکھا دے اور ایمان بالغیب کی حکمت کو تلف کرے۔

اب مَیں کہتا ہوں کہ جو امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو افضل الانبیا تھے جایز نہیں اور سنت اللہ سے باہر سمجھا گیا وہ حضرت مسیح کے لئے کیونکر جایز ہو سکتا ہے۔ یہ کمال بے ادبی ہوگی کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایک کمال کو مُستبعد خیال کریں اور پھر وہی کمال حضرت مسیح کی نسبت قریب قیاس مان لیں۔ کیا کسی سچے مسلمان سے ایسی گستاخی ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ (توضیح مرام ص۹-۱۰)

اگر حضرت مسیح ابن مریم نے درحقیقت ایسے طور سے ہی اترنا ہے جس طور سے ہمارے علماء یقین کئے بیٹھے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس سے کوئی فرد بشر انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ہمارے علماء کو یاد رکھنا چاہئیے کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا کیونکہ خدائے تعالیٰ قرآن شریف میں صاف فرماتا ہے کہ اگر مَیں فرشتوں کو بھی زمین پر نبی مقرر کرکے بھیجتا تو انہیں بھی

التباس اور اشتباہ سے خالی نہ رکھتا یعنی ان میں بھی شبہ اور شک کرنے کی جگہ باقی رہتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ یہی معجزہ آسمان سے اترنے کا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مانگا گیا تھا اور اس وقت اس معجزہ کے دکھلانے کی بھی ضرورت بہت تھی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار رسالت کرنے سے جہنم ابدی کی سزا تھی مگر پھر بھی خدائے تعالیٰ نے یہ معجزہ نہ دکھایا اور سائلوں کو صاف جواب ملا کہ اس دار الابتلا میں ایسے کھلے کھلے معجزات خدائے تعالیٰ ہرگز نہیں دکھاتا تا ایمان بالغیب کی صورت میں فرق نہ آوے کیونکہ جب خدائے تعالیٰ کی طرف سے ایک بندہ اترتا ہوا دیکھ لیا اور فرشتے بھی آسمان سے اترتے ہوئے نظر آئے تو پھر تو بات ہی بکلی فیصلہ ہوگئی تو پھر کون بدبخت ہے جو اس سے منکر رہے گا۔ قرآن شریف اس قسم کی آیات سے بھرا پڑا ہے جن میں لکھا ہے کہ ایسے معجزات دکھانا خدائے تعالیٰ کی عادت نہیں ہے اور کفار مکہ ہمیشہ ایسے ہی معجزات مانگا کرتے تھے اور خدائے تعالیٰ برابر انہیں یہ کہتا تھا کہ اگر ہم چاہیں تو کوئی نشان آسمان سے ایسا نازل کریں جس کی طرف تمام منکروں اور کافروں کی گردنیں جھک جائیں لیکن اس دار الابتلا میں ایسا نشان ظاہر کرنا ہماری عادت نہیں کیونکہ اس سے ایمان بالغیب جس پر تمام ثواب مترتب ہوتا ہے ضائع اور دور ہو جاتا ہے۔ سو اے بھائیو میں محض نصیحتاً للہ آپ لوگوں کو سمجھاتا ہوں کہ اس خیال محال سے باز آجاؤ ان دو قرینوں پر متوجہ ہو کر نظر ڈالو کہ کس قدر قوی اور کھلے کھلے ہیں۔ اول ایلیا نبی کا آسمان سے اترنا کہ آخر وہ اترے تو کس طرح اترے۔ دوسرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی سوال ہونا اور قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ اس کا جواب ملنا۔ اپنے دلوں میں سوچو کہ کیا یہ اس بات کے سمجھنے کے لئے قرائن قویہ اور دلایل کافیہ نہیں کہ آسمان سے اترنے سے مراد حقیقی اور واقعی طور پر اترنا نہیں بلکہ مثالی اور ظلی طور پر اترنا مراد ہے۔

(ازالہ اوہام حصہ اوّل ص۲۸۰ - ۲۸۲)

کفار کہتے ہیں کہ تو آسمان پر چڑھ کر ہمیں دکھلا تب ہم ایمان لے آویں گے۔ ان کو کہہ دے کہ میرا خدا اس سے پاک تر ہے کہ اس دار الابتلا میں ایسے کھلے کھلے نشان دکھاوے اور میں بجز اس کے اور کوئی نہیں ہوں کہ ایک آدمی۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آسمان پر چڑھنے کا نشان مانگا تھا اور انہیں صاف جواب ملا کہ یہ عادت اللہ نہیں کہ کسی جسم خاکی کو آسمان پر لے جاوے۔ اب اگر جسم خاکی کے ساتھ ابن مریم کا آسمان پر جانا صحیح مان لیا جائے تو یہ جواب مذکورہ بالا سخت اعتراض کے لائق ٹھہر جائے گا اور کلام الٰہی میں تناقض اور اختلاف لازم آئے گا لہٰذا قطعی اور یقینی یہی امر ہے کہ حضرت مسیح بجسدہ العنصری آسمان پر نہیں گئے بلکہ موت کے بعد آسمان پر گئے ہیں۔ بھلا ہم ان لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا موت کے بعد حضرت یحیٰی اور حضرت آدم اور حضرت ادریس اور حضرت ابراہیم اور حضرت یوسف وغیرہ آسمان پر اٹھائے گئے تھے یا نہیں۔ اگر نہیں اٹھائے گئے تو پھر کیونکر معراج کی رات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو آسمانوں میں دیکھا۔ اور اگر

اٹھائے گئے تھے تو پھر ناحق مسیح ابن مریم کی رفع کے کیوں اَور طور پر معنے کئے جاتے ہیں تعجب کہ توفی کا لفظ جو صریح وفات پر دلالت کرتا ہے جابجا ان کے حق میں موجود ہے اور اٹھائے جانے کا نمونہ بھی بدیہی طور پر کھلا ہے کیونکہ وہ انہیں فوت شدہ لوگوں میں جا ملے جو ان سے پہلے اٹھائے گئے تھے اور اگر کہو کہ وہ لوگ اٹھائے نہیں گئے تو میں کہتا ہوں کہ وہ پھر آسمان میں کیونکر پہنچ گئے۔ آخر اٹھائے گئے تبھی تو آسمان میں پہنچے۔ کیا تم قرآن شریف میں یہ آیت نہیں پڑھتے وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا[1] کیا یہ وہی رفع نہیں ہے جو مسیح کے بارہ میں آیا ہے؟ کیا اس کے اٹھائے جانے کے معنے نہیں ہیں فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ[2]۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم ص۶۲۵-۶۲۶)

قرآن شریف صاف فرماتا ہے کہ کسی انسان کا آسمان پر چڑھ جانا عادۃ اللہ کے مخالف ہے جیسا کہ فرماتا ہے قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا لیکن ہمارے مخالف حضرت عیسیٰ کو اُن کے جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر چڑھاتے ہیں۔ (کتاب البریّہ ص۱۹۱ حاشیہ)

مسیح ابن مریم کا برخلاف نصوص صریحہ کتاب اللہ کے صدہا برس آسمان پر زندگی بسر کرکے اور پھر ملائک کے گروہ میں ایک مجمع عظیم میں نازل ہونا اور سانس سے تمام کافروں کو مارنا اور یہ نظارہ دنیا کے لوگوں کو دکھائی دینا جو ایمان بالغیب کے بھی منافی ہے درحقیقت ایسا ہی امر تھا جو نیچر اور قانون قدرت کے ماننے والے اس سے انکار کرتے کیونکہ اس قسم کے معجزات کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں اور قرآن اس کا مکذب ہے جیسا کہ آیت قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ سے ظاہر ہے۔ (کتاب البریّہ ص۲۰۱ حاشیہ)

عادت اللہ میں یہ امر داخل نہیں کہ کوئی انسان اسی جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر چلا جائے اور پھر آسمان سے نازل ہو۔ (ایام الصلح ص۴۶)

غرض آسمان سے نازل ہونے کا بطلان نہ صرف آیت قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ سے ثابت ہوتا ہے بلکہ یہ تمام آیتیں جہاں لکھا ہے کہ جب فرشتے نازل ہوں گے تو ایمان بے فائدہ ہوگا اور وہ فیصلے کا وقت ہوگا نہ بشارت اور ایمان کا وقت بلند آواز سے پکار رہی ہیں کہ حضرت عیسیٰ کا آسمان سے فرشتوں کے ساتھ اُترنا سراسر باطل ہے۔

(ایام الصلح ص۱۴۳)

قرآن شریف میں اقتراحی نشانوں کے مانگنے والوں کو یہ جواب دیا گیا تھا کہ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا یعنی خدا تعالیٰ کی شان اس تہمت سے پاک ہے کہ کسی اس کے رسول یا نبی یا ملہم کو یہ قدرت حاصل ہو کہ جو الوہیت کے متعلق خارق عادت کام ہیں ان کو وہ اپنی قدرت سے دکھلائے اور فرمایا کہ ان کو کہہ دے

---

[1] مریم آیت ۵۸ ۔ [2] یونس آیت ۳۳ ۔

کہ مَیں تو صرف آدمیوں میں سے ایک رسول ہوں جو اپنی طرف سے کسی کام کے کرنے کا مجاز نہیں ہوں محض امر الٰہی کی پیروی کرتا ہوں پھر مجھ سے یہ درخواست کرنا کہ یہ نشان دکھلا اور یہ نہ دکھلا سراسر حماقت ہے جو کچھ خدا نے کہا وہی دکھلا سکتا ہوں نہ اور کچھ۔ (تحفہ غزنویہ ص۱۰۹)

جب کفار بدبخت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ اقتراحی معجزہ مانگا کہ ہم تب تجھے قبول کریں گے کہ جب ہمارے دیکھتے دیکھتے آسمان پر چڑھ جائے اور دیکھتے دیکھتے اتر آوے تو آپ کو حکم آیا کہ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا یعنی ان کو کہہ دے کہ میرا خدا اس بات سے پاک ہے کہ اپنی سنت قدیما اور دائمی قانونِ قدرت کے برخلاف کوئی بات کرے۔ مَیں تو صرف رسول اور انسان ہوں اور جس قدر رسول دنیا میں آئے ہیں اُن میں سے کسی کے ساتھ خدا تعالیٰ کی یہ عادت نہیں ہوئی کہ اس کو جسم عنصری آسمان پر لے گیا ہو اور پھر آسمان سے اتارا ہو اور اگر عادت ہے تو تم خود ہی اس کا ثبوت دو کہ فلاں نبی بجسم عنصری آسمان پر اٹھایا گیا تھا اور پھر اتارا گیا تب میں بھی آسمان پر جاؤں گا اور تمہارے روبرو اتروں گا اور اگر کوئی نظیر تمہارے پاس نہیں تو پھر کیوں ایسے امر کی نسبت مجھ سے تقاضا کرتے ہو جو رسولوں کے ساتھ سنت اللہ نہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو یہ سکھلایا ہوتا کہ حضرت مسیح زندہ بجسمہ العنصری آسمان پر چلے گئے ہیں تو ضرور وہ اس وقت اعتراض کرتے اور کہتے کہ یا حضرت آپ کیوں آسمان پر کسی رسول کا بجسم عنصری جانا سنت اللہ کے برخلاف بیان فرماتے ہیں حالانکہ آپ ہی نے تو ہمیں بتلایا تھا کہ حضرت مسیح آسمان پر زندہ بجسمہ العنصری چلے گئے ہیں۔ (تحفہ گولڑویہ ص۱۲۵)

وَقَدْ سَئَلَ الْمُشْرِكُوْنَ سَيِّدَنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنْ يَّرْقٰى فِى السَّمَآءِ اِنْ كَانَ صَادِقًا مَّقْبُوْلًا فَقِيْلَ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّىْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا فَمَاظَنُّكَ اَلَيْسَ ابْنُ مَرْيَمَ بَشَرًا كَمِثْلِ خَيْرِ الْمُرْسَلِيْنَ۔ اَوْ تَفْتَرِىْ عَلَى اللّٰهِ وَتُقَدِّمُهٗ عَلٰى اَفْضَلِ النَّبِيِّيْنَ۔ اَلَا اِنَّهٗ مَا صَعِدَ اِلَى السَّمَآءِ اَلَا اِنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِيْنَ وَشَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ قَدْ مَاتَ وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ (الھدٰی والتبصرۃ لمن یرٰی ص۱۱۲)

(ترجمہ از مرتب) مشرکین نے ہمارے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معجزہ مانگا تھا کہ اگر آپ سچے اور مقبولِ بارگاہ ہیں تو آپ آسمان پر چڑھ جائیں۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا یعنی اے رسول تو انہیں کہہ دے کہ میرا رب ایسی بیہودہ باتوں کے اختیار کرنے سے پاک ہے مَیں تو صرف بشر رسول ہوں آسمان پر نہیں جا سکتا۔

پس تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے کیا ابن مریم خیر المرسلین کی مانند بشر نہیں تھے یا تو اللہ پر افتراء کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو افضل الانبیاء پر مقدم قرار دیتا ہے خبردار مسیح آسمان پر نہیں چڑھے۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ جھوٹوں پر خدا کی لعنت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ گواہی دے دی ہے کہ مسیح علیہ السلام وفات پا گئے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے زیادہ سچا اور کون ہو سکتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آسمان پر چڑھنے کی درخواست کی گئی جیسا کہ قرآن شریف میں مذکور ہے مگر وہ یہ کہہ کر نامنظور کی گئی کہ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا تو کیا عیسٰی بشر نہ تھا کہ اس کو بغیر درخواست کے آسمان پر چڑھا یا گیا۔ (تذکرۃ الشہادتین ص۱۵)

یہ خیالات نہایت قابل شرم ہیں کہ خدا تعالیٰ حضرت مسیح کو مع جسم آسمان پر اٹھالے گیا تھا گویا یہودیوں سے ڈرتا تھا کہ کہیں پکڑ نہ لیں۔ جن لوگوں کو اصل تنازعہ کی خبر نہ تھی انہوں نے ایسے خیالات پھیلائے ہیں اور ایسے خیالات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو ہے کیونکہ آپ سے کفار قریش نے بہ تمام تر اصرار یہ معجزہ طلب کیا تھا کہ آپ ہمارے روبرو آسمان پر چڑھ جائیں اور کتاب لے کر آسمان سے اتریں تو ہم سب ایمان لے آویں گے اور ان کو یہ جواب ملا تھا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا یعنی میں ایک بشر ہوں اور خدا تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ وعدہ کے برخلاف کسی بشر کو آسمان پر چڑھا دے۔ حالانکہ وہ وعدہ کر چکا ہے کہ تمام بشر زمین پر ہی اپنی زندگی بسر کریں گے۔ لیکن حضرت مسیح کو خدا نے آسمان پر مع جسم چڑھا دیا اور اس وعدہ کا کچھ پاس نہ کیا۔ (لیکچر سیالکوٹ ص۳۳)

یہ سچی بات ہے کہ کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آسمان پر چڑھ جانے کا معجزہ مانگا۔ اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو ہر طرح کامل اور افضل تھے۔ ان کو چاہیئے تھا کہ وہ آسمان پر چڑھ جاتے مگر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی وحی سے کیا جواب دیا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا اس کا مفہوم یہ ہے کہ کہہ دو اللہ تعالیٰ اس امر سے پاک ہے کہ وہ خلاف وعدہ کرے جبکہ اس نے بشر کے لئے آسمان پر مع جسم کے جانا حرام کر دیا ہے۔ اگر میں جاؤں تو جھوٹا ٹھیروں گا۔ اب اگر تمہارا یہ عقیدہ صحیح ہے کہ مسیح آسمان پر چلا گیا ہے اور کوئی بالمقابل پادری یہ آیت پیش کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرے تو تم اس کا کیا جواب دے سکتے ہو؟

(الحکم جلد ۱۰ ۴۱ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۶ء ص۵)

فَانْظُرْ اِقْتِدَاءً بِهٰذَا الْقَانُوْنِ الْعَاصِمِ الَّذِيْ بَلَغَنَا مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ هَلْ تَجِدُ لِقِصَّةِ صُعُوْدِ الْمَسِيْحِ مَعَ جِسْمِهِ الْعُنْصُرِيِّ وَلِقِصَّةِ نُزُوْلِهٖ مِنَ السَّمَاءِ وَاضِعًا كَفَّيْهِ عَلٰى جَنَاحَيِ الْمَلَكَيْنِ اَصْلًا اَوْ اَثَرًا فِي الْقُرْاٰنِ اَوْ قِصَّةً مِّمَّا يُشَابِهُ هٰذِهِ الْقِصَّةَ

(ترجمہ از مرتب) تو اُس محفوظ قانون کی پیروی کرتے ہوئے جو ہمیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پہنچا ہے غور کر کہ کیا تو مسیح کے جسم عنصری کے ساتھ اوپر چڑھنے اور اُن کے آسمان سے دو فرشتوں کے پَروں پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے اُترنے کے قصّہ کی کوئی بنیاد یا ثبوت قرآن مجید میں پاتا ہے؟ یا اس قصّہ سے مشابہ کوئی اور قصّہ پاتا ہے؟ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید اس دُنیا میں اس قسم کے افعال

بَلِ الْقُرْاٰنُ يُنَزِّهُ شَانَ اللّٰهِ عَنْ مِثْلِ تِلْكَ الْاَفْعَالِ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا وَيَقُوْلُ: قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ (حمامة البشریٰ ص۳۳)

ایک طرف تو حضرت عیسیٰؑ کو خدا تعالیٰ کی طرح وحدہٗ لاشریک سمجھتے ہیں۔ وہی ہے جو مع جسم عنصری آسمان پر گیا اور وہی ہے جو کسی دن مع جسم عنصری زمین پر آئے گا اور اُسی نے پرندے پیدا کئے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کافروں نے قسمیں کھا کر بار بار سوال کیا کہ آپ مع جسم عنصری آسمان پر چڑھ کر دکھلائیے ہم ابھی ایمان لائیں گے۔ ان کو جواب دیا گیا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا یعنی ان کو کہہ دے کہ میرا خدا عہد شکنی سے پاک ہے اور بموجب اُس کے قول کے مع جسم عنصری آسمان پر نہیں جا سکتا کیونکہ یہ امر خدا کے وعدہ کے برخلاف ہے وجہ یہ کہ وہ فرماتا ہے کہ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ[1] وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ[2] ..... اگر عیسیٰؑ مع جسم عنصری آسمان پر گیا ہے تو قرآن کے بیان کے رُو سے لازم آتا ہے کہ عیسیٰؑ بشر نہیں تھا۔

(چشمہ مسیحی ص۲۷ حاشیہ)

جو لوگ مسلمان کہلا کر حضرت عیسیٰ کو مع جسم عنصری آسمان پر پہنچاتے ہیں وہ قرآن شریف کے برخلاف ایک لغو بات مُنہ پر لاتے ہیں۔ قرآن شریف تو آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ[3] میں حضرت عیسیٰ کی موت ظاہر کرتا ہے اور آیت قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا میں انسان کا مع جسم عنصری آسمان پر جانا ممتنع قرار دیتا ہے پھر یہ کیسی جہالت ہے کہ کلام الٰہی کے مخالف عقیدہ رکھتے ہیں۔ (چشمہ مسیحی ص۱۰ حاشیہ)

ہمارے مخالف باوجود بہت سے اختلافات کے جو مسیح موعود کے بارے میں ہر ایک فرقہ کی حدیثوں میں پائے جاتے ہیں اور بالاتفاق اس کو اُمتی بھی قرار دیا گیا ہے اس بات پر مطمئن ہیں کہ ضرور مسیح آسمان سے ہی نازل ہوگا۔ حالانکہ آسمان سے نازل ہونا خود غیر معقول اور خلاف نص قرآن ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ پس اگر بشر کے جسم عنصری کا آسمان پر چڑھانا عادت اللہ میں داخل تھا تو اس جگہ کفار قریش کو کیوں انکار کے ساتھ جواب دیا گیا۔ کیا عیسیٰ بشر نہیں تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں اور کیا خدا تعالیٰ کو حضرت

سے اللہ تعالیٰ کی شان کو منزہ قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا اے رسول تو انہیں کہہ کہ میرا رب ایسی بیہودہ باتوں کے اختیار کرنے سے پاک ہے۔ مَیں تو صرف بشر رسول ہوں آسمان پر نہیں جا سکتا۔

---

[1] الاعراف آیت ۲۶۔ [2] البقرہ آیت ۳۷۔ [3] المائدہ آیت ۱۱۸۔

عیسیٰ کو آسمان پر چڑھانے کے وقت وہ وعدہ یاد نہ رہا کہ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا اَحْيَآءً وَّ اَمْوَاتًا[۱] مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آسمان پر چڑھنے کا جب سوال کیا گیا تو وہ وعدہ یاد آگیا۔ (حقیقۃ الوحی ص۴۴)

خدا کی کتابوں میں لکھا گیا کہ مومن مرنے سے چند روز بعد یا نہایت چالیس دن تک زندہ کیا جاتا اور آسمان کی طرف اٹھایا جاتا ہے۔ یہ وہی جھگڑا ہے جو اب تک ہم میں اور ہمارے مخالفوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع کی نسبت چلا آتا ہے۔ ہم موافق کتاب اللہ کے ان کی رفع روحانی ہونے کے قائل ہیں اور وہ کتاب اللہ کی مخالفت کرکے اور خدا کے حکم قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا کو پیروں کے نیچے رکھ کر رفع جسمانی ہونے کے قائل ہیں اور مجھے کہتے ہیں کہ یہ دجال ہے کیونکہ لکھا ہے کہ تیس دجال آئیں گے۔ وہ نہیں سوچتے کہ اگر تیس دجال آنے والے تھے تو اس حساب کی رُو سے ہر ایک دجال کے مقابل پر تیس مسیح بھی تو چاہیئے تھے۔ یہ کیا غضب ہے کہ دجال تو تینتیس آگئے مگر مسیح ایک بھی نہ آیا۔ یہ امت کیسی بد قسمت ہے کہ اس کے حصہ میں دجال ہی رہ گئے اور سچے مسیح کا منہ دیکھنا اب تک نصیب نہ ہوا حالانکہ اسرائیلی سلسلہ میں تو صدہا نبی آئے تھے۔ (حقیقۃ الوحی ص۲۰۳)

يَرْفَعُوْنَ عِيْسٰى مَعَ جِسْمِهٖ اِلَى السَّمَآءِ وَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ قَوْلَهٗ تَعَالٰى قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ بَلْ يَزِيْدُوْنَ فِي الْبُغْضِ وَالشَّحْنَآءِ۔ يَا فِتْيَانُ اَيْنَ اَنْتُمْ مِنْ تِلْكَ الْاٰيَاتِ وَلِمَ تَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنَ الْقَوْلِ وَتَتْرُكُوْنَ الْبَيِّنَاتِ الْمُحْكَمَاتِ۔ اَلَا تَعْلَمُوْنَ اَنَّ الْكُفَّارَ طَلَبُوْا فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ مُعْجِزَةَ الصُّعُوْدِ اِلَى السَّمَآءِ مِنْ نَبِيِّنَا خَيْرِ الْاَنْبِيَآءِ وَزُبْدَةِ الْاَصْفِيَآءِ۔ فَاَجَابَهُمُ اللّٰهُ اَنَّ رَفْعَ بَشَرٍ مَّعَ جِسْمِهٖ لَيْسَ مِنْ عَادَتِهٖ بَلْ هُوَ خِلَافُ مَوَاعِيْدِهٖ وَسُنَّتِهٖ وَلَوْ فُرِضَ اَنَّ عِيْسٰى رُفِعَ مَعَ جِسْمِهٖ اِلَى السَّمَآءِ الثَّانِيَةِ۔ فَمَا مَعْنٰى هٰذَا الْمَنْعِ فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ اَلَمْ يَكُنْ عِيْسٰى بَشَرًا عِنْدَ حَضْرَةِ الْعِزَّةِ۔ ثُمَّ اَيُّ حَاجَةٍ اِشْتَدَّتْ لِرَفْعِهٖ

(ترجمہ از مرتب) لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جسم سمیت آسمان پر چڑھاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے قول قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ الخ پر غور نہیں کرتے بلکہ وہ بُغض اور کینہ میں بڑھ رہے ہیں۔ اے نوجوانو تم ان آیات پر غور کرو تم کیوں متشابہات کی پیروی کرتے ہو اور واضح محکمات کو چھوڑتے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اس آیت میں مذکور ہے کہ کفار نے ہمارے رسول کریم سے جو سب نبیوں سے بہتر اور تمام برگزیدہ لوگوں کے سردار ہیں آسمان پر چڑھنے کا معجزہ طلب کیا تھا تب اللہ تعالیٰ نے انہیں جواب دیا کہ بشر کو جسم سمیت آسمان پر اٹھانا اس کی عادت میں نہیں ہے بلکہ یہ اس کی سنت اور وعدوں کے خلاف طریق ہے۔ اور اگر یہ فرض کیا جائے کہ حضرت عیسیٰ جسم سمیت دوسرے آسمان پر اٹھائے گئے تھے تو اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آسمانوں پر جانے میں روک کے کیا معنے ہیں۔ کیا عیسیٰ علیہ السلام خدا تعالیٰ کے نزدیک بشر نہیں تھے۔ علاوہ ازیں کونسی سخت ضرورت پیش

۱؎ المرسلٰت آیت ۲۶، ۲۷؛

اِلَی السَّمٰوَاتِ الْعُلٰی۔ اَاَرْهَقَتْهُ الْاَرْضُ بِضِیْقِهَا اَوْمَا بَقِیَ مَفَرٌّ مِّنْ اَیْدِی الْیَهُوْدِ فِیْهَا فَرُفِعَ اِلَی السَّمَآءِ لِیُخْفٰی۔ (الاستفتاء ص۲)

فَلَاشَکَّ اَنَّ هٰذِهِ الْاٰیَةَ دَلِیْلٌ وَّاضِحٌ عَلٰی اِمْتِنَاعِ صُعُوْدِ بَشَرٍ اِلَی السَّمَآءِ مَعَ جِسْمِهِ الْعُنْصُرِیِّ وَلَا یُنْکِرُهٗ اِلَّا الْجَاهِلُوْنَ وَفِیْ قَوْلِهٖ تَعَالٰی "سُبْحَانَ رَبِّیْ" اِشَارَةٌ اِلٰی اٰیَةِ فِیْهَا تَحْیَوْنَ وَفِیْهَا تَمُوْتُوْنَ[1] فَاِنَّ رَفْعَ بَشَرٍ اِلَی السَّمَآءِ اَمْرٌ یَنْقُضُ هٰذَا الْعَهْدَ فَسُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یَنْقُضُ عَهْدَهٗ فَفَکِّرُوْا اَیُّهَا الْعَاقِلُوْنَ۔ (الاستفتاء ص۲ حاشیہ)

آسمان پر چڑھنے اور اترنے کا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزہ مانگا گیا تھا جس کا قرآن شریف میں ذکر ہے آخر ان کو صاف جواب دیا گیا اور خدا تعالیٰ نے فرمایا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۱۲۳)

وہ عقیدہ جس پر خدا تعالیٰ نے علی وجہ البصیرت مجھ کو قائم کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مثل دیگر انسانوں کے انسانی عمر پاکر فوت ہوگئے ہیں اور آسمان پر مع جسم عنصری چڑھ جانا اور پھر کسی وقت مع جسم عنصری زمین پر نازل ہونا یہ سب ان پر تہمتیں ہیں۔ قال اللہ عزوجل قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۲)

جب کافروں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آسمان پر چڑھنے کی درخواست کی کہ یہ معجزہ دکھلاویں کہ مع جسم

آئی تھی کہ انہیں بلند آسمانوں پر اٹھایا جاتا۔ کیا زمین ان کے لئے تنگ ہوگئی تھی یا یہود کے ہاتھوں سے بچ کر زمین میں ان کے لئے کوئی مفر نہ رہا تھا پس آپ کو آسمانوں پر اٹھایا گیا تاکہ انہیں چھپایا جائے۔

(ترجمہ از مرتب) بلا شبہ یہ آیت کسی بشر کے جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر جانے میں روک ہونے کے لئے واضح دلیل ہے اور اس کا انکار سوائے جاہلوں کے کوئی نہیں کر سکتا نیز آیت سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا میں اشارہ آیت فِیْهَا تَحْیَوْنَ وَفِیْهَا تَمُوْتُوْنَ کی طرف ہے کیونکہ کسی انسان کا آسمان پر اٹھایا جانا ایسا امر ہے جو اس عہد کو توڑتا ہے اور خدا تعالیٰ کی ذات پاک اور بلند ہے کہ وہ اپنے عہد کو توڑے۔ اے عقلمندو اس پر پوری طرح غور کرو۔

---

[1] الاعراف آیت ۲۶

عنصری آسمان پر چڑھ جائیں تو اُن کو یہ جواب ملا کہ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ الخ یعنی ان کو کہہ دے کہ میرا خدا اس بات سے پاک ہے کہ اپنے عہد اور وعدہ کے برخلاف کرے۔ وہ پہلے کہہ چکا ہے کہ کوئی جسم عنصری آسمان پر نہیں جائے گا جیسا کہ فرمایا اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا اَحْيَآءً وَّ اَمْوَاتًا[1] اور جیسا کہ فرمایا فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ[2] اور جیسا کہ فرمایا وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ[3] پس یہ عرب کے کفار کی شرارت تھی کہ وہ لوگ برخلاف وعدہ وعہد الٰہی معجزہ مانگتے تھے اور خوب جانتے تھے کہ ایسا معجزہ دکھایا نہیں جائے گا کیونکہ یہ خدا تعالیٰ کے اس قول کے برخلاف ہے جو گذر چکا ہے اور خدا تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ اپنے عہد کو توڑے اور پھر فرمایا کہ اُن کو کہہ دے کہ مَیں تو ایک بشر ہوں اور خدا تعالیٰ فرما چکا ہے کہ بشر کے لئے ممتنع ہے کہ اس کا جسم خاکی آسمان پر جائے ہاں پاک لوگ دوسرے جسم کے ساتھ آسمان پر جا سکتے ہیں جیسا کہ تمام نبیوں اور رسولوں اور مومنوں کی رُوحیں وفات کے بعد آسمان پر جاتی ہیں اور اُنہیں کی نسبت اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مُفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ[4] یعنی مومنوں کے لئے آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے۔ یاد رہے کہ اگر صرف روحیں ہوتیں تو ان کے لئے لَهُمْ کی ضمیر نہ آتی۔ پس یہ قرینہ قویہ اس بات پر ہے کہ بعد موت جو مومنوں کا رفع ہوتا ہے وہ مع جسم ہوتا ہے مگر یہ جسم خاکی نہیں ہے بلکہ مومن کی روح کو ایک اَور جسم ملتا ہے جو پاک اور نورانی ہوتا ہے اور اُس دُکھ اور عیب سے محفوظ ہوتا ہے جو عنصری جسم کے لوازم میں سے ہے یعنی وہ ارضی غذاؤں کا محتاج نہیں ہوتا اور نہ زمینی پانی کا حاجتمند ہوتا ہے اور وہ تمام لوگ جن کو خدا تعالیٰ کی ہمسایگی میں جگہ دی جاتی ہے ایسا ہی جسم پاتے ہیں اور ہم ایمان رکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ نے بھی وفات کے بعد ایسا ہی جسم پایا تھا اور اُسی جسم کے ساتھ وہ خدا تعالیٰ کی طرف اٹھائے گئے تھے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۲۴-۲۲۵)

کفار قریش نے ہمارے سید و مولیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معجزہ طلب کیا کہ اُن کے رُوبرو آسمان پر چڑھ جائیں تو آپ کو خدا تعالیٰ نے ان الفاظ کے ساتھ جواب دیا کہ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا یعنی ان لوگوں کو یہ جواب دے کہ خدا تعالیٰ اس بات سے پاک ہے کہ اپنے وعدہ میں تخلف کرے ..... اور مَیں تو صرف ایک انسان ہوں جو تمہاری طرف بھیجا گیا۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۱۹-۲۲۰)

ہمارا خدا تعالیٰ پر کیا حق ہے کہ ہم جو کہیں وہ وہی کر دے۔ یہ سُوء ادب ہے اور ایسا خدا خدا ہی نہیں ہو سکتا۔ ہاں یہ اس کا فضل ہے کہ اُس نے ہم کو امید اور حوصلہ دلایا کہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ[5] یہ نہیں کہا کہ تم جو مانگو گے وہی دیا جاوے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جب بعض اقتراحی نشانات مانگے گئے تو آپ نے یہی خدا کی

---

[1] المرسلٰت آیت ۲۶-۲۷ ◆ [2] الاعراف آیت ۲۶ ◆ [3] الاعراف آیت ۲۵ ◆ [4] صٓ آیت ۵۱ ◆ [5] المؤمن آیت ۶۱ ◆

تعلیم سے جواب دیا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا خدا کے رسول کبھی اپنی بشریت کی حد سے نہیں بڑھتے اور وہ آداب الٰہی کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

ہم نہیں مان سکتے کہ کوئی اس جسم کے ساتھ آسمان پر بھی چڑھ سکتا ہے کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار نے کہا کہ تو آسمان پر چڑھ جا آپ نے یہی فرمایا سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱)

خدا تعالیٰ کبھی قیامت کا نظارہ یہاں قائم نہیں کرتا اور وہ غلطی کرتے ہیں جو ایسے نشان دیکھنے چاہتے ہیں۔ یہ محرومی کے طریق ہوتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ آپ آسمان پر چڑھ جائیں اور کتاب لے آئیں تو آپ نے یہی جواب دیا هَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ پورے انکشاف کے بعد ایمان لاکر کسی ثواب کی امید رکھنا غلطی ہے۔ اگر کوئی مٹھی کھول دی جاوے اور پھر کوئی بتادے کہ اس میں فلاں چیز ہے تو اس کی کوئی قدر نہ ہوگی۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۶ مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

ایسے فرضی اوصاف ان (حضرت مسیح علیہ السلام۔ ناقل) کے لئے وضع کرتے ہیں جن سے آنحضرت صلعم کی ہتک اور ہجو ہو کیونکہ آنحضرت صلعم سے کفار نے سوال کیا کہ آپ آسمان پر چڑھ کر بتلا دیں تو آپ نے یہ معجزہ اُن کو نہ دکھلایا اور سُبْحَانَ رَبِّیْ کا جواب دیا گیا۔ اور یہاں بلا درخواست کسی کافر کے خود خدا تعالیٰ مسیحؑ کو آسمان پر لے گیا تو گویا خدا تعالیٰ نے خود آنحضرت صلعم کو کفار کی نظروں میں ہیٹا کرانا چاہا۔ کیا وہ خدا اَور تھا اور یہ اَور تھا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۴ مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۶۷)

ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک نبی مانتے ہیں اور سب سے اشرف جانتے ہیں اور ہرگز گوارا نہیں کرتے کہ کوئی عمدہ بات کسی اَور کی طرف منسوب کی جاوے۔ جب کفار نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی معجزہ طلب کیا کہ آسمان پر چڑھ کر دکھاویں تو آپ نے فرمایا سُبْحَانَ رَبِّیْ اور انکار کر دیا۔ دوسری طرف حضرت مسیح کو خدا آسمان پر لے جاوے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم قرآن سے کیا بلکہ کُل کتابوں سے دکھا سکتے ہیں کہ جس قدر اخلاق اور خوبیاں کُل انبیاء میں تھیں وہ سب کی سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع تھیں۔ کَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا[1] اسی کی طرف اشارہ ہے پس اگر آسمان پر جانا کوئی فضیلت ہو سکتی تھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس سے کب باہر رہ سکتے تھے۔ آخر یہ لوگ پچھتاویں گے کہ ان باتوں کو ہم نے کیوں نہ مانا۔ یہ لوگ ایک وار تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر کرتے ہیں کہ ایک معجزہ آسمان پر جانے کا لوگوں نے مانگا مگر خدا تعالیٰ نے آپ کی پرواہ نہ کی اور عیسٰی کو یہ عزت دی کہ اُسے آسمان

---

[1] النساء آیت ۱۱۴

پر اٹھالیا اور دوسرا حملہ خود خدا پر کرتے ہیں کہ اُس نے اپنی قوت خلق سے مسیح کو بھی کچھ دے دی جس سے تشابہ الخلق ہو گیا جواب دیتے ہیں کہ خدا نے خود مسیح کو یہ قدرت دی تھی۔ اے نادانو اگر خدائی نے تقسیم ہونا تھا تو کیا اس کے حصہ گیر عیسیٰ ہی رہ گئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کیوں نہ حصہ ملا۔ (البدر جلد ۲ ۳۵ مورخہ ۱۹ ستمبر ۱۹۰۳ء صہ ۲)

خود خدا تعالیٰ کے کلام میں اس امر کا فیصلہ کیا گیا ہے کہ کوئی آسمان پر نہیں جاتا۔ جہاں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کفار نے آسمان پر چڑھنے کا معجزہ طلب کیا تو فرمایا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا یعنی بشر رسول کبھی کوئی آسمان پر نہیں چڑھا.... کتب سماوی اور تاریخ زمانہ بھی یہی شہادت دیتی ہے۔ کوئی نظیر ایسی نہیں کہ پہلے کوئی دو چار نبی آسمان پر گئے ہوں۔ خود مسیح نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ یوحنا ہی الیاس ہے ہاں جس طرح آدم، موسیٰ، نوح اور دوسرے نبی آسمان پر گئے اس طرح بیشک حضرت عیسیٰ بھی گئے تھے چنانچہ شب معراج میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سب کو آسمان پر دیکھا حضرت عیسیٰ کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ افسوس ہے کہ ان لوگوں کی قوتِ شامہ ہی ماری گئی ہے۔ خود زمانہ کی حالت سے بُو آتی ہے کہ ایسا عقیدہ رکھنا عیسائیت کی پہلی اینٹ ہے۔

(بدر جلد ۱ ۱۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۵ء صہ ۲)

سچی اور بالکل سچی اور صاف بات یہی ہے کہ اجسام ضرور ملتے ہیں لیکن یہ عنصری اجسام یہاں ہی رہ جاتے ہیں یہ اُوپر نہیں جاسکتے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے جواب میں فرمایا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا یعنی ان کو کہہ دے میرا رب اس سے پاک ہے جو اپنے وعدوں کے خلاف کرے جو وہ پہلے کر چکا ہے مَیں تو صرف ایک بشر رسول ہوں۔ سُبْحَان کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ سابق جو وعدے ہو چکے ہیں ان کی خلاف ورزی وہ نہیں کرتا۔ وہ وعدہ کیا ہے؟ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ[1] اور ایسا ہی فرمایا اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا[2] اور پھر فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ[3] ان سب آیتوں پر اگر یکجائی نظر کی جاوے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جسم جو کھانے پینے کا محتاج ہے آسمان پر نہیں جاتا پھر ہم دوسرے نبیوں سے بڑھ کر مسیح میں یہ خصوصیت کیونکر تسلیم کرلیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کفار نے شرارت سے یہی سوال کیا تھا کہ آپ آسمان پر چڑھ جائیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پہلے وہ آیات سُن چکے تھے جس میں اس امر کی نفی کی گئی تھی۔ انہوں نے سوچا کہ اگر اب اقرار کریں تو اعتراض کا موقع ملے لیکن وہ تو اللہ کا کلام تھا اس میں اختلاف نہیں ہوسکتا تھا اس لئے ان کو یہی جواب ملا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا یعنی ان کو کہہ دو کہ ایسا معجزہ اللہ تعالیٰ کے قول کے خلاف ہے اور وہ اس سے

---

[1] البقرہ آیت ۳۷ ۔ [2] المرسلٰت آیت ۲۶ ۔ [3] الاعراف آیت ۲۶ ۔

پاک ہے کہ اپنے پہلے قول کے خلاف کرے۔

(الحکم جلد ۹ ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تو جب آسمان پر جانے کا معجزہ مانگا جاوے تو انہیں قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ کا جواب ملے اور مسیح کے لئے تجویز کر لیا جاوے کہ وہ آسمان پر چڑھ گئے۔ ایسی خصوصیتوں کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اسے خدا بنایا جاوے پھر توحید کہاں رہی؟

(الحکم جلد ۹ ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۲)

آیت قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا مسیح کو زندہ آسمان پر جانے سے روکتی ہے کیونکہ جب کفار نے آپ سے آسمان پر چڑھ جانے کا معجزہ مانگا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہی جواب دیا کہ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا یعنی میرا رب اس وعدہ خلافی سے پاک ہے جو ایک مرتبہ تو وہ انسان کے لئے یہ قرار دے کہ وہ اسی زمین میں پیدا ہوا اور یہاں ہی مرے گا فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَفِيْهَا تَمُوْتُوْنَ[1] میں تو ایک بشر رسول ہوں یعنی وہ بشریت میرے ساتھ موجود ہے جو آسمان پر نہیں جا سکتی اور دراصل کفار کی غرض اس سوال سے یہی تھی چونکہ وہ پہلے یہ سُن چکے تھے کہ انسان اِسی دُنیا میں جیتا اور مرتا ہے اس لئے انہوں نے موقع پاکر یہ سوال کیا جس کا جواب ان کو ایسا دیا گیا کہ ان کا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ پس یہ طے شدہ مسئلہ ہے کہ مسیح وفات پا چکے۔

(الحکم جلد ۱۰ ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

کہہ دے میرا رب پاک ہے۔ میں تو ایک انسان رسول ہوں انسان اس طرح اُڑ کر کبھی آسمان پر نہیں جاتے۔ یہی سنّت اللہ قدیم سے جاری ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ ۲۱ مورخہ ۱۷ جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

ہمارے نبی کریم صلعم پر جب کفار نے سوال کیا تھا کہ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ یعنی آسمان پر چڑھ جاؤ تو خدا نے یہی جواب دیا تھا کہ بشر آسمان پر نہیں جا سکتا جیسے فرمایا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا اگر بشر آسمان پر جا سکتا تھا تو چاہیئے تھا کہ کفار نظیر پیش کر دیتے۔

---

[1] الاعراف آیت ۲۶

افسوس ان لوگوں نے بے وجہ پادریوں کی مدد پر کمر باندھ لی ہے جب وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کی رُو سے بشر تو آسمان پر جا نہیں سکتا مگر عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر چلے گئے اس لئے وہ خدا ہیں تو پھر مُنہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ اتنا نہیں سمجھتے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو ایک کمزور اور عاجز انسان تھے اور خدا تعالیٰ کے رسول تھے ایک ذرّہ بھی اس سے زیادہ نہ تھے۔

(الحکم جلد ۱۱ ۳۹ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

اللہ تعالیٰ نے اقتراح کو منع کیا ہے اور تجربہ بتاتا ہے کہ اقتراح کرنے والے لوگ ہمیشہ ہدایت سے محروم ہی رہتے ہیں کیونکہ خدا نہ ان کی مرضی اور خواہشات کا تابع ہوتا ہے اور نہ وہ ہدایت پاتے ہیں۔ دیکھ لو جب نشانات اور معجزات اقتراحی رنگ میں طلب کئے گئے جب ہی یہی جواب ملا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔

(الحکم جلد ۱۲ ۲۴ مورخہ ۲ اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

وہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ناقل) بے شک خدا کے مقربین میں سے تھے۔ ان پر خدا تعالیٰ کا فضل تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی نبوت سے ممتاز تھے۔ مگر ان کے لئے کوئی ایسی خصوصیت مقرر کرنا جو دوسرے انبیاء میں نہ ہو ٹھیک نہیں۔ کہتے ہیں کہ آسمان پر کئی صدیوں سے بجسدہ العنصری متمکن ہے حالانکہ آنحضرتؐ سے کفار نے قسمیں کھا کھا کر کہا کہ ہم ضرور مان لیں گے اگر آپ ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جاویں۔ اس کا جواب جو دیا گیا وہ یہ تھا کہ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ابتداء سے ایک قانون مقرر کر دیا کہ فِيْهَا تَحْيَوْنَ[1] تو پھر اللہ اپنی سنّت کے خلاف کیوں کرتا۔ اگر یہ عقیدہ (عیسیٰ کے مع جسم آسمان پر چڑھ جانے کا) اس وقت کے مسلمانوں میں ہوتا تو کافروں کا حق تھا کہ انہیں یہ کہہ کر ملزم کریں کیا وجہ ہے ایک نبی کے لئے یہ امر جائز قرار دیتے ہیں اور دوسرے کے لئے نہیں حالانکہ تم اس بات کے بھی قائل ہو کہ آنحضرت صلعم تمام نبیوں سے اور بالخصوص حضرت عیسیٰ سے افضل اور جامع کمالات نبوت ہیں۔

غرض یہ زندہ آسمان پر چڑھ جانے کا ذکر قرآن شریف میں نہیں ہے بلکہ قرآن تو اس عقیدہ کی تردید کرتا ہے۔ یہ آیت ہے جو مَیں نے پڑھی ہے حدیث نہیں کہ اس پر ضعیف یا وضعی ہونے کا اعتراض ہو سکتا ہو۔ سارا قرآن مجید اوّل سے آخر تک دیکھ لو عیسیٰؑ کے اب تک زندہ رہنے کا ثبوت نہ پاؤ گے۔

(بدر جلد ۷ ۱۹-۲۰ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۚ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ (۹۷)

[1] الاعراف ۲۶

خَبِيْرًا بَصِيْرًا۝

یاد رکھو محض الہام جب تک اُس کے ساتھ فعلی شہادت نہ ہو ہرگز کسی کام کا نہیں۔ دیکھو جب کفار کی طرف سے اعتراض ہوا لَسْتَ مُرْسَلًا تو جواب دیا گیا کَفٰی بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ یعنی عنقریب خدا تعالیٰ کی فعلی شہادت میری صداقت کو ثابت کر دے گی پس الہام کے ساتھ فعلی شہادت بھی چاہیئے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۵ را پریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

۱۰۶۔ وَ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَ مَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا۝۱۰۶

قرآن کو ہم نے ضرورتِ حقہ کے ساتھ اتارا ہے اور حقانیت کے ساتھ اترا ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۲۲ حاشیہ نمبر ۱۱)

اور ہم نے اِس کلام کو ضرورتِ حقہ کے ساتھ اُتارا ہے اور ضرورتِ حقہ کے ساتھ یہ اُترا ہے۔ یعنی یہ کلام فی حدِ ذاتہٖ حق اور راست ہے اور اُس کا آنا بھی حقًّا اور ضرورتًا ہے یہ نہیں کہ فضول اور بے فائدہ اور بے وقت نازل ہُوا ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۴۲)

یہ ضرورتِ حقہ کے وقت نازل کیا گیا ہے اور ضرورتِ حقہ کے ساتھ اُترا ہے۔ (کرامات الصادقین صفحہ ۱۷)

متصوفین کے مذاق کے موافق صعود اور نزول کے ایک خاص معنے ہیں اور وہ یہ ہیں کہ جب اِنسان خلق اللہ سے بکلّی انقطاع کر کے خدائے تعالیٰ کی طرف جاتا ہے تو اُس حالت کا نام متصوفین کے نزدیک صعود ہے اور جب مامور ہو کر نیچے کو اصلاحِ خلق اللہ کے لئے آتا ہے تو اُس حالت کا نام نزول ہے۔ اسی اصطلاحی معنی کے لحاظ سے نزول کا لفظ اختیار کیا گیا ہے۔ اِسی کی طرف اشارہ ہے جو اس آیت میں اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے کہ بِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَ بِالْحَقِّ نَزَلَ۔

(ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۵۹۳)

ہم نے اس کو... سچائی کے ساتھ اتارا اور سچائی کے ساتھ اترا اور ایک دن وعدہ اللہ کا پورا ہونا تھا۔

(ازالہ اوہام حصہ اوّل صفحہ ۴۳ حاشیہ)

ضرورتِ حقہ کے ساتھ ہم نے اس کلام کو اتارا ہے اور ضرورتِ حقہ کے ساتھ اترا ہے۔ (نور القرآن نمبر ۱ صفحہ ۲)

وہ ضرورتِ حقہ کے ساتھ اتارا گیا اور ضرورتِ حقہ کے ساتھ اُترا۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد نہم صفحہ ۳۹ حاشیہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت کے لئے پہلی دلیل یہی ہے کہ آپ جس وقت تشریف لائے وہ وقت چاہتا تھا کہ مردے از غیب بروں آید و کارے بکند۔ اسی کی طرف قرآن کریم نے اس آیت میں اشارہ کیا ہے بِالْحَقِّ

اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ۙ

جو لوگ عیسائیوں اور یہودیوں میں سے صاحبِ علم ہیں جب ان پر قرآن پڑھا جاتا ہے تو سجدہ کرتے ہوئے ٹھوڑیوں پر گر پڑتے ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۸۶)

مجھے خدا نے اطلاع دی ہے کہ آخر بڑے بڑے مفسد اور سرکش مجھے شناخت کر لیں گے جیسا کہ فرماتا ہے یَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا۔*

(* ترجمہ:۔ ٹھوڑیوں پر سجدہ کرتے ہوئے گریں گے۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۷۹ حاشیہ)

وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۝

اور کہتے ہیں کہ ہمارا خدا تخلّف وعدہ سے پاک ہے۔ ایک دن ہمارے خداوند کا وعدہ پورا ہونا ہی تھا۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۸۶)

وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۝

اور روتے ہوئے مونہہ پر گر پڑتے ہیں اور خدا کا کلام اُن میں فروتنی اور عاجزی کو بڑھاتا ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۸۶)

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ۝

اُس کا کوئی بیٹا نہیں اور اس کے ملک میں اُس کا کوئی شریک نہیں اور ایسا کوئی اس کا دوست نہیں جو درماندہ ہو کر اُس نے اس کی طرف التجا کی۔ اس کو نہایت بلند سمجھ اور اس کی نہایت بڑائی کر۔

(ست بچن صفحہ ۸۹)

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ یہ بالکل سچی بات ہے کہ خدا تعالیٰ تھرک کر کسی کو ولی نہیں بناتا۔

(الحکم جلد ۸ ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء ص۴)

خدا کی ولایت کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اس کو کوئی ایسی احتیاج ہے جیسے ایک انسان کو دوست کی ہوتی ہے یا تھرڈ کر خدا کسی کو اپنا دوست بنا لیتا ہے بلکہ اس کے معنے (ہیں) فضل اور عنایت سے خدا تعالیٰ کسی کو اپنا بنا لیتا ہے اور اس سے اس شخص کو فائدہ پہنچتا ہے نہ کہ خدا کو۔ (البدر جلد ۳ ۱۱ مورخہ ۱۶ مارچ ۱۹۰۴ء ص۳)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ــــ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

تفسیر سُورۃ الکہف

بیان فرمودہ

سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَلَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا۝ؕ قَیِّمًا لِّیُنۡذِرَ بَاۡسًا شَدِیۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡہُ وَ یُبَشِّرَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ الَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَہُمۡ اَجۡرًا حَسَنًا۝ۙ مَّاکِثِیۡنَ فِیۡہِ اَبَدًا۝ۙ وَّ یُنۡذِرَ الَّذِیۡنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰہُ وَلَدًا۝ٝ مَا لَہُمۡ بِہٖ مِنۡ عِلۡمٍ وَّ لَا لِاٰبَآئِہِمۡ ؕ کَبُرَتۡ کَلِمَۃً تَخۡرُجُ مِنۡ اَفۡوَاہِہِمۡ ؕ اِنۡ یَّقُوۡلُوۡنَ اِلَّا کَذِبًا۝

حدیث میں آیا ہے کہ جب تم دجّال کو دیکھو تو سورۃ کہف کی پہلی آیتیں پڑھو اور وہ یہ ہیں اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ وَلَمۡ یَجۡعَلۡ لَّہٗ عِوَجًا ؕ قَیِّمًا لِّیُنۡذِرَ بَاۡسًا شَدِیۡدًا مِّنۡ لَّدُنۡہُ .....

وَيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝ ان آیتوں سے ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دجّال سے کس گروہ کو مراد رکھا ہے* اور عِوَج کے لفظ سے اس جگہ مخلوق کو شریک الباری ٹھہرانے سے مراد ہے جس طرح عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ٹھہرایا ہے اور اسی لفظ سے فیج اعوج مشتق ہے اور فیج اعوج سے وہ درمیانی زمانہ مراد ہے جس میں مسلمانوں نے عیسائیوں کی طرح حضرت مسیح کو بعض صفات میں شریک الباری ٹھہرا دیا۔ اس جگہ ہر ایک انسان سمجھ سکتا ہے کہ اگر دجّال کا بھی کوئی علیحدہ وجود ہوتا تو سورۃ فاتحہ میں اُس کے فتنہ کا بھی ذکر ضرور ہوتا اور اُس کے فتنہ سے بچنے کے لئے بھی کوئی علیحدہ دعا ہوتی مگر ظاہر ہے کہ اس جگہ یعنی سورۃ فاتحہ میں صرف مسیح موعود کو ایذا دینے سے بچنے کے لئے اور نصاریٰ کے فتنے سے محفوظ رہنے کے لئے دعا کی گئی ہے حالانکہ بموجب خیالات حال کے مسلمانوں کا دجّال ایک اَور شخص ہے اور اس کا فتنہ تمام فتنوں سے بڑھ کر ہے تو گویا نعوذ باللہ خدا بھول گیا کہ ایک بڑے فتنہ کا ذکر بھی نہ کیا اور صرف دو فتنوں کا ذکر کیا ایک اندرونی یعنی مسیح موعود کو یہودیوں کی طرح ایذا دینا دوسرے عیسائی مذہب اختیار کرنا۔ یاد رکھو اور خوب یاد رکھو کہ سورۃ فاتحہ میں صرف دو فتنوں سے بچنے کے لئے دعا سکھلائی گئی ہے (۱) اول یہ فتنہ کہ اسلام کے مسیح موعود کو کافر قرار دینا۔ اُس کی توہین کرنا۔ اس کی ذاتیات میں نقص نکالنے کی کوشش کرنا۔ اُس کے قتل کا فتویٰ دینا جیسا کہ آیت غیر المغضوب علیھم میں انہی باتوں کی طرف اشارہ ہے (۲) دوسرے نصاریٰ کے فتنے سے بچنے کے لئے دعا سکھلائی گئی اور سورۃ کو اسی کے ذکر پر ختم کرکے اشارہ کیا گیا ہے کہ فتنہ نصاریٰ ایک سیلِ عظیم کی طرح ہوگا۔ اس سے بڑھ کر کوئی فتنہ نہیں۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۷۲-۷۳)

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ

---

* نسائی نے ابوہریرہ سے دجّال کی صفت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث لکھی ہے یَخْرُجُ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ دَجَّالٌ یَّخْتِلُوْنَ الدُّنْیَا بِالدِّیْنِ۔ یَلْبَسُوْنَ لِلنَّاسِ جُلُوْدَ الضَّاْنِ۔ اَلْسِنَتُھُمْ اَحْلٰی مِنَ الْعَسَلِ وَقُلُوْبُھُمْ قُلُوْبُ الذِّیَابِ یَقُوْلُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ اَبِیْ یَغْتَرُّوْنَ اَمْ عَلَیَّ یَجْتَرِءُوْنَ الخ یعنی آخری زمانہ میں ایک گروہ دجّال نکلے گا۔ وہ دنیا کے طالبوں کو دین کے ساتھ فریب دیں گے یعنی اپنے مذہب کی اشاعت میں بہت سامال خرچ کریں گے۔ بھیڑوں کا لباس پہن کر آئیں گے۔ ان کی زبانیں شہد سے زیادہ میٹھی ہوں گی اور دل بھیڑیوں کے ہوں گے۔ خدا کہے گا کہ کیا تم میرے حلم کے ساتھ مغرور ہو گئے اور کیا تم میرے کلمات میں تحریف کرنے لگے۔

(کنز العمال جلد ۷ صفحہ ۱۷۴۔ منہ)

عَمَلًا۝

ہم نے ہر یک چیز کو جو زمین پر ہے زمین کی زینت بنا دیا ہے تا جو لوگ صالح آدمی ہیں بمقابلہ بُرے آدمیوں کے اُن کی صلاحیت آشکارا ہو جائے اور کثیف کے دیکھنے سے لطیف کی لطافت کھل جائے کیونکہ ضد کی حقیقت ضد ہی سے شناخت کی جاتی ہے اور نیکوں کا قدر و منزلت بدوں ہی سے معلوم ہوتا ہے۔

(براہین احمدیہ حصّہ سوم صفحہ ۱۹۰ حاشیہ نمبر ۱۱)

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا۝

کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہمارے عجیب کام فقط اصحابِ کہف تک ہی ختم ہیں۔ نہیں بلکہ خدا تو ہمیشہ صاحبِ عجائب ہے اور اس کے عجائبات کبھی منقطع نہیں ہوتے (براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۵۶۲ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۴)

مَیں دیکھتا ہوں براہین میں میرا نام اصحاب الکہف بھی رکھا ہے۔ اس میں یہ سِرّ ہے کہ جیسے وہ مخفی تھے اسی طرح پر تیرہ سو برس سے یہ راز مخفی رہا اور کسی پر نہ کھلا اور ساتھ اس کے جو رقیم کا لفظ ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ باوجود مخفی ہونے کے اس کے ساتھ ایک کتبہ بھی ہے اور وہ کتبہ یہی ہے کہ تمام نبی اس کے متعلق پیشگوئی کرتے چلے آئے ہیں۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۲۸ مورخہ ۱۰ راگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

مَیں یہ نہیں کہتا کہ حیاتِ مسیح کے متعلق اسی زمانہ کے لوگوں پر الزام ہے۔ نہیں بعض پہلوں نے غلطی کھائی ہے مگر وہ تو اس غلطی میں بھی ثواب ہی پر رہے کیونکہ مجتہد کے متعلق لکھا ہے قَدْ يُخْطِئُ وَ يُصِيْبُ کبھی مجتہد غلطی بھی کرتا ہے اور کبھی صواب مگر دونوں طرح پر اُسے ثواب ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مشیت ایزدی نے یہی چاہا تھا کہ ان سے یہ معاملہ مخفی رہے پس وہ غفلت میں رہے اور اصحابِ کہف کی طرح یہ حقیقت ان پر مخفی رہی جیسا کہ مجھے بھی الہام ہوا تھا اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا۔ اسی طرح مسیح کی حیات کا مسئلہ بھی ایک عجیب سِرّ ہے۔ باوجودیکہ قرآن شریف کھول کھول کر مسیح کی وفات ثابت کرتا ہے اور احادیث سے بھی یہی ثابت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر جو آیت استدلال کے طور پر پڑھی گئی وہ بھی اسی کو ثابت کرتی ہے مگر باوجود اس قدر آشکارا ہونے کے خدا تعالیٰ نے اس کو مخفی کر لیا اور آنے والے موعود کے لئے اس کو مخفی رکھا چنانچہ جب وہ آیا تو اس نے اس راز کو ظاہر کیا۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۶ مورخہ ۷ رفروری ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

۱۷ وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا۝

قرآنی آیات سے پتہ چلتا ہے کہ اٰوٰی کا لفظ یہ چاہتا ہے کہ اوّل کوئی مصیبت واقع ہو۔ اسی طرح الہام اِنَّہٗ اٰوَی الْقَرْیَۃَ چاہتا ہے کہ ابتداء میں خوفناک صورتیں ہوں۔ اصحابِ کہف کی نسبت بھی یہی ہے فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ اور ایک اور جگہ اٰوَیْنٰھُمَآ اِلٰی رَبْوَۃٍ[1] ہے۔ ان تمام مقامات سے یہی مطلب ہے کہ قبل اس کے کہ خدا تعالیٰ آرام دیوے مصیبت اور خوف کا نظارہ پیدا ہو جاوے۔ (البدر جلد ۱ ع۵،۶ مورخہ ۲۸ نومبر و ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۶)

اٰوٰی کا لفظ عربی زبان میں اُس پناہ دینے کو کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص کسی حد تک مصیبت رسیدہ ہو کر پھر امن میں آجاتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی[2] یعنی خدا نے تجھے یتیم پایا اور یتیمی کے مصائب میں تجھے مبتلا دیکھا پھر پناہ دی اور جیسا کہ فرماتا ہے وَاٰوَیْنٰھُمَآ اِلٰی رَبْوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِیْنٍ یعنی ہم نے عیسٰی اور اس کی ماں کو بعد اس کے جو یہودیوں نے ان پر ظلم کیا اور حضرت عیسٰی کو سُولی دینا چاہا ہم نے عیسٰی اور اس کی ماں کو پناہ دی اور دونوں کو ایک ایسے پہاڑ پر پہنچا دیا جو سب پہاڑوں سے اُونچا تھا یعنی کشمیر کا پہاڑ جس میں خوشگوار پانی تھا اور بڑی آسائش اور آرام کی جگہ تھی۔ اور جیسا کہ سورۃ الکہف میں یہ آیت ہے فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ (الجزو نمبر ۱۵) یعنی غار کی پناہ میں آجاؤ۔ اس طرح پر خدا اپنی رحمت تم پر پھیلائے گا یعنی تم ظالم بادشاہ کی ایذا سے نجات پاؤ گے۔ غرض اٰوٰی کا لفظ ہمیشہ اُس موقعہ پر آتا ہے کہ جب ایک شخص کسی حد تک کوئی مصیبت اُٹھا کر پھر امن میں داخل کیا جاتا ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۳۲)

۱۸ وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ

[1] المؤمنون آیت ۵۱ ؎ [2] الضحٰی آیت ۷ ؎

وَلِيًّا مُّرْشِدًا ○

جیسے جسمانی پیدائش کی ابتدا خدا ہی کی طرف سے ہے روحانی پیدائش کی ابتدا بھی خدا کی ہی طرف سے ہے يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ[1] جس کو وہ بلاتا ہے وہ دوسرے کی بھی سُن لیتا ہے مگر جس کو وہ نہیں بلاتا وہ کسی کی نہیں سُنتا جیسا کہ خود اُس نے فرمایا ہے مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا یعنی ہدایت وہ ہی پاتا ہے جس کو خدا ہدایت دے اور جس کو خدا گمراہ رکھنا چاہتا ہے اُس کو مُرشد ہدایت نہیں دے سکتا۔ (مکتوباتِ احمد حصّہ اوّل ص۳۵ مکتوب نمبر ۲۸ بنام میر عباس علی صاحب)

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ○

مجھے ان لوگوں کی حالتوں پر رحم آتا ہے کہ بخل کی وجہ سے کہاں تک ان لوگوں کی نوبت پہنچ گئی ہے۔ اگر کوئی نشان بھی طلب کریں تو کہتے ہیں کہ یہ دعا کرو کہ ہم سات دن میں مرجائیں۔ نہیں جانتے کہ خود تراشیدہ میعادوں کی خدا پیروی نہیں کرتا اُس نے فرمادیا ہے کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ[2] اور اس نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا سو جبکہ سیّدنا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن کی میعاد اپنی طرف سے پیش نہیں کرسکتے تو مَیں سات دن کا کیونکر دعویٰ کروں .... اگر کسی کو اس فیصلہ کے ماننے میں تردد ہو تو اس کو اختیار ہے کہ آپ خدا کے فیصلہ کو آزمائے لیکن ایسی شرارتیں چھوڑ دے جو آیت وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا سے مخالف پڑتی ہیں۔ شرارت کی حجت بازی سے صریح بے ایمانی کی بُو آتی ہے۔

(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ ص۶ نیز اربعین نمبر ۳ ص۱۱-۱۲)

وَاتْلُ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ○

لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ .... کوئی نہیں کہ جو خدا کی باتوں کو ٹال دے۔

(براہین احمدیہ حصّہ چہارم ص۵۶۰-۵۶۱ حاشیہ در حاشیہ نمبر۴)

---

[1] النحل آیت ۹۴ ۔ [2] بنی اسرائیل آیت ۳۷ ۔

کِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۞

لُغت کی رُو سے بھی ثابت ہے کہ ظالم کا لفظ بغیر کسی اور لحاظ کے فقط کم کرنے کے لئے بھی آیا ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ قرآن کریم میں ..... فرماتا ہے وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا اَیْ وَلَمْ تَنْقُصْ اور خدا تعالیٰ کی راہ میں نفس کے جذبات کو کم کرنا بلاشبہ اُن معنوں کی رُو سے ایک ظلم ہے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۴۰-۱۳۶)

جس حالت میں خدا تعالیٰ نے بعض متقیوں کا نام بھی ظالم رکھا ہے اور مراتبِ ثلاثہ تقویٰ سے پہلا مرتبہ تقویٰ کا ظلم کو ہی ٹھہرایا ہے تو اس سے ہم نے قطعی اور یقینی طور پر سمجھ لیا کہ اس ظلم کے لفظ سے وہ ظلم مراد نہیں ہے جو تقویٰ سے دُور اور کفار اور مشرکین اور نافرمانوں کا شعار ہے بلکہ وہ ظلم مراد ہے جو سلوک کے ابتدائی حالات میں متقیوں کے لئے شرط متحتم ہے یعنی جذبات نفسانی پر حملہ کرنا اور بشریّت کی ظلمت کو اپنے نفس سے کم کرنے کے لئے کوشش کرنا جیسا کہ اِس دوسری آیت میں بھی کم کرنے کے ہی معنی ہیں اور وہ یہ ہے وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا اَیْ وَلَمْ تَنْقُصْ دیکھو قاموس اور صحاح اور صراح جو ظلم کے معنے کم کرنے کے بھی لکھے ہیں اور اس آیت کے یہی معنے کئے ہیں یعنی وَلَمْ تَنْقُصْ۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۶۶)

وَاُلْقِیَ فِیْ رُوْعِیْ اَنَّ الْمَسِیْحَ سَمَّی الْاٰخِرِیْنَ مِنَ النَّصَارٰی الدَّجَّالِیْنَ لَا الْاَوَّلِیْنَ وَاِنْ کَانَ الْاَوَّلُوْنَ اَیْضًا دَاخِلِیْنَ فِی الضَّآلِّیْنَ الْمُحَرِّفِیْنَ وَالسِّرُّ فِیْ ذٰلِکَ اَنَّ الْاَوَّلِیْنَ مَا کَانُوْا مُجْتَھِدِیْنَ سَاعِیْنَ لِاِضْلَالِ الْخَلْقِ کَمِثْلِ الْاٰخِرِیْنَ بَلْ مَا کَانُوْا عَلَیْھَا قَادِرِیْنَ وَکَانُوْا کَرَجُلٍ مُّصْفَدٍ فِی السَّلَاسِلِ وَمُقَرَّنٍ فِی الْحِبَالِ وَکَالْمَسْجُوْنِیْنَ وَاَمَّا الَّذِیْنَ جَاءُوْا بَعْدَھُمْ فِیْ زَمَانِنَا ھٰذَا

ترجمہ:۔ اور میرے دل میں ڈالا گیا ہے کہ حضرت مسیح نے آخری زمانہ کے نصاریٰ کا نام دجّال رکھا اور ایسا نام پہلوں کا نہیں رکھا اگرچہ پہلے بھی گمراہوں میں داخل تھے اور کتابوں کی تحریف کرنے والے تھے۔ سو اِس میں بھید یہ ہے کہ پہلے نصاریٰ خلق اللہ کے گمراہ کرنے کی ایسی سخت کوشش نہیں کرتے تھے جیسے پچھلوں نے کیں بلکہ وہ ان کوششوں پر قادر نہیں تھے اور ایسے تھے جیسے کوئی زنجیروں میں جکڑا ہوا اور قیدی ہو مگر وہ لوگ جو ان کے بعد ہمارے اِس زمانہ میں آئے وہ دجّالیت میں اپنے پہلے بزرگوں سے بڑھ گئے اور خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کا امتحان کرنے کے لئے اُن کی ہتھکڑیوں اور

فَفَاقُوْا اَسْلَافَهُمْ فِي الدَّجْلِ وَالْكِذْبِ وَوَضَعَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَيَاصِرَهُمْ وَاَغْلَالَهُمْ وَنَجَّاهُمْ عَنِ السَّلَاسِلِ الَّتِيْ كَانَتْ فِيْ اَرْجُلِهِمْ ابْتِلَاءً مِّنْ عِنْدِهٖ وَكَانَ قَدْرًا مَّقْضِيًّا مِّنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ وَكَانَ قَدَّرَ اللّٰهُ اَنْ يَّبْرُزُوْا بَعْدَ اَلْفِ سَنَةٍ مِّنَ الْهِجْرَةِ حَتّٰى ظَهَرُوْا فِيْ هٰذِهِ الْاَيَّامِ كَغُوْلٍ خُلِّصَ وَاُخْرِجَ مِنَ السِّجْنِ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلٰى رَاحِلَتِهٖ لَاوِيًا اِلٰى زَافِرَتِهٖ وَحِزْبٍ خُلِقُوْا عَلٰى شَاكِلَتِهٖ وَكَانُوْا لِقَبُوْلِهٖ مُسْتَعِدِّيْنَ ثُمَّ اَشَاعُوْا كَيْفَ شَاءُوْا مِنْ اَنْوَاعِ الْكُفْرِ وَاَصْنَافِ الْوَسْوَاسِ وَكَانُوْا قَوْمًا مُّتَمَوِّلِيْنَ وَهٰذَا هُوَ الَّذِيْ كُتِبَ فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى اَنَّ الثُّعْبَانَ الَّذِيْ هُوَ الدَّجَّالُ يَلْبَثُ فِي السِّجْنِ اِلٰى اَلْفِ سَنَةٍ ثُمَّ يَخْرُجُ بِفَوْجٍ مِّنَ الشَّيَاطِيْنِ فَلْيَتَذَكَّرْ مَنْ كَانَ مِنَ الْمُتَذَكِّرِيْنَ كَذٰلِكَ خَلَصُوْا بَعْدَ الْاَلْفِ وَتَنَاسَوْا ذِمَامَ اللّٰهِ وَنَكَثُوْا عُهُوْدَهٗ وَاَحْفَظُوْا رَبَّهُمْ مُجْتَرِئِيْنَ وَجَمَعُوْا كُلَّ جُهْدِهِمْ لِاِضْلَالِ النَّاسِ وَاسْتَجَدُّوا الْمَكَائِدَ كَالْخَنَّاسِ وَجَاءُوْا بِسِحْرٍ مُّبِيْنٍ۔ وَاَضَاعُوا التَّقْوٰى وَالْعَمَلَ الصَّالِحَ وَاتَّكَأُوْا عَلٰى كَفَّارَةٍ لَا اَصْلَ لَهَا وَاتَّبَعُوْا كُلَّ اِثْمٍ وَّ اسْتَعْذَبُوْا كُلَّ عَذَابٍ وَّ كَذَّبُوا الْمُقَدَّسِيْنَ وَتَجَنَّوْا وَقَالُوْا نَحْنُ عِبَادُ الْمَسِيْحِ وَاَحِبَّاءُهٗ

اُن کے طوق گردنوں کو اُن سے الگ کر دیا اور اُن زنجیروں سے اُن کو نجات دے دی جو اُن کے پیروں میں تھے اور یہی ابتدا سے مقدّر تھا اور ایک ہزار ہجری گذرنے کے بعد اُن کا خروج شروع ہوا یہاں تک کہ ان دنوں میں وہ ایک ایسے دیو کی طرح ظاہر ہوئے جو زندان سے نکلا اور اپنی سواری پر سوار ہوا اور اپنے ان عزیزوں اور اُس گروہ کی طرف رُخ کر لیا جو اُس کے مادہ کے موافق اور اُس کے قبول کرنے کے لئے مستعد تھے۔ پھر اُنہوں نے جس طرح چاہا کفروں کو شائع کیا اور طرح طرح کے وساوس پھیلائے کیونکہ وہ ایک مالدار قوم ہے اور یہ وہی پیشگوئی ہے جو پہلی کتابوں میں لکھی گئی ہے کہ وہ اژدہا جو دجّال ہے ہزار برس تک قید رہے گا اور پھر ہزار برس کے بعد شیاطین کی ایک فوج کے ساتھ نکلے گا سو اِس طرح وہ ہزار برس کے بعد نکلے اور خدا کی حرمت اور اُس کے عہد کو بھلا دیا اور کُل عہدوں کو توڑ دیا اور شوخیاں کر کے اپنے رب کو غصّہ دلایا اور اپنی تمام کوششوں کو لوگوں کے گمراہ کرنے میں اکٹھا کر دیا اور تمام تدابیر کو کام میں لائے اور تقویٰ اور نیک عمل کو ضائع کیا اور ایسے کفارہ پر تکیہ کر بیٹھے جس کی کچھ بھی اصل نہیں اور ہر ایک گناہ کی اُنہوں نے پیروی کی اور ہر یک عذاب کو شیریں سمجھ لیا اور پاک لوگوں کی تکذیب کی اور کوشش کی جو ان کے عیب ڈھونڈیں اور کہا کہ ہم مسیح کے بندے اور اُس کے پیارے ہیں مگر یہ کہاں ہو سکتا ہے کہ ایسے فاسقوں کے ساتھ نیک بختوں کا میل جول ہو اور تو ابھی سُن چکا ہے کہ مسیح نے اُن کا نام ظلم کے مرتکب اور بدکار

وَهَيْهَاتَ اَنْ تُرَاجِعَ الْفَاسِقِيْنَ مِقَتُ الصَّالِحِيْنَ وَقَدْ سَمِعْتَ اٰنِفًا اَنَّ الْمَسِيْحَ سَمَّاهُمْ فَاعِلِي الظُّلْمِ وَسَمِعْتَ اَنَّ الظُّلْمَ وَ الدَّجْلَ شَيْئٌ وَّاحِدٌ وَقَدْ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئًا اَیْ لَمْ تَنْقُصْ وَ اِطْلَاقُ الظُّلْمِ عَلَى النَّقْصِ الَّذِیْ كَانَ فِیْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ اَوِ الزِّيَادَةِ الَّتِیْ لَيْسَتْ فِیْ مَوْضِعِهَا اَمْرٌ شَائِعٌ مُّتَعَارِفٌ فِی الْقَوْمِ وَ هٰذَا هُوَ الدَّجْلُ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلَى الْمُتَبَصِّرِيْنَ۔

(نور الحق حصہ اول صفحہ ۵۷ تا ۵۹)

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝

اہلِ عرب اس قسم کے استثنا کرتے ہیں۔ صرف ونحو میں بھی اگر دیکھا جاوے تو ایسے استثناء بکثرت ہوا کرتے ہیں اور ایسی نظیریں موجود ہیں جیسے کہا جاوے کہ میرے پاس ساری قوم آئی مگر گدھا۔ اس سے یہ سمجھنا کہ ساری کی ساری قوم جنس حمار میں سے تھی غلط ہے۔ کَانَ مِنَ الْجِنِّ کے بھی یہ معنے ہوئے کہ وہ فقط ابلیس ہی قوم جنّ میں سے تھا ملائکہ میں سے نہیں تھا ملائک ایک الگ پاک جنس ہے اور شیطان الگ۔ ملائکہ اور ابلیس کا راز ایسا مخفی در مخفی ہے کہ بجز اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا کے انسان کو چارہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو اقتدار و توفیق نہیں دی مگر وسوسہ اندازی میں وہ محرّک ہے جیسے ملائکہ پاک تحریکات کے محرّک ہیں ویسے ہی شیطان ناپاک جذبات کا محرّک ہے۔ ملائکہ کی منشاء ہے کہ انسان پاکیزہ ہو مطہّر ہو اور اس کے اخلاق عمدہ ہوں اور اس کے بالمقابل شیطان چاہتا ہے کہ انسان گندہ اور ناپاک ہو۔

اصل بات یہ ہے کہ قانونِ الٰہی ملائکہ و ابلیس کی تحریکات کا دوش بدوش چلتا ہے لیکن آخر کار ارادۂ الٰہی

رکھا ہے اور تُو نے یہ بھی سُن لیا ہے کہ ظلم اور دجّالیت ایک ہی چیز ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے کہ اس باغ نے اپنا پورا پھل دیا اور اس میں سے کچھ کم نہ کیا اور لفظ ظلم کا ایسی کمی پر اطلاق کرنا جو غیر محل ہو یا ایسی زیادتی پر جو بے موقع ہے ایک ایسا امر ہے جو قوم میں شائع متعارف ہے اور اِسی کا نام دجّالیت ہے جیسا کہ سمجھدار لوگوں پر پوشیدہ نہیں۔ (نور الحق حصہ اول صفحہ ۵۷-۵۹)۔ منہ۔

غالب آجاتا ہے گویا پسِ پردہ ایک جنگ ہے جو خود بخود جاری رہ کر آخر قادر و مقتدر حق کا غلبہ ہو جاتا ہے اور باطل کی شکست۔ چار چیزیں ہیں جن کی کنہ و راز کو معلوم کرنا انسان کی طاقت سے بالاتر ہے۔ اول۔ اللہ جلّ شانہٗ۔ دوئم۔ روح۔ سوئم۔ ملائکہ۔ چہارم۔ ابلیس۔ ہر شخص ان چہاروں میں سے خدا تعالیٰ کے وجود کا قائل ہے اور اس کے صفات الوہیت پر ایمان رکھتا ہے۔ ضرور ہے کہ وہ ہر سہ اشیاء روح و ملائکہ و ابلیس پر ایمان لائے۔

... انسان کو ہر حال میں رضائے الٰہی پر چلنا چاہیئے اور کارخانۂ الٰہی میں دخل در معقولات نہیں دینا چاہیئے۔ تقویٰ اور طہارت اطاعت و وفا میں ترقی کرنی چاہیئے اور یہ سب باتیں تب ممکن ہیں جب انسان کامل ایمان اور یقین سے ثابت قدم رہے اور صدق و اخلاص اپنے مولیٰ کریم سے دکھلائے اور وہ باتیں جو علمِ الٰہی میں مخفی ہیں اس کے کنہ معلوم کرنے میں بے سُود کوشش نہ کرے ... جو شخص ہر ایک چیز کی خواص و ماہیت دریافت کرنے کے پیچھے لگ جاتا ہے وہ نادانی سے کارخانہ ربی اور اس کی منشاء سے بالکل ناواقف و نابلد ہے اگر کوئی کہے کہ شیطان و ملائکہ دکھلاؤ تو کہنا چاہیئے کہ تمہارے اندر یہ خواص کہ بیٹھے بٹھائے آناً فاناً بدی کی طرف متوجہ ہو جانا یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کی ذات سے بھی منکر ہو جانا اور کبھی نیکی میں ترقی کرنا اور انتہا درجہ کی انکسار و فروتنی و عجز و نیاز میں گر جانا یہ اندرونی کششیں جو تمہارے اندر موجود ہیں ان سب کے محرک جو قوی ہیں وہ ان دو الفاظ مَلک و شیطان کے وجود میں مجسم ہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۳)

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا۝

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت موسیٰ وعظ فرما رہے تھے کسی نے پوچھا کہ آپ سے کوئی اور بھی علم میں زیادہ ہے تو انہوں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ اللہ تعالیٰ کو یہ بات ان کی پسند نہ آئی (یعنی یوں کہتے کہ خدا کے بندے بہت سے ہیں جو ایک سے ایک علم میں زیادہ ہیں) اور حکم ہوا کہ تم فلاں طرف چلے جاؤ جہاں تمہاری مچھلی زندہ ہو جاوے گی وہاں تم کو ایک علم والا شخص ملے گا پس جب وہ ادھر گئے تو ایک جگہ مچھلی بھول گئے جب دوبارہ تلاش کرنے آئے تو معلوم ہوا کہ مچھلی وہاں نہیں ہے وہاں ٹھیر گئے تو ایک ہمارے بندہ سے ملاقات ہوئی اس کو موسیٰ نے کہا کہ کیا مجھے اجازت ہے کہ آپ کے ساتھ رہ کر علم اور معرفت سیکھوں۔ اس بزرگ نے کہا کہ اجازت دیتا ہوں مگر آپ بدگمانی سے بچ نہیں سکیں گے کیونکہ جس بات کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی اور سمجھ نہیں دی جاتی تو اس پر صبر کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ جب دیکھا جاتا ہے کہ ایک شخص ایک موقعہ پر بے محل کام کرتا ہے تو اکثر بدظنی ہو جاتی ہے۔ پس موسیٰ نے کہا کہ

میں کوئی بدظنی نہ کروں گا اور آپ کا ساتھ دوں گا۔ اس نے کہا کہ اگر تو میرے ساتھ چلے گا تو مجھ سے کسی بات کا سوال نہ کرنا۔ پس جب چلے تو ایک کشتی پر جا کر سوار ہوئے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۲۹ مورخہ ۷ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

۶۶ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۝

اس جگہ یہ بھی واضح رہے کہ جو امر بذریعہ الہام الٰہی کسی پر نازل ہو وہ اُس کے لئے اور ہر یک کے لئے کہ کوئی وجہ یقین کرنے کی رکھتا ہے یا خدا نے کوئی نشان یقین کرنے کا اُس پر ظاہر کر دیا ہے واجب التعمیل ہے اور جو شخص جس کو اُس الہام کی نسبت باور دلایا گیا ہے اُس پر عمل کرنے سے عمداً دستکش ہو وہ مورد غضب الٰہی ہو گا بلکہ اُسکے خاتمہ بد ہونے کا سخت اندیشہ ہے۔ بلعم بن باعور کو خدا نے الہام میں لَا تدع علیھم کہا یعنی یہ کہ موسٰی اور اُس کے لشکر پر بددعا مت کر اُس نے برخلاف امر الٰہی کے حضرت موسٰی کے لشکر پر بددعا کرنے کا ارادہ کیا آخر اُس کا یہ نتیجہ ہوا کہ خدا نے اُس کو اپنی جناب سے ردّ کر دیا اور اُس کو کتّے سے تشبیہ دی۔ وہ الہام ہی تھا جس کی تعمیل سے حضرت موسٰی کی ماں نے حضرت موسٰی کو شیر خوارگی کی حالت میں ایک صندوق میں ڈال کر دریا میں پھینک دیا۔ الہام ہی تھا جس کے دیکھنے کے لئے موسٰی جیسے اولوالعزم پیغمبر کو خدا نے اپنے ایک بندہ خضر کے پاس جس کا نام بلیا بن ملکان تھا بھیجا تھا جس کے علم قطعی اور یقینی کی نسبت اللہ تعالیٰ نے آپ فرمایا فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا سو اسی علم قطعی اور یقینی کا یہ نتیجہ تھا کہ خضر نے حضرت موسٰی کے روبرو ایسے کام کئے کہ جو ظاہرا خلاف شرع معلوم ہوتے تھے کشتی کو توڑا۔ ایک معصوم بچّہ کو قتل کیا۔ ایک غیر ضروری کام کو کسی اُجرت کے بغیر اپنے گلے ڈال لیا اور ظاہر ہے کہ خضر رسول نہیں تھا اور نہ وہ اپنی امت میں ہوتا نہ جنگلوں اور دریاؤں کے کنارہ پر۔ اور خدا نے بھی اُس کو رسول یا نبی کر کے نہیں پکارا مگر جو اس کو اطلاع دی جاتی تھی اس کا نام یقینی اور قطعی رکھا ہے کیونکہ قرآن کے عرف میں علم اسی چیز کا نام ہے کہ جو قطعی اور یقینی ہو اور خود ظاہر ہے کہ اگر خضر کے پاس صرف ظنّیات کا ذخیرہ ہوتا تو اُس کے لئے کب جائز تھا کہ امر مظنون پر بھروسہ کر کے ان امور کو کرتا کہ جو صریح خلاف شرع اور منکر بلکہ باتفاق تمام پیغمبروں کے کبائر میں داخل تھے اور پھر اس صورت میں حضرت موسٰی کا اس کے پاس آنا بھی محض بے فائدہ تھا۔ پس جبکہ بہر صورت ثابت ہے کہ خضر کو خدائے تعالیٰ کی طرف سے علم یقینی اور قطعی دیا گیا تھا تو پھر کیوں کوئی شخص مسلمان کہلا کر اور قرآن شریف پر ایمان لا کر اس بات سے منکر رہے کہ کوئی فرد بشر امّت محمدیہ میں سے باطنی کمالات میں خضر کی مانند نہیں ہو سکتا۔ بلاشبہ ہو سکتا ہے بلکہ خدائے حیّ قیوم

اس بات پر قادر ہے کہ امتِ مرحومہ محمدیہ کے افرادِ خاصہ کو اُس سے بھی بہتر وزیادہ تر باطنی نعمتیں عطا فرما دے۔ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ[1] (براہین احمدیہ حصّہ سوم ص۲۶۴-۲۶۶ حاشیہ درحاشیہ نمبر۱)

مولوی غلام علی صاحب اور مولوی احمد اللہ صاحب امرتسری اور مولوی عبدالعزیز صاحب اور بعض دوسرے مولوی صاحبان اس قسم کے الہام سے کہ جو رسولوں کے وحی سے مشابہ ہے باصرار تمام انکار کر رہے ہیں بلکہ اِن میں سے بعض مولوی صاحبان مجانین کے خیالات سے اُس کو منسوب کرتے ہیں اور اُن کے اس بارہ میں حجت یہ ہے کہ اگر یہ الہام حق اور صحیح ہے تو صحابہ جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اسکے پانے کے لئے احق اور اولیٰ تھے حالانکہ اُن کا پانا متحقق نہیں ..... بجواب اس کے ہر یک طالبِ صادق کو اور نیز حضراتِ ممدوحہ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ عدم علم سے عدم شی لازم نہیں آتا۔ کیا ممکن نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اِس قسم کے الہامات پائے ہوں مگر مصلحتِ وقت سے عام طور پر اُن کو شائع نہیں کیا۔ اور خدائے تعالیٰ کو ہر یک نئے زمانہ میں نئے نئے مصالحہ ہیں پس نبوت کے عہد میں مصلحتِ ربانی کا یہی تقاضا تھا کہ جو غیر نبی ہے اُس کے الہامات نبی کے وحی کی طرح قلمبند نہ ہوں تا غیر نبی کا نبی کے کلام سے تداخل واقعہ نہ ہو جائے لیکن اُس زمانہ کے بعد جس قدر اولیاء اور صاحبِ کمالات باطنیہ گذرے ہیں اُن سب کے الہامات مشہور و متعارف ہیں کہ جو ہر یک عصر میں قلمبند ہوتے چلے آئے ہیں اس کی تصدیق کے لئے شیخ عبدالقادر جیلانی اور مجدّد الف ثانی کے مکتوبات اور دوسرے اولیاء اللہ کی کتابیں دیکھنی چاہئیں کہ کس کثرت سے اُن کے الہامات پائے جاتے ہیں بلکہ امام ربانی صاحب اپنے مکتوبات کی جلد ثانی میں جو مکتوب پنجاہ و یکم ہے اُس میں صاف لکھتے ہیں کہ غیر نبی بھی مکالمات و مخاطبات حضرت احدیت سے مشرف ہو جاتا ہے اور ایسا شخص محدّث کے نام سے موسوم ہے اور انبیا کے مرتبہ سے اُس کا مرتبہ قریب واقعہ ہوتا ہے ایسا ہی شیخ عبدالقادر جیلانی صاحب نے فتوح الغیب کے کئی مقامات میں اِس کی تصریح کی ہے۔ اور اگر اولیاء اللہ کے ملفوظات اور مکتوبات کا تجسس کیا جائے تو اس قسم کے بیانات ان کے کلمات میں بہت سے پائے جائیں گے۔ اور امتِ محمدیہ میں محدثیت کا منصب اِس قدر بکثرت ثابت ہوتا ہے جس سے انکار کرنا بڑے غافل اور بے خبر کا کام ہے اس اُمّت میں آج تک ہزارہا اولیاء اللہ صاحبِ کمال گذرے ہیں جن کی خوارق اور کرامات بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ثابت اور متحقق ہو چکی ہیں اور جو شخص تفتیش کرے اس کو معلوم ہوگا کہ حضرتِ احدیت نے جیسا کہ اِس امت کا خیر الامم نام رکھا ہے ایسا ہی اس اُمّت کے اکابر کو سب سے زیادہ کمالات بھی بخشے ہیں جو کسی طرح چھپ نہیں سکتے اور اُن سے انکار کرنا ایک سخت درجہ کی حق پوشی ہے اور نیز ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ الزام کہ صحابۂ کرام سے ایسے الہامات ثابت نہیں ہوئے بالکل بے جا اور غلط ہے کیونکہ

---

[1] البقرہ آیت ۱۰۷

احادیثِ صحیحہ کے رُو سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے الہامات اور خوارق بکثرت ثابت ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ساریہ کے لشکر کی خطرناک حالت سے باعلامِ الٰہی مطلع ہو جانا جس کو بیہقی نے ابنِ عمر سے روایت کیا ہے۔ اگر الہام نہیں تھا تو اَور کیا تھا اور پھر اُن کی یہ آواز کہ یا ساریہ الجبل الجبل مدینہ میں بیٹھے ہوئے مونہہ سے نکلنا اور وہی آواز قدرت غیبی سے ساریہ اور اس کے لشکر کو دور دراز مسافت سے سُنائی دینا اگر خارق عادت نہیں تھی تو اَور کیا چیز تھی۔ اسی طرح جناب علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے بعض الہامات و کشوف مشہور و معروف ہیں ماسوا اس کے میں پوچھتا ہوں کہ کیا خدائے تعالیٰ کا قرآن شریف میں اِس بارہ میں شہادت دینا تسلّی بخش امر نہیں ہے۔ کیا اُس نے صحابہ کرام کے حق میں نہیں فرمایا کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ[1]۔ پھر جس حالت میں خدائے تعالیٰ اپنے نبی کریم کے اصحاب کو امم سابقہ سے جمیع کمالات میں بہتر و بزرگ تر ٹھہراتا ہے اور دوسری طرف بطور مشتے نمونہ از خروارے پہلی امتوں کے کاملین کا حال بیان کر کے کہتا ہے کہ مریم صدیقہ والدہ عیسیٰ اور ایسا ہی والدہ حضرت موسیٰ اور نیز حضرت مسیح کے حواری اور نیز خضر جن میں سے کوئی بھی نبی نہ تھا یہ سب مُلہم من اللہ تھے اور بذریعہ وحی اعلام اسرار غیبیہ سے مطلع کئے جاتے تھے تو اب سوچنا چاہیئے کہ اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ امتِ محمدیہ کے کامل متبعین ان لوگوں کی نسبت بوجہ اولیٰ مُلہم و محدث ہونی چاہیئے کیونکہ وہ حسب تصریح قرآن شریف خیر الامم ہیں۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۴۴-۵۴۸ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۴)

محدث کا الہام یقینی اور قطعی ثابت ہوتا ہے جس میں دخل شیطان کا قائم نہیں رہ سکتا اور خود ظاہر ہے کہ اگر خضر اور موسیٰ کی والدہ کا الہام صرف شکوک اور شبہات کا ذخیرہ تھا اور قطعی اور یقینی نہ تھا تو اُن کو کب جائز تھا کہ وہ کسی بے گناہ کی جان کو خطرہ میں ڈالتے یا ہلاکت تک پہنچاتے یا کوئی دوسرا ایسا کام کرتے جو شرعاً و عقلاً جائز نہیں ہے آخر یقینی علم ہی تھا جس کے باعث سے وہ کام کرنا ان پر فرض ہو گیا تھا اور وہ امور اُن کے لئے روا ہو گئے کہ جو دوسروں کے لئے ہرگز روا نہیں۔ پھر ماسوا اس کے ذرا انصافاً سوچنا چاہیئے کہ کوئی امر مشہود و موجود کہ جو بپایۂ صداقت پہنچ چکا ہو اور تجارب صحیحہ کے رُو سے راست راست ثابت ہوتا ہو صرف ظنّی خیالات سے متزلزل نہیں ہو سکتا۔ وَإِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا[2] سو اس عاجز کے الہامات میں کوئی ایسا امر نہیں ہے جو زیرِ پردہ اور مخفی ہو بلکہ یہ وہ چیز ہے کہ جو صدہا امتحانوں کی بوتہ میں داخل ہو کر سلامت نکلی ہے اور خداوند کریم نے بڑے بڑے تنازعات میں فتح نمایاں بخشی ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۴۸-۵۴۹ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۴)

تم سوچو کہ اگر علم لدنی کا سارا مدار ظنّیات پر ہے تو پھر اس کا نام علم کیوں کر ہو گا۔ کیا ظنّیات بھی کچھ چیز ہیں جن کا

---

[1] آل عمران آیت ۱۱۱ ۔ [2] النجم آیت ۲۹ ۔

نام علم رکھا جائے۔ پس اس صورت میں وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا کے کیا معنے ہوں گے۔ پس جاننا چاہئے کہ خدا کے کلام پر غور صحیح کرنے سے اور صدہا تجارب مشہودہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ افراد خاصۂ امتِ محمدیہ کو جب وہ متابعت اپنے رسول مقبول میں فنا ہو جائیں اور ظاہراً و باطناً اُس کی پیروی اختیار کریں بہ تبعیت اُسی رسول کے اُس کی برکتوں میں سے عنایت کرتا ہے۔ یہ نہیں کہ صرف زہد خشک تک رکھنا چاہتا ہے اور جب کسی دل پر نبوی برکتوں کا پرتوہ پڑے گا تو ضرور ہے کہ اس کو اپنے متبوع کی طرح علم یقینی قطعی حاصل ہو کیونکہ جس چشمہ کا اُس کو وارث بنایا گیا ہے وہ شکوک اور شبہات کی کدورت سے بکلی پاک ہے اور منصب وارث الرسول ہونے کا بھی اسی بات کو چاہتا ہے کہ علمِ باطنی اُس کا یقینی اور قطعی ہو کیونکہ اگر اس کے پاس صرف مجموعہ ظنیات کا ہے تو پھر وہ کیونکر اس ناقص مجموعہ سے کوئی فائدہ خلق اللہ کو پہنچا سکتا ہے تو اس صورت میں وہ آدھا وارث ہوا نہ پورا۔ اور یک چشم ہوا نہ دونوں آنکھوں والا۔ اور جن ضلالتوں کی مدافعت کے لئے خدا نے اس کو قایم کیا ہے اُن ضلالتوں کا نہایت پُر زور ہونا اور زمانہ کا نہایت فاسد ہونا اور منکروں کا نہایت مکّار ہونا اور غافلوں کا نہایت خوابیدہ ہونا اور مخالفوں کا اَشَدُّ فِي الْكُفْرِ ہونا اس بات کے لئے بہت ہی تقاضا کرتا ہے کہ ایسے شخص کا علم لدنّی مشابہ بالرسل ہو اور یہی لوگ ہیں جن کا نام احادیث میں امثل اور قرآن شریف میں صدیق آیا ہے اور ان لوگوں کا زمانۂ ظہور پیغمبروں کے زمانۂ بعث سے بہت ہی مشابہ ہوتا ہے یعنی جیسے پیغمبر اس وقت آتے رہے ہیں کہ جب دُنیا میں سخت درجے پر گمراہی اور غفلت پھیلتی رہی ہے ایسا ہی یہ لوگ بھی اس وقت آتے ہیں کہ جب ہر طرف گمراہی کا سخت غلبہ ہوتا ہے اور حق سے ہنسی کی جاتی ہے اور باطل کی تعریف ہوتی ہے اور کاذبوں کو راستباز قرار دیا جاتا ہے اور دجّالوں کو مہدی سمجھا جاتا ہے اور دُنیا مخلوق اللہ کی نظر میں بہت پیاری معلوم ہوتی ہے جس کی تحصیل کے لئے ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں اور دین اُن کی نظر میں ذلیل اور خوار ہو جاتا ہے۔ ایسے وقتوں میں وہی لوگ حُجتِ اسلام ٹھہرتے ہیں جن کا الہام یقینی اور قطعی ہوتا ہے اور جو اُن کامل افراد کے قایم مقام ہوتے ہیں جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں۔

اب خلاصۂ کلام یہ ہے کہ الہام یقینی اور قطعی ایک واقعی صداقت ہے جس کا وجود افرادِ کاملۂ اُمتِ محمدیہ میں ثابت ہے اور انہیں سے خاص ہے۔ ہاں یہ سچ بات ہے کہ رسولوں کا الہام بہت ہی درخشاں اور روشن اور اجلیٰ اور اقویٰ اور اصفیٰ اور اعلیٰ اور مراتبِ یقین کے انتہائی درجے پر ہوتا ہے اور آفتاب کی طرح چمک کر ہر یک ظلمت کو اٹھا دیتا ہے مگر اولیا کے الہاموں میں سے جب تک معانی کسی الہامی عبارت کے مشتبہ ہوں یا وہ الہام ہی مشتبہ اور مخفی ہو تب تک وہ ایک امر ظنی ہوگا اور ولی کا الہام اُسی وقت حدِ قطع اور یقین تک پہنچے گا کہ جب ضعیف الہاموں کی قسم میں سے نہ ہو بلکہ اپنی کامل روشنی کے ساتھ نازل ہو اور بارش کی طرح متواتر برس کر اور اپنے نوروں کو قوی طور پر دکھلا کر ملہم کے دل کو کامل یقین سے پُر کر دے اور مختلف تقریروں اور مختلف لفظوں میں اُتر کر معنے اور مطلب

کو بکلی کھول دے اور عبارت کو متشابہات میں سے بر کل الوجوہ باہر کر دے اور متواتر دعاؤں اور سوالوں کے وقت خود خداوند تعالیٰ اُن معانی کا قطعی اور یقینی ہونا متواتر اجابتوں اور جوابوں کے ذریعہ سے بوضاحتِ تمام بیان فرما دے۔ جب کوئی الہام اِس حد تک پہنچ جائے تو وہ کالنّور اور قطعی اور یقینی ہے اور جو لوگ کہتے ہیں کہ اصلاً الہام اولیاء کو قطع اور یقین کی طرف راہ نہیں وہ معرفتِ کامل سے سخت بے نصیب ہیں۔ وما قدروا اللہ حق قدرہ۔ اللّٰھمّ اصلح اُمّۃ محمّد۔ (براہین احمدیہ حصّہ سوم ص۲۳۲-۲۳۵ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۱)

خدائے تعالیٰ کے کاموں کا کوئی انتہا نہیں پا سکتا۔ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام عظیم الشان نبی گذرے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے توریت دی اور جن کی عظمت اور وجاہت کی وجہ سے بلعم باعور بھی ان کا مقابلہ کر کے تحت الثریٰ میں ڈالا گیا اور کتّے کے ساتھ خدا نے اس کی مشابہت دی۔ وہی موسیٰ ہے جس کو ایک بادیہ نشین شخص کے علوم روحانیہ کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا اور ان غیبی اسرار کا کچھ پتہ نہ لگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔ (حقیقۃ الوحی ص۱۵۳ حاشیہ)

جو علماء عارف باللہ اور مؤید من اللہ ہوتے ہیں۔ وہ بتائید روح القدس جملہ علوم کا استخراج قرآن مجید سے کر سکتے ہیں۔ قال اللہ تعالیٰ لَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ[1] وایضاً قال اللہ تعالیٰ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا[2] وایضاً قال اللہ تعالیٰ وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا۔ اور علماء ظاہر کو یہ بات نصیب نہیں ہو سکتی ان کو البتہ اشد احتیاج طرف علوم رسمیہ اور فنون درسیہ کی ہوتی ہے۔ (الحق مباحثہ دہلی ص۱۶۴)

۸۳ وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِي الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَآ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝

حضرت ابراہیم کا قصہ ہے کہ جب لوط کی قوم تباہ ہونے لگی تو انہوں نے کہا کہ اگر سَو میں سے ایک ہی نیک

---

[1] الانعام آیت ۶۰ ؛ [2] العنکبوت آیت ۷۰ ؛

ہو تو کیا تباہ کر دے گا۔ کہا نہیں۔ آخر ایک تک بھی نہیں کروں گا۔ فرمایا۔ لیکن جب بالکل حد ہی ہو جاتی ہے تو پھر لَا یَخَافُ عُقْبٰہَا[1] خدا کی شان ہوتی ہے پلیدوں کے عذاب پر وہ پروا نہیں کرتا کہ اُن کی بیوی بچّوں کا کیا حال ہو گا اور صادقوں اور راستبازوں کے لئے کَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا کی رعایت کرتا ہے۔ حضرت موسٰی اور خضر کو حکم ہوا تھا کہ ان بچّوں کی دیوار بنا دو اِس لئے کہ ان کا باپ نیک بخت تھا اور اس کی نیک بختی کی خدا نے ایسی قدر کی کہ پیغمبر راج مزدور ہوئے۔ غرض ایسا تو رحیم کریم ہے لیکن اگر کوئی شرارت کرے اور زیادتی کرے تو پھر بُری طرح پکڑتا ہے۔ وہ ایسا غیور ہے کہ اُس کے غضب کو دیکھ کر کلیجہ پھٹتا ہے۔ دیکھو لوط کی بستی کو کیسے تباہ کر ڈالا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۳ مورخہ ۲۴ ؍ جون ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

جو لوگ لااُبالی زندگی بسر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی طرف سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ دیکھو دُنیا میں جو اپنے آقا کو چند روز سلام نہ کرے تو اس کی نظر بگڑ جاتی ہے تو جو خدا سے قطع کرے پھر خدا اس کی پروا کیوں کرے گا۔ اسی پر وہ فرماتا ہے کہ وہ ان کو ہلاک کر کے اُن کی اولاد کی بھی پروا نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو متقی صالح مرجاوے اس کی اولاد کی پروا کرتا ہے جیسا کہ اس آیت سے بھی پتہ لگتا ہے وَکَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا۔ اس باپ کی نیکی اور صلاحیت کے لئے خضر اور موسٰی جیسے اولوالعزم پیغمبر کو مزدور بنا دیا کہ وہ ان کی دیوار درست کر دیں۔ اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس شخص کا کیا درجہ ہو گا۔ خدا تعالیٰ نے لڑکوں کا ذکر نہیں کیا چونکہ ستّار ہے اسلئے پردہ پوشی کے لحاظ سے اور باپ کے محل مدح میں ذکر ہونے کی وجہ سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ پہلی کتابوں میں بھی اس قسم کا مضمون آیا ہے کہ سات پشت تک رعایت رکھتا ہوں۔ حضرت داؤد علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مَیں نے کبھی متقی کی اولاد کو ٹکڑے مانگتے نہیں دیکھا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۴ ؍ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

کَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا یعنی ان کا باپ صالح تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے ان کا خزانہ محفوظ رکھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لڑکے کچھ ایسے نیک نہ تھے باپ کی نیکی کی وجہ سے بچائے گئے۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۱ مورخہ ۱۸ ؍ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

اس آیت کریمہ کے مفہوم پر نظر غور ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن دو لڑکوں کے لئے حضرت خضر نے تکلیف اٹھائی اصل میں وہ اچھے چال چلن کے ہونے والے نہیں تھے بلکہ غالباً وہ بدچلن اور خراب حالت رکھنے والے علم الٰہی میں تھے۔ لہٰذا خدا تعالیٰ نے بباعث اپنی ستّاری کی صفت کے ان کے چال چلن کو پوشیدہ رکھ کر ان کے باپ کی صلاحیت ظاہر کر دی اور ان کی حالت کو جو اصل میں اچھی نہیں تھی کھول کر نہ سُنایا اور ایک خویش کی وجہ سے دو بیگانوں پر

---

[1] الشمس آیت ۱۶ ۔

رحم کر دیا۔ (مکتوبات جلد ہ ۲ ص ۱۱۵ (مکتوب نمبر ۸۳ بنام حضرت خلیفہ اوّل ؓ)

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ
ذِكْرًا ۭ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝ فَاَتْبَعَ
سَبَبًا ۝ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّ
وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۭ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ
فِيْهِمْ حُسْنًا ۝ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ
فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَاۗءَۨ
الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۭ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰٓى اِذَا
بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰي قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا
سِتْرًا ۝ كَذٰلِكَ ۭ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰٓى
اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ
قَوْلًا ۝ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي
الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓي اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝
قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ

رَدْمًا ۝ اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ قَالَ
انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِیْۤ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا ۝ؕ فَمَا
اسْطَاعُوْۤا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ۝ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ
رَّبِّیْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا ۝ؕ
وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ یَوْمَئِذٍ یَّمُوْجُ فِیْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ
جَمْعًا ۝ۙ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ یَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِیْنَ عَرْضًا ۝ۙ الَّذِیْنَ كَانَتْ
اَعْیُنُهُمْ فِیْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِیْ وَكَانُوْا لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَمْعًا ۝

خدا تعالیٰ نے میرا نام ذوالقرنین بھی رکھا کیونکہ خدا تعالیٰ کی میری نسبت یہ وحی مقدس کہ جَرِیُّ اللّٰہِ فِیْ حُلَلِ الْاَنْبِیَآءِ جس کے یہ معنے ہیں کہ خدا کا رسول تمام نبیوں کے پیرایوں میں یہ چاہتی ہے کہ مجھ میں ذوالقرنین کے بھی صفات ہوں کیونکہ سورۂ کہف سے ثابت ہے کہ ذوالقرنین بھی صاحبِ وحی تھا۔ خدا تعالیٰ نے اُس کی نسبت فرمایا ہے قُلْنَا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ۔ پس اس وحی الٰہی کی رُو سے کہ جَرِیُّ اللّٰہِ فِیْ حُلَلِ الْاَنْبِیَآءِ اس امت کے لئے ذوالقرنین مَیں ہوں اور قرآن شریف میں مثالی طور پر میری نسبت پیشگوئی موجود ہے مگر ان کے لئے جو فراست رکھتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ذوالقرنین وہ ہوتا ہے جو دو صدیوں کو پانے والا ہو اور میری نسبت یہ عجیب بات ہے کہ اس زمانہ کے لوگوں نے جس قدر اپنے اپنے طور پر صدیوں کی تقسیم کر رکھی ہے۔ ان تمام تقسیموں کے لحاظ سے جب دیکھا جائے تو ظاہر ہوگا کہ مَیں نے ہر ایک قوم کی دو صدیوں کو پالیا ہے۔ میری عمر اس وقت تخمیناً ۶۷ سال ہے پس ظاہر ہے کہ اس حساب سے جیسا کہ مَیں نے دو ہجری صدیوں کو پالیا ہے ایسا ہی دو عیسائی صدیوں کو بھی پالیا ہے اور ایسا ہی دو ہندی صدیوں کو بھی جن کا سن بکرماجیت سے شروع ہوتا ہے۔ اور مَیں نے جہاں تک ممکن تھا قدیم زمانہ کے تمام ممالک شرقی اور غربی کی مقرر شدہ صدیوں کا ملاحظہ کیا ہے کوئی قوم ایسی نہیں جس کی مقرر کردہ صدیوں میں سے دو صدیاں مَیں نے نہ پائی ہوں اور بعض احادیث میں بھی آچکا ہے کہ آنے والے مسیح کی ایک یہ بھی علامت ہے کہ وہ ذوالقرنین ہوگا۔

غرض بموجب نص وحی الٰہی کے مَیں ذوالقرنین ہوں اور جو کچھ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف کی ان آیتوں کی نسبت جو سورۂ کہف میں ذوالقرنین کے قصہ کے بارے میں ہیں میرے پر پیشگوئی کے رنگ میں معنے کھولے ہیں مَیں ذیل میں انکو بیان کرتا ہوں مگر یاد رہے کہ پہلے معنوں سے انکار نہیں ہے۔ وہ گذشتہ سے متعلق ہیں اور یہ آئندہ کے متعلق۔ اور قرآن شریف صرف قصہ گو کی طرح نہیں ہے بلکہ اس کے ہر ایک قصہ کے نیچے ایک پیشگوئی ہے اور ذوالقرنین کا قصہ مسیح موعود کے زمانہ کے لئے ایک پیشگوئی اپنے اندر رکھتا ہے جیسا کہ قرآن شریف کی عبارت یہ ہے وَیَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِی الْقَرْنَیْنِ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَیْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا یعنی یہ لوگ تجھ سے ذوالقرنین کا حال دریافت کرتے ہیں ان کو کہو کہ مَیں ابھی تھوڑا سا تذکرہ ذوالقرنین کا تم کو سناؤں گا۔ اور پھر بعد اس کے فرمایا اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِی الْاَرْضِ وَاٰتَیْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا یعنی ہم اس کو یعنی مسیح موعود کو جو ذوالقرنین بھی کہلائے گا روئے زمین پر ایسا مستحکم کریں گے کہ کوئی اسکو نقصان نہ پہنچا سکے گا اور ہم ہر طرح سے ساز و سامان اس کو دے دیں گے اور اس کی کارروائیوں کو سہل اور آسان کر دیں گے۔ یاد رہے کہ یہ وحی براہین احمدیہ حصص سابقہ میں بھی میری نسبت ہوئی ہے جیسا کہ اللہ فرماتا ہے اَلَمْ نَجْعَلْ لَّكَ سُهُوْلَةً فِیْ كُلِّ اَمْرٍ یعنی کیا ہم نے ہر ایک امر میں تیرے لئے آسانی نہیں کر دی یعنی کیا ہم نے تمام وہ سامان تیرے لئے میسر نہیں کر دیئے جو تبلیغ اور اشاعتِ حق کے لئے ضروری تھے جیسا کہ ظاہر ہے کہ اُس نے میرے لئے وہ سامان تبلیغ اور اشاعتِ حق کے میسر کر دئے جو کسی نبی کے وقت میں موجود نہ تھے۔ تمام قوموں کی آمد و رفت کی راہیں کھولی گئیں۔ طے مسافت کے لئے وہ آسانیاں کر دی گئیں کہ برسوں کی راہیں دنوں میں طے ہونے لگیں اور خبر رسانی کے وہ ذریعے پیدا ہوئے کہ ہزاروں کوس کی خبریں چند منٹوں میں آنے لگیں۔ ہر ایک قوم کی وہ کتابیں شائع ہوئیں جو مخفی اور مستور تھیں اور ہر ایک چیز کے بہم پہنچانے کے لئے ایک سبب پیدا کیا گیا۔ کتابوں کے لکھنے میں جو جو دقتیں تھیں وہ چھاپہ خانوں سے دفع اور دُور ہو گئیں یہاں تک کہ ایسی ایسی مشینیں نکلی ہیں کہ ان کے ذریعہ سے دس دن میں کسی مضمون کو اس کثرت سے چھاپ سکتے ہیں کہ پہلے زمانوں میں دس سال میں بھی وہ مضمون قید تحریر میں نہیں آسکتا تھا اور پھر ان کے شائع کرنے کے اس قدر حیرت انگیز سامان نکل آئے ہیں کہ ایک تحریر صرف چالیس دن میں تمام دُنیا کی آبادی میں شائع ہو سکتی ہے اور اس زمانہ سے پہلے ایک شخص بشرطیکہ اس کی عمر بھی لمبی ہو سو برس تک بھی اس وسیع اشاعت پر قادر نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر بعد اس کے اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا قُلْنَا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِیْهِمْ حُسْنًا ۝ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ یُرَدُّ اِلٰی رَبِّهٖ فَیُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَ اَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰی ۚ وَ سَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا یُسْرًا ۝ یعنی جب ذوالقرنین کو جو مسیح موعود ہے ہر ایک طرح کے سامان دئے جائیں گے۔ پس وہ ایک سامان کے پیچھے پڑے گا یعنی وہ مغربی ممالک کی اصلاح کیلئے

کمر باندھے گا اور وہ دیکھے گا کہ آفتاب صداقت اور حقانیت ایک کیچڑ کے چشمہ میں غروب ہو گیا اور اس غلیظ چشمہ اور تاریکی کے پاس ایک قوم کو پائے گا جو مغربی قوم کہلائے گی یعنی مغربی ممالک میں عیسائیت کے مذہب والوں کو نہایت تاریکی میں مشاہدہ کرے گا نہ ان کے مقابل پر آفتاب ہو گا جس سے وہ روشنی پا سکیں اور نہ ان کے پاس پانی صاف ہو گا جس کو وہ پیویں یعنی ان کی علمی اور عملی حالت نہایت خراب ہو گی اور وہ روحانی روشنی اور روحانی پانی سے بے نصیب ہوں گے تب ہم ذوالقرنین یعنی مسیح موعود کو کہیں گے کہ تیرے اختیار میں ہے چاہے تو ان کو عذاب دے یعنی عذاب نازل ہونے کے لئے بد دعا کرے (جیسا کہ احادیث صحیحہ میں مروی ہے) یا ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کا شیوہ اختیار کرے تب ذوالقرنین یعنی مسیح موعود جواب دے گا کہ ہم اُسی کو سزا دلانا چاہتے ہیں جو ظالم ہو۔ وہ دُنیا میں بھی ہماری بد دعا سے سزا یاب ہو گا اور پھر آخرت میں سخت عذاب دیکھے گا۔ لیکن جو شخص سچائی سے مُنہ نہیں پھیرے گا اور نیک عمل کرے گا اُس کو نیک بدلہ دیا جائے گا اور اس کو انہی کاموں کی بجا آوری کا حکم ہو گا جو سہل ہیں اور آسانی سے ہو سکتے ہیں۔ غرض یہ مسیح موعود کے حق میں پیشگوئی ہے کہ وہ ایسے وقت میں آئے گا جبکہ مغربی ممالک کے لوگ نہایت تاریکی میں پڑے ہوں گے اور آفتاب صداقت ان کے سامنے سے بالکل ڈوب جائے گا اور ایک گندے اور بدبودار چشمہ میں ڈوبے گا یعنی بجائے سچائی کے بدبودار عقائد اور اعمال ان میں پھیلے ہوئے ہوں گے اور وہی ان کا پانی ہو گا جس کو وہ پیتے ہوں گے اور روشنی کا نام و نشان نہیں ہو گا تاریکی میں پڑے ہوں گے۔ اور ظاہر ہے کہ یہی حالت عیسائی مذہب کی آجکل ہے جیسا کہ قرآن شریف نے ظاہر فرمایا ہے اور عیسائیت کا بھاری مرکز ممالک مغربیہ ہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰۤی اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ۝ كَذٰلِكَ ؕ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ۝ یعنی پھر ذوالقرنین جو مسیح موعود ہے جس کو ہر ایک سامان عطا کیا جائے گا ایک اور سامان کے پیچھے پڑے گا یعنی ممالک مشرقیہ کے لوگوں کی حالت پر نظر ڈالے گا اور وہ جگہ جس سے سچائی کا آفتاب نکلتا ہے اس کو ایسا پائے گا کہ ایک ایسی نادان قوم پر آفتاب نکلا ہے جن کے پاس دھوپ سے بچنے کے لئے کوئی بھی سامان نہیں یعنی وہ لوگ ظاہر پرستی اور افراط کی دھوپ سے جلتے ہوں گے اور حقیقت سے بے خبر ہوں گے اور ذوالقرنین یعنی مسیح موعود کے پاس حقیقی راحت کا سامان سب کچھ ہو گا جس کو ہم خوب جانتے ہیں مگر وہ لوگ قبول نہیں کریں گے اور وہ لوگ افراط کی دھوپ سے بچنے کے لئے کچھ بھی پناہ نہیں رکھتے ہوں گے نہ گھر نہ سایہ دار درخت نہ کپڑے جو گرمی سے بچا سکیں اس لئے آفتابِ صداقت جو طلوع کرے گا ان کی ہلاکت کا موجب ہو جائے گا۔ یہ ان لوگوں کے لئے ایک مثال ہے جو آفتابِ ہدایت کی روشنی تو ان کے سامنے موجود ہے اور اس گروہ کی طرح نہیں ہیں جن کا آفتاب غروب ہو چکا ہے لیکن ان لوگوں کو اُس آفتابِ ہدایت سے بجز اس کے کوئی

فائدہ نہیں کہ دھوپ سے چمڑا ان کا جل جائے اور رنگ سیاہ ہو جائے اور آنکھوں کی روشنی بھی جاتی رہے۔ اس تقسیم سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ مسیح موعود کا اپنے فرضِ منصبی کے ادا کرنے کے لئے تین قسم کا دورہ ہوگا اول اس قوم پر نظر ڈالے گا جو آفتاب ہدایت کو کھو بیٹھے ہیں اور ایک تاریکی اور کیچڑ کے چشمہ میں بیٹھے ہیں۔ دوسرا دورہ اُس کا ان لوگوں پر ہوگا جو ننگ دھڑنگ آفتاب کے سامنے بیٹھے ہیں یعنی ادب سے اور حیا سے اور تواضع سے اور نیک ظن سے کام نہیں لیتے نِرے ظاہر پرست ہیں گویا آفتاب کے ساتھ لڑنا چاہتے ہیں سو وہ بھی فیضِ آفتاب سے بے نصیب ہیں اور ان کو آفتاب سے بجز جلنے کے اَور کوئی حصہ نہیں۔ یہ ان مسلمانوں کی طرف اشارہ ہے جن میں مسیح موعود ظاہر تو ہوا مگر وہ انکار اور مقابلہ سے پیش آئے اور حیا اور ادب اور حُسنِ ظن سے کام نہ لیا اس لئے سعادت سے محروم رہ گئے۔ بعد اس کے اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ○ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ○ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ○ قَالَ مَا مَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِىْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۙ اٰتُوْنِىْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِىْۤ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ؕ فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ○ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّىْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّىْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّىْ حَقًّا ؕ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِىْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِى الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ۙ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَا ۙ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِىْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِىْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ○ اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِىْ مِنْ دُوْنِىْۤ اَوْلِيَآءَ ؕ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا[۲] پھر ذوالقرنین یعنی مسیح موعود ایک اَور سامان کے پیچھے پڑے گا اور جب وہ ایک ایسے موقعہ پر پہنچے گا یعنی جب وہ ایک ایسا نازک زمانہ پائے گا جس کو بین السدّین کہنا چاہیئے یعنی دو پہاڑیوں کی بیچ۔ مطلب یہ کہ ایسا وقت پائے گا جبکہ دو طرفہ

---

[۱] اس جگہ خدا تعالیٰ کو یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مسیح موعود کے وقت تین گروہ ہوں گے ایک گروہ تفریط کی راہ لے گا جو روشنی کو بالکل کھو بیٹھے گا اور دوسرا گروہ افراط کی راہ اختیار کرے گا جو تواضع اور انکسار اور فروتنی سے روشنی سے فائدہ نہیں اُٹھائے گا بلکہ خیرہ طبع ہو کر مقابلہ کرنے والے کی طرح روحانی دھوپ کے سامنے محض برہنہ ہونے کی حالت میں کھڑا ہوگا مگر تیسرا گروہ میانہ حالت میں ہوگا وہ مسیح موعود سے چاہیں گے کہ کسی طرح یاجوج ماجوج کے حملوں سے بچ جائیں اور یاجوج ماجوج اجیج کے لفظ سے نکلا ہے یعنی وہ قوم جو آگ کے استعمال کرنے میں ماہر ہیں۔

[۲] الکہف آیت ۹۳ تا ۱۰۳

خوف میں لوگ پڑے ہوں گے اور ضلالت کی طاقت حکومت کی طاقت کے ساتھ مل کر خوفناک نظارہ دکھائے گی تو ان دونوں طاقتوں کے ماتحت ایک قوم کو پائے گا جو اس کی بات کو مشکل سے سمجھیں گے یعنی غلط خیالات میں مبتلا ہوں گے اور بباعث غلط عقائد مشکل سے اس ہدایت کو سمجھیں گے جو وہ پیش کرے گا لیکن آخر کار سمجھ لیں گے اور ہدایت پالیں گے اور یہ تیسری قوم ہے جو مسیح موعود کی ہدایات سے فیضیاب ہوں گے تب وہ اس کو کہیں گے کہ اے ذوالقرنین یاجوج اور ماجوج نے زمین پر فساد مچا رکھا ہے پس اگر آپ کی مرضی ہو تو ہم آپ کے لئے چندہ جمع کر دیں تا آپ ہم میں اور اُن میں کوئی روک بنا دیں۔ وہ جواب میں کہے گا کہ جس بات پر خدا نے مجھے قدرت بخشی ہے وہ تمہارے چندوں سے بہتر ہے ہاں اگر تم نے کچھ مدد کرنی ہو تو اپنی طاقت کے موافق کرو تا میں تم میں اور ان میں ایک دیوار کھینچ دوں یعنی ایسے طور پر ان پر حجت پوری کروں کہ وہ کوئی طعن تشنیع اور اعتراض کا تم پر حملہ نہ کر سکیں۔ لوہے کی سلیں مجھے لا دو تا آمد و رفت کی راہوں کو بند کیا جائے یعنی اپنے تئیں میری تعلیم اور دلائل پر مضبوطی سے قائم کرو اور پوری استقامت اختیار کرو اور اس طرح پر خود لوہے کی سل بن کر مخالفانہ حملوں کو روکو اور پھر سلوں میں آگ پھونکو جب تک کہ وہ خود آگ بن جائیں یعنی محبتِ الٰہی اس قدر اپنے اندر بھڑکاؤ کہ خود الٰہی رنگ اختیار کرو۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ خدائے تعالیٰ سے کمال محبت کی یہی علامت ہے کہ محبّ میں ظلّی طور پر الٰہی صفات پیدا ہو جائیں اور جب تک ایسا ظہور میں نہ آوے تب تک دعویٰ محبت جھوٹ ہے۔ محبتِ کاملہ کی مثال بعینہٖ لوہے کی وہ حالت ہے جب کہ وہ آگ میں ڈالا جائے اور اس قدر آگ اس میں اثر کرے کہ وہ خود آگ بن جائے۔ پس اگرچہ وہ اپنی اصلیت میں لوہا ہے آگ نہیں ہے مگر چونکہ آگ نہایت درجہ اس پر غلبہ کر گئی ہے اس لئے آگ کے صفات اس سے ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ آگ کی طرح جلا سکتا ہے آگ کی طرح اس میں روشنی ہے۔ پس محبتِ الٰہیہ کی حقیقت یہی ہے کہ انسان اس رنگ سے رنگین ہو جائے۔ اور اگر اسلام اس حقیقت تک پہنچا نہ سکتا تو وہ کچھ چیز نہ تھا لیکن اسلام اس حقیقت تک پہنچاتا ہے۔ اول انسان کو چاہیئے کہ لوہے کی طرح اپنی استقامت اور ایمانی مضبوطی میں بن جائے کیونکہ اگر ایمانی حالت خس و خاشاک کی طرح ہے تو آگ اس کو چھوتے ہی بھسم کر دے گی پھر کیونکر وہ آگ کا مظہر بن سکتا ہے۔ افسوس بعض نادانوں نے عبودیت کے اس تعلق کو جو ربوبیت کے ساتھ ہے جس سے ظلّی طور پر صفاتِ الٰہیہ بندہ میں پیدا ہوتے ہیں نہ سمجھ کر میری اس وحی من اللہ پر اعتراض کیا ہے کہ اِنَّمَآ اَمْرُكَ اِذَآ اَرَدْتَ شَيْئًا اَنْ تَقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ یعنی تیری یہ بات ہے کہ جب تو ایک بات کو کہے ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے جو میرے پر نازل ہوا۔ یہ میری طرف سے نہیں ہے اور اس کی تصدیق اکابر صوفیہ اسلام کر چکے ہیں جیسا کہ سید عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ نے بھی فتوح الغیب میں یہی لکھا ہے اور عجیب تر یہ کہ سید عبد القادر جیلانیؒ نے بھی یہی آیت پیش کی ہے۔ افسوس لوگوں نے صرف رسمی ایمان پر کفایت کر لی ہے اور پوری معرفت کی طلب ان کے نزدیک کفر ہے اور خیال کرتے ہیں کہ یہی ہمارے لئے

کافی ہے حالانکہ وہ کچھ بھی چیز نہیں اور اس سے منکر ہیں کہ کسی سے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کا مکالمہ مخاطبہ یقینی اور واقعی طور پر ہو سکتا ہے۔ ہاں اس قدر ان کا خیال ہے کہ دلوں میں القا تو ہوتا ہے مگر نہیں معلوم کہ وہ القا شیطانی ہے یا رحمانی ہے اور نہیں سمجھتے کہ ایسے القا سے ایمانی حالت کو فائدہ کیا ہؤا اور کونسی ترقی ہوئی بلکہ ایسا القا تو ایک سخت ابتلا ہے جس میں معصیت کا اندیشہ یا ایمان جانے کا خطرہ ہے کیونکہ اگر ایسی مشتبہ وحی میں جو نہیں معلوم شیطان سے ہے یا رحمان سے ہے کسی کو تاکیدی حکم ہو کہ یہ کام کر تو اگر اس نے وہ کام نہ کیا اس خیال سے کہ شاید یہ شیطان نے حکم دیا ہے اور در اصل وہ خدا کا حکم تھا تو یہ انحراف موجب معصیت ہؤا اور اگر اُس حکم کو بجا لایا اور اصل میں شیطان کی طرف سے وہ حکم تھا تو اس سے ایمان گیا۔ پس ایسے الہام پانے والوں سے وہ لوگ اچھے رہے جو ایسے خطرناک الہامات سے جن میں شیطان بھی حصہ دار ہو سکتا ہے محروم ہیں۔ ایسے عقیدہ کی حالت میں عقل بھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ ممکن ہے کہ کوئی الہامِ الٰہی ایسا ہو جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کی ماں کا تھا جس کی تعمیل میں اُس کے بچّہ کی جان خطرہ میں پڑتی تھی یا جیسا کہ خضر علیہ السلام کا الہام تھا جس نے بظاہر حال ایک نفس زکیّہ کا ناحق خون کیا اور چونکہ ایسے امور بظاہر شریعت کے برخلاف ہیں اِس لئے شیطانی دخل کے احتمال سے کون ان پر عمل کرے گا اور بوجہ عدم تعمیل معصیت میں گرے گا اور ممکن ہے کہ شیطان لعین کوئی ایسا حکم دے کہ بظاہر شریعت کے مخالف معلوم نہ ہو اور در اصل بہت فتنہ اور تباہی کا موجب ہو یا پوشیدہ طور پر ایسے امور ہوں جو موجب سلبِ ایمان ہوں۔ پس ایسے مکالمہ مخاطبہ سے فائدہ کیا ہؤا۔

پھر آیات متذکرہ بالا کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ذوالقرنین یعنی مسیح موعود اُس قوم کو جو یاجوج ماجوج سے ڈرتی ہے کہے گا کہ مجھے تانبا لا دو کہ مَیں اس کو پگھلا کر اُس دیوار پر انڈیل دوں گا پھر بعد اس کے یاجوج ماجوج طاقت نہیں رکھیں گے کہ ایسی دیوار پر چڑھ سکیں یا اس میں سوراخ کر سکیں۔ یاد رہے کہ لوہا اگرچہ بہت دیر تک آگ میں رہ کر آگ کی صورت اختیار کر لیتا ہے مگر مشکل سے پگھلتا ہے مگر تانبا جلد پگھل جاتا ہے اور سالک کے لئے خدا تعالیٰ کی راہ میں پگھلنا بھی ضروری ہے۔ پس یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسے مستعد دل اور نرم طبیعتیں لاؤ کہ جو خدا تعالیٰ کے نشانوں کو دیکھ کر پگھل جائیں کیونکہ سخت دلوں پر خدا تعالیٰ کے نشان کچھ اثر نہیں کرتے لیکن انسان شیطانی حملے سے تب محفوظ ہوتا ہے کہ اوّل استقامت میں لوہے کی طرح ہو اور پھر وہ لوہا خدا تعالیٰ کی محبت کی آگ سے آگ کی صورت پکڑ لے اور پھر دل پگھل کر اُس لوہے پر پڑے اور اُس کو منتشر اور پراگندہ ہونے سے تھام لے۔ سلوک تمام ہونے کے لئے یہ تین ہی شرطیں ہیں جو شیطانی حملوں سے محفوظ رہنے کے لئے سدِّ سکندری ہیں اور شیطانی روح اس دیوار پر چڑھ نہیں سکتی اور نہ اس میں سوراخ کر سکتی ہے۔ اور پھر فرمایا کہ یہ خدا کی رحمت سے ہوگا اور اُس کا ہاتھ یہ سب کچھ کرے گا۔ انسانی منصوبوں کا اس میں دخل نہیں ہوگا اور جب قیامت کے دن نزدیک آجائیں گے تو پھر دوبارہ فتنہ برپا ہو

جائے گا یہ خدا کا وعدہ ہے۔

اور پھر فرمایا کہ ذوالقرنین کے زمانہ میں جو مسیح موعود ہے ہر ایک قوم اپنے مذہب کی حمایت میں اُٹھے گی اور جس طرح ایک موج دوسری موج پر پڑتی ہے ایک دوسرے پر حملہ کریں گے اتنے میں آسمان پر کرنا پھونکی جائے گی یعنی آسمان کا خدا مسیح موعود کو مبعوث فرما کر ایک تیسری قوم پیدا کر دے گا اور ان کی مدد کے لئے بڑے بڑے نشان دکھلائے گا یہاں تک کہ تمام سعید لوگوں کو ایک مذہب پر یعنی اسلام پر جمع کر دے گا اور وہ مسیح کی آواز سُنیں گے اور اسی کی طرف دوڑیں گے تب ایک ہی چوپان اور ایک ہی گلّہ ہوگا اور وہ دن بڑے ہی سخت ہوں گے اور خدا ہیبت ناک نشانوں کے ساتھ اپنا چہرہ ظاہر کر دے گا اور جو لوگ کفر پر اصرار کرتے ہیں وہ اِسی دُنیا میں بباعث طرح طرح کی بلاؤں کے دوزخ کا مُنہ دیکھ لیں گے۔ خدا فرماتا ہے کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کی آنکھیں میری کلام سے پردہ میں تھیں اور جن کے کان میرے حکم کو سُن نہیں سکتے تھے۔ کیا ان منکروں نے یہ گمان کیا تھا کہ یہ امر سہل ہے کہ عاجز بندوں کو خدا بنا دیا جائے اور مَیں معطل ہو جاؤں اس لئے ہم ان کی ضیافت کے لئے اِسی دُنیا میں جہنّم کو نمودار کر دیں گے یعنی بڑے بڑے ہولناک نشان ظاہر ہوں گے اور یہ سب نشان اُس کے مسیح موعود کی سچائی پر گواہی دیں گے۔ اُس کریم کے فضل کو دیکھو کہ یہ انعامات اس مُشتِ خاک پر ہیں جس کو مخالف کافر اور دجّال کہتے ہیں۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۹۰-۹۶)

(قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا) یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ذوالقرنین کا ذکر صرف گذشتہ زمانہ سے وابستہ نہیں بلکہ آئندہ زمانہ میں بھی ایک ذوالقرنین آنے والا ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۹۱ حاشیہ)

ذوالقرنین کا قصہ ہے اس میں اسی کی پیشگوئی ہے۔ چنانچہ قرآن شریف کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذوالقرنین مغرب کی طرف گیا تو اُسے آفتاب غروب ہوتا نظر آیا یعنی تاریکی پائی اور ایک گدلا چشمہ اس نے دیکھا وہاں پر ایک قوم تھی پھر مشرق کی طرف چلتا ہے تو دیکھا کہ ایک ایسی قوم ہے جو کسی اوٹ میں نہیں ہے اور وہ دھوپ سے جلتی ہے تیسری قوم ملی جس نے یاجوج ماجوج سے بچاؤ کی درخواست کی۔ اب یہ بظاہر تو قصہ ہے لیکن حقیقت میں ایک عظیم الشان پیشگوئی ہے جو اس زمانہ سے متعلق ہے۔ خدا تعالیٰ نے بعض حقائق تو کھول دئیے ہیں اور بعض مخفی رکھے ہیں اس لئے کہ انسان اپنے قویٰ سے کام لے۔ اگر انسان نرے منقولات سے کام لے تو وہ انسان نہیں ہو سکتا۔ ذوالقرنین اس لئے نام رکھا کہ وہ دو صدیوں کو پائے گا۔ اب جس زمانہ میں خدا نے مجھے بھیجا ہے سب صدیوں کو بھی جمع کر دیا۔ کیا یہ انسانی طاقت میں ہے کہ اس طرح پر دو صدیوں کا صاحب ہو جاوے۔

ہندوؤں کی صدی بھی پائی اور عیسائیوں کی بھی۔ مفتی صاحب نے تو کوئی ۱۶ یا ۱۷ صدیاں جمع کر کے دکھائی تھیں غرض ذوالقرنین کے معنے ہیں دو صدیاں پانے والا۔ اب خدا تعالیٰ نے اس کے لئے تین قوموں کا ذکر کیا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ پہلی قوم جو مغرب میں ہے اور آفتاب وہاں غروب ہوتا ہے اور وہ تاریکی کا چشمہ ہے یہ عیسائیوں کی

قوم ہے جس کا آفتابِ صداقت غروب ہوگیا اور آسمانی حق اور نور ان کے پاس نہیں رہا۔

دوسری قوم اس کے مقابل میں وہ ہے جو آفتاب کے پاس ہے مگر آفتاب سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتی۔ یہ مسلمانوں کی قوم ہے جن کے پاس آفتابِ صداقت قرآن شریف اس وقت موجود ہے مگر دابۃ الارض نے ان کو بے خبر بنا دیا ہے اور وہ اس سے اُن فوائد کو حاصل نہیں کر سکتے بجز جلنے اور دُکھ اُٹھانے کے جو ظاہر پرستی کی وجہ سے ان پر آیا۔ پس یہ قوم اس طرح پر بے نصیب ہوگئی۔ اب ایک تیسری قوم ہے جس نے ذوالقرنین سے التماس کی کہ یاجوج ماجوج کے درے بند کر دے تاکہ وہ اُن کے حملوں سے محفوظ ہو جاویں۔ وہ ہماری قوم ہے جس نے اخلاص اور صدق دل سے مجھے قبول کیا۔ خدا تعالیٰ کی تائیدات سے مَیں اِن حملوں سے اپنی قوم کو محفوظ کر رہا ہوں جو یاجوج ماجوج کر رہے ہیں۔ پس اس وقت خدا تعالیٰ تم کو تیار کر رہا ہے تمہارا فرض ہے کہ سچی توبہ کرو اور اپنی سچائی اور وفاداری سے خدا کو راضی کرو تاکہ تمہارا آفتاب غروب نہ ہو اور تاریکی کے چشمہ کے پاس جانے والے نہ ٹھہرو اور نہ تم ان لوگوں سے بنو جنہوں نے آفتاب سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ پس تم پورا فائدہ حاصل کرو اور پاک چشمہ سے پانی پیو تا خدا تم پر رحم کرے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۶، ۷)

یہ زمانہ چونکہ کشف حقائق کا زمانہ ہے اور خدا تعالیٰ قرآن شریف کے حقائق اور معارف مجھ پر کھول رہا ہے۔ ذوالقرنین کے قصے کی طرف جو میری توجہ ہوئی تو مجھے یہ سمجھایا گیا ہے کہ ذوالقرنین کے پیرایہ میں مسیح موعود ہی کا ذکر ہے اور اللہ تعالیٰ نے اس کا نام ذوالقرنین اس لئے رکھا ہے کہ قرن چونکہ صدی کو کہتے ہیں اور مسیح موعود دو قرنوں کو پائے گا اِس لئے ذوالقرنین کہلائے گا۔ چونکہ مَیں نے تیرھویں اور چودھویں صدی دونوں پائی ہیں اور اسی طرح پر دوسری صدیاں ہندوؤں اور عیسائیوں کی بھی پائی ہیں اس لحاظ سے تو ذوالقرنین ہے اور پھر اسی قصہ میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ ذوالقرنین نے تین قومیں پائیں۔ اوّل وہ جو غروب آفتاب کے پاس ہے اور کیچڑ میں ہے اس سے مراد عیسائی قوم ہے جس کا آفتاب ڈوب گیا ہے یعنی شریعتِ حقہ اُن کے پاس نہیں رہی۔ روحانیت مر گئی اور ایمان کی گرمی جاتی رہی۔ یہ ایک کیچڑ میں پھنسے ہوئے ہیں۔

دوسری قوم وہ ہے جو آفتاب کے پاس ہے اور جھلسنے والی دھوپ ہے۔ یہ مسلمانوں کی موجودہ حالت ہے۔ آفتاب یعنی شریعتِ حقہ اُن کے پاس موجود ہے مگر یہ لوگ اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے کیونکہ فائدہ تو حکمتِ عملی سے اُٹھایا جاتا ہے جیسے مثلاً روٹی پکانا۔ وہ گو آگ سے پکائی جاتی ہے لیکن جب تک اس کے مناسبِ حال انتظام اور تدبیر نہ کی جاوے وہ روٹی تیار نہیں ہو سکتی اسی طرح پر شریعتِ حقہ سے کام لینا بھی ایک حکمتِ عملی کو چاہتا ہے۔ پس مسلمانوں نے اس وقت باوجودیکہ اُن کے پاس آفتاب اور اس کی روشنی موجود تھی اور ہے لیکن کام نہیں لیا اور مفید صورت میں اس کو استعمال نہیں کیا اور خدا کے جلال اور عظمت سے حصہ نہیں لیا۔

اور تیسری وہ قوم ہے جس نے اس سے فریاد کی کہ ہم کو یاجوج اور ماجوج سے بچا یہ ہماری قوم ہے جو مسیح موعود کے پاس آئی اور اُس نے اس سے استفادہ کرنا چاہا ہے۔ غرض آج ان قصّوں کا علمی رنگ ہے ہمارا ایمان ہے کہ یہ قصّہ پہلے بھی کسی رنگ میں گذرا ہے لیکن یہ سچی بات ہے کہ اس قصّہ میں آئندہ کا بیان بھی بطور پیشگوئی تھا جو آج اس زمانہ میں پورا ہو گیا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

ایک دفعہ سورہ کہف جس کو ذوالقرنین بھی کہتے ہیں مَیں دیکھ رہا تھا تو جب مَیں نے اس قصّہ کو غور سے پڑھا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس میں بعینہٖ اس زمانہ کا حال درج ہے جیسے لکھا ہے کہ جب اس نے سفر کیا تو ایسی جگہ پہنچا جہاں کہ اُسے معلوم ہوا کہ سورج کیچڑ میں ڈوب گیا ہے اور یہ اس کا مغربی سفر تھا اور اس کے بعد پھر وہ ایسے لوگوں کے پاس پہنچتا ہے جو دھوپ میں ہیں اور جن پر کوئی سایہ نہیں۔ پھر ایک تیسری قوم اُسے ملتی ہے جو یاجوج ماجوج کے حالات بیان کر کے اس سے حمایت طلب کرتی ہے۔ اب مثالی طور پر تو خدا نے یہی بیان کیا ہے لیکن ذوالقرنین تو اس کو کہتے ہیں جس نے دو صدیاں پائی ہوں اور ہم نے دو صدیوں کو اس قدر لیا ہے کہ اعتراض کا موقع ہی نہیں رہتا۔ مَیں نے ہر صدی پر دو صدیوں سے حصّہ لیا ہے تم حساب کر کے دیکھ لو اور یہ جو قرآن میں قصص پائے جاتے ہیں تو یہ صرف قصّہ کہانیاں نہیں بلکہ یہ عظیم الشان پیشگوئیاں ہیں جو شخص ان کو صرف قصّے کہانیاں سمجھتا ہے وہ مسلمان نہیں۔ غرض اس حساب سے تو مجھے بھی ذوالقرنین ماننا پڑے گا اور آئمہ دین میں سے بھی ایک نے ذوالقرنین سے مسیح مراد لیا ہے۔ اب خدا تعالیٰ نے اس قصّہ میں مغربی اور مشرقی دو قوموں کا ذکر کیا ہے۔ مغربی قوم سے مراد تو وہ لوگ ہیں جن کو انجیل اور دیگر صحیفہ جات کا صاف شفاف پانی دیا گیا تھا مگر وہ روشن تعلیم انہوں نے ضائع کر دی اور اپنے پاس کیچڑ اور گند باقی رہنے دیا اور مشرقی قوم سے وہ مسلمان لوگ مراد ہیں جو امام کے سایہ کے نیچے نہیں آتے اور دھوپ کی شعاعوں سے جھلسے جا رہے ہیں لیکن ہماری جماعت بہت خوش نصیب ہے اس کو اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اس نے اپنے فضل سے ہدایت عطا فرمائی لیکن یہ ابھی ابتدائی حالت ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

وہ ذوالقرنین جس کا ذکر قرآن شریف میں ہے اَور ہے اور سکندر رومی اَور شخص ہے۔ بعض لوگ ہر دو کو ایک سمجھتے ہیں۔ ذوالقرنین دو صدیوں میں سے حصّہ لینے والا ہے۔ (بدر جلد ۸ نمبر ۷، ۸، ۹ مورخہ ۲۴ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ رَجُلٍ قَعَدَ فِيْ مَقْنُوْرَةٍ فَطَلَعَتِ الشَّمْسُ حَتّٰى جَاءَتْ عَلٰى رَأْسِهٖ وَهُوَ مِنَ الَّذِيْنَ يَخْتَفِيُوْنَ وَقَوْمٌ اٰخَرُوْنَ رَضُوْا بِالْحُمَاذِيْ وَقَعَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ كَالْمُحَاذِيْ وَ اِنِّيْ اَنَا

(ترجمہ از مرتّب) ان لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو ایک تاریک گھر سے میں ہے۔ پھر اس پر سورج نے بھی طلوع کیا یہاں تک کہ اس کے عین سر پر آگیا مگر وہ تاریکیوں میں ہی پڑا رہا۔ اور ایک اَور قوم ہے جو شدتِ گرمی پر راضی ہو گئے ہیں اور اس کے

الْاَحْوَذِیُّ کَذِی الْقَرْنَیْنِ وَجَدْتُ قَوْمًا فِیْ اُوَارٍ وَّقَوْمًا اٰخَرِیْنَ فِیْ زَمْھَرِیْرٍ وَّعَیْنٍ کَدِرَۃٍ لِّفَقْدِ الْعَیْنَیْنِ وَاِنِّیْ اَنَا الْغَیْذَانُ وَمِنَ اللّٰہِ اَرٰی وَاَعْلَمُ اَنَّ الْقَدَرَ اَخْرَجَ سَھْمَہٗ وَقَذَّ فَاذْکُرُوا اللّٰہَ بِعَیْنٍ ثَرَّۃٍ یَّا اُولِی النُّھٰی لَعَلَّکُمْ تَجِدُوْا خَیْرًا کَثِیْرًا وَّکَثِیْرًا مِّنَ النَّدٰی۔

(تذکرۃ الشہادتین ص ۹۶)

وَاِنَّمَا مَثَلُ الْمَسِیْحِ الْمَوْعُوْدِ کَمَثَلِ ذِی الْقَرْنَیْنِ وَاِلَیْہِ اَشَارَ الْقُرْاٰنُ یَآ اُولِی الْعَیْنَیْنِ فَکَفَاکُمْ ھٰذَا الْمَثَلُ اِنْ کُنْتُمْ تَتَاَمَّلُوْنَ وَاِنِّیْ اَنَا الْاَحْوَذِیُّ کَذِی الْقَرْنَیْنِ وَجُمِعَتْ لِیَ الْاَرَضُوْنَ کُلُّھَا بِتَزْوِیْجِ النُّفُوْسِ فَکَمَّلْتُ اَمْرَ سِیَاحَتِیْ وَمَا بَرِحْتُ مَوْضِعَ ھَاتَیْنِ الْقَدَمَیْنِ وَلَا سِیَاحَۃَ فِی الْاِسْلَامِ وَلَا شَدَّ الرِّحَالِ مِنْ غَیْرِ الْحَرَمَیْنِ فَرُزِقَ لِیَ السَّیَحَانُ بِھٰذَا الطَّرِیْقِ مِنْ رَّبِّ الْکَوْنَیْنِ وَوَجَدْتُ فِیْ سِیَاحَتِیْ قَوْمَیْنِ مُتَضَادَّیْنِ قَوْمٌ صَمَخَتْ عَلَیْھِمُ الشَّمْسُ وَلَفَحَتْ وُجُوْھَھُمْ نَارُ اُوَارٍ فَرَجَعُوْا بِخُفَّیْ حُنَیْنٍ وَّقَوْمٌ اٰخَرُوْنَ فِیْ زَمْھَرِیْرٍ وَّعَیْنٍ حَمِأَۃٍ

افراد ایک دوسرے کے بالمقابل بیٹھے ہوئے ہیں۔ مَیں وہ تیز رفتار سیّاح ہوں جو ذوالقرنین کی مانند ہے۔ مَیں نے ایک قوم کو سخت گرمی میں پایا اور دوسروں کو سخت سردی میں اور نابینائی کی وجہ سے ایسے چشمہ پر پایا جو گدلا ہے اور مَیں ہی صحیح نتیجہ پر پہنچنے والا ہوں اور اللہ کی طرف سے صحیح راہ کو دیکھ رہا ہوں اور مَیں جانتا ہوں کہ قضاو قدر نے صحیح نشانہ پر بیٹھنے والا تیر لگایا ہے۔ پس اے عقلمندو اشکبار آنکھوں کے ساتھ اللہ کو یاد کرو تا تم خدائی بخشش سے خیر کثیر پاسکو۔

(ترجمہ از مرتّب) مسیح موعود کی مثال ذوالقرنین کی ہے۔ اور اے آنکھ رکھنے والو دیکھو کہ قرآن مجید نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور یہ تمثیل تمہارے لئے اگر تم سوچو کافی ہے اور مَیں ذوالقرنین کی مانند تیز رفتار ہوں۔ اور انسانوں کو ملانے کے سامان پیدا کرکے میرے لئے تمام زمینیں اکٹھی کر دی گئی ہیں۔ پس مَیں نے اپنی سیاحت کے کام کو مکمل کر لیا ہے حالانکہ مَیں اپنے دونوں پاؤں کے مقام پر قائم رہا ہوں۔ اور اسلام میں سیاحت اور سفر حرمین کے سوا کسی اَور جگہ کے لئے نہیں ہے سو مجھے دونوں جہانوں کے ربّ کی طرف سے اس طریق (روحانی یا معنوی طور) پر سیاحت عطا کی گئی ہے اور مَیں نے اپنی سیاحت کے دوران دو متضاد قوموں کو پایا ہے جن میں سے ایک وہ قوم ہے جس پر سورج کی دھوپ پڑ رہی ہے اور اس کی تپش کی آگ نے ان کے چہروں کو جھلس دیا ہے اور وہ سراسر ناکام ہوگئے اور دوسرے لوگ اپنی نابینائی کی وجہ سے سخت سردی میں اور گدلا کیچڑ والے چشمہ پر ہیں۔ پہلی مثال اُن لوگوں کی ہے جو اپنے آپ کو مسلمان

لِفَقْدِ الْعَيْنِ ذٰلِكَ مَثَلُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ اِنَّا نَحْنُ مُسْلِمُوْنَ وَلَيْسَ لَهُمْ حَظٌّ مِّنْ شَمْسِ الْاِسْلَامِ يُحْرِقُوْنَ اَبْدَانَهُمْ مِنْ غَيْرِ نَفْعٍ وَيُلْفَحُوْنَ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ مَا بَقِيَ عِنْدَهُمْ مِنْ ضَوْءِ شَمْسِ التَّوْحِيْدِ وَاتَّخَذُوْا عِيْسٰى اِلٰهًا وَّاسْتَبْدَلُوا الْمَيِّتَ بِالَّذِيْ هُوَ حَيٌّ وَّيَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ اِلَيْهِ يَتَحَوَّجُوْنَ۔

هٰذَانِ مَثَلَانِ لِقَوْمٍ جَعَلُوْا اَنْفُسَهُمْ كَعَبَادِيْدَ مَا نَفَعَهُمْ ضَوْءُ الشَّمْسِ مِنْ غَيْرِ اَنْ تَلْفَحَ وُجُوْهَهُمْ حَرُّهَا فَهُمْ يَهْلِكُوْنَ وَمَثَلٌ لِّقَوْمٍ فَرُّوْا مِنْ ضَوْءِهَا فَنُهِبُوْا وَهُمْ يَغْتَهِبُوْنَ وَاِنِّيْ اَدْرَكْتُ الْقَرْنَيْنِ مِنَ السَّنَوَاتِ الْهِجْرِيَّةِ وَكَذٰلِكَ مِنْ سَنَةِ عِيْسٰى وَمِنْ كُلِّ سَنَةٍ بِهَا يُحَاسِبُوْنَ فَلِذٰلِكَ سُمِّيْتُ ذَا الْقَرْنَيْنِ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَدَبَّرُوْنَ۔

وَمَا جِئْتُ اِلَّا فِيْ وَقْتٍ فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ فِيْهِ وَهُمْ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْنَ فَبُعِثْتُ لِاَصُوْنَ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ صَوْلِهِمْ بِاٰيَاتٍ بَيِّنَاتٍ وَّاَدْعِيَةٍ تَجْذِبُ الْمَلَآئِكَةَ اِلَى الْاَرْضِ مِنَ

کہتے ہیں ان کو اسلام کے سورج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا وہ بغیر نفع کے اپنے بدنوں کو جلا رہے ہیں اور چہروں کو جھلسا رہے ہیں۔ دوسری ان لوگوں کی مثال ہے جن کے پاس توحید کے سورج کی روشنی میں سے کچھ باقی نہیں۔ انہوں نے عیسٰی علیہ السّلام کو معبود بنا لیا اور زندہ خدا کے بدلے ایک مُردہ کو اختیار کر لیا اور وہ خیال کرتے ہیں کہ وہ اس کے محتاج ہیں۔

یہ دونوں مثالیں ان لوگوں کی ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو ان حقیر لوگوں کی طرح بنا لیا جن کو سُورج کی روشنی نے کچھ نفع نہ پہنچایا سوائے اس کے کہ اس کی گرمی نے ان کے چہروں کو جھلس دیا پس وہ ہلاک ہو رہے ہیں۔ پھر یہ مثال ان لوگوں کی ہے جو سورج کی روشنی سے بھاگے اور ان کا سارا سامان چھینا گیا اور وہ ظلمت میں بھٹک رہے ہیں۔ مَیں نے ہجری تقویم کی دو صدیوں کو پایا ہے۔ ایسا ہی عیسوی سَن کے لحاظ سے بلکہ ہر تقویم کے لحاظ سے جس سے لوگ اپنا حساب کرتے ہیں دو صدیوں کو پایا ہے اِسی لئے اللہ کی کتاب نے مجھے ذوالقرنین کا نام دیا ہے اور اس میں سوچنے والوں کے لئے ایک زبردست نشان ہے۔

اور مَیں اسی وقت مبعوث ہوا جبکہ یاجوج و ماجوج کھول دئے گئے اور وہ ہر بلندی سے پھلانگتے ہوئے دُنیا میں پھیل گئے۔ پس مَیں اِس غرض کے لئے مبعوث کیا گیا کہ مسلمانوں کو یاجوج و ماجوج کے حملوں سے آیاتِ بیّنات اور ایسی دعاؤں کے ذریعہ سے جو فرشتوں کو آسمان سے زمین پر کھینچ لاتی ہیں محفوظ کروں اور تا

اَلسَّمٰوٰتِ وَ رَاَجْعَلْ سَدًّا لِقَوْمٍ یُّسْلِمُوْنَ۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۱۱۶-۱۱۷)

فَوَجَدَھَا تَغْرُبُ فِیْ عَیْنٍ حَمِئَۃٍ پس واضح ہو کہ آیت قرآنی بہت سے اسرار اپنے اندر رکھتی ہے جس کا احاطہ نہیں ہو سکتا اور جس کے ظاہر کے نیچے ایک باطن بھی ہے لیکن وہ معنے جو خدا نے میرے پر ظاہر فرمائے ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ آیت مع اپنے سابق اور لاحق کے مسیح موعود کے لئے ایک پیشگوئی ہے اور اس کے وقت ظہور کو مشخص کرتی ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ مسیح موعود بھی ذوالقرنین ہے کیونکہ قرن عربی زبان میں صدی کو کہتے ہیں اور آیت قرآنی میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ وعدہ کا مسیح جو کسی وقت ظاہر ہوگا اُس کی پیدائش اور اس کا ظاہر ہونا دو صدیوں پر مشتمل ہوگا چنانچہ میرا وجود اسی طرح پر ہے میرے وجود نے مشہور و معروف صدیوں میں خواہ ہجری ہیں خواہ مسیحی خواہ بکر ماجیتی اس طور پر اپنا ظہور کیا ہے کہ ہر جگہ دو صدیوں پر مشتمل ہے صرف کسی ایک صدی تک میری پیدائش اور ظہور ختم نہیں ہوئے۔ غرض جہاں تک مجھے علم ہے میری پیدائش اور میرا ظہور ہر ایک مذہب کی صدی میں صرف ایک صدی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ دو صدیوں میں اپنا قدم رکھتا ہے پس ان معنوں سے میں ذوالقرنین ہوں۔ چنانچہ بعض احادیث میں بھی مسیح موعود کا نام ذوالقرنین آیا ہے۔ اُن حدیثوں میں بھی ذوالقرنین کے یہی معنے ہیں جو میں نے بیان کئے۔

اب باقی آیت کے معنے پیشگوئی کے لحاظ سے یہ ہیں کہ دُنیا میں دو قومیں بڑی ہیں جن کو مسیح موعود کی بشارت دی گئی ہے اور مسیحی دعوت کے لئے پہلے انہیں کا حق ٹھہرایا گیا ہے سو خدا تعالیٰ ایک استعارے کے رنگ میں اس جگہ فرماتا ہے کہ مسیح موعود جو ذوالقرنین ہے اپنی سیر میں دو قوموں کو پائے گا۔ ایک قوم کو دیکھے گا کہ وہ تاریکی میں ایک ایسے بدبودار چشمے پر بیٹھی ہے کہ جس کا پانی پینے کے لائق نہیں اور اس میں سخت بدبودار کیچڑ ہے اور اس قدر ہے کہ اب اس کو پانی نہیں کہہ سکتے۔ یہ عیسائی قوم ہے جو تاریکی میں ہے جنہوں نے مسیحی چشمہ کو اپنی غلطیوں سے بدبودار کیچڑ میں ملا دیا ہے۔ دوسری سیر میں مسیح موعود نے جو ذوالقرنین ہے ان لوگوں کو دیکھا جو آفتاب کی جلتی ہوئی دھوپ میں بیٹھے ہیں اور آفتاب کی دھوپ اور ان میں کوئی اوٹ نہیں اور آفتاب سے انہوں نے کوئی روشنی تو حاصل نہیں کی اور صرف یہ حصہ ملا ہے کہ اس سے بدن اُن کے جل رہے ہیں اور اوپر کی جلد سیاہ ہو گئی ہے۔ اس قوم سے مراد مسلمان ہیں جو آفتاب کے سامنے تو ہیں مگر بجز جلنے کے اَور کچھ ان کو فائدہ نہیں ہوا یعنی ان کو توحید کا آفتاب دیا گیا مگر بجز جلنے کے آفتاب سے انہوں نے کوئی حقیقی روشنی حاصل نہیں کی یعنی دینداری کی سچی خوبصورتی اور سچے اخلاق وہ کھو بیٹھے اور تعصب اور کینہ اور اشتعال طبع اور درندگی کے چلن ان کے حصہ میں آگئے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پیرایہ میں فرماتا ہے کہ ایسے وقت میں مسیح موعود جو ذوالقرنین ہے آئے گا جبکہ عیسائی تاریکی میں ہوں گے اور اُن کے حصہ میں صرف ایک بدبودار کیچڑ ہوگا جس کو عربی میں حمأ کہتے ہیں اور مسلمانوں کے

میں ان لوگوں کے لئے ایک دیوار بنا دوں جو اطاعت گزار ہیں ۞

ہاتھ صرف خشک توحید ہوگی جو تعصب اور درندگی کی دھوپ سے جلے ہوں گے اور کوئی روحانیت صاف نہیں ہوگی اور پھر مسیح جو ذوالقرنین ہے ایک تیسری قوم کو پائیں گے جو یاجوج ماجوج کے ہاتھ سے بہت تنگ ہوگی اور وہ لوگ بہت دیندار ہوں گے اور ان کی طبیعتیں سعادت مند ہوں گی اور وہ ذوالقرنین سے جو مسیح موعود ہے مدد طلب کریں گے تا یاجوج ماجوج کے حملوں سے بچ جائیں اور تا وہ ان کے لئے سدِ روشن بنا دے گا یعنی ایسے پختہ دلائل اسلام کی تائید میں ان کو تعلیم دیگا یاجوج ماجوج کے حملوں کو قطعی طور پر روک دے گا اور ان کے آنسو پونچھے گا اور ہر ایک طور سے ان کی مدد کرے گا اور اُن کے ساتھ ہوگا یہ ان لوگوں کی طرف اشارہ ہے جو مجھے قبول کرتے ہیں یہ عظیم الشان پیشگوئی ہے اور اس میں صریح طور پر میرے ظہور اور میرے وقت اور میری جماعت کی خبر دی گئی ہے۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۵۳-۵۴)

اس سوال کے جواب میں کہ قرآن میں لکھا ہے کہ ذوالقرنین نے آفتاب کو دلدل میں غروب ہوتے پایا۔ فرمایا۔ یہ صرف ذوالقرنین کے وجدان کا بیان ہے۔ آپ بھی اگر جہاز میں سوار ہوں تو آپ کو بھی معلوم ہو کہ سمندر سے ہی آفتاب نکلا اور سمندر میں ہی غروب ہوتا ہے۔ قرآن نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ علم ہیئت کے موافق بیان کیا جاتا ہے ہر روز صدہا استعارہ بولے جاتے ہیں مثلاً اگر آپ یہ کہیں کہ آج میں ایک رکابی پلاؤ کی کھا کر آیا ہوں تو کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ آپ رکابی کو کھا گئے اگر آپ یہ کہیں کہ فلاں شخص شیر ہے کیا ہم یہ سمجھ لیں کہ اس کے پنجے شیر کی طرح اور ایک دُم بھی ضرور ہوگی۔ انجیل میں لکھا ہے کہ وہ زمین کے کنارہ سے سلیمان کی حکمت سننے آئے حالانکہ زمین گول ہے کنارہ کے کیا معنے۔ پھر یسعیاہ باب ۱۴ میں یہ آیت ہے ساری زمین آرام سے اور ساکن ہے مگر زمین کی تو جنبش ثابت ہو چکی۔

(جنگِ مقدس پرچہ ۵۔ جون ۱۸۹۳ء صفحہ ۳-۴)

پادری عبداللہ آتھم کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

آپ لکھتے ہیں کہ دلدل میں آفتاب کا غروب ہونا سلسلہ مجازات میں داخل نہیں مگر عینٍ حمئۃٍ سے تو کالا پانی مراد ہے اور اس میں اب بھی لوگ یہی نظارہ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں اور مجازات کی بنا مشاہداتِ عینیہ پر ہے جیسے ہم ستاروں کو کبھی نقطہ کے موافق کہہ دیتے ہیں اور آسمان کو کبود رنگ کہہ دیتے ہیں اور زمین کو ساکن کہہ دیتے ہیں پس جبکہ انہیں اقسام میں سے یہ بھی ہے تو اس سے کیوں انکار کیا جائے۔

(جنگِ مقدس آخری مضمون مورخہ ۵۔ جون ۱۸۹۳ء صفحہ ۱۳)

غلط فہمی معترض کے دل میں یہ پیدا ہوئی ہے کہ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ ایک بادشاہ (جس کی سیر و سیاحت کا ذکر قرآن شریف میں ہے) سیر کرتا کرتا کسی ایسے مقام تک پہنچا جہاں اسے سورج دلدل میں چھپتا نظر آیا۔ اب عیسائی صاحب مجاز سے حقیقت کی طرف رُخ کر کے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ سورج اتنا بڑا ہو کر ایک چھوٹے سے دلدل میں کیونکر چھپ گیا۔ یہ ایسی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ انجیل میں مسیح کو خدا کا برہ لکھا ہے یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ برہ تو وہ ہوتا ہے جس کے سر پر

سینگ اور بدن پر پشم وغیرہ بھی ہو اور چار پاؤں کی طرح سرنگوں چلتا اور وہ چیزیں کھاتا ہو جو بّرے کھایا کرتے ہیں۔
اے صاحب آپ نے کہاں سے اور کس سے سُن لیا کہ قرآن شریف نے واقعی طور پر سورج کے دلدل میں چھپنے کا دعویٰ کیا ہے قرآن شریف تو فقط بمنصب نقل خیال اس قدر فرماتا ہے کہ اُس شخص کو اس کی نگاہ میں دلدل میں سورج چھپتا ہُوا معلوم ہُوا سو یہ تو ایک شخص کی روایت کا حال بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایسی جگہ پہنچا جس جگہ سورج کسی پہاڑ یا آبادی یا درختوں کے اوٹ میں چھپتا ہُوا نظر نہیں آتا تھا جیسا کہ عام دستور ہے بلکہ دلدل میں چھپتا ہُوا معلوم دیتا تھا مطلب یہ کہ اس جگہ کوئی آبادی یا درخت یا پہاڑ نزدیک نہ تھے بلکہ جہاں تک نظر وفا کرے ان چیزوں میں سے کسی چیز کا نشان نظر نہیں آتا تھا فقط ایک دلدل تھا جس میں سورج چھپتا دکھائی دیتا تھا۔

ان آیات کا سیاق سباق دیکھو کہ اس جگہ حکیمانہ تحقیق کا کچھ ذکر بھی ہے فقط ایک شخص کی دور دراز سیاحت کا ذکر ہے اور ان باتوں کے بیان کرنے سے اسی مطلب کا اثبات منظور ہے کہ وہ ایسے غیر آباد مقام پر پہنچا سو اس جگہ ہیئت کے مسائل لے بیٹھنا بالکل بے محل نہیں تو اَور کیا ہے۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ آج رات بادل وغیرہ سے آسمان خوب صاف ہو گیا تھا اور ستارے آسمان کے نقطوں کی طرح چمکتے ہوئے نظر آتے تھے تو اس سے یہ جھگڑا لے بیٹھیں کہ کیا ستارے نقطوں کی مقدار پر ہیں اور ہیئت کی کتابیں کھول کھول کر پیش کریں تو بلاشبہ یہ حرکت بے خبروں کی سی حرکت ہو گی کیونکہ اس وقت متکلم کی نیت میں واقعی امر کا بیان کرنا مقصود نہیں وہ تو صرف مجازی طور پر جس طرح ساری دُنیا جہاں بولتا ہے بات کر رہا ہے۔ اے وہ لوگو جو عشائے ربانی میں مسیح کا لہو پیتے اور گوشت کھاتے ہو کیا ابھی تک تمہیں مجازات اور استعارات کی خبر نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ ہر ایک ملک کی عام بول چال میں مجازات اور استعارات کے استعمال کا نہایت وسیع دروازہ کھلا ہے اور وحی الٰہی انہیں محاورات و استعارات کو اختیار کرتی ہے جو سادگی سے عوام الناس نے اپنی روزمرہ کی بات چیت اور بول چال میں اختیار کر رکھی ہیں۔ فلسفہ کی دقیق اصطلاحات کی ہر جگہ اور ہر محل میں پیروی کرنا وحی کی طرز نہیں کیونکہ روئے سخن عوام الناس کی طرف ہے پس ضرور ہے کہ ان کی سمجھ کے موافق اور ان کے محاورات کے لحاظ سے بات کی جائے۔ حقائق و دقائق کا بیان کرنا بجائے خود ہے مگر محاورات کا چھوڑنا اور مجازات و استعاراتِ عادیہ سے یک لخت کنارہ کش ہونا ایسے شخص کے لئے ہرگز روا نہیں جو عوام الناس کے مذاق پر بات کرنا اُس کا فرض منصب ہے تا وہ اس کی بات کو سمجھیں اور ان کے دلوں پر اس کا اثر ہو۔ لہٰذا یہ مسلّم ہے کہ کوئی ایسی الہامی کتاب نہیں جس میں مجازات اور استعارات سے کنارہ کیا گیا ہو یا کنارہ کرنا جائز ہو کیا کوئی کلامِ الٰہی دُنیا میں ایسا بھی آیا ہے؟ اگر ہم غور کریں تو ہم خود اپنی ہر روزہ بول چال میں صدہا مجازات و استعارات بول جاتے ہیں اور کوئی بھی ان پر اعتراض نہیں کرتا مثلاً کہا جاتا ہے کہ ہلال بال سا باریک ہے اور ستارے نقطے سے ہیں یا چاند بادل کے اندر چھپ گیا اور سورج ابھی تک جو پہر دن چڑھا ہے نیزہ بھر اُوپر آیا ہے یا ہم نے ایک رکابی پلاؤ کی کھائی یا ایک پیالہ شربت کا پی لیا تو ان سب باتوں سے کسی کے دل میں

یہ دھوکا شروع نہیں ہوتا کہ ہلال کیونکر بال سا باریک ہو سکتا ہے اور ستارے کس وجہ سے بقدر نقطوں کے ہو سکتے ہیں یا چاند بال کے اندر کیونکر سما سکتا ہے اور کیا سُورج نے باوجود اپنی اس تیز حرکت کے جس سے وہ ہزار ہا کوس ایک دن میں طے کر لیتا ہے ایک پہر میں فقط بقدر نیزہ کے اتنی مسافت طے کر سکا ہے اور نہ رکابی پلاؤ کی کھانے یا پیالہ شربت کا پینے سے یہ کوئی خیال کر سکتا ہے کہ رکابی اور پیالہ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کھا لیا ہوگا بلکہ یہ سمجھیں گے کہ جو ان کے اندر چاول اور پانی ہے وہی کھایا پیا ہوگا۔ نہایت صاف بات پر اعتراض کرنا کوئی دانا مخالف بھی پسند نہیں کرتا۔ انصاف پسند عیسائیوں سے ہم نے خود سُنا ہے کہ ایسے ایسے اعتراض ہم میں سے وہ لوگ کرتے ہیں جو بے خبر یا سخت درجہ کے متعصب ہیں .... جہاز میں بیٹھنے والے اور اگن بوٹ پر سوار ہونے والے ہر روز یہ تماشا دیکھتے ہیں کہ سورج پانی میں سے ہی نکلتا ہے اور پانی میں ہی غروب ہوتا ہے اور صدہا مرتبہ آپس میں جیسا کہ دیکھتے ہیں بولتے بھی ہیں کہ وہ نکلا اور وہ غروب ہُوا۔ اب ظاہر ہے کہ اس بول چال کے وقت میں علم ہیئت کے دفتر انکے آگے کھولنا اور نظامِ شمسی کا مسئلہ لے بیٹھنا گویا یہ جواب سُننا ہے کہ اے پاگل کیا یہ علم تجھے ہی معلوم ہے ہمیں معلوم نہیں۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات صفحہ ۳۲-۳۰)

اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ :.... آپ نے آنے والے مسیح کا وقت یاجوج ماجوج کے ظہور کا زمانہ ٹھہرایا ہے اور یاجوج ماجوج یورپین عیسائی ہیں کیونکہ یہ نام اجیج کے لفظ سے نکالا گیا ہے جو شعلہ آگ کو کہتے ہیں۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ وہ لوگ آگ سے بہت کام لیں گے اور ان کی لڑائیاں آتشی ہتھیاروں سے ہوں گی اور اُن کے جہاز اور اُن کی ہزاروں کلیں آگ کے ذریعہ سے چلیں گی۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۵۳)

مسیح موعود کا یاجوج ماجوج کے وقت میں آنا ضروری ہے اور چونکہ اجیج آگ کو کہتے ہیں جس سے یاجوج ماجوج کا لفظ مشتق ہے اس لئے جیسا کہ خدا نے مجھے سمجھایا ہے یاجوج ماجوج وہ قوم ہے جو تمام قوموں سے زیادہ دُنیا میں آگ سے کام لینے میں استاد بلکہ اس کام کی موجد ہے۔ اور ان ناموں میں یہ اشارہ ہے کہ ان کے جہاز۔ ان کی ریلیں۔ ان کی کلیں آگ کے ذریعہ سے چلیں گی اور ان کی لڑائیاں آگ کے ساتھ ہوں گی اور وہ آگ سے خدمت لینے کے فن میں تمام دُنیا کی قوموں سے فائق ہوں گے اور اسی وجہ سے وہ یاجوج ماجوج کہلائیں گے سو وہ یورپ کی قومیں ہیں جو آگ کے فنون میں ایسے ماہر اور چابک اور یکتائے روزگار ہیں کہ کچھ بھی ضرور نہیں کہ اس میں زیادہ بیان کیا جائے۔ پہلی کتابوں میں بھی جو بنی اسرائیل کے نبیوں کو دی گئیں یورپ کے لوگوں کو ہی یاجوج ماجوج ٹھہرایا ہے بلکہ ماسکو کا نام بھی لکھا ہے جو قدیم پایہ تخت روس تھا۔ سو مقرر ہو چکا تھا کہ مسیح موعود یاجوج ماجوج کے وقت میں ظاہر ہوگا۔

(ایام الصلح صفحہ ۱۶۹)

سب سے بڑا فتنہ یہی نصاریٰ کا فتنہ ہے اور الدجال کا بروز ہے ایسا ہی یاجوج۔ یہ لفظ اجیج سے مشتق ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آتشی کاموں کے ساتھ اُن کا بہت بڑا تعلق ہوگا اور وہ آگ سے کام لینے میں بہت

مہارت رکھیں گے گویا آگ ان کے قابو میں ہوگی اور دوسرے لوگ اس آتشی مقابلہ میں ان سے عاجز رہ جائیں گے۔ اب یہ کیسی صاف بات ہے۔ دیکھ لو کہ آگ کے ساتھ اس قوم کو کس قدر تعلق ہے۔ کلیں کس قدر جاری ہیں اور دن بدن آگ سے کام لینے میں ترقی کر رہے ہیں۔ یہ دونوں بروز ہیں اور یہ دونوں کیفیتیں جو متفرق طور پر تھیں ایک میں آ گئی ہیں ایسا ہی ماجوج ہیں۔ (الحکم جلد ۵ ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۱ء ص۲)

ان (یاجوج ماجوج) کے لمبے کانوں سے مراد جاسوسی کی مشق ہے جیسے اس زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں تار خبر کا سلسلہ اور اخبار وغیرہ سب اسی میں ہیں۔ (الحکم جلد ا ۱ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۰۳ء ص۹)

اور یاجوج ماجوج کی نسبت تو فیصلہ ہو چکا ہے جو یہ دُنیا کی دو بلند اقبال قومیں ہیں جن میں سے ایک انگریز اور دوسرے روس ہیں۔ یہ دونوں قومیں بلندی سے نیچے کی طرف حملہ کر رہی ہیں یعنی اپنی خداداد طاقتوں کے ساتھ فتحیاب ہوتی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کی بدچلنیوں نے مسلمانوں کو نیچے گرا دیا اور ان کی تہذیب اور متانت شعاری اور ہمت اور اولوالعزمی اور معاشرت کے اعلیٰ اصولوں نے بحکم و مصلحت قادرِ مطلق ان کو اقبال دے دیا۔ ان دونوں قوموں کا بائیبل میں بھی ذکر ہے۔ (ازالہ اوہام حصّہ دوم ص۵۰۲)

ایسا ہی یاجوج ماجوج کا حال بھی سمجھ لیجیے۔ یہ دونوں پُرانی قومیں ہیں جو پہلے زمانوں میں دوسروں پر کُھلے طور پر غالب نہیں ہو سکیں اور ان کی حالت میں ضعف رہا لیکن خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ آخری زمانہ میں یہ دونوں قومیں خروج کریں گی یعنی اپنی جلالی قوت کے ساتھ ظاہر ہوں گی جیسا کہ سورۃ کہف میں فرماتا ہے وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ یعنی یہ دونوں قومیں دوسروں کو مغلوب کر کے پھر ایک دوسرے پر حملہ کریں گی اور جس کو خدائے تعالیٰ چاہے گا فتح دے گا۔ (ازالہ اوہام حصّہ دوم ص۵۰۸)

هٰذَانِ (يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ) لَاِسْمَانِ لِقَوْمٍ تَفَرَّقَتْ شُعَبُهُمْ فِيْ زَمَانِنَا هٰذَا اٰخِرِ الزَّمَانِ وَهُمْ فِيْ وَصْفٍ مُّتَشَارِكُوْنَ وَهُمْ قَوْمُ الرُّوْسِ وَقَوْمُ الْبَرَاطِنَةِ وَاِخْوَانُهُمْ وَالدَّجَّالُ فِيْهِمْ فَيْجُ قِسِّيْسِيْنَ وَدُعَاةُ الْاِنْجِيْلِ الَّذِيْنَ يَخْلِطُوْنَ الْبَاطِلَ بِالْحَقِّ وَيَدْجُلُوْنَ وَاعْتَدَتْ لَهُمُ الْهِنْدُ مُتَّكَأً وَّحَقَّتْ كَلِمَةُ نَبِيِّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهُمْ يَخْرُجُوْنَ مِنْ بِلَادِ الْمَشْرِقِ

(ترجمہ از مرتب) یاجوج و ماجوج ایک ایسی قوم کے دو نام ہیں جس کی شاخیں ہمارے اس آخری زمانہ میں دُنیا میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ اپنی صفات میں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں اور یہ قوم روس اور انگریز ہیں اور ان کے بھائی بند ہیں اور دجال ان میں پادریوں کی فوج ہے جو انجیل کی طرف دعوت دیتی ہے اور باطل اور حق کو ملا کر دجل سے کام لیتے ہیں ہندوستان ان کے لئے ٹھکانا بن گیا ہے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشگوئی پوری ہو گئی ہے کہ یہ

فَهُمْ مِّنْ مَشْرِقِ الْهِنْدِ خَارِجُوْنَ وَلَوْ كَانَ الدَّجَّالُ غَيْرَ مَا قُلْنَا وَكَذَالِكَ كَانَ قَوْمُ يَاجُوْجَ وَ مَاجُوْجَ غَيْرَ هٰذَا الْقَوْمِ لَلَزِمَ الْاِخْتِلَافُ وَ التَّنَاقُضُ فِيْ كَلَامِ نَبِيِّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَ اَيْمُ اللّٰهِ اَنَّ كَلَامَ نَبِيِّنَا مُنَزَّهٌ عَنْ ذَالِكَ۔ (آئینہ کمالات اسلام ص ۴۵۹-۴۶۰)

وَلٰكِنَّهُمْ اَخْطَاُوْا فِيْمَا قَالُوْا اِنَّ يَاجُوْجَ وَمَاجُوْجَ يَمُوْتُوْنَ فِيْ زَمَنِ عِيْسٰى كُلُّهُمْ فَاِنَّ يَاجُوْجَ وَمَاجُوْجَ هُمُ النَّصَارٰى مِنَ الرُّوْسِ وَالْاَقْوَامِ الْبَرْطَانِيَّةِ وَقَدْ اَخْبَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْ وُجُوْدِ النَّصَارٰى وَالْيَهُوْدِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَقَالَ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ فَكَيْفَ يَمُوْتُوْنَ كُلُّهُمْ قَبْلَ يَوْمِ الْقِيَامَةِ .... لَا يُقَالُ اِنَّ هٰذَا التَّفْسِيْرَ خِلَافُ الْاِجْمَاعِ وَاِنَّ الْقَوْمَ قَدِ اتَّفَقُوْا عَلٰى اَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يُشَابِهُوْنَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ وَلَهُمْ اٰذَانٌ طَوِيْلَةٌ لِاَنَّهُمْ قَدِ اتَّفَقُوْا عَلٰى اَنَّ يَاجُوْجَ وَمَاجُوْجَ قَوْمٌ مَّحْصُوْرُوْنَ فِي الْاِقْلِيْمِ الرَّابِعِ وَهُمْ اَزْيَدُ نَسْلًا وَعَدَدًا مِّنْ كُلِّ قَوْمٍ وَهٰذَا بَاطِلٌ بِالْبَدَاهَةِ لِاَنَّا لَا نَرٰى فِي الْاِقْلِيْمِ الرَّابِعِ اَثَرًا مِّنْهُمْ وَلَا مِنْ بِلَادِهِمْ وَ مُدُنِهِمْ وَعَسَاكِرِهِمْ مَعَ اَنَّ عِمَارَاتِ الْاَرْضِ قَدْ ظَهَرَتْ كُلُّهَا فَالرِّوَايَاتُ فِيْ هٰذَا الْبَابِ

لوگ بلادِ مشرق سے خروج کریں گے سو وہ ہندوستان کے مشرق سے نکل رہے ہیں اور اگر دجّال ہمارے بیان کے خلاف کوئی اور ہوتا اور اسی طرح یاجوج و ماجوج مذکورہ بالا قوموں کے علاوہ ہوتے تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام میں اختلاف اور تناقض لازم آتا اور مجھے خدا کی قسم ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام اس سے پاک اور منزہ ہے۔

(ترجمہ) لیکن انہوں نے اس میں غلطی کی ہے کہ یاجوج ماجوج سب کے سب مرجاویں گے کیونکہ یاجوج ماجوج سے مراد وہ نصاریٰ ہیں جو روس اور برطانیہ قوموں سے ہیں۔ اور خدا نے خبر دے دی ہے کہ یہود و نصاریٰ قیامت تک رہیں گے چنانچہ فرمایا ہے (فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ)[1] کہ ہم نے قیامت تک ان میں مخالفت ڈال دی ہے پس قیامت سے پہلے سب کے سب کس طرح مرسکتے ہیں .... یہ نہ کہا جاوے کہ یہ تفسیر اجماع کے خلاف ہے۔ قوم نے اس پر اتفاق کیا ہوا ہے کہ یاجوج ماجوج انسانوں کے مشابہ نہیں ہیں اور ان کے لمبے لمبے کان ہیں اس لیے کہ قوم نے اس پر اتفاق کیا ہوا ہے کہ وہ چوتھی اقلیم میں محصور ہیں اور ہر ایک قوم سے وہ تعداد اور نسل میں زیادہ ہیں اور یہ بالبداہت باطل ہے کیونکہ ہم چوتھی اقلیم میں ان کا اور ان کے شہروں اور لشکروں کا کچھ نام ونشان نہیں

---

[1] المائدہ آیت ۱۵۔

بَاطِلَةٌ كُلُّهَا۔ (حمامة البشریٰ ص۸۰ تا ص۸۲ مترجم)

فَالْحَاصِلُ اَنَّ هٰذِهِ الْاٰيَةَ يَعْنِيْ وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ[1] دَلِيْلٌ صَرِيْحٌ وَّ بُرْهَانٌ وَّاضِحٌ عَلٰى اَنَّ الْقُوَّةَ وَ الْغَلَبَةَ وَ الشَّوْكَةَ وَ التَّسَلُّطَ الْكَامِلَ الْفَائِقَ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ لَا يُجَاوِزُ هٰذَيْنِ الْقَوْمَيْنِ النَّصَارٰى وَ الْمُسْلِمِيْنَ وَ تَدَاوُلُ الْحُكُوْمَةِ التَّامَّةِ بَيْنَهُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَلَا يَكُوْنُ لِغَيْرِهِمْ حَظًّا مِّنْهَا بَلْ تُضْرَبُ عَلٰى اَعْدَآءِهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَ يَذُوْبُوْنَ يَوْمًا فَيَوْمًا حَتّٰى يَكُوْنُوْا كَالْفَانِيْنَ فَاِذَا كَانَ الْاَمْرُ كَذٰلِكَ فَوَجَبَ اَنْ تَكُوْنَ الْحُكُوْمَةُ وَالْقُوَّةُ مُتَدَاوِلَةٌ بَيْنَ هٰذَيْنِ الْقَوْمَيْنِ اِلَى الدَّوَامِ وَ مَخْصُوْصَةٌ بِهَا فَلَزِمَ بِنَآءً عَلٰى هٰذَا اَنْ يَكُوْنَ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ اِمَّا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ وَ اِمَّا مِنَ الْمُتَنَصِّرِيْنَ وَ لٰكِنَّهُمْ قَوْمٌ مُّفْسِدُوْنَ بَطَّالُوْنَ فَكَيْفَ يَجُوْزُ اَنْ يَكُوْنُوْا مِنْ اَهْلِ الْاِسْلَامِ فَتَقَرَّرَ بِالْقَطْعِ اَنَّهُمْ يَكُوْنُوْنَ مِنَ النَّصَارٰى وَعَلٰى دِيْنِ النَّصَارٰى۔ (حمامة البشریٰ ص۸۸ تا ص۹۰ مترجم)

پاتے حالانکہ زمین کی کُل آبادیاں ظاہر ہو چکی ہیں۔ پس اس باب میں سب روایتیں باطل ہیں۔

(حمامۃ البشریٰ ص۸۰ تا ص۸۲ مترجم)

(ترجمہ) خلاصہ یہ ہے کہ یہ آیت یعنی وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ صریح دلیل ہے کہ روئے زمین پر غلبہ اور قوت و شوکت اور کامل اور اعلیٰ درجہ کا تسلط قوم نصاریٰ اور مسلمانوں سے باہر نہ جاوے گا اور حکومت تامہ قیامت تک انہیں کے ہاتھوں میں پھرے گی اور کسی اَور کو اس سے حصہ نہ ملے گا بلکہ ان کے دشمنوں پر ذلّت اور مسکنت مسلّط کی جاوے گی اور وہ دن بدن پگھلتے جاویں گے یہاں تک کہ فناشدہ قوم کی مانند ہو جاویں گے پس جب آیت کا یہ مطلب ہے تو واجب ہے کہ حکومت اور قوت انہیں دو قوموں میں پھرے اور انہیں سے مختص رہے اور اس بنا پر ضروری ہے کہ یاجوج ماجوج یا تو مسلمانوں سے ہوں یا نصاریٰ سے لیکن یاجوج ماجوج ایک مفسد باطل پرست قوم ہے لہٰذا وہ اہلِ اسلام سے نہیں ہو سکتی۔ پس یقیناً ثابت ہوا کہ وہ قوم نصاریٰ سے ہیں اور دین نصاریٰ پر ہیں ✿

(حمامۃ البشریٰ ص۸۸ تا ص۹۰ مترجم)

---

[1] اٰل عمران آیت ۵۶ ✿

وَاَمَّا الْاٰفَاتُ الَّتِیْ تُقَدِّرُ ظُهُوْرُهَا فِیْ وَقْتِ الْمَسِیْحِ فَمِنْ اَعْظَمِهَا خُرُوْجُ یَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ وَخُرُوْجُ الدَّجَّالِ الْوَقِیْحِ وَهُمْ فِتْنَةٌ لِّلْمُسْلِمِیْنَ عِنْدَ عِصْیَانِهِمْ وَفِرَارِهِمْ مِنَ اللّٰهِ الْوَدُوْدِ وَبَلَآءٌ عَظِیْمٌ سُلِّطَ عَلَیْهِمْ کَمَا سُلِّطَ عَلَی الْیَهُوْدِ وَاعْلَمْ اَنَّ یَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ قَوْمَانِ یَسْتَعْمِلُوْنَ النَّارَ وَاَجِیْجَهٗ فِی الْمُحَارَبَاتِ وَغَیْرِهَا مِنَ الْمَصْنُوْعَاتِ وَلِذٰلِكَ سُمُّوْا بِهٰذَیْنِ الْاِسْمَیْنِ فَاِنَّ الْاَجِیْجَ صِفَةُ النَّارِ وَکَذٰلِكَ یَکُوْنُ حَرْبُهُمْ بِالْمَوَادِ النَّارِیَّاتِ وَیَفُوْقُوْنَ کُلَّ مَنْ فِی الْاَرْضِ بِهٰذَا الطَّرِیْقِ مِنَ الْقِتَالِ وَمِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ[1] وَلَا یَمْنَعُهُمْ بَحْرٌ وَّلَا جَبَلٌ مِّنَ الْجِبَالِ وَیَخِرُّ الْمُلُوْكُ اَمَامَهُمْ خَائِفِیْنَ وَلَا تَبْقٰی لِاَحَدٍ یَدُ الْمُقَاوَمَةِ وَیُدَاسُوْنَ تَحْتَهُمْ اِلَی السَّاعَةِ الْمَوْعُوْدَةِ وَمَنْ دَخَلَ فِیْ هَاتَیْنِ الْحِجَارَتَیْنِ وَلَوْ کَانَ لَهٗ مَمْلَکَةٌ عُظْمٰی فَطُحِنَ کَمَا یُطْحَنُ الْحَبُّ فِی الرَّحٰی وَتُزَلْزَلُ بِهِمَا الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا وَتُحَرَّكُ جِبَالُهَا وَیُشَاعُ ضَلَالُهَا وَلَا یُسْمَعُ دُعَآءٌ وَّلَا یَصِلُ اِلَی الْعَرْشِ بُکَآءٌ وَّیُصِیْبُ الْمُسْلِمِیْنَ مُصِیْبَةٌ تَاْکُلُ اَمْوَالَهُمْ

(ترجمہ از مرتب،) اور وہ آفات جن کا ظہور مسیح موعود کے وقت کے لئے مقدر تھا ان میں سے سب سے بڑی آفت یاجوج وماجوج اور بے شرم دجّال کا خروج ہے اور وہ مسلمانوں کے لئے فتنہ ہیں جبکہ مسلمانوں نے خدا تعالیٰ کی نافرمانی کی اور خدائے ودود سے انحراف کیا۔ اور یہ ایک بڑی بلا ہے جو مسلمانوں پر اس طرح مسلّط کی گئی ہے جس طرح یہود پر مسلّط کی گئی تھی اور جان لو کہ یاجوج اور ماجوج دو ایسی قومیں ہیں جو اپنی لڑائیوں میں نیز مصنوعات میں آگ اور اس کے شعلوں کا استعمال کرتی ہیں اور اسی بنا پر ان دونوں کے یہ نام رکھے گئے ہیں کیونکہ اجیج آگ کی صفت ہے اور اسی طرح ان کی جنگ آتشیں اسلحہ کے ذریعہ ہوتی ہے اور اسی طریق سے وہ تمام زمین والوں پر جنگ میں غالب آرہے ہیں اور وہ ہر بلندی سے پھلانگتے پھرتے ہیں۔ انہیں نہ کوئی سمندر روک رہا ہے اور نہ کوئی پہاڑ۔ بادشاہ ان کے سامنے خوف کے مارے سربسجود ہو جاتے ہیں اور کسی کو ان سے مقابلہ کی طاقت نہیں اور وہ بادشاہ موعود وقت تک ان کے پاؤں تلے روندے جائیں گے۔ اور جو شخص ان دونوں پتھروں کے درمیان آجائے گا خواہ وہ کتنا بڑا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو وہ اس طرح پیسا جائے گا جس طرح دانے چکّی میں پیسے جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے زمین میں زلزلے آتے رہیں گے۔ اس کے پہاڑ حرکت کریں گے اور اس کی گمراہی پھیل جائے گی اور اس وقت کوئی دعا قبول نہ ہوگی اور نہ عرش تک کوئی آہ وفغاں پہنچے گی اور مسلمانوں پر ایسی مصیبت آئے گی جو ان کے اموال،

---

[1] الانبیاء آیت ۹۷

واقبالهم واعراضهم وتهتك استار ملوك الاسلام ويظهر على الناس انهم كانوا مورد غضب الله من العصيان والاجرام وينزع منهم رعبهم واقبالهم وشوكتهم وجلالهم بما كانوا لا يتقون ويبارزون الاعداء من طريق وينهزمون من سبعة طرق بما كانوا لا يحسنون يراءون الناس ولا يتبعون رسول الله وسنته ولا يتدينون وان هم الا كالصور ليس الروح فيهم فلا ينظر اليهم الله بالرحمة ولا هم ينصرون وكان الله يريد ان يتوب عليهم ان كانوا يتضرعون فما تابوا وما تضرعوا فنزل على المجرمين وبالهم الا الذين يخشعون ويرون ايام المصائب ولياليها كما راى الملعونون فعند ذلك يقوم المسيح امام ربه الجليل ويدعوه في الليل الطويل بالصراخ والعويل ويذوب ذوبان الثلج على النار ويبتهل لمصيبة نزلت على الديار ويذكر الله بدموع جارية وعبرات متحدرة فيسمع دعاءه لمقام له عند ربه وتنزل ملائكة الايواء فيفعل الله ما يفعل وينجي الناس من الوباء فهناك يعرف المسيح في

اقبال اور عزتوں کو کھا جائے گی اور اسلامی بادشاہوں کے پردے پھاڑ دے گی اور لوگوں پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی اور جرم کرنے کی وجہ سے اس کے غضب کے مورد ہیں اور ان کا رعب، شوکت اور جلال ان سے چھن جائے گا کیونکہ وہ تقویٰ اختیار نہیں کرتے۔ اگر وہ دشمنوں کا ایک طریق سے مقابلہ کریں گے تو سات طریقوں سے ان کے مقابلہ میں شکست کھائیں گے کیونکہ وہ نیکوکار نہ تھے وہ صرف لوگوں کے دکھاوے کی خاطر کام کرتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی سُنّت کی پیروی نہیں کرتے تھے اور نہ دینداری اختیار کرتے تھے۔ اور وہ محض ڈھانچے ہیں جن میں کوئی رُوح نہیں پس اللہ تعالیٰ ان کی طرف رحمت کی نگاہ سے نہ دیکھے گا اور نہ وہ مدد دئے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ تو ان پر رجوع برحمت ہونا چاہے گا بشرطیکہ وہ تضرّع اختیار کریں مگر نہ انہوں نے توبہ کی اور نہ تضرّع اختیار کیا پس ان مجرموں پر وبال وارد ہوا سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے خشوع و خضوع اختیار کیا اور وہ مجرمین ملعونوں کی طرح شب و روز مصائب کو دیکھیں گے تب اس وقت مسیح موعود اپنے ربّ جلیل کے حضور کھڑا ہوگا اور رات بھر آہ و بکا کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے گا اور اسی طرح پگھل جائے گا جس طرح آگ پر برف پگھل جاتی ہے اور اس مصیبت کی وجہ سے جو ملک پر نازل ہو چکی ہوگی گریہ وزاری کرے گا اور اللہ تعالیٰ کو بہتے ہوئے اشکوں سے یاد کرے گا تب اس کی دعا سُنی جائے گی اس کے بلند مقام کی وجہ سے جو اسے اپنے ربّ کے حضور حاصل ہے اور پناہ دینے والے فرشتے نازل ہوں گے اور اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کی تجلّی کرے گا اور لوگوں کو مصیبت سے نجات دے گا تب اس وقت مسیح موعود کو زمین پر بھی اسی طرح پہچانا جائے گا جس طرح

الْاَرْضِ کَمَا عُرِفَ فِی السَّمَآءِ وَیُوْضَعُ لَهٗ الْقَبُوْلُ فِیْ قُلُوْبِ الْعَامَّةِ وَالْاُمَرَآءِ حَتّٰی یَتَبَرَّكَ الْمُلُوْكُ بِثِیَابِهٖ وَھٰذَا کُلُّهٗ مِنَ اللّٰهِ وَجَنَابِهٖ وَفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ عَجِیْبٌ۔

(حاشیہ متعلقہ خطبہ الہامیہ ص۳۲)

وَتَرَکْنَا بَعْضَھُمْ یَوْمَئِذٍ یَّمُوْجُ فِیْ بَعْضٍ.... وَالْمُرَادُ مِنْ قَوْلِهٖ بَعْضَھُمْ یَوْمَئِذٍ یَّمُوْجُ فِیْ بَعْضٍ اَنَّ نَارَ الْخُصُوْمَاتِ تَسْتَوْقِدُ فِیْ ذَالِكَ الزَّمَانِ فِیْ کُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْ فِرَقِ اَھْلِ الْاَدْیَانِ وَیُنْفِقُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّةَ کَالْجِبَالِ لِتَکْذِیْبِ الْاِسْلَامِ وَالْاِبْطَالِ وَارْتِدَادِ الْمُسْلِمِیْنَ وَیُؤَلِّفُوْنَ کُتُبًا مَّمْلُوْءَةً مِّنَ التَّوْھِیْنِ وَقَدْ اَشَارَ اللّٰهُ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنَ الْمَقَامِ اَنَّ تِلْكَ الْاَیَّامَ اَیَّامُ الْغُرْبَةِ لِلْاِسْلَامِ وَھُنَاكَ یَکُوْنُ الْمُسْلِمُوْنَ کَالْمَحْصُوْرِیْنَ وَتَھُبُّ عَلَیْھِمْ عَوَاصِفُ التَّفْرِقَةِ فَیَکُوْنُوْنَ کَعِھْنِیْنَ فَاَمَّا قَوْلُهٗ بَعْضَھُمْ یَوْمَئِذٍ یَّمُوْجُ فِیْ بَعْضٍ فَیُرِیْدُ مِنْهُ اَنَّ فِرْقَةً تَاْکُلُ فِرْقَةً اُخْرٰی وَتَعْلُوْا یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَتَسْمَعُوْنَ اَخْبَارَ خُرُوْجِھِمْ فِی الْاَرْضِیْنَ وَفِیْ تِلْكَ الْاَیَّامِ لَا یَکُوْنُ الْاِسْلَامُ اِلَّا کَعَجُوْزَةٍ وَّلَا یَبْقٰی لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا مِنْ عِزَّةٍ وَّتُصِیْبُهٗ ذِلَّةٌ عَلٰی ذِلَّةٍ وَّکَادَ اَنْ یُّقْبَرَ مِنْ غَیْرِ التَّجْھِیْزِ وَالتَّکْفِیْنِ وَتُصَبُّ عَلَیْهِ مَصَائِبُ مَاسَمِعَتْ اُذُنٌ مِّثْلَھَا

وہ آسمان پر پہچانا گیا اور اس وقت اسے عوام اور امراء کے دلوں میں قبولیت حاصل ہوگی یہاں تک کہ بادشاہ اس کے کپڑوں سے برکت ڈھونڈیں گے اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ اور اس کی جناب سے ہوگا اور لوگوں کی نگاہ میں عجیب ؛

بَعْضَھُمْ یَوْمَئِذٍ یَّمُوْجُ فِیْ بَعْضٍ سے یہ مراد ہے کہ اس زمانہ میں تمام فرقوں میں جنگ کی آگ بھڑک اُٹھے گی اور پہاڑوں برابر سونا چاندی اسلام کے نابود کرنے کے لئے اور مسلمانوں کو اسلام کے دائرہ سے نکالنے کے لئے خرچ کریں گے اور اسلام کی توہین سے بھری ہوئی کتابیں تالیف کی جائیں گی اور بہت سے مقاموں میں خدا تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے کہ وہ دن اسلام کی غربت کے ہوں گے اور مسلمان اس زمانہ میں قیدیوں کی طرح زندگی بسر کریں گے اور تفرقہ اور پراگندگی کی ہوائیں اُن کے سر پر چلیں گی پس وہ بکھر جائیں گے اور پراگندہ ہو جائیں گے اور بَعْضَھُمْ یَوْمَئِذٍ یَّمُوْجُ فِیْ بَعْضٍ سے مراد یہ ہے کہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو کھا جائے گا اور یاجوج ماجوج سربلندی پائیں گے اور تمام سطح زمین پر اُن کے نکلنے کی خبریں سُننے میں آئیں گی اور اُن دنوں میں اسلام بوڑھی عورت کی طرح ہوگا اور اس میں کسی طرح کی قوت اور عزت نہیں رہے گی اور ذلت پر ذلت اس کو پہنچے گی اور قریب ہوگا کہ بغیر تجہیز و تکفین کے زمین میں گاڑ دیا جائے اور ایسی مصیبتیں اس کے سر پر پڑیں گی

مِنْ قَبْلُ وَ يَخْرُجُ مِنَ الدِّيْنِ أَفْوَاجٌ مِّنَ الْجَاهِلِيْنَ لَاعِنِيْنَ وَ مُحَقِّرِيْنَ وَمُكَذِّبِيْنَ وَتُقَلَّبُ الْأُمُوْرُ كُلُّهَا وَ تَنْزِلُ الْمَصَائِبُ عَلَى الشَّرِيْعَةِ وَ أَهْلِهَا وَيُرَدُّ قَمَرُهَا كَعُرْجُوْنٍ قَدِيْمٍ فِيْ أَعْيُنِ النَّاظِرِيْنَ وَهٰذِهٖ ذِلَّةٌ مَّا أَصَابَتِ الْمِلَّةَ مِنْ قَبْلُ وَ لَنْ تُصِيْبَ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ فَعِنْدَ ذَالِكَ تَنْزِلُ النُّصْرَةُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَعَالِمُ الْعِزَّةِ مِنْ حَضْرَةِ الْكِبْرِيَاءِ مِنْ غَيْرِ سَيْفٍ وَّ سِنَانٍ وَّ مُحَارِبِيْنَ وَ إِلَيْهِ إِشَارَةٌ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا وَّهُوَ مُرَادٌ مِّنْ بَعْثِ الْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ يَا مَعْشَرَ الْعَاقِلِيْنَ۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۸۶-۱۹۰)

قَدْ وَعَدَ اللّٰهُ عِنْدَ الْفِتْنَةِ الْعُظْمٰى فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ وَالْبَلِيَّةِ الْكُبْرٰى قَبْلَ يَوْمِ الدَّيَّانِ أَنَّهٗ يَنْصُرُ دِيْنَهٗ مِنْ عِنْدِهٖ فِيْ تِلْكَ الْأَيَّامِ وَهُنَاكَ يَكُوْنُ الْإِسْلَامُ كَالْبَدْرِ التَّامِّ وَإِلَيْهِ أَشَارَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ فِيْ قَوْلِهٖ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا وَقَدْ أَخْبَرَ فِيْ اٰيَةٍ هِيَ قَبْلَ هٰذِهِ الْاٰيَةِ مِنْ تَفْرِقَةٍ عَظِيْمَةٍ بِقَوْلِهٖ تَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ ثُمَّ بَشَّرَ بِقَوْلِهٖ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ بِجَمْعٍ بَعْدَ التَّفْرِقَةِ فَلَا يَكُوْنُ هٰذَا الْجَمْعُ إِلَّا فِيْ مِائَةِ الْبَدْرِ لِيَدُلَّ الصُّوْرَةُ عَلٰى مَعْنَاهَا كَمَا كَانَتِ النُّصْرَةُ الْأُوْلٰى بِبَدْرٍ فَهَاتَانِ بِشَارَتَانِ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَ تَبْرُقَانِ كَدُرَّةٍ فِي الْكِتَابِ

کہ پہلے زمانہ میں کسی کان نے اس جیسا نہ سُنا ہوگا اور دین میں سے گروہ در گروہ جاہل لوگ لعنت کرتے ہوئے اور تکذیب کرتے ہوئے نکل جائیں گے اور تمام امور زیر و زبر کئے جائیں گے اور شریعت اور شریعت والوں پر رنج اور مصیبتیں اُتریں گی اور اس کا چاند دیکھنے والوں کی نظر میں پرانی ٹہنی کی طرح نظر آئے گا اور یہ وہ ذلّت ہے کہ اس سے پہلے ملّت کو نہیں پہنچی اور قیامت تک نہیں پہنچے گی۔ جب اس حد تک معاملہ پہنچ جاوے گا تب آسمان سے نصرت اور خدا تعالیٰ کی طرف سے بغیر تلوار اور بغیر نیزے اور لڑنے والوں کے عزّت کے نشان اُتریں گے اور اسی کی طرف خدا تعالیٰ کے اس قول میں اشارہ ہے وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ آخر آیت تک۔ اے عقلمندوں کے گروہ یہ مسیح موعود کی بعثت سے مراد ہے۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۸۶-۱۹۰)

خدا نے وعدہ فرمایا ہے کہ جب کہ آخر زمانہ میں بڑا بھاری فتنہ اور بلا قیامت سے پہلے ظاہر ہوگی اُن دنوں میں اپنی طرف سے اپنے دین کی مدد اور تائید فرمائے گا اور اُس زمانہ میں اسلام بدر کامل کی طرح ہو جائے گا اور اسی کی طرف اشارہ ہے اس قول میں وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا۔ اور اس آیت سے ایک بڑے تفرقہ کی خبر دی جہاں کہ فرمایا ہے وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ الخ پھر نُفِخَ فِي الصُّوْرِ الخ کے قول سے بشارت دی کہ اس پراگندگی کے بعد جمعیت حاصل ہوگی۔ پس یہ جمعیت حاصل نہ ہوگی مگر بدر کی صدی میں تاکہ صورت اپنے معنے پر دلالت کرے جیسا کہ پہلی نصرت بدر میں وقوع میں آئی۔ پس یہ دو خوشخبریاں مومنوں کے لئے ہیں اور موتی کی طرح کتاب مبین میں

الْمُبِيْنِ۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۹۲-۱۹۳)

قَدْ اَشَارَ اللّٰہُ فِیْ اٰیَاتٍ بَعْدَ ھٰذِہِ الْاٰیَةِ مِنْ غَیْرِ فَصْلٍ اِلٰی اَنَّ یَاْجُوْجَ مَاْجُوْجَ ھُمُ النَّصَارٰی اَلَا تَرٰی قَوْلَہٗ اَفَحَسِبَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنْ یَّتَّخِذُوْا عِبَادِیْ مِنْ دُوْنِیْٓ اَوْلِیَآءَ[1] وَکَذَالِکَ قَوْلُہٗ قُلْ ھَلْ نُنَبِّئُکُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُھُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَھُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا[2] وَکَذَالِکَ قَوْلُہٗ قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ[3] وَلَا شَکَّ اَنَّ النَّصَارٰی قَوْمٌ اتَّخَذُوا الْمَسِیْحَ مَعْبُوْدًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَتَمَایَلُوْا عَلَی الدُّنْیَا وَسَبَقُوْا غَیْرَھُمْ فِیْ اِیْجَادِ صَنَایِعِھَا وَقَالُوْٓا اِنَّ الْمَسِیْحَ ھُوَ کَلِمَةُ اللّٰہِ وَالْمَخْلُوْقُ کُلُّہٗ مِنْ ھٰذِہِ الْکَلِمَةِ فَھٰذِہِ الْاٰیَاتُ رَدٌّ عَلَیْھِمْ۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۸۶ حاشیہ)

ایک قوم بنانے کا ذکر قرآن شریف کی سورہ کہف میں موجود ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَتَرَکْنَا بَعْضَھُمْ یَوْمَئِذٍ یَّمُوْجُ فِیْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰھُمْ جَمْعًا یعنی ہم آخری زمانہ میں ہر ایک قوم کو آزادی دینگے تا اپنے مذہب کی خوبی دوسری قوم کے سامنے پیش کرے اور دوسری قوم کے مذہبی عقائد اور تعلیم پر حملہ کرے اور ایک مدّت تک ایسا ہوتا رہے گا۔ پھر قرنا میں ایک آواز پھونک دی جائے گی تب ہم تمام قوموں کو ایک قوم بنا دیں گے اور ایک ہی مذہب پر جمع کر دیں گے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۸۲ حاشیہ)

وَتَرَکْنَا بَعْضَھُمْ یَوْمَئِذٍ یَّمُوْجُ فِیْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰھُمْ جَمْعًا یعنی ان آخری دنوں

چمکتی ہیں۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۹۲-۱۹۳)

(ترجمہ از مرتب) اس آیت کے معًا بعد جو آیات ہیں ان میں اللہ تعالیٰ نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ یاجوج اور ماجوج نصارٰی ہی ہیں جیسے اَفَحَسِبَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنْ یَّتَّخِذُوْا عِبَادِیْ مِنْ دُوْنِیْٓ اَوْلِیَآءَ اور قُلْ ھَلْ نُنَبِّئُکُمْ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِیْنَ ضَلَّ سَعْیُھُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَھُمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا اور قُلْ لَّوْ کَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّکَلِمٰتِ رَبِّیْ الخ اور اس میں شک نہیں کہ نصارٰی کی قوم نے ہی مسیح علیہ السلام کو خدا کے سوا معبود بنایا ہے اور وہ دُنیا کی طرف مائل ہیں اور نت نئی ایجادیں کرنے میں دوسروں پر سبقت لے گئے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسیح ہی کلمۃ اللہ ہے اور باقی سب مخلوق اسی کلمہ سے ہے۔ یہ آیات ان کے ان خیالات کا رد کرتی ہیں۔

---

[1] الکہف آیت ۱۰۳۔ [2] الکہف آیت ۱۰۴، ۱۰۵۔ [3] الکہف آیت ۱۱۰۔

میں جو یاجوج ماجوج کا زمانہ ہوگا دُنیا کے لوگ مذہبی جھگڑوں اور لڑائیوں میں مشغول ہو جائیں گے اور ایک قوم دوسری قوم پر مذہبی رنگ میں ایسے حملے کرے گی جیسے ایک موج دریا دوسری موج پر پڑتی ہے اور دوسری لڑائیاں بھی ہوں گی اور اس طرح پر دُنیا میں بڑا تفرقہ پھیل جائے گا اور بڑی پھوٹ اور بغض اور کینہ لوگوں میں پیدا ہو جائے گا اور جب یہ باتیں کمال کو پہنچ جائیں گی تب خدا آسمان سے اپنی قرنا میں آواز پھونک دے گا یعنی مسیح موعود کے ذریعہ سے جو اس کی قرنا ہے ایک ایسی آواز دُنیا کو پہنچائے گا جو اس آواز کے سُننے سے سعادت مند لوگ ایک ہی مذہب پر اکٹھے ہو جائیں گے اور تفرقہ دُور ہو جائے گا اور مختلف قومیں دُنیا کی ایک ہی قوم بن جائیں گی۔

اور پھر دوسری آیت میں فرمایا وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا[1] اور اس دن جو لوگ مسیح موعود کی دعوت کو قبول نہیں کریں گے ان کے سامنے ہم جہنم کو پیش کریں گے یعنی طرح طرح کے عذاب نازل کریں گے جو جہنم کا نمونہ ہوں گے اور پھر فرمایا الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا[2] یعنی وہ ایسے لوگ ہوں گے کہ مسیح موعود کی دعوت اور تبلیغ سے ان کی آنکھیں پردہ میں رہیں گی اور وہ اس کی باتوں کو سُن بھی نہیں سکیں گے اور سخت بیزار ہوں گے اِس لئے عذاب نازل ہوگا۔ اس جگہ صُور کے لفظ سے مراد مسیح موعود ہے کیونکہ خدا کے نبی اسی کی صُور ہوتے ہیں یعنی قرنا جن کے دلوں میں وہ اپنی آواز پھونکتا ہے۔ یہی محاورہ پہلی کتابوں میں بھی آیا ہے کہ خدا کے نبیوں کو خدا کی قرنا قرار دیا گیا ہے یعنی جس طرح قرنا بجانے والا قرنا میں اپنی آواز پھونکتا ہے اسی طرح خدا ان کے دلوں میں آواز پھونکتا ہے اور یاجوج ماجوج کے قرینہ سے قطعی طور سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ قرنا مسیح موعود ہے کیونکہ احادیث صحیحہ سے یہ امر ثابت شدہ ہے کہ یاجوج ماجوج کے زمانہ میں ظاہر ہونے والا مسیح موعود ہی ہوگا۔

اب خلاصہ کلام یہ ہے کہ جب کہ ایک طرف بائبل سے یہ امر ثابت شدہ ہے کہ یورپ کے عیسائی فرقے ہی یاجوج ماجوج ہیں اور دوسری طرف قرآن شریف نے یاجوج ماجوج کی وہ علامتیں مقرر کی ہیں جو صرف یورپ کی سلطنتوں پر ہی صادق آتی ہیں جیسا کہ یہ لکھا ہے کہ وہ ہر ایک بلندی پر سے دوڑیں گے یعنی سب طاقتوں پر غالب ہو جائیں گے اور ہر ایک پہلو سے دُنیا کا عروج اُن کو مل جائے گا اور حدیثوں میں بھی یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ کسی سلطنت کو اُن کے ساتھ تاب مقابلہ نہیں ہوگی۔ پس یہ تو قطعی فیصلہ ہو چکا ہے کہ یہی قومیں یاجوج ماجوج ہیں اور اس سے انکار کرنا سراسر تحکم اور خدا تعالیٰ کے فرمودہ کی مخالفت ہے۔ اس میں کس کو کلام ہو سکتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے قول کے مطابق اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ کے موافق یہی قومیں ہیں جو اپنی دنیوی طاقت میں تمام قوموں پر فوقیت لے گئی

---

[1] الکھف آیت ۱۰۱ ۔ [2] الکھف آیت ۱۰۲ ۔

ہیں جنگ اور لڑائی کے داؤ پیچ اور ملکی تدابیر کے امور میں دنیا میں ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا اور انہیں کی کلوں اور ایجادوں نے کیا لڑائیوں میں اور کیا کسی قسم کے دُنیا کے آرام کے سامانوں میں ایک نیا نقشہ دُنیا کا ظاہر کر دیا ہے اور انسان کی تمدنی حالت کو ایک حیرت انگیز انقلاب میں ڈال دیا ہے اور تدبیر اور سیاست اور درستی سامان رزم بزم میں وہ یدِطولیٰ دکھلایا ہے کہ جب سے دُنیا پیدا ہوئی ہے کسی زمانہ میں اس کی نظیر نہیں پائی جاتی۔ پس خدا کے بزرگ نبی کی پیشگوئی سے صدہا سال بعد جو واقعہ اُس پیشگوئی کی مقرر کردہ علامتوں کے موافق ظہور میں آیا ہے وہ یہی واقعہ یورپین طاقتوں کا ہے سو جس طور سے خدا نے یاجوج ماجوج کے معنی ظاہر کر دئے اور جس قوم کو موجودہ واقعہ نے اُن علامات کا مصداق ٹھہرا دیا اس کو قبول نہ کرنا ایک کُھلے کُھلے حق سے انکار کرنا ہے۔ یوں تو انسان جب انکار پہ اصرار کرے تو اس کا مُنہ کون بند کر سکتا ہے لیکن ایک مُنصف مزاج آدمی جو طالبِ حق ہے وہ ان تمام امور پر اطلاع پا کر پورے اطمینان اور ثلجِ صدر سے گواہی دے گا کہ بلاشبہ یہی قومیں یاجوج ماجوج ہیں۔

اور جب یہ ثابت ہوا کہ یہی قومیں یاجوج ماجوج ہیں تو خود یہ ثابت شدہ امر ہے کہ مسیح موعود یاجوج ماجوج کے وقت میں ظاہر ہو گا جیسا کہ قرآن شریف نے بھی یاجوج ماجوج کے غلبہ اور طاقت کے ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا یعنی یاجوج ماجوج کے زمانہ میں بڑا تفرقہ اور پھوٹ لوگوں میں پڑ جائے گی اور ایک مذہب دوسرے مذہب پر اور ایک قوم دوسری قوم پر حملہ کرے گی تب ان دنوں میں خدا تعالیٰ اس پھوٹ کے دُور کرنے کے لئے آسمان سے بغیر انسانی ہاتھوں کے اور محض آسمانی نشانوں سے اپنے کسی مرسل کے ذریعہ جو صُور یعنی قرنا کا حکم رکھتا ہو گا اپنی پُرہیبت آواز لوگوں تک پہنچائے گا جس میں ایک بڑی کشش ہو گی اور اس طرح پر خدا تعالیٰ تمام متفرق لوگوں کو ایک مذہب پر جمع کر دے گا۔

اور احادیث صحیحہ صاف اور صریح لفظوں میں بتلا رہی ہیں کہ یاجوج ماجوج کا زمانہ مسیح موعود کا زمانہ ہے جیسا کہ لکھا ہے کہ جب قوم یاجوج ماجوج اپنی قوت اور طاقت کے ساتھ تمام قوموں پر غالب آجائے گی اور اُن کے ساتھ کسی کو تاب مقابلہ نہیں رہے گی تب مسیح موعود کو حکم ہو گا کہ اپنی جماعت کو کوہِ طُور کی پناہ میں لے آوے یعنی آسمانی نشانوں کے ساتھ اُن کا مقابلہ کرے اور خدا کی زبردست اور ہیبت ناک عجائبات سے مدد لے ان نشانوں کی مانند جو بنی اسرائیل کی سرکش قوم کے ڈرانے کے لئے کوہِ طور میں دکھلائے گئے تھے جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ[1] یعنی کوہِ طُور میں نشان کے طریق پر بڑے بڑے زلزلے آئے اور خدا نے طُور کے

---

[1] البقرہ آیت ۶۴

پہاڑ کو یہود کے سروں پر اس طرح پر لرزاں کر کے دکھلایا کہ گویا اب وہ ان کے سروں پر پڑتا ہے تب وہ اس ہیبت ناک نشان کو دیکھ کر بہت ڈر گئے اسی طرح مسیح موعود کے زمانہ میں بھی ہوگا۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۷۵-۸۱)

کون شخص اِس سے انکار کر سکتا ہے کہ ابتدائے زمانہ کے بعد دُنیا پر بڑے بڑے انقلاب آئے پہلے زمانہ کے لوگ تھوڑے تھے اور زمین کے چھوٹے سے قطعہ پر آباد تھے اور پھر وہ زمین کے دُور دُور کناروں تک پھیل گئے اور زبانیں بھی مختلف ہو گئیں اور اس قدر آبادی بڑھی کہ ایک ملک دوسرے ملک سے ایک علیحدہ دُنیا کی طرح ہو گیا تو ایسی صورت میں کیا ضرور نہ تھا کہ خدا تعالیٰ ہر ایک ملک کے لئے الگ الگ نبی اور رسول بھیجتا اور کسی ایک کتاب پر کفایت نہ رکھتا۔ ہاں جب دُنیا نے پھر اتحاد اور اجتماع کے لئے پلٹا کھایا اور ایک ملک کو دوسرے ملک سے ملاقات کرنے کے لئے سامان پیدا ہو گئے اور باہمی تعارف کے لئے انواع و اقسام کے ذرایع اور وسایل نکل آئے تب وہ وقت آگیا کہ قومی تفرقہ درمیان سے اُٹھا دیا جائے اور ایک کتاب کے ماتحت سب کو کیا جائے تب خدا نے سب دُنیا کے لئے ایک ہی نبی بھیجا تا وہ سب قوموں کو ایک ہی مذہب پر جمع کرے اور تا وہ جیسا کہ ابتداء میں ایک قوم تھی آخر میں بھی ایک ہی قوم بنا دے۔

اور یہ ہمارا بیان جیسا کہ واقعات کے موافق ہے ایسا ہی خدا تعالیٰ کے اُس قانونِ قدرت کے موافق ہے جو زمین و آسمان میں پایا جاتا ہے کیونکہ اگرچہ اُس نے زمین کو الگ تاثیرات بخشی ہیں اور چاند کو الگ اور ہر ایک ستارہ میں جدا جدا قوتیں رکھی ہیں مگر پھر بھی باوجود اس تفرقہ کے سب کو ایک ہی نظام میں داخل کر دیا ہے اور تمام نظام کا پیشرو آفتاب کو بنایا ہے جس نے اِن تمام سیاروں کو انجن کی طرح اپنے پیچھے لگا لیا ہے پس اِس سے غور کرنے والی طبیعت سمجھ سکتی ہے کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ کی ذات میں وحدت ہے ایسا ہی وہ نوعِ انسان میں بھی جو ہمیشہ کی بندگی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں وحدت کو ہی چاہتا ہے اور درمیانی تفرقہ قوموں کا جو باعث کثرتِ نسلِ انسانی نوعِ انسان میں پیدا ہوا وہ بھی دراصل کامل وحدت پیدا کرنے کے لئے ایک تمہید تھی کیونکہ خدا نے یہی چاہا کہ پہلے نوعِ انسان میں وحدت کے مختلف حصّے قائم کر کے پھر ایک کامل وحدت کے دائرہ کے اندر سب کو لے آوے سو خدا نے قوموں کے جدا جدا گروہ مقرر کئے اور ہر ایک قوم میں ایک وحدت پیدا کی اور اس میں یہ حکمت تھی کہ تا قوموں کے تعارف میں سہولت اور آسانی پیدا ہو اور ان کے باہمی تعلقات پیدا ہونے میں کچھ دِقت نہ ہو۔ اور پھر جب قوموں کے چھوٹے چھوٹے حصّوں میں تعارف پیدا ہو گیا تو پھر خدا نے چاہا کہ سب قوموں کو ایک قوم بنا دے جیسے مثلاً ایک شخص باغ لگاتا ہے اور باغ کے مختلف بُوٹوں کو مختلف تختوں پر تقسیم کرتا ہے اور پھر اس کے بعد تمام باغ کے اردگرد دیوار کھینچ کر سب درختوں کو ایک ہی دائرہ کے اندر کر لیتا ہے اِسی کی طرف قرآن شریف نے اشارہ فرمایا ہے اور وہ یہ آیت ہے اِنَّ ھٰذِہٖۤ اُمَّتُکُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً ۫ۖ وَّ اَنَا رَبُّکُمۡ فَاعۡبُدُوۡنِ[1]

---

[1] الانبیاء آیت ۹۳

یعنی اے دُنیا کے مختلف حصّوں کے نبیو! یہ مسلمان جو مختلف قوموں میں سے اس دنیا میں اکٹھے ہوئے ہیں یہ تم سب کی ایک امت ہے جو سب پر ایمان لاتے ہیں اور مَیں تمہارا خدا ہوں سو تم سب مل کر میری ہی عبادت کرو۔ اِس تدریجی وحدت کی مثال ایسی ہے جیسے خدا تعالیٰ نے حکم دیا کہ ہر ایک محلہ کے لوگ اپنی اپنی محلہ کی مسجدوں میں پانچ وقت جمع ہوں اور پھر حکم دیا کہ تمام شہر کے لوگ ساتویں دن شہر کی جامع مسجد میں جمع ہوں یعنی ایسی وسیع مسجد میں جس میں سب کی گنجایش ہو سکے اور پھر حکم دیا کہ سال کے بعد عیدگاہ میں تمام شہر کے لوگ اور نیز گردو نواح دیہات کے لوگ ایک جگہ جمع ہوں اور پھر حکم دیا کہ عمر بھر میں ایک دفعہ تمام دُنیا ایک جگہ جمع ہو یعنی مکّہ معظمہ میں۔ سو جیسے خدا نے آہستہ آہستہ امت کے اجتماع کو حج کے موقع پر کمال تک پہنچایا۔ اوّل چھوٹے چھوٹے موقعے اجتماع کے مقرر کئے اور بعد میں تمام دُنیا کو ایک جگہ جمع ہونے کا موقع دیا سو یہی سُنّت اللہ الہامی کتابوں میں ہے اور اس میں خدا تعالیٰ نے یہی چاہا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ نوع انسان کی وحدت کا دائرہ کمال تک پہنچا دے۔ اوّل تھوڑے تھوڑے ملکوں کے حصّوں میں وحدت پیدا کرے اور پھر آخر میں حج کے اجتماع کی طرح سب کو ایک جگہ جمع کر دیوے جیسا کہ اس کا وعدہ قرآن شریف میں ہے وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا یعنی آخری زمانہ میں خدا اپنی آواز سے تمام سعید لوگوں کو ایک مذہب پر جمع کر دے گا جیسا کہ وہ ابتداء میں ایک مذہب پر جمع تھے تاکہ اوّل اور آخر میں مناسبت پیدا ہو جائے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۳۶-۱۳۸)

یہ آیت سورہ کہف میں یاجوج ماجوج کے ذکر میں ہے۔ کتب سابقہ میں جو بنی اسرائیلی نبیوں پر نازل ہوئی تھیں صاف اور صریح طور پر معلوم ہوتا ہے بلکہ نام لے کر بیان کیا ہے کہ یاجوج ماجوج سے مراد یورپ کے عیسائی قومیں ہیں اور یہ بیان ایسی صراحت سے ان کتابوں میں موجود ہے کہ کسی طرح اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اور یہ کہنا کہ وہ کتابیں محرف مبدّل ہیں اُن کا بیان قابلِ اعتبار نہیں۔ ایسی بات وہی کہے گا جو خود قرآن شریف سے بے خبر ہے کیونکہ اللہ جلّ شانہٗ مومنوں کو قرآن شریف میں فرماتا ہے فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ[1] یعنی فلاں فلاں باتیں اہلِ کتاب سے پوچھ لو اگر تم بے خبر ہو۔ پس ظاہر ہے کہ اگر ہر ایک بات میں پہلی کتابوں کی گواہی ناجایز ہوتی تو خدا تعالیٰ کیوں مومنوں کو فرماتا کہ اگر تمہیں معلوم نہیں تو اہلِ کتاب سے پوچھ لو۔ بلکہ اگر نبیوں کی کتابوں سے کچھ فائدہ اٹھانا حرام ہے تو اس صورت میں یہ بھی ناجایز ہوگا کہ ان کتابوں میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بطور استدلال پیشگوئیاں پیش کریں حالانکہ خود صحابہ رضی اللہ عنہم اور بعد اُن کے تابعین بھی اُن پیشگوئیوں کو بطور حجّت پیش کرتے رہے ہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ کتب سابقہ کے بیان تین قسم کے ہیں۔

---

[1] الانبیاء آیت ۸

(۱) ایک تو وہ باتیں ہیں جو واجب التصدیق ہیں جیسا کہ خدا کی توحید اور ملایک کا ذکر اور بہشت و دوزخ کے وجود کی نسبت بیان اگر ان کا انکار کریں تو ایمان جائے۔

(۲) دوسری وہ باتیں ہیں جو رد کرنے کے لائق ہیں جیسا کہ وہ تمام امور جو قرآن شریف کے مخالف ہیں۔

(۳) تیسری قسم کی وہ باتیں ہیں جو قرآن شریف میں اگرچہ ان کا ذکر مفصل نہیں مگر وہ باتیں قرآن شریف کے مخالف نہیں بلکہ اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو بالکل مطابق ہیں جیسے مثلاً یاجوج ماجوج کی قوم کہ اجمالی طور پر اُن کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے بلکہ یہ ذکر بھی موجود ہے کہ آخری زمانہ میں تمام زمین پر اُن کا غلبہ ہو جائے گا جیساکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ[۱] اور یہ خیال کہ یاجوج ماجوج بنی آدم نہیں بلکہ اَور قسم کی مخلوق ہے یہ صرف جہالت کا خیال ہے کیونکہ قرآن میں ذو العقول حیوان جو عقل اور فہم سے کام لیتے ہیں اور مورد ثواب یا عذاب ہو سکتے ہیں وہ دو ہی قسم کے بیان فرمائے ہیں (۱) ایک نوع انسان جو حضرت آدم کی اولاد ہیں (۲) دوسرے وہ جو جنّات ہیں۔ انسانوں کے گروہ کا نام معشر الانس رکھا ہے اور جنّات کے گروہ کا نام معشر الجن رکھا ہے۔ پس اگر یاجوج ماجوج جن کے لئے مسیح موعود کے زمانہ میں عذاب کا وعدہ ہے معشر الانس میں داخل ہیں یعنی انسان ہیں تو خواہ نخواہ ایک عجیب پیدائش ان کی طرف منسوب کرنا کہ ان کے کان اس قدر لمبے ہوں گے اور ہاتھ اس قدر لمبے ہوں گے اور اس کثرت سے وہ بچے دیں گے اُن لوگوں کا کام ہے جن کی عقل محض سطحی اور بچوں کی مانند ہے۔ اگر اس بارے میں کوئی حدیث صحیح ثابت بھی ہو تو وہ محض استعارہ کے رنگ میں ہو گی جیساکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کی قومیں ان معنوں سے ضرور لمبے کان رکھتی ہیں کہ بذریعہ تار کے دُور دُور کی خبریں اُن کے کانوں تک پہنچ جاتی ہیں اور خدا نے برّی اور بحری لڑائیوں میں اُن کے ہاتھ بھی نبرد آزمائی کی وجہ سے اس قدر لمبے بنائے ہیں کہ کسی کو اُن کے مقابلہ کی طاقت نہیں اور توالد تناسل بھی ان کا ایشیائی قوموں کی نسبت بہت ہی زیادہ ہے۔ پس جبکہ موجودہ واقعات نے دکھلا دیا ہے کہ اُن احادیث کے یہ معنی ہیں اور عقل ان معنوں کو نہ صرف قبول کرتی بلکہ اُن سے لذت اُٹھاتی ہے تو پھر کیا ضرورت ہے کہ خواہ نخواہ انسانی خلقت سے بڑھ کر ان میں وہ عجیب خلقت فرض کی جائے جو سراسر غیر معقول اور اس قانون قدرت کے برخلاف ہے جو قدیم سے انسانوں کے لئے چلا آتا ہے اور اگر کہو کہ یاجوج ماجوج جنّات میں سے ہیں انسان نہیں ہیں تو یہ اَور حماقت ہے کیونکہ اگر وہ جنّات میں سے ہیں تو سدِ سکندری اُن کو کیونکر روک سکتی تھی جس حالت میں جنّات آسمان تک پہنچ جاتے ہیں جیساکہ آیت فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ[۲] سے ظاہر ہوتا ہے تو کیا وہ سدِ سکندری کے اُوپر چڑھ نہیں سکتے تھے جو آسمان کے قریب چلے

---

[۱] الانبیاء آیت ۹۷ ۔ [۲] الصّٰفّٰت آیت ۱۱ ۔

جاتے ہیں اور اگر کہو کہ وہ درندوں کی قسم ہیں جو عقل اور فہم نہیں رکھتے تو پھر قرآن شریف اور حدیثوں میں ان پر عذاب نازل کرنے کا کیوں وعدہ ہے کیونکہ عذاب گنہ کی پاداش میں ہوتا ہے اور نیز ان کا لڑائیاں کرنا اور سب پر غالب ہو جانا اور آخر کار آسمان کی طرف تیر چلانا صاف دلالت کرتا ہے کہ وہ ذوالعقول ہیں بلکہ دُنیا کی عقل میں سب سے بڑھ کر۔

حدیثوں میں بظاہر یہ تناقض پایا جاتا ہے کہ مسیح موعود کے مبعوث ہونے کے وقت ایک طرف تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ یاجوج ماجوج تمام دُنیا میں پھیل جائیں گے اور دوسری طرف یہ بیان ہے کہ تمام دُنیا میں عیسائی قوم کا غلبہ ہوگا جیسا کہ حدیث یکسر الصلیب سے بھی سمجھا جاتا ہے کہ صلیبی قوم کا اس زمانہ میں بڑا عروج اور اقبال ہوگا۔ ایسا ہی ایک دوسری حدیث سے بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ اس زمانہ میں رومیوں کی کثرت اور قوت ہوگی یعنی عیسائیوں کی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں رومی سلطنت عیسائی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ بھی قرآن شریف میں فرماتا ہے غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ[1] اس جگہ بھی روم سے مراد عیسائی سلطنت ہے اور پھر بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسیح موعود کے ظہور کے وقت دجّال کا تمام زمین پر غلبہ ہوگا اور تمام زمین پر بغیر مکہ معظمہ کے دجّال محیط ہو جائے گا۔

اب کوئی مولوی صاحب بتلا دیں کہ یہ تناقض کیونکر دُور ہو سکتا ہے۔ اگر دجّال تمام زمین پر محیط ہو جائیگا تو عیسائی سلطنت کہاں ہوگی۔ ایسا ہی یاجوج ماجوج جن کی عام سلطنت کی قرآن شریف خبر دیتا ہے وہ کہاں جائیں گے سو یہ غلطیاں ہیں جن میں یہ لوگ مبتلا ہیں جو ہمارے مکفّر اور مکذب ہیں۔ واقعات ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ دونوں صفات یاجوج ماجوج اور دجّال ہونے کی یورپین قوموں میں موجود ہیں کیونکہ یاجوج ماجوج کی تعریف حدیثوں میں یہ بیان کی گئی ہے کہ ان کے ساتھ لڑائی میں کسی کو طاقت مقابلہ نہیں ہوگی اور مسیح موعود بھی صرف دعا سے کام لیگا اور یہ صفت کُھلے کُھلے طور پر یورپ کی سلطنتوں میں پائی جاتی ہے اور قرآن شریف بھی اس کا مصدق ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ[2] اور دجّال کی نسبت حدیثوں میں یہ بیان ہے کہ وہ دجل سے کام لے گا اور مذہبی رنگ میں دُنیا میں فتنہ ڈالے گا سو قرآن شریف میں یہ صفت عیسائی پادریوں کی بیان کی گئی ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ[3] اس تقریر سے ظاہر ہے کہ یہ تینوں ایک ہی ہیں اسی وجہ سے سورۃ الفاتحہ میں دائمی طور پر یہ دعا سکھلائی گئی کہ تم عیسائیوں کے فتنہ سے پناہ مانگو۔ یہ نہیں کہا کہ تم دجّال سے پناہ مانگو۔ پس اگر کوئی اَور دجّال ہوتا جس کا فتنہ پادریوں سے زیادہ ہوتا تو خدا کی کلام میں بڑا فتنہ چھوڑ کر قیامت تک یہ دعا نہ سکھلائی جاتی

---

[1] الروم آیت ۳، ۴ ۔ [2] الانبیاء آیت ۹۷ ۔ [3] النساء آیت ۴۷ ۔

کہ تم عیسائیوں کے فتنہ سے پناہ مانگو اور یہ نہ فرمایا جاتا کہ عیسائی فتنہ ایسا ہے کہ قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ جائیں۔ پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں بلکہ یہ کہا جاتا کہ دجالی فتنہ ایسا ہے جس سے قریب ہے کہ زمین و آسمان پھٹ جائیں بڑے فتنے کو چھوڑ کر چھوٹے فتنہ سے ڈرانا بالکل غیر معقول ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۷۵-۷۹ حاشیہ)

سورۃ تکویر میں سب نشانات آخری زمانے کے ہیں انہی میں سے ایک نشان ہے وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ[1] یعنی جب اونٹنیاں بیکار چھوڑی جائیں گی۔ اسی کی تفسیر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وَلَيُتْرَكَنَّ الْقِلَاصُ فَلَا يُسْعٰى عَلَيْهَا[2] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح موعود بھی اسی زمانہ میں ہوگا بلکہ اس کے ابتدائی زمانے کے یہ نشان ہیں پھر فرمایا وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ[3] یعنی ایسے اسباب سفر مہیا ہو جائیں گے کہ قومیں باوجود اتنی دُور ہونے کے آپس میں مل جائیں گی حتّٰی کہ نئی دُنیا پُرانی سے تعلقات پیدا کر لے گی۔ یاجوج ماجوج کا آنا، دجّال کا نکلنا اور صلیب کا غلبہ یہ بھی اسی زمانے کے نشان ہیں ان کے متعلق لوگوں نے غلط فہمی سے تناقض پیدا کر لیا ہے اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب الگ الگ ہیں حالانکہ ان میں سے ہر ایک کی نسبت یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ تمام رُوئے زمین پر محیط ہو جائیں گے پس اگر یاجوج ماجوج محیط ہو گئے تو پھر دجّال کہاں احاطہ کرے گا اور صلیب کا غلبہ کس جگہ ہوگا؟ سوا یہ کہنے کے کچھ چارہ نہیں کہ یہ سب ایک ہی قوم کے مختلف افراد ہیں اور اگر ان کو ایک بنا دیں تو پھر کوئی مشکل نہ رہے گی۔ خدا تعالیٰ نے ان کی نسبت فرمایا ہے وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا جس سے ظاہر ہے کہ نہایت درجہ کا اختلاف پیدا ہو جائے گا اور سب مذاہب ایک دنگل میں ہو کر نکلیں گے "تَرَكْنَا" کا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آزادی کا زمانہ ہوگا اور یہ آزادی کمال تک پہنچ جائے گی تو اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے مامور کی معرفت ان کو جمع کرنے کا ارادہ کرے گا۔ پہلے دیکھو جَمَعْنٰهُمْ فرمایا اور ابتدائے عالم کے لئے خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً[4] فرمایا۔ لفظ بَثَّ اور جَمَعَ آپس میں پورا تناقض رکھتے ہیں گویا دائرہ پورا ہو کر پھر وہی زمانہ ہو جائے گا۔ پہلے تو وحدتِ شخصی تھی اب اخیر میں وحدتِ نوعی ہو جائے گی۔ اس سے آگے فرماتا ہے وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا۔ یہ مسیح موعود کے زمانے کا ایک اَور نشان بتلایا کہ اُس دن جہنّم پیش کیا جاوے گا اُن کافروں پر۔ یہ قیامت کا ذکر نہیں کیونکہ اُس دن جہنّم کا پیش کیا کرنا ہے اُس روز تو اُس میں کفار داخل ہوں گے۔ جہنّم سے مراد طاعون ہے چنانچہ ہمارے الہامات میں کئی بار طاعون کو جہنّم فرمایا گیا ہے۔ يَاْتِيْ عَلٰى جَهَنَّمَ زَمَانٌ لَّيْسَ فِيْهَا اَحَدٌ بھی ایک الہام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دو فرقوں کا ذکر

---

[1] التکویر آیت ۵ ٭ [2] صحیح مسلم جلد اوّل کتاب الایمان باب وجوب الایمان برسالت انبیا ٭ [3] التکویر آیت ۸
[4] النساء آیت ۲ ٭

فرمادیا۔ ایک تو وہ سعید جنہوں نے مسیح کو قبول کیا دوسرے وہ شقی جو مسیح کا کفر کرنے والے ہوں گے۔ ان کے لئے فرمایا کہ ہم طاعون بطور جہنّم بھیجیں گے اور نُفِخَ فِي الصُّوْرِ سے یہ مراد ہے کہ جو لوگ خدا تعالیٰ کی طرف سے آتے ہیں وحی کے ذریعہ ان میں آواز دی جاتی ہے اور پھر آواز اُن کی معرفت تمام جہان میں پہنچتی ہے پھر ان میں ایک ایسی کشش پیدا ہو جاتی ہے کہ لوگ باوجود اختلافِ خیالات وطبائع وحالات کے اس کی آواز پر جمع ہونے لگتے ہیں اور آخرکار وہ زمانہ آجاتا ہے کہ ایک ہی گلہ اور ایک ہی گلہ بان ہو۔

خدا تعالیٰ نے ہمارے لئے خود ہی ایسے اسباب مہیّا کر دئیے ہیں کہ جس سے تمام سعید روحیں ایک دین پر جمع ہو سکیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا تھا (قُلْ) یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا[1] ایک طرف یہ جَمِیْعًا اور دوسری طرف جَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ایک خاص علاقہ رکھتا ہے۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۳ مورخہ ۲۳ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

اَلَّذِیْنَ کَانَتْ اَعْیُنُهُمْ فِیْ غِطَآءٍ عَنْ ذِکْرِیْ وَکَانُوْا لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَمْعًا ذکر سے مراد یہ ہے کہ جو میں نے ان کو اپنے مامور کی معرفت یاد دیا۔ خدا کا یاد کرنا یہی ہوتا ہے کہ اپنی طرف سے ایک مصلح کو بھیج دیا سو اس مامور سے وہ غفلت میں رہے۔ ان کی آنکھوں کے آگے طرح طرح کے شبہات کے حجاب چھائے رہے اور حق کا نور نظر نہ آیا۔ یہ کیوں کہ جوشِ تعصّب سے ان کی ایسی حالت ہوگئی جو وہ اس مامور کی بات کو سُن ہی نہیں سکتے (وَکَانُوْا لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَمْعًا) اب ان لوگوں کی حالت یہی ہو رہی ہے اور اس کی سزا بھی وہی مل رہی ہے جو قرآن مجید میں ہے کہ عَرَضْنَا جَهَنَّمَ یَوْمَئِذٍ لِّلْکٰفِرِیْنَ عَرْضًا۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۳ مورخہ ۲۳ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

اصل بات یہ ہے کہ یہ وہ زمانہ آگیا ہے کہ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ کی کتاب میں ہے کہ وَتَرَکْنَا بَعْضَهُمْ یَوْمَئِذٍ یَّمُوْجُ فِیْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا۔ موجودہ آزادی کی وجہ سے انسانی فطرت نے ہر طرح کے رنگ ظاہر کر دئیے ہیں اور تفرقہ اپنے کمال کو پہنچ گیا ہے۔ گویا ایسا زمانہ ہے کہ ہر شخص کا ایک الگ مذہب ہے۔ یہی امور دلالت کرتے ہیں کہ اب نفخِ صُور کا وقت بھی یہی ہے اور فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا کی پیشگوئی کے پورا ہونے کا یہی زمانہ۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۶ اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

انبیاء جو آتے ہیں وہ کرنا کا حکم رکھتے ہیں۔ نفخ صور سے یہی مراد تھی کہ اس وقت ایک مامور کو بھیجا جائے گا وہ سُنا دے گا کہ اب تمہارا وقت آگیا ہے۔ کون کسی کو درست کر سکتا ہے جب تک کہ خدا درست نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو ایک قوّتِ جاذبہ عطا کرتا ہے کہ لوگوں کے دل اس کی طرف مائل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ خدا کے کام کبھی حبط نہیں

---

[1] الاعراف آیت ۱۵۹

جانتے۔ ایک قدرتی کشش کام کر دکھائے گی۔ اب وہ وقت آگیا ہے جس کی خبر تمام انبیاء ابتداء سے دیتے چلے آئے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے فیصلہ کا وقت قریب ہے اس سے ڈرو اور توبہ کرو۔

(بدر جلد ۷ ملا مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۹،۸)

فَإِذَا جَاءَ وَعْدُ رَبِّي جَعَلَهُ دَكَّاءَ.... فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا[1] یعنی جب وعدہ خدا تعالیٰ کا نزدیک آجائے گا تو خدا تعالیٰ اُس دیوار کو ریزہ ریزہ کر دے گا جو یاجوج ماجوج کی روک ہے اور خدا تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور ہم اُس دن یعنی یاجوج ماجوج کی سلطنت کے زمانہ میں متفرق فرقوں کو مہلت دیں گے کہ تا ایک دوسرے میں موجزنی کریں یعنی ہر ایک فرقہ اپنے مذہب اور دین کو دوسرے پر غالب کرنا چاہے گا اور جس طرح ایک موج اُس چیز کو اپنے نیچے دبانا چاہتی ہے جس کے اوپر پڑتی ہے اسی طرح موج کی مانند بعض بعض پر پڑیں گی تا ان کو دبالیں اور کسی کی طرف سے کمی نہیں ہوگی۔ ہر ایک فرقہ اپنے مذہب کو عروج دینے کے لئے کوشش کرے گا اور وہ انہیں لڑائیوں میں ہوں گے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے صُور پھونکا جائے گا تب ہم تمام فرقوں کو ایک ہی مذہب پر جمع کر دیں گے۔ صُور پھونکنے سے اِس جگہ یہ اشارہ ہے کہ اس وقت عادت اللہ کے موافق خدا تعالیٰ کی طرف سے آسمانی تائیدوں کے ساتھ کوئی مصلح پیدا ہوگا اور اُسکے دل میں زندگی کی رُوح پھونکی جائے گی اور وہ زندگی دوسروں میں سرایت کرے گی۔ یاد رہے کہ صُور کا لفظ ہمیشہ عظیم الشان تبدیلیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ گویا جب خدا تعالیٰ اپنی مخلوقات کو ایک صورت سے منتقل کر کے دوسری صورت میں لاتا ہے تو اس تغیّر صُور کے وقت کو نفخ صُور سے تعبیر کرتے ہیں اور اہلِ کشف پر مکاشفات کی رُو سے اس صُور کا ایک وجود جسمانی بھی محسوس ہوتا ہے اور یہ عجائبات اُس عالَم میں سے ہیں جن کے سر اس دُنیا میں بجز منقطعین کے اَور کسی پر کھل نہیں سکتے۔ بہرحال آیات موصوفہ بالا سے ثابت ہے کہ آخری زمانہ میں عیسائی مذہب اور حکومت کا زمین پر غلبہ ہوگا اور مختلف قوموں میں بہت سے تنازعات مذہبی پیدا ہوں گے اور ایک قوم دوسری قوم کو دبانا چاہے گی اور ایسے زمانہ میں صُور پھونک کر تمام قوموں کو دینِ اسلام پر جمع کیا جاوے گا یعنی سُنّت اللہ کے موافق آسمانی نظام قائم ہوگا اور ایک آسمانی مصلح آئے گا درحقیقت اسی مصلح کا نام مسیح موعود ہے۔ (شہادت القرآن صفحہ ۱۵-۱۶)

قرآن میں اسلامی طاقت کے کم ہونے اور امواجِ فتن کے اُٹھنے کے وقت جو عیسائی واعظوں کی دجالیّت سے مراد ہے نفخ صُور کی خوش خبری دی گئی ہے اور نفخ صُور سے مراد قیامت نہیں ہے کیونکہ عیسائیوں کے امواجِ فتن کے پیدا ہونے پر تو سَو برس سے زیادہ گذر گیا ہے مگر کوئی قیامت برپا نہیں ہوئی بلکہ مراد اس سے یہ ہے کہ کسی مہدی اور مجدّد کو بھیج کر ہدایت کی صُور پھونکی جائے اور ضلالت کے مُردوں میں پھر زندگی کی رُوح پھونک دی جاوے

---

[1] الکہف آیت ۹۹، ۱۰۰

کیونکہ نفخ صُور صرف جسمانی احیاء اور اماتت تک محدود نہیں ہے بلکہ روحانی احیاء اور اماتت بھی ہمیشہ نفخ صُور کے ذریعہ سے ہی ہوتا ہے۔ (شہادت القرآن ص۱۴)

ان آیات میں کسی کم تجربہ آدمی کو یہ خیال نہ گذرے کہ ان دونوں مقامات (الانبیاء آیات ۹۷، ۹۸ اور آیات زیر تفسیر) کے بعد میں جہنّم کا ذکر ہے اور بظاہر سیاق کلام چاہتا ہے کہ یہ قصّہ آخرت سے متعلق ہو مگر یاد رہے کہ یہ عام محاورہ قرآن کریم کا ہے اور صدہا نظیریں اس کی اس کلام پاک میں موجود ہیں کہ ایک دُنیا کے قصّہ کے ساتھ آخرت کا قصّہ پیوند کیا جاتا ہے اور ہر یک حصّہ کلام کا اپنے قرآئن سے دوسرے حصّہ سے تمیز رکھتا ہے۔ اِس طرز سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے۔ مثلاً قرآن کریم میں شق القمر کے معجزہ کو ہی دیکھو کہ وہ ایک نشان تھا لیکن ساتھ اس کے قیامت کا قصّہ چھیڑ دیا گیا جس کی وجہ سے بعض نادان قرینوں کو نظرانداز کرکے کہتے ہیں کہ شق القمر وقوع میں نہیں آیا بلکہ قیامت کو ہوگا۔

(شہادت القرآن ص۱۶ حاشیہ)

یہ زمانہ وہی زمانہ ہے جس میں خدا تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ مختلف فرقوں کو ایک قوم بنا دے اور ان مذہبی جھگڑوں کو ختم کرکے آخر ایک ہی مذہب میں سب کو جمع کر دے اور اسی زمانہ کی نسبت جو تلاطم امواج کا زمانہ ہے خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا اس آیت کو پہلی آیتوں کے ساتھ ملا کر یہ معنے ہیں کہ جس زمانہ میں دُنیا کے مذاہب کا بہت شور اُٹھے گا اور ایک مذہب دوسرے مذہب پر ایسا پڑے گا جیسا کہ ایک موج دوسری موج پر پڑتی ہے اور ایک دوسرے کو ہلاک کرنا چاہیں گے تب آسمان و زمین کا خدا اس تلاطمِ امواج کے زمانہ میں اپنے ہاتھوں سے بغیر دنیوی اسباب کے ایک نیا سلسلہ پیدا کرے گا اور اس میں ان سب کو جمع کرے گا جو استعداد اور مناسبت رکھتے ہیں تب وہ سمجھیں گے کہ مذہب کیا چیز ہے اور ان میں زندگی اور حقیقی راستبازی کی رُوح پھُونکی جائے گی اور خدا کی معرفت کا ان کو جام پلایا جائے گا اور ضرور ہے کہ یہ سلسلہ دُنیا کا منقطع نہ ہو جب تک کہ یہ پیشگوئی کہ آج سے تیرہ سو برس پہلے قرآن شریف نے دُنیا میں شائع کی ہے پوری نہ ہو جائے اور خدا نے اس آخری زمانہ کے بارہ میں جس میں تمام قومیں ایک ہی مذہب پر جمع کی جائیں گی صرف ایک ہی نشان بیان نہیں فرمایا بلکہ قرآن شریف میں اَور بھی کئی نشان لکھے ہیں منجملہ ان کے ایک یہ کہ اس زمانہ میں دریاؤں میں سے بہت سی نہریں نکلیں گی اور ایک یہ کہ زمین کی پوشیدہ کانیں یعنی معدنیں بہت سی نکل آویں گی اور زمینی علوم بہت سے ظاہر ہو جائیں گے اور ایک یہ کہ ایسے اسباب پیدا ہو جائیں گے جن کے ذریعہ سے کتابیں بکثرت ہو جائیں گی (یہ چھاپنے کے آلات کی طرف اشارہ ہے) اور ایک یہ کہ ان دنوں میں ایک ایسی سواری پیدا ہو جائے گی کہ اُونٹوں کو بیکار کر دے گی اور اس کے ذریعہ سے ملاقاتوں کے طریق سہل ہو جائیں گے اور ایک یہ کہ دُنیا کے باہمی تعلقات آسان ہو جائیں گے اور ایک دوسرے کو بآسانی خبریں پہنچا سکیں گے۔ (لیکچر لاہور ص۳۶-۳۸)

اسی زمانہ کے بارے میں جو میرا زمانہ ہے خدا تعالیٰ قرآن شریف میں خبر دیتا ہے جس کا خلاصہ ترجمہ یہ ہے کہ آخری دنوں میں طرح طرح کے مذاہب پیدا ہو جائیں گے اور ایک مذہب دوسرے مذہب پر حملہ کرے گا جیسا کہ ایک موج دوسری موج پر پڑتی ہے یعنی تعصب بہت بڑھ جائے گا اور لوگ طلبِ حق کو چھوڑ کر خواہ نخواہ اپنے مذاہب کی حمائت کریں گے اور کینے اور تعصب ایسے حدِّ اعتدال سے گذر جائیں گے کہ ایک قوم دوسری قوم کو نگل لینا چاہیگی تب انہیں دنوں میں آسمان سے ایک فرقہ کی بنیاد ڈالی جائے گی اور خدا اپنے مونہہ سے اُس فرقہ کی حمایت کے لئے ایک کرنا بجائے گا اور اُس کرنا کی آواز سے ہر ایک سعید اس فرقہ کی طرف کھچا آئے گا بجز اُن لوگوں کے جو شقی ازلی ہیں جو دوزخ کے بھرنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ قرآن شریف کے اس میں الفاظ یہ ہیں وَ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰھُمْ جَمْعًا اور یہ بات کہ وہ نفخ کیا ہوگا اور اس کی کیفیت کیا ہوگی اس کی تفصیل وقتاً فوقتاً خود ظاہر ہوتی جائے گی مجملاً صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ استعدادوں کو جنبش دینے کے لئے کچھ آسمانی کارروائی ظہور میں آئے گی اور ہولناک نشان ظاہر ہوں گے تب سعید لوگ جاگ اُٹھیں گے کہ یہ کیا ہوا چاہتا ہے کیا یہ وہی زمانہ نہیں جو قریب قیامت ہے جس کی نبیوں نے خبر دی ہے اور کیا یہ وہی انسان نہیں جس کی نسبت اطلاع دی گئی تھی کہ اس امت میں سے وہ مسیح ہو کر آئے گا جو عیسیٰ بن مریم کہلائے گا تب جس کے دل میں ایک ذرا بھی سعادت اور رشد کا مادہ ہے خدا تعالیٰ کے غضبناک نشانوں کو دیکھ کر ڈرے گا اور طاقتِ بالا اُس کو کھینچ کر حق کی طرف لے آئے گی اور اُس کے تمام تعصب اور کینے یوں جل جائیں گے جیسا کہ ایک خشک تنکا بھڑکتی ہوئی آگ میں پڑ کر بھسم ہو جاتا ہے۔

غرض اُس وقت ہر ایک رشید خدا کی آواز سُن لے گا اور اس کی طرف کھینچا جائے گا اور دیکھ لے گا کہ اب زمین اور آسمان دوسرے رنگ میں ہیں نہ وہ زمین ہے اور نہ وہ آسمان جیسا کہ مجھے پہلے اس سے ایک کشفی رنگ میں دکھلایا گیا تھا کہ مَیں نے ایک نئی زمین اور نیا آسمان بنایا ایسا ہی عنقریب ہونے والا ہے اور کشفی رنگ میں یہ بنانا میری طرف منسوب کیا گیا کیونکہ خدا نے اس زمانہ کے لئے مجھے بھیجا ہے لہذا اس نئے آسمان اور نئی زمین کا میں ہی موجب ہوا اور ایسے استعارات خدا کی کلام میں بہت ہیں۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۸۲-۸۳)

وَ نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰھُمْ جَمْعًا اس سے بھی مسیح موعود کی دعاؤں کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے نزول از آسمان کے یہی معنی ہیں کہ جب کوئی امر آسمان سے پیدا ہوتا ہے تو کوئی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور اُسے ردّ نہیں کر سکتا۔ آخری زمانہ میں شیطان کی ذریّت بہت جمع ہو جائے گی کیونکہ وہ شیطان کا آخری جنگ ہے مگر مسیح موعود کی دعائیں اس کو ہلاک کر دیں گی۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

۱۰۳۔ اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْۤ اَوْلِيَآءَ ؕ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ○

کیا ان منکروں نے یہ گمان کیا تھا کہ یہ امر سہل ہے کہ عاجز بندوں کو خدا بنا دیا جائے اور مَیں معطل ہو جاؤں اس لئے ہم ان کی ضیافت کے لئے اسی دُنیا میں جہنّم کو نمودار کر دیں گے یعنی بڑے بڑے ہولناک نشان ظاہر ہوں گے۔

(براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۹۹)

۱۰۶۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ○

فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا میں گناہ کا ذکر نہیں ہے۔ اس کا باعث صرف یہ ہے کہ ان لوگوں نے دُنیا کی خواہشوں کو مقدم رکھا ہوا تھا۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ لوگ دُنیا کا حظ پا چکے۔ وہاں بھی گناہ کا ذکر نہیں بلکہ دُنیا کی لذّات جن کو خدا تعالیٰ نے جائز کیا ہے اُن میں منہمک ہو جانے کا ذکر ہے۔ اس قسم کے لوگوں کا مرتبہ عنداللہ کچھ نہ ہوگا اور نہ ان کو کوئی عزّت کا مقام دیا جائے گا۔ شیریں زندگی اصل میں ایک شیطان ہے جو کہ انسان کو دھوکہ دیتی ہے۔ مومن تو خود مصیبت خریدتا ہے ورنہ اگر وہ مداہنہ برتتے تو ہر طرح آرام سے رہ سکتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگر اس طرح کرتے تو اس قدر جنگیں کیوں ہوتیں لیکن آپ نے دین کو مقدم رکھا اس لئے سب دشمن ہوگئے۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۲۹ مورخہ یکم اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

مومن آدمی کا سب ہمّ و غم خدا کے واسطے ہوتا ہے دُنیا کے لئے نہیں ہوتا اور وہ دنیاوی کاموں کو کچھ خوشی سے نہیں کرتا بلکہ اداس سا رہتا ہے اور یہی نجات حیات کا طریق ہے اور وہ جو دُنیا کے پھندوں میں پھنسے ہوئے ہیں اور ان کے ہمّ و غم سب دُنیا کے ہی لئے ہوتے ہیں ان کی نسبت تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ہم قیامت کو ان کا ذرہ بھر بھی قدر نہیں کریں گے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

۱۰۹۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ○

وہ آیات جن میں لکھا ہے کہ فوت شدہ لوگ پھر دُنیا میں نہیں آتے ازانجملہ یہ آیت ہے وَحَرَامٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ[1] .... پھر چھٹی آیت یہ ہے لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا۔

(ازالہ اوہام حصّہ دوم حاشیہ در حاشیہ متعلقہ صفحہ ۹۴۲ (الف و ب)

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا۝

یعنی اگر خدا کی کلام کے لکھنے کے لئے سمندر کو سیاہی بنایا جائے تو لکھتے لکھتے سمندر ختم ہو جائے اور کلام میں کچھ کمی نہ ہو۔ گو ویسے ہی اور سمندر بطور مدد کے کام میں لائے جائیں۔ رہی یہ بات کہ ہم لوگ ختم ہونا وحی کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کن معنوں سے مانتے ہیں سو اس میں اصل حقیقت یہ ہے کہ گو کلامِ الٰہی اپنی ذات میں غیر محدود ہے لیکن چونکہ وہ مفاسد کہ جن کی اصلاح کے لئے کلامِ الٰہی نازل ہوتی رہی یا وہ ضرورتیں کہ جن کو الہامِ ربّانی پورا کرتا رہا ہے وہ قدر محدود سے زیادہ نہیں ہیں اس لئے کلامِ الٰہی بھی اسی قدر نازل ہوئی ہے کہ جس قدر بنی آدم کو اس کی ضرورت تھی اور قرآن شریف ایسے زمانہ میں آیا تھا کہ جس میں ہر ایک طرح کی ضرورتیں کہ جن کا پیش آنا ممکن ہے پیش آگئی تھیں یعنی تمام امور اخلاقی اور اعتقادی اور قولی اور فعلی بگڑ گئے تھے اور ہر ایک قسم کا افراط تفریط اور ہر ایک نوع کا فساد اپنے انتہا کو پہنچ گیا تھا اِس لئے قرآن شریف کی تعلیم بھی انتہائی درجہ پر نازل ہوئی پس انہیں معنوں سے شریعت فرقانی مختتم اور مکمل ٹھہری اور پہلی شریعتیں ناقص رہیں کیونکہ پہلے زمانوں میں وہ مفاسد کہ جن کی اصلاح کے لئے الہامی کتابیں آئیں وہ بھی انتہائی درجہ پر نہیں پہنچے تھے اور قرآن شریف کے وقت میں وہ سب اپنی انتہا کو پہنچ گئے تھے۔ پس اب قرآن شریف اور دوسری الہامی کتابوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی کتابیں اگر ہر ایک طرح کے خلل سے محفوظ بھی رہتیں پھر بھی بوجہ ناقص ہونے تعلیم کے ضرور تھا کہ کسی وقت کامل تعلیم یعنی فرقان مجید ظہور پذیر ہوتا مگر قرآن شریف کے لئے اب یہ ضرورت درپیش نہیں کہ اس کے بعد کوئی اور کتاب بھی آوے کیونکہ کمال کے بعد اور کوئی درجہ باقی نہیں۔ ہاں اگر یہ فرض کیا جائے کہ کسی وقت اصولِ حقّہ قرآن شریف کے وید اور انجیل کی طرح مشرکانہ اصول بنائے جائیں گے اور تعلیمِ توحید میں تبدیل اور تحریف عمل میں آوے گی یا اگر ساتھ اس کے یہ بھی فرض کیا جائے جو کسی زمانہ میں وہ کروڑہا مسلمان جو توحید پر قائم ہیں وہ بھی پھر طریق

---

[1] الانبیاء آیت ۹۶ ؎

شرک اور مخلوق پرستی کا اختیار کرلیں گے تو بیشک ایسی صورتوں میں دوسری شریعت اور دوسرے رسول کا آنا ضروری ہوگا مگر دونوں قسم کے فرض محال ہیں۔ قرآن شریف کی تعلیم کا محرّف مبدّل ہونا اِس لئے محال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ[1]۔

(براہین احمدیہ حصّہ دوم صفحہ ۱۰۹-۱۱۰ حاشیہ نمبر ۹)

باوا نانک صاحب فرماتے ہیں

تیرا حکم نہ جاپے کتیرا الکھ نہ جانے کو ✦ جے سو شاعر میلئے تل نہ پوجاوے ہو

یعنی تیرے حکم کی تعداد کسی کو معلوم نہیں۔ اگر سو شاعر جمع کریں تو ایک تل بھر بھی پورا نہ کرسکیں

اب آپ لوگ ذرا غور کرکے دیکھیں کہ یہ مضمون باوا صاحب نے قرآن شریف کی اِس آیت سے لیا ہے قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا یعنی کہہ اگر خدا کے کلموں کے لئے سمندر کو سیاہی بنایا جاوے تو سمندر ختم ہوجائے گا قبل اس کے جو خدا کے کلمے ختم ہوں اگرچہ کئی ایک سمندر اسی کام میں اور بھی خرچ ہوجاویں۔ (ست بچن صفحہ ۸۷-۸۸)

خدا تعالیٰ کی پاک اور سچی کلام کو شناخت کرنے کی یہ ایک ضروری نشانی ہے کہ وہ اپنی جمیع صفات میں بےمثل ہو کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو چیز خدا تعالیٰ سے صادر ہوئی ہے اگر مثلاً ایک جَو کا دانہ ہے وہ بھی بےنظیر ہے اور انسانی طاقتیں اس کا مقابلہ نہیں کرسکتیں اور بےمثل ہونا غیر محدود ہونے کو مستلزم ہے یعنی ہر یک چیز اُسی حالت میں بےنظیر ٹھہر سکتی ہے جبکہ اُس کی عجائبات اور خواص کی کوئی حد اور کنارہ نظر نہ آوے اور جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں یہی خاصیت خدا تعالیٰ کی ہر یک مخلوق میں پائی جاتی ہے مثلاً اگر ایک درخت کے پتّے کی عجائبات کی ہزار برس تک بھی تحقیقات کی جائے تو وہ ہزار برس ختم ہوجائے گا مگر اُس پتّے کے عجائبات ختم نہیں ہوں گے اور اس میں سرّ یہ ہے کہ جو چیز غیر محدود قدرت سے وجود پذیر ہوئی ہے اس میں غیر محدود عجائبات اور خواص کا پیدا ہونا ایک لازمی اور ضروری امر ہے اور یہ آیت کہ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا اپنے ایک معنی کی رُو سے اسی امر کی مؤید ہے کیونکہ مخلوقات اپنے مجازی معنوں کی رُو سے تمام کلمات اللہ ہی ہیں اور اسی کی بناء پر یہ آیت ہے کہ كَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ[2] کیونکہ ابن مریم میں دوسری مخلوقات میں سے کوئی امر زیادہ نہیں۔ اگر وہ کلمۃ اللہ ہے تو آدم بھی کلمۃ اللہ ہے اور اس کی اولاد بھی کیونکہ ہر یک چیز کُنْ فَیَکُوْن کے کلمہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اسی طرح مخلوقات کی صفات اور خواص بھی کلماتِ ربّی ہیں یعنی مجازی

---

[1] الحجر آیت ۱۰۔ [2] نساء آیت ۱۷۲۔

معنوں کی رُو سے کیونکہ وہ تمام کلمہ کُنْ فَیَکُوْن سے نکلے ہیں سو ان معنوں کے رُو سے اِس آیت کا یہی مطلب ہوا کہ خواص مخلوقات بیحد اور بے نہایت ہیں اور جبکہ ہریک چیز اور ہریک مخلوق کے خواص بیحد اور بے نہایت ہیں اور ہریک چیز غیر محدود عجائبات پر مشتمل ہے تو پھر کیونکر قرآن کریم جو خدا تعالیٰ کا پاک کلام ہے صرف اِن چند معانی میں محدود ہوگا کہ جو چالیس پچاس یا مثلاً ہزار جزو کی کسی تفسیر میں لکھے ہوں یا جس قدر ہمارے سیّد و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک زمانہ محدود میں بیان کئے ہوں نہیں بلکہ ایسا کلمہ مُنہ پر لانا میرے نزدیک قریب قریب کفر کے ہے۔ اگر عمداً اُس پر اصرار کیا جائے تو اندیشہ کفر ہے۔ یہ سچ ہے کہ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کے معنے بیان فرمائے ہیں وہی صحیح اور حق ہیں مگر یہ ہرگز سچ نہیں کہ جو کچھ قرآن کریم کے معارف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائے اُن سے زیادہ قرآن کریم میں کچھ بھی نہیں۔ یہ اقوال ہمارے مخالفوں کے صاف دلالت کر رہے ہیں کہ وہ قرآن کریم کے غیر محدود عظمتوں اور خوبیوں پر ایمان نہیں لاتے اور ان کا یہ کہنا کہ قرآن کریم ایسوں کے لئے اُترا ہے جو اُمّی تھے اَور بھی اِس امر کو ثابت کرتا ہے کہ وہ قرآن شناسی کی بصیرت سے بکلّی بے بہرہ ہیں وہ نہیں سمجھتے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم محض امیوں کے لئے نہیں بھیجے گئے بلکہ ہریک رُتبہ اور طبقہ کے انسان اُن کی اُمّت میں داخل ہیں۔ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا[1] پس اِس آیت سے ثابت ہے کہ قرآن کریم ہریک استعداد کی تکمیل کے لئے نازل ہوا ہے اور درحقیقت آیت وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ[2] میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ پس یہ خیال کہ گویا جو کچھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کے بارہ میں بیان فرمایا اُس سے بڑھ کر ممکن نہیں، بدیہی البطلان ہے۔ ہم نہایت قطعی اور یقینی دلائل سے ثابت کر چکے ہیں کہ خدا تعالیٰ کی کلام کے لئے ضروری ہے کہ اس کے عجائبات غیر محدود اور نیز بے مثل ہوں اور اگر یہ اعتراض ہو کہ اگر قرآن کریم میں ایسے عجائبات اور خواص مخفیہ تھے تو پہلوں کا کیا گناہ تھا کہ اُن کو ان اسرار سے محروم رکھا گیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ بکلّی اسرارِ قرآنی سے محروم تو نہیں رہے بلکہ جس قدر معلوماتِ عرفانیہ خدا تعالیٰ کے ارادہ میں اُن کے لئے بہتر تھے وہ اُن کو عطا کئے گئے اور جس قدر اس زمانہ کی ضرورتوں کے موافق اس زمانہ میں اسرار ظاہر ہونے ضروری تھے وہ اس زمانہ میں ظاہر کئے گئے مگر وہ باتیں جو مدارِ ایمان ہیں اور جن کے قبول کرنے اور جاننے سے ایک شخص مسلمان کہلا سکتا ہے وہ ہر زمانہ میں برابر طور پر شائع ہوتی رہیں۔ مَیں متعجب ہوں کہ ان ناقص الفہم مولویوں نے کہاں سے اور کس سے سُن لیا کہ خدا تعالیٰ پر یہ حق واجب ہے کہ جو کچھ آیندہ زمانہ میں بعض آلاء و نعماء حضرتِ باری عزّ اسمہٗ ظاہر ہوں پہلے زمانہ میں بھی ان کا ظہور ثابت

---

[1] اعراف آیت ۱۵۹ ✦ [2] احزاب آیت ۴۱ ✦

ہو بلکہ اس بات کے ماننے کے بغیر کسی صحیح الحواس کو کچھ بن نہیں پڑتا کہ بعض نعماء الٰہی پچھلے زمانہ میں ایسے ظاہر ہوتے ہیں کہ پہلے زمانہ میں اُن کا اثر اور وجود پایا نہیں جاتا۔ دیکھو جس قدر صدہا نباتاتِ جدیدہ کے خواص اب دریافت ہوئے ہیں یا جس قدر انسانوں کے آرام کے لئے طرح طرح کے صناعات اور سواریاں اور سہولت معیشت کی باتیں اب نکلی ہیں پہلے ان کا کہاں وجود تھا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ایسے حقائق دقائق قرآنی کا نمونہ کہاں ہے جو پہلے دریافت نہیں کئے گئے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس رسالہ کے آخر میں جو سورۃ فاتحہ کی تفسیر ہے اس کے پڑھنے سے تمہیں معلوم ہو گا کہ اس قسم کے حقائق اور معارف مخفیہ قرآن کریم میں موجود ہیں جو ہر یک زمانہ میں اُس زمانہ کی ضرورتوں کے موافق ہیں۔ (کرامات الصادقین صفحہ ۱۸ تا ۲۰)

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝ ۱۱۱

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ کہہ میں ایک آدمی ہوں تم جیسا مجھے خدا سے الہام ہوتا ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے۔ (انجام آتھم صفحہ ۵)

اُن کو کہہ دے کہ مَیں تمہارے جیسا ایک آدمی ہوں مجھ پر یہ وحی ہوتی ہے کہ خدا ایک ہے اُس کا کوئی ثانی نہیں۔ (دافع البلاء صفحہ ۱۹)

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ الخ جو شخص خدا کی ملاقات کا طالب ہے اُسے لازم ہے کہ ایسا عمل اختیار کرے جس میں کسی نوع کا فساد نہ ہو اور کسی چیز کو خدا کی بندگی میں شریک نہ کرے۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۳۵ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

جو شخص خدا تعالیٰ کا دیدار چاہتا ہے چاہیئے کہ وہ ایسے کام کرے جن میں فساد نہ ہو یعنی ایک ذرہ متابعت نفس اور ہوا کی نہ ہو اور چاہیئے کہ خدا کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک نہ کرے نہ نفس کو نہ ہوا کو اور نہ دوسرے باطل معبودوں کو۔ (ست بچن صفحہ ۹۱)

وہ قرآن شریف میں اُس تعلیم کو پیش کرتا ہے جس کے ذریعہ سے اور جس پر عمل کرنے سے اِسی دُنیا میں دیدارِ الٰہی میسّر آ سکتا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ

بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا یعنی جو شخص چاہتا ہے کہ اسی دنیا میں اس خدا کا دیدار نصیب ہو جائے جو حقیقی خدا اور پیدا کنندہ ہے پس چاہیئے کہ وہ ایسے نیک عمل کرے جس میں کسی قسم کا فساد نہ ہو یعنی عمل اس کے نہ لوگوں کے دکھلانے کے لئے ہوں نہ اُن کی وجہ سے دل میں تکبّر پیدا ہو کہ مَیں ایسا ہوں اور ایسا ہوں۔ اور نہ وہ عمل ناقص اور ناتمام ہوں اور نہ ان میں کوئی ایسی بدبو ہو جو محبّتِ ذاتی کے برخلاف ہو بلکہ چاہیئے کہ صدق اور وفاداری سے بھرے ہوئے ہوں اور ساتھ اس کے یہ بھی چاہیئے کہ ہر ایک قسم کے شرک سے پرہیز ہو۔ نہ سُورج نہ چاند نہ آسمان کے ستارے نہ ہوا نہ آگ نہ پانی نہ کوئی اَور زمین کی چیز معبود ٹھہرائی جائے اور نہ دُنیا کے اسباب کو ایسی عزّت دی جائے اور ایسا ان پر بھروسہ کیا جائے کہ گویا وہ خدا کے شریک ہیں اور نہ اپنی ہمّت اور کوشش کو کچھ چیز سمجھا جائے کہ یہ بھی شرک کے قسموں میں سے ایک قسم ہے بلکہ سب کچھ کرکے یہ سمجھا جائے کہ ہم نے کچھ نہیں کیا اور نہ اپنے علم پر کوئی غرور کیا جائے اور نہ اپنے عمل پر کوئی ناز بلکہ اپنے تئیں فی الحقیقت جاہل سمجھیں اور کاہل سمجھیں اور خدا تعالیٰ کے آستانہ پر ہر ایک وقت رُوح گری رہے اور دعاؤں کے ساتھ اس کے فیض کو اپنی طرف کھینچا جائے اور اس شخص کی طرح ہو جائیں کہ جو سخت پیاسا اور بے دست و پا بھی ہے اور اس کے سامنے ایک چشمہ نمودار ہوا ہے نہایت صافی اور شیریں۔ پس اس نے افتاں و خیزاں بہرحال اپنے تئیں اس چشمہ تک پہنچا دیا اور اپنی لبوں کو اس چشمہ پر رکھ دیا اور علیحدہ نہ ہوا جب تک سیراب نہ ہوا۔ (لیکچر لاہور صؔ)

نیک عمل کی مثال ایک پرند کی طرح ہے۔ اگر صدق اور اخلاص کے قفس میں اُسے قید رکھو گے تو وہ رہے گا ورنہ پرواز کر جاوے گا اور یہ بجز خدا کے فضل کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَمَنْ كَانَ يَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا عملِ صالح سے یہاں یہ مراد ہے کہ اس میں کسی قسم کی بدی کی آمیزش نہ ہو صلاحیت ہی صلاحیت ہو۔ نہ عُجب ہو۔ نہ کبر ہو۔ نہ نخوت ہو۔ نہ تکبّر ہو۔ نہ نفسانی اغراض کا کوئی حصّہ ہو۔ نہ رو بخلق ہو۔ حتیٰ کہ دوزخ اور بہشت کی خواہش بھی نہ ہو صرف خدا کی محبّت سے وہ عمل صادر ہو۔ جب تک دوسری کسی قسم کی غرض کو دخل ہے تب تک ٹھوکر کھائے گا اور اس کا نام شرک ہے کیونکہ وہ دوستی اور محبّت کس کام کی جس کی بنیاد صرف ایک پیالہ چائے یا دوسری خالی محبوبات تک ہی ہے۔ ایسا انسان جس دن اس میں فرق آتا دیکھے گا اسی دن قطع تعلق کر دے گا۔ جو لوگ خدا سے اِس لئے تعلق باندھتے ہیں کہ ہمیں مال ملے یا اولاد حاصل ہو یا ہم فلاں فلاں امور میں کامیاب ہو جاویں اُن کے تعلقات عارضی ہوتے ہیں اور ایمان بھی خطرہ میں ہے جس دن ان کے اغراض کو کوئی صدمہ پہنچا اسی دن ایمان میں بھی فرق آجاوے گا۔ اِس لئے پکّا مومن وہ ہے جو کسی سہارے پر خدا کی عبادت نہیں کرتا۔ (البدر جلد ۲ ۳۴ مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۵-۶)

قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر دُنیا میں کسی کامل انسان کا نمونہ موجود

نہیں اور نہ آئندہ قیامت تک ہو سکتا ہے۔ پھر دیکھو کہ اقتداری معجزات کے ملنے پر بھی حضور کے شاملِ حال ہمیشہ عبودیت ہی رہی اور بار بار اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ ہی فرماتے رہے یہاں تک کہ کلمہ توحید میں اپنی عبودیت کے اقرار کا ایک جزوِ لازم قرار دیا جس کے بدوں مسلمان مسلمان ہی نہیں ہو سکتا۔ سوچو! اور پھر سوچو!! پس جس حال میں ہادیٔ اکمل کی طرزِ زندگی ہم کو یہ سبق دے رہی ہے کہ اعلیٰ ترین مقامِ قُرب پر بھی پہنچ کر عبودیت کے اعتراف کو ہاتھ سے نہیں دیا تو اور کسی کا تو ایسا خیال کرنا اور ایسی باتوں کا دل میں لانا ہی فضول اور عبث ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۰)

مومن جب خدا سے محبّت کرتا ہے تو الٰہی نُور کا اُس پر احاطہ ہو جاتا ہے اگرچہ وہ نور اُس کو اپنے اندر چھپا لیتا اور اس کی بشریّت کو ایک حد تک بھسم کر جاتا ہے جیسے آگ میں پڑا ہوا لوہا ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی وہ عبودیّت اور بشریّت معدوم نہیں ہو جاتی۔ یہی وہ راز ہے جو "قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ"[1] کی تہ میں مرکوز ہے۔ بشریّت تو ہوتی ہے مگر وہ الوہیت کے رنگ کے نیچے متواری ہو جاتی ہے اور اس کے تمام قویٰ اور اعضاء لِلّٰہی راہوں میں خدا تعالیٰ کے ارادوں سے پُر ہو کر اس کی خواہشوں کی تصویر ہو جاتے ہیں اور یہی وہ امتیاز ہے جو اس کو کروڑہا مخلوق کی روحانی تربیت کا کفیل بنا دیتا ہے اور ربوبیتِ تامہ کا ایک مظہر قرار دیتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو کبھی بھی ایک نبی اس قدر مخلوقات کے لئے ہادی اور راہبر نہ ہو سکے۔ چونکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کُل دُنیا کے انسانوں کی روحانی تربیت کے لئے آئے تھے اِس لئے یہ رنگ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میں بدرجہ کمال موجود تھا اور یہی وہ مرتبہ ہے جس پر قرآن کریم نے متعدد مقامات پر حضور کی نسبت شہادت دی ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے مقابل اور اُسی رنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کا ذکر فرمایا ہے مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ[1] اور ایسا ہی فرمایا قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا[2]۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۳)

یہ کبھی گمان نہ کرنا چاہیئے کہ حضرت مسیح یا دوسرے انبیاء ایک معمولی آدمی تھے وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ اور مقرب تھے۔ قرآن شریف نے مصلحت اور موقعہ کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت ایک لفظ اِس قسم کا بیان فرمایا ہے کہ جہاں آپ کے بہت سے انوار و برکات اور فضائل بیان کئے ہیں وہاں بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ بھی کہہ دیا ہے مگر یہ اس کے ہر گز معنے نہیں ہیں کہ آنحضرتؐ فی الواقعہ ہی عام آدمیوں جیسے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ آپ کی شان میں اِس لئے استعمال فرمایا کہ دوسرے انبیاؤں کی طرح آپ کی پرستش نہ ہو اور آپ کو خدا نہ بنایا جاوے اس سے یہ مراد ہر گز نہیں ہے کہ آپ کے فضائل و مراتب ہی سلب کر دئے جاویں۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۴۰ مورخہ ۲۴ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

اللہ تعالیٰ کے بندوں اور برگزیدوں کے پاس ارادت سے جانا سہل ہے لیکن ارادت سے واپس آنا مشکل

[1] الانبیاء آیت ۱۰۸ ٭ [2] الاعراف آیت ۱۵۹ ٭

ہے کیونکہ ان میں بشریت ہوتی ہے اور ان کے پاس جانے والے لوگوں میں سے اکثر ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے دل میں اس کی ایک فرضی اور خیالی تصویر بنا لیتے ہیں لیکن جب اس کے پاس جاتے ہیں تو وہ اس کے برخلاف پاتے ہیں جس سے بعض اوقات وہ ٹھوکر کھاتے ہیں اور ان کے اخلاص اور ارادت میں فرق آجاتا ہے۔ اِسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھول کر بیان کر دیا کہ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یعنی کہہ دو کہ بیشک مَیں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں یہ اس لئے کہ وہ لوگ اعتراض کرتے تھے وَقَالُوْا مَالِهٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ[1] اور انہوں نے کہا کہ یہ کیسا رسول ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی چلتا پھرتا ہے۔ ان کو آخر یہی جواب دیا گیا کہ یہ بھی ایک بشر ہے اور بشری حوائج اس کے ساتھ ہیں۔ اس سے پہلے جس قدر نبی اور رسول آئے وہ بھی بشر ہی تھے۔ یہ بات انہوں نے بنظر استخفاف کہی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی بازاروں میں عموماً سودا سلف خریدا کرتے تھے۔ ان کے دلوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو نقشہ تھا وہ تو نری بشریت تھی جس میں کھانا۔ پینا۔ سونا۔ چلنا۔ پھرنا وغیرہ تمام امور اور لوازم بشریت کے موجود تھے اس واسطے ان لوگوں نے ردّ کر دیا۔ یہ مشکل اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ اپنے دل سے ہی ایک خیالی تصویر بنا لیتے ہیں کہ نبی ایسا ہونا چاہیئے اور چونکہ اس تصویر کے موافق وہ اسے نہیں پاتے اِس لحاظ سے ٹھوکر کھاتے ہیں۔ یہ مرض یہاں تک ترقی کر گیا ہے کہ بعض شیعوں کا بعض ائمہ کی نسبت خیال ہے کہ وہ منہ کے راستے پیدا ہوئے تھے لیکن یہ باتیں ایسی ہیں کہ ایک عقلمند ان کو کبھی قبول نہیں کر سکتا بلکہ ہنسی کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جو شخص گذر جاوے اس کی نسبت جو چاہو تجویز کر لو کہ وہ آسمان سے اُترا تھا یا مُنہ کے راستہ پیدا ہوا تھا لیکن جو موجود ہیں ان میں بشری کمزوریاں موجود ہیں۔ وہ روتا بھی ہے۔ کھاتا بھی ہے اور پیتا بھی ہے۔ غرض ہر قسم کی بشری ضرورتوں اور کمزوریوں کو اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کو دیکھ کر ان لوگوں کو جو انبیاء و رسل کی حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں گھبراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی جو اللہ تعالیٰ کو ان کے اس قسم کے اعتراضوں کا ردّ کرنا پڑا اور قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ کہنا پڑا یعنی مجھ میں بشریت کے سوا جو امر تمہارے اور میرے درمیان خارق اور ما بہ الامتیاز ہے وہ یہ ہے کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی وحی آتی ہے۔ دوسری جگہ قرآن شریف میں یہ اعتراض بھی منقول ہوا ہے کہ یہ تو بیویاں کرتا ہے۔ اس کے جواب میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی فرمایا ہے کہ کوئی نبی اور رسول ایسا نہیں جو بیوی نہ رکھتا ہو۔ غرض ایسی باتوں سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۶ مورخہ ۲۴ / اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

---

[1] الفرقان آیت ۸

تفسیر سُورۃ مریم

بیان فرمُودہ

سیّدنا حضرت مسیح موعُود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

یٰزَکَرِیَّاۤ اِنَّا نُبَشِّرُکَ بِغُلٰمِ ۣاسۡمُہٗ یَحۡیٰی ۙ لَمۡ نَجۡعَلۡ لَّہٗ مِنۡ قَبۡلُ سَمِیًّا۝ (۸)

قرآن شریف اپنے زبردست ثبوتوں کے ساتھ ہمارے دعوے کا مصدّق اور ہمارے مخالفین کے اوہامِ باطلہ کی بیخکنی کر رہا ہے اور وہ گذشتہ نبیوں کے واپس دُنیا میں آنے کا دروازہ بند کرتا ہے اور بنی اسرائیل کے مثیلوں کے آنے کا دروازہ کھولتا ہے۔ اس نے یہ دعا تعلیم فرمائی ہے: اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ۔ اِس دعا کا ماحصل کیا ہے؟ یہی تو ہے کہ ہمیں اے ہمارے خدا نبیوں اور رسولوں کا مثیل بنا۔ اور پھر حضرت یحییٰؑ کے حق میں فرماتا ہے لَمۡ نَجۡعَلۡ لَّہٗ مِنۡ قَبۡلُ سَمِیًّا ۝ یعنی یحییٰؑ سے پہلے ہم نے کوئی اُس کا مثیل دُنیا میں نہیں بھیجا جس کو باعتبار اُن صفات کے یحییٰؑ کہا جائے۔ یہ آیت ہماری تصدیقِ بیان کے لئے اشارۃُ النّص ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے اس جگہ آیت موصوفہ میں قبل کی شرط لگائی بعد کی نہیں لگائی تا معلوم ہو کہ بعد میں اسرائیلی نبیوں کے ہم ناموں کے آنے کا دروازہ کُھلا ہے جن کا نام خدا تعالیٰ کے نزدیک وہی ہوگا جو ان نبیوں کا نام ہوگا جن کے وہ مثیل ہیں یعنی جو مثیلِ موسیٰؑ ہے اس کا نام موسیٰ ہوگا اور جو مثیلِ عیسیٰؑ ہے اس کا نام عیسیٰ یا ابنِ مریم ہوگا

اور خدا تعالیٰ نے اِس آیت میں سمیؑ کہا مثیل نہیں کہا تا معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ کا منشاء یہ ہے کہ جو شخص کسی اسرائیلی نبی کا مثیل بن کر آئے گا وہ مثیل کے نام سے نہیں پکارا جائے گا بوجہ انطباقِ کلی اسی نام سے پکارا جائے گا جس نبی کا وہ مثیل بن کر آئے گا۔ (ازالہ اوہام صہ ۵۳۸ - ۵۴۰ حصّہ دوم طبع اوّل)

۱۳۔ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۙ

حضرت اقدس نے اپنا ایک پُرانا الہام سُنایا یَا یَحْیٰی خُذِ الْکِتَابَ بِقُوَّۃٍ (اور فرمایا) وَالْخَیْرُ کُلُّہٗ فِی الْقُرْاٰنِ۔ اور فرمایا کہ اس میں ہم کو حضرت یحیٰی کی نسبت دی گئی ہے کیونکہ حضرت یحیٰی کو یہود کی اُن اقوام سے مقابلہ کرنا پڑا تھا جو کتاب اللہ توریت کو چھوڑ بیٹھے تھے اور حدیثوں کے بہت گرویدہ ہو رہے تھے اور ہر بات میں احادیث کو پیش کرتے تھے۔ ایسا ہی اس زمانہ میں ہمارا مقابلہ اہلِ حدیث کے ساتھ ہُوا کہ ہم قرآن پیش کرتے اور وہ حدیث پیش کرتے ہیں۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۵ صفحہ ۶ مورخہ ۲۴۔ اپریل ۱۹۰۲ء)

۱۶۔ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۟

آیت سَلٰمٌ عَلَیْہِ یَوْمَ وُلِدَ صاف دلالت کر رہی ہے کہ مسِّ شیطان سے محفوظ ہونا ابنِ مریمؑ سے مخصوص نہیں۔ اور زمخشری کا یہ طعن کہ حدیث خصوصیت ابنِ مریم دربارہ محفوظیّت از مسِّ شیطان جو امام بخاری اپنی صحیح میں لایا ہے نقص سے خالی نہیں اور اس کی صحت میں کلام ہے جیسا کہ خود اس نے بیان کیا ہے فضول ہے کیونکہ عمیق نظر سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بزرگ بخاری نے خود اشارہ کر دیا ہے کہ ابنِ مریم اور اس کی والدہ سے مراد ہر یک ایسا شخص ہے جو ان دونوں کی صفتیں اپنے اندر جمع رکھتا ہو۔ فَلَا تَنَاقُضَ وَلَا تَعَارُضَ۔

(ازالہ اوہام حصّہ دوم صہ ۹۰۲ طبع اوّل)

محققوں نے بخاری کی اس حدیث کو جو صفحہ ۶۵۲ میں لکھی ہے یعنی یہ کہ مَا مِنْ مَّوْلُوْدٍ یُّوْلَدُ اِلَّا وَالشَّیْطٰنُ یَمَسُّہٗ حِیْنَ یُوْلَدُ اِلَّا مَرْیَمَ وَابْنَھَا قرآن کریم کی اِن آیات سے مخالف پا کر کہ اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ[1]۔ وَاِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَانٌ[2] وَسَلَامٌ عَلَیْہِ یَوْمَ وُلِدَ اس حدیث کی یہ تاویل کر دی کہ ابنِ مریم اور مریم سے تمام ایسے اشخاص مراد ہیں جو ان دونوں کی صفت پر ہوں۔ جیسا کہ شارح بخاری نے اِس حدیث کی شرح میں لکھا ہے قَدْ طَعَنَ الزَّمَخْشَرِیُّ فِیْ مَعْنٰی ھٰذَا الْحَدِیْثِ وَتَوَقَّفَ فِیْ صِحَّتِہٖ وَقَالَ اِنْ صَحَّ فَمَعْنَاہُ

---

[1] الحجر آیت ۴۱ ۞ [2] الحجر آیت ۴۳ ۞

كُلُّ مَنْ كَانَ فِي صِفَتِهِمَا لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ[1]۔ یعنی علامہ زمخشری نے بخاری کی اس حدیث میں طعن کیا ہے اور اُس کی صحت میں اُس کو شک ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث معارضِ قرآن ہے اور فقط اس صورت میں صحیح متصور ہوسکتی ہے کہ اس کے یہ معنے کئے جائیں کہ مریم اور ابنِ مریم سے مراد تمام ایسے لوگ ہیں جو انکی صفت پر ہوں۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم حاشیہ صفحہ ۹۲۷، ۹۲۸)

حدیثوں میں آیا ہے کہ عیسیٰ اور اس کی ماں مسِّ شیطان سے پاک ہیں..... مولویوں نے اس کے یہ معنی کرلئے کہ بجز حضرت عیسیٰؑ اور ان کی ماں کے اَور کوئی نبی ہو یا رسول ہو مسِّ شیطان سے پاک نہیں یعنی معصوم نہیں اور آیت اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ کو بھول گئے اور نیز آیت وَسَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ کو پسِ پُشت ڈال دیا اور بات صرف اِتنی تھی کہ اس حدیث میں بھی یہودیوں کا ذَبّ اور دفع اعتراض منظور تھا چونکہ وہ لوگ طرح طرح کے ناگفتنی بہتان حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر لگاتے تھے اِس لئے خدا کے پاک رسول نے گواہی دی کہ یہودیوں میں سے مسِّ شیطان سے کوئی پاک نہ تھا اگر پاک تھے تو صرف حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ تھی نعوذ باللہ اس حدیث کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ ایک حضرت عیسیٰؑ اور ان کی والدہ ہی معصوم ہیں اور ان کے سوا کوئی نبی ہو یا رسول ہو مسِّ شیطان سے معصوم نہیں ہے۔

(ایام الصلح صفحہ ۱۱۶ - ۱۱۷)

۱۷۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۝

مریم کا نام بھی ایک واقعہ پر دلالت کرتا ہے اور وہ یہ کہ جب مریم کا لڑکا عیسیٰ پیدا ہؤا تو وہ اپنے اہل و عیال سے دُور تھی اور مریم وطن سے دُور رہنے کو کہتے ہیں۔ اِسی کی طرف اللہ جلّ شانہٗ اشارہ فرما کر کہتا ہے وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا یعنی مریم کو کتاب میں یاد کر جب کہ وہ اپنے اہل سے ایک شرقی مکان میں دُور پڑی ہوئی تھی۔ سو خدا نے مریم کے لفظ کی وجہ تسمیہ یہ قرار دی کہ مریم حضرت عیسیٰؑ کے پیدا ہونے کے وقت اپنے لوگوں سے دُور و مہجور تھی۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اس کا لڑکا عیسیٰ قوم سے قطع کیا جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہؤا اور حضرت مسیح اپنے ملک سے نکل گئے اور جیسا کہ

---

[1] الحجر آیت ۴۱

بیان کیا گیا ہے کشمیر میں جا کر وفات پائی اور اب تک کشمیر میں ان کی قبر موجود ہے۔

(ست بچن بار دوم صفحہ ۱۶۰ بقیہ حاشیہ در حاشیہ)

مریم: قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا۝

وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِّلنَّاسِ الآيَه ..... اور ہم اس کو لوگوں کے لئے رحمت کا نشان بنائیں گے اور یہ امر پہلے ہی سے قرار پایا ہوا تھا۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم طبع اوّل صفحہ ۵۱۶ بقیہ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

حضرت مسیح کے وقت میں یہودیوں میں ایک فرقہ صدوقی نام تھا جو قیامت سے منکر تھے۔ پہلی کتابوں میں بطور پیشین گوئی کے لکھا گیا تھا کہ ان کو سمجھانے کے لئے مسیح کی ولادت بغیر باپ کے ہوگی اور یہ ان کے لئے ایک نشان قرار دیا گیا تھا جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ دوسری آیت میں فرماتا ہے وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِّلنَّاسِ۔ اِس جگہ اَلنَّاس سے مراد وہی صدوقی فرقہ ہے جو اُس زمانہ میں بکثرت موجود تھا۔ چونکہ توریت میں قیامت کا ذکر بظاہر کسی جگہ معلوم نہیں ہوتا اِس لئے یہ فرقہ مُردوں کے جی اُٹھنے سے بکلّی منکر ہو گیا تھا۔ اب تک بائیبل کے بعض صحیفوں میں موجود ہے کہ مسیح اپنی ولادت کے رُو سے بطور عِلْمُ السَّاعَة کے ان کے لئے آیا تھا۔

(الحق دہلی صفحہ ۳۸ - ۳۹)

مریم: فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَىٰ جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يَا لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَٰذَا وَكُنتُ نَسْيًا مَّنسِيًّا۝

میری دعوت کی مشکلات میں سے ایک رسالت اور وحی الٰہی اور مسیح موعود ہونے کا دعویٰ تھا۔ اسی کی نسبت میری گھبراہٹ ظاہر کرنے کے لئے یہ الہام ہوا تھا فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلَىٰ جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَ يَا لَيْتَنِي مِتُّ قَبْلَ هَٰذَا وَكُنتُ نَسْيًا مَّنسِيًّا۔ مخاض سے مراد اِس جگہ وہ امور ہیں جن سے خوفناک نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ اور جِذْعِ النَّخْلَة سے مراد وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کی اولاد مگر صرف نام کے مسلمان ہیں۔ بامحاورہ ترجمہ یہ ہے کہ درد انگیز دعوت جس کا نتیجہ قوم کا جانی دشمن ہو جانا تھا اس مامور کو قوم کے لوگوں کی طرف لائی جو کھجور کی خشک شاخ یا جڑ کی مانند ہیں تب اس نے خوف کھا کر کہا کہ کاش مَیں اِس سے پہلے مرجاتا اور بھولا بسرا

ہو جاتا۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۵۳ حاشیہ)

مریم: ۲۹ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّ مَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا۝

اگر استعارہ کے رنگ میں یا اور بناء پر خدا تعالیٰ نے مریم کو ہارون کی ہمشیرہ ٹھہرایا ہے تو آپ کو اس سے کیوں تعجب ہوا جبکہ قرآن شریف بجائے خود بار بار بیان کر چکا ہے کہ ہارون نبی حضرت موسیٰؑ کے وقت میں تھا اور یہ مریم حضرت عیسیٰؑ کی والدہ تھی جو چودہ سو برس بعد ہارون کے پیدا ہوئی تو گویا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ ان واقعات سے بے خبر ہے اور نعوذ باللہ اس نے مریم کو ہارون کی ہمشیرہ ٹھہرانے میں غلطی کی ہے ...... اور ممکن ہے کہ مریم کا کوئی بھائی ہو جس کا نام ہارون ہو عدم علم سے عدم شئی تو لازم نہیں آتا ...... قرآن شریف میں تو یہ بھی لفظ نہیں کہ ہارون نبی کی مریم ہمشیرہ تھی صرف ہارون کا نام ہے نبی کا لفظ وہاں موجود نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہودیوں میں یہ رسم تھی کہ نبیوں کے نام تبرکاً رکھے جاتے تھے۔ سو قرین قیاس ہے کہ مریم کا کوئی بھائی ہوگا جس کا نام ہارون ہوگا۔ اور اس بیان کو محل اعتراض سمجھنا سراسر حماقت ہے۔

(چشمۂ مسیحی طبع اوّل ص۲۵ - ۲۸)

مریم: ۳۱ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا۝

اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ سے مراد فہم کتاب ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۰؍ نومبر ۱۹۰۱ء ص۳)

مریم: ۳۲، ۳۳ وَّ جَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا۝ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا۝

وَجَعَلَنِیْ مُبَارَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ مسیح کو خدا نے ایسی برکت دی ہے کہ جہاں جائے گا وہ مبارک ہوگا۔ ...... اس نے خدا سے بڑی برکت پائی اور وہ فوت نہ ہوا جب تک اس کو ایک شاہانہ عزت نہ دی گئی۔

(مسیح ہندوستان میں طبع اوّل ص۵۲)

حضرت مسیح فرماتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے مجھے فرمایا ہے نماز پڑھتا رہ اور زکوٰۃ دیتا رہ اور اپنی والدہ پر احسان

کرتا رہ جب تک تُو زندہ ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ان تمام تکلیفاتِ شرعیہ کا آسمان پر بجا لانا محال ہے اور جو شخص مسیح کی نسبت یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ زندہ مع جسدہٖ آسمان کی طرف اُٹھایا گیا اس کو اِس آیتِ موصوفہ بالا کے منشاء کے موافق یہ بھی ماننا پڑے گا کہ تمام احکامِ شرعی جو انجیل اور توریت کی رُو سے انسان پر واجب العمل ہوتے ہیں وہ حضرت مسیح پر اب بھی واجب ہیں حالانکہ یہ تکلیف مالا یطاق ہے۔ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو خدا تعالیٰ یہ حکم دیوے کہ اے عیسیٰ جب تک تُو زندہ ہے تیرے پر واجب ہے کہ تُو اپنی والدہ کی خدمت کرتا رہے اور پھر آپ ہی اس کے زندہ ہونے کی حالت میں ہی اس کو والدہ سے جدا کر دیوے اور تا بحیات زکوٰۃ کا حکم دیوے اور پھر زندہ ہونے کی حالت میں ہی ایسی جگہ پہنچا دے جس جگہ نہ وہ آپ زکوٰۃ دے سکتے ہیں اور نہ زکوٰۃ کے لئے کسی دوسرے کو نصیحت کر سکتے ہیں اور صلوٰۃ کے لئے تاکید کرے اور جماعتِ مومنین سے دُور پھینک دیوے جن کی رفاقت صلوٰۃ کی تکمیل کے لئے ضروری تھی۔ کیا ایسے اُٹھائے جانے سے بجز بہت سے نقصان عمل اور ضائع ہونے حقوق عباد اور فوت ہونے خدمت امرِ معروف اور نہی منکر کے کچھ اَور بھی فائدہ ہوا۔ اگر یہی اٹھارہ سو اکانوے برس زمین پر زندہ رہتے تو ان کی ذات جامع البرکات سے کیا کیا نفع خلق اللہ کو پہنچتا لیکن ان کے اوپر تشریف لے جانے سے بجز اس کے اَور کونسا نتیجہ نکلا کہ ان کی اُمّت بگڑ گئی اور وہ خدماتِ نبوّت کے بجا لانے سے بکلّی محروم رہ گئے۔ (ازالہ اوہام حصّہ دوم طبع اوّل صـ ۴۳۶-۴۳۷)

اِس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ انجیلی طریق پر نماز پڑھنے کے لئے حضرت عیسیٰ کو وصیّت کی گئی تھی اور وہ آسمان پر عیسائیوں کی طرح نماز پڑھتے ہیں اور حضرت یحییٰ ان کی نماز کی حالت میں ان کے پاس یونہی پڑے رہتے ہیں مُردے جو ہوئے اور جب دُنیا میں حضرت عیسیٰ آئیں گے تو برخلاف اس وصیّت کے اُمّتی بن کر مسلمانوں کی طرح نماز پڑھیں گے۔

(ازالہ اوہام حصّہ دوم طبع اوّل صـ ۶۰۱)

آیت وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا سے موت ثابت ہوئی کیونکہ کچھ شک نہیں کہ جیسا کہ کھانے پینے سے اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام بروئے نصِّ قرآنی معطل ہیں ایسا ہی دوسرے افعالِ جسمانی زکوٰۃ اور صلوٰۃ سے بھی معطل ہیں بلکہ زکوٰۃ تو علاوہ جسمانیّت کے مال کو بھی چاہتی ہے اور آسمان پر روپیہ پیسہ ہونا معلوم۔ (ایّام الصلح صـ ۱۴۰)

خدا نے مجھے حکم دے رکھا ہے کہ جب تک مَیں زندہ ہوں نماز پڑھتا رہوں اور زکوٰۃ دوں اب بتلاؤ کہ آسمان پر وہ زکوٰۃ کس کو دیتے ہیں۔ (تحفہ گولڑویہ طبع اوّل صـ ۳)

پہلی حالت انسان کی نیک بختی کی ہے کہ والدہ کی عزّت کرے۔ اویس قرنی کے لئے بسا اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یمن کی طرف مُنہ کر کے کہا کرتے تھے کہ مجھے یمن کی طرف سے خدا کی خوشبو آتی ہے۔ آپؐ

یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ وہ اپنی والدہ کی فرمانبرداری میں بہت مصروف رہتا ہے اور اِسی وجہ سے میرے پاس بھی نہیں آسکتا۔ بظاہر یہ بات ایسی ہے کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں مگر وہ ان کی زیارت نہیں کر سکتے صرف اپنی والدہ کی خدمت گذاری اور فرمانبرداری میں پوری مصروفیت کی وجہ سے۔ مگر مَیں دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو ہی آدمیوں کو السلام علیکم کی خصوصیّت سے وصیّت فرمائی یا اویس کو یا مسیح کو۔ یہ ایک عجیب بات ہے جو دوسرے لوگوں کو ایک خصوصیت کے ساتھ نہیں ملی۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب حضرت عمرؓ اُن سے ملنے کو گئے تو اویس نے فرمایا کہ والدہ کی خدمت میں مصروف رہتا ہوں اور میرے اُونٹوں کو فرشتے چرایا کرتے ہیں۔ ایک تو یہ لوگ ہیں جنہوں نے والدہ کی خدمت میں اِس قدر سعی کی اور پھر یہ قبولیّت اور عزت پائی۔ ایک وہ ہیں جو پیسہ پیسہ کے لئے مقدمات کرتے ہیں اور والدہ کا نام ایسی بُری طرح لیتے ہیں کہ رذیل قومیں چوڑھے چمار بھی کم لیتے ہوں گے۔ ہماری تعلیم کیا ہے؟ صرف اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک ہدایت کا بتلا دینا ہے۔ اگر کوئی میرے ساتھ تعلق ظاہر کرکے اس کو ماننا نہیں چاہتا تو وہ ہماری جماعت میں کیوں داخل ہوتا ہے؟ ایسے نمونوں سے دوسروں کو ٹھوکر لگتی ہے اور وہ اعتراض کرتے ہیں کہ ایسے لوگ ہیں جو ماں باپ تک کی بھی عزت نہیں کرتے۔ مَیں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ مادر پدر آزاد کبھی خیر و برکت کا مونہہ نہ دیکھیں گے پس نیک نیتی کے ساتھ اور پوری اطاعت اور فرمانبرداری کے رنگ میں خدا رسول کے فرمودہ پر عمل کرنے کو تیار ہو جاؤ بہتری اسی میں ہے ورنہ اختیار ہے۔ ہمارا کام صرف نصیحت کرنا ہے۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۲ مئی ۱۸۹۹ء صفحہ ۴)

مریم: ۳۴ وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا۝

اِس آیت میں واقعاتِ عظیمہ جو حضرت مسیح کے وجود کے متعلق تھے صرف تین بیان کئے گئے ہیں حالانکہ اگر رفع اور نزول واقعاتِ صحیحہ میں سے ہیں تو ان کا بیان بھی ضروری تھا۔ کیا نعوذ باللہ رفع اور نزول حضرت مسیح کا مورد اور محلِّ سلامِ الٰہی نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ سو اِس جگہ پر خدا تعالیٰ کا اُس رفع اور نزول کو ترک کرنا جو مسیح ابنِ مریم کی نسبت مسلمانوں کے دلوں میں بسا ہوا ہے صاف اِس بات پر دلیل ہے کہ وہ خیالِ ہیچ اور خلافِ واقعہ ہے بلکہ وہ رفع یَوْمَ اَمُوْتُ میں داخل ہے اور نزول سراسر باطل ہے۔

(ازالہ اوہام حصّہ دوم طبع اوّل صفحہ ۶۰۵)

مریم: ۳۶ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحٰنَهٗ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا

فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

خدا اپنی ذات میں کامل ہے اس کو کچھ حاجت نہیں کہ بیٹا بناوے کون سی کسر اس کی ذات میں رہ گئی تھی جو بیٹے کے وجود سے پوری ہوگئی اور اگر کوئی کسر نہیں تھی تو پھر کیا بیٹا بنانے میں خدا ایک فضول حرکت کرتا جس کی اس کو کچھ ضرورت نہ تھی وہ تو ہر یک عبث کام اور ہر یک حالت ناتمام سے پاک ہے۔ جب کسی بات کو کہتا ہے ہو۔ تو ہو جاتی ہے۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۳۵ بقیہ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ۝

قرآن شریف میں ادریس نبی کے حق میں ہے وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا اور اس کے ساتھ توفّی کا کہیں لفظ نہیں تاہم علماء ادریس کی وفات کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اس جہان سے ایسا اٹھایا گیا کہ پھر نہیں آئے گا یعنی مر گیا کیونکہ بغیر مرنے کے کوئی اس جہان سے ہمیشہ کے لئے رخصت نہیں ہوسکتا وجہ یہ کہ اس دُنیا سے نکلنے اور بہشت میں داخل ہونے کا موت ہی دروازہ ہے كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ[1]۔ اور اگر انہیں کہا جائے کہ کیا ادریس آسمان پر مر گیا یا پھر آکر مرے گا یا آسمان پر ہی اس کی رُوح قبض کی جائے گی تو ادریس کے دوبارہ دُنیا میں آنے سے صاف انکار کرتے ہیں۔ اور چونکہ دخولِ جنّت سے پہلے موت ایک لازمی امر ہے لہٰذا ادریس کا فوت ہو جانا مان لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رفع کے اِس جگہ معنے موت ہی ہیں۔ پھر جبکہ مسیح کے رفع کے ساتھ توفّی کا لفظ بھی موجود ہے تو کیوں اور کس دلیل سے اس کی حیات کے لئے ایک شورِ قیامت برپا کر دیا ہے۔

(ازالہ اوہام حصہ دوم طبع اوّل صفحہ ۵۵۰-۵۵۱)

یہ آیت حضرت ادریس کے حق میں ہے اور کچھ شک نہیں کہ اس آیت کے یہی معنی ہیں کہ ہم نے ادریس کو موت دے کر مکانِ بلند میں پہنچا دیا کیونکہ اگر وہ بغیر موت کے آسمان پر چڑھ گئے تو پھر بوجہ ضرورت موت جو ایک انسان کے لئے ایک لازمی امر ہے یہ تجویز کرنا پڑے گا کہ یا تو وہ کسی وقت اوپر ہی فوت ہو جائیں اور یا زمین پر آکر فوت ہوں مگر یہ دونوں شق ممتنع ہیں کیونکہ قرآن شریف سے ثابت ہے کہ جسمِ خاکی موت کے بعد پھر خاک ہی میں داخل کیا جاتا ہے اور خاک ہی کی طرف عود کرتا ہے اور خاک ہی سے اس کا حشر ہوگا اور ادریس کا پھر زمین پر آنا اور دوبارہ آسمان سے نازل ہونا قرآن اور حدیث سے ثابت نہیں لہٰذا یہ امر ثابت ہے

---

[1] آلِ عمران آیت ۱۸۶

کہ رفع سے مراد اس جگہ موت ہے مگر ایسی موت جو عزت کے ساتھ ہو جیسا کہ مقربین کے لئے ہوتی ہے کہ بعد موت ان کی روحیں علیین تک پہنچائی جاتی ہیں۔ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ[1]
(ازالہ اوہام حصہ دوم طبع اول ص ۵۹۹-۶۰۰)

وَ اَمَّا قَوْلُهٗ تَعَالٰی فِیْ قِصَّةِ اِدْرِیْسَ وَ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِیًّا فَاتَّفَقَ الْمُحَقِّقُوْنَ مِنَ الْعُلَمَاءِ اَنَّ الْمُرَادَ مِنَ الرَّفْعِ هٰهُنَا هُوَ الْاِمَاتَةُ بِالْاِكْرَامِ وَ رَفْعُ الدَّرَجَاتِ وَ الدَّلِیْلُ عَلٰی ذٰلِكَ اَنَّ لِكُلِّ اِنْسَانٍ مَوْتٌ مُقَدَّرٌ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰی كُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ وَلَا یَجُوْزُ الْمَوْتُ فِی السَّمٰوٰتِ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰی وَ فِیْهَا نُعِیْدُكُمْ وَلَا نَجِدُ فِی الْقُرْاٰنِ ذِكْرَ نُزُوْلِ اِدْرِیْسَ وَ مَوْتِهٖ وَ دَفْنِهٖ فِی الْاَرْضِ فَثَبَتَ بِالضَّرُوْرَةِ اَنَّ الْمُرَادَ مِنَ الرَّفْعِ الْمَوْتُ۔ فَحَاصِلُ الْكَلَامِ اَنَّ كُلَّمَا یُخَالِفُ الْقُرْاٰنَ وَ یُعَارِضُ قِصَصَهٗ فَهِیَ اَبَاطِیْلُ وَ اَكَاذِیْبُ۔ وَ اِنَّمَا هُوَ تَقَوُّلُ الْمُفْتَرِیْنَ۔ (حمامۃ البشریٰ ص ۳۴)

قطعی اور یقینی یہی امر ہے کہ حضرت مسیح بجسدہ العنصری آسمان پر نہیں گئے بلکہ موت کے بعد آسمان پر گئے ہیں۔ بھلا ہم ان لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا موت کے بعد حضرت یحییٰ اور حضرت آدم اور حضرت ادریس اور حضرت ابراہیم اور حضرت یوسف وغیرہ آسمان پر اٹھائے گئے تھے یا نہیں اگر نہیں اٹھائے گئے تو پھر کیونکر معراج کی رات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب کو آسمانوں میں دیکھا اور اگر اٹھائے گئے تھے تو پھر ناحق مسیح ابن مریم کی رفع کے کیوں اور طور پر معنے کئے جاتے ہیں۔ تعجب کہ توفّی کا لفظ جو صریح وفات پر دلالت کرتا ہے

ترجمہ :۔ اور حضرت ادریس کے قصہ میں خدا کا یہ قول کہ "وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِیًّا" "ہم نے اس کو ایک بلند مقام کی طرف اٹھایا" اس بارہ میں محقق علماء اس بات پر متفق ہیں کہ یہاں رفع سے مراد عزت کے ساتھ موت دینا اور درجات کا بلند کرنا ہے اور اس پر دلیل یہ ہے کہ ہر انسان کے لئے موت مقدر ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ[2] (ہر ایک جو زمین پر ہے فنا ہونے والا ہے) اور آسمانوں میں موت کا جواز نہیں پایا جاتا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "وَفِیْهَا نُعِیْدُكُمْ[3]" (اور ہم اسی زمین میں تم کو لوٹائیں گے) اور ہم قرآن میں ادریس کے نزول اور اس کی موت اور زمین میں دفن ہونے کا ذکر نہیں پاتے۔ پس بالضرور ثابت ہوا کہ رفع سے مراد موت ہے۔ الغرض حاصل کلام یہ ہے کہ ہر بات جو قرآن کے مخالف ہو اور اس کے قصوں کے مخالف ہو تو وہ باطل، جھوٹ اور افتراء کرنے والوں کی من گھڑت باتیں ہیں۔ (حمامۃ البشریٰ ص ۳۴)

---

[1] القمر آیت ۵۶ ؁ [2] الرحمٰن آیت ۲۷ ؁ [3] طٰہٰ آیت ۵۶ ؁

جا بجا ان کے حق میں موجود ہے اور اٹھائے جانے کا نمونہ بھی بدیہی طور پر کھلا ہے کیونکہ وہ انہیں فوت شدہ لوگوں میں جا ملے جو ان سے پہلے اُٹھائے گئے تھے اور اگر کہو کہ وہ لوگ اٹھائے نہیں گئے تو میں کہتا ہوں کہ وہ پھر آسمان میں کیونکر پہنچ گئے آخر اٹھائے گئے تبھی تو آسمان میں پہنچے۔ کیا تم قرآن شریف میں یہ آیت نہیں پڑھتے وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا کیا یہ وہی رفع نہیں ہے جو مسیح کے بارہ میں آیا ہے؟ کیا اس کے اُٹھائے جانے کے معنی نہیں ہیں۔ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ[1] (ازالہ اوہام حصہ دوم طبع اوّل صفحہ ۶۲۶-۶۲۷)

قرآن شریف میں ہر ایک جگہ رفع سے مراد رفع روحانی ہے بعض نادان کہتے ہیں کہ قرآن شریف میں یہ آیت بھی ہے کہ رَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا اور اس پر خود تراشیدہ قصہ بیان کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ شخص ادریس تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے مع جسم آسمان پر اُٹھا لیا تھا لیکن یہ یاد رہے کہ یہ قصہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قصے کی طرح ہمارے کم فہم علماء کی غلطی ہے اور اصل حال یہ ہے کہ اِس جگہ بھی رفع روحانی ہی مراد ہے۔ تمام مومنوں اور رسولوں اور نبیوں کا مرنے کے بعد رفع روحانی ہوتا ہے اور کافر کا رفع روحانی نہیں ہوتا چنانچہ آیت لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ[2] کا اسی کی طرف اشارہ ہے۔ اور اگر حضرت ادریس مع جسم عنصری آسمان پر گئے ہوتے تو بموجب نص صریح آیت فِيْهَا تَحْيَوْنَ[3] جیسا کہ حضرت مسیح کا آسمانوں پر سکونت اختیار کر لینا ممتنع تھا ایسا ہی ان کا بھی آسمان پر ٹھہرنا ممتنع ہے کیونکہ خدا تعالیٰ اِس آیت میں قطعی فیصلہ دے چکا ہے کہ کوئی شخص آسمان پر زندگی بسر نہیں کر سکتا بلکہ تمام انسانوں کے لئے زندہ رہنے کی جگہ زمین ہے۔

علاوہ اس کے اِس آیت کے دوسرے فقرہ میں جو فِيْهَا تَمُوْتُوْنَ[4] ہے یعنی زمین پر ہی مروگے صاف فرمایا گیا ہے کہ ہر ایک شخص کی موت زمین پر ہوگی پس اس سے ہمارے مخالفوں کو یہ عقیدہ رکھنا بھی لازم آیا کہ کسی وقت حضرت ادریس بھی آسمان پر سے نازل ہوں گے حالانکہ دُنیا میں یہ کسی کا عقیدہ نہیں اور طرفہ یہ کہ زمین پر حضرت ادریس کی قبر بھی موجود ہے جیسا کہ حضرت عیسیٰ کی قبر موجود ہے۔

(کتاب البریہ طبع اوّل صفحہ ۲۰۳-۲۰۴ حاشیہ)

ہم نے اِس کو یعنی اس نبی کو عالی مرتبہ کی جگہ پر اُٹھا لیا۔ اِس آیت کی تشریح یہ ہے کہ جو لوگ بعد موت خدا تعالیٰ کی طرف اُٹھائے جاتے ہیں ان کے لئے کئی مراتب ہوتے ہیں سو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے اس نبی کو بعد اٹھانے کے یعنی وفات دینے کے اُس جگہ عالی مرتبہ دیا۔ نواب صدیق حسن خان اپنی تفسیر فتح البیان میں لکھتے ہیں کہ اِس جگہ رفع سے مراد رفع روحانی ہے جو موت کے بعد ہوتا ہے ورنہ یہ محذور لازم آتا ہے کہ وہ نبی

---

[1] یونس آیت ۳۳ ◊ [2] الاعراف آیت ۴۱ ◊ [3][4] الاعراف آیت ۲۶ ◊

مرنے کے لئے زمین پر آوے۔ (ضمیمہ براہینِ احمدیہ حصّہ پنجم طبع اوّل صفحہ ۲۱۲ حاشیہ)

رَفَعۡنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا میں ان کو ماننا پڑا ہے کہ ادریس مرگیا۔ صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ اگر حضرت ادریس کو ایسا مانیں تو پھر ان کے بھی واپس آنے کا عقیدہ رکھنا پڑتا ہے جو صحیح نہیں۔ تعجب ہے کہ حضرت عیسیٰ کے لئے توفّی موجود ہے پھر بھی اس کی موت سے انکار کرتے ہیں۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ ؍نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

مریم ۷۲-۷۳ وَاِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا‌ ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتۡمًا مَّقۡضِيًّا ۚ‏ ثُمَّ نُنَجِّى الَّذِيۡنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيۡنَ فِيۡهَا جِثِيًّا‏

صفت ظلومیّت انسان کی مراتبِ سلوک کا ایک مرکب اور اس کے مقاماتِ قرب کے لئے ایک عظیم الشان ذریعہ اس کو عطا کیا گیا ہے جو بوجہ مجاہداتِ شاقہ کے اوائل حال میں نارِ جہنّم کی شکل پر تجلّی کرتا ہے لیکن آخر نعماءِ جنّت تک پہنچا دیتا ہے اور درحقیقت قرآن کریم کے دوسرے مقام میں جو یہ آیت ہے وَاِنۡ مِّنۡكُمۡ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتۡمًا مَّقۡضِيًّا ثُمَّ نُنَجِّى الَّذِيۡنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيۡنَ فِيۡهَا جِثِيًّا یہ بھی درحقیقت صفتِ محمودہ ظلومیّت کی طرف ہی اشارہ کرتی ہے اور ترجمہ آیت یہ ہے کہ تم میں سے کوئی بھی ایسا نفس نہیں جو آگ میں وارد نہ ہو۔ یہ وہ وعدہ ہے جو تیرے ربّ نے اپنے پر امرِ لازم اور واجب الادا ٹھہرا رکھا ہے۔ پھر ہم اس آگ میں وارد ہونے کے بعد متقیوں کو نجات دے دیتے ہیں اور ظالموں کو یعنی ان کو جو مشرک اور سرکش ہیں جہنّم میں زانو پر گرے ہوئے چھوڑ دیتے ہیں۔ اِس جگہ اَلظَّالِمِیْن پر جو الف لام آیا ہے وہ فائدہ تخصیص کا دیتا ہے اور اس سے غرض یہ ہے کہ ظالم دو قسم کے ہیں (۱) ایک متقی ظالم جن کی نجات کا وعدہ ہے اور جو خدا تعالیٰ کے پیارے ہیں اور جو آیت فَمِنۡهُمۡ ظَالِمٌ[1] میں ناجیوں میں شمار کئے گئے ہیں۔ (۲) دوسرے مشرک اور کافر اور سرکش ظالم جو جہنّم میں گرائے جائیں گے۔ اور اِس آیت میں بیان فرمایا کہ متقی بھی اُس نار کی مَس سے خالی نہیں ہیں۔ اِس بیان سے مراد یہ ہے کہ متقی اِس دُنیا میں جو دار الابتلاء ہے انواع اقسام کے پیرایہ میں بڑی مردانگی سے اُس نار میں اپنے تئیں ڈالتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے لئے اپنی جانوں کو ایک بھڑکتی ہوئی آگ میں گراتے ہیں اور طرح طرح کے آسمانی قضاء و قدر بھی نار کی شکل میں اُن پر وارد ہوتے ہیں وہ ستائے

---

[1] الفاطر آیت ۳۳

جاتے اور دُکھ دیئے جاتے ہیں اور اِس قدر بڑے بڑے زلزلے ان پر آتے ہیں کہ ان کے ماسوا کوئی ان زلازل کی برداشت نہیں کرسکتا اور حدیثِ صحیح میں ہے کہ تپ بھی جو مومن کو آتا ہے وہ نارِ جہنّم میں سے ہے اور مومن بوجہ تپ اور دوسری تکالیف کے نار کا حصّہ اِسی عالَم میں لے لیتا ہے اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ مومن کے لئے اِس دنیا میں بہشت دوزخ کی صورت میں متمثّل ہوتا ہے یعنی خدا تعالیٰ کی راہ میں تکالیفِ شاقہ جہنّم کی صورت میں اس کو نظر آتی ہیں پس وہ بطیبِ خاطر اس جہنّم میں وارد ہو جاتا ہے تو معًا اپنے تئیں بہشت میں پاتا ہے۔ اسی طرح اور بھی احادیثِ نبویّہ بکثرت موجود ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ مومن اِسی دُنیا میں نارِ جہنّم کا حصّہ لے لیتا ہے اور کافر جہنّم میں بجبر و اکراہ گرایا جاتا ہے لیکن مومن خدا تعالیٰ کے لئے آپ آگ میں گرتا ہے۔ ایک اَور حدیث اسی مضمون کی ہے جس میں لکھا ہے کہ ایک حصّہ نار کا ہر یک بشر کے لئے مقدّر ہے چاہے تو وہ اِس دُنیا میں اُس آگ کو اپنے لئے خدا تعالیٰ کی راہ میں قبول کر لیوے اور چاہے تو تنعّم اور غفلت میں عمر گزار دے اور آخرت میں اپنے تنعّم کا حساب دیوے اور آیت وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کے ایک دوسرے معنے بھی ہیں اور وہ یہ ہے کہ عالَمِ آخرت میں ہر یک سعید اور شقی کو متمثّل کرکے دکھلا دیا جائے گا کہ وہ دنیا میں سلامتی کی راہوں میں چلا۔ یا اُس نے ہلاکت اور موت اور جہنّم کی راہیں اختیار کیں سو اُس دن وہ سلامتی کی راہ جو صراطِ مستقیم اور نہایت باریک راہ ہے جس پر چلنے والے بہت تھوڑے ہیں اور جس سے تجاوز کرنا اور اِدھر اُدھر ہونا درحقیقت جہنّم میں گرنا ہے تمثّل کے طور پر نظر آجائے گی اور جو لوگ دُنیا میں صراطِ مستقیم پر چل نہیں سکے وہ اس روز اس صراط پر بھی چل نہیں سکیں گے کیونکہ وہ صراط درحقیقت دُنیا کی روحانی صراط کا ہی ایک نمونہ ہے اور جیسا کہ ابھی رُوحانی آنکھوں سے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ہماری صراط کے دائیں بائیں درحقیقت جہنّم ہے اگر ہم صراط کو چھوڑ کر دائیں طرف ہوئے تب بھی جہنّم میں گرے اور اگر بائیں طرف ہوئے تب بھی گرے اور اگر سیدھے صراطِ مستقیم پر چلے تب جہنّم سے بچ گئے یہی صورت جسمانی طور پر عالَمِ آخرت میں ہمیں نظر آجائے گی اور ہم آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ درحقیقت ایک صراط ہے جو پُل کی شکل پر دوزخ پر بچھایا گیا ہے جس کے دائیں بائیں دوزخ ہے تب ہم مامور کئے جائیں گے کہ اُس پر چلیں۔ سو اگر ہم دُنیا میں صراطِ مستقیم پر چلتے رہے ہیں اور دائیں بائیں نہیں چلے تو ہم کو اس صراط سے کچھ بھی خوف نہیں ہوگا اور نہ جہنّم کی بھاپ ہم تک پہنچے گی اور نہ کوئی فزع اور خوف ہمارے دل پر طاری ہوگا بلکہ نورِ ایمان کی قوت سے چمکتی ہوئی برق کی طرح ہم اس سے گذر جائیں گے کیونکہ ہم پہلے اُس سے گذر چکے ہیں۔ اسی کی طرف اللہ جلّ شانہٗ اشارہ فرماتا ہے مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ[1] (الجزو ۲۰ سورۃ النمل)

---

[1] النمل آیت ۹۰

یعنی نیکی کرنے والوں کو قیامت کے دن اس نیکی سے زیادہ بدلہ ملے گا اور وہ ہر ایک ڈر سے اس دن امن میں رہیں گے۔ ایسا ہی فرمایا ہے یٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ[1] (الجزء ۲۵) یعنی اے میرے بندو آج کے دن کچھ تم کو خوف نہیں اور نہ کوئی غم تمہیں ہو سکتا ہے لیکن جو شخص دُنیا میں صراطِ مستقیم پر نہیں چلا وہ اس وقت بھی چل نہیں سکے گا اور دوزخ میں گرے گا اور جہنم کی آگ کا ہیمہ بن جائے گا جیسا کہ اللہ جلشانہٗ فرماتا ہے وَمَنْ جَآءَ بِالسَّیِّئَۃِ فَکُبَّتْ وُجُوْھُھُمْ فِی النَّارِ ھَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ[2] (الجزء ۲۰) یعنی بدی کرنے والے اس دن جہنم میں گرائے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ یہ جزا درحقیقت وہی تمہارے اعمال ہیں جو تم دُنیا میں کرتے تھے یعنی خدا تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرے گا بلکہ نیکی کے اعمال جنّت کی صورت میں اور بدی کے اعمال دوزخ کی صورت میں ظاہر ہو جائیں گے۔

جاننا چاہیئے کہ عالَمِ آخرت درحقیقت دنیوی عالَم کا ایک عکس ہے اور جو کچھ دُنیا میں روحانی طور پر ایمان اور ایمان کے نتائج اور کفر اور کفر کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ عالَمِ آخرت میں جسمانی طور پر ظاہر ہو جائیں گے۔ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی[3] یعنی جو اِس جہان میں اندھا ہے وہ اُس جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ ہمیں اس تمثّلی وجود سے کچھ تعجب نہیں کرنا چاہیئے اور ذرا سوچنا چاہیئے کہ کیونکر روحانی امور عالَمِ رؤیا میں متمثّل ہو کر نظر آجاتے ہیں اور عالَمِ کشف تو اس سے بھی عجیب تر ہے کہ باوجود عدمِ غیبتِ حِس اور بیداری کے روحانی امور طرح طرح کے جسمانی اشکال میں انہی آنکھوں سے دکھائی دیتے ہیں جیسا کہ بسا اوقات عین بیداری میں ان روحوں سے ملاقات ہوتی ہے جو اِس دُنیا سے گذر چکی ہیں اور وہ اسی دُنیوی زندگی کے طور پر اپنے اصلی جسم میں اسی دُنیا کے کپڑوں میں سے ایک پوشاک پہنے ہوئے نظر آتے ہیں اور باتیں کرتے ہیں اور بسا اوقات ان میں سے مقدس لوگ باذنہٖ تعالیٰ آئندہ کی خبریں دیتے ہیں اور وہ خبریں مطابق واقعہ نکلتی ہیں بسا اوقات عین بیداری میں ایک شربت یا کسی قسم کا میوہ عالَمِ کشف سے ہاتھ میں آتا ہے اور وہ کھانے میں نہایت لذیذ ہوتا ہے اور ان سب امور میں یہ عاجز خود صاحبِ تجربہ ہے کشف کی اعلیٰ قسموں میں سے یہ ایک قسم ہے کہ بالکل بیداری میں واقع ہوتی ہے اور یہاں تک اپنے ذاتی تجربے سے دیکھا گیا ہے کہ ایک شیریں طعام یا کسی قسم کا میوہ یا شربت غیب سے نظر کے سامنے آگیا ہے اور وہ ایک غیبی ہاتھ سے مُنہ میں پڑتا جاتا ہے اور زبان کی قوتِ ذائقہ اس کے لذیذ طعم سے لذّت اُٹھاتی جاتی ہے اور دوسرے لوگوں سے باتوں کا سلسلہ بھی جاری ہے

---

[1] الزخرف آیت ۶۹ ‌ [2] النمل آیت ۹۱ ‌ [3] بنی اسرائیل آیت ۷۳

اور حواس ظاہری بخوبی اپنا اپنا کام دے رہے ہیں اور یہ شربت یا میوہ بھی کھایا جارہا ہے اور اس کی لذّت اور حلاوت بھی ایسی ہی کھلے کھلے طور پر معلوم ہوتی ہے بلکہ وہ لذّت اس لذّت سے نہایت اَلطف ہوتی ہے اور یہ ہرگز نہیں کہ وہ وہم ہوتا ہے یا صرف بے بنیاد تخیلات ہوتے ہیں بلکہ واقعی طور پر وہ خدا جسکی شان بِکُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمٌ[1] ہے ایک قسم کے خلق کا تماشا دکھا دیتا ہے پس جبکہ اسی قسم کے خلق اور پیدائش کا دُنیا میں ہی نمونہ دکھائی دیتا ہے اور ہر یک زمانہ کے عارف اس کے بارے میں گواہی دیتے چلے آئے ہیں تو پھر وہ تمثّلی خلق اور پیدائش جو آخرت میں ہوگی اور میزان اعمال نظر آئے گی اور پُل صراط نظر آئیگا اور ایسا ہی بہت سے اَور امور روحانی جسمانی تشکّل کے ساتھ نظر آئیں گے اُس سے کیوں عقلمند تعجب کرے کیا جس نے یہ سلسلہ تمثّلی خلق اور پیدائش کا دُنیا میں ہی عارفوں کو دکھا دیا ہے اس کی قدرت سے یہ بعید ہے کہ وہ آخرت میں بھی دکھا دے بلکہ ان تمثّلات کو عالمِ آخرت سے نہایت مناسبت ہے کیونکہ جس حالت میں اس عالم میں جو کمال انقطاع کا تجلّی گاہ نہیں ہے یہ تمثّلی پیدائش تزکیہ یافتہ لوگوں پر ظاہر ہوجاتی ہے تو پھر عالمِ آخرت میں جو اکمل اور اتم انقطاع کا مقام ہے کیوں نظر نہ آوے۔

یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہیئے کہ انسان عارف پر اسی دُنیا میں وہ تمام عجائبات کشفی رنگوں میں کھل جاتے ہیں کہ جو ایک محجوب آدمی قصّہ کے طور پر قرآن کریم کی اُن آیات میں پڑھتا ہے جو معاد کے بارے میں خبر دیتی ہیں سو جس کی نظر حقیقت تک نہیں پہنچتی وہ ان بیانات سے تعجب میں پڑجاتا ہے بلکہ لبسا اوقات اس کے دل میں اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا عدالت کے دن تخت پر بیٹھنا اور ملایک کا صف باندھے کھڑے ہونا اور ترازو میں عملوں کا تلنا اور لوگوں کا پُل صراط پر سے چلنا اور سزا جزا کے بعد موت کو بکرے کی طرح ذبح کردینا اور ایسا ہی اعمال کا خوش شکل یا بدشکل انسانوں کی طرح لوگوں پر ظاہر ہونا اور بہشت میں دُودھ اور شہد کی نہریں چلنا وغیرہ وغیرہ یہ سب باتیں صداقت اور معقولیت سے دُور معلوم ہوتی ہیں لیکن یہ تمام شکوک اس ایک ہی نقطہ کے حل ہونے سے رفع ہوجاتے ہیں کہ عالمِ آخرت ایک تمثّلی خلق کا عالم ہے یہ خدا تعالیٰ کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے کہ وہ بعض اشیا کو تمثّلی طور پر ایسا ہی پیدا کردیتا ہے جیسا دوسرے طور پر ہُوا کرتا ہے جیسے تم دیکھتے ہو کہ آئینہ میں تمہاری ساری شکل منعکس ہوجاتی ہے اور تم خیال کرسکتے ہو کہ کس طرح عکسی طور پر تمہاری تصویر کھینچی جاتی ہے کیسے تمہارے تمام خال و خط اس میں آجاتے ہیں اور پھر اگر خدا تعالیٰ روحانی امور کی سچ مچ تصویر کھینچ کر اور ان میں صداقت کی جان

---

[1] ؎

ڈال کر تمہاری آنکھوں کے سامنے رکھ دیوے تو کیوں اس سے تعجب کیا جاوے اللہ جلّ شانہٗ ڈھونڈنے والوں پر اِسی دُنیا میں یہ تمام صداقتیں ظاہر کر دیتا ہے اور آخرت میں کوئی بھی ایسا امر نہیں جس کی کیفیت اس عالم میں کھل نہ سکے۔

اور اگر یہ اعتراض کسی کے دل میں خلجان کرے کہ آیت وَ اِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کے بعد میں یہ آیت ہے کہ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا یعنی پھر ہم ورود دوزخ کے بعد متقیوں کو نجات دے دیں گے اور ظالموں کو دوزخ میں گرے ہوئے چھوڑ دیں گے اور نجات دینے کے مفہوم میں یہ بات داخل ہے کہ اوّل انسان کسی عذاب یا بلا میں مبتلا ہو پھر اس سے اس کو رہائی بخشی جاوے لیکن ان معنوں کی رُو سے نعوذ باللہ لازم آتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے مقرب بندے کسی حد تک عذابِ دوزخ میں مبتلا ہو جائیں گے اور پھر اس سے ان کو نجات دی جائے گی تو اس وہم کا یہ جواب ہے کہ نجات کا لفظ اِس جگہ اپنے حقیقی معنوں پر مستعمل نہیں بلکہ اس سے صرف اِس قدر مراد ہے کہ مومنوں کا نجات یافتہ ہونا اس وقت ہم ظاہر کر دیں گے اور لوگوں کو دکھائیں گے کہ وہ اس سخت قلق اور کرب کی جگہ سے نجات پا کر اپنی مرادات کو پہنچ گئے اور قرآن کریم میں یہ سُنّت اللہ ہے کہ بعض الفاظ اپنی اصلی حقیقت سے پھر کر مستعمل ہوتے ہیں جیسا کہ فرماتا ہے وَ اَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا[1] یعنی قرض دو اللہ کو قرض اچھا۔ اب ظاہر ہے کہ قرض کی اصل تعریف کے مفہوم میں یہ داخل ہے کہ انسان حاجت اور لاچاری کے وقت دوسرے سے بوقت دیگر ادا کرنے کے عہد پر کچھ مانگتا ہے لیکن اللہ جلّ شانہٗ حاجت سے پاک ہے۔ پس اِس جگہ قرض کے مفہوم میں سے صرف ایک چیز مراد لی گئی یعنی اس طور سے لینا کہ پھر دوسرے وقت اس کو واپس دے دینا اپنے ذمہ واجب ٹھہرا لیا ہو۔ ایسا ہی یہ آیت وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ[2] اصل مفہوم سے پھیری گئی کیونکہ عرفِ عام میں آزمائش کرنے والا اس نتیجہ سے غافل اور بے خبر ہوتا ہے جو امتحان کے بعد پیدا ہوتا ہے مگر اس سے اِس جگہ یہ مطلب نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے امتحان میں ڈالنے سے یہ مطلب ہے کہ تا شخص زیرِ امتحان پر اس کے اندرونی عیب یا اندرونی خوبیاں کھول دے۔ غرض اسی طرح پر یہ لفظ نجات بھی اپنے حقیقی معنوں سے پھیرا گیا ہے جیسا کہ ایک دوسری آیت میں اس کی تصریح ثابت ہے اور وہ یہ ہے۔ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝ وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ

---

[1] المزمّل آیت ۲۱ ۔ [2] البقرہ آیت ۱۵۶ ۔

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۞[1] (الجزء ۲۴ سورۃ الزمر)
یعنی قیامت کے دن تُو دیکھے گا کہ جنہوں نے خدا تعالیٰ پر جھوٹ بولا ان کے مُنہ کالے ہیں (اور کیوں کالے نہ ہوں) کیا یہ لائق نہیں کہ متکبّر لوگ جہنم میں ہی گرائے جائیں اور اللہ تعالیٰ متقیوں کو نجات دے گا اس طور سے کہ ان کو ان کی مرادات تک پہنچائے گا ان کو بُرائی نہیں لگے گی اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اب یہ آیت اس پہلی آیت کی گویا تفسیر کرتی ہے کیونکہ اس میں نجات دینے کی حقیقت یہ کھولی ہے کہ وہ اپنی مرادات کو پہنچ جائیں گے اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ وہ اس دن بُرائی کے مَسّ سے بالکل محفوظ ہوں گے ایک ذرہ تکلیف ان کو چھوئے گی بھی نہیں اور غم ان کے نزدیک نہیں آئے گا۔

اور اِس آیت وَ اِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ دراصل مخاطب وہی لوگ ہوں کہ جو عذابِ دوزخ میں گرفتار ہوں۔ پھر بعض ان میں سے کہ کچھ حصّہ تقویٰ کا رکھتے ہیں اس عذاب سے نجات پاویں اور دوسرے دوزخ میں ہی گرے رہیں اور یہ معنے اس حالت میں ہوں گے کہ جب اس خطاب سے ابرار اور اخیار اور تمام مقدس اور مقرب لوگ باہر رکھے جائیں لیکن حق بات یہ ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ کی کلام کا منشاء وہی معنے معلوم ہوتے ہیں جو ابھی ہم لکھ چکے ہیں وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ وَ اِلَیْہِ الْمَرْجَعُ وَالْمَآبُ۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام طبع اوّل صفحہ ۱۴۳ تا صفحہ ۱۵۱)

وَ اِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُهَا یعنی تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو دوزخ میں وارد نہ ہو۔

(شہادت القرآن طبع دوم صفحہ ۳۷)

اے بَد و اور اے نیکو تم میں سے کوئی بھی نہیں جو جہنّم کی آگ پر گذر نہ کرے مگر وہ جو خدا کے لئے اس آگ میں پڑتے ہیں وہ نجات دیئے جائیں گے لیکن جو اپنے نفسِ امّارہ کے لئے آگ پر چلتا ہے وہ آگ اسے کھا جائے گی پس مبارک وہ جو خدا کے لئے اپنے نفس سے جنگ کرتے ہیں اور بدبخت وہ جو اپنے نفس کے لئے خدا سے جنگ کر رہے ہیں اور اس سے موافقت نہیں کرتے جو شخص اپنے نفس کے لئے خدا کے حکم کو ٹالتا ہے وہ آسمان میں ہرگز داخل نہیں ہوگا سو تم کوشش کرو جو ایک نقطہ یا ایک شعشہ قرآن شریف کا بھی تم پر گواہی نہ دے تا تم اسی کے لئے پکڑے نہ جاؤ کیونکہ ایک ذرہ بدی کا بھی قابلِ پاداش ہے وقت تھوڑا ہے اور کارِ عمر ناپیدا۔ تیز قدم اُٹھاؤ جو شام نزدیک ہے جو کچھ پیش کرنا ہے وہ بار بار دیکھ لو ایسا نہ ہو کہ کچھ رہ جائے اور زیاں کاری کا موجب ہو یا سب گندی اور کھوٹی متاع ہو جو شاہی دربار میں پیش کرنے کے

---

[1] الزمر آیت ۶۱، ۶۲

لائق نہ ہو۔ (کشتی نوح طبع اوّل صفحہ ۲۳)

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ضرور انبیاء اور صلحا کو بھی دُنیا میں ایک ایسا وقت آتا ہے کہ نہایت درجے کی مصیبت کا وقت اور سخت جانکاہ مشکل ہوتی ہے اور اہلِ حق بھی ایک دفعہ اس صعوبت میں وارد ہوتے ہیں مگر خدا جلد تر ان کی خبر گیری کرتا اور ان کو اس سے نکال لیتا ہے۔ اور چونکہ وہ ایک تقدیر معلق ہوتی ہے اسی واسطے ان کی دعاؤں اور ابتہال سے ٹل جایا کرتی ہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا۝ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا۝ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا۝ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا۝

اور کہتے ہیں کہ رحمان نے حضرت مسیح کو بیٹا بنا لیا ہے یہ تم نے اے عیسائیو ایک چیز بھاری کا دعویٰ کیا۔ نزدیک ہے جو اس سے آسمان و زمین پھٹ جاویں اور پہاڑ کانپنے لگیں کہ تم انسان کو خدا بناتے ہو۔ پھر بعد اس کے جب ہم دیکھتے ہیں کہ کیا اس خدا بنانے میں یہودی لوگ جو اوّل وارث توریت کے تھے جن کے عہدِ عتیق کی پیشگوئیاں سراسر غلط فہمی کی وجہ سے پیش کی جاتی ہیں کیا کبھی انہوں نے جو اپنی کتابوں کو روز تلاوت کرنے والے تھے اور ان پر غور کرنے والے تھے اور حضرت مسیح بھی ان کی تصدیق کرتے تھے کہ یہ کتابوں کا مطلب خوب سمجھتے ہیں ان کی باتوں کو مانو۔ کیا کبھی انہوں نے ان بہت سی پیش کردہ پیشگوئیوں میں سے ایک کے ساتھ اتفاق کر کے اقرار کیا کہ ہاں یہ پیشگوئی حضرت مسیح کو خدا بتاتی ہے اور آنے والا مسیح انسان نہیں بلکہ خدا ہوگا تو اِس بات کا کچھ بھی پتہ نہیں لگتا کہ ایک دانا سوچ سکتا ہے کہ اگر حضرت مسیح سے ان کو کچھ بخل اور بغض پیدا ہوتا تو اس وقت پیدا ہوتا جب حضرت مسیح تشریف لائے پہلے تو وہ لوگ بڑی محبت سے اور بڑی غور سے انصاف و آزادی سے ان پیشگوئیوں کو دیکھا کرتے تھے اور ہر روز ان کتابوں کی تلاوت کرتے تھے اور تفسیریں لکھتے تھے پھر کیا غضب کی بات ہے کہ یہ مطلب ان سے بالکل پوشیدہ رہا۔

(جنگِ مقدس طبع اوّل روئیداد ۲۹ مئی ۱۸۹۳ء صفحہ ۸۸، ۸۹)

مسیح کو جو انسان ہے خدا کر کے ماننا یہ امر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسا گراں اور اس کے غضب کا موجب ہے کہ قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ جائیں پس یہ بھی مخفی طور پر اِس امر کی طرف اشارہ ہے کہ جب دُنیا خاتمہ کے قریب آجائے گی تو یہی مذہب ہے جس کی وجہ سے انسانوں کی زندگی کی صف لپیٹ دی جائے گی اِس آیت سے بھی یقینی طور پر سمجھا جاتا ہے کہ گو کیسا ہی اسلام غالب ہو اور گو تمام ملتیں ایک ہلاک شدہ جانور کی طرح ہو جائیں لیکن یہ مقدر ہے کہ قیامت تک عیسائیت کی نسل منقطع نہیں ہوگی بلکہ بڑھتی جائے گی اور ایسے لوگ بکثرت پائے جائیں گے کہ جو بہائم کی طرح بغیر سوچنے سمجھنے کے حضرت مسیح کو خدا جانتے رہیں گے یہاں تک کہ ان پر قیامت برپا ہو جائے گی۔ (تحفہ گولڑویہ طبع اوّل صفحہ ۷۸،۷۹)

خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں پیشگوئی کے طور پر فرمایا تھا کہ ایک وہ نازک وقت آنے والا ہے کہ قریب ہے کہ تثلیث کے غلبہ کے وقت آسمان پھٹ جائیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر جائیں یہ سب باتیں ظہور میں آگئیں اور اِس قدر حد سے زیادہ عیسائیت کی دعوت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب میں غلو کیا گیا کہ قریب ہے کہ وہ راست باز جو اخلاص کی وجہ سے آسمانی کہلاتے ہیں گمراہ ہو جائیں اور زمین پھٹ جائے یعنی تمام زمینی آدمی بگڑ جائیں اور وہ ثابت قدم لوگ جو جبالِ راسخہ کے مشابہ ہیں گر جائیں اور قرآن شریف کی وہ آیت جس میں یہ پیشگوئی ہے یہ ہے۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا

اور آیت چونکہ ذوالوجہین ہے اِس لئے دوسرے معنے اس کے یہ بھی ہیں کہ قیامتِ کبریٰ کے قریب عیسائیت کا زمین پر بہت غلبہ ہو جائے گا جیسا کہ آجکل ظاہر ہو رہا ہے اور اس آیت کریمہ کا منشا یہ ہے کہ اگر اس فتنہ کے وقت خدا تعالیٰ اپنے مسیح کو بھیج کر اصلاح اس فتنہ کی نہ کرے تو فی الفور قیامت آجائے گی اور آسمان پھٹ جائیں گے مگر چونکہ باوجود اس قدر عیسائیت کے غلو کے اور اس قدر تکذیب کے جو اَب تک کروڑہا کتابیں اور رسالے اور دو ورقہ کاغذات ملک میں شائع ہو چکے ہیں قیامت نہیں آئی تو یہ دلیل اِس بات پر ہے کہ خدا نے اپنے بندوں پر رحم کر کے اپنے مسیح کو بھیج دیا ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ خدا کا وعدہ جھوٹا نکلے۔

(تحفہ گولڑویہ طبع اوّل صفحہ ۱۱۳،۱۱۴)

فرمایا کہ قریب ہے کہ آسمان و زمین پھٹ جائیں اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں کہ زمین پر یہ ایک بڑا گناہ کیا گیا کہ انسان کو خدا اور خدا کا بیٹا بنایا اور قرآن کے اوّل میں بھی عیسائیوں کا رَدّ اور ان کا ذکر ہے جیسا کہ آیت اِيَّاكَ نَعْبُدُ اور وَلَا الضَّآلِّيْنَ سے سمجھا جاتا ہے اور قرآن کے آخر میں بھی عیسائیوں کا رَدّ ہے جیسا کہ سورۃ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَ لَمْ يُوْلَدْ سے سمجھا جاتا ہے

اور قرآن کے درمیان بھی عیسائی مذہب کے فتنہ کا ذکر ہے جیسا کہ آیت تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ سے سمجھا جاتا ہے اور قرآن سے ظاہر ہے کہ جب سے کہ دُنیا ہوئی مخلوق پرستی اور دجل کے طریقوں پر ایسا زور کبھی نہیں دیا گیا اِسی وجہ سے مباہلہ کے لئے بھی عیسائی ہی بُلائے گئے تھے نہ کوئی ہندو مُشرک۔ اور یہ جو رُوح القدس پہلے اس سے پرندوں یا حیوانوں کی شکل پر ظاہر ہوتا رہا اس میں کیا نکتہ تھا سمجھنے والا خود سمجھ لے اور اِس قدر ہم کہہ دیتے ہیں کہ یہ اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ ہمارے نبی صلعم کی انسانیت اِس قدر زبردست ہے کہ رُوح القدس کو بھی انسانیت کی طرف کھینچ لائی۔

(کشتی نوح طبع اوّل صفحہ ۷۵)

یہودیوں کی شرارتیں اور شوخیاں اسی حد تک ہیں کہ ان کی سزا اسی دُنیا میں دی جاسکتی تھی لیکن خدائیوں کی سزا یہ دُنیا برداشت نہیں کر سکتی کیونکہ ان کا عقیدہ ایسا نفرتی عقیدہ ہے جس کی نسبت خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا۔ یعنی یہ ایک ایسا بُرا کام ہے جس سے قریب ہے کہ زمین آسمان پھٹ جائیں اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ غرض یہودیوں کی چونکہ سزا تھوڑی تھی اِس لئے ان کو اسی جہان میں دی گئی اور عیسائیوں کی سزا اِس قدر سخت ہے کہ یہ جہان اس کی برداشت نہیں کر سکتا اِس لئے ان کی سزا کے واسطے دوسرا جہان مقرر ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲ مورخہ ۶ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

چالیس کروڑ انسان ایک ضعیف اور ناتواں انسان کو انہی دلائل سے خدا مان رہا ہے کہ وہ ازلی ابدی ہے زندہ آسمان پر موجود ہے اور اس نے خلق طیر کیا اور مُردوں کو زندہ کیا اور یہ مسلمان ہیں کہ اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارتے اور اپنی گردن کاٹنے کے واسطے خود ان کے ہاتھ میں چھُری دیتے اور انکی اس خطرناک بُت پرستی میں مدد کرتے ہیں جس کے واسطے خدا نے ایسا غضب ظاہر کیا تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَ تَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَ تَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۷ مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝

زمین، آسمان میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو مخلوق اور بندۂ خدا ہونے سے باہر ہو۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۳۷ بقیہ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

مریم فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِ قَوْمًا لُّدًّا ○

اور سخت جھگڑالو اس سے ملزم ہوتے ہیں۔ (کرامات الصادقین ص۱۷)

تفسیر سُورۃ طٰہٰ

بیان فرمودہ

سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اَلرَّحۡمٰنُ عَلَی الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰی ○ (۶)

خدا رحمان ہے جس نے عرش پر قرار پکڑا۔ اس قرار پکڑنے سے یہ مطلب ہے کہ اگرچہ اس نے انسان کو پیدا کر کے بہت سا قُرب اپنا اس کو دیا مگر یہ تمام تجلیات مختص الزمان ہیں یعنی تمام تشبیہی تجلیات اُس کی کسی خاص وقت میں ہیں جو پہلے نہیں تھیں مگر ازلی طور پر قرار گاہ خدا تعالیٰ کی عرش ہے جو تنزیہ کا مقام ہے کیونکہ جو فانی چیزوں سے تعلق کر کے تشبیہ کا مقام پیدا ہوتا ہے وہ خدا کی قرار گاہ نہیں کہلا سکتا وجہ یہ کہ وہ معرضِ زوال میں ہے اور ہر ایک وقت میں زوال اس کے سر پر ہے بلکہ خدا کی قرار گاہ وہ مقام ہے جو فنا اور زوال سے پاک ہے پس وہ مقام عرش ہے۔

اِس جگہ ایک اور اعتراض مخالف لوگ پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ قرآن شریف کے بعض مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن عرش کو آٹھ فرشتے اُٹھائیں گے جس سے اشارۃ النّص کے طور پر معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا میں چار فرشتے عرش کو اُٹھاتے ہیں اور اب اِس جگہ اعتراض یہ ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ تو اِس بات سے پاک اور برتر ہے کہ کوئی اس کے عرش کو اُٹھاوے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ابھی تم سُن چکے ہو کہ عرش

کوئی جسمانی چیز نہیں ہے جو اُٹھائی جائے یا اُٹھانے کے لائق ہو بلکہ صرف تنزہ اور تقدس کے مقام کا نام عرش ہے اِسی لئے اس کو غیر مخلوق کہتے ہیں ورنہ ایک مجسّم چیز خدا کی خالقیت سے کیونکر باہر رہ سکتی ہے اور عرش کی نسبت جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ سب اِستعارات ہیں پس اسی سے ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ ایسا اعتراض محض حماقت ہے۔ اب ہم فرشتوں کے اُٹھانے کا اصل نکتہ ناظرین کو سُناتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے تنزہ کے مقام میں یعنی اس مقام میں جبکہ اس کی صفت تنزہ اُس کی تمام صفات کو رُوپوش کر کے اس کو وراء الوراء اور نہاں در نہاں کر دیتی ہے جس مقام کا نام قرآن شریف کی اصطلاح میں عرش ہے تب خدا عقولِ انسانیہ سے بالاتر ہو جاتا ہے اور عقل کو طاقت نہیں رہتی کہ اس کو دریافت کر سکے تب اس کی چار صفتیں جن کو چار فرشتوں کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جو دُنیا میں ظاہر ہو چکی ہیں اس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہیں۔
(۱) اوّل ربوبیت جس کے ذریعہ سے وہ انسان کی روحانی اور جسمانی تکمیل کرتا ہے چنانچہ رُوح اور جسم کا ظہور ربوبیت کے تقاضا سے ہے اور اسی طرح خدا کا کلام نازل ہونا اور اس کے خارق عادت نشان ظہور میں آنا ربوبیت کے تقاضا سے ہے۔ (۲) دوم خدا کی رحمانیت جو ظہور میں آ چکی ہے یعنی جو کچھ اُس نے بغیر پاداشِ اعمال بیشمار نعمتیں انسان کے لئے میسّر کی ہیں یہ صفت بھی اس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے۔ (۳) تیسری خدا کی رحیمیت ہے اور وہ یہ کہ نیک عمل کرنے والوں کو اوّل تو صفت رحمانیت کے تقاضا سے نیک اعمال کی طاقتیں بخشتا ہے اور پھر صفت رحیمیت کے تقاضا سے نیک اعمال ان سے ظہور میں لاتا ہے اور اس طرح پر انکو آفات سے بچاتا ہے یہ صفت بھی اس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے۔ (۴) چوتھی صفت مالک یوم الدین ہے یہ بھی اس کے پوشیدہ وجود کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ نیکوں کو جزا اور بدوں کو سزا دیتا ہے۔ یہ چاروں صفتیں ہیں جو اُس کے عرش کو اُٹھائے ہوئے ہیں یعنی اس کے پوشیدہ وجود کا ان صفات کے ذریعہ سے اِس دُنیا میں پتہ لگتا ہے اور یہ معرفت عالمِ آخرت میں دو چند ہو جائے گی گویا بجائے چار کے آٹھ فرشتے ہو جائیں گے۔

(چشمۂ معرفت صفحہ ۲۶۶، ۲۶۷)

۹ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝

اِس سوال کے جواب میں کہ کیا خدا آسمان پر ہے فرمایا اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مالک ہے مگر لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔ اس نے اپنے آپ کو علو ہی سے منسوب کیا ہے پستی کی طرف اس کو منسوب نہیں کر سکتے سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰى۔ عُلو کو ہم مشاہدہ کرتے ہیں اور کشفی صورتوں میں آسمان سے نور نازل ہوتا ہوا دیکھا ہے گو ہم اس کی کُنہ اور کیفیت بیان نہ کر سکیں مگر یہ سچی بات ہے کہ اس کو علو ہی سے تعلق ہے بعض امور آنکھوں سے نظر آتے ہیں اور

بعض نہیں ہر صورت میں فلسفہ کام نہیں آتا پس اصل بات یہی ہے کہ ایک وقت ایسی حالت اِنسان پر آتی ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ آسمان سے اس کے دل پر کچھ گرا ہے جو اسے رقیق کر دیتا ہے اس وقت نیکی کا بیج اس میں بویا جاوے گا۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

۱۵۔ اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ﴿۱۵﴾

وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ اور میری یاد کے لئے نماز کو قائم کر۔

(براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۵۱۷ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

نماز سے بڑھ کر اَور کوئی وظیفہ نہیں ہے کیونکہ اس میں حمدِ الٰہی ہے، استغفار ہے اور درود شریف۔ تمام وظائف اور اوراد کا مجموعہ یہی نماز ہے اور اس سے ہر ایک قسم کے غم وہمّ دُور ہوتے ہیں اور مشکلات حل ہوتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر ذرا بھی غم پہنچتا تو آپؐ نماز کے لئے کھڑے ہو جاتے اور اِسی لئے فرمایا ہے اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰہِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ[1] اطمینان، سکینتِ قلب کے لئے نماز سے بڑھ کر اَور کوئی ذریعہ نہیں لوگوں نے قسم قسم کے وِرد اور وظیفے اپنی طرف سے بنا کر لوگوں کو گمراہی میں ڈال رکھا ہے اور ایک نئی شریعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کے مقابلہ میں بنا دی ہوئی ہے مجھ پر تو الزام لگایا جاتا ہے کہ مَیں نے نبوّت کا دعویٰ کیا ہے مگر مَیں دیکھتا ہوں اور حیرت سے دیکھتا ہوں کہ انہوں نے خود شریعت بنائی ہے اور نبی بنے ہوئے ہیں اور دُنیا کو گمراہ کر رہے ہیں۔ ان وظائف اور اوراد میں دُنیا کو ایسا ڈالا ہے کہ وہ خدا تعالےٰ کی شریعت اور احکام کو بھی چھوڑ بیٹھے ہیں۔ بعض لوگ دیکھے جاتے ہیں کہ اپنے معمول اور اوراد میں ایسے مُنہمک ہوتے ہیں کہ نمازوں کا بھی لحاظ نہیں رکھتے مَیں نے مولوی صاحب سے سُنا ہے کہ بعض گدی نشین شاکت مت والوں کے منتر اپنے وظیفوں میں پڑھتے ہیں۔ میرے نزدیک سب وظیفوں سے بہتر وظیفہ نماز ہی ہے نماز ہی کو سنوار سنوار کر پڑھنا چاہیئے اور سمجھ سمجھ کر پڑھو اور مسنون دعاؤں کے بعد اپنے لئے اپنی زبان میں بھی دعائیں کرو اس سے تمہیں اطمینانِ قلب حاصل ہوگا اور سب مشکلات خدا تعالیٰ چاہے گا تو اسی سے حل ہو جائیں گی۔ نماز یادِ الٰہی کا ذریعہ ہے اِسی لئے فرمایا ہے اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

---

[1] رعد آیت ۲۹۔

طٰہٰ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى

سانپ اِنسان کی نسل کا پہلا اور ابتدائی دشمن ہے اور بزبانِ حال کہتا ہے حَیَّ عَلَی الْمَوْتِ یعنی موت کی طرف آجا۔ اِس لئے اس کا نام حَیَّۃ ہُوا۔ (ضیاء الحق ص۱۱)

طٰہٰ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ۬ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ

محبت ایک عربی لفظ ہے اور اصل معنی اس کے پُر ہو جانا ہے چنانچہ عرب میں یہ مثل مشہور ہے کہ تَحَبَّبَ الْحِمَارُ یعنی جب عربوں کو یہ کہنا منظور ہو جاتا ہے کہ گدھے کا پیٹ پانی سے بھر گیا تو کہتے ہیں کہ تَحَبَّبَ الْحِمَارُ اور جب یہ کہنا منظور ہوتا ہے کہ اُونٹ نے اِتنا پانی پیا کہ وہ پانی سے پُر ہو گیا تو کہتے ہیں شَرِبَتِ الْاِبِلُ حَتّٰی تَحَبَّبَتْ اور حَبّ جو دانہ کو کہتے ہیں وہ بھی اسی سے نکلا ہے جس سے یہ مطلب ہے کہ وہ پہلے دانہ کی تمام کیفیت سے بھر گیا اور اِسی بناء پر اِحْبَاب سونے کو بھی کہتے ہیں کیونکہ جو دوسرے سے بھر جائے گا وہ اپنے وجود کو کھو دے گا گویا سو جائے گا اور اپنے وجود کی کچھ حِس اس کو باقی نہیں رہے گی۔ (نور القرآن نمبر ۲ ص۳۶)

اور اپنی طرف سے مَیں نے تجھ پر محبت ڈال دی یعنی تجھ میں ایک ایسی خاصیت رکھ دی کہ ہر ایک جو سعید ہو گا وہ تجھ سے محبت کرے گا اور تیری طرف کھنچا جائے گا مَیں نے ایسا کیا تا کہ تُو میری آنکھوں کے سامنے پرورش پاوے اور میرے رُوبرو تیرا نشوونما ہو۔ (براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۶۹)

اور اپنی طرف سے تجھ میں محبت ڈال دی ہے تا کہ میرے رُوبرو تجھ سے نیکی کی جائے۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم ص۵۱۵ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

براہین احمدیہ میں میری نسبت خدا تعالیٰ کی یہ پیشگوئی ہے اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ یعنی خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ مَیں تیری محبت لوگوں کے دلوں میں ڈالوں گا اور مَیں اپنی آنکھوں کے سامنے تیری پرورش کروں گا۔ یہ اس وقت کا الہام ہے کہ جب ایک شخص بھی میرے ساتھ تعلق نہیں رکھتا تھا

پھر ایک مدت کے بعد یہ الہام پُورا ہوُا اور ہزار ہا انسان خدا نے ایسے پیدا کئے کہ جن کے دلوں میں اس نے میری محبت بھر دی بعض نے میرے لئے جان دے دی اور بعض نے اپنی مالی تباہی میرے لئے منظور کی اور بعض میرے لئے اپنے وطنوں سے نکالے گئے اور دُکھ دئے گئے اور ستائے گئے اور ہزار ہا ایسے ہیں کہ وہ اپنے نفس کی حاجات پر مجھے مقدم رکھ کر اپنے عزیز مال میرے آگے رکھتے ہیں اور مَیں دیکھتا ہوں کہ ان کے دِل محبت سے پُر ہیں اور بہتیرے ایسے ہیں کہ اگر مَیں کہوں کہ وہ اپنے مالوں سے بکلّی دست بردار ہوجائیں یا اپنی جانوں کو میرے لئے فدا کریں تو وہ طیار ہیں جب مَیں اس درجہ کا صدق اور ارادت اکثر افراد اپنی جماعت میں پاتا ہوں تو بے اختیار مجھے کہنا پڑتا ہے کہ اے میرے قادر خدا درحقیقت ذرہ ذرہ پر تیرا تصرف ہے تُو نے اِن دلوں کو ایسے پُر آشوب زمانہ میں میری طرف کھینچا اور ان کو استقامت بخشی یہ تیری قدرت کا نشان عظیم الشان ہے۔ (حقیقۃ الوحی ۲۲۸،۲۲۹)

محبّت کا لفظ جہاں کہیں باہم انسانوں کی نسبت آیا بھی ہو اس سے درحقیقت حقیقی محبت مراد نہیں ہے بلکہ اسلامی تعلیم کی رُو سے حقیقی محبت صرف خدا سے خاص ہے اور دوسری محبّتیں غیر حقیقی اور مجازی طور پر ہیں۔ (سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب حاشیہ ص۳۳)

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝

مومن کو بھی تبلیغ دین میں حفظِ مراتب کا خیال رکھنا چاہیئے۔ جہاں نرمی کا موقعہ ہو وہاں سختی اور درشتی نہ کرے اور جہاں بجز سختی کرنے کے کام ہوتا نظر نہ آوے وہاں نرمی کرنا بھی گناہ ہے۔

گر حفظِ مراتب نہ کُنی زندیقی

دیکھو فرعون بظاہر کیسا سخت کافر انسان تھا مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسٰی کو یہی ہدایت ہوئی کہ قُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا رسول اکرم ؐ کے واسطے بھی قرآن شریف میں اِسی قسم کا حکم ہے وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا[1] مومنوں اور مسلمانوں کے واسطے نرمی اور شفقت کا حکم ہے۔

رسول اللہ ؐ اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بھی ایسی ہی حالت بیان کی گئی جہاں فرمایا ہے کہ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (پ۲۶ رکوع ۱۲) چنانچہ ایک

[1] الانفال آیت ۶۲

دوسرے مقام پر آنحضرتؐ کو مخاطب کرکے فرمایا ہے کہ منافق اور کفار کا سختی سے مقابلہ کرو چنانچہ فرماتا ہے کہ
یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ (۱۰-۱۶)
غرض اِن آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ خود خدا تعالیٰ نے بھی حفظِ مراتب کا لحاظ رکھا ہے مومنوں اور ایمانداروں کے واسطے کیسی نرمی کا حکم ہے اور کفار میں سے بعض میں مادہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ ان کو سختی کی ضرورت ہوتی ہے جس طرح بعض بیماریوں یا زخموں میں ایک حکیم حاذق کو چیر پھاڑ کی اور عملِ جراحی سے کام لینا پڑتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ ۲۱ مورخہ ۱۴۔ اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْۤ اَعْطٰى كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى

حکمتِ کاملہ الٰہیہ سے ہر یک چیز میں تحصیل غذا کے لئے پہلے ہی سے ایک قوت رکھی جاتی ہے خواہ وہ چیز پتھر ہو یا درخت یا انسان یا حیوان۔ درحقیقت یہ سب ایک ہی قوت کی تحریکوں سے حصولِ غذا کے لئے متوجہ کی جاتی ہیں اور اِس بات کے جواب میں کہ کیوں یہ چاروں قسم کی چیزیں غذا کی طالب ہیں کوئی جُدا جُدا بیان نہیں تا کسی جگہ پہلے جنم کی یادداشت اور اس کا خیال بنا رہنا سمجھا جائے اور کسی جگہ کوئی اور وجہ بتلائی جائے بلکہ درحقیقت اِن چاروں چیزوں کا تحصیل غذا کے لئے میل کرنا ایک ہی باعث سے ہے یعنی فطرتی قوت جو وجود پیدا ہونے کے ساتھ ہی اس میں پیدا ہو جاتی ہے اور اسی کی طرف اس پاک اور مقدس کلام میں اشارہ ہے جو فلسفی صداقتوں سے بھرا ہوا ہے جیسا کہ وہ جلّشانہٗ فرماتا ہے اَعْطٰى كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى یعنی تمہارا وہ خدا ہے جس نے ہر یک چیز کو مناسبِ حال اس کے وجود بخشا پھر غذا وغیرہ کی طلب کے لئے جس پر اس کی بقا موقوف ہے اس کے دل میں آپ خواہش ڈالی سو یہی صداقتِ حقہ ہے جس کو ایک قاعدہ کُلّی کے طور پر اللہ جلّشانہٗ نے اپنی کتابِ عزیز میں بیان فرما دیا ہے۔ نادانوں اور جاہلوں کی نظر محیط نہیں ہوتی اِس لئے وہ فقط ایک جزئی کو دیکھ کر اپنی غرض فاسد کے مطابق اس کے لئے ایک جھوٹا منصوبہ گھڑ لیتے ہیں اور دوسرے جزئیات کو جو اسی کے شریک ہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ (شحنۂ حق صفحہ ۲۲)

یعنی وہ خدا جس نے ہر چیز کو اس کے مناسبِ حال قویٰ اور جوارح بخشے اور پھر ان کو استعمال میں لانے کی توفیق دی۔ (جنگِ مقدس روئیداد ۵۔ جون ۱۸۹۳ء صفحہ ۴)

یعنی وہ خدا جس نے ہر یک چیز کو اس کے مناسبِ حال کمال خلقت بخشا اور پھر اس کو دوسرے کمالاتِ مطلوبہ کے لئے رہنمائی کی۔ پس یہ انعام ہے کہ ہر یک چیز کو اوّل اس کے وجود کی رُو سے وہ تمام قویٰ

وغیرہ عنایت ہوں جن کی وہ چیز محتاج ہے۔ پھر اس کے حالات مترقبہ کے حصول کے لئے اس کو راہیں دکھائی جائیں۔ (منن الرحمان ص ۹ حاشیہ متعلقہ ص ۱)

قرآن نے خدا کی معرفت عطا کرنے کے لئے دو طریق رکھے ہیں اوّل وہ طریق جس کے رُو سے اِنسانی عقل عقلی دلائل پیدا کرنے میں بہت قوی اور روشن ہو جاتی ہے اور غلطی کرنے سے بچ جاتی ہے اور دوسرا روحانی طریق..... اب دیکھو کہ عقلی طور پر قرآن نے خدا کی ہستی پر کیا کیا عمدہ اور بے مثال دلائل دئے ہیں جیسا کہ ایک جگہ فرماتا ہے رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی یعنی خدا وہ خدا ہے کہ جس نے ہر ایک شئے کے مناسبِ حال اس کو پیدائش بخشی پھر اس شئے کو اپنے کمالاتِ مطلوبہ حاصل کرنے کے لئے راہ دکھلا دی۔ اب اگر اِس آیت کے مفہوم پر نظر رکھ کر انسان سے لے کر تمام بحری اور بری جانوروں اور پرندوں کی بناوٹ تک دیکھا جائے تو خدا کی قدرت یاد آتی ہے کہ ہر ایک چیز کی بناوٹ اسکے مناسبِ حال معلوم ہوتی ہے پڑھنے والے خود سوچ لیں کیونکہ یہ مضمون بہت وسیع ہے۔

(رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب ص ۱۲۰)

یہ بات بیان کر دینے کے لائق ہے کہ جن کو خدا تعالیٰ کا ہاتھ امام بناتا ہے ان کی فطرت میں ہی امامت کی قوت رکھی جاتی ہے اور جس طرح الٰہی فطرت نے بموجب آیت کریمہ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ہر ایک چرند اور پرند میں پہلے سے وہ قوت رکھ دی ہے جس کے بارے میں خدا تعالیٰ کے علم میں یہ تھا کہ اس قوت سے اس کو کام لینا پڑے گا اسی طرح ان نفوس میں جن کی نسبت خدا تعالیٰ کے ازلی علم میں یہ ہے کہ ان سے امامت کا کام لیا جاوے گا منصبِ امامت کے مناسبِ حال کئی روحانی ملکے پہلے سے رکھے جاتے ہیں اور جن لیاقتوں کی آئندہ ضرورت پڑے گی ان تمام لیاقتوں کا بیج ان کی پاک سرشت میں بویا جاتا ہے۔

(ضرورت الامام ص ۶)

اِس عطا میں زیادہ تر دو قسم کے آدمی ہیں ایک بادشاہ، دوسرے مامور من اللہ یعنی پہلے خدا نے ان کو مامور بنایا ثُمَّ ھَدٰی یعنی پھر تبلیغ کے تمام سامان ان کے لئے مہیا کر دئے۔ جیسا کہ خدا نے ریل، تار، ڈاک، مطبع وغیرہ تمام اسباب ہمارے واسطے مہیا کر دئے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۸ مورخہ ۳ مارچ ۱۹۰۱ء ص ۱۲)

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝

وفاتِ مسیح یا ایسے مسائل کے متعلق پہلے لوگ جو کچھ کہہ آئے ان کے متعلق ہم حضرت موسیٰ کی طرح یہی کہتے ہیں کہ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّیْ یعنی گذشتہ لوگوں کے حالات سے اللہ تعالیٰ بہتر واقف ہے ہاں حال کے لوگوں کو ہم نے کافی طور پر سمجھا دیا ہے اور حجت قایم کر دی ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۶ صٹ ۔ ۳۰۔ اپریل ۱۹۰۲ء)

[۱] مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرٰى ○

بعض نہایت سادگی سے کہتے ہیں کہ سلاطین کی کتاب میں جو لکھا ہے کہ ایلیا جسم کے سمیت آسمان پر اُٹھایا گیا تو پھر کیا مسیح ابنِ مریم کے اُٹھائے جانے میں کچھ جائے اشکال ہے تو ان کو واضح ہو کہ درحقیقت ایلیا بھی خاکی جسم کے ساتھ نہیں اُٹھایا گیا تھا چنانچہ مسیح نے اس کی وفات کی طرف اشارہ کر دیا جبکہ اس نے یہودیوں کی وہ امید توڑ دی جو وہ اپنی خام خیالی سے باندھے ہوئے تھے اور کہہ دیا کہ وہ ہرگز نہیں آئے گا اور ظاہر ہے کہ اگر وہ جسمِ خاکی کے ساتھ اُٹھایا جاتا تو پھر خاک کی طرف اس کا رجوع کرنا ضروری تھا کیونکہ لکھا ہے کہ خاکی جسم خاک کی طرف ہی عود کرتا ہے مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ کیا ایلیا آسمان پر ہی فوت ہو گا یا كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ[۱] سے باہر رہے گا۔ اگر سوچ کر دیکھو تو ایلیا کی چادر گرنے والی وہی اس کا وجود تھا جو اس نے چھوڑ دیا اور نیا چولہ پہن لیا۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صٹ ۶۲، ۶۳، ۶۴)

وَلَا يَجُوْزُ الْمَوْتُ فِي السَّمٰوٰتِ لِقَوْلِهٖ تَعَالٰى وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَلَا نَجِدُ فِي الْقُرْاٰنِ ذِكْرَ نُزُوْلِ اِدْرِيْسَ وَمَوْتِهٖ وَدَفْنِهٖ فِي الْاَرْضِ فَثَبَتَ بِالضَّرُوْرَةِ اَنَّ الْمُرَادَ مِنَ الرَّفْعِ الْمَوْتُ۔

(حمامة البشرٰی صٹ ۳۴)

(ترجمہ از عربی) آسمان میں موت کا جواز ثابت نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ اور قرآن کریم میں ادریس علیہ السلام کے آسمان سے اُترنے ان کے وفات پانے اور ان کے زمین میں دفن ہونے کا ذکر موجود نہیں پس بالضرورت ثابت ہُوا کہ رفع سے مراد موت ہے۔

(حمامة البشرٰی صٹ ۳۴)

---

[۱] الرحمٰن آیت ۲۷

وہ عقیدہ جس پر خدا تعالیٰ نے علیٰ وجہ البصیرۃ مجھ کو قائم کیا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام مثل دیگر انسانوں کے انسانی عمر پاکر فوت ہوگئے ہیں اور آسمان پر مع جسم عنصری چڑھ جانا اور پھر کسی وقت مع جسم عنصری زمین پر نازل ہونا یہ سب ان پر تہمتیں ہیں قَالَ اللّٰہُ عَزَّ وَجَلَّ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا پس اصل مسئلہ جو طے ہونے اور فیصلہ ہونے کے لائق ہے وہ یہی ہے کہ کیا یہ سچ ہے کہ برخلاف عادت اللہ درحقیقت حضرت عیسٰی علیہ السلام مع جسم عنصری آسمان پر چڑھ گئے تھے اور اگر یہ نصوص صریحہ بیّنہ قرآن شریف سے ثابت ہوجائے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام درحقیقت آسمان پر مع جسم عنصری اُٹھائے گئے تھے تو پھر ان کے نازل ہونے کے بارے میں کسی بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ جو شخص مع جسم عنصری آسمان پر جائے گا اس کا واپس آنا بموجب نص قرآنی ضروری ہے پس اگر حضرت عیسٰی مع جسم آسمان پر چلے گئے ہیں تو واپس آنے میں کیا شک ہے وجہ یہ کہ اگر دوبارہ زمین پر آنے کے لئے کسی اور کام کی غرض سے ان کی کچھ ضرورت نہ ہو مگر پھر بھی مرنے کے لئے ان کا آنا ضرور ہوگا کیونکہ آسمان پر کوئی قبروں کی جگہ نہیں اور نص صریح قرآن شریف سے ثابت ہے کہ ہر ایک انسان زمین پر ہی مرے گا اور زمین میں ہی دفن کیا جائیگا اور زمین سے ہی نکالا جائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى البتہ یہ ممکن ہے کہ آسمان سے بیمار ہوکر آویں یا راہ میں بیمار ہوجائیں اور پھر زمین پر آکر مرجائیں اور یہ ہم نے اس لئے کہا کہ احادیث سے ثابت ہے کہ آنے والا عیسٰی زعفرانی رنگ کی دو چادروں میں نازل ہوگا اور تمام معبّرین کے اتفاق سے تعبیر کی رُو سے زرد رنگ چادر سے بیماری مراد ہوتی ہے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۰۰، ۲۰۱)

سوال ہُوا کہ آدم کی جنت کہاں تھی۔ فرمایا

ہمارا مذہب یہی ہے کہ زمین میں ہی تھی خدا فرماتا ہے مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ آدم کی بُود و باش آسمان پر یہ بات بالکل غلط ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۲ مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹۲)

۶۲ قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ۝

قرآن شریف میں صدہا جگہ اس بات کو پاؤگے کہ خدا تعالیٰ مفتری علی اللہ کو ہرگز سلامت نہیں چھوڑتا

اور اسی دُنیا میں اس کو سزا دیتا ہے اور ہلاک کرتا ہے۔ دیکھو اللہ تعالیٰ ایک موقعہ میں فرماتا ہے قَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰی یعنی مفتری نامراد مرے گا۔ (اربعین ۴ ص ۳)

افترا کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور مفتری ہمیشہ خائب و خاسر رہتا ہے قَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰی۔

(الحکم جلد ۸ ۱۲ مورخہ ۱۰؍ اپریل ۱۹۰۴ء ص ۸)

یاد رکھو جو مجھ سے مقابلہ کرتا ہے وہ مجھ سے نہیں بلکہ اس سے مقابلہ کرتا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے اگر ادنیٰ چپراسی کی ہتک کی جائے اور اس کی بات نہ مانی جاوے تو گورنمنٹ سے ہتک کرنے والے یا نہ ماننے والے کو سزا ملتی ہے اور باز پُرس ہوتی ہے تو پھر خدا کی طرف سے آنے والے کی بے عزتی کرنا اس کی بات کی پرواہ نہ کرنا کیونکر خالی جاسکتا ہے مَیں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اگر میرا سلسلہ خدا کی طرف سے نہیں تو یونہی بگڑ جائیگا خواہ کوئی اس کی مخالفت کرے یا نہ کرے کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ قَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰی۔

(الحکم جلد ۱۲ ۴۱ مورخہ ۱۴؍ جولائی ۱۹۰۸ء ص ۱۳)

۶۴ قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ۝

یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض جگہ خدا تعالیٰ انسانی محاورات کا پابند نہیں ہوتا یا کسی اَور زمانہ کے متروکہ محاورہ کو اختیار کرتا ہے اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ بعض جگہ انسانی گریمر یعنی صَرف و نحو کے ماتحت نہیں چلتا اس کی نظیریں قرآن شریف میں بہت پائی جاتی ہیں مثلاً یہ آیت اِنْ هٰذٰنِ لَسَاحِرَانِ انسانی نحو کی رُو سے اِنَّ هٰذَيْنِ چاہیئے۔ (حقیقۃ الوحی ص ۳۰۴ حاشیہ)

۶۹ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ۝

یعنی کچھ خوف مت کر کہ تُو غالب ہے اور فتح تیرے نام ہے۔ (تریاق القلوب ص ۳۲)

مت ڈر غلبہ تجھی کو ہے۔ (انجامِ آتھم ص ۵۹)

یعنی کچھ خوف مت کر تُو ہی غالب ہے۔ (حقیقۃ الوحی ص ۳۰۱)

مت خوف کر کہ غلبہ تجھ کو ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ اوّل ص ۱۹۶)

خدا تعالیٰ کے بندوں کے واسطے بھی اعلیٰ کا لفظ آیا اور ہمیشہ آتا ہے جیسے اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی مگر یہ تو انکسار سے ہوتا ہے۔ (البدر جلد اوّل ۱ مورخہ ۳۱ ر اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

یاد رکھو علو دو قسم کا ہوتا ہے ایک تو وہ علو ہے جو شیطانی علو اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ میں آیا ہے اور شیطان کے حق میں واعلو بھی آیا ہے جیسے فرمایا اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ یعنی تیرا یہ استعلا تکبر کے رنگ میں ہے یا واقعی تو اعلیٰ ہے ورنہ حقیقی علو تو خدا تعالیٰ کے خاص بندوں کے لئے ہے جو اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ کے موافق اس کو ظاہر کر سکتے ہیں جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی یہ علو جو خدا تعالیٰ کے خاص بندوں کو دیا جاتا ہے وہ انکسار کے رنگ میں ہوتا ہے اور شیطان کا علو استکبار سے ملا ہوا تھا۔ دیکھو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ کو فتح کیا تو آپ نے اسی طرح اپنا سر جھکایا اور سجدہ کیا جس طرح پر ان مصائب اور مشکلات کے دنوں میں جھکاتے اور سجدے کرتے تھے جب اسی مکہ میں آپ کی ہر طرح سے مخالفت کی جاتی اور دُکھ دیا جاتا تھا۔ جب آپ نے دیکھا کہ میں کس حالت میں یہاں سے گیا تھا اور کس حالت میں اب آیا ہوں تو آپؐ کا دل خدا کے شکر سے بھر گیا اور آپ نے سجدہ کیا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ ر اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

وَاَلْقِ مَا فِىْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ۝

(اس سوال کے جواب میں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کافروں نے جو جادو کیا تھا اس کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے۔ فرمایا)

جادو بھی شیطان کی طرف سے ہوتا ہے رسولوں اور نبیوں کی یہ شان نہیں ہوتی کہ ان پر جادو کا کچھ اثر ہو سکے بلکہ ان کو دیکھ کر جادو بھاگ جاتا ہے جیسے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى (۱۶/۱۲) دیکھو حضرت موسیٰؑ کے مقابل پر جادو تھا آخر موسیٰ غالب ہوا کہ نہیں۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ آنحضرت صلعم کے مقابلہ پر جادو غالب آ گیا ہم اس کو کبھی نہیں مان سکتے۔ آنکھ بند کر کے بخاری اور مسلم کو مانتے جانا یہ ہمارے مسلک کے برخلاف ہے۔ یہ تو عقل بھی تسلیم نہیں کر سکتی کہ ایسے عالی شان نبی پر جادو اثر کر گیا ہو۔ ایسی ایسی باتیں کہ اس جادو کی تاثیر سے (معاذ اللہ) آنحضرت صلعم کا حافظہ جاتا رہا یہ ہو گیا اور وہ ہو گیا کسی صورت میں صحیح نہیں ہو سکتیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی خبیث آدمی نے اپنی طرف سے ایسی باتیں ملا دی ہیں۔ گو ہم نظرِ تہذیب سے احادیث کو دیکھتے

ہیں لیکن جو حدیث قرآن کریم کے برخلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت کے برخلاف ہو اس کو ہم کب مان سکتے ہیں۔ اُس وقت احادیث جمع کرنے کا وقت تھا گو انہوں نے سوچ سمجھ کر احادیث کو درج کیا تھا مگر پوری احتیاط سے کام نہیں لے سکے وہ جمع کرنے کا وقت تھا لیکن اب نظر اور غور کرنے کا وقت ہے آثار نبی جمع کرنا بڑے ثواب کا کام ہے لیکن یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جمع کرنے والے خوب غور سے کام نہیں لے سکتے۔ اب ہر ایک کا اختیار ہے کہ خوب غور اور فکر سے کام لے جو ماننے والی ہو وہ مانے اور جو چھوڑنے والی ہو وہ چھوڑ دے ایسی بات کہ آنحضرت صلعم پر (معاذ اللہ) جادو کا اثر ہو گیا تھا اس سے تو ایمان اُٹھ جاتا ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا[۵] (۱۵/۵) ایسی ایسی باتیں کہنے والے تو ظالم ہیں نہ کہ مسلمان۔ یہ تو بے ایمانوں اور ظالموں کا قول ہے کہ آنحضرت صلعم پر (معاذ اللہ) سحر اور جادو کا اثر ہو گیا تھا اتنا نہیں سوچتے کہ جب (معاذ اللہ) آنحضرتؐ کا یہ حال ہے تو پھر اُمت کا کیا ٹھکانا وہ تو پھر غرق ہو گئی معلوم نہیں ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ جس معصوم نبی صلعم کو تمام انبیاء مسّ شیطان سے پاک سمجھتے آئے ہیں یہ ان کی شان میں ایسے ایسے الفاظ بولتے ہیں۔

(الحکم جلد ۱۱ عـ۴۲ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۷ء صـ۵)

اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝

یعنی جو شخص مجرم بن کر خدا کے پاس آئے گا تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے وہ اس میں نہ مرے گا اور نہ زندہ رہے گا مگر جو لوگ خدا کے محبّ ہیں وہ موت سے نہیں مرتے کیونکہ ان کا پانی اور ان کی روٹی ان کے ساتھ ہوتی ہے۔

(تقریر جلسۂ مذاہب صـ۹۸، ۹۹)

یعنی جو شخص مجرم ہونے کی حالت میں مرے گا اس کے لئے جہنّم ہے کہ وہ اس میں نہ مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔ اب دیکھو کہ جہنّمی کے واسطے زندگی بھی نہیں گو ابدی عذاب کے پورا کرنے کے لئے موت بھی نہیں۔

(تریاق القلوب صـ۱۰۹)

کسی چیز کی بجز خدا کے کوئی ہستی نہیں محض خدا ہے جس کا نام ہست ہے پھر اس کے زیر سایہ

---

[۵] بنی اسرائیل آیت ۴۸ ؎

ہوکر اور اس کی محبت میں محو ہوکر واصلوں کی رُوحیں حقیقی زندگی پاتی ہیں اور اس کے وصال کے بغیر زندگی حاصل نہیں ہوسکتی اِسی وجہ سے اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں کافروں کا نام مُردے رکھتا ہے اور دوزخیوں کی نسبت فرماتا ہے اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ٥ یعنی جو شخص مجرم ہونے کی حالت میں اپنے رب کو ملے گا اس کے لئے جہنّم ہے۔ نہ اس میں مرے گا نہ زندہ رہے گا یعنی اِس لئے نہیں مرے گا کہ دراصل وہ تعبّدِ ابدی کے لئے پیدا کیا گیا ہے لہٰذا اس کا وجود ضروری ہے اور اس کو زندہ بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ حقیقی زندگی وصالِ الٰہی سے حاصل ہوتی ہے اور حقیقی زندگی عین نجات ہے اور وہ بجز عشقِ الٰہی اور وصال حضرتِ عزّت کے حاصل نہیں ہوسکتی۔ اگر غیر قوموں کو حقیقی زندگی کی فلاسفی معلوم ہوتی تو وہ کبھی دعویٰ نہ کرتے کہ تمام ارواح خود بخود قدیم سے اپنا وجود رکھتے ہیں اور حقیقی زندگی سے بہرہ ور ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یہ علوم آسمانی ہیں اور آسمان سے ہی نازل ہوتے ہیں اور آسمانی لوگ ہی ان کی حقیقت کو جانتے ہیں اور دُنیا ان سے بیخبر ہے۔ (چشمۂ مسیحی صفحہ ۴۳، ۴۴)

جیسا کہ جسمی ترکیب میں انحلال ہوکر جسم پر موت آتی ہے ایسا ہی روحانی صفات میں تغیّرات پیدا ہوکر رُوح پر موت آجاتی ہے مگر جو لوگ وجہ اللہ میں محو ہوکر مرتے ہیں وہ بباعث اس اتصال کے جوان کو حضرت عزّت سے ہوجاتا ہے دوبارہ زندہ کئے جاتے ہیں اور ان کی زندگی خدا کی زندگی کا ایک ظِلّ ہوتا ہے اور پلید رُوحوں میں بھی عذاب دینے کے لئے ایک حِس پیدا کی جاتی ہے مگر وہ نہ مُردوں میں داخل ہوتے ہیں نہ زندوں میں۔ جیسا کہ ایک شخص جب سخت درد میں مُبتلا ہوتا ہے تو وہ بدحواسی کی زندگی اُس کے لئے موت کے برابر ہوتی ہے اور زمین و آسمان اُس کی نظر میں تاریک دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں کے بارہ میں خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے

اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ٥

یعنی جو شخص اپنے رب کے پاس مجرم ہوکر آئے گا اُس کے لئے جہنّم ہے وہ اس جہنّم میں نہ مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔ اور خود انسان جب کہ اپنے نفس میں غور کرے کہ کیونکر اس کی رُوح پر بیداری اور خواب میں تغیّرات آتے رہتے ہیں تو بالضرور اُس کو ماننا پڑتا ہے کہ جسم کی طرح رُوح بھی تغیّر پذیر ہے اور موت صرف تغیّر اور سلبِ صفات کا نام ہے ورنہ جسم کے تغیّر کے بعد بھی جسم کی مٹی تو بدستور رہتی ہے لیکن اس تغیّر کی وجہ سے جسم پر موت کا لفظ اطلاق کیا جاتا ہے۔ (چشمۂ معرفت صفحہ ۱۵۷، ۱۵۸)

یعنی جو شخص خدا کے پاس مجرم ہوکر آئے گا اس کی سزا جہنّم ہے نہ اس میں وہ مرے گا اور نہ زندہ رہے گا سو اِس جگہ خدا نے مُجْرِمًا کہا مُذْنِبًا نہیں کہا کیونکہ بعض صورتوں میں معصوم کو بھی مُذنب

کہہ سکتے ہیں مگر مجرم نہیں کہہ سکتے۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۱ نمبر ۵ صفحہ ۱۹۰)

اور جو کوئی خدا کے پاس مجرم کے طور پر آئے گا دوزخ میں ڈال دیا جائے گا لیکن ہمیں کہیں نہیں بتلایا گیا کہ جو کوئی رب کے پاس مُذنب ہو کر جائے گا دوزخ میں سزا پاوے گا۔ ایسا ہی قرآن شریف میں کئی آیتیں ہیں جن میں فسق۔ اِثم۔ کُفر وغیرہ تمام صورتوں میں قابلِ سزا فعل بیان کئے گئے ہیں مگر ذنب کی کہیں ایسی تعریف نہیں کی گئی۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۲ نمبر ۶ صفحہ ۲۴۱)

یعنی جو شخص مجرم بن کر آوے گا اُس کے لئے ایک جہنّم ہے جس میں نہ مرے گا اور نہ زندہ رہے گا۔ یہ کیسی صاف بات ہے۔ اصل لذت زندگی کی راحت اور خوشی ہی میں ہے بلکہ اسی حالت میں وہ زندہ متصوّر ہوتا ہے جبکہ ہر طرح کے امن اور آرام میں ہو۔ اگر وہ کسی درد مثلاً قولنج یا درد دانت ہی میں مبتلا ہو جاوے تو وہ مُردوں سے بدتر ہوتا ہے اور حالت ایسی ہوتی ہے کہ نہ تو مُردہ ہی ہوتا ہے اور نہ زندہ ہی کہلا سکتا ہے۔ پس اسی پر قیاس کرو جہنّم کے دردناک عذاب میں کیسی بُری حالت ہوگی۔ مجرم وہ ہے جو اپنی زندگی میں خدائے تعالیٰ سے اپنا تعلق کاٹ لیوے۔ اُس کو تو حکم تھا کہ وہ خدائے تعالیٰ کے لئے ہو جاتا۔ اور صادقوں کے ساتھ ہو جاتا مگر وہ ہَوا و ہَوس کا بندہ بن کر رہا اور شریروں اور دشمنانِ خدا و رسولؐ سے موافقت کرتا رہا۔ گویا اُس نے اپنے طرزِ عمل سے دکھا دیا کہ خدا تعالیٰ سے قطع کر لی ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۶۰، ۱۶۱)

خدا تعالیٰ سے جب اِنسان جدائی لے کر جاتا ہے تو اس کے تمثلات دوزخ ہوتے ہیں۔ خدا تعالیٰ کے کلام میں کذب نہیں ہے۔ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا۔ سچ فرمایا ہے جب اِنسان عذاب اور درد میں مبتلا ہے اگرچہ وہ زندہ ہے لیکن مُردوں سے بھی بدتر ہے وہ زندگی جو مرنے کے بعد انسان کو ملتی ہے وہ صلاح اور تقوٰی کے بدوں نہیں مل سکتی۔ جس کو تپ چڑھی ہوئی ہے اسے کیونکر زندہ کہہ سکتے ہیں سخت تپ میں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ رات ہے یا دن ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۷ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱)

دیکھو انسان پر جب کوئی جُرم ثابت ہو جائے تو وہ قابلِ سزا ٹھہر جاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ الآیہ

یعنی جو اپنے رَبّ کے حضور مجرم ہو کر آتا ہے اس کی سزا جہنم ہے۔ وہاں نہ وہ جیتا ہے نہ مرتا ہے۔ یہ ایک جُرم کی سزا ہے اور جو ہزاروں لاکھوں جُرموں کا مُرتکب ہو اس کا کیا حال ہوگا لیکن اگر کوئی شخص عدالت میں پیش ہو اور بعد ثبوت اس پر فردِ قرارداد جرم بھی لگ جاوے اور اس کے بعد عدالت اس کو چھوڑ دے تو

کس قدر احسانِ عظیم اس حاکم کا ہوگا۔اب غور کرو کہ یہ توبہ وہی بریّت ہے جو فردِ قرار دادِ جرم کے بعد حاصل ہوتی ہے۔توبہ کرنے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ پہلے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے اِس لئے اِنسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر دیکھے کہ کس قدر گناہوں میں وہ مبتلا تھا اور اُن کی سزا کس قدر اُس کو ملنے والی تھی جو اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے معاف کر دی۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۸ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

صرف زبان سے کہنا تو آسان ہے کہ جہنم میں پڑنا منظور۔اگر انہیں اس دُکھ درد کی کیفیت معلوم ہو تو پتہ لگے۔ایک آنکھ میں ذرا درد ہو تو معلوم ہو جاتا ہے کہ کس قدر تکلیف ہے۔پھر جہنم تو وہ جہنم ہے جس کی بابت قرآن شریف میں آیا ہے لَا یَمُوْتُ فِیْهَا وَ لَا یَحْیٰی۔ایسے لوگ سخت غلطی پر ہیں۔اس کا تو فیصلہ آسان ہے۔دُنیا میں دیکھ لے کہ کیا وہ دُنیا کی بلاؤں پر صبر کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔تو پھر یہ کیونکر سمجھ لیا کہ عذابِ جہنم کو برداشت کر لیں گے۔بعض لوگ تو دوسروں کو دھوکہ دیتے ہیں مگر یہ لوگ اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

۹۰ اَفَلَا یَرَوْنَ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّ لَا یَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا۠

قرآن شریف میں ایک مقام پر ان لوگوں کے لئے جو گوسالہ پرستی کرتے ہیں اور گوسالہ کو خدا بناتے ہیں آیا ہے اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا کہ وہ ان کی بات کا کوئی جواب اُن کو نہیں دیتا۔اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو خدا بولتے نہیں ہیں وہ گوسالہ ہی ہیں۔ہم نے عیسائیوں سے بارہا پوچھا ہے کہ اگر تمہارا خدا ایسا ہی ہے جو دُعاؤں کو سُنتا ہے اور ان کے جواب دیتا ہے تو بتاؤ وہ کس سے بولتا ہے؟ تم جو یسوع کو خدا کہتے ہو پھر اُس کو بُلا کر دکھاؤ۔مَیں دعوٰی سے کہتا ہوں کہ سارے عیسائی اکٹھے ہو کر بھی یسوع کو پکاریں وہ یقیناً کوئی جواب نہ دے گا کیونکہ وہ مَر گیا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۵ مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

مجیب اور ناطق خدا ہمارا ہی ہے جو ہماری دعاؤں کو سُنتا اور ان کے جواب دیتا ہے اور دوسرے مذاہب کے لوگ جو خدا پیش کرتے ہیں وہ لَا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا کا مصداق ہو رہا ہے۔اِس کی وجہ یہ ہے کہ بوجہ ان کے کفر اور بے دینی کے ان کی دعائیں مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ[1] کی مصداق

[1] المؤمن آیت ۵۱ ؎

ہوگئی ہیں ورنہ اللہ تعالیٰ تو سب کا ایک ہی ہے مگر ان لوگوں نے اس کی صفات کو سمجھا ہی نہیں ہے۔ پس یاد رکھو کہ ہمارا خدا ناطق خدا ہے وہ ہماری دعائیں سنتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ أَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ وَإِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ وَانْظُرْ إِلٰى إِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا○

اگرچہ یہ سچ ہے کہ بعض جگہ قرآن کریم کے مضارعات پر جب نونِ ثقیلہ ملا ہے تو وہ استقبال کے معنوں پر مستعمل ہوئے ہیں لیکن بعض جگہ ایسی بھی ہیں کہ حال کے معنے قائم رہے ہیں یا حال اور استقبال بلکہ ماضی بھی اشتراکی طور پر ایک سلسلہ متصلہ ممتدہ کی طرح مراد لئے گئے ہیں یعنی ایسا سلسلہ جو حال یا ماضی سے شروع ہوا اور استقبال کی انتہا تک بلا انقطاع برابر چلا گیا۔

پہلی آیات کی نظیر یہ ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے .... وَانْظُرْ إِلٰى إِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهٗ الخ یعنی اپنے معبود کی طرف دیکھ جس پر تُو معتکف تھا کہ اب ہم اس کو جلاتے ہیں۔ اس جگہ بھی استقبال مراد نہیں کیونکہ استقبال اور حال میں کسی قدر بُعد زمان کا ہونا شرط ہے۔ مثلاً اگر کوئی کسی کو یہ کہے کہ مَیں تجھے دس روپیہ دیتا ہوں سو لے مجھ سے دس روپیہ۔ تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوگا کہ اس نے استقبال کا وعدہ کیا ہے بلکہ یہ کہا جائے گا کہ یہ سب کارروائی حال میں ہی ہوئی۔

(الحق دہلی صفحہ ۳۲، ۳۳)

فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ أَنْ يُّقْضٰى إِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا○

قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا۔ دُعا کر کہ خدایا مجھے مراتبِ علمیہ میں ترقی بخش۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۱۸، ۴۱۹)

اے میرے ربّ تُو مجھے اپنی عظمت اور معرفتِ شیون اور صفات کا علمِ کامل بخش۔ اور پھر دوسری جگہ فرمایا وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَ اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ[۱]۔ اِن دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہؤا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو اوّل المسلمین ٹھہرے تو اس کا یہی باعث ہؤا کہ اَوروں کی نسبت علومِ معرفتِ الٰہی میں اَعلم ہیں یعنی علم ان کا معارفِ الٰہیہ کے بارے میں سب سے بڑھ کر ہے اِس لئے ان کا اسلام بھی سب سے اعلیٰ ہے اور وہ اوّل المسلمین ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس زیادتِ علم کی طرف اُس دوسری آیت میں بھی اشارہ ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا[۲] (الجزء ۵) یعنی خدا تعالیٰ نے تجھ کو وہ علوم عطا کئے جو تُو خود بخود نہیں جان سکتا تھا اور فضلِ الٰہی سے فیضانِ الٰہی سب سے زیادہ تیرے پر ہؤا یعنی تُو معارفِ الٰہیہ اور اسرار اور علومِ ربّانی میں سب سے بڑھ گیا اور خدا تعالیٰ نے اپنی معرفت کے عطر کے ساتھ سب سے زیادہ تجھے معطر کیا۔ غرض علم اور معرفت کو خدا تعالیٰ نے حقیقتِ اِسلامیہ کے حصول کا ذریعہ ٹھہرایا ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۸۶، ۱۸۷)

تیسری قوت بسطت فی العلم ہے جو امامت کے لئے ضروری ہے اور اس کا خاصّہ لازمی ہے چونکہ امامت کا مفہوم تمام حقائق اور معارف اور لوازم محبت اور صدق اور وفا میں آگے بڑھنے کو چاہتا ہے اِسی لئے وہ اپنے تمام دوسرے قویٰ کو اسی خدمت میں لگا دیتا ہے اور رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا کی دعا میں ہر دم مشغول رہتا ہے۔ اور پہلے سے اس کے مدارک اور حواس ان امور کے لئے جوہرِ قابل ہوتے ہیں اِسی لئے خدا تعالیٰ کے فضل سے علومِ الٰہیہ میں اس کو بسطت عنایت کی جاتی ہے اور اس کے زمانہ میں کوئی دوسرا ایسا نہیں ہوتا جو قرآنی معارف کے جاننے اور کمالاتِ افاضہ اور اتمامِ حجت میں اس کے برابر ہو۔ اس کی رائے صائب دوسروں کے علوم کی تصحیح کرتی ہے اور اگر دینی حقائق کے بیان میں کسی کی رائے اس کی رائے کے مخالف ہو تو حق اس کی طرف ہوتا ہے کیونکہ علومِ حقّہ کے جاننے میں نورِ فراست اس کی مدد کرتا ہے اور وہ نور ان چمکتی ہوئی شعاعوں کے ساتھ دوسروں کو نہیں دیا جاتا وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔ پس جس طرح مُرغی انڈوں کو اپنے پَروں کے نیچے لے کر ان کو بچے بناتی ہے اور پھر بچوں کو پَروں کے نیچے رکھ کر اپنے جوہر اُن کے اندر پہنچا دیتی ہے اسی طرح یہ شخص اپنے علومِ رُوحانیہ سے صحبت یابوں کو عِلمی رنگ سے رنگین کرتا رہتا ہے اور یقین اور معرفت میں بڑھاتا جاتا ہے مگر دوسرے مُلہموں اور زاہدوں

---

[۱] الانعام آیت ۱۶۴ ۔ [۲] النساء آیت ۱۱۴ ۔

کے لئے اِس قسم کی بسطتِ علمی ضروری نہیں کیونکہ نوعِ انسان کی تربیتِ علمی اُن کے سپرد نہیں کی جاتی ہے اور ایسے زاہدوں اور خواب بینوں میں اگر کچھ نقصان علم اور جہالت باقی ہے تو چنداں جائے اعتراض نہیں کیونکہ وہ کسی کشتی کے ملّاح نہیں ہیں بلکہ خود ملّاح کے محتاج ہیں۔ (ضرورت الامام صفحہ ۸)

انبیاء علیہم السلام ہمیشہ دُعا میں لگے رہتے ہیں اور ہمیشہ زیادہ نُور مانگتے رہتے ہیں۔ وہ کبھی اپنی روحانی ترقی پر سیر نہیں ہوتے اِس لئے ہمیشہ استغفار میں لگے رہتے ہیں کہ خدا ان کی ناقص حالت کو ڈھانپے اور پُورا روشنی کا پیمانہ دے اِسی وجہ سے خدائے تعالیٰ اپنے نبی کو فرماتا ہے قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا یعنی ہمیشہ علم کے لئے دعا کرتا رہ کیونکہ جیسا خدا بے حد ہے ایسا ہی اس کا علم بھی بے حد ہے۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۲ نمبر ۶ صفحہ ۲۴۴)

انبیاء کے علم میں بھی تدریجاً ترقی ہوتی ہے اِس لئے قرآن شریف میں آیا ہے قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ر مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۸)

مرشد اور مرید کے تعلقات استاد اور شاگرد کی مثال سے سمجھ لینے چاہئیں جیسے شاگرد استاد سے فائدہ اُٹھاتا ہے اسی طرح مرید اپنے مرشد سے لیکن شاگرد اگر اُستاد سے تعلق تو رکھے مگر اپنی تعلیم میں قدم آگے نہ بڑھائے تو فائدہ نہیں اُٹھا سکتا یہی حال مرید کا ہے۔ پس اِس سلسلہ میں تعلق پیدا کر کے اپنی معرفت اور علم کو بڑھانا چاہیئے۔ طالبِ حق کو ایک مقام پر پہنچ کر ہرگز ٹھہرنا نہیں چاہیئے ورنہ شیطانِ لعین اَور طرف لگا دے گا اور جیسے بند پانی میں عفونت پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح اگر مومن اپنی ترقیات کے لئے سعی نہ کرے تو وہ گر جاتا ہے۔ پس سعادت مند کا فرض ہے کہ وہ طلبِ دین میں لگا رہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی انسانِ کامل دُنیا میں نہیں گزرا لیکن آپ کو بھی رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا کی دُعا تعلیم ہوئی تھی پھر اَور کون ہے جو اپنی معرفت اور علم پر کامل بھروسہ کر کے ٹھہر جاوے اور آئندہ ترقی کی ضرورت نہ سمجھے۔ جوں جوں انسان اپنے علم اور معرفت میں ترقی کرے گا اُسے معلوم ہوتا جاوے گا کہ ابھی بہت سی باتیں حل طلب باقی ہیں بعض امور کو وہ ابتدائی نگاہ میں (اُس بچّے کی طرح جو اقلیدس کے اشکال کو محض بیہودہ سمجھتا ہے) بالکل بیہودہ سمجھتے تھے لیکن آخر وہی امور صداقت کی صورت میں اُن کو نظر آئے اِس لئے کس قدر ضروری ہے کہ اپنی حیثیت کو بدلنے کے ساتھ ہی علم کو بڑھانے کے لئے ہر بات کی تکمیل کی جاوے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۷ر جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

قوّت ذوق شوق علم سے پیدا ہوتی ہے جب تک علم اور معرفت نہ ہو کیا ہو سکتا ہے رَبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا کی دُعا میں یہ بھی ایک سِرّ ہے کیونکہ جس قدر آپ کا علم وسیع ہوتا گیا اُسی قدر آپ کی معرفت اور آپ کا

ذوق شوق ترقی کرتا گیا۔ پس اگر کوئی شخص چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت میں اُسے ذوق شوق پیدا ہو تو اُس کو اللہ تعالیٰ کی نسبت صحیح علم حاصل کرنا چاہیئے اور یہ علم کبھی حاصل نہیں ہوتا جب تک انسان صادق کی صحبت میں نہ رہے اور اللہ تعالیٰ کی تازہ بتازہ تجلیات کا ظہور مشاہدہ نہ کرے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۲۷ صفحہ ۳ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۵ء)

۱۱۶۔ وَلَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا○

یاد رہے کہ یہ حوا کا گناہ تھا کہ براہ راست شیطان کی بات کو مانا اور خدا کے حکم کو توڑا اور سچ تو یہ ہے کہ حوا کا نہ ایک گناہ بلکہ چار گناہ تھے (۱) ایک یہ کہ خدا کے حکم کی بے عزتی کی اور اُس کو جھوٹا سمجھا (۲) دوسرا یہ کہ خدا کے دشمن اور ابدی لعنت کے مستحق اور جھوٹ کے پُتلے شیطان کو سچا سمجھ لیا (۳) تیسرا یہ کہ اُس نافرمانی کو صرف عقیدہ تک محدود نہ رکھا بلکہ خدا کے حکم کو توڑ کر عملی طور پر ارتکابِ معصیت کیا۔ (۴) چوتھا یہ کہ حوا نے نہ صرف آپ ہی خدا کا حکم توڑا بلکہ شیطان کا قائم مقام بن کر آدم کو بھی دھوکا دیا تب آدم نے محض حوا کی دھوکا دہی سے وہ پھل کھایا جس کی ممانعت تھی اسی وجہ سے حوا خدا کے نزدیک سخت گناہ گار ٹھہری مگر آدم معذور سمجھا گیا محض ایک خفیف خطا جیسا کہ آیتِ کریمہ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا سے ظاہر ہے یعنی اللہ تعالیٰ اِس آیت میں فرماتا ہے کہ آدم نے عمداً میرے حکم کو نہیں توڑا بلکہ اس کو یہ خیال گزرا کہ حوا نے جو یہ پھل کھایا اور مجھے دیا شاید اُس کو خدا کی اجازت ہو گئی جو اُس نے ایسا کیا یہی وجہ ہے کہ خدا نے اپنی کتاب میں حوا کی بریت ظاہر نہیں فرمائی مگر آدم کی بریت ظاہر کی یعنی اس کی نسبت لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا فرمایا اور حوا کو سزا سخت دی مرد کا محکوم بنایا اور اس کا دستِ نگر کر دیا اور حمل کی مصیبت اور بچے جننے کا دکھ اُس کو لگا دیا اور آدم چونکہ خدا کی صورت پر بنایا گیا تھا اِس لئے شیطان اس کے سامنے نہ آسکا۔ اِس جگہ سے یہ بات نکلتی ہے کہ جس شخص کی پیدائش میں نر کا حصہ نہیں وہ کمزور ہے اور توریت کے رُو سے اس کی نسبت کہنا مشکل ہے کہ وہ خدا کی صورت پر یا خدا کی مانند پیدا کیا گیا۔ ہاں آدم بھی ضرور مر گیا لیکن یہ موت گناہ سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ مرنا ابتدا سے انسانی بناوٹ کا خاصہ تھا اگر گناہ نہ کرتا تب بھی مرتا۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۶ حاشیہ در حاشیہ)

وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا یعنی آدم نے یہ کام ارادۃً نہیں کیا اب گناہ تو ارادہ پر منحصر ہے اگر ایک شخص

زہر پی لے اور اس کو علم ہو کہ یہ زہر ہے اور اس کا نتیجہ موت ہو گا تو ایسی صورت میں وہ ایک گناہ کا مرتکب ہوتا ہے لیکن اگر وہ اس کو بغیر علم کے پی لے تو اگرچہ اس کو نتیجہ بھگتنا پڑے گا مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے گناہ کیا یہی حال حضرت آدم علیہ السلام کا ہے ہمیں بائیبل سے معلوم ہوتا ہے کہ حوا نے ان کو یہ پھل دیا تھا ان کو یہ علم نہ تھا کہ یہ وہی ممنوع پھل ہے۔ ان کا یہ کام بیشک خدائے تعالیٰ کے حکم کے خلاف تھا مگر اُنہوں نے اس حکم کو عمداً نہیں توڑا اِس لئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُنہوں نے گناہ کیا۔ اس پھل کے کھانے کا وہی نتیجہ نکلا جو زہر کھانے سے نکلتا ہے کیونکہ قدرت اپنا کام کرنے سے نہیں رُک سکتی مگر اس صورت میں کوئی گناہ نہیں تھا کیونکہ ارادہ نہیں تھا۔

حضرت آدمؑ کبھی شرک کے مرتکب نہیں ہوئے۔ شرک ایک ناقابلِ عفو گناہ ہے اور خدا کے پاک لوگ ایسا گناہ نہیں کر سکتے۔ جس آیت کا عیسائی حوالہ دیتے ہیں اس میں حضرت آدم کا نام نہیں ہے اس میں صرف عام انسانوں کے میلان کا ذکر ہے جو شرک کی طرف ان میں پایا جاتا ہے۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۲ نمبر ۶ صفحہ ۲۵۰)

فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْءَاتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِن وَرَقِ الْجَنَّةِ ۚ وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ ۝

عصٰی سے عمد تو نہیں پایا جاتا کیونکہ دوسری جگہ خود خدا تعالیٰ فرماتا ہے فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا[1]۔ عصٰی سے یاد آیا میرا ایک فقرہ ہے اَلْعَصَا عِلَاجُ مَنْ عَصٰی۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ جلالی تجلیات ہی سے اِنسان گناہ سے بچ سکتا ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۴۵ مورخہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

دِل کے خیالات پر مؤاخذہ نہیں ہوتا جب تک کہ انسان عزم نہ کرلے۔ ایک چور اگر بازار میں جاتا ہوا ایک صرّاف کی دوکان پر روپوں کا ڈھیر دیکھے اور اسے خیال آوے کاش کہ میرے پاس بھی اِس قدر روپیہ ہو اور پھر اسے چرانے کا ارادہ کرے مگر قلب اُسے لعنت کرے اور باز رہے تو گنہگار نہ ہو گا اور اگر وہ پختہ ارادہ کرلے کہ اگر موقع ملا تو ضرور چُرا لوں گا تو گنہگار ہو گا۔ آدمؑ کے قصہ میں بھی خدا فرماتا ہے وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا یعنی ہم نے اس کی عزیمت نہیں پائی۔ عصٰی آدمؑ کے معنے ہیں کہ صورت عصیان کی ہے۔ مثلاً آقا ایک غلام کو کہے کہ فلاں رستہ

---

[1] طٰہٰ آیت ۱۱۶

جا کر فلاں کام کر آؤ تو وہ اگر اجتہاد کرے اور دوسرے راہ سے جاوے تو عصیان تو ضرور ہے لیکن وہ نافرمان نہ ہوگا صرف اجتہادی غلطی ہوگی جس پر مؤاخذہ نہیں۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۳ مورخہ ۱۴ ؍ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۸، ۱۹)

۱۲۵ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى

جو شخص میرے فرمودہ سے اِعراض کرے اور اس کے مخالف کی طرف مائل ہو تو اس کے لئے تنگ معیشت ہے یعنی وہ حقائق اور معارف سے بے نصیب ہے اور قیامت کو اندھا اُٹھایا جائے گا۔ اب ہم اگر ایک حدیث کو صریح قرآن کریم کے مخالف پائیں اور پھر مخالفت کی حالت میں بھی اس کو مان لیں اور اس تخالف کی کچھ بھی پرواہ نہ کریں تو گویا اس بات پر راضی ہوگئے کہ معارفِ حقّہ سے بے نصیب رہیں اور قیامت کو اندھے اُٹھائے جائیں۔

(الحق لدھیانہ صفحہ ۳۵ طبع دوم ۱۹۰۳ء)

بہشتی زندگی والا انسان خدا کی یاد سے ہر وقت لذّت پاتا ہے اور جو بدبخت دوزخی زندگی والا ہے تو وہ ہر وقت اس دُنیا میں زقوم ہی کھا رہا ہے۔ اس کی زندگی تلخ ہوتی ہے۔ مَعِيْشَةً ضَنْكًا بھی اِسی کا نام ہے جو قیامت کے دن زقوم کی صورت پر متمثّل ہو جائے گی۔ غرض دونوں صورتوں میں باہم رشتے قائم ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳۰ مورخہ ۱۷ ؍ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

تفسیر سورۃ الانبیاء

بیان فرمودہ

سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصّلوٰۃ والسّلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

آیت ۴ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ۤ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۤ هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۚ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ ○

اور کافر باہم پوشیدہ طور پر یہ باتیں کرتے ہیں کہ یہ جو پیغمبری کا دعویٰ کرتا ہے اِس میں کیا زیادتی ہے۔ ایک تم سا آدمی ہے۔ سو کیا تم دیدہ و دانستہ جادو کے پیچ میں آتے ہو۔

(براہین احمدیہ حصہ سوم صفحہ ۲۲۰، ۲۲۱ حاشیہ نمبر ۱۱)

اے لوگو! کیا تم ایک فریب میں دیدہ و دانستہ پھنستے ہو۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۷)

آیت ۵ قٰلَ رَبِّيْ يَعْلَمُ الْقَوْلَ فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○

پیغمبر نے کہا کہ میرا خدا ہر بات کو جانتا ہے خواہ آسمان میں ہو خواہ زمین میں۔ وہ اپنی ذات میں سمیع

اور علیم ہے جس سے کوئی بات چھپ نہیں سکتی۔ (براہین احمدیہ حصّہ سوم صفحہ ۲۲۱ حاشیہ نمبر ۱۱)

۶۔ بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ۝

مگر کافر پیغمبر کی کب سُنتے ہیں وہ تو قرآن کی نسبت یہ کہتے ہیں کہ یہ پراگندہ خوابیں ہیں۔ بلکہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے آپ بنا لیا ہے۔ بلکہ ان کا یہ بھی مقولہ ہے کہ یہ شاعر ہے۔ بھلا اگر سچّا ہے تو ہمارے رُوبرو کوئی نشان پیش کردے جیسے پہلے نبی بھیجے گئے تھے۔ (براہین احمدیہ حصّہ سوم صفحہ ۲۲۱ حاشیہ نمبر ۱۱)

غور سے سُنو کہ عقلمندوں اور سوچنے والوں کے لئے میرے دعوے کے ساتھ اس قدر نشان موجود ہیں کہ اگر وہ انصاف سے کام لیں تو ان کے تسلّی پانے کے لئے نہایت کافی و شافی ذخیرہ خوارق موجود ہے۔ ہاں اگر کوئی اس شخص کی طرح جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مینہ کے بارے میں معجزہ استجابت دعا دیکھ کر یعنی کئی برسوں کے امساک باراں کے بعد مینہ برستا ہوا مشاہدہ کرکے پھر کہہ دیا تھا کہ یہ کوئی معجزہ نہیں اتفاقاً بادل آیا اور مینہ برس گیا۔ انکار سے باز نہ آوے تو ایسے شخص کا علاج ہمارے پاس نہیں۔ ایسے لوگ ہمارے سیّد و مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیشہ آسمانی نشان دیکھتے رہے پھر یہ کہتے رہے فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ۔ جو شخص سچے دِل سے خدا کا نشان دیکھنا چاہتا ہے اس کو چاہیئے کہ سب سے پہلے اس نشان پر نظر کرے کہ اس عاجز کا ظاہر ہونا عین اس وقت میں ہے جس وقت کا ذکر ہمارے سیّد خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانِ مبارک سے آپ فرمایا ہے یعنی صدی کا سر۔ پھر آپؐ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ صلیب کے غلبہ کے وقت ایک شخص پیدا ہوگا جو صلیب کو توڑے گا۔ ایسے شخص کا نام آنحضرتؐ نے مسیح ابنِ مریم رکھا ہے۔ (ضمیمہ انجام آتھم صفحہ ۱)

یاد رکھو کہ تمام نبیوں نے اُن لوگوں کو ملعون ٹھہرایا ہے جو نبیوں اور ماموروں سے اقتراحی نشان مانگتے ہیں۔ دیکھو حضرت عیسٰی علیہ السلام نے کیا فرمایا کہ اس زمانہ کے حرام کار مجھ سے نشان مانگتے ہیں انہیں کوئی نشان دکھلایا نہیں جائے گا۔ ایسا ہی قرآن نے ان لوگوں کا نام ملعون رکھا۔ جو لوگ حضرت سیّدنا محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی تجویز سے نشان مانگا کرتے تھے جن کا بار بار لعنت کے ساتھ قرآن شریف میں ذکر ہے جیسا کہ وہ لوگ کہتے تھے فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ یعنی ہمیں حضرت موسٰیؑ کے نشان دکھلائے جائیں یا حضرت مسیحؑ کے۔ اور کبھی آسمان پر چڑھ جانے کی درخواست کرتے تھے اور کبھی یہ نشان مانگتے تھے

کہ سونے کا گھر آپ کے لئے بن جائے اور ہمیشہ انہیں نفی میں جواب ملتا تھا۔ تمام قرآن شریف کو اوّل سے آخر تک دیکھو کہیں اِس بات کا نام و نشان نہ پاؤ گے کہ کسی کافر نے اپنی طرف سے یہ نشان مانگا ہو کہ کسی کی ٹانگ درست کر دو یا آنکھ درست کر دو یا مُردہ زندہ کر دو تو آنحضرتؐ نے وہی کام کر دیا ہو اور نہ انجیل میں اِس کی کوئی نظیر ملے گی کہ کفار نشان مانگنے آئے اور انہیں دکھایا گیا بلکہ ایک دفعہ خود صحابہ رضی اللہ عنہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ فلاں شخص جس کی نئی شادی ہوئی تھی اور سانپ کے کاٹنے سے مَر گیا تھا اُس کو زندہ کر دو تو آپؐ نے فرمایا کہ جاؤ اپنے بھائی کو دفن کرو۔ غرض قرآن شریف اِس بات سے بھرا پڑا ہے کہ مکّہ کے پلید اور حرام کار کافر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے طرح طرح کے نشان مانگا کرتے تھے اور ہمیشہ اِس سوال کی منظوری سے محروم رہتے اور خدا تعالیٰ سے لعنتیں سُنتے تھے۔ ایسا ہی تمام انجیل پڑھ کر دیکھ لو کہ اقتراحی نشان مانگنے والے حضرت عیسٰی علیہ السلام سے گالیاں سُنا کرتے تھے۔ سو اے عزیز کچھ خدا کا خوف کرو۔ عمر کا اعتبار نہیں۔ خدا تعالیٰ میرے ہاتھ پر نشان ظاہر کرتا ہے مگر اس سُنّت کے موافق جو قدیم سے اپنے ماموروں سے رکھتا ہے اور بلا شُبہ اس سُنّت کے اِلتزام سے ایک شخص اگر شیطان بن کر بھی آوے تب بھی اس کو الٰہی نشانوں سے قائل کر دیا جائے گا لیکن اگر خدا کی سُنّتِ قدیمہ کے مخالف دیکھنا چاہے تو اس کا اُس نعمت سے کچھ حصہ نہیں اور بالیقین وہ ایسا ہی محروم مرے گا جیسا کہ بوجہل وغیرہ محروم مر گئے۔

(تحفہ غزنویہ صفحہ ۲۹،۲۸)

کفار نے یہی سوال کیا تھا فَلْيَأْتِنَا بِآيَةٍ كَمَا أُرْسِلَ الْأَوَّلُونَ یعنی اگر یہ نبی سچا ہے تو موسٰے وغیرہ انبیاءِ بنی اسرائیل کے نشانوں کے مانند نشان دکھاوے اور مشرکین نے یہ بھی کہا کہ ہمارے مُردے ہمارے لئے زندہ کر دیوے یا آسمان پر ہمارے رُوبرو چڑھ جاوے اور کتاب لاوے جس کو ہم ہاتھ میں لے کر دیکھ لیں وغیرہ وغیرہ مگر خدائے تعالیٰ نے محکوموں کی طرح ان کی پیروی نہیں کی اور وہی نشان دکھلائے جو اس کی مرضی تھی یہاں تک کہ بعض دفعہ نشان طلب کرنے والوں کو یہ بھی کہا گیا کہ کیا تمہارے لئے قرآن کا نشان کافی نہیں اور یہ جواب نہایت پُر حکمت تھا کیونکہ ہر ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ نشان دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ کہ ان میں اور سحر و مکر و دست بازی وغیرہ میں تفرقہ و تمیز کرنا نہایت مشکل بلکہ محال ہوتا ہے اور دوسرے وہ نشان ہیں جو ان مغشوش کاموں سے بکلّی تمیز رکھتے ہیں اور کوئی شائبہ یا شبہ سحر یا مکر یا دست بازی اور حیلہ گری کا ان میں نہیں پایا جاتا۔ سو اسی دوسری قسم میں سے قرآن کریم کا معجزہ ہے جو بکلّی روشن اور ہر یک پہلو اور ہر یک طور سے لعل تاباں کی طرح چمک رہا ہے۔ لکڑی کا سانپ بنانا کوئی ممیز نشان نہیں ہے۔ حضرت موسٰیؑ نے بھی سانپ بنایا اور ساحروں نے بھی اور اب بھی بنائے جاتے ہیں مگر اب تک معلوم نہیں ہوا کہ سحر کے سانپ اور معجزہ

کے سانپ میں مابہ الامتیاز کیا ہے۔ اِسی طرح سلبِ امراض میں عمل الترب میں مشق کرنے والے خواہ وہ عیسائی ہیں یا ہندو یا یہودی یا مسلمان یا دہریہ اکثر کمال رکھتے ہیں اور البتہ بعض اوقات جذام وغیرہ امراض مزمنہ کو بمشیّتِ الٰہی اسی عمل کی تاثیر سے دُور کر دیتے ہیں۔ سو صرف شفاء امراض پر حصر رکھنا ایک دھوکہ ہے جب تک اس کے ساتھ پیشگوئی شامل نہ ہو۔ اسی طرح آجکل بعض تماشہ کرنے والے آگ میں بھی کودتے ہیں اور اس کے اثر سے بچ جاتے ہیں۔ سو کیا اِس قسم کے تماشوں سے کوئی حقیقت ثابت ہو سکتی ہے۔ من سلوٰی کا تماشہ شاید آپ نے کبھی دیکھا نہیں ایک ایک پیسہ لے کر کشمش وغیرہ برسا دیتے ہیں۔ اگر آپ آجکل کے یورپ کے تماشائیوں کو دیکھیں جو ایک مخفی فریب کی راہ سے سر کاٹ کر بھی پیوند کر دیتے ہیں تو شاید آپ ان کے دستِ بیع ہو جائیں۔ مجھے یاد ہے کہ جالندھر کے مقام میں ایک شعبدہ باز رجب علی نام نے جو آخر توبہ کر کے اِس عاجز کے سلسلہ بیعت میں داخل ہو گیا میرے مکان پر ایک مجلس میں شعبدہ دکھلایا تب آپ جیسے ایک بزرگ بول اُٹھے کہ یہ تو صریح کرامت ہے۔ حضرت ایسے کاموں سے ہرگز حقیقت نہیں کُھلتی بلکہ اس زمانہ میں تو اَور بھی شک پڑتا ہے۔ بہتیرے ایسے تماشہ کرنے والے اور طلسم دکھلانے والے پھرتے ہیں کہ اگر آپ ان کو دیکھیں تو کراماتی نام رکھیں لیکن کوئی عقلمند جس کی آجکل کے شعبدوں پر نظر محیط ہو ایسے کاموں کا نام نشانِ بیّن نہیں رکھ سکتا۔ مثلاً اگر کوئی شخص ایک کاغذ کے پرچہ کو اپنی بغل میں پوشیدہ کر کے پھر بجائے کاغذ کے اس میں سے کبوتر نکال کر دکھلا دے تو پھر آپ جیسا کوئی آدمی اگر اس کو صاحبِ کرامات کہے تو کہے مگر ایک عقلمند جو ایسے لوگوں کے فریبوں سے بخوبی واقف ہے ہرگز اُس کا نام کرامت نہیں رکھے گا بلکہ اس کو فریب اور دست بازی قرار دے گا۔ اسی وجہ سے قرآن کریم اور توریت میں سچے نبی کی شناخت کے لئے یہ علامتیں قرار نہیں دیں کہ وہ آگ سے بازی کرے یا لکڑی کے سانپ بنا دے یا اسی قسم کے اَور کرتب دکھلا دے بلکہ یہ علامت قرار دی کہ اس کی پیشگوئیاں وقوع میں آ جائیں یا اس کی تصدیق کے لئے پیشگوئی ہو کیونکہ استجابتِ دعا کے ساتھ اگر حسبِ مراد کوئی امرِ غیب خدا تعالیٰ کسی پر ظاہر کرے اور وہ پورا ہو جائے تو بلاشبہ اس کی قبولیّت پر ایک دلیل ہو گی اور یہ کہنا کہ نجومی یا رتال اس میں شریک ہیں یہ سراسر خیانت اور مخالفِ تعلیمِ قرآن ہے کیونکہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ[1] (خدا تعالیٰ بجز ان لوگوں کے جن کو وہ ہدایتِ خلق کے لئے بھیجتا ہے کسی دوسرے کو اپنے غیب پر مطلع نہیں کرتا۔ حاشیہ) پس جبکہ خدا تعالیٰ نے امورِ غیبیہ کو اپنے مرسلین کی ایک علامت خاصہ قرار دی ہے چنانچہ دوسری جگہ بھی فرمایا ہے وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ[2]

[1] الجن آیت ۲۷، ۲۸ [2] المؤمن آیت ۲۹

(اگر یہ رسول سچا ہے تو اس کی بعض پیشگوئیاں جو تمہارے حق میں ہیں پوری ہوں گی یعنی پیشگوئی کا پورا ہونا سچائی کی نشانی ہے۔ حاشیہ) تو پھر پیشگوئی کو استخفاف کی نظر سے دیکھنا اور لکڑی کا سانپ بنانے کیلئے درخواست کرنا انہیں مولویوں کا کام ہے جنہوں نے قرآن کریم میں خوض کرنا چھوڑ دیا اور نیز زمانہ کی ہوا سے بے خبر ہیں۔

(نشانِ آسمانی صفحہ ۳۲ تا ۳۵)

اَلْاَوَّلُوْنَ کا لفظ صاف بتاتا ہے کہ اب زمانہ ترقی کر گیا ہے پس اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سونٹے کا سانپ بنا کر دکھاتے تو وہ بھلا کب مؤثر ہو سکتا تھا۔ اِس قسم کے نشانات تو ابتدائے زمانہ میں کام آنیوالے تھے۔ جیسے ایک چھوٹے بچہ کے لئے جو پاجامہ سیا گیا ہے وہ اس کے بالغ ہونے پر کب کام آ سکتا ہے۔ اسیطرح پر وہ زمانہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ تھا اس قسم کے نشانات کا محتاج نہ تھا بلکہ اس میں بہت ہی اعلیٰ درجے کے خوارق کی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نشانات اپنے اندر ایک علمی سلسلہ رکھتے ہیں۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو آیا ہے کہ وہ مثیلِ موسیٰ تھے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپؐ نے عصا کا سانپ بنایا ہو۔ کافر یہی اعتراض کرتے رہے فَلْيَاْتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَاۤ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ۔ معجزہ ہمیشہ حالتِ موجودہ کے موافق ہوتا ہے پہلے نشانات کافی نہیں ہو سکتے اور نہ ہر زمانہ میں ایک ہی قسم کے نشان کافی ہو سکتے ہیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۷ مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۴)

۸۔ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْۤ اِلَيْهِمْ فَسْــَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۝

یعنی خدا کی سنتوں اور عادات کا نمونہ یہود اور نصاریٰ سے پوچھ لو اگر تمہیں معلوم نہیں۔

(کتاب البریہ صفحہ ۲۳، ۲۴)

کتبِ سابقہ میں جو بنی اسرائیلی نبیوں پر نازل ہوئی تھیں صاف اور صریح طور پر معلوم ہوتا ہے بلکہ نام لے کر بیان کیا ہے کہ یاجوج ماجوج سے مراد یورپ کی عیسائی قومیں ہیں اور یہ بیان ایسی صراحت سے ان کتابوں میں موجود ہے کہ کسی طرح اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اور یہ کہنا کہ وہ کتابیں محرّف مبدّل ہیں ان کا بیان قابلِ اعتبار نہیں۔ ایسی بات وہی کہے گا جو خود قرآن شریف سے بے خبر ہے کیونکہ اللہ جلّ شانہٗ مومنوں کو قرآن شریف میں فرماتا ہے فَسْــَٔلُوْۤا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی فلاں فلاں باتیں اہلِ کتاب

سے پُوچھ لو اگر تم بے خبر ہو۔ پس ظاہر ہے کہ اگر ہر ایک بات میں پہلی کتابوں کی گواہی ناجائز ہوتی تو خدا تعالےٰ کیوں مومنوں کو فرماتا کہ اگر تمہیں معلوم نہیں تو اہلِ کتاب سے پوچھ لو بلکہ اگر نبیوں کی کتابوں سے کچھ فائدہ اُٹھانا حرام ہے تو اس صورت میں یہ بھی ناجائز ہوگا کہ ان کتابوں میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت بطور استدلال پیشگوئیاں پیش کریں حالانکہ خود صحابہ رضی اللہ عنہم اور بعد ان کے تابعین بھی ان پیشگوئیوں کو بطور حُجت پیش کرتے رہے ہیں۔ (چشمۂ معرفت ص۸۲ حاشیہ)

اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں ہمیں حث اور ترغیب دیتا ہے کہ تم ہر ایک واقعہ اور ہر ایک امر کی جو تمہیں بتلایا گیا ہے پہلی امتوں میں نظیر تلاش کرو کہ وہاں سے تمہیں نظیر ملے گی اب ہم اس عقیدے کی نظیر کہ انسان دُنیا سے جاکر پھر آسمان سے دوبارہ دُنیا میں آسکتا ہے کہاں تلاش کریں اور کس کے پاس جاکر روویں کہ خدا کی گذشتہ عادات میں اس کا کوئی نمونہ بتلاؤ؟ ہمارے مخالف مہربانی کرکے آپ ہی بتلادیں کہ اس قسم کا واقعہ کبھی پہلے بھی ہوا ہے اور کبھی پہلے بھی کوئی انسان ہزار دو ہزار برس تک آسمان پر رہا اور پھر فرشتوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھے اُترا۔ اگر یہ عادت اللہ ہوتی تو کوئی نظیر اس کی گذشتہ قرون میں ضرور ملتی کیونکہ دُنیا تھوڑی رہ گئی ہے اور بہت گذر گئی اور آئندہ کوئی واقعہ دُنیا میں نہیں جس کی پہلے نظیر نہ ہو حالانکہ جو امر سنّت اللہ میں داخل ہے اس کی کوئی نظیر ہونی چاہیئے اللہ تعالیٰ ہمیں صاف صاف فرماتا ہے فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ یعنی ہر ایک نئی بات جو تمہیں بتلائی جائے تم اہلِ کتاب سے پوچھ لو وہ تمہیں اس کی نظیریں بتلائیں گے لیکن اس واقعہ کی یہود اور نصاریٰ کے ہاتھ بجز ایلیا کے قصّے کے کوئی اور نظیر نہیں اور ایلیا کا قصہ اس عقیدے کے برخلاف شہادت دیتا ہے اور دوبارہ آنے کو بروزی رنگ میں بتلاتا ہے۔

(ایام الصلح ص۱۴۳، ۱۴۴)

۹ وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝

دوسری آیت جو عام استدلال کے طریق سے مسیح ابنِ مریم کے فوت ہوجانے پر دلالت کرتی ہے یہ آیت ہے وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ یعنی کسی نبی کا ہم نے ایسا جسم نہیں بنایا جو کھانے کا محتاج نہ ہو اور وہ سب مر گئے کوئی ان میں سے باقی نہیں۔ ایسا ہی عام طور پر یہ بھی فرمایا وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَا۟ئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ ۝ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ

الْمَوْتِ[1] (ازالہ اوہام حصّہ اوّل صفحہ ۳۲۵)

مسیح کو زندہ خیال کرنا اور یہ اعتقاد رکھنا کہ برخلاف مفہوم آیت وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ مسیح جسمِ خاکی کے ساتھ دوسرے آسمان میں بغیر حاجت طعام کے یونہی فرشتوں کی طرح زندہ ہے درحقیقت خدا تعالیٰ کے پاک کلام سے رُوگردانی ہے۔ (ازالہ اوہام حصّہ اوّل صفحہ ۳۴۸)

جب ہم اس آیت پر بھی نظر ڈالیں کہ جو اللہ جلّ شانہٗ قرآن شریف میں فرماتا ہے کہ کوئی جسم کسی بشر کا ہم نے ایسا نہیں بنایا کہ بغیر روٹی کے زندہ رہ سکے تو ہمارے مخالفوں کے عقیدہ کے موافق یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہ آسمان پر روٹی بھی کھاتے ہوں، پاخانہ بھی پھرتے ہوں اور ضروریاتِ بشریت جیسے کپڑے اور برتن اور کھانے کی چیزیں سب موجود ہوں مگر کیا یہ سب کچھ قرآن اور حدیث سے ثابت ہو جائے گا۔ ہرگز نہیں۔ آخر ہمارے مخالف یہی جواب دیں گے کہ جس طرز سے وہ آسمان پر زندگی بسر کرتے ہیں وہ انسان کی معمولی زندگی سے نرالی ہے اور وہ انسانی حاجتیں جو زمین پر زندہ انسانوں میں پائی جاتی ہیں وہ سب اُن سے دُور کر دی گئی ہیں اور ان کا جسم اب ایک ایسا جسم ہے کہ نہ خوراک کا محتاج ہے اور نہ پوشاک کا اور نہ پاخانہ کی حاجت انہیں ہوتی ہے اور نہ پیشاب کی اور نہ زمین کے جسموں کی طرح اُن کے جسم پر زمانہ اثر کرتا ہے اور نہ وہ اب مکلّف احکامِ شرعیہ ہیں تو اس کا یہ جواب ہے کہ خدائے تعالیٰ تو صاف فرماتا ہے کہ اِن تمام خاکی جسموں کے لئے جب تک زندہ ہیں یہ تمام لوازم غیر منفک ہیں جیسا کہ اس نے فرمایا وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ ظاہر ہے کہ اِس آیت میں جز کے ذکر سے کُل مراد ہے یعنی گو اتنا ہی ذکر فرمایا کہ کسی نبی کا جسم ایسا نہیں بنایا گیا جو بغیر طعام کے رہ سکے مگر اِس کے ضمن میں کُل وہ لوازم و نتائج جو طعام کو لگے ہوئے ہیں سب اشارۃ النص کے طور پر فرما دئے۔ سو اگر مسیح ابنِ مریم اسی جسمِ خاکی کے ساتھ آسمان پر گیا ہے تو ضرور ہے کہ طعام کھاتا ہو اور پاخانہ اور پیشاب کی ضروری حاجتیں سب اُس کی دامنگیر ہوں کیونکہ کلامِ الٰہی میں کِذب جائز نہیں اور اگر یہ کہو کہ دراصل بات یہ ہے کہ مسیح اِس جسم کے ساتھ آسمان پر نہیں گیا بلکہ یہ جسم تو زمین میں دفن کیا گیا اور ایک اَور نُورانی جسم مسیح کو ملا جو کھانے پینے سے پاک تھا اُس جسم کے ساتھ اُٹھایا گیا تو حضرت یہی تو موت ہے جس کا آخر آپ نے اقرار کر لیا۔ ہمارا بھی تو یہی مذہب ہے کہ مقدس لوگوں کو موت کے بعد ایک نورانی جسم ملتا ہے اور وہی نُور جو وہ ساتھ رکھتے ہیں جسم کی طرح اُن کے لئے ہو جاتا ہے سو وہ اس کے ساتھ آسمان کی طرف اُٹھائے جاتے ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ

---

[1] الانبیآء آیت ۳۵، ۳۶

الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ[1] یعنی پاک روحیں جو نورانی الوجود ہیں خدا تعالیٰ کی طرف صعود کرتی ہیں اور عملِ صالح اُن کا رفع کرتا ہے یعنی جس قدر عملِ صالح ہو اُسی قدر رُوح کا رفع ہوتا ہے۔ (ازالہ اوہام حصّہ دوم ص۴۳۷-۴۴۰)

جب ہم اس آیت مذکورہ بالا (یعنی مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَ اُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ[2]) کو اس دوسری آیت کے ساتھ ملا کر پڑھیں کہ مَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ جس کے یہ معنی ہیں کہ کوئی ہم نے ایسا جسم نہیں بنایا کہ زندہ تو ہو مگر کھانا نہ کھاتا ہو تو اس یقینی اور قطعی نتیجہ تک ہم پہنچ جائیں گے کہ فی الواقع حضرت مسیح فوت ہو گئے کیونکہ پہلی آیت سے ثابت ہو گیا کہ اب وہ کھانا نہیں کھاتے اور دوسری آیت بتلا رہی ہے کہ جب تک یہ جسم خاکی زندہ ہے طعام کھانا اس کے لئے ضروری ہے۔ اِس سے قطعی طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ زندہ نہیں ہیں۔ (ازالہ اوہام حصّہ دوم ص۶۰۴)

درحقیقت یہی اکیلی آیت کافی طور پر مسیح کی موت پر دلالت کر رہی ہے کیونکہ جبکہ کوئی جسمِ خاکی بغیر طعام کے نہیں رہ سکتا یہی سُنّت اللہ ہے تو پھر حضرت مسیح کیونکر اب تک بغیر طعام کے زندہ موجود ہیں اور اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا[3] اور اگر کوئی کہے کہ اصحابِ کہف بھی تو بغیر طعام کے زندہ موجود ہیں تو مَیں کہتا ہوں کہ اُن کی زندگی بھی اِس جہان کی زندگی نہیں۔ مسلم کی حدیث سَو برس والی ان کو بھی مار چکی ہے۔ بیشک ہم اِس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اصحابِ کہف بھی شہداء کی طرح زندہ ہیں اِن کی بھی کامل زندگی ہے مگر وہ دُنیا کی ایک ناقصہ کثیفہ زندگی سے نجات پا گئے ہیں۔ دُنیا کی زندگی کیا چیز ہے اور کیا حقیقت۔ ایک جاہل اِسی کو بڑی چیز سمجھتا ہے اور ہر ایک قسم کی زندگی کو جو قرآن شریف میں مذکور و مندرج ہے اسی کی طرف گھسیٹتا چلا جاتا ہے۔ وہ یہ خیال نہیں کرتا کہ دُنیوی زندگی تو ایک ادنیٰ درجہ کی زندگی ہے جس کے ارذل حصّہ سے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پناہ مانگی ہے اور جس کے ساتھ نہایت غلیظ اور مکروہ لوازم لگے ہوئے ہیں۔ اگر ایک اِنسان کو اِس سفلی زندگی سے ایک بہتر زندگی حاصل ہو جائے اور سُنّت اللہ میں فرق نہ آوے تو اِس سے زیادہ اَور کونسی خوبی ہے۔ (ازالہ اوہام حصّہ دوم ص۶۰۴-۶۰۶)

لَوْ اَرَدْنَاۤ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّاۤ ۖ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ۝ [ترتیب نمبر]

---

[1] الفاطر آیت ۱۱ [2] المائدہ آیت ۷۶ [3] الفاطر آیت ۴۴

وَ اَیُّ فَائِدَۃٍ لَّکُمْ فِیْ حَیَاۃِ الْمَسِیْحِ اَیُّھَا النَّوْکٰی۔ مِنْ غَیْرِ اَنَّکُمْ تَنْصُرُوْنَ بِہٖ النَّصَارٰی اَفَلَا تَنْظُرُوْنَ اِلَی الزَّمَانِ۔ وَ قَدْ نَزَلَتْ عَلَیْکُمْ بَلِیَّۃٌ عُظْمٰی۔ وَ تَنَصَّرَ فَوْجٌ مِّنْ قَوْمِکُمْ وَاَحِبَّائِکُمْ وَ ھَلَکَتِ الْبِلَادُ وَالْعِبَادُ۔ وَاھْتَزَّ عَرْشُ الرَّحْمَانِ لِمَا نَزَلَ فَقَضٰی مَا قَضٰی۔ وَلَوْ اَرَادَ اللّٰہُ اَنْ یُّنْزِلَ اَحَدًا مِّنَ السَّمَآءِ کَمَا زَعَمْتُمْ لَکَانَ خَیْرًا لَّکُمْ اَنْ یُّنْزِلَ نَبِیَّکُمُ الْمُصْطَفٰی۔ اَمَا قَرَأْتُمْ قَوْلَہٗ تَعَالٰی لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَھْوًا لَّاتَّخَذْنٰہُ مِنْ لَّدُنَّا[1] یَعْنِیْ مُحَمَّدًا فَانْظُرُوْا نَظَرًا۔ (خطبہ الہامیہ ص۶۵)

لَوْ کَانَ فِیْہِمَآ اٰلِہَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا ۚ فَسُبْحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○[2]

اس (یعنی خدا تعالیٰ۔ ناقل) کے وحدہ لاشریک ہونے پر ایک عقلی دلیل بیان فرمائی اور کہا لَوْ کَانَ فِیْہِمَآ اٰلِہَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا۔ وَمَا کَانَ مَعَہٗ مِنْ اِلٰہٍ الخ یعنی اگر زمین آسمان میں بجز اُس ایک ذات جامع صفاتِ کاملہ کے کوئی اور بھی خدا ہوتا تو وہ دونوں بگڑ جاتے کیونکہ ضرور تھا کہ کبھی وہ جماعت خدائیوں کی ایک دوسرے کے برخلاف کام کرتے پس اسی پھوٹ اور اختلاف سے عالم میں فساد راہ پاتا اور نیز اگر الگ الگ خالق ہوتے تو ہر واحد اُن میں سے اپنی ہی مخلوق کی بھلائی چاہتا اور اُن کے آرام کے لئے دوسروں کا برباد کرنا روا رکھتا پس یہ بھی موجبِ فساد عالم ٹھہرتا۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم ص۴۴۳ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

(ترجمہ) اور مسیح علیہ السلام کی زندگی میں تم کو بجز اس کے کیا فائدہ ہے کہ پادریوں کو مدد دیتے ہو اور زمانہ کی طرف نہیں نظر کرتے ہو اور نہیں دیکھتے ہو کہ کس قدر مسلمان نصرانی ہوگئے اور کس قدر خدا کے بندے ہلاک ہوگئے۔ خدا کے بندوں پر بڑی بلا اُتری۔ اگر خدا کا یہی ارادہ ہوتا کہ کسی کو آسمان سے اُتارتا جیسا کہ تمہارا گمان ہے تو بہتر یہ تھا کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان سے اُتارتا۔ خدا نے جو فرمایا تم نے اب تک نہیں پڑھا کہ اگر ہم بیٹا بناتے تو اپنے پاس سے بیٹا بناتے۔ یعنی محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ اس آیت میں تدبر کرو۔ (خطبہ الہامیہ ص۶۵)

---

[1] الانبیاء آیت ۱۸ ✣ [2] الانبیاء آیت ۲۳ ✣ المؤمنون آیت ۹۲

ہم لوگ جو خدا تعالیٰ کو رَبّ العرش کہتے ہیں تو اس سے یہ مطلب نہیں کہ وہ جسمانی اور جسم ہے اور عرش کا محتاج ہے بلکہ عرش سے مراد وہ مقدس بلندی کی جگہ ہے جو اِس جہان اور آنے والے جہان سے برابر نسبت رکھتی ہے اور خدا تعالیٰ کو عرش پر کہنا درحقیقت ان معنوں سے مترادف ہے کہ وہ مالک الکونین ہے اور جیسا کہ ایک شخص اُونچی (جگہ) بیٹھ کر یا کسی نہایت اُونچے محل پر چڑھ کر یمین و یسار پر نظر رکھتا ہے ایسا ہی استعارہ کے طور پر خدا تعالیٰ بلند سے بلند تخت پر تسلیم کیا گیا ہے جس کی نظر سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں نہ اِس عالَم کی اور نہ اُس دوسرے عالَم کی ہاں اس مقام کو عام سمجھوں کے لئے اُوپر کی طرف بیان کیا جاتا ہے کیونکہ جبکہ خدا تعالیٰ حقیقت میں سب سے اُوپر ہے اور ہر یک چیز اس کے پیروں پر گری ہوئی ہے تو اُوپر کی طرف سے اس کی ذات کو مناسبت ہے مگر اُوپر کی طرف وہی ہے جس کے نیچے دونوں عالَم واقع ہیں اور وہ ایک انتہائی نقطہ کی طرح ہے جس کے نیچے سے دو عظیم الشان عالَم کی دو شاخیں نکلتی ہیں اور ہر یک شاخ ہزار ہا عالَم پر مشتمل ہے جن کا علم بجز اس ذات کے کسی کو نہیں جو اس نقطۂ انتہائی پر مستوی ہے جس کا نام عرش ہے اِس لئے ظاہری طور پر بھی وہ اعلیٰ سے اعلیٰ بلندی جو اُوپر کی سمت میں اس انتہائی نقطہ میں متصوّر ہو جو دونوں عالَم کے اُوپر ہے وہی عرش کے نام سے عند الشرع موسُوم ہے اور یہ بلندی باعتبار جامعیت ذاتِ باری کی ہے تا اس بات کی طرف اشارہ ہو کہ وہ مبدأ ہے ہر یک فیض کا اور مرجع ہے ہر یک چیز کا اور مسجود ہے ہر یک مخلوق کا اور سب سے اُونچا ہے اپنی ذات میں اور صفات میں اور کمالات میں ورنہ قرآن فرماتا ہے کہ وہ ہر یک جگہ ہے جیسا کہ فرمایا اَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ [1] جدھر مُنہ پھیرو ادھر ہی خدا کا مُنہ ہے اور فرماتا ہے هُوَ مَعَكُمۡ اَیۡنَمَا كُنۡتُمۡ [2] یعنی جہاں تم ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور فرماتا ہے نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ [3] یعنی ہم انسان سے اُس کی رگِ جان سے بھی زیادہ نزدیک ہیں۔ یہ تینوں تعلیموں کا نمونہ ہے۔ والسّلام علیٰ من اتبع الھدیٰ

(ست بچن صفحہ ۱۵۴-۱۵۵)

لَا یُسۡـَٔلُ عَمَّا یَفۡعَلُ وَهُمۡ یُسۡـَٔلُوۡنَ ۝ (۲۴)

خدا اپنے کاموں سے پُوچھا نہیں جاتا کہ کیوں ایسا کیا لیکن بندے پوچھے جائیں گے۔ (کتاب البریہ صفحہ ۲۹ حاشیہ)

وہ اپنے کاموں سے پوچھا نہیں جاتا کہ ایسا کیوں کیا اور لوگ پُوچھے جاتے ہیں۔

(براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۵۰۸ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

---

[1] البقرۃ: ۱۱۶ ۔ [2] الحدید: ۵ ۔ [3] قٓ: ۱۷

اُس کے کاموں کی اُس سے کوئی باز پُرس نہیں کر سکتا کہ ایسا کیوں کیا اور ایسا کیوں نہیں کیا اور وہ اپنے بندوں کے افعال و اقوال کی باز پُرس کرتا ہے۔ (ازالہ اوہام حصّہ اوّل صفحہ ۱۹۳-۱۹۴)

آیت ۲۷ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ○

وَقَالَ فِیْ مَقَامٍ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ - اور ایک مقام میں فرماتا ہے کہ عیسائی کہتے ہیں کہ عیسیٰ خدا کا بیٹا ہے۔ خدا بیٹوں سے پاک ہے بلکہ یہ عزّت دار بندے ہیں۔

(نور الحق حصّہ اوّل صفحہ ۵)

اور عیسائی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا بیٹا پکڑا۔ پاک ہے وہ بیٹوں سے بلکہ یہ بندے عزّت دار ہیں۔

(جنگِ مقدس روئداد ۲۹ رمئی ۱۸۹۳ء صفحہ ۹)

عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ وہ عزّت پانے والے بندے ہیں۔ (ست بچن صفحہ ۸۵)

آیت ۲۹ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ○

وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ اور وہ خدائے تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں۔

(براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۴۳۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

آیت ۳۰ وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّیْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِيْنَ ○

اور اگر کوئی کہے کہ مَیں بھی بمقابلۂ خدائے تعالیٰ ایک خدا ہوں تو ایسے شخص کو ہم واصلِ جہنّم کریں اور ظالموں کو ہم یہی سزا دیا کرتے ہیں۔ (براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۴۳۷ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

جو شخص یہ بات کہے کہ مَیں خدا ہوں بجز اس سچے خدا کے تو ہم اس کو جہنّم کی سزا دیں گے۔

(جنگِ مقدس روئداد ۲۹ رمئی ۱۸۹۳ء صفحہ ۹)

وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّیْ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ ـ كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِيْنَ وَاشْتَرَطَ قَوْلَ الظّٰلِمِيْنَ بِلَفْظِ مِّنْ دُوْنِهٖ لِيُخْرِجَ بِهٖ قَوْمًا اَصْبَی الْحِبُّ قُلُوْبَهُمْ وَهَيَّجَ كُرُوْبَهُمْ حَتّٰى غَلَبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَحْوِيَّةُ وَالسُّكْرُ وَجُنُوْنُ الْعَاشِقِيْنَ فَخَرَجَتْ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ كَلِمَاتٌ فِیْ مَقَامِ الْفَنَاءِ النَّظَرِیْ وَالْجَذْبَاتِ السَّمَاوِیْ وَوَرَدَ عَلَيْهِمْ وَارِدٌ فَكَانُوْا مِنَ الْوَالِهِيْنَ فَقَالَ بَعْضُهُمْ مَا فِیْ جُبَّتِیْ اِلَّا اللّٰهُ وَقَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّ يَدِیْ هٰذِهٖ يَدُ اللّٰهِ ـ وَقَالَ بَعْضُهُمْ اَنَا وَجْهُ اللّٰهِ الَّذِیْ وَجَّهْتُمْ اِلَيْهِ وَاَنَا جَنْبُ اللّٰهِ الَّذِیْ فَرَّطْتُمْ فِيْهِ وَقَالَ بَعْضُهُمْ اَنَا اَقُوْلُ وَاَنَا اَسْمَعُ فَهَلْ فِی الدَّارِ غَيْرِیْ وَقَالَ بَعْضُهُمْ اَنَا الْحَقُّ فَهٰؤُلَاءِ كُلُّهُمْ مَعْفُوُّوْنَ فَاِنَّهُمْ نَطَقُوْا مِنْ غَلَبَةِ كَمَالِ الْمَحْوِيَّةِ وَالْاِنْكِسَارِ لَا مِنَ الرُّعُوْنَةِ وَالْاِسْتِكْبَارِ وَحَفَّتْ بِهِمْ سُكْرُ صَهْبَاءِ الْعِشْقِ وَجَذْبَاتِ الْحِبِّ الْمُخْتَارِ فَخَرَجَتْ هٰذِهِ الْاَصْوَاتُ مِنْ خَوْخَةِ الْفَنَاءِ لَا مِنْ غُرْفَةِ الْخُيَلَاءِ وَمَا نَقَلُوا الْاَقْدَامَ اِلٰی دُوْنِ اللّٰهِ بَلْ فَنُوْا فِیْ حَضْرَةِ الْكِبْرِيَاءِ فَلَا شَكَّ اَنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ وَلَا يَجُوْزُ اتِّبَاعُ كَلِمَاتِهِمْ وَحِرْصُ مُضَاهَاتِهِمْ بَلْ هِیَ كَلِمٌ يَجِبُ اَنْ تُطْوٰی لَا اَنْ تُرْوٰی وَلَا يُؤَاخِذُ اللّٰهُ اِلَّا الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنَ الْمُتَعَمِّدِيْنَ الْمُجْتَرِئِيْنَ ـ (نور الحق حصہ اوّل صفحہ ۷۵، ۷۶)

(ترجمہ) اور جو ان میں سے یہ کہے کہ بدوں خدا کے مَیں بھی خدا ہوں سو ایسے شخص کی سزا جہنّم ہوگی اور اسی طرح ہم ظالموں کو سزا دیا کرتے ہیں اور قرآن نے جو ظالمین کے لفظ کے ساتھ مِنْ دُوْنِهٖ کی شرط لگا دی ہے اور کہا ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ مَیں خدا کے سوا خدا ہوں سو یہ شرط مِنْ دُوْنِهٖ کی یعنی سوا کی اِس واسطے لگائی ہے تا اُن لوگوں کو ظالم ہونے سے مستثنیٰ رکھے جن کے دلوں کو ان کے دوست حقیقی نے اپنی طرف کھینچ لیا اور اُن کے دلوں میں بیقراریاں پیدا کر دیں یہاں تک کہ ان کے دلوں پر محویّت اور سُکر اور عاشقوں سا جنون آ گیا سو فنا نظری کی حالت اور جذب سماوی کے وقت میں اُن کے مُنہ سے کچھ ایسی باتیں نکل گئیں اور بعض واردات اُن پر ایسے وارد ہوئے کہ وہ عشق کی مستی سے بیہوشوں کی طرح ہو گئے سو بعض نے اُس مستی کی حالت میں کہا کہ میرے جُبّہ میں خدا ہی ہے اور کوئی نہیں اور بعض نے کہا کہ میرا یہ ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے اور بعض نے کہا کہ مَیں ہی وجہ اللہ ہوں جس کی طرف تم نے مُنہ کیا اور مَیں ہی جنب اللہ ہوں جس کے حق میں تم نے تقصیر کی اور بعض نے کہا کہ مَیں ہی کہتا ہوں اور مَیں ہی سُنتا ہوں اور میرے سوا اور گھر میں کون ہے۔ اور بعض نے کہا کہ مَیں ہی حق ہوں سو یہ تمام لوگ مرفوع القلم ہیں کیونکہ وہ کمال محویّت سے بولے ہیں نہ رعونت اور تکبّر سے۔ اور شرابِ عشق کے نشہ اور دوست برگزیدہ کے جذبات نے اُن کو گھیر لیا سو یہ آوازیں فنا کی کھڑکی سے نکلیں نہ تکبّر کے بالاخانہ سے اور دون اللہ کی طرف انہوں نے قدم نہیں اُٹھایا بلکہ حضرتِ کبریا میں فنا ہو گئے سو کچھ شک نہیں کہ اُن پر ان کلمات سے کوئی ملامت نہیں اور اُن کے ان کلمات کی پیروی جائز نہیں اور نہ یہ روا ہے کہ ان کی (باقی صفحہ ۲۴۲ پر)

اَوَلَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰہُمَا ؕ وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ ؕ اَفَلَا یُؤۡمِنُوۡنَ ۝

آسمان اور زمین دونوں بند تھے سو ہم نے اِن دونوں کو کھول دیا۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۱۲ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

زمین و آسمان بند تھے اور حقائق و معارف پوشیدہ ہوگئے تھے سو ہم نے اُن کو اس شخص کے بھیجنے سے کھول دیا۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۶۹۴)

قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے اور حال کی تحقیقاتیں بھی اِس کی مصدق ہیں کہ عالم کبیر بھی اپنے کمال خلقت کے وقت تک ایک گٹھڑی کی طرح تھا جیسا کہ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے اَوَلَمۡ یَرَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقۡنٰہُمَا ؕ وَجَعَلۡنَا مِنَ الۡمَآءِ کُلَّ شَیۡءٍ حَیٍّ ؕ الجزو نمبر ۱۷ یعنی فرماتا ہے کہ کیا کافروں نے آسمان اور زمین کو نہیں دیکھا کہ گٹھڑی کی طرح آپس میں بندھے ہوئے تھے اور ہم نے ان کو کھول دیا۔ سو کافروں نے تو آسمان اور زمین بنتا نہیں دیکھا اور نہ اُن کی گٹھڑی دیکھی۔ لیکن اِس جگہ رُوحانی آسمان اور رُوحانی زمین کی طرف اشارہ ہے جس کی گٹھڑی کفارِ عرب کے روبرو کھُل گئی اور فیضانِ سماوی زمین پر جاری ہوگئے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۹۰-۱۹۲ حاشیہ در حاشیہ)

آسمان اور زمین ایک گٹھڑی کی طرح بندھے ہوئے تھے ہم نے ان دونوں کو کھول دیا یعنی زمین نے اپنی پوری قوت ظاہر کی اور آسمان نے بھی۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۰۱)

اِعۡلَمُوۡۤا اَیُّہَا الۡاَعِزَّۃُ اَنَّ السَّمَآءَ وَالۡاَرۡضَ کَانَتَا رَتۡقًا فَفَتَقَہُمَا اللّٰہُ فَکُشِطَتِ السَّمَآءُ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مشابہت کی خواہش کی جائے بلکہ یہ ایسے کلمے ہیں کہ لپیٹنے کے لائق ہیں نہ اظہار کے لائق۔ اور خدا تعالیٰ انہیں سے مؤاخذہ کرتا ہے جو عمدًا چالاکی سے ایسے کلمے مُنہ پر لاویں۔ (نور الحق حصہ اول صفحہ ۶۷،۶۵)

(حاشیہ صفحہ ہٰذا) (ترجمہ از مرتب) عزیزو! جان لو کہ آسمان اور زمین دونوں بند تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں کھول دیا۔ سو اس کے حکم سے آسمان سے پردہ ہٹایا گیا اور نوادر و عجائبات کو ظاہر کر دیا گیا تا

بِاَمْرِهٖ وَصُدِعَتْ وَنُزِّلَتْ نَوَادِرُ وَخُرِّجَتْ لِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ عِبَادَهٗ اِلٰی اَیِّ جِهَةٍ يَّمِيْلُوْنَ وَ
تَقَدَّمَتْ نَوَادِرُ الْاَرْضِ عَلٰی نَوَادِرِ السَّمَآءِ فَاغْتَرَّ النَّاسُ بِصَنَائِعِهَا وَعَجَائِبِ عُلُوْمِهَا وَ
غَرَائِبِ فُنُوْنِهَا وَكَادُوْا يَهْلِكُوْنَ فَنَظَرَ الرَّبُّ الْكَرِيْمُ اِلَى الْاَرْضِ وَرَاٰهَا مَمْلُوْءَةً مِّنَ
الْمُهْلِكَاتِ وَمُتْرَعَةً مِّنَ الْمُفْسِدَاتِ وَرَاَى الْخَلْقَ مَفْتُوْنًا بِنَوَادِرِهَا وَرَاَى الْمُتَنَصِّرِيْنَ
اَنَّهُمْ ضَلُّوْا وَيُضِلُّوْنَ وَرَاَى فَلَاسِفَتَهُمْ اخْتَلَبُوا النَّاسَ بِعُلُوْمِهِمْ وَنَوَادِرِ فُنُوْنِهِمْ
فَوَقَعَتْ تِلْكَ الْعُلُوْمُ فِيْ قُلُوْبِ الْاَحْدَاثِ بِمَوْقِعٍ عَظِيْمٍ كَاَنَّهُمْ سُحِرُوْا فَجُذِبُوْا اِلَى
الشَّهَوَاتِ وَاسْتِيْفَاءِ اللَّذَّاتِ وَالْتَحَقُوْا بِالْبَهَائِمِ وَالْحَشَرَاتِ وَعَصَوْا رَبَّهُمْ وَاَبَوَيْهِمْ
وَاَكَابِرَهُمْ وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحُرِّيَّةَ وَغَلَبَتْ عَلَيْهِمُ الْخَلَاعَةُ وَالْمُجُوْنُ فَاَرَادَ
اللّٰهُ اَنْ يَّحْفَظَ عِزَّةَ كِتَابِهٖ وَدِيْنَ طُلَّابِهٖ مِنْ فِتَنِ تِلْكَ النَّوَادِرِ كَمَا وَعَدَ فِيْ قَوْلِهٖ اِنَّا
نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ[1] فَاَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَاَيَّدَ عَبْدَهٗ فَضْلًا مِّنْهُ وَ
رَحْمَةً وَّ اَوْحٰی اِلَیَّ اَنْ اَقُوْمَ بِالْاِنْذَارِ وَاُنْزِلَ مَعِیَ نَوَادِرُ النِّكَاتِ وَالْعُلُوْمِ وَالتَّاْيِيْدَاتِ

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا امتحان لے کہ وہ کس طرف مائل ہوتے ہیں اور زمین کے عجائبات آسمان کے عجائبات
سے پہلے لوگوں کے سامنے نمودار ہو گئے اِس لئے لوگ اس کے صنائع اور عجیب علوم و فنون پر فریفتہ ہو گئے اور
قریب تھا کہ وہ ہلاک ہو جائیں تب ربّ کریم نے زمین کی طرف دیکھا کہ وہ مہلکات اور مفسدات سے بھر گئی ہے
اور یہ کہ مخلوق اس کے عجائبات پر فریفتہ ہو گئی ہے اور عیسائیوں کو دیکھا کہ وہ گمراہ ہو چکے ہیں اور دوسروں کو گمراہ
کر رہے ہیں اور ان کے فلاسفروں کو دیکھا کہ انہوں نے اپنے علوم اور نادر فنون کے ذریعہ لوگوں کے دل گرویدہ
بنالئے ہیں۔ سو یہ علوم نوجوانوں کے دلوں میں اِس طور پر گھر کر گئے کہ گویا ان پر جادو کر دیا گیا ہے پس وہ خواہشات
اور لذّات کے اسیر ہو کر چوپائیوں اور حشرات الارض کے ساتھ جا شامل ہوئے۔ انہوں نے اپنے ربّ، والدین
اور بزرگوں کی نافرمانی کی اور آزادی ان کے دلوں میں رچ گئی اور ان پر بے حیائی اور فسق و فجور غالب آ گیا
تب اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ وہ اپنی کتاب کی عزت اور اپنے عشاق کے دین کو ان نوادرات کے فتنہ سے محفوظ کرے جیسا کہ
اس نے اپنے کلام اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ[1] میں وعدہ فرمایا تھا سو اس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور
اپنے خاص فضل اور رحمت سے اپنے بندہ کی مدد فرمائی اور مجھ پر وحی نازل کی کہ مَیں انذار کا فریضہ ادا کروں۔ اس نے میرے

---

[1] الحجر آیت ۱۰

مِنَ السَّمَآءِ لِيَكْسِرَ بِهَا نَوَادِرَ الْمُتَنَصِّرِيْنَ وَصَلِيْبَهُمْ وَيَحْتَقِرَ اَدَبَهُمْ وَاَدِيْبَهُمْ وَيَدْحَضَ حُجَّتَهُمْ وَيُفْحِمَ بَعِيْدَهُمْ وَقَرِيْبَهُمْ۔ فَمَظْهَرُ نَوَادِرِ الْاَرْضِ وَفِتَنِهَا هُوَ الَّذِیْ سُمِّیَ بِالدَّجَّالِ الْمَعْهُوْدِ وَمَظْهَرُ نَوَادِرِ السَّمَآءِ وَاَنْوَارِهَا هُوَ الَّذِیْ سُمِّیَ بِالْمَسِيْحِ الْمَوْعُوْدِ خَصْمَانِ تَقَابَلَا فِیْ زَمَنٍ وَّاحِدٍ فَلْيَسْتَمِعِ الْمُسْتَمِعُوْنَ۔

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۴۷۹ تا ۴۸۱)

اِنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفُتِقَتَا فِیْ هٰذَا الزَّمَانِ لِيُبْتَلَى الصَّالِحُوْنَ وَالطَّالِحُوْنَ وَكُلٌّ بِمَا عَمِلَ يُجْزٰى۔ فَاَخْرَجَ اللّٰهُ مِنَ الْاَرْضِ مَا كَانَ مِنَ الْاَرْضِ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَا كَانَ مِنَ السَّمٰوٰتِ الْعُلٰى۔ فَفَرِيْقٌ عُلِّمُوْا مَكَائِدَ الْاَرْضِ وَفَرِيْقٌ اُعْطُوْا مَا اُعْطِیَ الرُّسُلُ مِنَ الْهُدٰى وَقُدِّرَ الْفَتْحُ لِلسَّمَاوِيِّيْنَ فِیْ هٰذَا الْوَغٰى۔ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا لَنْ يَّتْرُكَ اللّٰهُ الْعَبْدَ الَّذِیْ اَرْسَلَهٗ لِلْوَرٰى۔ وَلَا تُضَاعُ الشَّمْسُ لِاِنْكَارِ الْاَعْمٰى۔ فَرِيْقَانِ يَخْتَصِمَانِ فِی الرُّشْدِ وَالْهَوٰى۔ وَفُتِحَتْ لِفَرِيْقٍ اَبْوَابُ الْاَرْضِ اِلٰى تَحْتَ الثَّرٰى وَلِلثَّانِیْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ

ساتھ نادر نکات اور علوم اور تائیداتِ آسمانی اتاریں تا ان کے ذریعہ نصاریٰ کے نوادر اور ان کی صلیب کو توڑ دے اور ان کے ادب اور ادیبوں کو ذلیل کر دے اور ان کے دلائل کو غلط ثابت کرے اور ان کے دُور و نزدیک کا مُنہ بند کر دے۔ پس زمینی نوادر و عجائبات اور اس کے فتنوں کا مظہر وہ ہے جس کا نام دجّالِ معہود ہے اور آسمان کے نوادر و انوار کا مظہر وہ ہے جس کا نام مسیح موعود ہے اور یہ دونوں فریق ایک ہی وقت میں ایک دوسرے کے مقابل پر آ گئے۔ پس سُننے والے اِس بات کو خوب اچھی طرح سُن لیں۔

(آئینہ کمالات اسلام صفحہ ۴۷۹، ۴۸۰)

(ترجمہ) زمین و آسمان دونوں بند تھے اس زمانہ میں دونوں کُھل گئے تا کہ نیکوں اور بدوں کا امتحان ہو جائے اور ہر ایک گروہ اپنے اعمال کی جزا سزا پائے۔ پس خدا تعالیٰ نے کچھ چیزیں زمین کی زمین سے نکالیں اور جو کچھ آسمان سے اتارنا تھا اتارا۔ ایک گروہ نے زمینی فریبوں سے تعلیم پائی اور دوسرے گروہ کو وہ چیزیں دیں جو انبیاء کو دی تھیں۔ اس جنگ میں آسمان والوں کو فتح حاصل ہوئی۔ تم چاہو ایمان لاؤ یا نہ لاؤ خدا تعالیٰ اپنے بندہ کو جسے اصلاحِ خلق کے لئے بھیجا ہے ہرگز نہ چھوڑے گا اور خدا تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ اندھے کے انکار سے آفتاب کو ضائع کرے۔ دُو فریق ہیں جو آپس میں جھگڑتے ہیں۔ ایک گروہ کے لئے دروازے زمین کے کھولے گئے اور دوسرے گروہ کے لئے آسمانی دروازے کھولے

اِلٰی سِدْرَۃِ الْمُنْتَھٰی۔ اَمَّا الَّذِیْنَ فُتِحَتْ عَلَیْھِمْ اَبْوَابُ الْاَرْضِ فَھُمْ یَتَّبِعُوْنَ شَیْطَانَھُمُ الَّذِیْ اَغْوٰی۔ وَالَّذِیْنَ فُتِحَتْ عَلَیْھِمْ اَبْوَابُ السَّمَآءِ فَھُمْ وُرَثَاءُ النَّبِیِّیْنَ وَ قَوْمٌ مُّطَھَّرُوْنَ مِنْ کُلِّ شُحٍّ وَّ ھَوًی۔ یَدْعُوْنَ قَوْمَھُمْ اِلٰی رَبِّھِمْ وَ یَمْنَعُوْنَھُمْ مِمَّا یُشْرَکُ بِہٖ فِی الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰی۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۵)

زمین اور آسمان دونوں ایک گٹھڑی کی طرح بندھے ہوئے تھے جن کے جوہر مخفی تھے ہم نے مسیح کے زمانہ میں وہ دونوں گٹھڑیاں کھول دیں اور دونوں کے جوہر ظاہر کر دئے۔

(گورنمنٹ انگریزی اور جہاد صفحہ ۱)

کیا یہ سچ نہیں کہ اِس زمانہ میں زمین کی گٹھڑی ایسی کُھلی ہے کہ ہزارہا نئی حقیقتیں اور خواص اور کلیں ظاہر ہوتی جاتی ہیں پھر آسمانی گٹھڑی کیوں بند رہے۔ آسمانی گٹھڑی کی نسبت گذشتہ نبیوں نے بھی پیشگوئی کی تھی کہ بچے اور عورتیں بھی خدا کا الہام پائیں گی اور وہ مسیح موعود کا زمانہ ہوگا۔

(گورنمنٹ انگریزی اور جہاد صفحہ ۱ حاشیہ)

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ یعنی ہر ایک چیز پانی سے ہی زندہ ہے۔

(نسیم دعوت صفحہ ۵۰)

الانبیاء

وَھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّھَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ۔ کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ۝

آجکل کے علمِ ہیئت کے محققین جو یورپ کے فلاسفر ہیں جس طرز سے آسمانوں کے وجود کی نسبت خیال رکھتے ہیں درحقیقت وہ خیال قرآن کریم کے مخالف نہیں کیونکہ قرآن کریم نے اگرچہ آسمانوں کو نرا پول تو نہیں ٹھہرایا لیکن جس سماوی مادہ کو جو پول کے اندر بھرا ہوا ہے صلب اور کثیف اور متعسر الخرق مادہ

گئے۔ جس گروہ کے لئے زمینی دروازے کھولے گئے وہ شیطان کی پیروی کرتے ہیں اور وہ گروہ جس کے لئے آسمان کے دروازے کھولے گئے وہ انبیاء کے وارث ہیں اور ہر ایک طرح سے پاک و صاف ہیں۔ قوم کو پروردگار کی طرف بُلاتے ہیں اور ان کو بُرائیوں سے بچاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کے ساتھ کسی چیز کو زمین و آسمان میں شریک نہ کرنا چاہیئے۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۵)

بھی قرار نہیں دیا بلکہ ہوا یا پانی کی طرح نرم اور کثیف مادہ قرار دیا جس میں ستارے تیرتے ہیں اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے کُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ۔ ہاں یونانیوں نے آسمانوں کو اجسامِ کثیفہ تسلیم کیا ہوا ہے اور پیاز کے چھلکوں کی طرح تہ بتہ ان کو مانا ہے اور آخری تہ کا آسمان جو تمام تہوں پر محیط ہو رہا ہے جمیع مخلوقات کا انتہاء قرار دیا ہے جس کو وہ فلک الافلاک اور محدد بھی کہتے ہیں جو اُن کے زعم میں معہ تین اَور آسمانوں کے جن کا نام مدّبر اور جوزہر اور مائل ہے مشرق سے مغرب کی طرف گردش کرتا ہے اور باقی آسمان مغرب سے مشرق کی طرف گھومتے ہیں اور اُن کے گمان میں فلک محدد معمورہ عالم کا منتہا ہے جس کے پیچھے خلا ملا نہیں۔ گویا خدا تعالیٰ نے اپنے ممالک مقبوضہ کی ایک دیوار کھینچی ہوئی ہے جس کا ماوراء کچھ بھی نہیں نہ خلا نہ ملا۔

یونانیوں کی اس رائے پر جس قدر اعتراض وارد ہوتے ہیں وہ پوشیدہ نہیں نہ صرف قیاسی طور پر بلکہ تجربہ بھی ان کا مکذّب ہے جس حالت میں آجکل کے آلات دوربین نہایت دور کے ستاروں کا بھی پتہ لگاتے جاتے ہیں اور چاند اور سُورج کو ایسا دکھا دیتے ہیں کہ گویا وہ پانچ چار کوس پر ہیں تو پھر تعجب کا مقام ہے کہ باوجودیکہ آسمان یونانیوں کے زعم میں ایک کثیف جوہر ہے اور ایسا کثیف جو قابل خرق و التیام نہیں اور اس قدر بڑا کہ گویا چاند اور سُورج کو اس کی ضخامت کے ساتھ کچھ بھی نسبت نہیں۔ پھر بھی وہ اِن دوربین آلات سے نظر نہیں آسکا۔ اگر دُور کے آسمان نظر نہیں آتے تھے تو سماء الدّنیا جو سب سے قریب ہے ضرور نظر آجانا چاہیئے تھا۔ پس کچھ شک نہیں کہ جو یونانیوں نے عالم بالا کی تصویر دکھائی ہے وہ صحیح نہیں اور اِس قدر اعتراض اس پر پیدا ہوتے ہیں کہ جن سے مخلصی حاصل کرنا ممکن ہی نہیں لیکن قرآن کریم نے جو سمٰوٰت کی حقیقت بیان کی ہے وہ نہایت صحیح اور درست ہے جس کے ماننے کے بغیر انسان کو کچھ بن نہیں پڑتا اور اُس کی مخالفت میں جو کچھ بیان کیا جائے وہ سراسر ناواقفی یا تعصب پر مبنی ہوگا قرآن کریم نہ آسمانوں کو یونانی حکماء کی طرح طبقاتِ کثیفہ ٹھہراتا ہے اور نہ بعض نادانوں کے خیال کے موافق نرا پول جس میں کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ شق اوّل کی معقول طور پر غلطی ظاہر ہے جس کی نسبت ہم ابھی بیان کر چکے ہیں اور شق دوم یعنی یہ کہ آسمان کچھ بھی وجود مادی نہیں رکھتا نرا پول ہے استقرا کی رُو سے سراسر غلط ثابت ہوتا ہے کیونکہ اگر ہم اُس فضا کی نسبت جو چمکتے ہوئے ستاروں تک ہمیں نظر آتا ہے بذریعہ اپنے تجارب استقرائیہ کے تحقیقات کرنا چاہیں تو صاف ثابت ہوتا ہے کہ سُنّت اللہ یا قانونِ قدرت یہی ہے کہ خدا تعالیٰ نے کسی فضا کو محض خالی نہیں رکھا چنانچہ جو شخص غبارہ میں بیٹھ کر ہوا کے طبقات کو چیرتا چلا جاتا ہے وہ شہادت دے سکتا ہے کہ جس قدر وہ اُوپر کو چڑھا اُس نے کسی حصۂ فضا کو خالی نہیں پایا۔ پس یہ

استقرا ہمیں اِس بات کے سمجھنے کے لئے بہت مدد دے سکتا ہے کہ اگرچہ یونانیوں کی طرح آسمان کی حد بستہ ناجائز ہے مگر یہ بھی تو درست نہیں ہے کہ آسمانوں سے مراد صرف ایک خالی فضا اور پول ہے جس میں کوئی مخلوق مادہ نہیں۔ ہم جہاں تک ہمارے تجارب رویت رسائی رکھتے ہیں کوئی مجرد پول مشاہدہ نہیں کرتے پھر کیونکر خلاف اپنی مستمر استقرا کے حکم کر سکتے ہیں کہ ان مملو فضاؤں سے آگے چل کر ایسے فضا بھی ہیں جو بالکل خالی ہیں۔ کیا برخلاف ثابت شدہ استقراء کے اس وہم کا کچھ بھی ثبوت ہے۔ ایک ذرا بھی نہیں۔ پھر کیونکر ایک بے بنیاد وہم کو قبول کیا جائے اور مان لیا جائے۔ ہم کیونکر ایک قطعی ثبوت کو بغیر کسی مخالفانہ اور غالب ثبوت کے چھوڑ سکتے ہیں اور علاوہ اس کے اللہ جلّ شانہٗ کی اس میں کسرِ شان بھی ہے گویا وہ عام اور کامل خالقیت سے عاجز تھا تبھی تو تھوڑا سا بنا کر باقی بے انتہا فضا چھوڑ دی اور مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ اس استقرائی ثبوت کے انکار میں کہ کوئی فضا کسی جوہر لطیف سے خالی نہیں کون سی یقینی اور قطعی دلیل ایسے شخصوں کے ہاتھ میں ہے جو مجرّد پول کے قائل ہیں یا قائل ہوں۔ اگر کوئی شخص ایسا ہی اعتقاد اور رائے رکھتا ہے کہ چند مادی کُرّوں کے بعد تمام پول ہی پڑا ہے جو بے انتہا ہے تو وہ ہماری اس حجتِ استقرائی سے صاف اور صریح طور پر ملزم ٹھہر جاتا ہے ظاہر ہے کہ استقراء وہ استدلال اور حجت کی قسم ہے جو اکثر دُنیا کے ثبوتوں کو اُسی سے مدد ملی ہے مثلاً ہمارا یہ قول کہ انسان کی دو آنکھیں ہوتی ہیں اور ایک زبان اور دو کان اور وہ عورتوں کی پیشاب گاہ کی راہ سے پیدا ہوتا ہے اور پہلے بچہ پھر جوان اور پھر بڈھا ہوتا ہے اور آخر کسی قدر عمر پاکر مرجاتا ہے اور ایسا ہی ہمارا یہ قول کہ انسان سوتا بھی ہے اور کھاتا بھی اور آنکھوں سے دیکھتا اور ناک سے سُونگھتا اور کانوں کے ذریعہ سے سُنتا اور پیروں سے چلتا اور ہاتھوں سے کام کرتا اور دو کانوں میں اس کا سر ہے ایسا ہی اور صدہا باتیں اور ہر ایک نوع نباتات اور جمادات اور حیوانات کی نسبت جو ہم نے طرح طرح کے خواص دریافت کئے ہیں ان سب کا ذریعہ بجز استقراء کے اَور کیا ہے۔ پھر اگر استقراء میں کسی کو کلام ہو تو یہ تمام علوم درہم برہم ہو جائیں گے اور اگر یہ غلجان ان کے دِلوں میں پیدا ہو کہ آسمانوں کا اگر کچھ وجود ہے تو کیوں نظر نہیں آتا تو اس کا یہ جواب ہے کہ ہر ایک وجود کا مرئی ہونا شرط نہیں جو وجود نہایت لطافت اور بساطت میں پڑا ہے وہ کیونکر نظر آجائے اور کیونکر کوئی دوربین اُس کو دریافت کر سکے۔ غرض سماوی وجود کو خدا تعالیٰ نے نہایت لطیف قرار دیا ہے چنانچہ اسی کی تصریح میں یہ آیت اشارہ کر رہی ہے کہ کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ یعنی ہر ایک ستارہ اپنے اپنے آسمان میں جو اس کا مبلغ دَور ہے تیر رہا ہے اور درحقیقت خدا تعالیٰ نے یونانیوں کی محدد کی طرح اپنے عرش کو قرار نہیں دیا اور نہ اس کو محدود قرار دیا ہاں اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ ایک طبقہ قرار دیا ہے جس سے باعتبار اس کی کیفیت اور کمیت کے اَور کوئی اعلیٰ طبقہ

نہیں ہے اور یہ امر ایک مخلوق اور موجود کے لئے ممتنع اور محال نہیں ہو سکتا بلکہ نہایت قرینِ قیاس ہے کہ جو طبقہ عرش اللہ کہلاتا ہے وہ اپنی وسعتوں میں خدائے غیر محدود کے مناسب حال اور غیر محدود ہو۔

اور اگر یہ اعتراض پیش ہو کہ قرآن کریم میں یہ بھی لکھا ہے کہ کسی وقت آسمان پھٹ جائیں گے اور ان میں شگاف ہو جائیں گے۔ اگر وہ لطیف مادہ ہے تو اس کے پھٹنے کے کیا معنی ہیں تو اس کا یہ جواب ہے کہ اکثر قرآن کریم میں سماء سے مُراد کُلُّ مَا فِی السَّمَآءِ کو لیا ہے جس میں آفتاب اور ماہتاب اور تمام ستارے داخل ہیں ماسوا اس کے ہر یک جرم لطیف ہو یا کثیف قابلِ خرق ہے بلکہ لطیف تو بہت زیادہ خرق کو قبول کرتا ہے پھر کیا تعجب ہے کہ آسمانوں کے مادہ میں بحکم رب قدیر و حکیم ایک قسم کا خرق پیدا ہو جائے وَذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ [1] بالآخر یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ قرآن کریم کے ہر یک لفظ کو حقیقت پر حمل کرنا بھی بڑی غلطی ہے اللہ جلّ شانہٗ کا یہ پاک کلام بوجہ اعلیٰ درجہ کی بلاغت کے استعاراتِ لطیفہ سے بھرا ہوا ہے سو ہمیں اِس فکر میں پڑنا کہ انشقاق اور انفجار آسمانوں کا کیونکر ہو گا۔ درحقیقت ان الفاظ کے وسیع مفہوم میں ایک دخل بیجا ہے صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تمام الفاظ اور اس قسم کے اور بھی عالم مادی کے فنا کی طرف اشارہ ہے۔ الٰہی کلام کا مدعا یہ ہے کہ اِس عالَم کون کے بعد فساد بھی لازم پڑا ہوا ہے۔ ہر یک جو بنایا گیا توڑا جائے گا اور ہر یک ترکیب پاش پاش ہو جائے گی اور ہر یک جسم متفرق اور ذرہ ذرہ ہو جائے گا اور ہر یک جسم اور جسمانی پر عام فنا طاری ہو گی اور قرآن کریم کے بہت سے مقامات سے ثابت ہوتا ہے کہ انشقاق اور انفجار کے الفاظ جو آسمانوں کی نسبت وارد ہیں ان سے ایسے معنے مراد نہیں ہیں جو کسی جسم صلب اور کثیف کے حق میں مراد لئے جاتے ہیں جیسا کہ ایک دوسرے مقام میں اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے وَ السَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ [2] یعنی دُنیا کے فنا کرنے کے وقت خدا تعالیٰ آسمانوں کو اپنے داہنے ہاتھ سے لپیٹ لے گا۔ اب دیکھو کہ اگر شقّ السمٰوٰت سے درحقیقت پھاڑنا مراد لیا جائے تو مطویّات کا لفظ اس سے مغائر اور منافی پڑے گا کیونکہ اس میں پھاڑنے کا کہیں ذکر نہیں صرف لپیٹنے کا ذکر ہے۔ پھر ایک دوسری آیت ہے جو سورۃ الانبیاء جزو ۱۷ میں ہے اور وہ یہ ہے يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ [3] یعنی ہم اُس دن آسمانوں کو ایسا لپیٹ لیں گے جیسے ایک خط متفرق مضامین کو اپنے اندر لپیٹ لیتا ہے۔ اور جس طرز سے ہم نے اِس عالم کو وجود کی طرف حرکت دی تھی انہیں قدموں پر پھر یہ عالم عدم کی طرف لوٹایا جائے گا۔ یہ وعدہ ہمارے ذمّہ ہے جس کو ہم کرنے والے ہیں۔ بخاری

---

[1] العنکبوت آیت ۲۰ ۞ [2] الزمر آیت ۶۸ ۞ [3] الانبیاء آیت ۱۰۵ ۞

نے بھی اِس جگہ ایک حدیث لکھی ہے جس میں جائے غور یہ لفظ ہیں وَتَکُوْنُ السَّمٰوٰتُ بِيَمِيْنِهٖ۔ یعنی لپیٹنے کے یہ معنی ہیں کہ خدا تعالیٰ آسمانوں کو اپنے داہنے ہاتھ میں چھپالے گا اور جیسا کہ اب اسباب ظاہر اور مسبّب پوشیدہ ہے اس وقت مسبّب ظاہر اور اسباب زاویۂ عدم میں چھپ جائیں گے اور ہر یک چیز اُس کی طرف رجوع کر کے تجلّیات قہریہ میں مخفی ہو جائے گی اور ہر یک چیز اپنے مکان اور مرکز کو چھوڑ دے گی اور تجلّیاتِ الٰہیہ اُس کی جگہ لیں گی اور عللِ ناقصہ کے فنا اور انعدام کے بعد علّتِ تامہ کاملہ کا چہرہ نمودار ہو جائے گا۔ اِسی کی طرف اشارہ ہے کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ[1] لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ[2] یعنی خدا تعالیٰ اپنی قہری تجلّی سے ہر یک چیز کو معدوم کر کے اپنی وحدانیت اور یگانگت دکھلائے گا۔ اور خدا تعالیٰ کے وعدوں سے مراد یہ بات نہیں کہ اتفاقاً کوئی بات مُنہ سے نکل گئی اور پھر ہر حال گلے پڑا ڈھول بجانا پڑا۔ کیونکہ اِس قسم کے وعدے خدائے حکیم و علیم کی شان کے لائق نہیں۔ یہ صرف انسان ضعیف البنیان کا خاصہ ہے جس کا کوئی وعدہ تکلّف اور ضعف یا مجبوری اور لاچاری کے موانع سے ہمیشہ محفوظ نہیں رہ سکتا اور بایں ہمہ تقریباتِ اتفاقیہ پر مبنی ہوتا ہے نہ علم اور یقین اور حکمتِ قدیمہ پر۔ مگر خدا تعالیٰ کے وعدے اُس کی صفاتِ قدیمہ کے تقاضا کے موافق صادر ہوتے ہیں اور اُس کے مواعید اُس کی غیر متناہی حکمت کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔

اور اگر اس جگہ کوئی یہ اعتراض پیش کرے کہ خدا تعالیٰ نے آسمانوں کو سات میں کیوں محدود کیا اِس کی کیا وجہ ہے تو اس کا یہ جواب ہے کہ درحقیقت یہ تاثیراتِ مختلفہ کی طرف اشارہ ہے جو مختلف طبقاتِ سماوی سے مختلف ستارے اپنے اندر جذب کرتے ہیں اور پھر زمین پر اُن تاثیرات کو ڈالتے ہیں چنانچہ اسی کی تصریح اِس آیت میں موجود ہے اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا[3] (الجزو ۲۸) یعنی خدائے تعالیٰ نے آسمانوں کو سات پیدا کیا اور ایسا ہی زمینیں بھی سات ہی پیدا کیں اور ان سات آسمانوں کا اثر جو بامرِ الٰہی ان میں پیدا ہے سات زمینوں میں ڈالا تا کہ تم لوگ معلوم کر لو کہ خدا تعالیٰ ہر ایک چیز کے بنانے پر اور ہر ایک انتظام کے کرنے پر اور رنگا رنگ کے پیرائیوں میں اپنے کام دکھلانے پر قدرتِ تامہ رکھتا ہے اور تا تمہارے علم وسیع ہو جائیں اور علوم و فنون میں تم ترقی کرو اور ہیئت اور طبعی اور طبابت اور جغرافیہ وغیرہ علوم تم میں پیدا ہو کر خدا تعالیٰ کی عظمتوں کی طرف تم کو متوجہ کریں اور تم سمجھ لو کہ کیسے

---

[1] الرّحمٰن آیت ۲۷، ۲۸ [2] المؤمن آیت ۱۷ [3] الطلاق آیت ۱۳

خدا تعالیٰ کا علم اور اس کی حکمتِ کاملہ ہر یک شئی پر محیط ہو رہی ہے اور کیسی ترکیب ابلغ اور ترتیب محکم کیساتھ آسمان اور جو کچھ اس میں ہے اپنا رشتہ زمین سے رکھتا ہے اور کیسے خدا تعالیٰ نے زمین کو قوّتِ قابلہ عطا کر رکھی ہے اور آسمانوں اور ان کے اجرام کو قوّتِ مؤثرہ مرحمت فرمائی ہے۔

اور یاد رہے کہ جس طرح تنزّل امر جسمانی اور روحانی دونوں طور پر آسمانوں سے ہوتا ہے اور ملائک کی توجہات اجرام سماوی کی تاثیرات کے ساتھ مخلوط ہو کر زمین پر گرتی ہیں ایسا ہی زمین اور زمین والوں میں بھی جسمانی اور روحانی دونوں قوتیں قابلیّت کی عطا کی گئی ہیں تا قوابل اور مؤثرات میں بکلّی مساوات ہو۔

اور سات زمینوں سے مراد زمین کی آبادی کے سات طبقے ہیں جو نسبتی طور پر بعض بعض کے تحت واقع ہیں اور کچھ بیجا نہ ہوگا اگر ہم دوسرے لفظوں میں ان طبقاتِ سبعہ کو ہفت اقلیم کے نام سے موسوم کر دیں لیکن ناظرین اس دھوکہ میں نہ پڑیں کہ جو کچھ ہفت اقلیم کی تقسیم اُن یونانی علوم کی رُو سے ہو چکی ہے جس کو اسلام کے ابتدائی زمانہ میں حکماءِ اسلام نے یونانی کتب سے لیا تھا وہ بکلّی صحیح اور کامل ہے کیونکہ اِس جگہ تقسیم سے مراد ہماری ایک صحیح تقسیم مراد ہے جس سے کوئی معمورہ باہر نہ رہے اور زمین کی ہر ایک جزو کسی حِصّہ میں داخل ہو جائے۔ ہمیں اِس سے کچھ غرض نہیں کہ اب تک یہ صحیح اور کامل تقسیم معرضِ ظہور میں بھی آئی یا نہیں بلکہ صرف یہ غرض ہے کہ جو خیال اکثر انسانوں کا اِس طرف رجوع کر گیا ہے کہ زمین کو سات حصّہ پر تقسیم کیا جائے یہ خیال بھی گویا ایک الہامی تحریک تھی جو الٰہی تقسیم کے لئے بطور شاہد ہے۔

اگر یہ اعتراض پیش ہو کہ قرآن کریم میں جو خدا تعالیٰ نے کئی بار فرمایا ہے کہ ہم نے چھ دن میں زمین و آسمان کو پیدا کیا تو یہ امر ضعف پر دلالت کرتا ہے کیونکہ معًا اس کے ارادہ کے ساتھ ہی سب کچھ ہو جانا لازم ہے جیسا کہ وہ آپ ہی فرماتا ہے اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ[1] یعنی جب خدا تعالےٰ ایک چیز کے ہونے کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کا امر ایسی قوّت اور طاقت اور قدرت اپنے اندر رکھتا ہے کہ وہ اس چیز (کو) جو اس کے علم میں ایک علمی وجود رکھتا ہے فقط یہ کہتا ہے کہ ہو تو وہ ہو جاتی ہے۔

اِس وہم کا جواب یہ ہے کہ قدرت اور طاقت کا مفہوم اِس بات کو مستلزم نہیں کہ وہ چیز خواہ نخواہ بلا توقف ہو جائے اور نہ ارادہ کے مفہوم میں ضروری طور پر یہ بات داخل ہے کہ جس چیز کا ارادہ کیا گیا ہو وہ اُسی وقت ہو جائے بلکہ اُسی حالت میں ایک قدرت اور ایک ارادہ کو کامل قدرت اور کامل ارادہ کہا جائے گا جبکہ وہ ایک فاعل کے اصل منشاء کے موافق جلد یا دیر کے ساتھ جیسا کہ منشاء ہو ظہور میں آوے

---

[1] یٰسٓ آیت ۸۳۔

مثلاً چلنے میں کامل قدرت اُس شخص کی نہیں کہہ سکتے کہ جلد جلد وہ چل سکتا ہے اور آہستہ آہستہ چلنے سے وہ عاجز ہے بلکہ اُس شخص کو کامل القدرت کہیں گے کہ جو دونوں طور جلد اور دیر میں قدرت رکھتا ہو یا مثلاً ایک شخص ہمیشہ اپنے ہاتھ کو لمبا رکھتا ہے اور اکٹھا کرنے کی طاقت نہیں یا کھڑا رہتا ہے اور بیٹھنے کی طاقت نہیں تو ان سب صورتوں میں ہم اُس کو قوی قرار نہیں دیں گے بلکہ بیمار اور معلول کہیں گے۔ غرض قدرت اُسی وقت کامل طور پر متحقق ہوسکتی ہے کہ جبکہ دونوں شق سرعت اور بطوء پر قدرت ہو اگر ایک شق پر قدرت ہو تو وہ قدرت نہیں بلکہ عجز اور ناتوانی ہے۔ تعجب کہ ہمارے مخالف خدا تعالیٰ کے قانونِ قدرت کو بھی نہیں دیکھتے کہ دُنیا میں اپنے قضاو قدر کو جلد بھی نازل کرتا ہے اور دیر سے بھی۔ ہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صفاتِ قہریّہ اکثر جلدی کے رنگ میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور صفاتِ لطیفہ دیر اور توقف کے پیرایہ میں مثلاً انسان نو مہینے پیٹ میں رہ کر اپنے کمال وجود کو پہنچتا ہے اور مرنے کے لئے کچھ بھی دیر کی ضرورت نہیں۔ مثلاً انسان اپنے مرنے کے وقت صرف ایک ہی ہیضہ کا دست یا تھوڑا سا پانی قے کے طور پر نکال کر راہی مُلکِ بقا ہو جاتا ہے اور وہ بدن جس کی سالہائے دراز میں ظاہری اور باطنی تکمیل ہوئی تھی ایک ہی دم میں اُس کو چھوڑ کر رخصت ہوجاتا ہے۔

اب جس قدر مَیں نے اِس اعتراض کے جواب میں لکھا ہے میری دانست میں کافی ہے اِس لئے مَیں اسی پر بس کرتا ہوں لیکن یہ بات کھول کر یاد دلانا ضروری ہے کہ ارادہ کاملہ بھی قدرتِ کاملہ کی طرح دونوں شقوں سرعت اور بطوء کو چاہتا ہے مثلاً ہم جیسا یہ ارادہ کرسکتے ہیں کہ ابھی یہ بات ہوجائے ایسا ہی یہ بھی ارادہ کرسکتے ہیں کہ دس برس کے بعد ہو۔ مثلاً ریل اور تار اور صدہا کلیں جو اَب نکل رہی ہیں بے شک ابتداء سے خدا تعالیٰ کے ارادہ اور علم میں تھیں لیکن ہزارہا برس تک ان کا ظہور نہ ہوا اور وہ ارادہ تو ابتداء ہی سے تھا مگر مخفی چلا آیا اور اپنے وقت پر ظاہر ہوا اور جب وقت آیا تو خدا تعالیٰ نے ایک قوم کو اِن فکروں اور سوچوں میں لگا دیا اور ان کی مدد کی یہاں تک کہ وہ اپنی تدبیروں میں کامیاب ہوگئے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۳۸ تا ۱۷۱ حاشیہ درحاشیہ)

اور پھر اِس جگہ ایک اَور نکتہ قابلِ یاد داشت ہے اور وہ یہ کہ تیسری قسم کے لوگ بھی جن کا خدا تعالیٰ سے کامل تعلق ہوتا ہے اور کامل اور مصفّا الہام پاتے ہیں قبولِ فیوضِ الٰہیّہ میں برابر نہیں ہوتے اور ان سب کا دائرۂ استعداد فطرت ہم برابر نہیں ہوتا بلکہ کسی کا دائرۂ استعداد فطرت کم درجہ پر وسعت رکھتا ہے اور کسی کا زیادہ وسیع ہوتا ہے اور کسی کا بہت زیادہ اور کسی کا اِس قدر جو خیال وگمان سے برتر ہے اور کسی کا خدا تعالیٰ سے رابطہ محبت قوی ہوتا ہے اور کسی کا اقویٰ۔ اور

کسی کا اِس قدر کہ دُنیا اس کو شناخت نہیں کر سکتی اور کوئی عقل اُس کے انتہا تک نہیں پہنچ سکتی اور وہ اپنے محبوبِ ازلی کی محبت میں اِس قدر محو ہوتے ہیں کہ کوئی رگ و ریشہ اُن کی ہستی اور وجود کا باقی نہیں رہتا اور یہ تمام مراتب کے لوگ بموجب آیت کُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ اپنے دائرۂ استعداد فطرت سے زیادہ ترقی نہیں کر سکتے اور کوئی اُن میں سے اپنے دائرۂ فطرت سے بڑھ کر کوئی نور حاصل نہیں کر سکتا اور نہ کوئی روحانی تصویر آفتابِ نورانی کی اپنی فطرت کے دائرہ سے بڑھ کر اپنے اندر لے سکتا ہے اور خدا تعالیٰ ہر ایک کی استعداد فطرت کے موافق اپنا چہرہ اُس کو دکھا دیتا ہے اور فطرتوں کی کمی بیشی کی وجہ سے وہ چہرہ کہیں چھوٹا ہو جاتا ہے اور کہیں بڑا۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۶،۲۵)

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ؕ اَفَا۟ئِنْ مِّتَّ فَهُمُ الْخٰلِدُوْنَ

یعنی ہم نے تجھ سے پہلے کسی بشر کو ہمیشہ زندہ اور ایک حالت پر رہنے والا نہیں بنایا پس کیا اگر تُو مر گیا تو یہ لوگ باقی رہ جائیں گے۔ اِس آیت کا مدعا یہ ہے کہ تمام لوگ ایک ہی سُنّت اللہ کے نیچے داخل ہیں اور کوئی موت سے بچا نہیں اور نہ آئندہ بچے گا اور لُغت کے رُو سے خلود کے مفہوم میں یہ بات داخل ہے کہ ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہے کیونکہ تغیّر موت اور زوال کی تمہید ہے۔ پس نفی خلود سے ثابت ہوا کہ زمانہ کی تاثیر سے ہر یک شخص کی موت کی طرف حرکت ہے اور پیرانہ سالی کی طرف رجوع اور اِس سے مسیح ابنِ مریم کا بوجہ امتدادِ زمانہ اور شیخ فانی ہو جانے کے باعث سے فوت ہو جانا ثابت ہوتا ہے۔

(ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۶۰۶،۶۰۷)

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً ؕ وَاِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ ۝

یعنی ہر نفس موت کا مزہ چکھے گا اور پھر ہماری طرف واپس کئے جاؤ گے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۱۲ حاشیہ)

وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ يَذْكُرُ اٰلِهَتَكُمْ ۚ وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ۝

وَاِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا اور تجھے انہوں نے ایک ہنسی کی جگہ بنا رکھا ہے۔

(انجام آتھم صـ۵۷)

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ ؕ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ ۝

انسان کی فطرت میں جلدی ہے۔ عنقریب مَیں تم کو اپنے نشان دکھلاؤں گا۔ سو تم مجھ سے جلدی تو مت کرو۔

(براہین احمدیہ حصّہ سوم صـ۲۲۱ حاشیہ نمبر ۱۱)

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

یعنی کافر پوچھتے ہیں کہ یہ دعویٰ پورا کب ہوگا اگر تم سچے ہو تو تاریخ عذاب بتاؤ۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صـ۹۲)

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝

یعنی ان کافروں اور نافرمانوں کو کہہ کہ اگر خدا میں صفت رحمانیت کی نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ تم اس کے عذاب سے محفوظ رہ سکتے یعنی اسی کی رحمانیت کا اثر ہے کہ وہ کافروں اور بے ایمانوں کو مہلت دیتا ہے اور جلد تر نہیں پکڑتا۔

(براہین احمدیہ حصّہ چہارم صـ۳۷۵ حاشیہ نمبر ۱۱)

بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُؕ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَاؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ۝

طاعون کے متعلق بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اکثر غریب مرتے ہیں اور امراء اور ہمارے بڑے بڑے مخالف ابھی تک بچے ہوئے ہیں لیکن سُنّت اللہ یہی ہے کہ ائمۃ الکفر اخیر میں پکڑے جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰؑ کے وقت جس قدر عذاب پہلے نازل ہوئے ان سب میں فرعون بچا رہا۔ چنانچہ قرآن شریف میں بھی آیا کہ نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا یعنی ابتداء عوام سے ہوتا ہے اور پھر خواص پکڑے جاتے ہیں اور بعض کے بچانے میں اللہ تعالیٰ کی یہ حکمت بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے آخر میں توبہ کرنی ہوتی ہے یا ان کی اولاد میں سے کسی نے اسلام قبول کرنا ہوتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴؍ اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

خلاصہ کلام یہ کہ سُنّت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ جب کوئی خدا کی طرف سے آتا ہے اور اُس کی تکذیب کی جاتی ہے تو طرح طرح کی آفتیں آسمان سے نازل ہوتی ہیں جن میں اکثر ایسے لوگ پکڑے جاتے ہیں جن کا اس تکذیب سے کچھ تعلق نہیں۔ پھر رفتہ رفتہ ائمۃ الکفر پکڑے جاتے ہیں اور سب سے آخر بڑے شریروں کا وقت آتا ہے۔ اِسی کی طرف اللہ تعالیٰ اِس آیت میں اشارہ فرماتا ہے اَنَّا نَاْتِى الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا یعنی ہم آہستہ آہستہ زمین کی طرف آتے جاتے ہیں۔ اِس میرے بیان میں اُن بعض نادانوں کے اعتراضات کا جواب آگیا ہے جو کہتے ہیں کہ تکفیر تو مولویوں نے کی تھی اور غریب آدمی طاعون سے مارے گئے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۶۳)

وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ۝

قرآن شریف صرف سماع کی حد تک محدود نہیں ہے کیونکہ اس میں انسانوں کے سمجھانے کے لئے بڑے بڑے معقول دلائل ہیں اور جس قدر عقائد اور اصول اور احکام اس نے پیش کئے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا امر نہیں جس میں زبردستی اور تحکم ہو جیسا کہ اس نے خود فرما دیا ہے کہ یہ سب عقائد وغیرہ انسان کی فطرت میں پہلے سے منقوش ہیں اور قرآن شریف کا نام ذکر رکھا ہے جیسا کہ فرماتا ہے هٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ یعنی یہ قرآنِ بابرکت کوئی نئی چیز نہیں لایا بلکہ جو کچھ انسان کی فطرت اور صحیفۂ قدرت میں

بھرا پڑا ہے اس کو یاد دلاتا ہے۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۹۷)

۱۵۔ قُلْنَا يٰنَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝

اگر خدائے تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ اور ربوبیتِ تامہ کو قوانینِ محدودہ محصورہ میں ہی منحصر سمجھا جائے تو جس چیز کو غیر محدود تسلیم کیا گیا ہے اس کا محدود ہونا لازم آجائے گا۔ پس برہمو سماج والوں کی یہی بھاری غلطی ہے کہ وہ خدائے تعالیٰ کی غیر متناہی قدرتوں اور ربوبیتوں کو اپنے تنگ اور منقبض تجارب کے دائرہ میں گھسیڑنا چاہتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ جو امور ایک قانون مشخص مقرر کے نیچے آجائیں اُن کا مفہوم محدود ہونے کو لازم پڑا ہوا ہے اور جو حکمتیں اور قدرتیں ذاتِ غیر محدود میں پائی جاتی ہیں اُن کا غیر محدود ہونا واجب ہے۔ کیا کوئی دانا کہہ سکتا ہے کہ اُس ذاتِ قادر مطلق کو اِس اِس طور پر بنانا یاد ہے اور اس سے زیادہ نہیں۔ کیا اُس کی غیر متناہی قدرتیں انسانی قیاس کے پیمانہ سے وزن کی جاسکتی ہیں یا اُس کی قادرانہ اور غیر متناہی حکمتیں تصرف فی العالم سے کسی وقت عاجز ہوسکتی ہیں بلاشبہ اُس کا پُر زور ہاتھ ذرہ ذرہ پر قابض ہے اور کسی مخلوق کا قیام اور بقا اپنی مستحکم پیدائش کے موجب سے نہیں بلکہ اسی کے سہارے اور آسرے سے ہے اور اس کی ربانی طاقتوں کے آگے بے شمار میدان قدرتوں کے پڑے ہیں نہ اندرونی طور پر کسی جگہ انتہا ہے اور نہ بیرونی طور پر کوئی کنارہ ہے۔ جس طرح یہ ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ ایک مشتعل آگ کی تیزی فرو کرنے کے لئے خارج میں کوئی ایسے اسباب پیدا کرے جن سے اس آگ کی تیزی جاتی رہے اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ اس آگ کی خاصیتِ احراق دُور کرنے کے لئے اُسی کے وجود میں کوئی ایسے اسباب پیدا کر دے جن سے خاصیتِ احراق دُور ہو جائے کیونکہ اس کی غیر متناہی حکمتوں اور قدرتوں کے آگے کوئی بات انہونی نہیں۔ اور جب ہم اس کی حکمتوں اور قدرتوں کو غیر متناہی مان چکے تو ہم پر یہ بھی فرض ہے کہ ہم اس بات کو بھی مان لیں کہ اس کی تمام حکمتوں اور قدرتوں پر ہم کو علم حاصل ہونا ممتنع اور محال ہے سو ہم اس کی ناپیدا کنار حکمتوں اور قدرتوں کے لئے کوئی قانون نہیں بنا سکتے اور جس چیز کی حدود ہمیں معلوم ہی نہیں اُس کی پیمائش کرنے سے ہم عاجز ہیں۔ ہم بنی آدم کی دُنیا کا نہایت ہی تنگ اور چھوٹا سا دائرہ ہیں اور پھر اُس دائرہ کا بھی پورا پورا ہمیں علم حاصل نہیں۔ پس اس صورت میں ہماری نہایت ہی کم ظرفی اور سفاہت ہے کہ ہم اس اقل قلیل پیمانہ سے خدائے تعالیٰ کی غیر محدود حکمتوں اور قدرتوں کو ناپنے لگیں۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۴۰۲ تا ۴۰۹ حاشیہ نمبر ۱۱)

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس بات کے ماننے سے کہ خدا تعالیٰ کی غیر متناہی حکمت استحالات غیر متناہیہ پر قادر ہے۔ حقائق اشیاء سے امان اٹھ جاتا ہے۔ مثلاً اگر خدا تعالیٰ اِس بات پر قادر سمجھا جائے کہ پانی کی صورتِ نوعیہ کو سلب کر کے ہوا کی صورتِ نوعیہ اس جگہ رکھ دے یا ہوا کی صورت نوعیہ کو سلب کر کے آگ کی صورتِ نوعیہ اُس کی قائم مقام کر دے یا آگ کی صورتِ نوعیہ کو سلب کر کے اُن مخفی اسباب سے جو اُس کے علم میں ہیں پانی کی صورتِ نوعیہ میں لے آوے یا مٹی کو کسی زمین کی تہ میں تصرفاتِ لطیفہ سے سونا بنا دے یا سونے کو مٹی بنا دے تو اس سے امان اُٹھ جائے گا اور علوم و فنون ضائع ہو جائیں گے تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ خیال سراسر فاسد ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اپنی مخفی حکمتوں کے تصرّف سے عناصر وغیرہ کو صدہا طور کے استحالات میں ڈالتا رہتا ہے۔ ایک زمین کو ہی دیکھو کہ وہ انواع اقسام کے استحالات سے کیا کچھ بنتی رہتی ہے اُسی سے سمّ الفار نکل آتا ہے اور اسی سے خاذ زہر اور اُسی سے سونا اور اُسی سے چاندی اور اُسی سے طرح طرح کے جواہرات اور ایسا ہی بخارات کا صعود ہو کر کیا کیا چیزیں ہیں جو جوّ آسمان میں پیدا ہو جاتی ہیں اُنہیں بخارات سے برف گرتی ہے اور اُنہیں سے اولے بنتے ہیں اور اُنہیں میں سے برق اور اُنہیں میں سے صاعقہ۔ اور یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ کبھی جوّ آسمان سے راکھ بھی گرتی ہے تو کیا ان حالات سے علم باطل ہو جاتے ہیں یا امان اُٹھ جاتا ہے اور اگر یہ کہو کہ ان چیزوں میں تو خدا تعالیٰ نے پہلے ہی سے اُن کی فطرت میں ان تمام استحالات کا مادہ رکھا ہے تو ہمارا یہ جواب ہوگا کہ ہم نے کب اور کس وقت کہا ہے کہ اشیاء متنازعہ فیہا میں ایسا مادہ متشارکہ نہیں رکھا گیا بلکہ صحیح اور سچا مذہب تو یہی ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو اپنی ذات میں واحد ہے تمام اشیاء کو شئے واحد کی طرح پیدا کیا ہے تا وہ موجود احد کی وحدانیت پر دلالت کریں۔ سو خدا تعالیٰ نے اسی وحدانیت کے لحاظ سے اور نیز اپنی قدرتِ غیر محدودہ کے تقاضہ سے استحالات کا مادہ ان میں رکھا ہے اور بجز اُن روحوں کے جو اپنی سعادت اور شقاوت میں خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ اَبَدًا[1] کے مصداق ٹھہرائے گئے ہیں اور وعدۂ الٰہی نے ہمیشہ کے لئے ایک غیر متبدل خلقت اُن کے لئے مقرر کر دی ہے باقی کوئی چیز مخلوقات میں سے استحالات سے بچی ہوئی معلوم نہیں ہوتی بلکہ اگر غور کر کے دیکھو تو ہر وقت ہر یک جسم میں استحالہ اپنا کام کر رہا ہے یہاں تک کہ علمِ طبعی کی تحقیقاتوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تین برس تک انسان کا جسم بدل جاتا ہے اور پہلا جسم ذرّات ہو کر اُڑ جاتا ہے۔ مثلاً اگر پانی ہے یا آگ ہے تو وہ بھی استحالہ سے خالی نہیں اور دو طور کے استحالے اُن پر حکومت کر رہے

---

[1] الجنّ آیت ۲۴

ہیں۔ایک یہ کہ بعض اجزاء نکل جاتے ہیں اور بعض اجزاء جدیدہ آملتے ہیں۔دوسرے یہ کہ جو اجزاء نکل جاتے ہیں وہ اپنی استعداد کے موافق دوسرا جسم لے لیتے ہیں۔غرض اِس فانی دُنیا کو استحالات کے چرخ پر چڑھائے رکھنا خدا تعالیٰ کی ایک سُنّت ہے اور ایک باریک نگاہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب چیزیں بوجہ وحدتِ مبدءِ فیض اپنی اصل ماہیت میں ایک ہی ہیں گو اِن چیزوں کا کامل کیمیاگر انسان نہیں بن سکتا اور کیونکر بنے حکیمِ مطلق نے اپنے اسرارِ حکمیہ غیر متناہیہ پر کسی دوسرے کو محیط نہیں کیا اور اگر یہ کہو کہ اجرامِ علوی میں استحالات کہاں ہیں تو میں کہتا ہوں کہ بے شک ان میں بھی استحالات اور تحلیلات کا مادہ ہے گو ہمیں معلوم نہ ہو تبھی تو ایک دن زوال پذیر ہو جائیں گے۔ماسوا اس کے ہزارہا چیزوں کے استحالات پر نظر ڈال کر ثابت ہوتا ہے کہ کوئی چیز استحالہ سے خالی نہیں۔سو تم پہلے زمین کے استحالات سے انکار کرو پھر آسمان کی بات کرنا۔؎

تو کارِ زمیں رانکو ساختی ؎ کہ با آسمان نیز پرداختی

غرض جب انواع اقسام کے استحالات ہر روز مشاہدہ میں آتے ہیں اور وحدت ذاتی الٰہی کا یہ تقاضا بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام چیزوں کا منبع اور مبدء ایک ہو اور خدا تعالیٰ کی الوہیتِ تامہ بھی تبھی قائم رہ سکتی ہے کہ جب ذرہ ذرہ پر اُس کا تصرف تام ہو تو پھر یہ استبعاد اور یہ اعتراض کہ ان استحالات سے امان اُٹھ جائے گا اور علوم ضائع ہوں گے اگر سخت غلطی نہیں تو اَور کیا ہے اور ہم جو کہتے ہیں کہ اللہ جلّ شانہٗ قادر ہے کہ پانی سے آگ کا کام لیوے یا آگ سے پانی کا کام۔تو اِس سے یہ مطلب تو نہیں کہ اپنی حکمتِ غیر متناہی کو اُس میں دخل نہ دے یونہی تحکم سے کام لے لیوے کیونکہ خدا تعالیٰ کا کوئی فعل آمیزشِ حکمت سے خالی نہیں اور نہ ہونا چاہیئے بلکہ ہمارا یہ مطلب ہے کہ جس وقت وہ پانی سے آگ کا کام یا آگ سے پانی کا کام لینا چاہے تو اُس وقت اپنی اُس حکمت کو کام میں لائے گا جو اس عالم کے ذرہ ذرہ پر حکومت رکھتی ہے گو ہم اُس سے مطلع ہوں یا نہ ہوں اور ظاہر ہے کہ جو حکمت کے طور پر کام ہو وہ علوم کو ضائع نہیں کرتا بلکہ علوم کی اُس سے ترقی ہوتی ہے۔دیکھو مصنوعی طور پر پانی کی برف بنائی جاتی ہے یا برقی روشنی پیدا کی جاتی ہے تو کیا اِس سے امان اُٹھ جاتا ہے یا علم ضائع ہو جاتے ہیں۔

اِس جگہ ایک اَور بھید یاد رکھنے کے لائق ہے اور وہ یہ ہے کہ اولیاء سے جو خوارق کبھی اِس قسم کے ظہور میں آتے ہیں کہ پانی اُن کو ڈبو نہیں سکتا اور آگ اُن کو نقصان نہیں پہنچا سکتی اس میں بھی دراصل یہی بھید ہے کہ حکیمِ مطلق جس کی بے انتہاء اسرار پر انسان حاوی نہیں ہوسکتا اپنے دوستوں اور مقرّبوں کی توجہ کے وقت کبھی یہ کرشمۂ قدرت دکھلاتا ہے کہ وہ توجہ عالم میں تصرّف کرتی ہے اور جن ایسے مخفی اسباب کے جمع ہونے سے مثلاً آگ کی حرارت اپنے اثر سے رُک سکتی ہے خواہ وہ اسباب اجرامِ علوی کی تاثیریں ہوں یا خود مثلاً آگ کی کوئی مخفی

خاصیت یا اپنے بدن کی ہی کوئی مخفی خاصیت یا ان تمام خاصیتوں کا مجموعہ ہو وہ اسباب اُس توجہ اور اُس دُعا سے حرکت میں آتی ہیں تب ایک امر خارق عادت ظاہر ہوتا ہے مگر اس سے حقائقِ اشیاء کا اعتبار نہیں اُٹھتا اور نہ علوم ضائع ہوتے ہیں بلکہ یہ تو علومِ الٰہیہ میں سے خود ایک علم ہے اور یہ اپنے مقام پر ہے اور مثلاً آگ کا محرق بالخاصیت ہونا اپنے مقام پر۔ بلکہ یوں سمجھ لیجئے کہ یہ روحانی مواد ہیں جو آگ پر غالب آکر اپنا اثر دکھاتے ہیں اور اپنے وقت اور اپنے محل سے خاص ہیں۔ اس دقیقہ کو دُنیا کی عقل نہیں سمجھ سکتی کہ انسانِ کامل خدا تعالیٰ کے رُوح کا جلوہ گاہ ہوتا ہے اور جب کبھی کامل انسان پر ایک ایسا وقت آجاتا ہے کہ وہ اُس جلوہ کا عین وقت ہوتا ہے تو اُس وقت ہر ایک چیز اُس سے ایسی ڈرتی ہے جیسا کہ خدا تعالیٰ سے۔ اُس وقت اُس کو درندہ کے آگے ڈال دو۔ آگ میں ڈال دو وہ اُس سے کچھ بھی نقصان نہیں اُٹھائے گا کیونکہ اُس وقت خدا تعالےٰ کی روح اُس پر ہوتی ہے اور ہر ایک چیز کا عہد ہے کہ اُس سے ڈرے۔ یہ معرفت کا ایک اخیری بھید ہے جو بغیر صحبتِ کاملین سمجھ میں نہیں آسکتا۔ چونکہ یہ نہایت دقیق اور پھر نہایت درجہ نادر الوقوع ہے اِس لئے ہر ایک فہم اس فلاسفی سے آگاہ نہیں مگر یہ یاد رکھو کہ ہر ایک چیز خدا تعالیٰ کی آواز سُنتی ہے۔ ہر ایک چیز پر خدا تعالیٰ کا تصرف ہے اور ہر ایک چیز کی تمام ڈوریاں خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اُس کی حکمت ایک بے انتہا حکمت ہے جو ہر یک ذرہ کی جڑھ تک پہنچی ہوئی ہے اور ہر یک چیز میں اتنی ہی خاصیتیں ہیں جتنی اُس کی قدرتیں ہیں۔ جو شخص اِس بات پر ایمان نہیں لاتا وہ اُس گروہ میں داخل ہے جو مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ[1] کے مصداق ہیں اور چونکہ انسان کامل مظہر اتم تمام عالَم کا ہوتا ہے اِس لئے تمام عالَم اُس کی طرف وقتاً فوقتاً کھینچا جاتا ہے۔ وہ روحانی عالَم کا ایک عنکبوت ہوتا ہے اور تمام عالَم اُس کی تاریں ہوتی ہیں اور خوارق کا یہی سِر ہے۔

ع

بر کار و بارِ ہستی اثری ست عارفاں را
زجہاں چہ دید آں کس کہ ندید ایں جہاں را

(برکات الدعاء صفحہ ۲۲ تا ۲۷ حاشیہ)

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلَامًا یعنی ہم نے کہا کہ اے تپ کی آگ سرد اور سلامتی ہوجا۔

(نزول المسیح صفحہ ۱۶ نیز براہین احمدیہ حصّہ سوم صفحہ ۲۲۷ حاشیہ درحاشیہ نمبرا)

یہ محقق امر ہے کہ ہمارے سیّد و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خُو اور طبیعت پر آئے تھے مثلاً جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید سے محبت کرکے اپنے تئیں آگ میں ڈال لیا اور پھر

---

[1] الانعام آیت ۹۲

قُلْنَا یَا نَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّسَلَامًا کی آواز سے صاف بچ گئے ایسا ہی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے تئیں توحید کے پیارے سے اس فتنہ کی آگ میں ڈال لیا جو آنجناب کی بعثت کے بعد تمام قوموں میں گویا تمام دُنیا میں بھڑک اُٹھی تھی اور پھر آواز وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ[1] سے جو خدا کی آواز تھی اس آگ سے صاف بچائے گئے۔

(تریاق القلوب صفحہ ۱۵۵ حاشیہ)

یہ سچی بات ہے کہ خدائے تعالیٰ غیر معمولی طور پر کوئی کام نہیں کرتا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ خلق اسباب کرتا ہے خواہ ہم کو اُن اسباب پر اطلاع ہو یا نہ ہو۔ الغرض اسباب ضرور ہوتے ہیں اِس لئے "شق القمر" یا "نَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّسَلَامًا" کے معجزات بھی خارج از اسباب نہیں بلکہ وہ بھی بعض مخفی در مخفی اسباب کے نتائج ہیں اور سچے اور حقیقی سائنس پر مبنی ہیں۔ کوتاہ اندیش اور تاریک فلسفہ کے دلدادہ اُسے نہیں سمجھ سکتے۔ مجھے تو یہ حیرت آتی ہے کہ جس حال میں یہ ایک امرِ مسلّم ہے کہ عدمِ علم سے عدمِ شئے لازم نہیں آتا تو نادان فلاسفر کیوں ان اسباب کی بے علمی پر جو ان معجزات کا موجب ہیں اصل معجزات کی نفی کی جُرأت کرتا ہے۔ ہاں ہمارا یہ مذہب ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر چاہے تو اپنے کسی بندے کو اُن اسبابِ مخفیہ پر مطلع کر دے لیکن یہ کوئی لازم بات نہیں ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۳۷)

سیّد عبد القادر جیلانی بھی ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ جب مومن مومن بننا چاہتا ہے تو ضرور ہے کہ اُس پر دُکھ اور ابتلاء آویں اور وہ یہاں تک آتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو قریب موت سمجھتا ہے اور پھر جب اس حالت تک پہنچ جاتا ہے تو رحمتِ الٰہیہ کا جوش ہوتا ہے تو قُلْنَا يَا نَارُ كُوْنِىْ بَرْدًا وَّسَلَامًا کا حکم ہوتا ہے اصل اور آخری بات یہی ہے مگر نہ شنیدۂ کہ خدا داری چہ غم داری۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۶ مورخہ ۲۴ر دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ جو کچھ ہے دعا ہی ہے۔ اِس پیرانہ سالی میں گوناگوں تجارب سے یہی حاصل ہوا ہے کہ سوائے خدا کے کوئی شئے نہیں نہ سفید کو سیاہ کر سکتے ہیں نہ پُرانے کو نیا۔ پس لازم ہے کہ توکّل کو ہاتھ سے نہ دے۔ اگرچہ انسان کو بشریت کے تقاضا سے اضطراب ہوتا ہے مگر وہ خاصہ بشریت ہے اور سب انبیاء بھی اس میں شریک ہیں جیسے کہ جنگِ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اضطراب ہوا تھا مگر عام لوگوں میں اور انبیاؤں میں یہ فرق ہے کہ عام لوگوں کی طرح انبیاؤں کے اضطراب میں یاس کبھی نہیں ہوتی ان کو اِس امر پر پورا یقین ہوتا ہے کہ خدا ضائع کبھی نہ کرے گا۔ میرا یہ حال ہے کہ اگر مجھے جلتی آگ

---

[1] المائدہ آیت ۶۸

میں بھی ڈالا جاوے تو بھی یہی خیال ہوتا ہے کہ ضائع نہ ہوں گا۔ اضطراب تو ہوگا کہ آگ ہے اس سے انسان جل جاتا ہے مگر امید ہوتی ہے کہ ابھی آواز آوے گی یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ لیکن دوسرے لوگوں کے اضطراب میں یاس ہوتا ہے خدا پر اُن کو توقع نہیں ہوتی اور یہ کفر ہے بشریت سے جو خوفِ خدا اور اضطراب پیش کرتی ہے ایمان اُسے دفع اور ذب کرتا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۸ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۶۱)

اوامر کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک امر شرعی ہوتا ہے جس کے برخلاف انسان کر سکتا ہے دوسرے اوامر کونی ہوتے ہیں جس کا خلاف ہو ہی نہیں سکتا جیسا کہ فرمایا قُلْنَا یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ اس میں کوئی خلاف نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ آگ اس حکم کے خلاف ہرگز نہ کر سکتی تھی۔ انسان کو جو حکم اللہ تعالیٰ نے شریعت کے رنگ میں دئے ہیں جیسے اقیموا الصَّلٰوۃ نماز کو قائم رکھو یا فرمایا وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ ان پر جب وہ ایک عرصہ تک قائم رہتا ہے تو یہ احکام بھی شرعی رنگ سے نکل کر کونی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور پھر وہ ان احکام کی خلاف ورزی کر ہی نہیں سکتا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۵)

(عرض کیا گیا کہ آریہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے پر اعتراض کرتے ہیں تو) فرمایا۔

ان لوگوں کے اعتراض کی جڑ معجزات اور خوارق پر نکتہ چینی کرنا ہے۔ ہم خدا تعالیٰ کے فضل سے دعویٰ کرتے ہیں اور اسی لئے خدا تعالیٰ نے ہمیں مبعوث کیا ہے کہ قرآن کریم میں جس قدر معجزات اور خوارق انبیاء کے مذکور ہوئے ہیں اُن کو خود دکھا کر قرآن کی حقانیت کا ثبوت دیں۔ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر دُنیا کی کوئی قوم ہمیں آگ میں ڈالے یا کسی اور خطرناک عذاب اور مصیبت میں مبتلا کرنا چاہے تو خدا تعالےٰ اپنے وعدہ کے موافق ضرور ہمیں محفوظ رکھے گا.....

اور اسی ضمن میں فرمایا:۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے جب مَیں سیالکوٹ میں تھا ایک مکان میں مَیں اور چند آدمی بیٹھے ہوئے تھے بجلی پڑی اور ہمارا سارا مکان دُھوئیں سے بھر گیا اور اُس دروازہ کی چوکھٹ جس کے متصل ایک شخص بیٹھا ہُوا تھا ایسی چیری گئی جیسے آرے سے چیری جاتی ہے مگر اس کی جان کو کچھ بھی صدمہ نہ پہنچا لیکن اسی دن بجلی تیجا سنگھ کے شوالہ پر بھی پڑی اور ایک لمبا راستہ اس کے اندر کو چکر کھا کر جاتا تھا جہاں ایک آدمی بیٹھا ہُوا تھا۔ وہ تمام چکر بجلی نے بھی کھائے اور جا کر اس پر پڑی اور ایسا جلایا کہ بالکل ایک کوئلے کی شکل اُسے کر دیا پھر یہ خدا کا تصرف نہیں تو کیا ہے کہ ایک شخص کو بچا لیا اور ایک کو مار دیا۔ خدا نے ہم سے وعدہ فرمایا ہے اور

اس پر ہمارا ایمان ہے وہ وعدہ وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ[1] کا ہے۔

پس اسے کوئی مخالف آزمالے اور آگ جلا کر ہمیں اس میں ڈال دے آگ ہرگز ہم پر کام نہ کرے گی اور وہ ضرور ہمیں اپنے وعدہ کے موافق بچالے گا لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہم خود آگ میں کودتے پھریں۔ یہ طریق انبیاء کا نہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ[2] پس ہم خود آگ میں دیدہ دانستہ نہیں پڑتے بلکہ یہ حفاظت کا وعدہ دشمنوں کے مقابلہ پر ہے کہ اگر وہ آگ میں ہمیں جلانا چاہیں تو ہم ہرگز نہ جلیں گے اِس لئے میرا ایمان تو یہ ہے کہ ہمیں تکلف اور تاویل کرنے کی ضرورت نہیں ہے جیسے خدا کے باطنی تصرّفات ہیں ویسے ہی ظاہری بھی ہم مانتے ہیں بلکہ اِسی لئے خدا نے اوّل ہی سے الہام کر دیا ہوا ہے کہ

"آگ سے ہمیں مت ڈرا آگ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی غلام ہے"

بجز اس طریق کے کہ خدا خود ہی تجلّی کرے اور کوئی دوسرا طریق نہیں ہے جس سے اس کی ذات پر یقینِ کامل حاصل ہو۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۴۷ مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۷۳)

چونکہ اِس دُنیا میں بھی ایک بہشت ہے جو مومن کو دیا جاتا ہے اس کے موافق ایک تبدیلی بھی یہاں ہوتی ہے۔ اس کو ایک خاص قسم کا رُعب دیا جاتا ہے جو الٰہی تجلّیات کے پرتَو سے ملتا ہے نفسِ امّارہ کے جذبات سے اس کو روک دیا جاتا ہے اور نفسِ مطمئنّہ کی سکینت اور اطمینان اس کو ملتا ہے۔ اس کی دعائیں قبول ہوتی ہیں یہاں تک کہ جیسے ابراہیم علیہ السلام کو کہا گیا قُلْنَا یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ اسی طرح پر اس کے لئے کہا جاتا ہے یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا اس آواز پر اس کے سارے جوشوں کو ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے اور وہ خدا تعالیٰ میں ایک راحت اور اطمینان پالیتا ہے اور ایک تبدیلی اس میں پیدا ہو جاتی ہے۔ جب تک یہ تبدیلی نہ ہو نماز روزہ، کلمہ زکوٰۃ وغیرہ ارکان محض رسمی اور نمائشی طور پر ہیں ان میں کوئی رُوح اور قوّت نہیں ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

احکام اور امر دو قسم کے ہوتے ہیں ایک شرعی رنگ میں ہوتے ہیں جیسے نماز پڑھو۔ زکوٰۃ دو۔ خون نہ کرو وغیرہ۔ اِس قسم کے اوامر میں ایک پیشگوئی بھی ہوتی ہے کہ گویا بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اس کی خلاف ورزی کریں گے جیسے یہود کو کہا گیا کہ توریت کو محرّف مبدّل نہ کرنا۔ یہ بتاتا تھا کہ بعض ان میں سے کریں گے چنانچہ ایسا ہی ہوُا۔ غرض یہ امر شرعی ہے اور یہ اصطلاحِ شریعت ہے۔

---

[1] المائدہ آیت ۶۸۔ [2] البقرہ آیت ۱۹۶۔

دوسرا امر کونی ہوتا ہے اور یہ احکام اور امر قضا و قدر کے رنگ میں ہوتے ہیں جیسے قُلْنَا یَا نَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلَامًا اور وہ پورے طور پر وقوع میں آگیا۔

(الحکم جلد ۹ ۴۲ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۵ء صہ ۲)

فتنہ و فساد کی آگ تو ہر نبی کے مقابل میں ہوتی ہے اور وہی ہمیشہ کوئی ایسا رنگ اختیار کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک معجز نما طاقت اپنے نبی کی تائید میں اس کے بالمقابل دکھاتا ہے۔ ظاہری آتش کا حضرت ابراہیم پر فرو کر دینا خدا تعالیٰ کے آگے کوئی مشکل امر نہیں اور ایسے واقعات ہمیشہ ہوتے رہتے ہیں حضرت ابراہیم کے متعلق ان واقعات کی اب بہت تحقیقات کی ضرورت نہیں کیونکہ ہزاروں سالوں کی بات ہے ہم خود اس زمانہ میں ایسے واقعات دیکھ رہے ہیں اور اپنے اُوپر تجربہ کر رہے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے جبکہ مَیں سیالکوٹ میں تھا تو ایک دن بارش ہو رہی تھی جس کمرہ کے اندر مَیں بیٹھا ہوا تھا اس میں بجلی آئی سارا کمرہ دُھوئیں کی طرح بھر گیا اور گندھک کی سی بُو آتی تھی لیکن ہمیں کچھ ضرر نہ پہنچا۔ اُسی وقت وہ بجلی ایک مندر میں گری جو کہ تیجا سنگھ کا مندر تھا اور اس میں ہندوؤں کی رسم کے مطابق طواف کے واسطے پیچ در پیچ اِردگرد دیوار بنی ہوئی تھی اور وہ اندر بیٹھا ہوا تھا بجلی ان تمام چکروں میں سے ہو کر اندر جا کر اس پر گری اور وہ جل کر کوئلہ کی طرح سیاہ ہو گیا۔ دیکھو وہی بجلی کی آگ تھی جس نے اس کو جلا دیا مگر ہم کو کچھ ضرر نہیں دے سکی کیونکہ خدا تعالیٰ نے ہماری حفاظت کی۔ ایسا ہی سیالکوٹ کا ایک اَور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ رات کو مَیں ایک مکان کی دوسری منزل میں سویا ہوا تھا اور اُسی کمرہ میں میرے ساتھ پندرہ سولہ اَور آدمی بھی تھے۔ رات کے وقت شہتیر میں ٹک ٹک کی آواز آئی۔ مَیں نے آدمیوں کو جگایا کہ شہتیر خوفناک معلوم ہوتا ہے یہاں سے نکل جانا چاہیئے۔ انہوں نے کہا کوئی چوہا ہو گا کچھ خوف کی بات نہیں اور یہ کہہ کر پھر سو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر ویسی ہی آواز سُنی تب مَیں نے ان کو دوبارہ جگایا مگر پھر بھی انہوں نے کچھ پرواہ نہ کی۔ پھر تیسری بار شہتیر سے آواز آئی تب مَیں نے ان کو سختی سے اُٹھایا اور سب کو مکان سے باہر نکالا اور جب سب نکل گئے تو خود بھی وہاں سے نکلا ابھی مَیں دوسرے زینہ پر تھا کہ وہ چھت نیچے گری اور دوسری چھت کو بھی ساتھ لے کر نیچے جا پڑی اور چارپائیاں ریزہ ریزہ ہو گئیں اور ہم سب بچ گئے۔ یہ خدا تعالیٰ کی معجزہ نما حفاظت ہے جب تک کہ ہم وہاں سے نکل نہ آئے شہتیر گرنے سے محفوظ رہا۔

ایسا ہی ایک دفعہ ایک بچھو میرے بستر کے اندر لحاف کے ساتھ مرا ہوا پایا گیا اور دوسری دفعہ ایک بچھو لحاف کے اندر چلتا ہوا پکڑا گیا مگر ہر دو بار خدا تعالیٰ نے مجھے ان کے ضرر سے محفوظ رکھا

ایک دفعہ میرے دامن کو آگ لگ گئی تھی مجھے خبر بھی نہ ہوئی ایک اَور شخص نے دیکھا اور بتلایا اور اس آگ کو بجھا دیا۔ خدا تعالیٰ کے پاس کسی کے بچانے کی ایک راہ نہیں بلکہ بہت راہیں ہیں۔ آگ کی گرمی اور سوزش کے واسطے بھی کئی ایک اسباب ہیں اور بعض اسباب مخفی در مخفی ہیں جن کی لوگوں کو خبر نہیں اور خدا تعالیٰ نے وہ اسباب اب تک دُنیا پر ظاہر نہیں کئے جن سے اس کی سوزش کی تاثیر جاتی رہے۔ پس اس میں کون سے تعجب کی بات ہے کہ حضرت ابراہیمؑ پر آگ ٹھنڈی ہوگئی۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۲۰ مورخہ ۱۰ رجون ۱۹۰۷ء صفحہ ۳،۴)

۸۰۔ فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا ؗ وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ؕ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝

پس ہم نے وہ نشان سلیمان کو سمجھائے۔ (براہین احمدیہ حصہ چہارم صفحہ ۵۶۲ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۴)

۸۸۔ وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ۚ

فتح البیان اور ابنِ کثیر اور معالم کو دیکھو یعنی سُورۃ الانبیاء۔ سورہ یونس اور الصافات کی تفسیر پڑھو اور تفسیر کبیر صفحہ ۱۸۸ سے غور سے پڑھو تا معلوم ہو کہ ابتلاء کی وجہ کیا تھی یہی تو تھی کہ حضرت یونس قطعی طور پر عذاب کو سمجھے تھے اگر کوئی شرط منجانب اللہ ہوتی تو یہ ابتلاء کیوں آتا۔ چنانچہ صاحبِ تفسیر کبیر لکھتا ہے اِنَّهُمْ لَمَّا لَمْ يُؤْمِنُوْا اَوْعَدَهُمْ بِالْعَذَابِ فَلَمَّا كُشِفَ الْعَذَابُ مِنْهُمْ بَعْدَ مَا تَوَعَّدَهُمْ خَرَجَ مِنْهُمْ مُغَاضِبًا یعنی یونس نے اُس وقت عذاب کی خبر سُنائی جبکہ اُس قوم کے ایمان سے نومید ہو چکا پس جبکہ عذاب اُن پر سے اُٹھایا گیا تو غضب ناک ہو کر نکل گیا۔ پس ان تفسیروں سے اصل حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ اوّل یونس نے اس قوم کے ایمان کے لئے بہت کوشش کی اور جبکہ کوشش بے سُود معلوم ہوئی اور یاس کُلّی نظر آئی تو انہوں نے خدا تعالیٰ کی وحی سے عذاب کا وعدہ دیا جو تین دن کے بعد نازل ہوگا اور صاحبِ

تفسیر کبیر نے جو پہلا قول نقل کیا ہے اُس کے سمجھنے میں نادان شیخ نے دھوکا کھایا ہے اور نہیں سوچا کہ اُسکے آگے صفحہ ۱۸۸ میں وہ عبارت لکھی ہے جس سے ثابت ہوا ہے کہ عذاب موت کی پیشگوئی بلا شرط تھی اور یہی آخری قول مفسرین اور ابن مسعود اور حسن اور شعبی اور سعید بن جبیر اور وہب کا ہے۔ پھر ہم کہتے ہیں کہ جس حالت میں وعدہ کی تاریخ ٹلنا نصوصِ قرآنیہ قطعیہ یقینیہ سے ثابت ہے جیسا کہ آیت وَاعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً[1] اس کی شاہد ناطق ہے تو وعید کی تاریخیں جو نزول عذاب پر دال ہوتی ہیں جن کا ٹلنا اور ردّ بلا ہونا توبہ اور استغفار اور صدقات سے باتفاق جمیع انبیاء علیہم السلام ثابت ہے۔ پس ان تاریخوں کا ٹلنا بوجہ اولیٰ ثابت ہوا اور اس سے انکار کرنا صرف سفیہ اور نادان کا کام ہے نہ کسی صاحبِ بصیرت کا۔

اور صاحبِ تفسیر کبیر اپنی تفسیر کے صفحہ ۱۶۴ میں لکھتے ہیں اِنَّ ذَنْبَهٗ يَعْنِيْ ذَنْبَ يُوْنُسَ كَانَ لِاَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى وَعَدَهٗ اِنْزَالَ الْاِهْلَاكِ بِقَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْهُ فَظَنَّ اَنَّهٗ نَازِلٌ لَامَحَالَةَ فَلِاَجْلِ هٰذَا الظَّنِّ لَمْ يَصْبِرْ عَلٰى دُعَائِهِمْ فَكَانَ الْوَاجِبُ عَلَيْهِمْ اَنْ يَسْتَمِرَّ عَلَى الدُّعَاءِ لِجَوَازِ اَنْ لَّا يُهْلِكَهُمُ اللّٰهُ بِالْعَذَابِ یعنی یونس کا یہ گناہ تھا کہ اُس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ وعدہ ملا تھا کہ اس کی قوم پر ہلاکت نازل ہوگی کیونکہ انہوں نے تکذیب کی پس یونس نے سمجھ لیا کہ یہ عذابِ موت قطعی اور اٹل ہے اور ضرور نازل ہوگا۔ اسی ظن سے وہ دعاءِ ہدایت پر صبر نہ کرسکا اور واجب تھا کہ دعا ہدایت کی کئے جاتا کیونکہ جائز تھا کہ خدا دعاءِ ہدایت قبول کرے اور ہلاک نہ کرے۔ اب ..... کیسی صفائی سے ثابت ہوگیا کہ یونس نبی وعدہ اہلاک کو قطعی سمجھتا تھا اور یہی اس کے ابتلاء کا موجب ہوا کہ تاریخ موت ٹل گئی اور اگر اس پر کفایت نہیں تو دیکھو امام سیوطی کی تفسیر دُرِّ منثور سورۃ انبیاء قَالَ اَخْرَجَ ابْنُ اَبِيْ حَاتِمٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ۔ قَالَ لَمَّا دَعَا يُوْنُسُ عَلٰى قَوْمِهٖ اَوْحَى اللّٰهُ اِلَيْهِ اَنَّ الْعَذَابَ يُصَبِّحُهُمْ فَلَمَّا رَاَوْهُ جَاَرُوْا اِلَى اللّٰهِ وَبَكَى النِّسَاءُ وَالْوِلْدَانُ وَرَغَتِ الْاِبِلُ وَفُصْلَانُهَا وَخَارَتِ الْبَقَرُ وَعَجَاجِيْلُهَا وَلَغَتِ الْغَنَمُ وَسِخَالُهَا فَرَحِمَهُمُ اللّٰهُ وَصَرَفَ ذَالِكَ الْعَذَابَ عَنْهُمْ وَغَضِبَ يُوْنُسُ فَقَالَ كُذِّبْتُ فَهُوَ قَوْلُهٗ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا یعنی ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت کی ہے کہ جبکہ یونس نے اپنی قوم پر بد دعا کی سو خدا تعالیٰ نے اس کی طرف وحی بھیجی کہ صبح ہوتے ہی عذاب نازل ہوگا پس جبکہ قوم نے عذاب کے آثار دیکھے تو خدا تعالیٰ کی طرف تضرّع کیا اور عورتیں اور بچے روئے اور اُونٹنیوں نے ان کے بچوں سمیت اور گائیوں نے ان کے بچھڑوں سمیت اور بھیڑ بکری نے ان کے بزغالوں کے سمیت خوف کھا کر شور مچایا پس خدا تعالیٰ نے ان پر رحم کیا

---

[1] الاعراف آیت ۱۴۳

اور عذاب کو ٹال دیا اور یونس غضب ناک ہؤا کہ مجھے تو عذاب کا وعدہ دیا گیا تھا یہ قطعی وعدہ کیوں خلافِ واقع نکلا۔ پس یہی اس آیت کے معنے ہیں کہ یونس غضب ناک ہؤا۔ اب دیکھو کہ یہاں تک یونس پر ابتلاء آیا کہ کُذِبْتُ اُس کے مُنہ سے نکل گیا یعنی مجھ پر کیوں ایسی وحی نازل ہوئی جس کی پیشگوئی پوری نہ ہوئی۔ اگر کوئی شرط اس وعدہ کے ساتھ ہوتی تو یونس باوجودیکہ اُس کو خبر پہنچ چکی تھی کہ قوم نے حق کی طرف رجوع کر لیا کیوں یہ بات مُنہ پر لاتا کہ میری پیشگوئی خلافِ واقعہ نکلی اور اگر کہو کہ یونس کو اُن کے ایمان اور رجوع کی خبر نہیں پہنچی تھی اور اسی وہم میں تھا کہ باوجود کفر پر باقی رہنے کے عذاب سے بچ گئے اِس لئے اس نے کہا کہ میری پیشگوئی خلافِ واقعہ نکلی سو اس کا دنداں شکن جواب ذیل میں لکھتا ہوں جو سیوطی نے زیرِ آیت وَاِنَّ یُوْنُسَ الخ لکھا ہے۔

قَالَ وَاَخْرَجَ ابْنُ جَرِیْرٍ وَّابْنُ اَبِیْ حَاتِمٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ بَعَثَ اللّٰہُ یُوْنُسَ اِلٰی اَھْلِ قَرْیَۃٍ فَرَدُّوْا عَلَیْہِ فَامْتَنَعُوْا مِنْہُ فَلَمَّا فَعَلُوْا ذَالِکَ اَوْحَی اللّٰہُ اِلَیْہِ اِنِّیْ مُرْسِلٌ عَلَیْھِمُ الْعَذَابَ فِیْ یَوْمِ کَذَا وَکَذَا فَخَرَجَ مِنْ بَیْنِ اَظْھُرِھِمْ فَاَعْلَمَ قَوْمَہُ الَّذِیْ وَعَدَھُمُ اللّٰہُ مِنْ عَذَابِہٖ اِیَّاھُمْ .... فَلَمَّا کَانَتِ اللَّیْلَۃُ الَّتِیْ وُعِدَ الْعَذَابُ فِیْ صَبِیْحَتِھَا فَرَاٰہُ الْقَوْمُ فَحَذَرُوْا فَخَرَجُوْا مِنَ الْقَرْیَۃِ اِلٰی بَرَازٍ مِّنْ اَرْضِھِمْ وَفَرَّقُوْا کُلَّ دَآبَّۃٍ وَّوَلَدَھَا ثُمَّ عَجُّوْا اِلَی اللّٰہِ وَاَنَابُوْا وَاسْتَقَالُوْا فَاَقَالَھُمُ اللّٰہُ وَانْتَظَرَ یُوْنُسُ الْخَبَرَ عَنِ الْقَرْیَۃِ وَاَھْلِھَا حَتّٰی مَرَّ بِہٖ مَارٌّ فَقَالَ مَا فَعَلَ اَھْلُ الْقَرْیَۃِ قَالَ فَعَلُوْا اَنْ یَّخْرُجُوْا اِلٰی بَرَازٍ مِّنَ الْاَرْضِ ثُمَّ فَرَّقُوْا بَیْنَ کُلِّ ذَاتِ وَلَدٍ وَّوَلَدِھَا ثُمَّ عَجُّوْا اِلَی اللّٰہِ وَاَنَابُوْا فَقُبِلَ مِنْھُمْ وَاُخِّرَ عَنْھُمُ الْعَذَابُ فَقَالَ یُوْنُسُ عِنْدَ ذَالِکَ لَا اَرْجِعُ اِلَیْھِمْ کَذَّابًا وَّمَضٰی عَلٰی وَجْھِہٖ۔

یعنی ابنِ جریر اور ابنِ ابی حاتم نے ابنِ عباس سے یہ حدیث لکھی ہے کہ خدا نے یونس نبی کو ایک بستی کی طرف مبعوث کیا پس انہوں نے دعوت کو نہ مانا اور رُک گئے۔ سو جبکہ انہوں نے ایسا کیا تو خدا تعالیٰ نے یونس کی طرف وحی بھیجی کہ مَیں فلاں دن میں اُن پر عذاب نازل کروں گا۔ سو یونس نے اس قوم کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ فلاں تاریخ کو تم پر عذاب نازل ہوگا اور اُن میں سے نکل گیا۔ پس جبکہ وہ رات آئی جس کی صبح کو عذاب نازل ہونا تھا سو قوم نے عذاب کے آثار دیکھے سو وہ ڈر گئے اور اپنی بستی سے ایک وسیع میدان میں نکل آئے جو انہیں کی زمین کی حدود میں تھا اور ہر یک جانور کو اُس کے بچے سے علیحدہ کر دیا یعنی رحیم خدا کے رجوع دلانے کے لئے یہ حیلہ سازی کی جو شیرخوار بچوں کو خواہ وہ انسانوں کے تھے یا حیوانوں کے اُن کی ماؤں سے علیحدہ پھینک دیا اور اس مفارقت سے ایک قیامت کا شور اس میدان میں برپا ہؤا۔ ماؤں کو اُنکے

شیر خوار بچّوں کو جنگل میں دُور ڈالنے سے سخت رِقّت طاری ہوئی اور اس پر بچّوں نے بھی اپنی پیاری ماؤں سے علیحدہ ہو کر اور اپنے تئیں اکیلے پا کر درد ناک شور مچایا اور اس کارروائی کے کرتے ہی سب لوگوں کے دل درد سے بھر گئے اور نعرے مار مار کر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف تضرّع کیا اور اُس سے معافی چاہی تب رحیم خدا نے جس کی رحمت سبقت لے گئی ہے یہ حالِ زار ان کا دیکھ کر اُن کو معاف کر دیا اور ادھر حضرت یونس عذاب کے منتظر تھے اور دیکھتے تھے کہ آج اُس بستی اور اس کے لوگوں کی کیا خبر آتی ہے یہاں تک کہ ایک رہگذر مسافر ان کے پاس پہنچ گیا انہوں نے پوچھا کہ اس بستی کا کیا حال ہے اُس نے کہا کہ انہوں نے یہ کارروائی کی کہ اپنی زمین کے ایک وسیع میدان میں نکل آئے اور ہر یک بچّہ کو اس کی ماں سے الگ کر دیا پھر اس درد ناک حالت میں اُن سب کے نعرے بلند ہوئے اور تضرّع کی اور رجوع کیا سو خدا تعالیٰ نے ان کی تضرّع کو قبول کیا اور عذاب میں تاخیر ڈال دی پس یونس نے ان باتوں کو سُنکر کہا کہ جبکہ حال ایسا ہوا یعنی جبکہ ان کی توبہ منظور ہو گئی اور عذاب ٹل گیا تو مَیں کذّاب کہلا کر ان کی طرف نہیں جاؤں گا۔ سو وہ تکذیب سے ڈر کر اس ملک سے نکل گیا......

ظاہر ہے کہ اگر وحی قطعی عذاب کی نہ ہوتی اور کوئی دوسرا پہلو ایمان لانے کا قوم کو بتلایا ہوتا تو وہ میدان میں ایسی درد ناک صورت اپنی نہ بناتے بلکہ شرط کے ایفاء پر عذاب ٹل جانے کے وعدہ پر مطمئن ہوتے۔ ایسا ہی اگر حضرت یونس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے علم ہوتا کہ ایمان لانے سے عذاب ٹل جائے گا تو وہ کیوں کہتے کہ اب مَیں اُس قوم کی طرف نہیں جاؤں گا کیونکہ مَیں اُن کی نظر میں کذّاب ٹھہر چکا جبکہ وہ سُن چکے تھے کہ قوم نے توبہ کی اور ایمان لے آئی۔ پس اگر یہ شرط بھی اُن کی وحی میں داخل ہوتی تو ان کو خوش ہونا چاہیئے تھا کہ پیشگوئی پوری ہوئی نہ یہ کہ وہ وطن چھوڑ کر ایک بھاری مصیبت میں اپنے تئیں ڈالتے۔ قرآن کا لفظ لفظ اسی پر دلالت کر رہا ہے کہ وہ سخت ابتلاء میں پڑے اور حدیث نے کیفیت ابتلاء کی یہ بتلائی۔ پس اب بھی اگر کوئی شیخ وشاب منکر ہو تو یہ صریح اس کی گردن کشی ہے۔ (انوار الاسلام (اشتہار انعامی چار ہزار روپیہ) صفحہ ۱۲ تا ۱۶)

یُوناہ یعنی یونس نبی کی کتاب میں جو بائبل میں موجود ہے باب ۳ آیت ۴ میں لکھا ہے اور یُوناہ شہر میں (یعنی نینوا میں) داخل ہونے لگا اور ایک دن کی راہ جا کر کے منادی کی اور کہا چالیس اَور دن ہوں گے تب نینوا برباد کیا جائے گا۔ تب نینوا کے باشندوں نے خدا پر اعتقاد کیا اور روزہ کی منادی کی اور سب نے چھوٹے بڑے تک ٹاٹ پہنا اور خدا نے ان کے کاموں کو دیکھا کہ وہ اپنے بُرے راہ سے باز آئے تب خدا اُس بدی سے کہ اس نے کہی تھی کہ مَیں اس سے کروں گا پچھتا کے باز آیا اور اُس نے اُن سے وہ بدی نہ کی۔ باب ۴۔ پر یُوناہ اس سے ناخوش ہُوا اور نپٹ رنجیدہ ہو گیا۔ اور اُس نے خداوند کے آگے دعا مانگی۔ ۳۔ اب اے خداوند مَیں تیری منت کرتا ہوں کہ میری جان کو مجھ سے لے لے کیونکہ میرا مرنا میرے جینے سے بہتر ہے تم کلامہٗ اب

..... ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو کہ یونس نبی کی کتاب سے بھی قطعی طور پر ثابت ہوگیا کہ موت کا عذاب مل گیا اور یہ بھی یقینی طور پر ثابت ہوگیا کہ اس پیشگوئی میں کوئی شرط نہ تھی اسی لئے تو یونس نے رنجیدہ ہوکر دعا کی کہ اب میرا مرنا بہتر ہے..... اس معافی سے عیسائیوں کے کفارہ کی بھی بیخ کنی ہوگئی کیونکہ یونس کی قوم صرف اپنی توبہ اور استغفار سے بچ گئی اور یونس تو یہی چاہتا تھا کہ اُن پر عذاب نازل ہو۔

(انوار الاسلام (اشتہار انعامی چار ہزار روپیہ) صفحہ ۱۵ حاشیہ)

اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ یَا اُولِی الْاَلْبَابِ اَنَّ قَوْمَ یُوْنُسَ عُصِمُوْا مِنَ الْعَذَابِ مَعَ اَنَّہٗ لَمْ یَکُنْ شَرْطُ التَّوْبَۃِ فِیْ نَبَاِ اللّٰہِ رَبِّ الْاَرْبَابِ۔ وَلِاَجْلِ ذٰلِكَ ذَھَبَ یُوْنُسُ مُغَاضِبًا مِنْ حَضْرَۃِ الْکِبْرِیَاءِ۔ وَتَاہَ فِیْ فَلَوَاتِ الْاِبْتِلَاءِ۔ وَلِذٰلِكَ سَمَّاہُ اللّٰہُ یُوْنُسَ لِاَنَّہٗ اُوْنِسَ بَعْدَ الْاِبْلَاسِ۔ وَفَازَ بَعْدَ الْیَاْسِ۔ وَمَا اَضَاعَہٗ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ۔ فَلَا شَكَّ اَنَّ الْبَلَاءَ کُلَّہٗ وَرَدَ عَلَیْہِ لِعَدَمِ الشَّرْطِ فِیْ نَبَاِ الرَّحْمٰنِ۔ وَلَوْ کَانَ شَرْطٌ یَّعْلَمُہٗ لَمَا فَرَّ کَالْغَضْبَانِ۔ وَلَمَا تَاہَ کَالْمَبْھُوْتِیْنَ وَلَمَّا تَرَكَ یُوْنُسُ بِسُوْءِ فَھْمِہِ الْاِسْتِقَامَۃَ وَالْاِسْتِقْلَالَ وَتَحَرَّی الْجَلَاءَ وَالْاِنْتِقَالَ اَدْخَلَہُ اللّٰہُ فِیْ بَطْنِ الْحُوْتِ ثُمَّ نَبَذَہُ الْحُوْتُ فِیْ عَرَاءِ السَّبْرُوْتِ۔ وَرَاٰی کُلَّ ذٰلِكَ بِمَا اَعْلَنَ ضَجَرَ قَلْبِہٖ بِالْحَرَکَۃِ مِنَ الْمُقَامِ وَفَارَقَ مَقَرَّہٗ مِنْ غَیْرِ اِذْنِ اللّٰہِ الْعَلَّامِ

(ترجمہ از مرتب) اے عقلمندو۔ تم جانتے ہو کہ یونس کی قوم عذاب سے بچالی گئی حالانکہ خدا تعالیٰ کی پیشگوئی میں توبہ کی شرط نہیں تھی اور اسی وجہ سے یونسؑ خدا تعالیٰ سے ناراض ہوکر چلے گئے اور ابتلاء کے بیابانوں میں سرگرداں پھرتے رہے اور اس واقعہ کی بناء پر اللہ نے آپ کا نام یونس رکھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مایوسی کے بعد اطمینان وسکون عطا کیا اور ناامیدی کے بعد بامراد ہوئے اور ارحم الراحمین خدا نے انہیں ضائع ہونے سے بچالیا۔ یہ سب مصیبت (یونس علیہ السلام پر) محض اس لئے آئی کہ خدا تعالیٰ کی پیشگوئی میں کوئی شرط موجود نہ تھی۔ اور اگر انہیں کسی شرط کا علم ہوتا تو وہ ناراض ہوکر فرار اختیار نہ کرتے اور نہ ہی مدہوشوں کی طرح سرگرداں پھرتے اور جب حضرت یونس علیہ السلام نے غلط فہمی کی بناء پر استقامت اور استقلال کو ترک کر دیا اور جلاوطنی اور نقلِ مکانی کو اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو مچھلی کے پیٹ میں داخل کر دیا۔ پھر اس مچھلی نے آپ کو ایک خشک اور چٹیل میدان میں پھینک دیا۔ اور یہ سب مشکلات آپ پر اِس لئے آئیں کہ انہوں نے اپنی جگہ کو ترک کرکے بیقراری اور تنگ دلی کا اظہار کیا اور اپنے مقام کو اللہ تعالیٰ کے اِذن کے بغیر چھوڑ دیا اور شتاب کارؤں

وَفَعَلَ فِعْلَ الْمُسْتَعْجِلِيْنَ۔ وَ اِدْخَالُهٗ فِيْ بَطْنِ الْحُوْتِ كَانَ اِشَارَةً اِلٰى مُحَاوَرَتِهٖ صَدَرَتْ مِنْهُ كَالْمَبْهُوْتِ وَكَذٰلِكَ سَمَّاهُ اللّٰهُ ذَا النُّوْنِ۔ بِمَا ظَهَرَ مِنْهُ حِدَّةٌ وَّ نُوْنٌ۔ بِالْغَضَبِ الْمَكْنُوْنِ وَلَا يَلِيْقُ لِاَحَدٍ اَنْ يَّغْضَبَ عَلٰى رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

فَالْحَاصِلُ اَنَّ قِصَّةَ يُوْنُسَ فِيْ كَلَامِ اللّٰهِ الْقَدِيْرِ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّهٗ قَدْ يُؤَخَّرُ عَذَابُ اللّٰهِ مِنْ غَيْرِ شَرْطٍ يُّوْجِبُ حُكْمَ التَّاخِيْرِ كَمَا اُخِّرَ فِيْ نَبَاِ يُوْنُسَ بَعْدَ التَّشْهِيْرِ۔ فَكَيْفَ فِيْ نَبَاٍ يُّوْجَدُ فِيْهِ شَرْطُ الرُّجُوْعِ۔ فَفَكِّرْ بِالْخُضُوْعِ وَ الْخُشُوْعِ وَلَا تَنْسَ حَظَّكَ مِنَ التَّقْوٰى وَالدِّيْنِ وَاِنَّ قِصَّةَ يُوْنُسَ مَوْجُوْدَةٌ فِي الْقُرْاٰنِ وَ الْكُتُبِ السَّابِقَةِ وَ الْاَحَادِيْثِ النَّبَوِيَّةِ۔ وَلَيْسَ هُنَاكَ ذِكْرُ شَرْطٍ مَّعَ ذِكْرِ الْعُقُوْبَةِ۔ وَ اِنْ لَّمْ تَقْبَلْ فَعَلَيْكَ اَنْ تُرِيَنَا شَرْطًا فِيْ تِلْكَ الْقِصَّةِ فَلَا تَكُنْ كَالْاَعْمٰى مَعَ وُجُوْدِ الْبَصَارَةِ۔ وَ اعْلَمْ اَنَّ الشَّرْطَ لَمْ يَكُنْ اَصْلًا فِي الْقِصَّةِ الْمَذْكُوْرَةِ وَلِاَجْلِ ذٰلِكَ ابْتُلِيَ يُوْنُسُ وَصَارَ مِنَ الْمَلُوْمِيْنَ۔ وَ نَزَلَتْ عَلَيْهِ الْهُمُوْمُ۔ وَ اَخَذَهُ الضَّجَرُ

کا رویہ اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ کا انہیں مچھلی کے پیٹ میں داخل کرنا اس ناراضگی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے تھا جو آپ سے پریشان خاطر لوگوں کی طرح صادر ہوئی۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کا نام ذوالنون رکھا۔ کیونکہ آپ سے "نون" یعنی تیزی ظاہر ہوئی تھی اور دل میں بھرے ہوئے غصہ کا اظہار ہوا حالانکہ کسی کو خدائے ربّ العالمین سے ناراض ہونا مناسب نہیں۔

پس حاصل کلام یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ جو قرآن مجید میں بیان ہوا ہے اس بات کا ثبوت ہے کہ کبھی کبھی اللہ تعالیٰ کا عذاب بغیر ایسی شرط کے جو پیشگوئی میں مذکور ہو تاخیر میں ڈال دیا جاتا ہے جیسا کہ حضرت یونس علیہ السلام کی پیشگوئی کی تشہیر کے بعد عذاب کو پیچھے ڈال دیا گیا۔ پس اُس پیشگوئی کے وقوع میں تاخیر کا ہو جانا جس میں رجوع کی شرط بھی پائی جاتی ہو کیونکر قابلِ اعتراض ہو سکتا ہے۔ پس خشوع وخضوع کے ساتھ غور کرو اور اپنے تقویٰ اور دین کو نہ بھولو۔ حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ قرآن مجید، کتبِ سابقہ اور احادیثِ نبویہ میں موجود ہے اور وہاں سزا کے ذکر کے ساتھ کسی شرط کا ذکر نہیں۔ اور اگر تم اِس بات کو ماننے کے لئے تیار نہ ہو تو تم پر لازم ہے کہ اس قصہ میں کوئی شرط ہمیں دکھاؤ۔ پس بصارت رکھنے کے باوجود نابینا نہ بنو اور جان لو کہ اس قصہ میں ہرگز کوئی شرط موجود نہیں تھی۔ اور اِسی لئے حضرت یونس علیہ السلام ابتلاء میں ڈالے گئے اور موردِ ملامت ہوئے۔ آپ پر ہموم وغموم نازل ہوئے اور آپ کو تنگئ دِل نے پکڑ لیا یہاں تک کہ آپ موت

الْمَذْمُومُ حَتَّى اسْتَشْرَفَ بِهِ التَّلَفُ وَنَسِيَ كُلَّ بَلَاءٍ سَلَفٍ وَظَنَّ اَنَّهُ مِنَ الْمُفْتَنِيْنَ۔ فَمَا كَانَ سَبَبُ افْتِتَانِهِ اِلَّا اَنَّهُ اسْتَيْقَنَ اَنَّ الْعَذَابَ قَطْعِيٌّ لَا يُرَدُّ۔ وَاَنَّهُ سَيَقَعُ فِي الْمِيْعَادِ كَمَا يُوَدُّ۔ فَانْقَضَى الْمِيْعَادُ وَمَا اسْتَنْشَى مِنَ الْعَذَابِ رِيْحًا۔ وَمَا اسْتَغْشَى لِبَاسًا مَرِيْحًا فَاَضْجَرَهُ هٰذَا الْاِدْكَارُ وَاسْتَهْوَتْهُ الْاَفْكَارُ وَكَانَ رَاَى الْقَوْمَ غَالِيْنَ فِي الْمِرَاءِ۔ مُسْرِعِيْنَ بِالْاِبَاءِ فَحَسِبَ اَنَّهُ مِنَ الْمَغْلُوْبِيْنَ۔ فَقَالَ لَنْ اَرْجِعَ اِلَيْهِمْ كَذَّابًا وَلَنْ اَسْمَعَ لَعْنَ الْاَشْرَارِ وَمَا رَاٰى طَرِيْقًا يَخْتَارُهُ فَاَلْقٰى نَفْسَهُ فِي الْبَحْرِ الذَّخَّارِ۔ فَتَدَارَكَهُ رُحْمُ رَبِّهٖ وَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ بِحُكْمِ اللّٰهِ الْجَبَّارِ وَرَاٰى مَا رَاٰى بِقَلْبٍ حَزِيْنٍ فَمِنَ الْمَعْلُوْمِ اَنَّهُ لَوْ كَانَ شَرْطٌ فِي نُزُوْلِ الْعَذَابِ لَمَا اضْطَرَّ يُوْنُسُ اِلٰى هٰذَا الْاِضْطِرَابِ وَمَا فَرَّ كَالْمُتَنَدِّمِيْنَ۔ اَمَا تَقْرَءُ كُتُبَ الْاَوَّلِيْنَ۔ وَقَوْلَ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ۔ اَتَجِدُ فِيْهَا اَثَرًا مِّنَ الشَّرْطِ فَاَخْرِجْ لَنَا اِنْ كُنْتَ مِنَ الصَّادِقِيْنَ۔

کے قریب پہنچ گئے اور تمام سابقہ مصائب کو بھول گئے اور انہوں نے یقین کر لیا کہ وہ سخت آزمائش میں ڈالے گئے ہیں۔ آپ کا فتنہ میں پڑنے کا سبب سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ آپ نے یہ سمجھا کہ عذاب قطعی اور اٹل ہے اور یہ کہ وہ عذاب آپ کی خواہش کے مطابق وقتِ مقررہ پر ضرور آئے گا لیکن مقررہ وقت گزر گیا اور انہوں نے عذاب کی بُو تک بھی نہ سُونگھی اور نہ وہ اطمینان وسکون کا لباس زیب تن کر سکے۔ پس اس واقعہ کی سرگذشت نے آپ کو بے چین کر دیا اور افکار نے آپ پر غلبہ پا لیا اور چونکہ وہ اپنی قوم کی اس حالت کو دیکھ چکے تھے کہ وہ خصومت میں حد سے بڑھ گئے اور انہوں نے انکار میں جلد بازی سے کام لیا ہے اس پر آپ نے سمجھ لیا کہ وہ قوم کے مقابلہ میں ہار گئے ہیں پس انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ مَیں کذّاب بن کر اپنی قوم کے پاس واپس نہ جاؤں گا اور نہ ہی شریروں کے لعن طعن سُنوں گا اور آپ کو کوئی راہ نہ سُوجھی جسے اختیار کرتے لاچار آپ نے اپنے آپ کو بحرِ زخار میں ڈال دیا لیکن رحمتِ الٰہی نے آپ کو اس رنگ میں بچا لیا کہ انہیں اللہ کے حکم سے ایک بڑی مچھلی نے نگل لیا اور انہوں نے بڑے غمگین دِل کے ساتھ بہت بڑی مصیبت اُٹھائی۔ پس معلوم ہوُا کہ اگر نزولِ عذاب میں کوئی شرط ہوتی تو یونس علیہ السلام اس بے قراری کی حالت کو نہ پہنچتے اور ندامت زدہ لوگوں کی طرح اپنی قوم سے راہِ فرار اختیار نہ کرتے۔ کیا تم پہلے لوگوں کی کتب اور حضرت خاتم النبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو نہیں پڑھتے۔ کیا تم ان میں کوئی شرط پاتے ہو۔ اگر تم سچے ہو تو اسے ہمارے سامنے پیش کرو۔

فَالْاٰنَ مَا رَاْیُكَ فِیْ اَنْبَآءٍ قُیِّدَتْ بِشَرْطِ الرُّجُوْعِ وَالتَّوْبَةِ اَلَیْسَ بِوَاجِبٍ اَنْ یَّرْعَی اللّٰہُ شُرُوْطَهٗ بِالْفَضْلِ وَالرَّحْمَةِ۔ (انجامِ آتھم صفحہ ۲۲۵ تا ۲۲۹)

خدا کریم ہے اور وعید کی تاریخ کو توبہ اور رجوع کو دیکھ کر کسی دوسرے وقت پر ڈال دینا کرم ہے اور چونکہ اُس ازلی وعدہ کے رُو سے یہ تاخیر خدائے کریم کی ایک سُنّت ٹھہر گئی ہے جو اس کی تمام پاک کتابوں میں موجود ہے اِس لئے اس کا نام تخلف وعدہ نہیں بلکہ ایفاء وعدہ ہے کیونکہ سُنّت اللہ کا وعدہ اس سے پورا ہوتا ہے بلکہ تخلف وعدہ اس صورت میں ہوتا کہ جب سُنّت اللہ کا عظیم الشّان وعدہ ٹال دیا جاتا مگر ایسا ہونا ممکن نہیں کیونکہ اس صورت میں خدا تعالیٰ کی تمام کتابوں کا باطل ہونا لازم آتا ہے۔
(تبلیغِ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد سوم صفحہ ۱۶۷ حاشیہ)

تمام قرآن اِس تعلیم سے بھرا پڑا ہے کہ اگر توبہ و استغفار قبل نزول عذاب ہو تو وقت نزول عذاب ٹل جاتا ہے۔ بائبل میں ایک بنی اسرائیل کے بادشاہ کی نسبت لکھا ہے کہ اس کی نسبت صاف طور پر وحی وارد ہو چکی تھی کہ پندرہ دن تک اس کی زندگی ہے پھر فوت ہو جائے گا لیکن اس کی دعا اور تضرّع سے خدا تعالیٰ نے وہ پندرہ دن کا وعدہ پندرہ سال کے ساتھ بدلا دیا اور موت میں تاخیر ڈال دی۔ یہ قصّہ مفسّرین نے بھی لکھا ہے بلکہ اَور حدیثیں اس قسم کی بہت ہیں جن کا لکھنا موجبِ طُول ہے بلکہ علاوہ وعید کے ٹلنے کے جو کرمِ مولا میں داخل ہے اکابر صوفیہ کا مذہب ہے جو کبھی وعدہ بھی ٹل جاتا ہے اور اس کا ٹلنا موجب ترقی درجات اہلِ کمال ہوتا ہے۔ دیکھو فیوض الحرمین شاہ ولی اللہ صاحب اور فتوح الغیب سیّد عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہما اور وقتوں اور میعادوں کا ٹلنا تو ایک ایسی سُنّت اللہ ہے جس سے بجز ایک سخت جاہل کے اَور کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ دیکھو حضرت موسیٰؑ کو نزول توریت کے لئے تیس رات کا وعدہ دیا تھا اور کوئی ساتھ شرط نہ تھی مگر وہ وعدہ قائم نہ رہا اور اُس پر دس دن اَور بڑھائے گئے جس سے بنی اسرائیل گوسالہ پرستی کے فتنہ میں پڑے پس جبکہ اس نصِ قطعی سے ثابت ہے کہ خدا تعالیٰ ایسے وعدہ کی تاریخ کو بھی ٹال دیتا ہے جس کے ساتھ کسی شرط کی تصریح نہیں کی گئی تھی تو وعید کی تاریخ میں عند الرجوع تاخیر ڈالنا خود کرم میں داخل ہے اور ہم لکھ چکے ہیں کہ اگر تاریخ عذاب کسی کے توبہ استغفار سے ٹل جائے

پس اب ان پیشگوئیوں کے بارہ میں تمہاری کیا رائے ہے جنہیں توبہ اور رجوع کی شرط سے مقیّد کیا گیا ہے۔ کیا یہ ضروری نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور فضل کے ساتھ مقررہ شرائط کا لحاظ رکھے۔

تو اُس کا نام تخلف وعدہ نہیں کیونکہ بڑا وعدہ سُنّت اللہ ہے پس جبکہ سُنّت اللہ پوری ہوئی تو وہ ایفاءِ وعدہ ہوا نہ تخلف وعدہ۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد سوم صفحہ ۱۷۸ تا ۱۸۰)

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ .... یاد رکھنا چاہیئے کہ وعدہ سے مراد وہ امر ہے جو علمِ الٰہی میں بطور وعدہ قرار پا چکا ہے نہ وہ امر جو انسان اپنے خیال کے مطابق اس کو قطعی وعدہ خیال کرتا ہو۔ اسی وجہ سے المیعاد پر جو الف لام ہے وہ عہد ذہنی کی قسم میں سے ہے یعنی وہ امر جو ارادہ قدیمہ میں وعدہ کے نام سے موسوم ہے گو انسان کو اس کی تفاصیل پر علم ہو یا نہ ہو وہ غیر متبدل ہے ورنہ ممکن ہے جو انسان جس بشارت کو وعدہ کی صورت میں سمجھتا ہے اس کے ساتھ کوئی ایسی شرط مخفی ہو جس کا عدم تحقق اس بشارت کی عدم تحقق کے لئے ضرور ہو کیونکہ شرائط کا ظاہر کرنا اللہ جلّ شانہٗ پر حق واجب نہیں ہے چنانچہ اسی بحث کو شاہ ولی اللہ صاحب نے بسط سے لکھا ہے اور مولوی عبد الحق صاحب دہلوی نے بھی فتوح الغیب کی شرح میں اس میں بہت عمدہ بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ آنحضرت صلعم کا بدر کی لڑائی میں تضرّع اور دعا کرنا اسی خیال سے تھا کہ الٰہی مواعید اور بشارات میں احتمال شرط مخفی ہے اور یہ اِس لئے سُنّت اللہ ہے کہ تا اس کی خاص بندوں پر ہیبت اور عظمتِ الٰہی مستولی رہیں۔ ماحصل کلام یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے وعدوں میں بے شک تخلف نہیں وہ جیسا کہ خدا تعالیٰ کے علم میں ہیں پورے ہو جاتے ہیں لیکن انسان ناقص العقل کبھی اُن کو تخلف کی صورت میں سمجھ لیتا ہے کیونکہ بعض ایسی مخفی شرائط پر اطلاع نہیں پاتا جو پیشگوئی کو دوسرے رنگ میں لے آتے ہیں اور ہم لکھ چکے ہیں کہ الہامی پیشگوئیوں میں یہ یاد رکھنے کے لائق ہے کہ وہ ہمیشہ ان شرائط کے لحاظ سے پوری ہوتی ہیں جو سُنّت اللہ میں اور الٰہی کتاب میں مندرج ہو چکی ہیں گو وہ شرائط کسی ولی کے الہام میں ہوں یا نہ ہوں۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد سوم صفحہ ۱۸۱ حاشیہ)

دعا بہت بڑی سپر کامیابی کے لئے ہے۔ یونسؑ کی قوم گریہ وزاری اور دعا کے سبب آنے والے عذاب سے بچ گئی۔ میری سمجھ میں معاتبت مغاضبت کو کہتے ہیں اور حُوت مچھلی کو کہتے ہیں اور نون تیزی کو بھی کہتے ہیں اور مچھلی کو بھی۔ پس حضرت یونسؑ کی وہ حالت ایک مغاضبت کی تھی۔ اصل یوں ہے کہ عذاب کے ٹل جانے سے ان کو شکوہ اور شکایت کا خیال گذرا کہ پیشگوئی اور دعا یُونہی رائگاں گئی اور یہ بھی خیال گذرا کہ میری بات پوری کیوں نہ ہوئی پس یہی مغاضبت کی حالت تھی۔ اس سے ایک سبق ملتا ہے کہ تقدیر کو اللہ بدل دیتا ہے اور رونا دھونا اور صدقات فردِ قرار دادِ جُرم کو بھی ردّی کر دیتے ہیں۔ اصول خیرات کا اِسی سے نکلا ہے۔ یہ طریق اللہ کو راضی کرنے کے ہیں۔ علمِ تعبیر الرؤیا میں مال کلیجہ ہوتا ہے اِس لئے خیرات کرنا جان دینا ہوتا ہے۔ اِنسان خیرات کرتے وقت کس قدر صدق و ثبات دکھاتا ہے اور اصل بات تو یہ ہے کہ صرف قیل وقال سے

کچھ نہیں بنتا جب تک کہ عملی رنگ میں لا کر کسی بات کو نہ دکھایا جاوے۔ صدقہ اس کو اسی لئے کہتے ہیں کہ صادقوں پر نشان کر دیتا ہے۔ حضرت یونسؑ کے حالات میں دُرِّ منثور میں لکھا ہے کہ آپ نے کہا کہ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ جب تیرے سامنے کوئی آوے گا تجھے رحم آجائے گا۔ ؎

ایں مُشتِ خاک را گر نہ بخشم چہ کُنم

(الحکم جلد ۲ عـ۲ مورخہ ۶۔ مارچ ۱۸۹۸ء صـ۲)

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ یعنی اے خدا تُو پاک ہے تیرے سوا اور کوئی نہیں میں ظالموں میں سے تھا۔ (ست بچن صـ۷۹)

وَزَكَرِیَّآ اِذْ نَادٰی رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ ۝

یعنی اے خدا مجھے اکیلا مت چھوڑ اور تُو سب سے بہتر وارث ہے۔ (تحفۃ الندوہ صـ۵)

مجھے اکیلا مت چھوڑ اور تُو خیر الوارثین ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ اول صـ۱۹۶)

یعنی مجھے اکیلا مت چھوڑ اور ایک جماعت بنا دے۔

(الحکم جلد ۱۱ عـ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۷ء صـ۹)

وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِیْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ۝ اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۝ وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَیْنَهُمْ ۖ كُلٌّ اِلَیْنَا رٰجِعُوْنَ ۝ فَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْیِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ۝

مریم نے جب اپنی اندامِ نہانی کو نامحرم سے محفوظ رکھا یعنی غایت درجہ کی پاکدامنی اختیار کی تو ہم نے

اس کو یہ انعام دیا کہ وہ بچّہ اس کو عنایت کیا کہ جو رُوح القدس کے نفخ سے پیدا ہوُا تھا۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے جو دُنیا میں بچّے دو قسم کے پیدا ہوتے ہیں (۱) ایک جن میں نفخ روح القدس کا اثر ہوتا ہے اور ایسے بچّے وہ ہوتے ہیں جب عورتیں پاکدامن اور پاک خیال ہوں اور اسی حالت میں استقرار نطفہ ہو۔ وہ بچّے پاک ہوتے ہیں اور شیطان کا ان میں حصّہ نہیں ہوتا (۲) دوسری وہ عورتیں ہیں جن کے حالات اکثر گندے اور ناپاک رہتے ہیں پس ان کی اولاد میں شیطان اپنا حصّہ ڈالتا ہے جیسا کہ آیت وَ شَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ[1] اسی کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس میں شیطان کو خطاب ہے کہ ان کے مالوں اور بچّوں میں حصّہ دار بن جا یعنی وہ حرام کے مال اکٹھا کریں گی اور ناپاک اولاد جنیں گی۔ ایسا سمجھنا غلطی ہے کہ حضرت عیسٰی کو نفخ روح سے کچھ خصوصیت تھی جس میں دوسروں کو حصّہ نہیں بلکہ نعوذ باللہ یہ خیال قریب قریب کفر کے جا پہنچتا ہے اصل حقیقت صرف یہ ہے کہ قرآن شریف میں انسانوں کی پیدائش میں دو قسم کی شراکت بیان فرمائی گئی ہے (۱) ایک روح القدس کی شراکت جب والدین کے خیالات پر ناپاکی اور خباثت غالب نہ ہو (۲) اور ایک شیطان کی شراکت جب ان کے خیال پر ناپاکی اور پلیدی غالب ہو اسی کی طرف اشارہ اس آیت میں بھی ہے کہ لَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا[2] پس بلاشبہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام اُن لوگوں میں سے تھے جو مسِ شیطان اور نفخِ ابلیس سے پیدا نہیں ہوئے اور بغیر باپ کے اُن کا پیدا ہونا یہ امر دیگر تھا جس کو رُوح القدس سے کچھ تعلق نہیں..... رُوح القدس کے فرزند وہی ہیں جو عورتوں کی پاک دامنی اور مردوں کے کامل پاک خیال کی حالت میں رحم مادر میں وجود پکڑتے ہیں اور ان کی ضد شیطان کے فرزند ہیں۔ خدا کی ساری کتابیں یہی گواہی دیتی آئی ہیں اور پھر بقیہ ترجمہ یہ ہے کہ ہم نے مریم اور اس کے بیٹے کو بنی اسرائیل کے لئے اور اُن سب کے لئے جو سمجھیں ایک نشان بنایا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت عیسٰیؑ کو بغیر باپ کے پیدا کر کے بنی اسرائیل کو یہ سمجھا دیا کہ تمہاری بد اعمالی کے سبب سے نبوّت بنی اسرائیل سے جاتی رہی کیونکہ عیسٰی باپ کے رو سے بنی اسرائیل میں سے نہیں ہے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۱۹، ۱۲۰)

یعنی خدا تعالیٰ نے اس عورت کو ہدایت دی جس نے اپنی شرم گاہ کو نامحرم سے بچایا۔ پس خدا نے اُس میں اپنی رُوح کو پھونک دیا اور اس کو اور اس کے بیٹے کو دُنیا کے لئے ایک نشان ٹھہرایا اور خدا نے کہا کہ یہ اُمّت تمہاری ایک ہی اُمّت ہے اور مَیں تمہارا پروردگار ہوں سو تم میری ہی بندگی کرو مگر وہ فرقہ

---

[1] بنی اسرائیل آیت ۶۵ ؎ [2] نوح آیت ۲۸ ؎

فرقہ ہوگئے اور اپنی بات کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور باہم اختلاف ڈال دیا اور آخر ہر ایک ہماری ہی طرف رجوع کرے گا۔ (شہادت القرآن طبع دوم صفحہ ۱)

اَلَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا (اِس سوال کے جواب میں کہ اس امر کی تائید میں کہ مریم علیہا السلام نے ساری عمر نکاح نہیں کیا یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ قرآن میں آیا ہے وَالَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا ، فرمایا محصنات تو قرآن شریف میں خود نکاح والی عورتوں پر بولا گیا ہے وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ[1] اور اَلَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا کے معنے تو یہ ہیں کہ اس نے زنا سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا۔ یہ کہاں سے نکلا کہ اس نے ساری عمر نکاح ہی نہیں کیا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱)

قرآن شریف نے آکر ان دونوں قوموں (یہود و نصاریٰ) کی غلطیوں کی اصلاح کی۔ عیسائیوں کو بتایا کہ وہ خدا کا رسول تھا خدا نہ تھا اور وہ ملعون نہ تھا مرفوع تھا اور یہودیوں کو بتایا کہ وہ ولد الزنا نہ تھا بلکہ مریم صدیقہ عورت تھی۔ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا کی وجہ سے اس میں نفخ روح ہوا تھا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

(اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا پر مخالفین کے اِس اعتراض پر کہ یہ خلافِ تہذیب ہے فرمایا) جو خدا تعالیٰ کو خالق سمجھتے ہیں تو کیا اس خلق کو لغو اور باطل قرار دیتے ہیں جب اس نے ان اعضاء کو خلق کیا اس وقت تہذیب نہ تھی۔ خالق مانتے ہیں اور خلق پر اعتراض نہیں کرتے ہیں تو پھر اس ارشاد پر اعتراض کیوں؟ دیکھنا یہ ہے کہ کیا زبانِ عرب میں اس لفظ کا استعمال ان کے عُرف کے نزدیک کوئی خلافِ تہذیب امر ہے۔ جب نہیں تو دوسری زبان والوں کا حق نہیں کہ اپنے عُرف کے لحاظ سے اسے خلافِ تہذیب ٹھہرائیں ہر سوسائٹی کے عُرفی الفاظ اور مصطلحات الگ الگ ہیں اور تہذیب اور خلافِ تہذیب امور الگ۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱)

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے مومن کی دو مثالیں بیان فرمائی ہیں ایک مثال فرعون کی عورت سے ہے جو کہ اس قسم کے خاوند سے خدا کی پناہ چاہتی ہے یہ اُن مومنوں کی مثال ہے جو نفسانی جذبات سے آگے گر گر جاتے ہیں اور غلطیاں کر بیٹھتے ہیں پھر پچھتاتے ہیں توبہ کرتے ہیں خدا سے پناہ مانگتے ہیں اُن کا نفس فرعون سے خاوند کی طرح اُن کو تنگ کرتا رہتا ہے وہ لوگ نفسِ لوّامہ رکھتے ہیں بدی سے بچنے کیلئے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔ دوسرے مومن وہ ہیں جو اس سے اعلیٰ درجہ رکھتے ہیں وہ صرف بدیوں سے ہی

---

[1] النساء آیت ۲۵

نہیں بچتے بلکہ نیکیوں کو حاصل کرتے ہیں اُن کی مثال اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم سے دی ہے اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِنْ رُّوْحِنَا۔ ہر ایک مومن جو تقویٰ اور طہارت میں کمال پیدا کرے وہ بروزی طور پر مریم ہوتا ہے اور خدا اس میں اپنی رُوح پھونک دیتا ہے جو کہ ابنِ مریم بن جاتی ہے۔ زمخشری نے بھی اس کے یہی معنے کئے ہیں کہ یہ آیت عام ہے اور اگر یہ معنی نہ کئے جاویں تو حدیث شریف میں آیا ہے کہ مریم اور ابنِ مریم کے سوا مسِّ شیطان سے کوئی محفوظ نہیں۔ اِس سے لازم آتا ہے کہ نعوذ باللہ تمام انبیاء پر شیطان کا دخل تھا پس دراصل اِس آیت میں بھی اشارہ ہے کہ ہر ایک مومن جو اپنے تئیں اس کمال کو پہنچائے۔ خدا کی رُوح اس میں پھونکی جاتی ہے اور وہ ابنِ مریم بن جاتا ہے اور اس میں ایک پیشگوئی ہے کہ اس اُمت میں ابنِ مریم پیدا ہوگا۔ تعجب ہے کہ لوگ اپنے بیٹوں کا نام محمد اور عیسیٰ اور موسیٰ اور یعقوب اور اسحاق اور اسماعیل اور ابراہیم رکھ لیتے ہیں اور اس کو جائز جانتے ہیں پر خدا کے لئے جائز نہیں جانتے کہ وہ کسی کا نام عیسیٰ یا ابنِ مریم رکھ دے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ۔

کون شخص اس سے انکار کر سکتا ہے کہ ابتدائے زمانہ کے بعد دُنیا پر بڑے بڑے انقلاب آئے پہلے زمانہ کے لوگ تھوڑے سے تھے اور زمین کے چھوٹے سے قطعہ پر آباد تھے اور پھر وہ زمین کے دُور دُور کناروں تک پھیل گئے اور زبانیں بھی مختلف ہوگئیں اور اس قدر آبادی بڑھی کہ ایک ملک دوسرے ملک سے ایک علیحدہ دُنیا کی طرح ہوگیا تو ایسی صورت میں کیا ضرور نہ تھا کہ خدا تعالیٰ ہر ایک ملک کے لئے الگ الگ نبی اور رسول بھیجتا اور کسی ایک کتاب پر کفایت نہ رکھتا۔ ہاں جب دُنیا نے پھر اتحاد اور اجتماع کے لئے پلٹا کھایا اور ایک ملک کو دوسرے ملک سے ملاقات کرنے کے لئے سامان پیدا ہوگئے اور باہمی تعارف کے لئے انواع واقسام کے ذرائع اور وسایل نکل آئے تب وہ وقت آگیا کہ قومی تفرقہ درمیان سے اُٹھا دیا جائے اور ایک کتاب کے ماتحت سب کو کیا جائے تب خدا نے سب دُنیا کے لئے ایک ہی نبی بھیجا تا وہ سب قوموں کو ایک ہی مذہب پر جمع کرے اور تا وہ جیسا کہ ابتداء میں ایک قوم تھی آخر میں بھی ایک ہی قوم بنادے۔

اور یہ ہمارا بیان جیسا کہ واقعات کے موافق ہے ایسا ہی خدا تعالیٰ کے اُس قانونِ قدرت کے موافق ہے جو زمین و آسمان میں پایا جاتا ہے کیونکہ اگرچہ اُس نے زمین کو الگ تاثیرات بخشی ہیں اور چاند کو الگ اور ہر ایک ستارہ میں جُدا جُدا قوتیں رکھی ہیں مگر پھر بھی باوجود اس تفرقہ کے سب کو ایک ہی نظام میں داخل کر دیا ہے اور تمام نظام کا پیشرو آفتاب کو بنایا ہے جس نے ان تمام سیاروں کو انجن کی طرح اپنے پیچھے لگا لیا ہے۔ پس اس سے غور کرنے والی طبیعت سمجھ سکتی ہے کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ کی ذات میں وحدت

ہے ایسا ہی وہ نوعِ انسان میں بھی جو ہمیشہ کی بندگی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں وحدت کو ہی چاہتا ہے اور درمیانی تفرقہ قوموں کا جو بباعث کثرت نسلِ انسان نوعِ انسان میں پیدا ہوا وہ بھی دراصل کامل وحدت پیدا کرنے کے لئے ایک تمہید تھی کیونکہ خدا نے یہی چاہا کہ پہلے نوعِ انسان میں وحدت کے مختلف حصّے قائم کرکے پھر ایک کامل وحدت کے دائرہ کے اندر سب کو لے آوے سو خدا نے قوموں کے جُدا جُدا گروہ مقرر کئے اور ہر ایک قوم میں ایک وحدت پیدا کی اور اس میں یہ حکمت تھی کہ تا قوموں کے تعارف میں سہولت اور آسانی پیدا ہو اور ان کے باہمی تعلقات پیدا ہونے میں کچھ دِقّت نہ ہو اور پھر جب قوموں کے چھوٹے چھوٹے حصّوں میں تعارف پیدا ہو گیا تو پھر خدا نے چاہا کہ سب قوموں کو ایک قوم بنا دے۔ جیسے مثلاً ایک شخص باغ لگاتا ہے اور باغ کے مختلف بُوٹوں کو مختلف تختوں پر تقسیم کرتا ہے اور پھر اس کے بعد تمام باغ کے اِردگرد دیوار کھینچ کر سب درختوں کو ایک ہی دائرہ کے اندر کر لیتا ہے اِسی کی طرف قرآن شریف نے اشارہ فرمایا ہے اور وہ یہ آیت ہے اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ یعنی اے دُنیا کے مختلف حصّوں کے نبیو! یہ مسلمان جو مختلف قوموں میں سے اِس دُنیا میں اکٹھے ہوئے ہیں یہ تم سب کی ایک اُمّت ہے جو سب پر ایمان لاتے ہیں اور مَیں تمہارا خدا ہوں سو تم سب مِل کر میری ہی عبادت کرو (دیکھو الجزو نمبر ۱۷ سورۃ الانبیاء) اس تدریجی وحدت کی مثال ایسی ہے جیسے خدا تعالیٰ نے حکم دیا کہ ہر ایک محلہ کے لوگ اپنی اپنی محلہ کی مسجدوں میں پانچ وقت جمع ہوں اور پھر حکم دیا کہ تمام شہر کے لوگ ساتویں دن شہر کی جامع مسجد میں جمع ہوں یعنی ایسی وسیع مسجد میں جس میں سب کی گنجائش ہو سکے اور پھر حکم دیا کہ سال کے بعد عیدگاہ میں تمام شہر کے لوگ اور نیز گردونواح دیہات کے لوگ ایک جگہ جمع ہوں اور پھر حکم دیا کہ عمر بھر میں ایک دفعہ تمام دُنیا ایک جگہ جمع ہو یعنی مکہ معظمہ میں۔ سو جیسے خدا نے آہستہ آہستہ اُمّت کے اجتماع کو حج کے موقع پر کمال تک پہنچایا اوّل چھوٹے چھوٹے موقعے اجتماع کے مقرر کئے اور بعد میں تمام دُنیا کو ایک جگہ جمع ہونے کا موقع دیا سو یہی سُنّت اللہ الہامی کتابوں میں ہے اور اس میں خدا تعالیٰ نے یہی چاہا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ نوعِ انسان کی وحدت کا دائرہ کمال تک پہنچا دے اوّل تھوڑے تھوڑے ملکوں کے حصّوں میں وحدت پیدا کرے اور پھر آخر میں حج کے اجتماع کی طرح سب کو ایک جگہ جمع کر دیوے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۱۳۶ تا ۱۳۸)

(الانبیاء) وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَاۤ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۝ حَتّٰۤى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ ۝

اِس میں تو کچھ شک نہیں کہ اِس بات کے ثابت ہونے کے بعد کہ درحقیقت حضرت مسیح ابن مریم اسرائیلی نبی فوت ہو گیا ہے ہر یک مسلمان کو یہ ماننا پڑے گا کہ فوت شدہ نبی ہرگز دُنیا میں دوبارہ نہیں آ سکتا کیونکہ قرآن اور حدیث دونوں بالاتفاق اِس بات پر شاہد ہیں کہ جو شخص مرگیا پھر دُنیا میں ہرگز نہیں آئے گا اور قرآن کریم اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ کہہ کر ہمیشہ کے لئے اِس دُنیا سے اُن کو رخصت کرتا ہے۔

(ازالہ اوہام حصّہ دوم ص۶۶۵)

ہمارا یہی اصول ہے کہ مُردوں کو زندہ کرنا خدا تعالیٰ کی عادت نہیں اور وہ آپ فرماتا ہے حَرَامٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَھْلَکْنٰھَآ اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ یعنی ہم نے یہ واجب کر دیا ہے کہ جو مرگئے پھر وہ دُنیا میں نہیں آئیں گے۔ (ازالہ اوہام حصّہ دوم ص۶۰۰)

حضرت ابن عباسؓ سے حدیث صحیح میں ہے کہ اِس آیت کے یہ معنے ہیں کہ جن لوگوں پر واقعی طور پر موت وارد ہو جاتی ہے اور درحقیقت فوت ہو جاتے ہیں پھر وہ زندہ کر کے دُنیا میں بھیجے نہیں جاتے۔ یہی روایت تفسیر معالم میں بھی زیر تفسیر آیت موصوفہ بالا حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے۔

(ازالہ اوہام حصّہ دوم صلف حاشیہ درحاشیہ متعلق ص۹۴۲)

اُس نے صریح اور صاف لفظوں میں فرما دیا ہے کہ جو لوگ مرگئے پھر دُنیا میں نہیں آیا کرتے جیسا کہ وہ فرماتا ہے..... حَرَامٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَھْلَکْنٰھَآ اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ۔ (ازالہ اوہام حصّہ دوم ص۶۳۹)

اللہ تعالیٰ بار بار فرماتا ہے کہ جو مر جاتے ہیں وہ واپس نہیں آتے اور ترمذی میں حدیث موجود ہے کہ ایک صحابی شہید ہوئے انہوں نے عرض کی کہ یا الٰہی مجھے دُنیا میں پھر بھیجو تو خدا تعالیٰ نے جواب یہی دیا قَدْ سَبَقَ الْقَوْلُ مِنِّیْ حَرَامٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَھْلَکْنٰھَآ اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ۔

(الحکم جلد ۴ ص۲۶ مورخہ ۱۶؍جولائی ۱۹۰۰ء ص۲)

قرآن شریف پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مُردوں کے واپس نہ آنے کے دو وعدے ہیں ایک جہنمیوں کے لئے جیسے فرمایا وَحَرَامٌ عَلٰی قَرْیَةٍ اَھْلَکْنٰھَآ اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ۔ اَھْلَکْنٰھَآ عذاب پر بھی آتا ہے۔ اِس سے پایا جاتا ہے کہ خراب زندگی کے لوگ پھر واپس نہیں آئیں گے اور ایسا ہی بہشتیوں کے لئے بھی آیا ہے لَا یَبْغُوْنَ عَنْھَا حِوَلًا[1] (الحکم جلد ۸ ص۸ مورخہ ۱۰؍مارچ ۱۹۰۴ء ص۶)

اِن آیات کا یہ منشاء ہے کہ جو لوگ ہلاک کئے گئے اور دُنیا سے اُٹھائے گئے اُن پر حرام ہے کہ پھر دُنیا

---

[1] الکھف آیت ۱۰۹

میں آویں بلکہ جو گئے سو گئے۔ ہاں یاجوج و ماجوج کے وقت میں ایک طور سے رجعت ہوگی یعنی گذشتہ لوگ جو مر چکے ہیں اُن کے ساتھ اُس زمانہ کے لوگ ایسی اتم اور اکمل مشابہت پیدا کرلیں گے کہ گویا وہی آگئے اِسی بناء پر اس زمانہ کے علماء کا نام یہود رکھا گیا اور مہدی مسیح کا نام ابنِ مریم رکھا گیا اور پھر اُسی خاتم الخلفاء کا نام باعتبار ظہور بیّن صفاتِ محمدیہ کے محمد اور احمد رکھا گیا اور مستعار طور پر رسول اور نبی کہا گیا اور اُسی کو آدم سے لے کر اخیر تک تمام انبیاء کے نام دئے گئے تا وعدۂ رجعت پُورا ہو جائے۔

(نزول المسیح ص۵ حاشیہ)

وَ اَمَّا قَوْلُنَا اَنَّ یَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مِنَ النَّصَارٰی لَا قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ فَثَابِتٌ بِالنُّصُوْصِ الْقُرْاٰنِیَّةِ۔ لِاَنَّ الْقُرْاٰنَ الْکَرِیْمَ قَدْ ذَکَرَ غَلَبَتَهُمْ عَلٰی وَجْهِ الْاَرْضِ وَ قَالَ مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ یَعْنِیْ یَمْلِکُوْنَ کُلَّ رِفْعَةٍ فِی الْاَرْضِ وَ یَجْعَلُوْنَ اَعِزَّةَ اَهْلِهَاۤ اَذِلَّةً وَّ یَبْتَلِعُوْنَ کُلَّ حُکُوْمَةٍ وَّ رِیَاسَةٍ وَّ سَلْطَنَةٍ وَّ دَوْلَةٍ بِابْتِلَاعِ الْحُوْتِ الْعَظِیْمِ الصِّغَارَ۔ وَ اِنَّا نَرٰی بِاَعْیُنِنَا اَنَّهُمْ کَذٰلِکَ یَفْعَلُوْنَ وَ اضْمَحَلَّتْ رِیَاسَاتُ الْمُسْلِمِیْنَ وَ تَطَرَّقَ الضُّعْفُ فِیْ دَوْلَتِهِمْ وَ قُوَّتِهِمْ وَ شَوْکَتِهِمْ وَ یَرَوْنَ سَلَاطِیْنَ النَّصَارٰی کَالسِّبَاعِ حَوْلَهُمْ وَلَا یَبِیْتُوْنَ اِلَّا خَائِفِیْنَ وَ قَدْ ثَبَتَ مِنَ النُّصُوْصِ الْقَوِیَّةِ الْقَطْعِیَّةِ الْقُرْاٰنِیَّةِ اَنَّ کَاْسَ السَّلْطَنَةِ وَ الْغَلَبَةِ عَلٰی وَجْهِ الْاَرْضِ تَدُوْرُ بَیْنَ النَّصَارٰی وَ الْمُسْلِمِیْنَ وَلَا تَتَجَاوَزُهُمْ اَبَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ۔ کَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی: وَجَاعِلُ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ فَوْقَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْۤا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ۔ (حمامة البشرٰی ص۲۹ حاشیہ)

(ترجمہ) اور ہمارا یہ قول کہ یاجوج ماجوج نصاریٰ سے ہیں اور کوئی اَور قوم نہیں۔ تو یہ نصوصِ قرآنیہ سے ثابت ہے اِس لئے کہ قرآن کریم نے بتا دیا ہے کہ تمام رُوئے زمین پر غالب ہوں گی اور ہر ایک بلندی سے اُتریں گی۔ یعنی زمین میں ہر ایک رفعت کو حاصل کریں گے اور معززوں کو ذلیل کر دیں گے اور سب حکومتوں اور ریاستوں اور سلطنتوں اور دولتوں کو اس بڑی مچھلی کی مانند نگل جاویں گے جو چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو نگل جاتی ہے اور ہمارا چشمدید ہے کہ وہ ایسا ہی کر رہے ہیں اور مسلمانوں کی ریاستیں پژمردہ ہوگئی ہیں اور دولت وشوکت میں ضعف آگیا ہے اور عیسائی سلطنتوں کو اپنے اِردگرد درندوں کی مانند دیکھتے ہیں اور ڈرتے ڈرتے رات کاٹتے ہیں اور قرآن کے قوی اور قطعی نصوص سے ثابت ہو گیا ہے کہ سلطنت اور غلبہ کا پیالہ قیامت تک نصاریٰ اور مسلمانوں ہی کے درمیان چلتا رہے گا اور کبھی ان سے باہر نہ جاوے گا جیسا کہ خداوند کریم نے فرمایا ہے مَیں تیرے تابعداروں کو تیرے مُنکروں پر قیامت تک غالب رکھوں گا۔ (حمامۃ البشریٰ ص۲۹ حاشیہ)

اِنَّ اللّٰہَ قَدْ وَعَدَ فِی الْکِتَابِ اَنَّ فِیْ اٰخِرِ الْاَیَّامِ تَنْزِلُ مَصَائِبُ عَلَی الْاِسْلَامِ وَیَخْرُجُ قَوْمٌ مُفْسِدُوْنَ وَمِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ فَاَشَارَ فِیْ قَوْلِہٖ مِنْ کُلِّ حَدَبٍ اَنَّھُمْ یَمْلِکُوْنَ کُلَّ خِصْبٍ وَجَدْبٍ وَیُحِیْطُوْنَ عَلٰی کُلِّ الْبُلْدَانِ وَالدِّیَارِ وَیُفْسِدُوْنَ فَسَادًا عَامًّا فِیْ جَمِیْعِ الْاَقْطَارِ وَ فِیْ جَمِیْعِ قَبَائِلِ الْاَخْیَارِ وَالْاَشْرَارِ وَیُضِلُّوْنَ النَّاسَ بِاَنْوَاعِ الْحِیَلِ وَغَوَائِلِ الزَّخْرُفَۃِ وَیُلَوِّثُوْنَ عِرْضَ الْاِسْلَامِ بِاَصْنَافِ الْاِفْتِرَآءِ وَالتُّھْمَۃِ وَیَظْھَرُ مِنْ کُلِّ طَرَفٍ ظُلْمَۃٌ عَلٰی ظُلْمَۃٍ وَیَکَادُ الْاِسْلَامُ اَنْ یَّزْھَقَ بِتَبِعَۃٍ وَّیَزِیْدُ الضَّلَالُ وَالزُّوْرُ وَالْاِحْتِیَالُ وَیَرْحَلُ الْاِیْمَانُ وَتَبْقَی الدَّعَاوِیْ وَالدَّلَالُ حَتّٰی یَخْفٰی عَلَی النَّاسِ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِیْمُ وَیَشْتَبِہُ عَلَیْھِمُ الْمَھْیَعُ الْقَدِیْمُ لَا یَنْتَھِجُوْنَ مَحَجَّۃَ الْاِھْتِدَآءِ وَتَزِلُّ اَقْدَامُھُمْ وَتَغْلِبُ سِلْسِلَۃُ الْاَھْوَآءِ وَیَکُوْنُ الْمُسْلِمُوْنَ کَثِیْرَ التَّفْرِقَۃِ وَالْعِنَادِ وَمُنْتَشِرِیْنَ کَانْتِشَارِ الْجَرَادِ لَا تَبْقٰی مَعَھُمْ اَنْوَارُ الْاِیْمَانِ وَاٰثَارُ الْعِرْفَانِ بَلْ اَکْثَرُھُمْ یَنْخَرِطُوْنَ فِیْ سِلْکِ الْبَھَائِمِ اَوِ الذِّیَابِ اَوِ الثُّعْبَانِ وَیَکُوْنُوْنَ عَنِ الدِّیْنِ غَافِلِیْنَ۔ وَکُلُّ ذٰلِکَ یَکُوْنُ مِنْ اَثَرِ یَاجُوْجَ وَمَاجُوْجَ وَیُشَابِہُ النَّاسُ

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں وعدہ کیا ہے کہ آخری زمانہ میں اسلام پر مصائب نازل ہوں گی اور ایک مفسد قوم کا خروج ہوگا جو ہر ایک بلندی سے پھلانگتی ہوئی آئے گی۔ آیت کریمہ کے الفاظ مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ میں اِس طرف اشارہ ہے کہ وہ ہر زرخیز اور بنجر جگہ کے مالک ہو جائیں گے اور تمام شہروں اور علاقوں پر قبضہ کر لیں گے اور وہ تمام ممالک میں اور تمام نیکوں اور بدوں کے گروہوں میں عام فساد برپا کریں گے اور ہلاکت خیز ملمع سازیوں کے ذریعہ سے لوگوں کو گمراہ کریں گے اور اسلام کی عزت کو مختلف قسم کے افتراء اور تہمتوں سے ملوّث کر دیں گے اور ہر طرف تاریکی پر تاریکی چھا جائے گی اور اس کے نتیجہ میں اسلام مٹنے کے قریب پہنچ جائے گا۔ گمراہی، جھوٹ اور فریب کاری بڑھ جائے گی اور ایمان دُنیا سے رخصت ہو جائے گا اور صرف اسلام کا دعویٰ اور اس کے نام پر فخر و ناز باقی رہ جائے گا یہاں تک کہ لوگوں پر صراطِ مستقیم مخفی ہو جائے گا اور اسلام کا فراخ قدیمی راستہ ان پر مشتبہ ہو جائے گا وہ ہدایت کے راستے کو اختیار نہیں کریں گے اور ان کے قدم پھسل جائیں گے اور خواہشات یکے بعد دیگرے ان پر غلبہ پالیں گی اور مسلمانوں میں کثرت سے تفرقہ اور عناد پھیل جائے گا اور وہ ٹڈیوں کی مانند منتشر اور پراگندہ ہو جائیں گے ان میں نورِ ایمان اور آثارِ عرفان باقی نہیں رہیں گے بلکہ ان میں سے اکثر چوپایوں، بھیڑیوں اور اژدھاؤں کا طریق اختیار کر لیں گے اور دین سے بے بہرہ ہو جائیں گے اور یہ سب یاجوج اور ماجوج کے اثر کی وجہ سے ہوگا اور لوگ فالج زدہ عضو

العضو المفلوج۔ (سرّ الخلافه صفحہ ۳۹، ۴۰)

حَتّٰی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ (یَعْنِیْ یَکُوْنُ لَھُمُ الْغَلَبَۃُ وَالْفَتْحُ لَا یَدَانِ بِھِمْ لِاَحَدٍ) وَھُمْ مِّنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ..... وَالْمُرَادُ مِنْ کُلِّ حَدَبٍ ظَفْرُھُمْ وَفَوْزُھُمْ بِکُلِّ مُرَادٍ وَّعُرُوْجُھُمْ اِلٰی کُلِّ مَقَامٍ وَّکَوْنُھُمْ فَوْقَ کُلِّ رِیَاسَۃٍ قَاھِرِیْنَ۔

(خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۸۶، ۱۸۷)

خدا تعالیٰ نے دجّال معہود..... کے لفظ کو جیسا کہ حدیثوں میں آیا ہے کہیں قرآن میں ذکر نہیں فرمایا بلکہ بجائے دجّال کے نصاریٰ کی پُرفتن کارروائیوں کا ذکر کیا ہے چنانچہ مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ (شہادت القرآن صفحہ ۴۲)

یہاں تک کہ یاجوج اور ماجوج کھولے جائیں گے اور وہ ہر ایک بلندی سے دوڑتے ہوں گے اور جب تم دیکھو کہ یاجوج ماجوج زمین پر غالب ہو گئے تو سمجھو کہ وعدہ سچا مذہب حق کے پھیلنے کا نزدیک آگیا اور وہ وعدہ یہ ہے ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ[1] اور پھر فرمایا کہ اس وعدے کے ظہور کے وقت کفّار کی آنکھیں چڑھی ہوں گی اور کہیں گے کہ اے وائے ہم کو ہم اس غفلت میں تھے بلکہ ہم ظالم تھے یعنی ظہور حق بڑے زور سے ہوگا اور کفار سمجھ لیں گے کہ ہم خطا پر ہیں۔ ان تمام آیات کا ماحصل یہ ہے کہ آخری زمانہ میں دُنیا میں بہت سے مذہب پھیل جائیں گے اور بہت سے فرقے ہو جائیں گے پھر دو قومیں خروج کریں گی جن کا عیسائی مذہب ہوگا اور ہر ایک طور کی بلندی وہ حاصل کریں گے۔ (شہادت القرآن طبع دوم صفحہ ۱)

درحقیقت ایسی ہی پیشگوئی مسلمانوں کے اُس زمانہ کے لئے جو حضرت مسیح کے زمانہ سے بلحاظ مدت

کے مشابہ ہو جائیں گے۔ گویا کہ وہ مر چکے ہیں۔ (سرّ الخلافہ صفحہ ۳۹، ۴۰)

(ترجمہ) حَتّٰی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ (یعنی ان کو ایسا غلبہ اور فتح ملے گی کہ کوئی انکے ساتھ مقابلہ نہ کر سکے گا) وَھُمْ مِّنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ ..... اور ہر ایک بلندی سے دوڑنے سے یہ مطلب ہے کہ ہر ایک مراد اور مقصود میں کامیابی اور شادکامی ان کو میسّر آئے گی اور ہر ایک سلطنت اور ریاست ان کے تصرف میں آجائے گی۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۸۶، ۱۸۷)

---

[1] التوبۃ آیت ۳۳ و الصّف آیت ۱۰ ۞

وغیرہ لوازم مشابہ تھا قرآن کریم نے بھی کی ہے جیسا کہ فرماتا ہے مِنۡ کُلِّ حَدَبٍ یَّنۡسِلُوۡنَ اَیْ مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنۡسِلُوۡنَ اِلَی الْاِسْلَامِ وَیُفْسِدُوْنَ فِیْ اَرْضِہٖ وَیَتَمَلَّکُوْنَ بِلَادَہٗ وَیَجْعَلُوْنَ اَعِزَّۃَ اَھْلِھَا اَذِلَّۃً اِس آیت کے یہی معنی ہیں کہ قومِ نصاریٰ جو فرقہ یاجوج اور ماجوج ہوگا ہر یک بلندی سے ممالکِ اسلام کی طرف دوڑیں گے اور ان کو غلبہ ہوگا اور بلادِ اسلام کو وہ دباتے جائیں گے یہاں تک کہ سلطنتِ اسلام صرف بنام رہ جائے گی جیسا کہ آجکل ہے۔ واقعات کے تطابق کو دیکھو کہ کیونکر اسلام کے مصائب اور مسلمانوں کی دینی دنیوی تباہی کا زمانہ یہودیوں کے اُس زمانہ سے مل گیا ہے جو حضرت مسیح کے وقت میں تھا اور پھر دیکھو کہ قرآن کی پیشگوئی اسلامی سلطنت کے ضعف کے بارے میں اور مخالفوں کے غالب ہونے کی نسبت کیسی اُس پیشگوئی سے اِنطباق پا گئی ہے جو اسرائیلی سلطنت کے زوال کے بارہ میں توریت میں کی گئی تھی۔

(شہادت القرآن طبع دوم صفحہ ۴۱)

خدا تعالیٰ نے فرقانِ حمید میں ..... یہودیوں کی بہت سی نافرمانیاں جا بجا ذکر کر کے متواتر طور پر اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ آخری حالت عام مسلمانوں اور مسلمانوں کے علماء کی یہی ہو جائے گی اور پھر ذکر کیا کہ آخری زمانہ میں غلبہ نصاریٰ کا ہوگا اور اُن کے ہاتھ سے طرح طرح کے فساد پھیلیں گے اور ہر طرف سے امواجِ فتن اُٹھیں گی اور وہ ہر یک بلندی سے دوڑیں گی یعنی ہر یک طور سے وہ اپنی قوت اور اپنا عروج اور اپنی بلندی دکھلائیں گی۔ ظاہری طاقت اور سلطنت میں بھی اُن کی بلندی ہوگی کہ اَور حکومتیں اور ریاستیں ان کے مقابل پر کمزور ہو جائیں گی اور علوم وفنون میں بھی ان کو بلندی حاصل ہوگی کہ طرح طرح کے علوم وفنون ایجاد کریں گے اور نادر اور عجیب صنعتیں نکالیں گے اور مکاید اور تدابیر اور حُسنِ انتظام میں بھی بلندی ہوگی اور دنیوی مہمات میں اور ان کے حصول کے لئے اُن کی ہمتیں بھی بلند ہوں گی اور اشاعتِ مذہب کی جدّوجہد اور کوشش میں بھی وہ سب سے فائق اور بلند ہوں گے اور ایسا ہی تدابیر معاشرت اور تجارت اور ترقی کاشتکاری غرض ہر یک بات میں ہر یک قوم پر فائق اور بلند ہو جائیں گی یہی معنے ہیں مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ کے کیونکہ حَدَب بالتحریک زمینِ بلند کو کہتے ہیں اور نسل کے معنے ہیں سبقت لے جانا اور دوڑنا یعنی ہر ایک قوم سے ہر ایک بات میں جو شرف اور بلندی کی طرف منسوب ہو سکتی ہے سبقت لے جائیں گے اور یہی بھاری علامت اس آخری قوم کی ہے جس کا نام یاجوج ماجوج ہے اور یہی علامت پادریوں کے اُس گروہ پُر فتن کی ہے جس کا نام دجالِ معہود ہے اور چونکہ حَدَب زمینِ بلند کو بھی کہتے ہیں اس سے یہ اشارہ ہے کہ تمام زمینی بلندیاں ان کو نصیب ہوں گی مگر آسمانی بلندی سے بے نصیب ہوں گے۔

(شہادت القرآن طبع دوم صفحہ ۴۳)

کیا تم نہیں دیکھتے کہ عیسائی سلطنت تمام دُنیا کی ریاستوں کو نگلتی جاتی ہے اور ہر ایک نوع کی بلندی ان کو حاصل ہے اور مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ کا مصداق ہیں اور اسلام کی دینی دنیوی حالت ایسی ہی ابتر ہوگئی ہے جیساکہ حضرت مسیح علیہ السلام کے وقت میں یہودیوں کی حالت ابتر تھی۔

(شہادت القرآن طبع دوم ص۸)

دوسری قسم کی مخلوق جو مسیح موعود کی نشانی ہے یاجوج ماجوج کا ظاہر ہونا ہے۔ توریت میں ممالکِ مغربیہ کی بعض قوموں کو یاجوج ماجوج قرار دیا ہے اور ان کا زمانہ مسیح موعود کا زمانہ ٹھہرایا ہے قرآن شریف نے اس قوم کے لئے ایک نشانی یہ لکھی ہے کہ مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ یعنی ہر ایک فوقیتِ ارضی ان کو حاصل ہو جائے گی اور ہر ایک قوم پر وہ فتحیاب ہوجائیں گے دوسرے اس نشانی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ وہ آگ کے کاموں میں ماہر ہوں گے یعنی آگ کے ذریعہ سے ان کی لڑائیاں ہوں گی اور آگ کے ذریعہ سے ان کے انجن چلیں گے اور آگ سے کام لینے میں وہ بڑی مہارت رکھیں گے۔ اسی وجہ سے اُن کا نام یاجوج ماجوج ہے کیونکہ اجیج آگ کے شعلہ کو کہتے ہیں اور شیطان کے وجود کی بناوٹ بھی آگ سے ہے جیساکہ آیت خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ[1] سے ظاہر ہے اِس لئے قومِ یاجوج ماجوج سے اس کو ایک فطرتی مناسبت ہے اِسی وجہ سے یہی قوم اس کے اسمِ اعظم کی تجلّی کے لئے اور اس کا مظہر اتم بننے کے لئے موزوں ہے۔ (تحفہ گولڑویہ ص۱۰۷/۱۰۸)

اِس جگہ ایک لطیفہ بیان کرنے کے لائق ہے جس سے ظاہر ہوگا کہ خداتعالیٰ کے علم میں ایک زمانہ مقدر تھا جس میں فوت شدہ رُوحیں بروزی طور پر آنے والی تھیں اور وہ یہ ہے کہ خداتعالیٰ نے قرآن شریف میں یعنی سورۃ انبیاء جزو نمبر ۱۷ میں ایک پیشگوئی کی ہے جس کا یہ مطلب ہے کہ ہلاک شدہ لوگ یاجوج ماجوج کے زمانہ میں پھر دُنیا میں رجوع کریں گے اور وہ یہ آیت ہے وَحَرَامٌ عَلٰی قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَآ اَنَّھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ۝ حَتّٰٓی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَھُمْ مِّنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ ۝

(تحفہ گولڑویہ ص۱۱۹)

یعنی جن لوگوں کو ہم نے ہلاک کیا ہے اُن کے لئے ہم نے حرام کر دیا ہے کہ دوبارہ دُنیا میں آویں یعنی بروزی طور پر بھی وہ دُنیا میں نہیں آسکتے جب تک وہ دن نہ آویں کہ قومِ یاجوج ماجوج زمین پر غالب آجائے اور ہر ایک طور سے اُن کو غلبہ حاصل ہو جائے کیونکہ اِنسان کے ارضی قویٰ کی کامل ترقیات یاجوج ماجوج پر ختم ہوتی ہیں اور اِس طرح پر انسان کے ارضی قویٰ کا نشوونما جو ابتداء سے ہوتا چلا آیا ہے وہ محض

---

[1] الاعراف آیت ۱۳

یاجوج ماجوج کے وجود سے کمال کو پہنچتا ہے لہٰذا یاجوج ماجوج کے ظہور کا زمانہ رجعت بروزی کے زمانہ پر دلیلِ قاطع ہے کیونکہ یاجوج ماجوج کا ظہور استدارت زمانہ پر دلیل ہے اور استدارت زمانہ رجعت بروزی کو چاہتا ہے سو مسیح عیسیٰ بن مریم کی نسبت رجعت کا جو عقیدہ ہے اُس عقیدہ کے موافق عیسیٰ مسیح کی آمد ثانی کا یہی زمانہ ہے سو وہ آمد ثانی بروزی طور پر ظہور میں آگئی۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۲۹ تا ۱۳۳)

یاجوج ماجوج سے وہ قوم مراد ہے جن کو پورے طور پر ارضی قویٰ ملیں گے اور ان پر ارضی قویٰ کی ترقیات کا دائرہ ختم ہو جائے گا۔ یاجوج ماجوج کا لفظ اجیج سے لیا گیا ہے جو شعلۂ نار کو کہتے ہیں۔ پس یہ وجہ تسمیہ ایک تو بیرونی لوازم کے لحاظ سے ہے جس میں یہ اشارہ ہے کہ یاجوج ماجوج کے لئے آگ مسخر کی جائے گی اور وہ اپنے دنیوی تمدن میں آگ سے بہت کام لیں گے۔ اُن کے برّی اور بحری سفر آگ کے ذریعہ سے ہوں گے۔ انکی لڑائیاں بھی آگ کے ذریعہ سے ہوں گی ان کے تمام کاروبار کے انجن آگ کی مدد سے چلیں گے۔ دوسری وجہ تسمیہ لفظ یاجوج ماجوج کے اندرونی خواص کے لحاظ سے ہے اور وہ یہ ہے کہ اُن کی سرشت میں آتشی مادہ زیادہ ہوگا۔ وہ قومیں بہت تکبر کریں گی اور اپنی تیزی اور چُستی اور چالاکی میں آتشی خواص دکھلائیں گی اور جس طرح مٹی جب اپنے کمالِ تام کو پہنچتی ہے تو وہ حصہ مٹی کا کانی جوہر بن جاتا ہے جس میں آتشی مادہ زیادہ ہو جاتا ہے جیسے سونا چاندی اور دیگر جواہرات۔ پس اِس جگہ قرآنی آیت کا مطلب یہ ہے کہ یاجوج ماجوج کی سرشت میں ارضی جوہر کا کمال تام ہے جیسا کہ معدنی جواہرات میں اور فلذات میں کمال تام ہوتا ہے اور یہ دلیل اِس بات پر ہے کہ زمین نے اپنے انتہائی خواص ظاہر کر دیئے اور بموجب آیت وَ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا[1] اپنے اعلیٰ سے اعلیٰ جوہر کو ظاہر کر دیا۔ اور یہ امر استدارت زمانہ پر ایک دلیل ہے۔ یعنی جب یاجوج ماجوج کی کثرت ہوگی تو سمجھا جائے گا کہ زمانہ نے اپنا پورا دائرہ دکھلا دیا اور پورے دائرہ کو رجعت بروزی لازم ہے اور یاجوج ماجوج پر ارضی کمال کا ختم ہونا اِس بات پر دلیل ہے کہ گویا آدم کی خلقت الف سے شروع ہو کر جو آدم کے لفظ کے حرفوں میں سے پہلا حرف ہے اس یا کے حرف پر ختم ہو گئی کہ جو یاجوج کے لفظ کے سر پر آتا ہے جو حروف کے سلسلہ کا آخری حرف ہے گویا اس طرح پر یہ سلسلہ الف سے شروع ہو کر اور پھر حرف یا پر ختم ہو کر اپنے طبعی کمال کو پہنچ گیا۔

خلاصہ کلام یہ کہ آیت ممدوحہ میں اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بروزی رجوع جو استدارت دائرہ خلقت بنی آدم کے لئے ضروری ہے اس کی نشانی یہ ہے کہ یاجوج ماجوج کا ظہور اور خروج اقوای اور

---

[1] الزلزلۃ آیت ۳

اتم طور پر ہو جائے اور ان کے ساتھ کسی غیر کو طاقت مقابلہ نہ رہے کیونکہ دائرہ کے کمال کو یہ لازم ہے کہ اَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا[1] کا مفہوم کامل طور پر پُورا ہو جائے اور تمام ارضی قوتوں کا ظہور اور بروز ہو جائے اور یاجوج ماجوج کا وجود اِس بات پر دلیلِ کامل ہے کہ جو کچھ ارضی قوتیں اور طاقتیں انسان کے وجود میں ودیعت ہیں وہ سب ظہور میں آگئی ہیں کیونکہ اس قوم کی فطرتی اینٹ ارضی کمالات کے پژاوہ میں ایسے طور پر پختہ ہوئی ہے کہ اس میں کسی کو بھی کلام نہیں۔ اسی سِرّ کی وجہ سے خدا نے ان کا نام یاجوج ماجوج رکھا کیونکہ ان کی فطرت کی مٹی ترقی کرتے کرتے کانی جواہرات کی طرح آتشی مادہ کی پوری وارث ہو گئی اور ظاہر ہے کہ مٹی کی ترقیات آخر جواہرات اور فلزات معدنی پر ختم ہو جاتی ہیں تب معمولی مٹی کی نسبت اُن جواہرات اور فلزات میں بہت سا مادہ آگ کا آجاتا ہے۔ گویا مٹی کا انتہائی کمال شئے کمال یافتہ کو آگ کے قریب لے آتا ہے اور پھر جنسیت کی کشش کی وجہ سے دوسرے آتشی لوازم اور کمالات بھی اسی مخلوق کو دئے جاتے ہیں غرض بنی آدم کا یہ آخری کمال ہے کہ بہت سا آتشی حصہ ان میں داخل ہو جائے اور یہ کمال یاجوج ماجوج میں پایا جاتا ہے اور جو کچھ اس قوم کو دُنیا اور دُنیا کی تدابیر میں دخل ہے اور جس قدر اس قوم نے دنیوی زندگی کو رونق اور ترقی دی ہے اس سے بڑھ کر کسی کے قیاس میں متصوّر نہیں۔ پس اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ انسان کے ارضی قویٰ کا عطر ہے جواب وہ یاجوج ماجوج کے ذریعہ سے نکل رہا ہے لہٰذا یاجوج ماجوج کا ظہور اور بروز اور اپنی تمام طاقتوں میں کامل ہونا اِس بات کا نشان ہے کہ انسانی وجود کی تمام ارضی طاقتیں ظہور میں آگئیں اور انسانی فطرت کا دائرہ اپنے کمال کو پہنچ گیا اور کوئی حالتِ منتظرہ باقی نہیں رہی۔ پس ایسے وقت کے لئے رجعت بروزی ایک لازمی امر تھا اِس لئے اِسلامی عقیدہ میں یہ داخل ہو گیا کہ یاجوج ماجوج کے ظہور اور اقبال اور فتح کے بعد گذشتہ زمانہ کے اکثر اخیار و ابرار کی رجعت بروزی ہو گی اور جیسا کہ اِس مسئلہ پر مسلمانوں میں سے اہلِ سُنّت زور دیتے ہیں ایسا ہی شیعہ کا بھی عقیدہ ہے مگر افسوس کہ یہ دونوں گروہ اس مسئلہ کی فلاسفی سے بے خبر ہیں۔ اصل بھید ضرورت رجعت کا تو یہ تھا کہ استدارت دائرہ خلقت بنی آدم کے وقت میں جو ہزار ششم کا آخر ہے نقاطِ خلقت کا اس سمت کی طرف آجانا ایک لازمی امر ہے جس سمت سے ابتدائے خلقت ہے کیونکہ کوئی دائرہ جب تک اس نقطہ تک نہ پہنچے جس سے شروع ہوا تھا کامل نہیں ہو سکتا اور بالضرورت دائرہ کے آخری حصّہ کو رجعت لازم پڑی ہوئی ہے لیکن اس بھید کو سطحی عقلیں دریافت نہیں کر سکیں اور ناحق کلام اللہ کے برخلاف یہ عقیدہ بنا لیا کہ گویا تمام گذشتہ رُوحیں نیکوں اور بدوں کی واقعی

---

[1] الزلزلۃ آیت ۳

طور پر پھر دوبارہ دُنیا میں آجائیں گی مگر اس تحقیق سے ظاہر ہے کہ صرف رجعت بروزی ہوگی نہ حقیقی۔ اور وہ اس طرح پر کہ وہی نحاش جس کا دوسرا نام خنّاس ہے جس کو دُنیا کے خزانہ دئے گئے ہیں جو اوّل حوّا کے پاس آیا تھا اور اپنی دجالیت سے حیاتِ ابدی کی اُس کو طمع دی تھی پھر بروزی طور پر آخری زمانہ میں ظاہر ہوگا اور زن مزاج اور ناقص العقل لوگوں کو اِس وعدہ پر حیاتِ ابدی کی طمع دے گا کہ وہ توحید کو چھوڑ دیں لیکن خدا نے جیسا کہ آدم کو بہشت میں یہ نصیحت کی تھی کہ ہر ایک پھل تمہارے لئے حلال ہے بے شک کھاؤ لیکن اس درخت کے نزدیک مت جاؤ کہ یہ حُرمت کا درخت ہے۔ اِسی طرح خدا نے قرآن میں فرمایا وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ الخ[1] یعنی ہر ایک گناہ کی مغفرت ہوگی مگر شرک کو خدا نہیں بخشے گا پس شرک کے نزدیک مت جاؤ اور اس کو حُرمت کا درخت سمجھو۔ سو اب بروزی طور پر وہی نحاش جو حوّا کے پاس آیا تھا اس زمانہ میں ظاہر ہؤا اور کہا کہ اس حُرمت کے درخت کو خوب کھاؤ کہ حیاتِ ابدی اسی میں ہے۔ پس جس طرح گناہ ابتداء میں عورت سے آیا اسی طرح آخری زمانہ میں زن مزاج لوگوں نے نحاش کے وسوسہ کو قبول کیا سو تمام بروزوں سے پہلے یہی بروز ہے جو بروز نحاش ہے۔

پھر دوسرا بروز جو یاجوج ماجوج کے بعد ضروری تھا مسیح ابنِ مریم کا بروز ہے کیونکہ وہ رُوح القدس کے تعلق کی وجہ سے نحاش کا دشمن ہے۔ وجہ یہ کہ سانپ شیطان سے مدد پاتا ہے اور عیسٰی بن مریم رُوح القدس سے اور رُوح القدس شیطان کی ضد ہے۔ پس جب شیطان کا ظہور ہؤا تو اس کا اثر مٹانے کے لئے رُوح القدس کا ظہور ضروری ہؤا جس طرح شیطان بدی کا باپ ہے رُوح القدس نیکی کا باپ ہے۔ انسان کی فطرت کو دو مختلف جذبے لگے ہوئے ہیں (۱) ایک جذبہ بدی کی طرف جس سے انسان کے دل میں بُرے خیالات اور بدکاری اور ظلم کے تصوّرات پیدا ہوتے ہیں یہ جذبہ شیطان کی طرف سے ہے اور کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ انسان کی فطرت کے لازم حال یہ جذبہ ہے گو بعض تو میں شیطان کے وجود سے انکار بھی کریں لیکن اس جذبہ کے وجود سے انکار نہیں کرسکتے (۲) دوسرا جذبہ نیکی کی طرف ہے جس سے انسان کے دل میں نیک خیالات اور نیکی کرنے کی خواہشیں پیدا ہوتی ہیں اور یہ جذبہ رُوح القدس کی طرف سے ہے اور اگرچہ قدیم سے اور جب سے کہ انسان پیدا ہؤا ہے یہ دونوں قسم کے جذبے انسان میں موجود ہیں لیکن آخری زمانہ کے لئے مقدر تھا کہ پورے زور شور سے یہ دونوں قسم کے جذبے انسان میں ظاہر ہوں اِس لئے اس زمانہ میں بروزی طور پر یہودی بھی پیدا ہوئے اور بروزی طور پر مسیح ابنِ مریم بھی پیدا ہؤا اور خدا نے ایک گروہ بدی کا محرّک پیدا کر دیا جو

---

[1] النسآء آیت ۱۱۷ ﴿

وہی پہلا خناس بروزی رنگ میں ہے اور دوسرا گروہ نیکی کا محرک پیدا کر دیا جو مسیح موعود کا گروہ ہے۔ غرض پہلا بروز گروہ خناس ہے اور دوسرا بروز مسیح اور اس کا گروہ اور تیسرا بروز ان یہودیوں کا گروہ ہے جن سے بچنے کے لئے سُورۃ فاتحہ میں دعا غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سکھائی گئی اور چوتھا بروز صحابہ رضی اللہ عنہم کا بروز ہے جو بموجب آیت وَاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ[1] ضروری تھا اور اس حساب سے ان بروزوں کی لاکھوں تک نوبت پہنچتی ہے اِس لئے یہ زمانہ رجعت بروزی کا زمانہ کہلاتا ہے۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۳۱ تا ۱۳۴ حاشیہ)

یاجوج ماجوج دو قومیں ہیں جن کا پہلی کتابوں میں ذکر ہے اور اُس نام کی یہ وجہ ہے کہ وہ اجیج سے یعنی آگ سے بہت کام لیں گی اور زمین پر اُن کا بہت غلبہ ہو جائے گا اور ہر ایک بلندی کی مالک ہو جائیں گی تب اُسی زمانہ میں آسمان سے ایک بڑی تبدیلی کا اِنتظام ہوگا اور صلح اور آشتی کے دن ظاہر ہوں گے۔

(لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۱۱)

جیسا کہ قرآن شریف میں عیسائیت کے فتنہ کا ذکر ہے ایسا ہی یاجوج ماجوج کا ذکر ہے اور اس آیت میں کہ هُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ اُن کے غلبہ کی طرف اشارہ ہے کہ تمام زمین پر اُن کا غلبہ ہو جائے گا۔ اب اگر دجّال اور عیسائیت اور یاجوج ماجوج تین علیحدہ قومیں سمجھی جائیں جو مسیح کے وقت ظاہر ہوں گی تو اَور بھی تناقض بڑھ جاتا ہے مگر بائبل سے یقینی طور پر یہ بات سمجھ آتی ہے کہ یاجوج ماجوج کا فتنہ بھی درحقیقت عیسائیت کا فتنہ ہے کیونکہ بائبل نے اُس کو یاجوج کے نام سے پکارا ہے پس درحقیقت ایک ہی قوم کو باعتبار مختلف حالتوں کے تین ناموں سے پُکارا گیا ہے۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۶۳، ۶۴)

یاجوج ماجوج کی قوم کہ اجمالی طور پر اُن کا ذکر قرآن شریف میں موجود ہے بلکہ یہ ذکر بھی موجود ہے کہ آخری زمانہ میں تمام زمین پر اُن کا غلبہ ہو جائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ اور یہ خیال کہ یاجوج ماجوج بنی آدم نہیں بلکہ اَور قِسم کی مخلوق ہے یہ صرف جہالت کا خیال ہے کیونکہ قرآن میں ذوالعقول حیوان جو عقل اور فہم سے کام لیتے ہیں اور موردِ ثواب یا عذاب ہو سکتے ہیں وہ دو ہی قِسم کے بیان فرمائے ہیں (۱) ایک نوعِ اِنسان جو حضرت آدم کی اولاد ہیں (۲) دوسرے وہ جو جنّات ہیں اِنسانوں کے گروہ کا نام معشر الانس رکھا ہے اور جنّات کے گروہ کا نام معشر الجنّ رکھا ہے۔ پس اگر یاجوج ماجوج جن کے لئے مسیح موعود کے زمانہ میں عذاب کا وعدہ ہے معشر الانس میں داخل ہیں یعنی اِنسان ہیں

---

[1] الجمعۃ آیت ۴ ؎

توخواہ نخواہ ایک عجیب پیدائش ان کی طرف منسوب کرنا کہ اُن کے کان اِس قدر لمبے ہوں گے اور ہاتھ اس قدر لمبے ہوں گے اور اس کثرت سے وہ بچے دیں گے اُن لوگوں کا کام ہے جن کی عقل محض سطحی اور بچوں کی مانند ہے۔ اگر اس بارے میں کوئی حدیث صحیح ثابت بھی ہو تو وہ محض استعارہ کے رنگ میں ہوگی جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کی قومیں ان معنوں سے ضرور لمبے کان رکھتی ہیں کہ بذریعہ تار کے دُور دُور کی خبریں اُن کے کانوں تک پہنچ جاتی ہیں اور خدا نے بری اور بحری لڑائیوں میں اُن کے ہاتھ بھی نبرد آزمائی کی وجہ سے اِس قدر لمبے بنائے ہیں کہ کسی کو اُن کے مقابلہ کی طاقت نہیں اور توالد تناسل بھی اُن کا ایشیائی قوموں کی نسبت بہت ہی زیادہ ہے۔ پس جبکہ موجودہ واقعات نے دکھلا دیا ہے کہ اُن احادیث کے یہ معنی ہیں اور عقل ان معنوں کو نہ صرف قبول کرتی بلکہ اُن سے لذت اُٹھاتی ہے تو پھر کیا ضرورت ہے کہ خواہ نخواہ انسانی خلقت سے بڑھ کر اُن میں وہ عجیب خلقت فرض کی جائے جو سراسر غیر معقول اور اس قانونِ قدرت کے برخلاف ہے جو قدیم سے انسانوں کے لئے چلا آتا ہے اور اگر کہو کہ یاجوج ماجوج جنّات میں سے ہیں انسان نہیں ہیں تو یہ اَور حماقت ہے کیونکہ اگر وہ جنّات میں سے ہیں تو سدِ سکندری اُن کو کیونکر روک سکتی تھی جس حالت میں جنّات آسمان تک پہنچ جاتے ہیں جیسا کہ آیت فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ[1] سے ظاہر ہوتا ہے تو کیا وہ سدِ سکندری کے اُوپر چڑھ نہیں سکتے تھے جو آسمان کے قریب چلے جاتے ہیں۔ اور اگر کہو کہ وہ درندوں کی قسم ہیں جو عقل اور فہم نہیں رکھتے تو پھر قرآن شریف اور حدیثوں میں اُن پر عذاب نازل کرنے کا کیوں وعدہ ہے کیونکہ عذاب گنہ کی پاداش میں ہوتا ہے اور نیز اُن کا لڑائیاں کرنا اور سب پر غالب ہو جانا اور آخر کار آسمان کی طرف تیر چلانا صاف دلالت کرتا ہے کہ وہ ذوالعقول ہیں بلکہ دُنیا کی عقل میں سب سے بڑھ کر۔

حدیثوں میں بظاہر یہ تناقض پایا جاتا ہے کہ مسیح موعود کے مبعوث ہونے کے وقت ایک طرف تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ یاجوج ماجوج تمام دُنیا میں پھیل جائیں گے اور دوسری طرف یہ بیان ہے کہ تمام دُنیا میں عیسائی قوم کا غلبہ ہوگا جیسا کہ حدیث یَکْسِرُ الصَّلِیْبَ سے بھی سمجھا جاتا ہے کہ صلیبی قوم کا اس زمانہ میں بڑا عروج اور اقبال ہوگا ایسا ہی ایک دوسری حدیث سے بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ اس زمانہ میں رومیوں کی کثرت اور قوّت ہوگی یعنی عیسائیوں کی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں رومی سلطنت عیسائی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ بھی قرآن شریف میں فرماتا ہے غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِیْۤ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ[2]۔ اِس جگہ بھی روم سے مراد عیسائی سلطنت ہے اور پھر بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا

---

[1] الصّافات آیت ۱۱ ؎ [2] الروم آیت ۳،۴ ؎

ہے کہ مسیح موعود کے ظہور کے وقت دجّال کا تمام زمین پر غلبہ ہوگا اور تمام زمین پر بغیر مکہ معظمہ کے دجّال محیط ہو جائے گا۔

اب کوئی مولوی صاحب بتلاویں کہ یہ تناقض کیونکر دُور ہو سکتا ہے۔ اگر دجّال تمام زمین پر محیط ہو جائیگا تو عیسائی سلطنت کہاں ہوگی۔ ایسا ہی یاجوج ماجوج جن کی عام سلطنت کی قرآن شریف خبر دیتا ہے وہ کہاں جائیں گے سو یہ غلطیاں ہیں جن میں یہ لوگ مُبتلا ہیں جو ہمارے مکفّر اور مکذب ہیں۔ واقعات ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ دونوں صفات یاجوج ماجوج اور دجّال ہونے کی یورپین قوموں میں موجود ہیں کیونکہ یاجوج ماجوج کی تعریف حدیثوں میں یہ بیان کی گئی ہے کہ ان کے ساتھ لڑائی میں کسی کو طاقتِ مقابلہ نہیں ہوگی اور مسیح موعود بھی صرف دُعا سے کام لے گا اور یہ صفت کُھلے کُھلے طور پر یورپ کی سلطنتوں میں پائی جاتی ہے اور قرآن شریف بھی اِس کا مصدق ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ اور دجّال کی نسبت حدیثوں میں یہ بیان ہے کہ وہ دجل سے کام لے گا اور مذہبی رنگ میں دُنیا میں فتنہ ڈالے گا سو قرآن شریف میں یہ صفت عیسائی پادریوں کی بیان کی گئی ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ[1]۔ اِس تقریر سے ظاہر ہے کہ یہ تینوں ایک ہی ہیں اِسی وجہ سے سُورۃ الفاتحہ میں دائمی طور پر یہ دُعا سکھلائی گئی کہ تم عیسائیوں کے فتنہ سے پناہ مانگو یہ نہیں کہا کہ تم دجّال سے پناہ مانگو۔ پس اگر کوئی اَور دجّال ہوتا جس کا فتنہ پادریوں سے زیادہ ہوتا تو خدا کی کلام میں بڑا فتنہ چھوڑ کر قیامت تک یہ دُعا نہ سکھلائی جاتی کہ تم عیسائیوں کے فتنہ سے پناہ مانگو اور یہ نہ فرمایا جاتا کہ عیسائی فتنہ ایسا ہے کہ قریب ہے کہ اس سے آسمان پھٹ جائیں۔ پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں بلکہ یہ کہا جاتا کہ دجّالی فتنہ ایسا ہے جس سے قریب ہے کہ زمین و آسمان پھٹ جائیں بڑے فتنے کو چھوڑ کر چھوٹے فتنہ سے ڈرانا بالکل غیر معقول ہے۔

(چشمۂ معرفت صفحہ ۷۶ تا ۷۹ حاشیہ)

مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ کے بعد وہ خدا سے جنگ کریں گے اب گویا یہ خدا سے جنگ ہے یہ استعارہ ہے کہ جب اقبال یہاں تک پہنچ جاوے کہ کوئی سلطنت ان کے مقابل نہ ٹھہرے تو پھر خدا سے جنگ کرنی چاہیں گے خدا سے جنگ یہی ہے کہ نہ ان میں تضرع اور زاری رہے اور نہ دعا کی حقیقت پر نظر ہو بلکہ اسباب اور تدابیر پر پورا بھروسہ ہو اور قضا و قدر کا مقابلہ کیا جاوے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۷ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۲)

اِس وقت ضروری ہے کہ خوب غور کر کے دیکھا جاوے کہ کیا عیسائی فتنہ نہیں ہے جو مِنْ كُلِّ حَدَبٍ

---

[1] المائدہ آیت ۱۴

يَنْسِلُوْنَ کے مصداق ہو کر لاکھوں انسانوں کو گمراہ کر رہا ہے اور مختلف طریق اس نے اپنی اشاعت کے رکھے ہیں۔ اب وقت ہے کہ اس سوال کا جواب دیا جاوے کہ اس فتنہ کی اصلاح والے کا نام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا رکھا ہے۔ صلیب کا زور تو دن بدن بڑھ رہا ہے اور ہر جگہ اس کی چھاؤنیاں قائم ہوتی جاتی ہیں۔ مختلف مشن قائم ہو کر دُور دراز ملکوں اور اقطاعِ عالم میں پھیلتے جاتے ہیں اِس لئے اگر اَور کوئی بھی ثبوت اور دلیل نہ ہوتی تب بھی طبعی طور پر ہم کو ماننا پڑتا کہ اس وقت ایک مصلح کی ضرورت ہے جو اس فساد کی آگ کو بجھائے مگر خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہم کو صرف ضروریاتِ محسوسہ مشہودہ تک ہی نہیں رکھا بلکہ اپنے رسول کی عظمت وعزّت کے اظہار کے لئے بہت سی پیشگوئیاں پہلے سے اس وقت کے لئے مقرر رکھی ہوئی ہیں جن سے صاف پایا جاتا ہے کہ اس وقت ایک آنے والا مرد ہے اور اس کا نام مسیح موعود اور اس کا کام کسرِ صلیب ہے۔ اب اس ترتیب کے ساتھ ہر ایک سلیم الفطرت کو اِتنا تو ماننا پڑے گا کہ بجز اس تسلیم کے چارہ نہیں کہ کوئی مردِ آسمانی آوے اور اس کا کام اس وقت کسرِ صلیب ہی ہونا چاہیئے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْنَ اس امر کے اظہار کے واسطے کافی ہے کہ یہ کُل دُنیا کی زمینی طاقتوں کو زیرپا کریں گی ورنہ اس کے سوا اَور کیا معنے ہیں۔ کیا یہ قومیں دیواروں اور ٹیلوں کو کُودتی اور پھاندتی پھریں گی۔ نہیں بلکہ اس کے یہی معنے ہیں کہ وہ دُنیا کی کل ریاستوں اور سلطنتوں کو زیرپا کرلیں گی اور کوئی طاقت ان کا مقابلہ نہ کر سکے گی۔

واقعات جس امر کی تفسیر کریں وہی تفسیر ٹھیک ہُوا کرتی ہے۔ اِس آیت کے معنے خدا تعالیٰ نے واقعات سے بتا دئے ہیں۔ ان کے مقابلہ میں اگر کسی قِسم کی سیفی قوّت کی ضرورت ہوتی تو اب جیسے کہ بظاہر اِسلامی دُنیا کے امیدوں کے آخری دن ہیں چاہیئے تھا کہ اہلِ اسلام کی سیفی طاقت بڑھی ہوئی ہوتی اور اِسلامی سلطنتیں تمام دُنیا پر غلبہ پاتیں اور کوئی ان کے مقابل پر ٹھہر نہ سکتا مگر اب تو معاملہ اس کے برخلاف نظر آتا ہے۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے بطور تمہید یا عنوان کے یہ زمانہ ہے کہ ان کی فتح اور ان کا غلبہ دُنیوی ہتھیاروں سے نہیں ہو سکے گا بلکہ ان کے واسطے آسمانی طاقت کام کرے گی جس کا ذریعہ دعا ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر۱۱ مورخہ ۳ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۸۴)

ہمیں کئی بار اِس آیت کی طرف توجہ ہوئی ہے اور اس میں سوچتے ہیں کہ مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْنَ اس کا ایک تو یہ مطلب ہے کہ ساری سلطنتیں، ریاستیں اور حکومتیں ان سب کو یہ اپنے زیر کرلیں گے اور کسی کو ان کے مقابلے کی تاب نہ ہوگی۔

دوسرے معنے یہ ہیں کہ حَدَب کے معنے ہیں بلندی۔ نسل کے معنے ہیں دوڑنا۔ یعنی بلندی پر سے دوڑ جاویں گے۔ کُل عمومیّت کے معنے رکھتا ہے یعنی ہر قسم کی بلندی کو کُود جاویں گے۔ بلندی پر چڑھنا قوت اور جُرأت کو چاہتا ہے۔ نہایت بڑی بھاری اور آخری بلندی مذہب کی بلندی ہوتی ہے۔ سارے زنجیروں کو انسان توڑ سکتا ہے مگر رسم اور مذہب کی ایک ایسی زنجیر ہوتی ہے کہ اس کو کوئی ہمّت والا ہی توڑ سکتا ہے۔

سو ہمیں اس ربط سے یہ بھی ایک بشارت معلوم ہوتی ہے کہ وہ آخر کار اس مذہب اور رسم کی بلندی کو اپنی آزادی اور جرأت سے پھلانگ جاویں گے اور آخر کار اسلام میں داخل ہوتے جاویں گے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۴)

مَیں نے اِس آیت پر بڑی غور کی ہے۔ اس کے یہی معنے ہیں کہ ہر ایک بلندی سے دوڑیں گے۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ دو صورتیں ہیں اوّل یہ کہ ہر ایک سلطنت پر غالب آ جاویں گے۔ دوم یہ کہ بلندی کی طرف انسان قوّت اور جرأت کے بغیر دوڑ اور چڑھ نہیں سکتا اور مذہب پر غالب آ جانا بھی ایک بلندی ہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان پر وہ زمانہ بھی آوے گا کہ مذہب کے اوپر سے بھی گذر جاویں گے یعنی اپنے اُس تثلیثی مذہب سے بھی عبور کر جاویں گے اور اس کو پاؤں کے نیچے مَسل دیویں گے اور اسی سے ہمیں ان کے اِسلام میں داخل ہو جانے کی بُو آتی ہے۔ پہلی بات تو پوری ہو چکی ہے اب انشاء اللہ دوسری بات پوری ہوگی اور یہ باتیں خدا کے ارادہ کے ساتھ ہُوا کرتی ہیں۔ جب خدا کی مشیّت ہو تو ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور دلوں کو حسبِ استعداد صاف کرتے ہیں تب یہ کام ہُوا کرتے ہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۴ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۵)

۹۹-۹۹ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ○

اکثر لوگ دشنام دہی اور بیان واقعہ کو ایک ہی صورت میں سمجھ لیتے ہیں اور ان دونوں مختلف مفہوموں میں فرق کرنا نہیں جانتے بلکہ ایسی ہر یک بات کو جو دراصل ایک واقعی امر کا اظہار ہو اور اپنے محل پر چسپاں ہو محض اِس کے کسی قدر مرارت کی وجہ سے جو حق گوئی کے لازم حال ہُوا کرتی ہے دشنام دہی تصوّر کر لیتے ہیں حالانکہ دشنام اور سبّ اور شتم فقط اُس مفہوم کا نام ہے جو خلافِ واقعہ اور دروغ کے طور پر محض آزار رسانی کی غرض سے استعمال کیا جائے اور اگر ہر ایک سخت اور آزار دہ تقریر کو محض بوجہ

اس کے مرارت اور تلخی اور ایذا رسانی کے دشنام کے مفہوم میں داخل کر سکتے ہیں تو پھر اقرار کرنا پڑے گا کہ سارا قرآن شریف گالیوں سے پُر ہے کیونکہ جو کچھ بُتوں کی ذلت اور بُت پرستوں کی حقارت اور اُن کے بارہ میں لعنت ملامت کے سخت الفاظ قرآن شریف میں استعمال کئے گئے ہیں۔ یہ ہرگز ایسے نہیں ہیں جن کے سُننے سے بُت پرستوں کے دل خوش ہوئے ہوں بلکہ بلاشُبہ ان الفاظ نے ان کے غصّہ کی حالت کی بہت تحریک کی ہوگی کیا خدائے تعالیٰ کا کفارِ مکہ کو مخاطب کرکے یہ فرمانا کہ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ معترض کے من گھڑت قاعدہ کے موافق گالی میں داخل نہیں ہے۔

(ازالہ اوہام حصّہ اوّل ص ۱۳، ۱۴)

تم اور تمہارے معبودِ باطل جو انسان ہو کر خدا کہلاتے رہے جہنّم میں ڈالے جائیں گے (۲) دوسرا ایندھن جہنّم کا بُت ہیں مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کا وجود نہ ہوتا تو جہنّم بھی نہ ہوتا۔

(رپورٹ جلسۂ اعظم مذاہب ص ۱۳۷)

انبیاء سے پہلے تمام لوگ نیک و بد بھائی بھائی بنے ہوتے ہیں۔ نبی کے آنے سے ان کے درمیان ایک تمیز پیدا ہو جاتی ہے۔ سعید الگ ہو جاتے اور شقی الگ ہو جاتے ہیں۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مخالفین کو یہ کلمہ نہ سُناتے کہ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ تم اور تمہارے معبود سب جہنّم کے لائق ہیں تو کفار ایسی مخالفت نہ کرتے مگر اپنے معبودوں کے حق میں ایسے کلمات سُن کر وہ جوش میں آ گئے۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۴۵ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۰۷ء ص ۷)

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰىۤ ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ۝ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ۝

جو لوگ جنّتی ہیں اور اُن کا جنّتی ہونا ہماری طرف سے قرار پا چکا ہے وہ دوزخ سے دُور کئے گئے ہیں اور وہ بہشت کی دائمی لذّات میں ہیں۔ اِس آیت سے مراد حضرت عزیر اور حضرت مسیح ہیں اور ان کا بہشت میں داخل ہو جانا اِس سے ثابت ہوتا ہے جس سے اُن کی موت بھی بپایہ ثبوت پہنچتی ہے۔

(ازالہ اوہام حصّہ دوم ص ۶۲۱، ۶۲۲)

جو لوگ ہمارے وعدہ کے موافق بہشت کے لائق ٹھہر چکے ہیں وہ دوزخ سے دُور کئے گئے ہیں اور وہ بہشت کی دائمی لذات میں ہیں۔ تمام مفسّرین لکھتے ہیں کہ یہ آیت حضرت عیسٰی علیہ السلام کے حق میں ہے اور اس سے بصراحت و بداہت ثابت ہے کہ وہ بہشت میں ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ وہ وفات پا چکے ہیں ورنہ قبل از وفات بہشت میں کیونکر پہنچ گئے۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۳۲)

کتاب اللہ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ طاعون رجس ہے ہمیشہ کافروں پر نازل ہوتی ہے۔ ہاں جیسا کہ جہنم خاص کافروں کے لئے مخصوص ہے تاہم بعض گنہ گار مومن جو جہنم میں ڈالے جائیں گے وہ محض تمحیص اور تطہیر اور پاک کرنے کے لئے دوزخ میں ڈالے جائیں گے مگر خدا کے وعدہ کے موافق جو اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ہے برگزیدہ لوگ اس دوزخ سے دُور رکھے جائیں گے۔ اِسی طرح طاعون بھی ایک جہنم ہے کافر اس میں عذاب دینے کے لئے ڈالے جاتے ہیں اور ایسے مومن جن کو معصوم نہیں کہہ سکتے اور معاصی سے پاک نہیں ہیں اُن کے لئے یہ طاعون پاک کرنے کا ذریعہ ہے جس کو خدا نے جہنم کے نام سے پکارا ہے۔ سو طاعون ادنیٰ مومنوں کے لئے تجویز ہو سکتی ہے جو پاک ہونے کے محتاج ہیں مگر وہ لوگ جو خدا کی قُرب اور محبت میں بلند مقامات پر ہیں وہ ہرگز اس جہنم میں داخل نہیں ہو سکتے۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۰۱)

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ كَمَا بَدَأْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ وَعْدًا عَلَيْنَا اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۝ (۱۰۵)

ہم اُس دن آسمانوں کو ایسا لپیٹ لیں گے جیسے ایک خط متفرق مضامین کو اپنے اندر لپیٹ لیتا ہے اور جس طرز سے ہم نے اِس عالم کو وجود کی طرف حرکت دی تھی اُنہیں قدموں پہ پھر یہ عالم عدم کی طرف لوٹایا جائے گا۔ یہ وعدہ ہمارے ذمّہ ہے جس کو ہم کرنے والے ہیں۔ بخاری نے بھی اِس جگہ ایک حدیث لکھی ہے جس میں جائے غور یہ لفظ ہیں وَتَكُوْنُ السَّمٰوٰتُ بِيَمِيْنِهٖ یعنی لپیٹنے کے یہ معنی ہیں کہ خدا تعالیٰ آسمانوں کو اپنے داہنے ہاتھ میں چھپالے گا۔ اور جیسا کہ اب اسباب ظاہر اور مسبّب پوشیدہ ہے اُس وقت مسبّب ظاہر اور اسباب زاویہ عدم میں چھپ جائیں گے اور ہر یک چیز اُس کی طرف رجوع کر کے تجلّیاتِ قہریہ میں مخفی ہو جائے گی اور ہر یک چیز اپنے مکان اور مرکز کو چھوڑ دے گی اور تجلّیاتِ الٰہیہ اُس کی جگہ لیں گی اور عللِ ناقصہ کے فنا اور انعدام کے بعد علّتِ تامہ کاملہ کا چہرہ نمودار ہو جائے گا۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۵۲ تا ۱۵۴ حاشیہ در حاشیہ)

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ○

ہم نے زبور میں ذکر کے بعد لکھا ہے کہ جو نیک لوگ ہیں وہی زمین کے وارث ہوں گے یعنی ارضِ شام کے (زبور ۳۷) (براہینِ احمدیہ حصّہ سوم صفحہ ۲۳۷ حاشیہ نمبر ۱۱)

یہ حقیر خیال خدا تعالیٰ کی نسبت تجویز کرنا کہ اُس کو صرف اس اُمّت کے تیس برس کا ہی فکر تھا اور پھر اس کو ہمیشہ کے لئے ضلالت میں چھوڑ دیا اور وہ نور جو قدیم سے انبیاءِ سابقین کی اُمّت میں خلافت کے آئینہ میں وہ دکھلاتا رہا اس اُمّت کے لئے دکھلانا اُس کو منظور نہ ہوا کیا عقلِ سلیم خدائے رحیم و کریم کی نسبت ان باتوں کو تجویز کرے گی۔ ہرگز نہیں۔ اور پھر یہ آیت خلافتِ آئمہ پر گواہ ناطق ہے وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ کیونکہ یہ آیت صاف صاف پکار رہی ہے کہ اسلامی خلافت دائمی ہے اِس لئے کہ يَرِثُهَا کا لفظ دوام کو چاہتا ہے وجہ یہ کہ اگر آخری نوبت فاسقوں کی ہو تو زمین کے وارث وہی قرار پائیں گے نہ صالح اور سب کا وارث وہی ہوتا ہے جو سب کے بعد ہو۔

(شہادت القرآن طبع دوم صفحہ ۳۵)

اِس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ الارض سے مراد جو شام کی سرزمین ہے یہ صالحین کا ورثہ ہے اور جو اَب تک مسلمانوں کے قبضہ میں ہے۔ خدا تعالیٰ نے يَرِثُهَا فرمایا يَمْلِكُهَا نہیں فرمایا۔ اِس سے صاف پایا جاتا ہے کہ وارث اس کے مسلمان ہی رہیں گے اور اگر یہ کسی اَور کے قبضہ میں کسی وقت چلی بھی جاوے تو وہ قبضہ اس قسم کا ہوگا جیسے راہن اپنی چیز کا قبضہ مرتہن کو دے دیتا ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی پیشگوئی کی عظمت ہے۔ ارضِ شام چونکہ انبیاء کی سرزمین ہے اس لئے اللہ تعالیٰ اس کی بے حرمتی نہیں کرنا چاہتا کہ وہ غیروں کی میراث ہو۔

يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ فرمایا صالحین کے معنے یہ ہیں کہ کم از کم صلاحیت کی بنیاد پر قدم ہو۔ مومن کی جو تقسیم قرآن شریف میں کی گئی ہے اس کے تین ہی درجے اللہ تعالیٰ نے رکھے ہیں۔ ظالم، مقتصد، سابق بالخیرات۔ یہ ان کے مدارج ہیں ورنہ اسلام کے اندر یہ داخل ہیں۔ ظالم وہ ہوتا ہے کہ ابھی اس میں بہت غلطیاں اور کمزوریاں ہیں اور مقتصد وہ ہوتا ہے کہ نفس اور شیطان سے اس کی جنگ ہوتی ہے مگر کبھی یہ غالب آجاتا اور کبھی مغلوب ہوتا ہے۔ کچھ غلطیاں بھی ہوتی ہیں اور صلاحیت بھی اور سابق بالخیرات وہ

ہوتا ہے جو ان دونوں درجوں سے نکل کر مستقل طور پر نیکیاں کرنے میں سبقت لے جاوے اور بالکل صلاحیت ہی ہو. نفس اور شیطان کو مغلوب کر چکا ہو. قرآن شریف ان سب کو مسلمان ہی کہتا ہے۔
ہماری جماعت ہی کو دیکھ لو کہ وہ ایک لاکھ سے زیادہ ہے اور یہ سب کی سب ہمارے مخالفوں ہی سے نکل کر بنی ہے اور ہر روز جو بیعت کرتے ہیں یہ ان میں ہی سے آتے ہیں ان میں صلاحیّت اور سعادت نہ ہوتی تو یہ کس طرح نکل کر آتے۔ بہت سے خطوط اس قسم کی بیعت کرنے والوں کے آتے ہیں کہ پہلے میں گالیاں دیا کرتا تھا مگر اب توبہ کرتا ہوں مجھے معاف کیا جاوے۔ غرض صلاحیّت کی بُنیاد پر قدم ہو تو وہ صالحین میں داخل سمجھا جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

إِنَّ فِي هَٰذَا لَبَلَاغًا لِّقَوْمٍ عَابِدِينَ ۝

اِس میں اُن لوگوں کے لئے جو پرستار ہیں حقیقی پرستش کی تعلیم ہے۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۶۵۵)
وہ حکمتِ بالغہ ہے اس میں ہر یک چیز کا بیان ہے۔ (الحق لدھیانہ صفحہ ۲۸)

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ۝

اور تجھ کو ہم نے اِس لئے بھیجا ہے کہ تمام عالَم پر نظرِ رحمت کریں اور نجات کا راستہ اُن پر کھول دیں۔ (براہین احمدیہ حصّہ چہارم صفحہ ۵۴۳)
اور مَیں نے تجھے اِس لئے بھیجا ہے کہ تا سب لوگوں کے لئے رحمت کا سامان پیش کروں۔
(براہین احمدیہ صفحہ ۵۰۶ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)
یاد رہے کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ کے دو ہاتھ جلالی و جمالی ہیں اسی نمونہ پر چونکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ جلّ شانہٗ کے مظہرِ اتم ہیں لہٰذا خدا تعالیٰ نے آپ کو بھی وہ دونوں ہاتھ رحمت اور شوکت کے عطا فرمائے جمالی ہاتھ کی طرف اِس آیت میں اشارہ ہے کہ قرآن شریف میں ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ یعنی ہم نے تمام دُنیا پر رحمت کر کے تجھے بھیجا ہے۔ اور جلالی ہاتھ کی طرف اِس آیت میں اشارہ ہے وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى[1] اور چونکہ خدا تعالیٰ کو منظور تھا کہ یہ دونوں صفتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے اپنے وقتوں میں ظہور پذیر ہوں اِس لئے خدا تعالیٰ نے صفتِ جلالی کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے ذریعہ سے

[1] الانفال آیت ۱۸ ؎

ظاہر فرمایا اور صفتِ جمالی کو مسیح موعود اور اس کے گروہ کے ذریعہ سے کمال تک پہنچایا۔ اسی کی طرف اِس آیت میں اشارہ ہے وَاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ۔[1]

(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ ص۲۱ حاشیہ و اربعین ۳ ص۳۲ حاشیہ)

تمام دُنیا پر رحم کر کے ہم نے تجھے بھیجا ہے اور عالمین میں کافر اور بے ایمان اور فاسق اور فاجر بھی داخل ہیں اور اُن کے لئے رحم کا دروازہ اِس طرح پر کھولا کہ قرآن شریف کی ہدایتوں پر چل کر نجات پا سکتے ہیں۔ (سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب ص۴۲، ۴۳)

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ وَلَا یَسْتَقِیْمُ هٰذَا الْمَعْنٰی اِلَّا فِی الرَّحْمَانِیَّةِ فَاِنَّ الرَّحِیْمِیَّةَ یَخْتَصُّ بِعَالَمٍ وَّاحِدٍ مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔

(اعجاز المسیح ص۱۱۴ حاشیہ)

مَیں نے تمام عالموں کے لئے تجھے رحمت کر کے بھیجا ہے۔ (چشمہ معرفت ص۶۸)

اور ہم نے تجھے تمام دُنیا کے لئے ایک عام رحمت کر کے بھیجا ہے۔ (تذکرۃ الشہادتین ص۶)

تمام دُنیا کے لئے تجھے ہم نے رحمت کر کے بھیجا ہے اور تُو رحمتِ مجسّم ہے۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۱ ۵ ص۱۹۲)

ہم نے کسی خاص قوم پر رحمت کرنے کے لئے تجھے نہیں بھیجا بلکہ اِس لئے بھیجا ہے کہ تمام جہان پر رحمت کی جاوے پس جیسا کہ خدا تمام جہان کا خدا ہے ایسا ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمام دُنیا کے لئے رسول ہیں اور تمام دُنیا کے لئے رحمت ہیں اور آپ کی ہمدردی تمام دُنیا سے ہے نہ کسی خاص قوم سے۔

(لیکچر چشمہ معرفت ص۱۶)

جب کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تھے اُس وقت بھی چونکہ دُنیا کی حالت بہت ہی

(ترجمہ از مرتب) اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ اے نبی! ہم نے تمہیں تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ آپ کا رحمۃ للعالمین ہونا صفت رحمانیت کے لحاظ سے ہی درست ہو سکتا ہے کیونکہ رحیمیت تو صرف مومنوں کی دُنیا کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔

(اعجاز المسیح ص۱۱۴ حاشیہ)

---

[1] الجمعۃ آیت ۴

قابلِ رحم ہو گئی تھی۔ اخلاق، اعمال، عقاید سب کا نام و نشان اُٹھ گیا تھا اِس لئے اِس امت کو مرحومہ کہا گیا۔ کیونکہ اُس وقت بڑے ہی رحم کی ضرورت تھی اور اِسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ مَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ۔

قابلِ رحم اس شخص کو کہتے ہیں جسے سانپوں کی زمین پر چلنے کا حکم ہو یعنی خطراتِ عظیمہ اور آفاتِ شدیدہ درپیش ہوں۔ پس امتِ مرحومہ اِس لئے کہا کہ یہ قابلِ رحم ہے۔ جب انسان کو مشکل کام دیا جاتا ہے تو وہ مشکل قابلِ رحم ہوتی ہے۔ شرارتوں میں تجربہ کار، بداندیش خطا کاروں سے مقابلہ ٹھہرا اور پھر اُمّی جیسے حضرت نے فرمایا کہ ہم اُمّی ہیں اور حساب نہیں جانتے۔ پس اُمّیوں کو شریر قوموں کا مقابلہ کرنا پڑا جو مکاید اور شرارتوں میں تجربہ کار تھے اِس لئے اس کا نام اُمّتِ مرحومہ رکھا مسلمانوں کو کس قدر خوش ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو قابلِ رحم سمجھا۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۷)

چونکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کُل دُنیا کے انسانوں کی رُوحانی تربیت کے لئے آئے تھے اِس لئے یہ رنگ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام میں بدرجہ کمال موجود تھا اور یہی وہ مرتبہ ہے جس پر قرآن کریم نے متعدد مقامات پر حضور کی نسبت شہادت دی ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے مقابل اور اُسی رنگ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کا ذکر فرمایا ہے مَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۳)

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر شخص کا کلام اس کی ہمّت کے موافق ہوتا ہے جس قدر اس کی ہمت اور عزم اور مقاصد عالی ہوں گے اسی پایہ کا وہ کلام ہوگا اور وحیٔ الٰہی میں بھی یہی رنگ ہوتا ہے جس شخص کی طرف اس کی وحی آتی ہے جس قدر ہمت بلند رکھنے والا وہ ہوگا اسی پایہ کا کلام اسے ملے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمّت و استعداد اور عزم کا دائرہ چونکہ بہت ہی وسیع تھا اِس لئے آپ کو جو کلام ملا وہ بھی اس پایہ اور رتبہ کا ہے اور دوسرا کوئی شخص اس ہمت اور حوصلہ کا کبھی پیدا نہ ہوگا کیونکہ آپ کی دعوت کسی محدود وقت یا مخصوص قوم کے لئے نہ تھی جیسے آپ سے پہلے نبیوں کی ہوتی تھی بلکہ آپ کے لئے فرمایا گیا قُلۡ اِنِّيۡ رَسُوۡلُ اللّٰهِ اِلَيۡكُمۡ جَمِيۡعَاۨ [1] اور مَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ۔ جس شخص کی بعثت اور رسالت کا دائرہ اِس قدر وسیع ہو اس کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔

(الحکم جلد ۷، نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

---

[1] الاعراف آیت ۱۵۹

یاد رکھو کہ کتاب مجید کے بھیجنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا ہے کہ دُنیا پر عظیم الشان رحمت کا نمونہ دکھاوے جیسے فرمایا وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔

(الحکم جلد ۹ ع۹ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۵ء صـ۶)

یعنی اے نبی کریمؐ ہم نے تمہیں تمام عالم پر رحمت کے لئے بھیجا ہے۔

(الحکم جلد ۶ ع۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۲ء صـ۳)

مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتا ہے کہ جب آپ ہر ایک قسم کے خُلق سے ہدایت کو پیش کرتے چنانچہ ایسا ہی ہوُا کہ آپ نے اخلاق، صبر، نرمی اور نیز مار ہر ایک طرح سے اصلاح کے کام کو پُورا کیا اور لوگوں کو خدا کی طرف توجہ دلائی۔ مال دینے میں، نرمی برتنے میں، عقلی دلائل اور معجزات کے پیش کرنے میں آپ نے کوئی فرق نہیں رکھا۔ اصلاح کا ایک طریق مار بھی ہوتا ہے کہ جیسے ماں ایک وقت بچہ کو مار سے ڈراتی ہے وہ بھی آپ نے برت لیا تو مار بھی ایک خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ جو آدمی اَور کسی طریق سے نہیں سمجھتے خدا اُن کو اس طریق سے سمجھاتا ہے کہ وہ نجات پاویں۔ خدا تعالیٰ نے چار صفات جو مقرر کی ہیں جو کہ سورۃ فاتحہ کے شروع میں ہیں رسول اللہ صلعم نے ان چاروں سے کام لے کر تبلیغ کی ہے مثلاً پہلے ربّ العالمین یعنی عام ربوبیت ہے تو آیت مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ اسکی طرف اشارہ کرتی ہے۔ پھر ایک جلوہ رحمانیت کا بھی ہے کہ آپ کے فیضان کا بدل نہیں ہے۔ ایسی ہی دوسری صفات۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲۹ مورخہ ۷ اگست ۱۹۰۳ء صـ۲۲۶)

سورۃ فاتحہ میں جو اللہ تعالیٰ کی صفاتِ اربعہ بیان ہوئی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان چاروں صفات کے مظہرِ کامل تھے۔ مثلاً پہلی صفت ربّ العالمین ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بھی مظہر ہوئے جبکہ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ جیسے ربّ العالمین عام ربوبیت کو چاہتا تھا اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض و برکات اور آپ کی ہدایت و تبلیغ کُل دُنیا اور کُل عالموں کے لئے قرار پائی۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۳ء صـ۲۰)

یعنی اے رسول ہم نے تجھ کو رحمۃ لِلعالمین کر کے بھیجا ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء صـ۷)

۱۱۰ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ وَاِنْ اَدْرِيْۤ اَقَرِيْبٌ

اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ○

قرآن شریف میں اِنْ اَدْرِیْٓ اَقَرِیْبٌ اَمْ بَعِیْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ (مَیں نہیں جانتا کہ عذاب کے نزول کا وقت قریب ہے یا بعید) صاف بتاتا ہے کہ ہر ایک عذاب کی مقررہ تاریخ نہیں بتائی جاتی۔

(بدر جلد ۱ نمبر ۸ مورخہ ۲۵ رمئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ـــــــــ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

تفسیر سُورۃ الحج

بیان فرمودہ

سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسّلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

۲۔ یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّکُمۡ ۚ اِنَّ زَلۡزَلَۃَ السَّاعَۃِ شَیۡءٌ عَظِیۡمٌ ○

سَاعَۃ سے مراد قیامت بھی ہوگی۔ ہم کو اس سے انکار نہیں۔ مگر اس میں سکرات الموت ہی مراد ہے کیونکہ انقطاع تام کا وقت ہوتا ہے۔ اِنسان اپنے محبوبات اور مرغوبات سے یک دفعہ الگ ہوتا ہے اور ایک عجیب قسم کا زلزلہ اس پر طاری ہوتا ہے گویا اندر ہی اندر وہ ایک شکنجہ میں ہوتا ہے اِس لئے انسان کی تمام تر سعادت یہی ہے کہ وہ موت کا خیال رکھے اور دُنیا اور اُس کی چیزیں اس کی ایسی محبوبات نہ ہوں جو اس آخری ساعت میں علیحدگی کے وقت اس کی تکالیف کا موجب ہوں۔ دُنیا اور اُس کی چیزوں کے متعلق ایک شاعر نے کہا ہے ؎

این ہمہ در گُشتنت آہنگ ٭ گاہ بصلح کشند و گاہ بجنگ

(الحکم جلد ۴ نمبر ۴۶ مورخہ ۲۴ر دسمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۲)

۳۔ یَوۡمَ تَرَوۡنَہَا تَذۡہَلُ کُلُّ مُرۡضِعَۃٍ عَمَّاۤ اَرۡضَعَتۡ وَتَضَعُ کُلُّ

ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ۝

طرح طرح کے لباسوں میں مَوتیں وارد ہو رہی ہیں۔ طاعون ہے۔ وبائیں ہیں۔ قحط ہے۔ زلزلے ہیں۔

جب ایسی مصیبتیں وارد ہوتی ہیں تو دُنیا داروں کی عقل جاتی رہتی ہے اور وہ ایک سخت غم اور مصیبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں جس سے نکلنے کا کوئی طریق اُن کو نہیں سُوجھتا۔ قرآن شریف میں اِسی کی طرف اشارہ ہے کہ وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى تُو لوگوں کو دیکھتا ہے کہ نشے میں ہیں حالانکہ وہ کسی نشے میں نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ نہایت درجہ کے غم اور خوف سے اُن کی عقل ماری گئی ہے اور کچھ حوصلہ باقی نہیں رہا ایسے موقع پر بجز متقی کے کسی کے اندر صبر کی طاقت نہیں رہتی۔ دینی امور میں بجز تقویٰ کے کسی کو صبر حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلاء کے آنے کے وقت سوائے اس کے کون صبر کر سکتا ہے جو خدا تعالیٰ کی رضا کے ساتھ اپنی رضا کو ملائے ہو جب تک کہ پہلے ایمان پختہ نہ ہو ادنیٰ نقصان سے انسان ٹھوکر کھا کر دہریہ بن جاتا ہے جس کو خدا تعالیٰ سے تعلق نہیں۔ اس میں مصیبت کی برداشت نہیں۔ دُنیا دار لوگ تو ایسے مصائب کے وقت وجودِ باری تعالیٰ کا ہی انکار کر بیٹھتے ہیں۔ (بدر جلد ۷ نمبر ۲ مورخہ ۱۶؍ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ

شَيْئًا ۚ وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً فَإِذَا أَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَ رَبَتْ وَأَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ ○

وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ إِلٰى أَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا
یعنی اے بنی آدم تم دو گروہ ہو۔ ایک وہ جو پیرانہ سالی سے پہلے فوت ہو جاتے ہیں یعنی پیر فرتوت ہو کر نہیں مرتے بلکہ پہلے ہی مر جاتے ہیں۔ دوسرا وہ گروہ جو اس قدر بڈھے ہو جاتے ہیں جو ایک ارذل حالت زندگی کی جو قابلِ نفرت ہے اُن میں پیدا ہو جاتی ہے یہاں تک کہ عالم اور صاحب عقل ہونے کے بعد سراسر نادان بچے کی طرح بن جاتے ہیں اور تمام عمر کا آموختہ بیک دفعہ سب بھول جاتا ہے۔

اب چونکہ خدا تعالیٰ نے طرزِ حیات کے بارے میں بنی آدم کے صرف دو گروہوں میں تقسیم محدود کر دی تو بہر حال حضرت مسیح ابنِ مریم خدا تعالیٰ کے تمام خاکی بندوں کی طرح اس تقسیم سے باہر نہیں رہ سکتے۔ یہ حکماء کا قانونِ قدرت نہیں جو کوئی اس کو رَدّ کر دے گا یہ تو سُنّت اللہ ہے جس کو خود اللہ جلّ شانہٗ نے تصریح سے بیان فرما دیا ہے۔

سو اِس تقسیمِ الٰہی کی رُو سے لازم آتا ہے کہ یا تو حضرت مسیح مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى میں داخل ہوں اور وفات پا کر بہشتِ بریں میں اُس تخت پر بیٹھے ہوں جس کی نسبت اُنہوں نے آپ ہی انجیل میں بیان فرمایا ہے اور یا اگر اس قدر مدت تک فوت نہیں ہوئے تو زمانہ کی تاثیر سے اس ارذلِ عمر تک پہنچ گئے ہوں جس میں بباعث بیکاری حواس اُن کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۳۲۶، ۳۲۷)

اِس آیت میں خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ سُنّت اللہ دو ہی طرح سے تم پر جاری ہے بعض تم میں سے عمرِ طبعی سے پہلے فوت ہو جاتے ہیں اور بعض عمرِ طبعی کو پہنچتے ہیں یہاں تک کہ ارذل عمر کی طرف رَدّ کئے جاتے ہیں اور اس حد تک نوبت پہنچتی ہے کہ بعد علم کے نادان محض ہو جاتے ہیں۔ یہ آیت بھی مسیح ابنِ مریم کی موت پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان اگر زیادہ عمر پاوے تو دن بدن ارذل عمر کی طرف حرکت کرتا ہے یہاں تک کہ بچے کی طرح نادان محض ہو جاتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۶۰۸، ۶۰۹)

یہ بات فریقین میں مسلّم ہے کہ عام قانونِ قدرت خدا تعالیٰ کا یہی جاری ہے کہ اس عمرِ طبعی کے اندر اندر جو انسانوں کے لئے مقرر ہے ہر یک انسان مر جاتا ہے اور خدا تعالیٰ نے بھی قرآن کریم کے کئی مواضع میں

اِس بات کو بتصریح بیان کیا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا یعنی تم پر دو ہی حالتیں وارد ہوتی ہیں ایک یہ کہ بعض تم میں سے قبل از پیرانہ سالی فوت ہو جاتے ہیں اور بعض ارذل عمر تک پہنچتے ہیں یہاں تک کہ صاحبِ علم ہونے کے بعد محض نادان ہو جاتے ہیں۔ اب اگر خلاف اِس نصِ صریح کے کسی کی نسبت یہ دعویٰ کیا جائے کہ باوجود اسکے کہ عمرِ طبعی سے صدہا حصے زیادہ اُس پر زمانہ گزر گیا مگر وہ نہ مرا اور نہ ارذل عمر تک پہنچا اور نہ ایک ذرہ امتدادِ زمانہ نے اس پر اثر کیا تو ظاہر ہے کہ ان تمام امور کا اس شخص کے ذمہ ثبوت ہوگا جو ایسا دعویٰ کرتا ہے یا ایسا عقیدہ رکھتا ہے کیونکہ قرآن کریم نے تو کسی جگہ انسانوں کے لئے یہ ظاہر نہیں فرمایا کہ بعض انسان ایسے بھی ہیں جو معمولی انسانی عمر سے صدہا درجہ زیادہ زندگی بسر کرتے ہیں اور زمانہ اُن پر اثر کر کے اُن کو ارذل عمر تک نہیں پہنچاتا اور نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ کا مصداق نہیں ٹھہراتا پس جبکہ یہ عقیدہ ہمارے آقا و مولیٰ کی عام تعلیم سے صریح مخالف ہے تو صاف ظاہر ہے کہ جو شخص اس کا مدعی ہو ثبوت اُسی کے ذمہ ہے۔ غرض حسبِ تعلیمِ قرآنی عمرِ طبعی کے اندر اندر مر جانا اور زمانہ کے اثر سے عمر کے مختلف حصوں میں گوناگوں تغیرات کا لحاظ ہونا یہاں تک کہ بشرطِ زندگی ارذل عمر تک پہنچنا یہ ایک فطرتی اور اصلی امر ہے جو انسان کی فطرت کو لگا ہوا ہے جس کے بیان میں قرآن کریم بھرا ہوا ہے۔ (الحق دہلی صفحہ ۳۱،۳۲)

آیت وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ سے حضرت عیسٰی کی موت ثابت ہوتی ہے کیونکہ قرآن شریف میں باوجود تکرار مضمون اس آیت کے یہ فقرہ کہیں نہیں آیا کہ مِنْكُمْ مَّنْ صَعَدَ اِلَى السَّمَآءِ بِجِسْمِهِ الْعُنْصُرِيِّ ثُمَّ يَرْجِعُ فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ یعنی تم میں سے ایک وہ بھی ہے جو جسمِ عنصری کے ساتھ آسمان پر چڑھ گیا اور پھر آخری زمانہ میں دُنیا میں واپس آئے گا۔ پس اگر یہ سچ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام بجسمِ عنصری آسمان پر چلے گئے تو قرآن شریف کی یہ حصہ ناتمام رہے گی کیونکہ آسمان پر چڑھنے کی نسبت خدا نے اس آیت یا کسی دوسری آیت میں ذکر نہیں کیا اور اگر درحقیقت خدا کی یہ بھی سُنّت تھی تو تکمیل بیان کے لئے اس کا ذکر کرنا ضروری تھا اور جبکہ کئی دفعہ قرآن شریف میں جوان یا بوڑھا کر کے مارنے کا ذکر آچکا ہے تو اس کے ساتھ اس عادت اللہ کا بیان نہ کرنا کہ کسی کو آسمان پر آباد بھی کیا جاتا ہے اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کسی کو مع جسم آسمان پر آباد کر دینا خدا تعالیٰ کی سُنّتوں میں سے نہیں ہے۔

(ایام الصلح صفحہ ۱۴۰)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۣ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۣ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ○

قبولیتِ دعا حق ہے لیکن دعا نے کبھی سلسلہ موت فوت کو بند نہیں کر دیا۔ تمام انبیاء کے زمانہ میں یہی حال ہوتا رہا ہے۔ وہ لوگ بڑے نادان ہیں جو اپنے ایمان کو اس شرط سے مشروط کرتے ہیں کہ ہماری دعا قبول ہو اور ہماری خواہش پوری ہو۔ ایسے لوگوں کے متعلق قرآن شریف میں آیا ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۣ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ فِتْنَةُ ۣ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ○ بعض لوگ ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ایک کنارے پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں۔ اگر اس کو بھلائی پہنچے تو اس کو اطمینان ہو جاتا ہے اور اگر کوئی فتنہ پہنچے تو مُنہ پھیر لیتا ہے۔ ایسے لوگوں کو دُنیا اور آخرت کا نقصان ہے اور یہ نقصان ظاہر ہے۔

(بدر جلد ۱ نمبر ۱۶ مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ○ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَاۗبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ

الْعَذَابُ ۭ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ۝

اہلِ اسلام جو ایمان لائے ہیں جنہوں نے توحیدِ خالص اختیار کی اور یہود جنہوں نے اولیاء اور انبیاء کو اپنا قاضی الحاجات ٹھہرا دیا اور مخلوق چیزوں کو کارخانۂ خدائی میں شریک مقرر کیا اور صائبین جو ستاروں کی پرستش کرتے ہیں اور نصاریٰ جنہوں نے مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دیا ہے اور مجوس جو آگ اور سُورج کے پرستار ہیں اور باقی تمام مُشرک جو طرح طرح کے شرک میں گرفتار ہیں خدا اُن سب میں قیامت کے دن فیصلہ کر دے گا۔ خدا ہر ایک چیز پر شاہد ہے اور خود مخلوق پرستوں کا باطل پر ہونا کچھ پوشیدہ بات نہیں۔ یہ امر نہایت بدیہی ہے اور ہر ایک شخص ذاتی توجہ سے دیکھ سکتا ہے کہ جو کچھ آسمان اور زمین میں اجرامِ فلکی اور اجسامِ ارضی و نباتات اور جمادات اور حیوانات اور عناصر اور چاند اور سُورج اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور طرح طرح کے جاندار اور انسان ہیں جن کی مُشرک لوگ پُوجا کرتے ہیں یہ سب چیزیں خدا کو سجدہ کرتی ہیں یعنی اپنی ہستی اور بقاء اور وجود میں اس کی محتاج پڑی ہوئی ہیں اور بہ تذلّل تمام اُس کی طرف جُھکی ہوئی ہیں اور ایک دم اس سے بے نیاز نہیں۔ پس انہی چیزوں سے جو آپ ہی حاجت مند ہیں حاجتیں مانگنا صریح گمراہی ہے اور بعض انسان جو سرکش ہو جاتے ہیں وہ بھی تذلّل سے خالی نہیں کیونکہ اسی دُنیا میں طرح طرح کے آلام اور اسقام اور افکار اور ہموم کا عذاب ان پر نازل ہوتا رہتا ہے اور آخرت کا عذاب بھی اُن کے لئے تیار ہے پھر بجز خدا کے کونسی چیز ہے جس کے وجود پر نظر کرنے سے صفت غنی اور بے نیاز ہونے کی اُس میں پائی جاتی ہے تا کوئی اس کو اپنا معبود ٹھہرا وے اور جبکہ کوئی چیز بجز خدا کے غنی اور بے نیاز نہیں تو تمام مخلوق پرستوں کا باطل پر ہونا ثابت ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۴۳۸، ۴۳۹ حاشیہ در حاشیہ)

۲۷ وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْــــًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْقَاۗىِٕمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝

قَوْلُهٗ تَعَالٰی اِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرَاهِیْمَ مَکَانَ الْبَیْتِ دَلِیْلٌ عَلٰی کَوْنِ مَکَّۃَ اَوَّلَ الْعِمَارَاتِ فَلَا تَسْکُتْ کَالْمَیِّتِ وَکُنْ مِّنَ الْمُتَیَقِّظِیْنَ۔ فَحَاصِلُ الْمَقَالَاتِ اَنَّ مَکَّۃَ کَانَتْ اَوَّلَ الْعِمَارَاتِ ثُمَّ خَرِبَتْ مِنَ الْحَادِثَاتِ وَسَیْلِ الْاٰفَاتِ۔ (مِنَنُ الرَّحْمٰن صفحہ ۸۹)

ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ وَ اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۙ ۝

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ .... الخ سو اس پلیدی سے جو بُت ہیں پرہیز کرو اور دروغگوئی سے باز آؤ۔
(براہین احمدیہ صفحہ ۲۴۳ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

مجھے اس وقت اس نصیحت کی حاجت نہیں کہ تم خون نہ کرو کیونکہ بجز نہایت شریر آدمی کے کون ناحق کے خون کی طرف قدم اُٹھاتا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ ناانصافی پر ضد کرکے سچائی کا خون نہ کرو۔ حق کو قبول کر لو اگرچہ ایک بچہ سے اور اگر مخالف کی طرف حق پاؤ تو پھر فی الفور اپنی خشک منطق کو چھوڑ دو۔ سچ پر ٹھہر جاؤ اور سچی گواہی دو جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ یعنی بُتوں کی پلیدی سے بچو اور جھوٹ سے بھی کہ وہ بُت سے کم نہیں۔ جو چیز قبلہ حق سے تمہارا منہ پھیرتی ہے وہی تمہاری راہ میں بُت ہے۔ سچی گواہی دو اگرچہ تمہارے باپوں یا بھائیوں یا دوستوں پر ہو۔ چاہیئے کہ کوئی عداوت بھی تمہیں انصاف سے مانع نہ ہو۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۸۳۱، ۸۳۲)

قرآن شریف نے دروغ گوئی کو بُت پرستی کے برابر ٹھہرایا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ یعنی بُتوں کی پلیدی اور جھوٹ کی پلیدی سے

(ترجمہ) اللہ تعالیٰ کا یہ قول کہ یاد کر جب ہم نے ابراہیم کو دوبارہ بنانے کے لئے وہ مکان دکھلایا جہاں ابتداء میں بیت اللہ تھا۔ یہ قول صاف بتلا رہا ہے کہ مکّہ دُنیا میں پہلی عمارت ہے۔ پس مُردہ کی طرح چپ مت ہو جا اور جاگنے والوں کی طرح ہو۔ پس حاصل کلام یہ کہ مکّہ دُنیا میں پہلی عمارت تھی۔ پھر حادثات اور سیل آفات سے خراب ہو گیا۔ (منن الرحمٰن صفحہ ۸۹)

پرہیز کرو۔ (نور القرآن ۲ ص۱۱)

بُتوں کی پرستش اور جھوٹ بولنے سے پرہیز کرو یعنی جھوٹ بھی ایک بُت ہے جس پر بھروسہ کرنیوالا خدا کا بھروسہ چھوڑ دیتا ہے۔ سو جھوٹ بولنے سے خدا بھی ہاتھ سے جاتا ہے۔

(رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب ص۱۱۴)

بُتوں سے اور جھوٹ سے پرہیز کرو کہ یہ دونوں ناپاک ہیں۔ (لیکچر لاہور ص۱۱)

حرام خوری اس قدر نقصان نہیں پہنچاتی جیسے قولِ زور۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ حرام خوری اچھی چیز ہے۔ یہ سخت غلطی ہے اگر کوئی ایسا سمجھے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص جو اضطراراً سؤر کھالے تو یہ امر دیگر ہے لیکن اگر وہ اپنی زبان سے خنزیر کا فتوٰی دے دے تو وہ اسلام سے دُور نکل جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے حرام کو حلال ٹھہراتا ہے۔ غرض اس سے معلوم ہؤا کہ زبان کا زیاں خطرناک ہے اِس لئے متقی اپنی زبان کو بہت ہی قابو میں رکھتا ہے۔ اُس کے مُنہ سے کوئی ایسی بات نہیں نکلتی جو تقویٰ کے خلاف ہو پس تم اپنی زبان پر حکومت کرو نہ یہ کہ زبانیں تم پر حکومت کریں اور اناپ شناپ بولتے رہو۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

قرآن شریف نے جھوٹ کو بھی ایک نجاست اور رجس قرار دیا ہے جیسا کہ فرمایا ہے فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ دیکھو یہاں جھوٹ کو بُت کے مقابل رکھا ہے اور حقیقت میں جھوٹ بھی ایک بُت ہی ہے ورنہ کیوں سچائی کو چھوڑ کر دوسری طرف جاتا ہے۔ جیسے بُت کے نیچے کوئی حقیقت نہیں ہوتی اسی طرح جھوٹ کے نیچے بجز ملمع سازی کے اَور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ جھوٹ بولنے والوں کا اعتبار یہاں تک کم ہو جاتا ہے کہ اگر وہ سچ کہیں تب بھی یہی خیال ہوتا ہے کہ اس میں بھی کچھ جھوٹ کی ملاوٹ نہ ہو۔ اگر جھوٹ بولنے والے چاہیں کہ ہمارا جھوٹ کم ہو جاوے تو جلدی سے دُور نہیں ہوتا۔ مدت تک ریاضت کریں تب جا کر سچ بولنے کی عادت اُن کو ہو گی۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۱ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

بُت پرستی کے ساتھ اس جھوٹ کو ملایا ہے۔ جیسا احمق انسان اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر پتھر کی طرف سر جھکاتا ہے ویسے ہی صدق اور راستی کو چھوڑ کر اپنے مطلب کے لئے جھوٹ کو بُت بناتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بُت پرستی کے ساتھ ملایا اور اسی سے نسبت دی جیسے ایک بُت پرست بُت سے نجات چاہتا ہے۔ جھوٹ بولنے والا بھی اپنی طرف سے بُت بناتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس بُت کے ذریعہ نجات ہو جاوے گی۔ کیسی خرابی آ کر پڑی ہے۔ اگر کہا جاوے کہ کیوں بُت پرست ہوتے ہو اس نجاست کو چھوڑ دو تو کہتے ہیں کیونکر چھوڑ دیں۔ اس کے بغیر گذارہ نہیں ہو سکتا۔ اس سے بڑھ کر اَور کیا بدقسمتی ہو گی کہ جھوٹ

پر اپنا مدار سمجھتے ہیں مگر مَیں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ آخر سچ ہی کامیاب ہوتا ہے۔ بھلائی اور فتح اسی کی ہے ...... یقیناً یاد رکھو جھوٹ جیسی کوئی منحوس چیز نہیں۔ عام طور پر دُنیادار کہتے ہیں کہ سچ بولنے والے گرفتار ہو جاتے ہیں مگر مَیں کیونکر اس کو باور کروں مجھ پر سات مقدمات ہوئے ہیں اور خدا تعالیٰ کے فضل سے کسی ایک میں ایک لفظ بھی مجھے جھوٹ لکھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کوئی بتائے کہ کسی ایک میں بھی خدا تعالیٰ نے مجھے شکست دی ہو۔ اللہ تعالیٰ تو آپ سچائی کا حامی اور مددگار ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ راستباز کو سزا دے؟ اگر ایسا ہو تو پھر دُنیا میں کوئی شخص سچ بولنے کی جرأت نہ کرے اور خدا تعالیٰ پر سے ہی اعتقاد اُٹھ جاوے۔ راستباز تو زندہ ہی مر جاویں۔ اصل بات یہ ہے کہ سچ بولنے سے جو سزا پاتے ہیں وہ سچ کی وجہ سے نہیں ہوتی وہ سزا ان کی بعض اَور مخفی در مخفی بدکاریوں کی ہوتی ہے اور کسی اَور جھوٹ کی سزا ہوتی ہے۔ خدا تعالیٰ کے پاس تو ان کی بدیوں اور شرارتوں کا ایک سلسلہ ہوتا ہے ان کی بہت سی خطائیں ہوتی ہیں اور کسی نہ کسی میں وہ سزا پا لیتے ہیں۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۷؍مئی ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

۳۳۔ ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ۝

قبلہ کی طرف پاؤں کر کے سونے کے متعلق فرمایا یہ ناجائز ہے کیونکہ تعظیم کے برخلاف ہے۔ سائل نے عرض کی کہ احادیث میں اس کی ممانعت نہیں آئی۔ فرمایا کہ یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اسی بناء پر کہ حدیث میں ذکر نہیں ہے اور اس لئے قرآن شریف پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوا کرے تو کیا یہ جائز ہو جاوے گا؟ ہرگز نہیں۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۲۵/۲۶ مورخہ ۳۱؍جولائی و ۱۰؍اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۴)

۳۸۔ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ؕ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ۝

راستباز لوگ رُوح اور روحانیت کی رُو سے خدا تعالیٰ کی طرف اُٹھائے جاتے ہیں نہ یہ کہ اُن کا گوشت اور پوست اور اُن کی ہڈیاں خدا تعالیٰ تک پہنچ جاتی ہیں۔ خدا تعالیٰ خود ایک آیت میں فرماتا ہے

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ یعنی خدا تعالیٰ تک گوشت اور خون قربانیوں کا ہرگز نہیں پہنچتا بلکہ اعمالِ صالحہ کی رُوح جو تقویٰ اور طہارت ہے وہ تمہاری طرف سے پہنچتی ہے۔ (ازالہ اوہام ص ۲۸۷، ۲۸۸)

قانونِ قدرتِ قدیم سے ایسا ہی ہے کہ یہ سب کچھ معرفتِ کاملہ کے بعد ملتا ہے اور خوف اور محبت اور قدردانی کی جڑھ معرفتِ کاملہ ہے پس جس کو معرفتِ کاملہ دی گئی اس کو خوف اور محبت بھی کامل دی گئی اور جس کو خوف اور محبت کامل دی گئی اُس کو ہر ایک گناہ سے جو بیباکی سے پیدا ہوتا ہے نجات دی گئی پس ہم اس نجات کے لئے نہ کسی خون کے محتاج ہیں اور نہ کسی صلیب کے حاجت مند اور نہ کسی کفارہ کی ہمیں ضرورت ہے بلکہ ہم صرف ایک قربانی کے محتاج ہیں جو اپنے نفس کی قربانی ہے جس کی ضرورت کو ہماری فطرت محسوس کر رہی ہے ایسی قربانی کا دوسرے لفظوں میں نام اسلام ہے۔ اسلام کے معنے ہیں ذبح ہونے کے لئے گردن آگے رکھ دینا۔ یعنی کامل رضاء کے ساتھ اپنی رُوح کو خدا کے آستانہ پر رکھ دینا۔ یہ پیارا نام تمام شریعت کی رُوح اور تمام احکام کی جان ہے۔ ذبح ہونے کے لئے اپنی دلی خوشی اور رضاء سے گردن آگے رکھ دینا کامل محبت اور کامل عشق کو چاہتا ہے اور کامل محبّت کامل معرفت کو چاہتی ہے۔ پس اسلام کا لفظ اسی بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حقیقی قربانی کے لئے کامل معرفت اور کامل محبّت کی ضرورت ہے نہ کسی اَور چیز کی ضرورت۔ اِسی کی طرف خدا تعالیٰ قرآن شریف میں اشارہ فرماتا ہے لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ یعنی تمہاری قربانیوں کے نہ تو گوشت میرے تک پہنچ سکتے ہیں اور نہ خون بلکہ صرف یہ قربانی میرے تک پہنچتی ہے کہ تم مجھ سے ڈرو اور میرے لئے تقویٰ اختیار کرو۔ (لیکچر لاہور ص ۶، ۷)

دلوں کی پاکیزگی سچّی قربانی ہے گوشت اور خون سچّی قربانی نہیں۔ جس جگہ عام لوگ جانوروں کی قربانی کرتے ہیں خاص لوگ دلوں کو ذبح کرتے ہیں مگر خدا نے یہ قربانیاں بھی بند نہیں کیں تا معلوم ہو کہ اِن قربانیوں کا بھی اِنسان سے تعلق ہے۔ (براہین احمدیہ حصّہ پنجم (یادداشتیں ص ۹) وپیغام صلح ص ۵۹)

خدا تعالیٰ نے شریعتِ اسلام میں بہت سے ضروری احکام کے لئے نمونے قائم کئے ہیں چنانچہ انسان کو یہ حکم ہے کہ وہ اپنی تمام قوتوں کے ساتھ اور اپنے تمام وجود کے ساتھ خدا تعالیٰ کی راہ میں قربان ہو۔ پس ظاہری قربانیاں اسی حالت کے لئے نمونہ ٹھہرائی گئی ہیں لیکن اصل غرض یہی قربانی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ یعنی خدا کو تمہاری قربانیوں کا گوشت نہیں پہنچتا اور نہ خون پہنچتا ہے مگر تمہاری تقویٰ اس کو پہنچتی ہے یعنی اس سے اِتنا ڈرو کہ گویا اس کی راہ میں

مر ہی جاؤ۔ اور جیسے تم اپنے ہاتھ سے قربانیاں ذبح کرتے ہو اسی طرح تم بھی خدا کی راہ میں ذبح ہو جاؤ۔ جب کوئی تقویٰ اس درجہ سے کم ہے تو ابھی وہ ناقص ہے۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۹۱ حاشیہ)

اللہ تعالیٰ پوست کو پسند نہیں کرتا وہ تو روحانیت اور مغز کو قبول کرتا ہے اس لئے فرمایا لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى۔

(الحکم جلد ۸ ۲۵،۲۶ مورخہ ۳۱ جولائی و ۱۰ اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۳)

ظاہری نماز اور روزہ اگر اس کے ساتھ اخلاص اور صدق نہ ہو کوئی خوبی اپنے اندر نہیں رکھتا۔ جوگی اور سنیاسی بھی اپنی جگہ بڑی ریاضتیں کرتے ہیں۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ان میں سے بعض اپنے ہاتھ تک سکھا دیتے ہیں اور بڑی بڑی مشقتیں اُٹھاتے اور اپنے آپ کو مشکلات اور مصائب میں ڈالتے ہیں لیکن یہ تکالیف اُن کو کوئی نور نہیں بخشتیں اور نہ کوئی سکینت اور اطمینان ان کو ملتا ہے بلکہ اندرونی حالت اُن کی خراب ہوتی ہے وہ بدنی ریاضت کرتے ہیں جس کو اندر سے کم تعلق ہوتا ہے اور کوئی اثر اُن کی روحانیت پر نہیں پڑتا۔ اسی لئے قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى یعنی اللہ تعالیٰ کو تمہاری قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تقویٰ پہنچتا ہے۔ حقیقت میں خدا تعالیٰ پوست کو پسند نہیں کرتا بلکہ وہ مغز چاہتا ہے۔ اب سوال یہ ہوتا ہے کہ اگر گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ تقویٰ پہنچتا ہے تو پھر قربانی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور اسی طرح نماز روزہ اگر رُوح کا ہے تو پھر ظاہر کی ضرورت کیا ہے؟ اس کا جواب یہی ہے کہ یہ بالکل پکی بات ہے کہ جو لوگ جسم سے خدمت لینا چھوڑ دیتے ہیں اُن کو رُوح نہیں ملتی اور اس میں وہ نیازمندی اور عبودیت پیدا نہیں ہو سکتی جو اصل مقصد ہے۔ اور جو صرف جسم سے کام لیتے ہیں رُوح کو اس میں شریک نہیں کرتے وہ بھی خطرناک غلطی میں مبتلا ہیں اور یہ جوگی اسی قسم کے ہیں۔ روح اور جسم کا باہم خدا تعالیٰ نے ایک تعلق رکھا ہوا ہے اور جسم کا اثر رُوح پر پڑتا ہے ..... غرض جسمانی اور روحانی سلسلے دونوں برابر چلتے ہیں۔ رُوح میں جب عاجزی پیدا ہوتی ہے پھر جسم میں بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے جب روح میں واقع میں عاجزی اور نیازمندی ہو تو جسم میں اس کے آثار خود بخود ظاہر ہو جاتے ہیں اور ایسا ہی جسم پر ایک الگ اثر پڑتا ہے تو روح بھی اس سے متاثر ہو ہی جاتی ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳،۲)

إِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۗ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ

كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ۝ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝

الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ؕ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝

خدا کا ارادہ ہے کہ کفار کی بدی اور ظلم کو مومنوں سے دفع کرے یعنی مومنوں کو دفاعی جنگ کی اجازت دے تحقیقاً خدا خیانت پیشہ ناشکر لوگوں کو دوست نہیں رکھتا خدا ان مومنوں کو لڑنے کی اجازت دیتا ہے جن پر کافر قتل کرنے کے لئے چڑھ چڑھ کے آتے ہیں اور خدا حکم دیتا ہے کہ مومن بھی کافروں کا مقابلہ کریں کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور خدا اُن کی مدد پر قدرت رکھتا ہے یعنی اگرچہ تھوڑے ہیں مگر خدا اُن کی مدد پر قادر ہے۔ یہ قرآن شریف میں وہ پہلی آیت ہے جس میں مسلمانوں کو کفار کے مقابلہ کی اجازت دی گئی۔ آپ خود سوچ لو کہ اس آیت سے کیا نکلتا ہے۔ کیا لڑنے کے لئے خود سبقت کرنا یا مظلوم ہونے کی حالت میں اپنے بچاؤ کے لئے مجبوری مقابلہ کرنا۔ (مضمون متعلقہ چشمہ معرفت صفحہ ۲۰، ۲۱)

وہ لوگ کہ جو تمہارے ناحق کے جنگوں اور قتل کے ارادوں سے ظلم رسیدہ ہیں ان کی نسبت مدد دینے کا حکم ہو چکا ہے اور خدا ان کی مدد پر قادر ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۳۸ حاشیہ)

قرآن شریف میں ہرگز ہرگز جبر کی تعلیم نہیں ہے۔ پہلے کفار نے ابتداء کر کے صدہا مومنوں کو تکلیفیں دیں۔ قتل کیا۔ وطنوں سے نکالا اور پھر تعاقب کیا اور جب اُن کا ظلم حد سے بڑھ گیا اور ان کے جرائم خدائے تعالیٰ کی نظر میں سزا دہی کے لائق ٹھہر گئے تب اللہ تعالیٰ نے یہ وحی نازل کی اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۝ یعنی جن لوگوں پر یعنی مسلمانوں پر ظلم ہوا اور ان کے

قتل کرنے کے لئے اقدام کیا گیا۔ اب اللہ تعالیٰ بھی انہیں مقابلہ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ پھر چونکہ عرب کے لوگ بباعث ناحق کی خون ریزیوں کے جو وہ پہلے کر چکے تھے اور بڑی بڑی ایذاؤں سے مسلمانوں کو قتل کر چکے تھے اِس لئے ایک شخصی قصاص کے وہ مستحق ہوگئے تھے اور اس لائق تھے کہ جیسا انہوں نے ناحق بے گناہوں کو بُرے بُرے عذاب پہنچا کر قتل کیا ایسا ہی اُن کو بھی قتل کیا جائے اور جیسا کہ انہوں نے مسلمانوں کو اپنے وطنوں سے نکال کر تباہی میں ڈالا اور ان کے مالوں اور جائیدادوں اور گھروں پر قبضہ کر لیا ایسا ہی اُن کے ساتھ بھی کیا جائے لیکن خدا تعالیٰ نے رحم کے طور پر جیسی اور رعائتیں کی ہیں کہ ان کے بچے نہ مارے جاویں اور ان کی عورتیں قتل نہ ہوں ایسا ہی یہ بھی رعایت کر دی کہ اگر ان میں سے کوئی مقتول ہونے سے پہلے خود بخود ایمان لے آوے تو وہ اس سزا سے بچایا جاوے جو بوجہ اس کے پہلے جرائم اور خون ریزیوں کے اس پر واجب ہوتی تھی۔ (اہلِ اسلام اور عیسائیوں میں مباحثہ (جنگِ مقدس) روئیداد ۳۰ جون ۱۸۹۳ء صفحہ ۷۶)

اِسلام کی لڑائیاں ایسے طور سے نہیں ہوئیں کہ جیسے ایک زبردست بادشاہ کمزور لوگوں پر چڑھائی کرکے اُن کو قتل کر ڈالتا ہے بلکہ صحیح نقشہ ان لڑائیوں کا یہ ہے کہ جب ایک مدت دراز تک خدا تعالیٰ کا پاک نبی اور اس کے پیرو مخالفوں کے ہاتھ سے دُکھ اُٹھاتے رہے چنانچہ ان میں سے کئی قتل کئے گئے اور کئی بُرے بُرے عذابوں سے مارے گئے یہاں تک کہ ہمارے نبی صلعم کے قتل کر دینے کے لئے منصوبہ کیا گیا اور یہ تمام کامیابیاں اُن کے بُتوں کے معبود برحق ہونے پر حمل کی گئیں اور ہجرت کی حالت میں بھی آنحضرت صلعم کو امن میں نہ چھوڑا گیا بلکہ خود دس پڑاؤ تک چڑھائی کرکے خود جنگ کرنے کے لئے آئے تو اُس وقت ان کے حملہ کے روکنے کے لئے اور نیز ان لوگوں کو امن میں لانے کے لئے جو ان کے ہاتھ میں قیدیوں کی طرح تھے اور نیز اس بات کے ظاہر کرنے کے لئے کہ ان کے معبود جن کی تائید پر یہ سابقہ کامیابیاں حمل کی گئی ہیں لڑائیاں کرنے کا حکم ہوا ...... یہ ہرگز نہیں کہ ان لڑائیوں میں کسی قسم کا یہ ارادہ تھا کہ قتل کی دھمکی دے کر ان لوگوں کو مسلمان کر دیا جائے بلکہ وہ تو طرح طرح کے جرائم اور خون ریزیوں کے سبب سے پہلے سے واجب القتل ہو چکے تھے اور اسلامی رعایتوں میں سے جو ان کے ساتھ ربّ رحیم نے کیں ایک یہ بھی رعایت تھی کہ اگر کسی کو توفیقِ اسلام نصیب ہو تو وہ بچ سکتا ہے۔ اس میں جبر کہاں تھا۔ عرب پر تو اُنہیں کے سابقہ جرائم کی وجہ سے فتویٰ ہوگیا تھا ہاں باوجود اس کے یہ رعایتیں بھی تھیں کہ ان کے بچے نہ مارے جائیں۔ ان کے بڈھے نہ مارے جائیں اور ساتھ اس کے یہ بھی رعایت کہ بصورت ایمان لانے کے وہ بھی نہ مارے جائیں۔ (اہلِ اسلام اور عیسائیوں میں مباحثہ (جنگِ مقدس) روئیداد ۲ جون

سنہ ۱۸۹۳ء صہ ۶ تا ۸)

جنہوں نے تلواروں سے قتل کیا وہ تلواروں سے بھی مارے گئے۔ جنہوں نے ناحق غریبوں کو لُوٹا وہ لُوٹے گئے۔ جیسا کیا ویسا پایا بلکہ اُن کے ساتھ بہت نرمی کا برتاؤ ہوا جس پر آج اعتراض کیا جاتا ہے کہ کیوں ایسا برتاؤ ہوا سب کو قتل کیا ہوتا۔

(اہلِ اسلام اور عیسائیوں میں مباحثہ (جنگِ مقدس) پرچہ ۵ رجون سنہ ۱۸۹۳ء صہ ۳)

لڑائی کے سلسلہ کو دیکھنا ازبس ضروری ہے اور جب تک آپ سلسلہ کو نہ دیکھو گے اپنے تئیں عمدًا یا سہوًا بڑی غلطی میں ڈالو گے۔ سلسلہ تو یہ ہے کہ اوّل کفار نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا ارادہ کرکے آخر اپنے حملوں کی وجہ سے اُن کو مکہ سے نکال دیا اور پھر تعاقب کیا اور جب تکلیف حد سے بڑھی تو پہلا حکم جو لڑائی کے لئے نازل ہوا وہ یہ تھا اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا ط...... اِلَّاۤ اَنۡ یَّقُوۡلُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ط یعنی اُن لوگوں کو مقابلہ کی اجازت دی گئی جن کے قتل کے لئے مخالفوں نے چڑھائی کی۔ اِس وجہ سے اجازت دی گئی کہ اُن پر ظلم ہوا اور خدا مظلوم کی حمایت کرنے پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے وطنوں سے ناحق نکالے گئے اور ان کا گناہ بجز اس کے اور کوئی نہ تھا جو ہمارا ربّ اللہ ہے۔

(اہلِ اسلام اور عیسائیوں میں مباحثہ (جنگِ مقدس) پرچہ ۲ رجون سنہ ۱۸۹۳ء صہ ۱۷)

اِسلام نے تلوار اُٹھانے میں سبقت نہیں کی اور اِسلام نے صرف بوقتِ ضرورت امن قائم کرنے کی حد تک تلوار اُٹھائی ہے اور اسلام نے عورتوں اور بچوں اور راہبوں کے قتل کرنے کے لئے حکم نہیں دیا بلکہ جنہوں نے سبقت کرکے اسلام پر تلوار کھینچی وہ تلوار سے ہی مارے گئے اور تلوار کی لڑائیوں میں سب سے بڑھ کر توریت کی تعلیم ہے جس کی رُو سے بے شمار عورتیں اور بچے بھی قتل کئے گئے۔ جس خدا کی نظر میں وہ بے رحمی اور سختی کی لڑائیاں بُری نہیں تھیں بلکہ اُس کے حکم سے تھیں تو پھر نہایت بے انصافی ہوگی کہ وہی خدا اِسلام کی ان لڑائیوں سے ناراض ہو جو مظلوم ہونے کی حالت میں یا امن قائم کرنے کی غرض سے خدا تعالیٰ کے پاک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کرنی پڑی تھیں۔

(حجۃ الاسلام صہ ۳ و تبلیغ رسالت مجموعہ اشتہارات جلد سوم صہ ۳۸، ۳۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑائیوں کی ہرگز یہ غرض نہ تھی کہ خواہ نخواہ لوگوں کو قتل کیا جائے۔ وہ اپنے باپ دادا کے ملک سے نکالے گئے تھے اور بہت سے مسلمان مرد اور عورتیں بے گناہ شہید کئے گئے تھے اور ابھی ظالم ظلم سے باز نہیں آتے تھے اور اسلام کی تعلیم کو روکتے تھے۔ لہٰذا خدا کے قانونِ حفاظت نے یہ چاہا کہ مظلوموں کو بالکل نابود ہونے سے بچا لے۔ سو جنہوں نے تلوار اُٹھائی تھی انہیں کے ساتھ تلوار

کا مقابلہ ہوا۔ غرض قتل کرنے والوں کا فتنہ فرو کرنے کے لئے بطور مدافعت شر کے وہ لڑائیاں تھیں اور اس وقت ہوئیں جبکہ ظالم طبع لوگ اہلِ حق کو نابود کرنا چاہتے تھے۔ اس حالت میں اگر اسلام اس حفاظتِ خود اختیاری کو عمل میں نہ لاتا تو ہزاروں بچے اور عورتیں بے گناہ قتل ہو کر آخر اسلام نابود ہو جاتا۔
(تقریر جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۳۹ رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۲۰۹)

اِعْلَمُوْا اَنَّ قَتْلَ النَّاسِ مِنْ غَیْرِ تَفْهِیْمٍ وَّ تَبْلِیْغٍ وَّ اِتْمَامِ حُجَّةٍ۔ اَمْرٌ شَنِیْعٌ لَا یَرْضٰی بِهٖ اَهْلُ فِطْنَةٍ وَّلَا نُوْرُ فِطْرَةٍ۔ فَکَیْفَ یُعْزٰی اِلَی اللّٰهِ الْعَادِلِ الرَّحِیْمِ۔ وَالْمَنَّانِ الرَّءُوْفِ الْکَرِیْمِ۔ وَلَوْ کَانَ هٰذَا جَائِزًا لَکَانَ اَحَقَّ بِهٖ سَیِّدُنَا خَیْرُ الْبَرِیَّةِ۔ وَقَدْ سَمِعْتُمْ اَنَّهٗ صَبَرَ مُدَّةً طَوِیْلَةً عَلٰی تَطَاوُلِ الْکَفَرَةِ الْفَجَرَةِ۔ وَرَاٰی مِنْهُمْ کَثِیْرًا مِّنَ الظُّلْمِ وَالْاَذِیَّةِ۔ وَاَنْوَاعَ الشِّدَّةِ وَالصُّعُوْبَةِ۔ حَتّٰی اَخْرَجُوْهُ مِنَ الْبَلْدَةِ۔ ثُمَّ اَهْرَعُوْا اِلَیْهِ مُتَعَاقِبِیْنَ مُغَاضِبِیْنَ بِنِیَّةِ الْقَتْلِ وَالْاِبَادَةِ۔ فَصَبَرَ صَبْرًا لَّا یُوْجَدُ نَظِیْرُهٗ فِیْ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِ حَضْرَةِ الْعِزَّةِ۔ حَتّٰی بَلَغَ الْاِیْذَاءُ مُنْتَهَاهُ۔ وَطَالَ مَدَاهُ۔ فَهُنَاکَ نَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰیَةُ مِنَ اللّٰهِ السَّمِیْعِ الْخَبِیْرِ۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرٌ۔
فَانْظُرُوْا کَیْفَ صَبَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَخَیْرُ الرُّسُلِ عَلٰی ظُلْمِ الْکَفَرَةِ اِلٰی بُرْهَةٍ مِّنَ الزَّمَانِ

(ترجمہ از مرتّب) جان لو کہ بغیر تفہیم و تبلیغ اور بغیر اتمام حجّت کے لوگوں کا قتل کرنا ایک ایسی بُری بات ہے جسے کوئی عقل مند اور روشن ضمیر پسند نہیں کرتا۔ پس کیسے یہ مکروہ عمل عادل و رحیم اور محسن و مہربان اور کریم خدا کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ امر جائز ہوتا تو اس کے سب سے زیادہ مستحق ہمارے آقا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے۔ اور تمہیں یہ علم ہے کہ آپ نے کافروں اور فاجروں کی سرکشی پر ایک لمبا عرصہ صبر کیا اور ان کی طرف سے بہت سے ظلم اور اذیتیں اور طرح طرح کی سختیاں اور صعوبتیں دیکھیں یہاں تک کہ کافروں نے آپؐ کو مکّہ معظمہ سے نکال دیا۔ پھر غضبناک ہو کر آپؐ کو قتل کرنے کی نیّت سے آپؐ کا تعاقب کیا لیکن آنحضرتؐ نے ایسا صبر کیا جس کی نظیر گذشتہ پیغمبروں میں نہیں ملتی۔ تب اس وقت سمیع و خبیر خدا کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرٌ۔

پس دیکھو کس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کافروں کے ظلم پر ایک لمبا عرصہ صبر کیا،

وَدَفَعَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ حَتّٰی تَمَّتْ حُجَّةُ اللّٰهِ الدَّیَّانِ۔ انْقَطَعَتْ مَعَاذِیْرُ الْکَافِرِیْنَ۔ فَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ لَیْسَ کَقَصَّابٍ یَذْبَحُ الشَّاةَ بِغَیْرِ جَرِیْمَةٍ۔ بَلْ هُوَ حَلِیْمٌ عَادِلٌ لَا یَأْخُذُ مِنْ غَیْرِ اِتْمَامِ حُجَّةٍ۔

(انجامِ آتھم صفحہ ۱۳۸ تا ۱۴۰)

یاد رہے کہ قرآن کی تعلیم سے بے شک ثابت ہوتا ہے کہ یہود اور نصاریٰ سے لڑائیاں ہوئیں مگر ان لڑائیوں کا ابتداء اہلِ اسلام کی طرف سے ہرگز نہیں ہوا اور یہ لڑائیاں دین میں جبرًا داخل کرنے کے لئے ہرگز نہیں تھیں بلکہ اُس وقت ہوئیں جبکہ خود اسلام کے مخالفوں نے آپ ایذاء دے کر یا موذیوں کو مدد دے کر اُن لڑائیوں کے اسباب پیدا کئے اور جب اسباب انہیں کی طرف سے پیدا ہوگئے تو غیرتِ الٰہی نے اُن قوموں کو سزا دینا چاہی اور اُس سزا میں بھی رحمتِ الٰہی نے یہ رعایت رکھی کہ اِسلام میں داخل ہونے والا یا جزیہ دینے والا اُس عذاب سے بچ جائے۔ یہ رعایت بھی خدا کے قانونِ قدرت کے مطابق تھی کیونکہ ہر ایک مصیبت جو عذاب کے طور پر نازل ہوتی ہے مثلاً وبا یا قحط تو انسانوں کا کانشنس خود اس طرف متوجہ ہوجاتا ہے کہ وہ دعا اور توبہ اور تضرع اور صدقات اور خیرات سے اُس عذاب کو موقوف کرانا چاہیں چنانچہ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ رحیم خدا عذاب کے دُور کرنے کے لئے خود الہام دلوں میں ڈالتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ کی دعائیں کئی دفعہ منظور ہوکر بنی اسرائیل کے سر سے عذاب ٹل گیا۔ غرض اِسلام کی لڑائیاں سخت طبع مخالفوں پر ایک عذاب تھا جس میں ایک رحمت کا طریق بھی کُھلا تھا۔ سو یہ خیال کرنا دھوکہ ہے کہ اسلام نے توحید کے شائع کرنے کے لئے لڑائیاں کیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ لڑائیوں کی بنیاد محض سزا دہی کے طور پر اُس وقت سے شروع ہوئی کہ جب دوسری قوموں نے ظلم اور مزاحمت پر کمر باندھی۔

(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب صفحہ ۲۵)

اِسلام نے یہودیوں کے ساتھ توحید منوانے کے لئے لڑائیاں نہیں کیں بلکہ اسلام کے مخالف خود اپنی شرارتوں سے لڑائیوں کے محرک ہوئے۔ بعض نے مسلمانوں کے قتل کرنے کے لئے خود پہلے پہل تلوار اُٹھائی

اور بُرائی کا جواب نیکی سے دیا یہاں تک کہ بدلہ دینے والے خدا کی حجّت پوری ہوگئی اور کافروں کے سب عذر ختم ہوگئے۔ پس جان لو کہ اللہ تعالیٰ اس قصاب کی طرح نہیں جو بکری کے جُرم کے بغیر اسے ذبح کر دیتا ہے بلکہ وہ حلیم اور عادل ہے اور بغیر اتمامِ حجّت کے کسی پر گرفت نہیں کرتا۔

(انجامِ آتھم صفحہ ۱۳۸ تا ۱۴۰)

بعض نے ان کی مدد کی۔ بعض نے اسلام کی تبلیغ روکنے کے لئے بیجا مزاحمت کی۔ سو ان تمام موجبات کی وجہ سے مفسدین کی سرکوبی اور سزا اور رشر کی مدافعت کے لئے خدا تعالیٰ نے اُن ہی مفسدوں کے مقابل پر لڑائیوں کا حکم کیا۔ اور یہ کہنا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ برس تک اِس وجہ سے مخالفوں سے لڑائی نہیں کی کہ اُس وقت تک پوری جمعیت حاصل نہیں ہوئی تھی یہ محض ظالمانہ اور مفسدانہ خیال ہے۔ اگر صورتِ حال یہ ہوتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف تیرہ برس تک اُن ظلموں اور خون ریزیوں سے باز رہتے جو مکّہ میں اُن سے ظہور پذیر ہوئے اور پھر آپ منصوبہ کر کے یہ تجویز نہ کرتے کہ یا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دینا چاہیئے اور یا وطن سے نکال دینا چاہیئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہی بغیر حملہ مخالفین کے مدینہ کی طرف چلے جاتے تو ایسی بدظنیوں کی کوئی جگہ بھی ہوتی۔ لیکن یہ واقعہ تو ہمارے مخالفوں کو بھی معلوم ہے کہ تیرہ برس کے عرصہ میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں کی ہر ایک سختی پر صبر کرتے رہے اور صحابہؓ کو سخت تاکید تھی کہ بدی کا مقابلہ نہ کیا جائے چنانچہ مخالفوں نے بہت سے خون بھی کئے اور غریب مسلمانوں کو زدوکوب کرنے اور خطرناک زخم پہنچانے کا تو کچھ شمار نہ رہا۔ آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کرنے کیلئے حملہ کیا۔ سو ایسے حملہ کے وقت خدا نے اپنے نبی کو شرِّ اعداء سے محفوظ رکھ کر مدینہ میں پہنچا دیا اور خوشخبری دی کہ جنہوں نے تلوار اُٹھائی وہ تلوار ہی سے ہلاک کئے جائیں گے۔ پس ذرہ عقل اور انصاف سے سوچو کہ کیا اس روئداد سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ جمعیّت لوگوں کی ہوگئی تو پھر لڑائی کی نیّت جو پہلے سے دل میں پوشیدہ تھی ظہور میں آئی۔ افسوس ہزار افسوس کہ تعصب مذہبی کے رُو سے عیسائی دین کے حامیوں کی کہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ مدینہ میں جاکر جب مکّہ والوں کے تعاقب کے وقت بدر کی لڑائی ہوئی جو اسلام کی پہلی لڑائی ہے تو کونسی جمعیّت پیدا ہوگئی تھی۔ اُس وقت تو کل تین سَو تیرہ ۳۱۳ آدمی مسلمان تھے اور وہ بھی اکثر نوعمر ناتجربہ کار جو میدانِ بدر میں حاضر ہوئے تھے پس سوچنے کا مقام ہے کہ کیا اس قدر آدمیوں پر بھروسہ کر کے عرب کے تمام بہادروں اور یہود اور نصارٰی اور لاکھوں انسانوں کی سرکوبی کے لئے میدان میں کسی کا نکلنا عقل فتویٰ دے سکتی ہے؟!!! اِس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ نکلنا اُن تدبیروں اور ارادوں کا نتیجہ نہیں تھا جو انسان دشمنوں کو ہلاک کرنے اور اپنی فتحیابی کے لئے سوچتا ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو کم سے کم تیسؔ چالیسؔ ہزار فوج کی جمعیّت حاصل کر لینا ضروری تھا اور پھر اسی کے بعد لاکھوں انسانوں کا مقابلہ کرنا۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ یہ لڑائی مجبوری کے وقت خدا تعالیٰ کے حکم سے ہوئی تھی نہ ظاہری سامان کے بھروسے پر۔

(سراج الدین عیسائی کے چار سوالوں کا جواب صفحہ ۲۸، ۲۹)

فَلَمَّا اَصَابَ الْمُسْلِمِيْنَ الذِّلَّةَ الْاُوْلٰی فِیْ مَکَّۃَ وَعَدَھُمُ اللّٰہُ بِقَوْلِہٖ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ۔ وَاَشَارَ فِیْ قَوْلِہٖ عَلٰی نَصْرِھِمْ اَنَّ الْعَذَابَ یُصِیْبُ الْکُفَّارَ بِاَیْدِ الْمُؤْمِنِیْنَ فَاَنْجَزَ اللّٰہُ ھٰذَا الْوَعْدَ یَوْمَ بَدْرٍ وَقَتَلَ الْکَافِرِیْنَ بِسُیُوْفِ الْمُسْلِمِیْنَ۔
(خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۸۵، ۱۸۶)

اِسلام میں بجز دفاعی طور کی جنگ یا ان جنگوں کے سوا جو بغرض سزائے ظالم یا آزادی قائم کرنے کی نیت سے ہوں اور کسی صورت میں دین کے لئے تلوار اُٹھانے کی اجازت نہیں اور دفاعی طور کی جنگ سے مراد وہ لڑائیاں ہیں جن کی ضرورت اُس وقت پیش آتی ہے جبکہ مخالفوں کے بلوہ سے اندیشۂ جان ہو۔

(مسیح ہندوستان میں صفحہ ۲)

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں اور پھر بعد اس کے بھی کفار کے ہاتھ سے دُکھ اُٹھایا اور بالخصوص مکہ کے تیرہ[۱۳] برس اس مصیبت اور طرح طرح کے ظلم اُٹھانے میں گذرے کہ جس کے تصور سے بھی رونا آتا ہے لیکن آپؐ نے اس وقت تک دشمنوں کے مقابل پر تلوار نہ اُٹھائی اور نہ اُن کے سخت کلمات کا سخت جواب دیا جب تک کہ بہت سے صحابہ اور آپ کے عزیز دوست بڑی بے رحمی سے قتل کئے گئے اور طرح طرح سے آپ کو بھی جسمانی دُکھ دیا گیا اور کئی دفعہ زہر بھی دی گئی اور کئی قسم کی تجویزیں قتل کرنے کی کی گئیں جن میں مخالفوں کو ناکامی رہی۔ جب خدا کے اِنتقام کا وقت آیا تو ایسا ہوا کہ مکہ کے تمام رئیسوں اور قوم کے برسرآوردہ لوگوں نے اِتفاق کر کے یہ فیصلہ کیا کہ بہرحال اس شخص کو قتل کر دینا چاہیئے۔ اُس وقت خدا نے جو اپنے پیاروں اور صدیقوں اور راستبازوں کا حامی ہوتا ہے آپ کو خبر دے دی کہ اس شہر میں اب بجز بدی کے کچھ نہیں اور قتل پر کمربستہ ہیں یہاں سے جلد بھاگ جاؤ تب آپ بحکم الٰہی مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے مگر پھر بھی مخالفوں نے پیچھا نہ چھوڑا بلکہ تعاقب کیا اور بہرحال اسلام کو پامال کرنا چاہا جب اس حد تک اُن لوگوں کی شورہ پشتی بڑھ گئی اور کئی بے گناہوں کے قتل کرنے کے جرم نے بھی اُن کو سزا کے

(ترجمہ از اصل) جس وقت مسلمانوں کو پہلی ذلت مکہ میں پہنچی خدا نے ان سے اپنے اس قول میں وعدہ فرمایا تھا اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ ...... آخر آیت تک۔ اور عَلٰی نَصْرِھِمْ کے قول سے اشارہ کیا کہ مومنوں کے ہاتھ سے کفار پر عذاب اُترے گا۔ پس خدا تعالیٰ کا یہ وعدہ بدر کے دن ظاہر ہوا اور کافر مسلمانوں کی آبدار تلوار سے قتل کئے گئے۔

(خطبہ الہامیہ صفحہ ۱۸۵، ۱۸۶)

لائق بنایا تب اُن کے ساتھ لڑنے کے لئے بطور مدافعت اور حفاظتِ خود اختیاری اجازت دی گئی اور نیز وہ لوگ بہت سے بے گناہ مقتولوں کے عوض میں جن کو انہوں نے بغیر کسی معرکہ جنگ کے محض شرارت سے قتل کیا تھا اور اُن کے مالوں پر قبضہ کیا تھا اس لائق ہوگئے تھے کہ اسی طرح اُن کے ساتھ اور اُن کے معاونوں کے ساتھ معاملہ کیا جاتا مگر مکّہ کی فتح کے وقت ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو بخش دیا۔ لہٰذا یہ خیال کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے صحابہؓ نے کبھی دین پھیلانے کے لئے لڑائی کی تھی یا کسی کو جبراً اِسلام میں داخل کیا تھا سخت غلطی اور ظلم ہے۔ (مسیح ہندوستان میں صفحہ ۸ تا ۷)

کیا اُس مذہب کو ہم جبر کا مذہب کہہ سکتے ہیں جس کی کتاب قرآن میں صاف طور پر یہ ہدایت ہے کہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ یعنی دین میں داخل کرنے کے لئے جبر جائز نہیں۔ کیا ہم اُس بزرگ نبی کو جبر کا الزام دے سکتے ہیں جس نے مکّہ معظّمہ کے تیرہ برس میں اپنے تمام دوستوں کو دن رات یہی نصیحت دی کہ شر کا مقابلہ مت کرو اور صبر کرتے رہو۔ ہاں جب دشمنوں کی بدی حد سے گذر گئی اور دینِ اسلام کے مٹانے کے لئے تمام قوموں نے کوشش کی تو اُس وقت غیرتِ الٰہی نے تقاضا کیا کہ جو لوگ تلوار اُٹھاتے ہیں وہ تلوار ہی سے قتل کئے جائیں ورنہ قرآن شریف نے ہرگز جبر کی تعلیم نہیں دی اگر جبر کی تعلیم ہوتی تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب جبر کی تعلیم کی وجہ سے اس لائق نہ ہوتے کہ امتحانوں کے موقع پر سچے ایمانداروں کی طرح صدق دکھلا سکتے لیکن ہمارے سیّد و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی وفاداری ایک ایسا امر ہے کہ اس کے اظہار کی ہمیں ضرورت نہیں۔ یہ بات کسی پر پوشیدہ نہیں کہ اُن سے صدق اور وفاداری کے نمونے اس درجہ پر ظہور میں آئے کہ دوسری قوموں میں اُن کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اس وفادار قوم نے تلواروں کے نیچے بھی اپنی وفاداری اور صدق کو نہیں چھوڑا بلکہ اپنے بزرگ اور پاک نبی کی رفاقت میں وہ صدق دکھلایا کہ کبھی انسان میں وہ صدق نہیں آسکتا جب تک ایمان سے اُس کا دل اور سینہ منوّر نہ ہو غرض اِسلام میں جبر کو دخل نہیں۔ اسلام کی لڑائیاں تین قسم سے باہر نہیں (۱) دفاعی طور پر یعنی بہ طریق حفاظتِ خود اختیاری (۲) بطور سزا یعنی خون کے عوض میں خون (۳) بطور آزادی قائم کرنے کے یعنی بغرض مزاحموں کی قوت توڑنے کے جو مسلمان ہونے پر قتل کرتے تھے۔ پس جس حالت میں اسلام میں یہ ہدایت ہی نہیں کہ کسی شخص کو جبر اور قتل کی دھمکی سے دین میں داخل کیا جائے تو پھر کسی خونی مہدی یا خونی مسیح کی انتظار کرنا سراسر لغو اور بیہودہ ہے کیونکہ ممکن نہیں کہ قرآنی تعلیم کے برخلاف کوئی ایسا انسان بھی دُنیا میں آوے جو تلوار کے ساتھ لوگوں کو مسلمان کرے۔ (مسیح ہندوستان میں صفحہ ۹ تا ۱۰)

مَیں خدا تعالیٰ کی قسم سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان بنانے کے لئے کبھی

جبر نہیں کیا اور نہ تلوار کھینچی اور نہ دین میں داخل کرنے کے لئے کسی کے ایک بال کو بھی نقصان پہنچایا بلکہ وہ تمام نبوی لڑائیاں اور آنجناب کے صحابہ کرام کے جنگ جو اُس وقت کئے گئے یا تو اِس واسطے اُن کی ضرورت پڑی تا کہ اپنی حفاظت کی جائے اور یا اِس لئے ضرورت پڑی کہ تا ملک میں امن قائم کیا جائے اور جو لوگ اسلام کو اُس کے پھیلنے سے روکتے ہیں اور اُن لوگوں کو قتل کر دیتے ہیں جو مسلمان ہوں اُن کو کمزور کر دیا جائے جب تک کہ وہ اس نالائق طریق سے توبہ کر کے اسلام کی سلطنت کے مطیع ہو جائیں۔ پس ایسے جنگ کا اُس زمانہ میں کہاں پتہ ملتا ہے جو جبراً مسلمان بنانے کے لئے کی جاتی ہے۔ وہاں رحمتِ الٰہی نے قابلِ سزا قوموں کے لئے جو بہت سے خون کر چکی تھیں اور خونیوں کو مدد دے چکی تھیں اور اپنے جرائم کی وجہ سے عدالت کے رُو سے قتل کے لائق تھیں، رحیمانہ طور پر یہ رعایت رکھی تھی کہ ایسے مجرم اگر سچے دل سے مسلمان ہو جائیں تو ان کا وہ سنگین جرم معاف کر دیا جائے اور ایسے مجرموں کو اختیار ملا تھا کہ اگر چاہیں تو اس رحیمانہ قانون سے فائدہ اُٹھائیں۔ (تریاق القلوب صـ۵۳)

چونکہ مسلمان اِسلام کے ابتدائی زمانہ میں تھوڑے تھے اِس لئے ان کے مخالفوں نے بباعث اُس تکبر کے جو فطرتاً ایسے فرقوں کے دل اور دماغ میں جاگزیں ہوتا ہے جو اپنے تئیں دولت میں، مال میں، کثرت جماعت میں، عزت میں، مرتبت میں دوسرے فرقہ سے برتر خیال کرتے ہیں اُس وقت کے مسلمانوں یعنی صحابہ سے سخت دشمنی کا برتاؤ کیا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ آسمانی پودہ زمین پر قائم ہو بلکہ وہ ان راستبازوں کے ہلاک کرنے کے لئے اپنے ناخنوں تک زور لگا رہے تھے اور کوئی دقیقہ آزار رسانی کا اُٹھا نہیں رکھا تھا اور اُن کو خوف یہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ اس مذہب کے پَیر جم جائیں اور پھر اس کی ترقی ہمارے مذہب اور قوم کی بربادی کا موجب ہو جائے۔ سو اسی خوف سے جو اُن کے دلوں میں ایک رُعب ناک صورت میں بیٹھ گیا تھا نہایت جابرانہ اور ظالمانہ کارروائیاں اُن سے ظہور میں آئیں اور اُنہوں نے دردناک طریقوں سے اکثر مسلمانوں کو ہلاک کیا اور ایک زمانہ دراز تک، جو تیرہ برس کی مدت تھی اُن کی طرف سے یہی کارروائی رہی اور نہایت بے رحمی کی طرز سے خدا کے وفادار بندے اور نوع انسان کے فخر ان شریر درندوں کی تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے اور یتیم بچے اور عاجز اور مسکین عورتیں کوچوں اور گلیوں میں ذبح کئے گئے۔ اس پر بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے قطعی طور پر یہ تاکید تھی کہ شر کا ہرگز مقابلہ نہ کرو۔ چنانچہ ان برگزیدہ راستبازوں نے ایسا ہی کیا۔ اُن کے خونوں سے کوچے سُرخ ہو گئے پر انہوں نے دم نہ مارا۔ وہ قربانیوں کی طرح ذبح کئے گئے پر اُنہوں نے آہ نہ کی۔ خدا کے پاک اور مقدس رسول کو جس پر زمین اور آسمان سے بے شمار سلام ہیں بارہا پتھر مار مار کر خون سے آلودہ کیا گیا مگر اس صدق اور استقامت

کے پہاڑ نے ان تمام آزاروں کی دلی انشراح اور محبت سے برداشت کی اور ان صابرانہ اور عاجزانہ روشوں سے مخالفوں کی شوخی دن بدن بڑھتی گئی اور انہوں نے اس مقدس جماعت کو اپنا ایک شکار سمجھ لیا تب اُس خدا نے جو نہیں چاہتا کہ زمین پر ظلم اور بے رحمی حد سے گذر جائے اپنے مظلوم بندوں کو یاد کیا اور اُس کا غضب شریروں پر بھڑکا اور اُس نے اپنی پاک کلام قرآن شریف کے ذریعہ سے مظلوم بندوں کو اطلاع دی کہ جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے مَیں سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ مَیں تمہیں آج سے مقابلہ کی اجازت دیتا ہوں اور مَیں خدائے قادر ہوں ظالموں کو بے سزا نہیں چھوڑوں گا۔ یہ حکم تھا جس کا دوسرے لفظوں میں جہاد نام رکھا گیا اور اس حکم کی اصل عبارت جو قرآن شریف میں اب تک موجود ہے یہ ہے اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۙ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ یعنی خدا نے ان مظلوم لوگوں کی جو قتل کئے جاتے ہیں اور ناحق اپنے وطن سے نکالے گئے فریاد سُن لی اور ان کو مقابلہ کی اجازت دی گئی اور خدا قادر ہے جو مظلوم کی مدد کرے ..... مگر یہ حکم مختص الزمان والوقت تھا۔ ہمیشہ کے لئے نہیں تھا بلکہ اس زمانہ کے متعلق تھا جبکہ اسلام میں داخل ہونے والے بکریوں اور بھیڑوں کی طرح ذبح کئے جاتے تھے۔ (گورنمنٹ انگریزی اور جہاد ص۳ تا ۵)

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہرگز کسی پر تلوار نہیں اُٹھائی بجز اُن لوگوں کے جنہوں نے پہلے تلوار اُٹھائی اور سخت بے رحمی سے بے گناہ اور پرہیزگار مردوں اور عورتوں اور بچوں کو قتل کیا اور ایسے درد انگیز طریقوں سے مارا کہ اب بھی ان قصّوں کو پڑھ کر رونا آتا ہے۔

(گورنمنٹ انگریزی اور جہاد ص۷)

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں خود سبقت کر کے ہرگز تلوار نہیں اُٹھائی بلکہ ایک زمانہ دراز تک کفّار کے ہاتھ سے دُکھ اُٹھایا اور اس قدر صبر کیا جو ہر ایک انسان کا کام نہیں اور ایسا ہی آپ کے اصحاب بھی اسی اعلیٰ اصول کے پابند رہے اور جیسا کہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ دُکھ اُٹھاؤ اور صبر کرو ایسا ہی انہوں نے صدق اور صبر دکھایا۔ وہ پیروں کے نیچے کچلے گئے اُنہوں نے دَم نہ مارا۔ اُن کے بچے اُن کے سامنے ٹکڑے ٹکڑے کئے گئے۔ وہ آگ اور پانی کے ذریعے سے عذاب دئے گئے مگر وہ شر کے مقابلہ سے ایسے باز رہے کہ گویا وہ شیرخوار بچے ہیں۔ کون ثابت کر سکتا ہے کہ دُنیا میں تمام نبیوں کی اُمتوں میں سے کسی ایک نے بھی باوجود قدرتِ انتقام ہونے کے خدا کا حکم سُن کر ایسا اپنے تئیں عاجز اور مقابلہ سے دستکش بنا لیا جیسا کہ انہوں نے بنایا؟ کس کے پاس اِس بات کا ثبوت ہے کہ دُنیا میں کوئی اَور بھی ایسا گروہ ہؤا ہے جو باوجود بہادری اور جماعت اور قوّتِ بازو اور طاقت مقابلہ اور پائے جانے تمام لوازم مردمی

اور مردانگی کے پھر خونخوار دشمن کی ایذاء اور زخم رسانی پر تیرہ برس تک برابر صبر کرتا رہا۔ ہمارے سیّد و مولیٰ اور آپ کے صحابہ کا یہ صبر کسی مجبوری سے نہیں تھا بلکہ اس صبر کے زمانہ میں بھی آپ کے جان نثار صحابہ کے وہی ہاتھ اور بازو تھے جو جہاد کے حکم کے بعد اُنہوں نے دکھلائے اور بسا اوقات ایک ہزار جوان نے مخالف کے ایک لاکھ سپاہی نبرد آزما کو شکست دے دی۔ ایسا ہؤا تا لوگوں کو معلوم ہو کہ جو مکّہ میں دشمنوں کی خونریزیوں پر صبر کیا گیا تھا۔ اس کا باعث کوئی بزدلی اور کمزوری نہیں تھی بلکہ خدا کا حکم سُنکر انہوں نے ہتھیار ڈال دئے تھے اور بکریوں اور بھیڑوں کی طرح ذبح ہونے کو طیار ہو گئے تھے۔

(گورنمنٹ انگریزی اور جہاد صفحہ ۹-۱۰)

بعض لوگ جن کو حق کے ساتھ دشمنی ہوتی ہے جب ایسی تعلیم سُنتے ہیں تو اَور کچھ نہیں تو یہی اعتراض کر دیتے ہیں کہ اسلام میں اگر ہمدردی کی تعلیم ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لڑائیاں کیوں کرتے۔ وہ نادان اتنا نہیں سمجھتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جنگ کئے وہ تیرہ برس تک خطرناک دُکھ اور تکلیف پر تکلیف اُٹھانے کے بعد کئے اور وہ بھی صرف مدافعت کے طور پر۔ تیرہ برس تک ان کے ہاتھوں سے آپ تکلیف اُٹھاتے رہے۔ ان کے عزیز دوست اور یاروں کو سخت سخت عذاب دیا جاتا رہا اور جور و ظلم کا کوئی بھی ایسا پہلو نہ رہا جو مخالفوں نے ان کے لئے نہ برتا ہو یہاں تک کہ کئی مسلمان مرد اور کئی مسلمان عورتیں ان کے ہاتھ سے شہید بھی ہو گئے اور ان کے ہر وقت کے ایسے شدید ظلموں سے تنگ آ کر بحکمِ الٰہی شہر بھی چھوڑنا پڑا جب مدینہ منوّرہ کو تشریف لے گئے اور وہاں بھی ان ظالموں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ جب اِن کے ظلموں اور شرارتوں کی بات انتہا تک پہنچ گئی تو خدا تعالیٰ نے مظلوم قوم کو اس مظلومانہ حالت میں مقابلہ کا حکم دیا اور وہ بھی اِس لئے کہ شریر اپنی شرارت سے باز آ جائیں اور ان کی شرارت سے مخلوقِ خدا کو بچایا جائے اور ایک حق پرست قوم اور دینِ حق کے لئے راہ کھل جاوے ورنہ کوئی بتلاوے کہ مکّہ میں تیرہ سال تک رہ کر کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کا باپ مارا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی کسی کے لئے بدی نہیں چاہی۔ آپ تو رحمِ مجسّم تھے اگر بدی چاہتے تو جب آپ نے انہی ظالموں پر پورا تسلط حاصل کر لیا تھا اور شوکت اور غلبہ آپ کو مل گیا تھا تو آپ ان تمام ظالم آئمۃ الکفر کو جو ہمیشہ آپ کو دُکھ دیتے رہتے اور بغاوت پر تُلے رہتے تھے۔ قتل کروا دیتے تو کون پوچھتا تھا۔ (تقریریں جلسہ سالانہ ۱۹۰۴ء صفحہ ۲۸)

سارا قرآن بار بار کہہ رہا ہے کہ دین میں جبر نہیں اور صاف طور پر کہہ رہا ہے کہ جن لوگوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں لڑائیاں کی گئی تھیں وہ لڑائیاں دین کو جبراً شائع کرنے کے لئے نہیں تھیں بلکہ یا تو بطور سزا تھیں یعنی اُن لوگوں کو سزا دینا منظور تھا جنہوں نے ایک گروہ کثیر مسلمانوں

کو قتل کر دیا اور بعض کو وطن سے نکال دیا تھا اور نہایت سخت ظلم کیا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ ۝ یعنی ان مسلمانوں کو جن سے کفار جنگ کر رہے تھے بسبب مظلوم ہونے کے مقابلہ کرنے کی اجازت دی گئی اور خدا قادر ہے کہ جو اُن کی مدد کرے، اور یا وہ لڑائیاں جو بطور مدافعت تھیں یعنی جو لوگ اسلام کے نابود کرنے کے لئے پیش قدمی کرتے تھے یا اپنے ملک میں اسلام کو شائع ہونے سے جبراً روکتے تھے اُن سے بطورِ حفاظتِ خود اختیاری یا ملک میں آزادی پیدا کرنے کے لئے لڑائی کی جاتی تھی بجز ان تین صورتوں کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مقدس خلیفوں نے کوئی لڑائی نہیں کی بلکہ اسلام نے غیر قوموں کے ظلم کی اس قدر برداشت کی ہے جو اس کی دوسری قوموں میں نظیر نہیں ملتی۔ (کشتی نوح صـ۶۸)

اکثر مسلمان مجھ پر حملہ کرتے ہیں کہ تمہارے سلسلہ میں یہ عیب ہے کہ تم جہاد کو موقوف کرتے ہو، افسوس ہے کہ وہ نادان اس کی حقیقت سے محض ناواقف ہیں وہ اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بدنام کرتے ہیں۔ آپ نے کبھی اشاعتِ مذہب کے لئے تلوار نہیں اُٹھائی۔ جب آپؐ پر اور آپؐ کی جماعت پر مخالفوں کے ظلم انتہاء تک پہنچ گئے اور آپؐ کے مخلص خدام میں سے مردوں اور عورتوں کو شہید کر دیا گیا اور پھر مدینہ تک آپؐ کا تعاقب کیا گیا اُس وقت مقابلہ کا حکم ملا۔ آپؐ نے تلوار نہیں اٹھائی مگر دشمنوں نے تلوار اُٹھائی۔ بعض اوقات آپ کو ظالم طبع کفّار نے سر سے پاؤں تک خون آلود کر دیا تھا مگر آپؐ نے مقابلہ نہیں کیا۔ خوب یاد رکھو کہ اگر تلوار اسلام کا فرض ہوتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ میں اُٹھاتے مگر نہیں۔ وہ تلوار جس کا ذکر ہے وہ اُس وقت اُٹھی جب مُوذی کفّار نے مدینہ تک تعاقب کیا۔ اُس وقت مخالفین کے ہاتھ میں تلوار تھی مگر اب تلوار نہیں ہے ..... اور اسلام کے خلاف صرف قلم سے کام لیا جاتا ہے۔ پھر قلم کا جواب تلوار سے دینے والا احمق اور ظالم ہوگا یا کچھ اَور؟

اِس بات کو مت بھُولو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفّار کے حد سے گذرے ہوئے ظلم و ستم پر تلوار اُٹھائی اور وہ حفاظتِ خود اختیاری تھی جو ہر مہذّب گورنمنٹ کے قانون میں بھی حفاظتِ خود اختیاری کو جائز رکھا ہے۔ اگر ایک چور گھر میں گھس آوے اور وہ حملہ کر کے مار ڈالنا چاہے اس وقت اس چور کو بچاؤ کے لئے مار ڈالنا جُرم نہیں ہے۔

پس جب حالت یہاں تک پہنچی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار خدام شہید کر دئے گئے اور مسلمان ضعیف عورتوں تک کو نہایت سنگدلی اور بے حیائی کے ساتھ شہید کیا گیا تو کیا حق نہ تھا کہ اُن کو سزا دی جاتی۔ اس وقت اگر اللہ تعالیٰ کا یہ منشاء ہوتا کہ اسلام کا نام و نشان نہ رہے تو البتہ یہ ہو

سکتا تھا کہ تلوار کا نام نہ آتا مگر وہ چاہتا تھا کہ اسلام دُنیا میں پھیلے اور دُنیا کی نجات کا ذریعہ ہو اِس لئے اُس وقت محض مدافعت کے لئے تلوار اُٹھائی گئی میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اسلام کا اس وقت تلوار اُٹھانا کسی قانون مذہب اور اخلاق کی رُو سے قابلِ اعتراض نہیں ٹھہرتا۔ وہ لوگ جو ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسری پھیر دینے کی تعلیم دیتے ہیں وہ بھی صبر نہیں کر سکتے اور جن کے ہاں کیڑے کا مارنا بھی گناہ سمجھا جاتا ہے وہ بھی نہیں کر سکتے پھر اسلام پر اعتراض کیوں کیا جاتا ہے ؟

مَیں یہ بھی کھول کر کہتا ہوں کہ جو جاہل مسلمان کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے ذریعہ پھیلا ہے وہ نبی معصوم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر افتراء کرتے ہیں اور اسلام کی ہتک کرتے ہیں۔ خوب یاد رکھو کہ اسلام ہمیشہ اپنی پاک تعلیم اور ہدایت اور اپنے ثمرات انوار و برکات اور معجزات سے پھیلا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم الشان نشانات آپ کے اخلاق کی پاک تاثیرات نے اسے پھیلایا ہے اور وہ نشانات اور تاثیرات ختم نہیں ہوگئی ہیں بلکہ ہمیشہ اور ہر زمانہ میں تازہ بتازہ موجود رہتی ہیں اور یہی وجہ ہے جو مَیں کہتا ہوں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم زندہ نبی ہیں اِس لئے کہ آپ کی تعلیمات اور ہدایات ہمیشہ اپنے ثمرات دیتی رہتی ہیں اور آئندہ جب اسلام ترقی کرے گا تو اس کی یہی راہ ہوگی نہ کوئی اَور۔ پس جب اِسلام کی اشاعت کے لئے کبھی تلوار نہیں اُٹھائی گئی تو اس وقت ایسا خیال بھی کرنا گناہ ہے کیونکہ اب تو سب کے سب امن سے بیٹھے ہوئے ہیں اور اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے کافی ذریعے اور سامان موجود ہیں۔

مجھے بڑے ہی افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ عیسائیوں اور دوسرے معترضین نے اسلام پر حملے کرتے وقت ہرگز ہرگز اصلیت پر غور نہیں کیا۔ وہ دیکھتے نہیں کہ اس وقت تمام مخالف اسلام اور مسلمانوں کے استیصال کے درپے تھے اور سب کے سب مل کر اس کے خلاف منصوبے کرتے اور مسلمانوں کو دُکھ دیتے تھے۔ ان دُکھوں اور تکلیفوں کے مقابلہ میں اگر وہ اپنی جان نہ بچاتے تو کیا کرتے۔ قرآن شریف میں یہ آیت موجود ہے اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ط اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اُس وقت دیا گیا جب کہ مسلمانوں پر ظلم کی حد ہو گئی تو انہیں مقابلہ کا حکم دیا گیا۔ اس وقت کی یہ اجازت تھی دوسرے وقت کے لئے یہ حکم نہ تھا۔

(لیکچر لدھیانہ صفحہ ۲۴ تا ۲۶)

قرآن شریف نے ظلم اور زیادتی کی تعلیم نہیں دی اور صرف مظلوموں کی نسبت لڑائی کرنا جائز رکھا ہے اور نیز یہ کہ جس طرح دشمن نے اُن کا مال لُوٹ لیا ہے وہ بھی لُوٹ لیں زیادتی نہ کریں۔ پس کس قدر بے حیائی، بے شرمی اور بے ایمانی ہے کہ ناحق قرآن شریف پر یہ تہمت تھاپ دی جاتی ہے کہ گویا اُس نے آتے ہی بغیر اس کے کہ فریق ثانی سے مجرمانہ حرکتیں صادر ہوں لُوٹ اور قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا ہمیں

ایسی کوئی آیت سارے قرآن شریف میں نہیں ملتی ..... خدا تو قرآن شریف میں یہ فرماتا ہے اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ یعنی جن مسلمانوں پر ناحق قتل کرنے کیلئے چڑھائی کی جاتی ہے خدا نے دیکھا کہ وہ مظلوم ہیں اِس لئے خدا بھی اُن کو مقابلہ کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

(چشمۂ معرفت صفحہ ۱۹۵)

ہم ایک اور بات ان جاہلوں کو سُناتے ہیں کہ جو خواہ نخواہ جبر کا الزام خدا کے کلام پر دیتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مکّے کے رہنے والے کُل کفّار اور نیز دیہاتی اور گرد و نواح کے لوگ ایسے تھے کہ جنہوں نے اس زمانہ میں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ معظمہ میں تھے اور کوئی جنگ شروع نہ تھا کئی مسلمان ناحق قتل کر دیئے تھے اور ان مظلوموں کا خون ان کی گردن پر تھا اور در حقیقت وہ سب اسی گناہ میں شریک تھے کیونکہ بعض قاتل اور بعض ہمراز اور بعض ان کے معاون تھے۔ اِس وجہ سے وہ لوگ خدا کے نزدیک قتل کے لائق تھے کیونکہ ان کی اس قسم کی شرارتیں حد سے گذر گئی تھیں۔ علاوہ اِس کے سب سے بڑا گناہ اُن کا یہ تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقدامِ قتل کے مرتکب تھے اور انہوں نے پختہ ارادہ کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیں۔ پس ان گناہوں کی وجہ سے وہ خدا کی نظر میں واجب القتل ٹھہر چکے تھے اور ان کا قتل کرنا عین انصاف تھا کیونکہ وہ جرم قتل اور اقدامِ قتل کے مرتکب ہو چکے تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو برابر تیرہ برس اُن میں رہ کر وعظ کرتے رہے اور نیز آسمانی نشان دکھلاتے رہے اس صورت میں خدا کی حجّت ان پر پوری ہو چکی تھی۔ اس وجہ سے خدا نے جو رحیم و کریم ہے اُن کی نسبت یہ حکم دیا تھا کہ وہ اگرچہ اپنے جرائم کی وجہ سے بہر حال قتل کرنے کے لائق ہیں لیکن اگر کوئی اُن میں سے خدا کی کلام کو سُن کر اسلام قبول کرے تو یہ قصاص اس کو معاف کیا جاوے ورنہ اپنے گناہوں کی سزا میں جو قتل اور اقدامِ قتل ہے وہ بھی قتل کئے جائیں گے۔ اب بتلاؤ کہ اس میں کونسا جبر ہے؟ جس حالت میں وہ لوگ جرم قتل اور اقدامِ قتل کی وجہ سے بہر حال قتل کے لائق تھے اور یہ رعایت قرآن شریف نے ان کو دی کہ اسلام لانے کی حالت میں وہ قصاص دور ہو سکتا ہے تو اس میں جبر کیا ہوا؟ اور اگر یہ رعایت نہ دی جاتی تو ان کا قتل کرنا بہر حال ضروری تھا کیونکہ وہ قاتل اور اقدامِ قتل کے مرتکب تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ یعنی ہم اُن لوگوں کو جو ناحق قتل کئے جاتے ہیں اجازت دیتے ہیں کہ اب وہ بھی قاتلوں کا مقابلہ کریں یعنی ایک مدّت تک تو مومنوں کو مقابلہ کی اجازت نہیں دی گئی تھی اور وہ مدّت تیرہ[۱۳] برس تھی اور جب بہت سے مومن قتل ہو چکے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقدامِ قتل کے بھی کافر لوگ مرتکب ہوئے تب تیرہ[۱۳] برس کے مصائب اُٹھانے کے

بعد مقابلہ کی اجازت دی گئی۔ (چشمۂ معرفت صفحہ ۲۲۴، ۲۲۵)

اللہ تعالیٰ بعض مصالح کے رُو سے ایک فعل کرتا ہے اور آئندہ جب وہ فعل معرضِ اعتراض ٹھہرتا ہے تو پھر وہ فعل نہیں کرتا۔ اوّلاً ہمارے رسول نے کوئی تلوار نہ اٹھائی مگر اُن کو سخت سے سخت تکالیف برداشت کرنی پڑیں۔ تیرہ سال کا عرصہ ایک بچّہ کو بالغ کرنے کے لئے کافی ہے اور مسیح کی میعاد تو اگر اس میعاد میں سے دس نکال دیں تو تو بھی کافی ہوتی ہے۔ غرض اس لمبے عرصہ میں کوئی یا کسی رنگ کی تکلیف نہ تھی جو اٹھانی نہ پڑے۔ آخرکار وطن سے نکلے تو تعاقب ہوا۔ دوسری جگہ پناہ لی۔ تو دشمن نے وہاں بھی نہ چھوڑا جب یہ حالت ہوئی تو مظلوموں کو ظالموں کے ظلم سے بچانے کے لئے حکم ہوا اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ط وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ نِالَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ط جن لوگوں کے ساتھ لڑائیاں خواہ مخواہ کی گئیں اور گھروں سے ناحق نکالے گئے صرف اِس لئے کہ انہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ سو یہ ضرورت تھی کہ تلوار اٹھائی گئی۔ ورنہ آنحضرت کبھی تلوار نہ اٹھاتے۔ ہاں ہمارے زمانہ میں ہمارے برخلاف قلم اٹھائی گئی۔ قلم سے ہم کو اذیت دی گئی اور سخت ستایا گیا اُن کے مقابل قلم ہی ہمارا حربہ بھی ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۵۵، ۵۶)

(آنحضرتؐ کے زمانہ میں) اِسلام کی لڑائیاں ڈیفنسو (دفاعی) تھیں اور وہ صرف دس سال ہی کے اندر ختم ہوگئیں۔ (الحکم جلد ۳ نمبر ۱ مورخہ ۱۰؍جنوری ۱۸۹۹ء صفحہ ۸)

ابتدائے اسلام میں دفاعی لڑائیوں اور جسمانی جنگوں کی اِس لئے بھی ضرورت پڑتی تھی کہ دعوتِ اسلام کرنے والے کا جواب اُن دِنوں دلائل و براہین سے نہیں بلکہ تلوار سے دیا جاتا تھا اِس لئے لاچار جواب الجواب میں تلوار سے کام لینا پڑا لیکن اب تلوار سے جواب نہیں دیا جاتا بلکہ قلم اور دلائل سے اسلام پر نکتہ چینیاں کی جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں خدا تعالیٰ نے چاہا ہے کہ سیف (تلوار) کا کام قلم سے لیا جاوے اور تحریر سے مقابلہ کر کے مخالفوں کو پست کیا جاوے اِس لئے اب کسی کو شایاں نہیں کہ قلم کا جواب تلوار سے دینے کی کوشش کرے۔

گر حفظِ مراتب نہ کُنی زندیقی

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۶۸)

اِسلام کا کبھی ایسا منشاء نہ تھا کہ بے مطلب اور بلا ضرورت تلوار اُٹھائی جاوے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۶۹)

اِسلام کی نسبت جو کہتے ہیں کہ تلوار سے پھیلا یہ بالکل غلط ہے۔ اِسلام نے تلوار اس وقت تک نہیں

اُٹھائی جب تک سامنے تلوار نہیں دیکھی۔ قرآن شریف میں صاف لکھا ہے کہ جس قسم کے ہتھیاروں سے دشمن اِسلام پر حملہ کرے اُسی قسم کے ہتھیار استعمال کرو۔ مہدی کے لئے کہتے ہیں کہ آکر تلوار سے کام لے گا یہ صحیح نہیں۔ اب تلوار کہاں ہے؟ جو تلوار نکالی جاوے۔ (الحکم جلد ۱۲ ۴۴ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

نافہم مخالف یہ کہتے ہیں کہ جہاد کے ذریعہ اسلام پھیلایا جاتا ہے مگر میں کہتا ہوں کہ یہ صحیح نہیں ہے۔ اِسلام کی کامل تعلیم خود اس کی اشاعت کا موجب ہے۔ نفسِ اسلام کے لئے ہرگز کسی تلوار یا بندوق کی ضرورت نہیں ہے۔ اِسلام کی گزشتہ لڑائیاں وہ دفاعی لڑائیاں تھیں انہوں نے غلطی اور سخت غلطی کھائی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ وہ جبرًا مسلمان بنانے کے واسطے تھیں۔ غرض میرا ایمان ہے کہ اسلام تلوار کے ذریعہ نہیں پھیلایا جاتا بلکہ اس کی تعلیم جو اپنے ساتھ اعجازی نشان رکھتی ہے خود دلوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔

(الحکم جلد ۵ ۱۸ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۱ء صفحہ ۴)

ہم یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ اِسلامی جنگ بالکل دفاعی تھے اور ان میں وہ شدّت اور سخت گیری ہرگز نہ تھی جو موسیٰ اور یشوع کے جنگوں میں پائی جاتی ہے۔ اگر وہ کہیں کہ موسیٰ اور یشوع کی لڑائیاں عذابِ الٰہی کے رنگ میں تھیں تو ہم کہتے ہیں کہ اسلامی جنگوں کو کیوں عذابِ الٰہی کی صورت میں تسلیم نہیں کرتے؟ موسوی جنگوں کو کیا ترجیح ہے؟ بلکہ ان اسلامی جنگوں میں تو موسوی لڑائیوں کے مقابلہ میں بڑی بڑی رعایتیں دی گئی ہیں اصل بات یہی ہے کہ چونکہ وہ لوگ نوامیس الٰہیہ سے ناواقف تھے اِس لئے اللہ تعالیٰ نے ان پر موسےٰ علیہ السلام کے مخالفوں کے مقابلہ میں بہت بڑا رحم فرمایا کیونکہ وہ غفور و رحیم ہے۔ پھر اسلامی جنگوں میں موسوی جنگوں کے مقابلہ میں یہ بڑی خصوصیت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خادموں کو مکہ والوں نے برابر ۱۳ سال تک خطرناک ایذائیں دیں اور تکلیفیں دیں اور طرح طرح کے دُکھ اُن ظالموں نے دئیے چنانچہ ان میں سے کئی قتل کئے گئے اور بعض بُرے بُرے عذابوں سے مارے گئے۔ چنانچہ "تاریخ پڑھنے والے پر یہ امر مخفی نہیں ہے کہ بیچاری عورتوں کو سخت شرمناک ایذاؤں کے ساتھ مار دیا یہاں تک کہ ایک عورت کو دو اُونٹوں سے باندھ دیا اور پھر ان کو مختلف جہات میں دوڑا دیا اور اس بیچاری کو چیر ڈالا۔ اس قسم کی ایذاء رسانیوں اور تکلیفوں کو برابر ۱۳ سال تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی پاک جماعت نے بڑے صبر اور حوصلہ کے ساتھ برداشت کیا۔ اس پر بھی انہوں نے اپنے ظلم کو نہ روکا اور آخرکار خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ کیا گیا۔ اور جب آپؐ نے خدا تعالیٰ سے اُن کی شرارت کی اطلاع پاکر مکہ سے مدینہ کو ہجرت کی پھر بھی انہوں نے تعاقب کیا اور آخر جب یہ لوگ پھر مدینہ پر چڑھائی کر کے گئے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے حملہ کو روکنے کا حکم دیا کیونکہ اب وہ وقت آگیا تھا کہ اہلِ مکہ اپنی شرارتوں

اور شوخیوں کی پاداش میں عذابِ الٰہی کا مزہ چکھیں۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے جو پہلے وعدہ کیا تھا کہ اگر یہ لوگ اپنی شرارتوں سے باز نہ آئیں گے تو عذابِ الٰہی سے ہلاک کئے جائیں گے وہ پورا ہوا۔ خود قرآن شریف میں ان لڑائیوں کی یہ وجہ صاف لکھی ہے اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ۙ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ یعنی ان لوگوں کو مقابلہ کی اجازت دی گئی جن کے قتل کے لئے مخالفوں نے چڑھائی کی (اس لئے اجازت دی گئی) کہ ان پر ظلم ہوا اور خدا تعالیٰ مظلوم کی حمایت کرنے پر قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم ہیں جو ناحق اپنے وطنوں سے نکالے گئے۔ اُن کا گناہ بجز اس کے اور کوئی نہ تھا کہ انھوں نے کہا کہ ہمارا ربّ اللہ ہے۔ یہ وہ آیت ہے جس سے اسلامی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ پھر جس قدر رعایتیں اسلامی جنگوں میں دیکھو گے ممکن نہیں کہ موسوی یا یشوعی لڑائیوں میں اس کی نظیر مِل سکے۔ موسوی لڑائیوں میں لاکھوں بے گناہ بچوں کا مارا جانا، بوڑھوں اور عورتوں کا قتل، باغات اور درختوں کا جلا کر خاک سیاہ کر دینا تورات سے ثابت ہے مگر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے باوصفیکہ ان شریروں سے وہ سختیاں اور تکلیفیں دیکھی تھیں جو پہلے کسی نے نہ دیکھی تھیں پھر ان دفاعی جنگوں میں بھی بچّوں کو قتل نہ کرنے، عورتوں اور بوڑھوں کو نہ مارنے، راہبوں سے تعلق نہ رکھنے اور کھیتوں اور ثمردار درختوں کو نہ جلانے اور عبادت گاہوں کے مسمار نہ کرنے کا حکم دیا جاتا تھا۔ اب مقابلہ کر کے دیکھ لو کہ کس کا پلّہ بھاری ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

اِسلامی جنگیں بالکل دفاعی لڑائیاں تھیں۔ جب کفّار کی تکالیف اور شرارتیں حد سے گذر گئیں تو خدا (تعالیٰ) نے اُن کو سزا دینے کے لئے یہ حکم دیا مگر عیسائیوں نے جو مختلف اوقات میں مذہب کے نام سے لڑائیاں کی ہیں اُن کے پاس خدا تعالیٰ کی کونسی دستاویز اور حکم تھا جس کی رُو سے وہ لڑتے تھے ان کو تو ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسری پھیر دینے کا حکم تھا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

(جہاد کا ذکر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ) اب تلوار سے کام لینا تو اسلام پر تلوار مارنی ہے اب تو دلوں کو فتح کرنے کا وقت ہے اور یہ بات جبر سے نہیں ہوسکتی۔ یہ اعتراض کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے تلوار اُٹھائی بالکل غلط ہے۔ تیرہ برس تک آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور صحابہ کرام صبر کرتے رہے پھر باوجود اس کے کہ دشمنوں کا تعاقب کرتے تھے مگر صلح کے خواستگار ہوتے تھے کہ کسی طرح جنگ نہ ہو اور جو مشرک قومیں صلح اور امن کی خواستگار ہوتیں ان کو امن دیا جاتا اور صلح کی جاتی۔ اِسلام نے بڑے بڑے پیچوں سے اپنے آپکو جنگ سے بچانا چاہا ہے۔ جنگ کی بنیاد کو خود خدا تعالیٰ بیان فرماتا ہے کہ چونکہ یہ لوگ بہت مظلوم ہیں اور ان کو ہر طرح سے دُکھ دیا گیا ہے اِس لئے اب اللہ تعالیٰ اجازت دیتا ہے کہ یہ بھی اُن کے مقابلہ پر لڑیں۔ (البدر

جلد اوّل نمبر ۱۰ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۶)

مذہبی امور میں آزادی ہونی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ کہ دین میں کسی قسم کی زبردستی نہیں ہے۔ اِس قسم کا فقرہ انجیل میں کہیں بھی نہیں ہے۔ لڑائیوں کی اصل جڑ کیا تھی۔ اس کے سمجھنے میں ان لوگوں سے غلطی ہوئی ہے۔ اگر لڑائی کا ہی حکم تھا تو تیرہ برس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تو پھر ضائع ہی گئے کہ آپ نے آتے ہی تلوار نہ اُٹھائی۔ صرف لڑنے والوں کے ساتھ لڑائیوں کا حکم ہے۔ اِسلام کا یہ اصول کبھی نہیں ہوُا کہ خود ابتدائً جنگ کریں۔ لڑائی کا سبب کیا تھا؟ اسے خود خدا نے بتلایا ہے کہ ظُلِمُوْا۔ خدا تعالےٰ نے جب دیکھا کہ یہ لوگ مظلوم ہیں تو اب اجازت دیتا ہے کہ تم بھی لڑو۔ یہ نہیں حکم دیا کہ اب تلوار کا وقت ہے تم زبردستی تلوار کے ذریعہ لوگوں کو مسلمان کرو بلکہ یہ کہا کہ تم مظلوم ہو اب مقابلہ کرو۔ مظلوم کو تو ہر ایک قانون اجازت دیتا ہے کہ حفظِ جان کے واسطے مقابلہ کرے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۲/۱ مورخہ ۲۳/۳۰ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

خوب سمجھ لو کہ اب مذہبی لڑائیوں کا زمانہ نہیں اِس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں جو لڑائیاں ہوئی تھیں اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ جبرًا مسلمان بنانا چاہتے تھے بلکہ وہ لڑائیاں بھی دفاع کے طور پر تھیں۔ جب مسلمانوں کو سخت دُکھ دیا گیا اور مکّہ سے نکال دیا گیا اور بہت سے مسلمان شہید ہو چکے تب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اسی رنگ میں ان کا مقابلہ کرو پس وہ حفاظتِ خود اختیاری کے رنگ میں لڑائیاں کرنی پڑیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۳ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

اِسلامی جہاد پر یہ اعتراض تو محض فضول ہے کہ وہ لڑائیاں مذہب اور اشاعتِ اسلام کی خاطر تھیں۔ اِس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تیرہ سال تک مکّہ میں کفّار کے ہاتھوں سے سخت تکلیف اُٹھاتے رہے اور آپ کے جاں نثار صحابہ نے دُکھ اُٹھائے اور جانیں دیں۔ بعض غریب اور بیکس ضعیف عورتوں کو شرمناک تکالیف کفّار نے پہنچائیں یہاں تک کہ آخر آپ کو ہجرت کرنی پڑی اور ان کفّار نے وہاں بھی آپ کا تعاقب کیا ایسی صورت میں جب ان کی شرارتیں اور تکلیفیں حد سے گذر گئیں تو پھر خدا تعالیٰ نے سدِّ باب اور دفاع کے طور پر حکم دیا کہ ان سے جنگ کرو۔ چنانچہ پہلی آیت جس میں جہاد کا حکم ہوُا وہ یہ ہے :۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ...... الآیۃ

یعنی ان لوگوں کو اجازت دی گئی کہ جنگ کریں جن پر ظلم ہوُا ہے

مسلمان مظلوم تھے اُن کی طرف سے ابتداء نہیں ہوئی تھی بلکہ بانیٔ فساد کفّارِ مکّہ تھے۔ ایسی حالت میں بھی جب اُن کی شرارتیں انتہائی درجہ تک جا پہنچیں تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو مدافعت کے واسطے مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔

پس یہ اعتراض محض فضول اور لغو ہے کہ وہ لڑائیاں مذہب کے لئے تھیں۔ اگر محض مذہب کے لئے ہوتیں تو جزیہ دینے کی صورت میں اُن کو کیوں چھوڑا جاتا۔ پھر میں کہتا ہوں کہ عیسائی تو اس قسم کا اعتراض کر ہی نہیں سکتے۔ وہ اپنے گھر میں دیکھیں کہ اسلامی لڑائیاں موسوی لڑائیوں سے زیادہ ہیں؟ اور جبکہ وہ حضرت عیسٰی کو موسٰی علیہ السلام کا بھی (معاذ اللہ) خدا مانتے ہیں تو پھر ان لڑائیوں کا الزام عیسائیوں پر بدستور قائم ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں کہ وہ لڑائیاں اسلامی جنگوں سے زیادہ سخت اور خون ریز تھیں۔ اسلامی لڑائیوں میں بچّوں، عورتوں اور بوڑھوں کا لحاظ کیا جاتا تھا اور اُن کو قتل نہیں کیا جاتا تھا مگر موسوی لڑائیوں میں تو ان امور کی پرواہ نہیں کی جاتی تھی۔ ایسا ہی اسلامی جنگوں میں مذہبی عبادت گاہوں اور پھلدار درختوں کو بھی ضائع نہیں کیا جاتا تھا مگر موسوی لڑائیوں میں پھلدار درخت تباہ کر دئے جاتے۔ غرض اسلامی جنگ موسوی لڑائیوں کے مقابلہ میں کچھ چیز ہی نہیں۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۰)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مذہب کے لئے تلوار نہیں اُٹھائی بلکہ اتمامِ حجّت کے بعد جس طرح پر خدا نے چاہا منکروں کو عذاب دیا۔ وہ جنگیں دفاعی تھیں۔ تیرہ برس تک آپ ستائے جاتے رہے اور صحابہؓ نے جانیں دیں۔ انہوں نے (منکروں نے) نشان پر نشان دیکھے اور انکار کرتے رہے۔ آخر خدا تعالیٰ نے اُن جنگوں کی صورت میں عذاب سے ہلاک کیا۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۶ مورخہ ۱۴ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۵)

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت ظالم لوگ اسلام پر تلوار کے ساتھ حملے کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ اسلام کو تلوار کے ذریعہ سے نابود کر دیں۔ سو جنہوں نے تلواریں اُٹھائیں وہ تلوار سے ہی ہلاک کئے گئے۔ سو وہ جنگ صرف دفاعی جنگ تھی۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۱۹ مورخہ ۹ مئی ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائیوں کے لئے سبقت نہیں کی تھی بلکہ ان لوگوں نے خود سبقت کی تھی۔ خون کئے۔ ایذائیں دیں۔ تیرہ برس تک طرح طرح کے دُکھ دئے۔ آخر جب صحابہ کرامؓ سخت مظلوم ہو گئے تب اللہ تعالیٰ نے بدلہ لینے کی اجازت دی جیسے فرمایا اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ۱۴/۱۳ وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ ۲/۱ اُس زمانہ کے لوگ نہایت وحشی اور درندے تھے خون کرتے تھے جنگ کرتے تھے۔ طرح طرح کے ظلم اور دُکھ دیتے تھے۔ ڈاکوؤں اور لٹیروں کی طرح مار دھاڑ کرتے پھرتے تھے اور ناحق کی ایذا دہی اور خون ریزی پر کمر باندھے ہوئے تھے۔ خدا (تعالیٰ) نے فیصلہ کر دیا کہ ایسے ظالموں کو سزا دینے کا اِذن دیا جاتا ہے اور یہ ظلم نہیں بلکہ عین حق اور انصاف ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کے لئے انہوں نے بڑی بڑی کوششیں کیں۔ طرح طرح کے منصوبے کئے یہاں تک کہ ہجرت کرنی پڑی مگر پھر بھی انہوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مدینہ تک

تعاقب کیا اور خون کرنے کے درپے ہوئے۔ غرض جب ہمارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مدت تک صبر کیا اور مدت تک تکلیف اُٹھائی تب خدا (تعالیٰ) نے فیصلہ دیا کہ جنہوں نے تم لوگوں پر ظلم کئے اور تکلیفیں دیں اُن کو سزا دینے کا اِذن دیا جاتا ہے اور پھر بھی یہ فرما ہی دیا کہ اگر وہ صلح پر آمادہ ہوویں تو تم صلح کر لو۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو یتیم، غریب، بیکس پیدا ہوئے تھے وہ لڑائیوں کو کب پسند کر سکتے تھے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱)

یہ نہایت درجہ کا ظلم ہے کہ اسلام کو ظالم کہا جاتا ہے حالانکہ ظالم وہ خود ہیں جو تعصب کی وجہ سے بے سوچے سمجھے اسلام پر بے جا اعتراض کرتے ہیں اور باوجود بار بار سمجھانے کے نہیں سمجھتے کہ اسلام کے کُل جنگ اور مقابلے کفارِ مکہ کے ظلم و ستم سے تنگ آکر دفاعی رنگ میں حفاظتِ جان و مال کی غرض سے تھے اور کوئی بھی حرکت مسلمانوں کی طرف سے ایسی سرزد نہیں ہوئی جس کا ارتکاب اور ابتداء پہلے کفار کی طرف سے نہ ہوا ہو بلکہ بعض قابلِ نفریں حرکات کا مقابلہ بتقاضائے وسعت اخلاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود عمداً ترک کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ مثلاً کفار میں ایک سخت قابلِ نفرت رسم تھی جو کہ وہ مسلمان مُردوں سے کیا کرتے تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قبیح فعل سے مسلمانوں کو قطعاً روک دیا۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۲۲ مورخہ ۲۶ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۸)

اصل بات یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس زمانہ میں بڑی بڑی مشکلات کا سامنا تھا۔ آپ کے بہت سے جاں نثار اور عزیز دوست ظالم کفار کے تیر و تفنگ کا نشانہ بنے اور طرح طرح کے قابلِ شرم عذاب ان لوگوں نے مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کو پہنچائے حتیّٰ کہ آخر کار خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ کر لیا۔ چنانچہ آپ کا تعاقب بھی کیا۔ آپ کے قتل کرنے والے کے واسطے اِنعام مقرر کئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک غار میں پناہ گزین ہوئے۔ تعاقب کرنے میں کوئی کسر نہ اُٹھائی رکھی گئی مگر یہ تو خدا تعالیٰ کا تصرف تھا کہ آپ کو ان کی نظروں سے باوجود سامنے ہونے کے بچا لیا اور اُن کی آنکھوں میں خاک ڈال کر خود اپنے رسول کو ہاتھ دے کر بچا لیا۔ آخر کار جب ان کفار کے مظالم کی کوئی حد نہ رہی اور مسلمانوں کو اُن کے وطن سے باہر نکال کر بھی وہ سیر نہ ہوئے تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ارشاد نازل ہوا اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ۝ خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو تلوار اُٹھانے کی اجازت دی اور اس اجازت میں یہ ثابت کر دیا کہ واقع میں یہ لوگ ظالم تھے اور شرارت ان کی حد سے بڑھ چکی تھی اور مسلمانوں کا صبر بھی اپنے انتہائی نقطہ تک پہنچ چکا تھا۔ اب خدا (تعالیٰ) نے فرمایا کہ جن لوگوں نے تلوار سے مقابلہ کیا وہ تلوار ہی سے ہلاک کئے جاویں اور گو یہ چند اور ضعیف ہیں مگر میں

دکھادوں گا کہ مَیں بوجہ اس کے کہ وہ مظلوم ہیں ان کی نصرت کروں گا اور تم کو ان کے ہاتھ سے ہلاک کراؤں گا چنانچہ پھر اِس حکم کے بعد ان ہی چند لوگوں کی جو ذلیل اور حقیر سمجھے گئے تھے اور جن کا نہ کوئی حامی بنتا تھا اور نہ مددگار اور وہ کفّار کے ہاتھ سے سخت درجہ تنگ اور مجبور ہو گئے تھے ان کی مشارق اور مغارب میں دھاک بندھ گئی اور اِس طرح سے خدا نے ان کی نصرت کرکے دُنیا پر ظاہر کر دیا کہ واقعی وہ مظلوم تھے۔ غرض ہر طرح سے، ہر رنگ میں اور ہر پہلو پر نظر ڈال کر دیکھ لو کہ واقع میں اس وقت مسلمان مظلوم تھے یا کہ نہیں۔ اگر خدا (تعالیٰ) ایسے خطرناک اور نازک وقت میں بھی ان چند کمزور مسلمانوں کو اپنی حفاظتِ جان کے واسطے تلوار اُٹھانے اور دفاعی طور سے لڑائی کرنے کی اجازت نہ دیتا تو کیا ان کو دُنیا کے تختہ سے نابود ہی کر دیتا۔ تو پھر اس حالت میں ان کا تلوار اُٹھانا جبکہ ہر طرح سے ان کا حق تھا کہ وہ تلوار اُٹھاتے کیا شرعاً اور کیا عرفاً مگر وہ بھی آج تک نشانۂ اعتراض بنا ہُوا ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۸ رجون ۱۹۰۸ء صفحہ ۴،۶)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جنگ کئے وہ صرف دفاعی تھے۔ جب آپ کی اور آپ کے صحابہ کی تکالیف حد سے بڑھ گئیں اور بہت ستائے گئے اس وقت اللہ تعالیٰ نے مقابلہ کا حکم دیا چنانچہ پہلی آیت جو جہاد کے متعلق ہے وہ یہ ہے: اُذِنَ لِلَّذِیۡنَ یُقٰتَلُوۡنَ بِاَنَّہُمۡ ظُلِمُوۡا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصۡرِہِمۡ لَقَدِیۡرُۨ ۙ الَّذِیۡنَ اُخۡرِجُوۡا مِنۡ دِیَارِہِمۡ بِغَیۡرِ حَقٍّ الآیۃ یعنی ان لوگوں کو مقابلہ کی اجازت دی گئی جن کے مقابلہ قتل کے لئے مخالفوں نے چڑھائی کی (اِس لئے اجازت دی گئی) کہ ان پر ظلم ہُوا اور اللہ تعالیٰ مظلوم کی حمایت کرنے پر قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم ہیں جو ناحق اپنے وطنوں سے نکالے گئے۔ ان کا گناہ بجز اس کے اَور کوئی نہ تھا کہ انہوں نے کہا کہ ہمارا ربّ اللہ ہے۔ غرض آنحضرت صلعم کی لڑائیاں اس وقت تھیں جبکہ کفّار کے ظلم انتہاء تک پہنچ گئے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۶ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

بعض لوگ جن کو حق کے ساتھ دشمنی ہوتی ہے..... اعتراض کر دیتے ہیں کہ اسلام میں ہمدردی اگر ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لڑائیاں کیوں کی تھیں؟ وہ نادان اتنا نہیں جانتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو جنگ کئے وہ تیرہ برس تک خطرناک دُکھ اٹھانے کے بعد کئے اور وہ بھی مدافعت کے طور پر۔ تیرہ برس تک ان کے ہاتھوں سے آپ تکالیف اُٹھاتے رہے، مسلمان مرد اور عورتیں شہید کی گئیں۔ آخر جب آپ مدینہ تشریف لے گئے اور وہاں بھی ان ظالموں نے پیچھا نہ چھوڑا تو خدا تعالیٰ نے مظلوم قوم کو مقابلہ کا حکم دیا اور وہ بھی اِس لئے کہ شریروں کی شرارت سے مخلوق کو بچایا جائے اور ایک حق پرست قوم کے لئے راہ کُھل جاوے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کے لئے بدی نہیں چاہی۔ آپ تو رحمِ مجسّم تھے۔ اگر بدی چاہتے تو جب آپ نے پورا تسلّط حاصل کر لیا تھا اور شوکت اور غلبہ آپ کو مل گیا تھا تو آپ ان تمام ائمۃ الکفر کو جو ہمیشہ

آپ کو دُکھ دیتے رہتے تھے قتل کروا دیتے اور اس میں انصاف اور عقل کی رُو سے آپ کا پلہ بالکل پاک تھا مگر باوجود اس کے کہ عرفِ عام کے لحاظ سے اور عقل و انصاف کے لحاظ سے آپ کو حق تھا کہ ان لوگوں کو قتل کروا دیتے مگر نہیں۔ آپ نے سب کو چھوڑ دیا۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ رجنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

چودھویں پیشگوئی جو براہین احمدیہ کے اسی صفحہ ۲۳۹ میں ہے یہ ہے هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ۔ یعنی خدا وہ ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اس دین کو تمام دینوں پر غالب کرے۔ کوئی نہیں جو خدا کی باتوں کو ٹال سکے۔ ان پر ظلم ہؤا اور خدا ان کی مدد کرے گا۔ یہ آیاتِ قرآنی الہامی پیرایہ میں اس عاجز کے حق میں ہیں اور رسول سے مراد مامور اور فرستادہ ہے جو دینِ اسلام کی تائید کے لئے ظاہر ہؤا۔ اس پیشگوئی کا ماحصل یہ ہے کہ خدا نے جو اس مامور کو مبعوث فرمایا ہے یہ اسلئے فرمایا تا اس کے ہاتھ سے دینِ اسلام کو تمام دینوں پر غلبہ بخشے اور ابتداء میں ضروری ہے کہ اس مامور اور اس کی جماعت پر ظلم ہو لیکن آخر میں فتح ہو اور یہ دین اس مامور کے ذریعہ سے تمام ادیان پر غالب آجائے گا اور دوسری ملّتیں بیّنہ کے ساتھ ہلاک ہو جائیں گی۔ (سراجِ منیر صفحہ ۳۶)

معترضین نے اسلام پر حملے کرتے وقت ہرگز ہرگز اصلیّت پر غور نہیں کیا۔ وہ دیکھتے کہ اس وقت تمام مخالف اسلام اور مسلمانوں کے استیصال کے درپے تھے اور سب کے سب مل کر اس کے خلاف منصوبے کرتے اور مسلمانوں کو دُکھ دیتے تھے۔ ان دُکھوں اور تکلیفوں کے مقابلہ میں اگر وہ اپنی جان نہ بچاتے تو کیا کرتے۔

قرآن شریف میں یہ آیت موجود ہے اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت دیا گیا جبکہ مسلمانوں پر ظلم کی حد ہو گئی تو انہیں مقابلہ کا حکم دیا۔ اس وقت کی یہ اجازت تھی دوسرے وقت کے لئے یہ حکم نہ تھا۔ (بدر جلد ۲ نمبر ۵۱ مورخہ ۲۰ دسمبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۱۱)

مَیں یقیناً کہتا ہوں کہ اسلام کا غلبہ ہو کر رہے گا اور اُس کے آثار ظاہر ہو چکے ہیں۔ ہاں یہ سچی بات ہے کہ اس غلبہ کے لئے کسی تلوار اور بندوق کی حاجت نہیں اور نہ خدا نے مجھے ہتھیاروں کے ساتھ بھیجا ہے۔ جو شخص اس وقت یہ خیال کرے وہ اسلام کا نادان دوست ہو گا۔ مذہب کی غرض دلوں کو فتح کرنا ہوتی ہے اور یہ غرض تلوار سے حاصل نہیں ہوتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تلوار اُٹھائی مَیں بہت مرتبہ ظاہر کر چکا ہوں کہ وہ تلوار محض حفاظتِ خود اختیاری اور دفاع کے طور پر تھی

اور وہ بھی اس وقت جبکہ مخالفین اور منکرین کے مظالم حد سے گذر گئے اور بیکس مسلمانوں کے خون سے زمین سُرخ ہو چکی۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۴۱ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۵)

وَقَدْ بَيَّنَّا لَكَ اَنَّ الْحَرْبَ لَيْسَ مِنْ اَصْلِ مَقَاصِدِ الْقُرْآنِ وَلَا مِنْ جُذْرِ تَعْلِيْمِهٖ وَ اِنَّمَا هُوَ جُوِّزَ عِنْدَ اشْتِدَادِ الْحَاجَةِ وَبُلُوْغِ ظُلْمِ الظَّالِمِيْنَ اِلَى انْتِهَاءِهٖ وَاشْتِعَالِ جَوْرِ الْجَائِرِيْنَ وَلَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْ غَزْوَاتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَيْفَ صَبَرَ عَلٰى ظُلْمِ الْكُفَّارِ اِلٰى مُدَّةٍ يَبْلُغُ فِيْهِ صَبِيٌّ اِلٰى سِنِّ بُلُوْغِهٖ فَصَبَرَ وَكَانَ الْكُفَّارُ يُؤْذُوْنَهٗ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ يَنْهَبُوْنَ اَمْوَالَ الْمُؤْمِنِيْنَ كَالْاَشْرَارِ وَيَقْتُلُوْنَ رِجَالَهُمْ وَنِسَاءَهُمْ بِتَعْذِيْبَاتٍ تَتَحَدَّرُ بِتَصَوُّرِهَا دُمُوْعُ الْعُيُوْنِ وَتَقْشَعِرُّ قُلُوْبُ الْاَخْيَارِ وَكَذَالِكَ بَلَغَ الْاِيْذَاءُ اِلٰى انْتِهَائِهٖ حَتّٰى هَمُّوْا بِقَتْلِ نَبِيِّ اللّٰهِ فَاَمَرَهٗ رَبُّهٗ اَنْ يَّتْرُكَ وَطَنَهٗ وَيَهْرُبَ اِلَى الْمَدِيْنَةِ مُهَاجِرًا مِنْ مَّكَّةَ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنْ وَطَنِهٖ بِاِخْرَاجِ قَوْمِهٖ وَ مَعَ ذَالِكَ مَا كَانَ الْكُفَّارُ مُنْتَهِيْنَ۔ بَلْ لَمْ يَزَلِ الْفِتَنُ مِنْهُمْ تَسْتَعِرُ وَمَحَجَّةُ الدَّعْوَةِ تُعَرُّ حَتّٰى جَلَبُوْا عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْلَهُمْ وَرَجِلَهُمْ وَضَرَبُوْا خِيَامَهُمْ فِيْ

(ترجمہ از اصل) اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ لڑائی اور جہاد اصل مقاصد قرآن میں سے نہیں اور وہ صرف ضرورت کے وقت تجویز کیا گیا ہے یعنی ایسے وقت میں جبکہ ظالموں کا ظلم انتہا تک پہنچ جائے۔ اور پیروی کرنے کے لئے طریق عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بہتر ہے۔ دیکھو کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفّار کے ایذا پر اُس زمانہ تک صبر کیا جس میں ایک بچّہ اپنے سنِ بلوغ کو پہنچ جاتا ہے اور کافر لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ دُکھ دیتے اور رات دن ستاتے اور شریروں کی طرح اُن کے مالوں کو لُوٹتے اور مسلمانوں کے مَردوں اور عورتوں کو قتل کرتے اور ایسے بڑے بڑے عذابوں سے مارتے کہ اُن کے یاد کرنے سے آنکھوں کے آنسو جاری ہوتے ہیں اور نیک آدمیوں کے دِل کانپتے ہیں اور اِسی طرح دُکھ انتہاء کو پہنچ گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وطن سے نکالے گئے یہاں تک کہ ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کرنے کا قصد کیا سو اُس کے رب نے اُس کو حکم دیا تا وہ مدینہ بھاگ جائے۔ سو آنحضرت صلعم اپنے وطن سے کفار کے نکالنے سے ہجرت کر گئے اور ابھی کفار نے ایذا رسانی میں بس نہیں کی تھی بلکہ وہ فتنے بھڑکاتے اور دعوت کے کاموں میں مشکلات ڈالتے یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر معہ اپنے سواروں اور پیادوں کے چڑھائی کی اور بدر کے میدان میں جو

مَیَادِیْنِ بَدْرٍ بِفَوْجٍ کَثِیْرٍ قَرِیْبًا مِّنَ الْمَدِیْنَةِ وَ اَرَادُوا اسْتِیْصَالَ الدِّیْنِ فَاشْتَعَلَ غَضَبُ اللّٰہِ عَلَیْھِمْ وَ رَءٰی قُبْحَ جَفَاءِھِمْ وَ شِدَّةَ اعْتِدَاءِھِمْ فَنَزَلَ الْوَحْیُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَ قَالَ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُۨ ۝ فَاَمَرَ اللّٰہُ رَسُوْلَہُ الْمَظْلُوْمَ فِیْ ھٰذِہِ الْاٰیَةِ لِیُحَارِبَ الَّذِیْنَ ھُمْ بَدَءُوْا اَوَّلَ مَرَّةٍ بَعْدَ اَنْ رَءٰی شِدَّةَ اعْتِدَاءِھِمْ وَ کَمَالَ حِقْدِھِمْ وَضَلَالِھِمْ وَ رَءٰی اَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا یُرْجٰی بِالْمَوَاعِظِ صَلَاحُ اَحْوَالِھِمْ فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ حَرْبُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمَا حَارَبَ نَبِیُّ اللّٰہِ اَعْدَاءَ الدِّیْنِ اِلَّا بَعْدَ مَا رَاٰھُمْ سَابِقِیْنَ فِی التَّرَامِیْ بِالسِّھَامِ وَ التَّجَالُدِ بِالْحُسَامِ وَمَا کَانَ الْکُفَّارُ مَقْتُوْلِیْنَ فَقَطْ بَلْ کَانَ یَسْقُطُ مِنَ الْجَانِبَیْنِ قَتْلٰی وَکَانَ الْکُفَّارُ ظَالِمِیْنَ صَائِلِیْنَ۔ (نُوْرُ الْحَق حصہ اوّل صفحہ ۴۶ تا ۴۸)

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِیَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَ مَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا ؕ وَ لَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝

یعنی اگر خدا تعالیٰ کی یہ عادت نہ ہوتی کہ بعض کو بعض کے ساتھ دفع کرتا تو ظلم کی نوبت یہاں تک پہنچتی کہ گوشہ گزینوں کے خلوت خانے ڈھائے جاتے اور عیسائیوں کے گرجے مسمار کئے جاتے اور یہودیوں کے معبد نابود کئے جاتے اور مسلمانوں کی مسجدیں جہاں کثرت سے ذکرِ خدا ہوتا ہے منہدم کی جاتیں۔ اِس جگہ خدا تعالیٰ یہ ظاہر فرماتا ہے کہ ان تمام عبادت خانوں کا ئیں ہی حامی ہوں اور اسلام کا فرض ہے کہ اگر

مدینہ سے قریب ہے اپنی فوج کے خیمے کھڑے کر دیئے اور چاہا کہ دین کی بیخکنی کر دیں تب خدا کا غضب اُن پر بھڑکا اور اُس نے اُن کے بڑے ظلم اور سختی کے ساتھ حد سے تجاوز کرنا مشاہدہ کیا تو اُس نے اپنی وحی اپنے رسول پر اُتاری اور کہا کہ مسلمانوں کو خدا نے دیکھا جو ناحق اُن کے قتل کے لئے ارادہ کیا گیا ہے اور وہ مظلوم ہیں اِس لئے اُنہیں مقابلہ کی اجازت ہے اور خدا قادر ہے جو اُن کی مدد کرے سو خدا تعالیٰ نے اپنے رسول مظلوم کو اِس آیت میں اُن لوگوں کے مقابل پر ہتھیار اُٹھانے کی اجازت دی جن کی طرف سے ابتداء تھی مگر اُس وقت اجازت دی جبکہ انتہا درجہ کی زیادتی اور گمراہی اُن کی طرف سے دیکھ لی اور یہ دیکھ لیا کہ وہ ایک ایسی قوم ہے کہ بمجرد نصیحتوں سے اُن کی اصلاح غیر ممکن ہے۔ پس اب سوچو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لڑائیوں کی کیا حقیقت تھی اور نبی اللہ دشمنانِ دین سے ہرگز نہیں لڑا مگر جب تک کہ اُس نے یہ نہ دیکھ لیا کہ وہ تیر چلانے اور تلوار مارنے میں پیش دست اور سبقت کرنے والے ہیں اور نیز یہ تو نہیں تھا کہ صرف کفار ہی مارے جاتے تھے بلکہ جانبین سے مرنے والے کام آتے تھے اور کفار ظالم اور حملہ آور تھے۔ (نور الحق حصہ اول صفحہ ۴۶ تا ۴۸)

مثلاً کسی عیسائی ملک پر قبضہ کرے تو ان کے عبادت خانوں سے کچھ تعرض نہ کرے اور منع کر دے کہ ان کے گرجے مسمار نہ کئے جائیں اور یہی ہدایت احادیثِ نبویہؐ سے مفہوم ہوتی ہے کیونکہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جبکہ کوئی اسلامی سپہ سالار کسی قوم کے مقابلہ کے لئے مامور ہوتا تھا تو اس کو یہ حکم دیا جاتا تھا کہ وہ عیسائیوں اور یہودیوں کے عبادت خانوں اور فقراء کے خلوت خانوں سے تعرض نہ کرے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ اسلام کس قدر تعصب کے طریقوں سے دور ہے کہ وہ عیسائیوں کے گرجاؤں اور یہودیوں کے معبدوں کا ایسا ہی حامی ہے جیسا کہ مساجد کا حامی ہے۔ ہاں البتہ اس خدا نے جو اسلام کا بانی ہے یہ نہیں چاہا کہ اسلام دشمنوں کے حملوں سے فنا ہو جائے بلکہ اس نے دفاعی جنگ کی اجازت دی ہے اور حفاظتِ خود اختیاری کے طور پر مقابلہ کرنے کا اِذن دے دیا ہے۔

(مضمون متعلقہ چشمۂ معرفت صفحہ ۲۲، ۲۳)

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے وطنوں سے ناحق نکالے گئے اور ان کا گناہ بجز اس کے اور کوئی نہ تھا جو ہمارا ربّ اللہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ بعض کے شرّ کو بعض کی تائید کے ساتھ دفع نہ کرتا تو زمین فاسد ہو تی۔

(اہلِ اسلام اور عیسائیوں میں مباحثہ پرچہ ۲ ؍جون ۱۸۹۳ء صفحہ ۱۷)

وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ یعنی وہ جو خدا تعالیٰ کی مدد کرتا ہے خدا تعالیٰ اُس کی مدد کرتا ہے۔ اب حضرت دیکھئے آیت کے لفظ لَيَنْصُرَنَّ کے آخر میں نون ثقیلہ ہے لیکن اگر اِس آیت کے یہ معنے کریں کہ آئندہ کسی زمانہ میں اگر کوئی ہماری مدد کرے گا تو ہم اُس کی مدد کریں گے تو یہ معنے بالکل فاسد اور خلافِ سُنّتِ مستمرّہ الہٰیہ ٹھہریں گے کیونکہ اللہ جلّ شانہٗ کے قدیم سے اور اُسی زمانہ سے کہ جب بنی آدم پیدا ہوئے یہی سُنّتِ مستمرّہ ہے کہ وہ مدد کرنے والوں کی مدد کرتا ہے۔ یوں کیونکر کہا جائے کہ پہلے تو نہیں مگر آئندہ کسی نامعلوم زمانہ میں اس قاعدہ کا پابند ہو جائے گا اور اب تک تو صرف وعدہ ہی ہے عمل درآمد نہیں سُبْحَانَهٗ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ۔ (الحق دہلی صفحہ ۳۴)

اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ یعنی وے مظلوم جو اپنے وطنوں سے بے گناہ نکالے گئے صرف اِس بات پر کہ وہ کہتے تھے ہمارا ربّ اللہ ہے۔

(اہلِ اسلام اور عیسائیوں میں مباحثہ (جنگِ مقدس) پرچہ ۳ ؍جون ۱۸۹۳ء صفحہ ۷)

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ؕ

وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ○

اِس وقت مثیلِ مسیح کی سخت ضرورت تھی اور نیز اُن ملائک کی جو زندہ کرنے کے لئے اُترا کرتے ہیں سخت حاجت تھی کیونکہ روحانی موت اور غفلت ایک عالم پر جاری ہو گئی اور وہ تمام وجوہ پیدا ہو گئے جن کی وجہ سے توریت کی تائید میں مسیح ابنِ مریم دُنیا میں آیا تھا اور دجّال نے بھی بڑے زور کے ساتھ خروج کیا اور حضرت آدم کی پیدائش کے حساب سے الفِ ششم کا آخری حصہ آ گیا جو بموجب آیت اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ○ چھٹے دن کے قائم مقام ہے۔ سو ضرور تھا کہ اس چھٹے دن میں آدم پیدا ہوتا جو اپنی روحانی پیدائش کے رُو سے مثیلِ مسیح ہے اِس لئے خدا تعالیٰ نے اِس عاجز کو مثیلِ مسیح اور نیز آدم الفِ ششم کر کے بھیجا۔ (ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۴۵۵)

اِس عاجز کو جو خدا تعالیٰ نے آدم مقرر کر کے بھیجا اس کا یہ نشان رکھا کہ الفِ ششم میں جو قائم مقام روزِ ششم ہے یعنی آخری حصہ الف میں جو وقتِ عصر سے مشابہ ہے اس عاجز کو پیدا کیا جیسا کہ وہ فرماتا ہے اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ○ اور ضرور تھا کہ وہ ابنِ مریم جس کا انجیل اور فرقان میں آدم بھی نام رکھا گیا ہے وہ آدم کی طرز پر الفِ ششم کے آخر میں ظہور کرتا۔ سو آدم اوّل کی پیدائش سے الفِ ششم میں ظاہر ہونے والا یہی عاجز ہے۔ بہت سی حدیثوں سے ثابت ہو گیا ہے کہ بنی آدم کی عمر سات ہزار برس ہے اور آخری آدم پہلے آدم کی طرزِ ظہور پر الفِ ششم کے آخر میں جو روز ششم کے حکم میں ہے پیدا ہونے والا ہے سو وہ یہی ہے جو پیدا ہو گیا۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

(ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۶۹۶)

قمری حساب کے رُو سے جو اصل حساب اہلِ کتاب کا ہے میری ولادت چھٹے ہزار کے آخر میں تھی اور چھٹے ہزار کے آخر میں مسیح موعود کا پیدا ہونا ابتداء سے ارادۂ الٰہی میں مقرر تھا کیونکہ مسیح موعود خاتم الخلفاء ہے اور آخر کو اوّل سے مناسبت چاہیئے اور چونکہ حضرت آدم بھی چھٹے دن کے آخر میں پیدا کئے گئے ہیں اِس لئے بلحاظ مناسبت ضروری تھا کہ آخری خلیفہ جو آخری آدم ہے وہ بھی چھٹے ہزار کے آخر میں پیدا ہو۔ وجہ یہ کہ خدا کے سات دنوں میں سے ہر ایک دن ہزار برس کے برابر ہے جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ○ اور احادیثِ صحیحہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسیح موعود چھٹے ہزار میں پیدا ہو گا اِس لئے تمام اہلِ کشف مسیح موعود کا زمانہ قرار دینے میں چھٹے ہزار برس سے باہر نہیں گئے اور زیادہ سے زیادہ اُس کے ظہور کے وقت چودھویں صدی ہجری لکھا ہے اور

اہلِ اسلام کے اہلِ کشف نے مسیح موعود کو جو آخری خلیفہ اور خاتم الخلفاء ہے صرف اِس بات میں ہی آدم سے مشابہ قرار نہیں دیا کہ آدم چھٹے دن کے آخر میں پیدا ہوُا اور مسیح موعود چھٹے ہزار کے آخر میں پیدا ہوگا بلکہ اِس بات میں بھی مشابہ قرار دیا ہے کہ آدم کی طرح وہ بھی جمعہ کے دن پیدا ہوگا اور اُس کی پیدائش بھی توام کے طور پر ہوگی یعنی جیسا کہ آدم توام کے طور پر پیدا ہوُا تھا۔ پہلے آدم اور بعد میں حوّا ایسا ہی مسیح موعود بھی توام کے طور پر پیدا ہوگا سو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَالْمِنَّۃ کہ متصوّفین کی اس پیشگوئی کا مَیں مصداق ہوں۔

(حقیقۃ الوحی صہ۲۰۱)

ایک دن خدا کے نزدیک تمہارے ہزار سال کے برابر ہے پس جبکہ خدا تعالیٰ کی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ دن سات ہیں پس اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ انسانی نسل کی عمر سات ہزار سال ہے جیسا کہ خدا نے میرے پر ظاہر کیا ہے کہ سورۃ وَالْعَصْر کے عدد جس قدر حساب جُمل کی رُو سے معلوم ہوتے ہیں اسی قدر زمانہ نسلِ انسان کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک تک بحساب قمری گذر چکا تھا کیونکہ خدا نے حساب قمری رکھا ہے اور اس حساب سے ہماری اس وقت تک نسلِ انسان کی عمر چھ ہزار برس تک ختم ہو چکی ہے اور اب ہم ساتویں ہزار میں ہیں اور یہ ضرور تھا کہ مثیلِ آدم جس کو دوسرے لفظوں میں مسیح موعود کہتے ہیں چھٹے ہزار سال کے آخر میں پیدا ہو جو جمعہ کے دن کے قائم مقام ہے جس میں آدم پیدا ہوُا اور ایسا ہی خدا نے مجھے پیدا کیا پس اس کے مطابق چھٹے ہزار میں میری پیدائش ہوئی۔

(تتمہ حقیقۃ الوحی صہ۲۵،۲۶)

اِس آیت کے یہ معنے ہیں کہ تمہارا ہزار سال خدا کا ایک دن ہے۔

(تحفہ گولڑویہ صہ۹۲ حاشیہ)

ایک دن خدا کا ایسا ہے جیسا تمہارا ہزار برس ہے۔ پس چونکہ دن سات ہیں اِس لئے اِس آیت میں دُنیا کی عمر سات ہزار برس قرار دی گئی ہے لیکن یہ عمر اُس آدم کے زمانہ سے ہے جس کی ہم اولاد ہیں۔ خدا کی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی دُنیا تھی۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ لوگ کون تھے اور کس قسم کے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سات ہزار برس میں دُنیا کا ایک دَور ختم ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اور اسی امر پر نشان قرار دینے کے لئے دُنیا میں سات دن مقرر کئے گئے تا ہر ایک دن ایک ہزار برس پر دلالت کرے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ دُنیا پر اِس طرح سے کتنے دَور گذر چکے ہیں اور کتنے آدم اپنے اپنے وقت میں آ چکے ہیں۔ چونکہ خدا قدیم سے خالق ہے اِس لئے ہم مانتے اور ایمان لاتے ہیں کہ دُنیا اپنی نَوع کے اعتبار سے قدیم ہے لیکن اپنے شخص کے اعتبار سے قدیم نہیں ہے۔ افسوس کہ حضرات عیسائی

یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ صرف چھ ہزار برس ہوئے کہ جب خدا نے دُنیا کو پیدا کیا اور زمین و آسمان بنائے اور اس سے پہلے خدا ہمیشہ کے لئے معطل اور بیکار تھا اور ازلی طور پر معطل چلا آتا تھا۔ یہ ایسا عقیدہ ہے کہ کوئی صاحبِ عقل اس کو قبول نہیں کرے گا مگر ہمارا عقیدہ جو قرآن شریف نے ہمیں سکھلایا ہے کہ خدا ہمیشہ سے خالق ہے اگر چاہے تو کروڑوں مرتبہ زمین آسمان کو فنا کر کے پھر ایسے ہی بنا دے اور اُس نے ہمیں خبر دی ہے کہ وہ آدم جو پہلی اُمّتوں کے بعد آیا جو ہم سب کا باپ تھا اُس کے دُنیا میں آنے کے وقت سے یہ سلسلہ انسانی شروع ہوا ہے اور اس سلسلہ کی عمر کا پورا دَور سات ہزار برس تک ہے۔ یہ سات ہزار خدا کے نزدیک ایسے ہیں جیسے انسانوں کے سات دن۔ یاد رہے کہ قانونِ الٰہی نے مقرر کیا ہے کہ ہر ایک اُمّت کے لئے سات ہزار برس کا دَور ہوتا ہے۔ اسی دَور کی طرف اشارہ کرنے کے لئے انسانوں میں سات دِن مقرر کئے گئے ہیں۔ غرض بنی آدم کی عمر کا دَور سات ہزار برس مقرر ہے اور اس میں سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پانچ ہزار برس کے قریب گذر چکا تھا یا بہ تبدیلِ الفاظ یوں کہو کہ خدا کے دنوں میں سے پانچ دن کے قریب گذر چکے تھے جیسا کہ سورۃ وَالْعَصْرِ میں یعنی اُس کے حروف میں ابجد کے لحاظ سے قرآن شریف میں اشارہ فرما دیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں جب وہ سورت نازل ہوئی تب آدم کے زمانہ پر اسی قدر مدت گذر چکی تھی جو سورۃ موصوفہ کے عددوں سے ظاہر ہے۔ اِس حساب سے انسانی نَوع کی عمر میں سے اب اِس زمانہ میں چھ ہزار برس گذر چکے ہیں اور ایک ہزار برس باقی ہیں قرآن شریف میں بلکہ اکثر پہلی کتابوں میں بھی یہ نوشتہ موجود ہے کہ وہ آخری مرسل جو آدم کی صورت پر آئیگا اور مسیح کے نام سے پکارا جائے گا ضرور ہے کہ وہ چھٹے ہزار کے آخر میں پیدا ہو جیسا کہ آدم چھٹے دن کے آخر میں پیدا ہوا۔ یہ تمام نشان ایسے ہیں کہ تدبر کرنے والے کے لئے کافی ہیں اور اِن سات ہزار برس کی قرآن شریف اور دوسری خدا کی کتابوں کے رُو سے تقسیم یہ ہے کہ پہلا ہزار نیکی اور ہدایت کے پھیلنے کا زمانہ ہے اور دوسرا ہزار شیطان کے تسلط کا زمانہ ہے اور پھر تیسرا ہزار نیکی اور ہدایت کے پھیلنے کا اور چوتھا ہزار شیطان کے تسلط کا اور پھر پانچواں ہزار نیکی اور ہدایت کے پھیلنے کا (یہی وہ ہزار ہے جس میں ہمارے سید و مولیٰ ختمی پناہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا کی اصلاح کے لئے مبعوث ہوئے اور شیطان قید کیا گیا) اور پھر چھٹا ہزار شیطان کے کھُلنے اور مسلّط ہونے کا زمانہ ہے جو قرونِ ثلاثہ کے بعد شروع ہوتا اور چودھویں صدی کے سر پر ختم ہو جاتا ہے اور پھر ساتواں ہزار خدا اور اُس کے مسیح کا اور ہر ایک خیر و برکت اور ایمان اور صلاح اور تقویٰ اور توحید اور خدا پرستی اور ہر ایک قسم کی نیکی اور ہدایت کا زمانہ ہے۔ اب ہم ساتویں ہزار کے سر پر ہیں اس کے بعد کسی دوسرے مسیح کو قدم رکھنے کی جگہ نہیں کیونکہ زمانے سات ہی ہیں جو نیکی اور بدی میں تقسیم

کئے گئے ہیں۔ اِس تقسیم کو تمام انبیاء نے بیان کیا ہے کسی نے اِجمال کے طور پر اور کسی نے مفصّل طور پر۔
(لیکچر لاہور ص۳۸-۴۰)

قرآن شریف سے بھی صاف طور پر یہی نکلتا ہے کہ آدم سے اخیر تک عمر بنی آدم کی سات ہزار سال ہے اور ایسا ہی پہلی تمام کتابیں بھی باتفاق یہی کہتی ہیں اور آیت اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ؁ سے بھی یہی نکلتا ہے اور تمام نبی واضح طور پر یہی خبر دیتے آئے ہیں اور جیسا کہ میں ابھی بیان کر چکا ہوں سُورۃ وَالْعَصْرِ کے اعداد سے بھی یہی صاف معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آدم سے الفِ پنجم میں ظاہر ہوئے تھے اور اس حساب سے یہ زمانہ جس میں ہم ہیں ہزار ہفتم ہے جس بات کو خدا نے اپنی وحی سے ہم پر ظاہر کیا اُس سے ہم انکار نہیں کر سکتے اور نہ ہم کوئی وجہ دیکھتے ہیں کہ خدا کے پاک نبیوں کے متفق علیہ کلمہ سے انکار کریں۔ پھر جبکہ اِس قدر ثبوت موجود ہے اور بلا شبہ احادیث اور قرآن شریف کے رُو سے یہ آخری زمانہ ہے پھر آخری ہزار ہونے میں کیا شک رہا اور آخری ہزار کے سر پر مسیح موعود کا آنا ضروری ہے۔ (لیکچر سیالکوٹ ص۶تا۹)

کتبِ سابقہ اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ عمر دُنیا کی حضرت آدم علیہ السلام سے سات ہزار برس تک ہے۔ اِسی کی طرف قرآن شریف اِس آیت میں اشارہ فرماتا ہے کہ اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ؁ یعنی خدا کا ایک دن تمہارے ہزار برس کے برابر ہے اور خدا تعالیٰ نے میرے دل پر یہ الہام کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک حضرت آدم سے اسی قدر مدت بحساب قمری گذری تھی جو اِس سورت کے حروف کی تعداد سے بحساب ابجد معلوم ہوتی ہے اور اُس کے رُو سے حضرت آدم سے اب ساتواں ہزار بحساب قمری ہے جو دُنیا کے خاتمہ پر دلالت کرتا ہے اور یہ حساب جو سُورہ وَالْعَصْرِ کے حروف کی اعداد کے نکالنے سے معلوم ہوتا ہے یہود و نصاریٰ کے حساب سے قریباً تمام وکمال ملتا ہے۔ صرف قمری اور شمسی حساب کو ملحوظ رکھ لینا چاہیئے اور اُن کی کتابوں سے پایا جاتا ہے جو مسیح موعود کا چھٹے ہزار میں آنا ضروری ہے اور کئی برس ہو گئے کہ چھٹا ہزار گذر گیا۔
(براہین احمدیہ حصہ پنجم ص۱۱۶ حاشیہ)

خدا نے آدم کو چھٹے دن بروز جمعہ بوقت عصر پیدا کیا۔ توریت اور قرآن اور احادیث سے یہی ثابت ہے اور خدا نے انسانوں کے لئے سات دن مقرر کئے ہیں اور اِن دنوں کے مقابل پر خدا کا ہر ایک دن ہزار سال کا ہے۔ اس کی رُو سے استنباط کیا گیا ہے کہ آدم سے عمر دُنیا کی سات ہزار سال ہے اور چھٹا ہزار جو چھٹے دن کے مقابل پر ہے وہ آدم ثانی کے ظہور کا دن ہے یعنی مقدر یوں ہے کہ چھٹے ہزار

کے اندر دینداری کی رُوح دُنیا سے مفقود ہو جائے گی اور لوگ سخت غافل اور بیدین ہو جائیں گے تب انسان کے رُوحانی سلسلہ کو قائم کرنے کے لئے مسیح موعود آئے گا اور وہ پہلے آدم کی طرح ہزار ششم کے اخیر میں جو خدا کا چھٹا دن ہے ظاہر ہوگا چنانچہ وہ ظاہر ہو چکا اور وہ وہی ہے جو اِس وقت اِس تحریر کی رُو سے تبلیغ حق کر رہا ہے۔ میرا نام آدم رکھنے سے اِس جگہ یہ مقصود ہے کہ نوعِ انسان کا فرد کامل آدم سے ہی شروع ہوُا اور آدم پر ہی ختم ہوُا کیونکہ اس عالم کی وضع دَوری ہے اور دائرہ کا کمال اِسی میں ہے کہ جس نقطہ سے شروع ہوُا ہے اُسی نقطہ پر ختم ہو جائے پس خاتم الخلفاء کا آدم نام رکھنا ضروری تھا۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صـ۹۸ حاشیہ)

جیسا کہ خدا تعالیٰ کا قانونِ قدرت ہے کہ رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات آتی ہے اور اِس قانونِ قدرت میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اِسی طرح دُنیا پر اِس قسم کے زمانے آتے رہتے ہیں کہ کبھی رُوحانی طور پر رات ہوتی ہے اور کبھی طلوع آفتاب ہو کر نیا دن چڑھتا ہے چنانچہ پچھلا ایک ہزار جو گذرا ہے روحانی طور پر ایک تاریک رات تھی جس کا نام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فَیجِ اَعوج رکھا ہے۔ خدا تعالیٰ کا یہ ایک دن ہے جیسا کہ فرماتا ہے اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ اس ہزار سال میں دُنیا پر ایک خطرناک ظلمت کی چادر چھائی ہوئی تھی جس میں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزّت کو ایک ناپاک کیچڑ میں ڈالنے کے لئے پوری تدبیروں اور مکاریوں اور حیلہ جوئیوں سے کام لیا گیا ہے اور خود ان لوگوں میں ہر قسم کے شرک اور بدعات ہوگئے جو مسلمان کہلاتے تھے۔ مگر اس گروہ کی نسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَیْسُوْا مِنِّیْ وَ لَسْتُ مِنْھُمْ یعنی نہ وہ مجھ سے ہیں اور نہ مَیں اُن سے ہوں۔ غرض جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا یہ ہزار سالہ رات تھی جو گذر گئی۔ اب خدا تعالیٰ نے تقاضا فرمایا کہ دُنیا کو روشنی سے حصّہ دے اس شخص کو جو حصّہ لے سکے کیونکہ ہر ایک اِس قابل نہیں کہ اس سے حصّہ لے۔ چنانچہ اُس نے مجھے اِس صدی پر مامور کر کے بھیجا ہے تا کہ مَیں اسلام کو زندہ کروں۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۲ء صـ۲)

قرآن سے بتصریح معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ یہی ہے جس کا نام خدا (تعالیٰ) نے رکھا ہے سِتَّةَ اَیَّامٍ چھٹے دن کے آخری حصّہ میں آدم کا پیدا ہونا ضروری تھا۔ براہین میں اِسی کی طرف اشارہ ہے اَرَدْتُّ اَنْ اَسْتَخْلِفَ فَخَلَقْتُ اٰدَمَ پھر فرمایا اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۝ آج سے پہلے جو ہزار برس گذرا ہے وہ باعتبار بد اخلاقیوں اور بد اعمالیوں کے تاریکی کا زمانہ تھا کیونکہ وہ فسق و فجور کا زمانہ تھا اِسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خَیْرُ الْقُرُوْنِ

تَذَرْنِیْ کہہ کر تین سو برس کو مستثنیٰ کر دیا باقی ایک ہزار ہی رہ جاتا ہے ورنہ اس کے بغیر احادیث کی مطابقت ہو ہی نہیں سکتی اور اس طرح پر پہلی کتابوں سے بھی مطابقت ہو جاتی ہے اور وہ بات بھی پوری ہوتی ہے کہ ہزار سال تک شیطان کھلا رہے گا۔ یہ بات بھی کیسی پوری ہوتی ہے اور انگریز بھی اسی واسطے شور مچاتے ہیں کہ یہی زمانہ ہے جس میں ہمارے مسیح کو دوبارہ آنا چاہیئے۔ یہ مسئلہ ایسا مطابق آیا ہے کہ کوئی مذہب اِس سے انکار کر ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک علمی نشان ہے جس سے کوئی گریز نہیں ہو سکتا۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴؍ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

دانیال کی کتاب میں صدہا سال کو ہفتہ کہا گیا ہے اور دُنیا کی عمر بھی ایک ہفتہ بتلائی گئی ہے۔ اس جگہ ہفتہ سے مراد سات ہزار سال ہیں۔ ایک دن ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں آیا ہے اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ۔ تیرے رب کے نزدیک ایک دن تمہارے ہزار سال کے برابر ہے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۸ مورخہ ۲۱؍ فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

وَیَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ اور تجھ سے عذاب کے لئے جلدی کرتے ہیں۔
(ایک عیسائی کے تین سوال اور اُن کے جوابات صفحہ ۱۸)

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝

الہام رحمانی بھی ہوتا ہے اور شیطانی بھی اور جب انسان اپنے نفس اور خیال کو دخل دے کر کسی بات کے استکشاف کے لئے بطور استخارہ یا استخبارہ وغیرہ کے توجہ کرتا ہے۔ خاص کر اس حالت میں کہ جب اس کے دل میں یہ تمنا مخفی ہوتی ہے کہ میری مرضی کے موافق کسی کی نسبت کوئی بُرا یا بھلا کلمہ بطور الہام مجھے معلوم ہو جائے تو شیطان اُس وقت اُس کی آرزو میں دخل دیتا ہے اور کوئی کلمہ اُس کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے اور در اصل وہ شیطانی کلمہ ہوتا ہے۔ یہ دخل کبھی انبیاء اور رسولوں کی وحی میں بھی ہو جاتا ہے مگر وہ بلا توقف نکالا جاتا ہے۔ اسی کی طرف اللہ جلّ شانہٗ قرآن کریم میں اشارہ فرماتا ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْ

اُمْنِيَّتِهٖ الخ۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۲۸، ۶۲۹)

یہ بات خدا تعالیٰ کے قانونِ قدرت کے برخلاف ہے کہ وہ شیاطین کو اُن کے مواضع مناسبہ سے معطّل کر دیوے۔ اللہ جلّ شانہٗ قرآن کریم میں فرماتا ہے وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ یعنی ہم نے کوئی ایسا رسول اور نبی نہیں بھیجا کہ اُس کی یہ حالت نہ ہو کہ جب وہ کوئی تمنا کرے یعنی اپنے نفس سے کوئی بات چاہے تو شیطان اُس کی خواہش میں کچھ نہ ملا دے یعنی جب کوئی رسول یا کوئی نبی اپنے نفس کے جوش سے کسی بات کو چاہتا ہے تو شیطان اس میں بھی دخل دیتا ہے تب وحی متلوّ جو شوکت اور ہیبت اور روشنی تام رکھتی ہے اس دخل کو اُٹھا دیتی ہے اور منشاء الٰہی کو مصفّا کر کے دکھلا دیتی ہے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نبی کے دِل میں جو خیالات اُٹھتے ہیں اور جو کچھ خواطر اُس کے نفس میں پیدا ہوتی ہیں درحقیقت وہ تمام وحی ہوتی ہیں جیسا کہ قرآن کریم اس پر شاہد ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ لیکن قرآن کی وحی دوسری وحی سے جو صرف معانی منجانب اللہ ہوتی ہیں تمیز کلّی رکھتی ہے اور نبی کے اپنے تمام اقوال وحی غیر متلوّ میں داخل ہوتے ہیں کیونکہ رُوح القدس کی برکت اور چمک ہمیشہ نبی کے شاملِ حال رہتی ہے اور ہر یک بات اُس کی برکت سے بھری ہوئی ہوتی ہے اور وہ برکت رُوح القدس سے اُس کلام میں رکھی جاتی ہے لہٰذا ہر یک بات نبی کی جو نبی کی توجہ تام سے اور اُس کے خیال کی پوری مصروفیت سے اُس کے مُنہ سے نکلتی ہے وہ بلاشبہ وحی ہوتی ہے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۳۵۲، ۳۵۳)

پوچھا گیا کہ قرآن کا جو نزول ہُوا ہے وہ یہی الفاظ ہیں یا کس طرح؟

فرمایا:- یہی الفاظ ہیں اور یہی خدا کی طرف سے نازل ہُوا۔ قراءت کا اختلاف الگ امر ہے مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ میں لَا مُحَدَّثٍ قراءت شاذہ ہے اور یہ قراءت صحیح حدیث کا حکم رکھتی ہے جس طرح نَبِیٌّ اور رَسُوْلٌ کی وحی محفوظ ہوتی ہے اسی طرح مُحَدَّث کی وحی بھی محفوظ ہوتی ہے جیسا کہ اِس آیت میں پایا جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

بعض کا یہ خیال ہے کہ اگر کسی الہام کے سمجھنے میں غلطی ہو جائے تو امان اُٹھ جاتا ہے اور شک پڑ جاتا ہے کہ شاید اِس نبی یا رسول یا مُحدَّث نے اپنے دعویٰ میں بھی دھوکا کھایا ہو۔ یہ خیال سراسر سفسطہ ہے اور جو لوگ نیم سودائی ہوتے ہیں وہ ایسی ہی باتیں کیا کرتے ہیں اور اگر اُن کا یہی اعتقاد ہے تو تمام نبیوں کی نبوت سے اُن کو ہاتھ دھو بیٹھنا چاہیئے کیونکہ کوئی نبی نہیں جس نے کبھی نہ کبھی اپنے

اِجتہاد میں غلطی نہ کھائی ہو مثلاً حضرت مسیح جو خدا بنائے گئے اُن کی اکثر پیشگوئیاں غلطی سے پُر ہیں مثلاً یہ دعویٰ کہ مجھے داؤد کا تخت ملے گا۔ بجز اِس کے ایسے دعویٰ کے کیا معنے تھے کہ کسی مجمل الہام پر بھروسہ کرکے اُن کو یہ خیال پیدا ہوا کہ بادشاہ بن جاؤں گا۔۔۔۔ نبی کے ساتھ صدہا انوار ہوتے ہیں جن سے وہ شناخت کیا جاتا ہے اور جن سے اُس کے دعویٰ کی سچائی کُھلتی ہے۔ پس اگر کوئی اِجتہاد غلط ہو تو اصل دعویٰ میں کچھ فرق نہیں آتا مثلاً آنکھ اگر دُور کے فاصلہ سے اِنسان کو بَیل تصور کرے تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ آنکھ کا وجود بے فائدہ ہے یا اس کی رؤیت قابلِ اعتبار نہیں۔ پس نبی کے لئے اُس کے دعویٰ اور تعلیم کی ایسی مثال ہے جیسا کہ قریب سے آنکھ چیزوں کو دیکھتی ہے اور اُن میں غلطی نہیں کرتی۔ اور بعض اجتہادی امور میں غلطی کی ایسی مثال ہے جیسے دُور دراز کی چیزوں کو آنکھ دیکھتی ہے تو کبھی اُن کی تشخیص میں غلطی کر جاتی ہے۔ اِسی بناء پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کو جو یہودیوں کی بھلائی کے لئے اپنی بادشاہت کا خیال تھا اِس لئے بموجب آیت کریمہ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓی اَلْقَی الشَّیْطٰنُ فِیْٓ اُمْنِیَّتِہٖ شیطان نے آپ کو دھوکا دیا اور داؤد کے تخت کا لالچ دل میں ڈال دیا مگر چونکہ مُقرّب اور خدا کے پیارے تھے اِس لئے وہ شیطانی وسوسے قائم نہ رہ سکے اور جلد آپ نے سمجھ لیا کہ میری آسمان کی بادشاہت ہے نہ زمین کی۔

غرض مسیح کا یہ اجتہاد غلط نکلا۔ اصل وحی صحیح ہوگی مگر سمجھنے میں غلطی کھائی۔۔۔۔۔ اصل بات یہ ہے کہ جس یقین کو نبی کے دِل میں اس کی نبوت کے بارے میں بٹھایا جاتا ہے وہ دلائل تو آفتاب کی طرح چمک اُٹھتے ہیں اور اِس قدر تواتر سے جمع ہوتے ہیں کہ وہ امر بدیہی ہو جاتا ہے پھر بعض دوسری جزئیات میں اگر اجتہادی غلطی ہو بھی تو وہ اس یقین کو مُضر نہیں ہوتی۔ (ضمیمہ نزول المسیح صفحہ ۲۴ تا ۲۶)

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَأْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ۝

نَثْبُتَ مِنْ قَوْلِہٖ عَزَّ وَجَلَّ اَعْنِیْ وَلَا یَزَالُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ مِرْیَۃٍ مِّنْہُ اَنَّ الْعَلَامَاتِ

(ترجمہ از مرتب) اللہ عزّ وجلّ کے قول وَلَا یَزَالُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ مِرْیَۃٍ مِّنْہُ سے ثابت ہوتا ہے کہ شک و شُبہ کو دُور کر دینے والی قطعی علامات اور واضح نشانیاں جو بزبانِ

الْقَطْعِيَّةَ الْمُزِيْلَةَ لِلْمِرْيَةِ وَالْاَمَارَاتِ الظَّاهِرَةَ النَّاطِقَةَ الدَّآلَّةَ عَلٰى قُرْبِ الْقِيَامَةِ لَاتَظْهَرُ اَبَدًا وَاِنَّمَا تَظْهَرُ اٰيَاتٌ نَّظَرِيَّةٌ اَلَّتِيْ تَحْتَاجُ اِلَى التَّاْوِيْلَاتِ وَلَا تَظْهَرُ اِلَّا فِيْ حُلَلِ الْاِسْتِعَارَاتِ وَاِلَّا فَكَيْفَ يُمْكِنُ اَنْ تَنْفَتِحَ اَبْوَابُ السَّمَاءِ وَيَنْزِلُ مِنْهَا عِيْسٰى اَمَامَ اَعْيُنِ النَّاسِ وَفِيْ يَدِهٖ حَرْبَةٌ وَّ تَنْزِلُ الْمَلٰٓئِكَةُ مَعَهٗ۔

(حَمَامَةُ الْبُشْرٰى صفحہ ۸۳/۸۴)

حج اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ۔

ایسا پانی اُتارا جس سے گلی سڑی ہوئی زمین سرسبز ہو گئی۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور اُن کے جوابات صفحہ ۵)

حج وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ۔

یعنی عبادت کرتے ہیں سوائے اللہ کے ایسی چیز کی جس کی خدائی پر اللہ تعالیٰ نے کوئی نشان نہیں بھیجا یعنی نبوت پر تو نشان ہوتے ہی ہیں مگر وہ خدائی کے کام میں نہیں آسکتے اور پھر فرماتا ہے کہ اِس عقیدہ کے لئے اُن کے پاس کوئی علم بھی نہیں یعنی کوئی ایسی معقول دلائل بھی نہیں ہے جن سے کوئی عقیدہ پختہ ہو سکے۔

(جنگِ مقدس صفحہ ۹۶۔ ۲۹ مئی ۱۸۹۳ء)

حال قربِ قیامت کا پتہ دیتی ہوں کبھی بھی ظاہر نہیں ہوتیں۔ ہاں صرف ایسی نشانیاں ظاہر ہوتی ہیں جو غور و فکر اور تاویل کی محتاج ہوتی ہیں اور استعارات کے پردوں میں ہوتی ہیں۔ ورنہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آسمان کے دروازے ظاہری طور پر کھل جائیں اور ان میں سے عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کی نظروں کے سامنے ہاتھ میں نیزہ لئے ہوئے نازل ہوں اور فرشتے ان کے ہمراہ ہوں۔

۲۲۔ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۝

اے لوگو! ایک مثال ہے تم غور کرکے سُنو جن چیزوں سے تم مرادیں مانگتے ہو وہ چیزیں تو ایک مکھی بھی پیدا نہیں کرسکتیں اور اگر مکھی اُن سے کچھ چھین لے تو اُس سے چھوڑا نہیں سکتیں طالب بھی ضعیف ہیں اور مطلوب بھی ضعیف یعنی مخلوق چیزوں سے مُرادیں مانگنے والے ضعیف العقل ہیں اور مخلوق چیزیں جو معبود ٹھہرائی گئیں وہ ضعیف القدرت ہیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۴۳۷ حاشیہ در حاشیہ)

جن لوگوں کو تم خدا بنائے بیٹھے ہو وہ تو ایسے ہیں کہ اگر سب مل کر ایک مکھی پیدا کرنا چاہیں تو کبھی پیدا نہ کرسکیں اگرچہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں بلکہ اگر مکھی ان کی چیز چھین کر لے جائے تو اُنہیں طاقت نہیں ہوگی کہ وہ مکھی سے چیز واپس لے سکیں۔ اُن کے پرستار عقل کے کمزور اور وہ طاقت کے کمزور ہیں۔ کیا خدا ایسے ہُوا کرتے ہیں؟ (تقریر جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۶۶)

۲۲۔ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝

مُشرک لوگوں نے جیسا چاہیئے تھا خدا کو شناخت نہیں کیا۔ وہ ایسا سمجھتے ہیں کہ گویا خدا کا کارخانہ بغیر دوسرے شرکاء کے چل نہیں سکتا حالانکہ خدا اپنی ذات میں صاحبِ قوتِ تامّہ اور غلبہ کاملہ ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۴۳۷ حاشیہ در حاشیہ)

یاد رکھو کہ ہر ایک چیز خدا تعالیٰ کی آواز سُنتی ہے۔ ہر ایک چیز پر خدا تعالیٰ کا تصرّف ہے اور ہر ایک چیز کی تمام ڈوریاں خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں اس کی حکمت ایک بے انتہا حکمت ہے جو ہر ایک ذرہ کی جڑھ تک پہنچی ہوئی ہے اور ہر ایک چیز میں اتنی ہی خاصیتیں ہیں جتنی اس کی قدرتیں ہیں جو شخص اس بات پر ایمان نہیں لاتا وہ اُس گروہ میں داخل ہے جو مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ کے مصداق ہیں اور

چونکہ انسانِ کامل مظہرِ اَتم تمام عالم کا ہوتا ہے اِس لئے تمام عالم اس طرف وقتاً فوقتاً کھینچا جاتا ہے وہ روحانی عالم کا ایک عنکبوت ہوتا ہے اور تمام عالم اُس کی تاریں ہوتی ہیں اور خوارق کا یہی بستر ہے ؎

برکاروبار ہستی اثری ست عارفاں را

زجہاں چہ دید آں کس کہ ندید ایں جہاں را

(برکات الدعا صفحہ ۲۷ حاشیہ)

باعث مغضوب شدن اہلِ اسلام چیست ؟ ہمیں کہ از زباں میگویند کہ ایماں آوردیم و در دل ہیچ شئے نیست وہمیں معنی ایں آیت است مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۵، ۶ مورخہ ۲۸ نومبر و ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۶)

خدا تو وہ ہے کہ سب قوتوں والوں سے زیادہ قوت والا اور سب پر غالب آنے والا ہے۔ نہ اُس کو کوئی پکڑ سکے اور نہ مار سکے۔ ایسی غلطیوں میں جو لوگ پڑتے ہیں وہ خدا کی قدر نہیں پہچانتے اور نہیں جانتے خدا کیسا ہونا چاہیئے۔ اور پھر فرمایا کہ خدا امن کا بخشنے والا اور اپنے کمالات اور توحید پر دلائل قائم کرنے والا ہے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سچے خدا کا ماننے والا کسی مجلس میں شرمندہ نہیں ہو سکتا اور نہ خدا کے سامنے شرمندہ ہوگا کیونکہ اُس کے پاس زبردست دلائل ہوتے ہیں لیکن بناوٹی خدا کا ماننے والا بڑی مصیبت میں ہوتا ہے وہ بجائے دلائل بیان کرنے کے ہر ایک بیہودہ بات کو راز میں داخل کرتا ہے تا ہنسی نہ ہو اور ثابت شدہ غلطیوں کو چھپانا چاہتا ہے۔

(تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۶)

جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں کہ یہ مشکل ہے کہ مصنوعی خدا پر موت آوے اُنہوں نے اللہ تعالیٰ کو مانا نہیں وہ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ کے پورے مصداق ہیں۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۱۶ مورخہ ۱۷ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

۷۹۔ وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ۬ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ

شَهِيدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۖ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوا بِاللّٰهِ ۗ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيرُ ○

اصل بات یہی ہے کہ حقیقی معاون و ناصر وہی پاک ذات ہے جس کی شان ہے نِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ الْوَكِيْلُ وَ نِعْمَ النَّصِيْرُ۔ دُنیا اور دُنیا کی مددیں اُن لوگوں کے سامنے کالمیّت ہوتی ہیں اور مُردہ کیڑے کے برابر بھی حقیقت نہیں رکھتی ہیں۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ ص۱ ص۳
نیز بدر جلد ۲ نمبر ۲۵ مورخہ ۲۱ جون ۱۹۰۶ء ص۲)

ایک مولوی صاحب آئے اور انہوں نے سوال کیا کہ خدا تعالیٰ نے ہمارا نام مسلمان رکھا ہے آپ نے اپنے فرقہ کا نام احمدی کیوں رکھا ہے ؟ یہ بات هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ کے برخلاف ہے۔

اِس کے جواب میں حضرت (مسیح موعود علیہ السلام) نے فرمایا:۔

اِسلام بہت پاک نام ہے اور قرآن شریف میں یہی نام آیا ہے لیکن جیسا کہ حدیث شریف میں آچکا ہے اِسلام کے ۷۳ فرقے ہوگئے ہیں اور ہر ایک فرقہ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے انہی میں ایک رافضیوں کا ایسا فرقہ ہے جو سوائے دو تین آدمیوں کے تمام صحابہؓ کو سبّ و شتم کرتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ازواجِ مطہرات کو گالیاں دیتے ہیں اولیاء اللہ کو بُرا کہتے ہیں پھر بھی مسلمان کہلاتے ہیں۔ خارجی حضرت علی اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کو بُرا کہتے ہیں اور پھر بھی مسلمان نام رکھتے ہیں۔ بلادِ شام میں ایک فرقہ یزیدیہ ہے جو امام حسینؓ پر تبرا بازی کرتے ہیں اور مسلمان بنے پھرتے ہیں۔ اِسی مصیبت کو دیکھ کر سلفِ صالحین نے اپنے آپ کو ایسے لوگوں سے تمیز کرنے کے واسطے اپنے نام شافعی حنبلی وغیرہ تجویز کئے۔ آج کل نیچریوں کا ایک ایسا فرقہ نکلا ہے جو جنّت، دوزخ، وحی، ملائک سب باتوں کا منکر ہے یہاں تک کہ سیّد احمد خاں کا خیال تھا کہ قرآن مجید بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خیالات کا نتیجہ ہے اور عیسائیوں سے سُن کر یہ قصّے لکھ دیئے ہیں۔ غرض ان تمام فرقوں سے اپنے آپ کو تمیز کرنے کے واسطے اس فرقہ کا نام احمدیہ رکھا گیا۔

حضرت یہ تقریر کر رہے تھے کہ اس مولوی نے پھر سوال کیا کہ قرآن شریف میں تو حکم ہے کہ لا تفرقوا اور آپ نے تو تفرقہ ڈال دیا۔

حضرت نے فرمایا ہم تو تفرقہ نہیں ڈالتے بلکہ ہم تفرقہ دُور کرنے کے واسطے آئے ہیں۔ اگر احمدی نام رکھنے میں ہتک ہے تو پھر شافعی، حنبلی کہلانے میں بھی ہتک ہے مگر یہ نام ان اکابر کے رکھے ہوئے ہیں جن کو آپ بھی صلحاء مانتے ہیں۔ وہ شخص بدبخت ہوگا جو ایسے لوگوں پر اعتراض کرے اور ان کو بُرا کہے صرف امتیاز کے لئے ان لوگوں نے اپنے یہ نام رکھے تھے..... ہم مسلمان ہیں اور احمدی ایک امتیازی نام ہے۔

اگر صرف مسلمان نام ہو تو شناخت کا تمغہ کیونکر ظاہر ہو۔ خدا تعالیٰ ایک جماعت بنانا چاہتا ہے اور اس کا دوسروں سے امتیاز ہونا ضروری ہے بغیر امتیاز کے اس کے فوائد مترتب نہیں ہوتے اور صرف مسلمان کہلانے سے تمیز نہیں ہو سکتی۔ امام شافعی اور حنبلی وغیرہ کا زمانہ بھی ایسا تھا کہ اُس وقت بدعات شروع ہو گئی تھیں اگر اُس وقت یہ نام نہ ہوتے تو اہلِ حق اور ناحق میں تمیز نہ ہو سکتی ہزارہا گندے آدمی ملے جلے رہتے۔ یہ چار نام اسلام کے واسطے مثل چار دیواری کے تھے اگر یہ لوگ پیدا نہ ہوتے تو اسلام ایسا مشتبہ مذہب ہو جاتا کہ بدعتی اور غیر بدعتی میں تمیز نہ ہو سکتی۔ اب بھی ایسا زمانہ آ گیا ہے کہ گھر گھر ایک مذہب ہے۔ ہم کو مسلمان ہونے سے انکار نہیں مگر تفرقہ دُور کرنے کے واسطے یہ نام رکھا گیا ہے۔

پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے توریت والوں سے اختلاف کیا اور عام نظروں میں ایک تفرقہ ڈالنے والے بنے لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ تفرقہ خود خدا ڈالتا ہے۔ جب کھوٹ اور ملاوٹ زیادہ ہو جاتا ہے تو خدا خود چاہتا ہے کہ ایک تمیز ہو جائے.....

جو لوگ اِسلام کے نام سے انکار کریں یا اس نام کو عار سمجھیں اُن کو تو مَیں لعنتی کہتا ہوں۔ مَیں کوئی بدعت نہیں لایا۔ جیسا کہ حنبلی شافعی وغیرہ نام تھے ایسا ہی احمدی بھی نام ہے بلکہ احمد کے نام میں اسلام اور اسلام کے بانی احمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اِتّصال ہے اور یہ اِتّصال دوسرے ناموں میں نہیں۔ احمد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہے۔

اسلام احمدی ہے اور احمدی اسلام ہے۔ حدیث شریف میں محمدی رکھا گیا ہے۔ بعض اوقات الفاظ بہت ہوتے ہیں مگر مطلب ایک ہی ہوتا ہے۔ احمدی نام ایک امتیازی نشان ہے۔ آجکل اِس قدر طوفان زمانہ میں ہے کہ اوّل آخر کبھی نہیں ہوا۔ اِس واسطے کوئی نام ضروری تھا۔ خدا تعالیٰ کے نزدیک جو مسلمان ہیں وہ احمدی ہیں۔

(بدر جلد ۱ نمبر ۳۲ مورخہ ۳ ۔ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳،۴)

تفسیر سورۃ المؤمنون

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ○ الَّذِیۡنَ هُمۡ فِیۡ صَلَاتِهِمۡ خٰشِعُوۡنَ ○ وَالَّذِیۡنَ هُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ ○ وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوۡنَ ○ وَالَّذِیۡنَ هُمۡ لِفُرُوۡجِهِمۡ حٰفِظُوۡنَ ○ اِلَّا عَلٰۤى اَزۡوَاجِهِمۡ اَوۡ مَا مَلَكَتۡ اَيۡمَانُهُمۡ فَاِنَّهُمۡ غَيۡرُ مَلُوۡمِيۡنَ ○ فَمَنِ ابۡتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡعٰدُوۡنَ ○ وَالَّذِيۡنَ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ ○ وَالَّذِيۡنَ هُمۡ عَلٰى صَلَوٰتِهِمۡ يُحَافِظُوۡنَ ○ اُولٰٓئِكَ هُمُ الۡوٰرِثُوۡنَ ○ الَّذِيۡنَ يَرِثُوۡنَ الۡفِرۡدَوۡسَؕ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ ○ وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ ○ ثُمَّ جَعَلۡنٰهُ نُطۡفَةً فِىۡ قَرَارٍ مَّكِيۡنٍ ○ ثُمَّ خَلَقۡنَا النُّطۡفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقۡنَا الۡعَلَقَةَ مُضۡغَةً فَخَلَقۡنَا الۡمُضۡغَةَ

عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ؕ

خدا تعالیٰ نے اِس سورہ کے ابتداء میں جو سورۃ المؤمنون ہے جس میں یہ آیت فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ہے اِس بات کو بیان فرمایا ہے کہ کیونکر انسان مراتبِ سِتّہ کو طے کرکے جو اس کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں اپنے کمال رُوحانی اور جسمانی کو پہونچتا ہے سو خدا نے دونوں قسم کی ترقیات کو چھ چھ مرتبہ پر تقسیم کیا ہے اور مرتبہ ششم کو کمال ترقی کا مرتبہ قرار دیا ہے اور یہ مطابقت رُوحانی اور جسمانی وجود کی ترقیات کی ایسے خارق عادت طور پر دکھلائی ہے کہ جب سے انسان پیدا ہوا ہے کبھی کسی انسان کے ذہن نے اس نکتہ معرفت کی طرف سبقت نہیں کی۔ اور اگر کوئی دعویٰ کرے کہ سبقت کی ہے تو یہ بارِ ثبوت اُس کی گردن پر ہوگا کہ یہ پاک فلاسفی کسی انسان کی کتاب میں سے دکھلاوے۔ اور یہ یاد رہے کہ وہ ایسا ہرگز ثابت نہیں کرسکے گا۔ پس بدیہی طور پر یہ معجزہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے وہ عمیق مناسبت جو رُوحانی اور جسمانی وجود کے اُن ترقیات میں ہے جو وجود کامل کے مرتبہ تک پیش آتے ہیں ان آیاتِ مبارکہ میں ظاہر کردی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ظاہری اور باطنی صنعت ایک ہی ہاتھ سے ظہور پذیر ہوتی ہے جو خدا تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔

بعض نادانوں نے یہ بھی اعتراض کیا تھا کہ جس طرح خدا تعالیٰ نے نطفہ کی حالت سے لے کر اخیر تک جسمانی وجود کا قرآن شریف میں نقشہ کھینچا ہے یہ نقشہ اِس زمانہ کی جدید تحقیقاتِ طبّی کی رُو سے صحیح نہیں ہے لیکن اُن کی حماقت ہے کہ ان آیات کے معنی انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ گویا خدا تعالیٰ رِحم کے اندر اِنسانی وجود کو اِس طرح بناتا ہے کہ پہلے بکلّی ایک عضو سے فراغت کرلیتا ہے پھر دوسرا بناتا ہے یہ آیاتِ الٰہیہ کا منشاء نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہم نے بچشمِ خود ملاحظہ کرلیا ہے اور مُضغہ سے لیکر ہر ایک حالت کے بچہ کو دیکھ لیا ہے۔ خالقِ حقیقی رِحم کے اندر تمام اعضاء اندرونی و بیرونی کو ایک ہی زمانہ میں بناتا ہے یعنی ایک ہی وقت میں سب بنتے ہیں۔ تاخیر تقدیم نہیں۔ البتہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ پہلے تمام وجود انسان کا ایک جما ہوا خون ہوتا ہے اور پھر سارے کا سارا ایک ہی وقت میں مُضغہ بن جاتا ہے اور پھر ایک ہی وقت میں کچھ حصہ اس کا اپنے اپنے موقعہ پر ہڈیاں بن جاتا ہے اور پھر ایک ہی وقت میں اس تمام مجموعہ پر ایک زائد گوشت چڑھ جاتا ہے جو تمام بدن کی کھال کہلاتی ہے جس سے خوبصورتی

پیدا ہوتی ہے اور اس مرتبہ پر جسمانی بناوٹ تمام ہو جاتی ہے اور پھر جان پڑ جاتی ہے۔ یہ وہ تمام حالتیں ہیں جو ہم نے بچشم خود دیکھ لی ہیں۔

اب ہم روحانی مراتب ستّہ کا ذیل میں ذکر کرتے ہیں جیسا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (۱) قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ (۲) وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۙ (۳) وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ (۴) وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۙ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۚ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۚ (۵) وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ (۶) وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اور ان کے مقابل جسمانی ترقیات کے مراتب بھی چھ قرار دیئے ہیں جیسا کہ وہ اِن آیات کے بعد فرماتا ہے :- (۱) ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ (۲) ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً (۳) فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً (۴) فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا (۵) فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۚ (۶) ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۚ

جیسا کہ ہم اُوپر بیان کر چکے ہیں ظاہر ہے کہ پہلا مرتبہ رُوحانی ترقی کا یہ ہے جو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے یعنی قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ یعنی وہ مومن نجات پا گئے جو اپنی نماز اور یادِ الٰہی میں خشوع اور فروتنی اختیار کرتے ہیں اور رِقّت اور گدازش سے ذکرِ الٰہی میں مشغول ہوتے ہیں۔ اس کے مقابل پر پہلا مرتبہ جسمانی نشوونما کا جو اِس آیت میں ذکر کیا گیا ہے یہ ہے یعنی ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ یعنی پھر ہم نے اِنسان کو نطفہ بنایا اور وہ نطفہ ایک محفوظ جگہ میں رکھا۔ سو خدا تعالیٰ نے آدم کی پیدائش کے بعد پہلا مرتبہ انسانی وجود کا جسمانی رنگ میں نُطفہ کو قرار دیا ہے اور ظاہر ہے کہ نُطفہ ایک ایسا تخم ہے جو اجمالی طور پر مجموعہ اُن تمام قویٰ اور صفات اور اعضاء اندرونی اور بیرونی اور تمام نقش و نگار کا ہوتا ہے جو پانچویں درجہ پر مفصّل طور پر ظاہر ہو جاتے ہیں اور چھٹے درجہ پر اتم اور اکمل طور پر اُن کا ظہور[1] ہوتا ہے اور

---

[1] درجات سے مراد وہ درجے ہیں جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں۔ پانچواں درجہ وہ ہے جب قدرت صانعِ مطلق سے انسانی قالب تمام و کمال رِحم میں تیار ہو جاتا ہے اور ہڈیوں پر ایک خوشنما گوشت چڑھ جاتا ہے اور چھٹا درجہ وہ ہے جب اس قالب میں جان پڑ جاتی ہے اور جیسا کہ بیان کیا گیا ہے انسان کے رُوحانی وجود کا پہلا مرتبہ حالتِ خشوع اور عجز و نیاز اور سوز و گداز ہے اور درحقیقت وہ بھی اجمالی طور پر مجموعہ اُن تمام امور کا ہے جو بعد میں کُھلے طور پر انسان کے رُوحانی وجود میں نمایاں ہوتے ہیں۔ منہ

بایں ہمہ نطفہ باقی تمام درجات سے زیادہ تر معرضِ خطر میں ہے کیونکہ ابھی وہ اُس تخم کی طرح ہے جس نے ہنوز زمین سے کوئی تعلق نہیں پکڑا اور ابھی وہ رِحم کی کشش سے بہرہ ور نہیں ہوا ممکن ہے کہ وہ اندامِ نہانی میں پڑھ کر ضائع ہو جائے جیسا کہ تخم بعض اوقات پتھریلی زمین پر پڑکر ضائع ہو جاتا ہے اور ممکن ہے کہ وہ نطفہ بذاتہا ناقص ہو یعنی اپنے اندر ہی کچھ نقص رکھتا ہو اور قابلِ نشوونما نہ ہوا اور یہ اِستعداد اُس میں نہ ہو کہ رِحم اُس کو اپنی طرف جذب کرلے اور صرف ایک مُردہ کی طرح ہو جس میں کچھ حرکت نہ ہو جیسا کہ ایک بوسیدہ تخم زمین میں بویا جائے اور گو زمین عمدہ ہو مگر تاہم تخم بوجہ اپنے ذاتی نقص کے قابلِ نشوونما نہیں ہوتا اور ممکن ہے کہ بعض اَور عوارض کی وجہ سے جن کی تفصیل کی ضرورت نہیں نطفہ رِحم میں تعلق پذیر نہ ہو سکے اور رِحم اُس کو اپنی کشش سے محروم رکھے۔ جیسا کہ تخم بعض اوقات پَیروں کے نیچے کچلا جاتا ہے یا پرندے اُس کو چُگ جاتے ہیں یا کسی اَور حادثہ سے تلف ہو جاتا ہے۔

یہی صفات مومن کے رُوحانی وجود کے اوّل مرتبہ کے ہیں اور اوّل مرتبہ مومن کے رُوحانی وجود کا وہ خشوع اور رِقّت اور سوز و گداز کی حالت ہے جو نماز اور یادِ الٰہی میں مومن کو میسّر آتی ہے یعنی گُدازش اور رِقّت اور فروتنی اور عجز و نیاز اور رُوح کا انکسار اور ایک تڑپ اور قلق اور تپش اپنے اندر پیدا کرنا اور ایک خوف کی حالت اپنے پروردگار کے خدائے عزّ و جلّ کی طرف دل کو جُھکانا جیسا کہ اِس آیت میں فرمایا گیا ہے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ یعنی وہ مومن مراد پاگئے جو اپنی نماز میں اور ہر ایک طور کی یادِ الٰہی میں فروتنی اور عجز و نیاز اختیار کرتے ہیں اور رِقّت اور سوز و گداز اور قلق اور کرب اور دلی جوش سے اپنے رب کے ذکر میں مشغول ہوتے ہیں۔ یہ خشوع کی حالت جس کی تعریف کا اُوپر اشارہ کیا گیا ہے روحانی وجود کی طیاری کے لئے پہلا مرتبہ ہے۔ یا یوں کہو کہ وہ پہلا تخم ہے جو عبودیت کی زمین میں بویا جاتا ہے اور وہ اجمالی طور پر اُن تمام قویٰ اور صفات اور اعضاء اور تمام نقش و نگار اور حُسن و جمال اور خط و خال اور شمائل روحانیہ پر مشتمل ہے جو پانچویں اور چھٹے درجہ میں انسانِ کامل کے لئے نمودار طور پر ظاہر ہوتے اور اپنے دلکش پیرایہ میں تجلی فرماتے ہیں[1]۔ اور چونکہ وہ نطفہ کی طرح روحانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے۔ اِس لئے وہ آیتِ قرآنی میں نطفہ

---

[1] پانچواں درجہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں وہ ہے جو اِس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے یعنی وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ اور چھٹا درجہ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں وہ ہے جو اِس آیت میں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کی طرح پہلے مرتبہ پر رکھا گیا ہے اور نطفہ کے مقابل پر دکھلایا گیا ہے تا وہ لوگ جو قرآن شریف میں غور کرتے ہیں سمجھ لیں کہ نماز میں خشوع کی حالت رُوحانی وجود کے لئے ایک نطفہ ہے اور نطفہ کی طرح رُوحانی طور پر انسان کامل کے تمام قویٰ اور صفات اور تمام نقش و نگار اس میں مخفی ہیں۔ اور جیسا کہ نطفہ اس وقت تک معرضِ خطر میں ہے جب تک کہ رِحم سے تعلق نہ پکڑے۔ ایسا ہی روحانی وجود کی یہ ابتدائی حالت یعنی خشوع کی حالت اُس وقت تک خطرہ سے خالی نہیں جب تک کہ رحیم خدا سے تعلق نہ پکڑ لے۔ یاد رہے کہ جب خدا تعالیٰ کا فیضان بغیر توسط کسی عمل کے ہو تو وہ رحمانیت کی صفت سے ہوتا ہے جیسا کہ جو کچھ خدا نے زمین و آسمان وغیرہ انسان کے لئے بنائے یا خود انسان کو بنایا۔ یہ سب فیض رحمانیت سے ظہور میں آیا لیکن جب کوئی فیض کسی عمل اور عبادت اور مجاہدہ اور ریاضت کے عوض میں ہو وہ رحیمیت کا فیض کہلاتا ہے۔ یہی سُنّت اللہ بنی آدم کے لئے جاری ہے پس جبکہ انسان نماز اور یادِ الٰہی میں خشوع کی حالت اختیار کرتا ہے تب اپنے تئیں رحیمیت کے فیضان کے لئے مستعد بناتا ہے۔ سو نطفہ میں اور رُوحانی وجود کے پہلے مرتبہ میں جو حالتِ خشوع ہے صرف فرق یہ ہے کہ نطفہ رِحم کی کشش کا محتاج ہوتا ہے اور یہ رحیم کی کشش کی طرف احتیاج رکھتا ہے۔ اور جیسا کہ نطفہ کے لئے ممکن ہے کہ وہ رِحم کی کشش سے پہلے ہی ضائع ہو جائے ایسا ہی رُوحانی وجود کے پہلے مرتبہ کے لئے یعنی حالتِ خشوع کے لئے ممکن ہے کہ وہ رحیم کی کشش اور تعلق سے پہلے ہی برباد ہو جائے۔ جیسا کہ بہت سے لوگ ابتدائی حالت میں اپنی نمازوں میں روتے اور وجد کرتے اور نعرے مارتے اور خدا کی محبت میں طرح طرح کی دیوانگی ظاہر کرتے ہیں اور طرح طرح کی عاشقانہ حالت دکھلاتے ہیں۔ اور چونکہ اُس ذات ذوالفضل سے جس کا نام رحیم ہے کوئی تعلق پیدا نہیں ہوتا۔ اور نہ اس کی خاص تجلّی کے جذبہ سے اس کی طرف کھینچے جاتے ہیں اِس لئے اُن کا وہ تمام سوز و گداز اور تمام وہ حالتِ خشوع بے بنیاد ہوتی ہے اور بسا اوقات اُن کا قدم پھسل جاتا ہے یہاں تک کہ پہلی حالت سے بھی بدتر حالت میں جا پڑتے ہیں۔ پس یہ عجیب دلچسپ مطابقت ہے کہ جیسا کہ نطفہ جسمانی وجود کا اوّل مرتبہ ہے اور جب تک رِحم کی کشش اس کی دستگیری نہ کرے وہ کچھ چیز ہی نہیں ایسا ہی حالتِ خشوع

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بیان فرمایا گیا ہے یعنی وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَوٰتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ ۝ اور یہ پانچواں درجہ جسمانی درجات کے پنجم درجہ کے مقابل پر ہوتا ہے جس کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے یعنی فَکَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا اور چھٹا درجہ جسمانی درجات کے ششم درجہ کے مقابل پر پڑا ہے جس کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے ثُمَّ اَنْشَاْنٰہُ خَلْقًا اٰخَرَ۔ منہ

رُوحانی وجود کا اوّل مرتبہ ہے اور جب تک رحیم خدا کی کشش اُس کی دستگیری نہ کرے وہ حالت خشوع کچھ بھی چیز نہیں۔ اِسی لئے ہزار ہا ایسے لوگوں کو پاؤ گے کہ اپنی عمر کے کسی حصہ میں یادِ الٰہی اور نمازمیں حالت خشوع سے لذت اُٹھاتے اور وجد کرتے اور روتے تھے اور پھر کسی ایسی لعنت نے اُن کو پکڑ لیا کہ یک مرتبہ نفسانی امور کی طرف گر گئے اور دُنیا اور دُنیا کی خواہشوں کے جذبات سے وہ تمام حالت کھو بیٹھے۔ یہ نہایت خوف کا مقام ہے کہ اکثر وہ حالت خشوع رحیمیت کے تعلق سے پہلے ہی ضائع ہو جاتی ہے اور قبل اس کے کہ رحیم خدا کی کشش اس میں کچھ کام کرے وہ حالت برباد اور نابود ہو جاتی ہے اور ایسی صورت میں وہ حالت جو رُوحانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے اُس نطفہ سے مشابہت رکھتی ہے کہ جو رِحم سے تعلق پکڑنے سے پہلے ہی ضائع ہو جاتا ہے۔ غرض رُوحانی وجود کا پہلا مرتبہ جو حالتِ خشوع ہے اور جسمانی وجود کا پہلا مرتبہ جو نطفہ ہے باہم اس بات میں تشابہ رکھتے ہیں کہ جسمانی وجود کا پہلا مرتبہ یعنے نطفہ بغیر کششِ رِحم کے ہیچ ہے اور رُوحانی وجود کا پہلا مرتبہ یعنے حالتِ خشوع بغیر جذب رحیم کے ہیچ۔ اور جیسا کہ دُنیا میں ہزار ہا نطفے تباہ ہوتے ہیں اور نطفہ ہونے کی حالت میں ہی ضائع ہو جاتے ہیں اور رِحم سے تعلق نہیں پکڑتے ایسا ہی دُنیا میں ہزار ہا خشوع کی حالتیں ایسی ہیں کہ رحیم خدا سے تعلق نہیں پکڑتیں اور ضائع جاتی ہیں۔ ہزار ہا جاہل اپنے چند روزہ خشوع اور وجد اور گریہ وزاری پر خوش ہو کر خیال کرتے ہیں کہ ہم ولی ہو گئے غوث ہو گئے قطب ہو گئے اور ابدال میں داخل ہو گئے اور خدا رسیدہ ہو گئے حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں۔ ہنوز ایک نطفہ ہے۔ ابھی تو نامِ خدا ہے غنچہ صبا تو چھو بھی نہیں گئی ہے۔ افسوس کہ انہیں خام خیالیوں سے ایک دُنیا ہلاک ہو گئی۔ اور یاد رہے کہ یہ روحانی حالت کا پہلا مرتبہ جو حالتِ خشوع ہے طرح طرح کے اسباب سے ضائع ہو سکتا ہے جیسا کہ نطفہ جو جسمانی حالت کا پہلا مرتبہ ہے انواع و اقسام کے حوادث سے تلف ہو سکتا ہے۔ منجملہ ان کے ذاتی نقص بھی ہے مثلاً اس خشوع میں کوئی مشرکانہ ملونی ہے یا کسی بدعت کی آمیزش ہے یا اَور لغویات کا ساتھ اشتراک ہے۔ مثلاً نفسانی خواہشیں اور نفسانی ناپاک جذبات بجائے خود زور مار رہے ہیں یا سفلی تعلقات نے دل کو پکڑ رکھا ہے یا جیفہ دُنیا کی لغو خواہشوں نے زیر کر دیا ہے۔ پس ان تمام ناپاک عوارض کے ساتھ حالتِ خشوع اِس لائق نہیں ٹھہرتی کہ رحیم خدا اس سے تعلق پکڑ جائے۔ جیسا کہ اُس نطفہ سے رِحم تعلق نہیں پکڑ سکتا جو اپنے اندر کسی قسم کا نقص رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہندو جوگیوں کی حالتِ خشوع اور عیسائی پادریوں کی حالتِ انکسار ان کو کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ اور گو وہ سوز و گداز میں اس قدر ترقی کریں کہ اپنے جسم کو بھی ساتھ ہی استخوان بے پوست کر دیں تب بھی رحیم خدا اُن سے تعلق نہیں کرتا کیونکہ ان کی حالتِ خشوع میں ایک ذاتی نقص ہے۔ ایسا

ہی وہ بدعتی فقیر اسلام کے جو قرآن شریف کی پیروی چھوڑ کر ہزاروں بدعات میں مبتلا ہو جاتے ہیں یہانتک کہ بھنگ، چرس اور شراب پینے سے بھی شرم نہیں آتی اور دوسرے فسق و فجور بھی ان کے لئے شِیر مادر ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ ایسی حالت رکھتے ہیں کہ رحیم خدا سے اور اس کے تعلق سے کچھ مناسبت نہیں رکھتے بلکہ رحیم خدا کے نزدیک وہ تمام حالتیں مکروہ ہیں اِس لئے وہ باوجود اپنے طور کے وجد اور رقص اور اشعار خوانی اور سرود وغیرہ کے رحیم خدا کے تعلق سے سخت بے نصیب ہوتے ہیں اور اس نطفہ کی طرح ہوتے ہیں جو آتشک کی بیماری یا جذام کے عارضہ سے جل جائے اور اس قابل نہ رہے کہ رِحم اس سے تعلق پکڑ سکے۔ پس رِحم اور رحیم کا تعلق یا عدم تعلق ایک ہی بناء پر ہے صرف رُوحانی اور جسمانی عوارض کا فرق ہے اور جیسا کہ نطفہ بعض اپنے ذاتی عوارض کی رُو سے اِس لائق نہیں رہتا کہ رِحم اُس سے تعلق پکڑ سکے اور اس کو اپنی طرف کھینچ سکے۔ ایسا ہی حالتِ خشوع جو نطفہ کے درجہ پر ہے بعض اپنے عوارضِ ذاتیہ کی وجہ سے جیسے تکبّر اور عُجب اور رِیا یا اَور کسی قِسم کی ضلالت کی وجہ سے یا شرک سے اس لائق نہیں رہتی کہ رحیم خدا اس سے تعلق پکڑ سکے۔ پس نطفہ کی طرح تمام فضیلت رُوحانی وجود کے اوّل مرتبہ کی جو حالتِ خشوع ہے رحیم خدا کے ساتھ حقیقی تعلق پیدا کرنے سے وابستہ ہے جیسا کہ تمام فضیلت نطفہ کی رِحم کے ساتھ تعلق پیدا کرنے سے وابستہ ہے۔ پس اگر اس حالتِ خشوع کو اس رحیم خدا کے ساتھ حقیقی تعلق نہیں اور نہ حقیقی تعلق پیدا ہو سکتا ہے تو وہ حالت اس گندے نطفہ کی طرح ہے جس کو رِحم کے ساتھ حقیقی تعلق پیدا نہیں ہو سکتا۔ اور یاد رکھنا چاہیئے کہ نماز اور یادِ الٰہی میں جو کبھی انسان کو حالتِ خشوع میسّر آتی ہے اور وجد اور ذوق پیدا ہو جاتا ہے یا لذّت محسوس ہوتی ہے یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس انسان کو رحیم خدا سے حقیقی تعلق ہے جیسا کہ اگر نطفہ اندامِ نہانی کے اندر داخل ہو جائے اور لذّت بھی محسوس ہو تو اس سے یہ نہیں سمجھا جاتا کہ اس نطفہ کو رِحم سے تعلق ہو گیا ہے بلکہ تعلق کے لئے علیحدہ آثار اور علامات ہیں۔ پس یادِ الٰہی میں ذوق شوق جس کو دوسرے لفظوں میں حالتِ خشوع کہتے ہیں نطفہ کی اُس حالت سے مشابہ ہے جب وہ ایک صورت انزال پکڑ کر اندامِ نہانی کے اندر گر جاتا ہے اور اس میں کیا شک ہے کہ وہ جسمانی عالَم میں ایک کمال لذّت کا وقت ہوتا ہے لیکن تاہم فقط اس قطرۂ منی کا اندر گرنا اِس بات کو مستلزم نہیں کہ رِحم سے اس نطفہ کا تعلق بھی ہو جائے اور وہ رِحم کی طرف کھینچا جائے۔ پس ایسا ہی روحانی ذوق شوق اور حالتِ خشوع اِس بات کو مستلزم نہیں کہ رحیم خدا سے ایسے شخص کا تعلق ہو جائے اور اُس کی طرف کھینچا جائے بلکہ جیسا کہ نطفہ کبھی حرام کاری کے طور پر کسی رنڈی کے اندامِ نہانی میں پڑتا ہے تو اس میں بھی وہی لذّت نطفہ ڈالنے والے کو حاصل

ہوتی ہے جیسا کہ اپنی بیوی کے ساتھ۔ پس ایسا ہی بُت پرستوں اور مخلوق پرستوں کا خشوع و خضوع اور حالتِ ذوق اور شوق رنڈی بازوں سے مشابہ ہے یعنی خشوع اور خضوع مشرکوں اور اُن لوگوں کا جو محض اغراض دنیویہ کی بناء پر خدا تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اُس نطفہ سے مشابہت رکھتا ہے جو حرام کار عورتوں کے اندامِ نہانی میں جا کر باعثِ لذّت ہوتا ہے۔ بہرحال جیسا کہ نطفہ میں تعلق پکڑنے کی استعداد ہے حالتِ خشوع میں بھی تعلق پکڑنے کی استعداد ہے مگر صرف حالتِ خشوع اور رقّت اور سوز اِس بات پر دلیل نہیں ہے کہ وہ تعلق ہو بھی گیا ہے جیسا کہ نطفہ کی صورت میں جو اس رُوحانی صورت کے مقابل پر ہی مشاہدہ کر رہا ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے صحبت کرے اور منی عورت کے اندامِ نہانی میں داخل ہوجائے اور اس کو اس فعل سے کمال لذّت حاصل ہو تو یہ لذّت اس بات پر دلالت نہیں کریگی کہ حمل ضرور ہوگیا ہے پس ایسا ہی خشوع اور سوز و گداز کی حالت گو وہ کیسی ہی لذّت اور سرور کے ساتھ ہو خدا سے تعلق پکڑنے کے لئے کوئی لازمی علامت نہیں[1] ہے۔ یعنی کسی شخص میں نماز اور یادِ الٰہی کی حالت میں خشوع اور سوز و گداز اور گریہ و زاری پیدا ہونا لازمی طور پر اِس بات کو مستلزم نہیں کہ اس شخص کو خدا سے تعلق بھی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سب حالات کسی شخص میں موجود ہوں مگر ابھی اس کو خدا تعالیٰ سے تعلق نہ ہو جیسا کہ مشاہدہ صریحہ اِس بات پر گواہ ہے کہ بہت سے لوگ پند و نصیحت کی مجلسوں اور وعظ و تذکیر کی محفلوں یا نماز اور یادِ الٰہی کی حالت میں خوب روتے اور وجد کرتے اور نعرے مارتے اور سوز و گداز ظاہر کرتے ہیں اور آنسو ان کے رخساروں پر پانی کی طرح رواں ہو جاتے ہیں بلکہ بعض کا رونا تو مُنہ پر رکھا ہوا ہوتا ہے ایک بات سُنی اور وہیں رو دیا مگر تاہم لغویات سے وہ

---

[1] ابتدائی حالت میں خشوع اور رقّت کے ساتھ ہر طرح کے لغو کام جمع ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ بچّہ میں رونے کی عادت بہت ہوتی ہے اور بات بات میں ڈر جاتا اور خشوع اور انکسار اختیار کرتا ہے مگر بایں ہمہ بچپن کے زمانہ میں طبعًا انسان بہت سے لغویات میں مبتلا ہوتا ہے اور سب سے پہلے لغو باتوں اور لغو کاموں کی طرف ہی رغبت کرتا ہے اور اکثر لغو حرکات اور لغو طور پر کُودنا اور اُچھلنا ہی اس کو پسند آتا ہے جس میں بسا اوقات اپنے جسم کو بھی کوئی صدمہ پہونچا دیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کی زندگی کی راہ میں فطرتًا پہلے لغویات ہی آتے ہیں اور بغیر اس مرتبہ کے طے کرنے کے دوسرے مرتبہ تک وہ پہنچ ہی نہیں سکتا۔ پس طبعًا پہلا زینہ بلوغ کا بچپن کے لغویات سے پرہیز کرنا ہے۔ سو اس سے ثابت ہے کہ سب سے پہلا تعلق انسانی سرشت کو لغویات سے ہی ہوتا ہے۔ منہ

کنارہ کش نہیں ہوتے اور بہت سے لغو کام اور لغو باتیں اور لغو سیر و تماشے ان کے گلے کا ہار ہو جاتے ہیں جن سے سمجھا جاتا ہے کہ کچھ بھی ان کو خدا تعالیٰ سے تعلق نہیں اور نہ خدا تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت کچھ ان کے دلوں میں ہے پس یہ عجیب تماشا ہے کہ ایسے گندے نفسوں کے ساتھ بھی خشوع اور سوز و گداز کی حالت جمع ہو جاتی ہے اور یہ عبرت کا مقام ہے اور اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مجرّد خشوع اور گریہ وزاری کہ جو بغیر ترک لغویات ہو کچھ فخر کرنے کی جگہ نہیں اور نہ یہ قُربِ الٰہی اور تعلق باللہ کی کوئی علامت ہے۔ بہت سے ایسے فقیر میں نے بچشمِ خود دیکھے ہیں اور ایسا ہی بعض دوسرے لوگ بھی دیکھنے میں آئے ہیں کہ کسی دردناک شعر کے پڑھنے یا دردناک نظارہ دیکھنے یا دردناک قصہ کے سُننے سے اس جلدی سے اُن کے آنسو گرنے شروع ہو جاتے ہیں جیسا کہ بعض بادل اِس قدر جلدی سے اپنے موٹے موٹے قطرے برساتے ہیں کہ باہر سونے والوں کو رات کے وقت فرصت نہیں دیتے کہ اپنا بستر بغیر تر ہونے کے اندر لیجا سکیں۔ لیکن مَیں اپنی ذاتی شہادت سے گواہی دیتا ہوں کہ اکثر ایسے شخص مَیں نے بڑے مکّار بلکہ دُنیاداروں سے آگے بڑھے ہوئے پائے ہیں اور بعض کو مَیں نے ایسے خبیث طبع اور بددیانت اور ہر پہلو سے بدمعاش پایا ہے کہ مجھے ان کی گریہ وزاری کی عادت اور خشوع و خضوع کی خصلت دیکھ کر اِس بات سے کراہت آتی ہے کہ کسی مجلس میں ایسی رِقّت اور سوز و گداز ظاہر کروں ہاں کسی زمانہ میں خصوصیّت کے ساتھ یہ نیک بندوں کی علامت تھی مگر اب تو اکثر یہ پیرایہ مکّاروں اور فریب دہ لوگوں کا ہو گیا ہے۔ سبز کپڑے ، بال سر کے لمبے ، ہاتھ میں تسبیح ، آنکھوں سے دمبدم آنسو جاری ، لبوں میں کچھ حرکت گویا ہر وقت ذکرِ الٰہی زبان پر جاری ہے اور ساتھ اس کے بدعت کی پابندی یہ علامتیں اپنے فقر کی ظاہر کرتے ہیں مگر دلِ مجذوم محبّتِ الٰہی سے محروم۔ اِلّا ماشاء اللہ راستباز لوگ میری اس تحریر سے مستثنٰی ہیں جن کی ہر ایک بات بطور جوش اور حال کے ہوتی ہے نہ بطور تکلّف اور قال کے۔ بہرحال یہ تو ثابت ہے کہ گریہ وزاری اور خشوع اور خضوع نیک بندوں کے لئے کوئی مخصوص علامت نہیں بلکہ یہ بھی انسان کے اندر ایک قوّت ہے جو محل اور بے محل دونوں صورتوں میں حرکت کرتی ہے۔ اِنسان بعض اوقات ایک فرضی قِصّہ پڑھتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ فرضی اور ایک ناول کی قِسم ہے مگر تاہم جب اس کے ایک دردناک موقعہ پر پہنچتا ہے تو اس کا دل اپنے قابو سے نکل جاتا ہے اور بے اختیار آنسو جاری ہوتے ہیں جو تھمتے نہیں۔ ایسے دردناک قصّے یہاں تک مؤثر پائے گئے ہیں کہ بعض وقت خود ایک انسان ایک پُرسوز قِصّہ بیان کرنا شروع کرتا ہے اور جب بیان کرتے کرتے اس کے ایک پُر درد موقعہ پر پہنچتا ہے تو آپ ہی چشمِ پُرآب ہو جاتا ہے اور اس کی آواز بھی ایک رونے والے شخص کے رنگ میں ہو جاتی ہے۔ آخر اُس کا رونا اُچھل پڑتا ہے اور جو

سُننے کے اندر ایک قسم کی سرور اور لذّت ہے وہ اس کو حاصل ہو جاتی ہے اور اس کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ جس بِناء پر وہ روتا ہے وہ بِناء ہی غلط اور ایک فرضی قصّہ ہے۔ پس کیوں اور کیا وجہ کہ ایسا ہوتا ہے۔ اس کی یہی وجہ ہے کہ سوز و گداز اور گریہ و زاری کی قوّت جو انسان کے اندر موجود ہے۔ اس کو ایک واقعہ کی صحیح یا غلط ہونے سے کچھ کام نہیں بلکہ جب اس کے لئے ایسے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں جو اس قوّت کو حرکت دینے کے قابل ہوتے ہیں تو خواہ نخواہ وہ رِقّت حرکت میں آجاتی ہے اور ایک قِسم کا سرور اور لذّت ایسے انسان کو پہونچ جاتا ہے گو وہ مومن ہو یا کافر۔ اِسی وجہ سے غیر مشروع مجالس میں بھی جو طرح طرح کی بِدعات پر مشتمل ہوتی ہیں بے قید لوگ جو فقیروں کے لباس میں اپنے تئیں ظاہر کرتے ہیں مختلف قِسم کی کافیوں اور شعروں کے سُننے اور سرود کی تاثیر سے رقص اور وجد اور گریہ و زاری شروع کر دیتے ہیں اور اپنے رنگ میں لذّت اُٹھاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ ہم خدا کو مل گئے ہیں مگر یہ لذّت اس لذّت سے مشابہ ہے جو ایک زانی کو حرام کار عورت سے ہوتی ہے۔

اور پھر ایک اَور مشابہت خشوع اور نُطفہ میں ہے اور وہ یہ کہ جب ایک شخص کا نُطفہ اسکی بیوی یا کسی اَور عورت کے اندر داخل ہوتا ہے تو اس نطفہ کا اندامِ نہانی کے اندر داخل ہونا اور انزال کی صورت پکڑ کر رواں ہو جانا بعینہٖ رونے کی صورت پر ہوتا ہے جیسا کہ خشوع کی حالت کا نتیجہ بھی رونا ہی ہوتا ہے۔ اور جیسے بے اختیار نطفہ اُچھل کر صورتِ انزال اختیار کرتا ہے یہی صورت کمالِ خشوع کے وقت میں رونے کی ہوتی ہے کہ رونا آنکھوں سے اُچھلتا ہے۔ اور جیسی انزال کی لذّت کبھی حلال طور پر ہوتی ہے جبکہ اپنی بیوی سے انسان صُحبت کرتا ہے اور کبھی حرام طور پر جبکہ انسان کسی حرام کار عورت سے صحبت کرتا ہے یہی صورت خشوع اور سوز و گداز اور گریہ زاری کی ہے یعنی کبھی خشوع اور سوز و گداز محض خدائے واحد لاشریک کے لئے ہوتا ہے جس کے ساتھ کسی بدعت اور شرک کا رنگ نہیں ہوتا۔ پس وہ لذّت سوز و گداز کی ایک لذّت حلال ہوتی ہے مگر کبھی خشوع اور سوز و گداز اور اس کی لذّت بدعات کی آمیزش سے یا مخلوق کی پرستش اور بُتوں اور دیویوں کی پُوجا میں بھی حاصل ہوتی ہے مگر وہ لذّت حرام کاری کے جماع سے مشابہ ہوتی ہے۔ غرض مجرّد خشوع اور سوز و گداز اور گریہ و زاری اور اس کی لذّتیں تعلق باللہ کو مستلزم نہیں بلکہ جیسا کہ بہت سے ایسے نطفے ہیں جو ضائع ہو جاتے ہیں اور رِحم ان کو قبول نہیں کرتا ایسا ہی بہت سے خشوع اور تضرّع اور زاری ہیں جو محض آنکھوں کو کھونا ہے اور رحیم خدا ان کو قبول نہیں کرتا۔ غرض حالتِ

خشوع کو جو رُوحانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے نطفہ ہونے کی حالت سے جو جسمانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے ایک کُھلی کُھلی مشابہت ہے جس کو ہم تفصیل سے لکھ چکے ہیں اور یہ مشابہت کوئی معمولی امر نہیں ہے بلکہ صانع قدیم جلّ شانہٗ کے خاص ارادہ سے ان دونوں میں اکمل اور اتم مشابہت ہے یہاں تک کہ خدا تعالیٰ کی کتاب میں بھی لکھا گیا ہے کہ دوسرے جہان میں بھی یہ دونوں لذّتیں ہوں گی مگر مشابہت میں اِس قدر ترقی کر جائیں گی کہ ایک ہی ہو جائیں گی یعنی اِس جہان میں جو ایک شخص اپنی بیوی سے محبّت اور اختلاط کرے گا وہ اِس بات میں فرق نہیں کر سکے گا کہ وہ اپنی بیوی سے محبّت اور اختلاط کرتا ہے یا محبّتِ الٰہیہ کے دریائے بے پایاں میں غرق ہے اور مواصلانِ حضرتِ عزّت پر اسی جہان میں یہ کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو اہلِ دُنیا اور محجوبوں کے لئے ایک امرِ فوق الفہم ہے۔

اب ہم یہ تو بیان کر چکے کہ رُوحانی وجود کا پہلا مرتبہ جو حالتِ خشوع ہے جسمانی وجود کے پہلے مرتبہ سے جو نطفہ ہے مشابہتِ تام رکھتا ہے۔ اس کے بعد یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ رُوحانی وجود کا دوسرا مرتبہ بھی جسمانی وجود کے دوسرے مرتبہ سے مشابہ اور مماثل ہے اس کی تفصیل یہ ہے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ روحانی وجود کا دوسرا مرتبہ وہ ہے جو اس آیتِ کریمہ میں بیان فرمایا گیا ہے یعنی وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ یعنی مومن وہ ہیں جو لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو حرکتوں اور لغو مجلسوں اور لغو صحبتوں اور لغو تعلّقات سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور اس کے مقابل پر جسمانی وجود کا دوسرا مرتبہ وہ ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اپنے کلامِ عزیز میں عَلَقَہ کے نام سے موسوم فرمایا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً یعنے پھر ہم نے نطفہ کو علقہ بنایا۔ یعنے ہم نے اس کو لغو طور پر ضائع ہونے سے بچا کر رِحم کی تاثیر اور تعلق سے علقہ بنا دیا۔ اِس سے پہلے وہ معرضِ خطر میں تھا اور کچھ معلوم نہ تھا کہ وہ انسانی وجود بنے یا ضائع جائے لیکن وہ رِحم کے تعلق کے بعد ضائع ہونے سے محفوظ ہو گیا اور اس میں ایک تغیّر پیدا ہو گیا جو پہلے نہ تھا یعنے وہ ایک جمے ہوئے خون کی صورت میں ہو گیا اور قوام بھی غلیظ ہو گیا اور رِحم سے اس کا ایک علاقہ ہو گیا اِس لئے اس کا نام علقہ رکھا گیا اور ایسی عورت حاملہ کہلانے کی مستحق ہو گئی اور بوجہ اس علاقہ کے رِحم اس کا سرپرست بن گیا اور اس کے زیرِ سایہ نطفہ کا نشوونما ہونے لگا مگر اس حالت میں نطفہ نے کچھ زیادہ پاکیزگی حاصل نہیں کی صرف ایک خون جما ہوا بن گیا اور رِحم کے تعلق کی وجہ سے ضائع ہونے سے بچ گیا اور جس طرح اور صورتوں میں ایک نطفہ لغو طور پر پھیلتا اور بیہودہ طور پر اندر سے بہ نکلتا اور کپڑوں کو پلید کرتا تھا اب اس تعلق کی وجہ سے بیکار جانے سے محفوظ رہ گیا لیکن ہنوز وہ ایک جما ہوا خون تھا جس نے ابھی نجاستِ

خفیفہ کی آلودگی سے پاکی حاصل نہیں کی تھی۔ اگر رِحم سے یہ تعلق اس کا پیدا نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ وہ اندامِ نہانی میں داخل ہو کر بھی رِحم میں قرار نہ پاسکتا اور باہر کی طرف بہ جاتا مگر رِحم کی قوتِ مدبّرہ نے اپنے خاص جذب سے اُس کو تھام لیا اور پھر ایک جمے ہوئے خون کی شکل پر بنا دیا تب جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس تعلق کے وجہ سے عَلَقَہ کہلایا اور اس سے پہلے رِحم نے اس پر کوئی اپنا خاص اثر ظاہر نہیں کیا تھا اور اسی اثر نے اس کو ضائع ہونے سے روکا اور اسی اثر سے نطفہ کی طرح اس میں رِقّت بھی باقی نہ رہی یعنی اس کا قوام رکیک اور پتلا نہ رہا بلکہ کسی قدر گاڑھا ہو گیا۔

اور اِس عَلَقَہ کے مقابل پر جو جسمانی وجود کا دوسرا مرتبہ ہے رُوحانی وجود کا دوسرا مرتبہ وہ ہے جس کا ابھی ہم اُوپر ذکر کر چکے ہیں جس کی طرف قرآن شریف کی یہ آیت اشارہ کرتی ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ؁ یعنے رہائی یافتہ مومن وہ لوگ ہیں جو لغو کاموں اور لغو باتوں اور لغو حرکتوں اور لغو مجلسوں اور لغو صحبتوں سے اور لغو تعلقات سے اور لغو جوشوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور ایمان ان کا اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ اس قدر کنارہ کشی ان پر سہل ہو جاتی ہے کیونکہ بوجہ ترقی ایمان کے کسی قدر تعلق ان کا خدائے رحیم سے ہو جاتا ہے جیسا کہ علقہ ہونے کی حالت میں جب نطفہ کا تعلق کسی قدر رحم سے ہو جاتا ہے تو وہ لغو طور پر گر جانے یا بہ جانے یا اَور طور پر ضائع ہو جانے سے امن میں آجاتا ہے اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہ۔ سو رُوحانی وجود کے اس مرتبہ دوم میں خدائے رحیم سے تعلق بعینہٖ اُس تعلق سے مشابہ ہوتا ہے جو جسمانی وجود کے دوسرے مرتبہ پر علقہ کو رحم سے تعلق ہو جاتا ہے اور جیسا کہ قبل ظہور دوسرے مرتبہ وجود روحانی کے لغو تعلقات اور لغو شغلوں سے رہائی پانا غیر ممکن ہوتا ہے اور صرف وجود روحانی کا پہلا مرتبہ یعنے خشوع اور عجز و نیاز کی حالت اکثر برباد بھی چلی جاتی ہے اور انجام بد ہوتا ہے ایسا ہی نطفہ بھی جو جسمانی وجود کا پہلا مرتبہ ہے علقہ بننے کی حالت سے پہلے بسا اوقات صدہا مرتبہ لغو طور پر ضائع ہو جاتا ہے۔ پھر جب ارادۂ الٰہی اس بات کے متعلق ہوتا ہے کہ لغو طور پر ضائع ہونے سے اس کو بچائے تو اُس کے امر اور اِذن سے وہی نطفہ رحِم میں علقہ بن جاتا ہے تب وہ وجودِ جسمانی کا دوسرا مرتبہ کہلاتا ہے۔ غرض دوسرا مرتبہ رُوحانی وجود کا جو تمام لغو باتوں اور لغو کاموں سے پرہیز کرنا اور لغو باتوں اور لغو تعلقات اور لغو جوشوں سے کنارہ کش ہونا ہے۔ یہ مرتبہ بھی اسی وقت میسّر آتا ہے جب خدائے رحیم سے انسان کا تعلق پیدا ہو جائے کیونکہ یہ تعلق میں ہی طاقت اور قوت ہے کہ دوسرے تعلق کو توڑتا ہے اور ضائع ہونے سے بچاتا ہے اور گو انسان کو اپنی نماز میں حالتِ خشوع میسّر آجائے جو روحانی وجود کا پہلا مرتبہ

ہے۔ پھر بھی وہ خشوع لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو جوشوں سے روک نہیں سکتا جب تک کہ خدا سے وہ تعلق نہ ہو جو روحانی وجود کے دوسرے مرتبہ پر ہوتا ہے۔ اس کی ایسی ہی مثال ہے کہ گو ایک انسان اپنی بیوی سے ہر روز کئی دفعہ صحبت کرے تاہم وہ نطفہ ضائع ہونے سے رُک نہیں سکتا جب تک کہ رِحم سے اس کا تعلق پیدا نہ ہو جائے۔

پس خدا تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ اس کے یہی معنے ہیں کہ مومن وہی ہیں جو لغو تعلقات سے اپنے تئیں الگ کرتے ہیں اور لغو تعلقات سے اپنے تئیں الگ کرنا خدا تعالیٰ کے تعلق کا موجب ہے۔* گویا لغو باتوں سے دِل کو چھڑانا خدا سے دل کو لگا لینا ہے کیونکہ انسان تعبد ابدی کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور طبعی طور پر اس کے دل میں خدا تعالیٰ کی محبت موجود ہے پس اسی وجہ سے اِنسان کی رُوح کو خدا تعالیٰ سے ایک تعلق ازلی ہے جیسا کہ آیت اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى سے ظاہر ہوتا ہے اور وہ تعلق جو انسان کو رحیمیت کے پرتَو کے نیچے آکر یعنی عبادات کے ذریعہ سے خدا تعالیٰ سے حاصل ہوتا ہے جس تعلق کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ خدا پر ایمان لاکر ہر ایک لغو بات اور لغو کام اور لغو مجلس اور لغو حرکت اور لغو تعلق اور لغو جوش سے کنارہ کشی کی جائے۔ وہ اسی ازلی تعلق کو ممکن قوت سے حیزِ فعل میں لاتا ہے کوئی نئی بات نہیں ہے اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں انسان کے

---

* لغو تعلقات سے الگ ہونا خدا تعالیٰ کے تعلق کا اِس لئے موجب ہے کہ خدا تعالیٰ نے انہیں آیات میں اَفْلَحَ کے لفظ کے ساتھ وعدہ فرمایا ہے کہ جو شخص خدا کی طلب میں کوئی کام کرے گا وہ بقدر محنت کشی اور بقدر اپنی سعی کے خدا کو پائے گا اور اس سے تعلق پیدا کرے گا۔ پس جو شخص خدا کا تعلق حاصل کرنے کے لئے لغو کام چھوڑتا ہے اس کو اس وعدہ کے موافق جو لفظ اَفْلَحَ میں ہے ایک خفیف سا تعلق خدا تعالیٰ سے ہو جاتا ہے کیونکہ جو اس نے کام کیا ہے وہ بھی بڑا بھاری کام نہیں صرف ایک خفیف تعلق کو جو اس کو لغویات سے تھا چھوڑ دیا ہے اور یاد رہے کہ جیسا کہ لفظ اَفْلَحَ اوّل آیت میں موجود ہے یعنی اس آیت میں کہ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ۝ یہی لفظ عطف کے طور پر تمام آئندہ آیتوں سے وعدہ کے طور پر متعلق ہے۔ پس یہ آیت کہ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ یہ یہی معنے رکھتی ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ اور افلاح یعنی اَفْلَحَ کا لفظ ہر یک مرتبہ ایمان پر ایک خاص معنے رکھتا ہے اور ایک خاص تعلق کا وعدہ دیتا ہے۔ منہ۔

رُوحانی وجود کا پہلا مرتبہ جو نماز اور یادِ الٰہی میں حالتِ خشوع اور رِقّت اور سوز و گداز ہے یہ مرتبہ اپنی ذات میں صرف اطلاق کی حیثیت رکھتا ہے یعنی نفسِ خشوع کے لئے یہ لازمی امر نہیں ہے کہ ترکِ لغویات بھی ساتھ ہی ہو یا اس سے بڑھ کر کوئی اخلاقِ فاضلہ اور عاداتِ مہذّبہ ساتھ ہوں بلکہ ممکن ہے کہ جو شخص نماز میں خشوع اور رِقّت و سوز اور گریہ وزاری اختیار کرتا ہے خواہ اس قدر کہ دوسرے پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے ہنوز لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو حرکتوں اور لغو مجلسوں اور لغو تعلقوں اور لغو نفسانی جوشوں سے اس کا دل پاک نہ ہو یعنی ممکن ہے کہ ہنوز معاصی سے اس کو رستگاری نہ ہو کیونکہ خشوع کی حالت کا کبھی کبھی دل پر وارد ہونا یا نماز میں ذوق اور سرور حاصل ہونا یہ اَور چیز ہے اور طہارتِ نفس اَور چیز۔ اور گو کسی سالک کا خشوع اور عجز و نیاز اور سوز و گداز بدعت اور شرک کی آمیزش سے پاک بھی ہو تاہم ایسا آدمی جس کا وجودِ رُوحانی ابھی مرتبہ دوم تک نہیں پہنچا ابھی صرف قبلۂ رُوحانی کا قصد کر رہا ہے اور کوہستان اور بحرِ عظیم پُر طوفان اور درندگان دشمنِ ایمان و دشمنِ جان قدم قدم پر بیٹھے ہیں تاوقتیکہ وجودِ رُوحانی کے دوسرے مرتبہ تک نہ پہنچ جائے۔

یاد رہے کہ خشوع اور عجز و نیاز کی حالت کو یہ بات ہرگز لازم نہیں ہے کہ خدا سے سچا تعلق ہو جائے بلکہ بسا اوقات شریر لوگوں کو بھی نمونہ قہرِ الٰہی دیکھ کر خشوع پیدا ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ سے اُن کو کچھ بھی تعلق نہیں ہوتا اور نہ لغو کاموں سے ابھی رہائی ہوتی ہے مثلاً وہ زلزلہ جو چار اپریل ۱۹۰۵ء کو آیا تھا اس کے آنے کے وقت لاکھوں دلوں میں ایسا خشوع اور سوز و گداز پیدا ہوا تھا کہ بجز خدا کے نام لینے اور رونے کے اَور کوئی کام نہ تھا یہاں تک کہ دہریوں کو بھی اپنا دہریہ پن بھول گیا تھا اور پھر جب وہ وقت جاتا رہا اور زمین ٹھہر گئی تو حالتِ خشوع نابود ہو گئی یہاں تک کہ مَیں نے سُنا ہے کہ بعض دہریوں نے جو اس وقت خدا کے قائل ہو گئے تھے بڑی بیحیائی اور دلیری سے کہا کہ ہمیں غلطی لگ گئی تھی کہ ہم زلزلہ کے رُعب میں آ گئے ورنہ خدا نہیں ہے۔ غرض جیسا کہ ہم بار بار لکھ چکے ہیں خشوع کی حالت کے ساتھ بہت گند جمع ہو سکتے ہیں البتہ وہ تمام آئندہ کمالات کے لئے تخم کی طرح ہے مگر اسی حالت کو کمال سمجھنا اپنے نفس کو دھوکا دینا ہے بلکہ بعد اس کے ایک اَور مرتبہ ہے جس کی تلاش مومن کو کرنی چاہیئے اور کبھی آرام نہیں لینا چاہیئے اور سُست نہیں ہونا چاہیئے جب تک وہ رتبہ حاصل نہ ہو جائے اور وہ وہی مرتبہ ہے جس کو کلامِ الٰہی نے ان الفاظ سے بیان فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ یعنے مومن صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو نماز میں خشوع اختیار کرتے اور سوز و گداز ظاہر کرتے ہیں بلکہ ان سے بڑھ کر وہ مومن ہیں کہ باوجود خشوع اور سوز و گداز

کے تمام لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو تعلقوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں اور اپنی خشوع کی حالت کو بیہودہ کاموں اور لغو باتوں کے ساتھ ملا کر ضائع اور برباد نہیں ہونے دیتے اور طبعاً تمام لغویات سے علیحدگی اختیار کرتے ہیں اور بیہودہ باتوں اور بیہودہ کاموں سے ایک کراہت ان کے دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے اور یہ اِس بات پر دلیل ہوتی ہے کہ ان کو خدا تعالیٰ سے کچھ تعلق ہو گیا ہے کیونکہ ایک طرف سے اِنسان تب ہی مُنہ پھیرتا ہے جب دوسری طرف اُس کا تعلق ہو جاتا ہے۔
پس دُنیا کی لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو سیر و تماشا اور لغو صحبتوں سے واقعی طور پر اُسی وقت اِنسان کا دِل ٹھنڈا ہوتا ہے جب دل کا خدائے رحیم سے تعلق ہو جائے اور دل پر اس کی عظمت اور ہیبت غالب آ جائے۔ ایسا ہی نطفہ بھی اسی وقت لغو طور پر ضائع ہو جانے سے محفوظ ہوتا ہے جب رِحم سے اُس کا تعلق ہو جائے اور رِحم کا اثر اُس پر غالب آ جائے۔ اور اس تعلق کے وقت نطفہ کا نام علقہ ہو جاتا ہے۔ پس اسی طرح رُوحانی وجود کا دوسرا مرتبہ بھی جو مومن کا مُعْرِضْ عَنِ اللَّغْو ہونا ہے رُوحانی طور پر علقہ ہے کیونکہ اسی مرتبہ پر مومن کے دل پر ہیبت اور عظمتِ الٰہی وارد ہو کر اُس کو لغو باتوں اور لغو کاموں سے چھوڑاتی ہے اور ہیبت اور عظمتِ الٰہی سے متاثر ہو کر ہمیشہ کے لئے لغو باتوں اور لغو کاموں کو چھوڑ دینا یہی وہ حالت ہے جس کو دوسرے لفظوں میں تعلق باللہ کہتے ہیں لیکن یہ تعلق جو صرف لغویات کے ترک کرنے کی وجہ سے خدا تعالیٰ سے ہوتا ہے یہ ایک خفیف تعلق ہے کیونکہ اس مرتبہ پر مومن صرف لغویات سے تعلق توڑتا ہے لیکن نفس کی ضروری چیزوں سے اور ایسی باتوں سے جن پر معیشت کی آسودگی کا حِصّہ ہے ابھی اُس کے دل کا تعلق ہوتا ہے اِس لئے ہنوز ایک حِصّہ پلیدی کا اُس کے اندر رہتا ہے اِسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے وجودِ رُوحانی کے اس مرتبہ کو علقہ سے مشابہت دی ہے اور علقہ خون جما ہُوا ہوتا ہے جس میں بباعث خون ہونے کے ایک حِصّہ پلیدی کا باقی ہوتا ہے اور اس مرتبہ میں یہ نقص اِس لئے رہ جاتا ہے کہ ایسے لوگ پُورے طور پر خدا تعالیٰ سے ڈرتے نہیں اور پورے طور پر ان کے دِلوں میں حضرت عزّت جلّ شانہٗ کی عظمت اور ہیبت نہیں بیٹھی اِس لئے صرف نکمّی اور لغو باتوں کے چھوڑنے پر قادر ہو سکتے ہیں نہ اور باتوں پر۔ پس ناچار اس قدر پلیدی ان کے نفوسِ ناقصہ میں رہ جاتی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ سے ایک خفیف سا تعلق پیدا کر کے لغویات سے تو کنارہ کش ہو جاتے ہیں لیکن وہ ان کاموں کو چھوڑ نہیں سکتے جن کا چھوڑنا نفس پر بہت بھاری ہے۔ یعنی وہ خدا تعالیٰ کے لئے اُن چیزوں کو چھوڑ نہیں سکتے جو نفسانی لذّات کے لئے لوازمِ ضروریہ ہیں۔ اِس بیان سے ظاہر ہے کہ محض لغویات سے مُنہ پھیرنا ایسا امر نہیں ہے جو

بہت قابلِ تحسین ہو بلکہ یہ مومن کی ایک ادنیٰ حالت ہے ہاں خشوع کی حالت سے ایک درجہ ترقی پر ہے۔

اور جسمانی وجود کے تیسرے درجہ کے مقابل پر رُوحانی وجود کا تیسرا درجہ واقع ہُوا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ جسمانی وجود کا تیسرا مرتبہ یہ ہے جو اِس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً یعنے پھر اس کے بعد ہم نے علقہ کو بوٹی بنایا۔ یہ وہ مرتبہ ہے جس میں وجود جسمانی انسان کا ناپاکی سے باہر آتا ہے اور پہلے سے اس میں کسی قدر شدّت اور صلابت بھی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ نطفہ اور خون جما ہوا جو علقہ ہے وہ دونوں ایک نجاست خفیفہ اپنے اندر رکھتے ہیں اور اپنے قوام کے رُو سے بھی بہ نسبت مضغہ کے نرم اور رقیق ہیں مگر مضغہ جو ایک گوشت کا ٹکڑا ہوتا ہے پاک حالت اپنے اندر پیدا کرتا ہے اور بہ نسبت نطفہ اور علقہ کے قوام میں بھی ایک حد تک سختی پیدا کر لیتا ہے یہی حالت رُوحانی وجود کے تیسرے درجہ کی ہے اور رُوحانی وجود کا تیسرا درجہ وہ ہے جو اِس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ اِس آیت کے معنی یہ ہیں کہ وہ مومن کہ جو پہلی دو حالتوں سے بڑھ کر قدم رکھتا ہے وہ صرف بیہودہ اور لغو باتوں سے ہی کنارہ کش نہیں ہوتا بلکہ بُخل کی پلیدی کو دُور کرنے کے لئے جو طبعًا ہر ایک انسان کے اندر ہوتی ہے زکوٰۃ بھی دیتا ہے یعنی خدا کی راہ میں ایک حصّہ اپنے مال کا خرچ کرتا ہے۔ زکوٰۃ کا نام اِسی لئے زکوٰۃ ہے کہ انسان اس کی بجا آوری سے یعنے اپنے مال کو جو اُس کو بہت پیارا ہے لِلّٰہ دینے سے بُخل کی پلیدی سے پاک ہو جاتا ہے اور جب بُخل کی پلیدی جس سے اِنسان طبعًا بہت تعلق رکھتا ہے اِنسان کے اندر سے نکل جاتی ہے تو وہ کسی حد تک پاک بن کر خدا سے جو اپنی ذات میں پاک ہے ایک مناسبت پیدا کر لیتا ہے ؎

کوئی اُس پاک سے جو دِل لگا وے ✤ کرے پاک آپ کو تب اُس کو پاوے

اور یہ مرتبہ پہلی دو حالتوں میں پایا نہیں جاتا کیونکہ صرف خشوع اور عجز و نیاز یا صرف لغو باتوں کو ترک کرنا ایسے انسان سے بھی ہو سکتا ہے جس میں ہنوز بُخل کی پلیدی موجود ہے لیکن جب انسان خدا تعالیٰ کے لئے اپنے اُس مالِ عزیز کو ترک کرتا ہے جس پر اس کی زندگی کا مدار اور معیشت کا انحصار ہے اور جو محنت اور تکلیف اور عرق ریزی سے کمایا گیا ہے تب بُخل کی پلیدی اُس کے اندر سے نکل جاتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ایمان میں بھی ایک شدّت اور صلابت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ دونوں حالتیں مذکورہ بالا جو پہلے اس سے ہوتی ہیں ان میں یہ پاکیزگی حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایک چھپی ہوئی پلیدی اُن کے اندر رہتی ہے اس میں حکمت یہی ہے کہ لغویات سے مُنہ پھیرنے میں صرف ترکِ شر ہے اور شر بھی ایسی جس کی زندگی اور

بقاء کے لئے کچھ ضرورت نہیں اور نفس پر اس کے ترک کرنے میں کوئی مشکل نہیں لیکن اپنا محنت سے کمایا ہوا مال محض خدا کی خوشنودی کے لئے دینا یہ کسبِ غیر ہے جس سے وہ نفس کی ناپاکی جو سب ناپاکیوں سے بدتر ہے یعنی بخل دُور ہوتا ہے لہٰذا یہ ایمانی حالت کا تیسرا درجہ ہے جو پہلے دو درجوں سے اشرف اور افضل ہے اور اس کے مقابل پر جسمانی وجود کے تیار ہونے میں مُضغہ کا درجہ ہے جو پہلے دو درجوں نطفہ اور علقہ سے فضیلت میں بڑھ کر ہے اور پاکی میں خصوصیت رکھتا ہے کیونکہ نطفہ اور علقہ دونوں نجاستِ خفیفہ سے مُلوث ہیں مگر مُضغہ پاک حالت میں ہے اور جس طرح رِحم میں مُضغہ کو بہ نسبت نطفہ اور علقہ کے ایک ترقی یافتہ حالت اور پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے اور بہ نسبت نطفہ اور علقہ کے رِحم سے اس کا تعلق بھی زیادہ ہو جاتا ہے اور شدت اور صلابت بھی زیادہ ہو جاتی ہے یہی حالت وجودِ رُوحانی کی مرتبہ سوم کی ہے جس کی تعریف خدا تعالیٰ نے یہ فرمائی ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ یعنے مومن وہ ہیں جو اپنے نفس کو بخل سے پاک کرنے کے لئے اپنا عزیز مال خدا کی راہ میں دیتے ہیں اور اِس فعل کو وہ آپ اپنی مرضی سے اختیار کرتے ہیں۔ پس وجودِ رُوحانی کی اِس مرتبہ سوم میں وہی تین خوبیاں پائی جاتی ہیں جو وجودِ جسمانی کے مرتبہ سوم میں یعنی مضغہ ہونے کی حالت میں پائی جاتی ہیں کیونکہ یہ حالت جو بخل سے پاک ہونے کے لئے اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرنا اور اپنی محنت سے حاصل کردہ سرمایہ محض للہ دوسرے کو دینا بہ نسبت اس حالت کے جو محض لغو باتوں اور لغو کاموں سے پرہیز کرنا ہے ایک ترقی یافتہ حالت ہے اور اس میں صریح اور بدیہی طور پر بخل کی پلیدی سے پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور خدائے رحیم سے تعلق بڑھتا ہے کیونکہ اپنے مالِ عزیز کو خدا کے لئے چھوڑنا بہ نسبت لغو باتوں کے چھوڑنے کے زیادہ تر نفس پر بھاری ہے اِس لئے اس زیادہ تکلیف اُٹھانے کے کام سے خدا سے تعلق بھی زیادہ ہو جاتا ہے اور بباعث ایک مشقت کا کام بجالانے کے ایمانی شدت اور صلابت بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔

اب اِس کے بعد رُوحانی وجود کا چوتھا درجہ وہ ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اِس آیہ کریمہ میں ذکر فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ یعنے تیسرے درجہ سے بڑھ کر مومن وہ ہیں جو اپنے تئیں نفسانی جذبات اور شہواتِ ممنوعہ سے بچاتے ہیں۔ یہ درجہ تیسرے درجہ سے اِس لئے بڑھ کر ہے کہ تیسرے درجہ کا مومن تو صرف مال کو جو اس کے نفس کو نہایت پیارا اور عزیز ہے خدا تعالےٰ کی راہ میں دیتا ہے لیکن چوتھے درجہ کا مومن وہ چیز خدا تعالیٰ کی راہ میں نثار کرتا ہے جو مال سے بھی زیادہ پیاری اور محبوب ہے یعنی شہواتِ نفسانیہ کیونکہ انسان کو اپنی شہواتِ نفسانیہ سے اِس قدر

محبت ہے کہ وہ اپنی شہوات کے پورے کرنے کے لئے اپنے مالِ عزیز کو پانی کی طرح خرچ کرتا ہے اور ہزار ہا روپیہ شہوات کے پورا کرنے کے لئے برباد کر دیتا ہے اور شہوات کے حاصل کرنے کے لئے برباد کر دیتا ہے اور شہوات کے حاصل کرنے کے لئے مال کو کچھ بھی چیز نہیں سمجھتا جیسا کہ دیکھا جاتا ہے کہ ایسے نجس طبع اور بخیل لوگ جو ایک محتاج بھوکے اور ننگے کو بباعث سخت بخل کے ایک پیسہ بھی نہیں دے سکتے شہواتِ نفسانیہ کے جوش میں بازاری عورتوں کو ہزار ہا روپیہ دے کر اپنا گھر ویران کر لیتے ہیں پس معلوم ہوا کہ سیلابِ شہوت ایسا تُند اور تیز ہے کہ بخل جیسی نجاست کو بھی بہالے جاتا ہے اس لئے یہ بدیہی امر ہے کہ بہ نسبت اس قوتِ ایمانی کے جس کے ذریعہ سے بخل دُور ہوتا ہے اور انسان اپنا عزیز مال خدا کے لئے دیتا ہے یہ قوتِ ایمانی جس کے ذریعہ سے انسان شہواتِ نفسانیہ کے طوفان سے بچتا ہے نہایت زبردست اور شیطان کا مقابلہ کرنے میں نہایت سخت اور نہایت دیرپا ہے کیونکہ اس کا کام یہ ہے کہ نفسِ امّارہ جیسے پُرانے اژدہا کو اپنے پَیروں کے نیچے کچل ڈالتی ہے اور بخل تو شہواتِ نفسانیہ کے پُورا کرنے کے جوش میں اور نیز ریا اور نمود کے وقتوں میں بھی دُور ہو سکتا ہے مگر یہ طوفان جو نفسانی شہوات کے غلبہ سے پیدا ہوتا ہے یہ نہایت سخت اور دیرپا طوفان ہے جو کسی طرح بجز رحمِ خداوندی کے دُور ہو ہی نہیں سکتا اور جس طرح جسمانی وجود کے تمام اعضا میں سے ہڈی نہایت سخت ہے اور اس کی عمر بھی بہت لمبی ہے اسی طرح اِس طوفان کے دُور کرنیوالی قوتِ ایمانی نہایت سخت اور عمر بھی لمبی رکھتی ہے تا ایسے دشمن کا دیر تک مقابلہ کرکے پامال کر سکے اور وہ بھی خدا تعالیٰ کے رحم سے کیونکہ شہواتِ نفسانیہ کا طوفان ایک ایسا ہولناک اور پُر آشوب طوفان ہے کہ بجز خاص رحم حضرت احدیت کے فرو نہیں ہو سکتا اسی وجہ سے حضرت یوسفؑ کو کہنا پڑا وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ یعنے میں اپنے نفس کو بَری نہیں کرتا نفس نہایت درجہ بدی کا حکم دینے والا ہے اور اس کے حملہ سے مخلصی غیر ممکن ہے مگر یہ کہ خود خدا تعالیٰ رحم فرما وے۔ اِس آیہ جیسا کہ فقرہ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ہے طوفانِ نوح کے ذکر کے وقت بھی اسی کے مشابہ الفاظ ہیں کیونکہ وہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ پس یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ طوفانِ شہواتِ نفسانیہ اپنی عظمت اور ہیبت میں نوح کے طوفان سے مشابہ ہے۔

اور اس درجۂ روحانی کے مقابل پر جو وجودِ روحانی کا چوتھا درجہ ہے جسمانی وجود کا درجہ چہارم ہے جس کے بارے میں قرآن شریف میں یہ آیت ہے فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا یعنے پھر ہم نے

مضغہ سے ہڈیاں بنائیں اور ظاہر ہے کہ ہڈیوں میں بہ نسبت مضغہ یعنے بوٹی کے زیادہ صلابت اور سختی پیدا ہو جاتی ہے اور نیز ہڈی بہ نسبت مضغہ کے بہت دیرپا ہے اور ہزاروں برس تک اس کا نشان رہ سکتا ہے۔ پس وجودِ روحانی کے درجہ چہارم اور وجودِ جسمانی کے درجہ چہارم مشابہت ظاہر ہے کیونکہ وجودِ روحانی کے درجہ چہارم میں بہ نسبت وجودِ رُوحانی کے درجہ سوم کے ایمانی شدّت اور صلابت زیادہ ہے اور خدائے رحیم سے تعلق بھی زیادہ۔ ایسا ہی وجودِ جسمانی کے درجہ چہارم میں جو استخوان کا پیدا ہونا ہے بہ نسبت درجہ سوم وجودِ جسمانی کے جو محض مضغہ یعنی بوٹی ہے جسمانی طور پر شدّت اور صلابت زیادہ ہے اور رحم سے تعلق بھی زیادہ۔

پھر چہارم درجہ کے بعد پانچواں درجہ وجودِ رُوحانی کا وہ ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اِس آیت کریمہ میں ذکر فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ٥ یعنے پانچویں درجہ کے مومن جو چوتھے درجہ سے بڑھ گئے ہیں وہ ہیں جو صرف اپنے نفس میں یہی کمال نہیں رکھتے جو نفسِ امّارہ کی شہوات پر غالب آگئے ہیں اور اُس کے جذبات پر ان کو فتح عظیم حاصل ہو گئی ہے بلکہ وہ حتّی الوسع خدا اور اس کے مخلوق کی تمام امانتوں اور تمام عہدوں کے ہر ایک پہلو کا لحاظ رکھ کر تقویٰ کی باریک راہوں پر قدم مارنے کی کوشش کرتے ہیں اور جہاں تک طاقت ہے اس راہ پر چلتے ہیں۔ خدا کے عہدوں سے مراد وہ ایمانی عہد ہیں جو بیعت اور ایمان لانے کے وقت مومن سے لئے جاتے ہیں جیسے شرک نہ کرنا، خونِ ناحق نہ کرنا وغیرہ۔

لفظ رٰعُوْنَ جو اِس آیۃ میں آیا ہے جس کے معنی ہیں رعایت رکھنے والے۔ یہ لفظ عرب کے محاورہ کے موافق اُس جگہ بولا جاتا ہے جہاں کوئی شخص اپنی قوت اور طاقت کے مطابق کسی امر کی باریک راہ پر چلنا اختیار کرتا ہے اور اس امر کے تمام دقایق بجا لانا چاہتا ہے اور کوئی پہلو اُس کا چھوڑنا نہیں چاہتا۔ پس اس آیۃ کا حاصل مطلب یہ ہوا کہ وہ مومن جو وجودِ رُوحانی کے پنجم درجہ پر ہیں حتّی الوسع اپنی موجودہ طاقت کے موافق تقویٰ کی باریک راہوں پر قدم مارتے ہیں اور کوئی پہلو تقویٰ کا جو امانتوں یا عہد کے متعلق ہے خالی چھوڑنا نہیں چاہتے اور سب کی رعایت رکھنا ان کا ملحوظِ نظر ہوتا ہے اور اِس بات پر خوش نہیں ہوتے کہ موٹے طور پر اپنے تئیں امین اور صادق العہد قرار دے دیں بلکہ ڈرتے رہتے ہیں کہ در پردہ ان سے کوئی خیانت ظہور پذیر نہ ہو پس طاقت کے موافق اپنے تمام معاملات میں توجّہ سے غور کرتے رہتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ اندرونی طور پر اُن میں کوئی نقص اور خرابی ہو اور اِسی رعایت کا نام دوسرے لفظوں میں تقویٰ ہے۔

خلاصہ مطلب یہ کہ وہ مومن جو وجودِ روحانی میں پنجم درجہ پر ہیں وہ اپنے معاملات میں خواہ خدا کے ساتھ ہیں خواہ مخلوق کے ساتھ بیقید اور خلیع الرّسن نہیں ہوتے بلکہ اس خوف سے کہ خدا تعالیٰ کے نزدیک کسی اعتراض کے نیچے نہ آجاویں اپنی امانتوں اور عہدوں میں دُور دُور کا خیال رکھ لیتے ہیں اور ہمیشہ اپنی امانتوں اور عہدوں کی پڑتال کرتے رہتے ہیں اور تقویٰ کی دُور بین سے اس کی اندرونی کیفیت کو دیکھتے رہتے ہیں تا ایسا نہ ہو کہ در پردہ ان کی امانتوں اور عہدوں میں کچھ فتور ہو اور جو امانتیں خدا تعالیٰ کی اُن کے پاس ہیں جیسے تمام قویٰ اور تمام اعضاء اور جان اور مال اور عزّت وغیرہ ان کو حتی الوسع اپنی پابندی تقویٰ بہت احتیاط سے اپنے اپنے محل پر استعمال کرتے رہتے ہیں اور جو عہد ایمان لانے کے وقت خدا تعالیٰ سے کیا ہے کمال صدق سے حتّی المقدور اس کے پورا کرنے کے لئے کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ایسا ہی جو امانتیں مخلوق کی اُن کے پاس ہوں یا ایسی چیزیں جو امانتوں کے حکم میں ہوں ان سب میں تا بمقدور تقویٰ کی پابندی سے کاربند ہوتے ہیں۔ اگر کوئی تنازع واقع ہو تو تقویٰ کو مدِّنظر رکھ کر اس کا فیصلہ کرتے ہیں گو اس فیصلہ میں نقصان اُٹھالیں۔ یہ درجہ چوتھے درجہ سے اِس لئے بڑھ کر ہے کہ اس میں حتی الوسع تمام اعمال میں تقویٰ کی باریک راہوں سے کام لینا پڑتا ہے اور حتی الوسع جمیع امور میں ہر ایک قدم تقویٰ کی رعایت سے اُٹھانا پڑتا ہے مگر چوتھا درجہ صرف ایک ہی موٹی بات ہے اور وہ یہ کہ زنا سے اور بدکاریوں سے پرہیز کرنا اور ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ زنا ایک بہت بے حیائی کا کام ہے اور اس کا مرتکب شہواتِ نفس سے اندھا ہو کر ایسا ناپاک کام کرتا ہے جو انسانی نسل کے حلال سِلسلہ کو حرام میں ملا دیتا ہے اور تضیع نسل کا موجب ہوتا ہے اِسی وجہ سے شریعت نے اس کو ایسا بھاری گناہ قرار دیا ہے کہ اِسی دُنیا میں ایسے انسان کے لئے حدِ شرعی مقرر ہے پس ظاہر ہے کہ مومن کی تکمیل کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ وہ زنا سے پرہیز کرے کیونکہ زنا نہایت درجہ مفسد طبع اور بے حیا اِنسانوں کا کام ہے اور یہ ایک ایسا موٹا گناہ ہے جو جاہل سے جاہل اس کو بُرا سمجھتا ہے اور اس پر بجز کسی بے ایمان کے کوئی بھی دلیری نہیں کر سکتا۔ پس اس کا ترک کرنا ایک معمولی شرافت ہے کوئی بڑے کمال کی بات نہیں لیکن اِنسان کی تمام رُوحانی خوبصورتی تقویٰ کی تمام باریک راہوں پر قدم مارنا ہے٭ تقویٰ کی باریک راہیں روحانی

٭ ایمان کے لئے خشوع کی حالت مثل بیج کے ہے اور پھر لغو باتوں کے چھوڑنے سے ایمان اپنا نرم نرم سبزہ نکالتا ہے اور پھر اپنا مال بطور زکوٰۃ دینے سے ایمانی درخت کی ٹہنیاں نکل آتی ہیں جو اس کو کسی قدر مضبوط کرتی ہیں اور پھر شہواتِ نفسانیہ کا مقابلہ کرنے سے ان ٹہنیوں میں خوب مضبوطی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

خوبصورتی کے لطیف نقوش اور خوشنما خط و خال ہیں اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی امانتوں اور ایمانی* عہدوں کی حتی الوسع رعایت کرنا اور سر سے پَیر تک جتنے قویٰ اور اعضا ہیں جن میں ظاہری طور پر آنکھیں اور کان اور ہاتھ اور پَیر اور دوسرے اعضا ہیں اور باطنی طور پر دل اور دوسری قوتیں اور اخلاق ہیں ان کو جہاں تک طاقت ہو ٹھیک ٹھیک محلِ ضرورت پر استعمال کرنا اور ناجائز مواضع سے روکنا اور اُن کے پوشیدہ حملوں سے متنبہ رہنا اور اسی کے مقابل پر حقوقِ عباد کا بھی لحاظ رکھنا یہ وہ طریق ہے جو انسان کی تمام رُوحانی خوبصورتی اس سے وابستہ ہے اور خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں تقویٰ کو لباس کے نام سے موسوم کیا ہے چنانچہ لِبَاسُ التَّقْوٰی قرآن شریف کا لفظ ہے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ رُوحانی خوبصورتی اور رُوحانی زینت تقویٰ سے ہی پیدا ہوتی ہے اور تقویٰ یہ ہے کہ انسان خدا کی تمام امانتوں اور ایمانی عہد اور ایسا ہی مخلوق کی تمام امانتوں اور عہد کی حتی الوسع رعایت رکھے یعنے ان کے دقیق در دقیق پہلوؤں پر تا بمقدور کاربند ہو جائے۔

یہ تو وجودِ رُوحانی کا پانچواں درجہ ہے اور اس کے مقابل پر جسمانی وجود کا پانچواں درجہ وہ ہے جس کا اِس آیتِ کریمہ میں ذکر ہے فَکَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا یعنے پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت مڑھ دیا اور جسمانی بناوٹ کی کسی قدر خوبصورتی دکھلا دی۔ یہ عجیب مطابقت ہے کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے ایک جگہ رُوحانی طور پر تقویٰ کو لباس قرار دیا ہے۔ ایسا ہی کَسَوْنَا کا لفظ جو کسوت سے نکلا ہے وہ بھی بتلا رہا ہے کہ جو گوشت ہڈیوں پر مڑھا جاتا ہے وہ بھی ایک لباس ہے جو ہڈیوں پر پہنایا جاتا ہے پس یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور سختی پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اپنے عہد اور امانتوں کی تمام شاخوں کی محافظت کرنے سے درخت ایمان کا اپنے مضبوط تنہ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور پھر پھل لانے کے وقت ایک اور طاقت کا فیضان اُس پر ہوتا ہے کیونکہ اس طاقت سے پہلے نہ درخت کو پھل لگ سکتا ہے نہ پھول۔ وہی طاقت رُوحانی پیدائش کے مرتبہ ششم میں خلقِ آخر کہلاتی ہے اور اسی مرتبہ ششم پر انسانی کمالات کے پھل اور پھول ظاہر ہونے شروع ہوتے ہیں اور انسانی درخت کی رُوحانی شاخیں نہ صرف مکمل ہو جاتی ہیں بلکہ اپنے پھل بھی دیتی ہیں۔ منہ

* ایمانی عہدوں سے مراد وہ عہد ہیں جو انسان بیعت اور ایمان لانے کے وقت اُن کا اقرار کرتا ہے جیسے یہ کہ وہ خون نہیں کرے گا، چوری نہیں کرے گا، جھوٹی گواہی نہیں دے گا، خدا سے کسی کو شریک نہیں ٹھہرائے گا اور اسلام اور پیروی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مرے گا۔ منہ

دونوں لفظ دلالت کر رہے ہیں کہ جیسی خوبصورتی کا لباس تقوٰی پہناتی ہے ایسا ہی وہ کسوت جو ہڈیوں پر چڑھائی جاتی ہے ہڈیوں کے لئے ایک خوبصورتی کا پیرایہ بخشتی ہے وہاں لباس کا لفظ ہے اور یہاں کسوت کا اور دونوں کے معنی ایک ہیں اور نص قرآنی باٰوازِ بلند پکار رہی ہے کہ دونوں کا مقصد خوبصورتی ہے اور جیسا کہ انسان کی رُوح پر سے اگر تقوٰے کا لباس اوتار دیا جائے تو رُوحانی بدشکلی اس کی ظاہر ہو جاتی ہے اسی طرح اگر وہ گوشت و پوست جو حکیم مطلق نے انسان کی ہڈیوں پر مڑھا ہے اگر ہڈیوں پر سے اوتار دیا جائے تو انسان کی جسمانی شکل نہایت مکروہ نکل آتی ہے مگر اس درجہ پنجم میں خواہ درجہ پنجم وجودِ جسمانی کا ہے اور خواہ درجہ پنجم وجودِ رُوحانی کا ہے کامل خوبصورتی پیدا نہیں ہوتی کیونکہ ابھی رُوح کا اُس پر فیضان نہیں ہوا۔ یہ امر مشہود و محسوس ہے کہ ایک انسان گو کیسا ہی خوبصورت ہو جب وہ مَر جاتا ہے اور اس کی رُوح اس کے اندر سے نکل جاتی ہے تو ساتھ ہی اُس حُسن میں بھی فرق آجاتا ہے جو اُس کو قدرتِ قادر نے عطا کیا تھا حالانکہ تمام اعضاء اور تمام نقوش موجود ہوتے ہیں مگر صرف ایک رُوح کے نکلنے سے انسانی قالب کا گھر ایک ویران اور سنسان سا معلوم ہوتا ہے اور آب و تاب کا نشان نہیں رہتا یہی حالت رُوحانی وجود کے پانچویں درجہ کی ہے کیونکہ یہ امر بھی مشہود و محسوس ہے کہ جب تک کسی مومن میں خدا تعالیٰ کی طرف سے رُوح کا فیضان نہ ہو جو وجودِ رُوحانی کے چھٹے درجہ پر ملتی ہے اور ایک فوق العادت طاقت اور زندگی بخشتی ہے تب تک خدا کی امانتوں کے ادا کرنے اور اُن کے ٹھیک طور پر استعمال کرنے اور صدق کے ساتھ اس کا ایمانی عہد پُورا کرنے اور ایسا ہی مخلوق کے حقوق اور عہدوں کے ادا کرنے میں وہ آب و تاب پیدا نہیں ہوتی جس کا حُسن اور خوبی دلوں کو اپنی طرف کھینچے اور جس کی ہر ایک ادا فوق العادت اور اعجاز کے رنگ میں معلوم ہو بلکہ قبل اس رُوح کے تقوٰے کے ساتھ تکلّف اور بناوٹ کی ایک ملونی رہتی ہے کیونکہ اس میں وہ رُوح نہیں ہوتی جو حُسنِ رُوحانی کی آب و تاب دکھلا سکے اور یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ ایسے مومن کا قدم جو ابھی اس رُوح سے خالی ہے پورے طور پر نیکی پر قائم نہیں رہ سکتا بلکہ جیسا کہ ایک ہوا کے دھکہ سے مُردہ کا کوئی عضو حرکت کر سکتا ہے اور جب ہوا دُور ہو جائے تو پھر مُردہ اپنی حالت پر آجاتا ہے۔ ایسا ہی وجودِ رُوحانی کے پنجم درجہ کی حالت ہوتی ہے کیونکہ صرف عارضی طور پر خدا تعالیٰ کی نسیمِ رحمت اس کو نیک کاموں کی طرف جنبش دیتی رہتی ہے اور اس طرح تقوٰے کے کام اس سے صادر ہوتے ہیں لیکن ابھی نیکی کی رُوح اس کے اندر آباد نہیں ہوتی اِس لئے وہ حُسنِ معاملہ اس میں پیدا نہیں ہوتا جو اس رُوح کے داخل ہونے کے بعد اپنا جلوہ دکھلاتا ہے۔

غرض پنجم مرتبہ وجودِ رُوحانی کا گو ایک ناقص مرتبہ حُسن تقویٰ کا حاصل کرلیتا ہے مگر کمال اس حُسن کا وجودِ رُوحانی کے درجہ ششم پر ہی ظاہر ہوتا ہے جبکہ خدا تعالیٰ کی اپنی محبتِ ذاتیہ رُوحانی وجود کے لئے ایک رُوح کی طرح ہو کر انسان کے دل پر نازل ہوتی اور تمام رُوحانی نقصانوں کا تدارک کرتی ہے اور انسان محض اپنی قوتوں کے ساتھ کبھی کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ رُوح خدا تعالیٰ کی طرف سے نازل نہ ہو جیسا کہ حافظ شیرازی نے فرمایا ہے ؎

ما بداں منزل عالی نتوانیم رسید ❊ ہاں مگر لطف تو چوں پیش نہد گامے چند

پھر درجہ پنجم کے بعد چھٹا درجہ وجودِ رُوحانی کا وہ ہے جس کو خدا تعالیٰ نے اِس آیۃ کریمہ میں ذکر فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَوٰتِھِمْ یُحَافِظُوْنَ یعنی چھٹے درجہ کے مومن جو پانچویں درجہ سے بڑھ گئے ہیں وہ ہیں جو اپنی نمازوں پر آپ محافظ اور نگہبان ہیں یعنی وہ کسی دوسرے کی تذکیر اور یاددہانی کے محتاج نہیں رہتے بلکہ کچھ ایسا تعلق ان کو خدا سے پیدا ہو گیا ہے اور خدا کی یاد کچھ اِس قسم کی محبوب طبع اور مدار آرام اور مدار زندگی ان کے لئے ہو گئی ہے کہ وہ ہر وقت اس کی نگہبانی میں لگے رہتے ہیں اور ہر دم ان کا یادِ الٰہی میں گذرتا ہے اور نہیں چاہتے کہ ایک دم بھی خدا کے ذکر سے الگ ہوں۔

اب ظاہر ہے کہ انسان اُسی چیز کی محافظت اور نگہبانی میں تمام تر کوشش کرکے ہر دم لگا رہتا ہے جس کے گم ہونے میں اپنی ہلاکت اور تباہی دیکھتا ہے جیسا کہ ایک مسافر جو ایک بیابان بے آب و دانہ میں سفر کر رہا ہے جس کے صدہا کوس تک پانی اور روٹی ملنے کی کوئی امید نہیں وہ اپنے پانی اور روٹی کی جو ساتھ رکھتا ہے بہت محافظت کرتا ہے اور اپنی جان کے برابر اُس کو سمجھتا ہے کیونکہ وہ یقین رکھتا ہے کہ اس کے ضائع ہونے میں اُس کی موت ہے۔ پس وہ لوگ جو اُس مسافر کی طرح اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں اور گو مال کا نقصان ہو یا عزت کا نقصان ہو یا نماز کی وجہ سے کوئی ناراض ہو جائے نماز کو نہیں چھوڑتے اور اس کے ضائع ہونے کے اندیشہ میں سخت بیتاب ہوتے اور پیچ و تاب کھاتے گو مر ہی جاتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ایک دم بھی یادِ الٰہی سے الگ ہوں وہ درحقیقت نماز اور یادِ الٰہی کو اپنی ایک ضروری غذا سمجھتے ہیں جس پر اُن کی زندگی کا مدار ہے اور یہ حالت اس وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب خدا تعالیٰ اُن سے محبت کرتا ہے اور اس کی محبتِ ذاتیہ کا ایک افروختہ شعلہ جس کو رُوحانی وجود کے لئے ایک رُوح کہنا چاہیئے اُن کے دل پر نازل ہوتا ہے اور ان کو حیاتِ ثانی بخش دیتا ہے اور وہ رُوح ان کے تمام وجودِ رُوحانی کو روشنی اور زندگی بخشتی ہے تب وہ نہ کسی

تکلف اور بناوٹ سے خدا کی یاد میں لگے رہتے ہیں بلکہ وہ خدا جس نے جسمانی طور پر انسان کی زندگی روٹی اور پانی پر موقوف رکھی ہے وہ ان کی رُوحانی زندگی کو جس سے وہ پیار کرتے ہیں اپنی یاد کی غذا سے وابستہ کر دیتا ہے اِس لئے وہ اس روٹی اور پانی کو جسمانی روٹی اور پانی سے زیادہ چاہتے ہیں اور اس کے ضائع ہونے سے ڈرتے ہیں اور یہ اس رُوح کا اثر ہوتا ہے جو ایک شعلہ کی طرح ان میں ڈالی جاتی ہے جس سے عشقِ الٰہی کی کامل مستی اُن میں پیدا ہو جاتی ہے اِس لئے وہ یادِ الٰہی سے ایک دم الگ ہونا نہیں چاہتے۔ وہ اس کے لئے دُکھ اُٹھاتے اور مصائب دیکھتے ہیں مگر اُس سے ایک لحظہ بھی جُدا ہونا نہیں چاہتے اور پاس انفاس کرتے ہیں اور اپنی نمازوں کے محافظ اور نگہبان رہتے ہیں اور یہ امر اُن کے لئے طبعی ہے کیونکہ درحقیقت خدا نے اپنی محبت سے بھری ہوئی یاد کو جس کو دوسرے لفظوں میں نماز کہتے ہیں ان کے لئے ایک ضروری غذا مقرر کر دیا ہے اور اپنی محبتِ ذاتیہ سے اُن پر تجلّی فرما کر یادِ الٰہی کی ایک دلکش لذّت ان کو عطا کی ہے پس اِس وجہ سے یادِ الٰہی جان کی طرح بلکہ جان سے بڑھ کر اُن کو عزیز ہو گئی ہے اور خدا کی ذاتی محبت ایک نئی رُوح ہے جو شعلہ کی طرح ان کے دلوں پر پڑتی اور اُن کی نماز اور یادِ الٰہی کو ایک غذا کی طرح اُن کے لئے بنا دیتی ہے۔ پس وہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کی زندگی روٹی اور پانی سے نہیں بلکہ نماز اور یادِ الٰہی سے جیتے ہیں۔

غرض محبت سے بھری ہوئی یادِ الٰہی جس کا نام نماز ہے وہ درحقیقت ان کی غذا ہو جاتی ہے جسکے بغیر وہ جی ہی نہیں سکتے اور جس کی محافظت اور نگہبانی بعینہٖ اس مسافر کی طرح وہ کرتے رہتے ہیں جو ایک دشت بے آب و دانہ میں اپنی چند روٹیوں کی محافظت کرتا ہے جو اس کے پاس ہیں اور اپنے کسی قدر پانی کو جان کے ساتھ رکھتا ہے جو اس کی مشک میں ہے۔ واہب مطلق نے انسان کی روحانی ترقیات کے لئے یہ بھی ایک مرتبہ رکھا ہوا ہے جو محبتِ ذاتی اور عشق کے غلبہ اور استیلاء کا آخری مرتبہ ہے اور درحقیقت اس مرتبہ پر انسان کے لئے محبت سے بھری ہوئی یادِ الٰہی جس کا شرعی اصطلاح میں نماز نام ہے غذا کے قائم مقام ہو جاتی ہے بلکہ وہ بار بار جسمانی رُوح کو بھی اِس غذا پر فدا کرنا چاہتا ہے وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا جیسا کہ مچھلی بغیر پانی کے زندہ نہیں رہ سکتی اور خدا سے علیحدہ ایک دم بھی بسر کرنا اپنی موت سمجھتا ہے اور اس کی رُوح آستانۂ الٰہی پر ہر وقت سجدہ میں رہتی ہے اور تمام آرام اُس کا خدا ہی میں ہو جاتا ہے اور اُس کو یقین ہوتا ہے کہ مَیں اگر ایک طرفۃ العین بھی یادِ الٰہی سے الگ ہؤا تو بس مَیں مرا۔ اور جس طرح روٹی سے جسم میں تازگی اور آنکھ اور کان وغیرہ اعضاء کی قوتوں میں توانائی آجاتی ہے اِسی طرح اس مرتبہ پر یادِ الٰہی جو عشق اور محبت

کے جوش سے ہوتی ہے مومن کی رُوحانی قوتوں کو ترقی دیتی ہے یعنے آنکھ میں قوتِ کشف نہایت صاف اور لطیف طور پر پیدا ہو جاتی ہے اور کان خدا تعالیٰ کے کلام کو سُنتے ہیں اور زبان پر وہ کلام نہایت لذیذ اور اجلیٰ اور اصفیٰ طور پر جاری ہو جاتا ہے اور رؤیاءِ صادقہ بکثرت ہوتے ہیں[1] جو فلق صبح کی طرح ظہور میں آجاتے ہیں اور بباعث علاقہ صافیہ محبت جو حضرتِ عزت سے ہوتا ہے مبشر خوابوں سے بہت سا حصّہ اُن کو ملتا ہے یہی وہ مرتبہ ہے جس مرتبہ پر مومن کو محسوس ہوتا ہے کہ خدا کی محبت اس کے لئے روٹی اور پانی کا کام دیتی ہے۔ یہ نئی پیدائش اس وقت ہوتی ہے جب پہلے روحانی قالب تمام تیار ہو چکتا ہے اور پھر وہ رُوح جو محبتِ ذاتیہ الٰہیہ کا ایک شعلہ ہے ایسے مومن کے دِل پر آپڑتا ہے اور یک دفعہ طاقت بالا نشیمن بشریت سے بلند تر اس کو لے جاتی ہے اور یہ مرتبہ وہ ہے جس کو رُوحانی طور پر خلق آخر کہتے ہیں۔ اس مرتبہ پر خدا تعالیٰ اپنی ذاتی محبت کا ایک افروختہ شعلہ

---

[1] بہت سے نادان اس وہم میں گرفتار ہیں کہ ہمیں بھی بعض اوقات سچی خواب آجاتی ہے یا سچا الہام ہو جاتا ہے تو ہم میں اور ایسے اعلیٰ مرتبہ کے لوگوں میں فرق کیا ہوا اور ان عالی مرتبہ لوگوں کی کیا خصوصیت باقی رہی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اِس قدر طاقت خواب دیکھنے یا الہام کی اس غرض سے عام لوگوں کی فطرت رکھی گئی ہے کہ تا اُن کے پاس بھی اُن باریک باتوں کا کسی قدر نمونہ ہو جو اس جہان سے وراء الوراء باتیں ہیں اور اس طرح پر وہ اپنے پاس ایک نمونہ دیکھ کر دولت قبول سے محروم نہ رہیں اور اُن پر اتمامِ حجت ہو جائے ورنہ اگر انسانوں کی یہ حالت ہوتی کہ وحی اور رؤیا صادقہ کی حقیقت سے وہ بالکل بے خبر ہوتے تو بجز انکار کے کیا کر سکتے تھے اور اس حالت میں کسی قدر معذور تھے۔ پھر جبکہ باوجود موجود ہوتے اس نمونہ کے زمانۂ حال کے فلسفی اب تک وحی اور رؤیائے صادقہ کا انکار کرتے ہیں تو اس وقت عام لوگوں کا کیا حال ہوتا جبکہ ان کے پاس کوئی بھی نمونہ نہ ہوتا اور یہ خیال کہ ہمیں بھی بعض اوقات سچی خوابیں آجاتی ہیں یا کوئی سچے الہام ہو جاتے ہیں اس سے رسولوں اور نبیوں کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا کیونکہ ایسے لوگوں کے رؤیا اور الہام شکوک اور شبہات کے دخان سے خالی نہیں ہوتے اور بایں ہمہ مقدار میں بھی کم ہوتے ہیں۔ پس جیسا کہ ایک مفلس ایک پیسہ کے ساتھ ایک بادشاہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہیں کہہ سکتا کہ میرے پاس بھی مال ہے اور اس کے پاس بھی ایسا ہی یہ مقابلہ بھی ہیچ اور سراسر حماقت ہے۔ منہ

جس کو دوسرے لفظوں میں رُوح کہتے ہیں مومن کے دل پر نازل کرتا ہے اور اس سے تمام تاریکیوں اور آلایشوں اور کمزوریوں کو دُور کر دیتا ہے اور اُس رُوح کے پھونکنے کے ساتھ ہی وہ حُسن جو ادنیٰ مرتبہ پر تھا کمال کو پہنچ جاتا ہے اور ایک رُوحانی آب و تاب پیدا ہو جاتی ہے اور گندی زندگی کی کبودگی بکلّی دُور ہو جاتی ہے اور مومن اپنے اندر محسوس کر لیتا ہے کہ ایک نئی رُوح اُس کے اندر داخل ہو گئی ہے جو پہلے نہیں تھی۔ اس رُوح کے ملنے سے ایک عجیب سکینت اور اطمینان مومن کو حاصل ہو جاتی ہے اور محبّتِ ذاتیہ ایک فوّارہ کی طرح جوش مارتی اور عبودیت کے پودہ کی آبپاشی کرتی ہے اور وہ آگ جو پہلے ایک معمولی گرمی کی حد تک تھی اس درجہ پر وہ تمام و کمال افروختہ ہو جاتی ہے اور انسانی وجود کے تمام خس و خاشاک کو جلا کر اُلوہیت کا قبضہ اس پر کر دیتی ہے اور وہ آگ تمام اعضاء پر احاطہ کر لیتی ہے تب اُس لوہے کی مانند جو نہایت درجہ آگ میں تپایا جائے یہاں تک کہ سُرخ ہو جائے اور آگ کے رنگ پر ہو جائے اس مومن سے اُلوہیت کے آثار اور افعال ظاہر ہوتے ہیں جیسا کہ لوہا بھی اس درجہ پر آگ کے آثار اور افعال ظاہر کرتا ہے مگر یہ نہیں کہ وہ مومن خدا ہو گیا ہے بلکہ محبّتِ الٰہیہ کا کچھ ایسا ہی خاصّہ ہے جو اپنے رنگ میں ظاہر وجود کو لے آتی ہے اور باطن میں عبودیّت اور اُس کا ضعف موجود ہوتا ہے۔ اس درجہ پر مومن کی روٹی خدا ہوتا ہے جس کے کھانے پر اُس کی زندگی موقوف ہے اور مومن کا پانی بھی خدا ہوتا ہے جس کے پینے سے وہ موت سے بچ جاتا ہے اور اس کی ٹھنڈی ہَوا بھی خدا ہی ہوتا ہے جس سے اس کے دِل کو راحت پہنچتی ہے اور اس مقام پر استعارہ کے رنگ میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ خدا اس مرتبہ کے مومن کے اندر داخل ہوتا اور اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کرتا اور اس کے دل کو اپنا تخت گاہ بنا لیتا ہے تب وہ اپنے رُوح سے نہیں بلکہ خدا کے رُوح سے دیکھتا اور خدا کی رُوح سے سُنتا اور خدا کی رُوح سے بولتا اور خدا کی رُوح سے چلتا اور خدا کی رُوح سے دشمنوں پر حملہ کرتا ہے کیونکہ وہ اس مرتبہ پر نیستی اور استہلاک کے مقام میں ہوتا ہے اور خدا کی رُوح اس پر اپنی محبّتِ ذاتیہ کے ساتھ تجلّی فرما کر حیاتِ ثانی اس کو بخشتی ہے۔ پس اس وقت روحانی طور پر اس پر یہ آیۃ صادق آتی ہے ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

یہ تو وجودِ رُوحانی کا مرتبہ ششم ہے جس کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے اور اس کے مقابل پر جسمانی پیدائش کا مرتبہ ششم ہے اور اس جسمانی مرتبہ کے لئے بھی وہی آیۃ ہے جو رُوحانی مرتبہ کے لئے اُوپر ذکر ہو چکی ہے یعنے ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ جب

ہم ایک پیدائش کو تیار کر چکے تو بعد اس کے ہم نے ایک اَور پیدائش سے انسان کو پیدا کیا۔ اَور کے لفظ سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ وہ ایسی فوق الفہم پیدائش ہے جس کا سمجھنا انسان کی عقل سے بالاتر ہے اور اس کے فہم سے بہت دُور یعنے رُوح جو قالب کی تیاری کے بعد جسم میں ڈالی جاتی ہے وہ ہم نے انسان میں رُوحانی اور جسمانی دونوں طور پر ڈال دی جو مجہول الکنہ ہے اور جس کی نسبت تمام فلسفی اور اس مادی دُنیا کے تمام مقلد حیران ہیں کہ وہ کیا چیز ہے اور جب کہ حقیقت تک ان کو راہ نہ ملی تو اپنی اٹکل سے ہر ایک نے تُکیں لگائیں کسی نے روح کے وجود سے ہی انکار کیا اور کسی نے اس کو قدیم اور غیر مخلوق سمجھا۔ پس اللہ تعالیٰ اِس جگہ فرماتا ہے کہ "روح بھی خدا کی پیدائش ہے مگر دُنیا کے فہم سے بالاتر ہے اور جیسا کہ اس دُنیا کے فلاسفر اس روح سے بے خبر ہیں جو وجود جسمانی کے چھٹے مرتبہ پر خدا تعالیٰ کی طرف سے جسم پر فائض ہوتی ہے ویسا ہی وہ لوگ اِس رُوح سے بھی بے علم رہے کہ جو وجودِ روحانی کے چھٹے مرتبہ پر مومن صادق کو خدا تعالیٰ سے ملتی ہے اور اس بارے میں بھی مختلف راہیں اختیار کیں۔ بہتوں نے ایسے لوگوں کی پُوجا شروع کر دی جن کو وہ رُوح بھی دی گئی تھی اور ان کو قدیم اور غیر مخلوق اور خدا سمجھ لیا اور بہتوں نے اس سے انکار کر دیا کہ اس مرتبہ کے لوگ بھی ہوتے ہیں اور ایسی رُوح بھی انسان کو ملتی ہے۔

لیکن اِس بات کو بہت جلد ایک عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ جبکہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور خدا نے زمین کے تمام پرند و چرند پر اس کو بزرگی دے کر اور سب پر حکومت بخش کر اور عقل و فہم عنایت فرما کر اور اپنی معرفت کی ایک پیاس لگا کر اپنے ان تمام افعال سے جتلا دیا ہے کہ انسان خدا کی محبت اور عشق کے لئے پیدا کیا گیا ہے تو پھر اس سے کیوں انکار کیا جائے کہ انسان محبتِ ذاتیہ کے مقام تک پہنچ کر اس درجہ تک پہنچ جائے کہ اس کی محبت پر خدا کی محبت ایک روح کی طرح وارد ہو کر تمام کمزوریاں اس کی دُور کر دے اور جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے وجودِ روحانی کے ششم مرتبہ کے بارے میں فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ایسا ہی دائمی حضور اور سوز و گداز اور عبودیت انسان سے سرزد ہو اور اس طرح پر وہ اپنے وجود کی علتِ غائی کو پورا کرے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ یعنے مَیں نے پرستش کے لئے ہی جن و انس کو پیدا کیا ہے ہاں یہ پرستش اور حضرت عزت کے سامنے دائمی حضور کے ساتھ کھڑا ہونا بجز محبتِ ذاتیہ کے ممکن نہیں اور محبت سے مراد یک طرفہ محبت نہیں بلکہ خالق اور مخلوق کی دونوں محبتیں مراد ہیں تا بجلی کی آگ کی طرح جو مرنے والے انسان پر گرتی ہے اور جو اُس وقت اس انسان کے اندر سے نکلتی ہے بشریت کی کمزوریوں کو جلا دیں

اور دونوں مل کر تمام رُوحانی وجود پر قبضہ کرلیں۔

یہی وہ کامل صورت ہے جس میں انسان ان امانتوں اور عہد کو جن کا ذکر وجودِ روحانی کے مرتبہ پنجم میں تحریر ہے کامل طور پر اپنے اپنے موقع پر ادا کرسکتا ہے صرف فرق یہ ہے کہ مرتبہ پنجم میں انسان صرف تقوٰے کے لحاظ سے خدا اور مخلوق کی امانتوں اور عہد کا لحاظ رکھتا ہے اور اس مرتبہ پر محبتِ ذاتی کے تقاضا سے جو خدا کے ساتھ اس کو ہوگئی ہے جس کی وجہ سے خدا کی مخلوق کی محبت بھی اس میں جوش زن ہوگئی ہے اور اس رُوح کے تقاضا سے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے اس پر نازل ہوتی ہے ان تمام حقوق کو طبعًا بوجہ احسن ادا کرتا ہے اور اس صورت میں وہ حُسنِ باطنی جو حُسنِ ظاہری کے مقابل پر ہے بوجہ احسن اس کو نصیب ہوجاتا ہے کیونکہ وجودِ روحانی کے مرتبہ پنجم میں تو ابھی وہ رُوح انسان میں داخل نہیں ہوئی تھی جو محبتِ ذاتیہ سے پیدا ہوتی ہے اِس لئے جلوۂ حُسن بھی ابھی کمال پر نہیں تھا مگر رُوح کے داخل ہونے کے بعد وہ حُسن کمال کو پہنچ جاتا ہے ظاہر ہے کہ مُردہ خوبصورت اور زندہ خوبصورت یکساں آب و تاب نہیں رکھتے۔

جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں انسان کی پیدائش میں دو قسم کے حُسن ہیں ایک حُسن معاملہ اور وہ یہ کہ انسان خدا تعالیٰ کی تمام امانتوں اور عہد کے ادا کرنے میں یہ رعایت رکھے کہ کوئی امر حتّی الوسع انکے متعلق فوت نہ ہو جیسا کہ خدا تعالیٰ کے کلام میں رَاعُوْنَ کا لفظ اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایسا ہی لازم ہے کہ انسان مخلوق کی امانتوں اور عہد کی نسبت بھی یہی لحاظ رکھے یعنی حقوق اللہ اور حقوقِ عباد میں تقوٰے سے کام لے یہ حُسن معاملہ ہے یا یوں کہو کہ رُوحانی خوبصورتی ہے جو درجہ پنجم وجود روحانی میں نمایاں ہوتی ہے مگر ہنوز پورے طور پر چمکتی نہیں اور وجودِ رُوحانی کے درجہ ششم میں بوجہ کامل ہونے پیدائش اور رُوح کے داخل ہوجانے کے یہ خوبصورتی اپنی تمام آب و تاب دکھلا دیتی ہے اور یاد رہے کہ مرتبہ ششم وجود روحانی میں رُوح سے مراد وہ محبتِ ذاتیہ الٰہیہ ہے جو انسان کی محبتِ ذاتیہ پر ایک شعلہ کی طرح پڑتی اور تمام اندرونی تاریکی دُور کرتی اور رُوحانی زندگی بخشتی ہے اور اُس کے لوازم میں سے رُوح القدس کی تائید بھی کامل طور پر ہے۔

دوسرا حُسن انسان کی پیدائش میں حُسنِ بُشرہ ہے اور یہ دونوں حُسن اگرچہ رُوحانی اور جسمانی پیدائش درجہ پنجم میں نمودار ہوجاتے ہیں لیکن آب و تاب اُن کی فیضانِ رُوح کے بعد ظاہر ہوتی ہے اور جیسا کہ جسمانی وجود کی رُوح جسمانی قالب تیار ہونے کے بعد جسم میں داخل ہوتی ہے ایسا ہی روحانی وجود کی روح روحانی قالب تیار ہونے کے بعد انسان کے روحانی وجود میں داخل ہوتی ہے یعنی اُس وقت جبکہ انسان

بڑے کام دکھلاتا ہے۔

نوح میں وہی حُسن تھا جس کی پاس خاطر حضرت عزّت جلّشانہٗ کو منظور ہوئی اور تمام منکروں کو پانی کے عذاب سے ہلاک کیا گیا۔ پھر اس کے بعد موسٰےؑ بھی وہی حُسنِ رُوحانی لے کر آیا جس نے چند روز تکلیفیں اُٹھا کر آخر فرعون کا بیڑا غرق کیا۔ پھر سب کے بعد سیّد الانبیاء و خیر الوریٰ مولانا وسیّدنا حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم ایک عظیم الشّان روحانی حُسن لے کر آئے جس کی تعریف میں یہی آیت کریمہ کافی ہے دَنٰی فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی یعنی وہ نبی جنابِ الٰہی سے بہت نزدیک چلا گیا اور پھر مخلوق کی طرف جُھکا اور اِس طرح پر دونوں حقوں کو جو حق اللہ اور حق العباد ہے ادا کر دیا اور دونوں قسم کا حُسن روحانی ظاہر کیا اور دونوں قوسوں میں وتر کی طرح ہو گیا یعنی دونوں قوسوں میں جو ایک درمیانی خط کی طرح ہو اور اِس طرح اُس کا وجود واقع ہوا جیسے یہ اس حُسن کو ناپاک طبع اور اندھے لوگوں نے نہ دیکھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ یعنی تیری طرف وہ دیکھتے ہیں مگر تُو انہیں دکھائی نہیں دیتا آخر وہ سب اندھے ہلاک ہو گئے۔

مخلوق قوس

خالق قوس

درمیانی خط آنحضرتؐ

اِس جگہ بعض جاہل کہتے ہیں کہ کیوں کامل لوگوں کی بعض دعائیں منظور نہیں ہوتیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اُن کی تجلّی حُسن کو خدا تعالیٰ نے اپنے اختیار میں رکھا ہوا ہے پس جس جگہ یہ تجلّی عظیم ظاہر ہو جاتی ہے اور کسی معاملہ میں اُن کا حُسن جوش میں آتا ہے اور اپنی چمک دکھلاتا ہے تب اُس چمک کی طرف ذرّاتِ عالَم کھنچے جاتے ہیں اور غیر ممکن باتیں وقوع میں آتی ہیں جن کو دوسرے لفظوں میں مُعجزہ کہتے ہیں مگر یہ جوشِ روحانی ہمیشہ اور ہر جگہ ظہور میں نہیں آتا اور تحریکاتِ خارجیہ کا محتاج ہوتا ہے یہ اِس لئے کہ جیسا کہ خدائے کریم بے نیاز ہے اُس نے اپنے برگزیدوں میں بھی بے نیازی کی صفت رکھ دی ہے سو وہ خدا کی طرح سخت بے نیاز ہوتے ہیں اور جب تک کوئی پوری خاکساری اور اخلاص کے ساتھ ان کے رحم کے لئے ایک تحریک پیدا نہ کرے وہ قوت اُن کی جوش نہیں مارتی اور عجیب تر یہ کہ وہ لوگ تمام دُنیا سے زیادہ تر رحم کی قوت اپنے اندر رکھتے ہیں مگر اس کی تحریک اُن کے اختیار میں نہیں ہوتی گو وہ بارہا چاہتے بھی ہیں کہ وہ قوت ظہور میں آوے مگر بجز ارادہ الٰہیہ کے ظاہر نہیں ہوتی بالخصوص وہ منکروں اور منافقوں اور سُست اعتقاد لوگوں کی کچھ بھی پروا نہیں رکھتے اور ایک
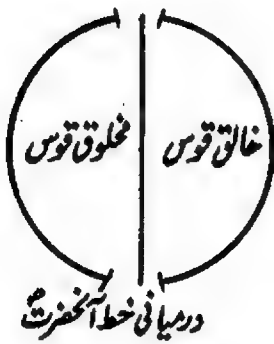
شریعت کا تمام جُوا اپنی گردن پر لے لیتا ہے اور مشقت اور مجاہدہ کے ساتھ تمام حدودِ الٰہیہ کے قبول کر لینے کے لئے تیار ہوتا ہے اور ورزش شریعت اور بجا آوری احکام کتاب اللہ سے اِس لائق ہو جاتا ہے کہ خدا کی رُوحانیت اس کی طرف توجہ فرماوے اور سب سے زیادہ یہ کہ اپنی محبّتِ ذاتیہ سے اپنے تئیں خدا تعالیٰ کی محبتِ ذاتیہ کا مستحق ٹھہرا لیتا ہے جو برف کی طرح سفید اور شہد کی طرح شیریں ہے اور جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں وجود رُوحانی خشوع کی حالت سے شروع ہوتا ہے اور رُوحانی نشوونما کے چھٹے مرتبہ پر لینے اس مرتبہ پر کر جبکہ رُوحانی قالب کے کامل ہونے کے بعد محبتِ ذاتیہ الٰہیہ کا شعلہ انسان کے دِل پر ایک رُوح کی طرح پڑتا ہے اور دائمی حضور کی حالت اُس کو بخش دیتا ہے کمال کو پہنچتا ہے اور تبھی رُوحانی حُسن اپنا پورا جلوہ دکھاتا ہے لیکن یہ حُسن جو رُوحانی حُسن ہے جس کو حُسنِ معاملہ کے ساتھ موسوم کر سکتے ہیں یہ وہ حُسن ہے جو اپنی قوی کششوں کے ساتھ حُسنِ بُشرہ سے بہت بڑھ کر ہے کیونکہ حسنِ بُشرہ صرف ایک یا دو شخص کے فانی عشق کا موجب ہوگا جو جلد زوال پذیر ہو جائے گا اور اس کی کشش نہایت کمزور ہوگی لیکن وہ رُوحانی حُسن جس کو حُسنِ معاملہ سے موسوم کیا گیا ہے وہ اپنی کششوں میں ایسا سخت اور زبردست ہے کہ ایک دُنیا کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور زمین و آسمان کا ذرہ ذرہ اس کی طرف کھنچا جاتا ہے اور قبولیتِ دعا کی بھی درحقیقت فلاسفی یہی ہے کہ جب ایسا روحانی حُسن والا انسان جس میں محبتِ الٰہیہ کی رُوح داخل ہو جاتی ہے جب کسی غیر ممکن اور نہایت مشکل امر کے لئے دعا کرتا ہے اور اس دعا پر پُورا پُورا زور دیتا ہے تو چونکہ وہ اپنی ذات میں حُسنِ روحانی رکھتا ہے اِس لئے خدا تعالیٰ کے امر اور اِذن سے اس عالَم کا ذرہ ذرہ اس کی طرف کھینچا جاتا ہے پس ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں جو اس کی کامیابی کے لئے کافی ہوں۔ تجربہ اور خدا تعالیٰ کی پاک کتاب سے ثابت ہے کہ دُنیا کے ہر ایک ذرہ کو طبعًا ایسے شخص کے ساتھ ایک عشق ہوتا ہے اور اس کی دعائیں اُن تمام ذرات کو ایسا اپنی طرف کھینچتی ہیں جیسا کہ آہن رُبا لوہے کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ پس غیر معمولی باتیں جن کا ذکر کسی علمِ طبعی اور فلسفہ میں نہیں اس کشش کی باعث ظاہر ہو جاتی ہیں اور وہ کشش طبعی ہوتی ہے جب سے کہ صانعِ مطلق نے عالَمِ اجسام کو ذرات سے ترکیب دی ہے ہر ایک ذرے میں وہ کشش رکھی ہے اور ہر ایک ذرہ روحانی حُسن کا عاشقِ صادق ہے اور ایسا ہی ہر ایک سعید رُوح بھی کیونکہ وہ حُسن تجلّی گاہِ حق ہے۔ وہی حُسن تھا جس کے لئے فرمایا گیا اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ۔ اور اب بھی بہتیرے ابلیس ہیں جو اس حُسن کو شناخت نہیں کرتے مگر وہ حُسن بڑے

مرے ہوئے کیڑے کی طرح ان کو سمجھتے ہیں اور وہ بے نیازی ان کی ایک ایسی شان رکھتی ہے جیسا کہ ایک معشوق نہایت خوبصورت بُرقع میں اپنا چہرہ چھپائے رکھے اور اسی بے نیازی کا ایک شعبہ یہ ہے کہ جب کوئی شریر انسان ان پر بدظنی کرے تو بسا اوقات بے نیازی کے جوش میں اُس بدظنی کو اَور بھی بڑھا دیتے ہیں کیونکہ تخلق باخلاق اللہ رکھتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللَّهُ مَرَضًا جب خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ کوئی مُعجزہ اُن سے ظاہر ہو تو اُن کے دِلوں میں ایک جوشش پیدا کر دیتا ہے اور ایک امر کے حصول کے لئے سخت کرب اور قلق ان کے دِلوں میں پیدا ہو جاتا ہے تب وہ بے نیازی کا بُرقع اپنے مُنہ پر سے اُتار لیتے ہیں اور وہ حُسن ان کا جو بجز خدا تعالیٰ کے کوئی نہیں دیکھتا وہ آسمان کے فرشتوں پر اور ذرہ ذرہ پر نمودار ہو جاتا ہے اور اُن کا مُنہ پر سے بُرقع اُٹھانا یہ ہے کہ وہ اپنے کامل صدق اور صفا کے ساتھ اور اس روحانی حُسن کے ساتھ جس کی وجہ سے وہ خدا کے محبوب ہو گئے ہیں اس خدا کی طرف ایک ایسا خارق عادت رجوع کرتے ہیں اور ایک ایسے اقبال علی اللہ کی اُن میں حالت پیدا ہو جاتی ہے جو خدا تعالیٰ کی فوق العادت رحمت کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ساتھ ہی ذرہ ذرہ اس عالم کا کھنچا چلا آتا ہے اور ان کی عاشقانہ حرارت کی گرمی آسمان پر جمع ہوتی اور بادلوں کی طرح فرشتوں کو بھی اپنا چہرہ دکھا دیتی ہے اور ان کی دردیں جو رعد کی خاصیّت اپنے اندر رکھتی ہیں ایک سخت شور ملاء اعلیٰ میں ڈال دیتی ہیں تب خدا تعالیٰ کی قدرت سے وہ بادل پیدا ہو جاتے ہیں جن سے رحمتِ الٰہی کا وہ مینہہ برستا ہے جس کی وہ خواہش کرتے ہیں۔ اُن کی روحانیت جب اپنے پورے سوز وگداز کے ساتھ کسی عقدہ کشائی کے لئے توجہ کرتی ہے تو وہ خدا تعالیٰ کی توجہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے کیونکہ وہ لوگ بباعث اس کے جو خدا سے ذاتی محبت رکھتے ہیں محبوبانِ الٰہی میں داخل ہوتے ہیں تب ہر ایک چیز جو خدا تعالیٰ کے زیرِ حکم ہے ان کی مدد کے لئے جوش مارتی ہے[1] اور رحمتِ الٰہی محض ان کی مراد پوری کرنے کے لئے ایک خلقِ جدید کے لئے تیار ہو جاتی ہے اور وہ امور ظاہر ہوتے ہیں جو اہلِ دُنیا کی نظر میں غیر ممکن معلوم ہوتے ہیں اور جن سے سفلی علوم محض ناآشنا ہیں ایسے لوگوں کو خدا تو نہیں کہہ سکتے مگر

---

[1] کافر اور دشمن بھی ایک قسم کی اُن کی مدد کرتے ہیں کہ ایذاء اور ظلم کے ساتھ ان کے دِل کو دُکھ دیتے اور ان کی رُوحانیت کو جوش میں لاتے ہیں ؎

تا دلِ مردِ خدا نامد بدرد ❊ ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد ❊ منہ

قُرب اور علاقہ محبت اُن کا کچھ ایسا صدق اور صفا کے ساتھ خدا تعالیٰ کے ساتھ ہوتا ہے گویا خدا اُن میں اُتر آتا ہے اور آدم کی طرح خدائی رُوح ان میں پھونکی جاتی ہے مگر یہ نہیں کہ وہ خدا ہیں لیکن درمیان میں کچھ ایسا تعلق ہے جیسا کہ لوہے کو جبکہ سخت طور پر آگ سے افروختہ ہو جائے اور آگ کا رنگ اُس میں پیدا ہو جائے آگ سے تعلق ہوتا ہے۔ اس صورت میں تمام چیزیں جو خدا تعالیٰ کے زیرِ حکم ہیں ان کے زیرِ حکم ہو جاتی ہیں اور آسمان کے ستارے اور سورج اور چاند سے لے کر زمین کے سمندروں اور ہوا اور آگ تک اُن کی آواز کو سُنتے اور ان کو شناخت کرتے اور اُن کی خدمت میں لگے رہتے ہیں اور ہر ایک چیز طبعاً اُن سے پیار کرتی ہے اور عاشقِ صادق کی طرح اُن کی طرف کھینچی جاتی ہے بجز شریر انسانوں کے جو شیطان کا اوتار ہیں۔ عشقِ مجازی تو ایک منحوس عشق ہے کہ ایک طرف پیدا ہوتا اور ایک طرف مرجاتا ہے اور نیز اس کی بناء اس حُسن پر ہے جو قابلِ زوال ہے اور نیز اُس حُسن کے نیچے آنے والے بہت ہی کم ہوتے ہیں مگر یہ کیا حیرت انگیز نظارہ ہے کہ وہ حُسنِ رُوحانی جو حُسنِ معاملہ اور صدق و صفا اور محبتِ الٰہیہ کی تجلّی کے بعد انسان میں پیدا ہوتا ہے اس میں ایک عالمگیر کشش پائی جاتی ہے وہ مستعد دلوں کو اِس طرح اپنی طرف کھینچ لیتا ہے کہ جیسے شہد چیونٹیوں کو اور نہ صرف انسان بلکہ عالم کا ذرہ ذرہ اس کی کشش سے متأثر ہوتا ہے۔ صادق المحبت انسان جو سچی محبت خدا تعالیٰ سے رکھتا ہے وہ وہ یوسف ہے جس کے لئے ذرّہ ذرّہ اِس عالم کا زلیخا صفت ہے اور ابھی حُسن اس کا اِس عالم میں ظاہر نہیں کیونکہ یہ عالم اس کی برداشت نہیں کرتا۔ خدا تعالےٰ اپنی پاک کتاب میں جو فرقانِ مجید ہے فرماتا ہے:۔ کہ مومنوں کا نور اُن کے چہروں پر دوڑتا ہے اور مومن اس حُسن سے شناخت کیا جاتا ہے جس کا نام دوسرے لفظوں میں نُور ہے۔

اور مجھے ایک دفعہ عالمِ کشف میں پنجابی زبان میں اِسی علامت کے بارہ میں یہ موزوں فقرہ شنایا گیا "عشقِ الٰہی وسّے مُنہ پر ولیاں ایہہ نشانی"۔ مومن کا نور جس کا قرآن شریف میں ذکر کیا گیا ہے وہ وہی رُوحانی حُسن و جمال ہے جو مومن کو وجودِ رُوحانی کے مرتبہ ششم پر کامل طور پر عطا کیا جاتا ہے جسمانی حُسن کا ایک شخص یا دو شخص خریدار ہوتے ہیں مگر یہ عجیب حُسن ہے جس کے خریدار کروڑہا رُوحیں ہو جاتی ہیں۔ اسی رُوحانی حُسن کی بنا پر بعض نے سیّد عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ[1] کی نعت میں یہ شعر کہے ہیں اور ان کو ایک نہایت درجہ حسین اور خوبصورت قرار دیا

---

[1] فطرتاً بعض طبائع کو بعض طبائع سے مناسبت ہوتی ہے اسی طرح میری رُوح (باقی اگلے صفحہ پر)

ہے اور وہ اشعار یہ ہیں:-

آں ترک عجم چوں زمئے عشق طرب کرد ❊ غارت گرئے کوفہ و بغداد و حلب کرد

صد لالہ رُخے بود بصد حُسن شگفتہ ❊ نازاں ہمہ را زیر قدم کرد عجب کرد

اور شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے بھی اس بارہ میں ایک شعر کہا ہے جو حُسنِ رُوحانی پر بہت منطبق ہوتا ہے اور وہ یہ ہے:-

صورت گرِ دیبائے چین رو صورتِ یارش ببیں ❊ یا صورتے برکش چنیں یا توبہ کُن صورت گری

اَب یہ بھی یاد رہے کہ بندہ تو حُسنِ معاملہ دکھلا کر اپنے صدق سے بھری ہوئی محبت ظاہر کرتا ہے مگر خدا تعالیٰ اس کے مقابلہ پر حد ہی کر دیتا ہے۔ اس کی تیز رفتار کے مقابل پر برق کی طرح اس کی طرف دوڑتا چلا آتا ہے اور زمین و آسمان سے اُس کے لئے نشان ظاہر کرتا ہے اور اسکے دوستوں کا دوست اور اس کے دشمنوں کا دشمن بن جاتا ہے اور اگر پچاس کروڑ انسان بھی اس کی مخالفت پر کھڑا ہو تو اُن کو ایسا ذلیل اور بے دست و پا کر دیتا ہے جیسا کہ ایک مرا ہوا کیڑا۔ اور محض ایک شخص کی خاطر کے لئے ایک دُنیا کو ہلاک کر دیتا ہے اور اپنی زمین و آسمان کو اُس کے خادم

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اور سیّد عبد القادر کی رُوح کو خمیر فطرت سے باہم ایک مناسبت ہے جس پر کشوف صحیحہ صریحہ سے مجھ کو اطلاع ملی ہے۔ اِس بات پر تیس برس کے قریب زمانہ گذر گیا ہے کہ جب ایک رات مجھے خدا نے اطلاع دی کہ اُس نے مجھے اپنے لئے اختیار کر لیا ہے تب یہ عجیب اتفاق ہوا کہ اُسی رات ایک بڑھیا کو خواب آئی جس کی عمر قریباً اسّی ۸۰ برس کی تھی اور اُس نے صبح مجھ کو آکر کہا کہ مَیں نے رات سیّد عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہ کو خواب میں دیکھا ہے اور ساتھ اُن کے ایک اَور بزرگ تھے اور دونوں سبز پوش تھے اور رات کے پچھلے حصّہ کا وقت تھا۔ دوسرا بزرگ عمر میں اُن سے کچھ چھوٹا تھا۔ پہلے اُنہوں نے ہماری جامع مسجد میں نماز پڑھی اور پھر مسجد کے باہر کے صحن میں نکل آئے اور مَیں اُن کے پاس کھڑی تھی اتنے میں مشرق کی طرف سے ایک چمکتا ہوا ستارہ نکلا تب اُس ستارہ کو دیکھ کر سیّد عبد القادر بہت خوش ہوئے اور ستارہ کی طرف مخاطب ہو کر کہا السلام علیکم اور ایسا ہی اُن کے رفیق نے السلام علیکم کہا اور وہ ستارہ مَیں تھا۔ المؤمن یَرٰی وَیُرٰی لَہٗ۔ منہ

بنا دیتا ہے اور اس کی کلام میں برکت ڈال دیتا ہے اور اس کے تمام در و دیوار پر نُور کی بارش کرتا ہے اور اس کی پوشاک میں اور اس کی خوراک میں اور اُس مٹی میں بھی جس پر اُس کا قدم پڑتا ہے ایک برکت رکھ دیتا ہے اور اس کو نامراد ہلاک نہیں کرتا اور ہر ایک اعتراض جو اس پر ہو اُس کا آپ جواب دیتا ہے وہ اُس کی آنکھیں ہو جاتا ہے جن سے وہ دیکھتا ہے اور اُس کے کان ہو جاتا ہے جن سے وہ سُنتا ہے اور اُس کی زبان ہو جاتا ہے جس سے وہ بولتا ہے اور اُس کے پاؤں ہو جاتا ہے جن سے وہ چلتا ہے اور اُس کے ہاتھ ہو جاتا ہے جن سے وہ دشمنوں پر حملہ کرتا ہے۔ وہ اُس کے دشمنوں کے مقابل پر آپ نکلتا ہے اور شریروں پر جو اس کو دُکھ دیتے ہیں آپ تلوار کھینچتا ہے۔ ہر میدان میں اس کو فتح دیتا ہے اور اپنی قضاء و قدر کے پوشیدہ راز اس کو بتلاتا ہے۔ غرض پہلا خریدار اُسکے روحانی حُسن و جمال کا جو حُسنِ معاملہ اور محبّتِ ذاتیہ کے بعد پیدا ہوتا ہے خدا ہی ہے۔ پس کیا ہی بدقسمت وہ لوگ ہیں جو ایسا زمانہ پاویں اور ایسا سُورج اُن پر طلوع کرے اور وہ تاریکی میں بیٹھے رہیں۔

بعض نادان یہ اعتراض بار بار پیش کرتے ہیں کہ محبوبانِ الٰہی کی یہ علامت ہے کہ ہر ایک دُعا اُن کی سُنی جاتی ہے اور جس میں یہ علامت نہیں پائی جاتی وہ محبوبانِ الٰہی میں سے نہیں ہے مگر افسوس کہ یہ لوگ مُنہ سے تو ایک بات نکال لیتے ہیں مگر اعتراض کرنے کے وقت یہ نہیں سوچتے کہ ایسے جاہلانہ اعتراض خدا تعالیٰ کے تمام نبیوں اور رسولوں پر وارد ہوتے ہیں مثلاً ہر ایک نبی کی یہ مراد تھی کہ تمام کفار اُن کے زمانہ کے جو اُن کی مخالفت پر کھڑے تھے مسلمان ہو جائیں مگر یہ مراد ان کی پوری نہ ہوئی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَنْ لَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ یعنی ”کیا تُو اس غم سے اپنے تئیں ہلاک کر دے گا کہ یہ لوگ کیوں ایمان

---

[1] یاد رہے کہ مومن کے ساتھ خدا تعالیٰ دوستانہ معاملہ کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ کبھی تو وہ مومن کے ارادہ کو پورا کرے اور کبھی مومن اس کے ارادہ پر راضی ہو جائے۔ پس ایک جگہ تو مومن کو مخاطب کرکے فرماتا ہے ادعونی استجب لکم یعنی دعا کرو کہ مَیں تمہاری دعا قبول کروں گا اس جگہ تو مومن کی خواہش پوری کرنا چاہتا ہے اور دوسری جگہ اپنی خواہش مومن سے منوانا چاہتا ہے جیسا کہ فرماتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ افسوس کہ نادان آدمی صرف ایک پہلو کو دیکھتا ہے اور دونوں پہلوؤں پر نظر نہیں ڈالتا۔ منہ

نہیں لاتے"۔

اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفّار کے ایمان لانے کے لئے اِس قدر جانکاہی اور سوز و گداز سے دُعا کرتے تھے کہ اندیشہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اِس غم سے خود ہلاک نہ ہو جاویں اِس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اِن لوگوں کے لئے اِس قدر غم نہ کر اور اِس قدر اپنے دل کو دردوں کا نشانہ مت بنا کیونکہ یہ لوگ ایمان لانے سے لاپرواہیں اور ان کے اغراض اور مقاصد اور ہیں۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ اشارہ فرمایا ہے کہ اے نبی (علیہ السلام) جس قدر تُو عقدِ ہمّت اور کامل توجہ اور سوز و گداز اور اپنی رُوح کو مشقت میں ڈالنے سے ان لوگوں کی ہدایت کے لئے دُعا کرتا ہے تیری دُعاؤں کے پُرتاثیر ہونے میں کچھ کمی نہیں ہے لیکن شرط قبولیتِ دعا یہ ہے کہ جس کے حق میں دُعا کی جاتی ہے سخت متعصب اور لاپروا اور گندی فطرت کا انسان نہ ہو ورنہ دُعا قبول نہیں ہوگی۔ اور جہاں تک مجھے خدا تعالیٰ نے دعاؤں کے بارے میں علم دیا ہے وہ یہ ہے کہ دُعا کے قبول ہونے کے لئے تین شرطیں ہیں۔

اوّل۔ دُعا کرنے والا کامل درجہ پر متقی ہو کیونکہ خدا تعالیٰ کا مقبول وہی بندہ ہوتا ہے جس کا شعار تقویٰ ہو اور جس نے تقویٰ کی باریک راہوں کو مضبوط پکڑا ہو اور جو امین اور متقی اور صادق العہد ہونے کی وجہ سے منظورِ نظرِ الٰہی ہو اور محبتِ ذاتیہ الٰہیہ سے معمور اور پُر ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اس کی عقدِ ہمّت اور توجہ اس قدر ہو کہ گویا ایک شخص کے زندہ کرنے کے لئے ہلاک ہو جائے اور ایک شخص کو قبر سے باہر نکالنے کے لئے آپ گور میں داخل ہو۔ اِس میں راز یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو اپنے مقبول بندے اِس سے زیادہ پیارے ہوتے ہیں جیسا کہ ایک خوبصورت بچہ جو ایک ہی ہو اس کی ماں کو پیارا ہوتا ہے۔ پس جبکہ خدائے کریم و رحیم دیکھتا ہے کہ ایک مقبول و محبوب اُس کا ایک شخص کی جان بچانے کے لئے رُوحانی مشقتوں اور تضرعات اور مجاہدات کی وجہ سے اُس حد تک پہنچ گیا ہے کہ قریب ہے کہ اس کی جان نکل جائے تو اُس کو علاقۂ محبت کی وجہ سے ناگوار گذرتا ہے کہ اسی حال میں اس کو ہلاک کر دے تب اس کے لئے اس دوسرے شخص کا گناہ بخش دیتا ہے جس کے لئے وہ پکڑا گیا تھا۔ پس اگر وہ کسی مُہلک بیماری میں گرفتار ہے یا اور کسی بَلا میں اسیر و لاچار ہے تو اپنی قدرت سے ایسے اسباب پیدا کر دیتا ہے جس سے رہائی ہو جائے اور بسا اوقات اس کا ارادہ ایک شخص کے قطعی طور پر ہلاک کرنے یا برباد کرنے پر قرار یافتہ ہوتا ہے لیکن جب ایک مصیبت زدہ کی خوش قسمتی سے ایسا شخص پُردرد تضرعات کے ساتھ درمیان میں آپڑتا ہے جس کو

حضرت عزت میں وجاہت ہے تو وہ مثل مقدمہ جو سزا دینے کے لئے مکمّل اور مرتّب ہو چکی ہے چاک کرنی پڑتی ہے کیونکہ اب بات اغیار سے یار کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور یہ کیونکر ہو سکے کہ خدا اپنے سچّے دوستوں کو عذاب دے۔

(۳) تیسری شرط استجابتِ دُعا کے لئے ایک ایسی شرط ہے جو تمام شرطوں سے مشکل تر ہے کیونکہ اُس کا پُورا کرنا خدا کے مقبول بندوں کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اس شخص کے ہاتھ میں ہے جو دُعا کرانا چاہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ نہایت صدق اور کامل اعتقاد اور کامل یقین اور کامل ارادت اور کامل غلامی کے ساتھ دعا کا خواہاں ہو اور یہ دِل میں فیصلہ کر لے کہ اگر دعا قبول بھی نہ ہو تاہم اس کے اعتقاد اور ارادت میں فرق نہیں آئے گا اور دعا کرانا آزمائش کے طور پر نہ ہو بلکہ سچے اعتقاد کے طور پر ہو اور نہایت نیازمندی سے اس کے دروازے پر گرے اور جہاں تک اس کے لئے ممکن ہے مال سے خدمت سے ہر ایک طور کی اطاعت سے ایسا قُرب پیدا کرے کہ اس کے دِل کے اندر داخل ہو جائے اور بایں ہمہ نہایت درجہ پر نیک ظن ہو اور اُس کو نہایت درجہ کا متقی سمجھے اور اس کی مقدّس شان کے برخلاف ایک خیال بھی دِل میں لانا کفر خیال کرے اور اِس قسم کی طرح طرح کی جاں نثاری دکھلا کر سچّے اعتقاد کو اس پر ثابت اور روشن کر دے اور اس کی مثل دُنیا میں کسی کو نہ سمجھے اور جان سے مال سے آبروسے اس پر فدا ہو جائے اور کوئی کلمہ کسرِ شان کا کسی پہلو سے اُس کی نسبت زبان پر نہ لائے اور نہ دِل میں۔ اور اِس بات کو اس کی نظر میں بپایۂ ثبوت پہنچا دے کہ درحقیقت وہ ایسا ہی معتقد اور مرید ہے اور بایں ہمہ صبر سے اِنتظار کرے اور اگر پچاس دفعہ بھی اپنے کام میں نامراد رہے پھر بھی اعتقاد اور یقین میں سُست نہ ہو کیونکہ یہ قوم سخت نازک دِل ہوتی ہے اور ان کی فراست چہرہ کو دیکھ کر پہچان سکتی ہے کہ یہ شخص کس درجہ کا اِخلاص رکھتا ہے اور یہ قوم باوجود نرم دل ہونے کے نہایت بے نیاز ہوتی ہے اِن کے دِل خدا نے ایسے بے نیاز پیدا کئے ہیں کہ متکبّر اور خود غرض اور مناسب طبع انسان کی کچھ پروا نہیں کرتے۔ اس قوم سے وہی لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں جو اس قدر غلامانہ اطاعت ان کی اختیار کرتے ہیں کہ گویا مر ہی جاتے ہیں مگر وہ شخص جو قدم قدم پر بدظنّی کرتا ہے اور دِل میں کوئی اعتراض رکھتا ہے اور پوری محبّت اور ارادت نہیں رکھتا وہ بجائے فائدہ کے ہلاک ہوتا ہے۔

اب ہم اس تقریر کے بعد کہتے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ نے مومن کے وجودِ رُوحانی کے مراتب ستّہ بیان کرکے اِن کے مقابل پر وجودِ جسمانی کے مراتب ستّہ دکھلائے ہیں یہ ایک علمی معجزہ ہے اور جس قدر

کتابیں دنیا میں کتبِ سماوی کہلاتی ہیں یا جن حکیموں نے نفس اور الٰہیات کے بارے میں تحریریں کی ہیں اور یا جن لوگوں نے صوفیوں کی طرز پر معارف کی باتیں لکھی ہیں کسی کا ذہن ان میں سے اِس بات کی طرف سبقت نہیں لے گیا کہ یہ مقابلہ جسمانی اور رُوحانی وجود کا دکھلاتا۔ اگر کوئی شخص میرے اِس دعوے سے منکر ہو اور اس کا گمان ہو کہ یہ مقابلہ رُوحانی اور جسمانی کسی اَور نے بھی دکھلایا ہے تو اس پر واجب ہے کہ اس علمی معجزہ کی نظیر کسی اَور کتاب میں سے پیش کر کے دکھلاوے اور مَیں نے توریت اور انجیل اور ہندوؤں کے وید کو بھی دیکھا ہے مگر مَیں سچ سچ کہتا ہوں کہ اِس قسم کا علمی معجزہ مَیں نے بجز قرآن شریف کے کسی کتاب میں نہ پایا اور صرف اِسی معجزہ پر حصر نہیں بلکہ تمام قرآن شریف ایسے ہی علمی معجزات سے پُر ہے جن پر ایک عقلمند نظر ڈال کر سمجھ سکتا ہے کہ یہ اُسی خدائے قادرِ مطلق کا کلام ہے جس کی قدرتیں زمین و آسمان کی مصنوعات میں ظاہر ہیں۔ وہی خدا جو اپنی باتوں اور کاموں میں بے مثل و مانند ہے۔ پھر جب ہم ایک طرف ایسے ایسے معجزات قرآن شریف میں پاتے ہیں اور دوسری طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمیّت کو دیکھتے ہیں اور اس بات کو اپنے تصوّر میں لاتے ہیں کہ آپ نے ایک حرف بھی کسی اُستاد سے نہیں پڑھا تھا اور نہ آپ نے طبعی اور فلسفہ سے کچھ حاصل کیا تھا بلکہ آپؐ ایک ایسی قوم میں پیدا ہوئے تھے کہ جو سب کی سب اُمّی اور ناخواندہ تھی اور ایک وحشیانہ زندگی رکھتی تھی اور باایں ہمہ آپ نے والدین کی تربیت کا زمانہ بھی نہیں پایا تھا۔ تو ان سب باتوں کو مجموعی نظر کے ساتھ دیکھنے سے قرآن شریف کے منجانب اللہ ہونے پر ایک ایسی چمکتی ہوئی بصیرت ہمیں ملتی ہے اور اس کا علمی معجزہ ہونا ایسے یقین کے ساتھ ہمارے دل میں بھر جاتا ہے کہ گویا ہم اس کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کو دیکھ لیتے ہیں۔ غرض جبکہ بدیہی طور پر ثابت ہے کہ سورۃ المؤمنون کی یہ تمام آیات جو ابتدائے سورۃ سے لے کر آیت فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ تک ہیں علمی معجزہ ہیں۔ پس اس میں کیا شک ہے کہ آیت فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ علمی معجزہ کی ایک جُزو ہے اور بباعث معجزہ کے جُزو ہونے کے معجزہ میں داخل ہے اور یہی ثابت کرنا تھا۔

اور یاد رہے کہ یہ علمی معجزہ مذکورہ بالا ایک ایسی صاف اور کُھلی کُھلی اور روشن اور بدیہی سچائی ہے کہ اب خدا تعالیٰ کی کلام کی رہبری اور یاد دہانی کے بعد عقل بھی اپنے معقولی علوم میں بہت فخر کے ساتھ اُس کو داخل کرنے کے لئے تیار ہے۔

کیونکہ عند العقل یہ بات ظاہر ہے کہ سب سے پہلے جو ایک سعید الفطرت آدمی کے نفس کو خدا تعالیٰ کی طرف اس کی طلب میں ایک حرکت پیدا ہوتی ہے وہ خشوع اور انکسار ہے اور خشوع سے

مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے لئے فروتنی اور تواضع اور تضرّع کی حالت اختیار کی جائے اور جو اس کے مقابل پر اخلاقِ رذیّہ ہیں جیسے تکبّر اور عُجب اور ریا اور لاپروائی اور بے نیازی اُن سب کو خدا تعالیٰ کے خوف سے چھوڑ دیا جائے اور یہ بات بدیہی ہے کہ جب تک انسان اپنے اخلاقِ رذیّہ کو نہیں چھوڑتا اس وقت تک اُن اخلاق کے مقابل پر جو اخلاقِ فاضلہ ہیں جو خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں اُن کو قبول نہیں کر سکتا کیونکہ دو ضدیں ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اِسی کی طرف اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں اشارہ فرماتا ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ کی ابتداء میں اُس نے فرمایا ہے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ یعنے قرآن شریف اُن لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو متقی ہیں یعنے وہ لوگ جو تکبّر نہیں کرتے اور خشوع اور انکسار سے خدا تعالیٰ کی کلام میں غور کرتے ہیں وہی ہیں جو آخر کو ہدایت پاتے ہیں۔ اس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ اِن آیات میں چھ جگہ اَفْلَحَ کا لفظ ہے پہلی آیۃ میں صریح ہے جیسا کہ فرمایا ہے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ۔ اور بعد کی آیتوں میں عطف کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے اور افلح کے لغت میں یہ معنے ہیں کہ اُصِيْرَ اِلَى الْفَلَاحِ یعنے فوزِ مرام کی طرف پھیرا گیا اور حرکت دیا گیا پس ان معنوں کی رُو سے مومن کا نماز میں خشوع اختیار کرنا فوزِ مرام کے لئے پہلی حرکت ہے جس کے ساتھ تکبّر اور عُجب وغیرہ چھوڑنا پڑتا ہے اور اس میں فوزِ مرام یہ ہے کہ انسان کا نفس خشوع کی سیرت اختیار کر کے خدا تعالیٰ سے تعلق پکڑنے کے لئے مُستعد اور تیار ہو جاتا ہے۔

دوسرا کام مومن کا یعنے وہ کام جس سے دوسرے مرتبہ تک قوتِ ایمانی پہنچتی ہے اور پہلے کی نسبت ایمان کچھ قوی ہو جاتا ہے عقلِ سلیم کے نزدیک یہ ہے کہ مومن اپنے دل کو جو خشوع کے مرتبہ تک پہنچ چکا ہے لغو خیالات اور لغو شغلوں سے پاک کرے کیونکہ جب تک مومن یہ ادنیٰ قوت حاصل نہ کرے کہ خدا کے لئے لغو باتوں اور لغو کاموں کو ترک کر سکے جو کچھ بھی مشکل نہیں اور صرف گنہ بے لذّت ہے اس وقت تک یہ طمع خام ہے کہ مومن ایسے کاموں سے دستبردار ہو سکے جن سے دستبردار ہونا نفس پر بہت بھاری ہے اور جن کے ارتکاب میں نفس کو کوئی فائدہ یا لذت ہے۔ پس اِس سے ثابت ہے کہ پہلے درجہ کے بعد کہ ترک تکبّر ہے دوسرا درجہ ترک لغویات ہے اور اس درجہ پر وعدہ جو لفظ افلح سے کیا گیا ہے یعنی فوزِ مرام اس طرح پر پورا ہوتا ہے کہ مومن کا تعلق جب لغو کاموں اور لغو شغلوں سے ٹوٹ جاتا ہے تو ایک خفیف سا تعلق خدا تعالیٰ سے اس کو ہو جاتا ہے اور قوّتِ ایمانی بھی پہلے سے زیادہ بڑھ جاتی ہے اور خفیف تعلق اِس لئے ہم نے کہا کہ لغویات سے تعلق بھی خفیف ہی ہوتا ہے۔ پس خفیف تعلق چھوڑنے سے خفیف تعلق ہی ملتا ہے۔

پھر تیسرا کام مومن کا جس سے تیسرے درجہ تک قوتِ ایمانی پہنچ جاتی ہے عقلِ سلیم کے نزدیک یہ ہے کہ وہ صرف لغو کاموں اور لغو باتوں کو ہی خدا تعالیٰ کے لئے نہیں چھوڑتا بلکہ اپنا عزیز مال بھی خدا تعالیٰ کے لئے چھوڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ لغو کاموں کے چھوڑنے کی نسبت مال کا چھوڑنا نفس پر زیادہ بھاری ہے کیونکہ وہ محنت سے کمایا ہؤا اور ایک کار آمد چیز ہوتی ہے جس پر خوش زندگی اور آرام کا دارومدار ہے اِس لئے مال کا خدا کے لئے چھوڑنا بہ نسبت لغو کاموں کے چھوڑنے کے قوتِ ایمانی کو زیادہ چاہتا ہے اور لفظ اَفْلَحَ کا جو آیات میں وعدہ ہے اِس کے اس جگہ یہ معنی ہوں گے کہ دوسرے درجہ کی نسبت اس مرتبہ میں قوتِ ایمانی اور تعلق بھی خدا تعالیٰ سے زیادہ ہو جاتی ہے اور نفس کی پاکیزگی اس سے پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اپنے ہاتھ سے اپنا محنت سے کمایا ہؤا مال محض خدا کے خوف سے نکالنا بجز نفس کی پاکیزگی کے ممکن نہیں۔

پھر چوتھا کام مومن کا جس سے چوتھے درجہ تک قوتِ ایمانی پہنچ جاتی ہے عقلِ سلیم کے نزدیک یہ ہے کہ وہ صرف مال کو خدا تعالیٰ کے راہ میں ترک نہیں کرتا بلکہ وہ چیز جس سے وہ مال سے بھی بڑھ کر پیار کرتا ہے یعنی شہواتِ نفسانیہ اُن کا وہ حصّہ جو حرام کے طور پر ہے چھوڑ دیتا ہے۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہر ایک اِنسان اپنی شہواتِ نفسانیہ کو طبعاً مال سے عزیز تر سمجھتا ہے اور مال کو ان کی راہ میں فدا کرتا ہے پس بِلا شُبہ مال کے چھوڑنے سے خدا کے لئے شہوات کو چھوڑنا بہت بھاری ہے اور لفظ اَفْلَحَ جو اس آیت سے بھی تعلق رکھتا ہے اسکے اِس جگہ یہ معنی ہیں کہ جیسے شہواتِ نفسانیہ سے انسان کو طبعاً شدید تعلق ہوتا ہے ایسا ہی اُنکے چھوڑنے کے بعد وہی شدید تعلق خدا تعالیٰ سے ہو جاتا ہے کیونکہ جو شخص کوئی چیز خدا تعالیٰ کی راہ میں کھوتا ہے اُس سے بہتر پا لیتا ہے۔ ؎

لطفِ او ترک طالباں نکند ٭ کس بہ کارِ رہش زیاں نکند
ہر کہ آں راہ جُست یافتہ است ٭ تافت آں رُو کہ سر نتافتہ است

پھر پانچواں کام مومن کا جس سے پانچویں درجہ تک قوتِ ایمانی پہنچ جاتی ہے عند العقل یہ ہے کہ صرف ترک شہواتِ نفس ہی نہ کرے بلکہ خدا کی راہ میں خود نفس کو ہی ترک کر دے اور اُس کے فدا کرنے پر تیار رہے یعنی نفس جو خدا کی امانت ہے اُسی مالک کو واپس دیدے اور نفس سے صرف اس قدر تعلق رکھے جیسا کہ ایک امانت سے تعلق ہوتا ہے اور دقائق تقوائے ایسی طور پر پوری کرے کہ گویا اپنے نفس اور مال اور تمام چیزوں کو خدا کی راہ میں وقف کر چکا ہے

اسی طرف یہ آیت اشارہ فرماتی ہے وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمٰنٰتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رٰعُوْنَ پس جبکہ انسان کے جان و مال اور تمام قسم کے آرام خدا کی امانت ہے[۱] جس کو واپس دینا امین ہونے کے لئے شرط ہے لہٰذا ترکِ نفس وغیرہ کے یہی معنے ہیں کہ یہ امانت خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کر کے اس طور سے یہ قربانی ادا کرے اور دوسرے یہ کہ جو خدا تعالیٰ کے ساتھ ایمان کے وقت اس کا عہد تھا اور جو عہد اور امانتیں مخلوق کی اس کی گردن پر ہیں اُن سب کو ایسے طور سے تقویٰ کی رعایت سے بجا لاوے کہ وہ بھی ایک سچی قربانی ہو جاوے کیونکہ دقائق تقویٰ کو انتہا تک پہنچانا یہ بھی ایک قسم کی موت ہے اور لفظ اَفْلَحَ کا جو اس آیت سے بھی تعلق رکھتا ہے اُس کے اِس جگہ یہ معنی ہیں کہ جب اس درجہ کا مومن خدا تعالیٰ کے راہ میں بذل نفس کرتا ہے اور تمام دقائق تقویٰ بجا لاتا ہے تب حضرت احدیّت سے انوارِ الٰہیہ اُس کے وجود پر محیط ہو کر رُوحانی خوبصورتی اس کو بخشتے ہیں جیسے کہ گوشت ہڈیوں پر چڑھ کر اُن کو خوبصورت بنا دیتا ہے اور جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں اِن دونوں حالتوں کا نام خدا تعالیٰ نے لباس ہی رکھا ہے تقویٰ کا نام بھی لباس ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لِبَاسُ التَّقْوٰی۔ اور جو گوشت ہڈیوں پر چڑھتا ہے وہ بھی لباس ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے فَکَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا کیونکہ کِسوت جس سے کَسَوْنَا کا لفظ نکلا ہے لباس کو ہی کہتے ہیں۔

اب یاد رہے کہ منتہا سلوک کا پنجم درجہ ہے اور جب پنجم درجہ کی حالت اپنے کمال کو پہنچ جاتی ہے تو اس کے بعد چھٹا درجہ ہے جو محض ایک موہبت کے طور پر ہے اور جو بغیر کسب اور کوشش کے مومن کو عطا ہوتا ہے اور کسب کا اس میں ذرہ دخل نہیں اور وہ یہ ہے کہ جیسے مومن خدا کے راہ میں اپنی روح کھوتا ہے ایک رُوح اس کو عطا کی جاتی ہے کیونکہ ابتداء سے یہ وعدہ ہے کہ جو کوئی خدا تعالیٰ کی راہ میں کچھ کھوئے گا وہ اُسے پائے گا اِس لئے رُوح کو کھونے والے رُوح کو پاتے ہیں۔ پس چونکہ مومن اپنی محبّتِ ذاتیہ سے خدا کی راہ میں اپنی جان وقف کرتا ہے اِس لئے خدا کی محبّتِ ذاتیہ کی رُوح کو پاتا ہے جس کے ساتھ رُوح القدس شامل ہوتا ہے۔ خدا کی محبّتِ ذاتیہ ایک رُوح ہے اور رُوح کا کام مومن

---

[۱] جیسا کہ نفس خدا تعالیٰ کی امانت ہے ایسا ہی مال بھی خدا تعالیٰ کی امانت ہے پس جو شخص صرف اپنے مال میں سے زکوٰۃ دیتا ہے وہ مال کو اپنا مال سمجھتا ہے مگر جو شخص مال کو خدا تعالیٰ کی امانت سمجھتا ہے وہ اپنے تمام مال کو خدا تعالیٰ کا مال جانتا ہے اور ہر ایک وقت خدا کی راہ میں دیتا ہے گو کوئی زکوٰۃ اس پر واجب نہ ہو۔ منہ

کے اندر کرتی ہے اِس لئے وہ خود رُوح ہے اور رُوح القدس اس سے جُدا نہیں کیونکہ اس محبّت اور رُوح القدس میں کبھی انفکاک ہو ہی نہیں سکتا اِسی وجہ سے ہم نے اکثر جگہ صرف محبّتِ ذاتیہ الٰہیہ کا ذکر کیا ہے اور رُوح القدس کا نام نہیں لیا کیونکہ ان کا باہم تلازم ہے اور جب رُوح کسی مومن پر نازل ہوتی ہے تو تمام بوجھ عبادات کا اُس کے سر پر سے ساقط ہو جاتا ہے اور اُس میں ایک ایسی قوّت اور لذّت آجاتی ہے جو وہ قوّت تکلّف سے نہیں بلکہ طبعی جوش سے یادِ الٰہی اُس سے کراتی ہے اور عاشقانہ جوش اُس کو بخشتی ہے پس ایسا مومن جبرائیل علیہ السلام کی طرح ہر وقت آستانۂ اِلٰہی کے آگے حاضر رہتا ہے اور حضرت عزّت کی دائمی ہمسائیگی اُس کے نصیب ہو جاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالےٰ اِس درجہ کے بارے میں فرماتا ہے وَ الَّذِیۡنَ ہُمۡ عَلٰی صَلَوٰتِہِمۡ یُحَافِظُوۡنَ یعنی مومن کامل وہ لوگ ہیں کہ ایسا دائمی حضور اُن کو میسّر آتا ہے کہ ہمیشہ وہ اپنی نماز کے آپ نگہبان رہتے ہیں۔ یہ اس حالت کی طرف اشارہ ہے کہ اس درجہ کا مومن اپنی رُوحانی بقا کے لئے نماز کو ایک ضروری چیز سمجھتا ہے اور اُس کو اپنی غذا قرار دیتا ہے جس کے بغیر وہ جی ہی نہیں سکتا۔ یہ درجہ بغیر اُس رُوح کے حاصل نہیں ہو سکتا جو خدا تعالیٰ کی طرف سے مومن پر نازل ہوتی ہے کیونکہ جبکہ مومن خدا تعالیٰ کے لئے اپنی جان کو ترک کر دیتا ہے تو ایک دوسری جان پانے کا مستحق ہوتا ہے۔

اِس تمام تقریر سے ثابت ہے کہ یہ مراتب ستّہ عقلِ سلیم کے نزدیک اُس مومن کی راہ میں پڑے ہیں جو اپنے وجودِ رُوحانی کو کمال تک پہنچانا چاہتا ہے اور ہر ایک انسان تھوڑے سے غور کے ساتھ سمجھ سکتا ہے کہ ضرور مومن پر اُس کے سلوک کے وقت چھ حالتیں آتی ہیں وجہ یہ کہ جب تک انسان خدا تعالیٰ سے کامل تعلق نہیں پکڑتا تب تک اُس کا نفسِ ناقص پانچ خراب حالتوں سے پیار کرتا ہے اور ہر ایک حالت کا پیار دُور کرنے کے لئے ایک ایسے سبب کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اُس پیار پر غالب آجائے اور نیا پیار پہلے پیار کا علاقہ توڑ دے۔

چنانچہ پہلی حالت جس سے وہ پیار کرتا ہے یہ ہے کہ وہ ایک غفلت میں پڑا ہوتا ہے اور اس کو بالکل خدا تعالیٰ سے بُعد اور دُوری ہوتی ہے اور نفس ایک کفر کے رنگ میں ہوتا ہے اور غفلت کے پردے تکبّر اور لاپروائی اور سنگدلی کی طرف اُس کو کھینچتے ہیں اور خشوع اور خضوع اور تواضع اور فروتنی اور انکسار کا نام ونشان اُس میں نہیں ہوتا اور اُسی اپنی حالت سے وہ محبّت کرتا ہے اور اُس کو اپنے لئے بہتر سمجھتا ہے اور پھر جب عنایتِ الٰہیہ اُس کی اصلاح کی طرف توجّہ کرتی ہے تو کسی واقعہ کے پیدا ہونے سے یا کسی آفت کے نازل ہونے سے خدا تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت اور جبروت کا

اس کے دِل پر اثر پڑتا ہے اور اس اثر سے اُس پر ایک حالتِ خشوع پیدا ہو جاتی ہے جو اُس کے تکبر اور گردن کشی اور غفلت کی عادت کو کالعدم کر دیتی ہے اور اُس سے علاقہ محبت توڑ دیتی ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو ہر وقت دُنیا میں مشاہدہ میں آتی رہتی ہے اور دیکھا جاتا ہے کہ جب ہیبتِ الٰہی کا تازیانہ کسی خوفناک لباس میں نازل ہوتا ہے تو بڑے بڑے شریروں کی گردن جھکا دیتا ہے اور خوابِ غفلت سے جگا کر خشوع اور خضوع کی حالت بنا دیتا ہے۔ یہ وہ پہلا مرتبہ رجوع الی اللہ کا ہے جو عظمت اور ہیبتِ الٰہی کے مشاہدہ کے بعد یا کسی اَور طور سے ایک سعید الفطرت کو حاصل ہو جاتا ہے اور گو وہ پہلے اپنی غافلانہ اور بے قید زندگی سے محبت ہی رکھتا تھا مگر جب مخالف اثر اس پہلے اثر سے قوی تر پیدا ہوتا ہے تو اس حالت کو بہر حال چھوڑنا پڑتا ہے۔

پھر اس کے بعد دوسری حالت یہ ہے کہ ایسے مومن کو خدا تعالیٰ کی طرف کچھ رجوع تو ہو جاتا ہے مگر اس رجوع کے ساتھ لغو باتوں اور لغو کاموں اور لغو شغلوں کی پلیدی لگی رہتی ہے جس سے وہ اُنس اور محبت رکھتا ہے۔ ہاں کبھی نماز میں خشوع کے حالات بھی اُس سے ظہور میں آتے ہیں لیکن دوسری طرف لغو حرکات بھی اُس کے لازمِ حال رہتی ہیں اور لغو تعلقات اور لغو مجلسیں اور لغو ہنسی ٹھٹھا اس کے گلے کا ہار رہتا ہے گویا وہ دو رنگ رکھتا ہے کبھی کچھ کبھی کچھ۔ ؎

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر میکنند ⁂ چوں بخلوت میروند آں کارِ دیگر میکنند

پھر جب عنایتِ الٰہیہ اس کو ضائع کرنا نہیں چاہتی تو پھر ایک اَور جلوہ عظمت اور ہیبت اور جبروتِ الٰہی کا اُس کے دل پر نازل ہوتا ہے جو پہلے جلوہ سے زیادہ تیز ہوتا ہے اور قوتِ ایمانی اُس سے تیز ہو جاتی ہے اور ایک آگ کی طرح مومن کے دِل پر پڑ کر تمام خیالاتِ لغو اُس کے ایک دَم میں بھسم کر دیتی ہے اور یہ جلوہ عظمت اور جبروتِ الٰہی کا اس قدر حضرتِ عزّت کی محبت اُس کے دل میں پیدا کرتا ہے کہ لغو کاموں اور لغو شغلوں کی محبت پر غالب آ جاتا ہے اور اُن کو دفع اور دُور کر کے اُنکی جگہ لے لیتا ہے اور تمام بیہودہ شغلوں سے دل کو سرد کر دیتا ہے تب لغو کاموں سے دل کو ایک کراہت پیدا ہو جاتی ہے۔

پھر لغو شغلوں اور لغو کاموں کے دُور ہونے کے بعد ایک تیسری خراب حالت مومن میں باقی رہ جاتی ہے جس سے وہ دوسری حالت کی نسبت بہت محبت رکھتا ہے یعنی طبعًا مال کی محبت اُس کے دل میں ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنی زندگی اور آرام کا مدار مال کو ہی سمجھتا ہے اور نیز اُسکے

حاصل ہونے کا ذریعہ صرف اپنی محنت اور مشقت خیال کرتا ہے پس اِس وجہ سے اُس پر خدا تعالیٰ کے راہ میں مال کا چھوڑنا بہت بھاری اور تلخ ہوتا ہے۔

پھر جب عنایتِ الٰہیہ اِس ورطۂ عظیمہ سے اُس کو نکالنا چاہتی ہے تو رازقیتِ الٰہیّہ کا عِلم اُس کو عطا کیا جاتا ہے اور توکّل کا بیج اس میں بویا جاتا ہے اور ساتھ اس کے ہیبتِ الٰہیہ بھی کام کرتی ہے اور دونوں تجلیات جمالی اور جلالی اس کے دل کو اپنے قابو میں لے آتی ہیں تب مال کی محبت بھی دِل میں سے بھاگ جاتی ہے اور مال دینے والے کی محبّت کا تخم دل میں بویا جاتا ہے اور ایمان قوی کیا جاتا ہے اور یہ قوتِ ایمانی درجہ سوم کی قوّت سے بڑھ کر ہوتی ہے کیونکہ اِس جگہ مومن صرف لغو باتوں کو ہی ترک نہیں کرتا بلکہ اُس مال کو ترک کرتا ہے جس پر اپنی خوشحال زندگی کا سارا مدار سمجھتا ہے اور اگر اس کی ایمان کو قوتِ توکّل عطا نہ کی جاتی اور رازقِ حقیقی کی طرف آنکھ کا دروازہ نہ کھولا جاتا تو ہرگز ممکن نہ تھا کہ بُخل کی بیماری دُور ہو سکتی۔ پس یہ قوّتِ ایمانی نہ صرف لغو کاموں سے چھوڑاتی ہے بلکہ خدا تعالیٰ کے رازق ہونے پر ایک قوی ایمان پیدا کر دیتی ہے اور نورِ توکّل دل میں ڈال دیتی ہے تب مال جو ایک پارہ جگر سمجھا جاتا ہے بہت آسانی اور شرح صدر سے مومن اُس کو خدا تعالیٰ کی راہ میں دیتا ہے اور وہ ضعف جو بُخل کی حالت میں نومیدی سے پیدا ہوتا ہے اب خدا تعالیٰ پر بہت سی امیدیں ہو کر وہ تمام ضعف جاتا رہتا ہے اور مال دینے والے کی محبّت مال کی محبت سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

پھر بعد اس کے چوتھی حالت ہے جس سے نفسِ امارہ بہت ہی پیار کرتا ہے اور جو تیسری حالت سے بدتر ہے کیونکہ تیسری حالت میں تو صرف مال کا اپنے ہاتھ سے چھوڑنا ہے مگر چوتھی حالت میں نفسِ امارہ کی شہوات محرّمہ کو چھوڑنا ہے اور ظاہر ہے کہ مال کا چھوڑنا بہ نسبت شہوات کے چھوڑنے کے اِنسان پر طبعاً سہل ہوتا ہے اِس لئے یہ حالت بہ نسبت حالاتِ گذشتہ کے بہت شدید اور خطرناک ہے اور فطرۃً انسان کو شہواتِ نفسانیہ کا تعلق بہ نسبت مال کے تعلق کے بہت پیارا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ مال کو جو اُس کے نزدیک مدارِ آسائش ہے بڑی خوشی سے شہواتِ نفسانیہ کی راہ میں فدا کر دیتا ہے اور اس حالت کے خوفناک جوش کی شہادت میں یہ آیت کافی ہے وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ یعنے یہ ایسا تُند زور جوش ہے جو اس کا فرو ہونا کسی بُرہانِ قوی کا محتاج ہے۔ پس ظاہر ہے کہ درجہ چہارم پر قوّتِ ایمانی بہ نسبت درجہ سوم کی بہت قوی اور زبردست ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ کی عظمت اور ہیبت اور جبروت کا مشاہدہ بھی پہلے کی نسبت

اُس میں زیادہ ہوتا ہے اور نہ صرف اس قدر بلکہ یہ بھی اُس میں نہایت ضروری ہے کہ جس لذتِ ممنوعہ کو دُور کیا گیا ہے اس کے عوض میں روحانی طور پر کوئی لذت بھی حاصل ہو اور جیسا کہ بخل کے دُور کرنے کے لئے خدا تعالیٰ کی رازقیت پر قوی ایمان درکار ہے اور خالی جیب ہونے کی حالت میں ایک قوی توکل کی ضرورت ہے تا بخل بھی دُور ہو اور غیبی فتوح پر امید بھی پیدا ہو جائے ایسا ہی شہواتِ ناپاک نفسانیہ کے دُور کرنے کے لئے اور آتشِ شہوت سے مخلصی پانے کے لئے اس آگ کے وجود پر قوی ایمان ضروری ہے جو جسم اور رُوح دونوں کو عذابِ شدید میں ڈالتی ہے اور نیز ساتھ اسکے اُس روحانی لذت کی ضرورت ہے جو ان کثیف لذتوں سے بے نیاز اور مستغنیٰ کر دیتی ہے۔ جو شخص شہواتِ نفسانیہ محرمہ کے پنجہ میں اسیر ہے وہ ایک اژدہا کے مُنہ میں ہے جو نہایت خطرناک زہر رکھتا ہے۔ پس اِس سے ظاہر ہے کہ جیسا کہ لغو حرکات کی بیماری سے بخل کی بیماری بڑھ کر ہے اسیطرح بخل کی بیماری کے مقابل پر شہواتِ نفسانیہ محرمہ کے پنجہ میں اسیر ہونا سب بلاؤں سے زیادہ بلا ہے جو خدا تعالیٰ کے ایک خاص رحم کی محتاج ہے اور جب خدا تعالیٰ کسی کو اس بلا سے نجات دینا چاہتا ہے تو اپنی عظمت اور ہیبت اور جبروت کی ایسی تجلی اس پر کرتا ہے جس سے شہواتِ نفسانیہ محرمہ پارہ پارہ ہو جاتی ہیں اور پھر جمالی رنگ میں اپنی لطیف محبت کا ذوق اُس کے دِل میں ڈالتا ہے اور جس طرح شیر خوار بچہ دُودھ چھوڑنے کے بعد صرف ایک رات تلخی میں گزارتا ہے بعد اس کے اُس دُودھ کو ایسا فراموش کر دیتا ہے کہ چھاتیوں کے سامنے بھی اگر اُس کے مُنہ کو رکھا جاوے تب بھی دُودھ پینے سے نفرت کرتا ہے یہی نفرت شہواتِ محرمہ نفسانیہ سے اُس راستباز کو ہو جاتی ہے جس کو نفسانی دُودھ چھُڑا کر ایک رُوحانی غذا اُس کے عوض میں دی جاتی ہے۔

پھر چوتھی حالت کے بعد پانچویں حالت ہے جس کے مفاسد سے نہایت سخت اور شدید محبت نفسِ امّارہ کو ہے کیونکہ اس مرتبہ پر صرف ایک لڑائی باقی رہ جاتی ہے اور وہ وقت قریب آجاتا ہے کہ حضرت عزت جلشانہ کے فرشتے اس وجود کی تمام آبادی کو فتح کر لیں اور اس پر اپنا پُورا تصرف اور دخل کر لیں اور تمام نفسانی سلسلہ کو درہم برہم کر دیں اور نفسانی قویٰ کے قریہ کو ویران کر دیں اور اس کے نمبرداروں کو ذلیل اور پست کر کے دکھلاویں اور پہلی سلطنت پر ایک تباہی ڈال دیں اور انقلاب سلطنت پر ایسا ہی ہؤا کرتا ہے اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝ اور یہ مومن کے لئے ایک آخری امتحان اور آخری جنگ ہے جس پر اُس کے تمام مراتب سلوک ختم ہو جاتے

ہیں اور اُس کا سلسلہ ترقیات جو کسب اور کوشش سے ہے انتہاء تک پہنچ جاتا ہے اور انسانی کوششیں اپنے اخیر نقطہ تک منزل طے کر لیتی ہیں۔ پھر بعد اس کے صرف موہبت اور فضل کا کام باقی رہ جاتا ہے جو خلقِ آخر کے متعلق ہے اور یہ پانچویں حالت چوتھی حالت سے مشکل تر ہے کیونکہ چوتھی حالت میں تو صرف مومن کا کام یہ ہے کہ شہواتِ محرمہ نفسانیہ کو ترک کرے مگر پانچویں حالت کے مومن کا کام یہ ہے کہ نفس کو بھی ترک کر دے اور اُس کو خدا تعالیٰ کی امانت سمجھ کر خدا تعالیٰ کی طرف واپس کرے اور خدا کے کاموں میں اپنے نفس کو وقف کر کے اُس سے خدمت لے اور خدا کی راہ میں بذل نفس کرنے کا ارادہ رکھے اور اپنے نفس کی نفی وجود کے لئے کوشش کرے کیونکہ جب تک نفس کا وجود باقی ہے گناہ کرنے کے لئے جذبات بھی باقی ہیں جو تقویٰ کے برخلاف ہیں اور نیز جب تک وجودِ نفس باقی ہے ممکن نہیں کہ انسان تقویٰ کی باریک راہوں پر قدم مار سکے یا پورے طور پر خدا کی امانتوں اور عہدوں یا مخلوق کی امانتوں اور عہدوں کو ادا کر سکے لیکن جیسا کہ بخل بغیر توکل اور خدا کی رازقیت پر ایمان لانے کے ترک نہیں ہو سکتا اور شہواتِ نفسانیہ محرمہ بغیر استیلاء ہیبت اور عظمتِ الٰہی اور لذّاتِ روحانیہ کے چھوٹ نہیں سکتیں۔ ایسا ہی یہ مرتبہ عظمیٰ کہ ترکِ نفس کر کے تمام امانتیں خدا تعالیٰ کی اُس کو واپس دی جائیں کبھی حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایک تیز آندھی عشقِ الٰہی کی چل کر کسی کو اُس کی راہ میں دیوانہ نہ بنا دے۔ یہ تو درحقیقت عشقِ الٰہی کے مستوں اور دیوانوں کے کام ہیں دُنیا کے عقلمندوں کے کام نہیں ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید ✽ قرعۂ فال بنامِ من دیوانہ زدند

اِسی کی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ فرماتا ہے اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ ہم نے اپنی امانت کو جو امانت کی طرح واپس دینی چاہیئے تمام زمین و آسمان کی مخلوق پر پیش کیا پس سب نے اُس امانت کے اُٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈرے کہ امانت کے لینے سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو مگر انسان نے اس امانت کو اپنے سر پر اُٹھا لیا کیونکہ وہ ظلوم اور جہول تھا۔ یہ دونوں لفظ انسان کے لئے محل مدح میں ہیں نہ محل مذمت میں اور ان کے معنے یہ ہیں کہ انسان کی فطرت میں ایک صفت تھی کہ وہ خدا کے لئے اپنے نفس پر ظلم اور سختی کر سکتا تھا اور ایسا خدا تعالیٰ کی طرف جھک سکتا تھا کہ اپنے نفس کو فراموش کر دے اِس لئے اس نے منظور کیا کہ اپنے تمام وجود کو امانت کی طرح پاوے اور پھر خدا کی راہ میں خرچ کر دے۔

اور اس پانچویں مرتبہ کے لئے یہ جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ یعنے مومن وہ ہیں جو اپنی امانتوں اور عہدوں کی رعایت رکھتے ہیں یعنے ادائے امانت اور ایفائے عہد کے بارے میں کوئی دقیقہ تقویٰ اور احتیاط کا باقی نہیں چھوڑتے یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اِنسان کا نفس اور اُس کے تمام قویٰ اور آنکھ کی بینائی اور کانوں کی شنوائی اور زبان کی گویائی اور ہاتھوں پیروں کی قوت یہ سب خدا تعالیٰ کی امانتیں ہیں جو اُس نے دی ہیں اور جس وقت وہ چاہے اپنی امانتوں کو واپس لے سکتا ہے پس ان تمام امانتوں کا رعایت رکھنا یہ ہے کہ باریک در باریک تقویٰ کی پابندی سے خدا تعالیٰ کی خدمت میں نفس اور اُس کے تمام قویٰ اور جسم اور اُس کے تمام قویٰ اور جوارح کو لگایا جائے اِس طرح پر کہ گویا یہ تمام چیزیں اُس کی نہیں بلکہ خدا کی ہو جائیں اور اس کی مرضی سے نہیں بلکہ خدا کی مرضی کے موافق ان تمام قویٰ اور اعضاء کا حرکت اور سکون ہو اور اس کا ارادہ کچھ بھی نہ رہے بلکہ خدا کا ارادہ اُن میں کام کرے اور خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں اُس کا نفس ایسا ہو جیسا کہ مُردہ زندہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور یہ خود رائی سے بیدخل ہو اور خدا تعالیٰ کا پُورا تصرّف اُس کے وجود پر ہو جائے یہاں تک کہ اسی سے دیکھے اور اسی سے سُنے اور اسی سے بولے اور اسی سے حرکت یا سکون کرے اور نفس کی دقیق در دقیق آلائشیں جو کسی خوردبین سے بھی نظر نہیں آسکتیں دُور ہو کر فقط رُوح رہ جائے غرض مہیمنت خدا کی اس پر احاطہ کرلے اور اپنے وجود سے اُس کو کھودے اور اس کی حکومت اپنے وجود پر کچھ نہ رہے اور سب حکومت خدا کی ہو جائے اور نفسانی جوش سب مفقود ہو جائیں اور الوہیّت کے ارادے اُس کے وجود میں جوش زن ہو جائیں پہلی حکومت بالکل اُٹھ جائے اور دوسری حکومت دل میں قائم ہو اور نفسانیت کا گھر ویران ہو اور اُس جگہ پر حضرت عزّت کے خیمے لگائے جائیں اور ہیبت اور جبروتِ الٰہی تمام اُن پَودوں کو جن کی آبپاشی گندے چشمۂ نفس سے ہوتی تھی اس پلید جگہ سے اکھیڑ کر رضا جوئی حضرت عزّت کی پاک زمین میں لگا دئے جائیں اور تمام آرزوئیں اور تمام ارادے اور تمام خواہشیں خدا میں ہو جائیں اور نفسِ امّارہ کی تمام عمارتیں مُنہدم کرکے خاک میں ملا دی جائیں اور ایک ایسا پاک محل تقدّس اور تطہّر کا دل میں تیار کیا جاوے جس میں حضرت عزّت نازل ہو سکے اور اس کی رُوح اس میں آباد ہو سکے اس قدر تکمیل کے بعد کہا جائے گا کہ وہ امانتیں جو منعمِ حقیقی نے اِنسان کو دی تھیں وہ واپس کی گئیں تب ایسے شخص پر یہ آیت صادق آئے گی وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ اِس درجہ پر صرف ایک قالب تیار

ہوتا ہے اور تجلّیٔ الٰہی کی رُوح جس سے مراد محبّتِ ذاتیہ حضرت عزّت ہے بعد اس کے مع رُوح القدس ایسے مومن کے اندر داخل ہوتی اور نئی حیات اس کو بخشتی ہے اور ایک نئی قوّت اس کو عطا کی جاتی ہے اور اگرچہ یہ سب کچھ رُوح کے اثر سے ہی ہوتا ہے لیکن ہنوز رُوح مومن سے صرف ایک تعلق رکھتی ہے اور ابھی مومن کے دِل کے اندر آباد نہیں ہوتی۔

پھر بعد اس کے وجودِ رُوحانی کا مرتبہ ششم ہے یہ وہی مرتبہ ہے جس میں مومن کی محبّتِ ذاتیہ اپنے کمال کو پہنچ کر اللہ جلّ شانہٗ کی محبّتِ ذاتیہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے تب خدا تعالیٰ کی وہ محبّتِ ذاتی مومن کے اندر داخل ہوتی اور اس پر احاطہ کرتی ہے جس سے ایک نئی اور فوق العادت طاقت مومن کو ملتی ہے اور وہ ایمانی طاقت ایمان میں ایک ایسی زندگی پیدا کرتی ہے جیسے ایک قالبِ بے جان میں رُوح داخل ہوجاتی ہے بلکہ وہ مومن میں داخل ہو کر درحقیقت ایک رُوح کا کام کرتی ہے تمام قویٰ میں اس سے ایک نور پیدا ہوتا ہے اور رُوح القدس کی تائید ایسے مومن کے شاملِ حال ہوتی ہے کہ وہ باتیں اور وہ علوم جو انسانی طاقت سے برتر ہیں وہ اس درجہ کے مومن پر کھولے جاتے ہیں اور اس درجہ کا مومن ایمانی ترقیات کے تمام مراتب طے کر کے ان ظلّی کمالات کی وجہ سے جو حضرتِ عزّت کے کمالات سے اس کو ملتے ہیں آسمان پر خلیفۃ اللہ کا لقب پاتا ہے کیونکہ جیسا کہ ایک شخص جب آئینہ کے مقابل پر کھڑا ہوتا ہے تو تمام نقوش اس کے مُنہ کے نہایت صفائی سے آئینہ میں مُنعکس ہو جاتے ہیں ایسا ہی اِس درجہ کا مومن جو نہ صرف ترکِ نفس کرتا ہے بلکہ نفیٔ وجود اور ترکِ نفس کے کام کو اس درجہ کے کمال تک پہنچاتا ہے کہ اس کے وجود میں سے کچھ بھی نہیں رہتا اور صرف آئینہ کے رنگ میں ہوجاتا ہے تب ذاتِ الٰہی کے تمام نقوش اور تمام اَخلاق اس میں مندرج ہوجاتے ہیں اور جیسا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ آئینہ جو ایک سامنے کھڑے ہونے والے مُنہ کے تمام نقوش اپنے اندر لیکر اس مُنہ کا خلیفہ ہو جاتا ہے اِسی طرح ایک مومن بھی ظلّی طور پر اَخلاق اور صفاتِ الٰہیّہ کو اپنے اندر لے کر خلافت کا درجہ اپنے اندر حاصل کرتا ہے اور ظلّی طور پر الٰہی صورت کا مظہر ہو جاتا ہے اور جیسا کہ خدا غیب الغیب ہے اور اپنی ذات میں وراء الوراء ہے ایسا ہی یہ مومنِ کامل اپنی ذات میں غیب الغیب اور وراء الوراء ہوتا ہے۔ دُنیا اس کی حقیقت تک پہنچ نہیں سکتی کیونکہ وہ دُنیا کے دائرہ سے بہت ہی دُور چلا جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ خدا جو غیر متبدّل اور حیّ و قیّوم ہے وہ مومنِ کامل کی اُس پاک تبدیلی کے بعد جبکہ مومن خدا کے لئے اپنا وجود بالکل کھو دیتا ہے اور ایک نیا چولہ پاک تبدیلی کا پہن کر اس میں سے اپنا سر نکالتا ہے تب خدا بھی اس کے لئے اپنی ذات میں ایک تبدیلی

کرتا ہے مگر یہ نہیں کہ خدا کی اَزلی اَبدی صفات میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے نہیں۔ بلکہ وہ قدیم سے اور اَزل سے غیر متبدل ہے لیکن یہ صرف مومن کامل کے لئے جلوۂ قدرت ہوتا ہے اور ایک تبدیلی جس کی ہم کُنہ نہیں سمجھ سکتے مومن کی تبدیلی کے ساتھ خدا میں بھی ظہور میں آجاتی ہے مگر اِس طرح پر کہ اُس کی غیر متبدل ذات پر کوئی گرد وغبار حدوث کا نہیں بیٹھتا وہ اسی طرح غیر متبدل ہوتا ہے جس طرح وہ قدیم سے ہے لیکن یہ تبدیلی جو مومن کی تبدیلی کے وقت ہوتی ہے یہ اس قسم کی ہے جیسا کہ لکھا ہے کہ جب مومن خدا تعالیٰ کی طرف حرکت کرتا ہے تو خدا اُس کی نسبت تیز حرکت کے ساتھ اُس کی طرف آتا ہے اور ظاہر ہے کہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ تبدیلیوں سے پاک ہے ایسا ہی وہ حرکتوں سے بھی پاک ہے لیکن یہ تمام الفاظ استعارہ کے رنگ میں بولے جاتے ہیں اور بولنے کی اِس لئے ضرورت پڑتی ہے کہ تجربہ شہادت دیتا ہے کہ جیسے ایک مومن خدا تعالیٰ کی راہ میں نیستی اور فنا اور استہلاک کرکے اپنے تئیں ایک نیا وجود بناتا ہے اس کی ان تبدیلیوں کے مقابل پر خدا بھی اس کے لئے ایک نیا ہو جاتا ہے اور اسکے ساتھ وہ معاملات کرتا ہے جو دوسرے کے ساتھ کبھی نہیں کرتا اور اس کو اپنے ملکوت اور اسرار کا وہ سَیر کراتا ہے جو دوسرے کو ہرگز نہیں دکھلاتا اور اس کے لئے وہ کام اپنے ظاہر کرتا ہے جو دوسروں کے لئے ایسے کام کبھی ظاہر نہیں کرتا اور اس قدر اس کی نصرت اور مدد کرتا ہے کہ لوگوں کو تعجب میں ڈالتا ہے اُس کے لئے خوارق دکھلاتا ہے اور معجزات ظاہر کرتا اور ہر ایک پہلو سے اس کو غالب کر دیتا ہے اور اُس کی ذات میں ایک قوّتِ کشش رکھ دیتا ہے جس سے ایک جہان اُس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اور وہی باقی رہ جاتے ہیں جن پر شقاوتِ اَزلی غالب ہے۔

پس اِن تمام باتوں سے ظاہر ہے کہ مومنِ کامل کی پاک تبدیلی کے ساتھ خدا تعالیٰ بھی ایک نئی صورت کی تجلی سے اُس پر ظاہر ہوتا ہے یہ اِس بات کا ثبوت ہے کہ اُس نے انسان کو اپنے لئے پیدا کیا ہے کیونکہ جب انسان خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرنا شروع کرے تو اُسی دن سے بلکہ اُسی گھڑی سے بلکہ اُسی دَم سے خدا تعالیٰ کا رجوع اُس کی طرف شروع ہو جاتا ہے اور وہ اُس کا متولّی اور متکفّل اور حامی اور ناصر بن جاتا ہے اور اگر ایک طرف تمام دُنیا ہو اور ایک طرف مومنِ کامل تو آخر غلبہ اسی کو ہوتا ہے کیونکہ خدا اپنی محبت میں صادق ہے اور اپنے وعدوں میں پُورا۔ وہ اُس کو جو درحقیقت اُس کا ہو جاتا ہے ہرگز ضائع نہیں کرتا۔ ایسا مومن آگ میں ڈالا جاتا ہے اور گلزار میں سے نکلتا ہے وہ ایک گرداب میں دھکیل دیا جاتا ہے اور ایک خوشنما باغ میں سے نمودار ہوتا ہے دشمن اس کے لئے بہت منصوبے کرتے اور اس کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں لیکن خدا اُن کے تمام مکروں

اور منصوبوں کو پاش پاش کر دیتا ہے کیونکہ وہ اس کے ہر قدم کے ساتھ ہوتا ہے اِس لئے آخر اُس کے ذلت چاہنے والے ذِلت کی مار سے مرتے ہیں اور نامرادی اُن کا انجام ہوتا ہے لیکن وہ جو اپنے تمام دل اور تمام جان اور تمام ہمت کے ساتھ خدا کا ہو گیا ہے وہ نامراد ہرگز نہیں مرتا اور اس کی عمر میں برکت دی جاتی ہے اور ضرور ہے کہ وہ جیتا رہے جب تک اپنے کاموں کو پُورا کرلے۔ تمام برکتیں اِخلاص میں ہیں اور تمام اخلاص خدا کی رضا جوئی میں اور تمام خدا کی رضا جوئی اپنی رضا کے چھوڑنے میں یہی موت ہے جس کے بعد زندگی ہے مبارک وہ جو اس زندگی میں سے حصّہ لے۔

اب واضح ہو کہ جہاں تک ہم نے سورۃ المؤمنون کی آیات ممدوحہ بالا کے مُعجزہ ہونے کی نسبت لکھنا تھا وہ سب ہم لکھ چکے اور بخوبی ثابت کر چکے کہ سورہ موصوفہ کی ابتداء میں مومن کے وجودِ رُوحانی کے چھ مراتب قرار دیئے ہیں اور مرتبہ ششم خلقِ آخر کا رکھا ہے یہی مراتب ستّہ سورۃ موصوفہ بالا میں جسمانی پیدائش کے بارہ میں بعد ذکر پیدائش رُوحانی بیان فرمائے گئے ہیں اور یہ ایک علمی اعجاز ہیں اور یہ علمی نکتہ قرآن شریف سے پہلے کسی کتاب میں مذکور نہیں ہے۔ پس اِن آیات کا آخری حصّہ یعنی فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ بلاشبہ ایک علمی مُعجزہ کی جڑ ہے کیونکہ وہ ایک اعجازی موقع پر چسپاں کیا گیا ہے اور انسان کے لئے یہ بات ممکن نہیں کہ اپنے بیان میں ایسی اعجازی صورت پیدا کرے اور پھر اس پر آیت فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ چسپاں کرے اور اگر کوئی کہے کہ اس پر کیا دلیل ہے کہ آیات مذکورہ بالا میں جو مقابلہ انسان کے مراتب پیدائش روحانی اور پیدائش جسمانی میں دکھلایا گیا ہے وہ علمی معجزہ ہے تو اِس کا جواب یہ ہے کہ معجزہ اس کو کہتے ہیں کہ کوئی انسان اس کے مثل بنانے پر قادر نہ ہو سکے یا گذشتہ زمانہ میں قادر نہ ہو سکا ہو اور نہ بعد میں قادر ہونے کا ثبوت ہو۔ پس ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ یہ بیان اِنسانی پیدائش کی دقیق فلاسفی کا جو قرآن شریف میں مندرج ہے یہ ایک ایسا بے مثل و مانند بیان ہے کہ اس کی نظیر پہلے اس سے کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی۔ نہ اِس زمانہ میں ہم نے سُنا کہ کسی ایسے شخص کو جو قرآن شریف کا علم نہیں رکھتا اس فلاسفی کے بیان کرنے میں قرآن شریف سے توارد ہوا ہو اور جبکہ قرآن شریف اپنے جمیع معارف اور نشانوں اور فصاحت بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہونے کا دعوے کرتا ہے اور یہ آیات قرآن شریف کا ایک حصّہ ہے جو دعوئ اعجاز میں داخل ہے پس اُس کا بے مثل و مانند ثابت ہونا باوجود دعوئے اعجاز اور طلب مقابلہ کے بلاشُبہ مُعجزہ ہے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ

پنجم صفحہ ۴۳ تا ۴۸)

جب تک انسان کتاب اللہ کو مقدم نہیں کرتا اور اس کے مطابق عمل درآمد نہیں کرتا تب تک اس کی نمازیں محض وقت کا ضائع کرنا ہے۔ قرآن مجید میں تو صاف طور پر لکھا ہے قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۙ الَّذِیۡنَ هُمۡ فِیۡ صَلَاتِهِمۡ خٰشِعُوۡنَ یعنی جب دُعا کرتے کرتے اِنسان کا دِل پگھل جائے اور آستانۂ اُلوہیت پر ایسے خلوص اور صدق سے گِر جاوے کہ بس اسی میں محو ہو جاوے اور سب خیالات کو مٹا کر اسی سے فیض اور استعانت طلب کرے اور ایسی یکسوئی حاصل ہو جائے کہ ایک قِسم کی رِقّت اور گداز پیدا ہو جائے تب فلاح کا دروازہ کُھل جاتا ہے جس سے دُنیا کی محبّت ٹھنڈی ہو جاتی ہے کیونکہ دُو محبّتیں ایک جگہ جمع نہیں رہ سکتیں جیسے لکھا ہے ؎

ہم خدا خواہی و ہم دُنیائے دُوں ✽ ایں خیال است و محال است وجنوں

اِسی لئے اس کے بعد ہی خدا فرماتا ہے وَالَّذِیۡنَ هُمۡ عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ ۙ یہاں لغو سے مُراد دُنیا ہے یعنی جب انسان کو نمازوں میں خشوع اور خضوع حاصل ہونے لگ جاتا ہے تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دُنیا کی محبت اس کے دل سے ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ اِس سے یہ مراد نہیں کہ پھر وہ کاشتکاری، تجارت، نوکری وغیرہ چھوڑ دیتا ہے بلکہ وہ دُنیا کے ایسے کاموں سے جو دھوکہ دینے والے ہوتے ہیں اور جو خدا سے غافل کر دیتے ہیں اِعراض کرنے لگ جاتا ہے اور ایسے لوگوں کی گِریہ وزاری اور تضرّع اور اِبتہال اور خدا کے حضور عاجزی کرنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ایسا شخص دین کی محبّت کو دُنیا کی محبّت، حرص، لالچ اور عیش و عشرت سب پر مقدّم کر لیتا ہے کیونکہ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ ایک نیک فعل دوسرے نیک فعل کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور ایک بدفعل دوسرے بدفعل کو ترغیب دیتا ہے جب وہ لوگ اپنی نمازوں میں خشوع خضوع کرتے ہیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طبعاً وہ لغو سے اِعراض کرتے ہیں اور اِس گندی دُنیا سے نجات پا جاتے ہیں اور اس دُنیا کی محبّت ٹھنڈی ہو کر خدا کی محبّت ان میں پیدا ہو جاتی ہے جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ هُمۡ لِلزَّکٰوۃِ فٰعِلُوۡنَ ۙ یعنی وہ خدا کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور یہ ایک نتیجہ ہے عَنِ اللَّغۡوِ مُعۡرِضُوۡنَ کا۔ کیونکہ جب دُنیا سے محبّت ٹھنڈی ہو جائے گی تو اس کا لازمی نتیجہ ہوگا کہ وہ خدا کی راہ میں خرچ کریں گے اور خواہ قارون کے خزانے بھی ایسے لوگوں کے پاس جمع ہوں وہ پرواہ نہیں کریں گے اور خدا کی راہ میں دینے سے نہیں جھجکیں گے۔ ہزاروں آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ وہ زکوٰۃ نہیں دیتے یہاں تک کہ اُن کی قوم کے بہت سے غریب اور مُفلس آدمی تباہ اور ہلاک ہو جاتے ہیں

مگر وہ ان کی پرواہ بھی نہیں کرتے حالانکہ خدا تعالیٰ کی طرف سے ہر ایک چیز پر زکوٰۃ دینے کا حکم ہے یہاں تک کہ زیور پر بھی۔ ہاں جواہرات وغیرہ چیزوں پر نہیں۔ اور جو امیر، نواب اور دولت مند لوگ ہوتے ہیں اُن کو حکم ہے کہ وہ شرعی احکام کے بموجب اپنے خزانوں کا حساب کرکے زکوٰۃ دیں لیکن وہ نہیں دیتے اِس لئے خدا فرماتا ہے کہ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ کی حالت تو اُن میں تب پیدا ہوگی جب وہ زکوٰۃ بھی دیں گے گویا زکوٰۃ کا دینا لغو سے اِعراض کرنے کا ایک نتیجہ ہے۔

پھر اس کے بعد فرمایا وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ یعنی جب وہ لوگ اپنی نمازوں میں خشوع خضوع کریں گے۔ لغو سے اِعراض کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ لوگ اپنے سوراخوں کی حفاظت کریں گے کیونکہ جب ایک شخص دین کو دُنیا پر مقدم رکھتا ہے اور اپنے مال کو خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے وہ کسی اَور کے مال کو ناجائز طریقہ سے کب حاصل کرنا چاہتا ہے اور کب چاہتا ہے کہ مَیں کسی دوسرے کے حقوق کو دباؤں اور جب وہ مال جیسی عزیز چیز کو خدا کی راہ میں قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتا تو پھر آنکھ، ناک، کان، زبان وغیرہ کو غیر محل پر کب استعمال کرنے لگا کیونکہ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب ایک شخص اوّل درجہ کی نیکیوں کی نسبت اِس قدر محتاط ہوتا ہے تو اَدنیٰ درجہ کی نیکیاں خود بخود عمل میں آتی جاتی ہیں مثلاً جب خشوع خضوع سے دُعا مانگنے لگا تو پھر اس کے ساتھ ہی لغو سے بھی اِعراض کرنا پڑا اور جب لغو سے اِعراض کیا تو پھر زکوٰۃ کے ادا کرنے میں دلیر ہونے لگا اور جب اپنے مال کی نسبت وہ اِس قدر محتاط ہوگیا تو پھر غیروں کے حقوق چھیننے سے بدرجہ اَولیٰ بچنے لگا اِس لئے اس کے آگے فرمایا وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ کیونکہ جو شخص دوسرے کے حق میں دست اندازی نہیں کرتا اور جو حقوق اس کے ذِمّہ ہیں ان کو ادا کرتا ہے اُس کے لئے لازمی ہے کہ وہ اپنے عہدوں کا پکّا ہو اور دوسرے کی امانتوں میں خیانت کرنے سے بچنے والا ہو اِس لئے بطور نتیجہ کے فرمایا کہ جب ان لوگوں میں یہ وصف پائے جاتے ہوں تو پھر لازمی بات ہے کہ وہ اپنے عہدوں کے بھی پکّے ہوں گے۔ پھر ان سب باتوں کے بعد فرمایا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ یعنی ایسے ہی لوگ ہیں جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں اور کبھی ناغہ نہیں کرتے اور انسان کی پیدائش کی اصل غرض بھی یہی ہے کہ وہ نماز کی حقیقت سیکھے جیسے فرمایا وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ یعنی ایماندار وہ لوگ ہیں جو لغو کاموں سے

پرہیز کرتے ہیں اور اپنا وقت بیہودہ کاموں میں نہیں کھوتے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۳۸۵ حاشیہ در حاشیہ نمبر ۳)

لغو سے اعراض کرنا مومن کی شان ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

مومن وہ ہوتے ہیں جو لغو باتوں سے اعراض کرتے ہیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۷ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

ایک اور اعتراض ہے جو بعض ناواقف آریہ پیش کیا کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یعنی خدا نے جو تمہارا رب ہے زمین اور آسمانوں کو چھ دن میں بنایا اور پھر عرش پر ٹھہرا۔ یہ چھ دن کی کیوں تخصیص ہے۔ یہ تو تسلیم کیا کہ خدا تعالیٰ کے کام اکثر تدریجی ہیں جیسا کہ اب بھی اس کی خالقیت جو جمادات اور نباتات اور حیوانات میں اپنا کام کر رہی ہے تدریجی طور پر ہی ہر ایک چیز کو اس کی خلقت کاملہ تک پہنچاتی ہے لیکن چھ دن کی تخصیص کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔

امّا الجواب پس واضح ہو کہ یہ چھ دن کا ذکر درحقیقت مراتب تکوینی کی طرف اشارہ ہے یعنی ہر یک چیز جو بطور خلق صادر ہوئی ہے اور جسم اور جسمانی ہے خواہ وہ مجموعہ عالم ہے اور خواہ ایک فرد از افرادِ عالم اور خواہ وہ عالم کبیر ہے جو زمین و آسمان و مافیہما سے مراد ہے اور خواہ وہ عالم صغیر جو انسان سے مراد ہے وہ بحکمت و قدرت باری تعالیٰ پیدائش کے چھ مرتبے طے کر کے اپنے کمال خلقت کو پہنچتی ہے اور یہ عام قانونِ قدرت ہے۔ کچھ ابتدائی زمانہ سے خاص نہیں چنانچہ اللہ جلّ شانہٗ ہر ایک انسان کی پیدائش کی نسبت بھی انہیں مراتبِ ستّہ کا ذکر فرماتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کے اٹھارھویں سیپارے سورۃ المؤمنون میں یہ آیت ہے وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّكِیْنٍ ۪ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ؕ یعنی پہلے تو ہم نے انسان کو اس مٹی سے پیدا کیا جو زمین کے تمام انواع اور اقسام کا لبّ لباب تھا اور اس کی تمام قوتیں اپنے اندر رکھتا تھا تا وہ باعتبار جسم بھی عالمِ صغیر ٹھہرے اور زمین کی تمام چیزوں کی اس میں قوت اور خاصیت ہو جیسا کہ وہ برطبق آیت فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ باعتبار رُوح عالمِ صغیر اور بلحاظ شیون و صفاتِ کاملہ و ظلّیت تام

رُوحِ الٰہی کا مظہر تام ہے۔ پھر بعد اس کے انسان کو ہم نے دوسرے طور پر پیدا کرنے کے لئے یہ طریق جاری کیا جو انسان کے اندر نطفہ پیدا کیا اور اس نطفہ کو ہم نے ایک مضبوط تھیلی میں جو ساتھ ہی رِحم میں بنتے جاتے ہی جگہ دی (قَرَارٍ مَّکِیْن کا لفظ اِس لئے اختیار کیا گیا کہ تا رِحم اور تھیلی دونوں پر اطلاق پاسکے) اور پھر ہم نے نطفہ سے عَلَقہ بنایا اور عَلَقہ سے مُضغہ اور مُضغہ کے بعض حصّوں میں سے ہڈیاں اور ہڈیوں پر پوست پیدا کیا۔ پھر اس کو ایک اَور پیدائش دی یعنی رُوح اُس میں ڈال دی۔ پس کیا ہی مبارک ہے وہ خدا جو اپنی صنعت کاری میں تمام صنّاعوں سے بلحاظ حُسنِ صنعت وکمال عجائباتِ خلقت بڑھا ہوا ہے۔

اب دیکھو کہ خدا تعالیٰ نے اِس جگہ بھی اپنا قانونِ قدرت یہی بیان فرمایا کہ انسان چھ طور کے خِلقت کے مدارج طے کرکے اپنے کمالِ انسانیت کو پہنچتا ہے اور یہ تو ظاہر ہے کہ عالَمِ صغیر اور عالَمِ کبیر میں نہایت شدید تشابہ ہے اور قرآن سے انسان کا عالَمِ صغیر ہونا ثابت ہے اور آیت لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ اِسی کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ تقویمِ عالَم کی متفرق خوبیوں اور حُسنوں کا ایک ایک حصّہ انسان کو دے کر بوجہ جامعیتِ جمیع شمائل وشیونِ عالَم اس کو اَحسن ٹھہرایا گیا ہے۔ پس اب بوجہ تشابہ عالَمین اور نیز بوجہ ضرورت تناسب افعال صانع واحد ماننا پڑتا ہے کہ جو عالَمِ صغیر میں مراتب تکوین موجود ہیں وہی مراتب تکوین عالَمِ کبیر میں بھی ملحوظ ہوں اور ہم صریح اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ یہ عالَمِ صغیر جو انسان کے اِسم سے موسوم ہے اپنی پیدائش میں چھ طریق رکھتا ہے اور کچھ شک نہیں کہ یہ عالَم عالَمِ کبیر کے کوائفِ مخفیہ کی شناخت کے لئے ایک آئینہ کا حکم رکھتا ہے۔ پس جبکہ اُس کی پیدائش کے چھ مرتبے ثابت ہوئے تو قطعی طور پر یہ حکم دے سکتے ہیں کہ عالَمِ کبیر کے بھی مراتب تکوین چھ ہی ہیں جو بلحاظ مؤثرات ستّہ یعنی تجلّیاتِ ستّہ جن کے آثار باقیہ نجوم ستّہ میں محفوظ رہ گئے ہیں معقولی طور پر متحقق ہوتے ہیں اور نجوم ستّہ کا اَب بھی علوم حکمیہ میں جنین کی تکمیل کے لئے تعلق مانا جاتا ہے چنانچہ سدیدی میں اسکے متعلق ایک مبسوط بحث لکھی ہے۔ بعض نادان اِس جگہ اِس آیت کی نسبت یہ اعتراض پیش کرتے ہیں کہ حال کی طبّی تحقیقاتوں کی رُو سے یہ طرز بچّہ کے بننے کی جو رِحمِ عورت میں بنتا ہے ثابت نہیں ہوتی بلکہ برخلاف اس کے ثابت ہوتا ہے لیکن یہ اعتراض سخت درجہ کی کم فہمی یا صریح تعصّب پر مبنی ہے۔ اِس بات کے تجربہ کے لئے کسی ڈاکٹر یا طبیب کی حاجت نہیں۔ خود ہر یک انسان اِس آزمائش کے لئے وقت خرچ کرکے اور اُن بچّوں کو دیکھ کر جو تام خلقت یا ناتمام خلقت کی حالت میں

پیدا ہوتے ہیں یا سقوطِ حمل کے طور پر گرتے ہیں حقیقتِ واقعیہ تک پہنچ سکتا ہے اور جیسا کہ ہم اپنے ذاتی مشاہدہ سے جانتے ہیں بلا شبہ یہ بات صحیح ہے کہ جب خدا تعالیٰ انسانی نطفہ سے کسی بچہ کو رِحم میں بنانے کے لئے ارادہ فرماتا ہے تو پہلے مرد اور عورت کا نطفہ رِحم میں ٹھہرتا ہے اور صرف چند روز تک اُن دونوں مَنیوں کے اِمتزاج سے کچھ تغیّر طاری ہو کر جمے ہوئے خون کی طرح ایک چیز ہو جاتی ہے جس پر ایک نرم سی جِھلی ہوتی ہے یہ جِھلی جیسے جیسے بچہ بڑھتا ہے بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ خاکی رنگ کی ایک تھیلی سی ہو جاتی ہے جو گٹھڑی کی طرح نظر آتی ہے اور اپنی تکمیلِ خلقت کے دنوں تک بچہ اسی میں ہوتا ہے۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے اور حال کی تحقیقاتیں بھی اس کی مصدق ہیں کہ عالَمِ کبیر بھی اپنے کمالِ خلقت کے وقت تک ایک گٹھڑی کی طرح تھا جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰھُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ الجزو نمبر ۷، یعنی فرماتا ہے کہ کیا کافروں نے آسمان اور زمین کو نہیں دیکھا کہ گٹھڑی کی طرح آپس میں بندھے ہوئے تھے اور ہم نے ان کو کھول دیا۔ سو کافروں نے تو آسمان اور زمین بنتا نہیں دیکھا اور نہ اُن کی گٹھڑی دیکھی لیکن اِس جگہ رُوحانی آسمان اور رُوحانی زمین کی طرف اشارہ ہے جس کی گٹھڑی کفارِ عرب کے رُوبرو کُھل گئی اور فیضانِ سماوی زمین پر جاری ہو گئے اب پھر ہم اپنے پہلے کلام کی طرف عَود کر کے کہتے ہیں کہ نطفتین مرد اور عورت کے جو آپس میں مِل جاتے ہیں وہ اوّل مرتبہ تکوین کا ہے اور پھر اُن میں ایک جوش آ کر وہ مجموعہ نطفتین جو قوت قاعدہ اور منعقدہ اپنے اندر رکھتا ہے سُرخی کی طرف مائل ہو جاتا ہے گویا وہ مَنی جو پہلے خون سے بنی تھی پھر اپنے اصلی رنگ کی طرف جو خونی ہے عَود کر آتی ہے یہ دوسرا درجہ ہے۔ پھر وہ خون جما ہوا جس کا نام عَلَقہ ہے ایک گوشت کا مُضغہ ہو جاتا ہے جو انسانی شکل کا کچھ خاکہ نہایت دقیق طور پر اپنے اندر رکھتا ہے یہ تیسرا درجہ ہے اور اِس درجہ پر اگر بچہ ساقط ہو جائے تو اس کے دیکھنے سے غور کی نظر سے کچھ خطوط انسان بننے کے اُس میں دکھائی دیتے ہیں چنانچہ اکثر بچے اِس حالت میں بھی ساقط ہو جاتے ہیں۔ جن عورتوں کو کبھی یہ اِتفاق پیش آیا ہے یا وہ دایہ کا کام کرتی ہیں وہ اِس حال سے خوب واقف ہیں۔ پھر چوتھا درجہ وہ ہے جب مُضغہ سے ہڈیاں بنائی جاتی ہیں جیسا کہ آیت فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا بیان فرما رہی ہے مگر اَلْمُضْغَةَ پر جو الف لام ہے وہ تخصیص کے لئے ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ تمام مُضغہ ہڈی نہیں بن جاتا بلکہ جہاں جہاں ہڈیاں درکار ہیں باذنہٖ تعالیٰ وہی نرم گوشت کسی قدر صُلب ہو کر ہڈی کی صورت بن جاتا ہے اور کسی قدر بدستور نرم گوشت رہتا ہے اور اِس درجہ

پر انسانی شکل کا کھلا کھلا خاکہ تیار ہو جاتا ہے جس کے دیکھنے کے لئے کسی خورد بین کی ضرورت نہیں۔
اِس خاکہ میں انسان کا اصل وجود جو کچھ بننا چاہیئے تھا بن چکتا ہے لیکن وہ بھی اُس لحم سے خالی ہوتا ہے
جو انسان کے لئے بطور ایک موٹے اور شاندار اور چمکیلے لباس کے ہے جس سے انسان کے تمام خط و
خال ظاہر ہوتے ہیں اور بدن پر تازگی آتی ہے اور خوبصورتی نمایاں ہو جاتی ہے اور تناسبِ اعضاء
پیدا ہوتا ہے۔ پھر بعد اِس کے پانچواں درجہ وہ ہے کہ جب اُس خاکہ پر لحم یعنی موٹا گوشت برعایت مواضع
مناسبہ چڑھایا جاتا ہے۔ یہ وہی گوشت ہے کہ جب انسان تپ وغیرہ سے بیمار رہتا ہے تو فاقہ اور بیماری
کی تکالیفِ شاقہ سے وہ گوشت تحلیل ہو جاتا ہے اور بسا اوقات اِنسان ایسی لاغری کی حالت پر پہنچ جاتا
ہے جو وہی پانچویں درجہ کا خاکہ یعنی مُشتِ استخوان رہ جاتا ہے جیسے مدقوقوں اور مسلولوں اور اصحاب
ذیابطیس میں مرض کے انتہائی درجہ میں یہ صورت ظاہر ہو جاتی ہے اور اگر کسی کی حیات مقدّر ہوتی
ہے تو پھر خدا تعالیٰ اس کے بدن پر گوشت چڑھاتا ہے۔ غرض یہ وہی گوشت ہے جس سے خوبصورتی اور
تناسب اعضاء اور رونق پیدا ہوتی ہے اور کچھ شک نہیں کہ یہ گوشت خاکہ کے تیار ہونے کے بعد آہستہ
آہستہ جنین پر چڑھتا رہتا ہے اور جب جنین ایک کافی حصّہ اس کا لے لیتا ہے تب باذنہٖ تعالیٰ اُس میں جان
پڑ جاتی ہے تب وہ نباتی حالت سے جو صرف نشو و نما ہے منتقل ہو کر حیوانی حالت کی خاصیت پیدا کر لیتا ہے
اور پیٹ میں حرکت کرنے لگتا ہے۔ غرض یہ ثابت شدہ بات ہے کہ بچّہ اپنی نباتی صورت سے حیوانی صورت
کو کامل طور پر اُس وقت قبول کرتا ہے کہ جبکہ عام طور پر موٹا گوشت اُس کے بدن پر مناسب کمی بیشی
کے ساتھ چڑھ جاتا ہے۔ یہی بات ہے جس کو کہ آج تک انسان کے مسلسل تجارت اور مشاہدات نے ثابت
کیا ہے۔ یہ وہی تمام صورت ہے جو قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے اور مشاہدات کے ذریعہ سے بتواتر
ثابت ہے۔ پھر اس پر اعتراض کرنا اگر نادانوں کا کام نہیں تو اَور کس کا ہے۔

اب پھر ہم اپنے پہلے کلام کی طرف رجوع کر کے لکھتے ہیں کہ چونکہ عالمِ صغیر میں جو انسان ہے
سُنّت اللہ یہی ثابت ہوئی ہے کہ اُس کے وجود کی تکمیل چھ مرتبوں کے طے کرنے کے بعد ہوتی ہے تو اِس
قانونِ قدرت کی رہبری سے ہمیں معقولی طور پر یہ راہ ملتی ہے کہ دُنیا کی ابتداء میں جو اللہ جلّ شانہٗ نے
عالمِ کبیر کو پیدا کیا تو اُس کی طرزِ پیدائش میں بھی یہی مراتبِ ستّہ ملحوظ رکھے ہوں گے اور ہر ایک مرتبہ
کو تفریق اور تقسیم کی غرض سے ایک دِن یا ایک وقت سے مخصوص کیا ہو گا جیسا کہ انسان کی پیدائش
کے مراتبِ ستّہ چھ وقتوں سے خاص ہیں اور دُنیا کی تمام قوموں کا سات دنوں پر اتفاق ہونا اور
ایک دن تعطیل کا نکال کر چھ دنوں کو کاموں کے لئے خاص کرنا اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ چھ دن

اُن چھ دنوں کی یادگار چلے آتے ہیں کہ جن میں زمین و آسمان اور جو کچھ اُن میں ہے بنایا گیا تھا۔
اور اگر کوئی اب بھی تسلیم نہ کرے اور انکار سے باز نہ آوے تو ہم کہتے ہیں کہ ہم نے تو عالمِ کبیر کیلئے عالمِ صغیر کی پیدائش کے مراتبِ ستّہ کا ثبوت دے دیا اور جو کام کرنے کے دن بالاتفاق ہر یک قوم میں مسلّم ہیں اُن کا چھ ہونا بھی ظاہر کر دیا اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ خدا تعالیٰ کے تمام پیدائشی کام اِس دُنیا میں تدریجی ہیں تو پھر اگر مُنکر کی نظر میں یہ دلیل کافی نہیں تو اس پر واجب ہوگا کہ وہ بھی تو اپنے اس دعوے پر کوئی دلیل پیش کرے کہ خدا تعالیٰ نے یہ عالمِ جسمانی صرف ایک دَم میں پیدا کر دیا تھا تدریجی طور پر پیدا نہیں کیا تھا۔ ہر ایک شخص جانتا ہے کہ وہی خدا اب بھی ہے جو پہلے تھا اور وہی خالقیت کا سِلسلہ اب بھی جاری ہے جو پہلے جاری تھا اور صاف بدیہی طور پر نظر آرہا ہے کہ خدا تعالیٰ ہر یک مخلوق کو تدریجی طور پر اپنے کمال وجود تک پہنچاتا ہے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ پہلے وہ قوی تھا اور جلد کام کر لیتا تھا اور اب ضعیف ہے اور دیر سے کرتا ہے بلکہ یہی کہیں گے کہ اُس کا قانونِ قدرت ہی ابتداء سے یہی ہے کہ وہ ہر یک مخلوق کو بتدریج پیدا کرتا ہے۔ سو حال کے افعالِ الٰہی ہمیں بتلا رہے ہیں کہ گذشتہ اور ابتدائی زمانہ میں بھی یہی تدریج ملحوظ تھی جو اَب ہے ہم سخت نادان ہوں گے اگر ہم حال کے آئینہ میں گذشتہ کی صورت نہ دیکھ لیں اور حال کی طرزِ خالقیت پر نظر ڈال کر صرف اتنا ہی ثابت نہیں ہوتا کہ خدا تعالیٰ اپنی پیدائش کے سلسلہ کو تدریج سے کمال وجود تک پہنچاتا ہے بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر یک مخلوق کی پیدائش میں چھ ہی مرتبے رکھے ہیں اور حکمتِ الٰہی نے ہر یک مخلوق کی پیدائش میں یہی تقاضا کیا ہے کہ اس کے پیدا ہونے کے چھ مرتبے ہوں جو چھ وقتوں میں انجام پذیر ہوں کسی مخلوق پر نظر ڈال کر دیکھ لو یہی چھ مراتب اُس میں متحقق ہوں گے یعنی بنظرِ تحقیق یہ ثابت ہوگا کہ ہر یک جسمانی مخلوق کے وجود کی تکمیل چھ مرتبوں کے طے کرنے کے بعد ہوتی ہے اور انسان پر کچھ موقوف نہیں۔ زمین پر جو ہزارہا حیوانات ہیں اُن کے وجود کی تکمیل بھی انہیں مراتبِ ستّہ پر موقوف پاؤ گے۔

پھر ایک اَور عجیب بات یہ ہے کہ یہ سلسلہ مراتبِ ستّہ تکوین کا صرف جسمانی مخلوق میں ہی محدود نہیں بلکہ رُوحانی امور میں بھی اِس کا وجود پایا جاتا ہے مثلاً تھوڑے سے غور سے معلوم ہوگا کہ انسان کی روحانی پیدائش کے مراتب بھی چھ ہی ہیں۔ پہلے وہ نطفہ کی صورت پر صرف حق کے قبول کرنے کی ایک استعدادِ بعیدہ اپنے اندر رکھتا ہے اور پھر جب اُس استعداد کے ساتھ ایک قطرۂ رحمتِ الٰہی مِل جاتا ہے۔ اُسی طرز کے موافق کہ جب عورت کے نطفہ میں مرد کا نطفہ پڑتا

ہے تو تب انسان کی باطنی حالت نطفہ کی صورت سے عَلَقہ کی صورت میں آجاتی ہے اور کچھ رشتہ باری تعالیٰ سے پیدا ہونے لگتا ہے جیسا کہ عَلَقہ کے لفظ سے تعلق کا مفہوم ہوتا ہے اور پھر وہ عَلَقہ اعمالِ صالحہ کے خون کی مدد سے مُضغہ بنتا ہے۔ اُسی طرز سے کہ جیسے خونِ حَیض کی مدد سے عَلَقہ مُضغہ بن جاتا ہے اور مُضغہ کی طرح ابھی اُس کے اَعضاء ناتمام ہوتے ہیں جیسا کہ مُضغہ میں ہڈی والے عضو ابھی ناپدید ہوتے ہیں ایسا ہی اس میں بھی شدّت لِلّٰہ اور ثبات لِلّٰہ اور استقامت لِلّٰہ کے عضو ابھی کما حقہٗ پیدا نہیں ہوتے گو تواضع اور نرمی موجود ہوتی ہے اور اگرچہ پُوری شدّت اور صلابت اِس مرتبہ میں پیدا نہیں ہوتی مگر مُضغہ کی طرح کسی قدر قضاء و قدر کی مَضغ کے لائق ہو جاتا ہے یعنی کسی قدر اِس لائق ہو جاتا ہے کہ قضاء و قدر کا دانت اُس پر چلے اور وہ اُس کے نیچے ٹھہر سکے کیونکہ عَلَقہ جو ایک سیال رطوبت کے قریب قریب ہے وہ تو اِس لائق ہی نہیں کہ دانتوں کے نیچے پیسا جاوے اور ٹھہرا رہے لیکن مُضغہ مَضغ کے لائق ہے اِسی لئے اُس کا نام مُضغہ ہے۔ سو مُضغہ ہونے کی وہ حالت ہے کہ جب کچھ چاشنی محبّتِ الٰہی کی دِل میں پڑ جاتی ہے اور تجلّی جلالی توجہ فرماتی ہے کہ بَلاؤں کے ساتھ اُس کی آزمائش کرے تب وہ مُضغہ کی طرح قضاء قدر کے دانتوں میں پیسا جاتا ہے اور خوب قیمہ کیا جاتا ہے۔ غرض تیسرا درجہ سالک کے وجود کا مُضغہ ہونے کی حالت ہے اور پھر چوتھا درجہ وہ ہے کہ جب انسان استقامت اور بلاؤں کی برداشت کی برکت سے آزمائے جانے کے بعد نقوشِ انسانی کا پورے طور پر انعام پاتا ہے یعنی رُوحانی طور پر اُس کے لئے ایک صورتِ انسانی عطا ہوتی ہے اور انسان کی طرح اس کو دو آنکھیں دو کان اور دل اور دماغ اور تمام ضروری قوٰی اور اعضاء عطا کئے جاتے ہیں اور بمقتضائے آیت اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ سختی اور نرمی مواضع مناسبہ میں ظاہر ہو جاتی ہے یعنی ہر ایک خُلق اُس کا اپنے اپنے محل پر صادر ہوتا ہے اور آدابِ طریقت تمام محفوظ ہوتے ہیں اور ہر یک کام اور کلام حفظِ حدود کے لحاظ سے بجالاتا ہے یعنی نرمی کی جگہ پر نرمی اور سختی کی جگہ پر سختی اور تواضع کی جگہ تواضع اور ترفع کی جگہ ترفع۔ ایسا ہی تمام قوٰی سے اپنے اپنے محل پر کام لیتا ہے۔ یہ درجہ جنین کے اُس درجہ سے مشابہت رکھتا ہے کہ جب وہ مُضغہ کی حالت سے ترقی کر کے انسان کی صورت کا ایک پورا خاکہ حاصل کر لیتا ہے اور ہڈی کی جگہ پر ہڈی نمودار ہو جاتی ہے اور گوشت کی جگہ گوشت باقی رہتا ہے ہڈی نہیں بنتی اور تمام اعضاء میں باہم تمیز کلّی پیدا ہو جاتی ہے لیکن ابھی خوبصورتی اور تازگی اور تناسب اعضاء نہیں ہوتا صرف خاکہ ہوتا ہے جو نظرِ دقیق سے دکھائی دیتا ہے۔ پھر بعد اس کے عنایتِ الٰہی توفیقاتِ متواترہ سے موفّق کر کے اور تزکیۂ نفس کے کمال تک

پہنچا کر اور فنافی اللہ کے اِنتہائی نقطہ تک کھینچ کر اُس کے خاکے کے بدن پر انواع اقسام کی برکات کا گوشت بھر دیتی ہے اور اُس گوشت سے اُس کی شکل کو چمکیلی اور اُس کی تمام ہیکل کو آبدار کر دیتی ہے تب اُس کے چہرہ پر کاملیت کا نُور برستا ہے اور اُس کے بدن پر کمالِ تام کی آب و تاب نظر آتی ہے اور یہ درجہ پیدائش کا جسمانی پیدائش کے اُس درجہ سے مشابہ ہے کہ جب جنین کے خاکہ کی ہڈیوں پر گوشت چڑھایا جاتا ہے اور خوبصورتی اور تناسب اعضاء ظاہر کیا جاتا ہے۔ پھر بعد اِس کے رُوحانی پیدائش کا چھٹا درجہ ہے جو مصداق ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ کا ہے وہ مرتبہ بقاہے جو فنا کے بعد ملتا ہے جس میں رُوح القدس کامل طور پر عطا کیا جاتا ہے اور ایک رُوحانی زندگی کی رُوح انسان کے اندر پھُونک دی جاتی ہے۔ ایسا ہی یہ چھ مراتب خدا تعالیٰ کی کلام میں بھی جمع ہیں۔ اوّل حروف کا مرتبہ جو حامل کلامِ الٰہی اور کلمات کتاب اللہ کے لئے بطور تخم کے ہیں جن کو معانی مقصودہ سے کچھ بھی حصّہ نہیں۔ ہاں اُنکے حصول کے لئے ایک استعداد بعیدہ رکھتے ہیں۔ دوم کلمات کا مرتبہ جو اس تخم کے ذریعہ سے ظہور خارجی کے رنگ میں آئے جن کو معانی مقصودہ سے کچھ حصّہ نہیں مگر اُن کے حصول کے لئے ایک ذریعہ قریبہ ہیں۔ سوم اُن فقراتِ ناتمام کا مرتبہ جو ابھی کلامِ مقصودہ کے پورے درجہ تک نہیں پہنچے تھے کیونکہ ہنوز تنزیل کا سلسلہ ناتمام تھا اور خدا تعالیٰ کے کلام نے ابھی اپنا کامل چہرہ نہیں دکھلایا تھا مگر ان فقرات کو معانی مقصودہ سے ایک وافر حصّہ تھا اِس لئے وہ کلام تام الٰہی کے لئے بطور بعض اعضاء کے ٹھہرے جن کا نام بلحاظ قلت وکثرت آیتیں اور سُورتیں رکھا گیا۔ چہارم اُس کا کلام جامع تام مفصّل ممیّز کا مرتبہ جو سب نازل ہو چکا اور جمیع مضامینِ مقصودہ اور علوم حکمیہ و قصص و اخبار و احکام و قوانین و ضوابط و حدود و مواعید و انذارات و تبشیرات اور درشتی اور نرمی اور شدت اور رحم اور حقائق و نکات پر بالا ستیفاء مشتمل ہے۔ پنجم بلاغت و فصاحت کا مرتبہ جو زینت اور آرائش کے لئے اُس کلام پر ازل سے چڑھائی گئی۔ ششم برکت اور تاثیر اور کشش کی رُوح کا مرتبہ جو اُس پاک کلام میں موجود ہے جس نے تمام کلام پر اپنی روشنی ڈالی اور اس کو زندہ اور منوّر کلام ثابت کیا۔

اِسی طرح ہر یک عاقل اور فصیح منشی کے کلام میں یہی چھ مراتب جمع ہوسکتے ہیں گو وہ کلام اعجازی حد تک نہیں پہنچتا۔ کیونکہ جن حروف میں کوئی کلام لکھا جائے گا خواہ وہ عربی ہوں یا انگریزی یا ہندی پہلے اُن کا وجود ضروری ہے۔ سو یہ تو پہلا مرتبہ ہُوا جو مضامینِ مقصودہ کے اظہار کے لئے ایک ذریعہ بعیدہ ہے مگر اُن سے کچھ حصّہ نہیں رکھتا۔ پھر بعد اس کے دوسرا مرتبہ کلمات کا ہے جو حروف قرار دادہ سے پیدا ہوں گے۔ جن کو معانی و مضامینِ مقصودہ سے ابھی کچھ حصّہ نہیں مگر ان کے حصول کے لئے ایک ذریعہ

قریبہ ہیں۔ پھر اس کے بعد تیسرا مرتبہ فقرات کا ہے جو ابھی معانی مقصودہ کے پورے جامع تو نہیں مگر ان میں سے کچھ حصہ رکھتے ہیں اور اُس مضمون کے لئے جو منشی کے ذہن میں ہے بطور اعضاء کے ہیں۔ پھر چوتھا مرتبہ کلام جامع تام کا ہے جو منشی کے دِل میں سے نکل کر بہ تمام وکمال کاغذ پر اندراج پا گیا ہے اور تمام معانی اور مضامین مقصودہ کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے۔ پھر پانچواں مرتبہ یہ ہے کہ اُن سادہ فقرات اور عبارتوں پر بلاغت اور فصاحت کا رنگ چڑھایا جائے اور خوش بیانی کے نمک سے ملیح کیا جائے۔ پھر چھٹا مرتبہ جو بلا توقف اُس مرتبہ کے تابع ہے یہ ہے کہ کلام میں اثر اندازی کی ایک جان پیدا ہو جائے جو دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیوے اور طبیعتوں میں گھر کر لیوے۔ اب غور کر کے دیکھ لو کہ یہ مراتبِ ستّہ بکلّی ان مراتبِ ستّہ کی مانند اور ان کی مثیل ہیں جن کا قرآن کریم میں نطفہ، علقہ، مضغہ اور کچھ مضغہ اور کچھ عظام یعنی انسان کی شکل کا خاکہ اور انسان کی پوری شکل اور جاندار انسان نام رکھا ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۷۲ تا ۲۱۱ حاشیہ در حاشیہ)

ہر یک قسم کی کجی اور بے راہی سے باز آ کر اور بالکل رُو بخدا ہو کر راہِ راست کو اختیار کرنا یہ وہی سخت گھاٹی ہے جس کو دوسرے لفظوں میں فنا سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ امورِ مالوفہ اور معتادہ کو یک لخت چھوڑ دینا اور نفسانی خواہشوں کو جو ایک عمر سے عادت ہو چکی ہے یک دفعہ ترک کرنا اور ہر ایک ننگ اور ناموس اور عُجب اور ریا سے مُنہ پھیر کر اور تمام ماسوا اللہ کو کالعدم سمجھ کر سیدھا خدا کی طرف رُخ کر لینا حقیقت میں ایک ایسا کام ہے جو موت کے برابر ہے اور یہ موت رُوحانی پیدائش کا مدار ہے اور جیسے دانہ جب تک خاک میں نہیں ملتا اور اپنی صورت کو نہیں چھوڑتا تب تک نیا دانہ وجود میں آنا غیر ممکن ہے۔ اِسی طرح رُوحانی پیدائش کا جسم اس فنا سے تیار ہوتا ہے۔ جوں جوں بندہ کا نفس شکست پکڑتا جاتا ہے اور اُس کا فعل اور ارادت اور رُوبخلق ہونا فنا ہوتا جاتا ہے توں توں پیدائش رُوحانی کے اعضاء بنتے جاتے ہیں یہاں تک کہ جب فناء اتم حاصل ہو جاتی ہے تو وجودِ ثانی کی خلعت عطا کی جاتی ہے اور ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ کا وقت آ جاتا ہے اور چونکہ یہ فناء اتم بغیر نصرت و توفیق و توجہ خاص قادرِ مطلق کے ممکن نہیں اِس لئے یہ دُعا تعلیم کی یعنی اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اے خدا ہم کو راہِ راست پر قائم کر اور ہر یک طور کی کجی اور بے راہی سے نجات بخش۔

(براہینِ احمدیہ صفحہ ۵۰۸ تا صفحہ ۵۱۰ حاشیہ نمبر ۱۱)

اگر یہ وسواس دِل میں گذرے کہ پھر اللہ جلّ شانہٗ نے مسیح ابنِ مریم کی نسبت اس قصہ میں جہاں پرندہ بنانے کا ذکر ہے تَخْلُقُ کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے جس کے بظاہر یہ معنی ہیں کہ تو پیدا کرتا

ہے۔ اِس کا جواب یہ ہے کہ اس جگہ حضرت عیسیٰؑ کو خالق قرار دینا بطور استعارہ ہے جیسا کہ اِس دوسری آیت میں فرمایا ہے فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ ۝ بلا شبہ حقیقی اور سچا خالق خدا تعالیٰ ہے اور جو لوگ مٹی یا لکڑی کے کھلونے بناتے ہیں وہ بھی خالق ہیں مگر جھوٹے خالق جن کے فعل کی اصلیت کچھ بھی نہیں۔ (ازالۂ اوہام صفحہ ۳۱۵،۳۱۴ حاشیہ)

اِبتدائی تقویٰ جس کے حصول سے متقی کا لفظ انسان پر صادق آسکتا ہے وہ ایک فطرتی حصّہ ہے کہ جو سعیدوں کی خِلقت میں رکھا گیا ہے اور ربوبیّتِ اُولیٰ اُس کی مربّی اور وجود بخش ہے جس سے متقی کا پہلا تولّد ہے مگر وہ اندرونی نور جو رُوح القدس سے تعبیر کیا گیا ہے وہ عبودیّتِ خالصہ تامّہ اور ربوبیّتِ کاملہ مستجمعہ کے پورے جوڑ و اتصال سے بطرز ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ کے پیدا ہوتا ہے اور یہ ربوبیّتِ ثانیہ ہے جس سے متقی تولّدِ ثانی پاتا ہے اور ملکوتی مقام پر پہنچتا ہے اور اس کے بعد ربوبیّتِ ثالثہ کا درجہ ہے جو خلقِ جدید سے موسوم ہے جس سے متقی لاہوتی مقام پر پہنچتا ہے اور تولّدِ ثالث پاتا ہے۔ فَتَدَبَّرْ۔

(ازالۂ اوہام صفحہ ۸۴۶ حاشیہ)

خدائے تعالیٰ کا پاک کلام ہمیں سمجھاتا ہے کہ رُوح اُس قالب میں سے ہی ظہور پذیر ہو جاتی ہے جو نُطفہ سے رِحم میں تیار ہوتا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں فرماتا ہے ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ۝ یعنی پھر ہم اُس جسم کو جو رِحم میں تیار ہوا تھا ایک اور پیدائش کے رنگ میں لاتے ہیں اور ایک اور خلقت اُس کی ظاہر کرتے ہیں جو رُوح کے نام سے موسوم ہے اور خدا بہت برکتوں والا ہے اور ایسا خالق ہے کہ کوئی اُس کے برابر نہیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ ہم اُسی جسم میں سے ایک اور پیدائش ظاہر کرتے ہیں یہ ایک گہرا راز ہے جو رُوح کی حقیقت دکھا رہا ہے اور اُن نہایت مستحکم تعلقات کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو رُوح اور جسم کے درمیان واقع ہیں اور یہ اشارہ ہمیں اِس بات کی بھی تعلیم دیتا ہے کہ انسان کے جسمانی اعمال اور اقوال اور تمام طبعی افعال جب خدائے تعالیٰ کے لئے اور اُس کی راہ میں ظاہر ہونے شروع ہوں تو اُن سے بھی یہی الٰہی فلاسفی متعلق ہے یعنی ان مخلصانہ اعمال میں بھی ابتداء ہی سے ایک رُوح مخفی ہوتی ہے جیسا کہ نُطفہ میں مخفی تھی اور جیسے جیسے ان اعمال کا قالب تیار ہوتا جائے وہ رُوح چمکتی جاتی ہے اور جب وہ قالب پورا تیار ہو چکتا ہے تو یک دفعہ وہ رُوح اپنی کامل تجلّی کے ساتھ چمک اُٹھتی ہے اور اپنی رُوحی حیثیّت سے اپنے وجود کو دکھا دیتی ہے اور زندگی کی صریح حرکت شروع

ہوجاتی ہے جبھی کہ اعمال کا پورا قالب تیار ہوجاتا ہے معاً بجلی کی طرح ایک چیز اندر سے اپنی کھلی کھلی چمک دکھلانا شروع کر دیتی ہے۔ (تقریر جلسہ مذاہب ص۱۰۹)

فَانْظُرْ اَنَّ الْاِنْسَانَ اِذَا قُلِّبَ فِیْ مَرَاتِبِ الْخَلْقَۃِ۔ وَاُخْرِجَ اِلٰی حَیِّزِ الْفِعْلِ مِنَ الْقُوَّۃِ۔ وَاُعْطِیَ صُوَرًا فِی الْمَجَالِی الطَّبْعِیَّۃِ وَقَفَّا بَعْضُھَا بَعْضًا بِالتَّمَایُزِ وَالتَّفْرِقَۃِ۔ فَجُمِعَتْ ھٰھُنَا مَدَارِجُ تَقْتَضِیْ لِاَنْفُسِھَا الْاَسْمَاءُ فَاَعْطَتْھَا الْعَرَبِیَّۃُ وَاَکْمَلَتِ الْعَطَاءَ۔ کَالْاَسْخِیَاءِ الْمُتَمَوِّلِیْنَ۔ وَتَفْصِیْلُہٗ اَنَّ اللّٰہَ اِذَا اَرَادَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ۔ فَبَدَءَ خَلْقَہٗ مِنْ سُلَالَۃِ طِیْنٍ مُطَھَّرٍ مِنَ الْاَدْرَانِ فَلِذٰلِکَ سَمَّاہُ اٰدَمَ عِنْدَ الْخِطَابِ وَفِی الْکِتَابِ لَمَّا خَلَقَہٗ مِنَ التُّرَابِ وَلَمَّا جَمَعَ فِیْہِ فَضَائِلَ الْعَالَمِیْنَ۔ وَکَذٰلِکَ خَمَّرَ فِیْ طِیْنَتِہٖ اُنْسَانِ۔ اُنْسٌ مَا خُلِقَ مِنْہُ وَاُنْسُ الْخَالِقِ الرَّحْمَانِ کَمَا یُوْجَدُ اُنْسُ الْاُمِّ وَالْاَبِ فِی الصِّبْیَانِ۔ فَدَعَاہُ بِاِسْمِ الْاِنْسَانِ وَھٰذَا مَبْنِیٌّ عَلَی التَّثْنِیَۃِ مِنَ الْمَنَّانِ۔ لِیَدُلَّ لَفْظُ الْاُنْسَیْنِ عَلٰی کِلْتَی الصِّفَتَیْنِ اِلَی انْقِطَاعِ الزَّمَانِ وَیَکُوْنُ مِنَ الْمُتَذَکِّرِیْنَ۔ ثُمَّ بَدَّلَ قَانُوْنَ الْقُدْرَۃِ۔ بِاِذْنِ اللّٰہِ ذِی الْعِزَّۃِ وَالْحِکْمَۃِ وَخَلَقَ الْاِنْسَانَ بَعْدَ تَغَیُّرَاتٍ۔ فِیْ اَرْحَامِ الْاُمَّھَاتِ۔ فَسُمِّیَ التَّغَیُّرُ الْاُوْلٰی

(ترجمہ از اصل) پس تُو دیکھ کہ جب انسان پیدائش کے مراتب میں پھیرا گیا اور حیز فعل سے قوت کی طرف لایا گیا اور طبعی جلوہ گاہوں میں قسم قسم کی صورتیں دیا گیا اور بعض قسم پیدائش بعض کے پیچھے آئیں اور ان میں باہم تفرقہ اور تمیز ہوا پس اِس جگہ کئی مدارج پیدا ہوئے جو اپنے لئے ناموں کو چاہتے تھے پس عربی نے ان کو ان کے نام عطا کئے اور اپنے عطیہ کو کامل کیا جیسے سخی اور مالدار لوگوں کا کام ہوتا ہے اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنا چاہا تو اس کو اُس مٹی سے پیدا کیا جو زمین کے تمام قویٰ کا عطر تھا اور میلوں سے پاک تھا اس کا نام خطاب اور کتاب میں آدم رکھا اِس لئے کہ اُسے مٹی سے پیدا کیا اور سارے جہان کی خوبیاں اس میں بھر دیں اور نیز اس کی طینت میں دو اُنس رکھ دیئے ایک تو اُسی شئے کا اُنس جس سے وہ مخلوق ہوا دوسرا خالق رحمان کا اُنس جیسے بچوں میں ماں باپ کا اُنس پایا جاتا ہے اِس لئے اُس کا نام انسان رکھا۔ یہ اسم تثنیہ ہے تا کہ ہمیشہ کے لئے ان دو اُنسوں کا لفظ ان دو صفتوں کو بتاتا رہے۔

پھر خدا تعالیٰ کے ارادہ سے قانونِ قدرت میں یوں تبدیلی واقع ہوئی کہ کئی تغیّرات کے بعد ماؤں کے رحموں کے معرفت اس کی آفرینش ہونے لگی سو پہلے تغیّر کا نام (باقی اگلے صفحہ پر)

مَاءً دَافِقًا وَنُطْفَةً۔ وَالثَّانِي الَّذِي يَزْدَادُ فِيهِ اٰثَرُ الْحَيَاتِ عَلَقَةً۔ وَالثَّالِثُ الَّذِي زَادَ اِلٰى قَدْرِ الْمَضْغِ شِدَّةً وَضَاهَا فِي قَدْرِهِ لُقْمَةً فَسُمِّيَ لِهٰذَا مُضْغَةً۔ وَالرَّابِعُ الَّذِي زَادَ مِنْ قَدْرِ اللُّقْمَةِ۔ وَمَعَ ذٰلِكَ بَلَغَ اِلٰى مُنْتَهَى الصَّلَابَةِ وَاَوْدَعَهَا اللّٰهُ حِكَمًا عَظِيمَةً خِلْقَةً وَنِظَامًا فَسَمَّاهَا عِظَامًا بِمَا بَلَغَتِ الْعَظَمَةَ وَزَادَتْ شَرَفًا وَكَمًّا وَمُقَامًا وَبِمَا رُكِّبَ بَعْضُهَا بِالْعِظَامِ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ وَالْخَامِسَ اللَّحْمَ الَّذِي زَادَ عَلَيْهَا كَالْحُلَّةِ۔ وَصَارَ سَبَبُ كَمَالِ الْحُسْنِ وَالزِّيْنَةِ۔ فَسُمِّيَ لَحْمًا بِمَا لُوْحِمَ بِالْعِظَامِ الصُّلْبَةِ وَصَارَ بِهَا كَذَوِي اللُّحْمَةِ۔ وَالسَّادِسُ خَلْقًا اٰخَرَ وَسُمِّيَ نَفْسًا لِنَفَاسَتِهَا وَلَطَافَتِهَا وَسَرَايَتِهَا فِي الْاَعْضَاءِ وَعِزَّتِهَا۔ وَسُمِّيَ جَمِيْعُهَا بِاسْمِ الْجَنِيْنِ۔ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ۔ (منن الرحمٰن صفحہ ۱۱۹-۱۲۱ بشمولہ روحانی خزائن جلد ۹ صفحہ ۲۴۴-۲۴۶)

قرآن شریف کی سورۂ عصر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا یہ زمانہ حضرت آدم علیہ السلام سے ہزار ششم پر واقع ہے یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش سے یہ چھٹا ہزار جا تا ہے اور ایسا ہی احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ آدم سے لے کر اخیر تک دُنیا کی عمر سات ہزار سال ہے لہٰذا آخر ہزار ششم وہ آخری حصہ اس دُنیا کا ہوا جس سے ہر ایک جسمانی اور روحانی تکمیل وابستہ ہے کیونکہ خدائی کارخانۂ قدرت میں چھٹے دن اور چھٹے ہزار کو الٰہی فعل کی تکمیل کے لئے قدیم سے مقرر فرمایا گیا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ماء دافق اور نطفہ رکھا اور دوسرے کا نام جس میں زندگی کا نشان ترقی کرتا ہے علقہ رکھا اور تیسرے کا نام جو درشتی میں ایک لقمہ کے اندازہ کی مانند ہوا مضغہ رکھا اور چوتھا تغیّر جو صلابت اور قدر میں لقمہ سے ترقی کر گیا اور بڑی بڑی حکمتوں پر اُس کا نظامِ خلقت مشتمل ہوا وہ عظام کے نام سے موسوم ہوا اِس لئے وہ عظمت اور شرف اور قدر و مقام میں اِنتہاء کو پہنچ گیا اور اِس لئے بھی کہ ہڈیوں سے اس کے بعض حصّے ترکیب پذیر ہوئے اور پانچویں کا نام لحم ہوا اِس لئے کہ لحم عربی میں ایک چیز کے پیوند اور لحوق کو کہتے ہیں جب وہ چیز دوسرے سے ملتی اور پیوند کرتی ہے سو گوشت کپڑا کی طرح باقی جسم پر ملتا ہے اور نیز اس لئے بھی کہ گوشت سخت ہڈیوں سے ملتا ہے اور ان کو باہم ملاتا ہے اور خویشی قرابت ان میں بخشتا ہے اور چھٹے کو خلق آخر کہا اور اسے کمال نفاست اور اعضاء میں سرایت کرنے کے سبب سے نفس بھی کہا اور پھر اس سارے مجموعہ کا نام جنین ہوا۔ فتبارک اللّٰہ احسن الخالقین۔ (منن الرحمٰن)

مثلاً حضرت آدم علیہ السلام چھٹے دن میں یعنی بروز جمعہ دن کے آخیر حصّے میں پیدا ہوئے یعنی آپ کے وجود کا تمام وکمال پیرایہ چھٹے دن ظاہر ہؤا گو خمیر آدم کا آہستہ آہستہ تیار ہو رہا تھا اور تمام جمادی نباتی حیوانی پیدائشوں کے ساتھ بھی شریک تھا لیکن کمال خلقت کا دن چھٹا دن تھا اور قرآن شریف بھی گو آہستہ آہستہ پہلے سے نازل ہو رہا تھا مگر اس کا کامل وجود بھی چھٹے دن ہی بروز جمعہ اپنے کمال کو پہنچا اور آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ نازل ہوئی اور انسانی نطفہ بھی اپنے تغیّرات کے چھٹے مرتبہ ہی خلقتِ بشری سے پُورا حصّہ پاتا ہے جس کی طرف آیت ثُمَّ اَنْشَاْنٰہُ خَلْقًا اٰخَرَ میں اشارہ ہے اور مراتب ستّہ یہ ہیں: ۱۔ نطفہ ۲۔ علقہ ۳۔ مضغہ ۴۔ عظام ۵۔ لحم محیط العظام ۶۔ خلق آخر۔ اس قانونِ قدرت سے جو روز ششم اور مرتبہ ششم کی نسبت معلوم ہو چکا ہے ماننا پڑتا ہے کہ دُنیا کی عمر کا ہزار ششم بھی یعنی اس کا آخری حصّہ بھی جس میں ہم ہیں کسی آدم کے پیدا ہونے کا وقت اور کسی دین کی تکمیل کے ظہور کا زمانہ ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۹۱-۹۳)

وحی الٰہی یعنی عَفَتِ الدِّیَارُ مَحِلُّھَا وَمَقَامُھَا یہ وہ کلام ہے جو آج سے تیرہ سَو برس پہلے خدا تعالیٰ نے لبید بن ربیعہ العامری کے دل میں ڈالا تھا جو اس کے اُس قصیدہ کا اوّل مصرع ہے جو سبعہ معلّقہ کا چوتھا قصیدہ ہے اور لبید نے زمانہ اسلام کا پایا تھا اور مشرف باسلام ہو گیا تھا اور صحابہ رضی اللہ عنہم میں داخل تھا اِس لئے خدا تعالیٰ نے اُس کے کلام کو یہ عزّت دی کہ جو آخری زمانہ کی نسبت ایک عظیم الشان پیشگوئی تھی کہ ایسی ایسی تباہیاں ہوں گی جن سے ایک ملک تباہ ہوگا وہ اُسی کے مصرع کے الفاظ میں بطور وحی فرمائی گئی جو اس کے مُنہ سے نکلی تھی۔ پس یہ تعجب سخت نادانی ہے کہ ایک کلام جو مسلمان کے مُنہ سے نکلا ہے وہ کیوں وحیِ الٰہی میں داخل ہؤا کیونکہ جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں وہ کلام جو عبداللہ بن ابی سرح کے مُنہ سے نکلا تھا یعنی فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ وہی قرآن شریف میں نازل ہؤا جس کی وجہ سے عبداللہ بن ابی سرح مُرتد ہو کر مکّہ کی طرف بھاگ گیا۔ پس جبکہ خدا تعالیٰ کے کلام کا ایک مُرتد کے کلام سے توارد ہؤا تو اس سے کیوں تعجب کرنا چاہیئے کہ لبید جیسے صحابی بزرگوار کے کلام سے اس کے کلام کا توارد ہو جائے۔ خدا تعالیٰ جیسے ہر ایک چیز کا وارث ہے ہر ایک پاک کلام کا بھی وارث ہے ہر ایک پاک کلام اسی کی توفیق سے مُنہ سے نکلتا ہے۔ پس اگر ایسا کلام بطور وحی نازل ہو جائے تو اس بارے میں وہی شخص شک کرے گا جس کو اِسلام میں شک ہو۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۹)

خود ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر بعض ایسے فقرے وحیِ الٰہی کے نازل ہو چکے ہیں جو پہلے

وہ کسی آدمی کے مُنہ سے نکلے تھے جیسا کہ یہ فقرہ وحیِ فرقانی یعنی فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ یہ فقرہ پہلے عبداللہ بن ابی سرح کی زبان سے نکلا تھا اور وہی فقرہ وحیِ قرآنی میں نازل ہوُا۔ دیکھو تفسیر کبیر الجزء السادس صفحہ ۲۷۶ مطبوعہ مصر۔ اصل عبارت یہ ہے رَوَى الْكَلْبِيُّ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنِ سَعْدِ ابْنِ اَبِیْ سَرْحٍ كَانَ يَكْتُبُ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا انْتَهٰى اِلٰى قَوْلِهٖ تَعَالٰى خَلْقًا اٰخَرَ عَجِبَ مِنْ ذَالِكَ فَقَالَ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اُكْتُبْ فَهٰكَذَا نَزَلَتْ فَشَكَّ عَبْدُ اللّٰهِ وَقَالَ اِنْ كَانَ مُحَمَّدٌ صَادِقًا فِيْمَا يَقُوْلُ فَاِنَّهٗ يُوْحٰى اِلَيَّ كَمَا يُوْحٰى اِلَيْهِ وَاِنْ كَانَ كَاذِبًا فَلَا خَيْرَ فِيْ دِيْنِهٖ فَهَرَبَ اِلٰى مَكَّةَ فَقِيْلَ اِنَّهٗ مَاتَ عَلَى الْكُفْرِ وَقِيْلَ اِنَّهٗ اَسْلَمَ يَوْمَ الْفَتْحِ۔ ترجمہ یہ ہے کہ کلبی نے ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن ابی سرح قرآن شریف کی آیات لکھا کرتا تھا یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رُوبرو جیسی آیت نازل ہوتی تھی اُس سے لکھواتے تھے۔ پس جب وہ آیت لکھوائی گئی جو خَلْقًا اٰخَرَ تک ختم ہوتی ہے تو عبداللہ اُس آیت سے تعجب میں پڑ گیا اور عبداللہ نے کہا فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہی لکھ لے کیونکہ خدا نے بھی یہی فقرہ جو تیرے مُنہ سے نکلا ہے فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ نازل کر دیا ہے۔ پس عبداللہ شک میں پڑ گیا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو میری زبان کا کلمہ ہے وہی خدا کا کلمہ ہو گیا اور اس نے کہا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعویٰ میں صادق ہے تو مجھے بھی وہی وحی ہوتی ہے جو اُسے ہوتی ہے اور اگر کاذب ہے تو اس کے دین میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ پھر وہ مکّہ کی طرف بھاگ گیا۔ پس ایک روایت یہ ہے کہ وہ کفر پر مرگیا اور ایک یہ بھی روایت ہے کہ وہ فتحِ مکّہ کے وقت مسلمان ہو گیا۔

اب دیکھو عبداللہ بن ابی سرح کی کلام سے خدا تعالیٰ کی کلام کا توارد ہوُا یعنی عبداللہ کے مُنہ سے بھی یہ فقرہ نکلا تھا فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ اور خدا تعالیٰ کی وحی میں بھی یہی آیا اور اگر کہو کہ پھر خدا تعالیٰ کی کلام اور انسان کی کلام میں مابہ الامتیاز کیا ہوُا تو اوّل تو ہم اس کا یہی جواب دیتے ہیں کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے آپ قرآن شریف میں فرمایا ہے مابہ الامتیاز قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ کلام جو غیر کا کلام کہلاتا ہے قرآنی سورتوں میں سے کسی سورت کے برابر ہو کیونکہ اعجاز کے لئے اسی قدر معتبر سمجھا گیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔ یہ نہیں فرمایا کہ فَاْتُوْا بِاٰيَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ یا فَاْتُوْا بِكَلِمَةٍ

مِّنْ مِّثْلِہٖ اور درحقیقت یہ سچ ہے کہ خدا کے کلمات علیحدہ علیحدہ تو وہی کلمات ہیں جو کفار کی زبان پر بھی جاری تھے۔ پھر رنگینیٔ عبارت اور نظمِ کلام اور دیگر لوازم کے لحاظ سے وہی کلمات بحیثیت مجموعی ایک معجزہ کے رنگ میں ہوگئے اور جو معجزہ خدا تعالیٰ کے افعال میں پایا جاتا ہے اس کی بھی یہی شان ہے یعنی وہ بھی اپنی حیثیتِ مجموعی سے معجزہ بنتا ہے جیسا کہ کلام اپنی حیثیت مجموعی سے معجزہ بنتا ہے۔ ہاں خدا تعالیٰ کے مُنہ سے جو چھوٹے چھوٹے فقرے نکلتے ہیں وہ اپنے مطالب عالیہ کے لحاظ سے جو ان کے اندر رہوتے ہیں انسانی فقرات سے اِمتیازِ کُلّی رکھتے ہیں۔ یہ امر دیگر ہے کہ انسان ان کے پوشیدہ حقائق و معارف تک نہ پہنچے مگر ضرور ان کے اندر انوارِ مخفیہ ہوتے ہیں جو ان کلمات کی رُوح ہوتے ہیں جیسا کہ یہی کلمہ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ اپنی گذشتہ آیات کے ساتھ تعلق کی وجہ سے ایک امتیازی رنگ اپنے اندر رکھتا ہے یعنی اس قسم کی روحانی فلاسفی اس کے اندر بھری ہوئی ہے کہ وہ بجائے خود ایک معجزہ ہے جس کی نظیر انسانی کلام میں نہیں ملتی۔

(ضمیمہ براہینِ احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۸-۳۰)

قرآن شریف رُوحوں کو ازلی ابدی نہیں ٹھہراتا ہے۔ ان کو مخلوق بھی مانتا ہے اور فانی بھی جیسا کہ وہ رُوحوں کے مخلوق ہونے کے بارے میں صاف طور پر فرماتا ہے کہ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ یعنی جب قالب تیار ہو جاتا ہے تو اس کی تیاری کے بعد اسی قالب میں سے ہم ایک نئی پیدائش کر دیتے ہیں یعنی رُوح۔

(چشمۂ معرفت صفحہ ۱۵۶)

ثابت شدہ واقعات یقینی اور قطعی طور پر شہادت دے رہے ہیں کہ خود نطفہ مرد اور عورت کا بغیر اس کے کہ اُس پر شبنم کی طرح آسمان کی فضا سے رُوح گرے رُوح پیدا ہونے کی اپنے اندر استعداد رکھتا ہے۔ پھر جب مرد اور عورت کا نطفہ باہم مل جاتا ہے تو وہ استعداد بہت قوی ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ وہ استعداد بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ جب بچہ کا پورا قالب تیار ہو جاتا ہے تو خدا تعالیٰ کی قدرت اور امر سے اُسی قالب میں سے رُوح پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ وہ واقعات ہیں جو مشہود اور محسوس ہیں۔ اِس کو ہم کہتے ہیں کہ نیستی سے ہستی ہوئی۔ کیونکہ ہم رُوح کو جسم اور جسمانی نہیں کہہ سکتے۔ اور یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ رُوح اُسی مادّہ میں سے پیدا ہوتی ہے جو بعد اجتماع دونوں نطفوں کے رحم مادر میں آہستہ آہستہ قالب کی صورت پیدا کرتا ہے اور اس مادّہ کے لئے ضروری نہیں کہ ساگ پات کی کسی قسم پر رُوح شبنم کی طرح گرے اور اس سے رُوح کا نطفہ پیدا ہو بلکہ وہ مادّہ گوشت سے بھی پیدا ہو سکتا ہے خواہ وہ گوشت بکرہ کا ہو یا مچھلی کا۔ یا ایسی مٹی ہو جو زمین کی

نہایت عمیق تہہ کے نیچے ہوتی ہے جس سے مینڈکیں وغیرہ کیڑے مکوڑے پیدا ہوتے ہیں۔ ہاں بلاشبہ یہ خدا کی قدرت کا ایک راز ہے کہ وہ جسم میں سے ایک ایسی چیز پیدا کرتا ہے کہ وہ نہ جسم ہے اور نہ جسمانی۔ پس واقعات موجودہ مشہودہ محسوسہ ظاہر کر رہے ہیں کہ آسمان سے رُوح نہیں گرتی بلکہ یہ ایک نئی رُوح ہوتی ہے جو ایک مرکّب نطفہ میں سے بقدرت قادر پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ یعنی جب رحم میں قالبِ انسانی تیار ہو جاتا ہے تو پھر ہم ایک نئی پیدائش سے اُس کو مکمّل کرتے ہیں یعنی ہم اس مادہ کے اندر سے جس سے قالب تیار ہوا ہے رُوح پیدا کر دیتے ہیں۔

(چشمۂ معرفت صفحہ ۱۱۵-۱۱۶)

رُوح کے ذکر پر فرمایا:-

جس شئے نے پیدا ہونا ہوتا ہے تو رُوح کی استعداد اس شئے میں ساتھ ساتھ چلی آتی ہے۔ جیسے جیسے وہ تیار ہوتی جاتی ہے اور جب وہ عین لائق ہوتی ہے تو خدا اس پر فیضان کرتا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ۔ مَیں نے ایک انڈہ کو ایک دفعہ پیالی میں ڈالا دیکھا تو اس کی زردی اور سفیدی پانی کی طرح ہوئی ہوئی تھی اور اس کے درمیان میں ایک نقطہ خشخاش کے دانہ کی طرح تھا اور اس کی کئی تاریں کوئی کسی طرف کو اور کوئی کسی طرف کو نکلی ہوئی تھیں اور سوائے اس نقطہ کے اور کوئی حرکت اس میں نہ تھی تو مَیں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ خلق اشیاء کا سلسلہ ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ اوّل سر بنایا پھر ہاتھ پھر پاؤں وغیرہ بلکہ اس کی کارروائی یکساں ہوتی ہے اور سب کچھ پہلے سے ہی ہوتا ہے صرف نشوونما پاتا جاتا ہے۔ مَیں نے بعض دائیوں کو کہا ہوا تھا کہ جو بچے اسقاط ہوا کریں تو دکھایا کرو تو مَیں نے بعض بچے دیکھے ان کے بھی سب اعضاء بنے بنائے تھے۔ خدا کا یہ خلق معمار کی طرح نہیں کہ اوّل دیواریں بنائیں پھر چوبارہ بنایا پھر اُوپر کچھ اور بنایا بلکہ چار ماہ کے بعد جب رُوح کی تکمیل ہوتی ہے تو اُس وقت اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ اُس پر صادق آتا ہے تو بچہ حرکت کرنے لگتا ہے۔

جیسے دُنیا کے سات دن ہیں۔ یہ اشارہ اسی طرف ہے کہ دُنیا کی عمر بھی سات ہزار برس ہے اور یہ کہ خدا نے دُنیا کو چھ دن میں بنا کر ساتویں دن آرام کیا۔ اِس سے یہ بھی نکلتا ہے کہ ہر شئے چھ مراتب ہی طے کر کے مرتبہ تکمیل کا حاصل کرتی ہے۔ نطفہ میں بھی اسی طرح چھ مراتب ہیں کہ انسان اوّل سلسلہ میں طِيْن ہوتا ہے پھر نُطْفَه۔ پھر عَلَقَه۔ پھر مُضْغَه۔ پھر عِظَامًا۔ پھر لَحْمًا۔ پھر

سب کے بعد اَنْشَاْنٰہُ خَلْقًا اٰخَرَ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے کچھ نہیں آتا بلکہ اندر سے ہی ہر ایک نشوونما ہوتی رہتی ہے۔

(البدر جلد اوّل ۱۱ مورخہ ۹ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۸۴-۸۵)

رُوح ایک مخلوق چیز ہے۔ اسی عنصری مادے سے خدا تعالیٰ اسے بھی پیدا کرتا ہے ..... رُوحِ انسانی باریک اور مخفی طور سے نطفۂ انسانی میں ہی موجود ہوتی ہے اور وہ نطفہ کے ساتھ ساتھ ہی آہستگی سے نشوونما کرتی اور ترقی پاتی چوتھے مہینے کے انجام اور پانچویں مہینے کی ابتداء میں ایک بیّن تغیر اور نشوونما پاکر ظہور پذیر ہوتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ اپنی کلامِ پاک میں فرماتا ہے کہ ثُمَّ اَنْشَاْنٰہُ خَلْقًا اٰخَرَ۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۵ مورخہ ۳۰ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵-۶)

وہ اندرونی نور جو رُوح القدس سے تعبیر کیا گیا ہے وہ عبودیتِ خالصہ تامّہ اور ربوبیتِ کاملہ مستجمعہ کے پورے جوڑ و اتصال سے بطرز ثُمَّ اَنْشَاْنٰہُ خَلْقًا اٰخَرَ کے پیدا ہوتا ہے اور یہ ربوبیتِ ثانیہ ہے جس سے متقی تولّدِ ثانی پاتا ہے اور ملکوتی مقام پر پہنچتا ہے اور اس کے بعد ربوبیتِ ثالثہ کا درجہ ہے جو خلقِ جدید سے موسوم ہے جس سے متقی لاہوتی مقام پر پہنچتا ہے اور تولّدِ ثالث پاتا ہے۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد اوّل صفحہ ۱۵۱ حاشیہ)

اللہ تعالیٰ نے جس قدر قویٰ عطا فرمائے وہ ضائع کرنے کے لئے نہیں دئے گئے۔ اُن کی تعدیل اور جائز استعمال کرنا ہی اُن کی نشوونما ہے اس واسطے اسلام نے قویٰ رجولیت یا آنکھ نکالنے کی تعلیم نہیں دی بلکہ اُن کا جائز استعمال اور تزکیہ نفس کرایا جیسے فرمایا قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۸-۴۹)

ثُمَّ اِنَّكُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ لَمَيِّتُوْنَ ۞

یعنی اوّل رفتہ رفتہ خدا تعالیٰ تم کو کمال تک پہنچاتا ہے اور پھر تم اپنا کمال پورا کرنے کے بعد زوال کی طرف میل کرتے ہو یہاں تک کہ مَر جاتے ہو یعنی تمہارے لئے خدا تعالیٰ کی طرف سے یہی قانونِ قدرت ہے۔ کوئی بشر اس سے باہر نہیں۔ اے خداوند قدیر اپنے اس قانونِ قدرت کے سمجھنے کے لئے اِن لوگوں کو بھی آنکھ بخش جو مسیح ابنِ مریم کو اس سے باہر سمجھتے ہیں۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۶۱۱-۶۱۲)

مَوْت کا لفظ قرآن کریم میں ذوالوجوہ ہے۔ کافر کا نام بھی مُردہ رکھا ہے اور ہوا و ہوس

سے مرنا بھی ایک قسم کی موت ہے اور قریب الموت کا نام بھی مَیّت ہے اور یہی تینوں وجوہ استعمال حیاتٓ میں بھی پائی جاتی یعنی حیاتٓ بھی تین قسم کی ہیں۔ (ازالۂ اوہام صفحہ ۶۴۰)

ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ۝

یعنی تم مرنے کے بعد قیامت کے دن اُٹھائے جاؤ گے۔ (ازالۂ اوہام صفحہ ۶۳۶)

وہ آیات جن میں لکھا ہے کہ فوت شدہ لوگ پھر دُنیا میں نہیں آتے ازاں جملہ یہ آیت ہے ... ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ ..... کوئی انسان راحت یا رنج عالم معاد کے چکھ کر پھر دُنیا میں ہرگز نہیں آتا۔ (ازالۂ اوہام حاشیہ در حاشیہ متعلقہ صفحہ ۹۴۲ الف و ب)

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِى الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ۝

یہ وہ زمانہ ہے جو اس عاجز پر کشفی طور پر ظاہر ہوا جو کمال طغیان اس کا اس سنِ ہجری میں شروع ہوگا جو آیت وَ اِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ میں بحساب جمل مخفی ہے یعنی ۱۲۷۴ھ۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۶۵۶)

مسیح موعود کے ظہور کی خصوصیّت کے ساتھ یہ علامت ہے کہ دجّال معہود کے خروج کے بعد نازل ہو کیونکہ یہ ایک واقعہ مسلّمہ ہے کہ دجّال معہود کے خروج کے بعد آنے والا وہی سچا مسیح ہے جو مسیح موعود کے نام سے موسوم ہے جس کا مسلم کی حدیث میں وجہ تسمیہ مسیح ہونے کا یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ مومنوں کی شدّت اور محنت اور ابتلاء کا غبار جو دجّال کی وجہ سے اُن کے طاری حال ہوگا اُن کے چہرہ سے پونچھ دے گا یعنی دلیل اور حجّت سے اُن کو غالب کر دکھائے گا سو اِس لئے وہ مسیح کہلائے گا کیونکہ مَسْح پونچھنے کو کہتے ہیں جس سے مَسِیْح مشتق ہے اور ضرور ہے کہ وہ دجّال معہود کے بعد نازل ہو۔ سو یہ عاجز دجّال معہود کے خروج کے بعد آیا ہے۔ پس اِس میں کچھ شک نہیں کہ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ دجّال معہود یہی پادریوں اور عیسائی متکلموں کا گروہ ہے جس نے زمین کو اپنے ساحرانہ کاموں سے تہ و بالا کر دیا ہے اور جو ٹھیک اس وقت سے زور کے ساتھ خروج کر رہا ہے اور جو اعداد آیت اِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ سے سمجھا جاتا ہے یعنی ۱۸۵۷ء

کا زمانہ۔ تو ساتھ ہی اِس عاجز کا مسیح موعود ہونا بھی ثابت ہو جائے گا۔ (ازالہ اوہام ص ۷۲۱، ۷۲۲)

آیت اِنَّا عَلٰی ذَھَابٍ بِہٖ لَقٰدِرُوْنَ میں ۱۸۵۷ء کی طرف اشارہ ہے جس میں ہندوستان میں ایک مفسدہ عظیم ہو کر آثارِ باقیہ اسلامی سلطنت کے ملک ہند سے ناپدید ہو گئے تھے کیونکہ اس آیت کے اعداد بحساب جمل ۱۲۷۴ ہیں اور ۱۲۷۴ کے زمانہ کو جب عیسوی تاریخ میں دیکھنا چاہیں تو ۱۸۵۷ء ہوتا ہے۔ سو درحقیقت ضعفِ اسلام کا زمانہ ابتدائی یہی ۱۸۵۷ء ہے جس کی نسبت خدا تعالیٰ آیت موصوفہ بالا میں فرماتا ہے کہ جب وہ زمانہ آئے گا تو قرآن زمین پر سے اُٹھایا جائے گا سو ایسا ہی ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی حالت ہو گئی تھی .... پس اس حکیم و علیم کا قرآن کریم میں یہ بیان فرمانا کہ ۱۸۵۷ء میں میرا کلام آسمان پر اُٹھایا جائے گا یہی معنے رکھتا ہے کہ مسلمان اس پر عمل نہیں کریں گے جیسا کہ مسلمانوں نے ایسا ہی کیا .... کتابِ الٰہی کی غلط تفسیروں نے انہیں بہت خراب کیا ہے اور ان کے دل اور دماغی قویٰ پر بہت بُرا اثر اُن سے پڑا ہے۔ اِس زمانہ میں بلاشبہ کتابِ الٰہی کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ایک نئی اور صحیح تفسیر کی جائے کیونکہ حال میں جن تفسیروں کی تعلیم دی جاتی ہے وہ نہ اخلاقی حالت کو درست کر سکتی ہیں اور نہ ایمانی حالت پر نیک اثر ڈالتی ہیں بلکہ فطرتی سعادت اور نیک روشنی کے مزاحم ہو رہی ہیں۔ کیوں مزاحم ہو رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دراصل اپنے اکثر زوائد کی وجہ سے قرآن کریم کی تعلیم نہیں ہے قرآنی تعلیم ایسے لوگوں کے دلوں سے مٹ گئی ہے کہ گویا قرآن آسمان پر اُٹھایا گیا ہے۔ وہ ایمان جو قرآن نے سکھلایا تھا اس سے لوگ بے خبر ہیں۔ وہ عرفان جو قرآن نے بخشا تھا اس سے لوگ غافل ہو گئے ہیں۔ ہاں یہ سچ ہے کہ قرآن پڑھتے ہیں مگر قرآن اُن کے حلق سے نیچے نہیں اُترتا۔ اِنہیں معنوں سے کہا گیا ہے کہ آخری زمانہ میں قرآن آسمان پر اُٹھایا جائے گا۔ پھر اِنہیں حدیثوں میں لکھا ہے کہ پھر دوبارہ قرآن کو زمین پر لانے والا ایک مرد فارسی الاصل ہوگا جیسا کہ فرمایا ہے لَوْ کَانَ الْاِیْمَانُ مُعَلَّقًا عِنْدَ الثُّرَیَّا لَنَالَہٗ رَجُلٌ مِّنْ فَارِسَ۔ یہ حدیث درحقیقت اسی زمانہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جو آیت اِنَّا عَلٰی ذَھَابٍ بِہٖ لَقٰدِرُوْنَ میں اشارۃً بیان کیا گیا ہے۔ (ازالہ اوہام ص ۷۲۲ تا ۷۲۶ حاشیہ)

مسیح ابن مریم کی آخری زمانہ میں آنے کی قرآن شریف میں پیشگوئی موجود ہے۔ قرآن شریف نے جو مسیح کے نکلنے کی چودہ سو برس تک مدت ٹھہرائی ہے۔ بہت سے اولیاء بھی اپنے مکاشفات کی رُو سے اس مدت کو مانتے ہیں اور آیت وَاِنَّا عَلٰی ذَھَابٍ بِہٖ لَقٰدِرُوْنَ جس کے بحساب جمل ۱۲۷۴ عدد ہیں۔ اِسلامی چاند کی سلخ راتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے جس میں نئے چاند کے نکلنے کی اشارت

چھپی ہوئی ہے جو غلام احمد قادیانی کے عددوں میں بحساب جمل پائی جاتی ہے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۱۸۵)

فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝

مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ...... ہم نے اپنے بزرگوں میں یعنی اولیاء سلف میں یہ نہیں سنا۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۶۱-۵۶۲ حاشیہ درحاشیہ)

فَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اَنِ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا فَاِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ فَاسْلُكْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ مِنْهُمْ وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝

اِصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم سے کشتی بنا۔ (کشتی نوح ٹائٹل پیج)

اِسی طرح براہین احمدیہ کے حصص سابقہ میں خداتعالیٰ نے میرا نام نوح بھی رکھا ہے اور میری نسبت فرمایا ہے وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ یعنی میری آنکھوں کے سامنے کشتی بنا اور ظالموں کی شفاعت کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہ کر کہ میں اُن کو غرق کروں گا۔ خدا نے نوحؑ کے زمانہ میں ظالموں کو قریباً ایک ہزار سال تک مہلت دی تھی اور اب بھی خیرالقرون کی تین صدیوں کو علیحدہ رکھ کر ہزار برس ہی ہو جاتا ہے۔ اِس حساب سے اب یہ زمانہ اس وقت پر آپہنچا ہے جبکہ نوحؑ کی قوم عذاب سے ہلاک کی گئی تھی اور خداتعالیٰ نے مجھے فرمایا اِصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ

یعنی میری آنکھوں کے رُوبرو اور میرے حکم سے کشتی بنا۔ (براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۸۶)

ۣ اِنۡ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا نَمُوۡتُ وَ نَحۡیَا وَ مَا نَحۡنُ بِمَبۡعُوۡثِیۡنَ ﴿ۙ۳۸﴾

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب کا کیا حال تھا۔ کوئی بَدی ایسی نہ تھی جو ان میں نہ پائی جاتی ہو جیسے کوئی ہر صیغہ اور امتحان کو پاس کرکے کامل اُستاد ہر فن کا ہو جاتا ہے اسی طرح پر وہ بدیوں اور بدکاریوں میں ماہر اور پورے تھے۔ شرابی، زانی، یتیموں کا مال کھانے والے، قمار باز غرض ہر بُرائی میں سب سے بڑھے ہوئے تھے بلکہ اپنی بدکاریوں پر فخر کرنے والے تھے۔ اُن کا قول تھا اِنۡ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا نَمُوۡتُ وَ نَحۡیَا۔ ہماری زندگی اِسی قدر ہے کہ یہاں ہی مرتے ہیں اور زندہ ہوتے ہیں۔ حشر نشر کوئی چیز نہیں۔ قیامت کچھ نہیں۔ جنّت کیا اور جہنم کیا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ر مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

اصل میں بہت سے عرب دہریہ تھے جیسا کہ قرآن شریف کی آیت ذیل سے معلوم ہوتا ہے:۔

اِنۡ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنۡیَا نَمُوۡتُ وَ نَحۡیَا

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۸ر جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

ثُمَّ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا تَتۡرَا ؕ کُلَّمَا جَآءَ اُمَّۃً رَّسُوۡلُهَا کَذَّبُوۡهُ فَاَتۡبَعۡنَا بَعۡضَهُمۡ بَعۡضًا وَّ جَعَلۡنٰهُمۡ اَحَادِیۡثَ ۚ فَبُعۡدًا لِّقَوۡمٍ لَّا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۴۵﴾

یعنی پھر پیچھے سے ہم نے اپنے رسول پے درپے بھیجے پس ان تمام آیات (زیر تفسیر آیت اور بعض اَور آیات جن کا اس سے پہلے ذکر کیا گیا ہے) سے ظاہر ہے کہ عادت اللہ یہی ہے کہ وہ اپنی کتاب بھیج کر پھر اُس کی تائید اور تصدیق کے لئے ضرور انبیاء کو بھیجا کرتا ہے چنانچہ توریت کی تائید کے لئے ایک ایک وقت میں چار چار سَو نبی بھی آیا جن کے آنے پر اب تک بائیبل شہادت دے رہی

ہے۔ (شہادت القرآن ص۴۵)

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ۝

یعنی ہم نے عیسٰی اور اس کی والدہ کو ایک ایسے ٹیلہ پر جگہ دی جو آرام کی جگہ تھی اور پانی صاف یعنی چشموں کا پانی وہاں تھا سو اس میں خدا تعالیٰ نے کشمیر کا نقشہ کھینچ دیا ہے اور اٰوٰی کا لفظ لغتِ عرب میں کسی مصیبت یا تکلیف سے پناہ دینے کے لئے آتا ہے اور صلیب سے پہلے عیسٰی اور اس کی والدہ پر کوئی زمانہ مصیبت کا نہیں گزرا جس سے پناہ دی جاتی۔ پس متعین ہوا کہ خدا تعالیٰ نے عیسٰی اور اس کی والدہ کو واقعہ صلیب کے بعد اُس ٹیلے پر پہنچایا تھا۔ (کشتی نوح ص۱۶ حاشیہ)

اٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ میں اللہ تعالیٰ یہ بات ہمیں سمجھاتا ہے کہ صلیب کے واقعہ کے بعد ہم نے عیسٰی مسیح کو صلیبی بَلا سے رہائی دے کر اس کو اور اس کی ماں کو ایک ایسے ٹیلے پر جگہ دی تھی کہ وہ آرام کی جگہ تھی اور اس میں چشمے جاری تھے یعنی سری نگر کشمیر۔
(کشتی نوح ص۶۹ حاشیہ)

وَمِنَ الْمَعْلُوْمِ اَنَّ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ فِیْ عَهْدِ عِیْسٰی عَلَیْهِ السَّلَامُ کَانُوْا مُتَفَرِّقِیْنَ مُنْتَشِرِیْنَ فِیْ بِلَادِ الْهِنْدِ وَفَارِسَ وَکَشْمِیْرَ۔ فَکَانَ فَرْضُهٗ اَنْ یُّدْرِکَهُمْ وَیُلَاقِیَهُمْ وَیَهْدِیَهُمْ اِلٰی صِرَاطِ الرَّبِّ الْقَدِیْرِ۔ وَتَرْکُ الْفَرْضِ مَعْصِیَةٌ وَالْاِعْرَاضُ عَنْ قَوْمٍ مُّنْتَظِرِیْنَ ضَالِّیْنَ جَرِیْمَةٌ کَبِیْرَةٌ تَعَالٰی شَانُ الْاَنْبِیَاءِ الْمَعْصُوْمِیْنَ مِنْ هٰذِهِ الْجَرَائِمِ۔ الَّتِیْ هِیَ اَشْنَعُ الذَّمَائِمِ ......

(ترجمہ از مرتب) یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ بنی اسرائیل حضرت عیسٰی علیہ السلام کے زمانہ میں ہندوستان، فارس اور کشمیر کے ممالک میں پھیلے ہوئے تھے، اِس لئے حضرت عیسٰی علیہ السلام کا فرض تھا کہ وہ ان کے پاس پہنچیں اور ان سے ملیں اور انہیں ربّ قدیر کی راہ دکھائیں۔ اور فرض کا ترک کرنا اور ایسے گمراہ لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کرنا جو کسی ہادی کے منتظر ہوں بہت بڑا گناہ ہے، ایسے سنگین جرائم سے انبیاءِ معصومین کی شان بالاتر ہوتی ہے ......

لَا شَكَّ وَلَا شُبْهَةَ وَلَا رَيْبَ اَنَّ عِيْسٰى لَمَّا مَنَّ اللّٰهُ بِتَخْلِيْصِهٖ مِنْ بَلِيَّةِ الصَّلْبِ هَاجَرَ مَعَ اُمِّهٖ وَبَعْضِ صَحَابَتِهٖ اِلٰى كَشْمِيْرَ وَرَبْوَتِهِ الَّتِىْ كَانَتْ ذَاتَ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ وَّ مَجْمَعَ الْاَعَاجِيْبِ ـ وَ اِلَيْهِ اَشَارَ رَبُّنَا نَاصِرُ النَّبِيِّيْنَ ـ وَمُعِيْنُ الْمُسْتَضْعَفِيْنَ ـ فِىْ قَوْلِهٖ وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗ اٰيَةً وَّ اٰوَيْنٰهُمَا اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ ـ وَلَا شَكَّ اَنَّ الْاِيْوَاءَ لَا يَكُوْنُ اِلَّا بَعْدَ مُصِيْبَةٍ ـ وَتَعَبٍ وَّكُرْبَةٍ ـ وَلَا يُسْتَعْمَلُ هٰذَا اللَّفْظُ اِلَّا بِهٰذَا الْمَعْنٰى وَهٰذَا هُوَ الْحَقُّ مِنْ غَيْرِ شَكٍّ وَّ شُبْهَةٍ ـ وَلَا يَتَحَقَّقُ هٰذِهِ الْحَالَةُ الْمُقْلِقَةُ فِىْ سَوَانِحِ الْمَسِيْحِ اِلَّا عِنْدَ وَاقِعَةِ الصَّلِيْبِ ـ وَلَيْسَتْ رَبْوَةٌ فِى الْاِرْتِفَاعِ فِىْ جَمِيْعِ الدُّنْيَا مِنَ الْبَعِيْدِ وَالْقَرِيْبِ ـ كَمِثْلِ اِرْتِفَاعِ جِبَالِ كَشْمِيْرَ وَكَمِثْلِ مَا يَتَعَلَّقُ بِشُعَبِهَا عِنْدَ الْعَلِيْمِ الْاَدِيْبِ ـ وَلَا يَسَعُ لَكَ تَخْطِئَةُ هٰذَا الْكَلَامِ مِنْ غَيْرِ التَّصْوِيْبِ ـ وَاَمَّا لَفْظُ الْقَرَارِ فِى الْاٰيَةِ فَيَدُلُّ عَلَى الْاِسْتِقْرَارِ فِىْ تِلْكَ الْخِطَّةِ بِالْاَمْنِ وَالْعَافِيَةِ ـ مِنْ غَيْرِ مُزَاحَمَةِ الْكَفَرَةِ الْفَجَرَةِ ـ وَلَا شَكَّ اَنَّ

اِس میں کچھ شک وشُبہ نہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کو صلیب کی مصیبت سے نجات بخشی تو آپ نے اپنی والدہ نیز اپنے چند ساتھیوں سمیت کشمیر کے بلند وبالا علاقہ کی طرف ہجرت کی جو چشموں سے شاداب اور مجمع عجائبات تھا اور ہمارے ربّ نے جو انبیاء کا مددگار اور کمزوروں کا دستگیر ہے اس کی طرف اپنے قول وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗٓ اٰيَةً وَّاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ میں اشارہ فرمایا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اِیْوَاء کا لفظ مصیبت اور پریشان کُن حالت سے نجات کے بعد ہی بولا جاتا ہے۔ اور یہ لفظ عربی زبان میں ہمیشہ انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور پریشان اور بے چین کرنے والی حالت حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی میں صرف صلیب کے واقعہ کے وقت ہی پیش آئی تھی اور ہر ذی علم جانتا ہے کہ تمام دُنیا میں کشمیر کے بلند وبالا اور سرسبز وشاداب پہاڑوں جیسا اور کوئی پہاڑ نہیں۔ اور اہلِ تحقیق کے لئے اس کلام کی تصدیق کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

آیت مذکورہ میں قرار کا لفظ مسیح علیہ السلام کے خطہ کشمیر میں امن وعافیت کے ساتھ بغیر کسی مخالف کی مزاحمت کے اندیشے کے رہائش اختیار کرنے پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے لئے ملکِ شام میں کوئی آرام کی جگہ نہ تھی اور بدبخت

عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ مَا كَانَ لَهٗ قَرَارٌ فِيْ اَرْضِ الشَّامِ۔ وَكَانَ يُخْرِجُهٗ مِنْ اَرْضٍ اِلٰى اَرْضٍ اَلْيَهُوْدُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنَ الْاَشْقِيَاءِ وَاللِّئَامِ۔ فَمَا رَاٰى قَرَارًا اِلَّا فِيْ خِطَّةِ كَشْمِيْرَ۔ وَ اِلَيْهِ اَشَارَ فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ رَبُّنَا الْخَبِيْرُ۔ وَ اَمَّا الْمَاءُ الْمَعِيْنُ فَهِيَ اِشَارَةٌ اِلٰى عُيُوْنٍ صَافِيَةٍ وَ يَنَابِيْعَ مُنْفَجِرَةٍ تُوْجَدُ فِيْ هٰذِهِ الْخِطَّةِ۔ وَلِذَالِكَ شَبَّهَ النَّاسُ تِلْكَ الْاَرْضَ بِالْجَنَّةِ۔ ("اَلْهُدٰى وَالتَّبْصِرَةُ لِمَنْ يَّرٰى" صفحہ ۱۱۵، ۱۱۶)

اِعْلَمْ اَنَّ لَفْظَ الْاِيْوَاءِ بِاَحَدٍ مِّنْ مُّشْتَقَّاتِهٖ قَدْ جَآءَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ مَّوَاضِعِ الْقُرْاٰنِ۔ وَكُلُّهَا ذُكِرَ فِيْ مَحَلِّ الْعَصْمِ مِنَ الْبَلَاءِ بِطَرِيْقِ الْاِمْتِنَانِ۔ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى۔ وَمَا اَرَادَ مِنْهُ اِلَّا الْاِرَاحَةَ بَعْدَ الْاَذٰى۔ وَقَالَ فِيْ مَقَامٍ اٰخَرَ۔ اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰكُمْ۔ فَانْظُرُوْا كَيْفَ صَرَّحَ حَقِيْقَةَ الْاِيْوَاءِ وَبِهَا دَاوَاكُمْ۔ وَقَالَ حِكَايَةً عَنِ ابْنِ نُوْحٍ سَاٰوِيْ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ۔ فَمَا كَانَ قَصْدُهٗ جَبَلًا رَفِيْعًا اِلَّا بَعْدَ

کینے یہودی آپ کو ایک علاقے سے دوسرے علاقے کی طرف نکلنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ پس خطۂ کشمیر کے سوا نہیں کہیں امن و عافیت کی جگہ نہ ملی اور اسی کی طرف ہمارے ربِ خبیر نے مذکورہ آیت میں اشارہ فرمایا ہے۔ ماء معین کے الفاظ سے ان صاف و شفاف اور بہنے والے چشموں کی طرف اشارہ ہے جو اس علاقے میں پائے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے لوگوں نے کشمیر کو جنّت نظیر قرار دیا ہے۔ (الہدیٰ صفحہ ۱۱۵)

(ترجمہ از مرتب) جاننا چاہیئے کہ لفظ ایواء اپنے اشتقاق کے لحاظ سے قرآن کریم میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے اور سب جگہ بطریق احسان بلاء سے نجات دینے کے معنے میں آیا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى۔ اس آیت میں اٰوٰی کے لفظ میں تکلیف کے بعد آرام پہنچانے کے معنے ہی مراد ہیں۔ ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰكُمْ۔ دیکھو۔ اس آیت میں کس طرح ایواء کے لفظ کی حقیقت کھول کر بتا دی گئی ہے اور تمہارے شک کا علاج کر دیا گیا ہے۔ پھر نوح علیہ السلام کے بیٹے کے قول کا ذکر کیا گیا ہے کہ اس نے کہا سَاٰوِيْ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ۔ اور اس کا بلند و بالا پہاڑ کی طرف جانے کا ارادہ مصیبت کو دیکھ لینے کے بعد ہی ہوا تھا۔ اب خود ہی بتائیں کہ مسیح علیہ السلام

رُؤْيَةِ الْبَلَاءِ۔ فَبَيِّنُوْا لَنَا اَيَّ بَلَاءٍ نَزَلَ عَلَى ابْنِ مَرْيَمَ وَمَعَهُ عَلٰى اُمِّهِ اَشَدُّ مِنْ بَلَاءِ الصَّلِيْبِ۔ ثُمَّ اَيَّ مَكَانٍ اٰوَاهُمَا اللّٰهُ اِلَيْهِ مِنْ دُوْنِ رَبْوَةِ كَشْمِيْرَ بَعْدَ ذَالِكَ الْيَوْمِ الْعَصِيْبِ۔ ("اَلْهُدٰى وَالتَّبْصِرَةُ لِمَنْ يَّرٰى" صفحہ ۱۱۵ حاشیہ طبع اول)

خدا تو کہتا ہے کہ واقعہ صلیب کے بعد عیسٰی اور اس کی ماں کو ہم نے ایک ٹیلہ پر جگہ دی جس میں صاف پانی بہتا تھا یعنی چشمے جاری تھے۔ بہت آرام کی جگہ تھی اور جنّت نظیر تھی جیسا کہ فرماتا ہے وَ اٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِيْنٍ یعنی ہم نے واقعہ صلیب کے بعد جو ایک بڑی مصیبت تھی عیسٰی اور اس کی ماں کو ایک بڑے ٹیلہ پر جگہ دی جو بڑے آرام کی جگہ اور پانی خوشگوار تھا یعنی خطۂ کشمیر۔ اب اگر آپ لوگوں کو عربی سے کچھ بھی مَس ہے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اٰوٰی کا لفظ اُسی موقع پر آتا ہے کہ جب کسی مصیبتِ پیش آمدہ سے بچا کر پناہ دی جاتی ہے۔ یہی محاورہ تمام قرآن شریف میں اور تمام اقوالِ عرب میں اور احادیث میں موجود ہے اور خدا تعالیٰ کے کلام سے ثابت ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو اپنی تمام عمر میں صرف صلیب کی ہی مصیبت پیش آئی تھی اور حدیث سے ثابت ہے کہ مریم کو تمام عمر میں اسی واقعہ سے سخت غم پہنچا تھا پس یہ آیت بلند آواز سے پکار رہی ہے کہ اس واقعۂ صلیب کے بعد خدا تعالیٰ نے اس آفت سے حضرت عیسٰیؑ کو نجات دے کر اس موذی ملک سے کسی دوسرے ملک میں پہنچا دیا تھا جہاں پانی صاف کے چشمے بہتے تھے اور اُونچا ٹیلہ تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا آسمان پر بھی کوئی چشمہ دار ٹیلہ ہے جس پر خدا تعالیٰ نے واقعۂ صلیب کے بعد حضرت مسیح کو جا بٹھایا اور ماں کو بھی اور حضرت مسیح کے سوانح میں غور کرکے کوئی نظیر تو پیش کرو کہ کسی مصیبت کے بعد انہیں ایسے ملک میں جگہ دی گئی ہو جو آرامگاہ اور جنّت نظیر ہو اور بڑا ٹیلہ ہو تمام دُنیا سے بلند اور چشمے جاری ہوں۔ پس آپ کے خیال کے رُو سے خدا تعالیٰ نعوذ باللہ صریح جھوٹا ٹھہرتا ہے کہ وہ تو صلیب کے بعد ٹیلہ کا ذکر کرتا ہے جس میں عیسٰی اور اُس کی ماں کو جگہ دی گئی اور آپ لوگ خواہ مخواہ اُس کو آسمان پر بٹھاتے ہیں اور محض بیکار۔ بھلا بتلاؤ تو سہی کہ نبی ہو کر اتنی مدّت کیوں بیکار بیٹھا رہا ہے۔

(اعجاز احمدی ص ۱۹، ۲۰)

اور ان کی والدہ پر صلیب کے اِبتلاء سے بڑھ کر اَور کونسی بڑی مصیبت نازل ہوئی تھی اور کشمیر کے ٹیلے کے سوا اَور کونسی جگہ ہے جس میں اس کٹھن وقت کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو پناہ دی۔

(الھدٰی ص ۱۱۵ حاشیہ)

اٰوَیْنٰھُمَآ اِلٰی رَبْوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیْنٍ یعنی اس مصیبت کے بعد جو صلیب کی مصیبت تھی ہم نے مسیح اور اس کی ماں کو ایسے ملک میں پہنچا دیا جس کی زمین بہت اُونچی تھی اور صاف پانی تھا اور بڑے آرام کی جگہ تھی اور احادیث میں آیا ہے کہ اس واقعہ کے بعد عیسیٰؑ ابن مریم نے ایک سو بیس برس کی عمر پائی اور پھر فوت ہو کر اپنے خدا کو جاملا اور دوسرے عالم میں پہنچ کر یحییٰؑ کا ہم نشیں ہوا کیونکہ اس کے واقعہ اور یحییٰ نبی کے واقعہ کو باہم مشابہت تھی۔ (تذکرۃ الشہادتین صؔ۲۷)

اس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کشمیر کی طرف سفر کرنا ایسا امر نہیں ہے کہ جو بے دلیل ہو بلکہ بڑے بڑے دلائل سے یہ امر ثابت کیا گیا ہے یہاں تک کہ خود لفظ کشمیر بھی اس پر دلیل ہے کیونکہ لفظ کشمیر وہ لفظ ہے جس کو کشمیری زبان میں کشیر کہتے ہیں۔ ہر ایک کشمیری اسکو کشیر بولتا ہے۔ پس معلوم ہوتا ہے کہ دراصل یہ لفظ عبرانی ہے کہ جو کاف اور اشیر کے لفظ سے مرکب ہے اور اشیر عربی زبان میں شام کے ملک کو کہتے ہیں اور کاف مماثلت کے لئے آتا ہے۔ پس صورت اِس لفظ کی کَاَشِیْرْ تھی یعنی کاف الگ اور اَشِیر الگ۔ جس کے معنے تھے مانند ملک شام یعنی شام کے ملک کی طرح۔ اور چونکہ یہ ملک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہجرت گاہ تھا اور وہ سرد ملک کے رہنے والے تھے اِس لئے خدا تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو تسلی دینے کے لئے اس ملک کا نام کَاَشِیْرْ رکھ دیا جس کے معنے ہیں اَشِیر کے ملک کی طرح۔ پھر کثرتِ استعمال سے الف ساقط ہو گیا اور کشیر رہ گیا۔ پھر بعد اِس کے غیر قوموں نے جو کشیر کے باشندے نہ تھے اور نہ اس ملک کی زبان رکھتے تھے ایک میم اس میں زیادہ کر کے کشمیر بنا دیا مگر یہ خدا تعالیٰ کا فضل اور اس کی رحمت ہے کہ کشمیری زبان میں اب تک کَشِیْرْ ہی بولا جاتا ہے اور لکھا جاتا ہے۔

ماسوا اس کے کشمیر کے ملک میں اور بہت سی چیزوں کے اب تک عبرانی نام پائے جاتے ہیں۔ بلکہ بعض پہاڑوں پر نبیوں کے نام استعمال پا گئے ہیں جن سے سمجھا جاتا ہے کہ عبرانی قوم کسی زمانہ میں ضرور اس جگہ آباد رہ چکی ہے جیسا کہ سلیمان نبی کے نام سے ایک پہاڑ کشمیر میں موجود ہے اور ہم اِس مدعا کے ثابت کرنے کے لئے ایک لمبی فہرست اپنی بعض کتابوں میں شائع کر چکے ہیں جو عبرانی الفاظ اور اسرائیلی نبیوں کے نام پر مشتمل ہے جو کشمیر میں اب تک پائے جاتے ہیں اور کشمیر کی تاریخی کتابیں جو ہم نے بڑی محنت سے جمع کی ہیں جو ہمارے پاس موجود ہیں ان سے بھی مفصلاً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ میں جو اِس وقت شمار کی رُو سے دو ہزار برس کے قریب گذر گیا ہے ایک اسرائیلی نبی کشمیر میں آیا تھا جو بنی اسرائیل میں سے تھا اور شاہزادہ نبی کہلاتا تھا اُسی کی قبر محلہ خانیار میں ہے جو یوز آسف

کی قبر کرکے مشہور ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ کتابیں تو میری پیدائش سے بہت پہلے کشمیر میں شائع ہو چکی ہیں پس کیونکر کوئی خیال کر سکتا ہے کہ کشمیریوں نے افتراء کے طور پر یہ کتابیں لکھی تھیں۔ اِن لوگوں کو اس افتراء کی کیا ضرورت تھی اور کس غرض کے لئے اُنہوں نے ایسا اِفتراء کیا اور عجیب تر یہ کہ وہ لوگ اب تک اپنی کمال سادہ لوحی سے دوسرے مسلمانوں کی طرح یہی اعتقاد رکھتے ہیں کہ حضرت عیسٰی آسمان پر مع جسم عنصری چلے گئے تھے اور پھر باوجود اِس اعتقاد کے پورے یقین سے اِس بات کو جانتے ہیں کہ ایک اسرائیلی نبی کشمیر میں آیا تھا کہ جو اپنے تئیں شہزادہ نبی کرکے مشہور کرتا تھا اور ان کی کتابیں بتلاتی ہیں کہ شمار کی رُو سے اُس زمانہ کو اب انیس سو برس سے کچھ زیادہ برس گزر گئے ہیں۔ اِس جگہ کشمیریوں کی سادہ لوحی سے ہمیں یہ فائدہ حاصل ہوا ہے کہ اگر وہ اس بات کا علم رکھتے کہ شاہزادہ نبی بنی اسرائیل میں کون تھا اور وہ نبی کون ہے جس کو اب انیس سو برس گذر گئے تو وہ کبھی ہمیں یہ کتابیں نہ دکھلاتے۔ اِس لئے مَیں کہتا ہوں کہ ہم نے ان کی سادہ لوحی سے بڑا فائدہ اُٹھایا۔ ماسوا اسکے وہ لوگ شاہزادہ نبی کا نام یوز آسف بیان کرتے ہیں۔ یہ لفظ صریح معلوم ہوتا ہے کہ یسوع آسف کا بگڑا ہوا ہے۔ آسف عبرانی میں اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو قوم کو تلاش کرنے والا ہو۔ چونکہ حضرت عیسٰی اپنی اس قوم کو تلاش کرتے کرتے جو بعض فرقے یہودیوں میں سے گم تھے کشمیر میں پہنچے تھے اِس لئے انہوں نے اپنا نام یسوع آسف رکھا تھا اور یوز آسف کی کتاب میں صریح لکھا ہے کہ یوز آسف پر خدا تعالیٰ کی طرف سے انجیل اُتری تھی۔ پس باوجود اِس قدر دلائل واضحہ کے کیونکر اِس بات سے انکار کیا جائے کہ یوز آسف دراصل حضرت عیسٰی علیہ السلام ہے ورنہ یہ بار ثبوت ہمارے مخالفوں کی گردن پر ہے کہ وہ کون شخص ہے جو اپنے تئیں شاہزادہ نبی ظاہر کرتا تھا جس کا زمانہ حضرت عیسٰی کے زمانہ سے بالکل مطابق ہے۔ اور یہ پتہ بھی ملا ہے کہ جب حضرت عیسٰی کشمیر میں آئے تو اُس زمانہ کے بدھ مذہب والوں نے اپنی پستکوں میں ان کا کچھ ذکر کیا ہے۔

ایک اور قوی دلیل اِس بات پر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اٰوَیْنٰھُمَآ اِلٰی رَبْوَۃٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّ مَعِیْنٍ یعنی ہم نے عیسٰی اور اُس کی ماں کو ایک ایسے ٹیلے پر پناہ دی جو آرام کی جگہ تھی اور ہر ایک دشمن کی دستِ درازی سے دُور تھی اور پانی اُس کا بہت خوشگوار تھا۔

یاد رہے کہ اٰوٰی کا لفظ عربی زبان میں اُس جگہ پر بولا جاتا ہے جب ایک مصیبت کے بعد کسی شخص کو پناہ دیتے ہیں۔ ایسی جگہ میں جو دارالامان ہوتا ہے۔ پس وہ دارالامان ملکِ شام نہیں ہو سکتا کیونکہ ملکِ شام قیصرِ رُوم کی عملداری میں تھا اور حضرت عیسٰی قیصر کے باغی قرار پا چکے تھے۔

پس وہ کشمیر ہی تھا جو شام کے ملک سے مشابہ تھا اور قرار کی جگہ تھی یعنی امن کی جگہ تھی یعنی قیصر روم کو اس سے کچھ تعلق نہ تھا۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۲۶ تا ۲۲۹)

اٰوٰی کا لفظ عرب کی زبان میں اس موقع پر استعمال پاتا ہے جبکہ کسی قدر تکلیف کے بعد کسی شخص کو اپنی پناہ میں لیا جائے جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی ٥ اور جیسا کہ فرماتا ہے اٰوَیْنٰهُمَآ اِلٰی رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِیْنٍ ٥ (حقیقۃ الوحی ص۹۴ حاشیہ)۔

خدا کا کلام قرآن شریف گواہی دیتا ہے کہ وہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) مر گیا اور اس کی قبر سرینگر کشمیر میں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاٰوَیْنٰهُمَآ اِلٰی رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِیْنٍ ٥ یعنی ہم نے عیسیٰ اور اس کی ماں کو یہودیوں کے ہاتھوں سے بچا کر ایک ایسے پہاڑ میں پہنچا دیا جو آرام اور خوشحالی کی جگہ تھی اور مصفا پانی کے چشمے اس میں جاری تھے سو وہی کشمیر ہے۔ اسی وجہ سے حضرت مریم کی قبر زمین شام میں کسی کو معلوم نہیں اور کہتے ہیں کہ وہ بھی حضرت عیسیٰ کی طرح مفقود ہے۔

(حقیقۃ الوحی ص۱۰۱ حاشیہ)

یعنی ہم نے عیسیٰ اور اس کی ماں کو بعد اس کے جو یہودیوں نے اُن پر ظلم کیا اور حضرت عیسیٰ کو سُولی دینا چاہا ہم نے عیسیٰ اور اس کی ماں کو پناہ دی اور دونوں کو ایک ایسے پہاڑ پر پہنچا دیا جو سب پہاڑوں سے اونچا تھا یعنی کشمیر کا پہاڑ جس میں خوشگوار پانی تھا اور بڑی آسائش اور آرام کی جگہ تھی۔

(حقیقۃ الوحی ص۲۳۲)

اٰوَیْنٰهُمَآ اِلٰی رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِیْنٍ کے متعلق بعض کہتے ہیں کہ وہ شام ہی میں تھا میں کہتا ہوں یہ بالکل غلط ہے۔ قرآن شریف خود اس کا مخالف ہے اس لئے کہ اٰوٰی کا لفظ تو اُس جگہ استعمال ہوتا ہے جہاں ایک مصیبت کے بعد نجات ملے اور پناہ دی جائے۔ یہ بات اُس رومی سلطنت میں رہ کر اُنہیں کب حاصل ہو سکتی تھی۔ وہ تو وہاں رہ سکتے ہی نہ تھے اِس لیئے لازمی طور پر انہوں نے ہجرت کی۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۵ء ص۵)

وَاٰوَیْنٰهُمَآ اِلٰی رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِیْنٍ ٥ یعنی ہم نے واقعۂ صلیب کے بعد جو ایک بڑی مصیبت تھی عیسیٰ اور اس کی ماں کو ایک بڑے ٹیلہ پر جگہ دی جو بڑے آرام کی جگہ اور پانی خوشگوار تھا یعنی خطۂ کشمیر۔ اب اگر آپ لوگوں کو عربی سے کچھ بھی مَس ہے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اٰوٰی کا لفظ اُسی موقع پر آتا ہے کہ جب کسی مصیبتِ پیش آمدہ سے بچا کر پناہ دی جاتی ہے۔ یہی محاورہ تمام قرآن شریف میں اور تمام اقوالِ عرب میں اور احادیث میں موجود ہے اور خدا تعالیٰ کے کلام سے

ثابت ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو اپنی تمام عمر میں صرف صلیب کی ہی مصیبت پیش آئی تھی اور حدیث سے ثابت ہے کہ مریم کو تمام عمر میں اسی واقعہ سے سخت غم پہنچا تھا۔ پس یہ آیت بلند آواز سے پکار رہی ہے کہ اس واقعۂ صلیب کے بعد خدا تعالیٰ نے اس آفت سے حضرت عیسٰی کو نجات دے کر اُس موذی ملک سے کسی دوسرے ملک میں پہنچا دیا تھا جہاں پانی صاف کے چشمے بہتے تھے اور اُونچا ٹیلہ تھا۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا آسمان پر بھی کوئی چشمہ دار ٹیلہ ہے جس پر خدا تعالیٰ نے واقعۂ صلیب کے بعد حضرت مسیح کو جا بٹھایا اور ماں کو بھی اور حضرت مسیح کے سوانح میں غور کرکے کوئی نظیر تو پیش کرو کہ کسی مصیبت کے بعد انہیں ایسے ملک میں جگہ دی گئی ہو جو آرام گاہ اور جنّت نظیر ہو اور بڑا ٹیلہ ہو تمام دُنیا سے بلند اور چشمے جاری ہوں۔ پس آپ کے خیال کے رُو سے خدا تعالیٰ نعوذ باللہ صریح جھوٹا ٹھہرتا ہے کہ وہ تو صلیب کے بعد ٹیلہ کا ذکر کرتا ہے جس میں عیسٰی اور اس کی ماں کو جگہ دی گئی اور آپ لوگ خواہ مخواہ اس کو آسمان پر بٹھاتے ہیں اور محض بیکار۔ بھلا بتاؤ تو سہی کہ نبی ہو کر اتنی مدت کیوں بیکار بیٹھ رہا ہے۔ (نزول المسیح ضمیمہ صفحہ ۲)

۵۲۔ یٰۤاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا ؕ اِنِّیْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ ؕ

یعنی پاک چیزیں کھاؤ اور پاک عمل کرو۔ اِس آیت میں حکم جسمانی صلاحیّت کے انتظام کے لئے ہے جس کے لئے كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ کا ارشاد ہے اور دوسرا حکم رُوحانی صلاحیّت کے انتظام کے لئے ہے جس کے لئے وَ اعْمَلُوْا صَالِحًا کا ارشاد ہے اور ان دونوں کے مقابلہ سے ہمیں یہ دلیل ملتی ہے کہ بدکاروں کے لئے عالَمِ آخرت کی سزا ضروری ہے کیونکہ جبکہ ہم دُنیا میں جسمانی پاکیزگی کے قواعد کو ترک کرکے فی الفور کسی بَلا میں گرفتار ہو جاتے ہیں اِس لئے یہ امر بھی یقینی ہے کہ اگر ہم روحانی پاکیزگی کے اصول کو ترک کریں گے تو اسی طرح موت کے بعد بھی کوئی عذاب مولم ضرور ہم پر وارد ہوگا جو وباء کی طرح ہمارے ہی اعمال کا نتیجہ ہوگا۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۰۱)

اِس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کفارہ کچھ چیز نہیں بلکہ جب کہ ہم اپنے جسمانی بد طریقوں سے وباء کو اپنے پر لے آتے ہیں اور پھر حفظِ صحت کے قواعد کی پابندی سے اُس سے نجات پاتے ہیں۔ یہی قانونِ قدرت ہمارے روحانی عذاب اور نجات سے وابستہ ہے۔ (ایام الصلح صفحہ ۱۰۱ حاشیہ)

قرآن شریف تو کُلُوۡا مِنَ الطَّیِّبٰتِ کی تعلیم دے اور یہ لوگ طیّب عمدہ چیزیں خاک ڈال کر غیر طیّب بنا دیں۔ اس قسم کے مذاہب اسلام کے بہت عرصہ بعد پیدا ہوئے ہیں۔ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اضافہ کرتے ہیں۔ ان کو اسلام سے اور قرآن کریم سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ خود اپنی شریعت الگ قائم کرتے ہیں۔ مَیں اس کو سخت حقارت اور نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُسوہ حسنہ ہیں۔ ہماری بھلائی اور خوبی یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آپؐ کے نقش قدم پر چلیں اور اس کے خلاف کوئی قدم نہ اُٹھائیں۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۳ صفحہ ۲ مورخہ ۱۰؍ اپریل ۱۹۰۳ء)

۵۴۔ فَتَقَطَّعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ بَیۡنَهُمۡ زُبُرًا ؕ كُلُّ حِزۡبٍۭ بِمَا لَدَیۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ ۝

فطرت ایسی چیز نہیں جو مستقل طور پر ہادی ہوسکے کیونکہ وہ شیطان کے قائم مقام مُضِلّ بھی تو ہو جاتی ہے۔ فطرت میں توہمات کے داخل ہو جانے سے جو بعض نقص پیدا ہو جاتے ہیں۔ اسی وجہ سے كُلُّ حِزۡبٍۭ بِمَا لَدَیۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ کہا گیا ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۷؍ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

۷۱، ۷۲۔ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ بِهٖ جِنَّةٌ ؕ بَلۡ جَآءَهُمۡ بِالۡحَقِّ وَ اَكۡثَرُهُمۡ لِلۡحَقِّ كٰرِهُوۡنَ ۝ وَ لَوِ اتَّبَعَ الۡحَقُّ اَهۡوَآءَهُمۡ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ وَ مَنۡ فِیۡهِنَّ ؕ بَلۡ اَتَیۡنٰهُمۡ بِذِكۡرِهِمۡ فَهُمۡ عَنۡ ذِكۡرِهِمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ۝ؕ

کیا یہ کہتے ہیں کہ اس کو جنون ہے۔ نہیں۔ بلکہ بات تو یہ ہے کہ خدا نے ان کی طرف حق بھیجا اور وہ حق کے قبول کرنے سے کراہت کر رہے ہیں اور اگر خدا ان کی خواہشوں کی پیروی کرتا تو

زمین اور آسمان اور جو کچھ ان میں ہے سب بگڑ جاتا بلکہ ہم ان کے لئے وہ ہدایت لائے ہیں جس کے وہ محتاج ہیں۔ سو جس ہدایت کے وہ محتاج ہیں اسی سے کنارہ کش ہیں۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۲۱، صفحہ ۲۲۲ حاشیہ)

مَا اتَّخَذَ اللّٰہُ مِنْ وَّلَدٍ وَّمَا کَانَ مَعَہٗ مِنْ اِلٰہٍ اِذًا لَّذَھَبَ کُلُّ اِلٰہٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُھُمْ عَلٰی بَعْضٍ سُبْحٰنَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوْنَ ○

یعنی اگر زمین و آسمان میں بجز اُس ایک ذات جامع صفات کاملہ کے کوئی اور بھی خدا ہوتا تو وہ دونوں بگڑ جاتے۔ کیونکہ ضرور تھا کہ کبھی وہ جماعت خدائیوں کی ایک دوسرے کے خلاف کام کرتے۔ پس اسی پھوٹ اور اختلاف سے عالم میں فساد راہ پاتا اور نیز الگ الگ خالق ہوتے تو ہر واحد اُن میں سے اپنی ہی مخلوق کی بھلائی چاہتا اور اُن کے آرام کے لئے دوسروں کا برباد کرنا روا رکھتا۔ پس یہ بھی موجب فساد عالم ٹھہرتا۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۳۴ حاشیہ در حاشیہ)

وَ اِنَّا عَلٰٓی اَنْ نُّرِیَکَ مَا نَعِدُھُمْ لَقٰدِرُوْنَ ○

اور ہم اِس بات پر قادر ہیں کہ جو کچھ ہم اُن کی نسبت وعدہ کرتے ہیں وہ تجھے دکھلا دیں۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۳۰)

اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ السَّیِّئَۃَ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَصِفُوْنَ ○

خدا تعالیٰ قرآن شریف میں پیش دستی کر کے لڑائی کرنا ایک سخت مجرمانہ فعل قرار دیتا ہے بلکہ مومنوں کو جا بجا صبر کا حکم دیا ہے جیسا کہ وہ اِس آیت میں فرماتا ہے۔ یعنی تیرا دشمن جو تجھ سے بدی کرتا ہے اس کا مقابلہ نیکی کے ساتھ کر۔ اگر تُو نے ایسا کیا تو وہ تیرا ایسا دوست ہو جائے گا کہ گویا رشتہ دار بھی ہے۔ (لیکچر چشمۂ معرفت صفحہ ۲۴)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ۱۳ برس تک جور و ستم سہنے پڑے اور پھر مدافعت کا حکم دیا

گیا۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا سے ظاہر ہے کہ پہلے جواب تک دینے کا بھی حکم نہیں تھا اِس لئے دو اصل فرمائے ایک تو وَاَعْرِضْ عَنِ الْجَاھِلِیْنَ جن لوگوں میں جہالت کا مادہ ہو۔ جو تکبّر سے بھرے ہوئے جھگڑالو ہوں۔ ان سے اعراض کرنا چاہیئے۔ ان کی باتوں کا جواب ہی نہ دیا جاوے۔ دوم اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ یعنی بدی کے مقابلہ میں نیکی کرنا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دوست بن جاتا ہے اور وہ دوست بھی ایسا کہ کَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ۔

(بدر جلد ۶ ع۱۵ مورخہ ۱۱ اپریل ۱۹۰۷ء صـ۶)

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۙ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا ۭ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا ۭ وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝

یعنی جب کافروں میں سے ایک کو موت آتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ اے میرے رب مجھ کو پھر دُنیا میں بھیج تا کہ مَیں نیک عمل کروں اور تدارک مافات مجھ سے ہو سکے تو اس کو کہا جاتا ہے کہ یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ یہ صرف اس کا قول ہے یعنی خدا تعالیٰ کی طرف سے ابتداء سے کوئی بھی وعدہ نہیں کہ مُردہ کو پھر دُنیا میں بھیجے اور پھر آگے فرمایا کہ جو لوگ مر چکے ہیں ان میں اور دُنیا میں ایک پردہ ہے جس کی وجہ سے وہ قیامت تک دُنیا کی طرف رجوع نہیں کر سکتے۔

(ازالہ اوہام حاشیہ درحاشیہ صـ۶۴۲ الف)

فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ يَوْمَئِذٍ وَّلَا يَتَسَآءَلُوْنَ ۝

خدا تعالیٰ کی آواز تو ہمیشہ آتی ہے مگر مُردوں کی نہیں آتی۔ اگر کہیں کسی مُردے کی آواز آتی ہے تو خدا تعالیٰ کی معرفت۔ یعنی خدا تعالیٰ کوئی خبر ان کے متعلق دے دیتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کوئی ہو خواہ نبی ہو یا صدیق یہ حال ہے کہ آں را خبر شد خبرش باز نیامد۔ اللہ تعالیٰ ان کے درمیان

اور اہل وعیال کے درمیان ایک حجاب رکھ دیتا ہے۔ وہ سب تعلق قطع ہو جاتے ہیں اِسی لئے فرمایا ہے فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ ۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷/ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

تفسیر سورۃ النّور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

۳ اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیۡ فَاجۡلِدُوۡا کُلَّ وَاحِدٍ مِّنۡہُمَا مِائَۃَ جَلۡدَۃٍ ۪ وَّلَا تَاۡخُذۡکُمۡ بِہِمَا رَاۡفَۃٌ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ۚ وَلۡیَشۡہَدۡ عَذَابَہُمَا طَآئِفَۃٌ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ۝

بعض وقت انسان مار کھانے سے درست ہوتا ہے اور بعض وقت مار دیکھنے سے۔ زنا کی سزا کے لئے بھی خدا نے کہا ہے کہ لوگوں کو دکھا کر دی جائے۔ اِسی طرح دوسروں کو تازیانہ پڑ رہا ہے اور ہماری جماعت دیکھ رہی ہے۔ بہت سے آدمی تھے جنہوں نے ہمارے منشاء اور ارادہ کو آج تک نہیں سمجھا تھا مگر اب خدا دوسروں کو تازیانہ لگا کر ان کو سمجھا رہا ہے طَآئِفَۃٌ مِّنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طائفہ میں کوئی کسر ہوگی۔ ان کی اصلاح اِس طرح سے ہو جائے گی کہ وہ دوسرے کو اصلاح ملتی دیکھ کر اپنی اِصلاح کریں گے اور اس میں کُل مومنوں کو بھی نہیں کہا بلکہ ایک طائفہ کو کہا ہے۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۵، ۶ مورخہ ۲۸ نومبر ۔ ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۵)

۵ وَالَّذِیۡنَ یَرۡمُوۡنَ الۡمُحۡصَنٰتِ ثُمَّ لَمۡ یَاۡتُوۡا بِاَرۡبَعَۃِ شُہَدَآءَ فَاجۡلِدُوۡہُمۡ ثَمٰنِیۡنَ جَلۡدَۃً وَّلَا تَقۡبَلُوۡا لَہُمۡ شَہَادَۃً اَبَدًا ۚ وَ

اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝

جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور اُس تہمت کے ثابت کرنے کے لئے چار گواہ نہ لاسکیں تو ان کو اسّی دُرّے مارو اور آئندہ کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو اور یہ لوگ آپ ہی بدکار ہیں۔ اِس جگہ مُحْصَنٰت کے لفظ کے وہی معنے ہیں جو آیتِ گذشتہ میں بَری کے لفظ کے معنے ہیں۔ اب اگر بموجب قول مولوی محمد حسین ایڈیٹر اشاعۃ السّنّۃ کے بری کے لفظ کا مصداق صرف وہی شخص ہوسکتا ہے کہ جس پر اوّل فرد قرار دادِ جُرم لگائی جاوے اور پھر گواہوں کی شہادت سے اس کی صفائی ہو جائے اور استغاثہ کا ثبوت ڈیفنس کے ثبوت سے ٹوٹ جائے تو اس صورت میں یعنی اگر بَری کے لفظ میں جو آیت ثُمَّ یَرْمِ بِهٖ بَرِیْٓـًٔا میں ہے یہی منشاء قرآن کا ہے۔ تو کسی عورت پر مثلاً زنا کی تہمت لگانا کوئی جُرم نہ ہوگا بجز اس صورت کے کہ اُس نے معتمد گواہوں کے ذریعہ سے عدالت میں ثابت کر دیا ہو کہ وہ زانیہ نہیں اور اس سے یہ لازم آئے گا کہ ہزارہا مستور الحال عورتیں جن کی بدچلنی ثابت نہیں حتّٰی کہ نبیوں کی عورتیں اور صحابہؓ کی عورتیں اور اہلِ بیت میں سے عورتیں تہمت لگانے والوں سے بجز اس صورت کے مخلصی نہ پاسکیں اور نہ بَری کہلانے کی مستحق ٹھہر سکیں جب تک کہ عدالتوں میں حاضر ہوکر اپنی عفت کا ثبوت نہ دیں حالانکہ ایسی عورتوں کی نسبت جن کی بدچلنی ثابت نہ ہو خدا تعالیٰ نے بارِ ثبوت الزام لگانے والوں پر رکھا ہے اور ان کو بَری اور محصنٰت کے نام سے پکارا ہے جیسا کہ اس آیت ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ سے سمجھا جاتا ہے۔ (تریاق القلوب صفحہ ۸۲-۸۳)

جو لوگ ایسی عورتوں پر تہمت لگاتے ہیں جن کا زناکار ہونا ثابت نہیں ہے بلکہ مستور الحال ہیں اگر وہ لوگ چار گواہ سے اپنے اِس الزام کو ثابت نہ کریں تو ان کو اسّی دُرّے مارنے چاہئیں۔ اب دیکھو کہ ان عورتوں کا نام خدا نے بَری رکھا ہے جن کا زانیہ ہونا ثابت نہیں۔ پس بَری کے لفظ کی یہ تشریح بعینہٖ ڈسچارج کے مفہوم سے مطابق ہے کیونکہ اگر بَری کا لفظ جو قرآن نے یَرْمِ بِهٖ بَرِیْٓـًٔا میں استعمال کیا ہے صرف ایسی صورت پر بولا جاتا ہے کہ جبکہ کسی کو مجرم ٹھہرا کر اُس پر فرد قرار دادِ جُرم لگائی جائے۔ اور پھر وہ گواہوں کی شہادت سے اپنی صفائی ثابت کرے اور استغاثہ کا ثبوت ڈیفنس کے ثبوت سے ٹوٹ جائے تو اس صورت میں ہر ایک شریر کو آزادی ہوگی کہ ایسی تمام عورتوں پر زنا کا الزام لگاوے جنہوں نے معتمد گواہوں کے ذریعہ سے عدالت میں ثابت نہیں

کر دیا کہ وہ زانیہ نہیں ہیں خواہ وہ رسولوں اور نبیوں کی عورتیں ہوں اور خواہ صحابہؓ کی اور خواہ اولیاء اللہ کی اور خواہ اہلِ بیت کی عورتیں ہوں اور ظاہر ہے کہ آیت یَرْمِ بِهٖ بَرِيْٓـًٔا میں بری کے لفظ سے ایسے معنے کرے صاف الحاد ہے جو ہرگز خدا تعالیٰ کا منشا نہیں ہے۔

(تریاق القلوب صفحہ ۱۳۶)

النور: وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝

شخص ملزم چار قسمیں خدا کی کھائے کہ وہ سچا ہے اور پانچویں قسم میں یہ کہے کہ اس پر خدا کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹا ہے۔ (تبلیغ رسالت جلد ۱۰ (مجموعہ اشتہارات) صفحہ حاشیہ)

النور: وَلَا يَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُّؤْتُوْٓا اُولِي الْقُرْبٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَالْمُهٰجِرِيْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ۭ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

جیسے خدا تعالیٰ نے اپنے اخلاق میں یہ داخل کر رکھا ہے کہ وہ وعید کی پیشگوئی کو توبہ و استغفار اور دعا اور صدقہ سے ٹال دیتا ہے اسی طرح انسان کو بھی اُس نے یہی اخلاق سکھائے ہیں جیسا کہ قرآن اور حدیث سے یہ ثابت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی نسبت جو منافقین نے محض خباثت سے خلاف واقعہ تہمت لگائی تھی اس تذکرہ میں بعض سادہ لوح صحابہؓ بھی شریک ہو گئے تھے۔ ایک صحابیؓ ایسے تھے کہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر سے دو وقتہ روٹی کھاتے تھے حضرت ابوبکرؓ نے ان کی اس خطا پر

قسم کھائی تھی اور وعید کے طور پر عہد کر لیا تھا کہ میں اس بیجا حرکت کی سزا میں اس کو کبھی روٹی نہ دوں گا اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ تب حضرت ابوبکرؓ نے اپنے اس عہد کو توڑ دیا اور بدستور روٹی لگا دی۔ اسی بناء پر اسلامی اخلاق میں یہ داخل ہے کہ اگر وعید کے طور پر کوئی عہد کیا جائے تو اس کا توڑنا حُسنِ اخلاق میں داخل ہے۔ مثلاً اگر کوئی اپنے خدمتگار کی نسبت قسم کھائے کہ میں اس کو ضرور پچاس جُوتے ماروں گا تو اس کی توبہ اور تضرع پر معاف کرنا سُنّتِ اسلام ہے تا تخلق باخلاق ہو جائے مگر وعدہ کا تخلف جائز نہیں۔ ترکِ وعدہ پر باز پُرس ہوگی مگر ترکِ وعید پر نہیں۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صـ۲۶-۲۷)

لوگوں کے گناہ بخشو اور ان کی زیادتیوں اور قصوروں کو معاف کرو کیا تم نہیں چاہتے کہ خدا بھی تمہیں معاف کرے اور تمہارے گناہ بخشے اور وہ تو غفور الرحیم ہے۔

اور انجیل نے بھی صبر اور عفو کی تعلیم دی ہے مگر اکثر لوگوں کو شاید یہ بات یاد نہیں ہوگی کہ حضرت عیسٰی انجیل میں فرماتے ہیں کہ مجھے دوسری قوموں سے سروکار نہیں میں صرف بنی اسرائیل کی بھیڑوں کے لئے آیا ہوں یعنی میری ہمدردی صرف یہودیوں تک محدود ہے مگر قرآن شریف میں صاف لکھا ہے کہ دوسری قوموں سے بھی ہمدردی کرو جیساکہ اپنی قوم کے لئے اور دوسری قوموں کو بھی معاف کرو جیساکہ اپنی قوم کو۔ (لیکچر چشمہ معرفت صـ۱۶)

۲۷ اَلْخَبِيثٰتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبٰتِ أُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُونَ مِمَّا يَقُولُونَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝

انبیاء علیہم السلام اور اللہ تعالیٰ کے مامور خبیث اور ذلیل بیماریوں سے محفوظ رکھے جاتے ہیں مثلاً جیسے آتشک ہو، جذام ہو یا اور کوئی ایسی ہی ذلیل مرض۔ یہ بیماریاں خبیث لوگوں ہی کو ہوتی ہیں اَلْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ۔ اس میں عام لفظ رکھا ہے اور نکات بھی عام ہیں اس لئے ہر خبیث مرض سے اپنے ماموروں اور برگزیدوں کو بچا لیتا ہے یہ کبھی نہیں ہوتا کہ مومن پر جھوٹا الزام لگایا جاوے اور

وہ بَری نہ کیا جاوے خصوصاً مصلح اور مامور۔ اور یہی وجہ ہے کہ مصلح یا مامور حسب نسب کے لحاظ سے بھی ایک اعلیٰ درجہ رکھتا ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۱ء صفحہ ۸)

مرد اگر پارسا طبع نہ ہو تو عورت کب صالح ہو سکتی ہے ہاں اگر مرد خود صالح بنے تو عورت بھی صالح بن سکتی ہے۔ قول سے عورت کو نصیحت نہ دینی چاہیئے بلکہ فعل سے اگر نصیحت دی جاوے تو اس کا اثر ہوتا ہے۔ عورت تو درکنار اور بھی کون ہے جو صرف قول سے کسی کی مانتا ہے..... اگر مرد کوئی کجی یا خامی اپنے اندر رکھے گا تو عورت ہر وقت کی اس پر گواہ ہے۔ اگر وہ رشوت لے کر گھر آیا ہے تو اس کی عورت کہے گی کہ جب خاوند لایا ہے تو میں کیوں اس کو حرام کہوں۔ غرضیکہ مرد کا اثر عورت پر ضرور پڑتا ہے اور وہ خود ہی اُسے خبیث اور طیب بناتا ہے۔ اس لئے لکھا ہے اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ اِس میں یہی نصیحت ہے کہ تم طیب بنو ورنہ ہزاروں ٹکریں مارو کچھ نہ بنے گا جو شخص خدا سے خود نہیں ڈرتا تو عورت اس سے کیسے ڈرے۔ نہ ایسے مولویوں کا وعظ اثر کرتا ہے نہ خاوند کا۔ ہر حال میں عملی نمونہ اثر کیا کرتا ہے۔ بھلا جب خاوند رات کو اُٹھ کر دعا کرتا ہے، روتا ہے تو عورت ایک دن دو دن تک دیکھے گی آخر ایک دن اُسے بھی خیال آوے گا اور ضرور متاثر ہو گی۔ عورت میں متاثر ہونے کا مادہ بہت ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب خاوند عیسائی وغیرہ ہوتے ہیں تو عورتیں انکے ساتھ عیسائی وغیرہ ہو جاتی ہیں۔ ان کی درستی کے واسطے کوئی مدرسہ بھی کفایت نہیں کر سکتا جتنا خاوند کا عملی نمونہ کفایت کرتا ہے۔ خاوند کے مقابلہ میں عورت کے بھائی بہن وغیرہ کا بھی کچھ اثر اس پر نہیں ہوتا۔

خدا نے مرد عورت دونوں کا ایک ہی وجود فرمایا ہے۔ یہ مردوں کا ظلم ہے کہ وہ اپنی عورتوں کو ایسا موقع دیتے ہیں کہ وہ ان میں نقص پکڑیں ورنہ اُن کو چاہیئے کہ عورتوں کو ہرگز ایسا موقع نہ دیں کہ وہ یہ کہہ سکیں کہ تو فلاں بدی کرتا ہے بلکہ عورت ٹکریں مار مار کر تھک جاوے اور کسی بدی کا پتہ اُسے مل ہی نہ سکے تو اس وقت اس کو دینداری کا خیال ہوتا ہے اور وہ دین کو سمجھتی ہے:

(البدر جلد ۲ نمبر ۹ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۶۸)

مرد اپنے گھر کا امام ہوتا ہے پس اگر وہی بد اثر قائم کرتا ہے تو پھر کس قدر بد اثر پڑنے کی امید ہے۔ مرد کو چاہیئے کہ اپنے قویٰ کو برمحل اور حلال موقع پر استعمال کرے۔ مثلاً ایک قوتِ غضبی ہے جب وہ اعتدال سے زیادہ ہو تو جنون کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ جنون میں اور اس میں بہت تھوڑا فرق ہے جو آدمی شدید الغضب ہوتا ہے اس سے حکمت کا چشمہ چھین لیا جاتا ہے بلکہ اگر کوئی مخالف ہو تو اس سے

بھی مغلوب الغضب ہو کر گفتگو نہ کرے۔

مرد کی ان تمام باتوں اور اوصاف کو عورت دیکھتی ہے وہ دیکھتی ہے کہ میرے خاوند میں فلاں فلاں اوصاف تقویٰ کے ہیں جیسے سخاوت، حلم، صبر اور جیسے اُسے پرکھنے کا موقع ملتا ہے وہ دوسرے کو مل نہیں سکتا اسی لئے عورت کو سارق بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ اندر ہی اندر اخلاق کی چوری کرتی رہتی ہے حتیٰ کہ آخر کار ایک وقت پورا اخلاق حاصل کر لیتی ہے۔

ایک شخص کا ذکر ہے کہ وہ ایک دفعہ عیسائی ہوا تو عورت بھی اس کے ساتھ عیسائی ہو گئی۔ شراب وغیرہ اوّل شروع کی پھر پردہ بھی چھوڑ دیا۔ غیر لوگوں سے بھی ملنے لگی۔ خاوند نے پھر اسلام کی طرف رجوع کیا تو اُس نے بیوی کو کہا کہ تو بھی میرے ساتھ مسلمان ہو۔ اس نے کہا کہ اب میرا مسلمان ہونا مشکل ہے۔ یہ عادتیں جو شراب وغیرہ اور آزادی کی پڑ گئی ہیں یہ نہیں چھوٹ سکتیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۰ مورخہ ۲۷ر مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۷۳)

اِفک عائشہ رضی اللہ عنہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اوّل کوئی اطلاع نہ ہوئی۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ حضرت عائشہؓ اپنے والد کے گھر چلی گئیں اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی کہا کہ اگر ارتکاب کیا ہے تو توبہ کرے۔ ان واقعات کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کس قدر اضطراب تھا مگر یہ راز ایک وقت تک آپ پر نہ کھلا لیکن جب خدا تعالیٰ نے اپنی وحی سے کیا اور فرمایا اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ تو آپ کو افک کی حقیقت معلوم ہوئی۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ متقی کو ایسی مشکلات میں نہیں ڈالتا۔ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ متقیوں کو اللہ تعالیٰ خود پاک چیزیں بہم پہنچاتا ہے اور خبیث چیزیں خبیث لوگوں کے لئے ہیں۔ اگر انسان تقویٰ اختیار کرے اور باطنی طہارت اور پاکیزگی حاصل کرے جو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں پاکیزگی ہے تو وہ ایسے اِبتلاؤں سے بچا لیا جاوے گا۔ ایک بزرگ کی کسی بادشاہ نے دعوت کی اور بکری کا گوشت بھی پکایا اور خنزیر کا بھی۔ اور جب کھانا رکھا گیا تو عمداً سؤر کا گوشت اس بزرگ کے سامنے رکھ دیا اور بکری کا اپنے اور اپنے دوستوں کے آگے۔ جب کھانا رکھا گیا اور کہا کہ شروع کرو تو اللہ تعالیٰ نے اس بزرگ پر بذریعہ کشف اصل حال کھول دیا اور انہوں نے کہا ٹھہرو تقسیم ٹھیک نہیں اور یہ کہہ کر اپنے آگے کی رکابیاں ان کے آگے اور ان کے آگے کی اپنے آگے رکھتے جاتے تھے اور یہ آیت پڑھتے جاتے تھے کہ اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ۔ غرض جب انسان شرعی امور کو ادا کرتا ہے اور

تقویٰ اختیار کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرتا ہے اور بُری اور مکروہ باتوں سے اس کو بچا لیتا ہے اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ کے یہی معنے ہیں۔
(الحکم جلد ۷ ملہ ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۰)

انسان اگر اپنے نفس کی پاکیزگی اور طہارت کی فکر کرے اور اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ کر گناہوں سے بچتا رہے تو اللہ تعالیٰ یہی نہیں کرتا کہ اس کو پاک کر دے گا بلکہ وہ اس کا متکفل اور متولی بھی ہو جائے گا اور اسے خبیثات سے بچائے گا اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ کے یہی معنے ہیں۔ اندرونی معصیت، ریاکاری، عُجب، تکبر، خوشامد، خود پسندی، بدظنی اور بدکاری وغیرہ وغیرہ خباثتوں سے بچنا چاہیئے۔ اگر اپنے آپ کو ان خباثتوں سے بچاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو پاک و مطہّر کر دے گا۔
(الحکم جلد ۸ ملہ ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

متقی کو تو کسی قسم کی تکلیف پیش نہیں آتی اور اُسے حلال روزی پہنچانے کی ذمہ داری خود خدا نے لی ہے اور اس نے یہ وعدہ بھی فرمایا ہے کہ اَلْخَبِیْثٰتُ لِلْخَبِیْثِیْنَ وَ الطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ۔ اِس سے معلوم ہوا کہ خبیث اشیاء خبیث لوگوں کو بہم پہنچائی جاتی ہیں اور پاکیزہ چیزیں پاکیزہ لوگوں کو دی جاتی ہیں۔ اس پر مجھے ایک واقعہ یاد آیا ہے کہ ایک شخص نے ایک شخص کی دعوت کی اور بکری کا گوشت بھی پکایا اور سؤر کا بھی جس کی دعوت کی وہ ایک پاکیزہ آدمی تھا اس کے آگے اس نے دیدہ و دانستہ سؤر کا گوشت رکھا اور اپنے آگے بکری کا۔ خدا تعالیٰ نے اس پر کشف سے یہ امر کھول دیا۔ جب بسم اللہ کا حکم ہُوا تو اُس نے کہا ٹھہرو یہ تقسیم ٹھیک نہیں ہے چنانچہ وہ اپنے آگے کی رکابیاں اُٹھا کر صاحبِ خانہ کے آگے اور اُس کے آگے کی اُٹھا کر اپنے آگے رکھتا جاتا تھا اور یہی آیت پڑھتا تھا کہ اَلْخَبِیْثٰتُ الخ۔
(البدر جلد ۲ ملہ ۲۹ مورخہ ۷ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۲۶)

قرآن تمہیں انجیل کی طرح یہ نہیں کہتا کہ بجز زناہ کے اپنی بیوی کی ہر ایک ناپاکی پر صبر کرو اور طلاق مت دو بلکہ وہ کہتا ہے کہ اَلطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ قرآن کا یہ منشاء ہے کہ ناپاک پاک کے ساتھ رہ نہیں سکتا۔ پس اگر تیری بیوی زنا تو نہیں کرتی مگر شہوت کی نظر سے غیر لوگوں کو دیکھتی ہے اور اُن سے بغل گیر ہوتی ہے اور زنا کے مقدمات اس سے صادر ہوتے ہیں گو ابھی تکمیل نہیں ہوئی اور غیر کو اپنی برہنگی دکھلا دیتی ہے اور مُشرکہ اور مُفسدہ ہے اور جس پاک خدا پر تو ایمان رکھتا ہے اُس سے وہ بیزار ہے تو اگر وہ باز نہ آوے تو تو اُسے طلاق دے سکتا ہے کیونکہ وہ اپنے اعمال میں تجھ سے علیحدہ ہو گئی۔ اب تیرے جسم کا ٹکڑہ نہیں رہی پس تیرے لئے اب جائز نہیں ہے کہ تو دیوثی سے اُس کے ساتھ بسر کرے کیونکہ اب وہ تیرے جسم کا ٹکڑہ نہیں ایک گندہ اور متعفّن عضو ہے جو کاٹنے کے لائق ہے ایسا

نہ ہو کہ وہ باقی عضو کو بھی گندہ کر دے اور تو مر جاوے۔ (کشتی نوح صفحہ ۲۶، ۲۷)

اُولٰٓئِكَ مُبَرَّءُوْنَ مِمَّا يَقُوْلُوْنَ۔ یہ اُس مقام کی آیت ہے کہ جہاں بے لوث اور بے گناہ ہونا ایک کا ایک وقت تک مشتبہ رہا پھر خدا نے اُس کی طرف سے ڈیفنس پیش کر کے اس کی بریت کی۔
(تریاق القلوب صفحہ ۱۳۵)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۝ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ ۚ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ۝

دوسرے گھروں میں وحشیوں کی طرح خود بخود بے اجازت نہ چلے جاؤ اجازت لینا شرط ہے۔ اور جب تم دوسروں کے گھروں میں جاؤ تو داخل ہوتے ہی السلام علیکم کہو اور اگر ان گھروں میں کوئی نہ ہو تو جب تک کوئی مالکِ خانہ تمہیں اجازت نہ دے ان گھروں میں مت جاؤ اور اگر مالکِ خانہ یہ کہے کہ واپس چلے جاؤ تو تم واپس چلے آؤ۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۹۶)

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ۭ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ۝

یہ خدا ہی کا کلام ہے جس نے اپنے کھلے ہوئے اور نہایت واضح بیان سے ہم کو ہمارے ہر ایک قول اور فعل اور حرکت اور سکون میں حدودِ معینہ مشخصہ پر قائم کیا اور ادبِ انسانیت اور پاک روشی کا طریقہ سکھلایا۔ وہی ہے جس نے آنکھ اور کان اور زبان وغیرہ اعضاء کی محافظت کے لئے بکمال تاکید فرمایا قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ الجزو ۱۸۔ یعنی مومنوں کو چاہیئے کہ وہ اپنی آنکھوں اور کانوں اور ستر گاہوں کو نامحرموں سے بچا دیں۔

اور ہر ایک نادیدنی اور ناشنیدنی اور ناکردنی سے پرہیز کریں کہ یہ طریقہ اُن کی اندرونی پاکی کا موجب ہوگا یعنی ان کے دل طرح طرح کے جذباتِ نفسانیہ سے محفوظ رہیں گے کیونکہ اکثر نفسانی جذبات کو حرکت دینے والے اور قویٰ بہیمیہ کو فتنہ میں ڈالنے والے یہی اعضاء ہیں۔ اب دیکھئے کہ قرآن شریف نے نامحرموں سے بچنے کے لئے کیسی تاکید فرمائی اور کیسے کھول کر بیان کیا کہ ایماندار لوگ اپنی آنکھوں اور کانوں اور ستر گاہوں کو ضبط میں رکھیں اور ناپاکی کے مواضع سے روکتے رہیں۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۱۹۲، ۱۹۳ حاشیہ)

مومنین کو کہہ دے کہ اپنی آنکھیں نامحرموں سے بند رکھیں اور اپنی ستر گاہوں کو اور کانوں کو نالائق امور سے بچاویں۔ یہی اُن کی پاکیزگی کے لئے ضروری اور لازم ہے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہر ایک مومن کے لئے منہیات سے پرہیز کرنا اور اپنے اعضاء کو ناجائز افعال سے محفوظ رکھنا لازم ہے اور یہی طریق اس کی پاکیزگی کا مدار ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۰۵ حاشیہ در حاشیہ)

قرآن کی یہ تعلیم ہے کہ نہ تو شہوت سے اور نہ بغیر شہوت کے بیگانہ عورت کے مُنہ پر ہرگز نظر نہ ڈال اور ان کی باتیں مت سُن اور ان کی آواز مت سُن اور ان کے حُسن کے قصے مت سُن کہ ان امور سے پرہیز کرنا تجھے ٹھوکر کھانے سے بچائے گا۔ جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ یعنی مومنوں کو کہہ دے کہ نامحرم کو دیکھنے سے اپنی آنکھوں کو بند رکھیں اور اپنے کانوں اور ستر گاہوں کی حفاظت کریں یعنی کان کو بھی ان کی نرم باتوں اور ان کی خوبصورتی کے قصوں سے بچاویں کہ یہ سب طریق ٹھوکر کھانے کے ہیں۔ (نور القرآن نمبر ۲ صفحہ ۲۵، ۲۶)

جو شخص آزادی سے نامحرم عورتوں کو دیکھتا رہے گا آخر ایک دن بدنیتی سے بھی دیکھے گا کیونکہ نفس کے جذبات ہر یک طبیعت کے ساتھ لگے ہوئے ہیں اور تجربہ بلند آواز سے بلکہ چیخیں مار کر ہمیں بتلا رہا ہے کہ بیگانہ عورتوں کو دیکھنے میں ہرگز انجام بخیر نہیں ہوتا۔ یورپ جو زناکاری سے بھر گیا اس کا کیا سبب ہے یہی تو ہے کہ نامحرم عورتوں کو بے تکلف دیکھنا عادت ہوگیا۔ اوّل تو نظر کی بدکاریاں ہوئیں اور پھر معانقہ بھی ایک معمولی امر ہوگیا پھر اس سے ترقی ہو کر بوسہ لینے کی بھی عادت پڑی یہاں تک کہ استاد جوان لڑکیوں کو اپنے گھروں میں لے جا کر یورپ میں بوسہ بازی کرتے ہیں اور کوئی منع نہیں کرتا۔ تھیٹروں پر فسق و فجور کی باتیں لکھی جاتی ہیں۔ تصویروں میں نہایت درجہ کی بدکاری کا نقشہ دکھایا جاتا ہے۔ عورتیں خود چھپواتی ہیں کہ مَیں ایسی خوبصورت ہوں اور میری ناک ایسی اور آنکھ ایسی ہے اور ان کے عاشقوں کے ناول لکھے جاتے ہیں اور بدکاری کا ایسا دریا بہہ رہا ہے کہ نہ تو کانوں کو بچا سکتے ہیں نہ آنکھوں کو نہ ہاتھوں کو نہ مُنہ کو۔ یہ

یسوع صاحب کی تعلیم ہے۔ (نور القرآن نمبر ۲ صفحہ ۴۱، ۴۲)

ایمان داروں کو جو مرد ہیں کہہ دے کہ آنکھوں کو نامحرم عورتوں کے دیکھنے سے بچائے رکھیں اور ایسی عورتوں کو کھلے طور سے نہ دیکھیں جو شہوت کا محل ہو سکتی ہیں اور ایسے موقعوں پر خوابیدہ نگاہ کی عادت پکڑیں اور اپنے ستر کی جگہ کو جس طرح ممکن ہو بچاویں۔ ایسا ہی کانوں کو نامحرموں سے بچاویں یعنی بیگانہ عورتوں کے گانے بجانے اور خوش الحانی کی آوازیں نہ سنیں، ان کے حسن کے قصے نہ سنیں۔ یہ طریق پاک نظر اور پاک دل رہنے کے لئے عمدہ طریق ہے۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۰۰)

مومنوں کو کہہ دے کہ نامحرم اور محل شہوت کے دیکھنے سے اپنی آنکھیں اس قدر بند رکھیں کہ پوری صفائی سے چہرہ نظر نہ آسکے اور نہ چہرہ پر کشادہ اور بے روک نظر پڑ سکے اور اس بات کے پابند رہیں کہ ہرگز آنکھ کو پورے طور پر کھول کر نہ دیکھیں نہ شہوت کی نظر سے اور نہ بغیر شہوت سے کیونکہ ایسا کرنا آخر ٹھوکر کا باعث ہے یعنی بے قیدی کی نظر سے نہایت پاک حالت محفوظ نہیں رہ سکتی اور آخر ابتلاء پیش آتا ہے اور دل پاک نہیں ہو سکتا جب تک آنکھ پاک نہ ہو۔ اور وہ مقام ازکٰی جس پر طالبِ حق کے لئے قدم مارنا مناسب ہے حاصل نہیں ہو سکتا اور اِس آیت میں یہ بھی تعلیم ہے کہ بدن کے ان تمام سوراخوں کو محفوظ رکھیں جن کی راہ سے بدی داخل ہو سکتی ہے۔ سوراخ کے لفظ میں جو آیت ممدوح میں مذکور ہے آلاتِ شہوت اور کان اور ناک اور منہ سب داخل ہیں۔ اب دیکھو کہ یہ تمام تعلیم کس شان اور پایہ کی ہے جو کسی پہلو پر نامعقول طور پر افراط یا تفریط سے زور نہیں ڈالا گیا اور حکیمانہ اعتدال سے کام لیا گیا ہے اور اِس آیت کا پڑھنے والا فی الفور معلوم کرلے گا کہ اس حکم سے جو کھلے کھلے نظر ڈالنے کی عادت نہ ڈالو یہ مطلب ہے کہ تا لوگ کسی وقت فتنہ میں مبتلا نہ ہو جائیں اور دونوں طرف مرد اور عورت میں سے کوئی فریق ٹھوکر نہ کھاوے لیکن انجیل میں جو بیقیدی اور کھلی آزادی دی گئی اور صرف اِنسان کی مخفی نیت پر مدار رکھا گیا ہے اس تعلیم کا نقص اور خامی ایسا امر نہیں ہے کہ اس کی تصریح کی کچھ ضرورت ہو۔

(تریاق القلوب صفحہ ۲۰)

مومنوں کو کہہ دے مرد ہوں یا عورتیں ہوں کہ اپنی آنکھوں کو غیر عورتوں اور مردوں کی طرف دیکھنے سے روکو اور کانوں کو غیر مردوں کی ناجائز آواز اور غیر کی آواز سننے سے روکو اور اپنے ستر گاہوں کی حفاظت کرو کہ اس طریق سے تم پاک ہو جاؤ گے۔

اب اے آریہ صاحبان انصاف سے سوچو کہ قرآن شریف تو اِس بات سے بھی منع کرتا ہے کہ کوئی مرد غیر عورت پر نظر ڈالے اور یا عورت غیر مرد پر نظر ڈالے یا اس کی آواز ناجائز طور پر سنے مگر آپ لوگ

خوشی سے اپنی بیویوں کو غیر مردوں سے ہم بستر کراتے ہیں اس کا نام نیوگ رکھتے ہیں۔ کس قدر ان دونوں تعلیموں میں فرق ہے۔ خود سوچ لیں۔ (نسیمِ دعوت صـ۸۲)

قرآن نے چونکہ کُل ملل اور فرقوں کو زیر نظر رکھ لیا تھا اور تمام ضرورتیں اُس تک پہنچ کر ختم ہوگئی تھیں اِس لئے قرآن نے عقائد کو بھی اور احکامِ عملی کو بھی مدلّل کیا چنانچہ قرآن فرماتا ہے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ یعنی مومنوں سے کہہ دے کہ کسی کے ستر کو آنکھ پھاڑ کر نہ دیکھیں اور باقی تمام فروج کی بھی حفاظت کریں۔ لازم ہے کہ انسان چشم خوابیدہ ہو تا کہ غیر محرم عورت کو دیکھ کر فتنہ میں نہ پڑے۔ کان بھی فروج میں داخل ہیں جو قصص سُنکر فتنہ میں پڑ جاتے ہیں اس لئے عام طور پر فرمایا کہ تمام موریوں کو محفوظ رکھو اور کہا کہ بالکل بند رکھو ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ یہ تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہے اور یہ طریق اعلیٰ درجہ کی پاکیزگی رکھتا ہے جس کے ہوتے ہوئے بدکاروں میں نہ ہوگے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صـ۸۵)

مسیح کا یہ کہنا کہ زنا کی نظر سے نہ دیکھ کوئی کامل تعلیم نہیں ہے۔ اس کے مقابلہ میں کامل تعلیم یہ ہے جو مبادئ گناہ سے بچاتی ہے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ یعنی کسی نظر سے بھی نہ دیکھیں کیونکہ دل اپنے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ کیسی کامل تعلیم ہے۔

(الحکم جلد ۴ نمبر ۴۴ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۰ء صـ۴)

مومن کو نہیں چاہیئے کہ دریدہ دہن بنے یا بے محابا اپنی آنکھ کو ہر طرف اُٹھائے پھرے۔ بلکہ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ پر عمل کر کے نظر کو نیچی رکھنا چاہیئے اور بدنظری کے اسباب سے بچنا چاہیئے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۱ مورخہ ۲۴ اگست ۱۹۰۱ء صـ۱۲، ۲)

یورپ کی طرح بے پردگی پر بھی یہ لوگ زور دے رہے ہیں لیکن یہ ہرگز مناسب نہیں۔ یہی عورتوں کی آزادی فسق و فجور کی جڑ ہے۔ جن ممالک نے اس قسم کی آزادی کو روا رکھا ہے ذرا ان کی اخلاقی حالت کا اندازہ کرو۔ اگر اس آزادی اور بے پردگی سے اُن کی عفت اور پاک دامنی بڑھ گئی ہے تو ہم مان لیں گے کہ ہم غلطی پر ہیں لیکن یہ بات بہت ہی صاف ہے کہ جب مرد اور عورت جوان ہوں اور آزادی اور بے پردگی بھی ہو تو ان کے تعلقات کس قدر خطرناک ہوں گے۔ بدنظر ڈالنی اور نفس کے جذبات سے اکثر مغلوب ہو جانا انسان کا خاصہ ہے۔ پھر جس حالت میں کہ پردہ میں بے اعتدالیاں ہوتی ہیں اور فسق و فجور کے مرتکب ہو جاتے ہیں تو آزادی میں کیا کچھ نہ ہوگا۔ مردوں کی حالت کا اندازہ کرو کہ وہ کس طرح بے لگام گھوڑے کی طرح ہو گئے ہیں۔ نہ خدا کا خوف رہا ہے نہ آخرت کا یقین ہے۔ دُنیاوی لذات کو اپنا

معبود بنا رکھا ہے۔ پس سب سے اوّل ضروری ہے کہ اس آزادی اور بے پردگی سے پہلے مردوں کی اخلاقی حالت درست کرو اگر یہ درست ہو جاوے اور مردوں میں کم ازکم اس قدر قوت ہو کہ وہ اپنے نفسانی جذبات سے مغلوب نہ ہو سکیں تو اس وقت اس بحث کو چھیڑو کہ آیا پردہ ضروری ہے کہ نہیں ورنہ موجودہ حالت میں اِس بات پر زور دینا کہ آزادی اور بے پردگی ہو گویا بکریوں کو شیروں کے آگے رکھ دینا ہے ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ کسی بات کے نتیجہ پر غور نہیں کرتے۔ کم ازکم اپنے کانشنس سے ہی کام لیں کہ آیا مردوں کی حالت ایسی اِصلاح شدہ ہے کہ عورتوں کو بے پردہ ان کے سامنے رکھا جاوے۔ قرآن شریف نے (جو کہ انسان کی فطرت کے تقاضوں اور کمزوریوں کو مدّنظر رکھ کر حسبِ حال تعلیم دیتا ہے) کیا عمدہ مسلک اختیار کیا ہے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ کہ تو ایمان والوں کو کہہ دے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں اور اپنے سوراخوں کی حفاظت کریں۔ یہ وہ عمل ہے جس سے اُن کے نفوس کا تزکیہ ہو گا۔ فروج سے مراد شرمگاہ ہی نہیں بلکہ ہر ایک سوراخ جس میں کان وغیرہ بھی شامل ہیں اور اس میں اس امر کی مخالفت کی گئی ہے کہ غیر محرم عورت کا راگ وغیرہ سُنا جاوے۔

پھر یاد رکھو کہ ہزار در ہزار تجارب سے یہ بات ثابت شدہ ہے کہ جن باتوں سے اللہ تعالیٰ روکتا ہے آخر کار انسان کو اُن سے رُکنا ہی پڑتا ہے (تعدد ازدواج اور طلاق کے مسئلہ پر غور کرو)

ہر چہ دانا کند کند ناداں ٭ لیک بعد از خرابیٔ بسیار

ہمیں افسوس ہے کہ آریہ صاحبان بھی بے پردگی پر زور دیتے ہیں اور قرآن شریف کے احکام کی مخالفت چاہتے ہیں حالانکہ اسلام کا یہ بڑا احسان ہندوؤں پر ہے کہ اُس نے اُن کو تہذیب سکھلائی اور اس کی تعلیم ایسی ہے جس سے مفاسد کا دروازہ بند ہو جاتا ہے مثل مشہور ہے ؎

خر بستہ بہ گرچہ دزد آشنا است

یہی حالت مرد اور عورت کے تعلقات کی ہے کہ اگرچہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن تاہم فطری جوش اور تقاضے بعض اس قسم کے ہوتے ہیں کہ جب ان کو ذرا سی تحریک ہوئی تو جھٹ حدِ اعتدال سے اِدھر اُدھر ہو گئے اِس لئے ضروری ہے کہ مرد اور عورت کے تعلقات میں حد درجہ کی آزادی وغیرہ کو ہرگز نہ دخل دیا جاوے ذرا اپنے دِلوں میں غور کرو کہ کیا تمہارے دل راجہ رامچندر اور کرشن وغیرہ کی طرح پاک ہو گئے ہیں؟ پھر جب وہ پاک دلی تم کو نصیب نہیں ہوئی تو بے پردگی کو رواج دے کر بکریوں کو شیروں کے آگے کیوں رکھتے ہو۔ ہٹ اور ضد اور تعصب اور چڑ وغیرہ سے تم لوگ دیدہ و دانستہ اِسلام کے اُن پاکیزہ اصولوں

کی مخالفت کیوں کرتے ہو جن سے تمہاری عفت برقرار رہتی ہے عقل تو اِس بات کا نام ہے کہ انسان کو نیک بات جہاں سے ملے وہ لے لیوے کیونکہ نیک بات کی مثال سونے اور ہیرے اور جواہر کی ہے اور یہ اشیاء خواہ کہیں ہوں آخر وہ سونا وغیرہ ہی ہوں گی اِس لئے تم کو لازم ہے کہ اسلام کے نام سے چڑ کر تم نیکی کو ترک نہ کرو ورنہ یاد رکھو کہ اِسلام کا تو کچھ حرج نہیں اگر اس کا ضرر ہے تو تم ہی کو ہے ہاں اگر تم لوگوں کو یہ اطمینان ہے کہ سب کے سب بھگت بن گئے ہو اور نفسانی جذبات پر تم کو پوری قدرت حاصل ہے اور قویٰ پرمیشر کی رضا اور احکام کے برخلاف بالکل حرکت نہیں کرتے تو پھر ہم تم کو منع نہیں کرتے بے شک بے پردگی کو رواج دو لیکن جہاں تک میرا خیال ہے ابھی تک تم کو وہ حالت نصیب نہیں اور تم میں سے جس قدر لوگ لیڈر بن کر قوم کی اصلاح کے درپے ہیں اُن کی مثال سفید قبر کی ہے جس کے اندر بجز ہڈیوں کے اَور کچھ نہیں کیونکہ ان کی صرف باتیں ہی ہیں عمل وغیرہ کچھ نہیں۔

اِسلام نے جو یہ حکم دیا ہے کہ مرد عورت سے اور عورت مرد سے پردہ کرے اس سے غرض یہ ہے کہ نفسِ انسانی پھسلنے اور ٹھوکر کھانے کی حد سے بچا رہے کیونکہ ابتداء میں اس کی یہی حالت ہوتی ہے کہ وہ بدیوں کی طرف جھکا پڑتا ہے اور ذرا سی بھی تحریک ہو تو بدی پر ایسے گرتا ہے جیسے کئی دنوں کا بھوکا آدمی کسی لذیذ کھانے پر۔ یہ انسان کا فرض ہے کہ اس کی اِصلاح کرے ...... یہ ہے سِرّ اسلامی پردہ کا۔ اور مَیں نے خصوصیت سے اسے ان مسلمانوں کے لئے بیان کیا ہے جن کو اسلام کے احکام اور حقیقت کی خبر نہیں۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۳۴ مورخہ ۸ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۶،۷)

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا

مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِى الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۖ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ ؕ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○

ایماندار عورتوں کو کہہ دے کہ وہ بھی اپنی آنکھوں کو نامحرم مردوں کے دیکھنے سے بچائیں اور اپنے کانوں کو بھی نامحرموں سے بچائیں یعنی ان کی پُرشہوات آوازیں نہ سُنیں اور اپنے ستر کی جگہ کو پردہ میں رکھیں اور اپنی زینت کے اعضاء کو کسی غیرمحرم پر نہ کھولیں اور اپنی اوڑھنی کو اِس طرح سر پر لیں کہ گریبان سے ہوکر سر پر آجائے یعنی گریبان اور دونوں کان اور سر اور کنپٹیاں سب چادر کے پردہ میں رہیں اور اپنے پیروں کو زمین پر ناچنے والوں کی طرح نہ ماریں۔ یہ وہ تدبیر ہے کہ جس سے پابندی ٹھوکر سے بچا سکتی ہے۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۰۰،۱۰۱)

خوابیدہ نگاہ سے غیرمحل پر نظر ڈالنے سے اپنے تئیں بچا لینا اور دوسری جائز النظر چیزوں کو دیکھنا اس طریق کو عربی میں غضِ بصر کہتے ہیں اور ہر ایک پرہیزگار جو اپنے دل کو پاک رکھنا چاہتا ہے اس کو نہیں چاہیئے کہ حیوانوں کی طرح جس طرف چاہے بے محابا نظر اُٹھا کر دیکھ لیا کرے بلکہ اس کے لئے اِس تمدّنی زندگی میں غضِ بصر کی عادت ڈالنا ضروری ہے اور یہ وہ مبارک عادت ہے جس سے اس کی یہ طبعی حالت ایک بھاری خُلق کے رنگ میں آجائے گی اور اس کی تمدّنی ضرورت میں بھی فرق نہیں پڑے گا۔ یہی وہ خُلق ہے جس کو احصان اور عفت کہتے ہیں۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب صفحہ ۱۰۲،۱۰۳)

آجکل پردہ پر حملے کئے جاتے ہیں لیکن یہ لوگ جانتے نہیں کہ اسلامی پردہ سے مراد زندان نہیں بلکہ ایک قسم کی روک ہے کہ غیرمرد اور عورت ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکے۔ جب پردہ ہوگا ٹھوکر سے بچیں گے۔ ایک منصف مزاج کہہ سکتا ہے کہ ایسے لوگوں میں جہاں غیرمرد و عورت اکٹھے بلا تامّل اور بے محابا مل سکیں۔ سیریں کریں کیونکر جذباتِ نفس سے اضطراراً ٹھوکر نہ کھائیں گے۔ بسا اوقات سُننے دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسی قومیں غیرمرد و عورت کو ایک مکان میں تنہا رہنے کو حالانکہ دروازہ بھی بند ہو کوئی عیب نہیں

سمجھتے۔ یہ گویا تہذیب ہے ان ہی بدنتائج کو روکنے کے لئے شارع اسلام نے وہ باتیں کرنے ہی کی اجازت نہ دی جو کسی کی ٹھوکر کا باعث ہوں۔ ایسے موقع میں یہ کہہ دیا کہ جہاں اس طرح دو غیر محرم مرد و عورت جمع ہوں تیسرا ان میں شیطان ہوتا ہے۔ ان ناپاک نتائج پر غور کرو جو یورپ اس خلیع الرسن تعلیم سے بھگت رہا ہے۔ بعض جگہ بالکل قابلِ شرم طوائفانہ زندگی بسر کی جارہی ہے۔ یہ انہی تعلیموں کا نتیجہ ہے۔ اگر کسی چیز کو خیانت سے بچانا چاہتے ہو تو حفاظت کرو لیکن اگر حفاظت نہ کرو اور یہ سمجھ رکھو کہ بھلے مانس لوگ ہیں تو یاد رکھو کہ ضرور وہ چیز تباہ ہوگی۔ اسلامی تعلیم کیا پاک تعلیم ہے کہ جس نے مرد و عورت کو الگ رکھ کر ٹھوکر سے بچایا اور انسان کی زندگی حرام اور تلخ نہیں کی جس سے یورپ نے آئے دن کی خانہ جنگیاں اور خودکشیاں دیکھیں۔ بعض شریف عورتوں کا طوائفانہ زندگی بسر کرنا ایک عملی نتیجہ اُس اجازت کا ہے جو غیر عورت کو دیکھنے کے لئے دی گئی۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۸)

قرآن مسلمان مردوں اور عورتوں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ غضِ بصر کریں۔ جب ایک دوسرے کو دیکھیں گے ہی نہیں تو محفوظ رہیں گے۔ یہ نہیں کہ انجیل کی طرح یہ حکم دے دیتا کہ شہوت کی نظر سے نہ دیکھ۔ افسوس کی بات ہے کہ انجیل کے مصنّف کو یہ بھی معلوم نہیں ہُوا کہ شہوت کی نظر کیا ہے؟ نظر ہی تو ایک ایسی چیز ہے جو شہوت انگیز خیالات کو پیدا کرتی ہے۔ اس تعلیم کا جو نتیجہ ہُوا ہے وہ ان لوگوں سے مخفی نہیں ہے جو اخبارات پڑھتے ہیں۔ اُن کو معلوم ہوگا کہ لندن کے پارکوں اور پیرس کے ہوٹلوں کے کیسے شرمناک نظارے بیان کئے جاتے ہیں۔

اسلامی پردہ سے یہ ہرگز مُراد نہیں ہے کہ عورت جیل خانہ کی طرح بند رکھی جاوے۔ قرآن شریف کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں ستر کریں۔ وہ غیر مرد کو نہ دیکھیں۔ جن عورتوں کو باہر جانے کی ضرورت تمدّنی امور کے لئے پڑے اُن کو گھر سے باہر نکلنا منع نہیں ہے۔ وہ بیشک جائیں لیکن نظر کا پردہ ضروری ہے۔

مساوات کے لئے عورتوں کے نیکی کرنے میں کوئی تفریق نہیں رکھی گئی اور نہ ان کو منع کیا گیا ہے کہ وہ نیکی میں مشابہت نہ کریں۔ اسلام نے یہ کب بتایا ہے کہ زنجیر ڈال کر رکھو۔ اسلام شہوات کی بناء کو کاٹتا ہے۔ یورپ کو دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ کُتّوں اور کُتیوں کی طرح زنا ہوتا ہے اور شراب کی اِس قدر کثرت ہے کہ تین میل تک شراب کی دُکانیں چلی گئی ہیں۔ یہ کس تعلیم کا نتیجہ ہے؟ کیا پردہ داری کا یا پردہ دری کا؟

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

پردہ کے متعلق بڑی افراط تفریط ہوئی ہے۔ یورپ والوں نے تفریط کی ہے اور اب ان کی تقلید سے بعض نیچری بھی اسی طرح چاہتے ہیں حالانکہ اس بے پردگی نے یورپ میں فسق وفجور کا دریا بہا دیا ہے اور اس کے بالمقابل بعض مسلمان افراط کرتے ہیں کہ کبھی عورت گھر سے باہر نکلتی ہی نہیں حالانکہ ریل پر سفر کرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ غرض ہم ان دونوں قسم کے لوگوں کو غلطی پر سمجھتے ہیں جو افراط اور تفریط کر رہے ہیں۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

شرعی پردہ یہ ہے کہ چادر کو حلقہ کے طور پر کر کے اپنے سر کے بالوں کو کچھ حصہ پیشانی اور زنخدان کے ساتھ بالکل ڈھانک لیں اور ہر ایک زینت کا مقام ڈھانک لیں۔ مثلاً منہ پر اس طرح پر چادر ہو (اس جگہ انسان کے چہرہ کی شکل دکھا کر جن مقامات پر پردہ نہیں ہے ان کو کھلا رکھ کر باقی پردہ کے نیچے دکھایا گیا ہے) اس قسم کے پردہ کو انگلستان کی عورتیں آسانی سے برداشت کر سکتی ہیں اور اس طرح پر سیر کرنے میں کچھ حرج نہیں آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۴ نمبر ۱ صفحہ ۱۷ (ماہ جنوری ۱۹۰۵ء)

۳۳۔ وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَاِمَآئِکُمْ اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ○

اگر کسی عورت کا خاوند مر جائے تو گو وہ عورت جوان ہی ہو دوسرا خاوند کرنا ایسا بُرا جانتی ہے جیسا کہ کوئی بڑا بھاری گناہ ہوتا ہے اور تمام عمر بیوہ اور رانڈ رہ کر یہ خیال کرتی ہے کہ میں نے بڑے ثواب کا کام کیا ہے اور پاک دامن بیوی ہوگئی ہوں حالانکہ اس کے لئے بیوہ رہنا سخت گناہ کی بات ہے۔ عورتوں کے لئے بیوہ ہونے کی حالت میں خاوند کر لینا نہایت ثواب کی بات ہے۔ ایسی عورت حقیقت میں بڑی نیک بخت اور ولی ہے جو بیوہ ہونے کی حالت میں بُرے خیالات سے ڈر کر کسی سے نکاح کر لے اور نابکار عورتوں کے لعن طعن سے نہ ڈرے۔ ایسی عورتیں جو خدا اور رسولؐ کے حکم سے روکتی ہیں خود لعنتی اور شیطان کی چیلیاں ہیں جن کے ذریعہ سے شیطان اپنا کام چلاتا ہے۔ جس عورت کو اللہ اور رسولؐ پیارا ہے اس کو چاہیئے کہ بیوہ ہونے کے بعد کوئی ایماندار اور نیک بخت خاوند تلاش کرے اور یاد رکھے کہ خاوند کی خدمت میں مشغول رہنا بیوہ ہونے کی حالت کے وظائف سے صدہا درجہ بہتر ہے۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد اوّل صفحہ ۴۸)

بیوہ کے نکاح کا حکم اسی طرح ہے جس طرح کہ باکرہ کے نکاح کا حکم ہے۔ چونکہ بعض قومیں بیوہ عورت کا نکاح خلافِ عزت خیال کرتے ہیں اور یہ بد رسم بہت پھیلی ہوئی ہے اِس واسطے بیوہ کے نکاح کے واسطے حکم ہؤا ہے لیکن اِس کے یہ معنے نہیں کہ ہر بیوہ کا نکاح کیا جائے نکاح تو اُسی کا ہوگا جو نکاح کے لائق ہے اور جس کے واسطے نکاح ضروری ہے۔ بعض عورتیں بوڑھی ہوکر بیوہ ہوتی ہیں بعض کے متعلق دوسرے حالات ایسے ہوتے ہیں کہ وہ نکاح کے لائق نہیں ہوتیں مثلاً کسی کو ایسا مرض لاحق ہے کہ وہ قابلِ نکاح ہی نہیں یا ایک بیوہ کافی اولاد اور تعلقات کی وجہ سے ایسی حالت میں ہے کہ اس کا دِل پسند ہی نہیں کرسکتا کہ وہ اب دوسرا خاوند کرے۔ ایسی صورتوں میں مجبوری نہیں کہ عورت کو خواہ مخواہ جکڑ کر خاوند کرایا جائے۔ ہاں اِس بد رسم کو مٹا دینا چاہیئے کہ بیوہ عورت کو ساری عمر بغیر خاوند کے جبراً رکھا جاتا ہے۔ (بدر جلد ۶ ملا مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۷ء صلا)

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ اِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْرًا ۖۗ وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ ؕ وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَمَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْۢ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

جو لوگ نکاح کی طاقت نہ رکھیں جو پرہیزگار رہنے کا اصل ذریعہ ہے تو ان کو چاہیئے کہ اَور تدبیروں سے طلب عفت کریں چنانچہ بخاری اور مسلم کی حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو نکاح کرنے پر قادر نہ ہو اس کے لئے پرہیزگار رہنے کے لئے یہ تدبیر ہے کہ وہ روزے رکھا کرے اور حدیث یہ ہے یَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ فَاِنَّهٗ اَغَضُّ

لِلْبَصَرِ وَاَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَاِنَّهٗ لَهٗ وِجَاءٌ (صحیح مسلم بخاری)
یعنی اے جوانوں کے گروہ جو کوئی تم میں سے نکاح کی قدرت رکھتا ہو تو چاہیئے کہ وہ نکاح کرے کیونکہ نکاح آنکھوں کو خوب نیچا کر دیتا ہے اور شرم کے اعضاء کو زنا وغیرہ سے بچاتا ہے ورنہ روزہ رکھو کہ وہ خصی کر دیتا ہے۔

اب اِن آیات اور حدیث اور بہت سی اُور آیات سے ثابت ہے کہ نکاح سے شہوت رانی غرض نہیں بلکہ بدخیالات اور بدنظری اور بدکاری سے اپنے تئیں بچانا اور نیز حفظِ صحت بھی غرض ہے۔

(آریہ دھرم ص۱۹)

جس کو نکاح میسّر نہ آوے چاہیئے کہ وہ اپنی عفت کو دوسرے طریقوں سے بچاوے مثلاً روزہ رکھے یا کم کھاوے یا اپنی طاقتوں سے تن آزار کام لے۔ اور لوگوں نے یہ بھی طریق نکالے ہیں کہ وہ ہمیشہ عمداً نکاح سے دستبردار رہیں یا خوجے بنیں اور کسی طریق سے رہبانیت اختیار کریں مگر ہم نے انسان پر یہ حکم فرض نہیں کئے اِسی لئے وہ ان بدعتوں کو پُورے طور پر نبھا نہ سکے۔ خدا کا یہ فرمانا کہ ہمارا یہ حکم نہیں کہ لوگ خوجے بنیں یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر خدا کا حکم ہوتا تو سب لوگ اس حکم پر عمل کرنے کے مجاز بنتے تو اس صورت بنی آدم کی قطع نسل ہو کر کبھی کا دُنیا کا خاتمہ ہو جاتا اور نیز اگر اِس طرح پر عفت حاصل کرنی ہو کہ عُضوِ مردمی کو کاٹ دیں تو یہ درپردہ اس صانع پر اعتراض ہے جس نے وہ عضو بنایا اور نیز جبکہ ثواب کا تمام مدار اِس بات میں ہے کہ ایک قوّت موجود ہو اور پھر انسان خدائے تعالیٰ کا خوف کر کے اس قوّت کے خراب جذبات کا مقابلہ کرتا رہے اور اس کے منافع سے فائدہ اُٹھا کر دو طور کا ثواب حاصل کرے۔ پس ظاہر ہے کہ ایسے عُضو کے ضائع کر دینے میں دونوں ثوابوں سے محروم رہا ثواب تو جذبہ مخالفانہ کے وجود اور پھر اس کے مقابلہ سے ملتا ہے مگر جس میں بچّہ کی طرح وہ قوّت ہی نہیں رہی اس کو کیا ثواب ملے گا۔ کیا بچّہ کو اپنی عفت کا ثواب مل سکتا ہے؟

(رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب ص۱۰۱)

۳۶۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ

مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِي اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

خدا آسمان و زمین کا نُور ہے یعنی ہر ایک نُور جو بلندی اور پستی میں نظر آتا ہے خواہ وہ اَرواح میں ہے خواہ اَجسام میں اور خواہ ذاتی ہے اور خواہ عرضی اور خواہ ظاہری ہے اور خواہ باطنی اور خواہ ذہنی ہے۔ خواہ خارجی۔ اُسی کے فیض کا عطیہ ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ربّ العالمین کا فیضِ عام ہر چیز پر محیط ہو رہا ہے اور کوئی اُس کے فیض سے خالی نہیں۔ وہی تمام فیوض کا مبدء ہے اور تمام انوار کا علّت العلل اور تمام رحمتوں کا سرچشمہ ہے۔ اُسی کی ہستی حقیقی تمام عالم کی قیّوم اور تمام زیر و زبر کی پناہ ہی وہی ہے جس نے ہر ایک چیز کو ظلمت خانۂ عدم سے باہر نکالا اور خلعتِ وجود بخشا۔ بجز اس کے کوئی ایسا وجود نہیں ہے کہ جو فی حدِّ ذاتہٖ واجب اور قدیم ہو یا اُس سے مستفیض نہ ہو بلکہ خاک اور افلاک اور انسان اور حیوان اور حجر اور شجر اور رُوح اور جسم سب اُسی کے فیضان سے وجود پذیر ہیں۔ یہ تو عام فیضان ہے جس کا بیان آیت اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ میں ظاہر فرمایا گیا۔ یہی فیضان ہے جس نے دائرہ کی طرح ہر ایک چیز پر احاطہ کر رکھا ہے جس کے فائز ہونے کے لئے کوئی قابلیت شرط نہیں لیکن بمقابلہ اس کے ایک خاص فیضان بھی ہے جو مشروط بشرائط ہے اور اُنہیں افرادِ خاصّہ پر فائز ہوتا ہے جن میں اُس کے قبول کرنے کی قابلیت و استعداد موجود ہے یعنی نفوسِ کاملہ انبیاء علیہم السّلام پر جن میں سے افضل و اعلیٰ ذاتِ جامع البرکات حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے دوسروں پر ہرگز نہیں ہوتا۔ اور چونکہ وہ فیضان ایک نہایت باریک صداقت ہے اور دقائق حکمیّہ میں سے ایک دقیق مسئلہ ہے اس لئے خداوند تعالیٰ نے اوّل فیضانِ عام کو (جو بدیہی الظہور ہے) بیان کر کے پھر اُس فیضانِ خاص کو بغرضِ اظہار کیفیت نُور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ایک مثال میں بیان فرمایا ہے کہ جو اِس آیت سے شروع ہوتی ہے مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ الخ اور بطور مثال اِس لئے بیان کیا کہ تا اِس دقیقۂ نازک کے سمجھنے میں ابہام اور دِقّت باقی نہ رہے کیونکہ معانیٔ معقولہ کو صُوَرِ محسوسہ میں بیان کرنے سے ہر ایک غبی و بلید بھی بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ بقیہ ترجمہ

آیاتِ ممدوحہ یہ ہے۔ اس نور کی مثال (فردِ کامل میں جو پیغمبر ہے) یہ ہے جیسے ایک طاق (یعنی سینۂ مشروح حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم) اور طاق میں ایک چراغ (یعنی وحی اللہ) اور چراغ ایک شیشہ کی قندیل میں جو نہایت مصفّٰی ہے (یعنی نہایت پاک اور مقدّس دِل میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دِل ہے جو کہ اپنی اصل فطرت میں شیشۂ سفید اور صافی کی طرح ہر یک طور کی کثافت اور کدورت سے منزّہ اور مطہر ہے اور تعلقاتِ ماسوی اللہ سے بکلّی پاک ہے) اور شیشہ ایسا صاف کہ گویا اُن ستاروں میں سے ایک عظیم النور ستارہ ہے جو کہ آسمان پر بڑی آب و تاب کے ساتھ چمکتے ہوئے نکلتے ہیں جن کو کوکبِ دُرّی کہتے ہیں (یعنی حضرت خاتم الانبیاءؐ کا دل ایسا صاف کہ کوکبِ دُرّی کی طرح نہایت منوّر اور درخشندہ جس کی اندرونی روشنی اُس کے بیرونی قالب پر پانی کی طرح بہتی ہوئی نظر آتی ہے) وہ چراغ زیتون کے شجرۂ مبارکہ سے (یعنی زیتون کے روغن سے) روشن کیا گیا ہے (شجرۂ مبارکہ زیتون سے مراد وجودِ مبارک محمدی ہے کہ جو بوجہ نہایت جامعیت وکمال انواع و اقسام کی برکتوں کا مجموعہ ہے جس کا فیض کسی جہت و مکان و زمان سے مخصوص نہیں بلکہ تمام لوگوں کے لئے عام علیٰ سبیل الدوام ہے اور ہمیشہ جاری ہے کبھی منقطع نہیں ہوگا) اور شجرۂ مبارکہ نہ شرقی ہے نہ غربی (یعنی طینتِ پاک محمدی میں نہ افراط ہے نہ تفریط بلکہ نہایت توسط و اعتدال پر واقع ہے اور احسنِ تقویم پر مخلوق ہے اور یہ جو فرمایا کہ اُس شجرۂ مبارکہ کے روغن سے جو چراغِ وحی روشن کیا گیا ہے۔ سو روغن سے مراد عقلِ لطیف نورانی محمدی مع جمیع اخلاقِ فاضلہ فطرتیہ ہے جو اُس عقلِ کامل کے چشمۂ صافی سے پرورده ہیں اور وحی کا چراغ لطائفِ محمدیہ سے روشن ہونا اِن معنوں کر کے ہے کہ اُن لطائفِ کاملہ پر وحی کا فیضان ہوا اور ظہورِ وحی کا موجب وہی ٹھہرے۔ اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ فیضانِ وحی اُن لطائفِ محمدیہ کے مطابق ہوا اور انہیں اِعتدالات کے مناسبِ حال ظہور میں آیا کہ جو طینتِ محمدیہ میں موجود تھی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر یک وحی نبیٔ منزّل علیہ کی فطرت کے موافق نازل ہوتی ہے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مزاج میں جلال اور غضب تھا۔ توریت بھی موسوی فطرت کے موافق ایک جلالی شریعت نازل ہوئی۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے مزاج میں حلم اور نرمی تھی سو انجیل کی تعلیم بھی حلم اور نرمی پر مشتمل ہے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاج بغایت درجہ وضع استقامت پر واقع تھا۔ نہ ہر جگہ حلم پسند تھا اور نہ ہر مقام غضب مرغوبِ خاطر تھا بلکہ حکیمانہ طور پر رعایتِ محل اور موقع کی ملحوظِ طبیعت مبارک تھی۔ سو قرآن شریف بھی اِسی طرزِ موزون و معتدل پر نازل ہوا کہ جامع شدّت و رحمت و ہیبت و شفقت و نرمی و درشتی ہے۔ سو اس جگہ اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمایا کہ چراغِ وحیٔ فرقان اِس شجرۂ مبارک سے روشن کیا گیا ہے کہ نہ شرقی ہے نہ غربی۔ یعنی

طینتِ معتدلہ محمدیہ کے موافق نازل ہوا ہے جس میں نہ مزاجِ موسوی کی طرح درشتی ہے نہ مزاجِ عیسوی کی مانند نرمی۔ بلکہ درشتی اور نرمی اور قہر اور لطف کا جامع ہے اور مظہرِ کمال اعتدال اور جامع بَینَ الجلال والجمال ہے اور اخلاقِ معتدلۂ فاضلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کہ جو بمعیّتِ عقلِ لطیف روغن ظہور روشنیٔ وحی قرار پائی اُن کی نسبت ایک دوسرے مقام میں بھی اللہ تعالیٰ نے آنحضرت کو مخاطب کرکے فرمایا ہے اور وہ یہ ہے اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ الجزو ۲۹ یعنی تو اے نبی ایک خُلقِ عظیم پر مخلوق و مفطور ہے یعنے اپنی ذات میں تمام مکارمِ اخلاق کا ایسا متمم و مکمّل ہے کہ اُس پر زیادت متصوّر نہیں کیونکہ لفظِ عظیم محاورۂ عرب میں اُس چیز کی صفت میں بولا جاتا ہے جس کو اپنا نوعی کمال پُورا پُورا حاصل ہو۔ مثلاً جب کہیں کہ یہ درخت عظیم ہے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ جس قدر طُول و عرض درخت میں ہو سکتا ہے وہ سب اس میں موجود ہے اور بعضوں نے کہا ہے کہ عظیم وہ چیز ہے جس کی عظمت اس حد تک پہنچ جائے کہ حیطۂ ادراک سے باہر ہو اور خُلق کے لفظ سے قرآن شریف اور ایسا ہی دوسری کتب حکمیہ میں صرف تازہ روی اور حُسنِ اختلاط یا نرمی و تلطّف و ملائمت (جیسا عوام النّاس خیال کرتے ہیں) مراد نہیں ہے۔ بلکہ خَلق بفتح خا اور خُلق بضم خا دو لفظ ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل واقع ہیں۔ خَلق بفتح خا سے مراد وہ صورتِ ظاہری ہے جو انسان کو حضرتِ واہب الصُّوَر کی طرف سے عطا ہوئی جس صورت کے ساتھ وہ دوسرے حیوانات کی صورتوں سے ممیّز ہے اور خُلق بضم خا سے مراد وہ صورتِ باطنی یعنی خواصِ اندرونی ہیں جن کی رُو سے حقیقتِ انسانیہ حقیقتِ حیوانیہ سے امتیازِ کُلّی رکھتی ہے۔ پس جس قدر انسان میں من حیث الانسانیت اندرونی خواص پائے جاتے ہیں اور شجرۂ انسانیّت کو نچوڑ کر نکل سکتے ہیں جو کہ انسان اور حیوان میں من حیث الباطن مابہ الامتیاز ہیں اُن سب کا نام خُلق ہے اور چونکہ شجرۂ فطرتِ انسانی اصل میں توسّط اور اعتدال پر واقع ہے اور ہر ایک افراط و تفریط سے جو قُویٰ حیوانیہ میں پایا جاتا ہے منزّہ ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ الجزو ۳۰ اِس لئے خُلق کے لفظ سے جو کسی مذمت کی قید کے بغیر بولا جائے ہمیشہ اخلاقِ فاضلہ مراد ہوتے ہیں اور وہ اخلاقِ فاضلہ جو حقیقتِ انسانیہ ہے تمام وہ خواصِ اندرونی ہیں جو نفسِ ناطقہ انسان میں پائے جاتے ہیں جیسے عقلِ ذکا۔ سُرعتِ فہم۔ صفائی ذہن۔ حُسنِ تحفظ۔ حُسنِ تذکّر۔ عفّت۔ حیا۔ صبر۔ قناعت۔ زہد۔ تورّع۔ جوانمردی۔ استقلال۔ عدل۔ امانت۔ صدقِ لہجہ۔ سخاوت فی محلّہ۔ ایثار فی محلّہ۔ کرم فی محلّہ۔ مروّت فی محلّہ۔ شجاعت فی محلّہ۔ علوِّ ہمّت فی محلّہ۔ حِلم فی محلّہ۔ تحمّل فی محلّہ۔ حمیّت فی محلّہ۔ تواضع فی محلّہ۔ ادب فی محلّہ۔ شفقت فی محلّہ۔ رأفت فی محلّہ۔ رحمت فی محلّہ۔ خوفِ الٰہی۔ محبّتِ الٰہیہ۔ اُنس باللہ۔ انقطاع اِلی اللہ وغیرہ وغیرہ) اور تبتّل

ایسا صاف اور لطیف کہ بن آگ ہی روشن ہونے پر آمادہ (یعنی عقل اور جمیع اخلاقِ فاضلہ اُس نبی معصوم کے ایسے کمال موزونیّت و لطافت و نورانیّت پر واقع کہ الہام سے پہلے ہی خود بخود روشن ہونے پر مستعد تھے) نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ۔ نور فائض ہؤا نور پر (یعنی جب کہ وجودِ مبارک حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم میں کئی نور جمع تھے سو اُن نوروں پر ایک اَور نورِ آسمانی جو وحیِ الٰہی ہے وارد ہوگیا اور اُس نور کے وارد ہونے سے وجودِ باجود خاتم الانبیاء کا مجمع الانوار بن گیا۔ پس اس میں یہ اشارہ فرمایا کہ نورِ وحی کے نازل ہونے کا یہی فلسفہ ہے کہ وہ نور پر ہی وارد ہوتا ہے تاریکی پر وارد نہیں ہوتا کیونکہ فیضان کیلئے مناسبت شرط ہے اور تاریکی کو نور سے کچھ مناسبت نہیں بلکہ نور کو نور سے مناسبت ہے اور حکیم مطلق بغیر رعایتِ مناسبت کوئی کام نہیں کرتا۔ ایسا ہی فیضانِ نور میں بھی اُس کا یہی قانون ہے کہ جس کے پاس کچھ نور ہے اُس کو اَور نور بھی دیا جاتا ہے اور جس کے پاس کچھ نہیں اس کو کچھ نہیں دیا جاتا۔ جو شخص آنکھوں کا نور رکھتا ہے وہی آفتاب کا نور پاتا ہے اور جس کے پاس آنکھوں کا نور نہیں وہ آفتاب کے نور سے بھی بے بہرہ رہتا ہے اور جس کو فطرتی نور کم ملا ہے اُس کو دوسرا نور بھی کم ہی ملتا ہے اور جس کو فطرتی نور زیادہ ملا ہے اسکو دوسرا نور بھی زیادہ ہی ملتا ہے اور انبیاء منجملہ سلسلہ متفاوتہ فطرتِ انسانی کے وہ افرادِ عالیہ ہیں جن کو اس کثرت اور کمال سے نورِ باطنی عطا ہؤا ہے کہ گویا وہ نورِ مجسّم ہوگئے ہیں۔ اِسی جہت سے قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نور اور سراجِ منیر رکھا ہے جیسا فرمایا ہے قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ الجزو ۶ وَدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا الجزو ۲۲ یہی حکمت ہے کہ نورِ وحی جس کے لئے نورِ فطرتی کا کامل اور عظیم الشان ہونا شرط ہے صرف انبیاء کو ملا اور انہیں سے مخصوص ہؤا۔ پس اِس حجتِ موجّہ سے کہ جو مثال متقدم الذکر میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی بطلان اُن لوگوں کے قول کا ظاہر ہے جنہوں نے باوصف اس کے کہ فطرتی تفاوتِ مراتب کے قائل ہیں پھر محض حمق وجہالت کی راہ سے یہ خیال کر لیا ہے کہ جو نور افرادِ کامل الفطرت کو ملتا ہے وہی نور افرادِ ناقصہ کو بھی مل سکتا ہے۔ انکو دیانت اور انصاف سے سوچنا چاہیئے کہ فیضانِ وحی کے بارے میں کس قدر غلطی میں وہ مبتلا ہو رہے ہیں صریح دیکھتے ہیں کہ خدا کا قانونِ قدرت اُن کے خیالِ باطل کی تصدیق نہیں کرتا۔ پھر شدّتِ تعصب و عناد سے اُسی خیالِ فاسد پر جمے بیٹھے ہیں۔ ایسا ہی عیسائی لوگ بھی نور کے فیضان کے لئے فطرتی نور کا شرط ہونا نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ جس دِل پر نورِ وحی نازل ہو اُس کے لئے اپنے کسی خاصّہ اندرونی میں نورانیّت کی حالت ضروری نہیں بلکہ اگر کوئی بجائے عقلِ سلیم کے کمال درجے کا نادان اور سفیہ ہو اور بجائے صفتِ شجاعت کے کمال درجے کا بُزدل۔ اور بجائے صفتِ سخاوت کے کمال درجے کا بخیل۔ بجائے صفتِ حمیت کے

کمال درجے کا بے غیرت اور بجائے صفتِ محبت الٰہیہ کے کمال درجے کا محبِ دُنیا اور بجائے صفتِ زہد و ورع و امانت کے بڑا بھارا چور اور ڈاکو اور بجائے صفتِ عفت و حیا کے کمال درجے کا بے شرم اور شہوت پرست۔ اور بجائے صفتِ قناعت کے کمال درجے کا حریص اور لالچی تو ایسا شخص بھی بقول حضرات عیسائیاں باوصف ایسی حالتِ خراب کے خدا کا نبی اور مقرب ہو سکتا ہے بلکہ ایک مسیح کو باہر نکال کر دوسرے تمام انبیاء جن کی نبوت کو بھی وہ مانتے ہیں اور اُن کی الہامی کتابوں کو بھی مقدس مقدس کر کے پکارتے ہیں وہ نعوذ باللہ بقول اُن کے ایسے ہی تھے اور کمالاتِ قدسیہ سے جو مستلزم عصمت و پاک دلی ہیں محروم تھے عیسائیوں کی عقل اور خداشناسی پر بھی ہزار آفرین۔ کیا اچھا نورِ وحی کے نازل ہونے کا فلسفہ بیان کیا مگر ایسے فلسفے کے تابع ہونے والے اور اس کو پسند کرنے والے وہی لوگ ہیں جو سخت ظلمت اور کور باطنی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں ورنہ نور کے فیض کے لئے نور کا ضروری ہونا ایسی بدیہی صداقت ہے کہ کوئی ضعیف العقل بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا مگر ان کا کیا علاج جن کو عقل سے کچھ بھی سروکار نہیں اور جو کہ روشنی سے بُغض اور اندھیرے سے پیار کرتے ہیں اور چمگادڑ کی طرح رات میں اُن کی آنکھیں خوب کھلتی ہیں لیکن روزِ روشن میں وہ اندھے ہو جاتے ہیں) خدا اپنے نور کی طرف (یعنی قرآن شریف کی طرف) جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے اور وہ ہر ایک چیز کو بخوبی جانتا ہے (یعنی ہدایت ایک امر منجانب اللہ ہے۔ اُسی کو ہوتی ہے جس کو عنایتِ ازلی سے توفیق حاصل ہو دوسرے کو نہیں ہوتی۔ اور خدا مسائلِ دقیقہ کو مثالوں کے پیرایہ میں بیان فرماتا ہے تا حقائقِ عمیقہ قریب بہ افہام ہو جائیں مگر وہ اپنے علمِ قدیم سے خوب جانتا ہے کہ کون ان مثالوں کو سمجھے گا اور حق کو اختیار کرے گا اور کون محروم و مخذول رہے گا) پس اس مثال میں جس کا یہاں تک جلی قلم سے ترجمہ کیا گیا خدا تعالیٰ نے پیغمبرِ اسلام کے دل کو شیشۂ مصفّٰی سے تشبیہ دی جس میں کسی نوع کی کدورت نہیں۔ یہ نورِ قلب ہے۔ پھر آنحضرتؐ کے فہم و ادراک و عقلِ سلیم اور جمیع اخلاقِ فاضلہ جبلّی و فطرتی کو ایک لطیف تیل سے تشبیہ دی جس میں بہت سی چمک ہے اور جو ذریعہ روشنی چراغ ہے۔ یہ نورِ عقل ہے کیونکہ منبع و منشا جمیع لطائفِ اندرونی کا قوتِ عقلیہ ہے۔ پھر ان تمام نوروں پر ایک نورِ آسمانی کا جو وحی ہے نازل ہونا بیان فرمایا یہ نورِ وحی ہے اور انوارِ ثلاثہ مل کر لوگوں کی ہدایت کا موجب ٹھہرے۔ یہی حقانی اصول ہے جو وحی کے بارے میں قدوسِ قدیم کی طرف سے قانونِ قدیم ہے اور اس کی ذاتِ پاک کے مناسب۔ پس اس تمام تحقیقات سے ثابت ہے کہ جب تک نورِ قلب و نورِ عقل کسی انسان میں کامل درجے پر نہ پائے جائیں تب تک وہ نورِ وحی ہرگز نہیں پاتا۔ اور پہلے اس سے یہ ثابت ہو چکا

ہے کہ کمالِ عقل اور کمالِ نورانیتِ قلب صرف بعض افرادِ بشریہ میں ہوتا ہے کُل میں نہیں ہوتا۔ اب اِن دونو ثبوتوں کے ملانے سے یہ امر بہ پایۂ ثبوت پہنچ گیا کہ وحی اور رسالت فقط بعض افرادِ کاملہ کو ملتی ہے نہ ہر ایک فردِ بشر کو۔ (براہین احمدیہ ص ۱۷۷-۱۸۲ حاشیہ)

یَکَادُ زَیْتُہَا یُضِیْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْہُ نَارٌ عنقریب ہے کہ اس کا تیل خود بخود روشن ہو جائے اگرچہ آگ اُس کو چھوبھی نہ جائے۔ (براہین احمدیہ ص ۴۹۸ حاشیہ در حاشیہ)

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی خدا آسمان اور زمین کا نور ہے۔ اسی سے طبقۂ سفلی اور علوی میں حیات اور بقاء کی روشنی ہے۔ (پُرانی تحریریں ص ۱۹)

اُس کا نورِ قدرت ساری زمین و آسمان اور ذرّہ ذرّہ کے اندر چمک رہا ہے۔ (شحنۂ حق ص ۵۴)

باوا صاحب (نانک[1]۔ ناقل) کے گرنتھ پر غور کرنے والوں پر یہ بات پوشیدہ نہیں کہ ویدوں کے ان اصولوں سے باوا صاحب نے صاف انکار کر دیا ہے جن کو سچائی کے مطابق نہیں پایا۔ مثلاً ویدوں کے رُو سے تمام اَرواح اور ذرّات غیر مخلوق اور انادی ہیں لیکن باوا صاحب کے نزدیک تمام ذرّات اور اَرواح مخلوق ہیں جیسا کہ وہ فرماتے ہیں

اوّل اللہ نور اُپایا قدرت کے سب بندے ۔ اک نور سے سب جگ اُپجا کون بھلے کون مندے

یعنی خدا تعالیٰ نے ایک نور پیدا کر کے اس نور سے تمام کائنات کو پیدا کیا۔ پس پیدائش کی رُو سے تمام اَرواح نُوری ہیں یعنی نیک و بد کا اعمال سے فرق پیدا ہوتا ہے ورنہ باعتبارِ خلقت ظلمتِ محض کوئی بھی پیدا نہیں کیا گیا۔ ہر یک میں نور کا ذرّہ مخفی ہے اس میں باوا صاحب نے اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے اِقتباس کیا ہے اِسی لئے اللہ اور نور کا لفظ شعر میں قائم رہنے دیا تا اقتباس پر دلالت کرے اور نیز حدیث اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰہُ نُوْرِیْ کی طرف بھی اس شعر میں اشارہ کیا ہے۔ (ست بچن ص ۱۴)

خدا ہی ہے جو ہر دم آسمان کا نور اور زمین کا نور ہے۔ اس سے ہر ایک جگہ روشنی پڑتی ہے۔ آفتاب کا وہی آفتاب ہے۔ زمین کے تمام جانداروں کی وہی جان ہے۔ سچا زندہ خدا وہی ہے۔ مبارک وہ جو اُس کو قبول کرے۔ (رپورٹ جلسہ اعظم مذاہب ص ۲۰۴، ۲۰۵)

اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کا نور ہے۔ ہر ایک نور اُسی کے نور کا پرتَو ہے۔ (ایام الصلح ص ۱۹)

---

[1] (باوا نانک صاحب)

فَلَمَّا ثَبَتَ اَنَّ رَبَّنَا هُوَ نُوْرُ كُلِّ شَيْءٍ مِّنَ الْاَشْيَاءِ وَمُنِيْرُ مَا فِي الْاَرْضِ وَالسَّمَاءِ ثَبَتَ اَنَّهُ الْمُفِيْضُ مِنْ جَمِيْعِ اَنْحَاءٍ۔ وَخَالِقُ الرَّقِيْعِ وَالْغَبْرَاءِ وَهُوَ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ وَاَنَّهُ اَعْطَى الْعَيْنَيْنِ وَخَلَقَ اللِّسَانَ وَالشَّفَتَيْنِ وَهَدَى الرَّضِيْعَ اِلَى النَّجْدَيْنِ وَمَا غَادَرَ مِنْ كَمَالٍ مَطْلُوْبٍ اِلَّا اَعْطَاهَا بِاَحْسَنِ اُسْلُوْبٍ۔

(منن الرحمٰن صفحہ ۵۴، ۵۵)

خدا اصل نور ہے۔ ہر ایک نور زمین و آسمان کا اسی سے نکلا ہے۔ پس خدا کا نام استعارۃً پتا رکھنا اور ہر ایک نور کی جڑ اس کو قرار دینا اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسانی رُوح کا خدا سے کوئی بھاری علاقہ ہے۔ (نسیم دعوت صفحہ ۲۲، ۲۳)

خدا وہ ہے جو زمین اور آسمان میں اُسی کے چہرہ کی چمک ہے اور اُس کے بغیر سب تاریکی ہے۔
(چشمۂ معرفت صفحہ ۸۹)

خدا ہر ایک چیز کا نور ہے اُسی کی چمک ہر ایک چیز میں ہے خواہ وہ چیز آسمان میں ہے اور خواہ وہ زمین میں۔ (چشمۂ معرفت صفحہ ۱۱۱)

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۙ

وہ ایسے مرد ہیں کہ ان کو یادِ الٰہی سے نہ تجارت روک سکتی ہے اور نہ بیع مانع ہوتی ہے یعنی محبت

(ترجمہ) جبکہ ثابت ہوا کہ ہمارا خدا ہر ایک چیز کا نور اور زمین اور آسمان کا روشن کرنے والا ہے تو ثابت ہوگیا کہ وہی ہر یک طرح سے مبدءِ جمیع فیوض ہے اور وہی زمین اور آسمان کا خالق اور احسن الخالقین ہے۔ اس نے دو آنکھیں دیں اور زبان اور ہونٹ دئے اور بچہ کو پستانوں کی طرف ہدایت دی اور کوئی ایسا کمالِ انسانی اُٹھا نہ رکھا جس کی طرف انسان کو حاجت ہے اور ہر یک مطلوب احسن طور سے ادا کیا۔
(منن الرحمٰن صفحہ ۵۴، ۵۵)

اللہ میں ایسا کمالِ تام رکھتے ہیں کہ دنیوی مشغولیاں گو کیسی ہی کثرت سے پیش آویں اُن کے حال میں خلل انداز نہیں ہو سکتیں۔
(براہین احمدیہ ص۱۵ حاشیہ در حاشیہ)

یہ ایک ہی آیت صحابہؓ کے حق میں کافی ہے کہ انہوں نے بڑی بڑی تبدیلیاں کی تھیں اور انگریز بھی اس کے معترف ہیں کہ اُن کی کہیں نظیر ملنا مشکل ہے۔ بادیہ نشین لوگ اور اتنی بہادری اور جرأت۔ تعجب آتا ہے۔
(الحکم جلد ۷ ص۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء ص۶)

یاد رکھو کہ کامل بندے اللہ تعالیٰ کے وہی ہوتے ہیں جن کی نسبت فرمایا ہے لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ۔ جب دل خدا کے ساتھ سچا تعلق اور عشق پیدا کر لیتا ہے تو وہ اس سے الگ ہوتا ہی نہیں۔ اس کی ایک کیفیت اس طریق پر سمجھ میں آسکتی ہے کہ جیسے کسی کا بچہ بیمار ہو تو خواہ وہ کہیں جاوے کسی کام میں مصروف ہو مگر اس کا دل اور دھیان اسی بچہ میں رہے گا۔ اسی طرح جو لوگ خدا کے ساتھ سچا تعلق اور محبت پیدا کرتے ہیں وہ کسی حال میں بھی خدا کو فراموش نہیں کرتے۔
(الحکم جلد ۸ ص۲۱ مورخہ ۲۴ جون ۱۹۰۴ء ص۱)

دین اور دُنیا ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے سوائے اس حالت کے جب خدا چاہے تو کسی شخص کی فطرت کو ایسا سعید بنائے کہ وہ دُنیا کے کاروبار میں پڑ کر بھی اپنے دین کو مقدم رکھے اور ایسے شخص بھی دُنیا میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص کا ذکر تذکرۃ الاولیاء میں ہے کہ ایک شخص ہزار ہا روپیہ کے لین دین کرنے میں مصروف تھا ایک ولی اللہ نے اس کو دیکھا اور کشفی نگاہ اس پر ڈالی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کا دل باوجود اس قدر لین دین ..... روپیہ کے خدا تعالیٰ سے ایک دم غافل نہ تھا۔ ایسے ہی آدمیوں کے متعلق خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ کوئی تجارت اور خرید و فروخت ان کو غافل نہیں کرتی اور انسان کا کمال بھی یہی ہے کہ دُنیوی کاروبار میں بھی مصروفیت رکھے اور پھر خدا کو بھی نہ بھولے۔ وہ ٹٹو کس کام کا ہے جو بروقت بوجھ لادنے کے بیٹھ جاتا ہے اور جب خالی ہو تو خوب چلتا ہے وہ قابلِ تعریف نہیں۔ وہ فقیر جو دُنیوی کاموں سے گھبرا کر گوشہ نشین بن جاتا ہے وہ ایک کمزوری دکھلاتا ہے۔ اسلام میں رہبانیت نہیں۔ ہم کبھی نہیں کہتے کہ عورتوں کو اور بال بچوں کو ترک کر دو اور دُنیوی کاروبار کو چھوڑ دو۔ نہیں۔ بلکہ ملازم کو چاہیئے کہ وہ اپنی ملازمت کے فرائض ادا کرے اور تاجر اپنی تجارت کے کاروبار کو پورا کرے لیکن دین کو مقدم رکھے۔

اس کی مثال خود دُنیا میں موجود ہے کہ تاجر اور ملازم لوگ باوجود اس کے کہ وہ اپنی تجارت اور ملازمت کو بہت عمدگی سے پورا کرتے ہیں پھر بھی بیوی بچے رکھتے ہیں اور ان کے حقوق برابر ادا کرتے

ہیں۔ ایسا ہی ایک انسان ان تمام مشاغل کے ساتھ خدا تعالیٰ کے حقوق کو ادا کر سکتا ہے اور دین کو دُنیا پر مقدم رکھ کر بڑی عمدگی سے اپنی زندگی گزار سکتا ہے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۱۱ مورخہ ۱۴ مارچ ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

ہمارے ایسے بندے بھی ہیں جو بڑے بڑے کارخانہ تجارت میں ایک دم کے لئے بھی ہمیں نہیں بھولتے خدا سے تعلق رکھنے والا دُنیادار نہیں کہلاتا۔ (بدر جلد ۷ نمبر ۱ مورخہ ۹ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۰)

ہم یہ نہیں کہتے کہ زراعت والا زراعت کو اور تجارت والا تجارت کو، ملازمت والا ملازمت کو اور صنعت و حرفت والا اپنے کاروبار کو ترک کر دے اور ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ والا معاملہ ہو۔ دست با کار دل بایار والی بات ہو۔ تاجر اپنے کاروبارِ تجارت میں اور زمیندار اپنے امورِ زراعت میں اور بادشاہ اپنے تختِ حکومت پر بیٹھ کر۔ غرض جو جس کام میں ہے اپنے کاموں میں خدا کو نصب العین رکھے اور اس کی عظمت اور جبروت کو پیشِ نظر رکھ کر اس کے احکام اور اوامر و نواہی کا لحاظ رکھتے ہوئے جو چاہے کرے۔ اللہ سے ڈرا اور سب کچھ کر۔

اِسلام کہاں ایسی تعلیم دیتا ہے کہ تم کاروبار چھوڑ کر لنگڑے لُولوں کی طرح نکمے بیٹھ رہو اور بجائے اس کے کہ اَوروں کی خدمت کرو خود دوسروں پر بوجھ بنو نہیں بلکہ سُست ہونا گناہ ہے۔ بھلا ایسا آدمی پھر خدا اور اس کے دین کی کیا خدمت کر سکے گا۔ عیال و اطفال جو خدا نے اس کے ذمے لگائے ہیں ان کو کہاں سے کھلائے گا۔

پس یاد رکھو کہ خدا کا یہ ہرگز منشاء نہیں کہ تم دُنیا کو بالکل ترک کر دو بلکہ اس کا جو منشاء ہے وہ یہ ہے کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا تجارت کرو، زراعت کرو، ملازمت کرو اور حرفت کرو۔ جو چاہو کرو مگر نفس کو خدا کی نافرمانی سے روکتے رہو اور ایسا تزکیہ کرو کہ یہ امور تمہیں خدا سے غافل نہ کر دیں پھر جو تمہاری دُنیا ہے وہ بھی دین کے حکم میں آ جاوے گی۔

انسان دُنیا کے واسطے پیدا نہیں کیا گیا۔ دل پاک ہو اور ہر وقت یہ لَو اور تڑپ لگی ہوئی ہو کہ کسی طرح خدا خوش ہو جائے تو پھر دُنیا بھی اس کے واسطے حلال ہے۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۹، ۵۰ مورخہ ۶، ۱۰ اگست ۱۹۰۸ء صفحہ ۲، ۳)

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ ۚ

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ ۭ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَاۗءُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○

خدا نے ہر ایک جاندار کو پانی سے پیدا کیا سو بعض جاندار پیٹ پر چلتے ہیں اور بعض دو پاؤں پر بعض چار پاؤں پر۔ خدا جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ بھی اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا نے یہ مختلف چیزیں اِس لئے بنائیں کہ تا مختلف قدرتیں اس کی ظاہر ہوں۔ غرض اختلاف طبائع جو فطرتِ مخلوقات میں واقع ہے۔ اس میں حکمتِ الٰہیہ انہیں امورِ ثلاثہ میں منحصر ہے جن کو خدائے تعالیٰ نے آیاتِ ممدوحہ میں بیان کر دیا۔ فتدبر (براہین احمدیہ صفحہ ۱۹۵ حاشیہ)

۵۵ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ ۭ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ وَمَا عَلَي الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ○

کہہ خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور یہ مسلّم اور بدیہی امر ہے کہ خدا کے احکام سے تخلف کرنا معصیت اور موجب دخول جہنّم ہے اور اس مقام میں جس طرح خدا اپنی اطاعت کے لئے حکم فرماتا ہے ایسا ہی رسول کی اطاعت کے لئے حکم فرماتا ہے۔ سو جو شخص اُس کے حکم سے مُنہ پھیرتا ہے وہ ایسے جرم کا ارتکاب کرتا ہے جس کی سزا جہنّم ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۵)

۵۶ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ۭ

يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا ۗ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○

خدا نے تم میں سے بعض نیکو کار ایمانداروں کے لئے یہ وعدہ ٹھہرا رکھا ہے کہ وہ انہیں زمین پر اپنے رسول مقبول کے خلیفے کرے گا۔ انہیں کی مانند جو پہلے کرتا رہا ہے اور ان کے دین کو کہ جو ان کے لئے اس نے پسند کر لیا ہے یعنی دینِ اسلام کو زمین پر جما دے گا اور مستحکم اور قائم کر دے گا اور بعد اس کے کہ ایماندار خوف کی حالت میں ہوں گے یعنی بعد اُس وقت کے کہ جب بباعث وفات حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ خوف دامنگیر ہوگا کہ شاید اب دین تباہ نہ ہو جائے تو اس خوف اور اندیشہ کی حالت میں خدائے تعالیٰ خلافتِ حقّہ کو قائم کر کے مسلمانوں کو اندیشۂ ابتریٔ دین سے بے غم اور امن کی حالت میں کر دے گا۔ وہ خالصًا میری پرستش کریں گے اور مجھ سے کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں گے۔ یہ تو ظاہری طور پر بشارت ہے مگر جیسا کہ آیاتِ قرآنیہ میں عادتِ الٰہیہ جاری ہے اس کے نیچے ایک باطنی معنے بھی ہیں اور وہ یہ ہیں کہ باطنی طور پر ان آیات میں خلافتِ رُوحانی کی طرف بھی اشارہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک خوف کی حالت میں کہ جب محبتِ الٰہیہ دلوں سے اُٹھ جائے اور مذاہبِ فاسدہ ہر طرف پھیل جائیں اور لوگ رُوبہ دُنیا ہو جائیں اور دین کے گم ہونے کا اندیشہ ہو تو ہمیشہ ایسے وقتوں میں خدا رُوحانی خلیفوں کو پیدا کرتا رہے گا کہ جن کے ہاتھ پر رُوحانی طور پر نصرت اور فتح دین کی ظاہر ہو اور حق کی عزت اور باطل کی ذِلّت ہو تا ہمیشہ دین اپنی اصلی تازگی پر عود کرتا رہے اور ایماندار ضلالت کے پھیل جانے اور دین کے مفقود ہو جانے کے اندیشہ سے امن کی حالت میں آجائیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۳۵، ۲۳۶ حاشیہ)

خدا تعالیٰ نے اِس اُمت کے مومنوں اور نیکو کاروں کے لئے وعدہ فرمایا ہے کہ انہیں زمین میں خلیفہ بنائے گا جیسا کہ اس نے پہلوں کو بنایا تھا یعنی اُسی طرز اور طریق کے موافق اور نیز اُسی مدت اور زمانہ کے مشابہ اور اُسی صورتِ جلال اور جمال کی مانند جو بنی اسرائیل میں سُنّت اللہ گزر چکی ہے اس اُمت میں بھی خلیفے بنائے جائیں گے اور اُن کا سلسلہ خلافت اس سلسلے سے کم نہیں ہوگا جو بنی اسرائیل کے خلفاء کے لئے مقرر کیا گیا تھا اور نہ ان کی طرزِ خلافت اس طرز سے مبائن و مخالف ہو گی جو بنی اسرائیل کے خلیفوں کے لئے مقرر کی گئی تھی۔ پھر آگے فرمایا گیا ہے کہ ان خلیفوں کے ذریعے سے زمین پر دین جما دیا جائے گا اور خدا خوف کے ..... دنوں کے بعد امن کے دن لائے گا۔ خالصًا اسی کی بندگی کریں گے اور کوئی اس کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے

لیکن اس زمانہ کے بعد پھر کفر پھیل جائے گا۔ مماثلتِ تامہ کا اشارہ جو کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ
سے سمجھا جاتا ہے صاف دلالت کر رہا ہے کہ یہ مماثلت مدت ایام خلافت اور خلیفوں کی طرزِ اصلاح اور طرزِ
ظہور سے متعلق ہے۔ سو چونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل میں خلیفۃ اللہ ہونے کا منصب حضرت موسیٰ سے
شروع ہوا اور ایک مدت دراز تک نوبت بہ نوبت انبیاء بنی اسرائیل میں رہ کر آخر چودہ (سو) برس کے پورے
ہونے تک حضرت عیسیٰ بن مریم پر یہ سلسلہ ختم ہوا۔ حضرت عیسیٰ بن مریم ایسے خلیفۃ اللہ تھے کہ ظاہری عنانِ
حکومت اُن کے ہاتھ میں نہیں آئی تھی اور سیاستِ ملکی اور اس دنیوی بادشاہ سے ان کو کچھ علاقہ نہیں تھا اور
دُنیا کے ہتھیاروں سے وہ کچھ کام نہیں لیتے تھے بلکہ اس ہتھیار سے کام لیتے تھے جو اُن کے انفاسِ طیبہ میں تھا
یعنی اس موجبہ بیان سے جو ان کی زبان پر جاری کیا گیا تھا جس کے ساتھ بہت سی برکتیں تھیں اور جس کے ذریعہ
سے وہ مرے ہوئے دلوں کو زندہ کرتے تھے اور بہرے کانوں کو کھولتے تھے اور مادرزاد اندھوں کو سچائی کی
روشنی دکھا دیتے تھے۔ اُن کا وہ دم ازلی کافر کو مارتا تھا اور اُس پر پوری حجت کرتا تھا لیکن مومن کو زندگی
بخشتا تھا۔ وہ بغیر باپ کے پیدا کئے گئے تھے اور ظاہری اسباب ان کے پاس نہیں تھے اور ہر بات میں
خدا تعالیٰ ان کا متولی تھا۔ وہ اُس وقت آئے تھے کہ جبکہ یہودیوں نے نہ صرف دین کو بلکہ انسانیت کی خصلتیں
بھی چھوڑ دی تھیں اور بے رحمی اور خود غرضی اور کینہ اور بغض اور ظلم اور حسد اور بے جا جوشِ نفسِ امارہ کے اُن میں
ترقی کر گئے تھے اور نہ صرف بنی نوع کے حقوق کو انہوں نے چھوڑ دیا تھا بلکہ غلبہ شقاوت کی وجہ سے حضرت
مُحسنِ حقیقی سے عبودیت اور اطاعت اور سچے اخلاص کا رشتہ بھی توڑ بیٹھے تھے۔ صرف بے مغز استخوان
کی طرح توریت کے چند الفاظ اُن کے پاس تھے جو قہرِ الٰہی کی وجہ سے ان کی حقیقت تک وہ نہیں پہنچ سکتے تھے
کیونکہ ایمانی فراست اور زیرکی بالکل ان میں سے اُٹھ گئی تھی اور اُن کے نفوسِ مظلمہ پر جہل غالب آگیا تھا اور
سفلی مکاریاں اور کراہت کے کام اُن سے سرزد ہوتے تھے اور جھوٹ اور ریاکاری اور غداری ان میں انتہا
تک پہنچ گئی تھی ایسے وقت میں ان کی طرف مسیح ابن مریم بھیجا گیا تھا جو بنی اسرائیل کے مسیحوں اور خلیفوں میں
سے آخری مسیح اور آخری خلیفۃ اللہ تھا جو برخلاف سُنّت اکثر نبیوں کے بغیر تلوار اور نیزہ کے آیا تھا۔ یاد رکھنا
چاہیئے کہ شریعتِ موسوی میں خلیفۃ اللہ کو مسیح کہتے ہیں اور حضرت داؤد کے وقت اور یا اُن سے کچھ عرصہ پہلے یہ
لفظ بنی اسرائیل میں شائع ہو گیا تھا۔ بہرحال اگرچہ بنی اسرائیل میں کئی مسیح آئے لیکن سب سے پیچھے آنے والا
مسیح وہی ہے جس کا نام قرآن کریم میں مسیح عیسیٰ ابن مریم بیان کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل میں مریمیں بھی کئی تھیں اور
ان کے بیٹے بھی کئی تھے لیکن مسیح عیسیٰ بن مریم اِن تینوں ناموں سے ایک مرکب نام بنی اسرائیل میں اُس وقت اور
کوئی نہیں پایا گیا۔ سو مسیح عیسیٰ ابن مریم یہودیوں کی اس خراب حالت میں آیا جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ آیات

موصوفہ بالا میں ابھی ہم بیان کر چکے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا اس اُمّت کے لئے وعدہ تھا کہ بنی اسرائیل کی طرز پر ان میں بھی خلیفے پیدا ہوں گے۔ اب ہم جب اس طرز کو نظر کے سامنے لاتے ہیں تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ضرور تھا کہ آخری خلیفہ اس اُمّت کا مسیح ابن مریم کی صورت مثالی پر آئے اور اس زمانہ میں آوے کہ جو اس وقت سے مشابہ ہو جس وقت میں بعد حضرت موسیٰؑ کے مسیح ابن مریم آئے تھے یعنی چودھویں صدی میں یا اُس کے قریب اُس کا ظہور ہو اور ایسا ہی بغیر سیف وسنان کے اور بغیر آلاتِ حرب کے آوے جیسا کہ حضرت مسیح ابن مریم آئے تھے اور نیز ایسے ہی لوگوں کی اصلاح کے لئے آئے جیسا کہ مسیح ابن مریم اُس وقت کے خراب اندرون یہودیوں کی اصلاح کے لئے آئے تھے۔ اور جب آیات ممدوحہ بالا کو غور سے دیکھتے ہیں تو ہمیں ان کے اندر سے یہ آواز سُنائی دیتی ہے کہ ضرور آخری خلیفہ اس اُمّت کا جو چودھویں صدی کے سر پر ظہور کرے گا حضرت مسیح کی صورت مثالی پر آئیگا اور بغیر آلاتِ حرب ظہور کرے گا۔ دو سلسلوں کی مماثلت میں یہی قاعدہ ہے کہ اوّل اور آخر میں اشد درجہ کی مشابہت اُن میں ہوتی ہے کیونکہ ایک لمبے سلسلہ اور ایک طولانی مدّت میں تمام درمیانی افراد کا مفصل حال معلوم کرنا طول بلاطائل ہے۔ پس جبکہ قرآن کریم نے صاف صاف بتلا دیا کہ خلافتِ اسلامی کا سلسلہ اپنی ترقی اور تنزل اپنی جلالی اور جمالی حالت کی رُو سے خلافتِ اسرائیلی سے بکلّی مطابق و مشابہ و مماثل ہوگا اور یہ بھی بتلا دیا کہ نبی عربی اُمّی مثیلِ موسیٰ ہے تو اس ضمن میں قطعی اور یقینی طور پر بتلایا گیا کہ جیسے اسلام میں سر دفتر الٰہی خلیفوں کا مثیل موسیٰ ہے جو اس سلسلہ اسلامیہ کا سپہ سالار اور بادشاہ اور تختِ عزت کے اوّل درجے پر بیٹھنے والا اور تمام کا مصدر اور اپنی رُوحانی اولاد کا مورث اعلیٰ ہے صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی اس سلسلہ کا خاتم باعتبار نسبت تامہ وہ مسیح عیسیٰ ابن مریم ہے جو اس اُمّت کے لوگوں میں سے بحکم ربّی مسیحی صفات سے رنگین ہو گیا ہے اور فرمان جَعَلْنٰكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ نے اس کو درحقیقت وہی بنا دیا ہے وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا اور اس آنے والے کا نام جو احمد رکھا گیا ہے وہ بھی اس کے مثیل ہونے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ محمد جلالی نام ہے اور احمد جمالی اور احمد اور عیسیٰ اپنے جمالی معنوں کی رُو سے ایک ہی ہیں۔ اسی کی طرف یہ اشارہ ہے وَمُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْ بَعْدِي اسْمُهٗ اَحْمَدُ مگر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فقط احمد ہی نہیں بلکہ محمد بھی ہیں یعنی جامع جلال و جمال ہیں لیکن آخری زمانہ میں برطبق پیشگوئی مجرد احمد جو اپنے اندر حقیقتِ عیسویت رکھتا ہے بھیجا گیا۔ (ازالہ اوہام ص ۶۶۸-۶۷۳)

خدا وعدہ دے چکا ہے کہ اس دین میں رسول اللہ صلعم کے بعد خلیفے پیدا کرے گا اور قیامت تک اُس کو قائم کرے گا۔ یعنی جس طرح موسیٰؑ کے دین میں مدت ہائے دراز تک خلیفے اور بادشاہ بھیجتا رہا ایسا ہی اِس جگہ بھی کرے گا اور اس کو معدوم ہونے نہیں دے گا۔ اب قرآن شریف موجود ہے۔ حافظ بھی بیٹھے

ہیں دیکھ لیجئے کہ کفار نے کس دعویٰ کے ساتھ اپنی رائیں ظاہر کیں کہ یہ دین ضرور معدوم ہو جائے گا اور ہم اس کو کالعدم کر دیں گے اور اُن کے مقابل پر یہ پیشگوئی کی گئی جو قرآن شریف میں موجود ہے کہ ہرگز تباہ نہیں ہو گا۔ یہ ایک بڑے درخت کی طرح ہو جائے گا اور پھیل جائے گا اور اس میں بادشاہ ہوں گے۔

جنگِ مقدس (مباحثہ اہلِ اسلام و عیسائیاں صفحہ ۱۶ پرچہ ۵ جون ۱۸۹۳ء)

خدا نے اُن لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور اچھے کام کئے یہ وعدہ کیا ہے کہ البتہ انہیں زمین میں اسی طرح خلیفہ کرے گا جیسا کہ ان لوگوں کو کیا جو اُن سے پہلے گذر گئے اور اُن کے دین کو جو اُنکے لئے پسند کیا ہے ثابت کر دے گا اور ان کے لئے خوف کے بعد امن کو بدل دے گا۔ میری عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے (الجزو ۱۸ سورۂ نور) اب غور سے دیکھو کہ اِس آیت میں بھی مماثلت کی طرف صریح اشارہ ہے اور اگر اس مماثلت سے مماثلتِ تامہ مراد نہیں تو کلام عبث ہوا جاتا ہے کیونکہ شریعتِ موسوی میں چودہ سو برس تک خلافت کا سلسلہ ممتد رہا۔ نہ صرف تیس برس تک اور صدہا خلیفے رُوحانی اور ظاہری طور پر ہوئے نہ چار اور پھر ہمیشہ کے لئے خاتمہ۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ مِنْکُمْ کا لفظ دلالت کرتا ہے کہ وہ خلیفے صرف صحابہ میں سے ہوں کیونکہ مِنْکُمْ کے لفظ میں مخاطب صرف صحابہ ہیں تو یہ خیال ایک بدیہی غلطی ہے اور ایسی بات صرف اُس شخص کے مُنہ سے نکلے گی جس نے کبھی قرآن کریم کو غور سے نہیں پڑھا اور نہ اس کی اسالیبِ کلام کو پہچانا کیونکہ اگر یہی بات صحیح ہے کہ مخاطبت کے وقت وہی لوگ مراد ہوتے ہیں جو موجودہ زمانہ میں بحیثیت ایماندار ی زندہ موجود ہوں تو ایسا تجویز کرنے سے سارا قرآن زیر و زبر ہو جائے گا۔ مثلاً اِسی آیتِ موصوفہ بالا کے مشابہ قرآن کریم میں ایک اور آیت بھی ہے جس میں اسی طرح بظاہر الفاظ وہ لوگ مخاطب ہیں جو حضرت موسیٰ پر ایمان لائے تھے اور اس وقت زندہ موجود تھے بلکہ ان آیات میں تو اِس بات پر نہایت قوی قرائن موجود ہیں کہ درحقیقت وہی مخاطب کئے گئے ہیں اور وہ آیات یہ ہیں قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ نَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ ○ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَ اصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ۟ يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○ قَالُوْۤا اُوْذِيْنَا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَاْتِيَنَا وَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ؕ قَالَ عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَ يَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ ○ (الجزو ۹ سورۃ الاعراف) یعنی فرعون نے کہا کہ ہم بنی اسرائیل کے بیٹوں کو قتل کریں گے اور ان کی بیٹیوں کو زندہ رکھیں گے اور تحقیقاً ہم ان پر غالب ہیں۔ تب موسیٰ نے اپنی قوم کو کہا کہ اللہ سے مدد چاہو اور صبر کرو زمین خدا کی ہے جس کو اپنے بندوں سے چاہتا ہے اس کا وارث بنا دیتا ہے اور انجام بخیر پرہیزگاروں کا ہی ہوتا ہے

تب موسیٰ کی قوم نے اس کو جواب دیا کہ ہم تیرے پہلے بھی ستائے جاتے تھے اور تیرے آنے کے بعد بھی ستائے گئے تو موسیٰ نے اُن کو جواب میں کہا کہ قریب ہے کہ خدا تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور زمین پر تمہیں خلیفے مقرر کر دے اور پھر دیکھے کہ تم کس طور کے کام کرتے ہو۔

اب اِن آیات میں صریح اور صاف طور پر وہی لوگ مخاطب ہیں جو حضرت موسیٰؑ کی قوم میں سے اُن کے سامنے زندہ موجود تھے اور انہوں نے فرعون کے ظلموں کا شکوہ بھی کیا تھا اور کہا تھا کہ ہم تیرے پہلے بھی ستائے گئے اور تیرے آنے کے بعد بھی۔ اور انہیں کو خطاب کر کے کہا تھا کہ تم ان تکلیفات پر صبر کرو۔ خدا تمہاری طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہوگا اور تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا اور تم کو زمین پر خلیفے بنا دیگا لیکن تاریخ دانوں پر ظاہر ہے اور یہودیوں اور نصاریٰ کی کتابوں کو دیکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ گو اس قوم کا دشمن یعنی فرعون ان کے سامنے ہلاک ہؤا مگر وہ خود تو زمین پر نہ ظاہری خلافت پر پہنچے نہ باطنی خلافت پر بلکہ اکثر ان کی نافرمانیوں سے ہلاک کئے گئے اور چالیس برس تک بیابان لق و دق میں آوارہ رہ کر جان بحق تسلیم ہوئے پھر بعد ان کی ہلاکت کے ان کی اولاد میں ایک ایسا سلسلہ خلافت کا شروع ہؤا کہ بہت سے بادشاہ اس قوم میں ہوئے اور داؤد اور سلیمان جیسے خلیفۃ اللہ اسی قوم میں سے پیدا ہوئے یہاں تک کہ آخر یہ سلسلہ خلافت کا چودھویں صدی میں حضرت مسیح پر ختم ہؤا پس اس سے ظاہر ہؤا کہ کسی قوم موجودہ کو مخاطب کرنے سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خطاب قوم موجودہ تک ہی محدود رہے بلکہ قرآن کریم کا تو یہ بھی محاورہ پایا جاتا ہے کہ بسا اوقات ایک قوم کو مخاطب کرتا ہے مگر اصل مخاطب کوئی اور لوگ ہوتے ہیں جو گذر گئے یا آئندہ آنے والے ہیں۔ مثلاً اللہ جلّ شانہٗ سورۃ البقرہ میں یہود موجودہ کو مخاطب کر کے فرماتا ہے یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِکُمْ ۚ وَ اِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ؀ یعنی اے بنی اسرائیل اس نعمت کو یاد کرو جو ہم نے تم پر انعام کی اور میرے عہد کو پورا کرو تا میں بھی تمہارے عہد کو پورا کروں اور مجھ سے پس ڈرو۔

اب ظاہر ہے کہ یہود موجودہ زمانہ آنحضرت تو ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ کا مصداق تھے۔ ان پر تو کوئی انعام بھی نہیں ہؤا تھا اور نہ ان سے یہ عہد ہؤا تھا کہ تم نے خاتم الانبیاء پر ایمان لانا۔ پھر بعد اس کے فرمایا وَ اِذْ نَجَّیْنٰکُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَکُمْ وَیَسْتَحْیُوْنَ نِسَآءَکُمْ ؕ وَفِیْ ذٰلِکُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ عَظِیْمٌ ؀ وَ اِذْ فَرَقْنَا بِکُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰکُمْ وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ؀ یعنی وہ وقت یاد کرو کہ جب ہم نے تم کو آلِ فرعون سے نجات دی۔ وہ تم کو طرح طرح دُکھ دیتے تھے۔ تمہارے لڑکوں کو مار ڈالتے تھے اور تمہاری لڑکیوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں

خدا تعالیٰ کی طرف سے تمہارا بڑا امتحان تھا اور وہ وقت یاد کرو جبکہ ہم نے تمہارے پہنچنے کے ساتھ ہی دریا کو پھاڑ دیا پھر ہم نے تم کو نجات دے دی اور فرعون کے لوگوں کو ہلاک کر دیا اور تم دیکھتے تھے۔

اب سوچنا چاہیئے کہ ان واقعات میں سے کوئی واقعہ بھی ان یہودیوں کو پیش نہیں آیا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھے نہ وہ فرعون کے ہاتھ سے دُکھ دئے گئے تھے نہ اُن کے بیٹوں کو کسی نے قتل کیا نہ وہ کسی دریا سے پار کئے گئے۔ پھر آگے فرماتا ہے وَاِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً فَاَخَذَتْکُمُ الصّٰعِقَۃُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنٰکُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ ۝ وَظَلَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی یعنی وہ وقت یاد کرو جب تم نے موسیٰ کو کہا ہم تیرے کہے پر تو ایمان نہیں لائیں گے جب تک خدا کو بچشم خود نہ دیکھ لیں۔ تب تم پر صاعقہ پڑی اور پھر تم کو زندہ کیا گیا تاکہ تم شکر کرو اور ہم نے بادلوں کو تم پر سائبان کیا اور ہم نے تم پر مَنّ اور سلویٰ اُتارا۔ اب ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ تو ان یہودیوں سے جو قرآن میں مخاطب کئے گئے دو ہزار برس پہلے فوت ہو چکے تھے اور ان کا حضرت موسیٰ کے زمانہ میں نام و نشان بھی نہ تھا پھر حضرت موسیٰ سے ایسا سوال کیونکر کر سکتے تھے۔ کہاں ان پر بجلی گری۔ کہاں انہوں نے من وسلویٰ کھایا۔ کیا وہ پہلے حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں اَور اَور قالبوں میں موجود تھے اور پھر آنحضرتؐ کے زمانہ میں بھی بطور تناسخ آموجود ہوئے اور اگر یہ نہیں تو بجز اس تاویل کے اَور کیا کہہ سکتے ہیں کہ مخاطبت کے وقت ضروری نہیں کہ وہی لوگ حقیقی طور پر واقعاتِ منسوبہ کے مصداق ہوں جو مخاطب ہوں۔ کلام الٰہی اور احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ ایک قاعدہ ٹھہر گیا ہے کہ بسا اَوقات کوئی واقعہ ایک شخص یا ایک قوم کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور دراصل وہ واقعہ کسی دوسری قوم یا دوسرے شخص سے تعلق رکھتا ہے اور اسی باب میں سے عیسٰی بن مریم کے آنے کی خبر ہے کیونکہ بعض احادیث میں آخری زمانہ میں آنے کا ایک واقعہ حضرت عیسٰیؑ کی طرف منسوب کیا گیا حالانکہ وہ فوت ہو چکے تھے۔ پس یہ واقعہ بھی حضرت مسیح کی طرف ایسا ہی منسوب ہے جیساکہ واقعہ فرعون کے ہاتھ سے نجات پانے کا اور مَنّ وسلویٰ کھانے کا اور صاعقہ گرنے کا اور دریا سے پار ہونے کا اور قصہ لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ کا اُن یہودیوں کی طرف منسوب کیا گیا جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں موجود تھے حالانکہ وہ واقعات اُن کی پہلی قوم کے تھے جو اُن سے صدہا برس پہلے مر چکے تھے۔ پس اگر کسی کو آیات کے معنے کرنے میں معقول شق کی طرف خیال نہ ہو اور ظاہر الفاظ پر اُڑ جانا واجب سمجھے تو کم سے کم ان آیات سے یہ ثابت ہو گا کہ مسئلہ تناسخ حق ہے ورنہ کیونکر ممکن تھا کہ خدا تعالیٰ ایک فاعل کے فعل کو کسی ایسے شخص کی طرف منسوب کرے جس کو اس فعل کے اِرتکاب سے کچھ بھی تعلق نہیں حالانکہ وہ آپ ہی فرماتا ہے لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی پھر اگر موسیٰ کی قوم نے موسیٰؑ کی نافرمانی کی تھی اور اُن پر بجلی

گری تھی یا انہوں نے گوسالہ پرستی کی تھی اور ان پر عذاب نازل ہوُا تھا تو اُس دوسری قوم کو ان واقعات سے کیا تعلق تھا جو دو ہزار برس بعد پیدا ہوئی۔ یُوں تو حضرت آدمؑ سے تا ایں دم متقدمین متاخرین کے لئے بطور آباء واجداد ہیں لیکن کسی کا گنہ کسی پر عائد نہیں ہو سکتا۔ پھر خدا تعالیٰ کا قرآن کریم میں یہ فرمانا کہ تم نے موسیٰؑ کی نافرمانی کی اور تم نے کہا کہ ہم خدا کو نہیں مانیں گے جب تک اس کو نہ دیکھ لیں اور اس گنہ کے سبب سے تم پر بجلی گری کیونکر ان تمام الفاظ کے بنظر ظاہر کوئی اَور معنے ہو سکتے ہیں بجز اس کے کہ کہا جائے کہ دراصل وہ تمام یہودی جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں موجود تھے حضرت موسیٰ کے وقت میں بھی موجود تھے اور اُنہیں پر منّ و سلوٰی نازل ہوُا تھا اور اُنہیں پر بجلی پڑی تھی اور انہیں کی خاطر فرعون کو ہلاک کیا گیا تھا اور پھر وہی یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بطور تناسخ پیدا ہو گئے اور اِس طرح پر خطاب صحیح ٹھہر گیا مگر سوال یہ ہے کہ کیوں ایسے سیدھے معنے نہیں کئے جاتے۔ کیا یہ خدا تعالیٰ کی قدرت سے دُور ہیں اور کیوں ایسے معنے قبول کئے جاتے ہیں جو تاویلاتِ بعیدہ کے حکم میں ہیں۔ کیا خدا تعالیٰ قادر نہیں کہ جس طرح بقول ہمارے مخالفوں کے وہ حضرت عیسیٰؑ کو بعینہٖ بجسدہ العنصری کسی وقت صدہا برسوں کے بعد پھر زمین پر لے آئے گا اسی طرح اُس نے حضرت موسیٰؑ کے زمانہ کے یہودیوں کو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں زندہ کر دیا ہو یا اُن کی رُوحوں کو بطور تناسخ پھر دُنیا میں لے آیا ہو جس حالت میں صرف بے بُنیاد اقوال کی بُنیاد پر حضرت عیسیٰ کی رُوح کا پھر دُنیا میں آنا تسلیم کیا گیا ہے تو کیوں اور کیا وجہ کہ ان تمام یہودیوں کی رُوحوں کا دوبارہ بطور تناسخ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں آجانا قبول نہ کیا جائے جن کے موجود ہو جانے پر نصوصِ صریحہ بیّنہ قرآن کریم شاہد ہیں۔ دیکھو خدا تعالیٰ صاف فرماتا ہے وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نُّؤْمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰہَ جَھْرَۃً فَاَخَذَتْکُمُ الصّٰعِقَۃُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ یعنی تم وہ وقت یاد کرو جبکہ تم نے نہ کسی اَور نے یہ کہا کہ ہم تیرے کہنے پر تو ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہم آپ ظاہر ظاہر خدا کو نہ دیکھ لیں اور پھر تم کو بجلی نے پکڑا اور تم دیکھتے تھے۔ اور اِس آیت میں ایک اَور لطیفہ یہ ہے کہ چونکہ خدا تعالیٰ نے اِس آیت کے مضمون میں موجودہ یہودیوں کو گذشتہ لوگوں کے قائم مقام نہیں ٹھہرایا بلکہ ان کو فی الحقیقت گذشتہ لوگ ہی ٹھہرا دیا تو اُس صورت میں قرآن کریم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک کے یہودیوں کے وہی نام رکھ دئے جو اُن گذشتہ بنی اسرائیل کے نام تھے کیونکہ جبکہ یہ لوگ حقیقتاً وہی لوگ قرار دے دیئے گئے تو یہ لازمی ہوُا کہ نام بھی وہی ہوں۔ وجہ یہ کہ نام حقائق کے لئے مثل عوارض غیر منفک کے ہیں اور عوارض لازمیہ اپنے حقائق سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اب خوب متوجہ ہو کر سوچو کہ جبکہ خدا تعالیٰ نے صریح اور صاف لفظوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے یہودیوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم نے ہی ایسے ایسے بُرے کام حضرت موسیٰؑ کے عہد میں

کئے تھے تو پھر ایسی صریح اور کھلی کھلی نص کی تاویل کرنا اور احادیث کی بنیاد پر حضرت عیسٰی علیہ السلام کو جو قرآن کریم کی رُو سے وفات یافتہ ہے پھر زمین پر اُتارنا کیسی بے اعتدالی اور نا انصافی ہے۔ عزیزو اگر خدا تعالیٰ کی یہی عادت اور سُنّت ہے کہ گذشتہ لوگوں کو پھر دُنیا میں لے آتا ہے تو نصِ قرآنی جو بتکرار در تکرار گذشتہ لوگوں کو مخاطب کرکے اُن کے زندہ ہونے کی شہادت دے رہی ہے اس سے درگذر کرنا ہرگز جائز نہیں اور اگر وہاں یہ دھڑکہ دِل کو پکڑتا ہے کہ ایسے معنے گو خدا تعالیٰ کی قدرت سے تو بعید نہیں لیکن معقول کے برخلاف ہیں اِس لئے تاویل کی طرف رُخ کیا جاتا ہے اور وہ معنے کئے جاتے ہیں جو عند العقل کچھ بعید نہیں ہیں تو پھر ایسا ہی حضرت عیسیٰؑ کے آنے کی پیشگوئی کے معنے کرنے چاہئیں کیونکہ اگر گذشتہ یہودیوں کا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں زندہ ہو جانا یا اگر بطریق تناسخ کے ان کی رُوحیں پھر آجانا طریق معقول کے برخلاف ہے تو حضرت مسیحؑ کی نسبت کیونکر دوبارہ دُنیا میں آنا تجویز کیا جاتا ہے جن کی وفات پر آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ بلند آواز سے شہادت دے رہی ہے۔ کیا یہودیوں کی رُوحوں کا دوبارہ دُنیا میں آنا خدا تعالیٰ کی قدرت سے بعید اور نیز طریق معقول کے برخلاف لیکن حضرت عیسیٰ کا بجسدہ العنصری پھر زمین پر آجانا بہت معقول ہے پھر اگر نصوصِ بیّنہ صریحہ قرآنیہ کو بباعث استبعاد ظاہری معنوں کے مؤوّل کرکے طریق صرف عن الظاہر اختیار کیا جاتا ہے تو پھر کیا وجہ کہ نصوص احادیثیہ کا صرف عن الظاہر جائز نہیں۔ کیا احادیث کی قرآن کریم سے کوئی اعلیٰ شان ہے کہ تا ہمیشہ احادیث کے بیان کو گو کیسا ہی بعید از عقل ہو ظاہر الفاظ پر قبول کیا جائے اور قرآن شریف میں تاویلات بھی کی جائیں پھر ہم اصل کلام کی طرف رجوع کرکے لکھتے ہیں کہ بعض صاحب آیت وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ کی عمومیت سے انکار کرکے کہتے ہیں کہ مِنْكُمْ سے صحابہؓ ہی مراد ہیں اور خلافتِ راشدہ حقّہ اُنہیں کے زمانہ تک ختم ہو گئی اور پھر قیامت تک اِسلام میں اس خلافت کا نام ونشان نہیں ہوگا۔ گویا ایک خواب وخیال کی طرح اس خلافت کا صرف تیس برس ہی دَور تھا اور پھر ہمیشہ کے لئے اِسلام ایک لازوال نحوست میں پڑ گیا۔ مگر میں پوچھتا ہوں کہ کیا کسی نیک دل اِنسان کی ایسی رائے ہوسکتی ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نسبت تو یہ اعتقاد رکھے کہ بلا شُبہ ان کی شریعت کی برکت اور خلافتِ راشدہ کا زمانہ برابر چودہ سو برس تک رہا لیکن وہ نبی جو افضل الرسل اور خیر الانبیاء کہلاتا ہے اور جس کی شریعت کا دامن قیامت تک ممتد ہے اس کی برکات گویا اس کے زمانہ تک ہی محدود رہیں اور خدا تعالیٰ نے نہ چاہا کہ کچھ بہت مدت تک اس کی برکات کے نمونے اس کے رُوحانی خلیفوں کے ذریعہ سے ظاہر ہوں۔ ایسی باتوں کو سُنکر تو ہمارا بدن کانپ جاتا

ہے مگر افسوس کہ وہ لوگ بھی مسلمان ہی کہلاتے ہیں کہ جو سراسر چالاکی اور بیباکی کی راہ سے ایسے بے ادبانہ الفاظ مُنہ پر لے آتے ہیں کہ گویا اسلام کی برکات آگے نہیں بلکہ مدت ہوئی کہ ان کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

ماسوا اس کے مِنْكُمْ کے لفظ سے یہ استدلال پیدا کرنا کہ چونکہ خطاب صحابہ سے ہے اِس لئے یہ خلافت صحابہؓ تک ہی محدود ہے عجیب عقلمندی ہے۔ اگر اسی طرح قرآن کی تفسیر ہو تو پھر یہودیوں سے بھی آگے بڑھ کر قدم رکھنا ہے۔ اب واضح ہو کہ مِنْكُمْ کا لفظ قرآن کریم میں قریباً بیاسی جگہ آیا ہے اور بجز دو یا تین جگہ کے جہاں کوئی خاص قرینہ قائم کیا گیا ہے باقی تمام مواضع میں مِنْكُمْ کے خطاب سے وہ تمام مسلمان مراد ہیں جو قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے۔

اب نمونہ کے طور پر چند وہ آیتیں ہم لکھتے ہیں جن میں مِنْكُمْ کا لفظ پایا جاتا ہے۔

(۱) فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ یعنی جو تم میں سے مریض یا سفر پر ہو تو اتنے ہی روزے اور رکھ لے۔ اب یہ سوچو کہ کیا یہ حکم صحابہ ہی سے خاص تھا یا اس میں اور بھی مسلمان جو قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے شامل ہیں۔ ایسا ہی نیچے کی آیتوں پر بھی غور کرو۔

(۲) ذٰلِكَ يُوعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ یعنی یہ اُس کو وعظ کیا جاتا ہے جو تم میں سے اللہ اور یوم آخرت پر ایمان لاتا ہے۔

(۳) وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا یعنی تم میں سے جو جورُوئیں چھوڑ کر فوت ہو جائیں۔

(۴) وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ یعنی تم میں سے ایسے لوگ ہونے چاہئیں جو نیکی کی دعوت کریں اور امر معروف اور نہی منکر اپنا طریق رکھیں۔

(۵) اَنِّيْ لَاۤ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى میں تم سے کسی عامل کا عمل ضائع نہیں کروں گا خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت ہو۔

(۶) لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ناجائز طور پر ایک دوسرے کے مال مت کھاؤ مگر باہم رضامندی کی تجارت سے۔

(۷) وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰۤى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا یعنی اگر تم مریض ہو یا سفر پر یا پاخانہ

سے آؤ یا عورتوں سے مباشرت کرو اور پانی نہ ملے تو ان سب صورتوں میں پاک مٹی سے تیمم کرو۔

(۸) اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ یعنی اللہ اور رسول اور اپنے بادشاہوں کی تابعداری کرو۔

(۹) مَنْ عَمِلَ مِنْکُمْ سُوْٓءً۬ا بِجَھَالَۃٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِہٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّہٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ یعنی جو شخص تم میں سے بوجہ اپنی جہالت کے کوئی بدی کرے اور پھر توبہ کرے اور نیک کاموں میں مشغول ہو جائے پس اللہ غفور رحیم ہے۔

(۱۰) فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤی اَشَدِّ الْعَذَابِ یعنی جو شخص تم سے ایسا کام کرے دُنیا کی زندگی میں اُس کو رُسوائی ہوگی اور قیامت کو اُس کے لئے سخت عذاب ہے۔

(۱۱) وَ اِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا یعنی تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو دوزخ میں وارد نہ ہو۔

(۱۲) وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْکُمْ وَ لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ یعنی ہم ان لوگوں کو جانتے ہیں جو تم میں سے آگے بڑھنے والے ہیں اور جو پیچھے رہنے والے ہیں۔

اب ان تمام مقامات کو دیکھو کہ مِنْکُمْ کا لفظ تمام مسلمانوں کے لئے عام ہے خواہ اس وقت موجود تھے خواہ بعد میں قیامت تک آتے جائیں۔ ایسا ہی تمام دوسرے مقامات میں بجز دو تین موضعوں کے عام طور پر اِستعمال ہؤا ہے اور تمام احکام میں بظاہر صورت مخاطب صحابہ ہی ہیں لیکن تخصیص صحابہ بجز قیام قرینہ کے جائز نہیں ورنہ ہر یک فاسق عذر کر سکتا ہے کہ صَوم اور صلوٰۃ اور حج اور تقویٰ اور طہارت اور اجتناب عن المعاصی کے متعلق جس قدر احکام ہیں ان احکام کے مخاطب صرف صحابہ ہی تھے اِس لئے ہمیں نماز روزہ وغیرہ کی پابندی لازم نہیں اور ظاہر ہے کہ ایسے کلمات بجز ایک زندیق کے اور کوئی خدا ترس آدمی زبان پر نہیں لاسکتا۔

اگر کسی کے دِل میں یہ خیال گذرے کہ اگر آیت وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فائدہ عموم کا دیتی ہے یعنی مقصود اصل تعمیم تھی نہ تخصیص تو پھر مِنْکُمْ کا لفظ اِس جگہ کیوں زیادہ کیا گیا اور اس کی زیادت کی ضرورت ہی کیا تھی۔ صرف اِس قدر فرمایا ہوتا کہ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ وعدہ ان ایمانداروں اور نیکوکاروں کے مقابل پر تھا جو اس اُمت سے پہلے گذر چکے ہیں۔ پس گویا تفصیل اِس آیت کی یوں ہے کہ خدا تعالیٰ نے تم سے پہلے ان لوگوں کو رُوئے زمین پر خلیفے مقرر کیا تھا جو ایماندار اور صالح تھے اور اپنے ایمان کے ساتھ اعمالِ صالح جمع رکھتے تھے اور خدا تعالیٰ وعدہ کرتا ہے کہ تم میں سے بھی اے مسلمانو ایسے لوگوں کو جو انہیں

صفاتِ حسنہ سے موصوف ہوں اور ایمان کے ساتھ اعمالِ صالح جمع رکھتے ہوں خلیفے کرے گا پس مِنۡکُمۡ
کا لفظ زائد نہیں بلکہ اس سے غرض یہ ہے کہ تا اسلام کے ایمانداروں اور نیکوکاروں کی طرف اشارہ کرے
کیونکہ جبکہ نیکوکار اور ایماندار کا لفظ اِس آیت میں پہلی اُمتوں اور اس اُمّت کے ایمانداروں اور نیکوکاروں
پر برابر حاوی تھا پھر اگر کوئی تخصیص کا لفظ نہ ہوتا تو عبارت رکیک اور مُبہم اور دُور از فصاحت ہوتی اور
مِنۡکُمۡ کے لفظ سے یہ جتانا بھی منظور ہے کہ پہلے بھی وہی لوگ خلیفے مقرر کئے گئے تھے کہ جو ایماندار اور
نیکوکار تھے اور تم میں سے بھی ایماندار اور نیکوکار ہی مقرر کئے جائیں گے۔ اب اگر آنکھیں دیکھنے کی ہوں
تو عام معنی کی رُو سے مِنۡکُمۡ کے لفظ کا زائد ہونا کہاں لازم آتا ہے اور تکرار کلام کیونکر ہے جبکہ ایمان اور
عملِ صالح اِسی اُمّت سے شروع نہیں ہوا پہلے بھی مومن اور نیکوکار گذرے ہیں تو اِس صورت میں تمیز کامل
بجز مِنۡکُمۡ کے لفظ کے کیونکر ہو سکتی تھی۔ اگر صرف اِس قدر ہوتا کہ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ تو کچھ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ یہ کن ایمانداروں کا ذکر ہے آیا اِس اُمّت کے ایماندار یا گذشتہ
اُمّتوں کے۔ اور اگر صرف مِنۡکُمۡ ہوتا اور اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ نہ ہوتا تو یہ سمجھا جاتا کہ
فاسق اور بدکار لوگ بھی خدا تعالیٰ کے خلیفے ہو سکتے ہیں حالانکہ فاسقوں کی بادشاہت اور حکومت بطور
اِبتلاء کے ہے نہ بطور اصطفاء کے۔ اور خدا تعالیٰ کے حقانی خلیفے خواہ وہ رُوحانی خلیفے ہوں یا ظاہری وہی
لوگ ہیں جو متقی اور ایماندار اور نیکوکار ہیں۔

اور یہ وہم کہ عام معنوں کی رُو سے ان آیات کی اخیر کی آیت وَمَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ
ھُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ بالکل بے معنی ٹھہر جاتی ہے۔ ایسا بیہودہ خیال ہے جو اس پر ہنسی آتی ہے کیونکہ آیت کے
صاف اور سیدھے یہ معنی ہیں کہ اللہ جلّ شانہٗ خلیفوں کے پیدا ہونے کی خوشخبری دے کر پھر باغیوں اور
نافرمانوں کو دھمکی دیتا ہے کہ بعد خلیفوں کے پیدا ہونے کے جب وہ وقتاً فوقتاً پیدا ہوں اگر کوئی بغاوت
اختیار کرے اور ان کی اطاعت اور بیعت سے منہ پھیرے تو وہ فاسق ہے۔ اب نادرستی معنوں کی کہاں ہے
اور واضح ہو کہ اس آیت کریمہ سے وہ حدیث مطابق ہے جو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں مَنۡ لَّمۡ
یَعۡرِفۡ اِمَامَ زَمَانِہٖ فَقَدۡ مَاتَ مِیۡتَۃَ الۡجَاہِلِیَّۃِ جس شخص نے اپنے زمانہ کے امام کو شناخت نہ کیا
وہ جاہلیت کی موت پر مر گیا یعنی جیسے جیسے ہر یک زمانہ میں امام پیدا ہوں گے اور جو لوگ ان کو شناخت
نہیں کریں گے تو ان کی موت کفارہ کی موت کے مشابہ ہوگی۔ اور معترض صاحب کا اِس آیت کو پیش کرنا کہ
قَالَ اللّٰہُ اِنِّیۡ مُنَزِّلُہَا عَلَیۡکُمۡ فَمَنۡ یَّکۡفُرۡ بَعۡدُ مِنۡکُمۡ فَاِنِّیۡۤ اُعَذِّبُہٗ عَذَابًا لَّاۤ اُعَذِّبُہٗۤ
اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِیۡنَ اور اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مِنۡکُمۡ کا لفظ اِس جگہ خصوصیت کے ساتھ حاضرین کے

حق میں آیا ہے ایک بے فائدہ بات ہے۔ کیونکہ ہم لکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کا عام محاورہ جس سے تمام
قرآن شریف بھرا پڑا ہے یہی ہے کہ خطاب عام ہوتا ہے اور احکامِ خطابیہ تمام اُمّت کے لئے ہوتے ہیں
نہ صرف صحابہ کے لئے۔ ہاں جس جگہ کوئی صریح اور صاف قرینہ تحدیدِ خطاب کا ہو وہ جگہ مستثنیٰ ہے۔ چنانچہ
آیت موصوفہ بالا میں خاص حواریوں کے ایک طائفہ نے نزولِ مائدہ کی درخواست کی اُسی طائفہ کو مخاطب
کرکے جواب ملا۔ سو یہ قرینہ کافی ہے کہ سوال بھی اُسی طائفہ کا تھا اور جواب بھی اُسی کو ملا۔ اور یہ کہنا کہ
اس کی مثالیں کثرت سے قرآن شریف میں ہیں بالکل جھوٹ اور دھوکا دیتا ہے۔ قرآن میں بیاسی کے قریب
لفظِ مِنْکُمْ ہے اور چھ سَو کے قریب اَور اَور صورتوں میں خطاب ہے لیکن تمام خطاباتِ احکامیہ وغیرہ
میں تعمیم ہے۔ اگر قرآن کے خطابات صحابہ تک ہی محدود ہوتے تو صحابہ کے فوت ہو جانے کے ساتھ قرآن
باطل ہو جاتا اور آیت متنازعہ فیہا جو خلافت کے متعلق ہے درحقیقت اِس آیت سے مشابہ ہے لَهُمُ
الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا کیا یہ بُشْرٰی صحابہ سے ہی خاص تھا یا کسی اَور کا بھی اِس سے حصّہ
ہے۔ اور معترض کا یہ کہنا کہ جو شخص اصل معنوں سے جو خصوصیت مخاطبین ہے عدول کرکے اس کے
معنے عموم لیوے اُس کا ذمّہ ہے کہ وہ دلیلِ یقینی سے اپنے عدول کو ثابت کرے۔ اس سے صاف ثابت
ہوتا ہے کہ نہ صرف معترض کو قرآن کریم سے بلکہ تمام الٰہی کتابوں کے اسلوبِ کلام سے کچھ بھی خبر نہیں۔
مشکل یہ ہے کہ اکثر شتاب کار لوگ قبل اس کے جو پُورے طور پر خوض کریں اعتراض کرنے کو تیار ہو
جاتے ہیں۔ اگر معترض صاحب کو صحیح نیّت سے تحقیق کا شوق تھا تو وہ تمام ایسے موقعے جہاں بظاہر نظر صحابہ
مخاطب ہیں جمع کرکے دیکھتے کہ اکثر اغلب اور بلا قیام قرینہ قرآن شریف میں کیا محاورہ ہے کیونکہ یہ صاف
ظاہر ہے کہ جو اکثر اغلب محاورہ ثابت ہوگا اُسی کے موافق اصل معنی ٹھہریں گے اور اُن سے عدول کرنا
بغیر قیام قرینہ جائز نہیں ہوگا۔ اب ظاہر ہے کہ اصل محاورہ قرآن کریم کا خطاب حاضرین میں عموم ہے
اور قرآن کا چھ سَو حکم اسی بناء پر عام سمجھا جاتا ہے نہ یہ کہ صحابہ تک محدود سمجھا جائے۔ پھر جو شخص عام محاورہ
سے عدول کرکے کسی حکم کو صحابہ تک ہی محدود رکھے اس کے ذمّہ یہ بارِ ثبوت ہوگا کہ قرائن قویّہ سے یہ
ثابت کرے کہ یہ خطاب صحابہ سے ہی خاص ہے اور دوسرے لوگ اس سے باہر ہیں۔ مثلاً اللہ جلّشانہٗ قرآن کریم
میں بظاہر صحابہ کو مخاطب کرکے فرماتا ہے کہ تم صرف خدا کی بندگی کرو اور صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ مدد چاہو اور
پاک چیزوں میں سے کھاؤ اور کسی قسم کا فساد مت کرو اور تم زکوٰۃ اور نماز کو قائم کرو اور مقامِ ابراہیم سے
جائے نماز ٹھہراؤ اور خیرات میں ایک دوسرے سے سبقت کرو اور مجھ کو یاد کرو۔ میں تم کو یاد کروں گا اور
میرا شکر کرو اور مجھ سے دعا مانگو اور جو لوگ خدا کی راہ میں شہید ہوں اُن کو مُردے مت کہو اور جو تم کو

سلام[13] علیکم کرے اس کا نام کافر اور بے ایمان نہ رکھو۔ پاک چیزیں[14] زمین کی پیداوار میں سے کھاؤ اور شیطان کی پیروی[15] نہ کرو۔ تم پر روزے[16] فرض کئے گئے ہیں مگر جو تم میں سے بیمار یا سفر پر ہو وہ اتنے روزے[17] پھر رکھے تم ایک دوسرے کے مال[18] کو ناحق کے طور پر مت کھاؤ اور تم تقویٰ[19] اختیار کرو تا فلاح پاؤ۔ اور تم خدا کی راہ[20] میں اُن سے جو تم سے لڑیں لڑو لیکن حد سے مت[21] بڑھو اور کوئی زیادتی مت[22] کرو کہ خدا زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا اور تم خدا[23] کی راہ میں خرچ کرو اور دانستہ[24] اپنے تئیں ہلاکت میں مت ڈالو اور لوگوں[25] سے احسان کرو کہ خدا محسنین کو دوست رکھتا ہے اور حج[26] اور عمرہ کو اللہ کے واسطے پورا کرو اور اپنے پاس توشہ[27] رکھو کہ توشہ میں یہ فائدہ ہے کہ تم کسی دوسرے سے سوال نہیں کرو گے۔ یعنی سوال ایک ذلت ہے اس سے بچنے کے لئے تدبیر کرنی چاہیئے اور تم صلح[28] اور اسلام میں داخل ہو اور مشرکات[29] سے نکاح مت کرو جب تک ایمان نہ لاویں۔ اور مشرکین[30] سے اے عورتو تم نکاح مت کرو جب تک ایمان نہ لاویں اور اپنے نفسوں[31] کے لئے کچھ آگے بھیجو اور خدا[32] تعالیٰ کو اپنی قسموں کا عرضہ مت بناؤ اور عورتوں[33] کو دکھ دینے کی غرض سے بندمت رکھو اور جو[34] لوگ تم میں سے فوت ہو جائیں اور جورُوئیں رہ جائیں تو وہ چار مہینے اور دس دن نکاح کرنے سے رُکی رہیں۔ اگر تم طلاق[35] دو تو عورتوں کو احسان کے ساتھ رخصت کرو۔ اگر تمہیں خوف[36] ہو تو نماز پیروں سے چلتے چلتے یا سوار ہونے کی حالت میں پڑھ لو۔ اگر اپنے صدقات[37] لوگوں کو دکھلا کے دو تو یہ عمدہ اچھی بات ہے کہ تا لوگ تمہارے نیک کاموں کی پیروی کریں اور اگر چھپا کر محتاجوں کو دو تو یہ تمہارے نفسوں کے لئے بہتر ہے۔ جب[38] تم کسی کو قرضہ دو تو ایک نوشت لکھا لو اور قرض[39] ادا کرنے میں خدا سے ڈرو اور کچھ باقی مت رکھو۔ اور جب[40] تم کوئی خرید و فروخت کرو تو اس پر گواہ رکھ لو۔ اور اگر تم سفر[41] میں ہو اور کوئی کاتب نہ ملے تو کوئی جائیداد قبضہ میں کر لو۔ تم سب[42] مل کر خدا کی رسی سے پنجہ مارو اور باہم پھوٹ مت ڈالو۔ تم میں سے ایسے[43] بھی ہونے چاہئیں کہ جو امر معروف اور نہی منکر کریں۔ تم خدا[44] کی مغفرت کی طرف دوڑو اور اگر تم میں سے کسی کی بیوی[45] فوت ہو جائے تو وہ اُس کی جائیداد میں سے نصف کا مالک ہے بشرطیکہ اُس کی کچھ اولاد نہ ہو اور اگر اولاد ہو تو پھر اُس کو چہارم حصہ جائیداد بعد عمل بر وصیت پہنچے گا۔

یہ چند احکام بطور نمونہ ہم نے لکھے ہیں۔ اِن میں ایک تھوڑی سی عقل کا آدمی بھی سوچ سکتا ہے کہ بظاہر یہ تمام خطاب صحابہ کی طرف ہے لیکن درحقیقت تمام مسلمان ان احکام پر عمل کرنے کے لئے مامور ہیں نہ یہ کہ صرف صحابہ مامور ہیں و بس۔ غرض قرآن کا اصلی اور حقیقی اسلوب جس سے سارا قرآن بھرا پڑا ہے یہ ہے کہ اس کے خطاب کے مورد حقیقی اور واقعی طور پر تمام وہ مسلمان ہیں جو قیامت تک پیدا ہوتے رہیں گے گو بظاہر صورت خطاب صحابہؓ کی طرف راجع معلوم ہوتا ہے۔ پس جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ یہ وعدہ یا وعید صحابہ تک ہی محدود ہے وہ قرآن کے عام محاورہ سے عدول کرتا ہے اور جب تک پورا ثبوت اس دعویٰ کا پیش نہ کرے تب تک وہ ایسے

طریق کے اختیار کرنے میں ایک ملحد ہے۔ کیا قرآن صرف صحابہ کے واسطے ہی نازل ہؤا تھا۔ اگر قرآن کے وعدہ اور وعید اور تمام احکام صحابہ تک ہی محدود ہیں تو گویا جو بعد میں پیدا ہوئے وہ قرآن سے بکلی بے تعلق ہیں۔ نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ھٰذِہِ الْخُرَافَاتِ۔

اور یہ کہنا کہ حدیث میں آیا ہے کہ خلافت تیس سال تک ہوگی عجیب فہم ہے جس حالت میں قرآن کریم بیان فرماتا ہے کہ ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَ ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ تو پھر اس کے مقابل پر کوئی حدیث پیش کرنا اور اس کے معنی مخالفِ قرآن قرار دینا معلوم نہیں کہ کس قسم کی سمجھ ہے۔ اگر حدیث کے بیان پر اعتبار ہے تو پہلے ان حدیثوں پر عمل کرنا چاہیئے جو صحت اور وثوق میں اس حدیث پر کئی درجہ بڑھی ہوئی ہیں مثلاً صحیح بخاری کی وہ حدیثیں جن میں آخری زمانہ میں بعض خلیفوں کی نسبت خبر دی گئی ہے خاص کر وہ خلیفہ جس کی نسبت بخاری میں لکھا ہے کہ آسمان سے اس کے لئے آواز آئے گی کہ ھٰذَا خَلِیْفَۃُ اللّٰہِ الْمَھْدِیُّ اب سوچو کہ یہ حدیث کس پایہ اور مرتبہ کی ہے جو ایسی کتاب میں درج ہے جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے لیکن وہ حدیث جو معترض صاحب نے پیش کی ہے علماء کو اس میں کئی طرح کا جرح ہے اور اس کی صحت میں کلام ہے۔ کیا معترض نے غور نہیں کی جو آخری زمانہ کی نسبت بعض خلیفوں کے ظہور کی خبریں دی گئی ہیں کہ حارث آئے گا۔ مہدی آئے گا۔ آسمانی خلیفہ آئے گا۔ یہ خبریں حدیثوں میں ہیں یا کسی اور کتاب میں۔ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ زمانے تین ہیں۔ اوّل خلافتِ راشدہ کا زمانہ۔ پھر فیج اعوج جس میں ملک عضوض ہوں گے اور بعد اس کے آخری زمانہ جو زمانہ نبوت کے نہج پر ہوگا یہاں تک کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمّت کا اوّل زمانہ اور پھر آخری زمانہ باہم بہت ہی متشابہ ہیں اور یہ دونوں زمانے اس بارش کی طرح ہیں جو ایسی خیر و برکت سے بھری ہوئی ہو کہ کچھ معلوم نہیں کہ برکت اس کے پہلے حصّہ میں زیادہ ہے یا پچھلے میں۔

اِس جگہ یہ بھی واضح رہے کہ اللہ جلّ شانہٗ قرآن کریم میں فرماتا ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ یعنی ہم نے ہی اِس کتاب کو اُتارا اور ہم ہی اِس تنزیل کی محافظت کریں گے۔ اِس میں اِس بات کی تصریح ہے کہ یہ کلام ہمیشہ زندہ رہے گا اور اس کی تعلیم کو تازہ رکھنے والے اور اس کا نفع لوگوں کو پہنچانے والے ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے۔ اور اگر یہ سوال ہو کہ قرآن کے وجود کا فائدہ کیا ہے جس فائدہ کے وجود پر اس کی حقیقی حفاظت موقوف ہے۔ تو اس دوسری آیت سے ظاہر ہے ھُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَ یُزَکِّیْھِمْ وَ یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَ الْحِکْمَۃَ۔ اِس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن کے بڑے فائدے وہ ہیں جن کے پہنچانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

تشریف لائے تھے۔

ایک حکمتِ فرقان یعنی معارف و دقائق قرآن۔ دوسری تاثیرِ قرآن جو موجب تزکیۂ نفوس ہے اور قرآن کی حفاظت صرف اسی قدر نہیں جو اس کے صحفِ مکتوبہ کو خوب نگہبانی سے رکھیں کیونکہ ایسے کام تو اوائل حال میں یہود اور نصاریٰ نے بھی کئے یہاں تک کہ توریت کے نقطے بھی گن رکھے تھے بلکہ اِس جگہ حفاظتِ ظاہری سے حفاظتِ فوائد و تاثیراتِ قرآنی مراد ہے اور وہ موافق سُنّت اللہ کے تبھی ہو سکتی ہے کہ جب وقتاً فوقتاً نائب رسول آویں جن میں ظلّی طور پر رسالت کی تمام نعمتیں موجود ہوں اور جن کو وہ تمام برکات دی گئی ہوں جو نبیوں کو دی جاتی ہوں جیسا کہ ان آیات میں اسی امرِ عظیم کی طرف اشارہ ہے اور وہ یہ ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَ لَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔

پس یہ آیت درحقیقت اِس دوسری آیت اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ کیلئے بطور تفسیر کے واقعہ ہے اور اِس سوال کا جواب دے رہی ہے کہ حفاظتِ قرآن کیونکر اور کس طور پر ہوگی سو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اس نبی کریم کے خلیفے وقتاً فوقتاً بھیجتا رہوں گا اور خلیفہ کے لفظ کو اشارہ کیلئے اختیار کیا گیا کہ وہ نبی کے جانشین ہوں گے اور اس کی برکتوں میں سے حصّہ پائیں گے جیسا کہ پہلے زمانوں میں ہوتا رہا اور اُن کے ہاتھ سے برجائی دین کی ہوگی اور خوف کے بعد امن پیدا ہوگا یعنی ایسے وقتوں میں آئیں گے کہ جب اِسلام تفرقہ میں پڑا ہوگا۔ پھر ان کے آنے کے بعد جو اُن سے سرکش رہے گا وہی لوگ بدکار اور فاسق ہیں۔ یہ اِس بات کا جواب ہے کہ بعض جاہل کہا کرتے ہیں کہ کیا ہم پر اولیاء کا ماننا فرض ہے۔ سو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بیشک فرض ہے اور اُن سے مخالفت کرنے والے فاسق ہیں اگر مخالفت پر ہی مریں۔

اِس جگہ معترض صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ اور پھر اعتراض کیا ہے کہ جبکہ دین کمال کو پہنچ چکا ہے اور نعمت پوری ہو چکی تو پھر نہ کسی مجدد کی ضرورت ہے نہ کسی نبی کی مگر افسوس کہ معترض نے ایسا خیال کر کے خود قرآن کریم پر اعتراض کیا ہے کیونکہ قرآن کریم نے اِس اُمّت میں خلیفوں کے پیدا ہونے کا وعدہ کیا ہے جیسا کہ ابھی گذر چکا ہے اور فرمایا ہے کہ اُن کے وقتوں میں دین اِستحکام پکڑے گا اور تزلزل اور تذبذب دُور ہوگا اور خوف کے بعد امن پیدا ہوگا۔ پھر اگر تکمیلِ دین کے بعد کوئی بھی کارروائی درست نہیں تو بقول معترض کے جو تیس

سال کی خلافت ہے وہ بھی باطل ٹھہرتی ہے کیونکہ جب دین کامل ہوچکا تو پھر کسی دوسرے کی ضرورت نہیں لیکن افسوس کہ معترض بے خبر نے ناحق آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کو پیش کر دیا۔ ہم کب کہتے ہیں کہ مجدّد اور محدّث دُنیا میں آکر دین میں سے کچھ کم کرتے ہیں یا زیادہ کرتے ہیں بلکہ ہمارا تو یہ قول ہے کہ ایک زمانہ گذرنے کے بعد جب پاک تعلیم پر خیالاتِ فاسدہ کا ایک غبار پڑ جاتا ہے اور حقِ خالص کا چہرہ چھپ جاتا ہے تب اُس خوبصورت چہرہ کو دکھلانے کے لئے مجدّد اور محدّث اور رُوحانی خلیفے آتے ہیں۔ نہ معلوم کہ بیچارہ معترض نے کہاں سے اور کس سے سُن لیا کہ مجدّد اور رُوحانی خلیفے دُنیا میں آکر دین کی کچھ ترمیم و تنسیخ کرتے ہیں۔ نہیں وہ دین کو منسوخ کرنے نہیں آتے بلکہ دین کی چمک اور روشنی دکھانے کو آتے ہیں اور معترض کا یہ خیال کہ اُن کی ضرورت ہی کیا ہے صرف اِس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ معترض کو اپنے دین کی پرواہ نہیں اور کبھی اس نے غور نہیں کی کہ اسلام کیا چیز ہے اور اسلام کی ترقی کس کو کہتے ہیں اور حقیقی ترقی کیونکر اور کن راہوں سے ہوسکتی ہے اور کس حالت میں کسی کو کہا جاتا ہے کہ وہ حقیقی طور پر مسلمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معترض صاحب اِس بات کو کافی سمجھتے ہیں کہ قرآن موجود ہے اور علماء موجود ہیں اور خود بخود اکثر لوگوں کے دلوں کو اسلام کی طرف حرکت ہے پھر کسی مجدّد کی کیا ضرورت ہے لیکن افسوس کہ معترض کو یہ سمجھ نہیں کہ مجدّدوں اور رُوحانی خلیفوں کی اس اُمّت میں ایسے ہی طور سے ضرورت ہے جیسا کہ قدیم سے انبیاء کی ضرورت پیش آتی رہی ہے۔ اِس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نبی مرسل تھے اور ان کی توریت بنی اسرائیل کی تعلیم کے لئے کامل تھی اور جس طرح قرآن کریم میں یہ آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ ہے اسی طرح توریت میں بھی آیات ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو ایک کامل اور جلالی کتاب دی گئی ہے جس کا نام توریت ہے چنانچہ قرآن کریم میں بھی توریت کی یہی تعریف ہے لیکن باوجود اس کے بعد توریت کے صدہا ایسے نبی بنی اسرائیل میں سے آئے کہ کوئی نئی کتاب اُن کے ساتھ نہیں تھی بلکہ ان انبیاء کے ظہور کے مطالب یہ ہوتے تھے کہ تا اُن کے موجودہ زمانہ میں جو لوگ تعلیمِ توریت سے دُور پڑ گئے ہوں پھر اُن کو توریت کے اصلی منشاء کی طرف کھینچیں اور جن کے دِلوں میں کچھ شکوک اور دہریّت اور بے ایمانی ہوگئی ہو اُن کو پھر زندہ ایمان بخشیں۔ چنانچہ اللہ جلّ شانہٗ خود قرآن کریم میں فرماتا ہے وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ وَقَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِہٖ بِالرُّسُلِ یعنی موسیٰ کو ہم نے توریت دی اور پھر اس کتاب کے بعد ہم نے کئی پیغمبر بھیجے تا توریت کی تائید اور تصدیق کریں۔ اِسی طرح دوسری جگہ فرماتا ہے ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا یعنی پھر پیچھے سے ہم نے اپنے رسول پے درپے بھیجے۔ پس ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ عادت اللہ یہی ہے کہ وہ اپنی کتاب بھیج کر پھر اُس کی تائید اور تصدیق کے لئے ضرور انبیاء بھیجا کرتا ہے چنانچہ توریت کی تائید

کے لئے ایک ایک وقت میں چار چار سَو نبی بھی آیا جن کے آنے پر اب تک بائیبل شہادت دے رہی ہے۔

اس کثرت ارسال رسل میں بھید یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ عہد مؤکد ہو چکا ہے کہ جو اُس کی سچی کتاب کا انکار کرے تو اُس کی سزا دائمی جہنّم ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ یعنی جو لوگ کافر ہوئے اور ہماری آیتوں کی تکذیب کی وہ جہنّمی ہیں اور اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔

اب جبکہ سزائے اِنکار کتابِ الٰہی ایسی سخت تھی اور دوسری طرف یہ مسئلہ نبوت اور وحیٔ الٰہی کا نہایت دقیق تھا بلکہ خود خدا تعالیٰ کا وجود بھی ایسا دقیق در دقیق تھا کہ جب تک انسان کی آنکھ خداداد نور سے منوّر نہ ہو ہرگز ممکن نہ تھا کہ سچی اور پاک معرفت اس کی حاصل ہو سکے چہ جائیکہ اس کے رسولوں کی معرفت اور اس کی کتاب کی معرفت حاصل ہو۔ اِس لئے رحمانیتِ الٰہی نے تقاضا کیا کہ اندھی اور نابینا مخلوق کی بہت ہی مدد کی جائے اور صرف اسی پر اکتفا نہ کیا جائے کہ ایک مرتبہ رسول اور کتاب بھیج کر پھر باوجود امتداد ازمنہ طویلہ کے ان عقائد کے انکار کی وجہ سے جن کو بعد میں آنے والے زیادہ اس سے سمجھ نہیں سکتے کہ وہ ایک پاک اور عمدہ منقولات ہیں ہمیشہ کی جہنّم میں منکروں کو ڈال دیا جائے اور درحقیقت سوچنے والے کیلئے یہ بات نہایت صاف اور روشن ہے کہ وہ خدا جس کا نام رحمٰن اور رحیم ہے اِتنی بڑی سزا دینے کے لئے کیونکر یہ قانون اختیار کر سکتا ہے کہ بغیر پورے طور پر اتمامِ حجت کے مختلف بلاد کے ایسے لوگوں کو جنہوں نے صدہا برسوں کے بعد قرآن اور رسول کا نام سُنا اور پھر وہ عربی سمجھ نہیں سکتے، قرآن کی خوبیوں کو دیکھ نہیں سکتے دائمی جہنّم میں ڈال دے اور کس انسان کی کانشنس اِس بات کو قبول کر سکتی ہے کہ بغیر اس کے کہ قرآن کریم کا منجانب اللہ ہونا اس پر ثابت کیا جائے یونہی اس پر چھری پھیر دی جائے۔ پس یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے دائمی خلیفوں کا وعدہ دیا تا وہ ظلّی طور پر انوارِ نبوت پا کر دُنیا کو ملزم کریں اور قرآن کریم کی خوبیاں اور اس کی برکات لوگوں کو دکھلاویں۔ یہ بھی یاد رہے کہ ہر ایک زمانہ کے لئے اتمامِ حجت بھی مختلف رنگوں سے ہُوا کرتا ہے اور مجدّدِ وقت اُن قوتوں اور ملکوں اور کمالات کے ساتھ آتا ہے جو موجودہ مفاسد کا اِصلاح پانا ان کمالات پر موقوف ہوتا ہے سو ہمیشہ خدا تعالیٰ اسی طرح کرتا رہے گا جب تک کہ اس کو منظور ہے کہ آثار رُشد اور اِصلاح کے دُنیا میں باقی رہیں اور یہ باتیں بے ثبوت نہیں بلکہ نظائرِ متواترہ اسکے شاہد ہیں اور مختلف بلاد کے نبیوں اور مُرسلوں اور محدّثوں کو چھوڑ کر اگر صرف بنی اسرائیل کے نبیوں اور مرسلوں اور محدّثوں پر ہی نظر ڈالی جائے تو ان کی کتابوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چودہ سَو برس کے عرصہ میں یعنی حضرت موسیٰؑ سے حضرت مسیحؑ تک ہزارہا نبی اور محدّث اُن میں پیدا ہوئے جو خادموں کی طرح کمربستہ ہو کر

توریت کی خدمت میں مصروف رہے چنانچہ اُن تمام بیانات پر قرآن شاہد ہے اور بائیبل شہادت دے رہی ہے اور وہ نبی کوئی نئی کتاب نہیں لاتے تھے کوئی نیا دین نہیں سکھاتے تھے صرف توریت کے خادم تھے اور جب بنی اسرائیل میں دہریت اور بے ایمانی اور بدچلنی اور سنگدلی پھیل جاتی تھی تو ایسے وقتوں میں وہ ظہور کرتے تھے۔ اب کوئی سوچنے والا سوچے کہ جس حالت میں موسیٰ کی ایک محدود شریعت کے لئے جو زمین کی تمام قوموں کے لئے نہیں تھی اور نہ قیامت تک اُس کا دامن پھیلا ہوا تھا خدا تعالیٰ نے یہ احتیاطیں کیں کہ ہزار ہا نبی اس شریعت کی تجدید کے لئے بھیجے اور بار ہا آنے والے نبیوں نے ایسے نشان دکھلائے کہ گویا بنی اسرائیل نے نئے سرے خدا کو دیکھ لیا تو پھر یہ اُمّت جو خیر الاُمم کہلاتی ہے اور خیر الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن سے لٹک رہی ہے کیونکر ایسی بدقسمت سمجھی جائے کہ خدا تعالیٰ نے صرف تیس برس اس کی طرف نظرِ رحمت کر کے اور آسمانی انوار دکھلا کر پھر اُس سے مُنہ پھیر لیا اور پھر اس اُمّت پر اپنے نبی کریمؐ کی مفارقت میں صدہا برس گذرے اور ہزار ہا طور کے فتنے پڑے اور بڑے بڑے زلزلے آئے اور انواع و اقسام کی دجالیت پھیلی اور ایک جہان نے دینِ متین پر حملے کئے اور تمام برکات اور معجزات سے انکار کیا گیا اور مقبول کو نامقبول ٹھہرایا گیا لیکن خدا تعالیٰ نے پھر کبھی نظر اُٹھا کر اس اُمّت کی طرف نہ دیکھا اور اس کو کبھی اس اُمّت پر رحم نہ آیا اور کبھی اس کو خیال نہ آیا کہ یہ لوگ بھی تو بنی اسرائیل کی طرح انسان ضعیف البنیان ہیں اور یہودیوں کی طرح ان کے پودے بھی آسمانی آبپاشی کے ہمیشہ محتاج ہیں۔ کیا اُس کریم خدا سے ایسا ہو سکتا ہے جس نے اُس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمیشہ کے مفاسد کے دُور کرنے کے لئے بھیجا تھا کیا ہم یہ گمان کر سکتے ہیں کہ پہلی اُمّتوں پر تو خدا تعالیٰ کا رحم تھا اِس لئے اس نے توریت کو بھیج کر پھر ہزار ہا رسول اور محدّث توریت کی تائید کے لئے اور دلوں کو بار بار زندہ کرنے کے لئے بھیجے لیکن یہ اُمّت موردِ غضب تھی اِسی لئے اُس نے قرآن کریم کو نازل کر کے ان سب باتوں کو بُھلا دیا اور ہمیشہ کے لئے علماء کو ان کی عقل اور اجتہاد پر چھوڑ دیا اور حضرت موسیٰ کی نسبت تو صاف فرمایا گیا وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا یعنی خدا موسیٰ سے ہمکلام ہُوا اور اس کی تائید اور تصدیق کے لئے رسول بھیجے جو مبشّر اور منذر تھے تاکہ لوگوں کی کوئی حُجّت باقی نہ رہے اور نبیوں کا مسلسل گروہ دیکھ کر توریت پر دلی صدق سے ایمان لاویں اور فرمایا وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ یعنی ہم نے بہت سے رسول بھیجے اور بعض کا تو ہم نے ذکر کیا اور بعض کا ذکر بھی نہیں کیا لیکن دینِ اسلام کے طالبوں کے لئے وہ انتظام نہ کیا۔ گویا جو رحمت اور عنایتِ باری حضرت موسیٰ کی قوم پر تھی وہ اس اُمّت پر

نہیں ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہمیشہ امتدادِ زمانہ کے بعد پہلے معجزات اور کرامات قصہ کے رنگ میں ہو جاتے ہیں اور پھر آنے والی نسلیں اپنے گروہ کو ہر یک امر خارق عادت سے بے بہرہ دیکھ کر آخر گذشتہ معجزات کی نسبت شک پیدا کرتی ہیں پھر جس حالت میں بنی اسرائیل کے ہزارہا انبیاء کا نمونہ آنکھوں کے سامنے ہے تو اس سے اَور بھی بے دلی اس اُمّت کو پیدا ہوگی اور اپنے تئیں بدقسمت پاکر بنی اسرائیل کو رشک کی نگہ سے دیکھیں گے یا بدخیالات میں گرفتار ہو کر اُن کے قِصّوں کو بھی صرف افسانجات خیال کریں گے اور یہ قول کہ پہلے اِس سے ہزارہا انبیاء ہو چکے اور معجزات بھی بکثرت ہوئے اِس لئے اس اُمّت کو خوارق اور کرامات اور برکات کی کچھ ضرورت نہیں تھی لہٰذا خدا تعالیٰ نے ان کو سب باتوں سے محروم رکھا۔ یہ صرف کہنے کی باتیں ہیں جنہیں وہ لوگ مُنہ پر لاتے ہیں جن کو ایمان کی کچھ بھی پرواہ نہیں ورنہ انسان نہایت ضعیف اور ہمیشہ تقویتِ ایمان کا محتاج ہے اور اس راہ میں اپنے خود ساختہ دلائل کبھی کام نہیں آسکتے جب تک تازہ طور پر معلوم نہ ہو کہ خدا موجود ہے ہاں جھُوٹا ایمان جو بدکاریوں کو روک نہیں سکتا نقلی اور عقلی طور پر قائم رہ سکتا ہے۔ اور اِس جگہ یہ بھی یاد رہے کہ دین کی تکمیل اِس بات کو مستلزم نہیں جو اس کی مناسب حفاظت سے بکلّی دستبردار ہو جائے مثلاً اگر کوئی گھر بناوے اور اس کے تمام کمرے سلیقہ سے تیار کرے اور اس کی تمام ضرورتیں جو عمارت کے متعلق ہیں باحسن وجہ پوری کر دیوے اور پھر مدّت کے بعد اندھیریاں چلیں اور بارشیں ہوں اور اس گھر کے نقش ونگار پر گرد و غبار بیٹھ جاوے اور اس کی خوبصورتی چھُپ جاوے اور پھر اس کا کوئی وارث اُس گھر کو صاف اور سفید کرنا چاہے مگر اس کو منع کر دیا جاوے کہ گھر تو مکمل ہو چکا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ منع کرنا سراسر حماقت ہے۔ افسوس کہ ایسے اعتراضات کرنے والے نہیں سوچتے کہ تکمیلِ شئے دیگر ہے اور وقتاً فوقتاً ایک مکمل عمارت کی صفائی کرنا یہ اَور بات ہے۔ یہ یاد رہے کہ مجدّد لوگ دین میں کچھ کمی بیشی نہیں کرتے ہاں گمشدہ دین کو پھر دلوں میں قائم کرتے ہیں اور یہ کہنا کہ مجدّدوں پر ایمان لانا کچھ فرض نہیں خدا تعالیٰ کے حکم سے اِنحراف ہے کیونکہ وہ فرماتا ہے وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ یعنی بعد اس کے جو خلیفے بھیجے جائیں پھر جو شخص ان کا منکر رہے وہ فاسقوں میں سے ہے۔

اب خلاصہ اس تمام تقریر کا کسی قدر اختصار کے ساتھ ہم ذیل میں لکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ دلائلِ مندرجہ ذیل سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بات نہایت ضروری ہے کہ بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس اُمّت میں فساد اور فتنوں کے وقتوں میں ایسے مصلح آتے رہیں جن کو انبیاء کے کئی کاموں میں سے یہ ایک کام سپرد ہو کہ وہ دینِ حق کی طرف دعوت کریں اور ہر یک بدعت جو دین سے مل گئی ہو اس کو دُور کریں اور آسمانی روشنی پاکر دین کی صداقت ہر یک پہلو سے لوگوں کو دکھلادیں اور اپنے پاک نمونہ سے لوگوں کو سچائی اور محبت اور

پاکیزگی کی طرف کھینچیں۔ (شہادت القرآن صفحہ ۲۸ تا صفحہ ۴۹)

خدا تعالیٰ نے تمہارے لئے اے مومنانِ اُمّتِ محمدیہ وعدہ کیا ہے کہ تمہیں بھی وہ زمین میں خلیفہ کرے گا جیسا کہ تم سے پہلوں کو کیا۔۔۔

اِن آیات کو اگر کوئی شخص تأمل اور غور کی نظر سے دیکھے تو مَیں کیونکر کہوں کہ وہ اِس بات کو سمجھ نہ جائے کہ خدا تعالیٰ اِس اُمّت کے لئے خلافتِ دائمی کا صاف وعدہ فرماتا ہے۔ اگر خلافت دائمی نہیں تھی تو شریعتِ موسوی کے خلیفوں سے تشبیہہ دینا کیا معنی رکھتا تھا اور اگر خلافتِ راشدہ صرف تیس برس تک رہ کر پھر ہمیشہ کے لئے اُس کا دَور ختم ہو گیا تھا تو اس سے لازم آتا ہے کہ خدا تعالیٰ کا ہرگز یہ ارادہ نہ تھا کہ اس امّت پر ہمیشہ کے لئے ابوابِ سعادت مفتوح رکھے کیونکہ رُوحانی سلسلہ کی موت سے دین کی موت لازم آتی ہے اور ایسا مذہب ہرگز زندہ نہیں کہلا سکتا جس کے قبول کرنے والے خود اپنی زبان سے ہی یہ اقرار کریں کہ تیرہ سو برس سے یہ مذہب مرا ہوا ہے اور خدا تعالیٰ نے اِس مذہب کے لئے ہرگز ارادہ نہیں کیا کہ حقیقی زندگی کا وہ نور جو نبی کریمؐ کے سینہ میں تھا وہ توارث کے طور پر دوسروں میں چلا آوے۔

افسوس کہ ایسے خیال پر جمنے والے خلیفہ کے لفظ کو بھی جو استخلاف سے مفہوم ہوتا ہے تدبّر سے نہیں سوچتے کیونکہ خلیفہ جانشین کو کہتے ہیں اور رسول کا جانشین حقیقی معنوں کے لحاظ سے وہی ہو سکتا ہے جو ظلّی طور پر رسول کے کمالات اپنے اندر رکھتا ہو اِس واسطے رسول کریمؐ نے نہ چاہا کہ ظالم بادشاہوں پر خلیفہ کا لفظ اطلاق ہو کیونکہ خلیفہ درحقیقت رسول کا ظلّ ہوتا ہے اور چونکہ کسی انسان کے لئے دائمی طور پر بقا نہیں لہٰذا خدا تعالیٰ نے ارادہ کیا کہ رسولوں کے وجود کو جو تمام دُنیا کے وجودوں سے اشرف و اولیٰ ہیں ظلّی طور پر ہمیشہ کے لئے تا قیامت قائم رکھے۔ سو اِسی غرض سے خدا تعالیٰ نے خلافت کو تجویز کیا تا دُنیا کبھی اور کسی زمانہ میں برکاتِ رسالت سے محروم نہ رہے۔ پس جو شخص خلافت کو صرف تیس برس تک مانتا ہے وہ اپنی نادانی سے خلافت کی علّتِ غائی کو نظرانداز کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ خدا تعالیٰ کا یہ ارادہ تو ہرگز نہیں تھا کہ رسول کریمؐ کی وفات کے بعد صرف تیس برس تک رسالت کی برکتوں کو خلیفوں کے لباس میں قائم رکھنا ضروری ہے پھر بعد اس کے دُنیا تباہ ہو جائے تو ہو جائے کچھ پرواہ نہیں بلکہ پہلے دنوں میں تو خلیفوں کا ہونا بجز شوکتِ اِسلام پھیلانے کے کچھ اَور زیادہ ضرورت نہیں رکھتا تھا کیونکہ انوارِ رسالت اور کمالاتِ نبوّت تازہ بتازہ پھیل رہے تھے اور ہزارہا معجزات بارش کی طرح ابھی نازل ہو چکے تھے اور اگر خدا تعالیٰ چاہتا تو اس کی سُنّت اور قانون سے یہ بھی بعید نہ تھا کہ بجائے ان چار خلیفوں کے اُس تیس برس کے عرصہ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کو ہی بڑھا دیتا۔ اِس حساب سے تیس برس کے ختم ہونے تک آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کُل ۹۳ برس کی عمر تک پہنچتے اور یہ اندازہ اس زمانہ کی مقرر عمروں سے نہ کچھ زیادہ اور نہ اُس قانونِ قدرت سے کچھ بڑھ کر ہے جو انسانی عمروں کے بارے میں ہماری نظر کے سامنے ہے۔

پس یہ حقیر خیال خدا تعالیٰ کی نسبت تجویز کرنا کہ اُس کو صرف اِس اُمّت کے تیس برس کا ہی فکر تھا اور پھر اُس کو ہمیشہ کے لئے ضلالت میں چھوڑ دیا اور وہ نور جو قدیم سے انبیاءِ سابقین کی اُمّت میں خلافت کے آئینہ میں وہ دکھلاتا رہا اِس اُمّت کے لئے دکھلانا اس کو منظور نہ ہوا کیا عقلِ سلیم خدائے رحیم وکریم کی نسبت ان باتوں کو تجویز کرے گی۔ ہرگز نہیں۔ اور پھر یہ آیت خلافتِ آئمہ پر گواہ ناطق ہے وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّکْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُهَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ کیونکہ یہ آیت صاف صاف پکار رہی ہے کہ اِسلامی خلافت دائمی ہے اِس لئے کہ یَرِثُهَا کا لفظ دوام کو چاہتا ہے وجہ یہ کہ اگر آخری نوبت فاسقوں کی ہو تو زمین کے وارث وہی قرار پائیں گے نہ صالح اور سب کا وارث وہی ہوتا ہے جو سب کے بعد ہو۔

پھر اِس پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ جس حالت میں خدا تعالیٰ نے ایک مثال کے طور پر سمجھا دیا تھا کہ مَیں اسی طور پر اس اُمّت میں خلیفے پیدا کرتا رہوں گا جیسے موسیٰ کے بعد خلیفے پیدا کئے۔ تو دیکھنا چاہیئے تھا کہ موسیٰ کی وفات کے بعد خدا تعالیٰ نے کیا معاملہ کیا۔ کیا اُس نے صرف تیس برس تک خلیفے بھیجے یا چودہ سَو برس تک اِس سلسلہ کو لمبا کیا۔ پھر جس حالت میں خدا تعالیٰ کا فضل ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہیں زیادہ تھا۔ چنانچہ اس نے خود فرمایا وَکَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا اور ایسا ہی اس اُمّت کی نسبت فرمایا کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تو پھر کیونکر ہو سکتا تھا کہ حضرت موسیٰؑ کے خلیفوں کا چودہ۱۴ سو برس تک سلسلہ ممتد ہو اور اِس جگہ صرف تیس۳۰ برس تک خلافت کا خاتمہ ہو جاوے اور نیز جبکہ یہ اُمّت خلافت کے انوارِ رُوحانی سے ہمیشہ کے لئے خالی ہے تو پھر آیت اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کے کیا معنے ہیں کوئی بیان تو کرے مثل مشہور ہے کہ او خویشتن گم است کرا رہبری کند۔ جبکہ اس اُمّت کو ہمیشہ کے لئے اندھا رکھنا ہی منظور ہے اور اس مذہب کو مُردہ رکھنا ہی مدِ نظر ہے تو پھر یہ کہنا کہ تم سب سے بہتر ہو اور لوگوں کی بھلائی اور راہنمائی کے لئے پیدا کئے گئے ہو کیا معنی رکھتا ہے۔ کیا اندھا اندھے کو راہ دکھا سکتا ہے۔ سو اَے لوگو جو مسلمان کہلاتے ہو برائے خدا سوچو کہ اس آیت کے یہی معنے ہیں کہ ہمیشہ قیامت تک تم میں رُوحانی زندگی اور باطنی بینائی رہے گی اور غیر مذہب والے تم سے روشنی حاصل کریں گے اور یہ روحانی زندگی اور باطنی بینائی جو غیر مذہب والوں کو حق کی دعوت کرنے کے لئے اپنے اندر لیاقت رکھتی ہے یہی وہ چیز ہے جس کو دوسرے لفظوں میں خلافت کہتے ہیں پھر کیونکر

کہتے ہو کہ خلافت صرف تیس برس تک ہو کر پھر زاویہ عدم میں مخفی ہو گئی۔ اِتّقوا اللہ۔ اِتّقوا اللہ۔ اِتّقوا اللہ۔ (شہادت القرآن ص۵۶-۵۹)

مماثلت تامہ کاملہ استخلاف محمدی کی استخلاف موسوی سے مسیح موعود کا آنا ضروری ٹھہراتی ہے جیسا کہ آیت مندرجہ ذیل سے مفہوم ہوتا ہے یعنی آیت وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ صاف بتلا رہی ہے کہ ایک مجدّد حضرت مسیح کے نام پر چودھویں صدی میں آنا ضروری ہے کیونکہ امر استخلاف محمدی امر استخلاف موسوی سے اسی حالت میں اکمل اور اتم مشابہت پیدا کر سکتا ہے کہ جبکہ اوّل زمانہ اور آخری زمانہ باہم نہایت درجہ کی مشابہت رکھتے ہوں اور آخری زمانہ کی مشابہت دو باتوں میں تھی ایک اُمّت کا حال ابتر ہونا اور دُنیا کے اقبال میں ضعف آجانا اور دینی دیانت اور ایمانداری اور تقویٰ میں فرق آجانا دوسرے ایسے زمانہ میں ایک مجدّد کا پیدا ہونا جو مسیح موعود کے نام پر آوے اور ایمانی حالت کو پھر بحال کرے۔ سو پہلی علامت کو ہمارے بھائی مسلمان صرف قبول ہی نہیں کرتے بلکہ مسلمانوں کا ادبار اور ایک ایسی غیر قوم کا اقبال اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جو اُن کے مذہب کو ایسا ہی حقیر اور ذلیل سمجھتی ہے جیسا کہ مجوسی یہودیوں پر غالب آکر حضرت مسیح کے زمانہ میں یہود کو حقیر اور ذلیل سمجھتے تھے اور یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ اندرونی حالت اِسلام کے علماء اور اسلام کے دُنیا داروں کی یہودیوں کے حالات سے کچھ کم نہیں ہے بلکہ خیر سے دوچند معلوم ہوتی ہے۔ (شہادت القرآن ص۶۸-۶۹)

اِنَّ دِیْنَنَا ھٰذَا الَّذِیْ اسْمُہُ الْاِسْلَامُ مَا اَرَادَ اللّٰہُ اَنْ یَّتْرُکَہٗ سُدًی وَمَا اَرَادَ اَنْ یُّبْطِلَہٗ وَ یُخْرِبَہٗ مِنْ اَیْدِی الْاَعْدَاءِ بَلْ قَالَ وَھُوَ اَصْدَقُ الصَّادِقِیْنَ: وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ ..... فَھٰذِہٖ کُلُّھَا مَوَاعِیْدُ صَادِقَۃٌ لِتَائِیْدِ الْاِسْلَامِ عِنْدَ ظُھُوْرِ الْفِتَنِ وَ

(ترجمہ از اصل) خدا نے نہیں چاہا کہ ہمارے دین اسلام کو مہمل چھوڑے اور دشمنوں کے ہاتھوں سے اِس کو باطل اور خراب کرا دے بلکہ اس نے فرمایا اور وہ بات کہنے میں سب سے بڑھ کر سچا ہے۔ کہ اللہ نے تم میں سے ان پکے مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے جو اچھے اعمال بجا لاویں گے کہ ضرور ان کو اسی طرز پر زمین میں خلیفہ بنا دے گا کہ جس طرح پہلوں کو بنایا ہے ..... پس اِسلام کی تائید کے لئے یہ سب کچھ وعدے ہیں فتنوں کے ظہور اور گناہوں کے غلبہ کے وقت اور جو فتنے

غَلَبَةِ الْمَعَاصِیْ وَالْاٰثَامِ وَاَیُّ فِتَنٍ اَکْبَرُ مِنْ هٰذِهِ الْفِتَنِ الَّتِیْ ظَهَرَتْ عَلٰی وَجْهِ الْاَرْضِ؟ وَاِنَّ النَّصَارٰی قَدْ دَخَلُوْا عَلَی النَّاسِ مِنْ بَابٍ لَطِیْفٍ وَسَحَرُوْا اَعْیُنَ النَّاسِ وَقُلُوْبَهُمْ وَاٰذَانَهُمْ بِالْمَکَائِدِ الَّتِیْ هِیَ دَقِیْقَةُ الْمَاٰخَذِ وَاَضَلُّوْا خَلْقًا کَثِیْرًا وَجَآءُوْا بِسِحْرٍ مُّبِیْنٍ۔

(حمامۃ البشریٰ مترجم صفحہ ۹۴، ۹۵)

مَیں رُوحانیّت کی رُو سے اِسلام میں خاتم الخلفاء ہوں جیساکہ مسیح ابنِ مریم اسرائیلی سِلسلہ کے لئے خاتم الخلفاء تھا۔ موسیٰ کے سِلسلہ میں ابنِ مریم مسیح موعود تھا اور محمدی سِلسلہ میں مَیں مسیح موعود ہوں۔

(کشتی نوح صفحہ ۱۶)

مسیح موعود کی پیشگوئی صرف حدیثوں میں نہیں ہے بلکہ قرآن شریف نے نہایت لطیف اشارات میں آنے والے مسیح کی خوشخبری دی ہے جیساکہ اس نے وعدہ فرمایا ہے کہ جس طرز اور طریق سے اسرائیلی نبوتوں میں سلسلۂ خلافت قائم کیا گیا ہے وہی طرز اسلام میں ہوگی۔ دیکھو آیت وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْکُمْ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ الاٰیۃ۔ یہ وعدہ مسیح موعود کے آنے کی خوشخبری اپنے اندر رکھتا ہے کیونکہ جب سلسلۂ خلافت انبیاء بنی اسرائیل میں غور کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ سِلسلہ حضرت موسیٰؑ سے شروع ہؤا اور پھر چودہ سو برس بعد حضرت عیسٰی علیہ السلام پر ختم ہوگیا۔ اور اِس نظامِ خلافت پر نظر ڈال کر معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کا مسیح موعود جس کے آنے کی یہود کو خوشخبری دی گئی تھی چودہ سو برس بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آیا اور غریبوں اور مسکینوں کی شکل میں ظاہر ہؤا اور اس مماثلت کے پُورا کرنے کے لئے جو قرآن شریف میں دونوں سلسلۂ خلافت اسرائیلی اور خلافتِ محمدی میں قائم کی گئی ہے ضروری ہے کہ ہر ایک مُنصف اِس بات کو مان لے کہ سلسلۂ خلافتِ محمدیہ کے آخر میں بھی ایک مسیح موعود کا وعدہ ہو جیساکہ سلسلۂ خلافتِ موسویہ کے آخر میں ایک مسیح موعود کا وعدہ تھا اور نیز تکمیل مشابہت دونوں سلسلوں کے لئے یہ بھی لازم آتا ہے کہ جیساکہ خلافتِ موسویہ کے چودہ سو برس کی مدّت پر مسیح موعود بنی اسرائیل کے لئے ظاہر ہؤا تھا ایسا ہی اور اسی مدّت کے مشابہ زمانہ میں خلافتِ محمدیہ کا

کہ اس وقت رُوئے زمین پر ظاہر ہو رہے ہیں اُن سے کونسا بڑا فتنہ ہے اور نصاریٰ لطیف دروازہ سے لوگوں پر داخل ہوئے ہیں اور اپنے باریک در باریک فریبوں سے لوگوں کی آنکھوں اور کانوں اور دِلوں کو سحر زدہ کر دیا ہے اور بہت سی مخلوق کو گمراہ کر دیا ہے اور کُھلے سحر کا کام کیا ہے۔

(حمامۃ البشریٰ مترجم صفحہ ۹۴، ۹۵)

مسیح موعود ظاہر ہو اور نیز تکمیل مشابہت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جیسا کہ یہودیوں کے علماء نے خلافتِ موسویہ کے مسیح موعود کو نعوذ باللہ کافر اور ملحد اور دجال قرار دیا تھا ایسا ہی خلافتِ محمدیہ کے مسیح موعود کو اسلامی قوم کے علماء کافر اور ملحد اور دجال قرار دیں اور نیز تکمیل مشابہت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ جیسا کہ خلافتِ موسویہ کا مسیح موعود ایسے وقت میں آیا تھا کہ جبکہ یہودیوں کی اخلاقی حالت نہایت ہی خراب ہو گئی تھی اور دیانت اور امانت اور تقویٰ اور طہارت اور باہمی محبت اور صلحکاری میں بہت فتور پڑ گیا تھا اور اُن کی اس ملک میں بھی سلطنت جاتی رہی تھی جس ملک میں مسیح موعود اُن کی دعوت کے لئے ظاہر ہوا تھا۔ ایسا ہی خلافتِ محمدیہ کا مسیح موعود قوم کی ایسی حالت اور ایسے ادبار کے وقت میں ظاہر ہو۔"

(ایام الصلح صفحہ ۵۱، ۵۲)

ثُمَّ بَعْدَ ذَالِكَ اعْلَمُوْا يَا أُولِي النُّهٰى۔ أَنَّ اللّٰهَ ذَكَرَ فِي الْقُرْاٰنِ أَنَّهٗ بَعَثَ مُوْسٰى بَعْدَ مَا أَهْلَكَ الْقُرُوْنَ الْأُوْلٰى۔ وَاٰتَاهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَوَهَبَ لِقَوْمِهٖ الْخِلَافَةَ۔ وَأَقَامَ فِيْهِمْ سِلْسِلَةَ الْهُدٰى۔ وَجَعَلَ خَاتَمَ خُلَفَائِهٖ رَسُوْلَهُ ابْنَ مَرْيَمَ عِيْسٰى۔ فَكَانَ عِيْسٰى اٰخِرُ لَبِنٍ هٰذِهِ الْعِمَارَةِ وَعِلْمًا لِسَاعَةِ زَوَالِهَا وَعِبْرَةً لِمَنْ يَّخْشٰى۔ ثُمَّ بَعَثَ اللّٰهُ نَبِيَّنَا الْأُمِّيَّ فِيْ أَرْضِ أُمِّ الْقُرٰى۔ وَجَعَلَهٗ مَثِيْلَ مُوْسٰى۔ وَجَعَلَ سِلْسِلَةَ خُلَفَائِهٖ كَمِثْلِ سِلْسِلَةِ خُلَفَاءِ الْكَلِيْمِ لِتَكُوْنَ رِدْءًا لَّهَا وَإِنَّ فِيْ هٰذَا لَاٰيَةً لِّمَنْ يَّرٰى۔ وَإِنْ شِئْتَ فَاقْرَءْ اٰيَةَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَإِنَّ فِيْهَا وَعْدَ الْاِسْتِخْلَافِ لِهٰذِهِ الْأُمَّةِ كَمِثْلِ الَّذِيْنَ اسْتُخْلِفُوْا

ترجمہ از اصل:- بعد اس کے تمہیں معلوم ہو اے دانشمندو کہ خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں یہ ذکر کیا کہ اس نے پہلی امتوں کے ہلاک کر دینے کے بعد موسیٰ کو پیدا کیا اور اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا کی اور اس کی قوم کو خلافت بخشی اور ان میں سلسلہ ہدایت کا قائم کیا اور اس سلسلہ کا خاتم الخلفاء حضرت عیسیٰ کو بنایا پس حضرت عیسیٰ اس عمارت کی آخری اینٹ تھے اور ایک دلیل تھے اس عمارت کے زوال کی گھڑی پر اور ایک عبرت تھے اُس شخص کے لئے جو ڈرتا ہو پھر خدا نے ہمارے پیغمبر امی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ کی زمین میں مبعوث فرمایا اور ان کو مثیل موسیٰ علیہ السلام بنایا اور اُن کے خلیفوں کا سلسلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفوں کے سلسلہ کی طرح اور ان کے مشابہ کر دیا تا کہ یہ سلسلہ اُس سلسلہ کا مددگار ہو اور اس میں دیکھنے والوں کیلئے ایک نشان ہے اور اگر تو چاہے تو اس آیت کو پڑھ لے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ اور اپنے ہوا و ہوس کا پیرو مت بن کیونکہ اس آیت میں صاف وعدہ

مِنْ قَبْلُ وَ الْكَرِيْمُ اِذَا وَعَدَ وَفَا۔ وَ اِنَّا لَا نَعْلَمُ اَسْمَاءَ خُلَفَاءٍ سَبَقُوْنَا مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ مِنْ قَبْلُ اِلَّا قَلِيْلًا مِمَّنْ مَضٰى۔ وَ مَا قَصَّ عَلَيْنَا رَبُّنَا قِصَصَ كُلِّهِمْ وَمَا اَنْبَاَنَا بِاَسْمَائِهِمْ فَلَا نُؤْمِنُ بِهِمْ اِلَّا اِجْمَالًا وَ نُفَوِّضُ تَفْصِيْلَهُمْ اِلٰى رَبِّنَا الْاَعْلٰى۔ وَلٰكِنَّا اُلْجِئْنَا بِنَصِّ الْقُرْاٰنِ اِلٰى اَنْ نُؤْمِنَ بِخَلِيْفَةٍ مِنَّا هُوَ اٰخِرُ الْخُلَفَاءِ عَلٰى قَدَمِ عِيْسٰى۔ وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَكْفُرَ بِهٖ فَاِنَّهٗ كُفْرٌ بِكِتَابِ اللّٰهِ۔ وَلَا يُفْلِحُ الْكَافِرُ حَيْثُ اَتٰى۔ وَ فَكِّرْ فِي الْقُرْاٰنِ حَقَّ الْفِكْرِ وَلَا تَكُنْ كَالَّذِيْ اسْتَكْبَرَ وَ اَبٰى۔ وَ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّنَا فَاقْرَءْ سُوْرَةَ النُّوْرِ مُتَدَبِّرًا لِيَتَجَلّٰى عَلَيْكَ هٰذَا النُّوْرُ كَالضُّحٰى۔

(خطبہ الہامیہ صفحہ ۳۹-۴۲)

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَا وَعَدَ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى۔ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّهٗ وَعَدَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْ يَسْتَخْلِفَ مِنْهُمْ كَمَا اسْتَخْلَفَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰى فَقَدْ اَقَرُّوْا بِتَشَابُهِ السِّلْسِلَتَيْنِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَ كَبَصِيْرٍ تَعَامٰى۔ وَلَمَّا كَانَ نَبِيُّنَا مَثِيْلَ مُوْسٰى وَكَانَ سِلْسِلَةُ خُلَفَاءِهٖ

اس اُمّت کے لئے ایسے خلیفوں کا ہے جو ان خلیفوں کی طرح ہوں جو بنی اسرائیل میں گذر چکے ہیں اور کریم جب وعدہ کرتا ہے تو اُسے پُورا کرتا ہے اور ہم ان تمام خلیفوں کے نام نہیں جانتے جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں مگر اس اُمّت کے اور اگلی اُمّتوں کے چند گزرے ہوئے آدمی۔ اور خدا نے ان سب کے نام سے بھی ہم کو اطلاع نہیں دی۔ پس ہم ان پر اجمالی طور پر ایمان لاتے ہیں اور ان کے ناموں کی تفصیل کو اپنے خدا کو سونپتے ہیں مگر ہم قرآن کی نص کے رُو سے اِس بات پر مجبور ہو گئے ہیں کہ اِس بات پر ایمان لائیں کہ آخری خلیفہ اسی اُمّت میں سے ہوگا اور وہ عیسٰی کے قدم پر آئے گا اور کسی مومن کی مجال نہیں کہ اس کا انکار کرے کیونکہ یہ قرآن کا انکار ہے اور جو کوئی قرآن کا منکر ہے وہ جہاں جاوے خدا کے عذاب کے نیچے ہے اور تو قرآن میں ایسا فکر کر جیسا کہ فکر کرنے کا حق ہے اور اس شخص کی طرح نہ ہو جو تکبّر کر کے سر پھیر لیتا ہے اور یہی بات خدا کی طرف سے حق ہے پس سورۃ نور کو غور سے پڑھ تا کہ تجھ پر یہ نور دِن کی طرح ظاہر ہو۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۳۹-۴۲)

ترجمہ از اصل :- اگر اُن سے پوچھا جائے کہ تمہارے خدا نے کیا وعدہ فرمایا ہے تو اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہاں خدا نے یہ وعدہ مومنوں سے ضرور کیا ہے کہ ان میں خلیفے پیدا کئے جاویں گے اُن خلیفوں کی مانند جو موسٰے علیہ السلام کی قوم میں خلیفے پیدا کئے گئے تھے۔ پس دونوں سلسلوں کی مشابہت کا اقرار کرتے ہیں پھر ایسے شخص کی طرح انکار کر بیٹھے ہیں کہ وہ سوجاکھا ہو اور اپنے آپ کو اندھا بنالے اور جس حالت میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مثیل موسٰے

مَثِیْلَ السِّلْسِلَۃِ الْمُوْسَوِیَّۃِ بِنَصٍّ اَجْلٰی۔ وَوَجَبَ اَنْ تُخْتَتَمَ السِّلْسِلَۃُ الْمُحَمَّدِیَّۃُ عَلٰی خَلِیْفَۃٍ ھُوَ مَثِیْلُ عِیْسٰی۔ کَمَا اخْتُتِمَ عَلَی ابْنِ مَرْیَمَ سِلْسِلَۃُ صَاحِبِ الْعَصَا۔ لِیُطَابِقَ ھٰذِہِ السِّلْسِلَۃُ بِسِلْسِلَۃٍ اُوْلٰی وَلِیَتِمَّ وَعْدُ مُمَاثَلَۃِ الْاِسْتِخْلَافِ کَمَا ھُوَ ظَاھِرٌ مِّنْ لَفْظِ کَمَا۔

(خطبہ الہامیہ ص ۵۰، ۵۱)

اَمَا قَالَ رَبُّکُمْ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ اِنَّ فِیْ ذَالِکَ حُجَّۃً عَلٰی مَنْ طَغٰی۔ فَاِنَّ لَفْظَ کَمَا یُوْجِبُ اَنْ یَّکُوْنَ سِلْسِلَۃُ الْخُلَفَاءِ فِیْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ کَمِثْلِ سِلْسِلَۃِ نَبِیِّ اللّٰہِ مُوْسٰی۔ اَلَّتِیْ خُتِمَتْ عَلَی ابْنِ مَرْیَمَ عِیْسٰی۔ فَاَیْنَ تَذْھَبُوْنَ مِنْ ھٰذِہِ الْاٰیٰتِ وَتُبْعِدُوْنَ مَا دَنٰی۔ وَوَاللّٰہِ لَیْسَ فِی الْقُرْاٰنِ الَّذِیْ ھُوَ اَھْلُ الْفَصْلِ وَالْقَضَاءِ اِلَّا خَبَرُ ظُھُوْرِ خَاتَمِ الْخُلَفَاءِ مِنْ اُمَّۃِ خَیْرِ الْوَرٰی۔ فَلَا تَقْفُوْا مَا لَیْسَ لَکُمْ بِہٖ عِلْمٌ وَّقَدْ اُعْطِیْتُمْ فِیْہِ مِنَ الْھُدٰی وَلَا تُخْرِجُوْا مِنْ اَفْوَاھِکُمْ کَلِمَاتٍ

ٹھہرے اور نیز سلسلہ خلفاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مثیل سلسلہ موسیٰ علیہ السلام قرار پایا جیسا کہ نص صریح اس پر دلالت کرتی ہے۔ پس واجب ہوا کہ سلسلہ محمدیہ ایک ایسے خلیفہ پر ختم ہو کہ وہ مثیل عیسیٰ علیہ السلام ہو جیسا کہ سلسلہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ہوا تا کہ یہ دونوں سلسلے باہم مطابق ہو جائیں اور تا کہ وعدہ مماثلت اُن سلسلہ کے خلیفوں کا اور اس سلسلہ کے خلیفوں کا پورا ہو جائے جیسا کہ امر مماثلت کَمَا کے لفظ سے ظاہر ہے جو آیت میں موجود ہے۔

(خطبہ الہامیہ ص ۵۰، ۵۱)

ترجمہ از اصل:- کیا تمہارے خدا نے نہیں فرمایا کہ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ اس میں ایک حجت ہے اس کے لئے کہ جو حد سے تجاوز کرتا ہے کیونکہ لفظ کَمَا جو اس آیت میں موجود ہے اس اُمت کے خلفاء کو موسیٰ علیہ السلام کے خلفاء سے مانند ہونے کو واجب کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ سلسلہ خلفائے موسیٰ علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام پر ختم ہو گیا ہے پس اس آیت سے کہاں روگردانی کرتے ہو اور نزدیک راہ کو دُور ڈالتے ہو اور خدا کی قسم قرآن شریف میں جو تمام اختلافوں کا فیصلہ کرنے والا ہے کہیں ذکر نہیں ہے کہ خاتم الخلفاء سلسلہ محمدیہ کا موسوی سلسلہ سے آئے گا۔ اس کی پیروی مت کرو کہ کوئی دلیل تمہارے پاس نہیں ہے بلکہ برخلاف اس کے تم کو دلیل دی گئی ہے اور کلماتِ متفرقہ اپنے مُنہ سے نہ نکالو کہ وہ کلمات اُس تیر کی طرح

شَتّٰی۔ اَلَّتِیْ لَیْسَتْ ھِیَ اِلَّا کَسَھْمٍ فِی الظُّلُمَاتِ یُرْمٰی۔ وَاِنَّ ھٰذَا الْوَعْدَ وَعْدٌ حَقٌّ۔
(خطبہ الہامیہ ص ۶۲، ۶۳)

وَحَثَّ اللّٰہُ لِلْمُؤْمِنِیْنَ عَلٰی ھٰذَا الدُّعَاءِ۔ ثُمَّ وَعَدَ فِیْ سُوْرَۃِ النُّوْرِ وَعْدًا اَنَّہٗ لَیَسْتَخْلِفَنَّ قَوْمًا مِّنْھُمْ کَمِثْلِ الَّذِیْنَ اسْتُخْلِفُوْا مِنْ قَبْلُ لِیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنَّ الدُّعَاءَ اُجِیْبَ لِبَعْضِھِمْ مِنَ الْحَضْرَۃِ الْعُلْیَا۔ (خطبہ الہامیہ ص ۸)

قَدْ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ کَمِثْلِ خُلَفَاءِ شِرْعَۃِ مُوْسٰی۔ فَوَجَبَ اَنْ یَّاْتِیَ اٰخِرُ الْخُلَفَاءِ عَلٰی قَدَمِ عِیْسٰی وَمِنْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ۔ (خطبہ الہامیہ ص ۸۴)

اِعْلَمْ اَنَّ الْمَسِیْحَ الْمَوْعُوْدَ فِیْ کِتَابِ اللّٰہِ لَیْسَ ھُوَ عِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ صَاحِبَ الْاِنْجِیْلِ وَخَادِمَ الشَّرِیْعَۃِ الْمُوْسَوِیَّۃِ کَمَا ظَنَّ بَعْضُ الْجُھَلَاءِ مِنَ الْفَیْجِ الْاَعْوَجِ وَالْفِئَۃِ الْخَاطِئَۃِ۔ بَلْ ھُوَ خَاتَمُ الْخُلَفَاءِ مِنْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ کَمَا کَانَ عِیْسٰی خَاتَمَ خُلَفَاءِ

ہیں جو اندھیرے میں چلایا جاوے اور یہ وعدہ جو مذکور ہوا سچا وعدہ ہے۔ (خطبہ الہامیہ ص ۶۲، ۶۳)

(ترجمہ از اصل) اس دعا[1] پر خدا نے مومنوں کو رغبت دلائی ہے اور اس کے بعد سورہ نور میں وعدہ دیا ہے کہ مسلمانوں میں سے خلیفے مقرر کرے گا اُن خلیفوں کی طرح جو ان سے پہلے ہوئے ہیں تاکہ مومنوں کو بشارت دے کہ ان کی دُعا قبول ہوئی۔ (خطبہ الہامیہ ص ۸)

(ترجمہ از اصل) خدا نے مومنوں سے وعدہ کیا تھا کہ اُن کو موسٰی کی شریعت کے خلیفوں کی مانند خلیفہ بنائے گا۔ یہاں سے واجب ہوا کہ آخری خلیفہ عیسٰی علیہ السلام کے قدم پر آئے گا اور اس اُمّت میں سے ہوگا۔ (خطبہ الہامیہ ص ۸۴)

(ترجمہ از اصل) جان لو کہ کتاب اللہ میں جس مسیح موعود کے آنے کا وعدہ دیا گیا ہے وہ صاحبِ انجیل اور خادمِ شریعتِ موسوی عیسٰی ابنِ مریم نہیں جیسا کہ فیج اعوج کے بعض جاہل لوگوں اور غلط کار فرقہ میں سے بعض نے خیال کیا ہے بلکہ وہ خاتم الخلفاء اسی اُمّت میں سے ہوگا جیسا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام خلفاء سلسلہ موسویہ کے خاتم تھے اور اس عمارت کی وہ

---

[1] اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔

السِّلْسِلَةِ الْكَلِيْمِيَّةِ۔ وَكَانَ لَهَا كَاٰخِرِ اللَّبِنَةِ وَخَاتَمَ الْمُرْسَلِيْنَ۔ وَاِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْحَقُّ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَقْرَءُوْنَ الْقُرْاٰنَ ثُمَّ يَمُرُّوْنَ مُنْكِرِيْنَ۔ وَاِنَّ الْفُرْقَانَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْمُتَنَازِعِيْنَ فِيْ هٰذِهِ الْمَسْئَلَةِ۔ فَاِنَّهٗ صَرَّحَ فِيْ سُوْرَةِ النُّوْرِ بِقَوْلِهٖ مِنْكُمْ بِاَنَّ خَاتَمَ الْاَئِمَّةِ مِنْ هٰذِهِ الْمِلَّةِ۔ (حاشیہ متعلقہ خطبہ الہامیہ صفحہ ب)

منجملہ دلائل قویّہ قطعیہ کے جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں جو مسیح موعود اسی اُمّتِ محمدیہ میں سے ہوگا قرآن شریف کی یہ آیت ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ یعنی خدا تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے جو ایماندار ہیں اور نیک کام کرتے ہیں وعدہ فرمایا ہے جو ان کو زمین میں انہی خلیفوں کی مانند جو اُن سے پہلے گذر چکے ہیں خلیفے مقرر فرمائے گا۔ اس آیت میں پہلے خلیفوں سے مراد حضرت موسیٰ کی اُمّت میں سے خلیفے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی شریعت کو قائم کرنے کے لئے پے در پے بھیجا تھا اور خاص کر کسی صدی کو ایسے خلیفوں سے جو دینِ موسوی کے مجدّد تھے خالی نہیں جانے دیا تھا اور قرآن شریف نے ایسے خلیفوں کا شمار کر کے ظاہر فرمایا ہے کہ وہ بارہ ہیں اور تیرھواں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں جو موسوی شریعت کا مسیح موعود ہے اور اس مماثلت کے لحاظ سے جو آیت ممدوحہ میں کَمَا کے لفظ سے مستنبط ہوتی ہے ضروری تھا کہ محمدی خلیفوں کو موسوی خلیفوں سے مشابہت و مماثلت ہو۔ سو اسی مشابہت کے ثابت اور متحقق کرنے کے لئے خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں بارہ موسوی خلیفوں کا ذکر فرمایا جن میں سے ہر ایک حضرت موسیٰؑ کی قوم میں سے تھا اور تیرھواں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر فرمایا جو موسیٰؑ کی قوم کا خاتم الانبیاء تھا مگر درحقیقت موسیٰؑ کی قوم میں سے نہیں تھا اور پھر خدا نے محمدی سلسلہ کے خلیفوں کو موسوی سلسلہ کے خلیفوں سے مشابہت دے کر صاف طور پر سمجھا دیا کہ اس سلسلہ کے آخر میں بھی ایک مسیح ہے اور درمیان میں بارہ خلیفے ہیں تا موسوی سلسلہ کے مقابل پر اس جگہ بھی چودہ کا عدد پورا ہو۔ ایسا ہی سلسلہ محمدی خلافت کے مسیح موعود کو چودھویں صدی

آخری اینٹ اور اس سلسلہ کے آخری مُرسل تھے اور یقیناً یہی بات سچی ہے۔ ان لوگوں کے لئے ہلاکت ہے جو قرآن تو پڑھتے ہیں پھر اس سے منکروں کی طرح اعراض کرتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے اِس مسئلہ کے بارے میں جھگڑا کرنے والوں کے درمیان فیصلہ کر دیا ہے اور مِنْكُمْ کے لفظ سے سورۃ نور میں صراحت کر دی ہے کہ خاتم الائمہ اُمّتِ محمدیہ میں سے ہی ہوگا۔ (حاشیہ متعلقہ خطبہ الہامیہ صفحہ ا ب)

کے سر پر پیدا کیا کیونکہ موسوی سلسلہ کا مسیح موعود بھی ظاہر نہیں ہوا تھا جب تک کہ سنِ موسوی کے حساب سے چودھویں صدی نے ظہور نہیں کیا تھا۔ ایسا کیا گیا تا دونوں مسیحوں کا مبدء سلسلہ سے فاصلہ باہم مشابہ ہو اور سلسلہ کے آخری خلیفہ مجدد کو چودھویں صدی کے سر پر ظاہر کرنا تکمیلِ نور کی طرف اشارہ ہے کیونکہ مسیح موعود اسلام کے قمر کا متمّم نور ہے اِس لئے اس کی تجدید چاند کی چودھویں رات سے مشابہت رکھتی ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے اِس آیت میں کہ لِیُظْہِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ۔ کیونکہ اظہارِ تام اور اتمامِ نور ایک ہی چیز ہے اور یہ قول کہ لِیُظْہِرَہٗ عَلَی الْاَدْیَانِ کُلَّ الْاِظْھَارِ مساوی اس قول سے ہے کہ لِیُتِمَّ نُوْرَہٗ کُلَّ الْاِتْمَامِ اور پھر دوسری آیت میں اس کی اور بھی تصریح ہے اور وہ یہ ہے یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ اِس آیت میں تصریح سے سمجھایا گیا ہے کہ مسیح موعود چودھویں صدی میں پیدا ہوگا کیونکہ اِتمامِ نور کے لئے چودھویں رات مقرر ہے۔ غرض جیسا کہ قرآن شریف میں حضرت موسیٰ اور حضرت عیسٰی بن مریم کے درمیان بارہ خلیفوں کا ذکر فرمایا گیا اور اُن کا عدد بارہ ظاہر کیا گیا اور یہ بھی ظاہر کیا گیا کہ وہ تمام بارہ کے بارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھے مگر تیرھواں خلیفہ جو آخری خلیفہ ہے یعنی حضرت عیسٰی علیہ السلام اپنے باپ کے رُو سے اس قوم میں سے نہیں تھا کیونکہ اس کا کوئی باپ نہ تھا جس کی وجہ سے وہ حضرت موسیٰ سے اپنی شاخ ملا سکتا۔ یہی تمام باتیں سلسلہ خلافتِ محمدیہ میں پائی جاتی ہیں یعنی حدیث متفق علیہ سے ثابت ہے کہ اس سلسلہ میں بھی درمیانی خلیفے بارہ ہیں اور تیرھواں جو خاتمِ ولایتِ محمدیہ ہے وہ محمدی قوم میں سے نہیں ہے یعنی قریش میں سے نہیں اور یہی چاہیئے تھا کہ بارہ خلیفے تو حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم میں سے ہوتے اور آخری خلیفہ اپنے آباء واجداد کے رُو سے اس قوم میں سے نہ ہوتا تا تحقق مشابہت اکمل اور اتم طور پر ہو جاتا سو الحمد للہ والمنّۃ کہ ایسا ہی ظہور میں آیا کیونکہ بخاری اور مسلم میں یہ حدیث متفق علیہ ہے جو جابر بن سمرہ سے ہے اور وہ یہ ہے لَا یَزَالُ الْاِسْلَامُ عَزِیْزًا اِلٰی اثْنٰی عَشَرَ خَلِیْفَۃً کُلُّھُمْ مِّنْ قُرَیْشٍ یعنی بارہ خلیفوں کے ہونے تک اسلام خوب قوّت اور زور میں رہے گا مگر تیرھواں خلیفہ جو مسیح موعود ہے اُس وقت آئے گا جب کہ اسلام غلبۂ صلیب اور غلبۂ دجالیّت سے کمزور ہو جائے گا اور وہ بارہ خلیفے جو غلبۂ اسلام کے وقت آتے رہیں گے وہ سب کے سب قریش میں سے ہوں گے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم میں سے ہوں گے* مگر مسیح موعود جو اسلام کے ضعف کے وقت آئے گا وہ قریش

---

* الفاظ حدیث یہ ہیں عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَۃَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

کی قوم میں سے نہیں ہوگا کیونکہ ضرور تھا کہ جیسا کہ موسوی سلسلہ کا خاتم الانبیاء اپنے باپ کے رُو سے حضرت موسٰی کی قوم میں سے نہیں ہے ایسا ہی محمدی سلسلہ کا خاتم الاولیاء قریش میں سے نہ ہو اور اس جگہ سے قطعی طور پر اِس بات کا فیصلہ ہو گیا کہ اسلام کا مسیح موعود اِسی اُمت میں سے آنا چاہیئے کیونکہ جبکہ نص قطعی قرآنی یعنی کَمَا کے لفظ سے ثابت ہو گیا کہ سلسلہ استخلافِ محمدی کا سلسلہ استخلافِ موسوی سے مماثلت رکھتا ہے جیسا کہ اسی کَمَا کے لفظ سے ان دونبیوں یعنی حضرت موسٰی اور حضرت محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی مماثلت ثابت ہے جو آیت کَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا سے سمجھی جاتی ہے تو یہ مماثلت اسی حالت میں قائم رہ سکتی ہے جبکہ محمدی سلسلہ کے آنے والے خلیفے گزشتہ خلیفوں کا عین نہ ہوں بلکہ غیر ہوں۔[۱] وجہ یہ کہ مشابہت

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔ یَقُوْلُ لَا یَزَالُ الْاِسْلَامُ عَزِیْزًا اِلٰی اِثْنَیْ عَشَرَ خَلِیْفَةً کُلُّھُمْ مِنْ قُرَیْشٍ متفق علیہ (مشکوٰۃ شریف باب مناقب قریش) یعنی اِسلام بارہ خلیفوں کے ظہور تک غالب رہے گا اور وہ تمام خلیفے قریش میں سے ہوں گے۔ اِس جگہ یہ دعوٰی نہیں ہو سکتا کہ مسیح موعود بھی انہی بارہ میں داخل ہے کیونکہ متفق علیہ یہ امر ہے کہ مسیح موعود اسلام کی قوت کے وقت نہیں آئے گا بلکہ اُس وقت آئے گا جبکہ زمین پر نصرانیت کا غلبہ ہوگا جیسا کہ یکسر الصلیب کے فقرہ سے مستنبط ہوتا ہے۔ پس ضرور ہے کہ مسیح کے ظہور سے پہلے اسلام کی قوت جاتی رہے اور مسلمانوں کی حالت پر ضعف طاری ہو جائے اور اکثر ان کے دوسری طاقتوں کے نیچے اسی طرح محکوم ہوں جیسا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے ظہور کے وقت یہودیوں کی حالت ہو رہی تھی۔ چونکہ حدیثوں میں مسیح موعود کا خاص طور پر تذکرہ تھا اِس لئے بارہ خلیفوں سے اس کو الگ رکھا گیا۔ کیونکہ مقدر ہے کہ وہ نزولِ شدائد و مصائب کے بعد آوے اور اس وقت آوے جبکہ اسلام کی حالت میں ایک صریح انقلاب پیدا ہو جائے اور اِسی طرز سے حضرت عیسٰی علیہ السلام آئے تھے یعنی ایسے وقت میں جبکہ یہودیوں میں ایک صریح زوال کی علامت پیدا ہو گئی تھی۔ پس اس طریق سے حضرت موسٰیؑ کے خلیفے بھی تیرہ ہوئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفے بھی تیرہ۔ اور جیسا کہ حضرت موسٰی سے حضرت عیسٰی علیہ السلام چودھویں جگہ تھے ایسا ہی ضرور تھا کہ اسلام کا مسیح موعود بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چودھویں جگہ پر ہو۔ اِس مشابہت سے مسیح موعود کا چودھویں صدی میں ظاہر ہونا ضروری تھا۔ منہ

[۱] حاشیہ صفحہ ہٰذا:۔ جبکہ بوجہ کَمَا کے لفظ کے جو آیت کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ میں موجود ہے محمدی سلسلہ کے خلیفوں کی نسبت وجوبًا و قطعًا مان لیا گیا ہے کہ وہ وہی خلیفے نہیں ہیں جو موسوی سلسلہ

اور مماثلت میں مِنْ وَجْہٍ مغائرت ضروری ہے اور کوئی چیز اپنے نفس کے مشابہ نہیں کہلا سکتی۔ پس اگر فرض کر لیں کہ آخری خلیفہ سلسلہ محمدیہ کا جو تقابل کے لحاظ سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے مقابل پر واقع ہوا ہے جس کی نسبت یہ ماننا ضروری ہے کہ وہ اس اُمت کا خاتم الاولیاء[1] ہے جیسا کہ سلسلہ موسویہ کے خلیفوں میں حضرت عیسٰی علیہ السلام خاتم الاولیاء ہے۔ اگر درحقیقت وہی عیسٰی علیہ السلام ہے جو دوبارہ آنے والا ہے تو اس سے قرآن شریف کی تکذیب لازم آتی ہے کیونکہ قرآن جیسا کہ کَمَا کے لفظ سے مستنبط ہوتا ہے دونوں سلسلوں کے تمام خلیفوں کو من وجہ مغائر قرار دیتا ہے اور یہ ایک نص قطعی ہے کہ اگر ایک دُنیا اس کے مخالف اکٹھی ہو جائے تب بھی وہ اس نص واضح کو ردّ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ جب پہلے سلسلہ کا عین ہی نازل ہو گیا تو وہ مغائرت فوت ہو گئی اور لفظ کَمَا کا مفہوم باطل ہو گیا۔ پس اس صورت میں تکذیب قرآن شریف لازم ہوئی وَ ھٰذَا بَاطِلٌ وَ کُلَّ مَا یَسْتَلْزِمُ الْبَاطِلَ فَھُوَ بَاطِلٌ۔
یاد رہے کہ قرآن شریف نے آیت کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ میں وہی کَمَا استعمال

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔ کے خلیفے تھے۔ ہاں اُن خلیفوں سے مشابہ ہیں اور نیز ساتھ اس کے واقعات نے بھی ظاہر کر دیا ہے کہ وہ لوگ پہلے خلیفوں کے عین نہیں ہیں بلکہ غیر ہیں تو پھر آخری خلیفہ اس سلسلہ محمدیہ کی نسبت جو مسیح موعود ہے کیوں یہ گمان کیا جاتا ہے کہ وہ پہلے مسیح کا عین ہے؟ کیا وہ کَمَا کے لفظ کے نیچے نہیں ہے؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ حسبِ منشاء کَمَا کے لفظ کے محمدی سلسلہ کا مسیح اسرائیلی مسیح کا غیر ہونا چاہیئے نہ عین۔ عین سمجھنا تو قرآن کے منطوق نص پر صریح حملہ ہے بلکہ قرآن شریف کی صریح تکذیب ہے اور نیز ایک بے جا تحکّم کہ بارہ خلیفوں کو تو حسبِ منشاء کَمَا کے لفظ کے اسرائیلی خلیفوں کا غیر سمجھنا اور پھر مسیح موعود کو جو سلسلہ موسویہ کے مقابل پر سلسلہ محمدیہ کا آخری خلیفہ ہے پہلے مسیح کا عین قرار دے دینا۔ وَھٰذِہٖ نُکْتَۃٌ مُبْتَکِرَۃٌ وَحُجَّۃٌ بَاھِرَۃٌ وَدُرَّۃٌ مِنْ دُرَرٍ تَفَرَّدْتُ بِھَا فَخُذُوْھَا بِقُوَّۃٍ وَاشْکُرُوا اللّٰہِ بِاِنَابَۃٍ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمَحْرُوْمِیْنَ۔ منہ

---

[1] شیخ محی الدین ابنِ عربی اپنی کتاب فصوص میں مہدی خاتم الاولیاء کی ایک علامت لکھتے ہیں کہ اس کا خاندان چینی حدود میں سے ہوگا اور اس کی پیدائش میں یہ ندرت ہوگی کہ اس کے ساتھ ایک لڑکی بطور توام پیدا ہوگی یعنی اس طرح پر خدا اناث کا مادہ اس سے الگ کر دے گا۔ سو اسی کشف کے مطابق اس عاجز کی ولادت ہوئی ہے اور اسی کشف کے مطابق میرے بزرگ چینی حدود سے پنجاب میں پہنچے تھے۔ منہ

کیا ہے جو آیت کَمَا اَرْسَلْنَا اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا میں ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مثیل موسیٰ ہو کر نہیں آئے بلکہ یہ خود موسیٰ بطور تناسخ آ گیا ہے یا یہ دعویٰ کرے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کہ توریت کی اس پیشگوئی کا میں مصداق ہوں بلکہ اس پیشگوئی کے معنے یہ ہیں کہ خود موسیٰ ہی آ جائے گا جو بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے ہے تو کیا اس فضول دعویٰ کا یہ جواب نہیں دیا جائے گا کہ قرآن شریف میں ہرگز بیان نہیں فرمایا گیا کہ خود موسیٰ آئے گا بلکہ کَمَا کے لفظ سے مثیلِ موسیٰ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ پس یہی جواب ہماری طرف سے ہے کہ اس جگہ بھی سلسلہ خلفاء محمدی کے لئے کَمَا کا لفظ موجود ہے اور یہ نص قطعی کلامِ الٰہی کی آفتاب کی طرح چمک کر ہمیں بتلا رہی ہے کہ سلسلہ خلافتِ محمدی کے تمام خلیفے خلفاء موسوی کے مثیل ہیں۔ اسی طرح آخری خلیفہ جو خاتم ولایتِ محمدیہ ہے جو مسیح موعود کے نام سے موسوم ہے وہ حضرت عیسیٰ سے جو خاتم سلسلہ نبوت موسویہ ہے مماثلت اور مشابہت رکھتا ہے۔ مثلاً دیکھو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت یوشع بن نون سے کیسی مشابہت ہے کہ انہوں نے ایسا ایک ناتمام کام لشکر اُسامہ اور انبیاء کاذبین کے مقابلہ کا پورا کیا جیسا کہ حضرت یوشع بن نون نے پورا کیا اور آخری خلیفہ سلسلہ موسوی کا یعنی حضرت عیسیٰ جیسا کہ اس وقت آیا جبکہ گلیل اور پیلاطوس کے علاقہ سے سلطنت یہود کی جاتی رہی تھی ایسا ہی سلسلہ محمدیہ کا مسیح ایسے وقت میں آیا کہ جب ہندوستان کی حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل چکی۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۲۲-۲۵)

جس آیت سے دونوں سلسلوں یعنی سلسلہ خلافتِ موسویہ اور سلسلہ خلافتِ محمدیہ میں مماثلت ثابت ہے یعنی جس سے قطعی اور یقینی طور پر سمجھا جاتا ہے کہ سلسلۂ نبوتِ محمدیہ کے خلیفے سلسلہ نبوتِ موسویہ کے مشابہ و مماثل ہیں وہ یہ آیت ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ الخ یعنی خدا نے ان ایمانداروں سے جو نیک کام بجا لاتے ہیں وعدہ کیا ہے جو اُن میں سے زمین پر خلیفے مقرر کرے گا۔ انہی خلیفوں کی مانند جو اُن سے پہلے گذر گئے تھے اب جب ہم مانند کے لفظ کو پیشِ نظر رکھ کر دیکھتے ہیں جو محمدی خلیفوں کی موسوی خلیفوں سے مماثلت واجب کرتا ہے تو ہمیں ماننا پڑتا ہے جو ان دونوں سلسلوں کے خلیفوں میں مماثلت ضروری ہے اور مماثلت کی پہلی بنیاد ڈالنے والا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہے اور مماثلت کا آخری نمونہ ظاہر کرنے کا وہ مسیح خاتم خلفائے محمدیہ ہے جو سلسلۂ خلافتِ محمدیہ کا سب سے آخری خلیفہ ہے۔ سب سے پہلا خلیفہ جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہے وہ حضرت یوشع بن نون کے مقابل اور ان کا مثیل ہے جس کو خدا نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خلافت کے لئے اختیار کیا اور سب سے زیادہ فراست کی رُوح اُس میں پھونکی یہاں تک کہ وہ مشکلات جو عقیدۂ باطلہ حیاتِ مسیح کے

مقابلہ میں خاتم الخلفاء کو پیش آنی چاہئیں تھیں۔ ان تمام شبہات کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کمال صفائی سے حل کر دیا اور تمام صحابہؓ میں سے ایک فرد بھی ایسا نہ رہا جس کا گذشتہ انبیاء علیہم السلام کی موت پر اعتقاد نہ ہوگیا ہو بلکہ تمام امور میں تمام صحابہؓ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ایسی ہی اطاعت اختیار کر لی جیسا کہ حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد بنی اسرائیل نے حضرت یشوع بن نون کی اطاعت کی تھی اور خدا بھی موسیٰ اور یشوع بن نون کے نمونہ پر جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا اور آپ کا حامی اور مؤید تھا ایسا ہی ابوبکر صدیق کا حامی اور مؤید ہوگیا۔ درحقیقت خدا نے یشوع بن نون کی طرح اس کو ایسا مبارک کیا جو کوئی دشمن اس کا مقابلہ نہ کر سکا اور اُسامہ کے لشکر کا ناتمام کام حضرت موسیٰؑ کے ناتمام کام سے مشابہت رکھتا تھا حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر پورا کیا۔ اور حضرت ابوبکرؓ کی حضرت یشوع بن نون کے ساتھ ایک اور عجیب مناسبت یہ ہے جو حضرت موسیٰؑ کی موت کی اطلاع سب سے پہلے حضرت یوشع کو ہوئی اور خدا نے بلاتوقف اُن کے دل میں وحی نازل کی جو موسیٰ مرگیا تا یہود حضرت موسیٰ کی موت کے بارے میں کسی غلطی یا اختلاف میں نہ پڑ جائیں جیسا کہ یشوع کی کتاب باب اوّل سے ظاہر ہے اسی طرح سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موت پر حضرت ابوبکرؓ نے یقین کامل ظاہر کیا اور آپؐ کے جسدِ مبارک پر بوسہ دے کر کہا کہ تُو زندہ بھی پاک تھا اور موت کے بعد بھی پاک ہے اور پھر وہ خیالات جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بارے میں بعض صحابہؓ کے دل میں پیدا ہوگئے تھے ایک عام جلسہ میں قرآن شریف کی آیت کا حوالہ دے کر اُن تمام خیالات کو دُور کر دیا اور ساتھ ہی اس غلط خیال کی بھی بیخ کنی کر دی جو حضرت مسیحؑ کی حیات کی نسبت احادیثِ نبویہ میں پوری غور نہ کرنے کی وجہ سے بعض کے دلوں میں پایا جاتا تھا اور جس طرح حضرت یشوع بن نون نے دین کے سخت دشمنوں اور مفتریوں اور مفسدوں کو ہلاک کیا تھا اسی طرح بہت سے مفسد اور جھوٹے پیغمبر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے مارے گئے اور جس طرح حضرت موسیٰؑ راہ میں ایسے نازک وقت میں فوت ہوگئے تھے کہ جب ابھی بنی اسرائیل نے کنعانی دشمنوں پر فتح حاصل نہیں کی تھی اور بہت سے مقاصد باقی تھے اور اِردگرد دشمنوں کا شور تھا جو حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد اَور بھی خطرناک ہوگیا تھا ایسا ہی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ایک خطرناک زمانہ پیدا ہوگیا تھا کئی فرقے عرب کے مُرتد ہوگئے تھے۔ بعض نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا اور کئی جھوٹے پیغمبر کھڑے ہوگئے تھے اور ایسے وقت میں جو ایک بڑے مضبوط دِل اور مستقل مزاج اور قوی الایمان اور دلاور اور بہادر خلیفہ کو چاہتا تھا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ مقرر کئے گئے اور ان کو خلیفہ ہوتے ہی بڑے غموں کا سامنا ہوُا جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول ہے کہ بباعث چند در چند فتنوں اور بغاوتِ اعراب

اور ٹکڑے ہونے جھوٹے پیغمبروں کے میرے باپ پر جبکہ وہ خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مقرر کیا گیا وہ مصیبتیں پڑیں اور وہ غم دِل پر نازل ہوئے کہ اگر وہ غم کسی پہاڑ پر پڑتے تو وہ بھی گر پڑتا اور پاش پاش ہو جاتا اور زمین سے ہموار ہو جاتا مگر چونکہ خدا کا یہ قانونِ قدرت ہے کہ جب خدا کے رسول کا کوئی خلیفہ اس کی موت کے بعد مقرر ہوتا ہے تو شجاعت اور ہمت اور استقلال اور فراست اور دِل قوی ہونے کی رُوح اس میں پھونکی جاتی ہے جیسا کہ یشوع کی کتاب باب اول آیت ۶ میں حضرت یشوع کو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مضبوط ہو اور دلاوری کر۔ یعنی موسیٰ تو مر گیا اب تو مضبوط ہو جا۔* یہی حکم قضا و قدر کے رنگ میں نہ شرعی رنگ میں حضرت ابوبکرؓ کے دل پر بھی نازل ہوا تھا۔ تناسب اور تشابہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا ابوبکر بن قحافہ اور یشوع بن نون ایک ہی شخص ہے۔ استخلافی مماثلت نے اِس جگہ کس کر اپنی مشابہت دکھلائی ہے۔ یہ اِس لئے کہ کسی دو لمبے سلسلوں میں باہم مشابہت کو دیکھنے والے طبعًا یہ عادت رکھتے ہیں کہ یا اوّل کو دیکھا کرتے ہیں اور یا آخر کو مگر دو سلسلوں کی درمیانی مماثلت کو جس کی تحقیق و تفتیش زیادہ وقت چاہتی ہے دیکھنا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ اوّل اور آخر پر قیاس کر لیا کرتے ہیں اِس لئے خدا نے اس مشابہت کو جو یشوع بن نون اور حضرت ابوبکرؓ میں ہے جو دونوں خلافتوں کے اوّل سلسلہ میں ہیں اور نیز اس مشابہت کو جو حضرت عیسٰی بن مریمؑ اور اس اُمت کے مسیح موعود میں ہے جو دونوں خلافتوں کے آخر سلسلہ میں ہیں اجلیٰ بدیہیات کر کے دکھلا دیا مثلاً یشوع اور ابوبکرؓ میں وہ مشابہت درمیان رکھ دی کہ گویا وہ دونوں ایک ہی وجود ہے یا ایک ہی جوہر کے دو ٹکڑے ہیں اور جس طرح بنی اسرائیل حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد یوشع بن نون کی باتوں کے شنوا ہو گئے اور کوئی اختلاف نہ کیا اور سب نے اپنی اطاعت ظاہر کی۔ یہی واقعہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو پیش آیا اور سب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جُدائی میں آنسو بہا کر دِلی رغبت سے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کو قبول کیا۔ غرض ہر ایک پہلو سے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مشابہت حضرت یشوع بن نون علیہ السلام سے ثابت ہوئی۔

---

*۔ خدا تعالیٰ کے حکم دو قسم کے ہوتے ہیں ایک شرعی جیسا یہ کہ تُو خون نہ کر۔ چوری نہ کر۔ جھوٹی گواہی مت دے۔ دوسری قسم حکم کی قضا و قدر کے حکم ہیں جیسا یہ حکم کہ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ۔ شرعی حکم میں محکوم کا تخلف حکم سے جائز ہے جیسا کہ بہتیرے باوجود حکم شرعی پانے کے خون بھی کرتے ہیں، چوری بھی کرتے ہیں۔ جھوٹی گواہی بھی دیتے ہیں مگر قضا و قدر کے حکم میں ہرگز تخلف جائز نہیں۔ انسان تو انسان قدری حکم سے جمادات بھی تخلف نہیں کر سکتے کیونکہ جبروتی کشش اس کے ساتھ ہوتی ہے سو حضرت یشوع کو خدا کا یہ حکم کہ مضبوط دل ہو جا قدری حکم تھا یعنی قضا و قدر کا حکم۔ وہی حکم حضرت ابوبکرؓ کے دل پر بھی نازل ہوا تھا۔ منہ

خدا نے جس طرح حضرت یشوع بن نون کو اپنی وہ تائیدیں دکھلائیں کہ جو حضرت موسیٰؑ کو دکھلایا کرتا تھا ایسا ہی خدا نے تمام صحابہؓ کے سامنے حضرت ابوبکرؓ کے کاموں میں برکت دی اور نبیوں کی طرح اس کا اقبال چمکا۔ اُس نے مُفسدوں اور جھوٹے نبیوں کو خدا سے قدرت اور جلال پا کر قتل کیا تا کہ اصحاب رضی اللہ عنہم جانیں کہ جس طرح خدا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا اس کے بھی ساتھ ہے۔ ایک اور عجیب مناسبت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضرت یشوع بن نون علیہ السلام سے ہے اور وہ یہ ہے کہ حضرت یشوع بن نون کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ایک ہولناک دریا سے جس کا نام یردن ہے عبور مع لشکر کرنا پیش آیا تھا اور یردن میں ایک طوفان تھا اور عبور غیر ممکن تھا اور اگر اس طوفان سے عبور نہ ہوتا تو بنی اسرائیل کی دشمنوں کے ہاتھ سے تباہی متصور تھی اور یہ وہ پہلا امر ہولناک تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد یشوع بن نون کو اپنے خلافت کے زمانہ میں پیش آیا۔ اس وقت خدا تعالیٰ نے اس طوفان سے اعجازی طور پر یشوع بن نون اور اس کے لشکر کو بچا لیا اور یردن میں خشکی پیدا کر دی جس سے وہ بآسانی گذر گیا۔ وہ خشکی بطور جوار بھاٹا تھی یا محض ایک فوق العادت اعجاز تھا بہرحال اِس طرح خدا نے ان کو طوفان اور دشمن کے صدمہ سے بچایا۔ اسی طوفان کی نسبت بلکہ اس سے بڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر خلیفۃ الحق کو مع تمام جماعت صحابہؓ کے جو ایک لاکھ سے زیادہ تھے پیش آیا۔ یعنی ملک میں سخت بغاوت پھیل گئی اور وہ عرب کے بادیہ نشین جن کو خدا نے فرمایا تھا وَقَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ (سورۃ حجرات) ضرور تھا کہ اس پیشگوئی کے مطابق وہ بگڑتے تا یہ پیشگوئی پوری ہوتی۔ پس ایسا ہی ہوا اور وہ سب لوگ مرتد ہو گئے اور بعض نے زکوٰۃ سے انکار کیا اور چند شریر لوگوں نے پیغمبری کا دعویٰ کر دیا جن کے ساتھ کئی لاکھ بدبخت انسانوں کی جمعیت ہو گئی اور دشمنوں کا شمار اس قدر بڑھ گیا کہ صحابہؓ کی جماعت اُن کے آگے کچھ بھی چیز نہ تھی اور ایک سخت طوفان ملک میں برپا ہوا۔ یہ طوفان اس خوفناک پانی سے بہت بڑھ کر تھا جس کا سامنا حضرت یشوع بن نون علیہ السلام کو پیش آیا تھا اور جیسا کہ یشوع بن نون حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد ناگہانی طور پر اس سخت ابتلاء میں مبتلا ہو گئے تھے کہ دریا سخت طوفان میں تھا اور کوئی جہاز نہ تھا اور ہر ایک طرف سے دشمن کا خوف تھا یہی ابتلاء حضرت ابوبکرؓ کو پیش آیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فوت ہو گئے اور ارتداد عرب کا ایک طوفان برپا ہو گیا اور جھوٹے پیغمبروں کا ایک دوسرا طوفان اس کو قوت دینے والا ہو گیا۔ یہ طوفان یوشع کے طوفان سے کچھ کم نہ تھا بلکہ بہت زیادہ تھا اور پھر جیسا کہ خدا کے کلام نے حضرت یوشع کو قوت دی اور فرمایا کہ جہاں جہاں تُو جاتا ہے مَیں تیرے ساتھ ہوں تُو مضبوط ہو اور دلاور بن جا اور بے دِل مت ہو تب یشوع میں بڑی

قوت اور استقلال اور وہ ایمان پیدا ہوگیا جو خدا کی تسلّی کے ساتھ پیدا ہوتا ہے ایسا ہی حضرت ابوبکرؓ کو بغاوت کے طوفان کے وقت خدا تعالیٰ سے قوت ملی جس شخص کو اس زمانہ کی اسلامی تاریخ پر اطلاع ہے وہ گواہی دے سکتا ہے کہ وہ طوفان ایسا سخت طوفان تھا کہ اگر خدا کا ہاتھ ابوبکرؓ کے ساتھ نہ ہوتا اور اگر درحقیقت اِسلام خدا کی طرف سے نہ ہوتا اور اگر درحقیقت ابوبکرؓ خلیفہ حق نہ ہوتا تو اس دن اِسلام کا خاتمہ ہوگیا تھا مگر یشوع نبی کی طرح خدا کے پاک کلام سے ابوبکر صدیقؓ کو قوت ملی کیونکہ خدا تعالےٰ نے قرآن شریف میں اس ابتلاء کی پہلے سے خبر دے رکھی تھی چنانچہ جو شخص اس آیت مندرجہ ذیل کو غور سے پڑھے گا وہ یقین کرلے گا کہ بلاشبہ اس ابتلاء کی خبر قرآن شریف میں پہلے سے دی گئی تھی اور وہ خبر یہ ہے کہ وعد اللّٰہ الّذین اٰمنوا منکم وعملوا الصّٰلحٰت لیستخلفنّھم فی الارض کما استخلف الّذین من قبلھم ولیمکّننّ لھم دینھم الّذی ارتضٰی لھم ولیبدّلنّھم من بعد خوفھم امنًا۔ یعبدوننی لا یشرکون بی شیئًا ومن کفر بعد ذٰلک فاولٰئک ھم الفٰسقون۔ یعنی خدا نے مومنوں کو جو نیکوکار ہیں وعدہ دے رکھا ہے جو ان کو خلیفے بنائے گا انہی خلیفوں کی مانند جو پہلے بنائے گئے تھے اور اُسی سِلسلۂ خلافت کی مانند سلسلہ قائم کرے گا جو حضرت موسیٰؑ کے بعد قائم کیا تھا اور اُن کے دین کو یعنی اسلام کو جس پر وہ راضی ہوا زمین پر جما دے گا اور اُس کی جڑ لگا دے گا اور خوف کی حالت کو امن کی حالت کے ساتھ بدل دے گا وہ میری پرستش کریں گے کوئی دوسرا میرے ساتھ نہیں ملائیں گے۔ دیکھو اِس آیت میں صاف طور پر فرما دیا ہے کہ خوف کا زمانہ بھی آئے گا اور امن جاتا رہے گا مگر خدا اس خوف کے زمانہ کو پھر امن کے ساتھ بدل دے گا۔ سو یہی خوف یشوع بن نون کو بھی پیش آیا تھا اور جیسا کہ اس کو خدا کے کلام سے تسلّی دی گئی ایسا ہی ابوبکر رضی اللہ عنہ کو بھی خدا کے کلام سے تسلّی دی گئی اور چونکہ ہر ایک سِلسلہ میں خدا کا یہ قانونِ قدرت ہے کہ اس کا کمال تب ظاہر ہوتا ہے کہ جب آخر حصّہ سلسلہ کا پہلے حصّہ سے مشابہ ہو جائے اِس لئے ضروری ہوا کہ موسوی اور محمدی سلسلہ کا پہلا خلیفہ موسوی اور محمدی سلسلہ کے آخری خلیفہ سے مشابہ ہو کیونکہ کمال ہر ایک چیز کا استدارت* کو چاہتا ہے یہی

---

* استدارت کے لفظ سے میری مراد یہ ہے کہ جب ایک دائرہ پورے طور پر کامل ہو جاتا ہے تو جس نقطہ سے شروع ہوا تھا اسی نقطہ سے جا ملتا ہے اور جب تک اس نقطہ کو نہ ملے تب تک اُس کو دائرہ کاملہ نہیں کہہ سکتے۔ پس آخری نقطہ کا پہلے نقطہ سے جا ملنا وہی امر ہے جس کو دوسرے لفظوں میں مشابہتِ تامہ کہا کرتے ہیں۔ پس جیسا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو یشوع بن نون سے مشابہت تھی یہاں تک کہ نام میں بھی تشابہ تھا

وجہ ہے کہ تمام بسائط گول شکل پر پیدا کئے گئے ہیں تا خدا کے ہاتھ کی پیدا کی ہوئی چیزیں ناقص نہ ہوں۔ اِس بناء پر ماننا پڑتا ہے کہ زمین کی شکل بھی گول ہے کیونکہ دوسری تمام شکلیں کمالِ تام کے مخالف ہیں اور جو چیز خدا کے ہاتھ سے بلا واسطہ نکلی ہے اس میں مناسبِ حال مخلوقیت کے کمالِ تام ضرور چاہیئے تا اس کا نقص خالق

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔ ایسا ہی ابوبکرؓ اور مسیح موعود کو بعض واقعات کے رُو سے بشدت مشابہت ہے اور وہ یہ کہ ابوبکرؓ کو خدا نے سخت فتنہ اور بغاوت اور معتزلوں اور مفسدوں کے عہد میں خلافت کے لئے مقرر کیا تھا ایسا ہی مسیح موعود اس وقت ظاہر ہؤا کہ جبکہ تمام علاماتِ صغریٰ کا طوفان ظہور میں آچکا تھا اور کچھ کبریٰ میں سے بھی۔ اور دوسری مشابہت یہ ہے کہ جیسا کہ خدا نے حضرت ابوبکرؓ کے وقت میں خوف کے بعد امن پیدا کر دیا اور برخلاف دشمنوں کی خواہشوں کے دین کو جما دیا ایسا ہی مسیح موعود کے وقت میں بھی ہوگا کہ اس طوفانِ تکذیب اور تکفیر اور تفسیق کے بعد یک دفعہ لوگوں کو محبت اور ارادت کی طرف میلان دیا جائے گا اور جب بہت سے نور نازل ہوں گے اور ان کی آنکھیں کُھلیں گی تو وہ معلوم کریں گے کہ ہمارے اعتراض کچھ چیز نہ تھے اور ہم نے اپنے اعتراضوں میں بجز اس کے اَور کچھ نہ دکھلایا جو اپنے سطحی خیال اور موٹی عقل اور حسد اور تعصب کے زہر کو لوگوں پر ظاہر کر دیا اور پھر اس کے بعد ابوبکرؓ اور مسیح موعود میں یہ مشابہت ظاہر کر دی جائے گی کہ اس دین کو جس کی مخالف بیخ کنی کرنا چاہتے ہیں زمین پر خوب جما دیا جائے گا اور ایسا مُستحکم کیا جائے گا کہ پھر قیامت تک اس میں تزلزل نہیں ہوگا۔ اور پھر تیسری مشابہت یہ ہوگی کہ جو شرک کی ملونی مسلمانوں کے عقیدوں میں مِل گئی تھی وہ بکلّی اُن کے دلوں سے نکال دی جائے گی۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ شرک کا ایک بڑا حصہ جو مسلمانوں کے عقائد میں داخل ہوگیا تھا یہاں تک کہ دجّال کو بھی خدائی کی صفتیں دی گئی تھیں اور حضرت مسیح کو ایک حصۂ مخلوق کا خالق سمجھا گیا تھا یہ ہر ایک قسم کا شرک دُور کیا جائے گا جیسا کہ آیت یعبدو ننی لا یشرکون بی شیئًا سے مُستنبط ہوتا ہے ایسا ہی اس پیشگوئی سے جو مسیح موعود اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ میں مشترک ہے یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ جس طرح شیعہ لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی تکفیر کرتے ہیں اور اُن کے مرتبہ اور بزرگی سے مُنکر ہیں ایسا ہی مسیح موعود کی تکفیر بھی کی جائے گی اور انکے مخالف ان کے مرتبۂ ولایت سے اِنکار کریں گے کیونکہ اس پیشگوئی کے اخیر میں یہ آیت ہے وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ اور اِس آیت کے معنے جیسا کہ روافض کی عملی حالت سے کُھلے ہیں یہی ہیں کہ بعض گمراہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقامِ بلند سے مُنکر ہو جائیں گے اور ان کی تکفیر کریں گے۔ پس اِس آیت سے سمجھا جاتا ہے کہ مسیح موعود کی بھی تکفیر ہوگی کیونکہ وہ خلافت کے اس آخری نقطہ پر ہے جو خلافت

کے نقص کی طرف عائد نہ ہو اور نیز اس لئے بسائط کا گول رکھنا خدا تعالیٰ نے پسند کیا کہ گول میں کوئی جہت نہیں ہوتی اور یہ امر توحید کے بہت مناسبِ حال ہے۔ غرض صنعت کا کمال مدوّر شکل سے ہی ظاہر ہوتا ہے کیونکہ اس میں انتہائی نقطہ اس قدر اپنے کمال کو دکھلاتا ہے کہ پھر اپنے مبدء کو جا ملتا ہے۔

اب ہم پھر اپنے اصل مدّعا کی طرف رجوع کر کے لکھتے ہیں کہ ہمارے مذکورہ بالا بیان سے یقینی اور قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو جو حضرت سیدنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپؐ کے پہلے خلیفہ تھے حضرت یوشع بن نون علیہ السلام سے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے پہلے خلیفہ ہیں اشد مشابہت ہے تو پھر اس سے لازم آیا کہ جیسا کہ سلسلہ محمدیہ کی خلافت کا پہلا خلیفہ سلسلہ موسویہ کی خلافت کے پہلے خلیفہ سے مشابہت رکھتا ہے ایسا ہی سلسلہ محمدیہ کی خلافت کا آخری خلیفہ جو مسیح موعود سے موسوم ہے سلسلہ موسویہ کے آخری خلیفہ سے جو حضرت عیسیٰ بن مریمؑ ہے مشابہت رکھے تا دونوں سلسلوں کی مشابہتِ تامہ میں جو نصِّ قرآنی سے ثابت ہوتی ہے کچھ نقص نہ رہے کیونکہ جب تک دونوں سلسلے یعنی سلسلہ موسویہ و سلسلہ محمدیہ اوّل سے آخر تک باہم مشابہت نہ دکھلائیں تب تک وہ مماثلت جو آیت کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ میں کَمَا کے لفظ سے مستنبط ہوتی ہے ثابت نہیں ہو سکتی اور پھر چونکہ ہم ابھی حاشیہ میں اکمل اور اتم طور پر ثابت کر چکے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسیح موعود سے مشابہت رکھتے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی ثابت ہو گیا کہ حضرت ابوبکرؓ حضرت یوشع بن نون سے مشابہت رکھتے ہیں اور حضرت یوشع بن نون اِس قاعدہ کے رُو سے جو دائرہ کا

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ۔ کے پہلے نقطہ سے ملا ہوا ہے۔ یہ بات بہت ضروری یاد رکھنے کے لائق ہے کہ ہر ایک دائرہ کا عام قاعدہ یہی ہے کہ اس کا آخری نقطہ پہلے نقطہ سے اِتّصال رکھتا ہے لہٰذا اس عام قاعدہ کے موافق خلافتِ محمدیہ کے دائرہ میں بھی ایسا ہی ہونا ضروری ہے یعنی یہ لازمی امر ہے کہ آخری نقطہ اُس دائرہ کا جس سے مراد مسیح موعود ہے جو سلسلۂ خلافتِ محمدیہ کا خاتم ہے وہ اس دائرہ کے پہلے نقطہ سے جو خلافتِ ابوبکر رضی اللہ عنہ کا نقطہ ہے جو سلسلۂ خلافتِ محمدیہ کے دائرہ کا پہلا نقطہ جو ابوبکرؓ ہے وہ اس دائرہ کے اِنتہائی نقطہ سے جو مسیح موعود ہے اِتّصالِ تام رکھتا ہے جیسا کہ مشاہدہ اِس بات پر گواہ ہے کہ آخر نقطہ ہر ایک دائرہ کا اس کے پہلے نقطہ سے جا ملتا ہے اب جبکہ اوّل اور آخر کے دونوں نقطوں کا اِتّصال ماننا پڑا تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ جو قرآنی پیشگوئیاں خلافت کے پہلے نقطہ کے حق میں ہیں یعنی حضرت ابوبکرؓ کے حق میں وہی خلافت کے آخری نقطہ کے حق میں بھی ہیں یعنی مسیح موعود کے حق میں۔ اور یہی ثابت کرنا تھا۔ منہ

اوّل نقطہ دائرہ کے آخر نقطہ سے اتحاد رکھتا ہے جیسا کہ ابھی ہم نے حاشیہ میں لکھا ہے حضرت عیسٰی بن مریمؑ سے
مشابہت رکھتے ہیں تو اس سلسلۂ مساوات سے لازم آیا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام اسلام کے مسیح موعود سے جو
شریعتِ اسلامیہ کا آخری خلیفہ ہے مشابہت رکھتے ہیں کیونکہ حضرت عیسٰیؑ حضرت یشوع بن نون سے مشابہ ہیں اور
حضرت یشوع بن نون حضرت ابوبکرؓ سے مشابہ۔ اور پہلے ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اسلام کے آخری خلیفہ یعنی
مسیح موعود سے مشابہ ہیں تو اس سے ثابت ہوا کہ حضرت عیسٰی اسلام کے آخری خلیفہ سے جو مسیح موعود ہے مشابہ
ہیں کیونکہ مشابہ کا مشابہ مشابہ ہوتا ہے۔ مثلاً اگر خط ا خط ب سے مساوی ہے اور خط ب خط ج سے مساوی۔ تو
ماننا پڑے گا کہ خط ا خط ج سے مساوی ہے اور یہی مدعا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مشابہت من وجہ مغائرت کو چاہتی ہے
اس لئے قبول کرنا پڑا کہ اسلام کا مسیح موعود حضرت عیسٰی علیہ السلام نہیں ہیں بلکہ اس کا غیر ہے اور عوام جو باریک
باتوں کو سمجھ نہیں سکتے اُن کے لئے اسی قدر کافی ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے دو
رسول ظاہر کر کے اُن کو دو مستقل شریعتیں عطا فرمائی ہیں ایک شریعتِ موسویہ دوسری شریعتِ محمدیہ۔ اور ان دونوں
سلسلوں میں تیرہ تیرہ خلیفے مقرر کئے ہیں اور درمیانی بارہ خلیفے جو ان دونوں شریعتوں میں پائے جاتے ہیں وہ ہر
دو نبی صاحب الشریعت کی قوم میں سے ہیں۔ یعنی موسوی خلیفے اسرائیلی ہیں اور محمدی خلیفے قریش ہیں مگر آخری
دو خلیفے ان دونوں سلسلوں کے وہ ان ہر دو نبی صاحب الشریعت کی قوم میں سے نہیں ہیں حضرت عیسٰیؑ اس لئے
کہ ان کا کوئی باپ نہیں اور اسلام کے مسیح موعود کی نسبت جو آخری خلیفہ ہے خود علمائے اسلام مان چکے ہیں
کہ وہ قریش میں نہیں ہے اور نیز قرآن شریف فرماتا ہے کہ یہ دونوں مسیح ایک دوسرے کا عین نہیں ہیں کیونکہ
خدا تعالیٰ قرآن شریف میں اسلام کے مسیح موعود کو موسوی مسیح موعود کا مثیل ٹھہراتا ہے نہ عین۔ پس محمدی
مسیح موعود کو موسوی مسیح کا عین قرار دینا قرآن شریف کی تکذیب ہے۔ اور تفصیل اس استدلال کی یہ ہے
کہ کَمَا کا لفظ جو آیت کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ میں ہے جس سے تمام محمدی سلسلہ کے خلیفوں
کی موسوی سلسلہ کے خلیفوں کے ساتھ مشابہت ثابت ہوتی ہے ہمیشہ مماثلت کے لئے آتا ہے اور مماثلت ہمیشہ
من وجہ مغائرت کو چاہتی ہے یہ ممکن نہیں کہ ایک چیز اپنے نفس کی مثیل کہلائے بلکہ مشبہ اور مشبہ بہٖ میں
کچھ مغائرت ضروری ہے اور عین کسی وجہ سے اپنے نفس کا مغائر نہیں ہو سکتا۔ پس جیسا کہ ہمارے نبی
صلی اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰؑ کے مثیل ہو کر ان کے عین نہیں ہو سکتے ایسا ہی تمام محمدی خلیفے جن میں سے
آخری خلیفہ مسیح موعود ہے وہ موسوی خلیفوں کے جن میں سے آخری خلیفہ حضرت عیسٰی علیہ السلام ہیں
کسی طرح عین نہیں ہو سکتے۔ اس سے قرآن شریف کی تکذیب لازم آتی ہے کیونکہ کَمَا کا لفظ جیسا کہ حضرت
موسیٰؑ اور آنحضرتؐ کی مشابہت کے لئے قرآن نے استعمال کیا ہے وہی کَمَا کا لفظ آیت کَمَا اسْتَخْلَفَ

اَلَّذِیْنَ میں وارد ہے جو اس قسم کی مغائرت چاہتا ہے جو حضرت موسیٰ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے۔ یاد رہے کہ اسلام کا بارھواں خلیفہ جو تیرھویں صدی کے سر پر ہونا چاہیئے وہ یحییٰ نبی کے مقابل پر ہے جس کا ایک پلید قوم کے لئے سر کاٹا گیا (سمجھنے والا سمجھ لے) اس لئے ضروری ہے کہ بارھواں خلیفہ قریش ہو جیسا کہ حضرت یحییٰ اسرائیلی ہیں لیکن اسلام کا تیرھواں خلیفہ جو چودھویں صدی کے سر پر ہونا چاہیئے جس کا نام مسیح موعود ہے اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ قریش میں سے نہ ہو جیسا کہ حضرت عیسیٰ اسرائیلی نہیں ہیں۔ سید احمد صاحب بریلوی سلسلہ خلافتِ محمدیہ کے بارھویں خلیفہ ہیں جو حضرت یحییٰ کے مثیل ہیں اور سید ہیں۔ (تحفہ گولڑویہ ص۵۷ تا ۶۳)

جبکہ مماثلت کی ضرورت کی وجہ سے واجب تھا کہ اس اُمت کے خلیفوں کا سلسلہ ایک ایسے خلیفہ پر ختم ہو جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مثیل ہو تو منجملہ وجوہ مماثلت کے ایک وجہ یہ بھی ضروری الوقوع تھی کہ جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت کے فقیہ اور مولوی ان کے دشمن ہو گئے تھے اور اُن پر کفر کا فتویٰ لکھا تھا اور ان کو سخت سخت گالیاں دیتے تھے اور ان کی اور ان کی پردہ نشین عورتوں کی توہین کرتے اور ان کے ذاتی نقص نکالتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ ان کو لعنتی ثابت کریں ایسا ہی اسلام کے مسیح موعود پر اس زمانہ کے مولوی کفر کا فتویٰ لکھیں اور اس کی توہین کریں اور اس کو جسے بے ایمان اور لعنتی قرار دیں اور گالیاں دیں اور اس کے پرائیویٹ امور میں دخل دیں اور طرح طرح کے اس پر افتراء کریں اور قتل کا فتویٰ دیں پس چونکہ یہ اُمت مرحومہ ہے اور خدا نہیں چاہتا کہ ہلاک ہوں اس لئے اُسنے یہ دعا غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ کی سکھلا دی اور اس کو قرآن میں نازل کیا اور قرآن اسی سے شروع ہوا اور یہ دعا مسلمانوں کی نمازوں میں داخل کر دی تاکہ وہ کسی وقت سوچیں اور سمجھیں کہ کیوں ان کو یہود کی اس سیرت سے ڈرایا گیا جس سیرت کو یہود نے نہایت بُرے طور سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ظاہر کیا تھا۔ (تحفہ گولڑویہ ص۶۷)

چونکہ اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ حسب وعدہ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ آخری خلیفہ اس اُمت کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رنگ میں آئے گا اور ضرور ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح قوم کے ہاتھ سے دُکھ اُٹھائے اور اس پر کفر کا فتویٰ لکھا جاوے اور اس کے قتل کے ارادے کئے جائیں اس لئے ترحم کے طور پر تمام مسلمانوں کو یہ دعا سکھلائی کہ تم خدا سے پناہ چاہو کہ تم اُن یہودیوں کی طرح نہ بن جاؤ جنہوں نے موسوی سلسلہ کے مسیح موعود کو کافر ٹھہرایا تھا اور اس کی توہین کرتے تھے اور ان کو گالیاں دیتے تھے۔" (تحفہ گولڑویہ ص۶۸،۶۹)

اَنْتَ تَقْرَءُ قَوْلَهُ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ وَ تَقْرَءُ قَوْلَهُ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فَفَکِّرْ فِیْ قَوْلِهٖ مِنْکُمْ فِیْ سُوْرَةِ النُّوْرِ وَاتْرُكِ الظَّالِمِیْنَ وَظَنَّهُمْ۔ اَلَمْ یَأْنِ لَكَ اَنْ تَعْلَمَ عِنْدَ قِرَاءَةِ هٰذِهِ الْاٰیَاتِ۔ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ جَعَلَ الْخُلَفَاءَ کُلَّهُمْ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ بِالْعِنَایَاتِ۔ فَکَیْفَ یَأْتِی الْمَسِیْحُ الْمَوْعُوْدُ مِنَ السَّمٰوٰتِ۔ اَلَیْسَ الْمَسِیْحُ الْمَوْعُوْدُ عِنْدَكَ مِنَ الْخُلَفَاءِ فَکَیْفَ تَحْسَبُهُ مِنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ وَمِنْ تِلْكَ الْاَنْبِیَاءِ۔ اَتَتْرُكُ الْقُرْاٰنَ وَفِی الْقُرْاٰنِ کُلُّ الشِّفَاءِ اَوْ تَغَلَّبَتْ عَلَیْكَ شِقْوَتُكَ فَتَتْرُكُ مُتَعَمِّدًا طَرِیْقَ الْاِهْتِدَاءِ۔ اَلَا تَرٰی قَوْلَهُ تَعَالٰی کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فِیْ هٰذِهِ السُّوْرَةِ۔ فَوَجَبَ اَنْ یَکُوْنَ الْمَسِیْحُ الْاٰتِیْ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ لَا مِنْ غَیْرِهِمْ بِالضَّرُوْرَةِ۔ فَاِنَّ لَفْظَ کَمَا یَأْتِیْ لِلْمُشَابَهَةِ وَالْمُمَاثَلَةِ۔ وَالْمُشَابَهَةُ تَقْتَضِیْ قَلِیْلًا مِنَ الْمُغَایِرَةِ۔ وَلَا یَکُوْنُ شَیْءٌ مُشَابِهَ نَفْسِهٖ کَمَا هُوَ مِنَ الْبَدِیْهِیَّاتِ۔ فَثَبَتَ بِنَصٍّ قَطْعِیٍّ اَنَّ عِیْسَی الْمُنْتَظَرَ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَهٰذَا یَقِیْنِیٌّ وَمُنَزَّهٌ عَنِ الشُّبُهَاتِ۔ هٰذَا مَا قَالَ الْقُرْاٰنُ وَیَعْلَمُهُ الْعَالِمُوْنَ۔ (اعجاز المسیح صفحہ ۱۷۴، ۱۷۵)

(ترجمہ از مرتب) اور تو خدا کا قول وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ بھی پڑھتا ہے اور اس کا قول لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ بھی پڑھتا ہے۔ پس تو سورۂ نور میں خدا تعالیٰ کے لفظ مِنْکُمْ میں غور کر اور ظالموں اور انکے اوہام کو چھوڑ دے۔ کیا تیرے لئے ابھی یہ وقت نہیں آیا کہ تو ان آیات کو پڑھ کر یہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تمام کے تمام خلفاء کو اسی اُمت میں سے بنانا مقدر کیا ہے تو پھر مسیح موعود کس طرح آسمانوں سے اُترے گا۔ کیا تمہارے نزدیک مسیح موعود خلفاء میں شامل نہیں۔ پھر تم مسیح موعود کو بنی اسرائیل اور بنی اسرائیل کے نبیوں میں سے کیوں گمان کرتے ہو۔ کیا تم قرآن کریم کو چھوڑتے ہو حالانکہ ہر قسم کی شفاء قرآن کریم میں ہے۔ کیا تم پر تمہاری بدبختی غالب آگئی ہے اور تم عمدًا ہدایت کا رستہ ترک کر رہے ہو۔ کیا تم اس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کے الفاظ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ کو نہیں دیکھتے۔ پس ضروری ہوا کہ آنے والا مسیح اسی اُمت میں سے ہو نہ کہ اُمت کے باہر سے۔ کیونکہ کَمَا کا لفظ مشابہت اور مماثلت کے لئے آتا ہے اور مشابہت کسی قدر مغائرت کو چاہتی ہے اور یہ ایک بدیہی امر ہے کہ کوئی چیز اپنے آپ کے مشابہ نہیں ہوا کرتی۔ پس قطعی نص سے ثابت ہوگیا کہ جس عیسٰی کا انتظار کیا جا رہا ہے وہ اسی اُمت میں سے ہے۔ اور یہ بات یقینی اور شبہات سے پاک ہے یہ قرآن کریم کا فرمودہ ہے اور عالم لوگ اسے خوب جانتے ہیں۔ پس اس کے بعد تم کونسی بات مانو گے؟

وَقَدْ سَمِعْتَ مِنْ قَبْلُ اَنَّ سُوْرَةَ النُّوْرِ قَدْ بَشَّرَتْنَا بِسِلْسِلَةِ خُلَفَاءٍ تُشَابِهُ سِلْسِلَةَ خُلَفَاءِ الْكَلِيْمِ۔ وَكَيْفَ تَتِمُّ الْمُشَابَهَةُ مِنْ دُوْنِ اَنْ يَّظْهَرَ مَسِيْحٌ كَمَسِيْحِ سِلْسِلَةِ الْكَلِيْمِ فِيْ اٰخِرِ سِلْسِلَةِ النَّبِيِّ الْكَرِيْمِ۔ وَاِنَّا اٰمَنَّا بِهٰذَا الْوَعْدِ فَاِنَّهٗ مِنْ رَّبِّ الْعِبَادِ۔ وَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۔ وَالْعَجَبُ مِنَ الْقَوْمِ اَنَّهُمْ مَا نَظَرُوْا اِلٰى وَعْدِ حَضْرَةِ الْكِبْرِيَاءِ وَهَلْ يُوَفّٰى وَيُنْجَزُ اِلَّا الْوَعْدُ فَلْيَنْظُرُوْا بِالتَّقْوٰى وَالْحَيَاءِ۔ وَهَلْ فِيْ شِرْعَةِ الْاِنْصَافِ اَنْ يُّنَزَّلَ الْمَسِيْحُ مِنَ السَّمَاءِ وَيُخْلَفُ وَعْدُ مُمَاثَلَةِ سِلْسِلَةِ الْاِسْتِخْلَافِ۔ وَاِنَّ تَشَابُهَ السِّلْسِلَتَيْنِ قَدْ وَجَبَ بِحُكْمِ اللّٰهِ الْغَيُوْرِ۔ كَمَا هُوَ مَفْهُوْمٌ مِّنْ لَفْظِ كَمَا فِيْ سُوْرَةِ النُّوْرِ۔ (اعجاز المسیح صفحہ ۱۸۴، ۱۸۵)

اَيُّهَا الْعُلَمَاءُ فَكِّرُوْا فِيْ وَعْدِ اللّٰهِ۔ وَاتَّقُوا الْمُقْتَدِرَ الَّذِيْ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔ اِنَّهٗ جَعَلَ النُّبُوَّةَ وَالْخِلَافَةَ فِيْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ ثُمَّ اَهْلَكَهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ۔ وَبَعَثَ نَبِيَّنَا بَعْدَهُمْ وَجَعَلَهٗ مَثِيْلَ مُوْسٰى فَاقْرَءُوْا سُوْرَةَ الْمُزَّمِّلِ اِنْ كُنْتُمْ

(ترجمہ از مرتب) تم پہلے سن چکے ہو کہ سورۃ نور ہمیں ایسے سلسلہ خلفاء کی بشارت دے رہی ہے جو سلسلہ موسویہ کے مشابہ ہوں گے اور یہ مشابہت سوائے اس کے کس طرح پوری ہو سکتی ہے کہ موسوی سلسلہ کے مسیح کی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ کے آخر میں بھی ایک مسیح ظاہر ہو اور ہم اس وعدہ پر ایمان رکھتے ہیں کیونکہ یہ وعدہ رب العباد کی طرف سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ وہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ اوران لوگوں پر تعجب ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کی طرف توجہ نہیں کی حالانکہ وعدہ کا ایفاء لازمی ہوتا ہے۔ پس تقویٰ اور حیاء کے ساتھ دیکھو کیا یہ طریق انصاف ہے کہ مسیح آسمان سے اُتارا جائے اور سلسلہ استخلاف کے وعدہ کی خلاف ورزی کرائی جائے اور ہر دو سلسلہ کا تشابہ خدائے غیور کے حکم سے ضروری ہے۔ چنانچہ سورۃ نور کے لفظ کما سے یہ بات سمجھی جاسکتی ہے۔ (اعجاز المسیح صفحہ ۱۸۴، ۱۸۵)

(ترجمہ از مرتب) اے علماء! اللہ تعالیٰ کے وعدہ کے بارے میں غور کرو اور اس خدائے مقتدر سے ڈرو جس کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ اللہ نے بنی اسرائیل میں نبوّت اور خلافت کا سلسلہ چلایا پھر ان کو ان کی زیادتیوں کے باعث ہلاک کر دیا اور ان کے بعد ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور آپ کو مثیلِ موسیٰ قرار دیا۔ اگر تمہیں اس کے متعلق شک و شبہ ہو تو سورۃ مزمّل پڑھو۔

تَشُكُّوْنَ۔ هٰذَانِ وَعْدَانِ مِنَ اللّٰهِ فَلَا تُحَرِّفُوْا كَلِمَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تَتَّقُوْنَ۔ وَلِذَالِكَ
بُدِءَ سِلْسِلَةُ نَبِيِّنَا مِنْ مَثِيْلِ مُوْسٰى۔ وَخُتِمَ عَلٰى مَثِيْلِ عِيْسٰى لِيَتِمَّ وَعْدُ اللّٰهِ صِدْقًا
وَحَقًّا۔ اِنَّ فِىْ ذَالِكَ لَاٰيَةً لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ وَكَانَ مِنَ الْوَاجِبِ اَنْ يَتَسَاوَى السِّلْسِلَتَانِ
اَلْاَوَّلُ كَالْاَوَّلِ وَالْاٰخِرُ كَالْاٰخِرِ اَلَا تَقْرَءُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَوْ بِهٖ تَكْفُرُوْنَ۔ فَاِنْ تَمَنَّيْتُمْ اَنْ
يَنْزِلَ عِيْسٰى بِنَفْسِهٖ فَقَدْ كَذَّبْتُمُ الْقُرْاٰنَ وَمَا اقْتَبَسْتُمْ مِنْ سُوْرَةِ النُّوْرِ نُوْرًا وَ
بَقِيْتُمْ مَعَ النُّوْرِ كَقَوْمٍ لَا يُبْصِرُوْنَ۔ اَتَبْغُوْنَ عِوَجًا بَعْدَ اَنْ تَسَاوَى السِّلْسِلَتَانِ۔
اِتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْدِلُوا الْمِيْزَانَ۔ مَا لَكُمْ لَا تَتَفَقَّهُوْنَ۔ وَكَانَ وَعْدُ اللّٰهِ اَنَّهٗ يَسْتَخْلِفُ مِنْكُمْ
وَمَا كَانَ وَعْدُهٗ اَنْ يَسْتَخْلِفَ مِنْ بَنِىْ اِسْرَائِيْلَ۔ فَلَا تَتَّبِعُوْا فَيْجًا اَعْوَجَ وَتَعَالَوْا اِلٰى
حُكْمِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَسْتَرْشِدُوْنَ۔ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تُفَضِّلُوْا عَلٰى سِلْسِلَةِ نَبِيِّكُمْ سِلْسِلَةَ
مُوْسٰى۔ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى۔ فَلِمَ لَا تَنْتَهُوْنَ۔ اَلَا تَقْرَءُوْنَ سُوْرَةَ النُّوْرِ اَوْ عَلَى
الْقُلُوْبِ اَقْفَالُهَا اَوْ اِلَى اللّٰهِ لَا تُرَدُّوْنَ۔ وَاِنَّ الْقُرْاٰنَ عَدَّلَ الْمِيْزَانَ۔ وَاَعْطٰى نَبِيَّنَا

اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ دو وعدے ہیں۔ اگر تم متقی ہو تو اللہ کے کلام میں تحریف کے مرتکب نہ ہو اور اسی لئے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ کو مثیلِ موسیٰ سے شروع کیا گیا اور اسے مثیلِ عیسیٰ پر ختم کیا گیا تا اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورے طور پر سچا ثابت ہو۔ اس میں سوچنے والوں کے لئے ایک بڑا نشان ہے اور یہ ضروری تھا کہ دونوں سلسلے برابر ہوں۔ پہلے کی ابتداء دوسرے کی ابتداء کی طرح اور پہلے کی انتہاء دوسرے کی انتہاء کی مانند۔ کیا تم قرآن مجید نہیں پڑھتے یا تم اس کا انکار کرتے ہو۔ اگر تم یہ چاہتے کہ بعینہٖ عیسیٰ نازل ہوں تو تم نے قرآن کریم کو جھٹلا دیا اور تم نے سورہ نور سے کوئی نور حاصل نہیں کیا اور نور کی موجودگی میں بھی تم ایسے لوگوں کی مانند ہی رہے جو نہیں دیکھتے۔ کیا تم سلسلہ موسوی اور سلسلہ محمدی کے برابر ہونے کے بعد کج روی اختیار کرنا چاہتے ہو، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میزان کو برابر رکھو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم بات سمجھتے نہیں۔ اللہ کا وعدہ تھا کہ وہ تم میں سے خلیفہ بنائے گا اور اس کا یہ وعدہ نہیں تھا کہ وہ بنی اسرائیل میں سے خلیفہ بنائے گا۔ پس تم فیج اعوج کی پیروی نہ کرو اور اپنے رب کے فیصلے کو قبول کرو۔ اگر تم ہدایت کے طالب ہو کیا تم چاہتے ہو کہ تم موسوی سلسلہ کو اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ پر فضیلت دو۔ یہ تو سراسر غلط تقسیم ہے پس کیوں تم اس بات سے نہیں رکتے کیا تم سورہ نور کو نہیں پڑھتے یا دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں یا تم اللہ کی طرف نہیں لوٹائے جاؤ گے۔ قرآن کریم نے میزان کو برابر رکھا ہے اور ہمارے نبی کریم

كُلَّمَا اَعْطٰى مُهْلِكَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ۔ فَمَا لَكُمْ لَا تَعْدِلُوْنَ۔ وَقَدْ بَلَّغَ الْقُرْاٰنُ اَمْرَهٗ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ۔ اَتَخْتَارُوْنَ اَهْوَاءَكُمْ عَلٰى كِتَابِ اللّٰهِ اَوْ بَلَغَكُمْ عِلْمٌ يُّسَاوِي الْقُرْاٰنَ فَاَخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ كُنْتُمْ تَصْدُقُوْنَ۔ كَلَّا بَلْ وَجَدُوْا كُبَرَاءَهُمْ عَلَيْهِ فَهُمْ عَلٰى اٰثَارِهِمْ يُهْرَعُوْنَ۔ وَقَدْ سَوَّى اللّٰهُ السِّلْسِلَتَيْنِ وَهُمْ يَزِيْدُوْنَ وَيَنْقُصُوْنَ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ اتَّخَذَ سَبِيْلًا غَيْرَ سَبِيْلِ الْقُرْاٰنِ۔ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ يَا حَسْرَةً عَلَيْهِمْ۔ اَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَوْ هُمْ قَوْمٌ عَمُوْنَ۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَتَتْرُكُوْنَ كِتَابَ اللّٰهِ قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَاءَنَا وَلَوْ كَانَ اٰبَاؤُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ۔ اَتَتْرُكُوْنَ كَلَامَ رَبِّكُمْ لِاٰبَاءِكُمْ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْمَلُوْنَ۔ وَقَالُوْا اِنَّا رَاَيْنَا فِي الْاَحَادِيْثِ۔ وَمَا فَهِمُوْا قَوْلَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَعْمَهُوْنَ۔ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ كِتَابِ اللّٰهِ وَبَيْنَ قَوْلِ رَسُوْلِهٖ۔ قَوْمٌ مُّفْتَرُوْنَ۔ وَقَدْ صَرَّحَ اللّٰهُ

صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ سب کچھ دیا جو فرعون اور ہامان کو ہلاک کرنے والا موسیٰ علیہ السلام کو دیا تھا پھر تم کیوں انصاف نہیں کرتے۔ قرآن کریم نے اپنا فیصلہ تمہیں پہنچا دیا ہے۔ پس جس نے اس فیصلے کے بعد انکار کیا تو ایسے لوگ فاسق ہیں۔ کیا تم اللہ تعالیٰ کی کتاب کے مقابلے میں اپنی خواہشات کو ترجیح دیتے ہو یا پھر تمہیں کوئی ایسا علم مل گیا ہے جو قرآن کریم کے مساوی ہے۔ سو اگر تم سچے ہو تو اس علم کو نکال کر ہمارے سامنے پیش کرو لیکن تم ہرگز ایسا نہیں کر سکو گے۔ اصل بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنے بڑوں کو اس راستے پر چلتے پایا تھا اور یہ انہی کے نقشِ قدم پر بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں سلسلوں کو برابر قرار دیا ہے اور یہ لوگ ان میں کمی بیشی کر رہے ہیں۔ پس اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے جو قرآن کریم کے رستہ کو چھوڑ کر اپنا الگ رستہ بناتا ہے۔ سنو ان لوگوں پر خدا کی لعنت ہے جو ظلم کرتے ہیں۔ ہائے افسوس کیا یہ لوگ قرآن کریم پر تدبر نہیں کرتے یا پھر وہ اندھے ہیں۔ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ تم تو اللہ کی کتاب کو چھوڑ رہے ہو تو وہ کہتے ہیں ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریق پر پایا ہے اگرچہ ان کے باپ دادا کچھ بھی علم و عقل نہ رکھتے ہوں۔ کیا تم اللہ کے کلام کو اپنے آباؤ اجداد کی خاطر چھوڑتے ہو۔ افسوس ہے تم پر اور اس کام پر جو تم کر رہے ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے احادیث میں ایسا دیکھا ہے حالانکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کو نہیں سمجھے اور صرف اندھیرے میں بھٹک رہے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ کتاب اللہ اور قولِ رسول میں تفریق پیدا کریں۔ یہ لوگ تو افتراء کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ

حَقَّ التَّصْرِیْحِ فِی الْفُرْقَانِ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ۔ یُؤْثِرُوْنَ الشَّكَّ عَلَی الْیَقِیْنِ وَھٰذَا ھُوَ مِنْ سِیَرِ قَوْمٍ یَھْلِکُوْنَ۔ اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ ھٰذَا کَانَ وَعْدًا مِّنَ اللّٰهِ۔ فَسَوّٰی السِّلْسِلَتَیْنِ کَمَا وَعَدَ فَمَا لَکُمْ تُجَوِّزُوْنَ الْخُلْفَ عَلَی اللّٰهِ وَلَا تَخَافُوْنَ۔ اَتَعْزُوْنَ اِلَی اللّٰهِ نَکْثَ الْعَھْدِ وَالْوَعْدِ۔ سُبْحَانَهٗ وَتَعَالٰی عَمَّا تَزْعُمُوْنَ اَظَنَنْتُمْ اَنَّ سِلْسِلَةَ الْمُصْطَفٰی لَا تُشَابِهُ سِلْسِلَةَ مُوْسٰی وَاِنْ ھٰذَا اِلَّا تَکْذِیْبُ الْقُرْاٰنِ اِنْ کُنْتُمْ تَفْھَمُوْنَ۔ اَلَا یُشَابِهُ اَوَّلُھَا بِاَوَّلِھَا وَاٰخِرُھَا بِاٰخِرِھَا سَاءَ مَا تَحْکُمُوْنَ۔ اَرَفَعْتُمْ مُوْسٰی وَوَضَعْتُمُ الْمُصْطَفٰی اُفٍّ لَّکُمْ وَلِمَا تَصْنَعُوْنَ۔ اَتُخْسِرُوْنَ الْقِسْطَاسَ بَعْدَ تَعْدِیْلِهٖ وَلَا تَعْدِلُوْنَ کِفَّتَیْهِ وَلَا تُقْسِطُوْنَ۔ وَاِنَّ اللّٰهَ اَرٰی فَضْلَ ھٰذِهِ السِّلْسِلَةِ بِخَتْمِ الْاَمْرِ عَلَیْھَا ثُمَّ تَاْتُوْنَ بِعِیْسٰی وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ مَا لَکُمْ لَا تُؤْتُوْنَ ذَا فَضْلٍ فَضْلَهٗ وَتَظْلِمُوْنَ اَتَقْطَعُوْنَ رِجْلَ ھٰذِهِ السِّلْسِلَةِ وَتُبْقُوْنَ رَأْسَھَا وَمَا ھٰذَا اِلَّا فِعْلُ الْمَجْنُوْنِ۔ (الہدیٰ ص۸۱ تا ۸۳)

نے فرقان مجید میں خوب کھول کر بیان کر دیا ہے۔ پس وہ قرآن کو چھوڑ کر اور کس بات پر ایمان لائیں گے یہ لوگ شک کو یقین پر ترجیح دیتے ہیں اور یہ ہلاک ہونے والوں کا راستہ ہے۔ اے لوگو! سنو! یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک وعدہ تھا اور اس نے دونوں سلسلوں کو اپنے وعدہ کے مطابق برابر کر دیا پس کیوں تم اللہ تعالیٰ کے متعلق خلاف ورزی جائز قرار دیتے ہو اور اس سے ڈرتے نہیں۔ کیا تم اللہ تعالیٰ کی طرف عہد شکنی منسوب کرتے ہو۔ وہ ذات اس سے جو تم خیال کرتے ہو پاک اور بلند ہے۔ کیا تم نے خیال کر لیا کہ سلسلہ محمدی سلسلہ موسوی کے مشابہ نہیں۔ اور یہ تو قرآن کریم کی تکذیب ہے اگر تم سمجھو۔ کیا اس کی ابتداء اس کی ابتداء سے اور اس کی انتہاء اس کی انتہاء سے مشابہ نہیں۔ تم بہت برا فیصلہ کر رہے ہو۔ کیا تم موسیٰ علیہ السلام کی شان کو بلند کرو گے اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو کم کرو گے۔ افسوس تم پر اور اس کارروائی پر جو تم کرتے ہو۔ کیا تم میزان کو اس کے برابر ہونے کے بعد کم کر رہے ہو اور تم اس کے دونوں پلڑوں کو برابر نہیں کرتے اور تم انصاف سے کام نہیں لیتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے پر شریعت کو ختم کر کے اس کی فضیلت ظاہر کر دی ہے۔ پھر باوجود اس کے جانتے بوجھتے ہوئے تم عیسیٰ کو لاتے ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم صاحب فضیلت کو اس کی فضیلت نہیں دیتے اور اس کا حق مارتے ہو۔ کیا تم اس سلسلہ کے پاؤں کاٹنا چاہتے ہو اور اس کے سر کو باقی رکھنا چاہتے ہو۔ اور یہ تو صرف ایک مجنون کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ (الہدیٰ ص۸۱ تا ۸۳)

وَاَمَّا الْمَسِيْحُ الْمَوْعُوْدُ فَهُوَ مِنْكُمْ كَمَا وَعَدَ اللّٰهُ فِيْ سُوْرَةِ النُّوْرِ۔ وَهُوَ اَمْرٌ وَاضِحٌ وَلَيْسَ كَالسِّرِّ الْمَسْتُوْرِ۔ وَاِنَّهٗ اِمَامُكُمْ مِنْكُمْ كَمَا جَاءَ فِيْ حَدِيْثِ الْبُخَارِيِّ وَالْمُسْلِمِ۔ وَمَنْ كَفَرَ بِشَهَادَةِ الْقُرْاٰنِ وَشَهَادَةِ الْحَدِيْثِ فَهُوَ لَيْسَ بِمُسْلِمٍ۔

(الہدٰی صـــ۱۱۲)

قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ فِيْ كِتَابِهِ الْمُبِيْنِ: وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا۔ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ وَمَاْوٰهُمُ النَّارُ وَلَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۔ هٰذَا مَا بَشَّرَ رَبُّنَا لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَاَخْبَرَ عَنْ عَلَامَاتِ الْمُسْتَخْلِفِيْنَ

(ترجمہ از مرتب) مسیح موعود تم ہی میں سے ہوگا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے سورہ نور میں وعدہ کیا ہے اور یہ ایک واضح امر ہے اور چھپا ہوا راز نہیں۔ اور تم میں سے ہی تمہارا امام ہوگا جیسا کہ حدیث بخاری اور مسلم میں آیا ہے۔ اور جو قرآن کریم اور حدیث کی گواہی کا انکار کرتا ہے تو وہ مسلمان نہیں۔

(الہدٰی صـــ۱۱۲-۱۱۳)

ترجمہ از مرتب) اللہ عزّ وجلّ نے اپنی کتابِ مبین میں فرمایا ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الخ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایمان لانے والوں اور مناسب حال عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین میں خلیفہ بنا دے گا جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنا دیا تھا۔ اور جو دین ان کے لئے پسند کیا ہے وہ ان کے لئے اسے مضبوطی سے قائم کر دے گا اور ان کے خوف کی حالت کے بعد وہ ان کے لئے امن کی حالت تبدیل کر دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے اور کسی چیز کو میرا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔ اور جو لوگ اس کے بعد بھی انکار کریں گے وہ نافرمانوں میں سے قرار دئے جائیں گے۔ اور تم سب نمازوں کو قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اس رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے اور کبھی خیال نہ کرو کہ کفار زمین میں ہمیں اپنی تدبیروں سے عاجز کر دیں گے اور ان کا ٹھکانا تو دوزخ ہے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ یہ وہ بشارت ہے جو ہمارے ربّ نے مومنوں کو دی ہے اور اللہ نے مومنوں میں سے خلیفہ بننے والوں کی علامتیں بتا

فمن اتى الله للاستماحة وما سلك مسلك الوقاحة وما شدّ جبائر التلبيس على
ساعد الصراحة فلا بدّ له من ان يقبل هذا الدليل ويترك المعاذير والاقاويل
ويأخذ طرق الصالحين۔

واما تفصيله ليبدو عليك دليله فاعلموا يا اولى الالباب والفضل اللباب ان
الله قد وعد في هذه الآيات للمسلمين والمسلمات انه سيستخلفنّ بعض المؤمنين
منهم فضلا ورحما ويبدّلنّهم من بعد خوفهم امنا. فهذا امر لا تجد مصداقه على
وجه اتمّ واكمل الا خلافة الصديق فان وقت خلافته كان وقت الخوف والمصائب
كما لا يخفى على اهل التحقيق. فان رسول الله صلى الله عليه وسلم لما توفي نزلت
المصائب على الاسلام والمسلمين وارتدّ كثير من المنافقين وتطاولت السنة
المرتدين وادّعى النبوة نفر من المفترين. واجتمع عليهم كثير من اهل البادية
حتى لحق بمسيلمة قريب من مائة الف من الجهلة الفجرة وهاجت الفتن وكثرت

دی ہیں۔ پس جو شخص اللہ تعالیٰ کی درگاہ میں مانگنے کے لئے آئے گا اور بے حیائی کے راستے پر گامزن نہیں ہوگا
اور مکر و فریب کی پٹیاں صراحت کی کلائی پر نہیں باندھے گا اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس دلیل کو
قبول کرے اور حیلے بہانے اور جھوٹی باتیں چھوڑ دے اور صالحین کا طریق اختیار کرے۔

لیکن اس کی تفصیل کے متعلق اے عقلمندو اور اعلیٰ فضیلت والو جان لو تاکہ تم پر اس کی دلیل
واضح ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں مسلمان مردوں اور عورتوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ضرور ان
میں سے بعض مومنوں کو اپنے فضل اور رحمت سے خلیفہ بنائے گا اور ان کے خوف کو امن میں بدل
دے گا۔ پس یہ ایک ایسی بات ہے جس کا پورا اور مکمل مصداق ہم حضرت ابوبکر صدیقؓ کی خلافت کو
پاتے ہیں جیسا کہ اہلِ تحقیق کے نزدیک یہ امر واضح ہے کہ ان کی خلافت کا زمانہ ایک خوف و مصائب کا
زمانہ تھا کیونکہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو اسلام اور مسلمانوں پر طرح طرح کی
مصیبتیں نازل ہوئیں اور بہت سارے منافق مُرتد ہو گئے اور مرتدین کی زبانیں دراز ہو گئیں اور
جھوٹے دعویداروں سے ایک گروہ نے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور ان کے گرد بہت سارے بادیہ نشین
جمع ہو گئے یہاں تک کہ مسیلمہ کے ساتھ قریباً ایک لاکھ جاہل اور فاجر لوگ آشامل ہوئے اور
فتنوں نے جوش مارا اور مصائب بڑھ گئے اور قسم قسم کی بلاؤں نے دُور و نزدیک سے مسلمانوں

المِحَنُ وَاَحَاطَتِ الْبَلَايَا قَرِيْبًا وَبَعِيْدًا وَزُلْزِلَ الْمُؤْمِنُوْنَ زِلْزَالًا شَدِيْدًا هُنَالِكَ ابْتُلِيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مِنَ النَّاسِ وَظَهَرَتْ حَالَاتٌ مُخَوِّفَةٌ مُدْهِشَةُ الْحَوَاسِ وَكَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ مُضْطَرِّيْنَ كَاَنَّ جَمْرًا اُضْرِمَتْ فِيْ قُلُوْبِهِمْ اَوْ ذُبِحُوْا بِالسِّكِّيْنِ وَكَانُوْا يَبْكُوْنَ تَارَةً مِنْ فِرَاقِ خَيْرِ الْبَرِيَّةِ وَاُخْرٰى مِنْ فِتَنٍ ظَهَرَتْ كَالنِّيْرَانِ الْمُحْرِقَةِ وَلَمْ يَكُنْ اَثَرًا مِنْ اَمْنٍ وَغُلِبَتِ الْمَفْتَتِنُوْنَ كَخَضْرَاءِ دِمَنٍ فَزَادَ الْمُؤْمِنُوْنَ خَوْفًا وَفَزَعًا وَمُلِئَتِ الْقُلُوْبُ وَهْشًا وَجَزَعًا فَفِيْ ذٰلِكَ الْاٰوَانِ جُعِلَ اَبُوْبَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ حَاكِمَ الزَّمَانِ وَخَلِيْفَةَ خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ فَغَلَبَ عَلَيْهِ هَمٌّ وَغَمٌّ مِنْ اَطْوَارٍ رَاٰهَا وَمِنْ اٰثَارٍ شَاهَدَهَا فِي الْمُنَافِقِيْنَ وَالْكَافِرِيْنَ وَالْمُرْتَدِّيْنَ وَكَانَ يَبْكِيْ كَمَرَابِيْعِ التَّرْبِيْعِ وَتَجْرِيْ عَبَرَاتُهٗ كَالْيَنَابِيْعِ وَيَسْئَلُ اللّٰهَ خَيْرَ الْاِسْلَامِ وَالْمُسْلِمِيْنَ۔

وَعَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ لَمَّا جُعِلَ اَبِيْ خَلِيْفَةً وَفَوَّضَ اللّٰهُ اِلَيْهِ الْاِمَارَةَ

کا احاطہ کر لیا اور مومن ایک سخت زلزلہ میں مبتلا کئے گئے اور مسلمانوں میں سے ہر فرد آزمائش میں ڈالا گیا اور خوفناک اور حواس کو دہشت ناک کرنے والے حالات پیدا ہو گئے اور مومن بے چارگی کی حالت کو پہنچ گئے۔ گویا ایک انگارا تھا جو ان کے دلوں میں بھڑکایا گیا یا یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ چھری کے ساتھ ذبح کر دیئے گئے ہیں کبھی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فراق کی وجہ سے اور کبھی آگ کی مانند جلا دینے والے فتنوں کی وجہ سے روتے تھے اور امن و امان کا کوئی نشان باقی نہ رہا اور فتنوں میں پڑے ہوئے مسلمان ایسے مغلوب ہو گئے جیسے روڑی کے اوپر اُگی ہوئی گھاس اس کو ڈھانپ لیتی ہے۔ پس مومنوں کا خوف اور گھبراہٹ بڑھ گیا اور ان کے دل دہشت اور کرب سے بھر گئے تو ایسے وقت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو زمانے کا حاکم اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا خلیفہ بنایا گیا۔ اسلام پر حالاتِ واردہ کی وجہ سے اور ان باتوں کی وجہ سے جو آپ نے منافقوں، کافروں اور مرتدین کی طرف سے دیکھیں۔ آپ پر سخت غم طاری ہو گیا اور آپ موسم ربیع کی بارش کی طرح روتے تھے اور آپ کے آنسو چشموں کی طرح بہتے تھے اور آپ اللہ تعالیٰ سے اسلام اور مسلمانوں کی بہتری اور بھلائی چاہتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب میرے باپ خلیفہ بنائے گئے اور اللہ تعالیٰ نے امرِ خلافت

فَرَأَى بِمُجَرَّدِ الْاِسْتِخْلَافِ تَمَوُّجَ الْفِتَنِ مِنْ كُلِّ الْأَطْرَافِ وَمَوْرَ الْمُتَنَبِّئِيْنَ الْكَاذِبِيْنَ
وَبَغَاوَةَ الْمُرْتَدِّيْنَ الْمُنَافِقِيْنَ. فَصُبَّتْ عَلَيْهِ مَصَائِبُ لَوْ صُبَّتْ عَلَى الْجِبَالِ لَانْهَدَّتْ
وَسَقَطَتْ وَانْكَسَرَتْ فِي الْحَالِ وَلٰكِنَّهٗ أُعْطِيَ صَبْرًا كَالْمُرْسَلِيْنَ. حَتّٰى جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ
قُتِلَ الْمُتَنَبِّئُوْنَ وَأُهْلِكَ الْمُرْتَدُّوْنَ وَأُزِيْلَ الْفِتَنُ وَدُفِعَ الْمِحَنُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ
وَاسْتَقَامَ أَمْرُ الْخِلَافَةِ وَنَجَّا اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنَ الْآفَةِ وَبَدَّلَ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ
أَمْنًا وَمَكَّنَ لَهُمْ دِيْنَهُمْ وَأَقَامَ عَلَى الْحَقِّ زَمَنًا وَسَوَّدَ وُجُوْهَ الْمُفْسِدِيْنَ وَأَنْجَزَ
وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهُ الصِّدِّيْقَ وَأَبَادَ الطَّوَاغِيْتَ وَالْغَرَانِيْقَ وَأَلْقَى الرُّعْبَ فِي قُلُوْبِ
الْكُفَّارِ فَانْهَزَمُوْا وَرَجَعُوْا وَتَابُوْا وَكَانَ هٰذَا وَعْدٌ مِّنَ اللّٰهِ الْقَهَّارِ وَهُوَ أَصْدَقُ
الصَّادِقِيْنَ. فَانْظُرْ كَيْفَ تَمَّ وَعْدُ الْخِلَافَةِ مَعَ جَمِيْعِ لَوَازِمِهٖ وَأَمَارَاتِهٖ فِي الصِّدِّيْقِ
وَادْعُ اللّٰهَ أَنْ يَشْرَحَ صَدْرَكَ لِهٰذَا التَّحْقِيْقِ. وَتَدَبَّرْ كَيْفَ كَانَتْ حَالَةُ الْمُسْلِمِيْنَ
فِيْ وَقْتِ اسْتِخْلَافِهٖ وَقَدْ كَانَ الْإِسْلَامُ مِنَ الْمَصَائِبِ كَالْحَرِيْقِ ثُمَّ رَدَّ اللّٰهُ الْكَرَّةَ

آپ کو تفویض کیا تو آپ نے خلیفہ بنتے ہی فتنوں کو ہر طرف سے موجزن پایا اور یہ کہ جھوٹے نبوّت کے
مدعی جوش میں ہیں اور منافق مرتد لوگ بغاوت پر آمادہ ہیں سو آپ پر اس قدر مصائب آپڑے کہ اگر
پہاڑوں پر اتنی مصیبتیں نازل ہوتیں تو وہ ٹوٹ کر گر جاتے اور ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ لیکن آپ کو
رسولوں کی طرح ایک صبر عطا کیا گیا یہاں تک کہ اللہ کی نصرت آئی اور جھوٹے مدعیانِ نبوّت قتل
کئے گئے اور مرتد ہلاک کر دیئے گئے اور فتنوں اور مصائب کا قلع قمع کر دیا گیا اور معاملے کا فیصلہ
کر دیا گیا اور امرِ خلافت مضبوط ہو گیا اور اللہ نے مومنوں کو مصیبت سے نجات بخشی اور ان پر خوف
طاری ہونے کے بعد اسے امن میں بدل دیا اور ان کے دین کو مضبوط کر دیا۔ اور مفسدین کے منہ
کالے کر دیئے اور اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اپنے بندے ابو بکر صدیق کی مدد فرمائی اور سرکشوں اور
بڑے بڑے بتوں کو تباہ کر دیا اور کفّار کے دلوں میں رعب ڈال دیا پس وہ شکست کھا گئے اور انہوں نے حق
کی طرف رجوع کیا اور سرکشی سے توبہ کی اور یہ غالب خدا کا وعدہ تھا جو تمام سچوں سے زیادہ سچا ہے پس
دیکھو کس طرح خلافت کا وعدہ اپنے تمام لوازم اور نشانات کے ساتھ حضرت ابو بکرؓ کی ذات میں پورا ہوا اور
تمہیں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیئے کہ وہ تمہارا سینہ اس تحقیق کے لئے کھول دے۔ اور غور کرو کہ حضرت ابو بکرؓ
کے خلیفہ منتخب ہونے کے وقت مسلمانوں کی کیسی کمزور حالت تھی اور اسلام مصائب کی وجہ سے ایک جلتے ہوئے شخص

عَلَی الْاِسْلَامِ وَ اَخْرَجَهٗ مِنَ الْبِئْرِ الْعَمِيْقِ وَقُتِلَ الْمُتَنَبِّئُوْنَ بِاَشَدِّ الْاٰلَامِ وَ اُهْلِكَ الْمُرْتَدُّوْنَ كَالْاَنْعَامِ وَ اٰمَنَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ خَوْفٍ كَانُوْا فِيْهِ كَالْمَيِّتِيْنَ۔ وَكَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ يَسْتَبْشِرُوْنَ بَعْدَ رَفْعِ هٰذَا الْعَذَابِ وَ يُهَنِّئُوْنَ الصِّدِّيْقَ وَ يَتَلَقَّوْنَهٗ بِالتَّرْحَابِ وَ يَحْمَدُوْنَهٗ وَ يَدْعُوْنَ لَهٗ مِنْ حَضْرَةِ رَبِّ الْاَرْبَابِ وَبَادَرُوْا اِلَى تَعْظِيْمِهٖ وَاٰدَابِ تَكْرِيْمِهٖ وَ اَدْخَلُوْا حُبَّهٗ فِيْ تَامُوْرِهِمْ وَ اقْتَدَوْا فِيْ جَمِيْعِ اُمُوْرِهِمْ وَكَانُوْا لَهٗ شَاكِرِيْنَ۔ وَصَقَلُوْا خَوَاطِرَهُمْ وَسَقَوْا نَوَاضِرَهُمْ وَزَادُوْا حُبًّا وَّوُدًّا وَّ طَاوَعُوْهُ جُهْدًا وَّجِدًّا وَكَانُوْا يَحْسَبُوْنَهٗ مُبَارَكًا وَّمُؤَيَّدًا كَالنَّبِيِّيْنَ۔ وَكَانَ هٰذَا كُلُّهٗ مِنْ صِدْقِ الصِّدِّيْقِ وَالْيَقِيْنِ الْعَمِيْقِ۔ وَ وَاللّٰهِ اِنَّهٗ كَانَ اٰدَمَ الثَّانِيَ لِلْاِسْلَامِ وَالْمَظْهَرَ الْاَوَّلَ لِاَنْوَارِ خَيْرِ الْاَنَامِ وَمَا كَانَ نَبِيًّا وَلٰكِنْ كَانَتْ فِيْهِ قُوَى الْمُرْسَلِيْنَ فَبِصِدْقِهٖ عَادَتْ

کی طرح تھا۔ پھر اللہ نے دوبارہ اسلام کو طاقت بخشی اور اس کو گہرے کنوئیں سے نکالا اور جھوٹے مدعیانِ نبوت سخت عذاب کے ساتھ قتل کئے گئے اور مُرتدین چوپایوں کی طرح ہلاک کر دیئے گئے۔ اور اللہ نے مومنوں کو اس خوف سے امن دیا جس میں وہ مُردوں کی طرح پڑے ہوئے تھے اور مومن اس مصیبت کے دُور ہوتے ہی خوشیاں منانے لگے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مبارک باد دینے لگے اور آپ کو مرحبا اور خوش آمدید کہتے اور آپ کی تعریف کرتے تھے اور آپ کے لئے خدا تعالیٰ سے دعائیں مانگتے تھے اور آپ کی تعظیم و تکریم میں جلدی کرتے تھے اور آپ کی محبت اپنے دِلوں میں بٹھاتے تھے اور تمام امور میں آپ کی اطاعت کرتے اور آپ کے شکر گزار تھے اور انہوں نے اپنے دِلوں کو جِلا دی اور دِل کے کھیتوں کو سیراب کیا اور آپ سے محبت میں بڑھ گئے اور پوری کوشش سے آپ کی اطاعت کی۔ اور وہ آپ کو مبارک اور انبیاء کی طرح مویّد سمجھا کرتے تھے۔ اور یہ سب کچھ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی سچائی اور گہرے یقین پر قائم ہونے کے سبب سے تھا۔ بخدا وہ اِسلام کے آدم ثانی اور آنحضرتؐ کے انوار کے لئے مظہرِ اوّل تھے۔ گو وہ نبی نہیں تھے لیکن ان میں انبیاء کے قویٰ پائے جاتے تھے۔ اور آپ کے صدق کی بدولت اِسلام کا باغ اپنی کامل تروتازگی کو پہنچا اور

ؔ لہ من سہو الکاتب والصحیح حُبًّا وَّوُدًّا۔ الناشر

حَدِیْقَةُ الْاِسْلَامِ اِلٰی زُخْرُفِهِ التَّامِ وَ اَخَذَ زِیْنَتَهٗ وَ قُوَّتَهٗ بَعْدَ صَدَمَاتِ السِّهَامِ وَ تَنَوَّعَتْ اَزَاهِیْرُهٗ وَ طَهُرَتْ اَغْصَانُهٗ مِنَ الْقَتَامِ وَ کَانَ ذٰلِکَ کَمَیِّتٍ نُوْبَ وَ شَرِیْدِ جُدْبٍ وَ جَرِیْحِ نُوْبٍ وَ ذَبِیْحِ جَوْبٍ وَ اَلِیْمِ اَنْوَاعِ تَعَبٍ وَ حَرِیْقٍ هَاجِرَةٍ ذَاتِ لَهَبٍ ثُمَّ نَجَّاهُ اللّٰهُ مِنْ جَمِیْعِ تِلْکَ الْبَلِیَّاتِ وَ اسْتَخْلَصَهٗ مِنْ سَائِرِ الْاٰفَاتِ وَ اَیَّدَهٗ بِعَجَائِبِ التَّائِیْدَاتِ حَتّٰی اَمَّ الْمُلُوْکَ وَ مَلَکَ الرِّقَابَ بَعْدَ مَا تَکَسَّرَ وَ افْتَرَشَ التُّرَابَ فَزُمَّتْ اَلْسِنَةُ الْمُنَافِقِیْنَ وَ تَهَلَّلَ وَجْهُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ وَ کُلُّ نَفْسٍ حَمِدَتْ رَبَّهٗ وَ شَکَرَتِ الصِّدِّیْقَ وَ جَاءَتْهُ مُطَاوِعًا اِلَّا الزِّنْدِیْقَ وَ الَّذِیْ کَانَ مِنَ الْفَاسِقِیْنَ وَ کَانَ کُلُّ ذٰلِکَ اَجْرَ عَبْدٍ تَخَیَّرَهُ اللّٰهُ وَ صَافَاهُ وَ رَضِیَ عَنْهُ وَ عَافَاهُ وَ اللّٰهُ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ۔

فَالْحَاصِلُ اَنَّ هٰذِهِ الْاٰیَاتِ کُلَّهَا مُخْبِرَةٌ عَنْ خِلَافَةِ الصِّدِّیْقِ وَ لَیْسَ لَهَا مَحْمَلٌ اٰخَرُ فَانْظُرْ عَلٰی وَجْهِ التَّحْقِیْقِ وَ اخْشَ اللّٰهَ وَ لَا تَکُنْ مِنَ الْمُتَعَصِّبِیْنَ۔ ثُمَّ انْظُرْ اَنَّ

اس نے اپنی زینت اور سکینت تیروں کے صدمات سہنے کے بعد حاصل کی اور اس کے اندر رنگا رنگ کے پھول پیدا ہوئے اور اس کی شاخیں غبار سے صاف ہو گئیں اور اس سے پہلے اسلام ایک ایسے مُردہ کی طرح تھا جس پر ماتم کیا جا چکا ہو اور قحط سے بھگائے ہوئے اور مصائب سے زخمی اور سفروں سے درماندہ اور قسم قسم کی تھکان سے دُکھ دیئے ہوئے اور شعلوں والی دوپہر کے جلے بُھنے ہوئے شخص کی مانند تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسے ان تمام مصائب سے نجات دی اور تمام آفات سے چھڑایا اور عجیب تائیدات سے اس کی مدد کی یہاں تک کہ اس نے بادشاہوں کی قیادت کی اور لوگوں کی گردنیں اس کے ہاتھ میں آگئیں۔ بعد اس کے کہ وہ درماندہ اور شکستہ ہو چکا تھا اور خاک میں مل چکا تھا پس منافقوں کی زبانیں بند ہو گئیں اور مومنوں کے چہرے چمک اُٹھے اور ہر ایک شخص نے اپنے رَبّ کی حمد کی اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا شکر بجا لایا اور سوائے زندیق اور فاسق کے سب ان کے پاس مطیع بن کر آگئے۔ یہ سارا اجر اس بندے کا تھا جسے اللہ نے چن لیا تھا اور اسے اپنی دوستی کیلئے مخصوص کر لیا تھا اور اس سے راضی ہو گیا تھا اور اس کو عافیت بخشی تھی اور اللہ تعالیٰ محسنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

حاصل کلام یہ کہ یہ تمام آیات حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کی خبر دے رہی ہیں اور ان کا کوئی اور مصداق نہیں ہے پس آپ تحقیق کی نظر سے اسے دیکھیں اور اللہ سے ڈریں اور متعصب مت بنیں پھر دیکھیں

هٰذِهِ الْاٰيَاتِ كَانَتْ مِنَ الْاَنْبَاءِ الْمُسْتَقْبَلَةِ لِيَزِيْدَ اِيْمَانُ الْمُؤْمِنِيْنَ عِنْدَ ظُهُوْرِهَا وَلِيَعْرِفُوْا مَوَاعِيْدَ حَضْرَةِ الْعِزَّةِ فَاِنَّ اللّٰهَ اَخْبَرَ فِيْهَا عَنْ زَمَانِ حُلُوْلِ الْفِتَنِ وَنُزُوْلِ الْمَصَائِبِ عَلَى الْاِسْلَامِ بَعْدَ وَفَاتِ خَيْرِ الْاَنَامِ وَوَعَدَ اَنَّهٗ سَيَسْتَخْلِفُ فِيْ ذٰلِكَ الزَّمَنِ بَعْضًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَيُؤْمِنُهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ وَيُمَكِّنُ دِيْنَهُ الْمُتَزَلْزِلَ وَيُهْلِكُ الْمُفْسِدِيْنَ وَلَا شَكَّ اَنَّ مِصْدَاقَ هٰذَا النَّبَاِ لَيْسَ اِلَّا اَبُوْبَكْرٍ وَزَمَانُهٗ فَلَا تُنْكِرْ وَقَدْ حَصْحَصَ بُرْهَانُهٗ اَنَّهٗ وَجَدَ الْاِسْلَامَ كَجِدَارٍ يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ مِنْ شَرِّ اَشْرَارٍ فَجَعَلَهُ اللّٰهُ بِيَدِهٖ كَحِصْنٍ مَّشِيْدٍ لَّهٗ جُدْرَانٌ مِّنْ حَدِيْدٍ وَفِيْهِ فَوْجٌ كَعَبِيْدٍ فَانْظُرْ هَلْ تَجِدُ مِنْ رَّيْبٍ فِيْ هٰذَا اَوْ يَسُوْغُ عِنْدَكَ اِتْيَانُ نَظِيْرِهٖ مِنْ زُمَرِ اٰخَرِيْنَ۔ (سرالخلافۃ ص ۱۵-۱۷)

کیا یہ سچ نہیں ہے کہ قرآن شریف نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مثیلِ موسیٰ قرار دیا ہے اور کیا یہ سچ نہیں ہے کہ قرآن کریم نے نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مثیلِ موسیٰ قرار دیا بلکہ آیت كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ میں تمام سلسلۂ خلافتِ محمدیہ کو سلسلۂ خلافتِ موسویہ کا مثیل قرار دیا ہے۔ پس اس صورت میں قطعاً و وجوباً لازم آتا ہے کہ سلسلۂ خلافتِ اسلامیہ کے آخر میں ایک مثیلِ عیسیٰ

کہ یہ تمام آیات آئندہ کے لئے پیشگوئیاں تھیں تاکہ ان کے ظہور کے وقت مومنوں کا ایمان بڑھ جائے اور وہ اللہ کے وعدوں کو پہچان لیں۔ کیونکہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلام میں فتنے پیدا ہونے اور اس پر مصائب نازل ہونے کی خبر دی تھی اور ان میں یہ وعدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اس وقت بعض مومنوں کو خلیفہ بنائے گا اور خوف کے بعد ان کو امن دے گا اور انکے متزلزل دین کو تقویت بخشے گا اور مفسدین کو ہلاک کرے گا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس پیشگوئی کا مصداق سوائے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اور ان کے زمانے کے کوئی نہیں۔ پس انکار نہ کریں کیونکہ اس کی دلیل تو ظاہر ہو گئی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسلام کو ایسی دیوار کی طرح پایا جو مفسدین کی شرارت کی وجہ سے گرنے کو تھی۔ خدا تعالیٰ نے اس کو ان کے ہاتھوں ایک چونہ گچ، مضبوط اونچے قلعہ کی طرح بنا دیا جس کی دیواریں فولادی تھیں اور اس میں ایسی فوج تھی جو غلاموں کی طرح فرمانبردار تھی۔ پس غور کریں کیا اس میں آپ کے لئے کوئی شک کی گنجائش ہے یا اس کی نظیر آپ کے نزدیک اور جماعتوں سے لانا ممکن ہے۔ (سرالخلافہ ص ۱۵-۱۷)

پیدا ہوا اور چونکہ اوّل و آخر کی مشابہت ثابت ہونے سے تمام سلسلہ کی مشابہت ثابت ہو جاتی ہے اس لئے خدا تعالیٰ کے پاک نبیوں کی کتابوں میں جابجا انہیں دونوں مشابہتوں پر زور دیا گیا ہے بلکہ اوّل اور آخر کے دشمنوں میں بھی مشابہت ثابت کی گئی ہے جیسا کہ ابوجہل کو فرعون سے مشابہت دی گئی ہے اور آخری مسیح کے مخالفین کو یہود مغضوب علیہم سے اور آیت کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ میں یہ بھی اشارہ کر دیا ہے کہ آخری خلیفہ اس اُمت کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسے زمانہ میں آئے گا جو وہ زمانہ اپنی مدت میں اس زمانہ کی مانند ہو گا جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد آئے تھے یعنی چودھویں صدی کیونکہ کَمَا کا لفظ جس مشابہت کو چاہتا ہے اس میں زمانہ کی مشابہت بھی داخل ہے۔ تمام فرقے یہودیوں کے اِس بات پر متفق ہیں کہ عیسیٰ بن مریم نے جس زمانہ میں دعوئی نبوت کیا وہ زمانہ حضرت موسیٰ سے چودھویں صدی تھی اور عیسائیوں میں سے پروٹسٹنٹ مذہب والے خیال کرتے ہیں کہ پندرھویں صدی موسوی سے کچھ سال گذر چکے تھے جب حضرت عیسیٰ نے دعوئی نبوت کیا اور پروٹسٹنٹ کا قول یہودیوں کے متفق علیہ قول کے مقابل پر کچھ چیز نہیں اور اگر اس کی صحت مان بھی لیں تو اس قدر قلیل فرق سے مشابہت میں کچھ فرق نہیں آتا بلکہ مشابہت ایک قلیل فرق کو چاہتی ہے ایسا ہی قرآن شریف کی رُو سے سلسلہ محمدیہ سلسلہ موسویہ سے ہر ایک نیکی اور بدی میں مشابہت رکھتا ہے۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۹-۱۰)

یہ فیصلہ بھی قرآن شریف نے ہی سورہ نور میں لفظ مِنْکُمْ کے ساتھ ہی کر دیا ہے کہ اس کے تمام خلیفے اسی اُمت میں سے پیدا ہوں گے اور وہ خلفاء سلسلہ موسوی کے مثیل ہوں گے اور صرف ایک ان میں سے سلسلہ کے آخر میں موعود ہو گا جو عیسیٰ بن مریم کے مشابہ ہو گا باقی موعود نہیں ہوں گے یعنی نام لے کر ان کے لئے کوئی پیشگوئی نہیں ہوگی اور یہ مِنْکُمْ کا لفظ بخاری میں بھی موجود ہے اور مسلم میں بھی ہے جسکے یہی معنے ہیں کہ وہ مسیح موعود اسی اُمت میں سے پیدا ہو گا۔ پس اگر ایک غور کرنے والا اِس جگہ پورا غور کرے اور طریق خیانت اختیار نہ کرے تو اس کو ان تین مِنْکُمْ کے لفظوں پر نظر ڈالنے سے یقین ہو جائے گا کہ یہ امر قطعی فیصلہ تک پہنچ چکا ہے کہ مسیح موعود اسی امت میں سے پیدا ہو گا۔

(تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۳۷-۳۸)

سورۃ نور میں بیان کیا گیا ہے کہ تمام خلیفے اِسی اُمت میں سے پیدا ہوں گے اور قرآن شریف سے مستنبط ہوتا ہے کہ اس اُمت پر دو زمانے بہت خوفناک آئیں گے ایک وہ زمانہ جو ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آیا اور دوسرا وہ زمانہ جو دجّالی فتنہ کا زمانہ

ہے جو مسیح کے عہد میں آنے والا تھا جس سے پناہ مانگنے کے لئے اِس آیت میں اشارہ ہے غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ اور اس زمانہ کے لئے یہ پیشگوئی سورۂ نور میں موجود ہے وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا اِس آیت کے معنے پہلی آیت کے ساتھ ملاکر یہ ہیں کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس دین پر آخری زمانہ میں ایک زلزلہ آئے گا اور خوف پیدا ہو جائے گا کہ یہ دین ساری زمین پر سے گم نہ ہو جائے تب خدا تعالیٰ دوبارہ اس دین کو رُوئے زمین پر تمکن کر دے گا اور خوف کے بعد امن بخش دیگا۔

(لیکچر لاہور صہ ۴۱)

سورہ نور میں صریح اشارہ فرماتا ہے کہ ہر ایک رنگ میں جیسے بنی اسرائیل میں خلیفے گذرے ہیں وہ تمام رنگ اس اُمّت کے خلیفوں میں بھی ہوں گے چنانچہ اسرائیلی خلیفوں میں سے حضرت عیسیٰ ایسے خلیفہ تھے جنہوں نے نہ تلوار اُٹھائی اور نہ جہاد کیا۔ سو اِس اُمّت کو بھی اسی رنگ کا مسیح موعود دیا گیا دیکھو آیت وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ..... وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۔ اِس آیت میں فقرہ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قابلِ غور ہے کیونکہ اس سے سمجھا جاتا ہے کہ محمدی خلافت کا سلسلہ موسوی خلافت کے سلسلہ سے مشابہ ہے اور چونکہ موسوی خلافت کا انجام ایسے نبی پر ہوا یعنی حضرت عیسیٰ پر جو حضرت موسیٰ سے چودھویں صدی کے سر پر آیا اور نیز کوئی جنگ اور جہاد نہیں کیا اِس لئے ضروری تھا کہ آخری خلیفہ سلسلہ محمدی کا بھی اسی شان کا ہو۔

(لیکچر سیالکوٹ صہ ۱۴-۱۵)

خدا تعالیٰ ...... دو قسم کی قدرت ظاہر کرتا ہے (۱) اوّل خود نبیوں کے ہاتھ سے اپنی قدرت کا ہاتھ دکھاتا ہے (۲) دوسرے ایسے وقت میں جب نبی کی وفات کے بعد مشکلات کا سامنا پیدا ہو جاتا ہے اور دشمن زور میں آجاتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اب کام بگڑ گیا اور یقین کر لیتے ہیں کہ اب یہ جماعت نابود ہو جائے گی اور خود جماعت کے لوگ بھی تردد میں پڑ جاتے ہیں اور اُن کی کمریں ٹوٹ جاتی ہیں اور کئی بدقسمت مرتد ہونے کی راہیں اختیار کر لیتے ہیں تب خدا تعالیٰ دوسری مرتبہ اپنی زبردست قدرت ظاہر کرتا ہے اور گرتی ہوئی جماعت کو سنبھال لیتا ہے۔ پس وہ جو اخیر تک صبر کرتا ہے خدا تعالیٰ کے اس معجزہ کو دیکھتا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے وقت میں ہوا جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موت ایک بے وقت موت سمجھی گئی اور بہت سے بادیہ نشین نادان مرتد ہو گئے اور صحابہؓ بھی مارے غم کے دیوانہ کی طرح ہو گئے تب خدا تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو کھڑا کر کے دوبارہ اپنی قدرت کا نمونہ دکھایا اور اسلام کو نابود ہوتے ہوتے تھام لیا اور اس وعدہ کو پورا کیا جو فرمایا تھا وَلَیُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِیْنَهُمُ الَّذِی ارْتَضٰى لَهُمْ

وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا یعنی خوف کے بعد پھر ہم اُن کے پیر جما دیں گے۔ ایسا ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وقت میں ہوا جبکہ حضرت موسیٰ مصر اور کنعان کی راہ میں پہلے اس سے جو بنی اسرائیل کو وعدہ کے موافق منزلِ مقصود تک پہنچا دیں فوت ہو گئے اور بنی اسرائیل میں ان کے مرنے سے ایک بڑا ماتم برپا ہوا جیسا کہ توریت میں لکھا ہے کہ بنی اسرائیل اس بے وقت موت کے صدمہ سے اور حضرت موسیٰ کی ناگہانی جدائی سے چالیس دن تک روتے رہے۔ ایسا ہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ معاملہ ہوا اور صلیب کے واقعہ کے وقت تمام حواری تتر بتر ہو گئے اور ایک ان میں سے مرتد بھی ہو گیا۔

(الوصیّت صفحہ ۴-۵)

قرآن شریف کی یہ آیت بھی کہ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ یہی چاہتی ہے کہ اس اُمّت کے لئے چودھویں صدی میں مثیلِ عیسیٰ ظاہر ہو جیسا کہ حضرت عیسیٰ حضرت موسیٰ سے چودھویں صدی میں ظاہر ہوئے تھے تا دونوں مثیلوں کے اوّل و آخر میں مشابہت ہو۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۶۵)

سورۃ نور میں مِنْكُمْ کا لفظ اِسی کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہر ایک خلیفہ اسی اُمّت میں سے ہوگا اور آیت كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ بھی اسی کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس سے ظاہر ہے کہ کوئی امر غیر معمولی نہیں ہوگا بلکہ جس طرح صدر زمانۂ اسلام میں ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم مثیلِ موسیٰ ہیں جیسا کہ آیت كَمَا اَرْسَلْنَا اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا سے ظاہر ہے ایسا ہی آخر زمانۂ اسلام میں دونوں سلسلوں میں موسوی اور محمدی کا اوّل اور آخر میں تطابق پورا کرنے کے لئے مثیلِ عیسیٰ کی ضرورت تھی۔

(براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۸۳)

ہمارا رسول مثیلِ موسیٰ ہے.... فرمایا وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ الخ اس مثیلِ موسیٰ کے خلفاء بھی اُسی سلسلہ سے ہوں گے جیسے کہ موسیٰ کے خلفاء سلسلہ وار آئے۔ اُس سلسلہ کی میعاد چودہ سو برس تک رہی۔ برابر خلفاء آتے رہے۔ یہ ایک اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیشگوئی تھی کہ جس طرح سے پہلے سلسلہ کا آغاز ہوا ویسے ہی اِس سلسلہ کا آغاز ہوگا یعنی جس طرح موسیٰ نے ابتداء میں جلالی نشان دکھلائے اور فرعون سے چھڑایا اسی طرح آنے والا نبی بھی موسیٰ کی طرح ہوگا۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۵۳)

قرآن شریف نے اِسرائیلی اور اسماعیلی سلسلوں میں خلافت کی مماثلت کا کھلا کھلا اشارہ کیا ہے جیسے اِس آیت سے ظاہر ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ

فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ الآیہ اسرائیلی سلسلہ کا آخری خلیفہ جو چودھویں صدی پر بعد از موسیٰ علیہ السلام آیا وہ مسیح ناصری تھا مقابل میں ضرور تھا کہ اس اُمّت کا مسیح بھی چودھویں صدی کے سر پر آوے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۵۸)

اِس آیت میں استخلاف کے موافق جو خلیفے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلہ میں ہوں گے وہ پہلے خلیفوں کی طرح ہوں گے اسی طرح قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مثیلِ موسیٰ فرمایا گیا ہے جیسے فرمایا ہے اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا اور آپ مثیلِ موسیٰ استثنا کی پیشگوئی کے موافق بھی ہیں۔ پس اس مماثلت میں جیسے کَمَا کا لفظ فرمایا گیا ہے ویسے ہی سورہ نور میں کَمَا کا لفظ ہے۔ اِس سے صاف معلوم ہوتا کہ موسوی سلسلہ اور محمدی سلسلہ میں مشابہت اور مماثلت تامہ ہے۔ موسوی سلسلہ کے خلفاء کا سلسلہ حضرت عیسٰی علیہ السلام پر آکر ختم ہو گیا تھا اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد چودھویں صدی میں آئے تھے۔ اِس مماثلت کے لحاظ سے کم از کم اتنا تو ضروری ہے کہ چودھویں صدی میں ایک خلیفہ اسی رنگ و قوت کا پیدا ہو جو مسیح سے مماثلت رکھتا ہو اور اسی کے قلب اور قدم پر ہو۔ پس اگر اللہ تعالیٰ اِس امر کی اور دوسری شہادتیں اور تائیدیں نہ بھی پیش کرتا تو یہ سلسلہ مماثلت بالطبع چاہتا تھا کہ چودھویں صدی میں عیسوی بروز آپؐ کی اُمّت میں ہو ورنہ آپ کی مماثلت میں معاذ اللہ ایک نقص اور ضعف ثابت ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ نے نہ صرف اس مماثلت کی تصدیق اور تائید فرمائی بلکہ یہ بھی ثابت کر دکھایا کہ مثیلِ موسیٰ، موسیٰ سے اور تمام انبیاء علیہم السلام سے افضل تر ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳،۲)

آیت استخلاف میں اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر ایک سلسلہ خلافت قائم کرنے کا وعدہ فرمایا اور اس سلسلہ کو پہلے سلسلہ خلافت کے ہم رنگ قرار دیا جیسا فرمایا کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اب اس وعدہ استخلاف کے موافق اور اس کی مماثلت کے لحاظ سے ضروری تھا کہ جیسے موسوی سلسلہ خلافت کا خاتم الخلفاء مسیح تھا ضرور ہے کہ سلسلہ محمدیہ کے خلفاء کا خاتم بھی ایک مسیح ہی ہو۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۷ مورخہ ۲۱ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ میں جو استخلاف کا وعدہ ہے یہ بھی اسی امر پر صاف دلیل ہے کہ کوئی پُرانا نبی اخیر تک نہ آوے ورنہ کَمَا باطل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کَمَا کے نیچے تو مثیل کو رکھا ہے عین کو نہیں رکھا پھر یہ کس قدر غلطی اور جرأت ہے کہ خدا تعالیٰ کے منشاء کے خلاف ایک بات اپنی طرف سے پیدا کر لی جاوے اور ایک نیا اعتقاد بنا لیا جاوے۔

اور پھر کتنا میں مدت کی بھی تعیین ہے کیونکہ مسیح موسیٰ کے بعد چودھویں صدی میں آیا تھا اِسلئے ضروری تھا کہ آنے والا محمدی مسیح بھی چودھویں صدی میں آئے۔ غرض یہ آیت ان تمام امور کو حل کرتی ہے اگر کوئی سوچنے والا ہو۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

کیا مِنْکُمْ ثلاثہ ہمارے مخالفوں کے لئے کافی نہیں۔ ایک بخاری کا مِنْکُمْ (اِمَامُکُمْ مِنْکُمْ) مسلم کا مِنْکُمْ (اَمَّکُمْ مِنْکُمْ) اور سب سے بڑھ کر قرآن کا مِنْکُمْ (وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ)

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۶)

قرآن پر تدبّر سے نظر کرنے والے کو معلوم ہوگا کہ دو سلسلوں کا مساوی ذکر ہے اوّل سلسلہ جو موسیٰ سے شروع ہوکر مسیح علیہ السلام پر ختم ہوتا ہے دوسرا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع ہوتا ہے یہ اس شخص پر ختم ہونا چاہیئے جو مثیلِ مسیح ہو کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مثیل موسیٰ ہیں۔ اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَیْکُمْ رَسُوْلًا شَاھِدًا عَلَیْکُمْ الآیہ (سورہ مزمل) اور پھر سورہ نور میں وعدہ استخلاف فرمایا کہ جس طرح پر موسوی سلسلہ ہو گذرا ہے اسی طرح پر محمدی سلسلہ بھی ہوگا تاکہ دونوں سلسلوں میں بموجب آیاتِ قرآنی باہم مطابقت اور موافقت تامّہ ہو چنانچہ جب موسوی سلسلہ آخر عیسٰی علیہ السلام پر ختم ہوا ضروری تھا کہ محمدی سلسلہ کا خاتم بھی عیسٰی موعود ہوتا۔ ان دونوں سلسلوں کا باہم تقابل مرایا متقابلہ کی طرح ہے یعنی جب دو شیشے ایک دوسرے کے بالمقابل رکھے جاتے ہیں تو ایک شیشہ کا دوسرے میں انعکاس ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۵)

اِس سوال کے جواب میں کہ قرآن میں مسیح موعود کا کہاں کہاں ذکر ہے۔ فرمایا:۔

سورۃ فاتحہ، سورۃ نور، سورۃ تحریم وغیرہ میں۔ سورۃ فاتحہ میں تو اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ سورہ نور میں وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ الآیہ اور سورہ تحریم میں جہاں مومنوں کی مثالیں بیان کی ہیں اُن میں فرمایا وَمَرْیَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

خدا وعدہ دے چکا ہے کہ اس دین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفے پیدا کرے گا اور قیامت تک اس کو قائم کرے گا۔ یعنی جس طرح موسیٰ کے دین میں مدتہائے دراز تک خلیفے اور بادشاہ بھیجتا رہا ایسا ہی اس جگہ بھی کرے گا اور اس کو معدوم ہونے نہیں دے گا۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد سوم صفحہ ۶)

حضرت عیسٰی علیہ السلام براہِ راست خدا کے نبی تھے اور میری نبوّت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کے واسطے اور فیوض سے ہے۔ پھر وہی عیسٰی کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ سورہ نور میں جو آیہ استخلاف ہے اس میں وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ لکھا ہے اور صحیح بخاری میں بھی امامکم منکم ہے۔ پھر عیسٰی علیہ السلام تو فوت ہو چکے ہیں اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں معراج کی رات میں مُردوں میں دیکھ چکے جو بہشت میں ہوں انہیں زندوں سے کیا تعلق۔ جس بات پر خدا نے اپنے قول سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فعل سے شہادت دے دی اس سے اِنکار کرنا دراصل میری تکذیب کرنا نہیں مَیں کیا ہوں اور میری تکذیب کیا دراصل یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ہے۔

(بدر جلد ۷ ﴿۲۵﴾ مورخہ ۲۵ ر جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۹)

موعود وہ ہے جس کا ذکر مِنْكُمْ میں ہے جیسے کہ فرماتا ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ الخ ورنہ اس طرح خواہ صدہا مسیح آویں اور کسی اُمّت کے ہوں وہ موعود نہ ہوں گے کیونکہ وہ مِنْكُمْ سے باہر ہوں گے حالانکہ خدا تعالیٰ کا وعدہ مِنْكُمْ کا ہے پھر باہر سے آنیوالا کیسے موعود ہو سکتا ہے۔ (البدر جلد ۲ ﴿۲۶﴾ مورخہ ۱۷ر جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۰۲)

مسیح موعود کی نسبت ان کا یہ خیال کہ وہ اسرائیلی مسیح ہوگا بالکل غلط ہے۔ قرآن شریف میں صاف لکھا ہے کہ وہ تم میں سے ہوگا جیسا سورہ نور میں ہے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ الخ پھر بخاری میں بھی مِنْكُمْ ہی ہے پھر مسلم میں بھی مِنْكُمْ ہی صاف لکھا ہے۔ ان ..... کو اس قدر خیال نہیں آتا اگر اسی مسیح نے پھر آنا تھا تو مِنْكُمْ کی بجائے مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لکھا ہوتا۔ اب قرآن شریف اور احادیث تو پکار پکار کر مِنْكُمْ کہہ رہے ہیں مگر ان لوگوں کا دعویٰ مِنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ کا ہے۔ سوچ کر دیکھو کہ قرآن کو چھوڑیں یا ان کو۔ (البدر جلد ۲ ﴿۳۹﴾ مورخہ ۱۶ ر اکتوبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۰۶)

قرآن شریف نے بڑی وضاحت کے ساتھ دو سلسلوں کا ذکر کیا ہے ایک وہ سلسلہ ہے جو حضرت موسٰی علیہ السلام سے شروع ہوا اور حضرت مسیح علیہ السلام پر آ کر ختم ہوا اور دوسرا سلسلہ جو اس سلسلہ کے مقابل پر واقع ہوا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ ہے چنانچہ توریت میں بھی آپ کو مثیلِ موسٰی کہا گیا اور قرآن شریف میں بھی آپ کو مثیلِ موسٰی ٹھہرایا گیا ہے جیسے فرمایا ہے اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا۔ پھر جس طرح پر حضرت موسٰی علیہ السلام کا سلسلہ حضرت مسیح علیہ السلام پر آ کر ختم ہو گیا اس سلسلہ کی مماثلت کے لئے ضروری تھا کہ اس وقت اور اس زمانہ پر جب حضرت مسیح حضرت موسٰی کے بعد آئے تھے مسیح محمدی بھی آتا اور یہ بالکل ظاہر اور صاف بات ہے کہ مسیح موسوی چودھویں صدی میں آیا تھا۔ اس لئے ضروری تھا کہ مسیح محمدی بھی چودھویں صدی

میں آتا۔ اگر کوئی اَور نشان اور شہادت نہ بھی ہوتی تب بھی اس سلسلہ کی تکمیل چاہتی تھی کہ اس وقت مسیح محمدی آوے مگر یہاں تو صدہا اَور نشان اور دلائل ہیں۔ پھر آنے والے کو اسی اُمّت میں سے ٹھہرایا گیا ہے جیسے وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ میں فرمایا گیا ہے اور اسی طرح پر احادیث میں بھی آنے والا اسی اُمّت سے ٹھہرایا گیا ہے جبکہ فرمایا ہے وَاِمَامُكُمْ مِنْكُمْ۔ اب نصوصِ قرآنیہ اور حدیثیہ بوضاحت شہادت دیتے ہیں کہ آنے والا مسیح موعود اسی اُمّت میں سے ہوگا اور ضرورت بجائے خود داعی ہے کیونکہ اسلام پر سخت حملے ہو رہے ہیں اور کوشش کی جاتی ہے کہ جہاں تک ان مخالفوں کا بس چلے اِسلام کو نابود کر دیں۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۱۲ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

اِسی اُمّت کے اَب مومنین اور اعمالِ صالحہ بجالانے والوں سے خلافت کا وعدہ کیا گیا اسی طرح پر جس طرح بنی اسرائیل میں خلفاء کئے گئے تھے یہاں بھی وہی كَمَا کا لفظ موجود ہے ایک طرف تو اس سلسلہ کو سِلسلہ موسویہ کا مثیل ٹھہرایا۔ دوسری جگہ سلسلہ موسوی کی طرح خلفاء بنانے کا وعدہ کیا پھر کیا دونو سِلسلوں کا طبعی توافق ظاہر نہیں کرتا کہ اس اُمّت میں خلفاء اسی رنگ کے قائم ہوں؟ ضرور کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

پیشگوئی دو قِسم کی ہوتی ہے۔ ایک وعدہ کی جیسے فرمایا وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ اہلِ سُنّت مانتے ہیں کہ اِس قِسم کی پیشگوئیوں میں تخلف نہیں ہوتا کیونکہ خدا تعالیٰ کریم ہے لیکن وعید کی پیشگوئیوں میں وہ ڈرا کر بخش بھی دیتا ہے اِس لئے کہ وہ رحیم ہے۔ بڑا نادان اور اِسلام سے دُور پڑا ہؤا ہے وہ شخص جو کہتا ہے وعید کی سب پیشگوئیاں پُوری ہوتی ہیں۔ وہ قرآن کریم کو چھوڑتا ہے اِسلئے کہ قرآن کریم تو کہتا ہے يُصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

۵۷ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ○

اِنسان کو جو حکم اللہ تعالیٰ نے شریعت کے رنگ میں دئے ہیں جیسے اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ نماز کو قائم رکھو۔ یا فرمایا وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ان پر جب وہ ایک عرصہ تک قائم رہتا ہے تو یہ

احکام بھی شرعی رنگ سے نکل کر کوئی رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور پھر وہ ان احکام کی خلاف ورزی کرہی نہیں سکتا۔
(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۵)

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْۢ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ؕ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ؕ فَاِذَا دَخَلْتُمْ بُيُوْتًا فَسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ تَحِيَّةً مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُبٰرَكَةً طَيِّبَةً ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

چھوت وغیرہ دراصل اِس بات کا نشان ہے کہ ہندوؤں کا مذہب کمزور ہے جو ہاتھ لگانے سے بھی جاتا رہتا ہے۔ اِسلام کی بنیاد چونکہ قوی تھی اِس لئے اس نے ایسی باتوں کو اپنے مذہب میں نہیں رکھا چنانچہ کھانے کے متعلق فرما دیا لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا۔
(بدر جلد ۷ نمبر ۱۹، ۲۰ مورخہ ۲۴ر مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

اگر کھانا کھانے کو کسی کے ساتھ جی نہیں کرتا تو کسی اور بہانہ سے الگ ہو جاوے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا مگر اظہار نہ کرے یہ اچھا نہیں۔
(البدر جلد ۲ نمبر ۲۷ مورخہ ۲۴ر جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۱۰)

تفسیر سورۃ الفرقان

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۝

تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا ۝

وہ بہت ہی برکت والا ہے جس نے قرآن کو اپنے بندہ پر اِس غرض سے اُتارا جو تمام جہان کو ڈرانے والا ہو یعنی تا ان کی بدراہی اور بدعقیدگی پر ان کو متنبہ کرے۔ پس یہ آیت بصراحت اِس بات پر دلیل ہے کہ قرآن کا بھی دعویٰ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسے وقت میں تشریف لائے تھے جبکہ تمام دُنیا اور تمام قومیں بگڑ چکی تھیں اور مخالف قوموں نے اس دعویٰ کو نہ صرف اپنی خاموشی سے بلکہ اپنے اقراروں سے مان لیا ہے۔ پس اس سے بہ بداہت نتیجہ نکلا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم درحقیقت ایسے وقت میں آئے تھے جس وقت میں ایک سچے اور کامل نبی کو آنا چاہیئے۔ پھر جب ہم دوسرا پہلو دیکھتے ہیں کہ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کس وقت واپس بُلائے گئے تو قرآن صاف اور صریح طور پر ہمیں خبر دیتا ہے کہ ایسے وقت میں بُلانے کا حکم ہؤا کہ جب اپنا کام پُورا کر چکے تھے یعنی اس وقت کے بعد بُلائے گئے جبکہ یہ آیت نازل ہو چکی تھی کہ مسلمانوں کے لئے تعلیم کا مجموعہ کامل ہو گیا اور جو کچھ ضروریاتِ دین میں نازل ہونا تھا وہ سب نازل ہو چکا اور نہ صرف یہی بلکہ یہ بھی خبر دی گئی کہ خدا تعالیٰ کی تائیدیں بھی کمال کو پہنچ گئیں اور جوق در جوق لوگ دینِ اسلام میں داخل ہو گئے اور یہ آیتیں بھی نازل ہو گئیں کہ خدا تعالیٰ نے ایمان اور تقویٰ کو ان کے دلوں میں لکھ دیا اور فسق و فجور سے انہیں بیزار کر دیا اور پاک اور نیک اخلاق سے وہ متصف ہو گئے اور ایک بھاری تبدیلی اُن کے اخلاق اور چلن اور رُوح میں واقع ہو گئی۔ (نورالقرآن ۱ صفحہ ۲۱ تا صفحہ ۲۶)

ہم نے تجھے بھیجا تا کہ دُنیا کی تمام قوموں کو ڈراوے یعنی ان کو متنبہ کرے کہ وہ خدا تعالیٰ کے حضور میں

اپنی بدکاریوں اور عقیدوں کی وجہ سے سخت گنہ گار ٹھہرے ہیں۔

یاد رہے کہ جو اِس آیت میں نذیر کا لفظ دُنیا کے تمام فرقوں کے مقابل پر استعمال کیا گیا ہے جسکے معنے گنہ گاروں اور بدکاروں کو ڈرانا ہے۔ اس لفظ سے یقینی سمجھا جاتا ہے کہ قرآن کا یہ دعویٰ تھا کہ تمام دُنیا بگڑ گئی اور ہر ایک نے سچائی اور نیک بختی کا طریق چھوڑ دیا کیونکہ انذار کا محل فاسق اور مشرک اور بدکار ہی ہیں اور انذار اور ڈرانا مجرموں کی ہی تنبیہہ کے لئے ہوتا ہے نہ نیک بختوں کے لئے۔ اِس بات کو ہر یک جانتا ہے کہ ہمیشہ سرکشوں اور بے ایمانوں کو ہی ڈرایا جاتا ہے اور سُنّت اللہ اسی طرح پر ہے کہ نبی نیکوں کے لئے بشیر ہوتے ہیں اور بدوں کے لئے نذیر۔ پھر جبکہ ایک نبی تمام دُنیا کے لئے نذیر ہوا تو ماننا پڑا کہ تمام دُنیا کو نبی کی وحی نے بد اعمالیوں میں مبتلا قرار دیا ہے اور یہ ایک ایسا دعویٰ ہے کہ نہ توریت نے موسیٰ کی نسبت کیا اور نہ انجیل نے عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کی نسبت بلکہ صرف قرآن شریف نے کیا۔ (نور القرآن صفحہ ۵، ۶)

ہم نے اِس لئے بھیجا ہے کہ تمام دُنیا کو ڈراوے لیکن ہم بڑے زور سے کہتے ہیں کہ قرآن شریف سے پہلے دُنیا کی کسی الہامی کتاب نے یہ دعویٰ نہیں کیا بلکہ ہر ایک نے اپنی رسالت کو اپنی قوم تک ہی محدود رکھا یہاں تک کہ جس نبی کو عیسائیوں نے خدا قرار دیا اُس کے مُنہ سے بھی یہی نکلا کہ "میں اسرائیل کی بھیڑوں کے سوا اَور کسی کی طرف نہیں بھیجا گیا" اور زمانہ کے حالات نے بھی گواہی دی کہ قرآن شریف کا یہ دعویٰ تبلیغِ عام کا عین موقع پر ہے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کے وقت تبلیغِ عام کا دروازہ کھُل گیا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ہاتھ سے بعد نزول اس آیت کے کہ قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا دُنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں کی طرف دعوتِ اسلام کے خط لکھے تھے کسی اَور نبی نے غیر قوموں کے بادشاہوں کی طرف دعوتِ دین کے ہرگز خط نہیں لکھے کیونکہ وہ دوسری قوموں کی دعوت کیلئے مامور نہ تھے یہ عام دعوت کی تحریک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے ہی شروع ہوئی اور مسیح موعود کے زمانہ میں اور اُس کے ہاتھ سے کمال تک پہنچی۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۶۸، ۶۹)

۳ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَلَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا ۝

لہ اعراف آیت ۱۵۹

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً لَّا یَخْلُقُوْنَ شَیْـًٔا وَّهُمْ یُخْلَقُوْنَ وَلَا یَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا یَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَیٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا۝

خدا وہ خدا ہے جو تمام زمین و آسمان کا اکیلا مالک ہے۔ کوئی اس کا حصّہ دار نہیں۔ اس کا کوئی بیٹا نہیں اور نہ اس کے ملک میں کوئی اس کا شریک۔ اور اسی نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا اور پھر ایک حد تک اس کے جسم اور اس کی طاقتوں اور اس کی عمر کو محدود کر دیا اور مشرکوں نے بجز اس خدائے حقیقی کے اَور اَور ایسے ایسے خدا مقرر کر رکھے ہیں جو کچھ بھی پیدا نہیں کر سکتے بلکہ آپ پیدا شدہ اور مخلوق ہیں اپنے ضرر اور نفع کے مالک نہیں ہیں اور نہ موت اور زندگی اور جی اُٹھنے کے مالک ہیں۔ اب دیکھو خدائے تعالیٰ صاف صاف طور پر فرما رہا ہے کہ بجز میرے کوئی اَور خالق نہیں بلکہ ایک دوسری آیت میں فرماتا ہے کہ تمام جہاں مل کر ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتا اور صاف فرماتا ہے کہ کوئی شخص موت اور حیات اور ضرر اور نفع کا مالک نہیں ہو سکتا۔ اس جگہ ظاہر ہے کہ اگر کسی مخلوق کو موت اور حیات کا مالک بنا دینا اور اپنی صفات میں شریک کر دینا اس کی عادت میں داخل ہوتا تو وہ بطور استثناء ایسے لوگوں کو ضرور باہر رکھ لیتا اور ایسی اعلیٰ توحید کی ہمیں ہرگز تعلیم نہ دیتا۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۳۱۳، ۳۱۴ حاشیہ)

وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا یعنی اس کے ملک میں کوئی اس کا شریک نہیں وہ سب کا خالق ہے اور اس کے خالق ہونے پر یہ دلیل واضح ہے کہ ہر ایک چیز کو ایک اندازہ مقرری پر پیدا کیا ہے کہ جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتی بلکہ اس اندازہ میں محصور اور محدود ہے۔ اس دلیل کی شکل منطقی اس طرح پر ہے کہ ہر جسم اور رُوح ایک اندازہ مقرری میں محصور اور محدود ہے اور ہر ایک وہ چیز کہ کسی اندازہ مقرری میں محصور اور محدود ہو اس کا کوئی حاصر اور محدد ضرور ہوتا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک جسم اور رُوح کے لئے ایک حاصر اور محدد ہے۔ اب اثبات قضیہ اولیٰ کا یعنی محدد القدر ہونے اشیاء کا اس طرح پر ہے کہ جمیع اجسام اور ارواح میں جو جو خاصیتیں پائی جاتی ہیں عقل تجویز کر سکتی ہے کہ اُن خواص سے زیادہ خواص اُن میں پائے جاتے مثلاً انسان کی دو آنکھیں ہیں اور عند العقل ممکن تھا کہ اس کی چار آنکھیں ہوتیں دو مُنہ کی طرف اور دو پیچھے کی طرف تا کہ جیسا آگے کی چیزوں کو دیکھتا ہے ویسا ہی پیچھے کی چیزوں کو بھی دیکھ لیتا اور کچھ شک

نہیں کہ چار آنکھ کا ہونا بہ نسبت دو آنکھ کے کمال میں زیادہ اور فائدہ میں دوچند ہے۔ اور انسان کے پر نہیں اور ممکن تھا کہ مثل اور پرندوں کے اس کے پر بھی ہوتے اور علیٰ ہٰذا القیاس نفس ناطقہ انسان بھی ایک خاص درجہ میں محدود ہے جیسا کہ وہ بغیر تعلیم کسی معلّم کے خود بخود مجہولات کو دریافت نہیں کر سکتا۔ قاسر خارجی سے کہ جیسے جنونی یا مخموری ہے سالم الحال نہیں رہ سکتا بلکہ فی الفور اس کی قوتوں اور طاقتوں میں تنزل واقع ہو جاتا ہے اسی طرح بذاتہٖ ادراک جزئیات کا نہیں کر سکتا جیسا کہ اس امر کو شیخ محقق بُوعلی سینا نے نمط سابع اشارات میں بتصریح لکھا ہے حالانکہ عندالعقل ممکن تھا کہ ان سب آفات اور عیوب سے بچا ہوا ہوتا۔ پس جن جن مراتب اور فضائل کو انسان اور اس کی رُوح کے لئے عقل تجویز کر سکتی ہے وہ کس بات سے ان مراتب سے محروم ہے آیا تجویز کسی اور مجوّز سے یا خود اپنی رضامندی سے۔ اگر کہو کہ اپنی رضامندی سے تو یہ صریح خلاف ہے کیونکہ کوئی شخص اپنے حق میں نقص روا نہیں رکھتا اور اگر کہو کہ تجویز کسی اور مجوّز سے تو مبارک ہو کہ وجود خالق ارواح اور اجسام کا ثابت ہو گیا اور یہی مدعا تھا۔

(پرانی تحریریں ص۴۶)

اس کے خالق ہونے پر یہ دلیل واضح ہے کہ ہر ایک چیز کو ایک اندازہ مقررہ میں محصور اور محدود پیدا کیا ہے جس سے وجود اس ایک حاصر اور محدِّد کا ثابت ہوتا ہے۔ (براہین احمدیہ ص۴۳۵ حاشیہ)

واضح رہے کہ تقدیر کے معنی صرف اندازہ کرنا ہے جیسے کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے وَخَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقْدِیْرًا یعنی ہر ایک چیز کو پیدا کیا تو پھر اس کے لئے ایک مقرر اندازہ ٹھہرا دیا اس سے کہاں ثابت ہوتا ہے کہ انسان اپنے اختیارات سے روکا گیا ہے بلکہ وہ اختیارات بھی اسی اندازہ میں آ گئے جب خداتعالیٰ نے انسانی فطرت اور انسانی خوئے کا اندازہ کیا تو اس کا نام تقدیر رکھا اور اسی میں یہ مقرر کیا کہ فلاں حد تک انسان اپنے اختیارات برت سکتا ہے یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے کہ تقدیر کے لفظ کو ایسے طور پر سمجھا جائے کہ گویا انسان اپنے خداداد قویٰ سے محروم رہنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے۔ اس جگہ تو ایک گھڑی کی مثال ٹھیک آتی ہے کہ گھڑی کا بنانے والا جس حد تک اس کا دَور مقرر کرتا ہے اس حد سے وہ زیادہ چل نہیں سکتی۔ یہی انسان کی مثال ہے کہ جو قویٰ اس کو دیئے گئے ہیں ان سے زیادہ وہ کچھ کر نہیں سکتا اور جو عمر دی گئی ہے اس سے زیادہ جی نہیں سکتا۔ (جنگِ مقدس ص۱۲۴،۱۲۵)

آپ خدا نے ہر یک چیز کو پیدا کیا اور اس کا اندازہ بھی اپنے اختیار میں مقرر کر دیا۔

(ست بچن طبع اوّل ص۹۲)

قرآن شریف نے وید کی طرح سے بے وجہ اور محض زبردستی کے طور پر اللہ جلّ شانہٗ کو تمام ارواح اور

ہر ایک ذرہ ذرہ اجسام کا مالک نہیں ٹھہرایا بلکہ اس کی ایک وجہ بیان کی ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ..... خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا (ترجمہ) یعنی زمین اور آسمان اور جو کچھ ان میں ہے سب خدا تعالیٰ کی ملکیت ہے کیونکہ وہ سب چیزیں اسی نے پیدا کی ہیں اور پھر ہر ایک مخلوق کی طاقت اور کام کی ایک حد مقرر کر دی ہے تا محدود چیزیں ایک محدِّد پر دلالت کریں جو خدا تعالیٰ ہے۔ سو ہم دیکھتے ہیں کہ جیسا کہ اجسام اپنے اپنے حدود میں مقیّد ہیں اور اس حد سے باہر نہیں ہو سکتے اسی طرح ارواح بھی مقیّد ہیں اور اپنی مقررہ طاقتوں سے زیادہ کوئی طاقت پیدا نہیں کر سکتے۔ اب پہلے ہم اجسام کے محدود ہونے کے بارہ میں بعض مثالیں پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ مثلاً چاند ایک مہینہ میں اپنا دَورہ ختم کر لیتا ہے یعنی انتیس یا تیس دن تک مگر سورج تین سو چونسٹھ دن میں اپنے دَورہ کو پورا کرتا ہے اور سورج کو یہ طاقت نہیں ہے کہ اپنے دَورہ کو اس قدر کم کر دے جیسا کہ چاند کے دَورہ کا مقدار ہے اور نہ چاند کی یہ طاقت ہے کہ اس قدر اپنے دَورہ کے دن بڑھا دے کہ جس قدر سورج کے لئے دن مقرر ہیں اور اگر تمام دُنیا اِس بات کے لئے اتفاق بھی کر لے کہ اِن دونوں نیّروں کے دَوروں میں کچھ کمی بیشی کر دیں تو یہ ہرگز ممکن نہیں ہوگا اور نہ خود سورج اور چاند میں یہ طاقت ہے کہ اپنے دَوروں میں کچھ تغیر تبدّل کر ڈالیں۔

پس وہ ذات جس نے اِن ستاروں کو اپنی اپنی حد پر ٹھہرا رکھا ہے یعنی جو ان کا محدِّد اور حد باندھنے والا ہے وہی خدا ہے۔ ایسا ہی انسان کے جسم اور ہاتھی کے جسم میں بڑا فرق ہے۔ اگر تمام ڈاکٹر اس بات کے لئے اکٹھے ہوں کہ انسان اپنی جسمانی طاقتوں اور جسم کی ضخامت میں ہاتھی کے برابر ہو جاوے تو یہ ان کے لئے غیر ممکن ہے اور اگر یہ چاہیں کہ ہاتھی محض اِنسان کے قد تک محدود رہے تو یہ بھی ان کے لئے غیر ممکن ہے۔ پس اِس جگہ بھی ایک تحدید ہے یعنی حد باندھنا جیسا کہ سورج اور چاند میں ایک تحدید ہے اور وہی تحدید ایک محدِّد یعنی حد باندھنے والے پر دلالت کرتی ہے یعنی اُس ذات پر دلالت کرتی ہے جس نے ہاتھی کو وہ مقدار بخشا اور انسان کے لئے وہ مقدار مقرر کیا۔ اور اگر غور کر کے دیکھا جائے تو ان تمام جسمانی چیزوں میں عجیب طور سے خدا تعالیٰ کا ایک پوشیدہ تصرّف نظر آتا ہے اور عجیب طور پر اس کی حد بندی مشاہدہ ہوتی ہے۔ اُن کیڑوں کی مقدار سے لے کر جو بغیر دُوربین کے دکھائی نہیں دے سکتے اُن بڑی بڑی مچھلیوں کی مقدار تک جو ایک بڑے جہاز کو بھی چھوٹے سے لقمہ کی طرح نِگل سکتی ہیں حیوانی اجسام میں ایک عجیب نظارہ حد بندی کا نظر آتا ہے۔ کوئی جانور اپنے جسم کی رُو سے اپنی حد سے باہر نہیں جا سکتا۔ ایسا ہی وہ تمام ستارے جو آسمان پر نظر آتے ہیں اپنی اپنی حد سے باہر نہیں جا سکتے۔ پس یہ حد بندی دلالت کر رہی ہے کہ در پردہ کوئی حد باندھنے والا ہے۔ یہی معنی اِس مذکورہ بالا آیت کے ہیں کہ خَلَقَ كُلَّ شَیْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِیْرًا۔

اب واضح ہو کہ جیسا کہ یہ حد بندی اجسام میں پائی جاتی ہے۔ ایسا ہی یہ حد بندی ارواح میں بھی ثابت ہے۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ جس قدر انسانی رُوح اپنے کمالات ظاہر کر سکتا ہے یا یوں کہو کہ جس قدر کمالات کی طرف ترقی کر سکتا ہے وہ کمالات ایک ہاتھی کے رُوح کو باوجود ضخیم اور جسیم ہونے کے حاصل نہیں ہو سکتے۔ اِسی طرح ہر ایک حیوان کی رُوح بلحاظ اپنی قوتوں اور طاقتوں کے اپنے نوع کے دائرہ کے اندر محدود ہے اور وہی کمالات حاصل کر سکتے ہیں کہ جو اس کے نوع کے لئے مقرر اور مقدر ہیں۔ پس جس طرح اجسام کی حد بندی اِس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اُن کا کوئی حد باندھنے والا اور خالق ہے اِسی طرح ارواح کی طاقتوں کی حد بندی اِس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ اُن کا بھی کوئی خالق اور حد باندھنے والا ہے۔ اور اِس جگہ تناسخ کا لغو اور بیہودہ جھگڑا پیش کرنا خدا تعالیٰ کے کاموں میں اختلاف ڈالنا ہے کیونکہ عقل صریح شہادت دیتی ہے کہ یہ دونوں حد بندیاں ایک ہی انتظام کے ماتحت ہیں اور ان دونوں حد بندیوں سے ایک ہی مقصود ہے اور وہ یہ کہ تا حد بندی سے حد باندھنے والے کا پتہ لگ جائے اور تا معلوم ہو جائے کہ جیسا کہ وہ اجسام کا خالق اور حد باندھنے والا ہے ایسا ہی وہ ارواح کا خالق اور حد باندھنے والا ہے۔

(چشمۂ معرفت صـ ۱۱-۹)

خدا وہ ہے جس نے ہر ایک چیز کو پیدا کیا اور کوئی چیز اس کی پیدائش سے باہر نہیں اور اس نے پیدا کر کے ہر ایک کے جسم اور طاقتوں اور قوتوں اور خواص اور صورت اور شکل کو ایک حد کے اندر محدود کر دیا تا اُس کا محدود ہونا محدّد پر دلالت کرے جو ذاتِ باری عزّ اسمہٗ ہے مگر آپ وہ غیر محدود ہے اِسلئے اس کی نسبت سوال نہیں ہو سکتا کہ اُس کا محدّد کون ہے۔ غرض آیت ممدوحہ بالا میں خدا تعالیٰ نے صاف فرما دیا کہ ہر ایک چیز جو ظہور پذیر ہوئی ہے مع اپنی تمام قوتوں اور طاقتوں کے خدا کی پیدا کردہ ہے۔ پس یہی کامل توحید ہے جو خدا تعالیٰ کو تمام فیوض کا سرچشمہ قرار دیتی ہے اور کوئی ایسی چیز قرار نہیں دیتی جو اسکی پیدا کردہ نہیں یا اُسی کے سہارے سے جیتی نہیں۔ (چشمۂ معرفت صـ ۱۵۷،۱۵۶)

بعض ایسی تقدیریں جو تقدیرِ مُبرم کے مشابہہ ہوں بدلائی بھی جاتی ہیں مگر جو تقدیر حقیقی اور واقعی طور پر مبرم ہے وہ مومن کامل کی دعاؤں سے ہرگز بدلائی نہیں جاتی اگرچہ وہ مومن کامل نبی اور رسول کا ہی درجہ رکھتا ہو۔ (آسمانی فیصلہ صـ ۱۴)

یہ سچ ہے کہ ہر ایک امر پر تقدیر محیط ہو رہی ہے مگر تقدیر نے علوم کو ضائع اور بے حُرمت نہیں کیا اور نہ اسباب کو بے اعتبار کر کے دکھلایا بلکہ اگر غور کر کے دیکھو تو یہ جسمانی اور رُوحانی اسباب بھی تقدیر سے باہر نہیں ہیں۔ مثلاً اگر ایک بیمار کی تقدیر نیک ہو تو اسباب تقدیر علاج پُورے طور پر میسّر آ جاتے ہیں اور جسم کی حالت

بھی ایسے درجہ پر ہوتی ہے کہ وہ اُن سے نفع اُٹھانے کے لئے مُستعد ہوتا ہے تب دَوا نشانہ کی طرح جا کر اثر کرتی ہے۔ یہی قاعدہ دُعا کا بھی ہے یعنی دعا کے لئے بھی تمام اسباب و شرائط قبولیت اُسی جگہ جمع ہوتے ہیں جہاں ارادۂ الٰہی اُس کے قبول کرلے کا ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے نظامِ جسمانی اور رُوحانی کو ایک ہی سلسلہ مؤثرات اور متاثرات میں باندھ رکھا ہے۔ (برکات الدعا صث)

تقدیر دو قسم کی ہوتی ہے ایک کا نام معلّق ہے اور دوسری کو مُبرم کہتے ہیں۔ اگر کوئی تقدیر معلق ہو تو دعا اور صدقات اُس کو ٹلا دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اُس تقدیر کو بدل دیتا ہے۔ مُبرم ہونے کی صورت میں وہ صدقات اور دُعا اس تقدیر کے متعلق کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتے ہاں وہ عبث اور فضول بھی نہیں رہتی کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے۔ وہ اس دعا اور صدقات کا اثر اور نتیجہ کسی دوسرے پیرائے میں اس کو پہنچا دیتا ہے۔ بعض صورتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی تقدیر میں ایک وقت تک توقف اور تاخیر ڈال دیتا ہے۔ قضائے معلّق اور مُبرم کا ماخذ اور پتہ قرآن کریم سے ملتا ہے۔ یہ الفاظ گو نہیں مثلاً قرآن کریم میں فرمایا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ[1] ترجمہ "دعا مانگو میں قبول کروں گا" اب یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ دعا قبول ہوسکتی ہے اور دعا سے عذاب ٹل جاتا ہے اور ہزار ہا کیا کُل کام دعا سے نکلتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کُل چیزوں پر قادرانہ تصرّف ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کے پوشیدہ تصرفات کی لوگوں کو خواہ خبر ہو یا نہ ہو مگر صدہا تجربہ کاروں کے وسیع تجربے اور ہزارہا دردمندوں کی دعا کے صریح نتیجے بتلا رہے ہیں کہ اس کا ایک پوشیدہ اور مخفی تصرّف ہے وہ جو چاہتا ہے محو کرتا ہے اور جو چاہتا ہے اثبات کرتا ہے۔ ہمارے لئے یہ امر ضروری نہیں کہ ہم اس کی تہہ تک پہنچیں اور اس کی کُنہ اور کیفیت معلوم کرنے کی کوشش کریں جبکہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ ایک شئے ہونے والی ہے۔ اِس لئے ہم کو اِس جھگڑے اور مباحثے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

خدا تعالیٰ نے انسان کے قضا و قدر کو مشروط بھی رکھا ہے جو توبہ، خشوع خضوع سے ٹل سکتی ہیں۔ جب کسی قسم کی تکلیف اور مصیبت اِنسان کو پہنچتی ہے تو وہ فطرتاً اور طبعًا اعمالِ حسنہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اپنے اندر ایک قلق اور کرب محسوس کرتا ہے جو اُسے بیدار کرتا اور نیکیوں کی طرف کھینچے لئے جاتا ہے اور گناہ سے ہٹاتا ہے۔ جس طرح پر ہم اَدویات کے اثر کو تجربے کے ذریعہ سے پالیتے ہیں اسی طرح ہر ایک مضطرب الحال انسان جب خدا تعالیٰ کے آستانہ پر نہایت تذلّل اور نیستی کے ساتھ گرتا ہے اور رَبِّیْ رَبِّیْ کہہ کر اس کو پکارتا اور دعائیں مانگتا ہے تو وہ رُویائے صالحہ یا الہامِ صحیحہ کے ذریعہ سے ایک بشارت اور تسلّی پا لیتا ہے۔ حضرت علی کرّم اللہ وجہٗ فرماتے ہیں کہ جب صبر اور صدق سے انتہاء کو پہنچے گی تو وہ قبول ہوجاتی ہے۔ دعا، صدقہ اور خیرات سے عذاب کا ٹلنا ایسی ثابت شدہ صداقت ہے جس پر ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی کا اِتفاق ہے اور کروڑہا صلحاء

[1] مومن آیت ۶۱

اور اتقیاء اور اولیاء اللہ کے ذاتی تجربے اِس امر پر گواہ ہیں۔

(الحکم جلد ۳ نمبر ۱۳۔ ۱۲؍ اپریل ۱۸۹۹ء صفحہ ۳ کالم ۱، ۲)

تقدیر یعنی دُنیا کے اندر تمام اشیاء کا ایک اندازہ اور قانون کے ساتھ چلنا اور ٹھہرنا اِس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اس کا کوئی مقدِّر یعنی اندازہ باندھنے والا ضرور ہے۔ گھڑی کو اگر کسی نے بالارادہ نہیں بنایا تو وہ کیوں اِس قدر ایک باقاعدہ نظام کے ساتھ اپنی حرکت کو قائم رکھ کر ہمارے واسطے فائدہ مند ہوتی ہے ایسا ہی آسمان کی گھڑی کہ اُس کی ترتیب اور باقاعدہ اور باضابطہ انتظام یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ بالارادہ خاص مقصد اور مطلب اور فائدہ کے واسطے بنائی گئی ہے۔ اِس طرح انسان مصنوع سے صانع کو اور تقدیر سے مقدِّر کو پہچان سکتا ہے۔ (الحکم جلد ۳ ۲۶ مورخہ ۲۴؍ جولائی ۱۸۹۹ء صفحہ ۱)

اہلِ علم خوب جانتے ہیں کہ قضا ٹل جایا کرتی ہے اِس لئے اِنسان پوری تضرع، خشوع، خضوع اور حضورِ قلب سے اور سچی عاجزی، فروتنی اور دردِ دل سے اس سے دعا کرے۔۔۔۔ ہمیں بار بار خیال آتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کو بھی کوئی ایک وحشتناک ہی معاملہ معلوم ہوُا ہوگا کہ انہوں نے ساری رات دعا میں صرف کی اور نہایت درجے کے درد انگیز اور بلبلانے والے الفاظ سے خدا کے حضور دعا کرتے رہے۔ ممکن ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی تقدیرِ معلّق کو مُبرم ہی خیال کر بیٹھے ہوں اور اسی وجہ سے ان کا یہ سارا اضطراب و گھبراہٹ بڑھ گئی ہو اور اس درجے کا گداز اور رِقّت ان میں اپنا آخری دم جان کر ہی پیدا ہوئی ہو کیونکہ اکثر ایک تقدیر جو معلّق ہوُا کرتی ہے ایسی باریک رنگ میں ہوتی ہے کہ اس کو سرسری نظر سے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مُبرم ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالقادر صاحب جیلانی رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنی کتاب فتوح الغیب میں لکھتے ہیں کہ میری دعا سے اکثر وہ قضا جو قضا مبرم کے رنگ میں ہوتی ہے ٹل جاتی ہے اور ایسے بہت سے واقعات ہو چکے ہیں مگر ان کے اِس امر کا جواب ایک اور بزرگ نے دیا ہے کہ اصل بات یہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تقدیرِ معلّق ایسے طور سے واقع ہوتی ہے کہ اس کا پہچاننا کہ آیا معلّق ہے یا مُبرم محال ہو جاتا ہے۔ اسے سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ مبرم ہے مگر درحقیقت ہوتی وہ تقدیرِ معلّق ہے اور وہ ایسی ہی تقدیریں ہوں گی جو شیخ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعا سے ٹل گئی ہوں کیونکہ تقدیرِ معلّق ٹل جایا کرتی ہے۔ غرض اہل اللہ نے اس امر کو خوب واضح طور سے لکھا ہے کہ قضا معلّق ٹل جایا کرتی ہے۔۔۔۔ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا[1] سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ضرور انبیاء اور صلحاء کو بھی دُنیا میں ایک ایسا وقت آتا ہے کہ نہایت درجہ کی مصیبت کا وقت اور سخت جانکاہ مشکل ہوتی ہے اور اہلِ حق بھی ایک دفعہ اس صعوبت میں وارد ہوتے ہیں مگر خدا جلد ان کی خبرگیری کرتا اور ان کو اس سے نکال لیتا ہے اور چونکہ وہ ایک تقدیرِ معلّق ہوتی ہے

[1] مریم آیت ۷۲

اسی واسطے ان کی دُعاؤں اور ابتہال سے ٹل جایا کرتی ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ تقدیر کے دو حصّے کیوں ہیں تو جواب یہ ہے کہ تجربہ اس بات پر شاہد ہے کہ بعض وقت سخت خطرناک صورتیں پیش آتی ہیں اور انسان بالکل مایوس ہو جاتا ہے لیکن دعا و صدقات و خیرات سے آخر کار وہ صورت ٹل جاتی ہے پس آخر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اگر معلق تقدیر کوئی شئے نہیں ہے اور جو کچھ ہے مبرم ہی ہے تو پھر دفعِ بلا کیوں ہو جاتا ہے؟ اور دعا و صدقہ خیرات وغیرہ کوئی شئے نہیں ہے بعض ارادے الٰہی صرف اِس لئے ہوتے ہیں کہ انسان کو ایک حد تک خوف دلایا جاوے اور پھر صدقہ و خیرات جب وہ کرے تو وہ خوف دُور کر دیا جاوے۔ دعا کا اثر مثل نر و مادہ کے ہوتا ہے کہ جب وہ شرط پوری ہو اور وقتِ مناسب مِل جاوے اور کوئی نقص نہ ہو تو ایک امر ٹل جاتا ہے اور جب تقدیر مبرم ہو تو پھر ایسے اسباب دُعا کی قبولیت کے بہم نہیں پہنچتے۔ طبیعت تو دعا کو چاہتی ہے مگر توجہ کامل میسّر نہیں آتی اور دِل میں گداز پیدا نہیں ہوتا۔ نماز، سجدہ وغیرہ جو کچھ کرتا ہے اس میں بدمزگی پاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انجام بخیر نہیں اور تقدیر مبرم ہے..... سیّد عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی لکھتے ہیں کہ بعض وقت میری دعا سے تقدیرِ مبرم ٹل گئی ہے۔ اس پر شارح شیخ عبد الحق محدّث دہلی نے اعتراض کیا ہے کہ تقدیر مبرم تو ٹل نہیں سکتی پھر اس کے کیا معنی ہوئے۔ آخر خود ہی جواب دیا ہے کہ تقدیر مبرم کی دو اقسام ہیں ایک مبرم حقیقی اور ایک مبرم غیر حقیقی۔ جو مبرم حقیقی ہے وہ تو کسی صورت سے ٹل نہیں سکتی ہے جیسے کہ انسان پر موت تو آنی ہے۔ اب اگر کوئی چاہے کہ اس پر موت نہ آوے اور یہ قیامت تک زندہ رہے تو یہ نہیں ٹل سکتی۔ دوسری غیر حقیقی وہ ہے جس میں مشکلات اور مصائب اِنتہائی درجہ تک پہنچ چکے ہوں اور قریب قریب نہ ٹلنے کے نظر آویں۔ اس کا نام مجازی طور پر مبرم رکھا گیا ہے ورنہ حقیقی مبرم تو ایسی ہے کہ اگر کُل انبیاء بھی مل کر دعا کریں کہ وہ ٹل جاوے تو وہ ہرگز نہیں ٹل سکتی۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۲۷ مورخہ ۱۶ جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳، ۴)

تقدیر دو طرح کی ہوتی ہے ایک کو تقدیر معلق کہتے ہیں اور دوسری کو تقدیر مبرم کہتے ہیں۔ ارادۂ الٰہی جب ہو چکتا ہے تو پھر اس کا تو کچھ علاج نہیں ہوتا۔ اگر اس کا بھی کچھ علاج ہوتا تو سب دُنیا بچ جاتی۔ مبرم کے علامات ہی ایسے ہوتے ہیں کہ دن بدن بیماری ترقی کرتی جاتی ہے اور حالت بگڑتی چلی جاتی ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اِفْكُ ۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ ﴿۵﴾

عَلَيۡهِ قَوۡمٌ اٰخَرُوۡنَ ۛۚ فَقَدۡ جَآءُوۡ ظُلۡمًا وَّزُوۡرًا ۚۛ

اگر آنحضرت اُمّی نہ ہوتے تو مخالفینِ اسلام بالخصوص یہودی اور عیسائی جن کو علاوہ اعتقادی مخالفت کے یہ بھی حسد اور بُغض دامنگیر تھا کہ بنی اسرائیل میں سے رسول نہیں آیا بلکہ ان کے بھائیوں میں سے جو بنی اسماعیل ہیں آیا وہ کیونکر ایک صریح امر خلافِ واقعہ پاکر خاموش رہتے بلا شبہ ان پر یہ بات بکمال درجہ ثابت ہو چکی تھی کہ جو کچھ آنحضرتؐ کے مونہہ سے نکلتا ہے وہ کسی اُمّی اور ناخواندہ کا کام نہیں اور نہ دس بیس آدمیوں کا کام ہے تب ہی تو وہ اپنی جہالت سے اَعَانَہٗ عَلَيۡهِ قَوۡمٌ اٰخَرُوۡنَ کہتے تھے اور جو ان میں سے دانا اور واقعی اہلِ علم تھے وہ بخوبی معلوم کر چکے تھے کہ قرآن انسانی طاقتوں سے باہر ہے اور اُن پر یقین کا دروازہ ایسا کھل گیا تھا کہ اُن کے حق میں خدا نے فرمایا یَعۡرِفُوۡنَهٗ كَمَا يَعۡرِفُوۡنَ اَبۡنَآءَهُمۡ۔[1]

(براہین احمدیہ صفحہ ۴۹۵، ۴۹۶)

اَعَانَہٗ عَلَيۡهِ قَوۡمٌ اٰخَرُوۡنَ یعنی ایک بڑی جماعت نے متفق ہو کر قرآن شریف کو تالیف کیا ہے ایک آدمی کا کام نہیں۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۴۹۱)

وَقَالُوۡا مَالِ هٰذَا الرَّسُوۡلِ يَاۡكُلُ الطَّعَامَ وَيَمۡشِىۡ فِى الۡاَسۡوَاقِ ؕ لَوۡلَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مَلَكٌ فَيَكُوۡنَ مَعَهٗ نَذِيۡرًا ۙ

عرب کے کفار کا ایک یہ اعتراض خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں لکھا ہے کہ يَاۡكُلُ الطَّعَامَ وَيَمۡشِىۡ فِى الۡاَسۡوَاقِ یعنی یہ تو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں پھرتا ہے۔ اُن کے نزدیک روٹی کھانا یا عمدہ کھانا استعمال کرنا شانِ نبوت کے برخلاف تھا اور نیز یہ اعتراض تھا کہ نبی گوشہ نشین ہونا چاہیئے نہ یہ کہ بازاروں میں بھی پھرے۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۲۸۴ حاشیہ)

انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایک تصرف تو اُسی مخلوق کی نوعیت اور اعتبار سے ہوتا ہے جو يَاۡكُلُ الطَّعَامَ وَيَمۡشِىۡ فِى الۡاَسۡوَاقِ وغیرہ کے رنگ میں ہوتا ہے۔ صحت بیماری وغیرہ اُس کے ہی اختیار میں ہوتا ہے اور ایک جدید تصرّف قُرب کے مراتب میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے طور پر ان کے قریب ہوتا ہے کہ اُن سے مخاطبات اور مطالعات شروع ہو جاتے ہیں اور اُن کی دعاؤں کا جواب ملتا ہے مگر بعض لوگ نہیں سمجھ سکتے اور یہاں تک ہی نہیں بلکہ نرے مطالعہ اور مخاطبہ سے بڑھ کر ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ الوہیت کی چادر ان پر

[1] بقرہ آیت ۱۴۷

پڑی ہوئی ہوتی ہے اور خدائے تعالیٰ اپنی ہستی کے طرح طرح کے نمونے اُن کو دکھاتا ہے اور یہ ایک ٹھیک مثال اس قرب اور تعلق کی ہے کہ جیسے لوہے کو کسی آگ میں رکھ دیں تو وہ اثر پذیر ہو کر سُرخ آگ کا ایک ٹکڑا ہی نظر آتا ہے اُس وقت اس میں آگ کی سی روشنی بھی ہوتی ہے اور احراق جو ایک صفت آگ کی ہے وہ بھی اس میں آجاتی ہے مگر بایں ہمہ یہ ایک بیّن بات ہے کہ وہ لوہا آگ یا آگ کا ٹکڑا نہیں ہوتا۔ اسی طرح سے ہمارے تجربہ میں آیا ہے کہ اہل اللہ قربِ الٰہی میں ایسے مقام تک جا پہنچتے ہیں جبکہ ربّانی رنگ بشریّت کے رنگ وبُو کو تمام وکمال اپنے رنگ کے نیچے متواری کر لیتا ہے اور جس طرح آگ لوہے کو اپنے نیچے ایسا چھپا لیتی ہے کہ ظاہر میں بجز آگ کے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا اور ظلّی طور پر وہ صفاتِ الٰہیہ کا رنگ اپنے اندر پیدا کرتا ہے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۶ء صفحہ ۱۴۰، ۱۴۱)

کفار نے جو یہ کہا تھا کہ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ تو انہوں نے بھی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری حالت دیکھ کر ہی یہ کلمہ مُنہ سے نکالا تھا کہ کیا ہے جی۔ یہ تو ہمارے جیسا آدمی ہی ہے۔ کھاتا پیتا بازاروں میں پھرتا ہے اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا فیض نہ تھا کہ ان کو کوئی رسالت کا امر نظر آتا۔ وہ معذور تھے۔ انہوں نے جو دیکھا تھا اسی کے مطابق رائے زنی کر دی۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ر مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

انہوں نے کہا کہ یہ کیسا رسول ہے کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں بھی چلتا پھرتا ہے۔ ان کو آخر یہی جواب دیا گیا کہ یہ بھی ایک بشر ہے اور بشری حوائج اس کے ساتھ ہیں۔ اس سے پہلے جس قدر نبی اور رسول آئے وہ بھی بشر ہی تھے۔ یہ بات انہوں نے بنظرِ استخفاف کہی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی بازاروں سے عموماً سودا سلف خریدا کرتے تھے۔ ان کے دلوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو نقشہ تھا وہ تو نری بشریت تھی جس میں کھانا پینا سونا چلنا پھرنا وغیرہ تمام امور اور لوازم بشریت کے موجود تھے اس واسطے ان لوگوں نے رد کر دیا۔ یہ مشکل اس لئے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ اپنے دل سے ہی ایک خیالی تصویر بنا لیتے ہیں کہ نبی ایسا ہونا چاہیئے اور چونکہ اس تصویر کے موافق وہ اسے نہیں پاتے اِس لحاظ سے ٹھوکر کھاتے ہیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۷ مورخہ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

طعام سے مراد اچھا مکلّف کھانا ہے۔ جب انکار حد سے گذر جاتا ہے تو ایسے ہی اعتراض سُوجھتے ہیں۔

(بدر جلد ۷ نمبر ۲۰، ۱۹ مورخہ ۲۴ر مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ ۲۱

وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ اَتَصْبِرُوْنَ ۚ وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ۝

ہم نے تجھ سے پہلے جس قدر رسول بھیجے ہیں وہ سب کھانا کھایا کرتے تھے اور بازاروں میں پھرتے تھے اور پہلے ہم بہ نصِ قرآنی ثابت کر چکے ہیں کہ دنیوی حیات کے لوازم میں سے طعام کا کھانا ہے سو چونکہ وہ اب تمام نبی طعام نہیں کھاتے لہٰذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ سب فوت ہو چکے ہیں جن میں بوجہ کلمہ حصر مسیح بھی داخل ہے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۱۲)

وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ۝

يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ ۔ ظالم اپنا ہاتھ کاٹے گا۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۸ صفحہ ۱۰۳)
ظالم اپنے ہاتھ کاٹے گا۔ (تبلیغِ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۸ صفحہ ۱۱۴)

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِى اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝

یاد رکھو قرآن شریف حقیقی برکات کا سرچشمہ اور نجات کا سچا ذریعہ ہے۔ یہ ان لوگوں کی اپنی غلطی ہے جو قرآن شریف پر عمل نہیں کرتے۔ عمل نہ کرنے والوں میں سے ایک گروہ تو وہ ہے جس کو اس پر اعتقاد ہی نہیں اور وہ اس کو خدا تعالیٰ کا کلام ہی نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ تو بہت دُور پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے اور نجات کا شفا بخش نسخہ ہے اگر وہ اس پر عمل نہ کریں تو کس قدر تعجب اور افسوس کی بات ہے۔ ان میں سے بہت سے تو ایسے ہیں جنہوں نے ساری عمر میں کبھی اُسے پڑھا ہی نہیں۔ پس ایسے آدمی جو خدا تعالیٰ کی کلام سے ایسے غافل اور لاپرواہ ہیں اُن کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص کو معلوم ہے کہ فلاں چشمہ نہایت ہی مصفّٰی اور شیریں اور خنک ہے اور اس کا پانی بہت سی امراض کے واسطے اکسیر اور شفاء ہے۔ یہ علم اس کو یقینی ہے لیکن باوجود اس علم کے اور باوجود پیاسا ہونے اور بہت سی امراض میں مبتلا ہونے کے وہ اس کے پاس نہیں جاتا تو یہ اس کی کیسی بدقسمتی اور جہالت ہے۔ اُسے تو چاہیئے تھا کہ وہ اس چشمہ پر

مُنہ رکھ دیتا اور سیراب ہو کر اُس کے لطف اور شفا بخش پانی سے حظ اُٹھاتا مگر وہ باوجود علم کے اس سے ویسا ہی دُور ہے جیسا کہ ایک بے خبر۔ اور اس وقت تک اُس سے دُور رہتا ہے جو موت آ کر خاتمہ کر دیتی ہے۔ اس شخص کی حالت بہت ہی عبرت بخش اور نصیحت خیز ہے مسلمانوں کی حالت اس وقت ایسی ہی ہو رہی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ساری ترقیوں اور کامیابیوں کی کلید یہی قرآن شریف ہے جس پر ہم کو عمل کرنا چاہیئے مگر نہیں۔ اس کی پرواہ بھی نہیں کی جاتی۔ ایک شخص جو نہایت ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ اور پھر نری ہمدردی ہی نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کے حکم اور ایما سے اس طرف بُلاوے تو اُسے کذاب اور دجّال کہا جاتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اَور کیا قابلِ رحم حالت اس قوم کی ہوگی۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ۝

اِس آیت سے بھی انبیاء کے دشمن مجرمین کے لفظ سے پکارے گئے ہیں اور اِس لئے یہودی بھی مجرم ٹھہرتے ہیں کیونکہ وہ بھی حضرت مسیح علیہ السلام کے جانی دشمن تھے اور آنحضرتؐ کے بھی دشمن تھے۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۲ نمبر ۶ صفحہ ۲۴۸)

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۝

کافر کہتے ہیں کہ کیوں قرآن ایک مرتبہ ہی نازل نہ ہوا۔ ایسا ہی چاہیئے تھا تا وقتاً فوقتاً ہم تیرے دِل کو تسلّی دیتے رہیں اور تا وہ معارف اور علوم جو وقت سے وابستہ ہیں اپنے وقت پر ہی ظاہر ہوں کیونکہ قبل از وقت کسی بات کا سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے سو اس مصلحت سے خدا نے قرآن شریف کو تئیس ۲۳ برس تک نازل کیا تا اُس مدت تک موعود نشان بھی ظاہر ہو جائیں۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۳۴۴)

انبیاء علیہم السلام اللہ تعالیٰ کے مکتب میں تعلیم پانے والے ہوتے ہیں اور تلامیذ الرحمٰن کہلاتے ہیں۔ اُن کی ترقی بھی تدریجی ہوتی ہے اِس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن شریف میں آیا ہے كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا۔ پس مَیں اِس بات کو خوب جانتا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام کی

حالت کیسی ہوتی ہے۔ جس دن نبی مامور ہوتا ہے اُس دن اور اُس کی نبوت کے آخری دن میں ہزاروں کوس کا فرق ہوجاتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ عــ۲۹ــ مورخہ ۱۷؍اگست ۱۹۰۲ء صــ۱ــ)

وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ۝

اور تیرے ساتھ ہنسی سے ہی پیش آئیں گے اور ٹھٹھا مار کر کہیں گے کیا یہی ہے جس کو خدا نے اصلاحِ خلق کے لئے مقرر کیا یعنی جن کا مادّہ ہی خُبث ہے اُن سے صلاحیت کی امید مت رکھ۔

(براہین احمدیہ صــ۵۱۲ــ حاشیہ)

ان لوگوں نے تجھے ایک ہنسی کی جگہ سمجھ رکھا ہے۔ وہ طنزاً کہتے ہیں کہ کیا یہی وہ شخص ہے جس کو خدا نے ہم میں دعوت کے لئے کھڑا کیا۔ (براہین احمدیہ حصّہ پنجم صــ۶۸ــ)

تجھے لوگ ہنسی کی جگہ بنالیں گے اور کہیں گے کہ کیا یہی شخص خدا نے مبعوث فرمایا ہے۔

(براہین احمدیہ حصّہ پنجم صــ۸۶ــ)

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ۝

کیا تُو یہ خیال کرتا ہے کہ اکثر لوگ اُن میں سے سُنتے اور سمجھتے ہیں۔ نہیں یہ تو چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر۔ (براہین احمدیہ صــ۵۴۳، ۵۴۴ــ)

انسان جو اخلاقِ فاضلہ کو حاصل کرکے نفع رساں ہستی نہیں بنتا۔ ایسا ہوجاتا ہے کہ وہ کسی بھی کام نہیں آسکتا۔ مُردار حیوان سے بھی بدتر ہوجاتا ہے کیونکہ اس کی تو کھال اور ہڈیاں بھی کام آجاتی ہیں اسکی تو کھال بھی کام نہیں آتی اور یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں انسان بَلْ هُمْ اَضَلُّ کا مصداق ہوجاتا ہے۔

(الحکم جلد ۴ عــ۲۵ــ مورخہ ۹؍جولائی ۱۹۰۰ء صــ۳ــ)

تیسرے درجہ کے وہ لوگ ہیں جو عمدہ اخلاق اور عمدہ اعمال میں سبقت لے جاتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا زمانہ جو صدرِ اسلام کا وقت تھا اس زمانہ پر ایک وسیع نظر ڈال کر ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم نے کیونکر ایمان لانے والوں کو مذکورہ بالا ادنیٰ درجہ سے اعلیٰ درجہ تک پہنچا دیا کیونکہ ایمان لانے والے اپنی ابتدائی حالت میں اکثر ایسے تھے کہ جس حالت کو وہ ساتھ لے کر آئے تھے وہ حالت جنگلی وحشیوں سے بدتر تھی اور درندوں کی طرح ان کی زندگی تھی اور اس قدر بداعمال اور بداخلاق میں مبتلا تھے کہ انسانیت سے باہر ہوچکے تھے اور ایسے بے شعور ہوچکے تھے کہ نہیں سمجھتے تھے کہ ہم بداعمال ہیں یعنی نیکی اور بدی کی شناخت کی حس بھی جاتی رہی تھی۔ پس قرآنی تعلیم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت نے جو پہلا اثر ان پر کیا تو وہ یہ تھا کہ ان کو محسوس ہوگیا کہ ہم پاکیزگی کے جامہ سے بالکل برہنہ اور بداعمالی کے گند میں گرفتار ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے انکی پہلی حالت کی نسبت فرمایا ہے اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا یعنی "یہ لوگ چارپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر" پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم کی پاک صحبت اور فرقانِ حمید کی دلکش تاثیر سے ان کو محسوس ہوگیا کہ جس حالت میں ہم نے زندگی بسر کی ہے وہ ایک وحشیانہ زندگی ہے اور سراسر بداعمالیوں سے ملوث ہے تو انہوں نے رُوح القدس سے قوت پاکر نیک اعمال کی طرف حرکت کی۔ (لیکچر چشمہ معرفت ص۵۶)

رکوع ۵ آیت ۴۶ تا ۴۸

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۙ ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا ۝ وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُوْرًا ۝

کیا تُو خدا کی طرف دیکھتا نہیں کہ وہ کیونکر سایہ کو لمبا کھینچتا ہے یہاں تک کہ تمام زمین پر تاریکی ہی (تاریکی) دکھائی دیتی ہے اور اگر وہ چاہتا تو ہمیشہ تاریکی رکھتا اور کبھی روشنی نہ ہوتی لیکن ہم آفتاب کو اس لئے نکالتے ہیں کہ تا اس بات پر دلیل قائم ہو کہ اس سے پہلے تاریکی تھی یعنی تا بذریعہ روشنی کے تاریکی کا وجود شناخت کیا جائے کیونکہ ضد کے ذریعہ سے ضد کا پہچاننا بہت آسان ہو جاتا ہے اور روشنی کا قدر و منزلت اُسی پر کھلتا ہے کہ جو تاریکی کے وجود پر علم رکھتا ہو اور پھر فرمایا کہ ہم تاریکی کو روشنی کے ذریعہ سے تھوڑا تھوڑا دُور کرتے جاتے ہیں تا اندھیرے میں بیٹھنے والے اس روشنی سے آہستہ آہستہ منتفع ہو جائیں اور جو یک دفعی انتقال

ہیں حیرت و وحشت متصور رہے وہ بھی نہ ہو سو اسی طرح جب دُنیا پر رُوحانی تاریکی طاری ہوتی ہے تو خلقت کو روشنی سے متنفع کرنے کے لئے اور نیز روشنی اور تاریکی میں جو فرق ہے وہ فرق ظاہر کرنے کے لئے خدائے تعالیٰ کی طرف سے آفتابِ صداقت نکلتا ہے اور پھر وہ آہستہ آہستہ دُنیا پر طلوع کرتا جاتا ہے۔

(براہین احمدیہ صـ۵۴۷، ۵۴۸)

وَهُوَ الَّذِيٓ أَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُوْرًا ۙ لِنُحْيِيَ بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ أَنْعَامًا وَّأَنَاسِيَّ كَثِيْرًا ۝

خدا وہ ذاتِ کریم و رحیم ہے کہ جو بارش سے پہلے ہواؤں کو چھوڑتا ہے پھر ہم ایک پاک پانی آسمان سے اتارتے ہیں تا اُس سے مری ہوئی بستی کو زندہ کریں اور پھر بہت سے آدمیوں اور چارپایوں کو پانی پلادیں۔

(براہین احمدیہ صـ۵۴۴)

ہم نے آسمان سے پاک پانی اتارا یعنی قرآن تا ہم اس کے ساتھ مُردہ زمین کو زندہ کریں۔

(ازالہ اوہام صـ۲۴۴)

وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوْا ۖ فَأَبٰٓى أَكْثَرُ النَّاسِ إِلَّا كُفُوْرًا ۝

اور ہم پھیر پھیر کر مثالیں بتلاتے ہیں تا لوگ یاد کرلیں کہ نبیوں کے بھیجنے کا یہی اصول ہے۔

(براہین احمدیہ حصہ چہارم صـ۵۴۵)

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ۝ۖ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝

اگر ہم چاہتے تو ہر ایک بستی کے لئے جُدا جُدا رسول بھیجتے مگر یہ اِس لئے کیا گیا کہ تا تجھ سے بھاری کوششیں ظہور میں آویں یعنی جب ایک مرد ہزاروں کا کام کرے گا تو بلاشبہ وہ بڑا اجر پائے گا اور یہ امر اس کی افضلیت کا موجب ہوگا سو چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم افضل الانبیاء اور سب رسولوں سے بہتر اور بزرگ تر تھے اور خدائے تعالیٰ کو منظور تھا کہ جیسے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے ذاتی جوہر کی رُو سے فی الواقع سب انبیاء کے سردار ہیں ایسا ہی ظاہری خدمات کی رُو سے بھی اُن کا سب سے فائق اور برتر ہونا دُنیا پر ظاہر اور روشن ہو جائے اِس لئے خدائے تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو کافہ بنی آدم کے لئے عام رکھا تا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محنتیں اور کوششیں عام طور پر ظہور میں آویں۔ موسیٰ اور ابنِ مریم کی طرح ایک خاص قوم سے مخصوص نہ ہوں اور تا ہر یک طرف سے اور ہر یک گروہ اور قوم سے تکالیفِ شاقہ اُٹھا کر اُس اجرِ عظیم کے مستحق ٹھہر جائیں کہ جو دوسرے نبیوں کو نہیں ملے گا۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۴۴/۵۴۵)

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا فَجَعَلَهُ نَسَبًا وَّ صِهْرًا ۗ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيرًا ۝ (۵۵)

خدا وہ ذات قادرِ مطلق ہے جس نے بشر کو اپنی قدرتِ کاملہ سے پیدا کیا پھر اس کے لئے نسل اور رشتہ مقرر کر دیا۔ اسی طرح وہ انسان کی رُوحانی پیدائش پر بھی قادر تھا یعنی اس کا قانونِ قدرت رُوحانی پیدائش میں بعینہٖ جسمانی پیدائش کی طرح ہے کہ اوّل وہ ضلالت کے وقت میں کہ جو عدم کا حکم رکھتا ہے کسی انسان کو روحانی طور پر اپنے ہاتھ سے پیدا کرتا ہے اور پھر اس کے متبعین کو کہ جو اُس کی ذرّیت کا حکم رکھتے ہیں بہ برکت متابعت اُس کی کے رُوحانی زندگی عطا فرماتا ہے سو تمام مُرسل رُوحانی آدم ہیں اور اُن کی اُمّت کے نیک لوگ اُن کی رُوحانی نسلیں ہیں اور روحانی اور جسمانی سلسلہ بالکل آپس میں تطابق رکھتا ہے اور خدا کے ظاہری اور باطنی قوانین میں کسی نوع کا اختلاف نہیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۴۶/۵۴۷)

قُلْ مَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَنْ شَاءَ أَنْ يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۝ (۵۸)

دوسری صفت رحمان کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس صفت کے بھی کامل مظہر ٹھہرے کیونکہ آپ کے فیوض و برکات کا کوئی بدل اور اجر نہیں مَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ۔ پھر آپؐ رحیمیت کے مظہر ہیں۔ آپؐ نے اور آپؐ کے صحابہؓ نے جو محنتیں اسلام کے لئے کیں اور ان خدمات میں جو تکالیف اُٹھائیں وہ ضائع نہیں ہوئیں بلکہ ان کا اجر دیا گیا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن شریف میں رحیم کا لفظ بولا ہی گیا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

۶۰ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ۚ اَلرَّحْمٰنُ فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِیْرًا۝

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کی تفسیر کے لئے دیکھیں تفسیر سورۃ اعراف آیت نمبر ۵۵ صفحہ ۱۶۷۔

الفرقان ۶۱ تا ۶۴ وَاِذَا قِیْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا الرَّحْمٰنُ ۗ اَنَسْجُدُ لِمَا تَاْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا۝ تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا۝ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا۝ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۝

جب کافروں اور بے دینوں اور دہریوں کو کہا جاتا ہے کہ تم رحمان کو سجدہ کرو تو وہ رحمان کے نام سے متنفر ہو کر بطور انکار سوال کرتے ہیں کہ رحمان کیا چیز ہے (پھر بطور جواب فرمایا) رحمان وہ ذات کثیر البرکت اور مصدر خیرات دائمی ہے جس نے آسمان میں بُرج بنائے بُرجوں میں آفتاب اور چاند کو رکھا جو کہ عامۂ مخلوقات کو بغیر تفریق کافر و مومن کے روشنی پہنچاتے ہیں۔ اسی رحمان نے تمہارے لئے یعنی تمام بنی آدم کے لئے دن اور رات بنائے جو کہ ایک دوسرے کے بعد دورہ کرتے رہتے ہیں تا جو شخص طالبِ معرفت ہو وہ ان دقائق حکمت سے فائدہ اُٹھاوے اور جہل اور غفلت کے پردہ سے خلاصی پاوے اور جو شخص شکرِ نعمت کرنے پر مستعد ہو وہ شکر کرے۔ رحمان کے حقیقی پرستار وہ لوگ ہیں کہ جو زمین پر بُردباری سے چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے سخت کلامی سے پیش آئیں تو سلامتی اور رحمت کے لفظوں سے ان کا معاوضہ کرتے ہیں یعنی بجائے سختی کے نرمی اور بجائے گالی کے دعا دیتے ہیں اور تشبّہ باخلاق رحمانی کرتے ہیں کیونکہ رحمان بھی بغیر تفریق نیک و بد کے اپنے سب بندوں کو سورج اور چاند اور زمین اور دوسری بے شمار نعمتوں سے فائدہ پہنچاتا ہے۔ پس اِن آیات میں خدائے تعالیٰ نے اچھی طرح کھول دیا کہ رحمان کا لفظ ان معنوں کر کے خدا پر بولا جاتا ہے کہ اس کی رحمتِ وسیع عام طور پر ہر ایک بُرے بھلے پر محیط ہو رہی ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۳۷۴، ۳۷۵ حاشیہ)

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً الخ خدا وہ ہے کہ جو رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات لاتا ہے تا جس نے یاد کرنا ہو وہ یاد کرے یا شکر کرنا ہو تو شکر کرے یعنی دن کے بعد رات کا آنا اور رات کے بعد دن کا آنا اس بات پر ایک نشان ہے کہ جیسے ہدایت کے بعد ضلالت اور غفلت کا زمانہ آجاتا ہے۔ ایسا ہی خدا کی طرف سے یہ بھی مقرر ہے کہ ضلالت اور غفلت کے بعد ہدایت کا زمانہ آتا ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۲۶)

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا الخ هَوْن ..... یعنی کسی دوسرے کو ظلم کی راہ سے بدنی آزار نہ پہنچانا اور بے شر انسان ہونا اور صلحکاری کے ساتھ زندگی بسر کرنا۔

(تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۴۰)

خدا کے نیک بندے صلحکاری کے ساتھ زمین پر چلتے ہیں۔ (تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۴۰)

وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ○ ۶۵

سچے مسلمان ہمیشہ غلبۂ اسلام کے لئے دعائیں مانگتے ہیں اور تہجد بھی پڑھتے ہیں اور نماز میں بھی

ان کو رقت طاری ہوتی ہے اور آیت یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّهِمۡ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا کا مصداق ہوتے ہیں۔

(ضمیمہ انوار الاسلام انعامی اشتہار تین ہزار صا)

عرب اور دُنیا کی حالت جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بالکل وحشی لوگ تھے کھانے پینے کے سوا کچھ نہیں جانتے تھے۔ نہ حقوق العباد سے آشنا نہ حقوق اللہ سے آگاہ۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے ایک طرف اُن کا نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ یَأۡكُلُوۡنَ كَمَا تَأۡكُلُ الۡاَنۡعَامُ (سورہ محمد آیت ۱۲) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تعلیم نے ایسا اثر کیا یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّهِمۡ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا کی حالت ہوگئی یعنی اپنے رب کی یاد میں راتیں سجدے اور قیام میں گذار دیتے تھے اللہ اللہ کس قدر فضیلت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سبب سے ایک بےنظیر انقلاب اور عظیم الشان تبدیلی واقع ہوگئی حقوق العباد اور حقوق اللہ دونوں کو میزانِ اعتدال پر قائم کر دیا اور مُردار خوار اور مُردہ قوم کو ایک اعلیٰ درجہ کی زندہ اور پاکیزہ قوم بنا دیا دُو ہی خوبیاں ہوتی ہیں علمی یا عملی۔ عملی حالت کا تو یہ حال ہے کہ یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّهِمۡ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا اور علمی کا یہ حال کہ اس قدر کثرت سے تصنیفات کا سلسلہ اور توسیعِ زبان کی خدمت کا سلسلہ جاری ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔

(الحکم جلد ۲ نمبر ۲۴،۲۵ مورخہ ۲۰، ۲۷ راگست ۱۸۹۸ء صفحہ ۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو جماعت ملی وہ ایسی پاکباز اور خدا پرست اور مخلص تھی کہ اس کی نظیر کسی دُنیا کی قوم اور کسی نبی کی جماعت میں ہرگز پائی نہیں جاتی۔ احادیث میں اُن کی بڑی بڑی تعریفیں آئی ہیں۔ یہاں تک فرمایا کہ اَللّٰهُ اَللّٰهُ فِيۡ اَصۡحَابِيۡ اور قرآن شریف میں بھی اُن کی تعریف ہوئی یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّهِمۡ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۷ مورخہ ۳۱ رجولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۱)

رُوحانیت اور پاکیزگی کے بغیر کوئی مذہب چل نہیں سکتا۔ قرآن شریف نے بتلایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پیشتر دُنیا کی کیا حالت تھی یَأۡكُلُوۡنَ كَمَا تَأۡكُلُ الۡاَنۡعَامُ (سورہ محمد آیت ۱۲) پھر جب انہی لوگوں نے اسلام قبول کیا تو فرماتا ہے یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّهِمۡ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا۔ جب تک آسمان سے تریاق نہ ملے تو دل درست نہیں رہتا۔ انسان آگے قدم رکھتا ہے مگر وہ پیچھے پڑتا ہے۔ قدسی صفات اور فطرت والا انسان ہو تو وہ مذہب چل سکتا ہے اس کے بغیر کوئی مذہب ترقی نہیں کر سکتا اور کرتا بھی ہے تو پھر قائم نہیں رہ سکتا۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۳۷ مورخہ ۲ راکتوبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۹۰)

خدا تعالیٰ تو اپنے بندوں کی صفت میں فرماتا ہے یَبِیۡتُوۡنَ لِرَبِّهِمۡ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا کہ وہ اپنے رب کے لئے تمام تمام رات سجدہ اور قیام میں گذارتے ہیں۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۲۶ مورخہ ۸ رجولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

مَیں بڑے زور سے کہتا ہوں کہ خواہ کیسا ہی پکا دشمن ہو اور خواہ وہ عیسائی ہو یا آریہ جب وہ ان حالات کو دیکھے گا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب کے تھے اور پھر اس تبدیلی پر نظر کرے گا جو آپکی تعلیم اور تاثیر سے پیدا ہوئی تو اسے بے اختیار آپ کی حقانیت کی شہادت دینی پڑے گی۔ موٹی سی بات ہے کہ قرآن مجید نے اُن کی پہلی حالت کا تو یہ نقشہ کھینچا ہے یَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ (سورہ محمد آیت ۱۲) یہ تو ان کی کفر کی حالت تھی پھر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک تاثیرات نے ان میں تبدیلی پیدا کی تو انکی یہ حالت ہو گئی یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا یعنی وہ اپنے ربّ کے حضور سجدہ کرتے ہوئے اور قیام کرتے ہوئے راتیں کاٹ دیتے ہیں۔ جو تبدیلی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے وحشیوں میں کی اور جس گڑھے سے نکال کر جس بلندی اور مقام تک انہیں پہنچایا اس ساری حالت کے نقشہ کو دیکھنے سے بے اختیار ہو کر انسان رو پڑتا ہے کہ کیا عظیم الشان انقلاب ہے جو آپ نے کیا۔ دُنیا کی کسی تاریخ اور کسی قوم میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ یہ نری کہانی نہیں یہ واقعات ہیں جن کی سچائی کا ایک زمانہ کو اعتراف کرنا پڑا ہے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

دوسرا معجزہ تبدیل اخلاق ہے کہ یا تو وہ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (سورہ اعراف آیت ۱۸۰) چارپایوں سے بھی بدتر تھے یا یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا رات نمازوں میں گذارنے والے ہو گئے۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۱۹ مورخہ ۹ مئی ۱۹۰۷ء صفحہ ۴)

قبل اسلام میں آنے کے ان لوگوں کی حالت وہ تھی کہ یَاْکُلُوْنَ کَمَا تَاْکُلُ الْاَنْعَامُ (سورہ محمد آیت ۱۲) چارپایوں کی طرح کھانے پینے کے سوائے ان کا کوئی شغل ہی نہ تھا۔ یہ تو حالتِ کفر تھی۔ اس کے بعد ان کی حالتِ اسلامی کی یہ تعریف ہے یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا اپنے ربّ کی عبادت میں سجدہ اور قیام کرتے ہوئے رات گذار دیتے ہیں۔ وہ کھانا پینا سب بھول گئے اور پہلا نقشہ بھی بالکل بدل گیا۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۳ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۱)

۶۸۔ وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا۝

اپنے خرچوں میں نہ تو اسراف کرتے ہیں نہ تنگ دلی کی عادت رکھتے ہیں اور میانہ روش چلتے ہیں۔

(تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۴۹)

۷۳۔ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ○

لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ جھوٹوں کی مجلسوں میں نہیں بیٹھتے۔ (تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۵۳)

وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا اگر کوئی لغوبات کسی سے سنیں جو جنگ کا مقدمہ اور لڑائی کی ایک تمہید ہو تو بزرگانہ طور پر طرح دے کر چلے جاتے ہیں اور ادنیٰ ادنیٰ بات پر لڑنا شروع نہیں کر دیتے یعنی جب تک کوئی زیادہ تکلیف نہ پہنچے اس وقت تک ہنگامہ پردازی کو اچھا نہیں سمجھتے اور صلحکاری کے محل شناس کا یہی اصول ہے کہ ادنیٰ ادنیٰ باتوں کو خیال میں نہ لاویں اور معاف فرماویں اور لغو کا لفظ جو اس آیت میں آیا ہے سو واضح ہو کہ عربی زبان میں لغو اس حرکت کو کہتے ہیں کہ مثلاً ایک شخص شرارت سے ایسی بکواس کرے یا بہ نیت ایذا ایسا فعل اس سے صادر ہو کہ دراصل اس سے کچھ ایسا حرج اور نقصان نہیں پہنچتا۔ سو صلح کاری کی یہ علامت ہے کہ ایسی بیہودہ ایذا سے چشم پوشی فرماویں اور بزرگانہ سیرت عمل میں لاویں لیکن ایذا صرف لغو کی مد میں داخل نہ ہو بلکہ اس سے واقعی طور پر جان یا مال یا عزت کو ضرر پہنچے تو صلحکاری کے خُلق کو اس سے کچھ تعلق نہیں بلکہ اگر ایسے گناہ کو بخشا جائے تو اس خُلق کا نام عفو ہے۔ (تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۱۴۰، ۱۴۱)

کبھی انسان کا غصہ کتاب اللہ کے برخلاف ہوتا ہے۔ گالی سن کر اس کا نفس جوش مارتا ہے تقویٰ تو اس کو سکھلاتا ہے کہ وہ غصہ ہونے سے باز رہے جیسے قرآن کریم کہتا ہے وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۱)

یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب انسان کسی کا مقابلہ کرتا ہے تو اسے کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا ہے جیسے مقدمات میں ہوتا ہے۔ اس لئے آرام اسی میں ہے کہ تم ایسے لوگوں کا مقابلہ ہی نہ کرو۔ سدِّباب کا طریق رکھو اور کسی سے جھگڑا مت کرو۔ زبان بند رکھو۔ گالیاں دینے والے کے پاس چپکے گذر جاؤ گویا سنا ہی نہیں اور ان لوگوں کی راہ اختیار کرو جن کے لئے قرآن شریف نے فرمایا ہے وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا۔ اگر یہ باتیں اختیار کر لو گے تو یقیناً یقیناً اللہ تعالیٰ کے سچے مخلص بن جاؤ گے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۰)

۷۴۔ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا

قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا۝

نکاح سے ایک اور غرض بھی ہے جس کی طرف قرآن کریم میں یعنی سورۃ الفرقان میں اشارہ ہے اور وہ یہ ہے وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا یعنی مومن وہ ہیں جو یہ دُعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے خدا ہمیں اپنی بیویوں کے بارے میں اور فرزندوں کے بارے میں دل کی ٹھنڈک عطا کر اور ایسا کر کہ ہماری بیویاں اور ہمارے فرزند نیک بخت ہوں اور ہم انکے پیش رو ہوں۔
(آریہ دھرم بار دوم صفحہ ۱۹)

یہ صحیح نہیں ہے کہ ہر ایک شخص جس کو کوئی خواب سچی آوے یا الہام کا دروازہ اُس پر کھلا ہو وہ اس نام سے موسوم ہو سکتا ہے بلکہ امام کی حقیقت کوئی اَور امرِ جامع اور حالتِ کاملہ تامّہ ہے جس کی وجہ سے آسمان پر اس کا نام امام ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ صرف تقویٰ اور طہارت کی وجہ سے کوئی شخص امام نہیں کہلا سکتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا پس اگر ہر ایک متقی امام ہے تو پھر تمام مومن متقی امام ہی ہوئے اور یہ امر منشاء آیت کے برخلاف ہے۔
(ضرورت الامام صفحہ ۳)

انسان کو سوچنا چاہیئے کہ اسے اولاد کی خواہش کیوں ہوتی ہے؟ کیونکہ اس کو محض طبعی خواہش ہی تک محدود نہ کر دینا چاہیئے کہ جیسے پیاس لگتی ہے یا بھوک لگتی ہے لیکن جب یہ ایک خاص اندازہ سے گزر جاوے تو ضرور اس کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیئے۔ خدا تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے جیسا کہ فرمایا ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ اب اگر انسان خود مومن اور عبد نہیں بنتا ہے اور اپنی زندگی کے اصل منشاء کو پورا نہیں کرتا ہے اور پورا حقِ عبادت ادا نہیں کرتا بلکہ فسق و فجور میں زندگی بسر کرتا ہے اور گناہ پر گناہ کرتا ہے تو ایسے آدمی کی اولاد کے لئے خواہش کیا نتیجہ رکھے گی صرف یہی کہ گناہ کرنے کے لئے وہ اپنا ایک اَور خلیفہ چھوڑنا چاہتا ہے۔ خود کونسی کمی کی ہے جو اولاد کی خواہش کرتا ہے۔ پس جب تک اولاد کی خواہش محض اس غرض کے لئے نہ ہو کہ وہ دیندار اور متقی ہو اور خدا تعالیٰ کی فرمانبردار ہو کر اُس کے دین کی خادم بنے بالکل فضول بلکہ ایک قسم کی معصیت اور گناہ ہے اور باقیاتِ صالحات کی بجائے اس کا نام باقیاتِ سیئات رکھنا جائز ہو گا۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ مَیں صالح اور خدا ترس اور خادمِ دین اولاد کی خواہش کرتا ہوں تو اس کا یہ کہنا بھی نِرا ایک دعوٰی ہی دعوٰی ہو گا جب تک کہ خود وہ اپنی حالت میں ایک اصلاح نہ کرے۔ اگر خود فسق و فجور کی زندگی بسر کرتا ہے اور مُنہ سے کہتا ہے کہ مَیں صالح اور متقی اولاد کی خواہش کرتا ہوں تو وہ اپنے اس دعوٰی میں کذّاب ہے۔ صالح اور متقی اولاد کی خواہش سے پہلے ضروری ہے کہ وہ خود اپنی اصلاح کرے اور

اپنی زندگی کو متقیانہ زندگی بنادے تب اس کی ایسی خواہش ایک نتیجہ خیز خواہش ہوگی اور ایسی اولاد حقیقت میں اِس قابل ہوگی کہ اس کو باقیات صالحات کا مصداق کہیں لیکن اگر یہ خواہش صرف اِس لئے ہو کہ ہمارا نام باقی رہے اور وہ ہمارے املاک و اسباب کی وارث ہو یا وہ بڑا نامور اور مشہور آدمی ہو اس قسم کی خواہش میرے نزدیک شرک ہے۔

یاد رکھو کسی نیکی کو بھی اِس لئے نہیں کرنا چاہیئے کہ اس نیکی کے کرنے پر ثواب یا اجر ملے گا کیونکہ اگر محض اِس خیال سے نیکی کی جاوے تو وہ ابتغاء لمرضات اللہ نہیں ہوسکتی بلکہ اس ثواب کی خاطر ہوگی اور اس سے اندیشہ ہوسکتا ہے کہ کسی وقت وہ اسے چھوڑ بیٹھے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ہر روز ہم سے ملنے کو آوے اور ہم اس کو ایک روپیہ دے دیا کریں تو وہ بجائے خود یہی سمجھے گا کہ میرا جانا صرف روپے کے لئے ہے جس دِن سے روپیہ نہ ملے اسی دِن سے آنا چھوڑ دے گا۔ غرض یہ ایک قسم کا باریک شرک ہے اس سے بچنا چاہیئے۔ نیکی کو محض اِس لئے کرنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ خوش ہو اور اس کی رضا حاصل ہو اور اس کے حکم کی تعمیل ہو۔ قطع نظر اس کے کہ اس پر ثواب ہو یا نہ ہو۔ ایمان تب ہی کامل ہوتا ہے جبکہ یہ وسوسہ اور وہم درمیان سے اُٹھ جاوے اگرچہ یہ سچ ہے کہ خدا تعالیٰ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ مگر نیکی کرنے والے کو اجر مدِ نظر نہیں رکھنا چاہیئے۔ دیکھو اگر کوئی مہمان یہاں محض اِس لئے آتا ہے کہ وہاں آرام ملے گا۔ ٹھنڈے شربت ملیں گے یا تکلف کے کھانے ملیں گے تو وہ گویا ان اشیاء کے لئے آتا ہے حالانکہ خود میزبان کا فرض ہوتا ہے کہ وہ حتی المقدور اُن کی مہمان نوازی میں کوئی کمی نہ کرے اور اس کو آرام پہنچاوے اور وہ پہنچاتا ہے لیکن مہمان کا خود ایسا خیال کرنا اس کے لئے نقصان کا موجب ہے۔

تو غرض مطلب یہ ہے کہ اولاد کی خواہش صرف نیکی کے اصول پر ہونی چاہیئے۔ اِس لحاظ سے اور خیال سے نہ ہو کہ وہ ایک گناہ کا خلیفہ باقی رہے۔ خدا تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ مجھے کبھی اولاد کی خواہش نہیں ہوئی تھی حالانکہ خدا تعالیٰ نے پندرہ یا سولہ برس کی عمر کے درمیان ہی اولاد دے دی تھی۔ یہ سلطان احمد اور فضل احمد اسی عمر میں پیدا ہوگئے تھے اور نہ کبھی مجھے یہ خواہش ہوئی کہ وہ بڑے بڑے دُنیا دار بنیں اور اعلیٰ عہدوں پر پہنچ کر مامور ہوں۔ غرض جو اولاد معصیت اور فسق کی زندگی بسر کرنے والی ہو اس کی نسبت تو سعدیؒ کا یہ فتویٰ ہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ

پیش از پدر مُردہ بہ ناخلف

پھر ایک اَور بات ہے کہ اولاد کی خواہش تو لوگ بڑی کرتے ہیں اور اولاد ہوتی بھی ہے مگر یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ وہ اولاد کی تربیت اور ان کو عمدہ اور نیک چلن بنانے اور خدا تعالیٰ کے فرماں بردار بنانے کی سعی

اور فکر کریں۔ نہ کبھی اُن کے لئے دُعا کرتے ہیں اور نہ مراتب تربیت کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔

میری اپنی تو یہ حالت ہے کہ میری کوئی نماز ایسی نہیں ہے جس میں مَیں اپنے دوستوں اور اولاد اور بیوی کے لئے دعا نہیں کرتا۔ بہت سے والدین ایسے ہیں جو اپنی اولاد کو بُری عادتیں سکھا دیتے ہیں۔ ابتداء میں جب وہ بدی کرنا سیکھنے لگتے ہیں تو ان کو تنبیہہ نہیں کرتے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دن بدن دلیر اور بے باک ہوتے جاتے ہیں.....

لوگ اولاد کی خواہش تو کرتے ہیں مگر نہ اِس لئے کہ وہ خادمِ دین ہو بلکہ اِس لئے کہ دنیا میں اُن کا کوئی وارث ہو اور جب اولاد ہوتی ہے تو اس کی تربیت کا فکر نہیں کیا جاتا۔ نہ اس کے عقائد کی اصلاح کی جاتی ہے اور نہ اخلاقی حالت کو درست کیا جاتا ہے۔ یہ یاد رکھو کہ اس کا ایمان درست نہیں ہو سکتا جو اقرب تعلقات کو نہیں سمجھتا جب وہ اس سے قاصر ہے تو اَور نیکیوں کی امید اس سے کیا ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد کی خواہش کو اِس طرح پر قرآن میں بیان فرمایا ہے رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا یعنی خدا تعالیٰ ہم کو ہماری بیویوں اور بچوں سے آنکھ کی ٹھنڈک عطا فرماوے اور یہ تب ہی میسّر آسکتی ہے کہ وہ فسق و فجور کی زندگی بسر نہ کرتے ہوں بلکہ عباد الرحمٰن کی زندگی بسر کرنے والے ہوں اور خدا کو ہر شئے پر مقدم کرنے والے ہوں اور آگے کھول کر کہہ دیا وَ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا اولاد اگر نیک اور متقی ہو تو یہ اُن کا امام ہی ہو گا۔ اس سے گویا متقی ہونے کی بھی دعا ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۵ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۱، ۱۲)

مَیں دیکھتا ہوں کہ لوگ جو کچھ کرتے ہیں وہ محض دُنیا کے لئے کرتے ہیں۔ محبتِ دُنیا ان سے کراتی ہے خدا کے واسطے نہیں کرتے۔ اگر اولاد کی خواہش کرے تو اِس نیت سے کرے وَ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا پر نظر کر کے کرے کہ کوئی ایسا بچہ پیدا ہو جائے جو اعلاءِ کلمۂ اسلام کا ذریعہ ہو جب ایسی پاک خواہش ہو تو اللہ تعالےٰ قادر ہے کہ زکریا کی طرح اولاد دے دے مگر مَیں دیکھتا ہوں کہ لوگوں کی نظر اس سے آگے نہیں جاتی کہ ہمارا باغ ہے یا اَور مِلک ہے وہ اس کا وارث ہو اور کوئی شریک اس کو نہ لے جائے مگر وہ اِتنا نہیں سوچتے کہ کم بخت جب تُو مر گیا تو تیرے لئے دوست دشمن اپنے بیگانے سب برابر ہیں۔ مَیں نے بہت سے لوگ ایسے دیکھے اور کہتے سُنے ہیں کہ دعا کرو کہ اولاد ہو جائے جو اس جائداد کی وارث ہو۔ ایسا نہ ہو کہ مرنے کے بعد کوئی شریک لے جاوے۔ اولاد ہو جائے خواہ وہ بدمعاش ہی ہو۔ یہ معرفت اسلام کی رہ گئی ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۹)

ان (اولاد) کی پرورش محض رحم کے لحاظ سے کرے نہ کہ جانشین بنانے کے واسطے بلکہ وَ اجْعَلْنَا

لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا کا لحاظ ہو کہ یہ اولاد دین کی خادم ہو لیکن کتنے ہیں جو اولاد کے واسطے یہ دعا کرتے ہیں کہ اولاد دین کی پہلوان ہو۔ بہت ہی تھوڑے ہوں گے جو ایسا کرتے ہوں۔ اکثر تو ایسے ہیں کہ وہ بالکل بے خبر ہیں کہ وہ کیوں اولاد کے لئے یہ کوششیں کرتے ہیں اور اکثر ہیں جو محض جانشین بنانے کے واسطے اور کوئی غرض ہوتی ہی نہیں صرف یہ خواہش ہوتی ہے کہ کوئی شریک یا غیران کی جائیداد کا مالک نہ بن جاوے۔ مگر یاد رکھو کہ اِس طرح پر دین بالکل برباد ہو جاتا ہے۔ غرض اولاد کے واسطے صرف یہ خواہش ہو کہ وہ دین کی خادم ہو۔ (الحکم جلد ۸ ۔ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۙ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝

باوا صاحب کا ایک شعر یہ ہے

اوچو تھان سوہاونا اوپر محل مرار ✦ سچ کرنی دے پائیے در گھر محل پیار

یعنی وہ بہشت اُونچا مکان ہے اس میں عمارتیں خوبصورت ہیں اور راست بازی سے وہ مکان ملتا ہے اور پیار اس محل کا دروازہ ہے جس سے لوگ گھر کے اندر داخل ہوتے ہیں اور یہ شعر اس آیت سے اقتباس کیا گیا ہے جو قرآن شریف میں ہے۔

اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ ..... حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا

یعنی جو لوگ راست باز ہیں اور خدا سے ڈرتے ہیں انہیں بہشت کے بالاخانوں میں جگہ دی جائے گی جو نہایت خوبصورت مکان اور آرام کی جگہ ہے۔ دیکھو اِس جگہ صریح باوا صاحب نے اِس آیت کا ترجمہ کر دیا ہے۔ کیا اب بھی کچھ شک باقی ہے کہ باوا صاحب قرآن شریف کے ہی تابعدار تھے۔ اِس قسم کا بیان بہشت کے بارہ میں وید میں کہاں ہے بلکہ انجیل میں بھی نہیں تبھی تو بعض نابینا عیسائی اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن میں جسمانی بہشت کا ذکر ہے مگر نہیں جانتے کہ قرآن بار بار کہتا ہے کہ جسم اور رُوح جو دونوں خدا تعالیٰ کی راہ میں دُنیا میں کام کرتے رہے ان دونوں کو جزا ملے گی۔ یہی تو پورا بدلہ ہے کہ رُوح کو رُوح کی خواہش کے مطابق اور جسم کو جسم کی خواہش کے مطابق بدلہ ملے لیکن دنیوی کدورتوں اور کثافتوں سے وہ جگہ بالکل پاک ہو گی اور لوگ اپنی پاکیزگی میں فرشتوں کے مشابہ ہوں گے اور باینہمہ جسم اور رُوح دونوں کے لحاظ سے لذت اور سروریں ہوں گے اور رُوح کی چمک جسم پر پڑے گی اور جسم کی لذت میں رُوح شریک ہو گا اور یہ بات دُنیا میں حاصل نہیں ہوتی بلکہ

دُنیا میں جسمانی لذت رُوحانی لذت سے روکتی ہے اور رُوحانی لذت جسمانی لذت سے مانع آتی ہے مگر بہشت میں ایسا نہیں ہوگا بلکہ اس روز دونوں لذتوں کا ایک دوسری پر عکس پڑے گا اور اس حالت کا نام سعادتِ عظمیٰ ہے۔ غرض باوا صاحب نے یہ نکتۂ معرفت قرآن شریف سے لیا ہے کیونکہ دوسری تمام قومیں اس سے غافل ہیں اور اُن کے عقیدے اس کے برخلاف ہیں۔ (ست بچن طبع اوّل صفحہ ۸۴)

قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا۝

کافروں کو کہہ کہ اگر تم خدا کی بندگی نہ کرو تو وہ تمہاری پرواہ کیا رکھتا ہے۔ سو تم نے بجائے طاعت اور بندگی کے جھٹلانا اختیار کیا سو عنقریب اس کی سزا تم پر وارد ہونے والی ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۴۸ حاشیہ)

چونکہ خدا کے قانون میں یہی انتظام مقرر ہے کہ رحمتِ خاصہ انہیں کے شامل حال ہوتی ہے کہ جو رحمت کے طریق کو یعنی دُعا اور توحید کو اختیار کرتے ہیں، اس باعث سے جو لوگ اِس طریق کو چھوڑ دیتے ہیں وہ طرح طرح کی آفات میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اِسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ..... یعنی ان کو کہہ دے کہ میرا خدا تمہاری پرواہ کیا رکھتا ہے اگر تم دعا نہ کرو اور اس کے فیضان کے خواہاں نہ ہو۔ خدا کو تو کسی کی زندگی اور وجود کی حاجت نہیں۔ وہ تو بے نیاز مطلق ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۴۷۳ حاشیہ)

ان کو کہہ دے کہ میرا خدا تمہاری پروا کیا رکھتا ہے۔ اگر تم اس کی پرستش نہ کرو اور اُس کے حکموں کو نہ سُنو۔ (تریاق القلوب صفحہ ۶)

ان کو کہہ دے کہ میرا خدا تمہاری پرواہ کیا رکھتا ہے اگر تم بندگی نہ کرو اور دعاؤں میں مشغول نہ رہو۔ (ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ ع ۳ صفحہ ۱۲۶ و تبلیغ رسالت جلد دہم صفحہ ۴۲)

ان کو کہہ دے کہ اگر تم نیک چلن انسان نہ بن جاؤ اور اس کی یاد میں مشغول نہ رہو تو میرا خدا تمہاری زندگی کی پرواہ کیا رکھتا ہے اور سچ ہے کہ جب انسان غافلانہ زندگی بسر کرے اور اُس کے دل پر خدا کی عظمت کا کوئی رعب نہ ہو اور بے قیدی اور دلیری کے ساتھ اس کے تمام اعمال ہوں تو ایسے انسان سے ایک بکری بہتر ہے جس کا دُودھ پیا جاتا ہے اور گوشت کھایا جاتا ہے اور کھال بھی بہت سے کاموں میں آجاتی ہے۔ (تبلیغ رسالت

(مجموعہ اشتہارات) جلد دہم ص۱۰۱)

اُن لوگوں کی نسبت (جو خدا تعالیٰ کے احکام کی پیروی یا پرواہ نہیں کرتے اور اپنی زندگی فسق و فجور میں گزارتے ہیں) فرماتا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ یعنی میرا رب تمہاری کیا پرواہ کرتا ہے اگر تم اس کی عبادت نہ کرو۔ (الحکم جلد ۵ ع۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۱ء ص۱)

اِنسان کی پیدائش کی اصل غرض تو عبادتِ الٰہی ہے لیکن اگر وہ اپنی فطرت کو خارجی اسباب اور بیرونی تعلقات سے تبدیل کر کے بیکار کر لیتا ہے تو خدا تعالیٰ اُس کی پرواہ نہیں کرتا۔ اسی کی طرف یہ آیت اشارہ کرتی ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ۔ مَیں نے ایک بار پہلے بھی بیان کیا تھا کہ مَیں نے ایک رؤیا میں دیکھا کہ مَیں ایک جنگل میں کھڑا ہوں۔ شرقاً غرباً اس میں ایک بڑی نالی چلی گئی ہے اس نالی پر بھیڑیں لٹائی ہوئی ہیں اور ہر ایک قصاب کے جو ہر ایک بھیڑ پر مسلط ہے ہاتھ میں چھری ہے جو انہوں نے اُن کی گردن پر رکھی ہوئی ہے اور آسمان کی طرف مُنہ کیا ہوا ہے۔ مَیں ان کے پاس ٹہل رہا ہوں۔ مَیں نے یہ نظارہ دیکھ کر سمجھا کہ یہ آسمانی حکم کے منتظر ہیں تو مَیں نے یہی آیت پڑھی قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ یہ سُنتے ہی ان قصابوں نے فی الفور چھریاں چلادیں اور یہ کہا کہ تم ہو کیا؟ آخر گوہ کھانے والی بھیڑیں ہی ہو۔

غرض خدا تعالیٰ متقی کی زندگی کی پرواہ کرتا ہے اور اس کی بقاء کو عزیز رکھتا ہے اور جو اُس کی مرضی کے برخلاف چلے وہ اس کی پرواہ نہیں کرتا اور اس کو جہنم میں ڈالتا ہے اِس لئے ہر ایک کو لازم ہے کہ اپنے نفس کو شیطان کی غلامی سے باہر کرے جیسے کلورافارم نیند لاتا ہے اسی طرح پر شیطان انسان کو تباہ کرتا ہے اور اسے غفلت کی نیند سُلاتا ہے اور اسی میں اس کو ہلاک کر دیتا ہے۔

(الحکم جلد ۵ ع۳۰ مورخہ ۱۷ اگست ۱۹۰۱ء ص۱)

ان لوگوں کو کہہ دے کہ اگر تم میری بندگی نہ کرو تو پرواہ کیا ہے۔ (رسالہ الانذار ص۶۳)

جانوروں کی زندگی دیکھو کہ کتنی ان سے لی جاتی ہیں اور ان کو ذبح کیا جاتا ہے پس جو انسان خدا تعالیٰ سے قطع تعلق کرتا ہے اس کی زندگی کی ضمانت نہیں رہتی چنانچہ فرمایا قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ یعنی اگر تم اللہ کو نہ پکارو تو میرا رب تمہاری پرواہ ہی کیا رکھتا ہے۔

یاد رکھو جو دُنیا کے لئے خدا کی عبادت کرتے ہیں یا اس سے تعلق نہیں رکھتے اللہ تعالیٰ اُن کی کچھ پرواہ نہیں رکھتا۔ (الحکم جلد ۴ ع۳۶ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۰ء ص۳)

کامل عابد وہی ہو سکتا ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچائے لیکن اس آیت میں اور بھی صراحت ہے اور وہ آیت یہ ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّي لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ یعنی ان لوگوں کو کہہ دو کہ اگر تم لوگ رب

کو نہ پکارو تو میرا رب تمہاری پرواہ ہی کیا کرتا ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ عابد کی پرواہ کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

انسانوں میں سے بھی جو سب سے زیادہ قابلِ قدر ہے اسے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھتا ہے اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا سچا تعلق رکھتے اور اپنے اندرونہ کو صاف رکھتے ہیں اور نوع انسان کے ساتھ خیر اور ہمدردی سے پیش آتے ہیں اور خدا کے سچے فرماں بردار ہیں۔ چنانچہ قرآن شریف سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ اس کے مفہوم مخالف سے صاف پتہ لگتا ہے کہ وہ دوسروں کی پرواہ کرتا ہے اور وہ وہی لوگ ہوتے ہیں جو سعادت مند ہوتے ہیں۔ وہ تمام کسریں اُن کے اندر سے نکل جاتی ہیں جو خدا سے دُور ڈال دیتی ہیں اور جب انسان اپنی اصلاح کر لیتا ہے اور خدا سے صلح کر لیتا ہے تو خدا اس کے عذاب کو بھی ٹلا دیتا ہے۔ خدا کو کوئی ضد تو نہیں چنانچہ اس کے متعلق بھی صاف طور پر فرمایا ہے مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ یعنی خدا نے تم کو عذاب دے کر کیا کرنا ہے اگر تم دیندار ہو جاؤ۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۶)

مومن شخص کا کام ہے کہ پہلے اپنی زندگی کا مقصدِ اصلی معلوم کرے اور پھر اس کے مطابق کام کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ۔ خدا کو تمہاری پرواہ ہی کیا ہے اگر تم اس کی عبادت نہ کرو اور اس سے دعائیں نہ مانگو۔ یہ آیت بھی..... آیت مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ ہی کی شرح ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

جب انسان کا ایک اصول ہو جاوے کہ زیستن از بہرِ خوردن است اسی وقت اس کی نظر (ذکر) پر نہیں رہتی بلکہ وہ دُنیا کے کاروبار اور تجارت ہی میں منہمک ہو جاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی طرف توجہ اور رجوع کا خیال بھی نہیں رہتا اس وقت اس کی زندگی قابلِ قدر وجود نہیں ہوتی ایسے لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ یعنی میرا رب تمہاری پرواہ کیا رکھتا ہے اگر تم اس کی بندگی نہ کرو۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

خدا تعالیٰ کو تو اِس بات کی مطلق پرواہ نہیں ہے کہ تم اس کی طرف میلان رکھو یا نہ۔ وہ فرماتا ہے قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ کہ اگر اس کی طرف رجوع رکھو گے تو تمہارا ہی اس میں فائدہ ہوگا۔

(البدر جلد ۴ نمبر ۳ مورخہ ۲۰ جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

خدا دین سے غافلوں کو ہلاکت میں ڈالنے سے پرواہ نہیں کرتا۔ پس ثابت ہوا کہ جو دین سے غافل نہ ہوں ان کی ہلاکت اور موت میں خدا تعالیٰ جلدی نہیں کرتا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۵ مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

بڑے بڑے صریح ظلم مظلوموں پر ڈھائے جاتے ہیں اور ہمارے سامنے ظالموں سے کوئی چنداں باز پرس نہیں ہوتی۔ اس کا باعث بھی خدا تعالیٰ نے اِسی آیت میں فرمایا ہے مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ یعنی خدا تعالیٰ کو تمہاری پرواہ کیا ہے اگر تم دعاؤں اور عبادتِ الٰہی میں تغافل اختیار کرو۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۵ مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

اگر خدا تعالیٰ کی طرف انسان جھکے تو وہ رحم کرتا ہے لیکن جب انسان لاپرواہی کرے تو وہ غنی بے نیاز ہے اس کو کسی کی کیا پرواہ ہے خدا تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ لوگوں کو کہہ دے اگر تم دعا نہ کرو تو میرے ربّ کو تمہاری کیا پرواہ ہے۔ بے شک وہ کریم، رحیم اور حلیم ہے مگر ساتھ ہی وہ غنی بے نیاز بھی ہے۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۱۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱۳)

مُورکھ ہے وہ انسان جو اس ضروری سفر کا کچھ بھی فکر نہیں رکھتا۔ خدا تعالیٰ اس شخص کی عمر کو بڑھا دیتا ہے جو سچ مچ اپنی زندگی کا طریق بدل کر خدا تعالیٰ کا ہی ہو جاتا ہے ورنہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ یعنی ان کو کہہ دو کہ خدا تعالیٰ تمہاری پرواہ کیا رکھتا ہے اگر تم اس کی بندگی اور عبادت نہ کرو سو جاگنا چاہیئے اور ہوشیار ہونا چاہیئے اور غلطی نہیں کھانا چاہیئے کہ یہ گھر سخت بے بنیاد ہے۔ (مکتوب بنام حضرت نواب محمد علی خاں صاحب مندرجہ الحکم جلد ۷ نمبر ۳۲ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۳)

یہ امر بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہ ہو اور رجوع نہ کرو تو اس سے اس کی ذات میں کوئی نقص پیدا نہیں ہو سکتا اور وہ تمہاری کچھ بھی پرواہ نہیں رکھتا جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے

قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ

یعنی ان کو کہہ دو کہ میرا ربّ تمہاری کیا پرواہ رکھتا ہے اگر تم سچے دل سے اس کی عبادت نہ کرو۔ جیسا کہ وہ رحیم و کریم ہے ویسا ہی وہ غنی بے نیاز بھی ہے۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

دعا میں لگے رہو کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَا دُعَآؤُکُمْ ایک انسان جو دُعا نہیں کرتا اس میں اور چارپائے میں کچھ فرق نہیں۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۲ مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

سُورۃ الشّعراء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ اَلَّا یَکُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ۝

کیا تُو اسی غم میں اپنے تئیں ہلاک کر دے گا کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۱۰ حاشیہ)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دِل میں نہایت درجہ کا یہ جوش تھا کہ مَیں اپنی زندگی میں اسلام کا زمین پر پھیلنا دیکھ لوں اور یہ بات بہت ہی ناگوار تھی کہ حق کو زمین پر قائم کرنے سے پہلے سفرِ آخرت پیش آوے۔ خدا تعالیٰ اِس آیت میں (اذا جاء نصر اللّٰہ ..... الآخر) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشخبری دیتا ہے کہ دیکھ مَیں نے تیری مراد پوری کر دی اور کم و بیش اس مراد کا ہر یک نبی کو خیال تھا مگر چونکہ اس درجہ کا جوش نہیں تھا اس لئے نہ مسیح کو اور نہ موسیٰ کو یہ خوشخبری ملی بلکہ اسی کو ملی جس کے حق میں قرآن نے فرمایا لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ اَلَّا یَکُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ یعنی کیا تُو اس غم سے ہلاک ہو جائے گا کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے۔ (نور القرآن حصہ اوّل صفحہ ۹ حاشیہ)

کیا تُو اس غم سے ہلاک ہو جائے گا کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے مطلب یہ ہے کہ تیری شفقت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ تُو ان کے غم میں ہلاک ہونے کے قریب ہے۔ (نور القرآن نمبر ۲ صفحہ ۳۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعی ہمدردی اور محنت اُٹھانے سے بنی نوع کی رہائی کے لئے جان کو وقف کر دیا تھا اور دُعا کے ساتھ اور تبلیغ کے ساتھ اور اُن کے جور و جفا اُٹھانے کے ساتھ اور ہر ایک مناسب اور حکیمانہ طریق کے ساتھ اپنی جان اور اپنے آرام کو اس راہ میں فدا کر دیا تھا جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفۡسَکَ اَلَّا یَکُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ ..... کیا تُو اس غم اور اس سخت محنت میں جو لوگوں کے لئے اُٹھا رہا ہے اپنے تئیں ہلاک کر دے گا ..... سو قوم کی راہ میں جان دینے کا حکیمانہ طریق یہی ہے

کہ قوم کی بھلائی کے لئے قانونِ قدرت کی مفید راہوں کے موافق اپنی جان پر سختی اُٹھاویں اور مناسب تدبیروں کے بجالانے سے اپنی جان ان پر فدا کر دیں نہ یہ کہ قوم کو سخت بلا یا گمراہی میں دیکھ کر اور خطرناک حالت میں پا کر اپنے سر پر پتھر مار لیں یا دو تین رتی اسٹرکنیا کھا کر اس جہان سے رخصت ہو جائیں اور پھر گمان کریں کہ ہم نے اپنی اس حرکتِ بیجا سے قوم کو نجات دے دی ہے۔ یہ مردوں کا کام نہیں ہے زنانہ خصلتیں ہیں اور بے حوصلہ لوگوں کا ہمیشہ سے یہی طریق ہے کہ مصیبت کو قابلِ برداشت نہ پا کر جھٹ پٹ خودکشی کی طرف دوڑتے ہیں۔

(تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۱۳۷، ۱۳۸)

... ہر ایک نبی کی یہ مراد تھی کہ تمام کفار اُن کے زمانہ کے جو اُن کی مخالفت پر کھڑے تھے مسلمان ہو جائیں مگر یہ مراد اُن کی پوری نہ ہوئی یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ یعنی کیا تو اس غم سے اپنے تئیں ہلاک کر دے گا کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے۔

اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کفار سے ایمان لانے کے لئے اِس قدر جانکاہی اور سوز و گداز سے دعا کرتے تھے کہ اندیشہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اِس غم سے خود ہلاک نہ ہو جاویں اِس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان لوگوں کے لئے اس قدر غم نہ کر اور اس قدر اپنے دِل کو درد وں کا نشانہ مت بنا کیونکہ یہ لوگ ایمان لانے سے لاپرواہ ہیں اور ان کے اغراض اور مقاصد اور ہیں۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ اشارہ فرمایا ہے کہ اے نبی (علیہ السلام) جس قدر تو عقدِ ہمت اور کامل توجہ اور سوز و گداز اور اپنی رُوح کو مشقت میں ڈالنے سے ان لوگوں کی ہدایت کے لئے دعا کرتا ہے۔ تیری دعاؤں کے پُرتاثیر ہونے میں کچھ کمی نہیں ہے لیکن شرط قبولیتِ دعا یہ ہے کہ جس کے حق میں دعا کی جاتی ہے سخت متعصب اور لاپرواہ اور گندی فطرت کا انسان نہ ہو ورنہ دعا قبول نہیں ہوگی۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۶۶)

... یہ نورِ ہدایت جو خارق عادت طور پر عرب کے جزیرہ میں ظہور میں آیا اور پھر دُنیا میں پھیل گیا یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم کی دِلی سوزش کی تاثیر تھی۔ ہر ایک قوم توحید سے دُور اور مہجور ہوگئی مگر اسلام میں چشمۂ توحید جاری رہا۔ یہ تمام برکتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا نتیجہ تھیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ یعنی کیا تو اس غم میں اپنے تئیں ہلاک کر دے گا جو یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ پس پہلے نبیوں کی اُمت میں جو اس درجہ کی صلاح و تقوٰی پیدا نہ ہوئی اس کی یہی وجہ تھی کہ اس درجہ کی توجہ اور دِل سوزی اُمت کے لئے اُن نبیوں میں نہیں تھی۔ (حقیقۃ الوحی

صـ۱۱۱ حاشیہ)

نبی بوجہ اس کے کہ ہمدردی بنی نوع کا اس کے دِل میں کمال درجہ پرجوشش ہوتا ہے اپنی رُوحانی توجہات اور تفرّع اور انکسار سے یہ چاہتا ہے کہ وہ خدا جو اس پر ظاہر ہوا ہے دوسرے لوگ بھی اس کو شناخت کریں اور نجات پاویں اور وہ دِلی خواہش سے اپنے وجود کی قربانی خدا تعالیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس تمنّا سے کہ لوگ زندہ ہوجائیں کئی موتیں اپنے لئے قبول کرلیتا ہے اور بڑے مجاہدات میں اپنے تئیں ڈالتا ہے جیسا کہ اِس آیت میں اشارہ ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ یعنی کیا تُو اِس غم میں اپنے تئیں ہلاک کردے گا کہ یہ کافر لوگ کیوں ایمان نہیں لاتے تب اگرچہ خدا مخلوق سے بے نیاز اور مستغنی ہے مگر اس کے دائمی غم اور حُزن اور کرب و قلق اور تذلّل اور نیستی اور نہایت درجہ کے صدق اور صفا پر نظر کرکے مخلوق کے مستعد دِلوں پر اپنے نشانوں کے ساتھ اپنا چہرہ ظاہر کردیتا ہے اور اُس کی پُرجوش دعاؤں کی تحریک سے جو آسمان پر ایک صعبناک شور ڈالتی ہیں خدا تعالیٰ کے نشان زمین پر بارش کی طرح برستے ہیں اور عظیم الشان خوارق دُنیا کے لوگوں کو دکھلائے جاتے ہیں جن سے دُنیا دیکھ لیتی ہے کہ خدا ہے اور خدا کا چہرہ نظر آجاتا ہے لیکن اگر وہ پاک نبی اس قدر دعا اور تفرّع اور ابتہال سے خدا تعالےٰ کی طرف توجہ نہ کرتا اور خدا کے چہرہ کی چمک دُنیا پر ظاہر کرنے کے لئے اپنی قربانی نہ دیتا اور ہر ایک قدم میں صدہا موتیں قبول نہ کرتا تو خدا کا چہرہ دُنیا پر ہرگز ظاہر نہ ہوتا کیونکہ خدا تعالیٰ بوجہ استغناء ذاتی کے بے نیاز ہے۔

(حقیقۃ الوحی صـ۱۱۴)

چونکہ (حقانی ریفارمر) بنی نوع کی ہمدردی میں محو ہوتے ہیں اِس لئے رات دن سوچتے رہتے ہیں۔ اور اِس فکر میں گُھٹتے رہتے ہیں کہ یہ لوگ کسی نہ کسی طرح اس راہ پر آجائیں اور ایک بار اس چشمہ سے ایک گھونٹ پی لیں۔ یہ ہمدردی یہ جوش ہمارے سیّد و مولیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں غایت درجہ کا تھا اس سے بڑھ کر کسی دوسرے میں ہو سکتا ہی نہیں۔ چنانچہ آپ کی ہمدردی اور غمگساری کا یہ عالم تھا کہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کا نقشہ کھینچ کر دکھایا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ یعنی کیا تُو اپنی جان کو ہلاک کردے گا اِس غم میں کہ یہ کیوں مومن نہیں ہوتے۔ اِس آیت کی حقیقت آپ پورے طور پر نہ سمجھ سکیں تو جُدا امر ہے مگر میرے دِل میں اس کی حقیقت یوں پھرتی ہے جیسے بدن میں خون ؎

بدل دردیکہ دارم از برائے طالبانِ حق ٭ نمے گردد بیاں آں درد از تقریر کوتاہم

مَیں خوب سمجھتا ہوں کہ اِن حقانی واعظوں کو کس قسم کا جانگداز درد اصلاحِ خلق کا لگا ہوا ہوتا ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۱ء صـ۳)

نبی کا آنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ قوتِ قدسی ہوتی ہے اور اس کے دِل میں لوگوں کی ہمدردی، نفع رسانی اور عام خیر خواہی کا بیتاب کر دینے والا جوش ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ یعنی کیا تُو اپنی جان کو ہلاک کر دے گا اِس خیال سے کہ وہ مومن نہیں ہوتے۔ اس کے دو پہلو ہیں ایک کافروں کی نسبت کہ وہ مسلمان کیوں نہیں ہوتے دوسرا مسلمانوں کی نسبت کہ اُن میں وہ اعلیٰ درجہ کی روحانی قوت کیوں نہیں پیدا ہوتی جو آپ چاہتے ہیں۔ چونکہ ترقی تدریجاً ہوتی ہے اِس لئے صحابہؓ کی ترقیاں بھی تدریجی طور پر ہوئی تھیں مگر انبیاء کے دِل کی بناوٹ بالکل ہمدردی ہی ہوتی ہے اور پھر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو جامع جمیع کمالاتِ نبوت تھے آپؐ میں یہ ہمدردی کمال درجہ پر تھی آپؐ صحابہؓ کو دیکھ کر چاہتے تھے کہ پوری ترقیات پر پہنچیں لیکن یہ عروج ایک وقت پر مقدر تھا آخر صحابہؓ نے وہ پایا جو دُنیا نے کبھی نہ پایا اور وہ دیکھا جو کسی نے نہ دیکھا۔

(الحکم جلد ۴ نمبر ۱۶ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۰ء صفحہ ۶)

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ رسالت میں ایک امر ظاہر ہوتا ہے اور ایک مخفی ہوتا ہے۔ مثلاً لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ایک کلمہ ہے جسے رسالت مآب نے بایں الفاظ لوگوں کو پہنچا دیا ہے لوگ مانیں یا نہ مانیں یعنی رسالت کا کام صرف پہنچا دینا تھا مگر رسالت کے یہ ظاہری معنی ہیں۔ ہم جب اور زیادہ غور کر کے بطون کی طرف جاتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت جو لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کے ساتھ بطور ایک جزوِ غیر منفک کے شامل ہوئی ہے۔ یہ صورت اِبلاغ تک ہی محدود نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوتِ قدسیہ کے زور سے اس تبلیغ کو باثر بنانے میں لانظیر نمونہ دکھلایا ہے اور قرآن کریم سے یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ آپؐ کو کس قدر سوزش اور گدازش لگی ہوئی تھی چنانچہ فرمایا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ یعنی کیا تُو اپنی جان کو ہلاک کر دے گا اِس فکر میں کہ یہ مومن کیوں نہیں بنتے۔ یہ پکی بات ہے کہ ہر نبی صرف لفظ لے کر نہیں آتا بلکہ اپنے اندر وہ ایک درد اور سوز و گداز بھی رکھتا ہے جو اپنی قوم کی اِصلاح کے لئے ہوتا ہے اور یہ درد اور اضطراب کسی بناوٹ سے نہیں ہوتا بلکہ فطرتاً اضطراری طور پر اُس سے صادر ہوتا ہے جیسے ایک ماں اپنے بچے کی پرورش میں مصروف ہوتی ہے۔ اگر بادشاہ کی طرف سے اُس کو حکم بھی دیا جاوے کہ اگر وہ اپنے بچے کو دودھ نہ بھی دے اور اس طرح پر اُس کے ایک دو بچے مر بھی جاویں تو اس کو معاف ہیں اور اس سے کوئی باز پُرس نہ ہوگی تو کیا بادشاہ کے ایسے حکم پر کوئی ماں خوش ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ بادشاہ کو گالیاں دے گی۔ وہ دُودھ دینے سے رُک سکتی ہی نہیں، یہ بات اس کی طبیعت میں طبعاً موجود ہے اور دُودھ دینے میں اُس کو کبھی بھی بہشت میں جانا

یا اس کا معاوضہ یا نام مرکوز اور ملحوظ نہیں ہوتا اور یہ جوش طبعی ہے جو اس کو فطرت نے دیا ہے ورنہ اگر یہ بات نہ ہوتی تو چاہیئے تھا کہ جانوروں کی مائیں بکری بھینس یا گائے یا پرندوں کی مائیں اپنے بچوں کی پرورش سے علیحدہ ہو جاتیں۔ ایک فطرت ہوتی ہے ایک عقل ہوتی ہے اور ایک جوش ہوتا ہے۔ ماؤں کا اپنے بچوں کی پرورش میں مصروف ہونا یہ فطرت ہے۔ اسی طرح پر مامورین جو آتے ہیں اُن کی فطرت میں بھی ایک بات ہوتی ہے۔ وہ کیا؟ مخلوق کے لئے دلسوزی اور بنی نوع انسان کی خیر خواہی کے لئے ایک گدازش۔ وہ طبعی طور پر چاہتے ہیں کہ لوگ ہدایت پا جاویں اور خدا تعالیٰ میں زندگی حاصل کریں۔

پس یہ وہ سِر ہے جو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے دوسرے حصّہ میں یعنی اظہارِ رسالت میں رکھا ہوا ہے جیسے پیغام پہنچانے والے عام طور پر پیغام پہنچا دیتے ہیں اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ اس پر عمل ہو یا نہ ہو۔ گویا وہ تبلیغ صرف کان ہی تک محدود ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے مامورینِ الٰہی کان تک بھی پہنچاتے ہیں اور اپنی قوتِ قدسی کے زور اور ذریعہ سے دِل تک بھی پہنچاتے ہیں اور یہ بات کہ جذب اور عقدِ ہمّت ایک انسان کو اس وقت دیا جاتا ہے جبکہ وہ خدا تعالیٰ کی چادر کے نیچے آجاتا ہے اور ظلّ اللہ بنتا ہے پھر وہ مخلوق کی ہمدردی اور بہتری کے لئے اپنے اندر ایک اِضطراب پاتا ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس مرتبہ میں کُل انبیاء علیہم السلام سے بڑھے ہوئے تھے اِس لئے آپ مخلوق کی تکلیف دیکھ نہیں سکتے تھے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۲۶ مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵، ۶)

... آپ کی زندگی کی تقسیم دو حصّوں پر کر دی گئی ایک تو مکّی زندگی جو ۱۳ برس کے زمانہ کی ہے اور دوسری وہ زندگی ہے جو مدنی زندگی ہے اور وہ ۱۰ برس کی ہے۔ مکّہ کی زندگی میں اسم احمدؐ کی تجلّی تھی اس وقت آپؐ کی دِن رات خدا تعالیٰ کے حضور گریہ و بکا اور طلب استعانت اور دعا میں گزرتی تھی۔ اگر کوئی شخص آپؐ کی اس زندگی کے بسر اوقات پر پوری اِطلاع رکھتا ہو تو اُسے معلوم ہو جائے گا کہ جو تضرّع اور زاری آپؐ نے اس مکّی زندگی میں کی ہے وہ کبھی کسی عاشق نے اپنے محبوب و معشوق کی تلاش میں نہیں کی اور نہ کر سکے گا۔ پھر آپ کی تضرّع اپنے لئے نہ تھی بلکہ یہ تضرّع دُنیا کی حالت کی پوری واقفیت کی وجہ سے تھی۔ خدا پرستی کا نام و نشان چونکہ مٹ چکا تھا اور آپ کی رُوح اور خمیر میں اللہ تعالیٰ میں ایمان رکھ کر ایک لذّت اور سرور آچکا تھا اور فطرتاً دُنیا کو اس لذّت اور محبت سے سرشار کرنا چاہتے تھے۔ ادھر دُنیا کی حالت کو دیکھتے تھے تو ان کی استعدادیں اور فطرتیں عجیب طرز پر واقع ہو چکی تھیں اور بڑے مشکلات اور مصائب کا سامنا تھا۔ غرض دُنیا کی اس حالت پر آپ گریہ و زاری کرتے تھے اور یہاں تک کرتے تھے کہ قریب تھا کہ جان نکل جاتی۔ اس کی طرف اشارہ کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَعَلَّکَ

بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ۔ یہ آپ کی متضرعانہ زندگی تھی اور اسمِ احمدؐ کا ظہور تھا۔ اس وقت آپ ایک عظیم الشان توجہ میں پڑے ہوئے تھے۔ اس توجہ کا ظہور مدنی زندگی اور اسمِ محمدؐ کی تجلّی کے وقت ہوا جیسا کہ اس آیت سے پتہ لگتا ہے وَاسْتَفْتَحُوْا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ (سورہ ابراہیم آیت ۱۶) (الحکم جلد ۵ ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

مامور من اللہ جب آتا ہے تو اس کی فطرت میں سچّی ہمدردی رکھی جاتی ہے اور یہ ہمدردی عوام سے بھی ہوتی ہے اور جماعت سے بھی۔ اس ہمدردی میں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑھے ہوئے تھے اِس لئے کہ آپ کُل دُنیا کے لئے مامور ہو کر آئے تھے اور آپؐ سے پہلے جس قدر نبی آئے وہ مختص القوم اور مختص الزّمان کے طور پر تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کُل دُنیا اور ہمیشہ کے لئے نبی تھے۔ اِس لئے آپ کی ہمدردی بھی کامل ہمدردی تھی چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ اس کے ایک تو یہ معنے ہیں کہ کیا تو اُن کے مومن نہ ہونے کی فکر میں اپنی جان دے دیگا۔ اس آیت سے اس درد اور فکر کا پتہ لگ سکتا ہے جو آپ کو دُنیا کی تباہ حالت دیکھ کر ہوتا تھا کہ وہ مومن بن جاوے۔ یہ تو آپ کی عام ہمدردی کے لئے ہے اور یہ معنے بھی اِس آیت کے ہیں کہ مومن کو مومن بنانے کی فکر میں تو اپنی جان دے دیگا یعنی ایمان کو کامل بنانے میں۔

اِسی لئے دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ (سُورۃ النسآء آیت ۱۳۷) بظاہر تو یہ تحصیل حاصل معلوم ہوتی ہوگی لیکن جب حقیقتِ حال پر غور کیا جاوے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ کئی مراتب ہوتے ہیں اِس لئے اللہ تعالیٰ تکمیل چاہتا ہے۔

غرض مامور کی ہمدردی مخلوق کے ساتھ اس درجہ کی ہوتی ہے کہ وہ بہت جلد اُس سے متأثر ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

مَیں تو زبان ہی سے کہتا ہوں دِل میں ڈالنا یہ خدا کا کام ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھانے میں کیا کسر باقی رکھی تھی؟ مگر ابوجہل اور اس کے امثال نہ سمجھے۔ آپ کو اس قدر فکر اور غم تھا کہ خدا نے خود فرمایا لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کِس قدر ہمدردی تھی۔ آپؐ چاہتے تھے کہ وہ ہلاک ہونے سے بچ جاویں مگر وہ بچ نہ سکے حقیقت میں معلّم اور واعظ کا تو اتنا ہی فرض ہے کہ وہ بتا دے۔ دِل کی کھڑکی تو خدا کے فضل سے کُھلتی ہے نجات اُسی کو ملتی ہے جو دل کا صاف ہو جو صاف دل نہیں وہ اچکا اور ڈاکو ہے خدا تعالیٰ اسے بُری طرح مارتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ ۶ مورخہ ۱۴ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۶)

کوئی نبی اور ولی قوتِ عشقیہ سے خالی نہیں ہوتا یعنی ان کی فطرت میں حضرت احدیت نے بندگانِ خدا کی بھلائی کے لئے ایک قسم کا عشق ڈالا ہوا ہوتا ہے۔ پس وہی عشق کی آگ اُن سے سب کچھ کراتی ہے اور اگر ان کو خدا کا یہ حکم بھی پہنچے کہ اگر تم دعا اور غم خوارئ خلق اللہ نہ کرو تو تمہارے اجر میں کچھ قصور نہیں۔ تب بھی وہ اپنے فطرتی جوش سے رہ نہیں سکتے اور ان کو اس بات کی طرف خیال بھی نہیں ہوتا کہ ہم کو اِس جان کنی سے کیا اجر ملے گا کیونکہ ان کے جوشوں کی بناء کسی غرض پر نہیں بلکہ وہ سب کچھ قوتِ عشقیہ کی تحریک سے ہے۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ خدا اپنے نبی کو سمجھاتا ہے کہ اس قدر غم اور درد کو تُو لوگوں کے مومن بن جانے کے لئے اپنے دِل پر اُٹھاتا ہے اس سے تیری جان جاتی رہے گی۔ سو وہ عشق ہی تھا جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جان جانے کی کچھ پرواہ نہ کی۔ پس حقیقی پیری مریدی کا یہی احوال ہے اور صادق اسی سے شناخت کئے جاتے ہیں کیونکہ خدا کا قدیمی احوال ہے کہ قوتِ عشقیہ صادقوں کے دِلوں میں ضرور ہوتی ہے تا وہ سچے غم خوار بننے کیلئے لائق ٹھہریں جیسے والدین اپنے بچہ کے لئے ایک قوتِ عشقیہ رکھتے ہیں تو ان کی دُعا بھی اپنے بچوں کی نسبت قبولیت کی استعداد زیادہ رکھتی ہے اسی طرح جو شخص صاحبِ قوتِ عشقیہ ہے وہ خلق اللہ کے لئے حکمِ والدین رکھتا ہے اور خواہ نخواہ دوسروں کا غم اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے کیونکہ قوتِ عشقیہ اس کو نہیں چھوڑتی اور یہ خداوندِ کریم کی طرف سے ایک اِنتظامی بات ہے کہ اُس نے بنی آدم کو مختلف فطرتوں پر پیدا کیا ہے مثلاً دُنیا میں بہادروں اور جنگ جو لوگوں کی ضرورت ہے سو بعض فطرتیں جنگ جُوئی کی استعداد رکھتی ہیں۔ اسی طرح دُنیا میں ایسے لوگوں کی بھی ضرورت ہے کہ جن کے ہاتھ پر خلق اللہ کی اصلاح ہُوا کرے۔ سو بعض فطرتیں یہی استعداد لے کر آتی ہیں اور قوتِ عشقیہ سے بھری ہوئی ہوتی ہیں فالحمد للہ علی الآلاء ظاہرھا و باطنھا۔ (مکتوبات بنام مولوی عبدالقادر صاحب مندرجہ الحکم جلد ۲ ۲۴/۲۵ مورخہ ۲۰ اگست ۱۸۹۸ء صفحہ ۱۲)

انبیاء خلقت کی ہدایت کے واسطے بہت توجہ کرتے ہیں۔ اسی کی طرف قرآن شریف میں اشارہ ہے کہ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مخلوق کی ہدایت کا اِس قدر غم تھا کہ قریب تھا کہ اسی میں اپنے آپ کو ہلاک کر دیں۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۷ جولائی ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ایک طرف انبیاء و رسل اور خدا تعالیٰ کے مامورین اہلِ دُنیا سے نفور ہوتے ہیں اور دوسری طرف مخلوق کے لئے ان کے دل میں اِس قدر ہمدردی ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپکو اس کے لئے بھی خطرہ میں ڈال دیتے ہیں اور خود ان کی جان جانے کا اندیشہ ہوتا ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت قرآن شریف میں فرماتا ہے لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ یہ کس قدر ہمدردی اور خیرخواہی ہے اللہ تعالیٰ نے اس میں فرمایا ہے کہ تو ان لوگوں کے مومن نہ ہونے کے متعلق اس قدر ہم و غم نہ کر۔ اس غم میں شاید تو اپنی جان ہی دے دے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمدردئ مخلوق میں کہاں تک بڑھ جاتے ہیں۔ اِس قسم کی ہمدردی کا نمونہ کسی اور میں نہیں پایا جاتا یہاں تک کہ ماں باپ اور دوسرے اقارب میں بھی ایسی ہمدردی نہیں ہوسکتی۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۸ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

۱۵ وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَاَخَافُ اَنْ يَّقْتُلُوْنِ ○

خدا تعالیٰ کے نبی شہرت پسند نہیں ہوتے بلکہ وہ اپنے تئیں چھپانا چاہتے ہیں مگر الٰہی حکم انہیں باہر نکالتا ہے۔ دیکھو حضرت موسیٰؑ کو جب مامور کیا جانے لگا تو انہوں نے پہلے عرض کیا کہ ہارون مجھ سے زیادہ افصح ہے پھر کہا وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ مگر الٰہی منشاء یہی تھا کہ وہی نبی بنیں اور وہی اس لائق تھے اس لئے حکم ہوا کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں تم جاؤ اور تبلیغ کرو۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۱۹ مورخہ ۹ رمئی ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

۲۰ وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِيْ فَعَلْتَ وَاَنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ○

چونکہ خدا کی غیرت عام طور پر اپنے بندوں کو انگشت نما نہیں کرنا چاہتی اِس لئے جب سے کہ دُنیا پیدا ہوئی ہے خدا اپنے خاص اور پیارے بندوں کو بیگانہ آدمیوں کی نظر سے کسی نہ کسی طرح ظاہری اعتراض کے نیچے لاکر محجوب اور مستور کر دیتا ہے تا اجنبی لوگوں کی اُن پر نظر نہ پڑسکے اور تا وہ خدا کی غیرت کی چادر کے نیچے پوشیدہ رہیں یہی وجہ ہے کہ سیّدنا و مولانا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے کامل انسان پر جو سراسر نورِ مجسّم ہیں اندھے پادریوں اور نادان فلسفیوں اور جاہل آریوں نے اِس قدر اعتراض کئے ہیں کہ اگر وہ سب اکٹھے کئے جائیں تو تین ہزار سے بھی کچھ زیادہ ہیں پھر کسی دوسرے کو کب امید ہے کہ مخالفوں کے اعتراض سے بچ سکے۔ اگر خدا چاہتا تو ایسا ظہور میں نہ آتا مگر خدا نے یہی چاہا کہ اُس کے خاص بندے دُنیا کے فرزندوں کے ہاتھ سے دُکھ دئے جائیں اور ستائے جائیں اور اُن کے حق میں طرح طرح کی باتیں کہی جائیں اسی طرح انجیل سے ثابت ہے کہ بدقسمت یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو بھی کافر اور مکار اور گمراہ اور گمراہ کرنے والا اور فریبی ٹھہرایا یہاں تک کہ ایک چور کو اُن پر ترجیح دی۔ ایسا ہی فرعون نے بھی حضرت موسیٰؑ کو

کافر کہ کے پکارا جیسا کہ قرآن شریف میں فرعون کا یہ کلمہ درج ہے وَفَعَلْتَ فَعْلَتَكَ الَّتِیْ فَعَلْتَ وَ اَنْتَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ یعنی اے موسیٰ جو کام تُو نے کیا وہ کیا اور تُو تو کافروں میں سے ہے۔

پس یہ کفر عجیب کفر ہے کہ ابتداء سے تمام رسول اور نبی وراثت کے طور پر نا دانوں کی زبان سے اُس کو لیتے آئے یہاں تک کہ آخری حصّہ اس کا ہمیں بھی مل گیا پس ہمارے لئے یہ فخر کی جگہ ہے کہ ہم اس حصّہ سے کہ جو نبیوں اور رسولوں اور صدّیقوں کو قدیم سے ملتا آیا ہے محروم نہ رہے بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ کئی گذشتہ نبیوں کی نسبت یہ حصّہ ہمیں زیادہ ملا ہے۔ (چشمۂ معرفت صفحہ ۳۳۱، ۳۳۲)

فَلَمَّا تَرَآءَ الْجَمْعٰنِ قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۚ۝ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ۝

جس طرح کھانگڑ بھینس کا دُودھ نکالنا بہت مشکل ہے اسی طرح سے خدا کے نشان بھی سخت تکلیف کی حالت میں اُترا کرتے ہیں۔ جیسے حضرت موسیٰؑ کو بنی اسرائیل نے کہا تھا "اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ" وہ ایسا سخت مشکل کا وقت تھا کہ آگے سے بھی اور پیچھے سے بھی اُن کو موت ہی موت نظر آتی تھی۔ سامنے سمندر اور پیچھے فرعون کا لشکر۔ اس وقت موسیٰؑ نے جواب دیا "كَلَّآ اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ"۔

پس ایسی ضرورتوں اور ابتلاء کے اوقات میں نشان ظاہر ہُوا کرتے ہیں جب کہ ایک قسم کی جان کندنی پیش آجاتی ہے۔ چونکہ خدا کا نام غیب ہے اِس لئے جب نہایت ہی اشد ضرورت آ بنتی ہے تو امورِ غیبیہ ظاہر ہُوا کرتے ہیں۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱)

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے آئے تو ان کو پہلے مصر میں فرعون نے یہ کام دیا ہُوا تھا کہ وہ آدھے دن اینٹیں پاتھا کریں اور آدھے دن اپنا کام کیا کریں لیکن جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو نجات دلانے کی کوشش کی تو پھر شریروں کی شرارت سے بنی اسرائیل کا کام بڑھا دیا گیا اور انہیں حکم ملا کہ آدھے دن تو تم اینٹیں پاتھا کرو اور آدھے دن گھاس لایا کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ حکم ملا اور انہوں نے بنی اسرائیل کو سُنایا تو وہ بڑے ناراض ہوئے اور کہا اے موسیٰ خدا تم کو وہ دُکھ دے جو ہم کو ملا ہے۔ اور بھی انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو بددعائیں دیں مگر موسیٰ علیہ السلام نے اُن کو یہی کہا کہ تم صبر کرو۔ تورات میں یہ سارا قصّہ لکھا ہے کہ جُوں جُوں موسیٰ علیہ السلام انہیں تسلّی دیتے تھے وہ اَور بھی برافروختہ ہوتے تھے۔ آخر یہ ہُوا کہ مصر سے بھاگ نکلنے کی تجویز ہوئی اور مصر

والوں کے کپڑے اور برتن وغیرہ جو لئے تھے وہ ساتھ ہی لے آئے۔ جب حضرت موسٰی (علیہ السلام) قوم کو لیکر نکل آئے تو فرعون نے اپنے لشکر کو لے کر اُن کا تعاقب کیا۔ بنی اسرائیل نے جب دیکھا کہ فرعونیوں کا لشکر ان کے قریب ہے تو وہ بڑے ہی مضطرب ہوئے۔ چنانچہ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ اس وقت وہ چلّائے اور کہا اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ اے موسٰی ہم تو پکڑے گئے مگر موسٰی علیہ السلام نے جو نبوت کی آنکھ سے انجام کو دیکھتے تھے انہیں یہی جواب دیا کَلَّا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ہرگز نہیں میرا رب میرے ساتھ ہے۔ توارت میں لکھا ہے کہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ کیا مصر میں ہمارے لئے قبریں نہ تھیں۔ اور یہ اضطراب اِس وجہ سے پیدا ہوا کہ پیچھے فرعون کا لشکر اور آگے دریائے نیل تھا۔ وہ دیکھتے تھے کہ نہ پیچھے جا کر بچ سکتے ہیں اور نہ آگے جا کر۔ مگر اللہ تعالیٰ قادر مقتدر خدا ہے۔ دریائے نیل میں سے انہیں راستہ مل گیا اور سارے بنی اسرائیل آرام کے ساتھ پار ہو گئے مگر فرعونیوں کا لشکر غرق ہو گیا۔ سید احمد خاں صاحب اِس موقع پر لکھتے ہیں کہ یہ جوار بھاٹا تھا مگر ہم کہتے ہیں کہ کچھ ہو اس میں کوئی شُبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ عظیم الشان معجزہ تھا جو ایسے وقت پر اللہ تعالیٰ نے اُن کے لئے راہ پیدا کر دی اور یہی متقی کے ساتھ ہوتا ہے کہ ہر ضیق سے اُسے نجات اور راہ ملتی ہے یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۔ (الحکم جلد ۷ ء ۱۱ مورخہ ۲۴۔ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ میرے ساتھ میرا رب ہے عنقریب وہ میرا راہ کھول دے گا۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۱۳ حاشیہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا۔ اس معیت میں حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ بھی ہیں اور گویا کل جماعت آپ کی آگئی۔ موسٰی علیہ السلام نے یہ نہیں کہا بلکہ کہا اِنَّ مَعِیَ رَبِّیْ۔ اِس میں کیا سِر تھا کہ انہوں نے اپنے ہی ساتھ معیت کا اظہار کیا؟ اس میں یہ راز ہے کہ اللہ جامع جمیع شیون کا ہے اور اسمِ اعظم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت کے ساتھ اسمِ اعظم کی معیت مع تمام صفات کے پائی جاتی ہے لیکن موسٰی علیہ السلام کی قوم شریر اور فاسق فاجر تھی۔ آئے دن لڑنے اور پتھر مارنے کو تیار ہو جاتی تھی اِس لئے ان کی طرف معیت کو منسوب نہیں کیا بلکہ اپنی ذات تک اُسے رکھا۔ اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور علو مدارج کا اظہار مقصود ہے۔

(الحکم جلد ۷ ء ۲ صفحہ ۸ مورخہ ۱۷ ر جنوری ۱۹۰۳ء)

بہ تحقیق میرا رب میرے ساتھ ہے وہ مجھے راہ بتلائے گا۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۵۶/۵۵۵ حاشیہ در حاشیہ)

میرے ساتھ میرا خدا ہے وہ مخلصی کی کوئی راہ دکھا دے گا۔ یہ قرآن شریف میں حضرت موسٰیؑ کے

قِصّہ میں ہے جبکہ فرعون نے ان کا تعاقب کیا تھا اور بنی اسرائیل نے سمجھا تھا کہ اب ہم پکڑے گئے۔
(براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۵۵ حاشیہ)

۸۱۔ وَاِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ يَشۡفِيۡنِ۝

اصل میں انسان جُوں جُوں اپنے ایمان کو کامل کرتا ہے اور یقین میں پکّا ہوتا جاتا ہے تُوں تُوں اللہ تعالیٰ اس کے واسطے خود علاج کرتا ہے اس کو ضرورت نہیں رہتی کہ دوائیں تلاش کرتا پھرے وہ خدا کی دوائیں کھاتا ہے اور خدا خود اس کا علاج کرتا ہے۔ بھلا کوئی دعوےٰ سے کہہ سکتا ہے کہ فلاں دوا سے فلاں مریض ضرور ہی شفا پا جاوے گا ہرگز نہیں بلکہ بعض اوقات دیکھا جاتا ہے کہ دوا اُلٹا ہلاکت کا موجب ہو جاتی ہے۔ بعض وقت تشخیص میں غلطی ہوتی ہے بعض وقت دواؤں کے اجزاء میں غلطی ہو جاتی ہے۔ غرض حتمی علاج نہیں ہو سکتا۔ ہاں خدا تعالیٰ جو علاج فرماتا ہے وہ حتمی ہوتا ہے اس سے نقصان نہیں ہوتا مگر یہ بات ذرا مشکل ہے کامل ایمان کو چاہتی ہے اور یقین کے پہاڑ سے پیدا ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کا اللہ تعالیٰ خود معالج ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ دانت میں سخت درد تھا میں نے کسی سے دریافت کیا کہ اس کا کیا علاج ہے۔ اس نے کہا کہ موٹا علاج مشہور ہے علاج دنداں اخراج دنداں۔ اس کا یہ فقرہ میرے دل پر بہت گراں گزرا کیونکہ دانت بھی ایک نعمتِ الٰہی ہے اُسے نکال دینا ایک نعمت سے محروم ہونا ہے۔ اِسی فکر میں تھا کہ غنودگی آئی اور زبان پر جاری ہوا وَ اِذَا مَرِضۡتُ فَهُوَ يَشۡفِيۡنِ اس کے ساتھ ہی معًا درد ٹھہر گیا اور پھر نہیں ہوا۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۵، ۶ صفحہ ۳۸ مورخہ ۲۸ نومبر و ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء)

۸۲۔ وَالَّذِيۡ يُمِيۡتُنِيۡ ثُمَّ يُحۡيِيۡنِ۝

وہ خدا جو مجھے مارتا ہے اور پھر زندہ کرتا ہے۔ اس موت اور حیات سے مراد صرف جسمانی موت اور حیات نہیں بلکہ اس موت اور حیات کی طرف اشارہ ہے جو سالک کو اپنے مقامات و منازل سلوک میں پیش آتی ہے چنانچہ وہ خلق کی محبتِ ذاتی سے مارا جاتا ہے اور خالقِ حقیقی کی محبتِ ذاتی کے ساتھ زندہ کیا جاتا ہے اور پھر اپنے رفقاء کی محبتِ ذاتی سے مارا جاتا ہے اور رفیقِ اعلیٰ کی محبتِ ذاتی کے ساتھ زندہ کیا جاتا ہے اور پھر اپنے نفس کی محبتِ ذاتی سے مارا جاتا ہے اور محبوبِ حقیقی کی محبتِ ذاتی کے ساتھ زندہ کیا جاتا ہے۔ اِسی طرح کئی موتیں اس پر وارد ہوتی رہتی ہیں اور کئی حیاتیں یہاں تک

کہ کامل حیات کے مرتبہ تک پہنچ جاتا ہے سو وہ کامل حیات جو اس سفلی دُنیا میں چھوڑنے کے بعد ملتی ہے وہ جسمِ خاکی کی حیات نہیں بلکہ اَور رنگ اور شان کی حیات ہے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۱۵، ۶۱۶)

وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ ۝

اس درجہ سے اُوپر جو ابھی ہم نے بہشتیوں اور دوزخیوں کے لئے بیان کیا ہے ایک اَور درجہ دخولِ جنّت دخولِ جہنّم ہے جس کو درمیانی درجہ کہنا چاہیئے اور وہ حشر اجساد کے بعد اور جنّتِ عظمٰی یا جہنّم کبریٰ میں داخل ہونے سے پہلے حاصل ہوتا ہے اور بوجہ تعلق جسدِ کامل قولی میں ایک اعلیٰ درجہ کی تیزی پیدا ہو کر اور خدا تعالیٰ کی تجلّیٔ رحم یا تجلّیٔ قہر کا حسبِ حالت اپنے کامل طور پر مشاہدہ ہو کر اور جنّتِ عظمٰی کو بہت قریب پا کر یا جہنّم کبریٰ کو بہت ہی قریب دیکھ کر وہ لذّات یا عقوبات ترقی پذیر ہو جاتے ہیں جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ آپ فرماتا ہے وَ اُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَ بُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِلْغٰوِيْنَ [1] ـــــ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ وَ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ [2]۔ اس دوسرے درجہ میں بھی لوگ مساوی نہیں ہوتے بلکہ اعلیٰ درجہ کے بھی ہوتے ہیں جو بہشتی ہونے کی حالت میں بہشتی انوار اپنے ساتھ رکھتے ہیں ...... ایسا ہی دوزخی ہونے کی حالت میں اعلیٰ درجہ کے کفّار ہوتے ہیں کہ قبل اس کے جو کامل طور پر دوزخ میں پڑیں اُن کے دِلوں پر دوزخ کی آگ بھڑکائی جاتی ہے۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۳۵۹، ۳۶۰)

وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ ۝

راقم اِس رسالہ نے ایک درویش کو دیکھا کہ وہ سخت گرمی کے موسم میں یہ آیتِ قرآنی پڑھ کر وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ زنبور کو پکڑ لیتا تھا اور اُس کی نیش زنی سے بکلّی محفوظ رہتا تھا اور خود اس راقم کے تجربہ میں بعض تاثیراتِ عجیبہ آیتِ قرآنی کی آچکی ہیں جن سے عجائباتِ قدرت حضرت باری جلّ شانہٗ معلوم ہوتے ہیں۔

(سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۴۲ مطبوعہ ۱۸۹۳ء)

---

[1] شعراء: ۹۱، ۹۲ ٭ [2] عبس: ۳۹ تا ۴۳

۸۶ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۝

اور کسی طور سے لوگوں کو اُن کے مال کا نقصان نہ پہنچاؤ اور فساد کی نیّت سے زمین پر مت پھرا کرو یعنی اِس نیت سے کہ چوری کریں یا ڈاکہ ماریں یا کسی کی جیب کتریں یا کسی اور ناجائز طریق سے بیگانہ مال پر قبضہ کریں۔ (تقریر جلسہ مذاہب صـ۳۹)

۱۹۶ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ۝

فصاحت اور بلاغت کے بارہ میں فرمایا بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ اور پھر اس کی نظیر مانگی اور کہا کہ اگر تم کچھ کر سکتے ہو اس کی نظیر دو۔ پس عربی مُبِیْن کے لفظ سے فصاحت بلاغت کے سوا اور کیا معنی ہو سکتے ہیں؟ خاص کر جب ایک شخص کہے کہ میں یہ تقریر ایسی زبان میں کرتا ہوں کہ تم اس کی نظیر پیش کرو تو بجز اس کے کیا سمجھا جائے کہ وہ کمال بلاغت کا مدعی ہے اور مُبِیْن کا لفظ بھی اسی کو چاہتا ہے۔ (جنگِ مقدّس (اہلِ اسلام اور عیسائیوں میں مناظرہ) پرچہ ۵ رجون ۱۸۹۳ء صـ۱٦)
(جنگِ مقدس طبع دوم صـ۱۷۳)

اور یہ کتاب عربی فصیح بلیغ میں ہے۔ (کرامات الصادقین صـ۱۷)

۲۱۵ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ۝

ہر وقت اِنسان کو فکر کرنی چاہیئے کہ جس طرح ممکن ہو عورتوں اور مردوں کو اس امرِ الٰہی سے اطلاع کر دیوے۔ حدیث میں آیا ہے کہ اپنے قبیلہ کا شیخ اسی طرح سوال کیا جائے گا جیسے کسی قوم کا نبی۔ غرض جو موقع مل سکے اسے کھونا نہیں چاہیئے۔ زندگی کا کچھ اعتبار نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ کا حکم ہوا تو آپؐ نے نام بنام سب کو خدا کا پیغام پہنچا دیا۔ ایسا ہی میں نے بھی کئی مرتبہ عورتوں اور مردوں کو مختلف موقعوں پر تبلیغ کی ہے اور اب بھی کبھی گھر میں وعظ سُنایا کرتا ہوں۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۴۴ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۱ء صـ۱)

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝ الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ ۝ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ ۝

خدا پر توکّل کر جو غالب اور رحم کرنے والا ہے۔ وہی خدا جو تجھے دیکھتا ہے جب تُو دعا اور دعوت کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ وہی خدا جو تجھے اس وقت دیکھتا تھا کہ جب تُو تخم کے طور پر راست بازوں کی پشتوں میں چلا آتا تھا۔ یہاں تک کہ اپنی بزرگ والدہ آمنہ معصومہ کے پیٹ میں پڑا۔ (تریاق القلوب صہ ۶۷)

هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ ۝ تَنَزَّلُ عَلَى كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ ۝

واضح ہو کہ شیطانی الہامات ہونا حق ہے اور بعض ناتمام سالک لوگوں کو ہُوا کرتے ہیں اور حدیث النفس بھی ہوتی ہے جس کو اضغاث احلام کہتے ہیں اور جو شخص اِس سے انکار کرے وہ قرآن شریف کی مخالفت کرتا ہے کیونکہ قرآن شریف کے بیان سے شیطانی الہام ثابت ہیں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب تک اِنسان کا تزکیۂ نفس پورے اور کامل طور پر نہ ہو تب تک اس کو شیطانی الہام ہو سکتا ہے اور وہ آیت عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیْمٍ کے نیچے آسکتا ہے مگر پاکوں کو شیطانی وسوسہ پر بلا توقف مطلع کیا جاتا ہے۔ (ضرورت الامام صہ ۱۱ مطبوعہ ۱۹۰۶ء)

کیا مَیں بتلاؤں کہ کن پر شیطان اُترا کرتے ہیں۔ ہر ایک جھوٹے مفتری پر اُترتے ہیں۔ (انجام آتھم صہ ۵۲)

کیا مَیں تمہیں بتلاؤں کہ کن لوگوں پر شیطان اُترا کرتے ہیں۔ ہر ایک کذّاب بدکار پر شیطان اُترتے ہیں۔ (حقیقۃ الوحی صہ ۷۳)

یاد رہے کہ رحمانی اِلہام اور وحی کے لئے اوّل شرط یہ ہے کہ اِنسان محض خدا کا ہو جائے اور شیطان کا کوئی حِصّہ اُس میں نہ رہے کیونکہ جہاں مُردار ہے ضرور ہے کہ وہاں کُتّے بھی جمع ہو جائیں اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے هَلْ أُنَبِّئُكُمْ عَلَى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيَاطِينُ۔ تَنَزَّلُ عَلَى كُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ مگر جس میں شیطان کا حِصّہ نہیں رہا اور وہ سِفلی زندگی سے ایسا دُور ہُوا کہ گویا مر گیا اور راست بازاور

وفادار بندہ بن گیا اور خدا کی طرف آ گیا اُس پر شیطان حملہ نہیں کر سکتا۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۳۸)

کیا میں تم کو یہ خبر دوں کہ جنات کن لوگوں پر اُترا کرتے ہیں۔ جنات اُنہیں پر اُترا کرتے ہیں کہ جو دروغگو اور معصیت کار ہیں (براہین احمدیہ صفحہ ۲۲۲ حاشیہ)

یُلْقُوْنَ السَّمْعَ وَاَکْثَرُهُمْ کٰذِبُوْنَ

اور اکثر ان کی پیشینگوئیاں جھوٹی ہوتی ہیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۲۲ حاشیہ)

وَالشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ وَاَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَکَرُوا اللّٰهَ کَثِیْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ

اور شاعروں کی پیروی تو وہی لوگ کرتے ہیں کہ جو گمراہ ہیں کیا تمہیں معلوم نہیں کہ شاعر لوگ قافیہ اور ردیف کے پیچھے ہر یک جنگل میں بھٹکتے پھرتے ہیں یعنی کسی حقانی صداقت کے پابند نہیں رہتے اور جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں اور ظالموں کو عنقریب معلوم ہو گا کہ ان کا مرجع اور مآب کونسی جگہ ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۲۲)

شاعر تو اگر مر بھی جاویں تو صداقت اور راستی و ضرورتِ حقّہ کا اپنے کلام میں اِلتزام نہ کر سکیں وہ تو بغیر فضول گوئی کے بول ہی نہیں سکتے اور ان کی ساری کل فضول اور جھوٹ پر ہی چلتی ہے۔ اگر جھوٹ نہیں یا فضول گوئی نہیں تو پھر شعر بھی نہیں۔ اگر تم اُن کا فقرہ فقرہ تلاش کرو کہ کس قدر حقائق دقائق ان میں جمع ہیں۔ کس قدر راستی اور صداقت کا اِلتزام ہے۔ کس قدر حق اور حکمت پر قیام ہے کس ضرورتِ حقّہ سے وہ باتیں اُن کے مُونہہ سے نکلی ہیں اور کیا کیا اَسرار بے مثل و مانند اُن میں لپٹے ہوئے ہیں تو تمہیں معلوم ہو کہ ان تمام خوبیوں میں سے کوئی بھی خوبی اُن کی مُردہ عبارات میں پائی نہیں جاتی۔ ان کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ جس طرف قافیہ ردیف ملتا نظر آیا اُسی طرف جُھک گئے اور جو مضمون دل کو اچھا لگا وہی

جھک ماری۔ نہ حق اور حکمت کی پابندی ہے اور نہ فضول گوئی سے پرہیز ہے اور نہ یہ خیال ہے کہ اس کلام کے بولنے کے لئے کونسی سخت ضرورت درپیش ہے اور اس کے ترک کرنے میں کونسا سخت نقصان عائد حال ہے ناحق بے فائدہ فقرہ سے فقرہ ملاتے ہیں۔ سر کی جگہ پاؤں پاؤں کی جگہ سر لگاتے ہیں۔ سراب کی طرح چمک تو بہت ہے پر حقیقت دیکھو تو خاک بھی نہیں۔ شعبدہ باز کی طرح صرف کھیل ہی کھیل اصلیت دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔ نادار نا طاقت اور ناتواں اور گئے گذرے ہیں۔ آنکھیں اندھی اور اس پر عشوہ گری۔ اِن کی نسبت نہایت ہی نرمی کیجیئے تو یہ کہیئے کہ وہ سب ضعیف اور ہیچ ہونے کی وجہ سے عنکبوت کی طرح ہیں اور ان کے اشعار بیتِ عنکبوت ہیں اُن کی نسبت خداوند کریم نے خوب فرمایا ہے ..... یعنی شاعروں کے پیچھے وہی لوگ چلتے ہیں جنہوں نے حق اور حکمت کا راستہ چھوڑ دیا ہے۔ کیا تُو نہیں دیکھتا کہ شاعر تو وہ لوگ ہیں جو قافیہ اور ردیف اور مضمون کی تلاش میں ہر یک جنگل میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ حقانی باتوں پر اُن کا قدم نہیں جمتا اور جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔ سو ظالم لوگ ہیں جو خدا کے حقانی کلام کو شاعروں کے کلام سے تشبیہہ دیتے ہیں انہیں عنقریب معلوم ہوگا کہ کس طرف پھریں گے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۳۹۱ تا صفحہ ۳۹۳ حاشیہ)

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں فصاحت بلاغت کا زور تھا اِس لئے آپؐ کو قرآن کریم بھی ایک معجزہ اسی رنگ کا ملا۔ یہ رنگ اِس لئے اختیار کیا کہ شعراء جادو بیان سمجھے جاتے تھے اور ان کی زبان میں اِتنا اثر تھا کہ وہ جو چاہتے تھے چند شعر پڑھ کر کرا لیتے تھے ...... ان کے پاس زبان تھی جو دلیری اور حوصلہ پیدا کر دیتی تھی۔ ہر حربہ میں وہ شعر سے کام لیتے تھے اور فِی کُلِّ وَادٍ یَّھِیْمُوْنَ کے مصداق تھے اِس لئے اُس وقت ضروری تھا کہ خدا تعالیٰ اپنا کلام بھیجتا پس خدا تعالیٰ نے اپنا کلام نازل فرمایا اور اس کلام کے رنگ میں اپنا معجزہ پیش کر دیا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴۔ اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

سورۃ النمل

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فَلَمَّا جَآءَهَا نُوۡدِیَ اَنۡۢ بُوۡرِکَ مَنۡ فِی النَّارِ وَ مَنۡ حَوۡلَهَا ؕ وَ سُبۡحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝

جب موسیٰ آیا تو پکارا گیا کہ برکت دیا گیا ہے جو آگ میں ہے اور جو آگ کے گرد ہے اور اللہ تعالیٰ پاک ہے تجسّم سے اور تحیّز سے اور وہ ربّ ہے تمام عالموں کا۔ اب دیکھئے اِس آیت میں صاف فرما دیا کہ جو آگ میں ہے اور جو اس کے گرد میں ہے اُس کو برکت دی گئی اور خدا تعالیٰ نے پکار کر اس کو برکت دی۔ اِس سے معلوم ہوُا کہ آگ میں وہ چیز تھی جس نے برکت پائی نہ کہ برکت دینے والا۔ وہ تو نُوۡدِیَ کے لفظ میں آپ اشارہ فرما رہا ہے کہ اُس نے آگ کے اندر اور گرد کو برکت دی۔ اِس سے ثابت ہوُا کہ آگ میں خدا نہیں تھا اور نہ مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے بلکہ اللہ جلّشانہٗ اس وہم کا خود دوسری آیت میں ازالہ فرماتا ہے۔ وَ سُبۡحٰنَ اللّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ یعنی خدا تعالیٰ اس حلول اور نزول سے پاک ہے وہ ہر ایک چیز کا ربّ ہے۔ جنگِ مقدّس (اہلِ اسلام اور عیسائیوں میں مباحثہ صنٓ ۲۰ ۲۳ مئی ۱۸۹۳ء)

وَ جَحَدُوۡا بِهَا وَ اسۡتَیۡقَنَتۡهَاۤ اَنۡفُسُهُمۡ ظُلۡمًا وَّ عُلُوًّا ؕ فَانۡظُرۡ کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الۡمُفۡسِدِیۡنَ ۝

اور لوگوں نے محض ظلم کی راہ سے انکار کیا حالانکہ اُن کے دل یقین کر گئے۔

(براہین احمدیہ صنٓ ۵۶۲ حاشیہ)

انہوں نے موسیٰ کے نشانوں کا انکار کیا لیکن ان کے دل یقین کر گئے۔ (الحق دہلی صفحہ ۳۶)

وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ...... ان کے دل ان نشانوں پر یقین کر گئے ہیں اور دلوں میں انہوں نے سمجھ لیا ہے کہ اب گریز کی جگہ نہیں۔ (براہین احمدیہ پہلی فصل صفحہ ۴۹۸ حاشیہ درحاشیہ)

۳۵ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَ كَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ ۝

پھر چوتھی حالت کے بعد پانچویں حالت ہے جس کے مفاسد سے نہایت سخت اور شدید محبّت نفس امارہ کو ہے کیونکہ اس مرتبہ پر صرف ایک لڑائی باقی رہ جاتی ہے اور وہ وقت قریب آجاتا ہے کہ حضرت عزت جلّ شانہٗ کے فرشتے اس وجود کی تمام آبادی کو فتح کرلیں اور اس پر اپنا پورا تصرّف اور دخل کرلیں اور تمام نفسانی سلسلہ کو درہم برہم کر دیں اور نفسانی قوٰی کے قریہ کو ویران کر دیں اور اس کے نمبرداروں کو ذلیل اور پست کر کے دکھلاویں اور پہلی سلطنت پر ایک تباہی ڈال دیں اور انقلابِ سلطنت پر ایسا ہی ہؤا کرتا ہے اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ اور یہ مومن کے لئے ایک آخری امتحان اور آخری جنگ ہے جس پر اس کے تمام مراتب سلوک ختم ہوجاتے ہیں اور اس کا سلسلہ ترقیات جو کسب اور کوشش سے ہے انتہا تک پہنچ جاتا ہے اور انسانی کوششیں اپنے اخیر نقطہ تک منزل طے کرلیتی ہیں پھر بعد اس کے صرف موہبت اور فضل کا کام باقی رہ جاتا ہے جو خلق آخر کے متعلق ہے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۲۸)

جب بادشاہ کسی گاؤں میں داخل ہوتے ہیں تو پہلا تانا بانا سب تباہ کر دیتے ہیں۔ بڑے بڑے نمبردار رئیس، نواب ہی پہلے پکڑے جاتے ہیں اور بڑے بڑے نامور ذلیل کئے جاتے ہیں اور اِس طرح پر ایک تغیّر عظیم واقع ہوتا ہے یہی ملوک کا خاصّہ ہے اور ایسا ہی ہمیشہ ہوتا چلا آیا ہے۔ اِسی طرح پر جب رُوحانی سلطنت بدلتی ہے تو پہلی سلطنت پر تباہی آجاتی ہے شیطان کے غلاموں کو قابو کیا جاتا ہے وہ جذبات اور شہوات جو انسان کی رُوحانی سلطنت میں مفسدہ پردازی کرتے ہیں اُن کو کُچل دیا جاتا ہے اور ذلیل کیا جاتا ہے اور رُوحانی طور پر ایک نیا سِکہ بیٹھ جاتا ہے اور بالکل امن و امان کی حالت پیدا ہوجاتی ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ عـ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

قِيۡلَ لَهَا ادۡخُلِي الصَّرۡحَ ۚ فَلَمَّا رَاَتۡهُ حَسِبَتۡهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتۡ عَنۡ سَاقَيۡهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنۡ قَوَارِيۡرَ ؕ قَالَتۡ رَبِّ اِنِّيۡ ظَلَمۡتُ نَفۡسِيۡ وَ اَسۡلَمۡتُ مَعَ سُلَيۡمٰنَ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝

منجملہ انسان کی طبعی حالتوں کے جو اس کی فطرت کو لازم پڑی ہوئی ہیں ایک برتر ہستی کی تلاش ہے جس کے لئے اندر ہی اندر انسان کے دل میں ایک کشش موجود ہے اور اس تلاش کا اثر اسی وقت سے محسوس ہونے لگتا ہے جبکہ بچّہ ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے کیونکہ بچّہ پیدا ہوتے ہی پہلے رُوحانی خاصیت اپنی جو دکھاتا ہے وہ یہی ہے کہ ماں کی طرف جُھکا جاتا ہے اور طبعًا ماں کی محبت رکھتا ہے اور پھر جیسے جیسے حواس اس کے کُھلتے جاتے ہیں اور شگوفۂ فطرت اس کا کِھلتا جاتا ہے یہ کشش محبت جو اس کے اندر چُھپی ہوئی تھی اپنا رنگ و رُوپ نمایاں طور پر دکھاتی چلی جاتی ہے پھر تو یہ ہوتا ہے کہ بجز اپنی ماں کی گود کے کسی جگہ آرام نہیں پاتا اور پورا آرام اس کا اسی کے کنارِ عاطفت میں ہوتا ہے اور اگر ماں سے علیحدہ کر دیا جائے اور دُور ڈال دیا جاوے تو تمام عیش اس کا تلخ ہو جاتا ہے اور اگرچہ اس کے آگے نعمتوں کا ایک ڈھیر ڈال دیا جاوے تب بھی وہ اپنی سچی خوشحالی ماں کی گود میں ہی دیکھتا ہے اور اس کے بغیر کسی طرح آرام نہیں پاتا۔ سو وہ کششِ محبت جو اس کو اپنی ماں کی طرف پیدا ہوتی ہے وہ کیا چیز ہے؟

درحقیقت یہ وہی کشش ہے جو معبودِ حقیقی کے لئے بچّہ کی فطرت میں رکھی گئی ہے بلکہ ہر ایک جگہ جو انسان تعلقِ محبت پیدا کرتا ہے درحقیقت وہی کشش کام کر رہی ہے اور ہر ایک جگہ جو یہ عاشقانہ جوش دکھلاتا ہے درحقیقت اسی محبت کا وہ ایک عکس ہے گویا دوسری چیزوں کو اُٹھا اُٹھا کر ایک گم شدہ چیز کو تلاش کر رہا ہے جس کا اب نام بھول گیا ہے۔ سو انسان کا مال یا اولاد یا بیوی سے محبت کرنا یا کسی خوش آواز کے گیت کی طرف اس کی رُوح کا کھینچے جانا درحقیقت اسی گم شدہ محبوب کی تلاش ہے اور چونکہ انسان اس دقیق در دقیق ہستی کو جو آگ کی طرح ہر ایک میں مخفی اور سب پر پوشیدہ ہے اپنی جسمانی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا اور نہ اپنی ناتمام عقل سے اس کو پا سکتا ہے۔ اِس لئے اس کی معرفت کے بارے میں انسان کو بڑی بڑی غلطیاں لگی ہیں اور سہو کاریوں سے اس کا حق دوسرے کو دیا گیا ہے۔ خدا نے

قرآن شریف میں یہ خوب مثال دی ہے کہ دُنیا ایک ایسے شیش محل کی طرح ہے جس کی زمین کا فرش نہایت مصفّٰی شیشوں سے کیا گیا ہے اور پھر ان شیشوں کے نیچے پانی چھوڑا گیا ہے جو نہایت تیزی سے چل رہا ہے اب ہر ایک نظر جو شیشوں پر پڑتی ہے وہ اپنی غلطی سے ان شیشوں کو بھی پانی سمجھ لیتی ہے اور پھر انسان ان شیشوں پر چلنے سے ایسا ڈرتا ہے جیسا کہ پانی سے ڈرنا چاہیئے حالانکہ وہ درحقیقت شیشے ہیں مگر صاف اور شفاف۔ سو یہ بڑے بڑے اجرام جو نظر آتے ہیں جیسے آفتاب اور ماہتاب وغیرہ۔ یہ وہی صاف شیشے ہیں جن کی غلطی سے پرستش کی گئی اور ان کے نیچے ایک اعلیٰ طاقت کام کر رہی ہے جو ان شیشوں کے پردہ میں پانی کی طرح بڑی تیزی سے چل رہی ہے اور مخلوق پرستوں کی نظر کی یہ غلطی ہے کہ انہیں شیشوں کی طرف اس کام کو منسوب کر رہے ہیں جو ان کے نیچے کی طاقت دکھلا رہی ہے۔ یہی تفسیر اس آیت کریمہ کی ہے اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ۔ غرض چونکہ خدائے تعالیٰ کی ذات باوجود نہایت روشن ہونے کے پھر بھی نہایت مخفی ہوئی ہے اس لئے اس کی شناخت کے لئے صرف یہ نظام جسمانی جو ہماری نظروں کے سامنے ہے کافی نہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ ایسے نظام پر مدار رکھنے والے باوجودیکہ اس ترتیب ابلغ اور محکم کو جو صدہا عجائبات پر مشتمل ہے نہایت غور کی نظر سے دیکھتے رہے بلکہ ہیئت اور طبعی اور فلسفہ میں وہ مہارتیں پیدا کیں کہ گویا زمین و آسمان کے اندر دھنس گئے مگر پھر بھی شکوک و شبہات کی تاریکی سے نجات نہ پا سکے اور اکثر ان کے طرح طرح کی خطاؤں میں مبتلا ہو گئے اور بیہودہ اوہام میں پڑ کر کہیں کے کہیں چلے گئے۔

(تقریر جلسہ مذاہب صفحہ ۵۵-۵۷)

اگر غور سے دیکھا جائے تو وہ تمام کام جو یہ جسمانی آفتاب کر رہا ہے وہ سب کام اس حقیقی آفتاب کے ظلّ ہیں اور یہ نہیں کہ وہ صرف رُوحانی کام کرتا ہے بلکہ جس قدر اس جسمانی سُورج کے کام ہیں وہ اس کے اپنے کام نہیں ہیں بلکہ درحقیقت اسی معبودِ حقیقی کی پوشیدہ طاقت اس کے اندر وہ کام کر رہی ہے جیسا کہ اسی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے قرآن شریف میں ایک ملکہ کا قصّہ لکھا ہے جو آفتاب پرست تھی اور اس کا نام بلقیس تھا اور وہ اپنے ملک کی بادشاہ تھی اور ایسا ہوا کہ اس وقت کے نبی نے اس کو دھمکی دے بھیجی کہ تجھے ہمارے پاس حاضر ہونا چاہیئے ورنہ ہمارا لشکر تیرے پر چڑھائی کرے گا اور پھر تیری خیر نہیں ہو گی پس وہ ڈر گئی اور اس نبی کے پاس حاضر ہونے کے لئے اپنے شہر سے روانہ ہوئی اور قبل اس کے کہ وہ حاضر ہو اس کو متنبہ کرنے کے لئے ایک ایسا محل تیار کیا گیا جس پر نہایت مصفا شیشہ کا فرش تھا اور اس فرش کے نیچے نہر کی طرح ایک وسیع خندق تیار کی گئی تھی جس میں پانی بہتا تھا اور پانی میں مچھلیاں چلتی تھیں۔ جب وہ ملکہ اس جگہ پہنچی تو اس کو حکم دیا گیا کہ محل کے اندر آجا تب اس نے نزدیک جا کر

دیکھا کہ پانی زور سے بہہ رہا ہے اور اس میں مچھلیاں ہیں۔ اس نظارہ سے اس پر یہ اثر ہُوا کہ اُس نے اپنی پنڈلیوں پر سے کپڑا اُٹھا لیا کہ ایسا نہ ہو کہ پانی میں تر ہو جائے تب اُس نبی نے اس ملکہ کو جس کا نام بلقیس تھا آواز دی کہ اے بلقیس تُو کس غلطی میں گرفتار ہو گئی یہ تو پانی نہیں ہے جس سے ڈر کر تُو نے پاجامہ اُوپر اُٹھا لیا یہ تو شیشہ کا فرش ہے اور پانی اس کے نیچے ہے۔ اس مقام میں قرآن شریف میں یہ آیت ہے قَالَ اِنَّہٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ یعنی اس نبی نے کہا کہ اے بلقیس تُو کیوں دھوکا کھاتی ہے یہ تو شیش محل کے شیشے ہیں جو اُوپر کی سطح پر بطور فرش کے لگائے گئے ہیں اور پانی جو زور سے بہہ رہا ہے وہ تو ان شیشوں کے نیچے ہے نہ کہ یہ خود پانی ہیں تب وہ سمجھ گئی کہ میری مذہبی غلطی پر مجھے ہوشیار کیا گیا ہے اور مَیں نے فی الحقیقت جہالت کی راہ اختیار کر رکھی تھی جو سُورج کی پُوجا کرتی تھی تب وہ خدائے واحد لاشریک پر ایمان لائی اور اس کی آنکھیں کُھل گئیں اور اس نے یقین کر لیا کہ وہ طاقتِ عظمیٰ جس کی پرستش کرنی چاہیئے وہ تو اور ہے اور مَیں دھوکہ میں رہی اور سطحی چیز کو معبود ٹھہرایا اور اس نبی کی تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ دُنیا ایک شیش محل ہے اور سُورج اور چاند اور ستارے اور عناصر وغیرہ جو کچھ کام کر رہے ہیں یہ دراصل ان کے کام نہیں یہ تو بطور شیشوں کے ہیں بلکہ ان کے نیچے ایک مخفی طاقت ہے جو خدا ہے یہ سب اس کے کام ہیں۔ اس نظارہ کو دیکھ کر بلقیس نے سچے دل سے سُورج کی پُوجا سے توبہ کی اور سمجھ لیا کہ وہ طاقت ہی اَور ہے کہ سُورج وغیرہ سے کام کراتی ہے اور یہ تو صرف شیشے ہیں۔ (نسیم دعوت صفحہ ۴۵، ۴۶)

مختلف رنگوں اور پیرایوں اور عالموں میں جو دُنیا کا نظام قائم رکھنے کے لئے زمین آسمان کی چیزیں کام کر رہی ہیں۔ یہ وہ نہیں کام کرتیں بلکہ خدائی طاقت ان کے نیچے کام کر رہی ہے جیسا کہ دوسری آیت میں بھی فرمایا صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ یعنی دُنیا ایک شیش محل ہے جس کے شیشوں کے نیچے زور سے پانی چل رہا ہے اور نادان سمجھتا ہے کہ یہی شیشے پانی ہیں حالانکہ پانی ان کے نیچے ہے۔

(نسیم دعوت صفحہ ۵۸-۵۹)

قرآن شریف میں ایک شاہزادی بلقیس نام کا ایک عجیب قصّہ لکھا ہے جو سُورج کی پُوجا کرتی تھی شائد وید کی پَیرو تھی حضرت سلیمان نے اُس کو بُلایا اور اُس کے آنے سے پہلے ایسا محل تیار کیا جس کا فرش شیشہ کا تھا اور شیشہ کے نیچے پانی بہہ رہا تھا جب بلقیس نے حضرت سلیمانؑ کے پاس جانے کا قصد کیا تو اس نے اس شیشہ کو پانی سمجھا اور اپنا پاجامہ پنڈلی سے اُوپر اُٹھا لیا حضرت سلیمان نے کہا کہ دھوکہ مت کھا یہ پانی نہیں ہے بلکہ یہ شیشہ ہے پانی اس کے نیچے ہے تب وہ عقلمند عورت سمجھ گئی کہ اس پیرایہ میں میرے مذہب کی غلطی انہوں نے ظاہر کی ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ سُورج اور چاند اور دوسرے روشن

اجرام شیشہ کی مانند ہیں اور ایک پوشیدہ طاقت ہے جو ان کے پردہ کے نیچے کام کر رہی ہے اور وہی خدا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں اِس جگہ فرمایا صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنۡ قَوَارِیۡرَ یعنی یہ ایک محل ہے شیشوں سے بنایا گیا۔ سو دُنیا کو خدا نے شیش محل سے مثال دی ہے جاہل ان شیشوں کی پرستش کرتے ہیں اور دانا اس پوشیدہ طاقت کے پرستار ہیں مگر وید نے اس شیش محل کی طرف کچھ اشارہ نہیں کیا اور ان ظاہری شیشوں کو پرمیشور سمجھ لیا اور پوشیدہ طاقت سے بے خبر رہا۔ (چشمہ معرفت ص۲۷۷)

ہمارا تو یہ ایمان ہے اور مذہب ہے کہ ایک فوق الفوق قادر ہستی ہے جو ہم پر کام کرتی ہے جدھر چاہتی ہے لے جاتی ہے وہ خالق ہے ہم مخلوق ہیں۔ وہ حیّ قیّوم ہے اور ہم ایک عاجز مخلوق قرآن شریف میں حضرت سلیمانؑ اور بلقیس کا ذکر ہے کہ اس نے پانی کو دیکھ کر اپنی پنڈلی سے کپڑا اُٹھایا۔ اس میں بھی یہی تعلیم ہے جو حضرت سلیمانؑ نے اس عورت کو دی تھی وہ دراصل آفتاب پرستی کرتی تھی۔ اس کو اس طریق سے انہوں نے سمجھایا کہ جیسے یہ پانی شیشہ کے اندر چل رہا ہے دراصل اوپر شیشہ ہی ہے۔ اسی طرح پر آفتاب کو روشنی اور ضیاء بخشنے والی ایک اور زبردست طاقت ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۸ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

اِس جگہ ایک قرآنی نکتہ کو جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکہ سبا کو اُس کی آفتاب پرستی کی غلطی پر آگاہ کرنے کے لئے صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ کی شکل میں دکھایا یاد رکھنے کے قابل ہے چنانچہ قرآن شریف میں لکھا ہے اِنَّهٗ صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنۡ قَوَارِیۡرَ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ اجرام علوی واجسام سفلی میں نظر آتا ہے جن میں سے بعض کی جاہل لوگ پرستش بھی کرتے ہیں تمام یہ چیزیں ہیچ اور معدوم محض ہیں پرستش کے لائق نہیں۔ اور جو کچھ بظاہر ان میں طاقتیں نظر آتی ہیں اُن کی طرف منسوب کرنا ایک دھوکہ ہے بلکہ ایک ہی طاقتِ عظمیٰ ان سب کے نیچے پوشیدہ ہے کہ جو درحقیقت ان سے الگ ہے اور وہی یہ سب کرشمے دکھلا رہی ہے جیسا اُس صَرۡحٌ مُّمَرَّدٌ کے نیچے پانی تھا اور اُس صرح کا عین نہیں تھا بلکہ اس سے الگ تھا مگر بلقیس کی نظر سقیم میں عین دکھائی دیا تھا تب ہی اُس نے اُن شیشوں کو بہتے پانی کے دریا کی طرح سمجھا اور اپنی پنڈلیوں پر سے پاجامہ اُٹھا لیا۔ یہ اُس کو ایسا ہی دھوکا لگا تھا جیسا اُس کو آفتاب پرستی میں لگا تھا کہ وہ طاقتِ عظمیٰ اُس کو نظر نہ آئی کہ جو در پردہ آفتاب سے عجائب کام ظہور میں لاتی اور اُس سے الگ تھی۔ اسی طرح دُنیا ایک ایسے شیش محل کی طرح ہے جس کی زمین کا فرش نہایت مصفّٰی شیشوں سے کیا گیا ہے اور پھر اُن شیشوں کے نیچے پانی چھوڑا گیا ہے جو نہایت تیزی سے چل رہا ہے۔ اب ہر ایک نظر جو شیشوں پر پڑتی ہے وہ اپنی غلطی سے اُن شیشوں کو بھی پانی سمجھ لیتی ہے

اور پھر انسان ان شیشوں پر چلنے سے ایسا ڈرتا ہے جیسے پانی سے۔ حالانکہ وہ درحقیقت شیشے ہیں۔ سو یہ نکتہ کہ جو تمام عالم کے انکشاف حقیقت کے لئے عمدہ ترین اصول ہے اہل اللہ سے بہت مناسبت رکھتا ہے اور جس طرح اللہ جلّ شانہٗ نے بلقیس کی نسبت فرمایا ہے فَلَمَّا رَاَتْهُ حَسِبَتْهُ لُجَّةً وَّ كَشَفَتْ عَنْ سَاقَيْهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ یعنی بلقیس نے اس شیشی محل کو جس کا فرش مصفّٰی اور شفاف شیشے تھے اور نیچے ان کے پانی بہتا تھا اپنی غلط فہمی سے بہتا پانی خیال کیا۔ ایسا ہی اہل اللہ کی نسبت یہ لوگ دھوکا کھاجاتے ہیں یعنی وہ پانی جو ان کی شیشوں کے فرش کے نیچے یعنی ان کی فانی حالت کے تحت منجانب اللہ رہتا ہے اور کبھی اپنی سختی اور کبھی اپنی نرمی دکھاتا ہے اور کبھی تلخ اور شور اور بے مزہ کی صورت میں اور کبھی شیریں اور خوشگوار پانی کی شکل میں نظر آتا ہے اور کبھی طوفان کی طرح قوّتِ غضبی کے زور سے بہتا ہے اور کبھی نہایت آہستگی اختیار کرتا ہے۔ اس پانی کو جاہل خیال کرتا ہے کہ یہ نفسانی جذبات کا پانی ہے اور اہل اللہ کی شانِ عظیم سے منکر ہوجاتا ہے یا شک میں پڑ جاتا ہے حالانکہ ان کا نفس بہت سے صیقلوں کے شیشہ کی صفت پر آگیا ہے اور جو کچھ ایک جاہل کو پانی اور پانی کا زور نظر آتا ہے وہ الٰہی چشمہ ہے جو اس شیشہ کے نیچے بہتا ہے۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۵)

النمل ۴۹ تا ۵۴

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلَا يُصْلِحُوْنَ ۝ قَالُوْا تَقَاسَمُوْا بِاللّٰهِ لَنُبَيِّتَنَّهٗ وَاَهْلَهٗ ثُمَّ لَنَقُوْلَنَّ لِوَلِيِّهٖ مَا شَهِدْنَا مَهْلِكَ اَهْلِهٖ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ۝ وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ ۙ اَنَّا دَمَّرْنٰهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةًۢ بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَاَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا

يَتَّقُوْنَ○

اور شہر میں نو شخص ایسے تھے جن کا پیشہ ہی فساد تھا اور اصلاح کے روادار نہ تھے انہوں نے باہم قسمیں کھائیں کہ رات کو پوشیدہ طور پر شبخون مار کر اس شخص کو اور اس کے گھر والوں کو قتل کر دو اور پھر ہم اس کے وارث کو جو خون کا دعویدار ہو گا یہ کہیں گے کہ ہم تو ان لوگوں کو قتل کرنے کے وقت اس موقع پر حاضر نہ تھے اور ہم سچ سچ کہتے ہیں یعنی یہ بہانہ بنائیں گے کہ ہم تو قتل کرنے کے وقت فلاں فلاں جگہ گئے ہوئے تھے جیسا کہ اب بھی مجرم لوگ ایسے ہی بہانے بنایا کرتے ہیں تا مقدمہ نہ چلے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تو دیکھ کہ اُن کے مکر کا انجام کیا ہوا۔ ہم نے ان کو اور ان کے تمام قوم کو ہلاک کر دیا اور یہ گھر جو ویران پڑے ہوئے ہیں یہ انہیں کے گھر ہیں ہم نے اس لئے اُن کو یہ سزا دی کہ یہ ہمارے برگزیدہ بندوں پر ظلم کرتے تھے اور باز نہیں آتے تھے۔ پس ہمارا یہ عذاب اُن لوگوں کے لئے ایک نشان ہے جو جانتے ہیں اور ہم نے ان ظالم لوگوں کے ہاتھ سے ان ایمانداروں کو نجات دے دی جو متقی اور پرہیزگار تھے۔ سو خدا کا مکر یہ تھا کہ جب شریر آدمی شرارت میں بڑھتے گئے تو ایک مدت تک خدا نے اپنے ارادۂ عذاب کو مخفی رکھا اور جب ان کی شرارت نہایت درجہ تک پہنچ گئی بلکہ انہوں نے ایک بڑا مکر کر کے خدا کے برگزیدوں کو قتل کرنا چاہا تب وہ پوشیدہ عذاب خدا نے اُن پر ڈال دیا جس کی ان کو کچھ بھی خبر نہ تھی اور ان کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ اس طرح ہم نیست و نابود کئے جائیں گے۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خدا کے برگزیدہ بندوں کو ستانا اچھا نہیں آخر خدا پکڑتا ہے۔ کچھ مدت تک تو خدا اپنے ارادہ کو مخفی رکھتا ہے اور وہی اس کا ایک مکر ہے مگر جب شریر آدمی اپنی شرارت کو انتہاء تک پہنچا دیتا ہے تب خدا اپنے ارادہ کو ظاہر کر دیتا ہے پس نہایت بدقسمت وہ لوگ ہوتے ہیں جو خدا کے برگزیدہ بندوں کے مقابل پر محض شرارت کے جوش سے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اُن کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں آخر خدا ان کو ہی ہلاک کرتا ہے۔ اس کے بارہ میں رومی صاحب کا یہ شعر نہایت عمدہ ہے

تا دلِ مردِ خدا نامد بدرد ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد

(چشمہ معرفت صفحہ ۱۹۳، ۱۹۴)

وَمَكَرُوْا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ

یعنی کافروں نے اِسلام کے مٹانے کے لئے ایک مکر کیا اور ہم نے بھی ایک مکر کیا یعنی یہ کہ ان کو اپنی مکاریوں میں بڑھنے دیا تا وہ ایسے درجہ شرارت پر پہنچ جائیں کہ جو سُنّت اللہ کے موافق عذاب نازل ہونے کا

درجہ ہے۔ اس مقام پر شاہ عبد القادر صاحب کی طرف سے موضح القرآن میں سے ایک نوٹ ہے جس کی عبارت ہم بلفظہٖ درج کرتے ہیں اور وہ یہ ہے یعنی ان کے ہلاک ہونے کے اسباب پورے ہوتے تھے۔ جب تک شرارت حد کو نہ پہنچی تب تک ہلاک نہیں ہوئے۔ تمّ عبارتہ دیکھو صفحہ ۵۲۸ قرآن مطبع فتح الکریم۔ ان تمام آیات سے ثابت ہوا کہ عذابِ الٰہی جو دُنیا میں نازل ہوتا ہے وہ تبھی کسی پر نازل ہوتا ہے کہ جب وہ شرارت اور ظلم اور تکبّر اور علوّ اور غلوّ میں نہایت کو پہنچ جاتا ہے یہ نہیں کہ ایک کافر خوف سے مَرا جاتا ہے اور پھر بھی عذابِ الٰہی کے لئے اس پر صاعقہ پڑے اور ایک مشرک اندیشۂ عذاب سے جان بلب ہوا اور پھر بھی اس پر پتھر برسیں۔ خداوند تعالیٰ نہایت درجہ کا رحیم اور علیم ہے۔ عذاب کے طور پر صرف اسی کو اس دُنیا میں پکڑتا ہے جو اپنے ہاتھ سے عذاب کا سامان تیار کرے۔ (انوارِ اسلام صفحہ ۱۴، ۱۵)

۶۳ اَمَّنۡ یُّجِیۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَ یَکۡشِفُ السُّوۡٓءَ وَ یَجۡعَلُکُمۡ خُلَفَآءَ الۡاَرۡضِ ؕ ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ ؕ قَلِیۡلًا مَّا تَذَکَّرُوۡنَ ؕ

خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں ایک جگہ پر اپنی شناخت کی یہ علامت ٹھہرائی ہے کہ تمہارا خدا وہ خدا ہے جو بیقراروں کی دعا سُنتا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے اَمَّنۡ یُّجِیۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاہُ پھر جب کہ خدا تعالیٰ نے دعا کی قبولیت کو اپنی ہستی کی علامت ٹھہرائی ہے تو پھر کس طرح کوئی عقل اور حیا والا گمان کر سکتا ہے کہ دعا کرنے پر کوئی آثار صریحہ اجابت کے مترتب نہیں ہوتے اور محض ایک رسمی امر ہے جس میں کچھ بھی رُوحانیت نہیں میرے خیال میں ہے کہ ایسی بے ادبی کوئی سچّے ایمان والا ہرگز نہیں کرے گا جبکہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے کہ جس طرح زمین و آسمان کی صفت پر غور کرنے سے سچّا خدا پہچانا جاتا ہے اسی طرح دعا کی قبولیت کو دیکھنے سے خدا تعالیٰ پر یقین آتا ہے۔ (ایّام الصلح صفحہ ۳)

کلامِ الٰہی میں لفظ مضطرّ سے وہ ضرر یافتہ مراد ہیں جو محض ابتلاء کے طور پر ضرر یافتہ ہوں نہ سزا کے طور پر۔ لیکن جو لوگ سزا کے طور پر کسی ضرر کے تختۂ مشق ہوں وہ اِس آیت کے مصداق نہیں ہیں ورنہ لازم آتا ہے کہ قومِ نوحؑ اور قومِ لُوط اور قومِ فرعون وغیرہ کی دعائیں اس اضطرار کے وقت میں قبول کی جاتیں مگر ایسا نہیں ہوا اور خدا کے ہاتھ نے اُن قوموں کو ہلاک کر دیا۔ (دافع البلاء صفحہ ۱۱)

دوسری شرط قبولیّتِ دُعا کے واسطے یہ ہے کہ جس کے واسطے انسان دعا کرتا ہو اس کے لئے دِل میں درد ہو اَمَّنۡ یُّجِیۡبُ الۡمُضۡطَرَّ اِذَا دَعَاہُ۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۳۲ مورخہ ۳۱ اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۳)

یاد رکھو کہ خدا تعالیٰ بڑا بے نیاز ہے جب تک کثرت سے اور بار بار اضطراب سے دعا نہیں کی جاتی وہ پرواہ نہیں کرتا۔ دیکھو کسی کی بیوی یا بچہ بیمار ہو یا کسی پر سخت مقدمہ آجاوے تو ان باتوں کے واسطے اس کو کیسا اِضطراب ہوتا ہے۔ پس دعا میں بھی جب تک سچی تڑپ اور حالتِ اضطراب پیدا نہ ہو تب تک وہ بالکل بے اثر اور بیہودہ کام ہے۔ قبولیت کے واسطے اِضطراب شرط ہے جیسا کہ فرمایا اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ۔ (الحکم جلد ۱۲ ع۱۶ مورخہ ۲ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۝

خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ نیکوں کو بچائے اور بدوں کو ہلاک کرے۔ اگر وقت اور تاریخ بتلائی جائے تو ہر ایک شریر سے شریر اپنے واسطے بچاؤ کا سامان کر سکتا ہے۔ اگر وقت کے نہ بتلانے سے پیشگوئی قابلِ اعتراض ہو جاتی ہے تو پھر تو قرآن شریف کی پیشگوئیوں کا بھی یہی حال ہے۔ وہاں بھی اس قسم کے لوگوں نے اِعتراض کیا تھا کہ مَتٰی ھٰذَا الْوَعْدُ یہ وعدہ کب پورا ہو گا ہمیں وقت اور تاریخ بتلاؤ مگر بات یہ ہے کہ وعید کی پیشگوئیوں میں تعیّن نہیں ہوتا ورنہ کافر بھی بھاگ کر بچ جائے۔

(بدر جلد ۱ ع۱۰ صفحہ ۲ مورخہ ۸ جون ۱۹۰۵ء)

اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِیْنَ۝

بخاری کے صفحہ ۱۸۳ میں یہ حدیث جو لکھی ہے قَالَ ھَلْ وَجَدْتُّمْ مَا وَعَدَکُمْ رَبُّکُمْ حَقًّا اِس حدیث کو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے اس کے سیدھے اور حقیقی معنی کے رُو سے قبول نہیں کیا اس عذر سے کہ یہ قرآن کریم کے معارض ہے اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی اور ابنِ عمر کی حدیث کو صرف اِسی وجہ سے رَدّ کر دیا ہے کہ ایسے معنے معارض قرآن ہیں۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۹۲۷)

وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْھِمْ اَخْرَجْنَا لَھُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُکَلِّمُھُمْ اَنَّ النَّاسَ کَانُوْا بِاٰیٰتِنَا لَا یُوْقِنُوْنَ۝

دابۃ الارض سے مراد کوئی لایعقل جانور نہیں بلکہ بقول حضرت علی رضی اللہ عنہ آدمی کا نام ہی دابۃ الارض ہے اور اِس جگہ لفظ دابۃ الارض سے ایک ایسا طائفہ انسانوں کا مراد ہے جو آسمانی روح اپنے اندر نہیں رکھتے لیکن زمینی علوم و فنون کے ذریعہ سے منکرینِ اسلام کو لاجواب کرتے ہیں اور اپنا علمِ کلام اور طریقِ مناظرہ تائیدِ دین کی راہ میں خرچ کرکے بجان و دل خدمتِ شریعتِ غرّا بجالاتے ہیں۔ سو وہ چونکہ درحقیقت زمینی ہیں آسمانی نہیں اور آسمانی رُوح کامل طور پر اپنے اندر نہیں رکھتے اِس لئے دابۃ الارض کہلاتے ہیں اور چونکہ کامل تزکیہ نہیں رکھتے اور نہ کامل وفاداری اِس لئے چہرہ ان کا انسانوں کا ہے مگر بعض اعضاء اُن کے بعض دوسرے حیوانات سے مشابہہ ہیں۔ اسی طرف اللہ جلّ شانہٗ اشارہ فرماتا ہے وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ یعنی جب ایسے دن آئیں گے جو کفار پر عذاب نازل ہو اور ان کا وقتِ مقدر قریب آجائے گا تو ہم ایک گروہ دابۃ الارض کا زمین سے نکالیں گے وہ گروہ متکلمین کا ہوگا جو اسلام کی حمایت میں تمام ادیانِ باطلہ پر حملہ کرے گا یعنی وہ علماء ظاہر ہوں گے جن کو علمِ کلام اور فلسفہ میں یدِطولیٰ ہوگا۔ وہ جا بجا اسلام کی حمایت میں کھڑے ہوجائیں گے اور اسلام کی سچائیوں کو استدلالی طور پر مشارق مغارب میں پھیلائیں گے اور اس جگہ اَخْرَجْنَا کا لفظ اِس وجہ سے اختیار کیا کہ آخری زمانہ میں اُن کا خروج ہوگا نہ حدوث یعنی مخفی طور پر یا کم مقدار کے طور پر تو پہلے ہی سے تھوڑے بہت ہر ایک زمانہ میں وہ پائے جائیں گے لیکن آخری زمانہ میں بکثرت اور نیز اپنے کمال لائق کے ساتھ پیدا ہوں گے اور حمایتِ اسلام میں جا بجا واعظین کے منصب پر کھڑے ہو جائیں گے اور شمار میں بہت بڑھ جائیں گے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۵۰۲ تا ۵۰۴)

آثار القیامہ میں لکھا ہے کہ حضرت علی کرّم اللہ وجہہٗ سے پُوچھا گیا کہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ دابۃ الارض آپ ہی ہیں اور آپ نے جواب دیا کہ دابۃ الارض میں تو کچھ چارپایوں اور کچھ پرندوں کی بھی مشابہت ہوگی مجھ میں وہ کہاں ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ دابۃ الارض اسم جنس ہے جس سے ایک طائفہ مراد ہے۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۵۰۲ حاشیہ)

دابۃ الارض یعنی وہ علماء و واعظین جو آسمانی قوت اپنے اندر نہیں رکھتے ابتداء سے چلے آتے ہیں لیکن قرآن کا مطلب یہ ہے کہ آخری زمانہ میں ان کی حد سے زیادہ کثرت ہوگی اور اُن کے خروج سے مراد وہی ان کی کثرت ہے۔

اور یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جیسی ان چیزوں کے بارے میں جو آسمانی قوت اپنے اندر نہیں رکھتیں اور آخری زمانہ میں پورے جوش اور طاقت کے ساتھ ظہور کریں گی خروج کا لفظ استعمال ہوا

ہے۔ ایسا ہی اُس شخص کے بارے میں جو حدیثوں میں لکھا ہے کہ آسمانی وحی اور قوت کے ساتھ ظہور کریگا نزول کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ سو ان دونوں لفظوں خروج اور نزول میں درحقیقت ایک ہی امر مدّنظر رکھا گیا ہے۔ یعنی اِس بات کا سمجھانا منظور ہے کہ یہ ساری چیزیں جو آخری زمانہ میں ظاہر ہونے والی ہیں باعتبار اپنی قوتِ ظہور کے خروج اور نزول کی صفت سے متّصف کی گئی ہیں جو آسمانی قوت کے ساتھ آنے والا تھا اس کو نزول کے لفظ سے یاد کیا گیا اور جو زمینی قوت کے ساتھ نکلنے والا تھا اس کو خروج کے لفظ کے ساتھ پکارا گیا تا نزول کے لفظ کے ساتھ آنے والے کی ایک عظمت سمجھی جائے اور خروج کے لفظ سے ایک نخوت اور حقارت ثابت ہو اور نیز یہ بھی معلوم ہو کہ نازل خارج پر غالب ہے۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۵۱۰، ۵۱۱)

زمینی لوگ دابۃ الارض ہیں مسیح السماء نہیں ہیں مسیح السماء آسمان سے اُترتا ہے اور اس کا خیال آسمان کو مسخ کرکے آتا ہے اور رُوح القدس اُس پر نازل ہوتا ہے اس لئے وہ آسمانی روشنی ساتھ رکھتا ہے لیکن دابۃ الارض کے ساتھ زمین کی غلاظتیں ہوتی ہیں اور نیز وہ انسان کی پوری شکل نہیں رکھتا بلکہ اس کے بعض اجزاء مسخ شدہ بھی ہوتے ہیں۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۸۶۸، ۸۶۹)

احادیث میں دابۃ الارض کو بھی ایک خاص نام رکھ کر بیان کیا ہے لیکن احادیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی استعمال کی رُو سے عام ہے اور دابۃ الارض کو صحیح مسلم میں ایسے پیرایہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ ایک طرف تو اس کو دجّال کی جساسہ ٹھہرا دیا گیا ہے اور اُسی کی رفیق اور اسی جزیرہ میں رہنے والی جہاں وہ ہے اور ایک طرف حرم مکّہ معظمہ میں صفا کے نیچے اس کو جگہ دے رکھی ہے گویا وہ اس ارضِ مقدّس کے نیچے ہے نہ دجّال کے پاس۔ اور بیان کیا گیا ہے کہ اُسی میں سے اُس کا خروج ہوگا۔ اِس استعارہ سے یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ دابۃ الارض درحقیقت اسم جسم[1] ایسے علماء کے لئے ہے جو ذوجہتین واقع ہیں۔ ایک تعلق اُن کا دین اور حق سے ہے اور ایک تعلق ان کا دُنیا اور دجّالیت سے۔ اور آخری زمانہ میں ایسے مولویوں اور ملّاؤں کا پیدا ہونا کئی جگہ بخاری میں لکھا ہے چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ لوگ حدیث خیر البریّہ پڑھیں گے اور قرآن کی بھی تلاوت کرتے ہوں گے لیکن قرآن اُن کے حلق کے نیچے نہیں اُترے گا سو یہ وہی زمانہ ہے۔ انہیں لوگوں کی ملاقات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈرایا ہے اور فرمایا ہے فَاعْتَزِلْ تِلْكَ الْفِرَقَ كُلَّهَا وَلَوْ اَنْ تَعَضَّ بِاَصْلِ شَجَرَةٍ حَتّٰى يُدْرِكَكَ الْمَوْتُ وَاَنْتَ عَلٰى ذٰلِكَ۔ صفحہ ۵۰۹ بخاری۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۹۰۳، ۹۰۴)

مَیں نے ایک جانور دیکھا جس کا قد ہاتھی کے قد کے برابر تھا مگر مُنہ آدمی کے مُنہ سے ملتا تھا اور

[1] نقل مطابق اصل "اسم جنس پڑھا جائے" ناشر

بعض اعضاء دوسرے جانوروں سے مشابہ تھے اور میں نے دیکھا کہ وہ یوں ہی قدرت کے ہاتھ سے پیدا ہو گیا اور میں ایک ایسی جگہ پر بیٹھا ہوں جہاں چاروں طرف بَن ہیں جن میں بَیل، گدھے، گھوڑے، کُتّے، سؤر، بھیڑئیے، اُونٹ وغیرہ ہر ایک قسم کے موجود ہیں اور میرے دل میں ڈالا گیا کہ یہ سب انسان ہیں جو بدعملوں سے ان صورتوں میں ہیں اور پھر میں نے دیکھا کہ وہ ہاتھی کی ضخامت کا جانور جو مختلف شکلوں کا مجموعہ ہے جو محض قدرت سے زمین میں سے پیدا ہو گیا ہے وہ میرے پاس آبیٹھا ہے اور قطب کی طرف اس کا مونہہ ہے۔ خاموش صورت ہے آنکھوں میں بہت حیا ہے اور بار بار چند منٹ کے بعد اُن بَنوں میں سے کسی بَن کی طرف دوڑتا ہے اور جب بَن میں داخل ہوتا ہے تو اس کے داخل ہونے کے ساتھ ہی شور قیامت اُٹھتا ہے اور ان جانوروں کو کھانا شروع کرتا ہے اور ہڈیوں کے چابنے کی آواز آتی ہے تب وہ فراغت کر کے پھر میرے پاس آبیٹھتا ہے اور شاید دس منٹ کے قریب بیٹھا رہتا ہے اور پھر دوسرے بَن کی طرف جاتا ہے اور وہی صورت پیش آتی ہے جو پہلے آئی تھی اور پھر میرے پاس آبیٹھتا ہے۔ آنکھیں اس کی بہت لمبی ہیں اور میں اس کو ہر ایک دفعہ جو میرے پاس آتا ہے خوب نظر لگا کر دیکھتا ہوں اور وہ اپنے چہرہ کے اندازہ سے مجھے یہ بتلاتا ہے کہ میرا اس میں کیا قصور ہے میں مامور ہوں اور نہایت شریف اور پرہیزگار جانور معلوم ہوتا ہے اور کچھ اپنی طرف سے نہیں کرتا بلکہ وہی کرتا ہے جو اس کو حکم ہوتا ہے تب میرے دل میں ڈالا گیا کہ یہی طاعون ہے اور یہی وہ دابۃ الارض ہے جس کی نسبت قرآن شریف میں وعدہ تھا کہ آخری زمانہ میں ہم اس کو نکالیں گے اور وہ لوگوں کو اس لئے کاٹے گا کہ وہ ہمارے نشانوں پر ایمان نہیں لاتے تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ اور جب مسیح موعود کے بھیجنے سے خدا کی حجت ان پر پُوری ہو جائے گی تو ہم زمین میں سے ایک جانور نکال کر کھڑا کریں گے وہ لوگوں کو کاٹے گا اور زخمی کرے گا اس لئے کہ لوگ خدا کے نشانوں پر ایمان نہیں لائے تھے۔ اور پھر آگے فرمایا ہے وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ يُّكَذِّبُ بِاٰيٰتِنَا فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ۔ حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْ قَالَ اَكَذَّبْتُمْ بِاٰيٰتِيْ وَلَمْ تُحِيْطُوْا بِهَا عِلْمًا اَمَّا ذَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ بِمَا ظَلَمُوْا فَهُمْ لَا يَنْطِقُوْنَ۔ ترجمہ۔ اُس دن ہم ہر ایک اُمّت میں سے اُس گروہ کو جمع کریں گے جو ہمارے نشانوں کو جھٹلاتے تھے اور ان کو ہم جُدا جُدا جماعتیں بنا دیں گے یہاں تک کہ جب وہ عدالت میں حاضر کئے جائیں گے تو خدائے عزّوجلّ ان کو کہے گا کہ کیا تم نے میرے نشانوں کی بغیر تحقیق کے تکذیب کی۔ یہ تم نے کیا کیا اور ان پر بوجہ اُن کے ظالم ہونے کے حجت پُوری ہو جائے گی اور وہ بول نہ سکیں گے۔

اب خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہی دابۃ الارض جو ان آیات میں مذکور ہے جس کا مسیح موعود کے زمانہ

میں ظاہر ہونا ابتداء سے مقرر ہے یہی وہ مختلف صورتوں کا جانور ہے جو مجھے عالمِ کشف میں نظر آیا اور دل میں ڈالا گیا کہ یہ طاعون کا کیڑا ہے اور خدا تعالیٰ نے اس کا نام دابۃ الارض رکھا کیونکہ زمین کے کیڑوں میں سے ہی یہ بیماری پیدا ہوتی ہے اِسی لئے پہلے چوہوں پر اس کا اثر ہوتا ہے اور مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے اور جیسا کہ انسان کو ایسا ہی ہر ایک جانور کو یہ بیماری ہو سکتی ہے اِسی لئے کشفی عالم میں اس کی مختلف شکلیں نظر آئیں۔ اور اس بیان پر کہ دابۃ الارض درحقیقت مادہ طاعون کا نام ہے جس سے طاعون پیدا ہوتی ہے مفصلہ ذیل قرائن اور دلائل ہیں:۔

(۱) اوّل یہ کہ دابۃ الارض کے ساتھ عذاب کا ذکر ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَإِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ أَخْرَجْنَا لَهُمْ دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ یعنی جب ان پر آسمانی نشانوں اور عقلی دلائل کے ساتھ حجت پوری ہو جائے گی تب دابۃ الارض زمین سے نکالا جائے گا۔ اب ظاہر ہے کہ دابۃ الارض عذاب کے موقع پر زمین سے نکالا جائے گا نہ یہ کہ یُوں ہی بیہودہ طور پر ظاہر ہوگا جس کا نہ کچھ نفع نہ نقصان۔ اور اگر کہو کہ طاعون تو ایک مرض ہے مگر دابۃ الارض لغوی معنوں کے رُو سے ایک کیڑا ہونا چاہیئے جو زمین میں سے نکلے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حال کی تحقیقات سے یہی ثابت ہوا ہے کہ طاعون کو پیدا کرنے والا وہی ایک کیڑا ہے جو زمین میں سے نکلتا ہے بلکہ ٹیکہ لگانے کے لئے وہی کیڑے جمع کئے جاتے ہیں اور اُن کا عرق نکالا جاتا ہے اور خوردبین سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی شکل یُوں ہے (۸) یعنی بہ شکل دو نقطہ۔ گویا آسمان پر بھی نشان کسوف وخسوف دو کے رنگ میں ظاہر ہوا اور ایسا ہی زمین میں۔

دوسرا قرینہ یہ ہے کہ قرآن شریف کے بعض مقامات بعض کی تفسیر ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن شریف میں جہاں کہیں یہ مرکب لفظ آیا ہے اس سے مراد کیڑا لیا گیا ہے۔ مثلاً یہ آیت فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلَىٰ مَوْتِهِ إِلَّا دَابَّةُ الْأَرْضِ تَأْكُلُ مِنسَأَتَهُ یعنی ہم نے سلیمان پر جب موت کا حکم جاری کیا تو جنّات کو کسی نے اُن کے مرنے کا پتہ نہ دیا بلکہ گھُن کے کیڑے نے کہ جو سلیمان کے عصا کو کھاتا تھا (سورۃ السبا الجزو ۲۲) اب دیکھو اِس جگہ بھی ایک کیڑے کا نام دابۃ الارض رکھا گیا۔ بس اس سے زیادہ دابۃ الارض کے اصلی معنوں کی دریافت کے لئے اور کیا شہادت ہوگی کہ خود قرآن شریف نے اپنے دوسرے مقام میں دابۃ الارض کے معنے کیڑا کیا ہے۔ سو قرآن کے برخلاف اس کے معنی کرنا ہی تحریف اور اِلحاد اور دجل ہے۔

(۳) تیسرا قرینہ یہ ہے کہ آیت میں صریح معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے نشانوں کی تکذیب کے وقت میں

کوئی امام الوقت موجود ہونا چاہیئے کیونکہ وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ کا فقرہ یہی ہے کہ اتمام حجت کے بعد یہ عذاب ہوا اور یہ تو متفق علیہ عقیدہ ہے کہ خروج دابۃ الارض آخری زمانہ میں ہوگا جبکہ مسیح موعود ظاہر ہوگا تاکہ خدا کی حجت دنیا پر پوری کرے پس ایک منصف کو یہ بات جلد تر سمجھ آسکتی ہے کہ جبکہ ایک شخص موجود ہے جو مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور آسمان اور زمین میں بہت سے نشان اُس کے ظاہر ہو چکے ہیں تو اب بلاشبہ دابۃ الارض یہی طاعون ہے جس کا مسیح کے زمانہ میں ظاہر ہونا ضروری تھا اور چونکہ یاجوج ماجوج موجود ہے اور مِنْ كُلِّ حَدَبٍ يَنْسِلُوْنَ کی پیشگوئی تمام دنیا میں پوری ہو رہی ہے اور دجّالی فتنے بھی انتہا تک پہنچ گئے ہیں اور پیشگوئی يُتْرَكُ الْقِلَاصُ فَلَا يُسْعٰى عَلَيْهَا بھی بخوبی ظاہر ہو چکی ہے اور شراب اور زنا اور جھوٹ کی بھی کثرت ہو گئی ہے اور مسلمانوں میں یہودیت کی فطرت بھی جوش مار رہی ہے تو صرف ایک بات باقی تھی جو دابۃ الارض زمین میں سے نکلے سو وہ بھی نکل آیا۔ اِس بات پر جھگڑنا جہالت ہے کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاں جگہ پھٹے گی اور دابۃ الارض وہاں سے سر نکالے گا پھر تمام دنیا میں چکر مارے گا کیونکہ اکثر پیشگوئیوں پر استعارات کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ جب ایک بات کی حقیقت کھل جائے تو ایسے اوہامِ باطلہ کے ساتھ حقیقت کو چھوڑنا کمال جہالت ہے۔ اِسی عادت سے بدبخت یہودی قبولِ حق سے محروم رہ گئے۔

(۴) قرینہ چہارم دابۃ الارض کے طاعون ہونے پر یہ ہے کہ سورۃ فاتحہ میں ایک رنگ میں یہ پیشگوئی کی گئی ہے کہ کسی وقت بعض مسلمان بھی وہ یہودی بن جائیں گے جو حضرت عیسٰی علیہ السلام کے وقت میں تھے جو آخر کار طاعون وغیرہ بلاؤں سے ہلاک کئے گئے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ کی قدیم سے یہ عادت ہے کہ جب ایک قوم کو کسی فعل سے منع کرتا ہے تو ضرور اس کی تقدیر میں یہ ہوتا ہے کہ بعض ان میں سے اس فعل کے ضرور مرتکب ہوں گے ..... چونکہ خدا تعالیٰ جانتا تھا کہ آخری زمانہ میں اسی اُمّت میں سے مسیح موعود آئے گا اور بعض یہودی صفت مسلمانوں میں سے اس کو کافر قرار دیں گے اور قتل کے درپے ہوں گے اور اس کی سخت توہین وتحقیر کریں گے اور نیز جانتا تھا کہ اِس زمانہ میں تثلیث کا مذہب ترقی پر ہوگا اور بہت سے بدقسمت انسان عیسائی ہو جائیں گے اِس لئے اس نے مسلمانوں کو یہ دُعا (غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ) سکھلائی۔ اور اس دعا میں مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ کا جو لفظ ہے وہ بلند آواز سے کہہ رہا ہے کہ وہ لوگ جو اسلامی مسیح کی مخالفت کریں گے وہ بھی خدا تعالیٰ کی نظر میں مغضوب علیہم ہوں گے جیسا کہ اسرائیلی مسیح کے مخالف مغضوب علیہم تھے اور حضرت مسیح خود انجیل میں اشارہ کرتے ہیں کہ میرے منکروں پر مری یعنی طاعون پڑے گی اور بعد اس کے دوسرے عذاب بھی نازل ہوں گے اِس لئے ضروری تھا

کہ مسیح اسلامی کی تائید میں بھی یہ باتیں ظہور میں آئیں۔ اور بھی دلائل اِس بات پر بہت ہیں کہ یہی دابۃ الارض جس کا قرآن شریف میں ذکر ہے طاعون ہے اور بلاشبہ یہ زمینی بیماری ہے اور زمین میں سے ہی نکلتی ہے۔ (نزول المسیح صفحہ ۳۷ تا ۴۲)

یہ جو اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا کہ وہ دابۃ الارض یعنی طاعون کا کیڑا زمین میں سے نکلے گا اس میں یہی بھید ہے کہ تا وہ اِس بات کی طرف اشارہ کرے کہ وہ اس وقت نکلے گا کہ جب مسلمان اور ان کے علماء زمین کی طرف جھک کر خود دابۃ الارض بن جائیں گے۔ ہم اپنی بعض کتابوں میں یہ لکھ آئے ہیں کہ اس زمانہ کے ایسے مولوی اور سجادہ نشین جو متقی نہیں ہیں یہ دابۃ الارض ہیں اور اب ہم نے اِس رسالہ میں یہ لکھا ہے کہ دابۃ الارض طاعون کا کیڑا ہے ان دونوں بیانوں میں کوئی شخص تناقض نہ سمجھے۔ قرآن شریف ذوالمعارف ہے اور کئی وجوہ سے اس کے معنے ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد نہیں اور جس طرح قرآن شریف یک دفعہ نہیں اُترا اسی طرح اس کے معارف بھی دلوں پر یک دفعہ نہیں اُترتے۔ اِسی بناء پر محققین کا یہی مذہب ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معارف بھی یک دفعہ آپ کو نہیں ملے بلکہ تدریجی طور پر آپ نے علمی ترقیات کا دائرہ پورا کیا ہے ایسا ہی میں ہوں جو بروزی طور پر آپ کی ذات کا مظہر ہوں۔ آنحضرتؐ کی تدریجی ترقی میں بھید یہ تھا کہ آپ کی ترقی کا ذریعہ محض قرآن تھا پس جبکہ قرآن شریف کا نزول تدریجی تھا اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تکمیل معارف بھی تدریجی تھی اور اسی قدم پر مسیح موعود ہے جو اس وقت تم میں ظاہر ہوا علمِ غیب خدا تعالیٰ کا خاصہ ہے جس قدر وہ دیتا ہے اُسی قدر ہم لیتے ہیں۔ پہلے اُسی نے غیب سے مجھے یہ فہم عطا کیا کہ ایسے سُست زندگی والے جو خدا اور اُس کے رسول پر ایمان تو لاتے ہیں مگر عملی حالت میں بہت کمزور ہیں یہ دابۃ الارض ہیں یعنی زمین کے کیڑے ہیں آسمان سے ان کو کچھ حصہ نہیں اور مقدر تھا کہ آخری زمانہ میں یہ لوگ بہت ہو جائیں گے اور اپنے ہونٹوں سے اِسلام کی شہادت دیں گے مگر ان کے دِل تاریکی میں ہوں گے یہ تو وہ معنی ہیں جو پہلے ہم نے شائع کئے اور یہ معنے بجائے خود صحیح اور درست ہیں۔ اب ایک اَور معنے خدا تعالیٰ کی طرف سے اس آیت کے متعلق کھلے جن کو ابھی ہم نے بیان کر دیا ہے یعنی یہ کہ دابۃ الارض سے مراد وہ کیڑا بھی ہے جو مقدر تھا جو مسیح موعود کے وقت میں زمین میں سے نکلے اور دُنیا کو ان کی بداعمالیوں کی وجہ سے تباہ کرے۔ یہ خوب یاد رکھنے کے لائق ہے کہ جیسی یہ آیت دو معنوں پر مشتمل ہے ایسے ہی صدہا نمونے اس قسم کے کلامِ الٰہی میں پائے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے اُس کو معجزانہ کلام کہا جاتا ہے جو ایک ایک آیت دس دس پہلو پر مشتمل ہوتی ہے اور وہ تمام پہلو صحیح ہوتے ہیں بلکہ قرآن شریف کے حروف اور ان کے اعداد بھی معارفِ مخفیہ سے خالی نہیں ہوتے۔ (نزول المسیح صفحہ ۴۲ تا ۴۴)

خدا تعالیٰ فرماتا ہے ..... کہ جب قربِ قیامت ہوگا ہم زمین میں سے ایک کیڑا نکالیں گے جو لوگوں کو کاٹے گا اِس لئے کہ انہوں نے ہمارے نشانوں کو قبول نہیں کیا..... اور یہ صریح طور پر طاعون کی نسبت پیشگوئی ہے کیونکہ طاعون بھی ایک کیڑا ہے۔ اگرچہ پہلے طبیبوں نے اس کیڑے پر اطلاع نہیں پائی لیکن خدا جو عالم الغیب ہے وہ جانتا تھا کہ طاعون کی جڑھ اصل میں کیڑا ہی ہے جو زمین میں سے نکلتا ہے اِس لئے اس کا نام دابۃ الارض رکھا یعنی زمین کا کیڑا۔ (لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۴۹)

دابۃ الارض کے معنے طاعون کے بھی ہیں جیسا کہ قرآن شریف کی اِس آیت سے معلوم ہوتا ہے وَاِذَا وَقَعَ الْقَوْلُ عَلَيْهِمْ اَخْرَجْنَا لَهُمْ دَآبَّةً مِّنَ الْاَرْضِ تُكَلِّمُهُمْ اَنَّ النَّاسَ كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا لَا يُوْقِنُوْنَ یعنی جب لوگوں پر حجت پوری ہو جائے گی تو ہم اُن کے لئے زمین سے ایک کیڑا نکالیں گے جو لوگوں کو اس واسطے کاٹے گا کہ وہ خدا تعالیٰ کے نشانوں پر ایمان نہیں لاتے تھے۔ تُكَلِّمُهُمْ کے معنی اقرب الموارد میں صاف کاٹنے کے کئے ہیں۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵ حاشیہ)

دابۃ الارض کے دو معنی ہیں۔ ایک تو وہ علماء جن کو آسمان سے حصہ نہیں ملا وہ زمین کے کیڑے ہیں۔ دوسرے دابۃ الارض سے مراد طاعون ہے دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ[1] قرآن شریف سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب تک انسان میں رُوحانیت پیدا نہ ہو یہ زمین کا کیڑا ہے اور طاعون کی نسبت بھی سب نبیوں نے پیشگوئی کی تھی کہ مسیح کے وقت پھیلے گی۔ تُكَلِّمُ النَّاسَ۔ تکلیم کاٹنے کو بھی کہتے ہیں اور خود قرآن شریف نے ہی فیصلہ کر دیا ہے۔ اس سے آگے لکھ دیا ہے کہ وہ اِس لئے لوگوں کو کاٹے گی کہ ہمارے مامور پر ایمان نہیں لائے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

دابۃ الارض طاعون کو کہتے ہیں اِس لئے کہ اس کے کیڑے تو زمینی ہی ہوتے ہیں۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

جب گمراہی اور ضلالت کا زمانہ ہوگا ایسے وقت میں لوگوں کا ایمان خدا پر صرف بچوں کی کھیل کی طرح ہوگا تب ہم اُن میں ایک کیڑا نکالیں گے جو اُن کو کاٹے گا۔ غرض یہ (طاعون) خدا تعالیٰ کا ایک قہر ہے جس سے بچنے کے واسطے ہر ایک کو لازم ہے کہ اپنی نجات کا آپ سامان کرے۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۵، ۶ مورخہ ۲۸ نومبر و ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۹)

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیح موعود جس کے وقت کے متعلق یہ پیشگوئی ہے۔ اس کے دعاوی کا بہت

---

[1] سورہ سبا آیت ۱۵

بڑا انحصار اور دارومدار نشانات پر ہوگا اور خدا (تعالیٰ) نے اسے بھی بہت سے نشانات عطا فرما رکھے ہونگے کیونکہ یہ جو فرمایا کہ اَنَّ النَّاسَ کَانُوْا بِاٰیٰتِنَا لَا یُوْقِنُوْنَ (سورہ نمل آیت ۸۳) یعنی اس عذاب کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے نشانات کی کچھ بھی پرواہ نہ کی اور ان کو نہ مانا اِس واسطے ان کو یہ سزا ملی۔ ان نشانات سے مراد صرف مسیح موعود کے نشانات ہیں ورنہ یہ امر تو ٹھیک نہیں کہ گناہ تو زید کرے اور اس کی سزا عمر کو ملے جو اس سے تیرہ سو سال بعد آیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اگر لوگوں نے نشانات دیکھے اور ان سے انکار کیا تو اس انکار کی سزا تو ان کو اسی وقت مل گئی اور وہ تباہ اور برباد ہوگئے اور اگر آیت سے وہی نشانات مراد ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے ظاہر ہوئے تھے تو اب ہزاروں لاکھوں مسلمان ایسے ہیں کہ اگر ان سے پوچھا بھی جاوے کہ بتاؤ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کون کون سے نشانات ظاہر ہوئے تو ہزاروں میں سے شاید کوئی ہی ایسا نکلے جس کو اِس طرح پر آپ کے نشانات کا علم ہو ورنہ عام طور سے اب مسلمانوں کو خبر تک بھی نہیں کہ وہ نشانات کیا تھے اور کس طرح خدا (تعالیٰ) نے آپ کی تائید میں ان کو ظاہر فرمایا مگر کیا اس لاعلمی سے کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ لوگ سارے کے سارے ان نشانات سے منکر ہیں اور ان کو وہ نہیں مانتے حالانکہ وہ مومن بھی ہیں۔ اگر ان کو علم ہو تو وہ ماننے بیٹھے ہیں اُن کو کوئی انکار نہیں ان لوگوں کے متعلق تو ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نشانات نہ ماننے کا لفظ لا سکتے ہی نہیں کیونکہ انہوں نے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی نبوّت کی تفاصیل سمیت مان لیا ہوا ہے وہ انکار کیسے کر سکتے ہیں۔ اور دیگر مذاہب کے لوگوں پر وہ نشانات اب حجت نہیں کیونکہ انہوں نے وہ دیکھے نہیں ہیں جنہوں نے دیکھ کر انکار کیا تھا وہ ہلاک ہو چکے۔ موجودہ زمانہ کے لوگوں نے آپ کے نشانات دیکھے ہی نہیں تو وہ اس انکار کی وجہ سے ہلاک کیسے ہو سکتے ہیں؟

پس معلوم ہوا کہ ان نشانات سے مراد مسیح موعود ہی کے نشانات ہیں جن کا انکار کرنے کی وجہ سے عذاب کی تنبیہہ ہے اور خدا تعالیٰ کا غضب ہے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے مسیح موعود کے نشانات سے انکار کیا ہے اور یہ خدائی فیصلہ ہے جس کو رَدّ نہیں کر سکتا۔ یہ نصِّ صریح ہے اِس بات پر کہ طاعون مسیح موعود کے اِنکار کی وجہ سے آئی ہے۔ (الحکم جلد ۷ مـ۱۵ مورخہ ۲۴ اپریل ۱۹۰۳ء صـ۳)

۹۰۔ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا ۚ وَهُمْ مِّنْ فَزَعٍ يَّوْمَئِذٍ اٰمِنُوْنَ ۝

نیکی کرنے والوں کو قیامت کے دن اُس نیکی سے زیادہ بدلہ ملے گا اور وہ ہر ایک ڈر سے اُس دن امن میں رہیں گے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۴۷)

وَمَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَكُبَّتْ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ ۖ هَلْ تُجْزَوْنَ إِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ۝

بدی کرنے والے اُس دن جہنم میں گرائے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ یہ جزا درحقیقت وہی تمہارے اعمال ہیں جو تم دُنیا میں کرتے تھے یعنی خدا تعالیٰ کسی پر ظلم نہیں کرے گا بلکہ نیکی کے اعمال جنت کی صورت میں اور بدی کے اعمال دوزخ کی صورت میں ظاہر ہو جائیں گے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۴۸)

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلَّهِ سَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ فَتَعْرِفُونَهَا ۚ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝

اور کہہ خدا سب کامل صفتوں کا مالک ہے عنقریب وہ تمہیں اپنے نشان دکھلائے گا ایسے نشان کہ تم ان کو شناخت کر لوگے اور خدا تمہارے عملوں سے غافل نہیں ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۳۰ حاشیہ)

اور یہ کہ سب خوبیاں اللہ کے لئے ہیں وہ تمہیں ایسے نشان دکھائے گا جنہیں تم شناخت کر لوگے۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات صفحہ ۱۸)

تفسیر سورۃ القصص

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ ۚ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِى الْيَمِّ وَلَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ ۚ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۝

مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَاٰيَاتِهٖ فَقَدْ وَجَبَ عَلَيْهِ اَنْ يُّؤْمِنَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْحِىْ اِلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ رَسُوْلًا كَانَ اَوْ غَيْرَ رَسُوْلٍ وَيُكَلِّمُ مَنْ يَّشَآءُ نَبِيًّا كَانَ اَوْ مِنَ الْمُحَدَّثِيْنَ اَلَا تَرٰى اَنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى قَدْ اَخْبَرَ فِىْ كِتَابِهٖ اَنَّهٗ كَلَّمَ اُمَّ مُوْسٰى وَقَالَ لَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ وَكَذَالِكَ اَوْحٰى اِلَى الْحَوَارِيِّيْنَ وَكَلَّمَ ذَا الْقَرْنَيْنِ وَاَخْبَرَنَا بِهٖ فِىْ كِتَابِهٖ۔ (تحفہ بغداد صفحہ ۱۵، ۱۶ حاشیہ)

(ترجمہ از مرتب) :۔ جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کی آیات پر ایمان لاتا ہے اس پر واجب ہے کہ وہ اس بات پر بھی ایمان لائے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کی طرف چاہے وحی کرتا ہے خواہ وہ رسول ہو یا غیر رسول۔ اور وہ جس سے چاہتا ہے کلام کرتا ہے خواہ وہ نبی ہو یا محدثوں میں سے کوئی ہو۔ کیا تمہیں علم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب (قرآن مجید) میں یہ خبر دی ہے کہ اس نے (موسیٰ علیہ السلام) کی والدہ سے کلام کیا اور اس سے کہا لَا تَخَافِىْ وَلَا تَحْزَنِىْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ پھر اس طرح اس نے مسیح ناصری علیہ السلام کے حواریوں کی طرف بھی وحی کی اور ذوالقرنین سے بھی اس نے کلام کیا اور اس نے ہمیں اس بات کے متعلق اپنی کتاب میں خبر دی ہے۔ (تحفہ بغداد صفحہ ۱۵، ۱۶ حاشیہ)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَقُوْلُ اِنَّ بَابَ الْاِلْهَامِ مَسْدُوْدٌ عَلٰى هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَمَا تَدَبَّرَ فِي الْقُرْاٰنِ حَقَّ التَّدَبُّرِ وَمَا لَقِيَ الْمُلْهَمِيْنَ۔ فَاعْلَمْ اَيُّهَا الرَّشِيْدُ اَنَّ هٰذَا الْقَوْلَ بَاطِلٌ بِالْبَدَاهَةِ وَيُخَالِفُ الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ وَشَهَادَاتِ الصَّالِحِيْنَ۔ اَمَّا كِتَابُ اللّٰهِ فَاَنْتَ تَقْرَءُ فِي الْقُرْاٰنِ الْكَرِيْمِ اٰيَاتٍ تُؤَيِّدُ قَوْلَنَا هٰذَا وَقَدْ اَخْبَرَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ كِتَابِهِ الْمُحْكَمِ عَنْ بَعْضِ رِجَالٍ وَّنِسَاءٍ كَلَّمَهُمْ رَبُّهُمْ وَخَاطَبَهُمْ وَاَمَرَهُمْ وَنَهَاهُمْ وَمَا كَانُوْا مِنَ الْاَنْبِيَاءِ وَلَا رُسُلِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ اَلَا تَقْرَءُ فِي الْقُرْاٰنِ لَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۔

فَتَدَبَّرْ اَيُّهَا الْمُنْصِفُ الْعَاقِلُ كَيْفَ لَا يَجُوْزُ مُكَالِمَاتُ اللّٰهِ بِبَعْضِ رِجَالِ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الَّتِيْ هِيَ خَيْرُ الْاُمَمِ وَقَدْ كَلَّمَ اللّٰهُ نِسَاءَ قَوْمٍ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ وَقَدْ اَتَاكُمْ مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ۔ (حمامة البشرٰی صفحہ ۷۹-۸۰)

وَدَخَلَ الْمَدِيْنَةَ عَلٰى حِيْنِ غَفْلَةٍ مِّنْ اَهْلِهَا فَوَجَدَ

(ترجمہ از مرتب) بعض لوگ کہتے ہیں کہ اِس اُمّت میں الہام کا دروازہ بند ہے ایسے لوگوں نے قرآن کریم پر پوری طرح تدبّر نہیں کیا اور نہ ہی وہ مُلہمین سے ملے ہیں۔ پس اسے صاحب رُشد جان لے کہ یہ بات بالکل غلط ہے اور کتاب اللہ، سُنّتِ نبویؐ اور صالحین کی شہادت کے خلاف ہے۔ کتاب اللہ ہی کو دیکھو تم اس میں بہت سی ایسی آیات پڑھو گے جو ہماری بات کی تائید کرتی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی محکم کتاب میں بعض مردوں اور عورتوں سے متعلق خبر دی ہے کہ ان کے ربّ نے ان سے کلام کیا اور انہیں مخاطب کیا۔ انہیں بعض باتوں کے کرنے کا حکم دیا اور بعض امور سے منع کیا اور وہ ربّ العالمین کی طرف سے نہ تو نبی تھے اور نہ ہی رسول۔ کیا تُو قرآن کریم میں یہ آیت نہیں پڑھتا جس میں حضرت موسیٰؑ کی ماں کو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ لَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ۔ پس اے منصف اور عقلمند تم اِس بات پر غور کرو کہ اس اُمّت میں جو خیر الاُمم ہے کیوں بعض مردوں سے خدا تعالیٰ کا کلام کرنا جائز نہیں حالانکہ اس نے تم سے پہلی اُمّتوں کی عورتوں سے بھی کلام کیا ہے اور پہلوں کی مثالیں تمہارے پاس موجود ہیں۔

(حمامة البشریٰ صفحہ ۷۹، ۸۰)

فِيهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ هَٰذَا مِنْ شِيعَتِهِ وَهَٰذَا مِنْ عَدُوِّهِ ۖ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِنْ شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ فَوَكَزَهُ مُوسَىٰ فَقَضَىٰ عَلَيْهِ ۖ قَالَ هَٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ ۖ إِنَّهُ عَدُوٌّ مُضِلٌّ مُبِينٌ ○

موسٰی پر الزام مُکّا مارنے کا جو عیسائی لگاتے ہیں اس کی نسبت فرمایا کہ وہ گناہ نہیں تھا اُن کا ایک اسرائیلی بھائی نیچے دبا ہُوا تھا طبعی جوش سے انہوں نے ایک مُکّا مارا۔ وہ مر گیا۔ جیسے اپنی جان بچانے کے لئے اگر کوئی خون بھی کر دے تو وہ جُرم نہیں ہوتا۔ موسٰی کا قول قرآن شریف میں ہے هَٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ یعنی قبطی نے اس اسرائیلی کو عملِ شیطان (فاسد ارادہ) سے دبایا ہُوا تھا۔

(البدر جلد ۱ عـ۲ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۰۲ء صـ۱۵)

آیت ۱۷ قَالَ رَبِّ إِنِّي قَتَلْتُ مِنْهُمْ نَفْسًا فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ○

انبیاء کو خدا ذلیل نہیں کیا کرتا۔ انبیاء کی قوتِ ایمانی یہ ہے کہ خدا کی راہ میں جان دے دینا وہ اپنی سعادت جانیں۔ اگر کوئی موسٰی علیہ السلام کے قصہ پر نظر ڈال کر اس سے یہ نتیجہ نکالے کہ وہ ڈرتے تھے تو یہ بالکل فضول امر ہے (اور اس ڈر سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ ان کو جان کی فکر تھی بلکہ ان کو یہ خیال تھا کہ منصبِ رسالت کی بجا آوری میں کہیں اس کا اچھا اثر نہ پڑے)

(البدر جلد ۲ عـ۳۳ مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۰۳ء صـ۲۵۸)

آیت ۳۷ فَلَمَّا جَاءَهُمْ مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا بَيِّنَاتٍ قَالُوا مَا هَٰذَا إِلَّا

سِحْرٌ مُّفْتَرًى وَّمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ○

وَمَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ہم نے اپنے بزرگوں میں یعنے اولیاء سلف میں یہ نہیں سُنا۔ (براہین احمدیہ ص۵۶۲)

ان کی بدقسمتی ہے کہ جب ان کو وہ اصل اسلام جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے پیش کیا جائے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا اسی طرح مانتے آئے ہیں مگر میں کہتا ہوں کہ کیا اتنی بات کہہ کر یہ اپنے کو بری کر سکتے ہیں؟ نہیں بلکہ قرآن شریف کے موافق اور خدا تعالیٰ کی سُنّتِ قدیم کے مطابق اس قول سے بھی ایک حجت ان پر پوری ہوتی ہے جب کبھی کوئی خدا کا مامور اور مُرسل آتا ہے تو مخالفوں نے اس کی تعلیم کو سُنکر یہی کہا ہے مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۲ صفحہ ۴/۵ مورخہ ۱۷ر جون ۱۹۰۲ء)

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰٓاَيُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ ۚ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ○

اَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ ...... لَعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ۔ اپنے رفیق کو کہا کہ کسی فتنہ یا آزمائش کی آگ بھڑکا تا میں موسیٰ کے خدا پر ..... مطلع ہو جاؤں کہ کیونکر وہ اسکی مدد کرتا ہے اور اُس کے ساتھ ہے یا نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جھوٹا ہے۔

(براہین احمدیہ ص۵۱۱ حاشیہ)

وَلَوْلَآ اَنْ تُصِيْبَهُمْ مُّصِيْبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَيَقُوْلُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ وَنَكُوْنَ مِنَ

الْمُؤْمِنِيْنَ۝

تا عذاب کے نازل ہونے پر گمراہ لوگ یہ نہ کہیں کہ اے خدا تو نے قبل از عذاب اپنا رسول کیوں نہ بھیجا تا ہم تیری آیتوں کی پیروی کرتے اور مومن بن جاتے۔ (براہین احمدیہ ص۵۴۳)

۶۰ وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْٓ اُمِّهَا رَسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۚ وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ۝

وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ یعنی ہم نے کبھی کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر صرف ایسی حالت میں کہ جب اس کے رہنے والے ظلم پر کمربستہ ہوں۔

یاد رہے کہ اگرچہ شرک بھی ایک ظلم بلکہ ظلم عظیم ہے مگر اس جگہ ظلم سے مراد وہ سرکشی ہے جو حد سے گذر جائے اور مفسدانہ حرکات انتہا تک پہنچ جائیں ورنہ اگر مجرد شرک ہو جس کے ساتھ ایذا اور تکبر اور فساد منضم نہ ہو اور ایسا تجاوز از حد نہ ہو جو اعظلوں پر حملہ کریں اور ان کے قتل کرنے پر آمادہ ہوں یا معصیت پر پورے طور پر سرنگوں ہو کر بالکل خوفِ خدا دل سے اٹھا دیں تو ایسے شرک یا کسی اور گناہ کے لئے وعدہ عذابِ آخرت ہے اور دنیوی عذاب صرف اعتداء اور سرکشی اور حد سے زیادہ بڑھنے کے وقت نازل ہوتا ہے۔ (انوارِ اسلام ص۱۴)

کوئی بستی نہیں ہلاک ہوتی مگر اس حالت میں کہ جب اس کے اہل ظلم پر کمربستہ ہوں۔
(البدر جلد ۲ ص۴۲ مورخہ ۱۱ ستمبر ۱۹۰۳ء ص۳۶۶)

ہم کسی بستی کو بھی ہلاک نہیں کرتے جب تک کہ ان کے درمیان کوئی رسول نہ بھیجیں۔
(حقیقۃ الوحی (اعلانِ حق ص۱) ص۴۴۳)

۷۱ وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۗ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۝

اُسی کے لئے تمام محامد ثابت ہیں اور دُنیا و آخرت میں وہی منعم حقیقی ہے اور اسی کے ہاتھ میں ہر ایک

حکم ہے اور وہی تمام چیزوں کا مرجع و مآب ہے۔ (براہین احمدیہ ص۴۳۶ حاشیہ)

فَاَوْمٰی فِیْہِ اِلٰی اَحْمَدَیْنِ وَجَعَلَھُمَا مِنْ نَعْمَائِہِ الْکَاثِرَۃِ۔ فَالْاَوَّلُ مِنْھُمَا اَحْمَدُ الْمُصْطَفٰی وَرَسُوْلُنَا الْمُجْتَبٰی۔ وَالثَّانِیْ اَحْمَدُ اٰخِرِ الزَّمَانِ الَّذِیْ سُمِّیَ مَسِیْحًا وَ مَھْدِیًّا مِّنَ اللّٰہِ الْمَنَّانِ۔ وَقَدِ اسْتُنْبِطَتْ ھٰذِہِ النُّکْتَۃُ مِنْ قَوْلِہٖ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ فَلْیَتَدَبَّرْ مَنْ کَانَ مِنَ الْمُتَدَبِّرِیْنَ۔ (اعجاز المسیح ص۱۳۵)

اَنَّہٗ تَعَالٰی مَا اخْتَارَ لِنَفْسِہٖ ھٰھُنَا اَرْبَعَۃً مِّنَ الصِّفَاتِ اِلَّا لِیُرِیَ نَمُوْذَجَھَا فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا قَبْلَ الْمَمَاتِ۔ فَاَشَارَ فِیْ قَوْلِہٖ وَلَہُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَۃِ اِلٰی اَنَّ ھٰذَا النَّمُوْذَجَ یُعْطٰی لِصَدْرِ الْاِسْلَامِ۔ ثُمَّ لِلْاٰخِرِیْنَ مِنَ الْاُمَّۃِ الذَّاخِرَۃِ۔ وَکَذٰلِکَ قَالَ فِیْ مَقَامٍ اٰخَرَ وَھُوَ اَصْدَقُ الْقَائِلِیْنَ ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَثُلَّۃٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ فَقَسَّمَ زَمَانَ الْھِدَایَۃِ وَالْعَوْنِ وَالنُّصْرَۃِ اِلٰی زَمَانِ نَبِیِّنَا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاِلٰی

(ترجمہ از مرتب) اِس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے دو احمدوں کا ذکر فرما کر ہر دو کو اپنی بے پایاں نعمتوں میں شمار کیا ہے۔ ان میں سے پہلے احمد تو ہمارے نبی احمد مصطفیٰ اور رسول مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور دوسرا احمد احمدِ آخر الزمان ہے جس کا نام محسن خدا کی طرف سے مسیح اور مہدی بھی رکھا گیا ہے۔ یہ نکتہ مَیں نے خدا تعالیٰ کے قول اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ سے اخذ کیا ہے۔ پس ہر غور و فکر کرنے والے کو غور کرنا چاہیئے۔

(اعجاز المسیح ص۱۳۵)

(ترجمہ از مرتب) اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنی ذات کی چار صفات کو محض اِس لئے اِختیار کیا ہے کہ تا وہ اِس دُنیا میں ہی انسان کو (یعنی دُنیا کی) موت سے پہلے ان صفات کا نمونہ دکھائے۔ پس اس نے اپنے کلام لَہُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَ الْاٰخِرَۃِ میں اشارہ فرمایا۔ کہ یہ نمونہ آغازِ اِسلام میں بھی عطا کیا جائے گا اور پھر اُمّت کی خواری کے بعد اس کے آخری لوگوں کو بھی (عطا کیا جائے گا) اِسی طرح اللہ تعالیٰ نے ایک اور جگہ (قرآن مجید میں) فرمایا ہے اور وہ بات کرنے والوں میں سے سب سے زیادہ سچّا ہے۔ ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَ ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ۔ پس اللہ تعالیٰ نے ہدایت، مدد اور نصرت کے زمانہ کو ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ پر اور اُس آخری زمانہ پر جو

الزَّمَانِ الْاٰخِرِ الَّذِیْ ھُوَ زَمَانُ مَسِیْحِ ھٰذِہِ الْمِلَّۃِ وَکَذَالِکَ قَالَ وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ فَاَشَارَ اِلَی الْمَسِیْحِ الْمَوْعُوْدِ وَجَمَاعَتِہٖ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْھُمْ فَثَبَتَ بِنُصُوْصٍ بَیِّنَۃٍ مِنَ الْقُرْاٰنِ اَنَّ ھٰذِہِ الصِّفَاتِ قَدْ ظَھَرَتْ فِیْ زَمَنِ نَبِیِّنَا ثُمَّ تَظْھَرُ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ وَھُوَ زَمَانٌ یَکْثُرُ فِیْہِ الْفِسْقُ وَالْفَسَادُ وَیَقِلُّ الصَّلَاحُ وَالسَّدَادُ۔

(اعجاز المسیح صفحہ ۱۴۹،۱۵۰)

وَلَہُ الْحَمْدُ فِی الْاُوْلٰی وَالْاٰخِرَۃِ وَمِنَ الْاَزَلِ اِلٰی اَبَدِ الْاٰبِدِیْنَ وَلِذَالِکَ سَمَّی اللّٰہُ نَبِیَّہٗ اَحْمَدَ وَکَذَالِکَ سَمّٰی بِہِ الْمَسِیْحَ الْمَوْعُوْدَ لِیُشِیْرَ اِلٰی مَا تَعَمَّدَ۔ وَاَنَّ اللّٰہَ کَتَبَ الْحَمْدَ عَلٰی رَأْسِ الْفَاتِحَۃِ ثُمَّ اَشَارَ اِلَی الْحَمْدِ فِیْ اٰخِرِ ھٰذِہِ السُّوْرَۃِ فَاِنَّ اٰخِرَھَا لَفْظُ الضَّآلِّیْنَ وَھُمُ النَّصَارَی الَّذِیْنَ اَعْرَضُوْا عَنْ حَمْدِ اللّٰہِ وَاَعْطَوْا حَقَّہٗ لِاَحَدٍ مِّنَ الْمَخْلُوْقِیْنَ۔ فَاِنَّ حَقِیْقَۃَ الضَّلَالَۃِ ھِیَ تَرْکُ الْمَحْمُوْدِ الَّذِیْ یَسْتَحِقُّ الْحَمْدَ

اس اُمّت کے مسیح کا زمانہ ہے تقسیم کر دیا اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ۔ اس میں مسیح موعود، اس کی جماعت اور ان کے تابعین کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ پس قرآن کریم کی نصوصِ بیّنہ سے ثابت ہوا کہ یہ صفات ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی ظاہر ہوئیں پھر آخری زمانہ میں بھی ظاہر ہوں گی۔ اور آخری زمانہ ایسا زمانہ ہے جس میں بدکاری اور ہر قسم کی خرابیاں بکثرت پھیل جائیں گی اور راستی بہت ہی کم ہو جائے گی۔

(اعجاز المسیح صفحہ ۱۴۹،۱۵۰)

(ترجمہ از مرتب) اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی پہلی بعثت اور پچھلی بعثت میں بلکہ ازل سے ابد الآباد تک سب تعریف اسی کے لئے ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کا نام احمد رکھا اور اسی طرح مسیح موعود کا بھی یہی نام رکھا تا اس نے جو قصد کیا تھا اس کی طرف اشارہ فرمائے۔ اور اللہ تعالیٰ نے سورہ فاتحہ کے ابتداء میں الحمد لکھا ہے پھر اس سُورت کے آخر میں بھی الحمد کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ اس کے آخر میں اَلضَّآلِّیْن کا لفظ ہے اور وہ نصاریٰ ہیں جنہوں نے خدا تعالیٰ کی حمد کرنے سے مُنہ موڑ لیا اور اس کا حق مخلوق کے ایک فرد کو دے دیا کیونکہ گمراہی کی حقیقت یہ ہے کہ اس قابلِ تعریف ہستی کو جو حمد و ثناء کی مستحق ہے چھوڑ دیا جائے جیسا کہ نصاریٰ نے کیا ہے۔

وَالثَّنَاءَ كَمَا فَعَلَ النَّصَارٰى وَنَحَتُوْا مِنْ عِنْدِهِمْ مَحْمُوْدًا اٰخَرَ وَبَالَغُوْا فِي الْاِطْرَاءِ وَاتَّبَعُوا الْاَهْوَاءَ وَبَعُدُوْا مِنْ عَيْنِ الْحَيَاتِ وَهَلَكُوْا كَمَا يَهْلَكُ الضَّالُّ فِي الْمَوْمَاةِ وَاِنَّ الْيَهُوْدَ هَلَكُوْا فِيْ اَوَّلِ اَمْرِهِمْ وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ الْقَهَّارِ۔ وَالنَّصَارٰى سَلَكُوْا قَلِيْلًا ثُمَّ ضَلُّوْا وَفَقَدُوا الْمَاءَ فَمَاتُوْا فِيْ فَلَاةٍ مِنَ الْاِضْطِرَارِ۔ فَحَاصِلُ هٰذَا الْبَيَانِ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اَحْمَدَيْنِ فِيْ صَدْرِ الْاِسْلَامِ وَفِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ۔ وَاَشَارَ اِلَيْهِمَا بِتَكْرَارِ لَفْظِ الْحَمْدِ فِيْ اَوَّلِ الْفَاتِحَةِ وَفِيْ اٰخِرِهَا لِاَهْلِ الْعِرْفَانِ وَفَعَلَ كَذَالِكَ لِيَرُدَّ عَلَى النَّصْرَانِيِّيْنَ۔ وَاَنْزَلَ اَحْمَدَيْنِ مِنَ السَّمَاءِ لِيَكُوْنَا كَالْجِدَارَيْنِ لِحِمَايَةِ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ۔ (اعجاز المسیح صفحہ ۱۹۳، ۱۹۴)

اِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ قُلْ رَّبِّیْۤ اَعْلَمُ مَنْ جَآءَ بِالْهُدٰی وَمَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ○

لَرَآدُّکَ اِلٰی مَعَادٍ تجھے اسی جگہ پھیر لائے گا جہاں سے تجھے نکالا گیا ہے۔

(براہین احمدیہ ص ۲۳۴ حاشیہ)

انہوں نے اپنے پاس سے ایک اور قابلِ تعریف معبود بنالیا ہے اور انہوں نے اس کی تعریف میں بڑا مبالغہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی اور زندگی کے چشمہ سے دُور نکل گئے اور اس طرح ہلاک ہو گئے جس طرح ایک راہ گم کردہ شخص بیابان میں ہلاک ہو جاتا ہے اور یہود تو اپنی ابتداء میں ہی ہلاک ہو گئے تھے اور خدائے قہار کے غضب کے مورد بن گئے تھے نصاریٰ چند قدم چلے پھر گمراہ ہو گئے اور رُوحانی پانی کھو دیا اور آخرکار لاچار ہو کر بیابانوں میں ہی مر گئے۔ پس خلاصہ بیان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو احمد پیدا کئے ایک اِسلام کے ابتدائی زمانہ میں اور ایک آخری زمانہ میں۔ اور اللہ تعالیٰ نے اہلِ عرفان کے لئے سورۃ فاتحہ کے شروع میں اور اس کے آخر میں الحمد کا لفظاً و معنًا تکرار کر کے ان دونوں (احمدوں) کی طرف اشارہ فرمایا ہے اور خدا نے ایسا عیسائیوں کی تردید کے لئے کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے دو احمد آسمان سے اُتارے تا وہ دونوں پہلوں اور پچھلوں کی حمایت کے لئے دو دیواروں کی طرح ہو جائیں۔ (اعجاز المسیح صفحہ ۱۹۳، ۱۹۴)

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ لَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

تو بجز خدا کے کسی اور سے مرادیں مت مانگ۔ سب ہلاک ہو جائیں گے۔ ایک اُسی کی ذات باقی رہ جاوے گی۔ اُسی کے ہاتھ میں حکم ہے اور وہی تمہارا مرجع ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۴۳۵، ۴۳۶ حاشیہ)

دوسرا حصہ اس توحید کا یہ ہے کہ جیسا کہ کوئی چیز بجز خدا کے خود بخود موجود نہیں ایسا ہی ہر ایک چیز بجز خدا کے اپنی ذات میں فانی اور ہالک ہونے سے بری نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ یعنی ہر ایک چیز معرض ہلاکت میں ہے اور مرنے والی ہے بجز خدا کی ذات کے کہ وہ موت سے پاک ہے اور اسی طرح ایک اور آیت میں فرمایا کہ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ یعنی ہر ایک جو زمین پر ہے آخر مرے گا۔ پس جیسا کہ خدا نے اس آیت میں کہ وَخَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ ہے لفظ کل کے ساتھ جو احاطہ تامہ کے لئے آتا ہے ہر ایک چیز کو جو اُس کے سوا ہے مخلوق میں داخل کر دیا ایسا ہی اِس لفظ کلؔ کے ساتھ اس آیت میں جو کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ ہے اور نیز اِس آیت میں کہ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ ہے ہر ایک چیز کے لئے بجز اپنی ذات کے موت ضروری ٹھہرا دی۔ پس جیسا کہ جسمی ترکیب میں انحلال ہو کر جسم پر موت آتی ہے ایسا ہی رُوحانی صفات میں تغیرات پیدا ہو کر رُوح پر موت آجاتی ہے مگر جو لوگ وجہ اللہ میں محو ہو کر مرتے ہیں وہ بباعث اس اتصال کے جو اُن کو حضرت عزت سے ہو جاتا ہے دوبارہ زندہ کئے جاتے ہیں اور اُن کی زندگی خدا کی زندگی کا ایک ظل ہوتا ہے اور پلید رُوحوں میں بھی عذاب دینے کے لئے ایک حِسّ پیدا کی جاتی ہے مگر وہ نہ مُردوں میں داخل ہوتے ہیں نہ زندوں میں جیسا کہ ایک شخص جب سخت درد میں مُبتلا ہوتا ہے تو وہ بدحواسی کی زندگی اُس کے لئے موت کے برابر ہوتی ہے اور زمین و آسمان اس کی نظر میں تاریک دکھائی دیتے ہیں۔

(چشمہ معرفت صفحہ ۱۵۷، ۱۵۸)

سُورۃ العنکبوت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۝

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ۝

کیا یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بے اِمتحان کئے صرف زبانی ایمان کے دعویٰ سے چھوٹ جاویں گے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۰۹ حاشیہ در حاشیہ)

جو شخص ایمان لاتا ہے اسی کو عرفان دیا جاتا ہے۔ ایمان اِس بات کو کہتے ہیں کہ اُس حالت میں مان لینا کہ جبکہ ابھی علم کمال تک نہیں پہنچا اور شکوک وشبہات سے ہنوز لڑائی ہے۔ پس جو شخص ایمان لاتا ہے یعنی باوجود کمزوری اور نہ مہیا ہونے کُل اسبابِ یقین کے اس بات کو اغلب اِحتمال کی وجہ سے قبول کر لیتا ہے وہ حضرتِ احدیت میں صادق اور راستباز شمار کیا جاتا ہے اور پھر اس کو موہبت کے طور پر معرفتِ تامّہ حاصل ہوتی ہے اور ایمان کے بعد عرفان کا جام اس کو پلایا جاتا ہے۔ اِسی لئے ایک مردِ متقی رسولوں اور نبیوں اور ماموریں من اللہ کی دعوت کو سُنکر ہر ایک پہلو پر ابتداء امر میں ہی حملہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ وہ حِصّہ جو کسی مامور من اللہ کے منجانب اللہ ہونے پر بعض صاف اور کُھلے کُھلے دلائل سے سمجھ آجاتا ہے اُسی کو اپنے اقرار اور ایمان کا ذریعہ ٹھہرا لیتا ہے اور وہ حصّہ جو سمجھ نہیں آتا اُس میں سُنّتِ صالحین کے طور پر استعارات اور مجازات قرار دیتا ہے اور اس طرح تناقض کو درمیان سے اُٹھا کر صفائی اور اخلاص کے ساتھ ایمان لے آتا ہے تب خدا تعالیٰ اس کی حالت پر رحم کرکے اور اس کے ایمان پر راضی ہوکر اور اُس کی دعاؤں کو سُنکر معرفتِ تامّہ کا دروازہ اُس پر کھولتا ہے اور الہام اور کشوف کے ذریعہ سے اور دوسرے آسمانی نشانوں کے وسیلہ سے یقینِ کامل تک اُس کو پہنچاتا ہے۔ (ایّام الصلح صفحہ ۳۱، ۳۲)

کیا لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ مَیں اسی قدر پر راضی ہوجاؤں کہ وہ کہہ دیں کہ ہم ایمان لائے اور ابھی

ان کا اِمتحان نہ کیا جائے؟ (الوصیت مث۲۷ طبع چہارم)

کتاب بحر الجواہر میں لکھا ہے کہ ابو الخیر نام ایک یہودی تھا جو پارسا طبع اور راست باز آدمی تھا اور خدا تعالیٰ کو واحد لاشریک جانتا تھا۔ ایک دفعہ وہ بازار میں چلا جاتا تھا تو ایک مسجد سے اُس کو آواز آئی کہ ایک لڑکا قرآن شریف کی یہ آیت پڑھ رہا تھا۔

الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝

یعنی کیا لوگ گمان کرتے ہیں کہ یوں ہی وہ نجات پا جاویں گے۔ صرف اس کلمہ سے کہ ہم ایمان لائے اور ابھی خدا کی راہ میں اُن کا اِمتحان نہیں کیا گیا کہ کیا ان میں ایمان لانے والوں کی سی استقامت اور صدق اور وفا بھی موجود ہے یا نہیں؟ اس آیت نے ابو الخیر کے دل پر بڑا اثر کیا اور اُس کے دل کو گداز کر دیا تب وہ مسجد کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہو کر زار زار رویا۔ رات کو حضرت سیدنا و مولٰنا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اُس کی خواب میں آئے اور فرمایا یَا اَبَا الْخَیْرِ اَعْجَبَنِیْ اَنَّ مِثْلَكَ مَعَ كُلِّ كَمَالِ فَضْلِكَ یُنْكِرُ بِنُبُوَّتِیْ یعنی اے ابو الخیر مجھے تعجب آیا کہ تیرے جیسا اِنسان باوجود اپنے کمال فضل اور بزرگی کے میری نبوت سے انکار کرے۔ پس صبح ہوتے ہی ابو الخیر مسلمان ہو گیا اور اپنے اِسلام کا اِعلان کر دیا۔ خلاصہ یہ کہ مَیں اِس بات کو بالکل سمجھ نہیں سکتا کہ ایک شخص خدا تعالیٰ پر ایمان لاوے اور اُس کو واحد لاشریک سمجھے اور خدا اُس کو دوزخ سے تو نجات دے مگر نابینائی سے نجات نہ دے حالانکہ نجات کی جڑھ معرفت ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۴۶، ۱۴۷)

مومن کو چاہیئے کہ دوسرے کے حالات سے عبرت پکڑے۔ کیا تم تعجب کرتے ہو کہ جس امتحان میں خدا تعالیٰ نے یہودیوں کو ڈالا تھا وہی امتحان تمہارا بھی کیا گیا ہو خدا تعالیٰ فرماتا ہے الٓمّٓ ۝ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۝ (تتمہ حقیقۃ الوحی مث۱۶۲)

یہ غلطی ہے جو کہا جاتا ہے کہ کسی ولی کے پاس جا کر صدہا ولی فی الفور بن گئے۔ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ (س ۲۰) جب تک انسان آزمایا نہ جاوے فتن میں نہ ڈالا جاوے وہ کب ولی بن سکتا ہے..... اہل اللہ مصائب شدائد کے بعد درجات پاتے ہیں لوگوں کا یہ خیالِ خام ہے کہ فلاں شخص فلاں کے پاس جا کر بلا مجاہدہ و تزکیہ ایک دم میں صدّیقین میں داخل ہو گیا۔ قرآن کو دیکھو کہ خدا کس طرح تم پر راضی ہو جب تک نبیوں کی طرح مصائب و زلازل نہ آویں جنہوں نے بعض وقت تنگ آ کر یہ بھی کہہ دیا حتّٰی یقول الرّسول والّذین اٰمنوا مَعَهٗ مَتٰی نصر اللہ۔ اللہ کے بندے ہمیشہ بلاؤں میں ڈالے گئے پھر خدا نے ان کو

قبول کیا۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۷ جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

رضوان و قربِ الٰہی حاصل کرنے کے لئے دو ہی طریق ہیں۔ ایک تو تشریعی احکام سے ترقی ہوتی ہے اسی لئے تشریعی تکالیف فرمائیں مگر یہ وہ تکالیف ہیں جن سے اِنسان بچ سکتا ہے دوسرے وہ تکالیف ہیں جو خدا اِنسان کے سر پر ڈالتا ہے۔ کسی کے ہاتھ میں تازیانہ دے کر اسے کہا جاتا ہے کہ تو اپنے بدن پر آپ مار تو وہ حتی الامکان ایسا نہ کرے گا کیونکہ انسان اپنے تئیں دُکھ نہیں دینا چاہتا پس جو تکالیف اختیاری ہیں ان سے بچ کر وہ منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا مگر جو تکالیف خدا کی طرف سے ہوں وہ جب اِنسان پر پڑتی ہیں اور وہ ان پر صبر کرتا ہے تو اس کی ترقی کا موجب ہو جاتی ہیں ... غرض تکالیف دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ حصّہ ہے جو احکام پر مشتمل ہے مگر اس میں بہانوں کی گنجائش ہے۔ صوم و زکوٰۃ و صلوٰۃ و حج جب تک پورا اخلاق نہ ہو۔ اِنسان ان سے پہلو تہی کر سکتا ہے پس اس کسر کو نکالنے کے لئے تکالیفِ سماویہ کا ورود ہوتا ہے تاکہ جو کچھ انسانی ہاتھ سے پورا نہیں ہوا وہ خدا کی مدد سے پورا ہو جائے۔ آریہ کہتے ہیں تکالیف کسی پچھلے کرم کی سزا میں ہیں ہم کہتے ہیں یہ آئندہ ترقیات کے لئے ہیں ورنہ جپ تپ کرنا بھی ایک سزا ہوگا۔ (بدر جلد ۷ نمبر ۲۵ مورخہ ۲۵ جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

اِبتلاء ضروری ہے جیسے یہ آیت اشارہ کرتی ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔ (س ۲۰) (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۶)

بہت سے لوگ یہاں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ پھُوک مار کر عرش پر پہنچائے اور واصلین سے ہو جاویں ایسے لوگ ٹھٹھہ کرتے ہیں وہ انبیاء کے حالات کو دیکھیں یہ غلطی ہے جو کہا جاتا ہے کہ کسی ولی کے پاس جا کر صدہا ولی فی الفور بن گئے۔ اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتا ہے کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَكُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔ (س ۲۰) جب تک اِنسان آزمایا نہ جاوے۔ فتن میں نہ ڈالا جاوے وہ کب ولی بن سکتا ہے۔ ایک مجلس میں بایزید وعظ فرما رہے تھے وہاں ایک مشائخ زادہ بھی تھا جو ایک لمبا سلسلہ رکھتا تھا اُس کو آپ سے اندرونی بغض تھا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ خاصہ ہے کہ پُرانے خاندانوں کو چھوڑ کر کسی اَور کو لے لیتا ہے جیسے بنی اسرائیل کو چھوڑ کر بنی اسماعیل کو لے لیا کیونکہ وہ لوگ عیش و عشرت میں پڑ کر خدا کو بھول گئے ہوئے ہیں۔ وَتِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ (ت) سو اُس شیخ زادے کو خیال آیا کہ یہ ایک معمولی خاندان کا آدمی ہے کہاں سے ایسا صاحبِ خوارق آ گیا لوگ اس طرف جھکتے ہیں اور ہماری طرف نہیں آتے۔ یہ باتیں خدا تعالیٰ نے بایزید پر ظاہر کیں۔ انہوں نے ایک قِصّہ کے رنگ میں یہ بیان شروع کیا کہ ایک جگہ مجلس میں رات کے وقت ایک لمپ جل رہا

تھا۔ تیل اور پانی میں بحث ہوئی۔ پانی نے تیل کو کہا کہ تو کثیف اور گندہ ہے اور باوجود کثافت کے میرے اُوپر آتا ہے۔ مَیں ایک مصفا چیز ہوں اور طہارت کے لئے اِستعمال کیا جاتا ہوں لیکن نیچے ہوں۔ اس کا باعث کیا ہے۔ تیل نے کہا کہ جس قدر صعوبتیں مَیں نے کھینچی ہیں تو نے کہاں وہ جھیلی ہیں جس کے باعث یہ بلندی مجھے نصیب ہوئی۔ ایک زمانہ تھا جب مَیں بویا گیا۔ زمین میں مخفی رہا۔ خاکسار ہوا۔ پھر خدا کے ارادہ سے بڑھا۔ بڑھنے نہ پایا کہ کاٹا گیا۔ پھر طرح طرح کی مشقتوں کے بعد صاف کیا گیا۔ کولھوؤں میں پیسا گیا۔ پھر تیل بنا اور آگ لگائی گئی۔ کیا اِن مصائب کے بعد بھی مَیں بلندی حاصل نہ کرتا۔ یہ ایک مثال ہے کہ اہل اللہ مصائب شدائد کے بعد درجات پاتے ہیں۔ لوگوں کا یہ خیال خام ہے کہ فلاں شخص فلاں کے پاس جا کر بلامجاہدہ وتزکیہ ایک دم میں صدیقین میں داخل ہوگیا۔ قرآن کو دیکھو کہ خدا کس طرح تم پر راضی ہو۔ جب تک نبیوں کی طرح تم پر مصائب و زلازل نہ آویں جنہوں نے بعض وقت تنگ آ کر یہ بھی کہہ دیا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ۔ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (س ۲) اللہ کے بندے ہمیشہ بلاؤں میں ڈالے گئے۔ پھر خدا نے ان کو قبول کیا۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۲، ۴۳)

غرض اِس سِلسلہ میں جو ابتلاؤں کا سلسلہ ہوتا ہے بہت سی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں اور بہت سی موتوں کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ ہم قبول کرتے ہیں کہ ان انسانوں میں جو اس سِلسلہ میں داخل ہوتے ہیں ان میں بعض بُزدل بھی ہوتے ہیں۔ شجاع بھی ہوتے ہیں۔ بعض ایسے بزدل ہوتے ہیں کہ صرف قوم کی کثرت کو دیکھ کر ہی الگ ہو جاتے ہیں۔ اِنسان بات کو تو پورا کر لیتا ہے مگر ابتلا کے سامنے ٹھہرنا مشکل ہے۔ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ یعنی کیا لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ ایمان لائیں اور امتحان نہ ہو۔ غرض امتحان ضروری شئے ہے اِس سِلسلہ میں جو داخل ہوتا ہے وہ ابتلا سے خالی نہیں رہ سکتا۔ ہمارے بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ وہ ایک طرف ہیں اور باپ الگ۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۰ مورخہ ۲۴ر اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

قرآن شریف سے صاف پایا جاتا ہے کہ ایمان کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ ابتلا آویں جیسے فرمایا اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ یعنی کیا لوگ خیال کرتے ہیں کہ صرف اٰمَنَّا کہنے سے چھوڑے جائیں اور وہ فتنوں میں نہ پڑیں۔

انبیاء علیہم السلام کو دیکھو اوائل میں کس قدر دُکھ ملتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف دیکھو کہ آپؐ کی مکی زندگی میں کس قدر دُکھ اُٹھانے پڑے۔ طائف میں جب آپؐ گئے تو اس قدر آپؐ کے

پتھر مارے کہ خون جاری ہو گیا تب آپؐ نے فرمایا کہ کیسا وقت ہے میں کلام کرتا ہوں اور لوگ منہ پھیر لیتے ہیں اور پھر کہا کہ اے میرے رب میں اس دکھ پر صبر کروں گا جب تک کہ تو راضی ہو جاوے۔

اولیاء اور اہل اللہ کا یہی مسلک اور عقیدہ ہوتا ہے۔ سید عبد القادر جیلانی لکھتے ہیں کہ عشق کا خاصہ ہے کہ مصائب آتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے ؎

عشقا! ببرآ! تو مغز گرداں خوردی   باشیر دِلاں چہ رستمی ہا کردی

اکنوں کہ بما روئے نبرد آوردی   ہر حیلہ کہ داری نکنی نامردی

مصائب اور تکالیف پر اگر صبر کیا جاوے اور خدا تعالیٰ کی قضا کے ساتھ رضا ظاہر کی جاوے تو وہ مشکل کشائی کا مقدمہ ہوتی ہیں ؎

ہر بلا کیں قوم را او داده است   زیر آں یک گنج ہا بنہاده است

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی تکالیف کا نتیجہ تھا کہ مکہ فتح ہو گیا۔ دعا میں خدا تعالیٰ کے ساتھ شرط باندھنا بڑی غلطی اور نادانی ہے۔ جن مقدس لوگوں نے خدا کے فضل اور فیوض کو حاصل کیا۔ انہوں نے اس طرح حاصل کیا کہ خدا کی راہ میں مر مر کر فنا ہو گئے۔ خدا تعالیٰ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو دس دن کے بعد گمراہ ہو جانے والے ہوتے ہیں۔ وہ اپنے نفس پر خود گواہی دیتے ہیں جبکہ لوگوں سے شکوہ کرتے ہیں کہ ہماری دعا قبول نہیں ہوئی۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۴)

مصیبت اور مشکلات بھی انسان کے ایمان کے پرکھنے کا ایک ذریعہ ہیں چنانچہ قرآن شریف میں آیا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۷ مورخہ ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

جب سے نبوت کا سلسلہ جاری ہوا ہے یہی قانون چلا آیا ہے قبل از وقت اِبتلاء ضرور آتے ہیں تا کچوں اور پکوں میں امتیاز ہو اور مومنوں اور منافقوں میں بیّن فرق نمودار ہو اسی لئے خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ۔ یہ لوگ یہ گمان کر بیٹھے ہیں کہ وہ صرف اتنا ہی کہنے پر نجات پا جائیں کہ ہم ایمان لائے اور اُن کا کوئی امتحان نہ ہو یہ کبھی نہیں ہوتا۔ دنیا میں بھی امتحان اور آزمائش کا سلسلہ موجود ہے۔ جب دنیاوی نظام میں یہ نظیر موجود ہے تو روحانی عالم میں یہ کیوں نہ ہو؟ بغیر امتحان اور آزمائش کے حقیقت نہیں کھلتی۔ آزمائش کے لفظ سے یہ کبھی دھوکا نہ کھانا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کو جو عالم الغیب اور یَعۡلَمُ السِّرَّ وَ اَخۡفٰی ہے۔ امتحان یا آزمائش کی ضرورت ہے اور بدوں امتحان اور آزمائش کے اس کو کچھ معلوم نہیں ہوتا۔ ایسا خیال کرنا نہ صرف غلطی بلکہ کفر کی حد تک پہنچتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ

کی عظیم الشان صفات کا انکار ہے۔ اِمتحان یا آزمائش سے اصل غرض یہ ہوتی ہے کہ تا حقائقِ مخفیہ کا اظہار ہو جاوے اور شخص زیرِ امتحان پر اس کی حقیقتِ ایمان منکشف ہو کر اسے معلوم ہو جاوے کہ وہ کہاں تک اللہ کے ساتھ صدق و اخلاص اور وفا رکھتا ہے اور ایسا ہی دوسرے لوگوں کو اس کی خوبیوں پر اِطلاع ملے۔ پس یہ خیال باطل ہے اگر کوئی کرے کہ اللہ تعالیٰ جو امتحان کرتا ہے تو اس سے پایا جاتا ہے کہ اس کو علم نہیں اس کو تو ذرہ ذرہ کا علم ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ ایک آدمی کی ایمانی کیفیتوں کے اظہار کے لئے اس پر ابتلاء آویں اور وہ اِمتحان کی چکی میں پیسا جاوے۔ کسی نے کیا اچھا کہا ہے ؎

ہر بلا کیں قوم راحق دادہ است   زیر آں گنج کرم بنہادہ است

اِبتلاؤں اور امتحانوں کا آنا ضروری ہے بغیر اس کے کشفِ حقائق نہیں ہوتا۔

(الحکم جلد ۷ ملا مورخہ ۱۴ فروری ۱۹۰۳ء صا)

تھوڑے اِبتلاء کا ہونا ضروری ہے جیسے لکھا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔ پیغمبرِ خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک طرف تو مکہ میں فتح کی خبریں دی جاتی تھیں اور ایک طرف اُن کو جان کی بھی خیر نظر نہ آتی تھی۔ اگر نبوت کا دِل نہ ہوتا تو خدا جانے کیا ہوتا۔ یہ اسی دل کا حوصلہ تھا۔ بعض اِبتلاء صرف تبدیلی کے واسطے ہوتے ہیں۔ عملی نمونے ایسے اعلیٰ درجہ کے ہوں کہ اُن سے تبدیلیاں ہوں اور ایسی تبدیلی ہو کہ خود انسان محسوس کرے کہ اب مَیں وہ نہیں ہوں جو کہ مَیں پہلے تھا بلکہ اب مَیں ایک اَور انسان ہوں۔ اِس وقت خدا کو راضی کرو حتّٰی کہ تم کو بشارتیں ہوں۔

(البدر جلد اوّل ۹ مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶۹)

دعا اور اس کی قبولیت کے زمانہ کے درمیانی اَوقات میں بسا اَوقات ابتلاء پر ابتلاء آتے ہیں اور ایسے ایسے اِبتلاء بھی آ جاتے ہیں جو کمر توڑ دیتے ہیں مگر مستقل مزاج سعید الفطرت ان ابتلاؤں اور مشکلات میں بھی اپنے رَبّ کی عنایتوں کی خوشبو سُونگھتا ہے اور فراست کی نظر سے دیکھتا ہے کہ اس کے بعد نصرت آتی ہے۔ ان ابتلاؤں کے آنے میں ایک سِرّ یہ بھی ہوتا ہے کہ دعا کے لئے جوش بڑھتا ہے۔ کیونکہ جس جس قدر اضطرار اور اضطراب بڑھتا جاوے گا۔ اسی قدر رُوح میں گدازش ہوتی جائے گی اور یہ دعا کی قبولیت کے اسباب میں سے ہے۔ پس کبھی گھبرانا نہیں چاہیئے اور بے صبری اور بیقراری سے اپنے اللہ پر بدظن نہیں ہونا چاہیئے یہ کبھی بھی خیال کرنا نہیں چاہیئے کہ میری دعا قبول نہ ہو گی یا نہیں ہوتی۔ ایسا وہم اللہ تعالیٰ کی اس صفت سے اِنکار ہو جاتا ہے کہ وہ دعائیں قبول فرمانے والا ہے۔

(الحکم جلد ۷ ملا مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۳ء صا-۲)

بیعت کرنا صرف زبانی اقرار ہی نہیں بلکہ یہ تو اپنے آپ کو فروخت کر دینا ہے خواہ ذِلّت ہو نقصان ہو۔ کچھ ہی کیوں نہ ہو کسی کی پرواہ نہ کی جاوے۔ مگر دیکھو اب کس قدر ایسے لوگ ہیں جو اپنے اقرار کو پُورا کرتے ہیں بلکہ خدا تعالیٰ کو آزمانا چاہتے ہیں۔ بس یہی سمجھ رکھا ہے کہ اب ہمیں مطلقاً کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونی چاہیئے اور ایک پُر امن زندگی بسر ہو حالانکہ انبیاء اور قطبوں پر مصائب آئے اور وہ ثابت قدم رہے مگر یہ ہیں کہ ہر ایک تکلیف سے محفوظ رہنا چاہتے ہیں۔ بیعت کیا ہوئی گویا خدا تعالیٰ کو رشوت دینی ہوئی حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ یعنی کیا یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ یہ فقط کلمہ پڑھ لینے پر ہی چھوڑ دئے جاویں گے اور ان کو ابتلاؤں میں نہیں ڈالا جاوے گا۔ پھر یہ لوگ بلاؤں سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ ہر ایک شخص کو جو ہمارے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے جان لینا چاہیئے کہ جب تک آخرت کے سرائے کا فکر نہ کیا جاوے کچھ نہ بنے گا اور یہ ٹھیکہ کرنا کہ مَلک الموت میرے پاس نہ پھٹکے۔ میرے کنبے کا نقصان نہ ہو میرے مال کا بال بیکا نہ ہو۔ ٹھیک نہیں ہے۔ خود شرطِ وفا دکھلاوے اور ثابت قدمی وصدق سے مستقل رہے۔ اللہ تعالیٰ مخفی راہوں سے اس کی رعایت کرے گا اور ہر ایک قدم پر ان کا مددگار بن جاوے گا۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۴ مورخہ ۳۰ جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

جب اللہ تعالیٰ کسی آسمانی سِلسلہ کو قائم کرتا ہے تو ابتلاء اس کی جزو ہوتے ہیں۔ جو اس سلسلہ میں داخل ہوتا ہے ضروری ہوتا ہے کہ اس پر کوئی نہ کوئی ابتلاء آوے تا کہ اللہ تعالیٰ سچّے اور مستقل مزاجوں میں امتیاز کر دے اور صبر کرنے والوں کے مدارج میں ترقی ہو۔ ابتلاء کا آنا بہت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ کیا لوگ گمان کر بیٹھے ہیں کہ وہ صرف اتنا کہنے پر ہی چھوڑ دئے جاویں کہ ہم ایمان لائے اور ان پر کوئی ابتلاء نہ آوے ایسا کبھی نہیں ہوتا۔ خدا تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے کہ وہ غداروں اور سچّوں کو الگ کر دے۔ پس ایمان کے بعد ضروری ہے کہ اِنسان دُکھ اُٹھاوے بغیر اس کے ایمان کا کچھ مزا ہی نہیں ملتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کو کیا کیا مشکلات پیش آئیں اور انہوں نے کیا کیا دُکھ اُٹھائے۔ آخر ان کے صبر پر اللہ تعالیٰ نے اُن کو بڑے بڑے مدارج اور مراتبِ عالیہ عطا کئے۔ انسان جلد بازی کرتا ہے اور ابتلاء آتا ہے تو اس کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ دُنیا ہی رہتی ہے اور نہ دین ہی رہتا ہے مگر جو صبر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ ہوتا ہے اور ان پر انعام واکرام کرتا ہے اِس لئے کسی اِبتلاء پر گھبرانا نہیں چاہیئے۔ ابتلاء مومن کو اللہ تعالیٰ کے اَور بھی قریب کر دیتا ہے اور اس کی

وفاداری کو مستحکم بناتا ہے لیکن کچے اور غدار کو الگ کر دیتا ہے۔
(الحکم جلد ۷ عدد ۳۱ مورخہ ۲۴ر اگست ۱۹۰۳ء صفحہ ۴)

اِنعام و برکات اِمتحان و ابتلاء کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ یاد رکھو کہ ہمیشہ عظیم الشان نعمت ابتلاء سے آتی ہے اور ابتلاء مومن کے لئے شرط ہے جیسے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ یعنی کیا لوگ گمان کر بیٹھے ہیں کہ وہ اتنا ہی کہہ دینے پر چھوڑ دئے جاویں کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہ جاویں۔ ایمان کے اِمتحان کے لئے مومن کو ایک خطرناک آگ میں پڑنا پڑتا ہے مگر اس کا ایمان اس آگ سے اس کو صحیح سلامت نکال لاتا ہے اور وہ آگ اس پر گلزار ہو جاتی ہے۔ مومن ہو کر ابتلاء سے کبھی بے فکر نہیں ہونا چاہیئے اور ابتلاء پر زیادہ ثباتِ قدم دکھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور حقیقت میں جو سچا مومن ہے اِبتلاء میں اس کے ایمان کی حلاوت اور لذّت اَور بھی بڑھ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور اس کے عجائبات پر اس کا ایمان بڑھتا ہے اور وہ پہلے سے بہت زیادہ خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کرتا اور دعاؤں سے فتحیاب اجابت چاہتا ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ انسان خواہش تو اعلیٰ مدارج اور مراتب کی کرے اور ان تکالیف سے بچنا چاہے جو انکے حصول کے لئے ضروری ہیں۔ یقیناً یاد رکھو کہ ابتلاء اور امتحان ایمان کی شرط ہے اس کے بغیر ایمان ایمان کامل ہوتا ہی نہیں اور کوئی عظیم الشان نعمت بغیر ابتلاء ملتی ہی نہیں۔ دُنیا میں بھی عام قاعدہ یہی ہے کہ دنیوی آسائشوں اور نعمتوں کے حاصل کرنے کے لئے قِسم قِسم کی مشکلات اور رنج و تعب اُٹھانے پڑتے ہیں طرح طرح کے اِمتحانوں میں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر کامیابی کی شکل نظر آتی ہے اور پھر بھی وہ محض اللہ تعالیٰ کے فضل پر موقوف ہے۔ پھر خدا تعالیٰ جیسی نعمتِ عظمیٰ جس کی کوئی نظیر ہی نہیں یہ بدوں اِمتحان کیسے میسر آسکے۔
(الحکم جلد ۸ عدد ۳ مورخہ ۲۴ر جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۱)

خدا تعالیٰ کی راہ میں جب تک انسان بہت سی مشکلات اور امتحانات میں پورا نہ اُترے وہ کامیابی کا سرٹیفکیٹ حاصل نہیں کر سکتا۔ اِسی لئے فرمایا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ کیا لوگ گمان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ محض اِتنی ہی بات پر راضی ہو جاوے کہ وہ کہہ دیں کہ ہم ایمان لائے اور وہ آزمائے نہ جاویں۔۔۔۔ کل ایمان دار بننے کے لئے مجاہدات کی ضرورت ہے اور مختلف اِبتلاؤں اور امتحانوں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے ؎

گوئیند سنگ لعل شود در مقامِ صبر   آرے شود و لیک بخونِ جگر شود

(الحکم جلد ۸ عدد ۱۷ مورخہ ۲۴ر مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

کیا انسانوں نے گمان کر لیا ہے کہ ہم اٰمَنَّا ہی کہہ کر چھٹکارا پالیں گے اور کیا وہ آزمائش میں نہ ڈالے جاویں گے۔ سو اصل مطلب یہ ہے کہ یہ آزمائش اسی لئے ہے کہ خدا تعالیٰ دیکھنا چاہتا ہے کہ آیا ایمان لانے والے نے دین کو ابھی دُنیا پر مقدم کیا ہے یا نہیں۔ آجکل اِس زمانہ میں جب لوگ خدا تعالیٰ کی راہ کو اپنے مصالح کے خلاف پاتے ہیں یا بعض جگہ حکام سے ان کو کچھ خطرہ ہوتا ہے تو وہ خدا کی راہ سے اِنکار کر بیٹھتے ہیں ایسے لوگ بے ایمان ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ فی الواقع خدا ہی احکم الحاکمین ہے۔ اِس میں کچھ شک نہیں کہ خدا تعالیٰ کی راہ بہت دشوار گذار ہے اور یہ بالکل سچ ہے کہ جب تک اِنسان خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنی کھال اپنے ہاتھ سے نہ اُتارے تب تک وہ خدا تعالیٰ کی نگاہ میں مقبول نہیں ہوتا۔ ہمارے نزدیک بھی ایک بے وفا لوکر کسی قدر و منزلت کے قابل نہیں۔ جو لوکر صدق اور وفا نہیں دکھلاتا وہ کبھی قبولیت نہیں پاتا۔ اِسی طرح جنابِ الٰہی میں وہ شخص پرلے درجہ کا بے ادب ہے جو چند روزہ دنیوی منافع پر نگاہ رکھ کر خدا (تعالیٰ) کو چھوڑتا ہے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۳۰ مورخہ ۸۔ اگست ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ صرف مُنہ سے کہہ دینا کہ ہم ایمان لے آئے ہیں کافی ہے اور کوئی امتحانی مشکل پیش نہ آئے گی یہ بالکل غلط خیال ہے۔ اللہ تعالیٰ مومن پر ابتلاء بھیج کر امتحان کرتا ہے۔ تمام راست بازوں سے خدا تعالیٰ کی یہی سُنّت ہے۔ وہ مصائب اور شدائد میں ضرور ڈالے جاتے ہیں۔

(البدر جلد ۳ نمبر ۲۵ مورخہ یکم جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

اِبتلاؤں کا آنا ضروری ہے اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْۤا اَنْ یَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ ھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ یعنی کیا لوگ گمان کر بیٹھے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے اتنی ہی بات پر راضی ہو جاوے کہ وہ کہہ دیں کہ ہم ایمان لائے حالانکہ وہ ابھی اِمتحان میں نہیں ڈالے گئے۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۱ مورخہ ۱۰۔ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

اکثر یہی چاہتے ہیں کہ ہتھیلی پر سرسوں جما دی جاوے۔ وہ نہیں جانتے کہ دین کے کاموں میں کس قدر صبر اور حوصلہ کی حاجت ہے۔ اور تعجب تو یہ ہے کہ وہ جس دُنیا کے لئے رات دن مرتے اور ٹکریں مارتے ہیں اس کے کاموں کے لئے تو برسوں انتظار کرتے ہیں۔ کسان بیج بو کر کتنے عرصہ تک منتظر رہتا ہے لیکن دین کے کاموں میں آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ پھونک مار کر ولی بنا دو اور پہلے ہی دن چاہتے ہیں کہ عرش پر پہنچ جاویں حالانکہ نہ اس راہ میں کوئی محنت اور مشقّت اُٹھائی اور نہ کسی ابتلاء کے نیچے آیا۔ خوب یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون اور آئین نہیں یہاں ہر ترقی تدریجی ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ نری اِتنی باتوں سے خوش نہیں ہو سکتا کہ ہم کہہ دیں ہم مسلمان ہیں یا مومن ہیں چنانچہ اس نے فرمایا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ

اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ یعنی کیا یہ لوگ گمان کر بیٹھے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اتنے ہی کہنے پر راضی ہوجاوے اور یہ لوگ چھوڑ دیئے جاویں کہ وہ کہہ دیں ہم ایمان لائے اور ان کی کوئی آزمائش نہ ہو۔ یہ امر سُنّت اللہ کے خلاف ہے کہ پھونک مار کر ولی (اللہ) بنا دیا جاوے۔ اگر یہی سُنّت ہوتی تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کرتے اور اپنے جاں نثار صحابہؓ کو پھونک مار کر ولی بنا دیتے ان کو امتحان میں ڈلوا کر ان کے سر نہ کٹواتے اور خدا تعالیٰ ان کی نسبت یہ نہ فرماتا کہ مِنْھُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَہٗ وَمِنْھُمْ مَّنْ یَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِیْلًا۔ پس جب دُنیا بغیر مشکلات اور محنت کے ہاتھ نہیں آتی تو عجب بیوقوف ہے وہ انسان جو دین کو حلوائے بے ورد سمجھتا ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ دین سہل ہے مگر ہر نعمت مشقت کو چاہتی ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۱ مورخہ ۱۷ رجون ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

لوگ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم مومن ہیں اور مسلمان ہیں لیکن در اصل وہ نہیں ہوتے۔ زبانی اقرار تو ایک آسان بات ہے لیکن کر کے دکھانا اور بات ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ الآیۃ یعنی کیا لوگ گمان کرتے ہیں کہ وہ مومن اور پکے ایمان دار ہیں اور ابھی وہ آزمائے نہیں گئے۔ پس جب تک آزمائش نہ ہو ایمان کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ بہت لوگ ہیں جو آزمائش کے وقت پھسل جاتے ہیں اور تکلیف کے وقت ان کا ایمان ڈگمگا جاتا ہے۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۹ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۷ء صفحہ ۱)

کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ صرف اِتنا کہہ دینے سے ہی کہ ہم ایمان لائے چھوٹ جائیں گے اور ان کا امتحان نہ لیا جاوے گا۔ امتحان کا ہونا تو ضروری ہے اور امتحان بڑی چیز ہے۔ سب پیغمبروں نے امتحان سے ہی درجے پائے ہیں۔ یہ زندگی دُنیا کی بھروسہ والی زندگی نہیں ہے۔ کچھ ہی کیوں نہ ہو آخر چھوڑنی پڑتی ہے مصائب کا آنا ضروری ہے۔ دیکھو ایوبؑ کی کہانی میں لکھا ہے کہ طرح طرح کی تکالیف اسے پہنچیں اور بڑے بڑے مصائب نازل ہوئے اور اس نے صبر کئے رکھا۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

اصل میں ابتلاؤں کا آنا ضروری ہے۔ اگر انسان عمدہ عمدہ کھانے گوشت پلاؤ اور طرح طرح کے آرام و راحت میں زندگی بسر کر کے خدا کو ملنے کی خواہش کرے تو یہ محال ہے۔ بڑے بڑے زخموں اور سخت سے سخت ابتلاؤں کے بغیر انسان خدا (تعالیٰ) کو مل ہی نہیں سکتا۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ ۲۹/۳ غرض بغیر امتحان کے تو بات بنتی ہی نہیں اور پھر امتحان بھی ایسا جو کہ کمر توڑنے والا ہو۔ ہمارے نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سب سے بڑھ کر مشکل امتحان ہوا تھا جیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے وَوَضَعْنَا عَنْکَ وِزْرَکَ الَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَھْرَکَ ۹۴/۳۴ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ

۲۴ر ستمبر ۱۹۰۷ء صٹ)

کیا یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ صرف زبانی قیل وقال پر ہی ان کو چھوڑ دیا جائے گا اور صرف اتنا کہنے سے ہی کہ ہم ایمان لے آئے دیندار سمجھے جائیں گے اور ان کا امتحان نہ ہوگا بلکہ امتحان اور آزمائش کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ سب انبیاء کا اس پر اتفاق ہے کہ ترقی مدارج کے لئے آزمائش ضروری ہے اور جب تک کوئی شخص آزمائش اور امتحان کی منازل طے نہیں کرتا دیندار نہیں بن سکتا۔

(الحکم جلد ۱۱ ۳۶ مورخہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۱

بدر جلد ۶ ۴۲ مورخہ ۱۷ر اکتوبر ۱۹۰۷ء صٹ)

خدا تعالیٰ کے مامور پر ایمان لانے کے ساتھ ابتلاء ضروری ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ۔ کیا لوگوں نے سمجھا کہ چھوڑے جائیں گے یہ کہنے پر کہ ہم ایمان لائے اور آزمائے نہ جائیں گے۔ گویا ایمان کی شرط ہے نہ آزمایا جانا۔ صحابہ کرامؓ کیسے آزمائے گئے۔ ان کی قوم نے طرح طرح کے عذاب دئے۔ ان کے اموال پر بھی ابتلاء آئے۔ جانوں پر بھی۔ خویش و اقارب پر بھی۔ اگر ایمان لانے کے بعد آسائش کی زندگی آجاوے تو اندیشہ کرنا چاہیئے کہ میرا ایمان صحیح نہیں کیونکہ یہ سُنّت اللہ کے خلاف ہے کہ مومن پر ابتلاء نہ آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوسکتا۔ وہ جب اپنی رسالت پر ایمان لائے تو اسی وقت سے مصائب کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ عزیزوں سے جُدا ہوئے۔ میل ملاپ بند کیا گیا۔ ملک سے نکالے گئے۔ دشمنوں نے زہر تک دے دیا۔ تلواروں کے سامنے زخم کھائے۔ اخیر عمر تک یہی حال رہا۔ پس جب ہمارے مقتدا و پیشوا کے ساتھ ایسا ہوا تو پھر اس پر ایمان لانے والے کون ہیں جو بچے رہیں۔ ایسے ابتلاء جب آویں تو مردانہ طریق سے ان کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔

ابتلاء اسی واسطے آتے ہیں کہ صادق جُدا ہوجائے اور کاذب جُدا۔ خدا رحیم ہے مگر وہ غنی اور بے نیاز بھی ہے۔ جب انسان اپنے ایمان کو استقامت کے ساتھ مدد نہ دے تو خدا (تعالیٰ) کی مدد بھی منقطع ہو جاتی ہے۔ بعض آدمی صرف اتنی سی بات سے دہریہ ہو جاتے ہیں کہ ان کا لڑکا مر گیا یا بیوی مر گئی یا رزق کی تنگی ہو گئی حالانکہ یہ ایک ابتلاء تھا جس میں پُورا نکلتے تو انہیں اس سے بڑھ کر دیا جاتا اور رزق کی تنگی سے پراگندہ دِل ہونا مومن کا کام متقی کا شیوہ نہیں۔ یہ جو

پراگندہ روزی پراگندہ دِل

کہتے ہیں اس کے یہ معنے ہیں کہ جو پراگندہ دِل ہو وہ پراگندہ روزی رہتا ہے اور اوّل تو صادقوں کے سوانح دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خود اپنے تئیں پراگندہ روزی بنالیا۔ دیکھو حضرت ابوبکرؓ تاجر تھے

بڑے معزز۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاکر سب کو دشمن بنالیا۔ کاروبار میں بھی فرق آگیا۔ یہاں تک کہ اپنے شہر سے بھی نکلے۔ یہ بات خوب یاد رکھو کہ سچی تقویٰ ایسی چیز ہے جس سے تمام مشکلات حل ہوجاتی ہیں اور کل پراگندگیوں سے نجات ملتی ہے۔ (بدر جلد ۷ ۸ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

جو لوگ خدائی امتحان میں پاس ہوجاتے ہیں پھر اُن کے واسطے ہر طرح کے آرام وآسائش، رحمت اور فضل کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ دیکھو قرآن شریف میں صاف فرمایا ہے کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ صرف زبان سے کہہ لینا تو آسان ہے مگر کچھ کرکے دکھانا اور خدائی امتحان میں پاس ہونا بڑی بات ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ ۱۸ مورخہ ۶ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

خدا بڑا بے نیاز ہے۔ اس کو اِس بات کی کیا پرواہ ہے کہ کوئی جہنم میں جاوے یا کہ بہشت میں جاوے کسی کے دوزخ میں جانے سے خدا کا کچھ بگڑتا نہیں اور کسی کے بہشت میں جانے سے سنورتا نہیں۔ خدا کا اس میں ذاتی نفع یا نقصان کچھ بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ یعنی کیا بس اتنی بات سے کہ لوگ زبان سے اتنا کہہ دیں کہ ہم ایمان لائے خدا راضی ہوجاتا ہے اور حال یہ کہ ابھی ان کے اس قول کا امتحان نہیں کیا گیا کہ آیا وہ حقیقتاً مومن ہیں بھی یا کہ نہیں اور ان کے اس قول کا صدق و کذب ظاہر نہیں ہوا۔ پس سچی اور پکی بات یہی ہے کہ انسان اوّل صدق، اخلاص اور گدازش اختیار کرکے اپنے اُوپر ہزاروں موتیں بسر کرے جب جا کر اللہ (تعالیٰ) رحم کرتا ہے اور اس کی طرف جھانکتا ہے۔ جنتر منتر سے ولی بن جانے والے خیالات کے لوگ اور صرف ایک چھُوہ سے آسمانی خزانوں کے مالک بن جانے کے خیالات رکھنے والے ہمیشہ محروم رہتے ہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ ۲۴ مورخہ ۲ اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

اِنسان دُنیوی امتحان کے واسطے کیا کیا تیاریاں کرتا ہے اور کس قدر فکر اور غم اس کو ہوتا ہے اور کیسی کیسی شاقہ محنت برداشت کرتا ہے۔ بے فکری ہے تو کس سے؟ دینی اِمتحان سے۔ نہیں محنت کی جاتی تو کس کے واسطے؟ دین کے امتحان کے واسطے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ بھی ایک امتحان کی طرف متوجہ کرتا ہے اس کا بھی کچھ فکر کرنا چاہیئے اس امتحان کے واسطے کچھ تیاری کرنی ازبس لازمی ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ ۳۱ مورخہ ۶ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۲)

خطرناک مشکلات میں ثابت قدم رہنا اور قدم آگے ہی آگے اُٹھانا اور خدائی اِمتحان میں پاس ہوجانا سچے اور حقیقی ایمان کی دلیل ہے مشکلات کا آنا اور ابتلاؤں کا آنا مومن پر ضروری ہے تا ظاہر ہو کہ کون سچا

مومن اور کون صرف زبانی ایمان کا مدعی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔
(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

یہ ضروری ہے کہ مخالف بھی ہوں کیونکہ سُنّت اللہ اسی طرح جاری ہے کہ ہر شخص جو خدا کی طرف قدم اُٹھاتا ہے اس کے لئے اِمتحان ضروری رکھا ہوا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔ اِمتحان خدا کی عادت ہے۔ یہ خیال نہ کرو کہ عالم الغیب خدا کو امتحان کی کیا ضرورت ہے؟ یہ اپنی سمجھ کی غلطی ہے اللہ تعالیٰ اِمتحان کا محتاج نہیں ہے اِنسان خود محتاج ہے تاکہ اس کو اپنے حالات کی اطلاع ہو اور اپنے ایمان کی حقیقت کُھلے۔ مخالفانہ رائے سُنکر اگر مغلوب ہو جاوے تو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ قوت نہیں ہے جس قدر علوم و فنون دُنیا میں ہیں بدُوں اِمتحان ان کو سمجھ نہیں سکتا۔ خدا کا امتحان یہی ہے کہ انسان سمجھ جاوے کہ میری حالت کیسی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ مامور من اللہ کے دُشمن ضرور ہوتے ہیں جو ان کو تکلیفیں اور اذیتیں دیتے ہیں۔ توہین کرتے ہیں۔ ایسے وقت میں سعید الفطرت اپنی روشن ضمیری سے اُن کی صداقت کو پالیتے ہیں۔ پس ماموروں کے مخالفوں کا وجود بھی اِس لئے ضروری ہے جیسے پھُولوں کے ساتھ کانٹے کا وجود ہے۔ تریاق بھی ہے تو زہریں بھی ہیں۔ کوئی ہم کو کسی نبی کے زمانہ کا پتہ دے جسکے مخالف نہ ہوئے ہوں اور جنہوں نے اس کو دکاندار، ٹھگ، جھوٹا، مفتری نہ کہا ہو۔ موسیٰ علیہ السلام پر بھی افتراء کر دیا یہاں تک کہ ایک پلید نے تو زنا کا اتہام لگا دیا اور ایک عورت کو پیش کر دیا۔ غرض ان پر ہر قِسم کے افتراء کئے جاتے ہیں تا لوگ آزمائے جاویں اور یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ خدا کے لگائے ہوئے پودے ان نابکاروں کی پھونکوں سے معدوم کئے جاویں۔ یہی ایک نشان اور تمیز ہوتی ہے اُن کے خدا کی طرف سے ہونے کی کہ مخالف کوشش کرتے ہیں کہ وہ نابود ہو جاویں اور وہ بڑھتے اور پھُولتے ہیں۔ ہاں جو خدا کی طرف سے نہ ہو وہ آخر معدوم اور نیست و نابود ہو جاتا ہے لیکن جس کو خدا نے اپنے ہاتھ سے لگایا ہے وہ کسی کی کوشش سے نابود نہیں ہو سکتا۔ وہ کاٹنا چاہتے ہیں اور یہ بڑھتا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہو سکتا ہے کہ خدا کا ہاتھ ہے جو اس کو تھامے ہوئے ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کس قدر عظیم الشان معجزہ ہے کہ ہر طرف سے مخالفت ہوتی تھی مگر آپؐ ہر میدان میں کامیاب ہی ہوتے تھے۔ صحابہؓ کے لئے یہ کیسی دل خوش کرنے والی دلیل تھی جب وہ اِس نظارے کو دیکھتے تھے۔
(الحکم جلد ۵ نمبر ۴ مورخہ ۳۱ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۵)

ہم ابتلاء سے کسی طرح بھاگ نہیں سکتے۔ خدا تعالیٰ نے ترقیات کا ذریعہ صرف ابتلاء ہی رکھا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْٓا اَنْ یَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ۔ (مکتوباتِ احمدیہ

جلد ۵ حصہ دوم ص۸۵ (مکتوب ۱۱ بنام حضرت خلیفہ اوّل)

ابتلاؤں کا آنا ضروری ہے۔ مومن کو چاہیئے کہ ایک بہادر کی طرح ان کو قبول کرے۔ خدا تعالےٰ مومن کو تباہ کرنا نہیں چاہتا بلکہ ابتلاؤں کو اِس لئے نازل کرتا ہے کہ اس کے گناہ بخشے اور اس کا مرتبہ زیادہ کرے۔ (مکتوباتِ احمدیہ جلد ۵ حصّہ اوّل ص۱۲ (مکتوب ۲۸ بنام حضرت سیٹھ عبدالرحمٰن صاحب مدراسی)

۱۰۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ۝

یعنی ہماری سُنّتِ مستمرہ قدیمہ ہے کہ جو لوگ ایمان لاویں اور عملِ صالح کریں ہم ان کو صالحین میں داخل کر لیا کرتے ہیں۔ اب حضرت مولوی صاحب[۱] دیکھیئے کہ لَنُدْخِلَنَّهُمْ میں نون ثقیلہ ہے لیکن اگر اِس جگہ آپ کی طرز پر معنی کئے جائیں تو اِس قدر فساد لازم آتا ہے جو کسی پر پوشیدہ نہیں کیونکہ اس صورت میں ماننا پڑتا ہے کہ یہ قاعدہ آئندہ کے لئے باندھا گیا ہے اور اب تک کوئی نیک اعمال بجا لاکر صلحاء میں داخل نہیں کیا گیا۔ گویا آئندہ کے لئے گنہگار لوگوں کی توبہ منظور ہے اور پہلے اس سے دروازہ بند ہو رہا ہے۔ سو آپ سوچیں کہ ایسے معنی کرنا کس قدر مفاسد کو مستلزم ہے۔ (الحق دہلی ص۳۴)

جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کئے ہم ان کو ضرور ضرور صالحین میں داخل کر دیتے ہیں۔

اِس پر بعض اعتراض کرتے ہیں کہ اعمالِ صالحہ کرنے والے صالحین ہوتے ہیں پھر اُن کو صالحین میں داخل کرنے سے کیا مراد ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اِس میں ایک لطیف نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس بات کو بیان فرماتا ہے کہ صلاحیت کی دو قسم ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ انسان تکالیفِ شاقہ اُٹھا کر نیکیوں کا بوجھ اُٹھاتا ہے۔ نیکیاں کرتا ہے لیکن ان کے کرنے میں اسے تکلیف اور بوجھ معلوم ہوتا ہے اور اندر نفس کے کشاکش موجود ہوتی ہے اور جب وہ نفس کی مخالفت کرتا ہے تو سخت تکلیف محسوس ہوتی ہے لیکن جب وہ اعمالِ صالحہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے جیسا کہ اِس آیت کا منشاء ہے۔ اس وقت وہ تکالیفِ شاقہ اور محنتیں جو خود نیکیوں کے لئے برداشت کرتا ہے اُٹھ جاتی ہیں اور طبعی طور پر وہ صلاحیت کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے اور وہ تکالیف تکالیف نہیں رہتی ہیں اور نیکیوں کو ایک ذوق اور لذّت سے کرتا ہے اور ان دونوں

[۱] مراد مولوی محمد بشیر صاحب سہسوانی ہیں۔

میں یہی فرق ہوتا ہے کہ پہلا نیکی کرتا ہے مگر تکلیف اور تکلف سے اور دوسرا ذوق اور لذت سے۔ وہ نیکی اس کی غذا ہوجاتی ہے جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا اور وہ تکلف اور تکلیف جو پہلے ہوتی تھی۔ اب ذوق وشوق اور لذت سے بدل جاتی ہے۔ یہ وہ مقام ہوتا ہے صالحین کا جن کے لئے فرمایا لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ۔

اس مقام پر پہنچ کر کوئی فتنہ اور فساد مومن کے اندر نہیں رہتا۔ نفس کی شرارتوں سے محفوظ ہوجاتا ہے اور اس کے جذبات پر فتح پاکر مطمئن ہوکر دار الامان میں داخل ہوجاتا ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲
الحکم جلد ۸ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۱)

۱۱۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ۝

اور بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو زبانی تو ایمان کے وعدے کرتے ہیں اور مومن ہونے کی لاف وگزاف مارتے رہتے ہیں۔ لیکن جب معرضِ امتحان و ابتلاء میں آتے ہیں تو ان کی حقیقت کھل جاتی ہے اس فتنہ و ابتلاء کے وقت اُن کا ایمان اللہ تعالیٰ پر ویسا نہیں رہتا بلکہ شکایت کرنے لگتے ہیں۔ اسے عذابِ الٰہی قرار دیتے ہیں حقیقت میں وہ لوگ بڑے ہی محروم ہیں جن کو صالحین کا مقام حاصل نہیں ہوتا کیونکہ یہی تو وہ مقام ہے جہاں انسان ایمانی مدارج کے ثمرات کو مشاہدہ کرتا ہے اور اپنی ذات پر اُن کا اثر پاتا ہے اور نئی زندگی اسے ملتی ہے لیکن یہ زندگی پہلے ایک موت کو چاہتی ہے اور یہ انعام وبرکات امتحان و ابتلاء کے ساتھ وابستہ ہوتے ہیں....

یقیناً یاد رکھو کہ ابتلاء اور امتحان ایمان کی شرط ہے اس کے بغیر ایمان ایمانِ کامل ہوتا ہی نہیں اور کوئی عظیم الشان نعمت بغیر ابتلاء ملتی ہی نہیں ہے۔ دُنیا میں بھی عام قاعدہ یہی ہے کہ دُنیاوی آسائشوں اور

نعمتوں کے حاصل کرنے کے لئے قسم قسم کی مشکلات اور رنج و تعب اُٹھانے پڑتے ہیں طرح طرح کے امتحانوں میں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر کامیابی کی شکل نظر آتی ہے اور پھر بھی وہ محض خدا تعالیٰ کے فضل پر موقوف ہے۔ پھر خدا تعالیٰ جیسی نعمتِ عظمیٰ جس کی کوئی نظیر ہی نہیں یہ بدوں امتحان کیسے میسّر آسکے۔

پس جو چاہتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو پاوے اُسے چاہیئے کہ وہ ہر ایک اِبتلاء کے لئے تیار ہو جاوے جب اللہ تعالیٰ کوئی سِلسلہ قائم کرتا ہے جیسا کہ اِس وقت اُس نے اِس سِلسلہ کو قائم کیا ہے تو جو لوگ اس میں اوّلاً داخل ہوتے ہیں اُن کو قسم قسم کی تکالیف اُٹھانی پڑتی ہیں۔ ہر طرف سے گالیاں اور دھمکیاں سُننی پڑتی ہیں۔ کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ یہاں تک کہ اُن کو کہا جاتا ہے کہ ہم تم کو یہاں سے نکال دیں گے یا اگر ملازم ہے تو اس کے موقوف کرانے کے منصوبے ہوتے ہیں۔ جس طرح ممکن ہوتا ہے تکلیفیں پہنچائی جاتی ہیں اور اگر ممکن ہو تو جان لینے سے دریغ نہیں کیا جاتا۔ ایسے وقت میں جو لوگ ان دھمکیوں کی پرواہ کرتے ہیں اور امتحان کے ڈر سے کمزوری ظاہر کرتے ہیں۔ یاد رکھو خدا تعالیٰ کے نزدیک اُن کے ایمان کی ایک پیسہ بھی قیمت نہیں ہے کیونکہ وہ اِبتلاء کے وقت خدا تعالیٰ سے نہیں انسان سے ڈرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی عظمت و جبروت کی پرواہ نہیں کرتا وہ بالکل ایمان نہیں لایا کیونکہ دھمکی کو اس کے مقابلہ میں وقعت دیتا اور ایمان چھوڑنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ صالحین میں داخل ہونے سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ خلاصہ اور مفہوم ہے اِس آیت کا وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳ مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۱-۲)

۱۸۔ اِنَّمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْثَانًا وَّ تَخْلُقُوْنَ اِفْكًا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ ؕ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○

تم اے مشرکو بجز خدا کے صرف بے جان بُتوں کی پرستش کرتے ہو اور سراسر جھوٹ پر جم رہے ہو۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۴۳۷ حاشیہ در حاشیہ)

۳۷۔ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۙ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ

وَارْجُوا الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝

اور فساد کی نیت سے زمین پر مت پھرا کر۔ یعنی اس نیت سے کہ چوری کریں یا ڈاکہ ماریں یا کسی کی جیب کتریں یا کسی اور ناجائز طریق سے بیگانہ مال پر قبضہ کریں اور پھر فرمایا کہ تم اچھی چیزوں کے عوض میں خبیث اور ردّی چیزیں نہ دیا کرو.....

اِن تمام آیات میں خدا تعالیٰ نے تمام طریقے بددیانتی کے بیان فرما دیئے اور ایسا کلام کلّی کے طور پر فرمایا جس میں کسی بددیانتی کا ذکر باہر نہ رہ جائے۔ صرف یہ نہیں کہا کہ تُو چوری نہ کرتا ایک نادان یہ نہ سمجھ لے کہ چوری تو میرے لئے حرام ہے مگر دوسرے ناجائز طریقے سب حلال ہیں۔ اس کلمہ جامع کے ساتھ تمام ناجائز طریقوں کو حرام ٹھہرانا یہی حکمت بیانی ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۳۳، ۳۴)

۴۴ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۝

جس طرح آفتاب کا قدر آنکھ ہی سے پیدا ہوتا ہے اور روزِ روشن کے فوائد اہلِ بصارت ہی پر ظاہر ہوتے ہیں اسی طرح خدا کی کلام کا کامل طور پر اُنہیں کو قدر ہوتا ہے کہ جو اہلِ عقل ہیں جیسا کہ خدائے تعالیٰ نے آپ فرمایا ہے وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ یعنی یہ مثالیں ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں پر ان کو معقول طور پر وہی سمجھتے ہیں کہ جو صاحبِ علم اور دانشمند ہیں۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۲۱۷ حاشیہ)

۴۶ اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ ۝

نماز میں لذّت اور سرور بھی عبودیّت اور ربوبیّت کے ایک تعلق سے پیدا ہوتا ہے۔ جب تک

اپنے آپ کو عدمِ محض یا مشابہ بالعدم قرار دے کر جو ربوبیت کا ذاتی تقاضا ہے نہ ڈال دے اس کا فیضان اور پر تَو اس پر نہیں پڑتا اور اگر ایسا ہو تو پھر اعلیٰ درجہ کی لذّت حاصل ہوتی ہے جس سے بڑھ کر کوئی حظّ نہیں ہے۔ اس مقام پر انسان کی رُوح جب ہمہ نیستی ہو جاتی ہے تو وہ خدا کی طرف ایک چشمہ کی طرح بہتی ہے اور ماسوی اللہ سے اُسے اِنقطاع ہو جاتا ہے اس وقت خدائے تعالیٰ کی محبّت اس پر گرتی ہے۔ اِس اِتصال کے وقت ان دو جوشوں سے جو اُوپر کی طرف سے ربوبیّت کا جوش اور نیچے کی طرف سے عبودیت کا جوش ہوتا ہے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کا نام صلوٰۃ ہے جو سیئات کو بھسم کر جاتی ہے اور اپنی جگہ ایک نور اور چمک چھوڑ دیتی ہے جو سالک کو راستہ کے خطرات اور مشکلات کے وقت ایک منوّر شمع کا کام دیتی ہے اور ہر قسم کے خس و خاشاک اور ٹھوکر کے پتھروں اور خار و خس سے جو اس کی راہ میں ہوتے ہیں آگاہ کر کے بچاتی ہے اور یہی وہ حالت ہے جبکہ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ کا اطلاق اس پر ہوتا ہے کیونکہ اس کے ہاتھ میں نہیں نہیں اس کے شمع دانِ دِل میں ایک روشن چراغ رکھا ہوا ہوتا ہے اور یہ درجہ کامل تذلّل کامل نیستی اور فروتنی اور پوری اطاعت سے حاصل ہوتا ہے پھر گناہ کا خیال اُسے آ کیونکر سکتا ہے اور انکار اس میں پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ فحشاء کی طرف اس کی نظر اُٹھ ہی نہیں سکتی۔ غرض اسے ایسی لذّت، ایسا سرور حاصل ہوتا ہے کہ مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ اسے کیونکر بیان کروں۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۳ عـ۱ صـ۶

الحکم جلد ۳ عـ۱۳ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۸۹۹ء صـ۵-۶)

نماز ہی ایک ایسی نیکی ہے جس کے بجا لانے سے شیطانی کمزوری دُور ہوتی ہے اور اسی کا نام دعا ہے شیطان چاہتا ہے کہ انسان اس میں کمزور رہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ جس قدر اِصلاح اپنی کرے گا وہ اِسی ذریعہ سے کرے گا۔ پس اس کے واسطے پاک صاف ہونا شرط ہے..... جب تک گندگی اِنسان میں ہوتی ہے اُس وقت تک شیطان اس سے محبّت کرتا ہے۔ (البدر جلد ۲ عـ۴ مورخہ ۱۳ فروری ۱۹۰۳ء صـ۲۷)

اپنے دِلوں میں خدا تعالیٰ کی محبّت اور عظمت کا سِلسلہ جاری رکھیں اور اس کے لئے نماز سے بڑھ کر اَور کوئی شئی نہیں ہے کیونکہ روزہ تو ایک سال کے بعد آتے ہیں اور زکوٰۃ صاحبِ مال کو دینی پڑتی ہے مگر نماز ہے کہ ہر ایک (حیثیت کے آدمی کو) پانچوں وقت ادا کرنی پڑتی ہے اسے ہرگز ضائع نہ کریں۔ اسے بار بار پڑھو اور اِس خیال سے پڑھو کہ مَیں ایسی طاقت والے کے سامنے کھڑا ہوں کہ اگر اس کا ارادہ ہو تو ابھی قبول کر لیوے اسی حالت میں بلکہ اسی ساعت میں بلکہ اسی سیکنڈ میں۔ کیونکہ دوسرے دنیوی حاکم تو خزانوں کے محتاج ہیں اور اُن کو فکر ہوتی ہے کہ خزانہ خالی نہ ہو جاوے اور ناداری کا اُن کو فکر لگا رہتا

ہے مگر خدا تعالیٰ کا خزانہ ہروقت بھرا بھرا یا ہے۔ جب اس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو صرف یقین کی حاجت ہوتی ہے کہ اُسے اس امر پر یقین ہو کہ میں ایک سمیع، علیم اور خبیر اور قادر ہستی کے سامنے کھڑا ہوا ہوں اگر اُسے لہر آجاوے تو ابھی دے دیوے۔ بڑی تضرع سے دعا کرے نا اُمید اور بدظنی ہرگز نہ ہووے اور اگر اس طرح کرے تو (اس راحت کو) جلدی دیکھ لے گا اور خدا تعالیٰ کے اور اور فضل بھی شاملِ حال ہوں گے اور خود خدا بھی ملے گا۔ تو یہ طریق ہے جس پر کاربند ہونا چاہیئے۔ مگر ظالم فاسق کی دعا قبول نہیں ہوا کرتی کیونکہ وہ خدا تعالیٰ سے لاپرواہ ہے اور خدا تعالیٰ بھی اس سے لاپرواہ ہے۔ ایک بیٹا اگر باپ کی پرواہ نہ کرے اور ناخلف ہو تو باپ کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی تو خدا کو کیوں ہو۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۴ مورخہ ۱۳ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۹)

نماز بھی گناہوں سے بچنے کا ایک آلہ ہے۔ نماز کی یہ صفت ہے کہ انسان کو گناہ اور بدکاری سے ہٹا دیتی ہے سو تم ویسی نماز کی تلاش کرو اور اپنی نماز کو ایسی بنانے کی کوشش کرو۔ نماز نعمتوں کی جان ہے اللہ تعالیٰ کے فیض اسی نماز کے ذریعہ سے آتے ہیں سو اس کو سنوار کر ادا کرو تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی نعمت کے وارث بنو۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

نماز ہر ایک مسلمان پر فرض ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک قوم اسلام لائی اور عرض کی کہ یا رسول اللہ ہمیں نماز معاف فرما دی جائے کیونکہ ہم کاروباری آدمی ہیں۔ مویشی وغیرہ کے سبب سے کپڑوں کا کوئی اعتماد نہیں ہوتا اور نہ ہمیں فرصت ہوتی ہے تو آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ دیکھو جب نماز نہیں تو ہے ہی کیا؟ وہ دین ہی نہیں جس میں نماز نہیں۔ نماز کیا ہے؟ یہی کہ اپنے عجز و نیاز اور کمزوریوں کو خدا کے سامنے پیش کرنا اور اسی سے اپنی حاجت روائی چاہنا۔ کبھی اس کی عظمت اور اس کے احکام کی بجاآوری کے واسطے دست بستہ کھڑا ہونا اور کبھی کمال مذلت اور فروتنی سے اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔ اس سے اپنی حاجات کا مانگنا یہی نماز ہے۔ ایک سائل کی طرح کبھی اس مسئول کی تعریف کرنا کہ تُو ایسا ہے تُو ایسا ہے۔ اس کی عظمت اور جلال کا اظہار کر کے اس کی رحمت کو جنبش دلانا پھر اس سے مانگنا۔ پس جس دین میں یہ نہیں وہ دین ہی کیا ہے۔

انسان ہر وقت محتاج ہے اس سے اس کی رضا کی راہیں مانگتا رہے اور اس کے فضل کا اسی سے خواستگار ہو کیونکہ اسی کی دی ہوئی توفیق سے کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اے خدا ہم کو توفیق دے کہ ہم تیرے ہو جائیں اور تیری رضا پر کاربند ہو کر تجھے راضی کر لیں۔ خدا کی محبت، اسی کا خوف، اسی کی یاد میں دل لگا رہنے کا نام نماز ہے اور یہی دین ہے۔

پھر جو شخص نماز ہی سے فراغت حاصل کرنی چاہتا ہے اُس نے حیوانوں سے بڑھ کر کیا کیا؟ وہی کھانا پینا اور حیوانوں کی طرح سو رہنا۔ یہ تو دین ہرگز نہیں۔ یہ سیرتِ کفار ہے بلکہ جو دَم غافل وہ دَم کافر والی بات بالکل راست اور صحیح ہے۔

چنانچہ قرآن شریف میں ہے کہ اُذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنَ یعنی اے میرے بندو تم مجھے یاد کیا کرو اور میری یاد میں مصروف رہا کرو مَیں بھی تم کو نہ بھولوں گا تمہارا خیال رکھوں گا۔ اور میرا شکر کیا کرو اور میرے انعامات کی قدر کیا کرو اور کفر نہ کیا کرو۔ اِس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ذکرِ الٰہی کے ترک اور اس سے غفلت کا نام کفر ہے۔ پس جو دَم غافل وہ دَم کافر والی بات صاف ہے۔ یہ پانچ وقت تو خدا تعالیٰ نے بطور نمونہ کے مقرر فرمائے ہیں ورنہ خدا کی یاد میں تو ہر وقت دِل کو لگا رہنا چاہیئے اور کبھی کِسی وقت بھی غافل نہ ہونا چاہیئے۔ اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے ہر وقت اسی کی یاد میں غرق ہونا بھی ایک ایسی صفت ہے کہ انسان اس سے انسان کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے اور خدا تعالیٰ پر کسی طرح کی امید اور بھروسہ کرنے کا حق رکھ سکتا ہے۔

اصل میں قاعدہ ہے کہ اگر انسان نے کسی خاص منزل پر پہنچنا ہے اس کے واسطے چلنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جتنی لمبی وہ منزل ہو گی اتنا ہی زیادہ تیزی، کوشش اور محنت اور دیر تک اسے چلنا ہو گا۔ سو خدا (تعالیٰ) تک پہنچنا بھی تو ایک منزل ہے اور اس کا بُعد اور دُوری بھی لمبی۔ پس جو شخص خدا (تعالیٰ) سے مِلنا چاہتا ہے اور اس کے دربار میں پہنچنے کی خواہش رکھتا ہے اس کے واسطے نماز ایک گاڑی ہے جس پر سوار ہو کر وہ جلد تر پہنچ سکتا ہے اور جس نے نماز ترک کر دی وہ کیا پہنچے گا۔

اصل میں مسلمانوں نے جب سے نماز کو ترک کیا یا اُسے دِل کی تسکین، آرام اور محبت سے اس کی حقیقت سے غافل ہو کر پڑھنا ترک کیا ہے تب ہی سے اِسلام کی حالت بھی معرضِ زوال میں آئی ہے۔ وہ زمانہ جس میں نمازیں سنوار کر پڑھی جاتی تھیں۔ غور سے دیکھ لو کہ اسلام کے واسطے کیسا تھا۔ ایک دفعہ تو اسلام نے تمام دُنیا کو زیر پا کر دیا تھا۔ جب سے اسے ترک کیا وہ خود متروک ہو گئے ہیں۔ دردِ دل سے پڑھی ہوئی نماز ہی ہے کہ تمام مشکلات سے انسان کو نکال لیتی ہے۔ ہمارا بارہا کا تجربہ ہے کہ اکثر کسی مشکل کے وقت دعا کی جاتی ہے ابھی نماز میں ہی ہوتے ہیں کہ خدا نے اِس امر کو حل اور آسان کر دیا ہوا ہوتا ہے۔

نماز میں کیا ہوتا ہے یہی کہ عرض کرتا ہے، اِلتجا کے ہاتھ بڑھاتا ہے اور دوسرا اس کی عرض کو اچھی طرح سُنتا ہے۔ پھر ایک ایسا وقت بھی ہوتا ہے کہ جو سُنتا تھا وہ بولتا ہے اور گذارش کرنے والے کو جواب دیتا ہے۔ نمازی کا یہی حال ہے۔ خدا کے آگے سربسجود رہتا ہے اور خدا تعالیٰ کو اپنے مصائب اور

حوائج سناتا ہے۔ پھر آخر سچی اور حقیقی نماز کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ایک وقت جلد آجاتا ہے کہ خدا تعالیٰ اسکے جواب کے واسطے بولتا اور اس کو جواب دے کر تسلی دیتا ہے۔ بھلا یہ بجز حقیقی نماز کے ممکن ہے۔ ہرگز نہیں اور پھر جن کا خدا ہی ایسا نہیں وہ بھی گئے گذرے ہیں۔ اُن کا کیا دین اور کیا ایمان ہے۔ وہ کس امید پر اپنے اوقات ضائع کرتے ہیں۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

نماز کیا ہے؟ ایک قسم کی دعا ہے جو انسان کو تمام بُرائیوں اور فواحش سے محفوظ رکھ کر حسنات کا مستحق اور انعامِ الٰہیہ کا مورد بنا دیتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ اللہ اسم اعظم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام صفات کو اس کے تابع رکھا ہے۔ اب ذرا غور کرو نماز کی ابتداء اذان سے شروع ہوتی ہے۔ اذان اللہ اکبر سے شروع ہوتی ہے یعنی اللہ کے نام سے شروع ہو کر لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یعنی اللہ ہی پر ختم ہوتی ہے۔ یہ فخر اسلامی عبادت ہی کو ہے کہ اس میں اوّل اور آخر میں اللہ تعالیٰ ہی مقصود ہے نہ کچھ اور۔ مَیں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اس قسم کی عبادت کسی قوم اور ملّت میں نہیں ہے۔ پس نماز جو دعا ہے اور جس میں اللہ کو جو خدائے تعالیٰ کا اسم اعظم ہے مقدم رکھا ہے۔ ایسا ہی انسان کا اسمِ اعظم استقامت ہے۔ اسم اعظم سے مراد یہ ہے کہ جس ذریعہ سے انسانیت کے کمالات حاصل ہوں۔

(منقول از ٹریکٹ نمبر ۱ بعنوان "حضرت اقدس کی ایک تقریر اور مسئلہ وحدۃ الوجود پر ایک خط" مرتبہ حضرت شیخ یعقوب علی صاحب عرفانی صفحہ ۱۸)

نماز ایسی چیز ہے کہ اس سے دُنیا بھی سنور جاتی ہے اور دین بھی ..... نماز تو وہ چیز ہے کہ انسان اس کے پڑھنے سے ہر ایک طرح کی بدعملی اور بے حیائی سے بچایا جاتا ہے مگر جیسا کہ مَیں پہلے بیان کر چکا ہوں اس طرح کی نماز پڑھنی انسان کے اپنے اختیار میں نہیں ہوتی اور یہ طریق خدا کی مدد اور استعانت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اور جب تک انسان دُعاؤں میں نہ لگا رہے اِس طرح کا خشوع اور خضوع پیدا نہیں ہو سکتا اِس لئے چاہیئے کہ تمہارا دن اور تمہاری رات غرض کوئی گھڑی دعاؤں سے خالی نہ ہو۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۖ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ وَقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ

أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَإِلٰهُنَا وَإِلٰهُكُمْ وَاحِدٌ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○

اس مسئلہ میں کسی سمجھدار مسلمان کو اختلاف نہیں کہ دینی حمایت کے لئے ہمیں کسی جوش یا اشتعال کی تعلیم نہیں دی گئی بلکہ ہمارے لئے قرآن میں یہ حکم ہے وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اور دوسری جگہ یہ حکم ہے کہ جَادِلْهُمْ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ اس کے معنے یہی ہیں کہ نیک طور پر اور ایسے طور پر جو مفید ہو عیسائیوں سے مجادلہ کرنا چاہیئے اور حکیمانہ طریق اور ایسے ناصحانہ طور کا پابند ہونا چاہیئے کہ ان کو فائدہ پہنچے۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ہفتم صہ ۳۹)

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَآءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ○ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ○ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ○

مضمون پڑھنے والے نے بیان کیا کہ قرآن بائبل کی نقل ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان لوگوں کی بیباکی اور دروغگوئی یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ دنیا میں کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ قرآن شریف تئیس برس برابر یہود اور نصاریٰ کے رُوبرو اُترتا رہا مگر کسی نے یہ اعتراض نہ کیا کہ قرآن شریف بائبل کی نقل ہے اور خود ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُمّی تھے اور نہ لکھ سکتے تھے اور نہ پڑھ سکتے تھے اور نصاریٰ اور یہود کے علماء سخت دشمن تھے اس صورت میں کیونکر ممکن تھا کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نصاریٰ اور یہود کی کتابوں میں سے کچھ نقل کر سکتے تھے چنانچہ اِس بارے میں قرآن شریف میں یہ آیات ہیں۔ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ وَمِنْ هٰٓؤُلَاۗءِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الْكٰفِرُوْنَ ○ وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ○ بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ○ (ترجمہ) اور اے پیغمبر جس طرح اگلے پیغمبروں پر ہم نے کتابیں اتاری تھیں اسی طرح تجھ پر یہ کتاب اُتاری ہے پس جن کو تجھ سے پہلے ہم نے کتاب دی ہے اُن کے سمجھدار اور سعید لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور ان مشرکین اہلِ مکہ سے بھی سوچنے والے لوگ ایمان لاتے ہیں اور ان دونوں فرقوں میں سے وہ لوگ ایمان نہیں لاتے جنہوں نے دیدہ و دانستہ کفر کو اپنے لئے اختیار کر لیا ہے۔ اور اے پیغمبر! قرآن سے پہلے نہ تو تم کوئی کتاب ہی پڑھتے تھے اور نہ تم اپنے ہاتھ سے کچھ لکھ سکتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو اِن بے دین لوگوں کو شبہ کرنے کی کوئی گنجائش ہوتی مگر اب تو ان کا شبہ سراسر ہٹ دھرمی ہے یعنی جبکہ یہ امر ثابت شدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محض ناخواندہ اور اُمّی تھے اور کوئی نہیں ثابت کر سکا کہ آپؐ لکھ سکتے یا پڑھ سکتے تھے تو پھر ایسے شبہات ایمانداری کے برخلاف ہیں اور پھر فرمایا کہ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جن لوگوں کو قرآن شریف کے حقائق اور معارف کا علم دیا گیا ہے اُن کے نزدیک تو قرآن شریف خدا کے کھلے کھلے نشان ہیں یعنی اعتراض وہی لوگ کرتے ہیں جو قرآن شریف میں کچھ تدبر نہیں کرتے اور اس کے معجزانہ مرتبہ سے بے خبر ہیں اور تدبر کرنے والے تو ایک ہی نظر سے شناخت کر جاتے ہیں کہ یہ کلام انسانی طاقتوں سے برتر ہے کیونکہ وہ اعجازی صفت اپنے اندر رکھتا ہے۔ علاوہ اِس کے یہ کہ وہ عین ضرورت کے وقت آیا ہے اور اس وقت آیا ہے جبکہ دُنیا خدا کے راہ کو بھول چکی تھی اور جن بیماروں کے لئے آیا ان کو اس نے چنگا کر کے دکھلا دیا اور نہ توریت اور نہ انجیل وہ اصلاح کر سکی جو قرآن شریف نے کی کیونکہ توریت کی تعلیم پر چلنے والے یعنی یہودی ہمیشہ بار بار بُت پرستی میں پڑتے رہے۔ چنانچہ تاریخ جاننے والے اس پر گواہ ہیں اور وہ کتابیں کیا باعتبار علمی تعلیم کے اور کیا باعتبار عملی تعلیم کے سراسر ناقص تھیں اِس لئے ان پر چلنے والے بہت جلد گمراہی میں پھنس گئے۔ انجیل پر ابھی تیس۳۰ برس بھی نہیں گزرے تھے کہ بجائے خدا کی پرستش کے ایک عاجز انسان کی پرستش نے جگہ لے لی یعنی حضرت عیسٰیؑ خدا بنائے گئے اور تمام نیک اعمال کو چھوڑ کر ذریعہ معافی گناہ یہ ٹھہرا دیا کہ اُن کے مصلوب ہونے اور خدا کا بیٹا ہونے پر ایمان لایا جائے۔ پس کیا یہی کتابیں تھیں جن کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نقل کی بلکہ سچ تو یہ بات ہے کہ وہ کتابیں آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک ردّی کی طرح ہو چکی تھیں اور بہت جھوٹ ان میں ملائے گئے تھے جیسا کہ کئی جگہ قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے کہ وہ کتابیں محرّف و مبدّل ہیں اور اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہیں چنانچہ اس واقعہ پر اس زمانہ میں بڑے بڑے محقق انگریزوں نے بھی شہادت دی ہے۔

(چشمۂ معرفت صفحہ ۲۵۳ تا ۲۵۵)

اور اس سے پہلے تو کسی کتاب کو نہیں پڑھتا تھا اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا تا باطل پرستوں کو شک کرنے کی کوئی وجہ بھی ہوتی بلکہ وہ آیاتِ بیّنات ہیں جو اہلِ علم لوگوں کے سینوں میں ہیں اور اُن سے انکار وہی لوگ کرتے ہیں جو ظالم ہیں۔

اِن تمام آیات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اُمّی ہونا بکمال وضاحت ثابت ہوتا ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر آنحضرتؐ فی الحقیقت اُمّی اور ناخواندہ نہ ہوتے تو بہت سے لوگ اِس دعوائے اُمّیت کی تکذیب کرنے والے پیدا ہو جاتے کیونکہ آنحضرتؐ نے کسی ایسے ملک میں یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ جس ملک کے لوگوں کو آنحضرتؐ کے حالات اور واقعات سے بے خبر اور ناواقف قرار دے سکیں بلکہ وہ تمام لوگ ایسے تھے جن میں آنحضرتؐ نے ابتداء عمر سے نشوونما پایا تھا اور ایک حصّۂ کلاں عمر اپنی کا اُن کی مخالطت اور مصاحبت میں بسر کیا تھا۔ پس اگر فی الواقع جناب ممدوح اُمّی نہ ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ اپنے اُمّی ہونے کا ان لوگوں کے سامنے نام بھی لے سکتے جن پر کوئی حال ان کا پوشیدہ نہ تھا اور جو ہر وقت اِس گھات میں لگے ہوئے تھے کہ کوئی خلاف گوئی ثابت کریں اور اس کو مشتہر کر دیں۔ جن کا عناد اِس درجہ تک پہنچ چکا تھا کہ اگر بس چل سکتا تو کچھ جھوٹ موٹ سے ہی ثبوت بنا کر پیش کر دیتے اور اسی جہت سے اُن کو اُن کی ہر یک بدظنی پر ایسا مسکت جواب دیا جاتا تھا کہ وہ ساکت اور لاجواب رہ جاتے تھے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۴۷۸-۴۸۱)

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ یعنی قرآن آیاتِ بیّنات ہیں جو اہلِ علم کے سینوں میں ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ اِس آیت کے یہی معنے ہیں کہ مومنوں کو قرآن کریم کا علم اور نیز اس پر عمل عطا کیا گیا ہے اور جبکہ قرآن کی جگہ مومنوں کے سینے ٹھہرے تو پھر یہ آیت کہ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ بجز اس کے اور کیا معنی رکھتی ہے کہ قرآن سینوں سے محو نہیں کیا جائے گا جس طرح کہ توریت اور انجیل یہود اور نصاریٰ کے سینوں سے محو کی گئی اور گو توریت اور انجیل اُن کے ہاتھوں اور اُن کے صندوقوں میں تھی لیکن اُن کے دِلوں سے محو ہو گئی یعنی اُن کے دل اُسی پر قائم نہ رہے اور انہوں نے توریت اور انجیل کو اپنے دلوں میں قائم اور بحال نہ کیا۔ غرض یہ آیت بلند آواز سے پکار رہی ہے

کہ کوئی حصّہ قرآن کا برباد اور ضائع نہیں ہوگا اور جس طرح روزِ اوّل سے اس کا پودا دِلوں میں جمایا گیا یہی سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ (شہادت القرآن صفحہ ۵۴-۵۵)

وَقَالُوا لَوْلَآ أُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَ اِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ شَهِيْدًا ۚ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْبَاطِلِ وَكَفَرُوْا بِاللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ؕ وَلَوْلَآ اَجَلٌ مُّسَمًّى لَّجَآءَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وَلَيَاْتِيَنَّهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

کہتے ہیں کیوں نہ اُتریں اس پر نشانیاں (جو تم مانگتے ہو یعنی عذاب کی نشانیاں) وہ تو خدائے تعالیٰ کے پاس اور خاص اُس کے اختیار میں ہیں اور مَیں تو صرف ڈرانے والا رسول یعنی میرا کام فقط یہ ہے کہ عذاب کے دن سے ڈراؤں نہ یہ کہ اپنی طرف سے عذاب نازل کروں اور پھر فرمایا کہ کیا ان لوگوں کے لئے (جو اپنے پر کوئی عذاب کی نشانی وارد کرانی چاہتے ہیں) یہ رحمت کی نشانی کافی نہیں جو ہم نے تجھ پر (اسے رسول اُمّی) وہ کتاب (جو جامع کمالات ہے) نازل کی جو اُن پر پڑھی جاتی ہے یعنی قرآن شریف جو ایک رحمت کا نشان ہے جس سے درحقیقت وہی مطلب نکلتا ہے جو کفّار عذاب کے نشانوں سے پورا کرنا چاہتے ہیں کیونکہ کفّارِ مکّہ اس غرض سے عذاب کا نشان مانگتے تھے کہ تا وہ ان پر وارد ہو کر انہیں حق الیقین تک

پہنچادے صرف دیکھنے کی چیز نہ رہے کیونکہ مجرد رؤیت کے نشانوں میں اُن کو دھوکے کا اِحتمال تھا اور چشم بندی وغیرہ کا خیال۔ سو اس وہم اور اضطراب کے دُور کرنے کے لئے فرمایا کہ ایسا ہی نشان چاہتے ہو جو تمہارے وجودوں پر وارد ہو جائے تو پھر عذاب کے نشان کی کیا حاجت ہے کیا اس مدّعا کے حاصل کرنے کے لئے رحمت کا نشان کافی نہیں یعنی قرآن شریف جو تمہاری آنکھوں کو اپنے پُر نُور اور تیز شعاعوں سے خیرہ کر رہا ہے اور اپنی ذاتی خوبیاں اور اپنے حقائق اور معارف اور اپنی فوق العادت خواص اس قدر دکھلا رہا ہے جس کے مقابلہ ومعارضہ سے تم عاجز رہ گئے ہو اور تم پر اور تمہاری قوم پر ایک خارق عادت اثر ڈال رہا ہے اور دِلوں پر وارد ہو کر عجیب درعجیب تبدیلیاں دکھلا رہا ہے۔ مدتہائے دراز کے مُردے اُس سے زندہ ہوتے چلے جاتے ہیں اور مادر زاد اندھے جو بے شمار پُشتوں سے اندھے ہی چلے آتے تھے آنکھیں کھول رہے ہیں اور کفر اور الحاد کی طرح طرح کی بیماریاں اُس سے اچھی ہوتی چلی جاتی ہیں اور تعصب کے سخت جذامی اُس سے صاف ہوتے جاتے ہیں۔ اُس سے نُور ملتا ہے اور ظلمت دُور ہوتی ہے اور وصلِ الٰہی میسّر آتا ہے اور اس کے علامات پیدا ہوتے ہیں سو تم کیوں اس رحمت کے نشان کو چھوڑ کر جو ہمیشہ کی زندگی بخشتا ہے عذاب اور موت کا نشان مانگتے ہو۔ پھر بعد اس کے فرمایا کہ یہ قوم تو جلدی سے عذاب ہی مانگتی ہے رحمت کے نشانوں سے فائدہ اُٹھانا نہیں چاہتی اُن کو کہہ دے کہ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ عذاب کی نشانیاں البتہ باوقات ہوتی ہیں تو یہ عذابی نشانیاں بھی کب کی نازل ہو گئی ہوتیں اور عذاب ضرور آئے گا اور ایسے وقت میں آئیگا کہ اُن کو خبر بھی نہیں ہوگی۔

اب اِنصاف سے دیکھو کہ اِس آیت میں کہاں معجزات کا انکار پایا جاتا ہے۔ یہ آیتیں تو بآوازِ بلند پکار رہی ہیں کہ کفّار نے ہلاکت اور عذاب کا نشان مانگا تھا سو اوّل انہیں کہا گیا کہ دیکھو تم میں زندگی بخش نشان موجود ہے یعنی قرآن جو تم پر وارد ہو کر تمہیں ہلاک کرنا نہیں چاہتا بلکہ ہمیشہ کی حیات بخشتا ہے مگر جب عذاب کا نشان تم پر وارد ہُوا تو وہ تمہیں ہلاک کرے گا۔ پس کیوں تم ناحق اپنا مرنا ہی چاہتے ہو اور اگر تم عذاب ہی مانگتے ہو تو یاد رکھو کہ وہ بھی جلد آئے گا۔ پس اللہ جلّ شانہٗ نے اِن آیات میں عذاب کے نشان کا وعدہ دیا اور قرآن شریف میں جو رحمت کے نشان ہیں اور دِلوں پر وارد ہو کر اپنا خارق عادت اثر ان پر ظاہر کرتے ہیں اُن کی طرف توجہ دلائی پر معترض کا یہ گمان کہ اِس آیت میں لا نافیہ جنس معجزات کی نفی پر دلالت کرتا ہے جس سے کُل معجزات کی نفی لازم آتی ہے محض صرف ونحو سے ناواقفیت کی وجہ سے ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ نفی کا اثر اُسی حد تک محدود ہوتا ہے جو متکلم کے ارادہ میں متعیّن ہوتی ہے خواہ وہ ارادہ تصریحًا بیان کیا گیا ہو یا اشارۃً۔ مثلاً کوئی کہے کہ اب سردی کا نام ونشان باقی نہیں رہا تو

ظاہر ہے کہ اُس نے اپنی بلدہ کی حالت موجودہ کے موافق کہا ہے اور گو اس نے بظاہر اپنے شہر کا نام بھی نہیں لیا مگر اس کے کلام سے یہ سمجھنا کہ اُس کا یہ دعویٰ ہے کہ کل کوہستانی ملکوں سے بھی سردی جاتی رہی اور سب جگہ سخت اور تیز دھوپ پڑنے لگی اور اُس کی دلیل یہ پیش کرنا کہ جس لَا کو اُس نے استعمال کیا ہے وہ نفی جنس کا لَا ہے جس کا تمام جہان پر اثر پڑنا چاہیئے درست نہیں۔ مکّہ کے مغلوب بُت پرست جنہوں نے آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور آنجناب کے معجزات کو معجزہ کرکے مان لیا اور جو کفر کے زمانہ میں بھی صرف خشک منکر نہیں تھے بلکہ روم و ایران میں بھی جاکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو متعجبانہ خیال سے ساحر مشہور کرتے تھے اور گو بےجا پیرایوں میں ہی سہی مگر نشانوں کا اقرار کر لیا کرتے تھے جن کے اقرار قرآن شریف میں موجود ہیں۔ وہ اپنے ضعیف اور کمزور کلام میں جو انوارِ ساطعہ نبوّتِ محمّدیہ کے نیچے دبے ہوئے تھے کیوں لَا نافیہ استعمال کرنے لگے۔ اگر ان کو ایسا ہی لمبا چوڑا انکار ہوتا تو وہ بالآخر نہایت درجہ کے یقین سے جو انہوں نے اپنے خونوں کے بہانے اور اپنی جانوں کے فدا کرنے سے ثابت کر دیا تھا مشرف باسلام کیوں ہو جاتے اور کفر کے ایام میں جو اُن کے بار بار کلمات قرآن شریف میں درج ہیں وہ یہی ہیں کہ وہ اپنی کوتاہ بینی کے دھوکہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام ساحر رکھتے تھے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے وَاِنۡ یَّرَوۡا اٰیَۃً یُّعۡرِضُوۡا وَیَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ یعنی جب کوئی نشان دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ پکا جادو ہے۔ پھر دوسری جگہ فرماتا ہے وَعَجِبُوۡۤا اَنۡ جَآءَہُمۡ مُّنۡذِرٌ مِّنۡہُمۡ ۫ وَقَالَ الۡکٰفِرُوۡنَ ہٰذَا سٰحِرٌ کَذَّابٌ یعنی انہوں نے اِس بات سے تعجب کیا کہ انہیں میں سے ایک شخص اُن کی طرف بھیجا گیا اور بے ایمانوں نے کہا کہ یہ تو جادوگر کذّاب ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جبکہ وہ نشانوں کو دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جادوگر کہتے تھے اور پھر اس کے بعد انہیں نشانوں کو معجزہ کرکے مان بھی لیا اور جزیرہ کا جزیرہ مسلمان ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاک معجزات کا ہمیشہ کے لئے سچے دل سے گرویدہ بن گیا تو پھر ایسے لوگوں سے کیونکر ممکن ہے کہ وہ عام طور پر نشانوں سے صاف منکر ہو جاتے اور انکارِ معجزات میں ایسا لَا نافیہ استعمال کرتے جو ان کی حدِ حوصلہ سے باہر اور ان کی مستمر رائے سے بعید تھا بلکہ قرائن سے آفتاب کی طرح ظاہر ہے کہ جس جس جگہ پر قرآن شریف میں کفّار کی طرف سے یہ اعتراض لکھا گیا ہے کہ کیوں اس پیغمبر پر کوئی نشانی نہیں اُتری۔ ساتھ ہی یہ بھی بتلا دیا گیا ہے کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ جو نشانیاں ہم مانگتے ہیں اُن میں کوئی نشانی کیوں نہیں اُترتی۔ اب قصّہ کوتاہ یہ کہ آپ نے آیتِ متذکرہ بالا کے لَا نافیہ کو قرائن کی حد سے زیادہ کھینچ دیا ہے۔ ایسا لَا نافیہ عربوں کے کبھی خواب میں بھی نہیں آیا ہوگا۔ اُن کے دل تو اسلام کی حقیقت سے بھرے ہوئے تھے تب ہی تو سب کے سب بجز معدودے چند

کہ جو اُس عذاب کو پہنچ گئے تھے جس کا اُن کو وعدہ دیا گیا تھا بالآخر مشرف بالاسلام ہو گئے تھے اور یاد رہے کہ ایسا لاؔ نافیہ حضرت مسیح کے کلام میں بھی پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے۔ فریسیوں نے مسیح کے نشانات طلب کئے اُس نے آہ کھینچ کر کہا کہ اس زمانہ کے لوگ کیوں نشان چاہتے ہیں۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اِس زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان نہیں دیا جائے گا۔ دیکھو مرقس باب۸۔

اب دیکھو کیسا حضرت مسیح نے صفائی سے انکار کر دیا ہے۔ اگر غور فرمائیں تو آپ کا اعتراض اس اعتراض کے آگے کچھ بھی چیز نہیں کیونکہ آپ نے فقط کفار کا انکار پیش کیا اور وہ بھی نہ عام انکار بلکہ خاص نشانات کے بارے میں۔ اور ظاہر ہے کہ دشمن کا انکار بکلی قابل اطمینان نہیں ہوتا کیونکہ دشمن خلاف واقع بھی کہہ جاتا ہے مگر حضرت مسیح تو آپ اپنے مُنہ سے معجزات کے دکھلانے سے انکار کر رہے ہیں اور نفی صدورِ معجزات کو زمانہ کے ساتھ متعلق کر دیا ہے اور فرماتے ہیں کہ اس زمانے کے لوگوں کو کوئی نشان دیا نہ جائیگا پس اس سے بڑھ کر انکار معجزات کے بارے میں اور کونسا بیان واضح ہو سکتا ہے اور اس لاؔ نافیہ سے بڑھ کر اَور کونسا لاؔ نافیہ ہوگا۔ (ایک عیسائی کے تین سوال اور اُن کے جوابات صفحہ ۱۲)

واضح ہو کہ قرآن شریف میں نشان مانگنے کے سوالات کفار کی طرف سے صرف ایک دو جگہ نہیں بلکہ کئی مقامات میں یہی سوال کیا گیا ہے اور ان سب مقامات کو بنظرِ یکجائی دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ کفارِ مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین قسم کے نشان مانگا کرتے تھے (۱) وہ نشان جو عذاب کی صورت میں فقط اپنے اقتراح سے کفارِ مکہ نے طلب کئے تھے (۲) دوسرے وہ نشان جو عذاب کی صورت میں یا مقدمۂ عذاب کی صورت میں پہلی اُمتوں پر وارد کئے گئے تھے (۳) تیسرے وہ نشان جس سے پردۂ غیبی بکلی اُٹھ جائے جس کا اُٹھ جانا ایمان بالغیب کی بکلی برخلاف ہے سو عذاب کے نشانات ظاہر ہونے کے لئے جو سوال کئے گئے ہیں ان کا جواب تو قرآن شریف میں یہی دیا گیا ہے کہ تم منتظر رہو۔ عذاب نازل ہوگا۔ ہاں ایسی صورت کا عذاب نازل کرنے سے انکار کیا گیا ہے جس کی پہلی تکذیب ہو چکی ہے تاہم عذاب نازل ہونیکا وعدہ دیا گیا ہے جو آخر غزوات کے ذریعہ سے پورا ہو گیا لیکن تیسری قسم کا نشان دکھلانے سے بکلی انکار کیا گیا ہے اور خود ظاہر ہے کہ ایسے سوال کا جواب انکار ہی تھا نہ اَور کچھ کیونکہ کفار کہتے تھے کہ ہم تب ایمان لائیں گے کہ جب ہم ایسا نشان دیکھیں کہ زمین سے آسمان تک ایک نردبان رکھی جائے اور تو ہمارے دیکھتے دیکھتے اُس نردبان کے ذریعہ سے زمین سے آسمان پر چڑھ جائے اور فقط تیرا آسمان پر چڑھنا ہم ہرگز قبول نہیں کریں گے جب تک آسمان سے ایک ایسی کتاب نہ لاوے جس کو ہم پڑھ لیں اور پڑھیں بھی اپنے ہاتھ میں لے کر۔ یا تو ایسا کر کہ مکہ کی زمین میں جو ہمیشہ پانی کی تکلیف رہتی ہے شام اور عراق کے

ملک کی طرح نہریں جاری ہو جائیں اور جس قدر ابتداءِ دُنیا سے آج تک ہمارے بزرگ مر چکے ہیں سب زندہ ہو کر آجائیں اور اس میں قصی بن کلاب بھی ہو کیونکہ وہ بڈھا ہمیشہ سچ بولتا تھا اُس سے ہم پوچھیں گے کہ تیرا دعویٰ حق ہے یا باطل۔ یہ سخت سخت خود تراشیدہ نشان تھے جو وہ مانگتے تھے اور پھر بھی نہ صاف طور پر بلکہ شرط پر شرط لگانے سے جن کا ذکر قرآن شریف میں جا بجا آیا ہے۔ پس سوچنے والے کے لئے عرب کے شریروں کی ایسی درخواستیں ہمارے سید و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات ظاہرہ و آیاتِ بیّنہ و رسولانہ ہیئت پر صاف اور کُھلی کُھلی دلیل ہے۔ خدا جانے ان دِل کے اندھوں کو ہمارے مولیٰ و آقا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے انوارِ صداقت نے کس درجہ تک عاجز و تنگ کر رکھا تھا اور کیا کچھ آسمانی تائیدات و برکات کی بارشیں ہو رہی تھیں کہ جن سے خیرہ ہو کر اور جن کی ہیئت سے مُنہ پھیر کر سراسر ٹالنے اور بھاگنے کی غرض سے ایسی دُور از صواب درخواستیں پیش کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے معجزات کا دکھلانا ایمان بالغیب کی حد سے باہر ہے۔ یوں تو اللہ جلّ شانہٗ قادر ہے کہ زمین سے آسمان تک زینہ رکھ دیوے جس کو سب لوگ دیکھ لیویں اور دو چار ہزار کیا دو چار کروڑ آدمیوں کو زندہ کر کے اُن کے مُنہ سے ان کی اولاد کے سامنے صدقِ نبوت کی گواہی دلا دیوے۔ یہ سب کچھ وہ کر سکتا ہے مگر ذرا سوچ کر دیکھو کہ اس انکشافِ تام سے ایمان بالغیب جو مدارِ ثواب اور اجر ہے دُور ہو جاتا ہے اور دُنیا نمونۂ محشر ہو جاتی ہے پس جس طرح قیامت کے میدان میں جو انکشافِ تام کا وقت ہو گا ایمان کام نہیں آتا۔ اسی طرح اس انکشافِ تام سے بھی ایمان لانا کچھ مفید نہیں بلکہ ایمان اسی حد تک ایمان کہلاتا ہے کہ جب کچھ اخفا بھی باقی رہے۔ جب سارے پردے کُھل گئے تو پھر ایمان ایمان نہیں رہتا۔ اِسی وجہ سے سارے نبی ایمان بالغیب کی رعایت سے مُعجزے دکھلاتے رہے ہیں کبھی کسی نبی نے ایسا نہیں کیا کہ ایک شہر کا شہر زندہ کر کے اُن سے اپنی نبوت کی گواہی دلا دے یا آسمان تک نردبان رکھ کر اور سب کے رُوبرو چڑھ کر تمام دُنیا کو تماشا دکھلا دے۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور اُن کے جوابات صفحہ ۱۲ حاشیہ)

دیکھو! کسی خاص شخص کی پرواہ نہ خدا کو منظور ہُوا کرتی ہے اور نہ ہی اس کے رسول کسی خاص شخص کی ہدایت کے لئے زور دیا کرتے ہیں بلکہ ان کی دعائیں اور اضطراب عام خلقِ خدا کے واسطے ہوتے ہیں دیکھو رسولِ اکرمؐ سے بھی معجزات مانگے گئے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے کیا جواب دیا وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ اللہ تعالیٰ نے اِقتراح کو منع کیا ہے اور تجربہ بتاتا ہے کہ اقتراح کرنے والے لوگ ہمیشہ ہدایت سے محروم ہی رہتے ہیں کیونکہ خدا نہ ان کی مرضی اور خواہشات کا تابع ہوتا

ہے اور نہ وہ ہدایت پاتے ہیں۔ دیکھو جب نشانات اور معجزات اقتراحی رنگ میں طلب کئے گئے جب ہی یہی جواب ملا قُلْ سُبْحَانَ رَبِّیْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔

(الحکم جلد ۱۲ ۲۴ مورخہ ۲ اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ یعنی ان کو کہہ دو کہ نشان اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں جس نشان کو چاہتا ہے اسی نشان کو ظاہر کرتا ہے بندہ کا اس پر زور نہیں ہے کہ جبر کے ساتھ اس سے ایک نشان لیوے یہ جبر اور اقتدار تو آپ ہی کی کتابوں میں پایا جاتا ہے بقول آپ کے مسیح اقتداری معجزات دکھلاتا تھا اور اس نے شاگردوں کو بھی اقتدار بخشا اور آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ اب بھی حضرت مسیحؑ زندہ حیّ وقیّوم، قادرِ مطلق، عالم الغیب دن رات آپ کے ساتھ ہے جو چاہو وہی دے سکتا ہے۔ پس آپ حضرت مسیحؑ سے درخواست کریں کہ ان تینوں بیماروں کو آپ کے ہاتھ رکھنے سے اچھا کر دیویں تا نشانی ایمان داری کی آپ میں باقی رہ جاوے ورنہ یہ تو مناسب نہیں کہ ایک طرف اہلِ حق کے ساتھ بحیثیت سچے عیسائی ہونے کے مباحثہ کریں اور جب سچے عیسائی کے نشان مانگے جائیں تب کہیں کہ ہم میں استطاعت نہیں۔ اِس بیان سے تو آپ اپنے پر ایک اقبالی ڈگری کراتے ہیں کہ آپ کا مذہب اِس وقت زندہ مذہب نہیں ہے لیکن ہم جس طرح پر خدا تعالیٰ نے ہمارے سچے ایمان دار ہونے کے نشان ٹھہرائے ہیں اس التزام سے نشان دکھلانے کو تیار ہیں۔ اگر نشان نہ دکھلا سکیں تو جو سزا چاہیں دے دیں اور جس طرح کی چھری چاہیں ہمارے گلے میں پھیر دیں اور وہ طریق نشان نمائی کا جس کے لئے ہم مامور ہیں وہ یہ ہے کہ ہم خدا تعالیٰ سے جو ہمارا سچا اور قادر خدا ہے اس مقابلہ کے وقت جو ایک سچے اور کامل نبی کا اِنکار کیا جاتا ہے تضرع سے کوئی نشان مانگیں تو وہ اپنی مرضی سے نہ ہمارا محکوم اور تابع ہو کر جس طرح چاہے گا نشان دکھلائے گا۔ آپ خوب سوچیں کہ حضرت مسیحؑ بھی باوجود آپ کے اِس قدر غلو کے اقتداری نشان دکھلانے سے عاجز رہے۔ دیکھئے مرقس باب ۸ آیت ۱۱-۱۲ میں لکھا ہے "تب فریسی نکلے اور اس سے حجّت کر کے یعنی جس طرح اب اِس وقت مجھ سے حجّت کی گئی اس کے اِمتحان کے لئے آسمان سے کوئی نشان چاہا اس نے اپنے دِل سے آہ کھینچ کر کہا کہ اس زمانہ کے لوگ کیوں نشان چاہتے ہیں، مَیں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس زمانہ کے لوگوں کو کوئی نشان دیا نہ جائے گا۔ اب دیکھئے کہ یہودیوں نے اسی طرز سے نشان مانگا تھا۔ حضرت مسیحؑ نے آہ کھینچ کر نشان دکھلانے سے انکار کر دیا۔ پھر اس سے بھی عجب طرح کا ایک اور مقام دیکھئے کہ جب مسیحؑ صلیب پر کھینچے گئے تو تب یہودیوں نے کہا کہ اس نے اَوروں کو بچایا پر آپ کو نہیں بچا سکتا اگر اسرائیل کا بادشاہ ہے تو اب صلیب سے اُتر آوے تو ہم اس پر ایمان لاویں گے۔ اب ذرا نظرِ غور سے اِس آیت کو سوچیں کہ یہودیوں نے صاف عہد اور اقرار کر لیا تھا کہ اب صلیب سے اُتر آوے تو وہ ایمان

لاویں گے لیکن حضرت مسیح اُتر نہیں سکے۔ ان تمام مقامات سے صاف ظاہر ہے کہ نشان دکھلانا اقتداری طور پر انسان کا کام نہیں ہے بلکہ خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جیسا کہ ایک اور مقام میں حضرت مسیح فرماتے ہیں یعنی متی باب ۱۲ آیت ۳۸ کہ اس زمانہ کے بد اور حرامکار لوگ نشان ڈھونڈتے ہیں پر یونس نبی کے نشان کے سوا کوئی نشان دکھلایا نہ جائے گا۔ اب دیکھئے کہ اس جگہ حضرت مسیح نے ان کی درخواست کو منظور نہیں کیا بلکہ وہ بات پیش کی جو خدا تعالیٰ کی طرف سے ان کو معلوم تھی۔ اسی طرح میں بھی وہ بات پیش کرتا ہوں جو خدا تعالیٰ کی طرف سے مجھ کو معلوم ہے۔ میرا دعویٰ نہ خدائی کا اور نہ اقتدار کا اور میں ایک مسلمان آدمی ہوں جو قرآن شریف کی پیروی کرتا ہوں اور قرآن شریف کی تعلیم کی رو سے اس موجودہ نجات کا مدعی ہوں۔

(جنگِ مقدس صفحہ ۶۱، ۶۲ روئیداد ۲۶ مئی ۱۸۹۳ء)

۲۰ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ثُمَّ اِلَيْنَا تُرْجَعُوْنَ۝

بغیر مرنے کے کوئی اس جہان سے ہمیشہ کے لئے رخصت نہیں ہو سکتا۔ وجہ یہ کہ اس دنیا سے نکلنے اور بہشت میں داخل ہونے کا موت ہی دروازہ ہے كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۴۵۱)

ہر نفس موت کا مزا چکھے گا اور پھر ہماری طرف واپس کئے جاؤ گے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۲)

۲۱ وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۝

وہ کامل حیات جو اس سفلی دنیا کے چھوڑنے کے بعد ملتی ہے وہ جسم خاکی کی حیات نہیں بلکہ اور رنگ اور شان کی حیات ہے۔ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۶۱۶)

۲۲ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ۝

افتراء کی بھی ایک حد ہوتی ہے اور مفتری ہمیشہ خائب و خاسر رہتا ہے قَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى اور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ اگر تو اِفترا کرے تو تیری رگِ جان ہم کاٹ ڈالیں گے اور ایسا ہی فرمایا مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا ایک شخص ان باتوں پر ایمان رکھ کر افتراء کی جرأت کیونکر کر سکتا ہے۔ ظاہری گورنمنٹ میں ایک شخص اگر فرضی چپڑاسی بن جائے تو اس کو سزا دی جاتی ہے اور وہ جیل میں بھیجا جاتا ہے تو کیا خدا تعالیٰ کی ہی مقتدر حکومت میں یہ اندھیر ہے؟ کہ کوئی محض جھوٹا دعویٰ مامور من اللہ ہونے کا کرے اور پکڑا نہ جائے بلکہ اس کی تائید کی جائے۔ اِس طرح تو دہریت پھیلتی ہے۔ خدا تعالیٰ کی ساری کتابوں میں لکھا ہے کہ مُفتری ہلاک کیا جاتا ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۱۲ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۴ء صفحہ
بدر جلد ۳ نمبر ۲۰-۲۱ مورخہ ۲۴ مئی و یکم جون ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

۷۰: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۝

بھلا یہ کیونکر ہو سکے کہ جو شخص نہایت لاپروائی سے سُستی کر رہا ہے وہ ایسا ہی خدا کے فیض سے مستفیض ہو جائے جیسے وہ شخص کہ جو تمام عقل اور تمام زور اور تمام اخلاص سے اُس کو ڈھونڈتا ہے۔ اِسی کی طرف ایک دوسرے مقام میں بھی اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے اور وہ یہ ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کو بالضرور اپنی راہیں دکھلا دیا کرتے ہیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۴۷۵ حاشیہ)

یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کریں گے ہم اُن کو وہ اپنی خاص راہیں آپ دکھلا دیں گے جو مجرد عقل اور قیاس سے سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ (سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۲۷ حاشیہ)

جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں اور کریں گے ہم اُن کو اپنی راہیں دکھلا رہے ہیں اور دکھلائیں گے۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر اِس جگہ مجرد استقبال مراد لیا جائے تو اس سے معنے فاسد ہو جائیں گے اور یہ کہنا پڑے گا کہ یہ وعدہ صرف آئندہ کے لئے ہے اور حال میں جو لوگ مجاہدہ میں مشغول ہیں یا پہلے مجاہدات بجا لا چکے ہیں وہ خدا تعالیٰ کی راہوں سے بے نصیب ہیں بلکہ اس آیت میں عادتِ مستمرہ جاریہ دائرہ بین الازمنۃ الثلثۃ کا بیان ہے جس کا حاصل مطلب یہ ہے کہ ہماری یہی عادت ہے کہ مجاہدہ کرنے والوں کو اپنی راہیں دکھلایا کرتے ہیں۔ کسی زمانہ کی خصوصیت نہیں بلکہ سُنّتِ مستمرہ دائرہ سائرہ کا

بیان ہے جس کے اثر سے کوئی زمانہ باہر نہیں۔ (الحق دہلی ص۳۳)

اِس آیت کو نازل ہوئے تیرہ سو برس گذر گیا ہے اور کچھ شک نہیں کہ برطبق مضمون اس آیت کے ہر ایک جو اس عرصہ میں مجاہدہ کرتا رہا ہے وہ وعدہ لَنَھْدِیَنَّھُمْ سے حصہ مقسومہ لیتا رہا ہے اور اب بھی لیتا ہے اور آئندہ بھی لے گا۔ (الحق دہلی ص۶۲)

جس طرح ہماری دُنیوی زندگی میں صریح نظر آتا ہے کہ ہمارے ہر ایک فعل کے لئے ایک ضروری نتیجہ ہے اور وہ نتیجہ خدائے تعالیٰ کا فعل ہے۔ ایسا ہی دین کے متعلق بھی یہی قانون ہے جیسا کہ خدائے تعالیٰ ان دو مثالوں میں صاف فرماتا ہے:

اَلَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ

یعنی جو لوگ اِس فعل کو بجالائے کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کی جستجو میں پوری پوری کوشش کی تو اس فعل کے لئے لازمی طور پر ہمارا یہ فعل ہوگا کہ ہم اُن کو اپنی راہ دکھا دیں گے اور جن لوگوں نے کجی اختیار کی اور سیدھی راہ پر چلنا نہ چاہا تو ہمارا فعل اس کی نسبت یہ ہوگا کہ ہم ان کے دلوں کو کج کر دیں گے۔

(اِسلامی اصول کی فلاسفی ص۵۰)

جو لوگ ہماری راہ میں ہر ایک طور سے کوشش بجا لاتے ہیں ہم اُن کو اپنی راہیں دکھا دیا کرتے ہیں۔

(اِسلامی اصول کی فلاسفی ص۱۰۵)

جو لوگ ہماری راہ میں جو صراطِ مستقیم ہے مجاہدہ کریں گے تو ہم اُن کو اپنی راہیں بتلا دیں گے اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کی راہیں وہی ہیں جو انبیاء کو دکھلائی گئی تھیں۔ (شہادت القرآن ص۵۶)

جو لوگ ہماری راہ میں اور ہماری طلب کے لئے طرح طرح کی کوششیں اور محنتیں کرتے ہیں ہم ان کو اپنی راہ دکھلا دیتے ہیں۔ (لیکچر لاہور ص۱۳)

جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں اور ہماری طلب میں کوشش کو انتہا تک پہنچا دیتے ہیں اُنہیں کے لئے ہمارا یہ قانونِ قدرت ہے کہ ہم اُن کو اپنی راہ دکھلا دیا کرتے ہیں۔ (حقیقۃ الوحی ص۱۱۴)

جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ اختیار کرتے ہیں اور جو کچھ اُن سے اور اُن کی قوتوں سے ہوسکتا ہے بجا لاتے ہیں تب عنایت حضرت احدیت ان کا ہاتھ پکڑتی ہے اور جو کام ان سے نہیں ہوسکتا تھا وہ آپ کو دکھلاتی ہے۔ (حقیقۃ الوحی ص۱۳۱ حاشیہ)

قرآن شریف میں یہ وعدہ ہے کہ جو شخص سچے دل سے خدا تعالیٰ پر ایمان لائے گا خدا اس کو ضائع نہیں کرے گا اور حق اُس پر کھول دے گا اور راہِ راست اُس کو دکھائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

پس اِس آیت کے یہ معنی ہوئے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والا ضائع نہیں کیا جاتا آخر اللہ تعالیٰ پوری ہدایت اس کو کر دیتا ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۴۵)

اِنسان کے دِل پر کئی قسم کی حالتیں وارد ہوتی رہتی ہیں۔ آخر خدا تعالیٰ سعید رُوحوں کی کمزوری کو دُور کرتا ہے اور پاکیزگی اور نیکی کی قوت بطور موہبت عطا فرماتا ہے۔ پھر اس کی نظر میں وہ سب باتیں مکروہ ہو جاتی ہیں جو خدا تعالیٰ کی نظر میں مکروہ ہیں۔ اور وہ سب راہیں پیاری ہو جاتی ہیں جو خدا تعالیٰ کو پیاری ہیں۔ تب اس کو ایک ایسی طاقت ملتی ہے جس کے بعد ضعف نہیں۔ اور ایک ایسا جوش عطا ہوتا ہے جس کے بعد کسل نہیں اور ایسی تقویٰ دی جاتی ہے کہ جس کے بعد معصیت نہیں اور ربِّ کریم ایسا راضی ہو جاتا ہے کہ جس کے بعد خطا نہیں مگر یہ نعمت دیر کے بعد عطا ہوتی ہے۔ اوّل اوّل انسان اپنی کمزوریوں سے بہت سی ٹھوکریں کھاتا ہے اور اسفل کی طرف گر جاتا ہے مگر آخر اس کو صادق پاکر طاقتِ بالا کھینچ لیتی ہے۔ اس کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی نُثَبِّتُهُمْ عَلَى التَّقْوٰى وَالْاِيْمَانِ وَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَ الْمَحَبَّةِ وَالْعِرْفَانِ وَسَنُيَسِّرُهُمْ لِفِعْلِ الْخَيْرَاتِ وَتَرْكِ الْعِصْيَانِ۔

(مکتوباتِ احمدیہ جلد ۵ نمبر ۲ صفحہ ۴۷ مکتوب نمبر ۳۱ بنام حضرت خلیفہ اوّل)

رُوح القدس کی تائید جو مومن کے شامل ہوتی ہے وہ محض خدا تعالیٰ کا انعام ہوتا ہے جو ان کو ملتا ہے جو سچے دل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن شریف پر ایمان لاتے ہیں وہ کسی مجاہدہ سے نہیں ملتا محض ایمان سے ملتا ہے اور مُفت ملتا ہے صرف یہ شرط ہے کہ ایسا شخص ایمان میں صادق ہو اور قدم میں استوار اور امتحان کے وقت صابر ہو لیکن خدائے عزّوجلّ کی لدنّی ہدایت جو اِس آیت میں مذکور ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وہ بجز مجاہدہ کے نہیں ملتی۔ مجاہدہ کرنے والا ابھی مثل اندھے کے ہوتا ہے اور اس میں اور بینا ہونے میں ابھی بہت فاصلہ ہوتا ہے مگر رُوح القدس کی تائید اس کو نیک ظن کر دیتی ہے اور اس کو قوت دیتی ہے جو وہ مجاہدہ کی طرف راغب ہو اور مجاہدہ کے بعد انسان کو ایک اور رُوح ملتی ہے جو پہلی رُوح سے بہت قوی اور زبردست ہوتی ہے مگر یہ نہیں کہ دو ۲ رُوحیں ہیں رُوح القدس ایک ہی ہے صرف فرق مراتبِ قوت کا ہے جیسا کہ دو ۲ خدا نہیں ہیں صرف ایک خدا ہے مگر وہی خدا جن خاص خاص تجلیات کے ساتھ ان لوگوں کا ناصر اور مربّی ہوتا اور ان کے لئے خارق عادت عجائبات دکھاتا ہے وہ دوسروں کو ایسے عجائباتِ قدرت ہرگز نہیں کھلاتا۔ (لیکچر چشمہ معرفت صفحہ ۵۷، ۵۸)

پھر وہ لوگ رُوح القدس کی طاقت سے بہرہ ور ہو کر ان مجاہدات میں لگے کہ اپنے پاک اعمال کے ساتھ شیطان پر غالب آجائیں تب انہوں نے خدا کے راضی کرنے کے لئے ان مجاہدات کو اختیار کیا کہ جن سے بڑھ کر انسان کے لئے متصور نہیں۔ انہوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کا خس وخاشاک کی طرح بھی قدر نہ کیا۔ آخر وہ قبول کئے گئے اور خدا نے ان کے دلوں کو گناہ سے بکلی بیزار کر دیا اور نیکی کی محبت ڈال دی جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کو اپنی راہ دکھا دیا کرتے ہیں۔ (لیکچر چشمہ معرفت صفحہ ۵)

جو ہمارے راہ میں مجاہدہ کرے گا ہم اُس کو اپنی راہیں دکھلا دیں گے۔ یہ تو وعدہ ہے اور ادھر یہ دعا ہے کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ سو انسان کو چاہیئے کہ اس کو مدِّ نظر رکھ کر نماز میں بالحاح دعا کرے اور تمنّا رکھے کہ وہ بھی ان لوگوں میں سے ہو جاوے جو ترقی اور بصیرت حاصل کر چکے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اِس جہان سے بے بصیرت اور اندھا اُٹھایا جاوے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳)

سارا مدار مجاہدہ پر ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا جو لوگ ہم میں ہو کر کوشش کرتے ہیں ہم اُن کے لئے اپنی تمام راہیں کھول دیتے ہیں۔ مجاہدہ کے بدُوں کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ سید عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نظر میں چور کو قطب بنا دیا۔ دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں اور ایسی ہی باتوں نے لوگوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی کی جھاڑ پھونک سے کوئی بزرگ بن جاتا ہے۔ جو لوگ خدا کے ساتھ جلدی کرتے ہیں وہ ہلاک ہو جاتے ہیں۔ دُنیا میں ہر چیز کی ترقی تدریجی ہے۔ روحانی ترقی بھی اسی طرح ہوتی ہے اور بدُوں مجاہدہ کے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اور مجاہدہ بھی وہ ہو جو خدا تعالیٰ میں ہو کر۔ یہ نہیں کہ قرآن کریم کے خلاف خود ہی بے فائدہ ریاضتیں اور مجاہدہ جوگیوں کی طرح تجویز کر بیٹھے۔ یہی کام ہے جس کے لئے خدا نے مجھے مامور کیا ہے تا کہ میں دُنیا کو دکھلا دوں کہ کس طرح پر انسان اللہ تعالیٰ تک پہنچ سکتا ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے۔ نہ سب محروم رہتے ہیں اور نہ سب ہدایت پاتے ہیں۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۱۶ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۰ء صفحہ ۶)

جو لوگ ہم میں ہو کر سعی اور مجاہدہ کرتے ہیں آخر ہم ان کو اپنی راہوں کی طرف راہنمائی کرتے ہیں اُن پر دروازے کھولے جاتے ہیں۔ یہ سچی بات ہے کہ جو ڈھونڈتے ہیں پاتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا

اے خواجہ درد نیست ورنہ طبیب ہست

(الحکم جلد ۵ نمبر ۱۲ مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ ۸)

مجاہدہ ایک ایسی شئے ہے کہ اس کے بدُوں انسان کسی ترقی کے بلند مقام کو پا نہیں سکتا۔ خدا تعالیٰ

نے قرآن شریف میں فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا جو لوگ ہم میں ہوکر مجاہدہ کرتے ہیں ہم اُن میں اپنی راہیں کھول دیتے ہیں۔ غرض مجاہدہ کرو اور خدا میں ہوکر کرو تا خدا کی راہیں تم پر کھلیں اور اُن راہوں پر چل کر تم اس لذت کو حاصل کرسکو جو خدا میں ملتی ہے۔ اِس مقام پر مصائب اور مشکلات کی کچھ حقیقت نہیں رہتی یہ وہ مقام ہے جس کو قرآن شریف کی اصطلاح میں شہید کہتے ہیں۔

(الحکم جلد ۵ ﹰ۲۵ مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۱-۲)

خدا تعالیٰ تو ہر ایک انسان کو اپنی معرفت کے رنگ میں رنگین کرنا چاہتا ہے کیونکہ انسان کو خدا نے اپنی صورت پر پیدا کیا ہے اور اسی لئے فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔

(الحکم جلد ۶ ﹰ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

صدق بڑی چیز ہے اس کے بغیر عملِ صالح کی تکمیل نہیں ہوتی۔ خدا تعالیٰ اپنی سُنّت نہیں چھوڑتا اور انسان اپنا طریق نہیں چھوڑنا چاہتا اِس لئے فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا خدا تعالیٰ میں ہوکر جو مجاہدہ کرتا ہے اس پر اللہ تعالیٰ اپنی راہیں کھول دیتا ہے۔

(الحکم جلد ۶ ﹰ۲۸ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

اِس دین کی جڑ تقویٰ اور نیک بختی ہے اور یہ ممکن نہیں جب تک خدا پر یقین نہ ہو اور یہ یقین سوائے خدا کے اَور سے ملتا نہیں۔ اِسی لئے فرمایا وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔

(الحکم جلد ۶ ﹰ۳۸ مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

مجاہدات پر اللہ تعالیٰ کی راہیں کھلتی ہیں اور نفس کا تزکیہ ہوتا ہے جیسے فرمایا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا اور وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔ (الحکم جلد ۶ ﹰ۴۶ مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰)

تقویٰ کا مرحلہ بڑا مشکل ہے اسے وہی طے کرسکتا ہے جو بالکل خدا (تعالیٰ) کی مرضی پر چلے۔ جو وہ چاہے وہ کرے اپنی مرضی نہ کرے۔ بناوٹ سے کوئی حاصل کرنا چاہے تو ہرگز نہ ہوگا اِس لئے خدا کے فضل کی ضرورت ہے اور وہ اسی طرح سے ہوسکتا ہے کہ ایک طرف تو دعا کرے اور ایک طرف کوشش کرتا رہے خدا تعالیٰ نے دعا اور کوشش دونوں کی تاکید فرمائی ہے۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ میں تو دُعا کی تاکید فرمائی ہے اور وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا میں کوشش کی۔ جب تک تقویٰ نہ ہوگی اولیاء الرحمٰن میں ہرگز داخل نہ ہوگا اور جب تک یہ نہ ہوگا حقائق اور معارف ہرگز نہ کھلیں گے۔

(البدر جلد ۳ ﹰ۲ مورخہ ۸ جنوری ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

اِس میں شک نہیں کہ اِنسان بعض اَوقات تدبیر سے فائدہ اُٹھاتا ہے لیکن تدبیر پر کُلّی بھروسہ کرنا سخت

نادانی اور جہالت ہے۔ جب تک تدبیر کے ساتھ دعا نہ ہو کچھ نہیں۔ اور دعا کے ساتھ تدبیر نہ ہو تو کچھ فائدہ نہیں۔ جس کھڑکی کی راہ سے معصیت آتی ہے پہلے ضروری ہے کہ اس کھڑکی کو بند کیا جاوے۔ پھر نفس کی کشاکش کے لئے دعا کرتا رہے۔ اِسی کے واسطے کہا ہے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔ اس میں کس قدر ہدایت تدابیر کو عمل میں لانے کے واسطے کی گئی ہے۔ تدابیر میں بھی خدا کو نہ چھوڑے۔

(الحکم جلد ۸ عـــ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صـــ)

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا میں مجاہدہ سے مراد یہی مشق ہے کہ ایک طرف دعا کرتا رہے دوسری طرف کامل تدبیر کرے۔ آخر اللہ تعالیٰ کا فضل آجاتا ہے اور نفس کا جوش و خروش دَب جاتا اور ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور ایسی حالت ہو جاتی ہے جیسے آگ پر پانی ڈال دیا جاوے بہت سے انسان ہیں جو نفس امّارہ میں مبتلا ہیں۔

(الحکم جلد ۸ عـــ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صـــ)

گناہوں سے پاک ہونے کے واسطے بھی اللہ تعالیٰ ہی کا فضل درکار ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اس کے رجوع اور توبہ کو دیکھتا ہے تو اس کے دِل میں غیب سے ایک بات پڑ جاتی ہے اور وہ گناہ سے نفرت کرنے لگتا ہے اور اس حالت کے پیدا ہونے کے لئے حقیقی مجاہدہ کی ضرورت ہے۔

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا

جو مانگتا ہے اس کو ضرور دیا جاتا ہے اِس لئے مَیں کہتا ہوں کہ دعا جیسی کوئی چیز نہیں۔

(الحکم جلد ۸ عـــ۸ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۰۴ء صـــ)

خدا تعالیٰ کا یہ سچا وعدہ ہے کہ جو شخص صدق دل اور نیک نیّتی کے ساتھ اس کی راہ کی تلاش کرتے ہیں وہ ان پر ہدایت و معرفت کی راہیں کھول دیتا ہے جیسا کہ اس نے خود فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہم میں ہو کر مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں کھول دیتے ہیں۔ ہم میں سے ہو کر سے یہ مراد ہے کہ محض اخلاص اور نیک نیّتی کی بناء پر خدا جوئی اپنا مقصد رکھ کر لیکن اگر کوئی اِستہزاء اور ٹھٹھے کے طریق پر آزمائش کرتا ہے وہ بدنصیب محروم رہ جاتا ہے۔ پس اسی پاک اصول کی بناء پر اگر تم سچے دِل سے کوشش کرو اور دعا کرتے رہو تو وہ غفور الرحیم ہے لیکن اگر کوئی اللہ تعالیٰ کی پرواہ نہیں کرتا وہ بے نیاز ہے۔

(الحکم جلد ۸ عـــ۱۸ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۴ء صـــ۲)

جس قدر کاروبار دُنیا کے ہیں سب میں اوّل انسان کو کچھ کرنا پڑتا ہے۔ جب وہ ہاتھ پاؤں ہلاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ بھی برکت ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح پر خدا تعالیٰ کی راہ میں وہی لوگ کمال حاصل کرتے ہیں جو مجاہدہ کرتے ہیں اِس لئے فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔ پس کوشش

کرنی چاہیئے کیونکہ مجاہدہ ہی کامیابیوں کی راہ ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۸، ۳۹ مورخہ ۱۰، ۱۷ ر نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

جو لوگ کوشش کرتے ہیں ہماری راہ میں انجام کار راہنمائی پر پہنچ جاتے ہیں جس طرح وہ دانہ تخم ریزی کا بدوں کوشش اور آبپاشی کے بے برکت رہتا بلکہ خود بھی فنا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تم بھی اس اقرار کو ہر روز یاد نہ کرو گے اور دعائیں نہ مانگو گے کہ خدایا ہماری مدد کر تو فضل الٰہی وارد نہیں ہو گا اور بغیر امداد الٰہی کے تبدیلی ناممکن ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۸، ۳۹ مورخہ ۱۰، ۱۷ ر نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۶)

مثل مشہور ہے جوئندہ یابندہ۔ جو شخص دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اس کے لئے کھولا جاتا ہے اور قرآن شریف میں بھی فرمایا گیا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہماری طرف آتے ہیں اور ہمارے لئے مجاہدہ کرتے ہیں ہم اُن کے واسطے اپنی راہ کھول دیتے ہیں اور صراطِ مستقیم پر چلا دیتے ہیں۔ لیکن جو شخص کوشش ہی نہیں کرتا وہ کس طرح اس راہ کو پا سکتا ہے۔ خدایابی اور حقیقی کامیابی اور نجات کا بھی یہی گُر اور اصول ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کی راہ میں مجاہدہ کرنے سے تھکے نہیں۔ نہ درماندہ ہو اور نہ اس راہ میں کوئی کمزوری ظاہر کرے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۴۱، ۴۲ مورخہ ۳۰ ر نومبر، ۱۰ ر دسمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۶
الحکم جلد ۸ نمبر ۴۳، ۴۴ مورخہ ۱۷، ۲۴ ر دسمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

جو شخص خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کرے گا تو اللہ تعالیٰ بھی اس کی طرف رجوع کرے گا۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ جہاں تک بس چل سکے وہ اپنی طرف سے کوتاہی نہ کرے۔ پھر جب اس کی کوشش اس کے اپنے انتہائی نکتہ پر پہنچے گی تو وہ خدا (تعالیٰ) کے نور کو دیکھ لے گا۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا میں اسی کی طرف اشارہ ہے کہ جو حق کوشش کا اس کے ذمہ ہے اسے بجا لائے یہ نہ کرے کہ اگر پانی ۲۰ ہاتھ نیچے کھودنے سے نکلتا ہے تو وہ صرف دو ہاتھ کھود کر ہمت ہار دے۔ ہر ایک کام میں کامیابی کی یہی جڑ ہے کہ ہمت نہ ہارے۔ پھر اس اُمت کے لئے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ اگر کوئی پورے طور سے دُعا و تزکیہ نفس سے کام لے گا سب وعدے قرآن شریف کے اس کے ساتھ پورے ہو کر رہیں گے۔ ہاں جو خلاف کرے گا وہ محروم رہے گا کیونکہ اس کی ذات غیور ہے اس نے اپنی طرف آنے کی راہ ضرور رکھی ہے لیکن اسکے دروازے تنگ بنائے ہیں۔ پہنچتا وہی ہے جو تلخیوں کا شربت پی لیوے۔ لوگ دُنیا کی فکر میں درد برداشت کرتے ہیں حتّٰی کہ بعض اسی میں ہلاک ہو جاتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے لئے ایک کانٹے کی درد بھی برداشت کرنا پسند نہیں کرتے۔ جب تک اس کی طرف سے صدق اور صبر اور وفاداری کے آثار ظاہر نہ ہوں تو اُدھر سے رحمت کے آثار کیسے ظاہر ہوں۔ (البدر جلد ۴ نمبر ۳ مورخہ ۲۰ ر جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۳ نیز الحکم جلد ۹ نمبر ۴ مورخہ ۳۱ ر جنوری ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ہمیں کوئی محنت اور مشقت نہ کرنی پڑے وہ بیہودہ خیال کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں صاف فرمایا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے دروازوں کے کھلنے کے لئے مجاہدہ کی ضرورت ہے اور وہ مجاہدہ اسی طریق پر ہو جس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے۔ اس کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ اور اُسوۂ حسنہ ہے۔ بہت سے لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کو چھوڑ دیتے ہیں اور پھر سبز پوش یا گیرُوے پوش فقیروں کی خدمت میں جاتے ہیں کہ پھونک مار کر کچھ بنا دیں۔ یہ بیہودہ بات ہے۔ ایسے لوگ جو شرعی امور کی پابندیاں نہیں کرتے اور ایسے بیہودہ دعوے کرتے ہیں وہ خطرناک گناہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے بھی اپنے مراتب کو بڑھانا چاہتے ہیں کیونکہ ہدایت دینا اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور وہ مُشتِ خاک ہو کر خود ہدایت دینے کے مدعی ہوتے ہیں۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۲۴ مورخہ ۱۰ر جولائی ۱۹۰۵ء صفحہ ۹)

اِسلام اور دوسرے مذاہب میں جو امتیاز ہے وہ یہی ہے کہ اِسلام حقیقی معرفت عطا کرتا ہے جس سے انسان کی گناہ آلود زندگی پر موت آجاتی ہے اور پھر اسے ایک نئی زندگی عطا کی جاتی ہے جو بہشتی زندگی ہوتی ہے..... اب سوال ہوتا ہے کہ جبکہ یہ ما بہ الامتیاز ہے تو کیوں ہر شخص نہیں دیکھ لیتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ سُنّتُ اللہ اسی پر واقع ہوئی ہے کہ یہ بات بجز مجاہدہ، توبہ اور تبتّل تام کے نہیں ملتی چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ کریں گے انہی کو یہ راہ ملے گی۔ پس جو لوگ خدا کی وصایا اور احکام پر عمل نہ کریں بلکہ ان سے اِعراض کریں ان پر یہ دروازہ کس طرح کُھل جائے یہ نہیں ہو سکتا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷ر اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۱۲)

ہمّتِ مرداں مددِ خدا۔ صدق اور وفا سے خدا تعالیٰ کو طلب کرنا موجب فتحیابی ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۵ مورخہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳ حاشیہ)

یاد رکھنا چاہیئے کہ ایمان بغیر اعمال کے ایسا ہے جیسے کوئی باغ بغیر انہار کے۔ جو درخت لگایا جاتا ہے اگر مالک اس کی آبپاشی کی طرف توجہ نہ کرے تو ایک دن خشک ہو جائے گا اسی طرح ایمان کا حال ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا یعنی تم ہلکے ہلکے کام پر نہ رہو بلکہ اس راہ میں بڑے بڑے مجاہدات کی ضرورت ہے۔ نفس کو بیل سے مشابہت دی گئی ہے۔ (بدر جلد ۷ نمبر ۲۵ مورخہ ۲۵ر جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

ہمارے راہ کے مجاہد راستہ پاویں گے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اس راہ میں پیغمبر کے ساتھ مل کر جدّوجُہد کرنا ہوگا۔ ایک دو گھنٹہ کے بعد بھاگ جانا مجاہد کا کام نہیں بلکہ جان دینے کے لئے تیار رہنا اُس کا کام

ہے۔ سو متقی کی نشانی استقامت ہے۔ (الحکم جلد ۶ ص۲۲ مورخہ ۱۷ر جون ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

خدا تعالیٰ مغز اور حقیقت کو چاہتا ہے رسم اور نام کو پسند نہیں کرتا۔ جب انسان سچے دل سے سچے اسلام کی تلاش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ اس کو اپنی راہیں دکھا دیتا ہے جیسے فرمایا وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ خدا تعالیٰ بخیل نہیں۔ اگر انسان مجاہدہ کرے گا تو وہ یقیناً اپنی راہ کو ظاہر کر دے گا۔ (الحکم جلد ۷ ص۷ مورخہ ۲۱ر فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۹)

جو شخص محض اللہ تعالیٰ سے ڈر کر اس کی راہ کی تلاش میں کوشش کرتا ہے اور اس سے اس امر کی گرہ کشائی کے لئے دعائیں کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے قانون کے موافق (وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہم میں سے ہو کر کوشش کرتے ہیں ہم اپنی راہیں ان کو دکھا دیتے ہیں) خود ہاتھ پکڑ کر راہ دکھا دیتا ہے اور اُسے اطمینانِ قلب عطا کرتا ہے اور اگر خود دل ظلمت کدہ اور زبان دعا سے بوجھل ہو اور اعتقاد شرک و بدعت سے ملوّث ہو تو وہ دعا ہی کیا ہے اور وہ طلب ہی کیا ہے جس پر نتائج حسنہ مترتب ہوں۔ (الحکم جلد ۷ ص۱۷ مورخہ ۱۰ر مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۳)

جو محنت کرتا ہے اور خدا کے عشق اور محبت میں محو ہو جاتا ہے وہ دوسروں سے ممتاز اور خدا کا منظورِ نظر ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی خود دستگیری کرتا ہے جیسے فرمایا وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی جو لوگ ہماری خاطر مجاہدات کرتے ہیں آخر ہم ان کو اپنا راستہ دکھا دیتے ہیں جتنے اولیاء، انبیاء اور بزرگ لوگ گزرے ہیں انہوں نے خدا کی راہ میں جب بڑے بڑے مجاہدات کئے تو آخر خدا تعالیٰ نے اپنے دروازے ان پر کھول دئے۔

(الحکم جلد ۱۲ ص۱ مورخہ ۲ر جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

توبہ استغفار وصول الی اللہ کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا پوری کوشش سے اس کی راہ میں لگے رہو منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ کو کسی سے بخل نہیں۔ (بدر جلد ۷ ص۲ مورخہ ۱۶ر جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

بموجب تعلیم قرآن شریف ہمیں یہ امر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں اپنے کرم، رحم، لطف اور مہربانیوں کے صفات بیان کرتا ہے اور رحمٰن ہونا ظاہر کرتا ہے اور دوسری طرف فرماتا ہے کہ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى اور وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا فرما کر اپنے فیض کو سعی اور مجاہدہ میں منحصر فرماتا ہے نیز اس میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل ہمارے واسطے ایک اسوہ حسنہ اور عمدہ نمونہ ہے۔ صحابہؓ کی زندگی میں غور کر کے دیکھو بھلا انہوں نے محض معمولی

نمازوں سے ہی وہ مدارج حاصل کر لئے تھے ؟ نہیں۔ بلکہ انہوں نے تو خدا تعالیٰ کی رضا کے حصول کے واسطے اپنی جانوں تک کی پرواہ نہیں کی اور بھیڑ بکریوں کی طرح خدا کی راہ میں قربان ہو گئے جب جا کر کہیں ان کو یہ رُتبہ حاصل ہؤا تھا۔ اکثر لوگ ہم نے ایسے دیکھے ہیں وہ یہی چاہتے ہیں کہ ایک پھُونک مار کر ان کو وہ درجات دلا دئے جاویں اور عرش تک ان کی رسائی ہو جاوے۔

ہمارے رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بڑھ کر کون ہو گا۔ وہ افضل البشر افضل الرسل و الانبیاء تھے جب انہوں نے ہی پھُونک سے وہ کام نہیں کئے تو اَور کون ہے جو ایسا کر سکے۔ دیکھو آپؐ نے غارِ حراء میں کیسے کیسے ریاضات کئے۔ خدا جانے کتنی مدت تک تضرعات اور گریہ و زاری کیا کئے۔ تزکیہ کے لئے کیسی کیسی جانفشانیاں اور سخت سے سخت محنتیں کیا کئے جب جا کر کہیں خدا کی طرف سے فیضان نازل ہؤا۔

اصل بات یہی ہے کہ اِنسان خدا کی راہ میں جب تک اپنے اُوپر ایک موت اور حالتِ فنا وارد نہ کر لے تب تک ادھر سے کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ البتہ جب خدا دیکھتا ہے کہ انسان نے اپنی طرف سے کمال کوشش کی ہے اور میرے پانے کے واسطے اپنے اُوپر موت وارد کر لی ہے تو پھر وہ انسان پر خود ظاہر ہوتا ہے اور اس کو نوازتا اور قدرت نمائی سے بلند کرتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ ۲۴ مورخہ ۲ اپریل ۱۹۰۸ء صفحہ ۱-۲)

جو لوگ خدا میں ہو کر خدا پانے کے واسطے تڑپ اور گدازش سے کوشش کرتے ہیں ان کی محنت اور کوشش ضائع نہیں جاتی اور ضرور ان کی راہبری اور ہدایت کی جاتی ہے۔ جو کوئی صدق اور خلوصِ نیت سے خدا کی طرف قدم اُٹھاتا ہے خدا اس کی طرف راہ نمائی کے واسطے بڑھتا ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ تدبر کرے اور حق طلبی کی سچی تڑپ اور پیاس اپنے اندر پیدا کرے۔ معلومات کے وسیع کرنے کی جو سبیل اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں ان پر کاربند ہو۔ خدا بھی بے نیاز ہو جاتا ہے اُس شخص سے جو خدا سے لاپروائی کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ ۳۳ مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۱-۲)

اپنے نفس کی تبدیلی کے واسطے سعی کرو۔ نمازوں میں دعائیں مانگو۔ صدقات خیرات سے اور دوسرے ہر طرح کے حیلہ سے وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا میں شامل ہو جاؤ۔ جس طرح بیمار طبیب کے پاس جاتا، دوائی کھاتا، مسہل لیتا، خون نکلواتا، ٹکور کرواتا اور شفا حاصل کرنے کے واسطے ہر طرح کی تدبیر کرتا ہے۔ اِسی طرح اپنی روحانی بیماریوں کو دُور کرنے کے واسطے ہر طرح کی کوشش کرو۔ صرف زبان سے نہیں بلکہ مجاہدہ کے جس قدر طریق خدا تعالیٰ نے فرمائے ہیں وہ سب بجا لاؤ۔

(بدر جلد ۱ ۳۲ مورخہ ۸ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۲-۳)

یہ جو فرمایا کہ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا یعنی ہمارے راہ کے مجاہد راستہ پاویں گے

اس کے معنے یہ ہیں کہ اس راہ میں پیمبر کے ساتھ مل کر جدّ و جہد کرنا ہوگا۔ ایک دو گھنٹہ کے بعد بھاگ جانا مجاہد کا کام نہیں بلکہ جان دینے کے لئے تیار رہنا اس کا کام ہے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۴۲)

جو ہمارے راہ میں مجاہدہ کریگا ہم اس کو اپنی راہیں دکھلا دیں گے۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۳۹)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم کو کیا کوئی ولی بننا ہے؟ افسوس انہوں نے کچھ قدر نہ کی۔ بے شک انسان نے ولی بننا ہے۔ اگر وہ صراطِ مستقیم پر چلے گا تو خدا بھی اس کی طرف چلے گا اور پھر ایک جگہ پر اُس کی ملاقات ہوگی۔ اُس کی اس طرف سے حرکت خواہ آہستہ ہوگی لیکن اس کے مقابل خدا تعالیٰ کی حرکت بہت جلد ہوگی چنانچہ یہ آیت اسی طرف اشارہ کرتی ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا الخ

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۵۷)

خدا کی طرف سعی کرنے والا کبھی بھی ناکام نہیں رہتا۔ اُس کا سچا وعدہ ہے کہ اَلَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا خدائے تعالیٰ کی راہوں کی تلاش میں جو جویا ہؤا وہ آخر منزلِ مقصود پر پہنچا۔ دُنیوی اِمتحانوں کے لئے تیاریاں کرنے والے راتوں کو دِن بنا دینے والے طالب علموں کی محنت اور حالت کو ہم دیکھ کر رحم کھا سکتے ہیں تو کیا اللہ تعالیٰ جس کا رحم اور فضل بے حد اور بے اَنت ہے اپنی طرف آنے والے کو ضائع کر دے گا۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۶۱، ۱۶۲)

یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جو جذب کی قوت لے کر نکلتی ہے وہ دوسرے کو جذب کرتی ہے۔ اس جذب میں اِس قدر قوت ہوتی ہے کہ دُنیا اور مافیہا کی ساری باتیں اُس میں بھسم ہو جاتی ہیں اور وہ خدا تعالیٰ کے فضل اور فیض کو اپنی طرف کھینچنے لگتی ہے اور اس سلسلہ کو باقی تمام سلسلوں پر تقدم اور فوق ہو جاتا ہے لیکن اس کے لئے مجاہدہ صحیحہ کی ضرورت ہے اس کے بغیر یہ راہ نہیں کھلتی جیسا کہ فرمایا وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۲ مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

جس طرح ہر ایک کاشتکار کو تخم ریزی اور آبپاشی کے علاوہ بھی محنت اور کوشش کرنی پڑتی ہے اسی طرح خدا تعالیٰ نے رُوحانی فیوض و برکات کے ثمراتِ حسنہ کے حصول کے واسطے بھی مجاہدات لازمی اور ضروری رکھے ہیں چنانچہ فرماتا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

سُوْرَةُ الرُّوْم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ﴿۲﴾ فِیْۤ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ ہُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِہِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۙ﴿۳﴾ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ۬ؕ لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ ؕ وَ یَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ﴿۴﴾

جبکہ خدا تعالیٰ کے قانونِ قدرت نے مکاشفات اور رؤیائے صالحہ کے لئے یہی اصل مقرر کر دیا ہے کہ وہ اکثر استعارات سے پُر ہوتے ہیں تو اس اصل سے معنی کو پھیرنا اور یہ دعویٰ کرنا کہ ہمیشہ پیشگوئیاں ظاہر پر ہی محمول ہوتی ہیں۔ اگر الحاد نہیں تو اَور کیا ہے؟ صوم اور صلوٰۃ کی طرح پیشگوئی کو بھی ایک حقیقتِ منکشفہ سمجھنا بڑی غلطی اور بڑا بھارا دھوکہ ہے۔ یہ احکام تو وہ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کرکے دکھلا دئیے اور تجلّی ان کا پردہ اُٹھا دیا۔ مگر کیا ان پیشگوئیوں کے حق میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا ہے کہ یہ من کل الوجوہ مکشوف ہیں اور ان میں کوئی ایسی حقیقت اور کیفیت مخفی نہیں جو ظہور کے وقت سمجھ آسکے۔ اگر کوئی حدیث صحیح موجود ہے تو کیوں پیش نہیں کی جاتی۔۔

.... آپ لوگ جانتے ہیں کہ جب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ابوجہل سے شرط لگائی اور قرآن شریف کی وہ پیشگوئی مدار شرط رکھی کہ الٓمّٓ ○ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ○ فِیْۤ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ ہُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِہِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ○ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ؕ اور تین برس کا عرصہ ٹھہرایا تو آپ پیشگوئی کی صورت کو دیکھ کر فی الفور دُور اندیشی کو کام میں لائے اور شرط کی کسی قدر ترمیم کرنے کے لئے ابوبکر صدیق کو حکم فرمایا اور فرمایا کہ بِضْعِ سِنِیْنَ کا لفظ مجمل ہے اور اکثر نو برس تک

اطلاق پاتا ہے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۴۰۶، ۴۰۷)

اُن بادشاہوں کے مثیلوں کا قرآن شریف میں ذکر ہے جنہوں نے یہودیوں کے سلاطین کی بدچلنی کے وقت اُن کے ممالک پر قبضہ کیا جیسا کہ آیت غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِھِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۝ سے ظاہر ہوتا ہے۔ حدیثوں سے ثابت ہے کہ روم سے مُراد نصاریٰ ہیں اور وہ آخری زمانہ میں پھر اسلامی ممالک کے کچھ حصے دبالیں گے اور اِسلامی بادشاہوں کے ممالک اُن کی بدچلنیوں کے وقت میں اُسی طرح نصاریٰ کے قبضے میں آجائیں گے جیسا کہ اِسرائیلی بادشاہوں کی بدچلنیوں کے وقت رومی سلطنت نے اُن کا ملک دبالیا تھا پس واضح ہو کہ یہ پیشگوئی ہمارے اِس زمانہ میں پوری ہوگئی۔ مثلاً رُوس نے جو کچھ رومی سلطنت کو خدا کی اَزلی مشیت سے نقصان پہنچایا وہ پوشیدہ نہیں اور اس آیت میں جبکہ دوسرے طور پر صنے کئے جائیں غالب ہونے کے وقت میں روم سے مُراد قیصرِ روم کا خاندان نہیں کیونکہ وہ خاندان اِسلام کے ہاتھ سے تباہ ہو چکا بلکہ اِس جگہ بروزی طور پر روم سے روس اور دوسری عیسائی سلطنتیں مُراد ہیں جو عیسائی مذہب رکھتی ہیں۔ یہ آیت اوّل اس موقع پر نازل ہوئی تھی جبکہ کسریٰ شاہِ ایران نے بعض حدود پر لڑائی کر کے قیصر شاہِ روم کو مغلوب کر دیا تھا پھر جب اس پیشگوئی کے مطابق بِضْعِ سِنِیْنَ میں قیصرِ روم شاہِ ایران پر غالب آگیا تو پھر یہ آیت نازل ہوئی کہ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ الخ جس کا مطلب یہ تھا کہ رومی سلطنت اب تو غالب آگئی ہے مگر پھر بِضْعِ سِنِیْنَ میں اسلام کے ہاتھ سے مغلوب ہوں گے مگر باوجود اس کے کہ دوسری قرأت میں غَلَبَتْ کا صیغہ ماضی معلوم تھا اور سَیُغْلَبُوْنَ کا صیغہ مضارع مجہول تھا مگر پھر بھی پہلی قرأت جس میں غُلِبَتْ کا صیغہ ماضی مجہول تھا اور سَیَغْلِبُوْنَ مضارع معلوم تھا منسوخ التلاوت نہیں ہوئی بلکہ اسی طرح جبرائیل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن شریف سُناتے رہے جس سے اس سُنّت اللہ کے موافق جو قرآن شریف کے نزول میں ہے یہ ثابت ہُوا کہ ایک مرتبہ پھر مقدر ہے کہ عیسائی سلطنتِ روم کے بعض حدود کو پھر اپنے قبضہ میں کرلے گی۔ اِسی بناء پر احادیث میں آیا ہے کہ مسیح کے وقت میں سب سے زیادہ دُنیا میں روم ہوں گے یعنی نصاریٰ۔

اِس تحریر سے ہماری غرض یہ ہے کہ قرآن اور احادیث میں روم کا لفظ بھی بروزی طور پر آیا ہے یعنی روم سے اصل روم مُراد نہیں ہیں بلکہ نصاریٰ مُراد ہیں۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۲۵)

حدیثوں میں بظاہر یہ تناقض پایا جاتا ہے کہ مسیح موعود کے مبعوث ہونے کے وقت ایک طرف تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ یاجوج ماجوج تمام دُنیا میں پھیل جائیں گے اور دوسری طرف یہ بیان ہے کہ تمام دُنیا میں عیسائی قوم کا غلبہ ہوگا جیسا کہ حدیث یَکْسِرُ الصَّلِیْبَ سے بھی سمجھا جاتا ہے کہ صلیبی قوم کا اِس زمانہ میں بڑا عروج اور اقبال ہوگا۔ ایسا ہی ایک دوسری حدیث سے بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ اس زمانہ میں رومیوں کی کثرت اور قوت ہوگی یعنی عیسائیوں کی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں رومی سلطنت عیسائی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ بھی قرآن شریف میں فرماتا

ہے غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْۤ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ ھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۙ اِس جگہ بھی روم سے مُراد عیسائی سلطنت ہے اور پھر بعض احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسیح موعود کے ظہور کے وقت دجّال کا تمام زمین پر غلبہ ہوگا اور تمام زمین پر بغیر مکہ معظمہ کے دجّال محیط ہو جائے گا۔

اب ..... بتلاویں کہ یہ تناقض کیونکر دُور ہو سکتا ہے۔ اگر دجّال تمام زمین پر محیط ہو جائے گا تو عیسائی سلطنت کہاں ہوگی۔ ایسا ہی یاجوج ماجوج جن کی عام سلطنت کی قرآن شریف خبر دیتا ہے وہ کہاں جائیں گے۔ سو یہ غلطیاں ہیں جن میں یہ لوگ مُبتلا ہیں..... واقعات ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ دونوں صفات یاجوج ماجوج اور دجّال ہونے کے یوروپین قوموں میں موجود ہیں کیونکہ یاجوج ماجوج کی تعریف حدیثوں میں یہ بیان کی گئی ہے کہ ان کے ساتھ لڑائی میں کسی کو طاقتِ مقابلہ نہیں ہوگی اور مسیح موعود بھی صرف دُعا سے کام لے گا اور یہ صفت کھلے کھلے طور پر یورپ کی سلطنتوں میں پائی جاتی ہے۔ اور قرآن شریف بھی اِس کا مصدق ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَ ھُمْ مِّنْ کُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ۔ اور دجّال کی نسبت حدیثوں میں یہ بیان ہے کہ وہ دجل سے کام لے گا اور مذہبی رنگ میں دُنیا میں فتنہ ڈالے گا۔ سو قرآن شریف میں یہ صفت عیسائی پادریوں کی بیان کی گئی ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ۔ اِس تقریر سے ظاہر ہے کہ یہ تینوں ایک ہی ہیں۔ اِسی وجہ سے سُورۃ الفاتحہ میں دائمی طور پر یہ دُعا سکھلائی گئی کہ تم عیسائیوں کے فتنہ سے پناہ مانگو یہ نہیں کہا کہ تم دجّال سے پناہ مانگو۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۷۷ تا ۷۹)

قرآن شریف بہت سی پیشگوئیوں سے بھرا پڑا ہے جیسا کہ روم اور ایران کی سلطنت کی نسبت ایک زبردست پیشگوئی قرآن شریف میں موجود ہے اور یہ اُس وقت کی پیشگوئی ہے جبکہ مجوسی سلطنت نے ایک لڑائی میں رومی سلطنت پر فتح پائی تھی اور کچھ زمین اُن کے ملک کی اپنے قبضہ میں کر لی تھی تب مُشرکینِ مکہ نے فارسیوں کی فتح اپنے لئے ایک نیک فال سمجھی تھی اور اس سے یہ سمجھا تھا کہ چونکہ فارسی سلطنت مخلوق پرستی میں ہمارے شریک ہے ایسا ہی ہم بھی اس نبی کا استیصال کریں گے جس کی شریعت اہلِ کتاب سے مشابہت رکھتی ہے تب خدا تعالیٰ نے قرآن شریف میں یہ پیشگوئی فرمائی کہ آخرکار رومی سلطنت کی فتح ہوگی اور چونکہ روم کی فتح کی نسبت یہ پیشگوئی ہے اِس لئے اِس سُورت کا نام سُورۃ الروم رکھا گیا ہے اور چونکہ عرب کے مُشرکوں نے مجوسیوں کی سلطنت کی فتح کو اپنی فتح کے لئے ایک نشان سمجھ لیا تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے اِس پیشگوئی میں یہ بھی فرما دیا کہ جس روز پھر روم کی فتح ہوگی اُس روز مسلمان بھی مُشرکوں پر فتحیاب ہوں گے چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ اِس بارہ میں قرآن شریف کی آیت یہ ہے الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِیْۤ اَدْنَی الْاَرْضِ وَ ھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَیَغْلِبُوْنَ ۙ فِیْ بِضْعِ سِنِیْنَ ؕ۬ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْۢ بَعْدُ ؕ وَ یَوْمَئِذٍ یَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ (ترجمہ) مَیں خدا ہوں جو سب سے بہتر جانتا ہوں۔ رومی سلطنت بہت قریب زمین میں مغلوب ہو گئی ہے اور وہ لوگ پھر نو سال تک تین سال کے بعد مجوسی سلطنت پر غالب ہو جائیں گے۔ اُس دن مومنوں کے لئے بھی ایک خوشی کا دن ہوگا چنانچہ ایسا ہی ہُوا اور تین

سال کے بعد نو سال کے اندر پھر رومی سلطنت ایرانی سلطنت پر غالب آگئی اور اس دن مسلمانوں نے بھی مُشرکوں پر فتح پائی کیونکہ وہ دن بدر کی لڑائی کا دن تھا جس میں اہلِ اسلام کو فتح ہوئی تھی۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۳۰۵، ۳۰۶)

لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ پہلے بھی خدا کا حکم ہے اور پیچھے بھی خدا کا ہی حکم ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۱۶ حاشیہ)

مَیں اللہ بہت جاننے والا ہوں۔ رُومی اپنی سرحد میں اہلِ فارس سے مغلوب ہو گئے ہیں اور بہت ہی جلد چند سال میں یقیناً غالب ہونے والے ہیں۔ پہلے اور آئندہ آنے والے واقعات کا عِلم اور اُن کے اَسباب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں جس دن رومی غالب ہوں گے وہی دن ہوگا جب مومن بھی خوشی کریں گے۔

اَب غور کر کے دیکھو کہ کیسی حیرت انگیز اور جلیل القدر پیشگوئی ہے۔ ایسے وقت میں یہ پیشگوئی کی گئی جب مسلمانوں کی کمزور اور ضعیف حالت خود خطرہ میں تھی۔ نہ کوئی سامان تھا نہ طاقت تھی۔ ایسی حالت میں مخالف کہتے تھے کہ یہ گروہ بہت جلد نیست و نابود ہو جائے گا۔ مدت کی قید بھی اس میں لگا دی اور پھر يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ کہہ کر دوہری پیشگوئی بنا دی یعنی جس روز رومی فارسیوں پر غالب آئیں گے اُس دن مسلمان بھی بامُراد ہو کر خوش ہونگے چنانچہ جس طرح یہ پیشگوئی کی تھی اسی طرح بدر کے روز پوری ہوگئی۔ اِدھر رومی غالب ہوئے اور اُدھر مسلمانوں کو فتح ہوئی۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۱۶ مورخہ ۳۰۔ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے زمانہ میں ایرانی لوگ مُشرک تھے اور قیصرِ روم جو کہ عیسائی تھا دراصل موحّد تھا اور مسیح کو ابن اللہ نہیں مانتا تھا اور جب اس کے سامنے مسیح کا وہ ذکر جو قرآن میں درج ہے پیش کیا گیا تو اُس نے کہا میرے نزدیک مسیح کا درجہ اس سے ذرہ بھی زیادہ نہیں جو قرآن نے بتلایا ہے۔ حدیث میں بھی اس کی گواہی بخاری میں موجود ہے کہ مَیں گواہی دیتا ہوں کہ یہ وہی کلام ہے جو کہ توریت میں ہے اور اس کی حیثیت نبوت سے بڑھ کر نہیں ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ الٓمّٓ ۚ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۙ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ؕ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْۢ بَعْدُ ؕ وَيَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ یعنی روم اَب مغلوب ہو گیا ہے مگر تھوڑے عرصہ میں پھر غالب ہوگا[1]۔ عیسائی لوگ نہایت شرارت سے کہتے ہیں کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے دونوں طاقتوں کا اندازہ کر لیا تھا اور پھر فراست سے یہ پیشگوئی کر دی تھی۔ ہم کہتے ہیں کہ اسی طرح مسیح بھی بیماروں کو دیکھ کر اندازہ کر لیا کرتا تھا جو اچھے ہونے کے قابل نظر آتے تھے اُن کا سلب امراض کر دیتا۔ اس طرح تو سارے مُعجزات اُن کے ہاتھ سے جاتے ہیں يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ اس دن مومنوں کو دو

---

[1] نو سال تک تین سال کے بعد۔

خوشیاں ہوں گی ایک تو جنگِ بدر کی فتح دوسرے رُوم والی پیشگوئی کے پُورا ہونے کی۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۷۔ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۴)

یہ بات ہر ایک وسیع المعلومات شخص پر ظاہر ہے کہ اپنے مکاشفات کے متعلق اکثر نبیوں سے بھی اجتہادی غلطیاں ہوئی ہیں اور ان کے شاگردوں سے بھی۔ جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے بِضْعِ کے لفظ کو جو آیت سَيَغْلِبُوْنَ فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ میں داخل ہے تین برس میں محدود سمجھ لیا تھا اور یہ غلطی تھی جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو متنبہ کیا۔

(مکتوباتِ احمدیہ جلد ۵ حصہ ۵ صفحہ ۴۶ مکتوب نمبر ۴ بنام حضرت خلیفہ اوّلؓ)

قرآن کریم کی پیشگوئیوں کے تذکرہ پر فرمایا کہ الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ میں کیسی عظیم الشان پیشگوئی ہے۔ ایرانی مُشرک تھے اور رومن عیسائی تھے مگر قیصرِ روم نے جس کا نام ہرقل تھا جیسا کہ بخاری میں درج ہے اسلام کی عظمت کا اعتراف کیا تھا اور اس طرح پر موحّد ہی تھا۔ غرض جب ایرانیوں نے رومیوں پر فتح پائی تو کفارِ مکّہ نے یہ سمجھ لیا کہ ہم بھی غالب ہوں گے لیکن خدا تعالیٰ نے اس پیشگوئی میں ان کو بتادیا کہ ایرانی پھر مغلوب ہو جائیں گے۔ بعض نے اس پیشگوئی کو اٹکل کہا مگر انہیں یہ معلوم نہیں کہ اس میں دوہری پیشگوئی ہے کہ اسی دن اسلام کی بھی فتح ہوگی چنانچہ بدر کی لڑائی میں جب فتح ہوئی اسی دن ایرانی مغلوب ہوئے۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰۔ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۴)

۱۱۔ ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰۤى اَنْ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَكَانُوْا بِهَا يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ الخ انہوں نے ہمارے نشانوں کو جھٹلایا اور وہ پہلے سے ہنسی کر رہے تھے۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد اوّل صفحہ ۱۱۶)

۲۳۔ وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ۝

بولیوں کی تحقیق کی طرف توجہ دلانے والا بجز قرآن کریم کے اور کوئی دُنیا میں ظاہر نہیں ہؤا۔ اسی پاک کلام نے یہ فرمایا وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ۝ (سُورہ روم) خدا تعالیٰ کی ہستی اور توحید کے نشانوں میں سے زمین آسمان کا پیدا کرنا بولیوں اور رنگوں کا اختلاف

ہے۔ درحقیقت خداشناس کے لئے یہ بڑے نشان ہیں مگر ان کے لئے جو اہلِ علم ہیں۔ اب دیکھو کہ کس قدر تحقیق السنہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اُس کو خداشناسی کا مدار ٹھہرا دیا ہے۔ (منن الرحمٰن صفحہ ۳۸، ۳۹ حاشیہ)

۳۱۔ فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ

شاید کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ خدا نے اعتقادِ توحید کو سب انسانوں میں فطرتی بیان کیا ہے اور فرمایا ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ الجزو ۲۱ یعنی توحید پر قائم ہونا انسان کی فطرت میں داخل ہے جس پر انسان کی پیدائش کی بُنیاد ہے اور نیز فرمایا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى الجزو ۹ یعنی ہر یک رُوح نے ربوبیتِ الٰہیہ کا اقرار کیا کسی نے انکار نہ کیا۔ یہ بھی فطرتی اقرار کی طرف اشارہ ہے۔ اور نیز فرمایا وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ الجزو ۲۷ یعنی میں نے جنّ و انس کو اِس لئے پیدا کیا ہے کہ میری پرستش کریں۔ یہ بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ پرستشِ الٰہی ایک فطرتی امر ہے۔ پس جب توحیدِ الٰہی اور پرستشِ الٰہی سب بنی آدم کے لئے فطرتی امر ہُوا اور کوئی آدمی سرکشی اور بے ایمانی کے لئے پیدا نہ کیا گیا تو پھر جو امور برخلافِ خدا دانی و خداترسی ہیں کیونکر فطرتی امر ہو سکتے ہیں۔

یہ شبہ صرف ایک صداقت کی غلط فہمی ہے کیونکہ وہ امر جو آیات مندرجہ بالا سے ثابت ہوتا ہے وہ تو صرف اِس قدر ہے کہ انسان کی فطرت میں رجوع اِلی اللہ اور اقرارِ وحدانیت کا تخم بویا گیا۔ یہ کہاں آیاتِ موصوفہ میں لکھا ہے کہ وہ تخم ہر ایک فطرت میں مساوی ہے بلکہ جابجا قرآن شریف میں اِس بات کی تصریح ہے کہ وہ تخم بنی آدم میں متفاوت المراتب ہے کسی میں نہایت کم، کسی میں متوسط، کسی میں نہایت زیادہ۔ جیسا ایک جگہ فرمایا ہے فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ الجزو ۲۲ یعنی بنی آدم کی فطرتیں مختلف ہیں۔ بعض لوگ ظالم ہیں جن کے نورِ فطرتی کو قوائے بہیمیہ یا غضبیہ نے دبایا ہُوا ہے بعض درمیانی حالت میں ہیں بعض نیکی اور رجوع اِلی اللہ میں سبقت لے گئے ہیں اسی طرح بعض کی نسبت فرمایا وَاجْتَبَيْنٰهُمْ الجزو ۷ اور ہم نے ان کو چُن لیا یعنی وہ باعتبار اپنی فطرتی قوتوں کے دوسروں میں سے چیدہ اور برگزیدہ تھے اِس لئے قابلِ رسالت و نبوت ٹھہرے اور بعض کی نسبت فرمایا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ الجزو ۹ یعنی ایسے ہیں جیسے چارپائے۔ اور نورِ فطرتی اُن کا اِس قدر کم ہے کہ اُن میں اور مویشی میں کچھ تھوڑا ہی فرق ہے۔ پس دیکھنا چاہیئے کہ اگرچہ خدا تعالیٰ نے یہ بھی فرما دیا ہے کہ تخمِ توحید ہر ایک نفس میں موجود ہے لیکن ساتھ ہی اُس کے یہ بھی کئی مقامات میں

کھول کر بتلا دیا ہے کہ وہ تخم سب میں مساوی نہیں بلکہ بعض کی فطرتوں پر جذباتِ نفسانی اُن کے ایسے غالب آگئے ہیں کہ وہ نور کالمفقود ہوگیا ہے۔ پس ظاہر ہے کہ قوای بہیمیہ یا غضبیہ کا فطرتی ہونا وحدانیتِ الٰہی کے فطرتی ہونے کو منافی نہیں ہے خواہ کوئی کیسا ہی ہَوا پرست اور نفسِ امارہ کا مغلوب ہو پھر بھی کسی نہ کسی قدر نورِ فطرتی اس میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً جو شخص بوجہ غلبہ قوای شہویہ یا غضبیہ چوری کرتا ہے یا خون کرتا ہے یا حرام کاری میں مبتلا ہوتا ہے تو اگرچہ یہ فعل اس کی فطرت کا مقتضا ہے لیکن بمقابلہ اُس کے نورِ صلاحیت جو اس کی فطرت میں رکھا گیا ہے وہ اُس کو اُس وقت جب اس سے کوئی حرکتِ بیجا صادر ہو جائے ملزم کرتا ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا[1] الجزو ۳۰ یعنی ہر ایک اِنسان کو ایک قسم کا خدا نے الہام عطا کر رکھا ہے جس کو نورِ قلب کہتے ہیں اور وہ یہ کہ نیک اور بَد کام میں فرق کر لینا۔ جیسے کوئی چور یا خونی چوری یا خون کرتا ہے تو خدا اُس کے دِل میں اُسی وقت ڈال دیتا ہے کہ تُو نے یہ کام بُرا کیا اچھا نہیں کیا لیکن وہ ایسے القاء کی کچھ پرواہ نہیں رکھتا کیونکہ اس کا نورِ قلب نہایت ضعیف ہوتا ہے اور عقل بھی ضعیف اور قوتِ بہیمیہ غالب اور نفس طالب۔ سو اس طور کی طبیعتیں بھی دُنیا میں پائی جاتی ہیں جن کا وجود روز مرہ کے مشاہدات سے ثابت ہوتا ہے۔ اُن کے نفس کا شورش اور اشتعال جو فطرتی ہے کم نہیں ہو سکتا کیونکہ جو خدا نے لگا دیا اُس کو کون دُور کرے۔ ہاں خدا نے اُن کا ایک علاج بھی رکھا ہے۔ وہ کیا ہے؟ توبہ و استغفار اور ندامت یعنی جب کہ بُرا فعل جو اُن کے نفس کا تقاضا ہے اُن سے صادر ہو۔ جب حسب خاصۂ فطرتی کوئی بُرا خیال دِل میں آوے تو اگر وہ توبہ اور استغفار سے اُس کا تدارک چاہیں تو خدا اِس گناہ کو معاف کر دیتا ہے۔ جب وہ بار بار ٹھوکر کھانے سے بار بار نادم اور تائب ہوں تو وہ ندامت اور توبہ اُس آلودگی کو دھو ڈالتی ہے۔ یہی حقیقی کفارہ ہے جو اس فطرتی گناہ کا علاج ہے۔ اِسی کی طرف اللہ تعالیٰ نے اشارہ فرمایا ہے وَمَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا[2] الجزو ۵ یعنی جس سے کوئی بَدعملی ہو جائے یا اپنے نفس پر کسی نوع کا ظلم کرے اور پھر پشیمان ہو کر خدا سے معافی چاہے تو وہ خدا کو غفور و رحیم پائے گا۔ اِس لطیف اور پُرحکمت عبارت کا مطلب یہ ہے کہ جیسے لغزش اور گناہ نفوسِ ناقصہ کا خاصہ ہے جو اُن سے سرزد ہوتا ہے اس کے مقابلہ پر خدا کا ازلی اور ابدی خاصہ مغفرت و رحم ہے اور اپنی ذات میں وہ غفور و رحیم ہے یعنی اُس کی مغفرت سرسری اور اِتفاقی نہیں بلکہ وہ اس کی ذاتِ قدیم کی صفتِ قدیم ہے جس کو وہ دوست رکھتا ہے اور جوہرِ قابل پر اُس کا فیضان چاہتا ہے۔ یعنی جب کبھی کوئی بشر بروقت صدورِ لغزش و گناہ بہ ندامت و توبہ خدا کی طرف رجوع کرے تو وہ خدا کے نزدیک اِس قابل ہو جاتا ہے کہ رحمت اور مغفرت کے ساتھ خدا اُس کی طرف رجوع کرے اور یہ رجوعِ الٰہی بندۂ نادم اور تائب کی طرف ایک یا دو

---

[1] الشمس آیت ۹

[2] النساء آیت ۱۱۱

مرتبہ میں محدود نہیں بلکہ یہ خدائے تعالیٰ کی ذات میں خاصہ دائمی ہے اور جب تک کوئی گنہگار توبہ کی حالت میں اُس کی طرف رجوع کرتا ہے وہ خاصہ اُس کا ضرور اُس پر ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ پس خدا کا قانونِ قدرت یہ نہیں ہے کہ جو ٹھوکر کھانے والی طبیعتیں ہیں وہ ٹھوکر نہ کھاویں یا وہ لوگ قوی بہیمیہ یا غضبیہ کے مغلوب ہیں اُن کی فطرت بدل جاوے بلکہ اُس کا قانون جو قدیم سے بندھا چلا آتا ہے یہی ہے کہ ناقص لوگ جو بمقتضائے اپنے ذاتی نقصان کے گناہ کریں وہ توبہ و استغفار کرکے بخشے جائیں لیکن جو شخص بعض قوتوں میں فطرتاً ضعیف ہے وہ قوی نہیں ہو سکتا اِس میں تبدیل پیدائش لازم آتی ہے اور وہ بداہتًا محال ہے اور خود مشہود و محسوس ہے کہ مثلاً جس کی فطرت میں سریع الغضب ہونے کی خصلت پائی جاتی ہے وہ بطیئُ الغضب ہرگز نہیں بن سکتا بلکہ ہمیشہ دیکھا جاتا ہے کہ ایسا آدمی غضب کے موقع پر آثارِ غضب بلا اختیار ظاہر کرتا ہے اور ضبط سے باہر آجاتا ہے یا کوئی ناگفتنی بات زبان پر لے آتا ہے اور اگر کسی لحاظ سے کچھ صبر بھی کرے تو دِل میں ضرور پیچ و تاب کھاتا ہے۔ پس یہ احمقانہ خیال ہے کہ کوئی منتر جنتر یا کوئی خاص مذہب اختیار کرنا اُس کی طبیعت کو بدل دے گا۔ اِس جہت سے اُس نبیؐ معصوم نے جس کی لبوں پر حکمت جاری تھی فرمایا خِیَارُهُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُهُمْ فِي الْإِسْلَامِ یعنی جو لوگ جاہلیت میں نیک ذات ہیں وہی اِسلام میں بھی داخل ہو کر نیک ذات ہوتے ہیں غرض طبائعِ اِنسانی جواہرِ کانی کی طرح مختلف الاقسام ہیں بعض طبیعتیں چاندی کی طرح روشن اور صاف۔ بعض گندھک کی طرح بدبُودار اور جلد بھڑکنے والی۔ بعض زیبق کی طرح بے ثبات اور بے قرار۔ بعض لوہے کی طرح سخت اور کثیف۔ اور جیسا یہ اختلافِ طبائع بدیہی الثبوت ہے ایسا ہی انتظامِ ربّانی کے بھی موافق ہے۔ کچھ بے قاعدہ بات نہیں۔ کوئی ایسا امر نہیں کہ قانونِ نظامِ عالَم کے برخلاف ہو بلکہ آسائش و آبادیٔ عالَم اسی پر موقوف ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر تمام طبیعتیں ایک ہی مرتبۂ استعداد پر ہوتیں تو پھر مختلف طور کے کام (جو مختلف طور کی استعدادوں پر موقوف تھے) جن پر دُنیا کی آبادی کا مدار تھا حَیزِ التوا میں رہ جاتے کیونکہ کثیف کاموں کے لئے وہ طبیعتیں مناسبِ حال ہیں جو کثیف ہیں اور لطیف کاموں کے لئے وہ طبیعتیں مناسبت رکھتی ہیں جو لطیف ہیں۔ یونانی حکیموں نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے کہ جیسے بعض انسان حیوانات کے قریب قریب ہوتے ہیں اسی طرح عقل تقاضا کرتی ہے کہ بعض انسان ایسے بھی ہوں جن کا جوہرِ نفس کمال صفوت اور لطافت پر واقع ہو تا جس طرح طبائعِ اِنسانی کا سلسلہ نیچے کی طرف اِس قدر متنزل نظر آتا ہے کہ حیوانات سے جا کر اتصال پکڑ لیا ہے اِسی طرح اُوپر کی طرف بھی ایسا متصاعد ہو کر عالَمِ اعلیٰ سے اِتّصال پکڑ لے۔

اب جبکہ ثابت ہو گیا کہ افرادِ بشریہ عقل میں، قوای اخلاقیہ میں، نورِ قلب میں متفاوت المراتب ہیں تو اِس سے وحیٔ ربّانی کا بعض افرادِ بشریہ سے خاص ہونا یعنی اُن سے جو منِ کُلّ الوجوہ کامل ہیں بہ پایۂ ثبوت پہنچ گیا کیونکہ یہ بات تو خود ہر ایک عاقل پر روشن ہے کہ ہر ایک نفس اپنی استعداد اور قابلیت کے موافق انوارِ الٰہیّہ کو قبول کرتا ہے اُس سے زیادہ نہیں۔ اِس کے سمجھنے کے لئے آفتاب نہایت روشن مثال ہے کیونکہ ہر چند آفتاب اپنی کرنیں چاروں طرف چھوڑ

رہا ہے لیکن اُس کی روشنی قبول کرنے میں ہر ایک مکان برابر نہیں۔ جس مکان کے دروازے بند ہیں اُس میں کچھ روشنی نہیں پڑ سکتی اور جس میں بمقابل آفتاب ایک چھوٹا سا روزنہ ہے اُس میں روشنی تو پڑتی ہے مگر تھوڑی جو کلی ظلمت کو نہیں اُٹھا سکتی لیکن وہ مکان جس کے دروازے بمقابل آفتاب سب کے سب کھلے ہیں اور دیواریں بھی کسی کثیف شئے سے نہیں بلکہ نہایت مصفّٰی اور روشن شیشہ سے ہیں اُس میں صرف یہی خوبی نہیں ہوگی کہ کامل طور پر روشنی قبول کریگا بلکہ اپنی روشنی چاروں طرف پھیلا دے گا اور دوسروں تک پہنچا دے گا۔ یہی مؤخر الذکر نفوسِ صافیہ انبیاء کے مطابق حال ہے یعنی جن نفوسِ مقدسہ کو خدا اپنی رسالت کے لئے چُن لیتا ہے وہ بھی رفعِ حُجب اور بکمل صفوت میں اُس شیش محل کی طرح ہوتے ہیں جس میں نہ کوئی کثافت ہے اور نہ کوئی حجاب باقی ہے پس ظاہر ہے کہ جن افرادِ بشریہ میں وہ کمالِ تام موجود نہیں ایسے لوگ کسی حالت میں مرتبۂ رسالتِ الٰہی نہیں پا سکتے بلکہ یہ مرتبہ قسّام ازل سے اُنہیں کو ملا ہؤا ہے جن کے نفوسِ مقدسہ حُجبِ ظلمانی سے بکلّی پاک ہیں۔ جن کو اغشیہ جسمانی سے بغایت درجہ آزادگی ہے۔ جن کا تقدس و تنزہ اُس درجہ پر جس کے آگے خیال کرنے کی گنجائش ہی نہیں وہی نفوسِ تامہ کاملہ وسیلۂ ہدایت جمیع مخلوقات ہیں اور جیسے حیات کا فیضان تمام اعضاء کو قلب کے ذریعہ سے ہوتا ہے ایسا ہی حکیمِ مطلق نے ہدایت کا فیضان اُنہیں کے ذریعہ سے مقرر کیا ہے کیونکہ وہ کامل مناسبت جو مفیض اور مستفیض میں چاہیئے وہ صرف اُنہیں کو عنایت کی گئی ہے اور یہ ہرگز ممکن نہیں کہ خداوند تعالیٰ جو نہایت تجرّد و تنزہ میں ہے ایسے لوگوں پر افاضۂ انوارِ وحیٔ مقدس اپنے کا کرے۔ جن کی فطرت کے دائرہ کا اکثر حصہ ظلمانی اور دُود آمیز ہے اور نیز نہایت تنگ اور منقبض اور جن کی طبائعِ خسیسہ کدوراتِ سفلیہ میں منغمس اور آلودہ ہیں۔ اگر ہم اپنے تئیں آپ ہی دھوکا نہ دیں تو بے شک ہمیں اقرار کرنا پڑے گا کہ مبدءِ قدیم سے اتصالِ تام پانے کے لئے اور اُس قدوسِ اعظم کا ہم کلام بننے کے لئے ایک ایسی خاص قابلیت اور نورانیت شرط ہے کہ جو اُس مرتبۂ عظیم کی قدر اور شان کے لائق ہے۔ یہ بات ہرگز نہیں کہ ہر یک شخص جو عین نقصان اور فرومائگی اور آلودگی کی حالت میں ہے اور صدہا حُجبِ ظلمانیہ میں محجوب ہے وہ باوصف اپنی پست فطرتی اور دُون ہمتی کے اُس مرتبہ کو پا سکتا ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۱۷۲ تا ۱۷۶ حاشیہ)

وہ قرآن کریم ہے کتابِ مکنون میں ہے جس کے ایک معنی یہ ہیں کہ صحیفۂ فطرت میں اس کی نقلیں منقوش ہیں یعنی اس کا یقین فطری ہے جیسا کہ فرمایا ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا۔ (الحق لدھیانہ صفحہ ۲۸)

اِسلام اِنسان کی فطرت میں رکھا گیا ہے اور خدا تعالیٰ نے انسان کو اِسلام پر پَیدا کیا اور اسلام کے لئے پَیدا کیا ہے یعنی یہ چاہا ہے کہ انسان اپنے تمام قوٰی کے ساتھ اس کی پرستش، اطاعت اور محبت میں لگ جائے اِسی وجہ سے اس قادرِ کریم نے اِنسان کو تمام قوٰی اسلام کے مناسبِ حال عطا کئے ہیں ..... اِنسان کو جو کچھ اندرونی اور بَیرونی اعضاء دئے گئے ہیں یا جو کچھ قوتیں عنایت ہوئی ہیں اصل مقصود اُن سے خدا کی معرفت اور خدا کی پرستش اور خدا تعالیٰ

کی محبت ہے اسی وجہ سے انسان دُنیا میں ہزاروں شغلوں کو اختیار کر کے پھر بھی بجز خدا تعالیٰ کے اپنی خوشحالی کسی میں نہیں پاتا۔ بڑا دولتمند ہو کر، بڑا عہدہ پا کر، بڑا تاجر بن کر، بڑی بادشاہت تک پہنچ کر، بڑا فلاسفر کہلا کر آخران دنیوی گرفتاریوں سے بڑی حسرتوں کے ساتھ جاتا ہے اور ہمیشہ دل اس کا دُنیا کے استغراق سے اس کو ملزم کرتا رہتا ہے اور اس کے مکروں اور فریبوں اور ناجائز کاموں میں کبھی اس کا کانشنس اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ ایک دانا انسان اس مسئلہ کو اس طرح بھی سمجھ سکتا ہے کہ جس چیز کے قویٰ ایک اعلیٰ سے اعلیٰ کام کر سکتے ہیں اور پھر آگے جا کر ٹھہر جاتے ہیں وہ اعلیٰ کام اس کی پیدائش کی علتِ غائی سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً بیل کا کام اعلیٰ سے اعلیٰ قلبہ رانی یا آبپاشی یا بار برداری ہے اس سے زیادہ اس کی قوتوں میں کچھ ثابت نہیں ہوا۔ سو بیل کی زندگی کا مدعا یہی تین چیزیں ہیں اس سے زیادہ کوئی قوت اس میں پائی نہیں جاتی۔ مگر جب ہم انسان کی قوتوں کو ٹٹولتے ہیں کہ ان میں اعلیٰ سے اعلیٰ کونسی قوت ہے تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ خدائے اعلیٰ و برتر کی اس میں تلاش پائی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ چاہتا ہے کہ خدا کی محبت میں ایسا گداز اور محو ہو کہ اس کا اپنا کچھ بھی نہ رہے سب خدا کا ہو جائے۔ وہ کھانے اور سونے وغیرہ طبعی امور میں دوسرے حیوانات کو اپنا شریک غالب رکھتا ہے صنعتکاری میں بعض حیوانات اس سے بہت بڑھے ہوئے ہیں بلکہ شہد کی مکھیاں بھی ہر ایک پھول کا عطر نکال کر ایسا شہدِ نفیس پیدا کرتی ہیں کہ اب تک اس صنعت میں انسان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ پس ظاہر ہے کہ انسان کا اعلیٰ کمال خدائے تعالیٰ کا وصال ہے لہٰذا اس کی زندگی کا اصل مدعا یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف اس کے دل کی کھڑکی کھلے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۰۱، ۱۰۲)

وَاَمَّا الرَّجُلُ الْمُحَمَّدِيُّ فَقَدْ اُمِرَلَهٗ اَنْ يَّتَّبِعَ الشَّرِيْعَةَ الْفِطْرِيَّةَ كَمَا يَتَّبِعُ الشَّرِيْعَةَ الْقَانُوْنِيَّةَ وَلَا يَقْطَعُ اَمْرًا اِلَّا بَعْدَ شَهَادَةِ الشَّرِيْعَةِ الْفِطْرِيَّةِ وَلِذٰلِكَ سُمِّيَ الْاِسْلَامُ دِيْنَ الْفِطْرَةِ لِلُزُوْمِ الْفِطْرَةِ لِهٰذِهِ الْمِلَّةِ وَاِلَيْهِ اَشَارَ نَبِيُّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِسْتَفْتِ قَلْبَكَ وَلَوْ اَفْتَاكَ الْمُفْتُوْنَ۔ فَانْظُرْ كَيْفَ رَغَّبَ فِي الشَّرِيْعَةِ الْفِطْرِيَّةِ وَلَمْ يَقْنَعْ عَلٰى مَا قَالَ الْعَالِمُوْنَ۔ فَالْمُسْلِمُ الْكَامِلُ مَنْ يَّتَّبِعُ الشَّرِيْعَتَيْنِ۔ وَيَنْظُرُ بِالْعَيْنَيْنِ فَيُهْدٰى اِلَى الصِّرَاطِ وَلَا يَخْدَعُهُ الْخَادِعُوْنَ۔ وَلِذٰلِكَ ذَكَرَ اللّٰهُ فِي مَحَامِدِ الْاِسْلَامِ اَنَّهٗ شَرِيْعَةٌ فِطْرِيَّةٌ

(ترجمہ از مرتب) ایک مسلمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جیسے وہ شریعتِ قانونیہ کی پیروی کرتا ہے ویسے ہی شریعتِ فطریہ کی بھی پیروی کرے اور کسی امر کا قطعی فیصلہ شریعتِ فطریہ کی شہادت کے بغیر نہ کرے۔ اور چونکہ اس ملت کے ساتھ فطرت لازم ہے اس لئے اسلام کو دینِ فطرت کہا جاتا ہے اور اسی کی طرف رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے کہ تُو اپنے دل سے فتویٰ طلب کر خواہ تجھے مفتی بھی فتویٰ دیں۔ پس غور کرو کہ کس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعتِ فطریہ کی طرف رغبت دلائی ہے اور اس بات کو کافی سمجھنے کا ارشاد نہیں فرمایا جو عالم لوگ بیان کرتے ہیں پس کامل مسلم وہ ہے جو دو شریعتوں کی پیروی کرے اور دو آنکھوں کے ساتھ دیکھے۔ سو ایسے شخص کی ہی سیدھے راستہ کی طرف راہنمائی کی جائے گی اور اس کو دھوکہ دینے والے دھوکہ نہیں دے سکیں گے اس لئے

حَيْثُ قَالَ فِطْرَتَ اللهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا۔ وَهٰذَا مِنْ اَعْظَمِ فَضَائِلِ هٰذِهِ الْمِلَّةِ وَمَنَاقِبِ تِلْكَ الشَّرِيْعَةِ فَاِنَّهٗ يُوْجَدُ فِيْ هٰذَا التَّعْلِيْمِ مَدَارُ الْاَمْرِ عَلَى الْقُوَّةِ الْقُدْسِيَّةِ الْقَاضِيَةِ الْمَوْجُوْدَةِ فِي النَّشْاَةِ الْاِنْسَانِيَّةِ الْمُوْصُوْلَةِ اِلٰى كَمَالٍ تَامٍّ فِيْ مَرَاتِبِ الْمَحْوِيَّةِ. فَلَا يَبْقٰى مَعَهَا مَنْفَذٌ لِلتَّصَرُّفَاتِ النَّفْسَانِيَّةِ لِمَا فِيْهِ عَمَلٌ عَلَى الشَّهَادَةِ الْفِطْرِيَّةِ. وَاَمَّا التَّوْرَاةُ وَالْاِنْجِيْلُ فَيَتْرُكَانِ الْاِنْسَانَ اِلٰى حَدٍّ هُوَ اَبْعَدُ مِنَ الشَّهَادَةِ الْفِطْرِيَّةِ الْقُدْسِيَّةِ وَاَقْرَبُ اِلٰى دَخْلِ اِفْرَاطِ الْقُوَّةِ الْغَضَبِيَّةِ اَوْ تَفْرِيْطِ الْقُوَّةِ الْوَاهِمَةِ حَتّٰى يُمْكِنَ اَنْ يُسَمَّى الْمُنْتَقِمُ فِيْ بَعْضِ الْمَوَاضِعِ ذِئْبًا مُوْذِيًا عِنْدَ الْعُقَلَاءِ اَوْ يُسَمَّى الَّذِيْ عَفَا فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ وَاَغْضٰى مَثَلًا عِنْدَ رُؤْيَةِ فِسْقِ اَهْلِهٖ دَيُّوْثًا وَقَبِيْحًا عِنْدَ اَهْلِ الْغَيْرَةِ وَالْحَيَاءِ. وَلِذٰلِكَ تَرٰى فِيْ بَعْضِ الْمَوَاضِعِ رَجُلًا سَرَّهٗ تَعْلِيْمُ الْعَفْوِ يَتْرُكُ حَقِيْقَةَ الْعَفْوِ وَالرَّحْمَةِ وَيُجَاوِزُ حُدُوْدَ الْغَيْرَةِ الْاِنْسَانِيَّةِ فَاِنَّ الْعَفْوَ فِيْ كُلِّ مَحَلٍّ لَيْسَ بِمَحْمُوْدٍ عِنْدَ الْعَاقِلِيْنَ. وَكَذٰلِكَ الْاِنْتِقَامُ فِيْ كُلِّ مَقَامٍ لَيْسَ بِخَيْرٍ عِنْدَ الْمُتَدَبِّرِيْنَ. فَلَا شَكَّ اَنَّهٗ مَنْ اَوْجَبَ الْعَفْوَ عَلٰى نَفْسِهٖ فِيْ كُلِّ مَقَامٍ بِمُتَابَعَةِ الْاِنْجِيْلِ فَقَدْ وَضَعَ الْاِحْسَانَ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ فِيْ بَعْضِ الْحَالَاتِ. وَمَنْ اَوْجَبَ الْاِنْتِقَامَ عَلٰى نَفْسِهٖ فِيْ كُلِّ مَقَامٍ بِمُتَابَعَةِ التَّوْرَاةِ فَقَدْ وَضَعَ الْقِصَاصَ فِيْ

اللہ تعالیٰ نے اسلام کی خوبیوں میں سے اس خوبی کا ذکر کیا ہے کہ وہ ایک فطری قانون ہے جیسا کہ فرمایا فِطْرَتَ اللهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا اور یہ اس ملت کے فضائل میں سے سب سے بڑی فضیلت ہے اور اس شریعت کی خوبیوں میں سے سب سے بڑی خوبی ہے کیونکہ اس تعلیم میں حکم کا دارومدار اس قوتِ قدسیہ پر ہے جو فیصلہ کرنے والی اور انسانی سرشت میں موجود ہے اور فنا کے مراتب میں کمال تک پہنچانے والی ہے اور اس کی موجودگی میں تصرفاتِ نفسانیہ کے لئے کوئی راہ باقی نہیں رہتی کیونکہ اس میں فطرت کی شہادت پر عمل کیا جاتا ہے لیکن تورات اور انجیل انسان کو اس مقام پر چھوڑ دیتی ہیں جو انسان کی پاکیزہ فطرت کی شہادت سے بہت دُور ہے اور قوتِ غضبیہ اور قوتِ واہمہ کی افراط و تفریط کے دخل کے زیادہ قریب ہے یہاں تک کہ عقلمندوں کے نزدیک یہ بھی ممکن ہے کہ بعض مواقع پر انتقام لینے والے کو مُوذی بھیڑیے کا نام دیا جائے یا جو شخص بے موقع عفو سے کام لیتا ہے یا اپنے اہل کے فسق کو دیکھ کر چشم پوشی کرتا ہے ممکن ہے اسے اربابِ غیرت اور اہلِ حیاء دیوث قرار دیں اس لئے تم بعض مواقع پر دیکھو گے کہ ایک شخص جو عفو کی تعلیم کو اچھا سمجھتا ہے وہ رحم اور عفو کی حقیقت کو چھوڑ دیتا ہے اور غیرتِ انسانی کی حدود سے تجاوز کر جاتا ہے کیونکہ عقلمندوں کے نزدیک بے موقع عفو قابلِ تعریف نہیں اور نہ ہی تدبّر کرنے والوں کے نزدیک اِنتقام ہر جگہ لائقِ تحسین ہے۔ پس اس میں شک نہیں کہ جو شخص انجیل کی پیروی میں ہر جگہ اپنے نفس پر عفو کو لازم کر لیتا ہے تو گویا بعض حالات میں وہ احسان کو بے محل کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اور جو شخص تورات کی پیروی میں ہر جگہ اِنتقام کو ضروری قرار دیتا ہے تو وہ بعض اوقات بے موقع قصاص لینے کا فیصلہ کر دیتا ہے اور حسنات کی بلندیوں سے گر جاتا

غَیْرِ مَحَلِّہٖ وَالْحَطِّ مِنْ مَدَارِجِ الْحَسَنَاتِ وَ اَمَّا الْقُرْاٰنُ فَقَدْ رَغَّبَ فِیْ مِثْلِ ھٰذِہِ الْمَوَاضِعِ اِلٰی شَھَادَۃِ الشَّرِیْعَۃِ الْفِطْرِیَّۃِ الَّتِیْ تَنْبَعُ مِنْ عَیْنِ الْقُوَّۃِ الْقُدْسِیَّۃِ وَتَنْزِلُ مِنْ رُوْحِ الْاَمِیْنِ فِیْ جُذُوْرِ الْقُلُوْبِ الصَّافِیَۃِ وَقَالَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ فَانْظُرْ اِلٰی ھٰذِہِ الدَّقِیْقَۃِ الرُّوْحَانِیَّۃِ فَاِنَّہٗ اَمَرَ بِالْعَفْوِ عَنِ الْجَرِیْمَۃِ بِشَرْطِ اَنْ یَّتَحَقَّقَ فِیْہِ اِصْلَاحٌ لِّنَفْسٍ وَ اِلَّا فَجَزَاءُ السَّیِّئَۃِ بِالسَّیِّئَۃِ وَلَمَّا کَانَ الْقُرْاٰنُ خَاتَمَ الْکُتُبِ وَ اَکْمَلَھَا وَ اَحْسَنَ الصُّحُفِ وَ اَجْمَلَھَا وَضَعَ اَسَاسَ التَّعْلِیْمِ عَلٰی مُنْتَھٰی مِعْرَاجِ الْکَمَالِ وَجَعَلَ الشَّرِیْعَۃَ الْفِطْرِیَّۃَ زَوْجًا لِلشَّرِیْعَۃِ الْقَانُوْنِیَّۃِ فِیْ کُلِّ الْاَحْوَالِ لِیَعْصِمَ النَّاسَ مِنَ الضَّلَالِ وَ اَرَادَ اَنْ یَّجْعَلَ الْاِنْسَانَ کَالْمَیِّتِ لَا یَتَحَرَّکُ اِلَی الْیَمِیْنِ وَلَا اِلَی الشِّمَالِ وَلَا یَقْدِرُ عَلٰی عَفْوٍ وَّلَا عَلٰی اِنْتِقَامٍ اِلَّا بِحُکْمِ الْمَصْلِحَۃِ مِنَ اللّٰہِ ذِی الْجَلَالِ۔

(حاشیہ متعلقہ خطبہ الہامیہ صفحہ ش۔ ح)

ایک علم کا ذریعہ انسانی کانشنس بھی ہے جس کا نام خدا کی کتاب میں انسانی فطرت رکھا ہے۔ جیساکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا

یعنی خدا کی فطرت جس پر لوگ پیدا کئے گئے ہیں۔ اور وہ نقش فطرت کیا ہے؟ یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کو واحد لاشریک، خالق الکل مرنے اور پیدا ہونے سے پاک سمجھنا۔ اور ہم کانشنس کو علم الیقین کے مرتبہ پر اس لئے کہتے ہیں کہ گو بظاہر اس میں ایک علم سے دوسرے علم کی طرف اِنتقال نہیں پایا جاتا جیساکہ دھوئیں کے علم سے آگ کے علم کا ہر طرف اِنتقال پایا جاتا ہے لیکن ایک قسم کے باریک اِنتقال سے یہ مرتبہ خالی نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر یک چیز میں خدا نے ایک نامعلوم خاصیت رکھی ہے جو بیان یا تقریر میں نہیں آسکتی لیکن اس چیز پر نظر ڈالنے اور اس کا تصور کرنے سے بلا توقف اس خاصیت کی طرف

ہے لیکن قرآن کریم نے ان جگہوں میں اس شریعتِ فطریہ کی شہادت کی طرف رغبت دلائی ہے جو قوتِ قدسیہ کے چشمہ سے پھوٹتی ہے اور جبریل کی طرف سے پاک دِل کی گہرائیوں میں اُترتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ۔ پس اس رُوحانی نکتہ پر غور کریں کیونکہ اِس میں مجرم کو معاف کرنے کا حکم ہے بشرطیکہ اس سے نفس کی اِصلاح ہوتی ہو ورنہ بُرائی کا بدلہ بُرائی ہی ہے۔ اور چونکہ قرآن کریم خاتم الکتب اور کامل کتاب اور خوبصورت اور بہترین صحیفہ ہے اِس لئے اس نے اپنی تعلیم کی بنیاد انتہائی کمال پر رکھی ہے اور تمام حالات میں شریعتِ فطریہ کو شریعتِ قانونیہ کا جوڑا قرار دیا ہے تا لوگوں کو گمراہی سے بچائے اور اس نے چاہا کہ انسانی نفس کو ایک ایسے مُردہ کی طرح کر دے جو دائیں بائیں حرکت نہیں کر سکتا اور نہ وہ خدائے ذوالجلال کے مصلحت آمیز حکم کے بغیر عفو یا اِنتقام پر قادر ہو سکتا ہے۔ (حاشیہ متعلقہ خطبہ الہامیہ صفحہ ش۔ ح)

ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ غرض وہ خاصیت اس وجود کو ایسی لازم پڑی ہوتی ہے جیسا کہ آگ کو دھواں لازم ہے۔ مثلاً جب ہم خدائے تعالیٰ کی ذات کی طرف توجہ کرتے ہیں کہ کیسی ہونی چاہیئے۔ آیا خدا ایسا ہونا چاہیئے کہ ہماری طرح پیدا ہو اور ہماری طرح دُکھ اُٹھاوے اور ہماری طرح مرے تو معاً اس تصور سے ہمارا دل دُکھتا اور کانشنس کانپتا ہے اور اس قدر جوش دکھلاتا ہے کہ گویا اس خیال کو دھکے دیتا ہے اور بول اُٹھتا ہے کہ وہ خدا جس کی طاقتوں پر تمام امیدوں کا مدار ہے وہ تمام نقصانوں سے پاک اور کامل اور قوی چاہیئے۔ اور جب ہی خدا کا خیال ہمارے دل میں آتا ہے معاً توحید اور خدا ایں دھوئیں اور آگ کی طرح بلکہ اس سے بہت زیادہ ملازمتِ تامّہ کا احساس ہوتا ہے۔ لہٰذا جو علم ہمیں ہمارے کانشنس کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے وہ علم الیقین کے مرتبہ میں داخل ہے لیکن اس پر ایک اور مرتبہ ہے جو عین الیقین کہلاتا ہے اور اس مرتبہ سے اس طور کا علم مراد ہے کہ جب ہمارے یقین اور اس چیز میں جس پر کسی نوع کا یقین کیا گیا ہے کوئی درمیانی واسطہ نہ ہو۔ مثلاً جب ہم قوتِ شامّہ کے ذریعہ سے ایک خوشبو یا بدبو کو معلوم کرتے ہیں اور یا ہم قوتِ ذائقہ کے ذریعہ سے شیریں یا نمکین پر اطلاع پاتے ہیں یا قوتِ حاسہ کے ذریعہ سے گرم یا سرد کو معلوم کرتے ہیں تو یہ تمام معلومات ہمارے عین الیقین کی قسم میں داخل ہیں مگر عالَمِ ثانی کے بارے میں ہمارا علم الیقیات تب عین الیقین کی حد تک پہنچتا ہے کہ جب خود بلاواسطہ ہم الہام پاویں۔ خدا کی آواز کو اپنے کانوں سے سُنیں اور خدا کے صاف اور صحیح کشفوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ ہم بیشک کامل معرفت کے حاصل کرنے کے لئے بلاواسطہ الہام کے محتاج ہیں اور اس کامل معرفت کی ہم اپنے دل میں بھوک اور پیاس بھی پاتے ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ نے ہمارے لئے پہلے سے اس معرفت کا سامان میسّر نہیں کیا تو یہ پیاس اور بھوک ہمیں کیوں لگا دی ہے کیا ہم اس زندگی میں جو ہماری آخرت کے ذخیرہ کے لئے یہی ایک پیمانہ ہے اس بات پر راضی ہو سکتے ہیں کہ ہم اس سچے اور کامل اور قادر اور زندہ خدا پر صرف قصوں اور کہانیوں کے رنگ میں ایمان لاویں یا محض عقلی معرفت پر کفایت کریں جو اب تک ناقص اور ناتمام معرفت ہے۔ کیا خدا کے سچے عاشقوں اور حقیقی دلدادوں کا دل نہیں چاہتا کہ اس محبوب کے کلام سے لذّت حاصل کریں؟ کیا جنہوں نے خدا کے لئے تمام دُنیا کو برباد کیا، دل کو دیا جان کو دیا وہ اس بات پر راضی ہو سکتے ہیں کہ صرف ایک دھندلی سی روشنی میں کھڑے رہ کر مرتے رہیں اور اس آفتاب صداقت کا مُنہ نہ دیکھیں۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ اس زندہ خدا کا اَنَا الْمَوْجُوْد کہنا وہ معرفت کا مرتبہ عطا کرتا ہے کہ اگر دُنیا کے تمام فلاسفروں کی خود تراشیدہ کتابیں ایک طرف رکھیں اور ایک طرف اَنَا الْمَوْجُوْد خدا کا کہنا تو اس کے مقابل وہ تمام دفتر ہیچ ہیں۔ جو فلاسفر کہلا کر آپ اندھے رہے وہ ہمیں کیا سکھلائیں گے۔ غرض اگر خدا تعالیٰ نے حق کے طالبوں کو کامل معرفت دینے کا ارادہ فرمایا ہے تو ضرور اُس نے اپنے مکالمہ اور مخاطبہ کا طریق کھلا رکھا ہے۔ اس بارے میں اللہ جلّ شانہٗ قرآن شریف میں یہ فرماتا ہے: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ۔

(اسلامی اُصول کی فلاسفی صفحہ ۱۲۱ تا ۱۲۲)

رُوح کا خدائے واحد لاشریک کا طلبگار ہونا اور بغیر خدا کے وصال کے کسی چیز میں سچی تسلی نہ پانا یہ انسانی فطرت میں داخل ہے یعنی خدا نے اِس خواہش کو انسانی رُوح میں پیدا کر رکھا ہے جو انسانی رُوح کسی چیز سے تسلی اور سکینت بجز وصالِ الٰہی کے نہیں پا سکتی پس اگر انسانی رُوح میں یہ خواہش موجود ہے تو ضرور ماننا پڑتا ہے کہ رُوح خدا کی پیدا کردہ ہے جس نے اس میں یہ خواہش ڈال دی مگر یہ خواہش تو درحقیقت اِنسانی رُوح میں موجود ہے۔ اِس سے ثابت ہؤا کہ اِنسانی رُوح درحقیقت خدا کی پیدا کردہ ہے۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جس قدر دو چیزوں میں کوئی ذاتی تعلق درمیان ہو اسی قدر ان میں اس تعلق کی وجہ سے محبت بھی پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ ماں کو اپنے بچے سے محبت ہوتی ہے اور بچہ کو اپنی ماں سے۔ کیونکہ وہ اس کے خون سے پیدا ہؤا ہے اور اس کے رحم میں پرورش پائی ہے۔ پس اگر رُوحوں کو خدا تعالیٰ کے ساتھ کوئی تعلق پیدائش کا درمیان نہیں اور وہ قدیم سے خود بخود ہیں تو عقل قبول نہیں کر سکتی کہ اُن کی فطرت میں خدا تعالیٰ کی محبت ہو اور جب ان کی فطرت میں پرمیشر کی محبت نہیں تو وہ کسی طرح نجات پا ہی نہیں سکتیں۔ (چشمہ مسیحی صفحہ ۴۰، ۴۱)

(آیت فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا کے) معنے یہی ہیں کہ اِسلام فطرتی مذہب ہے۔ اِنسان کی بناوٹ جس مذہب کو چاہتی ہے وہ اِسلام ہے۔ اِس کے یہ معنی ہیں کہ اِسلام میں بناوٹ نہیں ہے۔ اس کے تمام اصول فطرتِ اِنسانی کے موافق ہیں تثلیث اور کفّارہ کی طرح نہیں ہیں جو سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ عیسائیوں نے خود مانا ہے کہ جہاں تثلیث نہیں گئی وہاں توحید کا مطالبہ ہوگا کیونکہ فطرت کے موافق توحید ہی ہے۔ اگر قرآن شریف نہ بھی ہوتا تب بھی انسانی فطرت توحید ہی کو مانتی کیونکہ وہ باطنی شریعت کے موافق ہے۔ ایسا ہی اِسلام کی کُل تعلیم باطنی شریعت کے موافق ہے برخلاف عیسائیوں کی تعلیم کے جو مخالف ہے۔ دیکھو حال ہی میں امریکہ میں طلاق کا قانون خلافِ انجیل پاس کرنا پڑا۔ یہ دِقت کیوں پیش آئی اِس لئے کہ انجیل کی تعلیم فطرت کے موافق نہ تھی۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰ ؍نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

فطر کے معنے پھاڑنے کے ہیں اور فطرت سے یہ مراد ہے کہ انسان خاص طور پر پھاڑا گیا ہے۔ جب آسمان سے قوت آتی ہے تو نیک قوتیں پھٹنی شروع کر دیتی ہیں۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۶ مورخہ ۱۷ ؍فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

۳۲۔ مُنِیْبِیْنَ اِلَیْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝

تفسیر حسینی میں زیر تفسیر آیت وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ لکھا ہے کہ کتاب تیسیر میں شیخ محمد ابن اسلم طوسی سے نقل کیا ہے کہ ایک حدیث مجھے پہنچی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ” جو کچھ

مجھ سے روایت کرو پہلے کتاب اللہ پر عرض کر لو اگر وہ حدیث کتاب اللہ کے موافق ہو تو وہ حدیث میری طرف سے ہو گی ورنہ نہیں۔" سو میں نے اِس حدیث کو کہ مَنْ تَرَكَ الصَّلٰوةَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ كَفَرَ قرآن سے مطابق کرنا چاہا اور تیس سال اِس بارہ میں فکر کرتا رہا مجھے یہ آیت ملی وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔

(الحق لدھیانہ صفحہ ۳۸)

قرآن مجید نے خود حدیث کو اپنا خادم مفسر قرار دیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں بعض احکام ایسے طور پر بیان کئے ہیں کہ وہ بلا تفصیل صاحب حدیث صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی مسلمان مخاطب قرآن کی سمجھ میں نہ آتی اور نہ وہ دستور العمل ٹھہرائی جا سکتی۔ ایک حکم نماز ہی کو لو قرآن میں اس کی نسبت صرف یہ ارشاد ہے اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ اور کہیں اس کی تفسیر نہیں ہے کہ نماز کیونکر قائم کی جائے۔ صاحب الحدیث آنحضرت صلعم (بابی ھو و امی) نے قولی و فعلی حدیثوں سے بتایا کہ نماز یوں پڑھی جاتی ہے تو وہ حکم قرآن سمجھ و عمل میں آیا۔ (الحق لدھیانہ صفحہ ۵۳)

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۝

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ اپنا قانونِ قدرت یہ بتلاتا ہے کہ انسان کی زندگی میں صرف چار واقعات ہیں پہلے وہ پیدا کیا جاتا ہے پھر تکمیل اور تربیت کے لئے رُوحانی اور جسمانی طور پر رزقِ مقسوم اُسے ملتا ہے۔ پھر اس پر موت وارد ہوتی ہے پھر وہ زندہ کیا جاتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اِن آیات میں کوئی ایسا کلمہ استثنائی نہیں جس کی رُو سے مسیح کے واقعاتِ خاصہ باہر رکھے گئے ہوں حالانکہ قرآن کریم اوّل سے آخر تک یہ التزام رکھتا ہے کہ اگر کسی واقعہ کے ذکر کرنے کے وقت کوئی فردِ بشر باہر نکالنے کے لائق ہو تو فی الفور اس قاعدہ کُلیہ سے اس کو باہر نکال لیتا ہے یا اس کے واقعاتِ خاصہ بیان کر دیتا ہے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۱۸، ۶۱۹)

اللہ وہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا پھر تمہیں رزق دیا پھر تمہیں مارے گا پھر زندہ کرے گا۔ کیا تمہارے معبودوں میں سے جو انسانوں میں سے ہیں کوئی ایسا کر سکتا ہے۔ پاک ہے خدا ان بہتانوں سے جو مُشرک لوگ اس پر لگا رہے ہیں۔

(جنگِ مقدس صفحہ ۷۸)

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ

بِبَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ○

وہ رسول اس وقت آیا کہ جب جنگل اور دریا میں فساد ظاہر ہوگیا یعنی تمام رُوئے زمین پر ظلمت اور ضلالت پھیل گئی اور کیا اُمّی لوگ اور کیا اہلِ کتاب اور اہلِ علم سب کے سب بگڑ گئے اور کوئی حق پر قائم نہ رہا اور یہ سب فساد اس لئے ہؤا کہ لوگوں کے دلوں سے خلوص اور صدق اُٹھ گیا اور اُن کے اعمال خدا کے لئے نہ رہے بلکہ اُن میں بہت سا خلل واقع ہوگیا اور وہ سب رُوبدُنیا ہوگئے اور رُوبحق نہ رہے اِس لئے امدادِ الٰہی اُن سے منقطع ہوگئی سو خدا نے اپنی حجت پُوری کرنے کے لئے اُن کے لئے اپنا رسُول بھیجا تا اُن کو اُن کے بعض عملوں کا مزہ چکھادے اور تا ایسا ہو کہ وہ رجوع کریں۔ (براہینِ احمدیہ صفحہ ۵۲۹، ۵۳۰)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دعویٰ تھا کہ مَیں تمام قوموں کے لئے آیا ہوں سو قرآن شریف نے تمام قوموں کو ملزم کیا ہے کہ وہ طرح طرح کے شرک اور فسق و فجور میں مبتلا ہیں جیسا کہ وہ فرماتا ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ یعنی دریا بھی بگڑ گئے اور جنگل بھی بگڑ گئے۔ (نور القرآن ۱ صفحہ ۵)

ہمارے سیّد و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایسے وقت میں مبعوث ہوئے تھے جبکہ دُنیا ہر ایک پہلو سے خراب اور تباہ ہو چکی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ یعنی جنگل بھی بگڑ گئے اور دریا بھی بگڑ گئے۔ یہ اشارہ اِس بات کی طرف ہے کہ جو اہلِ کتاب کہلاتے ہیں وہ بھی بگڑ گئے اور جو دوسرے لوگ ہیں جن کو الہام کا پانی نہیں ملا وہ بھی بگڑ گئے۔ پس قرآن شریف کا کام دراصل مُردوں کو زندہ کرنا تھا۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۴)

یہ بات ہر ایک عقلِ سلیم قبول کرے گی کہ کمال اصلاح کی نوبت کمال فساد کے بعد آتی ہے طبیب کا یہ کام نہیں کہ وہ چنگے بھلے لوگوں کو وہ دوائیں دے جو عین بیماری کے غلبہ کے وقت دینی چاہئیں اِسی لئے قرآن شریف نے پہلے یہ بیان کر دیا کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ یعنی تمام دُنیا میں فساد پھیل گیا اور ہر ایک قسم کے گناہ اور معاصی کا طوفان برپا ہوگیا اور پھر ہر ایک بدعقیدگی اور بدعملی کے بارے میں مکمل ہدایتیں پیش کر کے فرمایا کہ:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ

یعنی آج مَیں نے تمہارا دین کامل مکمل کر دیا۔ مگر کسی پہلے زمانہ میں جس میں ابھی طوفانِ ضلالت بھی جوش میں نہیں آیا تھا مکمل کتاب کیونکر انسانوں کو مل سکتی ہے۔ (چشمۂ معرفت صفحہ ۱۳۹، ۱۴۰)

پادری فنڈل صاحب مصنف میزان الحق جو عیسائی مذہب کا سخت حامی ایک یورپین انگریز ہے وہ اپنی کتاب میزان الحق میں لکھتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں سب قوموں سے زیادہ بگڑی ہوئی عیسائی قوم تھی

اور ان کی بدچلنیاں عیسائی مذہب کی عار اور ننگ کا موجب تھیں اور خود قرآن شریف بھی اپنے نزول کی ضرورت کیلئے یہ آیت پیش کرتا ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ یعنی جنگل بھی بگڑ گئے اور دریا بھی بگڑ گئے۔ اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ کوئی قوم خواہ وحشیانہ حالت رکھتی ہیں اور خواہ عقلمندی کا دعویٰ کرتی ہیں فساد سے خالی نہیں ہیں۔

(پیغامِ صلح صفحہ ۳۴، ۳۵)

یہ اُمّتِ مرحومہ ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوئی ہے کہ جس کے لئے آفات پیدا ہونے لگی ہیں۔ انسان کی حرکت گناہوں اور معاصی کی طرف ایسی ہے جیسے کہ ایک پتھر نیچے کو چلا جاتا ہے۔ اُمّتِ مرحومہ اِس لئے کہلاتی ہے کہ معاصی کا زور ہو گیا جیسے کہ فرمایا اللہ تعالیٰ نے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ اور دوسری جگہ فرمایا يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا۔ اِن سب آیات پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِن دونوں آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے دو نقشے دکھائے ہیں اوّل الذکر میں تو اُس زمانہ کا جبکہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تھے۔ اُس وقت بھی چونکہ دُنیا کی حالت بہت ہی قابلِ رحم ہو گئی تھی۔ اخلاق، اعمال، عقائد سب کا نام و نشان اُٹھ گیا تھا۔ اِس لئے اِس اُمّت کو مرحومہ کہا گیا کیونکہ اس وقت بڑے ہی رحم کی ضرورت تھی اور اِسی لئے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا کہ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ۔

(رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۱۴۶، ۱۴۷)

قرآن شریف جس وقت نازل ہُوا ہے کیا اُس وقت نظامِ رُوحانی یہ نہیں چاہتا تھا کہ خدا کا کلام نازل ہو اور کوئی مردِ آسمانی آوے جو اس گُم شدہ متاع کو واپس دلائے۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ بعثت کی تاریخ پڑھو تو معلوم ہو جاوے گا کہ دُنیا کی کیا حالت تھی۔ خدا تعالیٰ کی پرستش دُنیا سے اُٹھ گئی تھی اور توحید کا نقش یا مٹ چکا تھا۔ باطل پرستی اور معبودانِ باطلہ کی پرستش نے اللہ جلّ شانہٗ کی جگہ لے رکھی تھی۔ دُنیا پر جہالت اور ظلمت کا ایک خوفناک پردہ چھایا ہوا تھا۔ دُنیا کے تختہ پر کوئی مُلک، کوئی قطعہ، کوئی سرزمین ایسی نہ رہ گئی تھی جہاں خدائے واحد ہاں حیّ و قیّوم خدا کی پرستش ہوتی ہو۔ عیسائیوں کی مُردہ پرست قوم تثلیث کے چکر میں پھنسی ہوئی تھی اور ویدوں میں توحید کا بیجا دعویٰ کرنے والے ہندوستان کے رہنے والے ۳۳ کروڑ دیوتاؤں کے پجاری تھے۔ غرض خود خدا تعالیٰ نے جو نقشہ اُس وقت کی حالت کا اِن الفاظ میں کھینچا ہے کہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ یہ بالکل سچا ہے اور اس سے بہتر انسانی زبان اور قلم اس حالت کو بیان نہیں کر سکتی۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۱ مورخہ ۱۰؍جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

ہمارے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ..... اعتقادی اور عملی حالت بالکل خراب ہو گئی تھی اور نہ صرف عرب کی بلکہ کُل دُنیا کی حالت بگڑ چکی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ اس فسادِ عظیم کے وقت خدا تعالیٰ نے اپنے کامل اور پاک بندہ کو مامور کر کے بھیجا جس کے سبب سے تھوڑی ہی مدت میں ایک عجیب تبدیلی واقع ہو گئی مخلوق پرستی کی بجائے خدا تعالیٰ پُوجا گیا بد اعمالیوں کی بجائے اعمالِ صالحہ نظر آنے لگے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷؍اپریل ۱۹۰۱ء صفحہ ۵)

دریا بھی بگڑ گئے اور جنگل بھی بگڑ گئے۔ دریاؤں سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو پانی دیا گیا یعنی شریعت اور کتاب اللہ ملی۔ اور جنگل سے مُراد وہ ہیں جن کو اس سے حصّہ نہیں ملا تھا مطلب یہ ہے کہ اہلِ کتاب بھی بگڑ گئے اور مُشرک بھی۔ الغرض آپ کا زمانہ ایسا زمانہ تھا کہ دُنیا میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ (الحکم جلد ۶ ملا مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

جو تقویٰ اختیار کرتا ہے وہ ہمارے ساتھ ہی ہے خواہ اس نے ہماری دعوت سُنی ہو یا نہ سُنی ہو کیونکہ یہی غرض ہے ہماری بعثت کی۔ اِس وقت تقویٰ عنقا یا کبریت کی طرح ہو گیا ہے کسی کام میں خلوص نہیں رہا بلکہ طولی ملی ہوئی ہے۔ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس طولی کو جلا کر خلوص پیدا کرو۔ اِس وقت ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ کا نمونہ ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت یورپ اور دیگر ممالک کی بگڑی ہوئی حالتوں کا علم نہ تھا خدا تعالیٰ کی وحی پر ایمان تھا اور اب عرشان کی حالت پیدا ہو گئی ہے جو چاہے ان ممالک میں جا کر دیکھ لے۔ (الحکم جلد ۷ ملا مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰، ۱۱)

اِس وقت لوگ رُوحانی پانی کو چاہتے ہیں۔ زمین بالکل مَر چکی ہے۔ یہ زمانہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ کا ہو گیا ہے۔ جنگل اور سمندر بگڑ چکے ہیں۔ جنگل سے مُراد مُشرک لوگ اور بحر سے مراد اہلِ کتاب ہیں۔ جاہل و عالم بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ غرض انسانوں کے ہر طبقہ میں فساد واقع ہو گیا ہے جس پہلو اور جس رنگ میں دیکھو دُنیا کی حالت بدل گئی ہے۔ رُوحانیت باقی نہیں رہی اور نہ اس کی تاثیریں نظر آتی ہیں اخلاقی اور عملی کمزوریوں میں ہر چھوٹا بڑا مُبتلا ہے۔ خدا پرستی اور خدا شناسی کا نام و نشان مٹا ہوا نظر آتا ہے اِس لئے اِس وقت ضرورت ہے کہ آسمانی پانی اور نورِ نبوّت کا نزول ہو اور مستعد دِلوں کو روشنی بخشے۔ خدا تعالیٰ کا شکر کرو۔ اس نے اپنے فضل سے اس وقت اس نور کو نازل کیا ہے مگر تھوڑے ہیں جو اس نور سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ (الحکم جلد ۷ ملا مورخہ ۳۱ مارچ ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دُنیا میں آنا اور پھر وہاں سے رُخصت ہونا قطعی دلیل آپ کی نبوت پر ہے۔ آئے آپ اُس وقت جبکہ زمانہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ کا مصداق تھا اور ضرورت ایک نبی کی تھی۔ ضرورت پر آنا بھی ایک دلیل ہے اور آپ اُس وقت دُنیا سے رُخصت ہوئے جب اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ کا آوازہ دیا گیا اس میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ آپ کس قدر عظیم الشان کامیابی کے ساتھ دُنیا سے رُخصت ہوئے۔ (الحکم جلد ۷ ملا مورخہ ۱۷ جولائی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰)

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی آمد اس وقت ہوئی کہ زمانہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ کا مصداق تھا اور گئے اس وقت جبکہ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَ الْفَتْحُ[1] کی سند آپ کو مل گئی۔

(البدر جلد ۲ ملا مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۵۷)

صحابۂ کرامؓ سارے ہی باخدا اور عاقل تھے مگر آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اُن سے بڑھ کر ایسے وفادار تھے کہ

---

[1] سُورۃ النصر: ۲

کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا تھا اِس لئے آپ کو سانپوں اور درندوں اور خاردار کانٹوں والا جنگل اس کے درندے حیوانات انسانی شکل میں دکھلائے گئے پھر ملک بھی ایسا اس کے سپرد کیا کہ جس سے بڑھ کر دُنیا میں کوئی شریر النفس نہ تھا پھر آئے ایسے وقت پر کہ تمام مُردہ اور فساد کی جڑھ تھے جیسے فرمایا ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ اور گئے ایسے وقت پر کہ فرمایا اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ[1] الآیۃ اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ[2] الآیۃ۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۸، ۳۹ مورخہ ۱۰/۱۷ نومبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۸)

مَیں جانتا ہوں کہ جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش قسمتی ثابت ہوتی ہے اور کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں۔ امورِ رسالت میں یہ کامیابی اور سعادت کسی اَور کو نہیں ملی۔ آپ کی آمد کا وہ وقت تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے خود ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ سے بیان کیا ہے یعنی خشکی میں امن تھا نہ تری میں۔ مُراد اس سے یہ ہے کہ اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب سب بگڑ چکے تھے اور قسم قسم کے فساد اور خرابیاں ان میں پھیلی ہوئی تھیں۔ گویا زمانہ کی حالت بالطبع تقاضا کرتی تھی کہ اس وقت ایک زبردست ہادی اور مصلح پیدا ہو ایسی حالت میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو مبعوث فرمایا اور پھر آپؐ ایسے وقت دُنیا سے رخصت ہوئے جب آپؐ کو یہ آواز آگئی اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا[3]۔ یہ آواز کسی اَور نبی اور رسُول کو نہیں آئی۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۴۳ مورخہ ۱۰ دسمبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

آپ کے متعلق ایک ایسا نکتہ ہے جو آپ کی عظمت کو اَور بھی بڑھا دیتا ہے اور وہ یہ ہے کہ آپؐ ایسے وقت تشریف لائے جبکہ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ کا وقت تھا یعنی اہلِ کتاب بھی بگڑ چکے تھے اور غیر اہلِ کتاب بھی بگڑے ہوئے تھے اور یہ بات مخالفوں کی تصدیق سے بھی ثابت ہے۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۶ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اُس وقت مبعوث ہوئے تھے جب فسق و فجور، شرک اور بُت پرستی اپنے انتہاء کو پہنچ چکی تھی اور ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ والا معاملہ ہو رہا تھا اور گئے اُس وقت تھے جب وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا والا نظارہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیا تھا اور یہ ایک ایسی بات ہے جس کی نظیر تمام دُنیا میں نہیں پائی جاتی اور یہی تو کاملیت ہے کہ جس مقصود کے لئے آئے تھے اس کو پُورا کر کے دکھا دیا حضرت عیسٰی علیہ السّلام تو صلیب کا ہی مُنہ دیکھتے پھرے اور یہودیوں سے رہائی نہ پا سکے مگر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غالب ہو کر وہ اَخلاق دکھائے جن کی نظیر نہیں۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۲)

قرآن (مجید) ایک ایسی پاک کتاب ہے جو اس وقت دُنیا میں آئی تھی جب کہ بڑے بڑے فساد پھیلے ہوئے تھے اور

---

[1] سُورۃ المائدۃ: ۴ [2] سُورۃ النصر: ۲ [3] سُورۃ المائدۃ: ۴

بہت سی اعتقادی اور عملی غلطیاں رائج ہو گئی تھیں اور تقریباً سب کے سب لوگ بد اعمالیوں اور بدعقیدگیوں میں گرفتار تھے۔ اسی کی طرف اللہ جلّ شانہٗ قرآن مجید میں اشارہ فرماتا ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ یعنی تمام لوگ کیا اہلِ کتاب اور کیا دوسرے سب کے سب بدعقیدگیوں میں مبتلا تھے اور دُنیا میں فسادِ عظیم برپا تھا۔ غرض ایسے زمانہ میں خدا تعالیٰ نے تمام عقائدِ باطلہ کی تردید کے لئے قرآن مجید جیسی کامل کتاب ہماری ہدایت کے لئے بھیجی جس میں کُل مذاہبِ باطلہ کا ردّ موجود ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ ۲ مورخہ ۲ جنوری ۱۹۰۸ء صفحہ ۵)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ یعنی دریا بھی بگڑ گئے اور خشک زمین بھی بگڑ گئی مطلب یہ کہ جس قوم کے ہاتھ میں کتابِ آسمانی تھی وہ بھی بگڑ گئی اور جن کے ہاتھ میں کتابِ آسمانی نہیں تھی اور خشک جنگل کی طرح تھے وہ بھی بگڑ گئے اور یہ امر ایک ایسا سچا واقعہ ہے کہ ہر ایک ملک کی تاریخ اس پر گواہ ناطق ہے۔ کیا آریہ ورت کے دانا مورخ اس سے انکار کر سکتے ہیں کہ آنجناب کے ظہور کا زمانہ درحقیقت ایسا ہی تھا اور بُت خانوں کو اس قدر عزت دی گئی تھی کہ گویا وید کا اصل مذہب یہی ہے۔ (لیکچر چشمہ معرفت ص۸)

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلُ كَانَ أَكْثَرُهُمْ مُشْرِكِينَ ○

کہہ زمین پر سیر کرو پھر دیکھو کہ جو تم سے پہلے کافر اور سرکش گذر چکے ہیں ان کا کیا انجام ہُوا اور اکثر ان میں سے مشرک ہی تھے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۳۱)

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا إِلَىٰ قَوْمِهِمْ فَجَاءُوهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَانْتَقَمْنَا مِنَ الَّذِينَ أَجْرَمُوا ۖ وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ ○

اور ہم نے تجھ سے پہلے کئی پیغمبر ان کی قوم کی طرف بھیجے اور وہ بھی روشن نشان لائے پس آخر ہم نے ان مجرم لوگوں سے بدلہ لیا جنہوں نے ان نبیوں کو قبول نہیں کیا تھا اور ابتداء سے یہی مقرر ہے کہ مومنوں کی مدد کرنا ہم پر ایک حق لازم ہے یعنی قدیم سے عادت اللہ اسی طرح پر جاری ہے کہ سچے نبی ضائع نہیں چھوڑے جاتے اور ان کی جماعت متفرق اور

پراگندہ نہیں ہوتی بلکہ ان کو مدد ملتی ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۲۷ حاشیہ نمبر ۱۱)

ہمیں خدا تعالیٰ نے اپنی پاک کتاب میں جو قرآن شریف ہے یہی سکھایا ہے کہ بندہ کے مقابل پر خدا کا نام منصف رکھنا نہ صرف گناہ بلکہ کفر صریح ہے۔ ہاں جب وہ خود ایک وعدہ کرتا ہے تو اس وعدہ کا پورا کرنا اپنے پر ایک حق ٹھہرا لیتا ہے جیسا کہ وہ قرآن شریف میں فرماتا ہے:

حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ

یعنی ہم جو ابتداء سے مومنوں کے لئے نصرت اور مدد کا وعدہ دے چکے ہیں اس لئے ہم اپنے پر یہ حق ٹھہراتے ہیں کہ انکی مدد کریں ورنہ دوسرا شخص اس پر کوئی حق نہیں ٹھہرا سکتا۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۲۶)

الروم ۴۹ تا ۵۱

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۝ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ۝ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

خدائے تعالیٰ وہ ذات کریم و رحیم ہے کہ جو بروقت ضرورت ایسی ہوائیں چلاتا ہے جو بدلی کو اُبھارتی ہیں پھر خدائے تعالیٰ اس بدلی کو جس طرح چاہتا ہے آسمان میں پھیلا دیتا ہے اور اس کو تہ بہ تہ رکھتا ہے پھر تُو دیکھتا ہے کہ اس کے بیچ میں سے مینہ نکلتا ہے پھر جن بندوں کو اپنے بندوں میں سے اس مینہ کا پانی پہنچاتا ہے تو وہ خوش وقت ہو جاتے ہیں اور ناگہانی طور پر خدا اُن کے غم کو خوشی کے ساتھ مبدل کر دیتا ہے اور مینہ کے اُترنے سے پہلے ان کو بباعث نہایت سختی کے کچھ اُمید باقی نہیں رہتی پھر یک دفعہ خدائے تعالیٰ اُن کی دستگیری فرماتا ہے یعنی ایسے وقت میں باران رحمت نازل ہوتا ہے جب لوگوں کے دل ٹوٹ جاتے ہیں اور مینہ برسنے کی کوئی اُمید باقی نہیں رہتی اور پھر فرمایا کہ تُو خدا کی

رحمت کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھ اور اُس کی رحمت کی نشانیوں پر غور کر کہ وہ کیونکر زمین کو اس کے مرنے کے پیچھے زندہ کرتا ہے بیشک وہی خدا ہے جس کی یہ بھی عادت ہے کہ جب لوگ رُوحانی طور پر مَر جاتے ہیں اور سختی اپنی نہایت کو پہنچ جاتی ہے تو اِس طرح وہ ان کو بھی زندہ کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر اور توانا ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۲۸، ۵۲۹)

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُعْفًا وَّشَيْبَةً ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ وَهُوَ الْعَلِيْمُ الْقَدِيْرُ ○

خدا وہ خدا ہے جس نے تمہیں ضعف سے پیدا کیا پھر ضعف کے بعد قوت دے دی پھر قوت کے بعد ضعف اور پیرانہ سالی دی۔ یہ آیت بھی صریح طور پر اِس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ کوئی انسان اس قانونِ قدرت سے باہر نہیں اور ہر یک مخلوق اس محیط قانون میں داخل ہے کہ زمانہ اس کی عمر پر اثر کر رہا ہے یہاں تک کہ تاثیر زمانہ کی سے وہ پیر فرتوت بن جاتا ہے اور پھر مَر جاتا ہے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۱۰، ۶۱۱)

یہ آیت تمام انسانوں کے لئے ہے یہاں تک کہ تمام انبیاء علیہم السّلام اس میں داخل ہیں اور خود ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو نبیوں کے سردار ہیں وہ بھی اس سے باہر نہیں آپؐ پر بھی پیرانہ سالی کے علامات ظاہر ہو گئے تھے اور چند سفید بال ریش مبارک میں آ گئے تھے اور آپؐ خود اپنی آخری عمر میں آثار پیرانہ سالی کے ضعف کے اپنے اندر محسوس کرتے تھے لیکن بقول ہمارے مخالفین کے حضرت عیسٰی اس سے بھی باہر ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک خصوصیت اُن کی ہے جو فوق العادت ہے اور یہی حضرت عیسٰی علیہ السّلام کی خدائی پر ایک دلیل ہے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۲۱۹)

○

سُورۃ لقمٰن

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝

وَاِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۝

خدا کے ساتھ کسی دوسری چیز کو ہرگز شریک مت ٹھہراؤ۔ خدا کا شریک ٹھہرانا سخت ظلم ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۳۶۴ حاشیہ)

شرک تین قسم کا ہے اوّل یہ کہ عام طور پر بُت پرستی، درخت پرستی وغیرہ کی جاوے۔ یہ سب سے عام اور موٹی قسم کا شرک ہے۔ دوسری قسم شرک کی یہ ہے کہ اسباب پر حد سے زیادہ بھروسہ کیا جاوے کہ فلاں کام نہ ہوتا تو میں ہلاک ہو جاتا یہ بھی شرک ہے۔ تیسری قسم شرک کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے وجود کے سامنے اپنے وجود کو بھی کوئی شے سمجھا جاوے۔ موٹے شرک میں تو آجکل اس روشنی اور عقل کے زمانہ میں کوئی گرفتار نہیں ہوتا البتہ اس مادی ترقی کے زمانہ میں شرک فی الاسباب بہت بڑھ گیا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۰ مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

ہر ایک گناہ بخشنے کے قابل ہے مگر اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی معبود کارساز جاننا ایک ناقابلِ عفو گناہ ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ۔ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ[1] یہاں شرک سے یہی مُراد نہیں کہ پتھروں وغیرہ کی پرستش کی جاوے بلکہ یہ ایک شرک ہے کہ اسباب کی پرستش کی جاوے اور معبوداتِ دُنیا پر زور دیا جاوے اسی کا نام ہی شرک ہے۔ اور معاصی کی مثال

---

[1] سُورۃ النساء: ۴۹

توحقہ کی سی ہے کہ اس کے چھوڑ دینے سے کوئی دِقت اور مُشکل کی بات نظر نہیں آتی مگر شرک کی مثال افیم کی سی ہے کہ وہ عادت ہو جاتی ہے جس کا چھوڑنا محال ہے۔ (الحکم جلد ۷ ۲۴ مورخہ ۳۰ر جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱)

یاد رکھو شرک کی کئی قسمیں ہوتی ہیں ان میں سے ایک شرکِ جلی کہلاتا ہے دوسرا شرکِ خفی۔ شرکِ جلی کی مثال تو عام طور پر یہی ہے جیسے یہ بُت پرست لوگ بُتوں، درختوں یا اور اشیاء کو معبود سمجھتے ہیں اور شرکِ خفی یہ ہے کہ اِنسان کسی شئی کی تعظیم اس طرح کرے جس طرح اللہ تعالیٰ کی کرتا ہے یا کرنی چاہیئے یا کسی شئے سے اللہ تعالیٰ کی طرح محبّت کرے یا اس سے خوف کرے یا اس پر توکّل کرے۔ (الحکم جلد ۹ ۴۰ مورخہ ۱۷ر نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۷)

۱۶۔ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا ۡ وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝

اگر تجھے اِس بات کی طرف بہکادیں کہ تُو میرے ساتھ کسی اَور کو شریک ٹھہراوے تو اُن کا کہا مت مان۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۶۳۶ حاشیہ)

۱۹۔ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۝

اِسلام ایک وسیع مذہب ہے جو ہر بات کا مدار نیّات پر رکھتا ہے۔ بدر کی لڑائی میں ایک شخص میدانِ جنگ میں نکلا جو اِترا کر چلتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دیکھو یہ چال بہت بُری ہے کیونکہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا مگر اس وقت یہ چال خدا تعالیٰ کو بہت ہی پسند ہے کیونکہ یہ اس کی راہ میں اپنی جان تک نثار کرتا ہے اور اس کی نیّت اعلیٰ درجہ کی ہے۔

غرض اگر نیّت کا لحاظ نہ رکھا جائے تو بہت مشکل پڑتی ہے۔ اِس طرح پر ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جن کا تہ بند نیچے ڈھلکتا ہے وہ دوزخ میں جائیں گے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ سُن کر رو پڑے کیونکہ اُن کا تہ بند بھی ویسا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ تو ان میں سے نہیں ہے۔ غرض نیّت کو بہت [illegible] دخل ہے اور حفظِ مراتب ضروری

شئے ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ۚ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ۔

ہمارا مطلب و مُدعا یہ ہے کہ ایسے امور کی مُوشگافی اور تہ بینی کی امید سے اپنی عقلوں اور فکروں کو آوارہ مت کرو جو تمہاری بساط سے باہر ہیں۔ کیا یہ سچ نہیں کہ بہتیرے ایسے لوگ ہیں کہ ناجائز فکروں میں پڑ کر اپنی اُس معین اور مقرر وسعت سے جو قدرت نے اُن کو دے رکھی ہے باہر چلے جاتے ہیں اور اپنی محدود عقل سے کُل کائنات کے عمیق درعمیق رازوں کو حل کرنا چاہتے ہیں۔ سو یہ افراط ہے جیسے بکُلّی تحقیق و تفتیش سے مُنہ پھیر لینا تفریط ہے۔ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ یعنی اپنی چال میں توسّط اختیار کر۔ نہ ایسا فکر کو مُنجمد کر لینا چاہیئے کہ جو ہزارہا نکات و لطائف الٰہیات قابلِ دریافت ہیں اُن کی تحصیل سے محروم رہ جائیں اور نہ اِس قدر تیزی کرنی چاہیئے کہ ان فکروں میں پڑ جائیں کہ خدائے تعالیٰ کو کس نے پیدا کیا ہے اور یا اُس نے اِس قدر اُرواح اور اُجسام کس طرح بنا لئے ہیں اور یا اُس نے کیونکر اکیلا ہونے کی حالت میں اِس قدر وسیع عالم بنا ڈالا ہے۔ (سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۱۱۸، ۱۱۹)

خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بوحیِ الٰہی استنباط احکامِ قرآن کر کے قرآن ہی سے یہ مسائل زائدہ لئے ہیں جس حالت میں قرآن کریم صاف ظاہر کرتا ہے کہ کُل خبائث حرام کئے گئے تو کیا آپ کے نزدیک درندے اور گدھے طیبات میں سے ہیں؟ جن کے حرام کرنے کے لئے کسی حدیث کی واقعی طور پر ضرورت تھی۔ گدھے کی مذمت خود اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے۔ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ۔ پھر جو اس کی نظر میں کسی وجہ سے مُنکر اور مکروہ اور خبائث میں داخل ہے وہ کس طرح حلال ہو جاتا؟ اور تمام درندے بدبُو سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ چڑیا گھر میں جا کر دیکھو کہ شیر اور بھیڑیا اور چیتا وغیرہ اِس قدر بدبُو رکھتے ہیں کہ پاس کھڑا ہونا مشکل ہوتا ہے۔ پھر اگر یہ خبائث میں داخل نہیں ہیں تو اَور کیا ہیں؟

(الحق لدھیانہ صفحہ ۱۰۴)

نہ بہت اُونچا بول اکر و نہ بہت نیچا درمیان کو نگاہ رکھو یعنی باستثناء وقتِ ضرورت کے۔ چلنے میں بھی نہ بہت تیز چلو اور نہ بہت آہستہ۔

(اِسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۲۹ شائع کردہ نظارت اِصلاح وارشاد)

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ ۚ وَيَعْلَمُ

مَا فِی الْاَرْحَامِ وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ

بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ

یَعْلَمُ مَا فِی الْاَرْحَامِ۔ ایک آریہ صاحب نے ..... بصورت اعتراض پیش کیا تھا کہ لڑکا لڑکی کے پیدا ہونے کی شناخت دائیوں کو بھی ہوتی ہے یعنی دائیاں بھی معلوم کر سکتی ہیں کہ لڑکا پیدا ہوگا یا لڑکی۔ واضح رہے کہ ایسا اعتراض کرنا معترض کی سراسر حیلہ سازی اور حق پوشی ہے کیونکہ اول تو کوئی دائی ایسا دعویٰ نہیں کر سکتی بلکہ ایک حاذق طبیب بھی ایسا دعویٰ ہرگز نہیں کر سکتا کہ اس امر میں میری رائے قطعی اور یقینی ہے جس میں تخلف کا امکان نہیں صرف ایک اٹکل ہوتی ہے جو بارہا خطا جاتی ہے۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد اول صفحہ ۲)

عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ پر حضرت اقدسؑ نے فرمایا کہ:۔

یہ بات واقعی ہے اور قرآن پاک سے بھی ثابت ہے کہ سَاعَةٌ سے اس جگہ مراد یہودیوں کی تباہی کا زمانہ ہے۔ یہ وہی زمانہ تھا اور جس ساعت کے یہ لوگ منتظر ہیں اس کا تو ابھی کہیں پتہ بھی نہیں ہے۔ ایک پہلو سے اول مسیحؑ کے وقت یہودیوں نے بدبختی لے لی اور دوسرے وقت میں نصاریٰ نے بدبختی کا حصّہ لے لیا۔ مسلمانوں نے بھی پوری مشابہت یہود سے کر لی۔ اگر ان کی سلطنت یا اختیار ہوتا تو ہمارے ساتھ بھی مسیحؑ والا معاملہ کرتے۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۷ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱)

○

سُورَةُ السَّجدة

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ○

وَاِنَّ زَمَانَ خَلْقِيْ اَلْفٌ سَادِسٌ لَارَيْبَ فِيْهِ فَاسْئَلِ الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَنَطَقَ بِهِ التَّوْرَاةُ الَّتِيْ يُؤْمِنُ بِهَا الْمُسْلِمُوْنَ وَلَمْ يَثْبُتْ بِنُصُوْصٍ صَرِيْحَةٍ مَايُخَالِفُ هٰذِهِ الْعِدَّةَ وَيَعْلَمُهُ الْعَالِمُوْنَ۔ فَمَاكَانَ لَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِعِدَّةِ التَّوْرَاةِ وَمَاقَالَ النَّبِيُّوْنَ۔ وَكَيْفَ وَمَاخَالَفَهُ الْقُرْاٰنُ بَلْ صَدَّقَهُ سُوْرَةُ الْعَصْرِفَاَيْنَ يَفِرُّوْنَ۔ بَلْ اِلَيْهِ يُشِيْرُ قَوْلُهٗ تَعَالٰى يُدَبِّرُ الْاَمْرَمِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ وَاقْرَءُوْا مَعَهَا اٰيَةَ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۔ هٰذِهٖ

ترجمہ از مرتب :- لاریب میری پیدائش کا زمانہ چھٹا ہزار ہے پس تو اہلِ علم لوگوں سے دریافت کرلے اور تورات نے بھی جس پر مسلمان ایمان رکھتے ہیں یہی بیان کیا ہے اور نصوصِ صریحہ سے اس گنتی کے خلاف کوئی بات ثابت نہیں اور اہلِ علم اسے خوب جانتے ہیں پس ان کے لئے یہ بات جائز نہیں کہ تورات کی گنتی اور انبیاء کے بیان کا انکار کریں اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جبکہ خود قرآن کریم نے اس کی مخالفت نہیں کی بلکہ سُورۃ العصر نے اس کی تصدیق کر دی ہے پس وہ اس حقیقت سے بھاگ کر کہاں جا سکتے ہیں بلکہ اسی کی طرف اللہ تعالیٰ کا یہ قول اشارہ کرتا ہے کہ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ ثُمَّ يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ اور اس کے ساتھ آیتِ قرآنیہ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ بھی پڑھو۔ یہ آیت ہم نے

أٰيَةٌ كَتَبْنَاهَا مِنْ سُوْرَةِ السَّجْدَةِ۔ وَمِنْ سُنَّةٍ أَنَّهَا تُقْرَءُ فِي صَلٰوةِ الْفَجْرِ مِنَ الْجُمُعَةِ۔ وَاَنَّ اللهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَقُوْلُ فِي هٰذِهِ السُّوْرَةِ إِنَّهُ دَبَّرَ أَمْرَ الشَّرِيْعَةِ بِاِنْزَالِ الْفُرْقَانِ الْحَمِيْدِ۔ وَأَكْمَلَ لِلنَّاسِ دِيْنَهُمْ بِالْكَلَامِ الْمَجِيْدِ۔ ثُمَّ يَأْتِيْ بَعْدَ ذٰلِكَ زَمَانٌ تَمْتَدُّ ضَلَالَتُهُ إِلٰى أَلْفِ سَنَةٍ وَيُرْفَعُ كِتَابُ اللهِ إِلَيْهِ وَيَعْرُجُ إِلَى اللهِ أَمْرُهُ بِشِقَّيْهِ يَعْنِيْ يُضَاعُ فِيْهِ حَقُّ اللهِ وَحَقُّ الْعِبَادِ۔ وَتَهُبُّ صَرَاصِرُ الْفَسَادِ عَلٰى قِسْمَيْهِ۔ وَيَفْشُو الْكَذِبُ وَالْفِرْيَةُ يَعْنِي الْفِتَنَ الدَّجَّالِيَّةَ وَيَظْهَرُ الْفِسْقُ وَالْكُفْرُ وَالشِّرْكُ۔ وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُعْرِضِيْنَ عَنْ رَبِّهِمْ وَظَهِيْرِيْنَ عَلَيْهِ۔ ثُمَّ يَأْتِيْ بَعْدَ ذٰلِكَ أَلْفٌ أُخْرٰى يُغَاثُ فِيْهِ النَّاسُ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ وَيُرْسَلُ اٰدَمُ اٰخِرِ الزَّمَانِ لِيُجَدِّدَ الدِّيْنَ۔ وَإِلَيْهِ أَشَارَ فِيْ أٰيَةٍ هِيَ بَعْدَ هٰذِهِ الْأٰيَةِ أَعْنِيْ قَوْلَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ۔ وَإِنَّ هٰذَا الْإِنْسَانَ هُوَ الْمَسِيْحُ الْمَوْعُوْدُ وَقَدْ بَعَثَهُ بَعْدَ انْقِضَاءِ أَلْفِ سَنَةٍ مِنَ الْقُرُوْنِ الَّتِيْ هِيَ خَيْرُ الْقُرُوْنِ۔ وَاتَّفَقَ عَلَيْهِ مَعْشَرُ النَّبِيِّيْنَ۔ وَقَدْ جَاءَ فِي الصَّحِيْحَيْنِ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَيْرُ أُمَّتِيْ قَرْنِيْ ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ

سُورہ سجدہ سے لی ہے اور یہ سُنّتِ نبویؐ ہے کہ یہ سُورۃ ہر جمعہ کو صبح کی نماز میں پڑھی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ نے اِس سُورۃ میں بیان فرمایا ہے کہ اس نے قرآن کریم نازل کر کے اپنی شریعت کے حکم کو اپنی تدبیر کے مطابق قائم کر دیا اور کلامِ مجید کے ساتھ لوگوں کے لئے ان کے دین کو مکمل کر دیا۔ اس کے بعد پھر ایک زمانہ ایسا آئے گا جس کی ضلالت ایک ہزار سال تک ممتد رہے گی اور کتاب اللہ اُٹھالی جائے گی اور قرآن کریم کے احکام اپنے دونوں حصوں سمیت اللہ کی طرف عروج کر جائیں گے یعنی اس زمانہ میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں ضائع کر دیئے جائیں گے اور اس کی دونوں قسموں پر فساد کی تند ہوائیں چلیں گی اور جھوٹ اور افتراء یعنی دجّالی فتنے پھیل جائیں گے اور نافرمانی، کُفر اور شرک عام ہو جائے گا تو مجرم لوگوں کو اپنے رَبّ سے سرتابی کرتے ہوئے اور خدا تعالیٰ کی مخالفت میں سرگرم دیکھے گا۔ پھر اس کے بعد دوسرا ہزار سال آئے گا جس میں رَبّ العالمین کی طرف سے لوگوں کی فریاد رَسی کی جائے گی اور آدم آخر زمان کو تجدیدِ دین کے لئے مبعوث کیا جائے گا۔ چنانچہ اس کی طرف اس کے بعد کی آیت یعنی وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ میں اشارہ کیا گیا ہے اور یہ موعود انسان مسیح موعود ہی ہے اور اس کی بعثت کا زمانہ خیر القرون سے ایک ہزار سال ختم ہونے کے بعد ہی مقدر تھا اور اسی پر انبیاء کی جماعت نے اتفاق کیا ہے اور بخاری اور مسلم میں عمران بن حصین سے یہ مروی ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری اُمّت کا بہترین زمانہ میری صدی ہے، اس کے بعد بہتر لوگ وہ ہیں جو ان کے بعد آئیں گے اور پھر وہ لوگ جو ان کے بعد ہوں گے۔ پھر ان کے بعد ایسے لوگ پیدا

ثُمَّ الَّذِيْنَ يَلُوْنَهُمْ ثُمَّ اِنَّ بَعْدَهُمْ قَوْمٌ يَّشْهَدُوْنَ وَلَا يُسْتَشْهَدُوْنَ وَيَخُوْنُوْنَ وَلَا يُؤْتَمَنُوْنَ وَيَنْذُرُوْنَ
وَلَا يُوْفُوْنَ وَيَظْهَرُ فِيْهِمُ السِّمَنُ وَفِيْ رِوَايَةٍ وَيَحْلِفُوْنَ وَلَا يُسْتَحْلَفُوْنَ. فَظَهَرَ مِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ
الَّذِيْ هُوَ الْمُتَّفَقُ عَلَيْهِ اَنَّ الزَّمَانَ الْمَحْفُوْظَ مِنْ غَلَبَةِ الْكِذْبِ الَّذِيْ هُوَ مِنْ صِفَاتِ الدَّجَّالِيَّةِ
وَزَمَانَ الصِّدْقِ وَالصَّلَاحِ وَالْعِفَّةِ لَا يُجَاوِزُ ثَلٰثَ مِائَةٍ مِنْ قَرْنِ سَيِّدِنَا خَيْرِ الْبَرِيَّةِ ثُمَّ بَعْدَ ذَالِكَ
يَأْتِيْ زَمَانٌ كَلَيْلٍ سَجٰى عِنْدَ غَيْبَةِ بَدْرٍ اِخْتَفٰى وَفِيْهِ يَفْشُو الْكِذْبُ وَيَهْوٰى مِنَ الْاَهْوَاءِ مَنْ هَوٰى
وَيَزِيْدُ كُلَّ يَوْمٍ زُوْرٌ وَاَحَادِيْثُ تُفْتَرٰى فَاِذَا بَلَغَ الْكِذْبُ اِلٰى حَدِّ الْكَمَالِ فَيَنْتَهِيْ يَوْمًا اِلٰى ظُهُوْرِ الدَّجَّالِ
وَهُوَ اٰخِرُ اَيَّامِ هٰذَا الْاَلْفِ كَمَا يَقْتَضِيْهِ سِلْسِلَةُ التَّرَقِّيْ فِي الزُّوْرِ وَالْاِفْتِعَالِ. وَكَمَا هُوَ مَفْهُوْمُ حَدِيْثِ
رَسُوْلِ اللّٰهِ ذِي الْجَلَالِ. وَذَالِكَ الزَّمَانُ هُوَ الزَّمَانُ الَّذِيْ يَعْرُجُ اَمْرُ اللّٰهِ اِلَيْهِ وَالْهُدٰى. وَيُرْفَعُ
الْقُرْاٰنُ اِلَى السَّمٰوٰتِ الْعُلٰى وَقَدْ شَهِدَتِ الْوَاقِعَاتُ الْخَارِجِيَّةُ اَنَّ هٰذَا الزَّمَانَ الْفَاسِدَ امْتَدَّ اِلٰى
اَلْفِ سَنَةٍ اَعْنِيْ اِلٰى هٰذَا الزَّمَانِ حَتّٰى صَارَ الصِّلُّ كَالْاُفْعُوَانِ فَفَهِمْنَا مِنْ هٰذَا بِالْيَقِيْنِ التَّامِّ وَالْعِرْفَانِ.
اَنَّ قَوْلَهٗ تَعَالٰى يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ يَتَعَلَّقُ بِهٰذِهِ الْمُدَّةِ الَّتِيْ

ہوں گے جو بغیر گواہی مانگنے کے گواہی دیں گے اور وہ خائن ہوں گے اور ان کو امانت دار نہیں سمجھا جائے گا۔ وہ نذریں
مانیں گے لیکن انہیں پورا نہیں کریں گے۔ وہ خوب موٹے تازے نظر آئیں گے۔ اور ایک روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ وہ
حلف طلب کئے بغیر حلف اُٹھائیں گے۔ اِس متفق علیہ حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جھوٹ کی کثرت جو دجالی صفات
میں سے ایک صفت ہے اس سے محفوظ زمانہ اور صدق اور صلاح اور عفت کا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد
تین سَو سال کی مدت سے تجاوز نہیں کرے گا پھر اس کے بعد ایک ایسی تاریک رات آئے گی جس میں ماہِ کامل چھپ گیا ہو۔
اس زمانہ میں جھوٹ عام ہو جائے گا اور نفسانی خواہشات کی طرف وہ راغب ہوں گے جو انہیں پسند کرتے ہیں۔ اور جھوٹ ہر روز
پھیلتا جائے گا اور جھوٹی احادیث وضع کی جائیں گی پس جب جھوٹ اپنے کمال کو پہنچ جائے گا تو وہ ایک دن دجال کے ظہور کے
زمانہ تک جا پہنچے گا اور وہ اس ہزار سال کے آخری دن ہوں گے۔ جیسا کہ فریب اور افتراء میں ترقی کا سلسلہ اس کا تقاضا
کرتا ہے اور جیسا کہ خدائے ذوالجلال کے رسول کی حدیث کا مفہوم ہے یہ وہ زمانہ ہو گا جس میں اللہ تعالیٰ کا امر اور ہدایت
اس کی طرف صعود کر جائیں گے اور قرآن مجید آسمان کی طرف اُٹھا لیا جائے گا اور خارجی واقعات نے بھی اِس بات کی
شہادت دی ہے کہ یہ خرابیوں سے پُر زمانہ ہزار سال تک یعنی اس زمانہ تک پھیلا ہوا ہے جس وقت زہریلا سانپ اژدھا
کی شکل اختیار کر جائے گا۔ اس سے ہم نے یقینِ تام اور عرفان کے ساتھ سمجھ لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول
يَعْرُجُ اِلَيْهِ فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗۤ اَلْفَ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ کا تعلق اس مدت سے ہے

مَرَّتْ فِی الضَّلَالَةِ وَالْفِسْقِ وَالطُّغْیَانِ۔ وَکَثُرَ فِیْهِ الْمُشْرِکُوْنَ اِلَّا قَلِیْلٌ مِّنَ الَّذِیْنَ کَانُوْا یَتَّقُوْنَ۔ وَاَنَّهٗ اَلْفُ سَنَةٍ مَا زَادَ عَلَیْهِ وَمَا نَقَصَ فَاَیُّ دَلِیْلٍ اَکْبَرُ مِنْ هٰذَا لَوْ کُنْتُمْ تَفَکَّرُوْنَ۔ وَاِنْ لَّمْ تَقْبَلُوْا فَبَیِّنُوْا لَنَا مَا مَعْنٰی هٰذِهِ الْاٰیَةِ مِنْ دُوْنِ هٰذَا الْمَعْنٰی اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔ اَتَظُنُّوْنَ اَنَّ الْقِیَامَةَ هِیَ اَلْفُ سَنَةٍ کَسَنَوَاتِ مُدَّةِ الدُّنْیَا اَوْ تَصْعَدُ الْاَعْمَالُ اِلَی اللّٰهِ فِیْ یَوْمِ الْقِیَامَةِ فِیْ مُدَّةٍ کَمِثْلِهَا وَلَا یَعْلَمُهَا اللّٰهُ قَبْلَهَا اِتَّقُوا اللّٰهَ اَیُّهَا الْمُسْرِفُوْنَ۔ وَاَیُّ شَهَادَةٍ اَکْبَرُ مِمَّا ظَهَرَ فِی الْخَارِجِ اَعْنِیْ مِقْدَارَ مُدَّةٍ غَلَبَتِ الضَّلَالَةُ فِیْهَا فَاِنَّکُمْ رَاَیْتُمْ بِاَعْیُنِکُمْ اَنَّ مُدَّةَ زَمَانِ الضَّلَالَةِ وَشِدَّتِهَا وَتَزَایُدِهَا بَعْدَ قُرُوْنِ الْخَیْرِ قَدِ امْتَدَّتْ اِلٰی اَلْفِ سَنَةٍ حَقًّا وَصِدْقًا اَتُنْکِرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُشَاهِدُوْنَ۔ وَبَدَءَ الْکِذْبُ کَزَرْعٍ ثُمَّ صَارَ کَشَجَرَةٍ حَتّٰی ظَهَرَتْ هَیْکَلُ الدَّجَّالِ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۔ وَاِنَّ الضَّلَالَةَ وَاِنْ کَانَتْ مِنْ قَبْلُ وَلٰکِنْ مَا حَدَثَتْ قُرُوْنُهَا اِلَّا بَعْدَ هٰذِهِ الْقُرُوْنِ الثَّلٰثَةِ۔ اَلَا تَقْرَءُوْنَ حَدِیْثَ الْقُرُوْنِ وَقَدْ جَمَعَ هٰذَا الْاَلْفُ کُلَّ ضَلَالَةٍ وَاَنْوَاعَ شِرْکٍ وَبِدْعَةٍ وَاَقْسَامَ فِسْقٍ وَمَعْصِیَةٍ وَاُضِیْعَ فِیْهِ حُقُوْقُ اللّٰهِ وَحُقُوْقُ الْعِبَادِ وَحُقُوْقُ الْمَخْلُوْقِ وَانْفَتَحَتْ اَبْوَابُ الْاِرْتِدَادِ فَبِاَیِّ دَلِیْلٍ بَعْدَ ذَالِکَ تُؤْمِنُوْنَ۔ وَفُتِحَتْ یَاجُوْجُ وَمَاجُوْجُ وَتَرَوْنَ اَنَّهُمْ مِنْ کُلِّ حَدَبٍ یَنْسِلُوْنَ۔

جو گمراہی، فسق اور سرکشی میں گزرے گی اور اس میں مشرکوں کی تعداد بڑھ جائے گی اور متقی لوگ بہت تھوڑے رہ جائیں گے اور یہ ایک ہزار سال کا عرصہ ہوگا نہ زیادہ اور نہ کم۔ پس اگر تم فکر کرو تو اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور اگر تم ان معنی کو قبول نہ کرو تو تم ہی بتاؤ کہ اِس آیت کے ان معنی کے سوا اور کیا معنی ہوں گے۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ قیامت ہزار سال تک رہے گی جو عمرِ دُنیا کے سالوں کی مانند ہوں گے یا قیامت کے دن اتنی ہی مدت میں اعمال کا صعود اللہ تعالیٰ کی طرف ہوگا اور ان اعمال کا علم اللہ تعالیٰ کو اس سے قبل نہیں ہوگا۔ اے حد سے تجاوز کرنیوالو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور جو کچھ خارج میں ظاہر ہوا ہے یعنی اس مدت کی مقدار جس میں گمراہی غالب آگئی اس سے بڑھ کر اور کونسی دلیل ہوگی۔ تم نے اپنی آنکھوں کے ساتھ دیکھ لیا ہے کہ گمراہی اور اس کی شدت اور ترقی کا زمانہ خیرالقرون سے ایک ہزار سال تک یقینی اور حتمی طور پر پھیلا ہوا ہے کیا تم اس کو دیکھتے ہوئے اس کا اِنکار کرسکتے ہو جھوٹ ایک چھوٹے سے پودہ کی طرح پھوٹا اور پھر بڑھتے بڑھتے ایک تناور درخت بن گیا حتّٰی کہ تمہاری نگاہوں کے سامنے دجّال کا وجود بھی ظاہر ہوگیا گو گمراہی پہلے بھی موجود تھی لیکن اس کی صدیاں تین صدیوں کے بعد مقدر تھیں کیا تم ان تین صدیوں سے تعلق رکھنے والی حدیث نہیں پڑھتے اور یہ ہزار سال ہر قسم کی گمراہی ہر نوع کا شرک و بدعت اور ہر قسم کا فسق اور معصیت اپنے اندر جمع کئے ہوئے ہے اور ان ہزار سال میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کو ضائع کیا گیا اور ارتداد کے دروازے کھُل گئے پھر تم اس کے سوا کس دلیل پر ایمان لاؤ گے۔ اور یاجوج و ماجوج آزاد کر دیئے گئے۔ اور تم دیکھتے ہو کہ وہ ہر اُونچی جگہ سے پھلانگتے ہوئے دوڑے چلے آرہے ہیں

وَمَا خَرَجَا اِلَّا بَعْدَ الْقُرُوْنِ الثَّلٰثَةِ وَمَا كَمُلَ اِقْبَالُهُمَا اِلَّا عِنْدَ اٰخِرِ حِصَّةِ هٰذَا الْاَلْفِ وَكُمِّلَ الْاَلْفُ مَعَ تَكْمِيْلِ سَطْوَتِهِمَا وَاِنَّ فِيْمَا لَاٰيَةً لِقَوْمٍ يَتَدَبَّرُوْنَ وَاِنَّ الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِهٰذَا السِّرِّ الْمَكْتُوْمِ وَيَقُوْلُ اِنَّ يَاجُوْجَ وَمَاجُوْجَ قَدْ حُبِسَا وَصُفِدَا اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ثُمَّ يُفْتَحَانِ فِيْ اَيَّامِ غُرُوْبِ شَمْسِ الصَّلَاحِ وَزَمَانِ الضَّلَالَةِ كَمَا اَنْتُمْ تَرَوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْاَيَّامِ وَتُشَاهِدُوْنَ. وَكَفَى الطَّالِبِيْنَ هٰذَا الْقَدْرُ مِنَ الْبَيَانِ. وَاَرٰى اَنِّيْ اَكْمَلْتُ مَا اَرَدْتُ وَاَتْمَمْتُ الْحُجَّةَ عَلٰى اَهْلِ الْعُدْوَانِ۔

(خطبہ الہامیہ حاشیہ متعلقہ صفحہ د، ذ)

قَدْ صَرَّحَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِيْ هٰذِهِ الْاٰيَةِ وَبَيَّنَ حَقَّ التَّبْيِيْنِ اَنَّ اَيَّامَ الضَّلَالَةِ بَعْدَ اَيَّامِ دَعْوَةِ الْقُرْاٰنِ هِيَ اَلْفُ سَنَةٍ وَبَعْدَهَا يُبْعَثُ مَسِيْحُ الرَّحْمٰنِ فَانْقَطَعَتِ الْخُصُوْمَةُ بِهٰذَا التَّعْيِيْنِ الْمُبِيْنِ لَا سِيَّمَا اِذَا اُلْحِقَ بِهٖ مَا جَاءَ ذِكْرُ اَلْفِ سَنَةٍ فِيْ كُتُبِ النَّبِيِّيْنَ السَّابِقِيْنَ فَفَكِّرْ ثُمَّ فَكِّرْ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ۔

(حاشیہ متعلقہ حاشیہ خطبہ الہامیہ صفحہ و)

اِس میں کیا شک ہے کہ جس زمانہ کے آثار انجیل ظاہر کرتی ہے اُسی زمانہ کی دانیال بھی خبر دیتا ہے اور انجیل کی پیشگوئی دانیال کی پیشگوئی کو قوت دیتی ہے کیونکہ وہ سب باتیں اس زمانہ میں وقوع میں آ گئی ہیں اور ساتھ ہی یہود و نصاریٰ کی وہ پیشگوئی جو بائبل میں سے استنباط کی گئی ہے اس کی موید ہے اور وہ یہ کہ مسیح موعود آدم کی تاریخ پیدائش سے چھٹے سال کے آخر میں پیدا ہوگا چنانچہ قمری حساب کے رُو سے جو اصل حساب اہلِ کتاب کا ہے میری ولادت چھٹے ہزار کے آخر میں تھی اور چھٹے ہزار کے آخر میں مسیح موعود کا پیدا ہونا ابتداء سے ارادۂ الٰہی میں مقرر تھا کیونکہ مسیح موعود

اور یہ دونوں ان تین صدیوں کے بعد ہی نکلے ہیں اور ان دونوں کا آنا اس ہزار سال کے آخر میں ہی مکمل ہؤا ہے اور یہ ہزار سال ان کے غلبہ کی تکمیل کے ساتھ ہی پُورا ہؤا ہے اور اس میں تدبّر کرنے والوں کے لئے ایک نشان ہے اور قرآن کریم اس سربستہ راز کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یاجوج اور ماجوج ایک مقررہ وقت تک مقید اور پابہ زنجیر کر دئے گئے ہیں اور پھر ان کو نیکی کے سُورج کے غروب ہونے اور گمراہی کے زمانہ میں آزاد کر دیا جائے گا جیسا کہ تم ان دنوں دیکھ رہے ہو اور طالبوں کے لئے اِس قدر بیان ہی کافی ہے اور مَیں دیکھتا ہوں کہ مَیں نے اپنے ارادہ کو پُورا کر دیا ہے اور زیادتی کرنے والوں پر حجت پوری کر دی ہے۔

ترجمہ از مرتب :۔ اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اِس بات کو صراحت سے اور وضاحت سے بیان کر دیا ہے کہ گمراہی کا زمانہ دعوتِ قرآن کے زمانہ کے بعد ایک ہزار سال کا زمانہ ہے اور اس کے بعد مسیح موعود مبعوث ہوگا اور اس بیّن تعیین کے بعد خصوصاً جب اس کیساتھ گذشتہ انبیاء کی کتب میں ایک ہزار سال کے ذکر کو ملا لیا جائے جھگڑا ختم ہو جاتا ہے پس تُو فکر کر اور پھر فکر کر یہاں تک کہ تجھے یقین حاصل ہو جائے۔

خاتم الخلفاء ہے اور آخر کو اوّل سے مناسبت چاہیئے اور چونکہ حضرت آدم بھی چھٹے دن کے آخر میں پیدا کئے گئے ہیں اسلئے بلحاظ مناسبت ضروری تھا کہ آخری خلیفہ جو آخری آدم ہے وہ بھی چھٹے ہزار کے آخر میں پیدا ہو۔ وجہ یہ کہ خدا کے سات دنوں میں سے ایک دن ہزار برس کے برابر ہے جیسا کہ خود وہ فرماتا ہے اِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ [1] اور احادیثِ صحیحہ سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسیح موعود چھٹے ہزار میں پیدا ہوگا۔

(حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۰۰، ۲۰۱)

ایک دن خدا کے نزدیک تمہارے ہزار سال کے برابر ہے پس جبکہ خدا تعالیٰ کی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ دن سات ہیں پس اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ انسانی نسل کی عمر سات ہزار سال ہے جیسا کہ خدا نے میرے پر ظاہر کیا ہے کہ سورۃ وَالعصر کے عدد جس قدر حساب جمل کی رُو سے معلوم ہوتے ہیں اُسی قدر زمانہ نسلِ انسانی کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک تک بحساب قمری گذر چکا تھا کیونکہ خدا نے حساب قمری رکھا ہے اور اس حساب سے ہماری اس وقت تک نسلِ انسانی کی عمر چھ ہزار برس تک ختم ہو چکی ہے اور اب ہم ساتویں ہزار میں ہیں اور یہ ضرور تھا کہ مثیلِ آدم جس کو دوسرے لفظوں میں مسیح موعود کہتے ہیں چھٹے ہزار کے آخر میں پیدا ہو جو جمعہ کے دن کے قائم مقام ہے جس میں آدم پیدا ہوا اور ایسا ہی خدا نے مجھے پیدا کیا پس اس کے مطابق چھٹے ہزار میں میری پیدائش ہوئی اور یہ عجیب اتفاق ہوا کہ میں معمولی دنوں کی رُو سے بھی جمعہ کے دن پیدا ہوا تھا۔ (تتمہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۵، ۲۶)

۱۲ قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَّلَکُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُکِّلَ بِکُمْ ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمْ تُرْجَعُوْنَ○

تفسیر معالم کے صفحہ ۱۶۲ میں زیر تفسیر آیت یٰعِیْسٰۤی اِنِّیْ مُتَوَفِّیْکَ وَرَافِعُکَ اِلَیَّ [2] لکھا ہے کہ علی بن طلحہ ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ اِس آیت کے یہ معنی ہیں کہ اِنِّیْ مُمِیْتُکَ یعنی میں تجھ کو مارنے والا ہوں۔ اس پر دوسرے اقوال اللہ تعالیٰ کے دلالت کرتے ہیں قُلْ یَتَوَفّٰکُمْ مَّلَکُ الْمَوْتِ۔ اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ طَیِّبِیْنَ [3] اَلَّذِیْنَ تَتَوَفّٰھُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِھِمْ [4] غرض حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اعتقاد یہی تھا کہ حضرت عیسیٰ فوت ہو چکے ہیں۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۲۴۷)

ظاہر ہے کہ ..... توفّی کے لفظ سے موت اور قبض رُوح ہی مراد ہے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۳۳۲)

---

[1] سورۃ الحج: ۴۸ [2] سورۃ آل عمران: ۵۶ [3] سورۃ النحل: ۳۳ [4] سورۃ النحل: ۲۹

تمام قرآن شریف میں توفّی کے معنی یہ ہیں کہ رُوح کو قبض کرنا اور جسم کو بیکار چھوڑ دینا جیسا کہ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے
کہ قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۰۱)

بہت سی اور آیتیں قرآن شریف کی ہیں جن سے بداہت یہی معلوم ہوتا ہے کہ رفع الی اللہ اور رجوع الی اللہ
کے الفاظ ہمیشہ فوت ہی کے لئے آیا کرتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ
الَّذِیْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰی رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ یعنی وہ فرشتہ تمہیں وفات دے گا جو تم پر موکّل ہے اور پھر تم اپنے رب
کی طرف واپس کئے جاؤ گے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۲۱۲ حاشیہ)

۱۸۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّاۤ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ○

کوئی نفس نیکی کرنے والا نہیں جانتا کہ وہ کیا کیا نعمتیں ہیں جو اس کے لئے مخفی ہیں سو خدا تعالیٰ نے ان تمام نعمتوں کو مخفی قرار دیا جن کا دُنیا کی نعمتوں میں نمونہ نہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دُنیا کی نعمتیں ہم پر مخفی نہیں ہیں اور دُودھ اور انار اور انگور وغیرہ کو ہم جانتے ہیں اور ہمیشہ یہ چیزیں کھاتے ہیں تو اس سے معلوم ہُوا کہ وہ چیزیں اَور ہیں اور ان کو ان چیزوں سے صرف نام کا اشتراک ہے پس جس نے بہشت کو دُنیا کی چیزوں کا مجموعہ سمجھا اس نے قرآن شریف کا ایک حرف بھی نہیں سمجھا۔

اِس آیت کی شرح میں جو ابھی مَیں نے ذکر کی ہے ہمارے سیّد و مولیٰ نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بہشت اور اس کی نعمتیں وہ چیزیں ہیں جو نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھیں اور نہ کسی کان نے سُنیں اور نہ دلوں میں کبھی گذریں حالانکہ ہم دُنیا کی نعمتوں کو آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں اور کانوں سے بھی سُنتے ہیں اور دِل میں بھی وہ نعمتیں گزرتی ہیں۔ پس جبکہ خدا تعالیٰ اور رسول اس کا ان چیزوں کو ایک نرالی چیزیں بتلاتا ہے تو ہم قرآن سے دُور جا پڑتے ہیں۔ اگر یہ گمان کریں کہ بہشت میں بھی دُنیا کا ہی دُودھ ہوگا جو گائیوں اور بھینسوں سے دوہا جاتا ہے گویا دُودھ دینے والے جانوروں کے وہاں ریوڑ کے ریوڑ موجود ہوں گے اور درختوں پر شہد کی مکھیوں نے بہت سے چھتّے لگائے ہوئے ہوں گے اور فرشتے تلاش کرکے وہ شہد نکالیں گے اور نہروں میں ڈالیں گے کیا ایسے خیالات اس تعلیم سے کچھ مناسبت رکھتے ہیں جس میں یہ آیتیں موجود ہیں کہ دُنیا نے ان چیزوں کو کبھی نہیں دیکھا اور وہ چیزیں رُوح کو روشن کرتی ہیں اور خدا کی معرفت بڑھاتی ہیں اور رُوحانی غذائیں ہیں گو ان غذاؤں کا تمام نقشہ جسمانی رنگ میں ظاہر کیا گیا ہے مگر ساتھ ساتھ بتایا گیا ہے کہ ان کا سرچشمہ رُوح اور راستی ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۸۳، ۸۴)

خدا کے چھپانے میں بھی ایک عظمت ہوتی ہے اور خدا کا چھپانا ایسا ہے جیسے کہ جنت کی نسبت فرمایا ہے فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ (کوئی جی نہیں جانتا کیسی کیسی قُرَّةُ اَعْیُنٍ ان کے لئے پوشیدہ رکھی گئی ہے) اور حقیقت چھپانے میں بھی ایک قسم کی عزت ہوتی ہے جیسے کھانا لایا جاتا ہے تو اس پر دستر خوان وغیرہ ہوتا ہے تو یہ ایک عزت کی علامت ہوتی ہے۔

(البدر جلد اول نمبر ۱۱ مورخہ ۹ جنوری ۱۹۰۲ء صفحہ ۸۶)

۲۲۔ وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ○

ایسے وقت میں جبکہ شرارت انتہا کو پہنچتی ہے اور قطعی فیصلے کا وقت آجاتا ہے تو مخالفوں کے حق میں انبیاء علیہم السلام کی بھی دعا قبول نہیں ہوتی۔ دیکھو حضرت نوح علیہ السلام نے طوفان کے وقت اپنے بیٹے کنعان کے لئے جو کافروں اور منکروں سے تھا دعا کی اور قبول نہ ہوئی (دیکھو سورہ ہود رکوع ۴) اور ایسا ہی جب فرعون ڈوبنے لگا تو خدا پر ایمان لایا مگر قبول نہ ہوا۔ ہاں اس خاص وقت سے پہلے اگر رجوع کیا جاوے تو البتہ قبول ہوتا ہے وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ یعنی جب خفیف سے آثار عذاب کے ظاہر ہوں تو اُس وقت کی توبہ قبول ہوتی ہے۔ (اعلانِ حق مشمولہ حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۵)

۲۴۔ وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ فَلَا تَكُن فِي مِرْيَةٍ مِّن لِّقَائِهِ ۖ وَجَعَلْنَاهُ هُدًى لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ○

اَعِیْسٰی حَیٌّ وَّمَاتَ الْمُصْطَفٰی تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِیْزٰی۔ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔ وَاِذَا ثَبَتَ اَنَّ الْاَنْبِیَاءَ کُلَّهُمْ اَحْیَاءٌ فِی السَّمٰوٰتِ فَاَیُّ خُصُوْصِیَّةٍ ثَابِتَةٌ لِحَیَاتِ الْمَسِیْحِ اَهُوَ یَاْکُلُ وَیَشْرَبُ وَهُمْ لَا یَاْکُلُوْنَ وَلَا یَشْرَبُوْنَ بَلْ حَیَاتُ کَلِیْمِ اللّٰهِ ثَابِتٌ بِنَصِّ الْقُرْاٰنِ الْکَرِیْمِ اَلَا تَقْرَءُ فِی الْقُرْاٰنِ مَا قَالَ

ترجمہ از مرتب:۔ کیا عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے؟ یہ تقسیم ناقص ہے انصاف کرو جو تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔ اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ تمام کے تمام انبیاء آسمانوں میں زندہ ہیں تو حیاتِ مسیح علیہ السلام کے لئے کونسی خصوصیت ثابت ہے؟ کیا آپ کھاتے اور پیتے ہیں اور باقی انبیاء نہیں کھاتے اور نہیں پیتے بلکہ کلیم اللہ علیہ السلام کی زندگی قرآن کریم سے ثابت ہے۔ کیا تو قرآن کریم میں خدا تعالیٰ کا یہ قول نہیں پڑھتا کہ فَلَا تَكُن

اللهُ تعالیٰ عزّوجلّ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ وَاَنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ هٰذِهِ الْاٰيَةَ نَزَلَتْ فِيْ مُوْسٰى فَهِيَ دَلِيْلٌ صَرِيْحٌ عَلٰى حَيَاتِ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ لِاَنَّهٗ لَقِيَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْاَمْوَاتُ لَا يُلَاقُوْنَ الْاَحْيَاءَ وَلَا تَجِدُ مِثْلَ هٰذِهِ الْاٰيَاتِ فِيْ شَانِ عِيْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ نَعَمْ جَاءَ ذِكْرُ وَفَاتِهٖ فِيْ مَقَامَاتٍ شَتّٰى فَتَدَبَّرْ فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَدَبِّرِيْنَ۔ (حَمَامَةُ الْبُشْرٰی ص۳۵)

یہ تمام شہادتیں (جن کا ذکر حضور پہلے فرما چکے ہیں) اگر ان (مسیح علیہ السلام) کے مرنے کو ثابت نہیں کرتیں تو پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کوئی نبی بھی فوت نہیں ہوا سب بجسم عنصری آسمان پر جا بیٹھے ہیں کیونکہ اس قدر شہادتیں ان کی موت پر ہمارے پاس موجود نہیں بلکہ حضرت موسیٰ کی موت خود مشتبہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان کی زندگی پر یہ آیت قرآنی گواہ ہے یعنی یہ کہ فَلَا تَكُنْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ اور ایک حدیث بھی گواہ ہے کہ موسیٰ ہر سال دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ خانہ کعبہ کے حج کرنے کو آتا ہے۔ (تحفہ گولڑویہ صفحہ ۱۰۹)

۲۸ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَى الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَاَنْفُسُهُمْ اَفَلَا يُبْصِرُوْنَ۝

کیا انہوں نے کبھی نہیں دیکھا کہ ہمارا یہی دستور اور طریق ہے کہ ہم خشک زمین کی طرف پانی روانہ کر دیا کرتے ہیں پھر اس سے کھیتی نکالتے ہیں تا اُن کے چارپائے اور خود وہ کھیتی کو کھاویں اور مرنے سے بچ جائیں۔ سو تم کیوں نظر غور سے ملاحظہ نہیں کرتے تا تم اِس بات کو سمجھ جاؤ کہ وہ کریم و رحیم خدا کہ جو تم کو جسمانی موت سے بچانے کے لئے شدّتِ قحط اور امساکِ باراں کے وقت بارانِ رحمت نازل کرتا ہے وہ کیونکر شدّتِ ضلالت کے وقت جو رُوحانی قحط ہے زندگی کا پانی نازل کرنے سے جو اس کا کلام ہے تم سے دریغ کرے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۳۰)

فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآئِهٖ اور تُو جانتا ہے کہ یہ آیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں نازل ہوئی ہے اور یہ حیاتِ موسیٰ علیہ السلام پر صریح دلیل ہے کیونکہ آپ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور مُردے ان لوگوں سے ملاقات نہیں کرتے جو زندہ ہوں اور تجھے اِس قسم کی آیات عیسیٰ علیہ السلام کی شان میں نہیں ملیں گی ہاں ان کی وفات کا ذکر مختلف مقامات پر آیا ہے۔ پس تُو تدبّر کر۔ اللہ تعالیٰ تدبّر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

سُورَةُ الاَحزَاب

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنۡ قَلۡبَیۡنِ فِیۡ جَوۡفِہٖ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَزۡوَاجَکُمُ الّٰٓیِٴۡ تُظٰہِرُوۡنَ مِنۡہُنَّ اُمَّہٰتِکُمۡ ۚ وَ مَا جَعَلَ اَدۡعِیَآءَکُمۡ اَبۡنَآءَکُمۡ ؕ ذٰلِکُمۡ قَوۡلُکُمۡ بِاَفۡوَاہِکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ یَقُوۡلُ الۡحَقَّ وَ ہُوَ یَہۡدِی السَّبِیۡلَ ○ اُدۡعُوۡہُمۡ لِاٰبَآئِہِمۡ ہُوَ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰہِ ۚ فَاِنۡ لَّمۡ تَعۡلَمُوۡۤا اٰبَآءَہُمۡ فَاِخۡوَانُکُمۡ فِی الدِّیۡنِ وَ مَوَالِیۡکُمۡ ؕ وَ لَیۡسَ عَلَیۡکُمۡ جُنَاحٌ فِیۡمَاۤ اَخۡطَاۡتُمۡ بِہٖ ۙ وَ لٰکِنۡ مَّا تَعَمَّدَتۡ قُلُوۡبُکُمۡ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ○

(آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت زینبؓ کے ساتھ نکاح کرنے کے متعلق آریہ صاحبان نے یہ اعتراض کیا کہ متبنٰی اگر اپنی جورو کو طلاق دے دیوے تو متبنٰی بنانے والے کا اس عورت سے نکاح جائز نہیں۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں:-)

خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں پہلے ہی یہ حکم فرما دیا تھا کہ تم پر صرف ان بیٹوں کی عورتیں حرام ہیں جو تمہارے صلبی

بیٹے ہیں جیسا کہ یہ آیت ہے وَحَلَائِلُ اَبْنَآئِکُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِکُمْ یعنی تم پر فقط ان بیٹوں کی جورُواں حرام ہیں جو تمہاری پُشت اور تمہارے نطفہ سے ہوں۔ پھر جبکہ پہلے سے یہی قانون تعلیم قرآنی میں خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہو چکا ہے اور یہ زینب کا قصّہ ایک مدّت بعد اس کے ظہور میں آیا تو اَب ہر یک سمجھ سکتا ہے کہ قرآن نے یہ فیصلہ اسی قانون کے مطابق کیا جو اس سے پہلے منضبط ہو چکا تھا۔ قرآن کھولو اور دیکھو کہ زینب کا قصّہ اخیری حصّۂ قرآن میں ہے مگر یہ قانون کہ متبنّٰی کی جورو حرام نہیں ہو سکتی یہ پہلے حصّے میں موجود ہے اور اس وقت کا یہ قانون ہے کہ جب زینب کا زید سے ابھی نکاح بھی نہیں ہؤا تھا۔ تم آپ ہی قرآن شریف کو کھول کر ان دونوں مقاموں کو دیکھ لو اور ذرہ شرم کو کام میں لاؤ۔

اور پھر بعد اس کے سُورۃ الاحزاب میں فرمایا مَاجَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِّنْ قَلْبَیْنِ فِیْ جَوْفِہٖ وَمَا جَعَلَ اَزْوَاجَکُمُ الّٰٓئِیْ تُظٰھِرُوْنَ مِنْھُنَّ اُمَّھٰتِکُمْ وَمَاجَعَلَ اَدْعِیَآءَکُمْ اَبْنَآءَکُمْ ذٰلِکُمْ قَوْلُکُمْ بِاَفْوَاھِکُمْ وَاللّٰہُ یَقُوْلُ الْحَقَّ وَھُوَ یَھْدِی السَّبِیْلَ۔ اُدْعُوْھُمْ لِاٰبَآئِھِمْ ھُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰہِ یعنی خدا تعالیٰ نے کسی کے پیٹ میں دو دِل نہیں بنائے پس اگر تم کسی کو کہو کہ تُو میرا دِل ہے تو اس کے پیٹ میں دو دِل نہیں ہو جائیں گے دِل تو ایک ہی رہے گا۔ اِسی طرح جس کو تم ماں کہہ بیٹھے وہ تمہاری ماں نہیں بن سکتی اور اسی طرح خدا نے تمہارے مُنہ بولے بیٹوں کو حقیقت میں تمہارے بیٹے نہیں کر دیا یہ تو تمہارے مُنہ کی باتیں ہیں اور خدا سچ کہتا ہے اور سیدھی راہ دکھلاتا ہے۔ تم اپنے مُنہ بولے بیٹوں کو اُن کے باپوں کے نام سے پُکارو۔ یہ تو قرآنی تعلیم ہے مگر چونکہ خدا تعالیٰ کو منظور تھا کہ اپنے پاک نبی کا نمونہ اس میں قائم کر کے پُرانی رسم کی کراہت کو دِلوں سے دُور کر دے سو یہ نمونہ خدا تعالیٰ نے قائم کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام آزاد کردہ کی بیوی کی اپنے خاوند سے سخت ناسازش ہو گئی آخر طلاق تک نوبت پہنچی۔ پھر جب خاوند کی طرف سے طلاق مِل گئی تو اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیوندِ نکاح کر دیا اور خدا تعالیٰ کے نکاح پڑھنے کے یہ معنی نہیں کہ زینبؓ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایجاب قبول نہ ہؤا اور جبراً خلافِ مرضی زینب کے اُس کو گھر میں آباد کر لیا۔ یہ تو ان لوگوں کی بدذاتی اور ناحق کا اِفتراء ہے جو خدا تعالیٰ سے نہیں ڈرتے۔ بھلا اگر وہ سچے ہیں تو اس اِفتراء کا حدیث صحیح یا قرآن سے ثبوت تو دیں۔ اِتنا بھی نہیں جانتے کہ اِسلام میں نکاح پڑھنے والے کو یہ منصب نہیں ہوتا کہ جبراً نکاح کر دے بلکہ نکاح پڑھنے سے پہلے فریقین کی رضامندی ضروری ہوتی ہے۔ اَب خلاصہ یہ کہ صرف مُنہ کی بات سے نہ تو بیٹا بن سکتا ہے نہ ماں بن سکتی ہے مثلاً ہم آریوں سے پُوچھتے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی شخص غصّہ میں آکر یا کسی دھوکہ سے اپنی عورت کو ماں کہہ بیٹھے تو کیا اس کی عورت اس پر حرام ہو جائے گی اور طلاق پڑ جائے گی اور خود یہ خیال بداہت باطل ہے کیونکہ طلاق تو آریوں کے مذہب میں کسی طور سے پڑ ہی نہیں سکتی خواہ اپنی بیوی کو نہ ایک دفعہ بلکہ ہزار دفعہ ماں کہہ دیں یا دادی کہہ دیں تو پھر جبکہ صرف مُنہ کے کہنے سے کوئی عورت ماں یا دادی نہیں بن سکتی تو پھر صرف مُنہ کی بات سے کوئی غیر کا نطفہ بیٹا کیونکر بن سکتا ہے اور کیونکر قبول کیا جاتا ہے کہ درحقیقت بیٹا ہو گیا اور اس کی عورت اپنے پر حرام ہو گئی۔ خدا کے کلام میں اِختلاف نہیں ہو سکتا۔

پس بلاشبہ یہ بات صحیح ہے کہ اگر صرف مُنہ کی بات سے ایک آریہ کی عورت اُس کی ماں نہیں بن سکتی تو اسی طرح صرف مُنہ کی بات سے غیر کا بیٹا بیٹا بھی نہیں بن سکتا۔ (آریہ دھرم صفحہ ۵۲، ۵۳)

۱۱ اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَ اِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَ بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَ تَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۝

اِسلام کی لڑائیاں ایسے طور سے نہیں ہوئیں کہ جیسے ایک زبردست بادشاہ کمزور لوگوں پر چڑھائی کرکے اُن کو قتل کر ڈالتا ہے بلکہ صحیح نقشہ ان لڑائیوں کا یہ ہے کہ جب ایک مدت دراز تک خدا تعالیٰ کا پاک نبی اور اُس کے پیرو مخالفوں کے ہاتھ سے دُکھ اُٹھاتے رہے چنانچہ اُن میں سے کئی قتل کئے گئے اور کئی بُرے بُرے عذابوں سے مارے گئے یہانتک کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کر دینے کے لئے منصوبہ کیا گیا اور یہ تمام کامیابیاں اُن کے بُتوں کے معبودِ برحق ہونے پر محمول کی گئیں اور ہجرت کی حالت میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو امن میں نہ چھوڑا گیا بلکہ خود آٹھ پڑاؤ تک چڑھائی کرکے خود جنگ کرنے کے لئے آئے تو اُس وقت اُن کے حملہ کے روکنے کے لئے اور نیز اُن لوگوں کو امن میں لانے کے لئے جو اُن کے ہاتھ میں قیدیوں کی طرح تھے اور نیز اِس بات کے ظاہر کرنے کے لئے کہ اُن کے معبود جن کی تائید پر یہ سابقہ کامیابیاں حمل کی گئی ہیں لڑائیاں کرنے کا حکم ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے..... اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَ مِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ الخ (جنگِ مقدس صفحہ ۱۶۲)

۱۲ هُنَالِكَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا۝

انبیاء و رسل کے سوانح پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ درمیان میں ہمیشہ مکروہات آجایا کرتے ہیں۔ طرح طرح کی ناکامیاں پیش آتی ہیں۔ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا سے معلوم ہوتا ہے کہ حد درجہ کی ناکامی کی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن یہ شکست اور ہزیمت نہیں ہوا کرتی ابتلاء میں مامور کا صبر و استقلال اور جماعت کی استقامت اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے۔ وہ خود فرماتا ہے كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَ رُسُلِیْ[1] لفظ کَتَبَ سُنّت اللہ پر دلالت کرتا ہے یعنی یہ خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ اپنے رسُولوں کو ضرور ہی غلبہ دیا کرتا ہے۔ درمیانی دشواریاں کچھ شے نہیں ہوتیں اگرچہ وہ ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ[2] کا ہی مصداق کیوں نہ ہو۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۹ مورخہ یکم مارچ ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

---

[1] سُورۃ المجادلہ: ۲۲ [2] سُورۃ التوبہ: ۱۱۸

زلزلہ کا لفظ ظاہر معنوں کے سوا دوسرے معنوں پر بھی بولا گیا ہے جیسا کہ قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے۔ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۲ مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۳)

۲۲ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا۝

مَیں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ بہت سے لوگ ہیں جو اپنے تراشے ہوئے وظائف اور اَوراد کے ذریعہ سے ان کمالات کو حاصل کرنا چاہتے ہیں لیکن مَیں تمہیں کہتا ہوں کہ جو طریق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار نہیں کیا وہ محض فضول ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر منعم علیہ کی راہ کا سچا تجربہ کار اور کون ہو سکتا ہے جن پر نبوت کے بھی سارے کمالات ختم ہو گئے۔ آپ نے جو راہ اختیار کیا ہے وہ بہت ہی صحیح اور اَقرب ہے اس راہ کو چھوڑ کر اور ایجاد کرنا خواہ وہ بظاہر کتنا ہی خوش کرنے والا معلوم ہوتا ہو میری رائے میں ہلاکت ہے اور خدا تعالیٰ نے مجھ پر ایسا ہی ظاہر کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے اتباع سے خدا ملتا ہے اور آپ کے اتباع کو چھوڑ کر خواہ کوئی ساری عمر ٹکریں مارتا رہے گوہر مقصود اس کے ہاتھ میں نہیں آسکتا چنانچہ سعدیؒ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی ضرورت بتاتا ہے۔

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا ✦ و لیکن میفزائے بر مصطفےٰ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ کو تو نہ چھوڑو۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ قسم قسم کے وظیفے لوگوں نے ایجاد کر لئے ہیں۔ اُلٹے سیدھے لٹکتے ہیں اور جوگیوں کی طرح راہبانہ طریقے اختیار کئے جاتے ہیں لیکن یہ سب بےفائدہ ہیں انبیاء علیہم السلام کی یہ سُنّت نہیں کہ وہ اُلٹے سیدھے لٹکتے رہیں یا نفی اثبات کے ذکر کریں اور ارّہ کے ذکر کریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اُسوۂ حسنہ فرمایا لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلو اور ایک ذرّہ بھر بھی اِدھر یا اُدھر ہونے کی کوشش نہ کرو۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۱۰ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

۲۴ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا

بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝

یہ لوگ جو ایمان لائے دو قسم کے ہیں۔ پہلے تو وہ ہیں جو جاں نثاری کے عہد کو پُورا کر چکے اور خدا کی راہ میں شہید ہو گئے اور دوسرے وہ لوگ ہیں جو شہادت کے منتظر ہیں اور چاہتے ہیں کہ خدا کی راہ میں جانیں دیں اور انہوں نے اپنی بات میں ذرا بھی رَدّ و بدل نہیں کی اور اپنے عہد پر قائم رہے۔ (چشمۂ معرفت صفحہ ۲۲۸، ۲۲۹)

شیعہ سَبّ و شتم تو کرتے ہیں مگر اُن کا (صحابہؓ کا) کام دیکھو کہ جیسے خدا کی مرضی تھی ویسے ہی اسلام کو پھیلا کر دکھا دیا۔ خوب جانتے تھے کہ بیویاں مریں گی، بچے ذبح ہوں گے اور ہر ایک قسم کی تکلیفِ شدید ہو گی مگر پھر بھی خدا کے کام سے مُنہ نہ موڑا یہی فقرہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایک جماعت وہ ہے کہ اپنا نحب (ذمّہ) ادا کر چکے ہیں جیسے مِنۡهُمۡ مَّنۡ قَضٰى نَحۡبَهٗ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّنۡتَظِرُ کیسا سرٹیفکیٹ ہے کہ بعض نے میری راہ میں جان دے دی۔ ایک جان وہ جس پر عیسائی پھڑک رہے ہیں اور پیچھے سے معلوم ہوا کہ وہ بھی نہیں دی گئی۔ (البدر جلد ۱ نمبر ۲ مورخہ ۷ر نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۲)

دُنیا میں جس قدر انبیاء آئے ہیں..... اُن میں ایک کشش ہوتی ہے جس سے لوگ ان کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں اور جب دُعا کی جاتی ہے وہ کشش کے ذریعہ سے زہریلے مادہ پر جو لوگوں کے اندر ہوتا ہے اثر کرتی ہے اور اس رُوحانی مریض کو تسلّی اور تسکین بخشتی ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو کہ بیان میں ہی نہیں آ سکتی۔ اور اصل مَغز شریعت کا یہی ہے کہ وہ کشش طبیعت میں پیدا ہو جاوے۔ سچا تقویٰ اور استقامت بغیر اس صاحبِ کشش کی موجودگی کے پیدا نہیں ہو سکتے اور نہ اس کے سوا قوم بنتی ہے۔ یہی کشش ہے جو کہ دلوں میں قبولیت ڈالتی ہے اس کے بغیر ایک غلام اور نوکر بھی اپنے آقا کی خاطر خواہ فرمانبرداری نہیں کر سکتا اور اسی کے نہ ہونے کی وجہ سے نوکر اور غلام جن پر بڑے انعام و اکرام کئے گئے ہوں آخر کار نمک حرام نکل جاتے ہیں بادشاہوں کی ایک تعداد کثیر ایسے غلاموں کے ہاتھوں ذبح ہوتی رہی لیکن کیا کوئی ایسی نظیر انبیاء میں دکھلا سکتا ہے کہ کوئی نبی اپنے کسی غلام یا مرید سے قتل ہوا ہے؟ مال اور زر اور کوئی اور ذریعہ دل کو اس طرح سے قابو نہیں کر سکتا جس طرح سے یہ کشش قابو کرتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وہ کیا بات تھی کہ جس کے ہونے سے صحابہؓ نے اس قدر صدق دکھایا اور انہوں نے نہ صرف بُت پرستی اور مخلوق پرستی ہی سے مُنہ موڑا بلکہ درحقیقت اُن کے اندر سے دُنیا کی طلب ہی مسلوب ہو گئی اور وہ خدا کو دیکھنے لگ گئے۔ وہ نہایت سرگرمی سے خدا تعالیٰ کی راہ میں ایسے فدا تھے کہ گویا ہر ایک ان میں سے ابراہیم تھا۔ انہوں نے کامل اخلاص سے خدا تعالیٰ کا جلال ظاہر کرنے کے لئے وہ کام کئے جس کی نظیر بعد اس کے کبھی پیدا نہیں ہوئی اور خوشی سے دین کی راہ میں ذبح ہونا قبول کیا بلکہ بعض صحابہؓ نے جو بِلکل شہادت نہ پائی تو اُن کو خیال گذرا کہ شاید ہمارے صدق میں کچھ کسر ہے جیسے کہ اس آیت میں اشارہ ہے مِنۡهُمۡ مَّنۡ قَضٰى نَحۡبَهٗ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّنۡتَظِرُ یعنی بعض تو شہید ہو چکے تھے اور بعض منتظر تھے کہ کب شہادت

نصیب ہو۔ اب دیکھنا چاہیئے کہ کیا ان لوگوں کو دوسروں کی طرح حوائج نہ تھے اور اولاد کی محبت اور دوسرے تعلقات نہ تھے؟ مگر اس کشش نے اُن کو ایسا مستانہ بنا دیا تھا کہ دین کو ہر ایک شئے پر مقدم کیا ہوا تھا۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۳۶ مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۲۸۱، ۲۸۲)

اہلِ اسلام میں اب صرف الفاظ پرستی رہ گئی ہے اور وہ انقلاب جسے خدا چاہتا ہے وہ بھول گئے ہیں اس لئے انہوں نے توبہ کو بھی الفاظ تک محدود کر دیا ہے لیکن قرآن شریف کا منشاء یہ ہے کہ نفس کی قربانی پیش کی جاوے مَنْ قَضٰی نَحْبَهٗ دلالت کرتا ہے کہ وہ توبہ یہ ہے جو انہوں نے کی اور مَنْ يَّنْتَظِرُ بتلاتا ہے کہ وہ یہ توبہ ہے جو انہوں نے کر کے دکھلائی ہے اور وہ منتظر ہیں۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۴۱، ۴۲ مورخہ ۲۹ اکتوبر و ۸ نومبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۳۲۲)

صحابہ کرامؓ کی وہ پاک جماعت تھی جو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی الگ نہیں ہوئے اور وہ آپ کی راہ میں جان دینے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے بلکہ دریغ نہیں کیا۔ ان کی نسبت آیا ہے مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ یعنی بعض اپنا حق ادا کر چکے اور بعض منتظر ہیں کہ ہم بھی اس راہ میں مارے جاویں۔ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر وعظمت معلوم ہوتی ہے مگر یہاں یہ بھی سوچنا چاہیئے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے روشن ثبوت ہیں۔ اب کوئی شخص ان ثبوتوں کو ضائع کرتا ہے تو وہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ضائع کرنا چاہتا ہے۔ پس وہی شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی قدر کر سکتا ہے جو صحابہ کرامؓ کی قدر کرتا ہے جو صحابہ کرامؓ کی قدر نہیں کرتا وہ ہرگز ہرگز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر نہیں کرتا۔ وہ اس دعویٰ میں جھوٹا ہے اگر کہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہوں کیونکہ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہو اور پھر صحابہؓ سے دشمنی۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۷ مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

قرآن شریف نے صحابہؓ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ یعنی بعض صحابہؓ میں سے ایسے ہیں جو اپنی جان دے چکے ہیں اور بعض ابھی منتظر ہیں۔ جب تک اس مقام پر انسان نہیں پہنچتا بامراد نہیں ہو سکتا۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۱۸، ۱۹ مورخہ ۸، ۱۶ مئی ۱۹۰۴ء صفحہ ۱۰)

خدا کے مرسلین اور مامورین کبھی بُزدل نہیں ہوا کرتے بلکہ سچے مومن بھی بُزدل نہیں ہوتے بُزدلی ایمان کی کمزوری کی نشانی ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم پر مصیبتوں نے بار بار حملے کئے مگر انہوں نے کبھی بُزدلی نہیں دکھائی۔ خدا تعالیٰ اُن کی نسبت فرماتا ہے مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا یعنی جس ایمان پر انہوں نے کمر ہمت باندھی تھی اس کو بعض نے تو نبھا دیا اور بعض منتظر ہیں کہ کب موقع ملے اور سُرخرو ہوں اور انہوں نے کبھی کم ہمتی اور بُزدلی نہیں دکھائی۔ (بدر جلد ۱ نمبر ۸ مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

خدا تعالیٰ نے صحابہؓ کی تعریف میں کیا خوب فرمایا ہے مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ

مَنْ قَضٰی نَحْبَہٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ پارہ ۲۱ رکوع ۱۹ مومنوں میں ایسے مرد ہیں جنہوں نے اس وعدہ کو سچا کر دکھایا جو انہوں نے خدا تعالیٰ کے ساتھ کیا تھا۔ سو اُن میں سے بعض اپنی جانیں دے چکے اور بعض جانیں دینے کو تیار بیٹھے ہیں صحابہؓ کی تعریف میں قرآن شریف سے آیات اکٹھی کی جائیں تو اس سے بڑھ کر کوئی اُسوۂ حسنہ نہیں۔

(بدر جلد ۱ مئی۲۰ مورخہ ۱۷؍ اگست ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

صحابہؓ یہ چاہتے تھے کہ خدا تعالیٰ کو راضی کریں خواہ اس راہ میں کیسی ہی سختیاں اور تکلیفیں اُٹھانی پڑیں۔ اگر کوئی مصائب اور مشکلات میں نہ پڑتا اور اُسے دیر ہوتی تو وہ روتا اور چلاتا تھا۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ ان ابتلاؤں کے نیچے خدا تعالیٰ کی رضا کا پروانہ اور خزانۂ مخفی ہے ؎

ہر بلا کیں قوم را حق دادہ است ✦ زیر آں گنج کرم بنہادہ است

قرآن شریف ان کی تعریف سے بھرا ہوا ہے اسے کھول کر دیکھو۔ صحابہؓ کی زندگی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا عملی ثبوت تھا۔ صحابہؓ جس مقام پر پہنچے تھے اس کو قرآن شریف میں اس طرح پر بیان فرمایا ہے مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَہٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ یعنی بعض ان میں سے شہادت پا چکے اور انہوں نے گویا اصل مقصود حاصل کر لیا اور بعض اس انتظار میں ہیں کہ چاہتے ہیں کہ شہادت نصیب ہو۔ صحابہؓ دُنیا کی طرف نہیں جھکے کہ عمریں لمبی ہوں اور اس قدر مال و دولت سے اور یوں بے فکری اور عیش کے سامان ہوں۔ میں جب صحابہؓ کے اس نمونہ کو دیکھتا ہوں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ قدسی کمال فیضان کا بے اختیار اقرار کرنا پڑتا ہے کہ کس طرح پر آپ نے ان کی کایا پلٹ دی اور انہیں بالکل رُو بخدا کر دیا۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ۔ (الحکم جلد ۹ مئی۳۸ مورخہ ۳۱؍ اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۴)

صحابہؓ ..... کے دلی ارادے اور نفسانی جذبات بالکل دُور ہو گئے تھے۔ ان کا اپنا کچھ رہا ہی نہ تھا۔ نہ کوئی خواہش تھی نہ آرزو بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو اور اس کے لئے وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں بکریوں کی طرح ذبح ہو گئے۔ قرآن شریف ان کی اس حالت کے متعلق فرماتا ہے مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَہٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔

یہ حالت انسان کے اندر پیدا ہو جانا آسان بات نہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں جان دینے کو آمادہ ہو جاوے مگر صحابہؓ کی حالت بتاتی ہے کہ انہوں نے اس فرض کو ادا کیا جب انہیں حکم ہوا کہ اس راہ میں جان دے دو پھر وہ دُنیا کی طرف نہیں جھکے۔ (الحکم جلد ۱۰ مئی۱ مورخہ ۱۰؍ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

یہ امر سُنّت اللہ کے خلاف ہے کہ پھونک مار کر ولی (اللہ) بنا دیا جاوے۔ اگر یہی سُنّت ہوتی تو پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کرتے اور اپنے جاں نثار صحابہؓ کو پھونک مار کر ولی بنا دیتے۔ ان کو امتحان میں ڈلوا کر اُن کے سر نہ کٹواتے اور خدا تعالیٰ ان کی نسبت یہ نہ فرماتا مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰی نَحْبَہٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا۔ پس جب دُنیا بغیر مشکلات اور محنت کے ہاتھ نہیں آتی تو عجب بیوقوف ہے وہ انسان جو دین کو حلوائے بے دود سمجھتا ہے یہ تو سچ

ہے کہ دین سہل ہے مگر ہر نعمت مشقت کو چاہتی ہے۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۱ مورخہ ۱۷؍جون ۱۹۰۶ء صفحہ ۳)

صحابہؓ کی جو تکمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کی وہ اِس سے ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ خود ان کی نسبت فرماتا ہے مِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ الخ۔ اور پھر ان کی نسبت رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ فرمایا۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲۷ مورخہ ۳۱؍جولائی ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

صحابہؓ کے زمانہ پر اگر غور کیا جاوے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے ابتداء سے فیصلہ کر لیا ہوا تھا کہ اگر خدا (تعالیٰ) کی راہ میں جان دینی پڑے تو پھر دے دیں گے۔ انہوں نے تو خدا تعالیٰ کی راہ میں مَرنے کو قبول کیا ہوا تھا جتنے صحابہؓ جنگوں میں جاتے تھے کچھ تو شہید ہو جاتے تھے اور کچھ واپس آجاتے تھے اور جو شہید ہو جاتے تھے اُن کے اقرباء پھر اُن سے خوش ہوتے تھے کہ انہوں نے خدا (تعالیٰ) کی راہ میں جان دی اور جو بچ آتے تھے وہ اِس انتظار میں رہتے تھے اور شاکی رہتے کہ شاید ہم میں کوئی کمی رہ گئی جو ہم جنگ میں شہید نہیں ہوئے اور وہ اپنے ارادوں کو مضبوط رکھتے تھے اور خدا (تعالیٰ) کے لئے جان دینے کو تیار رہتے تھے جیسے فرمایا اللہ تعالیٰ نے مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۲۱/۱۹۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۴ مورخہ ۲۴؍ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۹)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ ایک لاکھ سے متجاوز تھے میرا ایمان ہے کہ ان میں سے کسی کا بھی طوطی والا ایمان نہ تھا۔ ایک بھی ان میں سے ایسا نہ تھا جو کچھ دین کے لئے ہو اور کچھ دُنیا کے لئے بلکہ وہ سب کے سب خدا تعالیٰ کی راہ میں جان دینے کے لئے تیار تھے جیسے کہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۵ مورخہ ۳۰؍ستمبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۷)

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۝

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ الخ یعنی اے اہلِ بیت خدا تمہیں ایک اِمتحان کے ذریعہ سے پاک کرنا چاہتا ہے جیسا کہ حق ہے پاک کرنے کا۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۱۰ صفحہ ۱۲۷)

جہاں یہ آیت ہے وہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں ہی کا ذکر ہے۔ سارے مفسّر اِس پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ

اُمّہات المؤمنین کی صفت اِس جگہ بیان فرماتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے الطَّیِّبٰتُ لِلطَّیِّبِیْنَ[1] یہ آیت چاہتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والے طیّبات ہوں۔ ہاں اس میں صرف بیبیاں ہی شامل نہیں بلکہ آپؐ کے گھر کی رہنے والی ساری عورتیں شامل ہیں اور اِس لئے اس میں بنت بھی داخل ہو سکتی ہے بلکہ ہے اور جب فاطمہ رضی اللہ عنہا داخل ہوئیں توحسنین رضؓ بھی داخل ہوئے۔ پس اِس سے زیادہ یہ آیت وسیع نہیں ہو سکتی جتنی وسیع ہو سکتی تھی ہم نے کر دی کیونکہ قرآن شریف ازواج کو مخاطب کرتا ہے اور بعض احادیث نے حضرت فاطمہ اور حسنین کو مطہّرین میں داخل کیا ہے۔ پس ہم نے دونو کو ایک جا جمع کر لیا۔

شیعہ نے ازواجِ مطہرات کو سب وشتم سے یاد کیا ہے اور چونکہ خدا تعالیٰ کو معلوم تھا کہ یہ لوگ ایسا کریں گے اِس لئے قبل از وقت اُن کی براءت کر دی۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۵ مورخہ ۲۴ر اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

اہلِ بیت جو ایک پاک گروہ اور بڑا عظیم الشان گھرانا تھا اس کے پاک کرنے کے واسطے بھی اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا کہ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا یعنی میں ہی ناپاکی اور نجاست کو دُور کروں گا اور خود ہی ان کو پاک کیا تو بھلا اور کون ہے جو خود بخود پاک صاف ہونے کی توفیق رکھتا ہو پس لازمی ہے کہ اس سے دُعا کرتے رہو اور اسی کے آستانہ پر گرے رہو ساری توفیقیں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ر اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم سے اے اہلِ بیت ناپاکی دُور کر دے اور تم کو بالکل پاک کر دے۔

(الحکم جلد ۱۱ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ر جنوری ۱۹۰۷ء صفحہ ۷)

۳۶ اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ

---

[1] سُورۃ النور: ۲۷

وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا○

وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ سچے مرد اور سچی عورتیں بڑے بڑے اجر پائیں گے۔
(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۴۷)

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا○

کسی مومن یا مومنہ کو جائز نہیں ہے کہ جب خدا اور اس کا رسولؐ کوئی حکم کرے تو ان کو اس حکم کے رَدّ کرنے میں اختیار ہو اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ حق سے بہت دُور جا پڑا ہے یعنی نجات سے بے نصیب رہا کیونکہ نجات اہلِ حق کے لئے ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۲۶)

وَاِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِيْٓ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰىهُ ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ

مفعولاً

جو لوگ متبنّٰی کرتے ہیں ان کا یہ دعوٰی سراسر لغو اور باطل ہے کہ وہ حقیقت میں بیٹا ہو جاتا ہے اور بیٹوں کے تمام احکام اُس کے متعلق ہوتے ہیں ظاہر ہے کہ قانونِ قدرت اس بیہودہ دعوٰی کو رَدّ کرتا ہے اِس لئے کہ جس کا نطفہ ہوتا ہے اسی کے اعضاء میں سے بچّے کے اعضاء حصّہ لیتے ہیں۔ اسی کے قویٰ کے مشابہ اس کے قویٰ ہوتے ہیں۔ اور اگر وہ انگریزوں کی طرح سفید رنگ رکھتا ہے تو یہ بھی اس سفیدی سے حصّہ لیتا ہے اگر وہ حبشی ہے تو اس کو بھی اس سیاہی کا بخرہ ملتا ہے اگر وہ آتشک زدہ ہے تو یہ بیچارہ بھی اُسی بَلا میں پھنس جاتا ہے۔ غرض جس کا حقیقت میں نطفہ ہے اُسی کے آثار بچہ میں ظاہر ہوتے ہیں جیسے گیہوں سے گیہوں پَیدا ہوتی ہے اور چنے سے چنا نکلتا ہے۔ پس اِس صورت میں ایک کے نطفہ کو اسکے غیر کا بیٹا قرار دینا واقعاتِ صحیحہ کے مخالف ہے۔ ظاہر ہے کہ صرف مُنہ کے دعوٰی سے واقعاتِ حقیقیہ بدل نہیں سکتے۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ مَیں نے سمّ الفار کے ایک ٹکڑہ کو طباشیر کا ٹکڑہ سمجھ لیا تو وہ اس کے کہنے سے طباشیر نہیں ہو جائے گا اور اگر وہ اس وہم کی بناء پر اُسے کھائے گا تو ضرور مرے گا۔ جس حالت میں خدا نے زید کو بکر کے نطفہ سے پَیدا کرکے بکر کا بیٹا بنا دیا تو پھر کسی انسان کی فضول گوئی سے وہ خالد کا بیٹا نہیں بن سکتا۔ اور اگر بکر اور خالد ایک مکان میں اکٹھے بیٹھے ہوں اور اس وقت حکمِ حاکم پہنچے کہ زید جس کا حقیقت میں بیٹا ہے اس کو پھانسی دیا جائے تو اُس وقت خالد فی الفور عُذر کر دیگا کہ زید حقیقت میں بکر کا بیٹا ہے میرا اس سے کچھ تعلق نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی شخص کے دُو باپ تو نہیں ہوسکتے پس اگر متبنّٰی بنانے والا حقیقت میں باپ ہو گیا ہے تو یہ فیصلہ ہونا چاہیئے کہ اصلی باپ کس دلیل سے لا دعوٰی کیا گیا ہے۔ غرض اس سے زیادہ کوئی بات بھی بیہودہ نہیں کہ خدا کی بنائی ہوئی حقیقتوں کو بدل دیں .....

اب جاننا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم میں پہلے ہی یہ حکم فرما دیا تھا کہ تم پر صرف ان بیٹوں کی عورتیں حرام ہیں جو تمہارے صلبی بیٹے ہیں جیسا کہ یہ آیت ہے

وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِکُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِکُمْ [1]

یعنی تم پر فقط ان بیٹوں کی جورواں حرام ہیں جو تمہاری پُشت اور تمہارے نطفہ سے ہوں پھر جبکہ پہلے سے یہی قانون تعلیم قرآنی میں خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہو چکا ہے اور یہ زینب کا قصہ ایک مُدّت بعد اُس کے ظہور میں آیا۔ تو اَب ہر ایک سمجھ سکتا ہے کہ قرآن نے یہ فیصلہ اُسی قانون کے مطابق کیا جو اس سے پہلے منضبط ہو چکا تھا۔ قرآن کھولو اور دیکھو کہ زینب کا قصہ اخیری حصّہ قرآن میں ہے مگر یہ قانون کہ متبنّٰی کی جورو حرام نہیں ہوسکتی یہ پہلے حصّہ میں ہی موجود ہے اور

---

[1] سورۃ النساء: ۲۴

اس وقت کا یہ قانون ہے کہ جب زینب کا زید سے ابھی نکاح بھی نہیں ہوا تھا۔ تم آپ ہی قرآن شریف کو کھول کر ان دونوں مقاموں کو دیکھ لو...... اور دوسری جز جس پر اعتراض کی بُنیاد رکھی گئی ہے یہ ہے کہ زینب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قبول نہیں کیا تھا صرف زبردستی خدا تعالیٰ نے حکم دے دیا۔ اس کے جواب میں ابھی ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ ایک نہایت بدذاتی کا اِفترا ہے جس کا ہماری کتابوں میں نام و نشان نہیں۔ اگر سچے ہیں تو قرآن یا حدیث میں سے دکھلادیں۔ کیسی بے ایمان قوم ہے کہ جھوٹ بولنے سے شرم نہیں کرتی۔ اگر افترا نہیں تو ہمیں بتلادیں کہاں لکھا ہے۔ کیا قرآن شریف میں یا بخاری اور مسلم میں۔ قرآن شریف کے بعد بااستقلال وثوق کے لائق ہماری دو ہی کتابیں ہیں ایک بخاری اور ایک مسلم۔ سو قرآن یا بخاری اور مسلم سے اِس بات کا ثبوت دیں کہ وہ نکاح زینب کے خلافِ مرضی پڑھا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس حالت میں زینب زید سے جو آنحضرتؐ کا غلام آزاد تھا راضی نہ تھی اور اسی بناء پر زید نے تنگ آکر طلاق دی تھی اور زینب نے خود آنحضرتؐ کے گھر میں ہی پرورش پائی تھی اور آنحضرتؐ کے اقارب میں سے [illegible] منت تھی تو زینب کیلئے اس سے بہتر اَور کونسی مراد اور کونسی فخر کی جگہ تھی کہ غلام کی قید سے نکل کر اس شاہِ عالم کے نکاح میں آوے جو خدا کا پیغمبر اور خاتم الانبیاء اور ظاہری بادشاہت اور ملک داری میں بھی دُنیا کے تمام بادشاہوں کا سرتاج تھا جس کے رُعب سے قیصر اور کسریٰ کانپتے تھے۔ دیکھو تمہارے ہندوستان کے راجوں نے محض فخر حاصل کرنے کے لئے مغلیہ خاندان کے بادشاہوں کو باوجود ہندو ہونے کے لڑکیاں دیں اور آپ درخواستیں دے کر اور تمنا کر کے اس سعادت کو حاصل کیا اور اپنے مذہبی قوانین کی بھی کچھ رعایت نہ رکھی بلکہ اپنے گھروں میں اُن لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھلایا اور اسلام کا طریق سکھایا اور مسلمان بنا کر بھیجا حالانکہ یہ تمام بادشاہ اس عالیشان جناب کے آگے ہیچ تھے جس کے آگے دُنیا کے بادشاہ جھکے ہوئے تھے۔ کیا کوئی عقل قبول کر سکتی ہے کہ ایک ایسی عورت جو اس ذِلّت سے تنگ آگئی تھی جو اُس کا خاوند ایک غلام آزاد کردہ ہے وہ اس غلام سے آزاد ہونے کے بعد اس شہنشاہ کو قبول نہ کرے جس کے پاؤں پر دُنیا کے بادشاہ گرتے تھے بلکہ دیکھ کر رُعب کو برداشت نہیں کر سکتے تھے چنانچہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ملک کا بادشاہ گرفتار ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رُوبرو پیش کیا گیا اور وہ ڈر کر بید کی طرح کانپتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اِس قدر خوف مت کر مَیں کیا ہوں ایک بڑھیا کا بیٹا ہوں جو باسی گوشت کھایا کرتی تھی۔ سو ایسا خاوند جو دُنیا کا بھی بادشاہ اور آخرت کا بھی بادشاہ ہو وہ اگر فخر کی جگہ نہیں تو اَور کون ہو سکتا ہے اور زینب وہ تھی جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زید کے ساتھ آپ شادی کی تھی اور آپؐ کی دست پروردہ تھی اور ایک یتیم لڑکی آپؐ کے عزیزوں میں سے تھی جس کو آپ نے پالا تھا وہ دیکھتی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں عزت کے تخت پر بیٹھی ہیں اور مَیں ایک غلام کی جورو ہوں اِسی وجہ سے دن رات تکرار رہتا تھا اور قرآن شریف بیان فرماتا ہے کہ آنحضرتؐ اِس رشتہ سے طبعًا نفرت رکھتے تھے اور روز کی لڑائی دیکھ کر جانتے تھے کہ اس کا انجام ایک دن طلاق ہے۔ چونکہ یہ آیتیں پہلے سے وارد ہو چکی تھیں

کہ منہ بولا بیٹا در اصل بیٹا نہیں ہو سکتا تھا اس لئے آنحضرتؐ کی فراست اِس بات کو جانتی تھی کہ اگر زید نے طلاق دیدی تو غالباً خدا تعالیٰ مجھے اِس رشتہ کے لئے حکم کرے گا تا لوگوں کے لئے نمونہ قائم کرے چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ قصہ قرآن شریف میں بعینہٖ درج ہے۔

پھر پلید طبع لوگوں نے جن کی بدذاتی ہمیشہ افتراء کرنے کی خواہش رکھتی ہے خلافِ واقعہ یہ باتیں بنائیں کہ آنحضرتؐ خود زینب کے خواہشمند ہوئے حالانکہ زینب کچھ دُور سے نہیں تھی کوئی ایسی عورت نہیں تھی جس کو آنحضرتؐ نے کبھی نہ دیکھا ہو۔ یہ زینب وہی تو تھی جو آنحضرتؐ کے گھر میں آپؐ کی آنکھوں کے آگے جوان ہوئی اور آپؐ نے خود نہ کسی اور نے اُس کا نکاح اپنے غلام آزاد کردہ سے کر دیا اور یہ نکاح اُس کو اور اُس کے بھائی کو اوّل میں نامنظور تھا اور آپ نے بہت کوشش کی یہاں تک کہ وہ راضی ہو گئی۔ ناراضگی کی یہی وجہ تھی کہ زید غلام آزاد کردہ تھا۔ پھر یہ کس قدر بے ایمانی اور بدذاتی ہے جو واقعاتِ صحیحہ کو چھوڑ کر افتراء کئے جائیں۔ قرآن موجود۔ بخاری، مسلم موجود ہے نکالو کہاں سے یہ بات نکلتی ہے کہ آنحضرتؐ زینب کے نکاح کو خود اپنے لئے چاہتے تھے۔ کیا آپؐ نے زید کو کہا تھا کہ تُو طلاق دے دے تا میرے نکاح میں آوے بلکہ آپؐ تو بار بار طلاق دینے سے ہمدردی کے طور پر منع کرتے تھے۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو ہم نے قرآن اور حدیث میں سے لکھی ہیں لیکن اگر کوئی اس کے برخلاف مدعی ہے تو ہماری کتبِ موصوفہ سے اپنے دعویٰ کو ثابت کرے ورنہ بے ایمان اور خیانت پیشہ ہے اور یہ بات جو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نکاح پڑھ دیا اسکے معنے یہ ہیں کہ یہ نکاح میری مرضی کے موافق ہے اور میں نے ہی چاہا ہے کہ ایسا ہو تا مومنوں پر حرج باقی نہ رہے۔

یہ معنے تو نہیں کہ اب زینب کی خلافِ مرضی اس پر قبضہ کر لو ظاہر ہے کہ نکاح پڑھنے والے کا یہ منصب تو نہیں ہوتا کہ کسی عورت کو اس کے خلاف مرضی کے مرد کے حوالہ کر دیوے بلکہ وہ تو نکاح پڑھنے میں اُن کی مرضی کا تابع ہوتا ہے سو خدا تعالیٰ کا نکاح یہی ہے کہ زینب کے دِل کو اُس طرف جھکا دیا اور آپ کو فرما دیا کہ ایسا کرنا ہوگا تا اُمّت پر حرج نہ رہے۔ اب بھی اگر کوئی باز نہ آوے تو ہمیں قرآن اور بخاری اور مسلم سے اپنے دعویٰ کا ثبوت دکھلاوے کیونکہ ہمارے دین کا تمام مدار قرآن شریف پر ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث قرآن کی مفسر ہے اور جو قول اِن دونوں کے مخالف ہو وہ مردود اور شیطانی قول ہے۔ یُوں تو تہمت لگانا سہل ہے مثلاً اگر کسی آریہ کو کوئی کہے کہ تیری والدہ کا تیرے والد سے اصل نکاح نہیں ہوا جبراً اس کو پکڑ لائے تھے اور اس پر کوئی اطمینان بخش ثبوت نہ دے اور مخالفانہ ثبوت کو قبول نہ کرے تو ایسے بدذات کا کیا علاج ہے۔ ایسا ہی وہ شخص بھی اِس سے کچھ کم بدذات نہیں جو مقدس اور راستبازوں پر بے ثبوت تُہمت لگاتا ہے۔ ایماندار آدمی کا یہ شیوہ ہونا چاہیئے کہ پہلے ان کتابوں کا صحیح صحیح حوالہ دے جو مقبول ہوں اور پھر اعتراض کرے ورنہ ناحق کسی مقدس کی بے عزتی کر کے اپنی ناپاکی فطرت کی ظاہر نہ کرے۔ (آریہ دھرم صفحہ ۴۹ تا ۵۵)

متبنّٰی کی مطلقہ سے نکاح کرنا ناجائز نہیں۔ صرف مُنہ کی بات سے نہ کوئی بیٹا بن سکتا ہے اور نہ کوئی باپ بن سکتا ہے

اور نہ ماں بن سکتی ہے مثلاً اگر کوئی عیسائی غصہ میں آکر اپنی بیوی کو ماں کہہ دے تو کیا وہ اُس پر حرام ہو جائے گی اور طلاق واقع ہو جائے گی بلکہ وہ بدستور اُسی ماں سے مجامعت کرتا رہے گا پس جس شخص نے یہ کہا کہ طلاق بغیر زنا کے نہیں ہو سکتی اس نے خود قبول کر لیا کہ صرف اپنے مُنہ سے کسی کو ماں یا باپ یا بیٹا کہہ دینا کچھ چیز نہیں ورنہ وہ ضرور کہہ دیتا کہ ماں کہنے سے طلاق پڑ جاتی ہے مگر شاید کہ مسیح کو وہ عقل دی تھی جو فتح مسیح کو ہے۔ اب تم پر فرض ہے کہ اِس بات کا ثبوت انجیل میں سے دو کہ اپنی عورت کو ماں کہنے سے طلاق پڑ جاتی ہے یا یہ کہ اپنے مسیح کی تعلیم کو ناقص مان لو یا یہ ثبوت دو کہ بائبل کی رُو سے متبنّٰی فی الحقیقت بیٹا ہو جاتا اور بیٹے کی طرح وارث ہو جاتا ہے۔

(نور القرآن ۲؎ صفحہ ۱۳، ۱۴)

﴿ٱلَّذِينَ يُبَلِّغُونَ رِسَٰلَٰتِ ٱللَّهِ وَيَخْشَوْنَهُۥ وَلَا يَخْشَوْنَ أَحَدًا إِلَّا ٱللَّهَ ۗ وَكَفَىٰ بِٱللَّهِ حَسِيبًا﴾

اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر جو اُس کے پیغام پہنچاتے ہیں وہ پیغام رسانی میں کسی سے نہیں ڈرتے۔

(جنگِ مقدس صفحہ ۵۳ روئیداد ۲۵ رمئی ۱۸۹۳ء)

وہ ایمان دار بھی ہیں کہ بہادری سے دین کی راہ میں اپنی جانیں دے دیتے ہیں اور کسی سے نہیں ڈرتے۔

(جنگِ مقدس صفحہ ۱۹۴ روئیداد ۵ رجون ۱۸۹۳ء)

﴿مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَآ أَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ وَلَٰكِن رَّسُولَ ٱللَّهِ وَخَاتَمَ ٱلنَّبِيِّـۧنَ ۗ وَكَانَ ٱللَّهُ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيمًا﴾

اگر یہ عذر پیش ہو کہ بابِ نبوت مسدود ہے اور وحی جو انبیاء پر نازل ہوتی ہے اُس پر مُہر لگ چکی ہے مَیں کہتا ہوں کہ نہ من کل الوجوہ بابِ نبوت مسدود ہوا ہے اور نہ ہر ایک طور سے وحی پر مُہر لگائی گئی ہے بلکہ جزئی طور پر وحی اور نبوت کا اس اُمتِ مرحومہ کے لئے ہمیشہ دروازہ کُھلا ہے مگر اس بات کو بحضورِ دل یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ نبوت جس کا ہمیشہ کے لئے سلسلہ جاری رہے گا نبوتِ تامہ نہیں ہے بلکہ جیسا کہ مَیں ابھی بیان کر چکا ہوں وہ صرف ایک جزئی نبوت ہے جو دوسرے لفظوں میں محدثیت کے اِسم سے موسوم ہے جو انسانِ کامل کی اقتداء سے ملتی ہے جو مستجمع جمیع کمالات نبوتِ تامہ ہے یعنی ذاتِ ستودہ صفات حضرت سیدنا و مولانا محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (توضیح مرام صفحہ ۱۹)

فَاعْلَمْ اَرْشَدَكَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَنَّ النَّبِیَّ مُحَدَّثٌ وَالْمُحَدَّثُ نَبِیٌّ بِاعْتِبَارِ حُصُوْلِ نَوْعٍ مِّنْ اَنْوَاعِ النُّبُوَّةِ
وَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ۔ اَیْ لَمْ يَبْقَ مِنْ اَنْوَاعِ
النُّبُوَّةِ اِلَّا نَوْعٌ وَّاحِدٌ وَّهِیَ الْمُبَشِّرَاتُ مِنْ اَقْسَامِ الرُّؤْيَا الصَّادِقَةِ وَالْمُكَاشَفَاتِ الصَّحِيْحَةِ وَالْوَحْیُ
الَّذِیْ يَنْزِلُ عَلٰى خَوَاصِّ الْاَوْلِيَاءِ وَالنُّوْرُ الَّذِیْ يَتَجَلّٰى عَلٰى قُلُوْبِ قَوْمٍ مُّوْجَعٍ فَانْظُرْ اَيُّهَا النَّاقِدُ
الْبَصِيْرُ اَيُفْهَمُ مِنْ هٰذَا سَدُّ بَابِ النُّبُوَّةِ عَلٰى وَجْهٍ كُلِّیٍّ بَلِ الْحَدِيْثُ يَدُلُّ عَلٰى اَنَّ النُّبُوَّةَ التَّامَّةَ
الْكَامِلَةَ لِوَحْیِ الشَّرِيْعَةِ قَدِ انْقَطَعَتْ وَلٰكِنَّ النُّبُوَّةَ الَّتِیْ لَيْسَ فِيْهَا اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ فَهِیَ بَاقِيَةٌ اِلٰى
يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا انْقِطَاعَ لَهَا اَبَدًا وَقَدْ عَلِمْتَ وَقَرَأْتَ فِیْ كُتُبِ الْحَدِيْثِ اَنَّ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةَ جُزْءٌ مِّنْ
سِتَّةٍ وَّاَرْبَعِيْنَ جُزْءً مِّنَ النُّبُوَّةِ اَیْ مِنَ النُّبُوَّةِ التَّامَّةِ فَلَمَّا كَانَ لِلرُّؤْيَا نَصِيْبٌ مِّنْ هٰذِهِ الْمَرْتَبَةِ
فَكَيْفَ الْكَلَامُ الَّذِیْ يُوْحٰى مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى اِلٰى قُلُوْبِ الْمُحَدَّثِيْنَ فَاعْلَمْ اَيَّدَكَ اللّٰهُ اَنَّ حَاصِلَ كَلَامِنَا اَنَّ
اَبْوَابَ النُّبُوَّةِ الْجُزْئِيَّةِ مَفْتُوْحَةٌ اَبَدًا وَلَيْسَ فِیْ هٰذَا النَّوْعِ اِلَّا الْمُبَشِّرَاتُ اَوِ الْمُنْذِرَاتُ مِنَ الْاُمُوْرِ
الْغَيْبِيَّةِ اَوِ اللَّطَائِفِ الْقُرْاٰنِيَّةِ وَالْعُلُوْمِ اللَّدُنِّيَّةِ وَاَمَّا النُّبُوَّةُ الَّتِیْ تَامَّةٌ كَامِلَةٌ جَامِعَةٌ لِّجَمِيْعِ كَمَالَاتِ

ترجمہ از مرتب :۔ پس جان لے اللہ تعالیٰ تجھے ہدایت دے کہ نبی محدث ہوتا ہے اور محدث نبوت کی انواع میں سے ایک نوع کے حصول کی وجہ سے نبی ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب نبوت میں سے صرف اس کی ایک نوع باقی رہ گئی ہے اور وہ رؤیا صادقہ اور مکاشفاتِ صحیحہ کی اقسام میں سے مبشرات ہیں اور وہ وحی ہے جو خاص خاص اولیاء پر نازل ہوتی ہے اور وہ وہ نور ہے جو دردمند قوم کے دلوں پر اپنی تجلی فرماتا ہے۔ پس اے کھرے اور کھوٹے میں تمیز کرنے والے اور بصیرت رکھنے والے سُن کیا اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ بابِ نبوت کُلّی طور پر بند ہے بلکہ حدیث اِس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ایسی نبوتِ کاملہ جو وحی شریعت کی حامل ہو وہ منقطع ہوچکی ہے لیکن ایسی نبوت جس میں صرف مبشرات ہوں وہ قیامت تک باقی ہے وہ کبھی منقطع نہیں ہوگی اور تجھے اِس بات کا علم ہے اور تُو نے کتبِ حدیث میں بھی یہ پڑھا ہے کہ رؤیا صالحہ نبوت یعنی نبوتِ تامہ کا چھیالیسواں حصہ ہے۔ پس جب رؤیا صادقہ کو یہ مرتبہ حاصل ہے تو پھر وہ کلام کتنا عظیم ہوگا جو خدا تعالیٰ کی طرف سے محدثین کے قلوب پر نازل کیا جاتا ہے۔ پس جان لے اللہ تعالیٰ تیری مدد فرمائے کہ ہمارے کلام کا ماحصل یہ ہے کہ نبوتِ جزئیہ کے دروازے ہمیشہ کے لئے کُھلے ہیں اور اِس نوع میں وہ مبشرات اور منذرات آتی ہیں جو امورِ غیبیہ پر مشتمل ہوتی ہیں یا لطائفِ قرآنی اور علومِ لدنی سے ان کا تعلق ہوتا ہے لیکن نبوّتِ کاملہ تامہ جو وحی کے تمام کمالات کی جامع ہے ہم اس کے منقطع ہونے پر اِس دن

الْوَحْيِ فَقَدْ اٰمَنَّا بِانْقِطَاعِهَا مِنْ يَوْمِ نَزَلَ فِيْهِ۔ مَاکَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ۔
(توضیح مرام صفحہ ۱۹، ۲۰)

کیونکر ممکن تھا کہ خاتم النبیین کے بعد کوئی اور نبی اسی مفہوم تام اور کامل کے ساتھ جو نبوتِ تامہ کی شرائط میں سے ہے آسکتا۔ کیا یہ ضروری نہیں کہ ایسے نبی کی نبوتِ تامہ کے لوازم جو وحی اور نزول جبرئیل ہے اس کے وجود کے ساتھ لازم ہونی چاہیئے کیونکہ حسب تصریح قرآن کریم رسول اسی کو کہتے ہیں جس نے احکام وعقائد دین جبرئیل کے ذریعہ سے حاصل کئے ہوں لیکن وحی نبوت پر تو تیرہ سو برس سے مہر لگ گئی ہے کیا یہ مہر اس وقت ٹوٹ جائیگی اور اگر کہو کہ مسیح ابن مریم نبوتِ تامہ سے معزول کرکے بھیجا جائے گا تو اس سزا کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیئے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بے استحقاق معبود قرار دیا گیا تھا سو خدائے تعالیٰ نے چاہا کہ اس کی سزا میں نبوت سے اس کو الگ کر دیا جائے اور وہ زمین پر آکر دوسروں کے پیرو بنیں اوروں کے پیچھے نماز پڑھیں اور امام اعظم کی طرح صرف اجتہاد سے کام لیں اور حنفی الطریق ہوکر حنفی مذہب کی تائید کریں لیکن یہ جواب معقول نہیں ہے خدائے تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس الزام سے ان کو بری کر دیا ہے اور ان کی نبوت کو ایک دائمی نبوت قرار دیا ہے۔
(ازالہ اوہام صفحہ ۵۲۴، ۵۲۵)

خاتم النبیین کے بعد مسیح ابن مریم رسول کا آنا فسادِ عظیم کا موجب ہے۔ اس سے یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ وحی نبوت کا سلسلہ پھر جاری ہو جائے گا اور یا یہ قبول کرنا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ مسیح ابن مریم کو لوازم نبوت سے الگ کر کے اور محض ایک اُمتی بنا کر بھیجے گا اور یہ دونوں صورتیں ممتنع ہیں۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۵۲۴)

خاتم النبیین ہونا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی دوسرے نبی کے آنے سے مانع ہے۔ ہاں ایسا نبی جو مشکوٰۃ نبوتِ محمدیہ سے نور حاصل کرتا ہے اور نبوتِ تامہ نہیں رکھتا جس کو دوسرے لفظوں میں محدث بھی کہتے ہیں وہ اس تحدید سے باہر ہے کیونکہ وہ بباعث اتباع اور فنافی الرسول ہونے کے جناب ختم المرسلین کے وجود میں ہی داخل ہے جیسے جزکل میں داخل ہوتی ہے۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۵۷۵)

اگرچہ ایک ہی دفعہ وحی کا نزول فرض کیا جاوے اور صرف ایک ہی فقرہ حضرت جبرئیل لاویں اور پھر چپ ہو جاویں یہ امر بھی ختمِ نبوت کا منافی ہے کیونکہ جب ختمیت کی مہر ہی ٹوٹ گئی اور وحی رسالت پھر نازل ہونی شروع ہو گئی تو پھر تھوڑا یا بہت نازل ہونا برابر ہے۔ ہر یک دانا سمجھ سکتا ہے کہ اگر خدائے تعالیٰ صادق الوعد ہے اور جو

سے ایمان لاتے ہیں جب سے یہ آیت قرآنی نازل ہوئی مَاکَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ۔

آیت خاتم النبیین میں وعدہ دیا گیا ہے اور جو حدیثوں میں بتصریح بیان کیا گیا ہے کہ اب جبرئیل بعد وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ کے لئے وحیِ نبوت کے لانے سے منع کیا گیا ہے۔ یہ تمام باتیں سچ اور صحیح ہیں تو پھر کوئی شخص بحیثیت رسالت ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہرگز نہیں آسکتا۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۵۷۷)

یہ بات مستلزم محال ہے کہ خاتم النبیین کے بعد پھر جبرئیل علیہ السلام کی وحیِ رسالت کے ساتھ زمین پر آمدورفت شروع ہو جائے! اور ایک نئی کتاب اللہ گو مضمون میں قرآن شریف سے توارد رکھتی ہو پیدا ہو جائے اور جو امر مستلزم محال ہو وہ محال ہوتا ہے۔ فتدبر (ازالہ اوہام صفحہ ۵۸۳)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی مرد کا باپ نہیں ہے مگر وہ رسول اللہ ہے اور ختم کرنے والا ہے نبیوں کا۔ یہ آیت بھی صاف دلالت کر رہی ہے کہ بعد ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی رسول دُنیا میں نہیں آئے گا۔ پس اِس سے بھی بکمال وضاحت ثابت ہے کہ مسیح ابن مریم رسول اللہ دُنیا میں نہیں آسکتا کیونکہ مسیح ابنِ مریم رسول ہے اور رسول کی حقیقت اور ماہیت میں یہ امر داخل ہے کہ دینی علوم کو بذریعہ وحی جبرئیل حاصل کرے اور ابھی ثابت ہو چکا ہے کہ اب وحیِ رسالت تا قیامت منقطع ہے۔ اِس سے ضروری طور پر ماننا پڑتا ہے کہ مسیح ابنِ مریم ہرگز نہیں آئے گا اور یہ امر خود مستلزم اِس بات کو ہے کہ وہ مر گیا۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۶۱۴)

قرآن کریم بعد خاتم النبیین کے کسی رسول کا آنا جائز نہیں رکھتا خواہ وہ نیا رسول ہو یا پُرانا ہو کیونکہ رسول کو علم دین بتوسط جبرئیل ملتا ہے اور باب نزول جبرائیل بہ پیرایہ وحیُ رسالت مسدود ہے اور یہ بات خود ممتنع ہے کہ دُنیا میں رسول تو آوے مگر سلسلہ وحیُ رسالت نہ ہو۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۷۶۱)

محدث نبی بالقوہ ہوتا ہے اور اگر بابِ نبوت مسدود نہ ہوتا تو ہر یک محدث اپنے وجود میں قوت اور استعداد نبی ہو جانے کی رکھتا تھا اور اسی قوت اور استعداد کے لحاظ سے محدث کا حمل نبی پر جائز ہے یعنی کہہ سکتے ہیں کہ اَلْمُحَدَّثُ نَبِیٌّ (محدث نبی ہے۔ ناقل) جیسا کہ کہہ سکتے ہیں اَلْعِنَبُ خَمْرٌ نَظْرًا عَلَى الْقُوَّةِ وَالْاِسْتِعْدَادِ وَمِثْلُ هٰذَا الْحَمْلِ شَائِعٌ مُتَعَارَفٌ فِیْ عِبَارَاتِ الْقَوْمِ وَقَدْ جَرَتِ الْمُحَاوَرَاتُ عَلٰی ذٰلِكَ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلٰى كُلِّ ذَكِيٍّ عَالِمٍ مُطَّلِعٍ عَلٰى كُتُبِ الْاَدَبِ وَالْكَلَامِ وَالتَّصَوُّفِ (انگور کو شراب اس کی استعداد کی بناء پر کہہ سکتے ہیں اور ایسا محمول کرنا قوم میں شائع و متعارف ہے اور محاورات میں بکثرت آتا ہے جو کہ ہر ذکی عالم جو کتب ادب و کلام اور تصوف سے واقف ہے مخفی نہیں۔ ناقل) اوراسی حمل کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جل شانہ نے اس قرأت کو جو وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ وَّلَا مُحَدَّثٍ ہے مختصر کرکے قرأت ثانی میں صرف یہ الفاظ کافی قرار دئے کہ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ[1]

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۲۳۸، ۲۳۹)

---

[1] سورۃ الحج: ۵۳

مَاكَانَ اللّٰهُ اَنْ يُّرْسِلَ نَبِيًّا بَعْدَ نَبِيِّنَا خَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ وَمَا كَانَ اَنْ يُّحْدِثَ سِلْسِلَةَ النُّبُوَّةِ ثَانِيًا بَعْدَ انْقِطَاعِهَا وَيَنْسَخَ بَعْضَ اَحْكَامِ الْقُرْاٰنِ وَيَزِيْدَ عَلَيْهَا وَيُخْلِفَ وَعْدَهٗ وَيَنْسٰى اِكْمَالَهُ الْفُرْقَانَ وَ يُحْدِثَ الْفِتَنَ فِى الدِّيْنِ الْمَتِيْنِ. اَلَا تَقْرَءُوْنَ فِىْ اَحَادِيْثِ الْمُصْطَفٰى صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ الْمَسِيْحَ يَكُوْنُ اَحَدًا مِّنْ اُمَّتِهٖ وَيَتَّبِعُ جَمِيْعَ اَحْكَامِ مِلَّتِهٖ وَيُصَلِّىْ مَعَ الْمُصَلِّيْنَ۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۳۷۷)

قرآن کریم میں ایک جگہ رسل کے لفظ کے ساتھ بھی مسیح موعود کی طرف اشارہ ہے لیکن یہ سوال کہ انہی الفاظ کے ساتھ جو احادیث میں آئے ہیں کیوں قرآن میں ذکر نہیں کیا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ تا پڑھنے والوں کو دھوکہ نہ لگ جاوے کہ مسیح موعود سے مراد درحقیقت حضرت عیسٰی علیہ السّلام ہی ہیں جن پر انجیل نازل ہوئی تھی اور ایسا ہی دجّال سے کوئی خاص مفسد مُراد ہے۔ سو خدا تعالیٰ نے فرقانِ حمید میں اِن تمام شبہات کو دُور کر دیا اِس طرح پر کہ اوّل نہایت تصریح اور توضیح سے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی وفات کی خبر دی جیسا کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِىْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ[1] سے ظاہر ہے اور پھر ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتم الانبیاء ہونا بھی ظاہر کر دیا جیسا کہ فرمایا وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔

(شہادت القرآن صفحہ ۶۵، ۶۶)

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم محض اُمّیوں کے لئے نہیں بھیجے گئے بلکہ ہر یک رُتبہ اور طبقہ کے اِنسان اُن کی اُمّت میں داخل ہیں۔ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا[2] پس اِس آیت سے ثابت ہے کہ قرآن کریم ہر یک استعداد کی تکمیل کے لئے نازل ہوا ہے اور درحقیقت آیت وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ میں بھی اِسی کی طرف اشارہ ہے۔ (کرامات الصادقین صفحہ ۱۹)

جیسا کہ یہ عقیدہ حضرت عیسٰی علیہ السّلام کے آسمان پر چڑھنے کا قرآن شریف کے بیان سے مخالف ہے ایسا ہی اُنکے

ترجمہ از مرتب:۔ اللہ تعالیٰ ہمارے نبی خاتم النّبیّین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں بھیجے گا اور نہ سلسلۂ نبوت کے منقطع ہونے کے بعد اسے دوبارہ جاری کرے گا اور نہ ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ قرآن کریم کے بعض احکام کو منسوخ کرے یا ان میں اضافہ کرے اور اپنے وعدہ کی خلاف ورزی کرے اور بھول جائے کہ وہ قرآن مجید کو کامل کر چکا ہے اور دینِ متین میں فتنے پیدا ہونے کی راہ کھول دے۔ کیا تم محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نہیں پڑھتے کہ آنے والا مسیح آپ کی ہی اُمّت کا ایک فرد ہوگا اور آپ کے دین کے تمام احکام کی اِتّباع کرے گا اور مسلمانوں کے طریق پر نماز ادا کرے گا۔

---

[1] سُورۃ المائدہ: ۱۱۸ [2] سُورۃ الاعراف: ۱۵۹

آسمان سے اُترنے کا عقیدہ بھی قرآن کے بیان سے منافاتِ کلّی رکھتا ہے کیونکہ قرآن شریف جیسا کہ آیت فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي[1] اور آیت قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ[2] میں حضرت عیسیٰ کو مار چکا ہے ایسا ہی آیت اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ[3] اور آیت وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ میں صریح نبوت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کر چکا ہے اور صریح لفظوں میں فرما چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں جیسا کہ فرمایا ہے وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ لیکن وہ لوگ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو دوبارہ دُنیا میں واپس لاتے ہیں اُن کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ بدستور اپنی نبوت کے ساتھ دُنیا میں آئیں گے اور برابر پینتالیس برس تک اُن پر جبریل علیہ السلام وحی نبوت لے کر نازل ہوتا رہے گا۔ اب بتلاؤ کہ اُن کے عقیدہ کے موافق ختمِ نبوت اور ختمِ وحیٔ نبوت کہاں باقی رہا بلکہ ماننا پڑا کہ خاتم الانبیاء حضرت عیسیٰ ہیں۔

(تحفہ گولڑویہ صفحہ ۵۱)

اِذَا كَانَ نَبِيُّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاتَمَ الْاَنْبِيَاءِ، فَلَا شَكَّ اَنَّهُ مَنْ اٰمَنَ بِنُزُوْلِ الْمَسِيْحِ الَّذِيْ هُوَ نَبِيٌّ مِّنْ بَنِيْ اِسْرَائِيْلَ فَقَدْ كَفَرَ بِخَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ۔ فَيَا حَسْرَةً عَلٰى قَوْمٍ يَقُوْلُوْنَ اَنَّ الْمَسِيْحَ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ نَازِلٌ بَعْدَ وَفَاةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ، وَيَقُوْلُوْنَ اَنَّهُ يَجِيْءُ وَيَنْسَخُ بَعْضَ اَحْكَامِ الْفُرْقَانِ وَيَزِيْدُ عَلَيْهَا وَيَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً وَهُوَ خَاتَمُ الْمُرْسَلِيْنَ، وَقَدْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ وَسَمَّاهُ اللّٰهُ تَعَالٰى خَاتَمَ الْاَنْبِيَاءِ، فَمِنْ اَيْنَ يَظْهَرُ نَبِيٌّ بَعْدَهُ؟

(تحفہ بغداد صفحہ ۲۸)

ترجمہ از مرتب :- جب ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں تو وہ شخص جو اس مسیح کے نزول کو مانتا ہے جو بنی اسرائیل کا ایک نبی ہے تو بے شک وہ خاتم النبیین کی نفی کا منکر ہو گیا پس افسوس ہے اُن لوگوں پر جو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مسیح عیسیٰ بن مریم نازل ہو گا۔ نیز وہ یہ کہتے ہیں کہ وہ آکر قرآن کریم کے بعض احکام کو منسوخ کرے گا اور بعض پر اضافے کرے گا اور اس پر چالیس سال تک وحی نازل ہوتی رہے گی اور وہ خاتم المرسلین ہو گا حالانکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور آپ کا نام اللہ تعالےٰ نے خاتم الانبیاء رکھا ہے پھر آپ کے بعد کوئی نبی کیسے آسکتا ہے۔

(تحفہ بغداد صفحہ ۲۸)

---

[1] سُورۃ المائدہ : ۱۱۸ [2] سُورۃ آلِ عمران : ۱۴۵ [3] سُورۃ المائدہ : ۴

وَاِنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَا يُنْقَلُوْنَ مِنْ هٰذِهِ الدُّنْيَا اِلٰى دَارِ الْاٰخِرَةِ اِلَّا بَعْدَ تَكْمِيْلِ رِسَالَاتٍ قَدْ اُرْسِلُوْا لِتَبْلِيْغِهَا، وَلِكُلِّ بُرْهَةٍ مِنَ الزَّمَانِ مُنَاسَبَةٌ بِوُجُوْدِ نَبِيٍّ فَيُرْسَلُ كُلُّ نَبِيٍّ بِرِعَايَةِ الْمُنَاسَبَةِ وَاِلٰى هٰذَا اِشَارَةٌ فِيْ قَوْلِهٖ تَعَالٰى: وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ. فَلَوْلَمْ يَكُنْ لِرَسُوْلِنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكِتَابِ اللّٰهِ الْقُرْاٰنِ مُنَاسَبَةٌ لِجَمِيْعِ الْاَزْمِنَةِ الْاٰتِيَةِ وَاَهْلِهَا عِلَاجًا وَّمُدَاوَاةً لَمَا اُرْسِلَ ذٰلِكَ النَّبِيُّ الْعَظِيْمُ الْكَرِيْمُ لِاِصْلَاحِهِمْ وَمُدَاوَاتِهِمْ لِلدَّوَامِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، فَلَا حَاجَةَ لَنَا اِلٰى نَبِيٍّ بَعْدَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ اَحَاطَتْ بَرَكَاتُهٗ كُلَّ اَزْمِنَةٍ وَفُيُوْضُهٗ وَارِدَةٌ عَلٰى قُلُوْبِ الْاَوْلِيَاءِ وَالْاَقْطَابِ وَالْمُحَدَّثِيْنَ بَلْ عَلَى الْخَلْقِ كُلِّهِمْ وَاِنْ لَّمْ يَعْلَمُوْا اَنَّهَا فَائِضَةٌ مِنْهُ، فَلَهُ الْمِنَّةُ الْعُظْمٰى عَلَى النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ۔

(حمامة البشرٰی صفحہ ۴۹)

وَاَمَّا ذِكْرُ نُزُوْلِ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ فَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّحْمِلَ هٰذَا الْاِسْمَ الْمَذْكُوْرَ فِي الْاَحَادِيْثِ عَلٰى ظَاهِرِ مَعْنَاهُ، لِاَنَّهٗ يُخَالِفُ قَوْلَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ

ترجمہ از مرتب :- انبیاء کا اس وقت دُنیا سے دارُالآخرت کی طرف اِنتقال ہوتا ہے جب وہ اس پیغام کی تبلیغ کو مکمل کر لیتے ہیں جس کے لئے انہیں بھیجا گیا تھا۔ اور ہر زمانے کو نبئ وقت سے ایک مناسبت ہوتی ہے پس اللہ تعالیٰ ہر نبی کو مناسبت کی رعایت کے ساتھ مبعوث کرتا ہے اس کی طرف اللہ تعالیٰ کا یہ قول اشارہ کرتا ہے وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ اگر ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اور خدا کی کتاب قرآن کریم کو تمام آئندہ زمانوں کے لوگوں سے علاج اور مداوات کے لحاظ سے مناسبت نہ ہوتی تو ہمارے یہ عظیم نبی کریم لوگوں کی اِصلاح اور ان کے علاج کے لئے قیامت تک کے لئے نہ بھیجے جاتے۔ پس ہمیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی اور نبی کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ کی برکات تمام زمانوں پر محیط ہیں اور آپ کے فیوض اولیاء، اقطاب اور محدثین بلکہ تمام مخلوق کے قلوب پر جاری ہیں۔ اگرچہ وہ اِس بات کا علم نہیں رکھتے کہ یہ فیوض آپ ہی کی طرف سے آرہے ہیں۔ پس آپ کا تمام لوگوں پر عظیم احسان ہے۔

(حمامۃ البشریٰ صفحہ ۴۹)

ترجمہ از مرتب :- اور جو عیسٰی بن مریم کے نزول کا ذکر ہے پس کسی مومن کے لئے جائز نہیں کہ احادیث میں اِس نام کو ظاہر پر محمول کرے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اِس قول کے خلاف ہے کہ ہم نے محمدؐ کو کسی مرد کا باپ نہیں بنایا ہاں وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں۔

وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ، أَلَا تَعْلَمُ أَنَّ الرَّبَّ الرَّحِيْمَ الْمُتَفَضِّلَ سَمّٰى نَبِيَّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَاتَمَ الْأَنْبِيَاءِ
بِغَيْرِ اسْتِثْنَاءٍ، وَفَسَّرَهُ نَبِيُّنَا (صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ) فِيْ قَوْلِهٖ لَا نَبِيَّ بَعْدِيْ بِبَيَانٍ وَاضِحٍ لِّلطَّالِبِيْنَ؟
وَلَوْ جَوَّزْنَا ظُهُوْرَ نَبِيٍّ بَعْدَ نَبِيِّنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَجَوَّزْنَا انْفِتَاحَ بَابِ وَحْيِ النُّبُوَّةِ بَعْدَ تَغْلِيْقِهَا
وَهٰذَا خُلْفٌ كَمَا لَا يَخْفٰى عَلَى الْمُسْلِمِيْنَ. وَكَيْفَ يَجِيْءُ نَبِيٌّ بَعْدَ رَسُوْلِنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدِ انْقَطَعَ
الْوَحْيُ بَعْدَ وَفَاتِهٖ وَخَتَمَ اللّٰهُ بِهِ النَّبِيِّيْنَ؟ أَنَعْتَقِدُ بِأَنَّ عِيْسَى الَّذِيْ أُنْزِلَ عَلَيْهِ الْإِنْجِيْلُ هُوَ خَاتَمُ
الْأَنْبِيَاءِ لَا رَسُوْلُنَا صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ أَنَعْتَقِدُ أَنَّ ابْنَ مَرْيَمَ يَأْتِيْ وَيَنْسَخُ بَعْضَ أَحْكَامِ الْفُرْقَانِ
وَيَزِيْدُ بَعْضًا فَلَا يَقْبَلُ الْجِزْيَةَ وَلَا يَضَعُ الْحَرْبَ، وَقَدْ أَمَرَ اللّٰهُ بِأَخْذِهَا وَأَمَرَ بِوَضْعِ الْحَرْبِ بَعْدَ
أَخْذِ الْجِزْيَةِ؟ أَلَا تَقْرَأُ آيَةَ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صَاغِرُوْنَ؟ فَكَيْفَ يَنْسَخُ الْمَسِيْحُ مُحْكَمَاتِ
الْفُرْقَانِ، وَكَيْفَ يَتَصَرَّفُ فِي الْكِتَابِ الْعَزِيْزِ وَيَطْمِسُ بَعْضَ أَحْكَامِهٖ بَعْدَ تَكْمِيْلِهَا؟ فَأَعْجَبَنِيْ أَنَّهُمْ
يَجْعَلُوْنَ الْمَسِيْحَ نَاسِخَ بَعْضِ أَحْكَامِ الْفُرْقَانِ وَلَا يَنْظُرُوْنَ إِلٰى آيَةِ: اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَلَا
يَتَفَكَّرُوْنَ أَنَّهٗ لَوْ كَانَتْ لِتَكْمِيْلِ دِيْنِ الْإِسْلَامِ حَالَةٌ مُّنْتَظَرَةٌ يُرْجٰى ظُهُوْرُهَا بَعْدَ انْقِضَاءِ أُلُوْفٍ

کیا تُو نہیں جانتا کہ اس محسن رَبّ نے ہمارے نبی کا نام خاتم الانبیاء رکھا ہے اور کسی کو مستثنیٰ نہیں کیا اور آنحضرتؐ
نے طالبوں کے لئے بیان واضح سے اس کی تفسیر یہ کی ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے اور اگر ہم آنحضرتؐ کے بعد
کسی نبی کا ظہور جائز رکھیں تو لازم آتا ہے کہ وحیٔ نبوّت کے دروازہ کا انفتاح بھی بند ہونے کے بعد جائز خیال کریں
اور یہ باطل ہے جیسا کہ مسلمانوں پر پوشیدہ نہیں۔ اور آنحضرتؐ کے بعد کوئی نبی کیونکر آوے حالانکہ آپ کی وفات کے
بعد وحیٔ نبوّت منقطع ہو گئی ہے اور آپ کے ساتھ نبیوں کو ختم کر دیا ہے۔ کیا ہم اعتقاد کر لیں کہ ہمارے نبی خاتم الانبیاء
نہیں بلکہ عیسیٰ جو صاحب انجیل ہے وہ خاتم الانبیاء ہے، یا ہم یہ اعتقاد رکھیں کہ ابن مریم آکر قرآن کے بعض احکام
کو منسوخ اور کچھ زیادہ کرے گا۔ اور نہ جزیہ لے گا اور نہ جنگ چھوڑے گا حالانکہ اللہ کا ارشاد ہے کہ جزیہ لے لو اور جزیہ
لینے کے بعد جنگ چھوڑ دو۔ کیا تُو یہ آیت نہیں پڑھتا کہ ذلّت کے ساتھ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیویں۔ پس
قرآن کے محکمات کو کیونکر مسیح منسوخ کرے گا، اور کتاب عزیز میں کیونکر تصرّف کر کے کچھ احکام کو
تکمیل کے بعد مٹا دے گا۔ مَیں تعجب کرتا ہوں کہ وہ کیونکر قرآن کے بعض احکام کا مسیح کو
ناسخ بتاتے ہیں، اور اِس آیت کو نہیں دیکھتے کہ آج مَیں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر دیا
ہے، اگر دینِ اسلام کی تکمیل کے لئے کوئی حالتِ منتظرہ ہوتی جو کئی ہزار سال کے گذرنے کے بعد
اس کے ظہور کی اُمید ہو سکتی تو قرآن کے ساتھ اکمالِ دین ہونا فاسد ہو جاتا اور عندا کا یہ

مِنَ السَّنَوَاتِ لَفَسَدَ مَعْنٰی اِکْمَالِ الدِّیْنِ وَالْفَرَاغِ مِنْ کَمَالِهٖ بِاِنْزَالِ الْقُرْاٰنِ وَلَکَانَ قَوْلُ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ مِنْ نَوْعِ الْکِذْبِ وَخِلَافِ الْوَاقِعَةِ، بَلْ کَانَ الْوَاجِبُ فِیْ هٰذِهِ الصُّوْرَةِ اَنْ یَقُوْلَ الرَّبُّ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی اِنِّیْ مَا اَنْزَلْتُ هٰذَا الْقُرْاٰنَ کَامِلًا عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ بَلْ سَاُنْزِلُ بَعْضَ اٰیَاتِهٖ عَلٰی عِیْسَی بْنِ مَرْیَمَ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ فَیَوْمَئِذٍ یَکْمُلُ الْقُرْاٰنُ وَمَا کَمُلَ اِلٰی هٰذَا الْحِیْنِ۔

(حمامة البشریٰ صفحہ ۱۹ تا ۲۱)

کیا ایسا بدبخت مُفتری جو خود رسالت اور نبوّت کا دعویٰ کرتا ہے قرآن شریف پر ایمان رکھ سکتا ہے اور کیا ایسا وہ شخص جو قرآن شریف پر ایمان رکھتا ہے اور آیت وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ کو خدا کا کلام یقین رکھتا ہے وہ کہہ سکتا ہے کہ مَیں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد رسول اور نبی ہوں۔ صاحبِ انصاف طلب کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اِس عاجز نے کبھی اور کسی وقت حقیقی طور پر نبوّت یا رسالت کا دعویٰ نہیں کیا اور غیر حقیقی طور پر کسی لفظ کو استعمال کرنا اور لُغت کے عام معنوں کے لحاظ سے اس کو بول چال میں لانا مستلزم کُفر نہیں مگر مَیں اِس کو بھی پسند نہیں کرتا کہ اِس میں عام مسلمانوں کو دھوکا لگ جانے کا اِحتمال ہے لیکن وہ مکالمات اور مخاطبات جو اللہ جلّ شانہٗ کی طرف سے مجھ کو ملے ہیں جن میں یہ لفظ نبوّت اور رسالت کا بکثرت آیا ہے ان کو مَیں بوجہ مامور ہونے کے مخفی نہیں رکھ سکتا لیکن بار بار کہتا ہوں کہ اُن الہامات میں جو لفظ مُرسل یا رسول یا نبی میری نسبت آیا ہے وہ اپنے حقیقی معنوں پر مستعمل نہیں ہے اور اصل حقیقت جس کی میں علیٰ رؤس الاشہاد گواہی دیتا ہوں یہی ہے جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا نہ کوئی پُرانا اور نہ کوئی نیا۔ وَمَنْ قَالَ بَعْدَ رَسُوْلِنَا وَسَیِّدِنَا اِنِّیْ نَبِیٌّ اَوْ رَسُوْلٌ عَلٰی وَجْهِ الْحَقِیْقَةِ وَالْاِفْتِرَاءِ وَتَرَکَ الْقُرْاٰنَ وَاَحْکَامَ الشَّرِیْعَةِ الْغَرَّاءِ فَهُوَ کَافِرٌ کَذَّابٌ غرض ہمارا مذہب یہی ہے کہ جو شخص حقیقی طور پر نبوّت کا دعویٰ کرے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ فیوض سے اپنے تئیں الگ کرکے اور اس پاک سرچشمہ سے جُدا ہو کر آپ ہی براہِ راست نبی اللہ بننا چاہتا ہے تو وہ مُلحد بے دین ہے اور غالباً ایسا شخص اپنا کوئی نیا کلمہ بنائے گا اور عبادات میں کوئی نئی طرز پیدا کرے گا اور احکام میں کچھ تغیّر و تبدّل کر دے گا پس بلاشبہ وہ مسیلمہ کذّاب کا بھائی ہے اور اس کے کافر ہونے میں کچھ شک نہیں۔ ایسے خبیث کی نسبت

کہنا کہ آج مَیں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر دیا ہے جھوٹ اور خلافِ واقعہ ہو جاتا بلکہ اس صورت میں تو واجب تھا کہ یُوں کہتا کہ مَیں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کو کامل نہیں اتارا بلکہ آخر زمانہ میں عیسیٰ ابن مریم پر اسکی کچھ آیات اتاروں گا پس اس دن قرآن کامل ہوگا اور ابھی کامل نہیں۔

(حمامۃ البشریٰ ۱۹ تا ۲۱)

کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ وہ قرآن شریف کو مانتا ہے۔ (انجام آتھم صفحہ ۲۷، ۲۸ حاشیہ)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مقدسہ ایسے صاف تھے کہ خود اس مطلب کی طرف رہبری کرتے تھے کہ ہرگز اس پیشگوئی میں نبی اسرائیلی کا دوبارہ دُنیا میں آنا مراد نہیں ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار فرما دیا تھا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور حدیث لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ ایسی مشہور تھی کہ کسی کو اس کی صحت میں کلام نہ تھا اور قرآن شریف جس کا لفظ لفظ قطعی ہے اپنی آیت کریمہ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ سے بھی اس بات کی تصدیق کرتا تھا کہ فی الحقیقت ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہو چکی ہے پھر کیونکر ممکن تھا کہ کوئی نبی نبوت کے حقیقی معنوں کے رُو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تشریف لاوے۔ اس سے تو تمام تار و پود اسلام درہم برہم ہو جاتا تھا اور یہ کہنا کہ "حضرت عیسیٰ نبوت سے معطّل ہو کر آئے گا" نہایت بیحیائی اور گستاخی کا کلمہ ہے۔ کیا خدا تعالیٰ کے مقبول اور مقرب نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے اپنی نبوت سے معطّل ہو سکتے ہیں؟ پھر کونسا راہ اور طریق تھا کہ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دُنیا میں آتے۔ غرض قرآن شریف میں خدا تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام خاتم النبیین رکھ کر اور حدیث میں خود آنحضرتؐ نے لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ فرما کر اس امر کا فیصلہ کر دیا تھا کہ کوئی نبی نبوت کے حقیقی معنوں کے رُو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نہیں آسکتا اور پھر اس بات کو زیادہ واضح کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرما دیا تھا کہ آنے والا مسیح موعود اسی اُمت میں سے ہوگا چنانچہ صحیح بخاری کی حدیث اِمَامُکُمْ مِنْکُمْ اور صحیح مسلم کی حدیث فَاَمَّکُمْ مِنْکُمْ جو عین مقامِ ذکر مسیح موعود میں ہے صاف طور پر بتلا رہی ہے کہ وہ مسیح موعود اسی اُمت میں سے ہوگا۔ (کتاب البریہ صفحہ ۱۸۴، ۱۸۵ حاشیہ)

مسیح ابن مریم کے دوبارہ آنے کو یہ آیت بھی روکتی ہے وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ اور ایسا ہی یہ حدیث بھی کہ لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ۔ یہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ باوجودیکہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں پھر کسی وقت دوسرا نبی آجائے اور وحی نبوت شروع ہو جائے؟ (ایام الصلح صفحہ ۴۷)

حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے الہام قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ کے متعلق فرماتے ہیں کہ

یہ مقام ہماری جماعت کے لئے سوچنے کا مقام ہے کیونکہ اس میں خداوند قدیر فرماتا ہے کہ خدا کی محبت اسی سے وابستہ ہے کہ تم کامل طور پر پیرو ہو جاؤ اور تم میں ایک ذرہ مخالفت باقی نہ رہے اور اس جگہ جو میری نسبت کلام الٰہی میں رسول اور نبی کا لفظ اختیار کیا گیا ہے کہ یہ رسول اور نبی اللہ ہے یہ اطلاق مجاز اور استعارہ کے طور پر ہے کیونکہ جو شخص خدا سے براہِ راست وحی پاتا ہے اور یقینی طور پر خدا اس سے مکالمہ کرتا ہے جیسا کہ نبیوں سے کیا اُس پر رسول یا نبی کا لفظ بولنا غیر موزوں نہیں ہے بلکہ یہ نہایت فصیح استعارہ ہے اسی وجہ سے صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور انجیل اور

دانی ایل اور دوسرے نبیوں کی کتابوں میں جہاں میرا ذکر کیا گیا ہے وہاں میری نسبت نبی کا لفظ بولا گیا ہے۔

(اربعین نمبر۳ صفحہ ۲۵ حاشیہ)

اگر یہ کہا جائے کہ آنحضرتؐ تو خاتم النّبیّین ہیں پھر آپ کے بعد اور نبی کس طرح آسکتا ہے اس کا جواب یہی ہے کہ بیشک اِس طرح سے تو کوئی نبی نیا ہو یا پُرانا نہیں آسکتا جس طرح سے آپ لوگ حضرت عیسٰی علیہ السلام کو آخری زمانہ میں اتارتے ہیں اور پھر اس حالت میں ان کو نبی بھی مانتے ہیں بلکہ چالیس برس تک سلسلۂ وحیٔ نبوت کا جاری رہنا اور زمانۂ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بڑھ جانا آپ لوگوں کا عقیدہ ہے بیشک ایسا عقیدہ تو معصیت ہے اور آیت وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ اور حدیث لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ اس عقیدہ کے کذبِ صریح ہونے پر کامل شہادت ہے لیکن ہم اس قسم کے عقائد کے سخت مخالف ہیں اور ہم اس آیت پر سچا اور کامل ایمان رکھتے ہیں جو فرمایا کہ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ اور اِس آیت میں ایک پیشگوئی ہے جس کی ہمارے مخالفوں کو خبر نہیں اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس آیت میں فرماتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پیشگوئیوں کے دروازے قیامت تک بند کر دئے گئے اور ممکن نہیں کہ اب کوئی ہندو یا یہودی یا عیسائی یا کوئی رسمی مسلمان نبی کے لفظ کو اپنی نسبت ثابت کر سکے۔ نبوت کی تمام کھڑکیاں بند کی گئیں مگر ایک کھڑکی سیرتِ صدیقی کی کھلی ہے فنا فی الرسول کی پس جو شخص اس کھڑکی کی راہ سے خدا کے پاس آتا ہے اُس پر ظلّی طور پر وہی نبوت کی چادر پہنائی جاتی ہے جو نبوتِ محمدی کی چادر ہے اِس لئے اس کا نبی ہونا غیرت کی جگہ نہیں کیونکہ وہ اپنی ذات سے نہیں بلکہ اپنے نبی کے چشمہ سے لیتا ہے اور نہ اپنے لئے بلکہ اُسی کے جلال کے لئے۔ اِس لئے اس کا نام آسمان پر محمد اور احمد ہے۔ اِس کے یہ معنی ہیں کہ محمدؐ کی نبوت آخر محمدؐ کو ہی ملی۔ گو بروزی طور پر مگر نہ کسی اَور کو۔ پس یہ آیت کہ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ اِس کے معنے یہ ہیں لَیْسَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِ الدُّنْیَا وَلٰكِنْ هُوَ اَبٌ لِّرِجَالِ الْاٰخِرَةِ لِاَنَّهٗ خَاتَمُ النَّبِيّٖنَ وَلَا سَبِیْلَ اِلٰی فُیُوْضِ اللّٰهِ مِنْ غَیْرِ تَوَسُّطِهٖ غرض میری نبوت اور رسالت باعتبار محمد اور احمد ہونے کے ہے نہ میرے نفس کے رُو سے اور یہ نام بحیثیت فنافی الرسول مجھے ملا ہے لہٰذا خاتم النّبیّین کے مفہوم میں فرق نہ آیا لیکن عیسٰی کے اُترنے سے ضرور فرق آئے گا اور یہ بھی یاد رہے کہ نبی کے معنے لُغت کے رُو سے یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے اطلاع پا کر غیب کی خبر دینے والا۔ پس جہاں یہ معنی صادق آئیں گے نبی کا لفظ بھی صادق آئے گا اور نبی کا رسول ہونا شرط ہے کیونکہ اگر وہ رسول نہ ہو تو پھر غیب مصفّٰی کی خبر اس کو مل نہیں سکتی اور یہ آیت روکتی ہے لَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ[1]۔ اب اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اِن معنوں کے رُو سے نبی سے انکار کیا جائے تو اِس سے لازم آتا ہے کہ یہ عقیدہ رکھا جائے کہ یہ اُمّت مکالمات و

---

[1] سورۃ الجن: ۲۷، ۲۸

مخاطباتِ الٰہیہ سے بے نصیب ہے کیونکہ جس کے ہاتھ پر اخبارِ غیبیہ منجانب اللہ ظاہر ہوں گے بالضرور اس پر مطابق آیت لَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖ کے مفہوم نبی کا صادق آئے گا۔ اِسی طرح جو خدا تعالیٰ کی طرف سے بھیجا جائے گا اُسی کو ہم رسول کہیں گے۔ فرق درمیان یہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک ایسا نبی کوئی نہیں جس پر جدید شریعت نازل ہو یا جس کو بغیر توسط آنجنابؐ اور ایسی فنائی الرسول کی حالت کے جو آسمان پر اس کا نام محمد اور احمد رکھا جائے یونہی نبوت کا لقب عنایت کیا جائے وَمَنِ ادَّعٰی فَقَدْ کَفَرَ۔ اِس میں اصل بھید یہی ہے کہ خاتم النّبیّین کا مفہوم تقاضا کرتا ہے کہ جب تک کوئی پردہ مغائرت کا باقی ہے اس وقت تک اگر کوئی نبی کہلائے گا تو گویا اس مُہر کو توڑنے والا ہوگا جو خاتم النّبیّین پر ہے لیکن اگر کوئی شخص اُسی خاتم النّبیّین میں ایسا گُم ہو کہ بباعث نہایت اِتحاد اور نفیِ غیریت کے اسی کا نام پا لیا ہو اور صاف آئینہ کی طرح محمدی چہرہ کا اس میں اِنعکاس ہو گیا ہو تو وہ بغیر مُہر توڑنے کے نبی کہلائے گا کیونکہ وہ محمد ہے گو ظلّی طور پر۔ پس باوجود اس شخص کے دعویٔ نبوت کے جس کا نام ظلّی طور پر محمد اور احمد رکھا گیا پھر بھی سیدنا محمد خاتم النّبیّین ہی رہا کیونکہ یہ محمد ثانی اُسی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصویر اور اسی کا نام ہے مگر عیسٰی بغیر مُہر توڑنے کے آ نہیں سکتا۔

(ایک غلطی کا ازالہ صفحہ ۳ تا ۵)

نبوت کے معنی اظہار امرِ غیب ہے اور نبی ایک لفظ ہے جو عربی اور عبرانی میں مشترک ہے یعنی عبرانی میں اسی لفظ کو نابی کہتے ہیں اور یہ لفظ نابا سے مشتق ہے جس کے یہ معنے ہیں خدا سے خبر پا کر پیشگوئی کرنا۔ اور نبی کے لئے شارع ہونا شرط نہیں ہے یہ صرف موہبت ہے جس کے ذریعہ سے امورِ غیبیہ کُھلتے ہیں۔ (ایک غلطی کا ازالہ صفحہ ۶،۵)

ان معنوں سے کہ میں نے اپنے رسولِ مقتدا سے باطنی فیوض حاصل کر کے اور اپنے لئے اُس کا نام پا کر اُس کے واسطہ سے خدا کی طرف سے علمِ غیب پایا ہے رسول اور نبی ہوں مگر بغیر کسی جدید شریعت کے اِس طور کا نبی کہلانے سے مَیں نے کبھی اِنکار نہیں کیا بلکہ انہی معنوں سے خدا نے مجھے نبی اور رسول کر کے پکارا ہے سو اَب بھی مَیں اِن معنوں سے نبی اور رسول ہونے سے اِنکار نہیں کرتا اور میرا یہ قول

"من نیستم رسول ونیاوردہ ام کتاب"

اِس کے معنے صرف اِس قدر ہیں کہ مَیں صاحبِ شریعت نہیں ہوں۔ ہاں یہ بات بھی ضرور یاد رکھنی چاہیئے اور ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ مَیں باوجود نبی اور رسول کے لفظ سے پکارے جانے کے خدا کی طرف سے اطلاع دیا گیا ہوں کہ یہ تمام فیوض بلا واسطہ میرے پر نہیں ہیں بلکہ آسمان پر ایک پاک وجود ہے جس کا رُوحانی افاضہ میرے شاملِ حال ہے یعنی محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اسی واسطہ کو ملحوظ رکھ کر اور اس میں ہو کر اور اس کے نام محمدؐ اور احمدؐ سے مسمّٰی ہو کر مَیں رسول بھی ہوں اور نبی بھی ہوں یعنی بھیجا گیا بھی اور خدا سے غیب کی خبریں پانے والا بھی۔ اور اِس طور سے خاتم النّبیّین کی مُہر محفوظ رہی کیونکہ مَیں نے اِنعکاسی اور ظلّی طور پر محبت کے آئینہ کے ذریعہ سے وہی نام پایا۔ اگر کوئی شخص اِس وحیِ الٰہی پر ناراض ہو

کہ کیوں خدا تعالیٰ نے میرا نام نبی اور رسول رکھا ہے تو یہ اس کی حماقت ہے کیونکہ میرے نبی اور رسول ہونے سے خدا کی مُہر نہیں ٹوٹتی۔ (ایک غلطی کا ازالہ صفحہ ۶، ۷)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو درحقیقت خاتم النبیین تھے مجھے رسول اور نبی کے لفظ سے پکارے جانا کوئی اعتراض کی بات نہیں اور نہ اس سے مُہرِ ختمیت ٹوٹتی ہے کیونکہ میں بارہا بتلا چکا ہوں کہ میں بموجب آیت وَ اٰخَرِیۡنَ مِنۡھُمۡ لَمَّا یَلۡحَقُوۡا بِھِمۡ[1] بروزی طور پر وہی نبی خاتم الانبیاء ہوں اور خدا نے آج سے بیس برس پہلے براہین احمدیہ میں میرا نام محمد اور احمد رکھا ہے اور مجھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود قرار دیا ہے پس اِس طور سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے میں میری نبوت سے کوئی تزلزل نہیں آیا کیونکہ ظِل اپنے اصل سے علیحدہ نہیں ہوتا۔ اور چونکہ مَیں ظلّی طور پر محمد ہوں صلی اللہ علیہ وسلم پس اس طور سے خاتم النبیین کی مُہر نہیں ٹوٹی کیونکہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت محمدؐ تک ہی محدود رہی یعنی بہرحال محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی نبی رہے نہ اَور کوئی۔ یعنی جبکہ مَیں بروزی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور بروزی رنگ میں تمام کمالاتِ محمدی مع نبوتِ محمدیہ کے میرے آئینہ ظلیت میں منعکس ہیں تو پھر کونسا الگ انسان ہُوا جس نے علیحدہ طور پر نبوت کا دعویٰ کیا۔ (ایک غلطی کا ازالہ صفحہ ۸)

اللہ تعالیٰ نے اپنی کلامِ پاک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی کے باپ ہونے کی نفی کی ہے لیکن بروز کی خبر دی ہے اگر بروز صحیح نہ ہوتا تو پھر آیت وَ اٰخَرِیۡنَ مِنۡھُمۡ میں ایسے موعود کے رفیق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کیوں ٹھہرتے اور نفی بروز سے اس آیت کی تکذیب لازم آتی ہے۔ جسمانی خیال کے لوگوں نے کبھی اس موعود کو حسنؓ کی اولاد بنایا اور کبھی حسینؓ کی اور کبھی عباسؓ کی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صرف یہ مقصود تھا کہ وہ فرزندوں کی طرح اُس کا وارث ہوگا۔ اُس کے نام کا وارث، اُس کے خُلق کا وارث، اُس کے علم کا وارث، اُس کی رُوحانیت کا وارث اور ہر ایک پہلو سے اپنے اندر اُس کی تصویر دکھلائے گا اور وہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ سب کچھ اس سے لے گا اور اس میں فنا ہو کر اُس کے چہرے کو دکھائے گا۔ پس جیسا کہ ظلّی طور پر اُس کا نام لے گا، اُس کا خُلق لے گا، اُس کا علم لے گا ایسا ہی اُس کا نبی لقب بھی لے گا کیونکہ بروزی تصویر پوری نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ تصویر ہر ایک پہلو سے اپنے اصل کے کمال اپنے اندر نہ رکھتی ہو۔ پس چونکہ نبوت بھی نبی میں ایک کمال ہے اِس لئے ضروری ہے کہ تصویر بروزی میں وہ کمال بھی نمودار ہو۔ تمام نبی اس بات کو مانتے چلے آئے ہیں کہ وجود بروزی اپنے اصل کی پوری تصویر ہوتی ہے یہاں تک کہ نام بھی ایک ہو جاتا ہے۔ پس اِس صورت میں ظاہر ہے کہ جس طرح بروزی طور پر محمد اور احمد نام رکھے جانے سے دو محمد اور دو احمد نہیں ہو گئے اسی طرح بروزی طور پر نبی یا رسول کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ خاتم النبیین کی مُہر ٹوٹ گئی کیونکہ وجود بروزی کوئی

---

[1] سورۃ الجمعہ: ۴

الگ وجود نہیں۔ اِس طرح پر تو محمدؐ کے نام کی نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ہی محدود رہی۔ تمام انبیاء علیہم السلام کا اِس پر اتفاق ہے کہ بروز میں دُوئی نہیں ہوتی کیونکہ بروز کا مقام اِس مضمون کا مصداق ہوتا ہے کہ

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

لیکن اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ دُنیا میں آئے تو بغیر خاتم النّبیین کی مُہر توڑنے کے کیونکر دُنیا میں آسکتے ہیں۔ غرض خاتم النّبیین کا لفظ ایک الٰہی مُہر ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر لگ گئی ہے اب ممکن نہیں کہ کبھی یہ مُہر ٹوٹ جائے ہاں یہ ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نہ ایک دفعہ بلکہ ہزار دفعہ دُنیا میں بروزی رنگ میں آجائیں اور بروزی رنگ میں اَور کمالات کے ساتھ اپنی نبوت کا بھی اظہار کریں اور یہ بروز خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک قرار یافتہ عہدہ تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَّاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِھِمْ اور انبیاء کو اپنے بروز پر غیرت نہیں ہوتی کیونکہ وہ ان ہی کی صورت اور انہی کا نقش ہے لیکن دوسرے پر ضرور غیرت ہوتی ہے۔ دیکھو حضرت موسیٰؑ نے معراج کی رات جب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے مقام سے آگے نکل گئے تو کیونکر رو رو کر اپنی غیرت ظاہر کی۔ تو پھر جس حالت میں خدا تو فرمائے کہ تیرے بعد کوئی اَور نبی نہیں آئے گا اور پھر اپنے فرمودہ کے برخلاف عیسیٰؑ کو بھیج دے تو پھر کس قدر یہ فعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دِلآزاری کا موجب ہوگا۔ غرض بروزی رنگ کی نبوت سے ختمِ نبوت میں فرق نہیں آتا اور نہ مُہر ٹوٹتی ہے لیکن کسی دوسرے نبی کے آنے سے اِسلام کی بیخ کنی ہو جاتی ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس میں سخت اہانت ہے کہ عظیم الشان کام دجال کشی کا عیسیٰؑ سے ہوا نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آیتِ کریمہ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ نعوذ باللہ اس سے جھوٹی ٹھہرتی ہے اور اِس آیت میں ایک پیشگوئی مخفی ہے اور وہ یہ کہ اَب نبوت پر قیامت تک مُہر لگ گئی ہے اور بجز بروزی وجود کے جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود ہے کسی میں یہ طاقت نہیں جو کھُلے کھُلے طور پر نبیوں کی طرح خدا سے کوئی عِلمِ غیب پاوے اور چونکہ وہ بروزِ محمدی جو قدیم سے موعود تھا وہ مَیں ہوں اِس لئے بروزی رنگ کی نبوت مجھے عطا کی گئی اور اِس نبوت کے مقابل پر اَب تمام دُنیا بے دست و پا ہے کیونکہ نبوت پر مُہر ہے ایک بروزِ محمدی جمیع کمالاتِ محمدیہ کے ساتھ آخری زمانہ کے لئے مقدر تھا سو وہ ظاہر ہوگیا اَب بجز اِس کھڑکی کے اَور کوئی کھڑکی نبوت کے چشمہ سے پانی لینے کے لئے باقی نہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ بروزی طور کی نبوت اور رسالت سے ختمیت کی مُہر نہیں ٹوٹتی اور حضرت عیسیٰؑ کے نزول کا خیال جو مستلزم تکذیب آیت وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ہے وہ ختمیت کی مُہر کو توڑتا ہے اور اس فضول اور خلافِ عقیدہ کا تو قرآن شریف میں نشان نہیں اور کیونکر ہو سکتا کہ وہ آیت ممدوحہ بالا کے صریح خلاف ہے لیکن ایک بروزی نبی اور رسول کا آنا قرآن شریف سے ثابت ہو رہا ہے جیسا کہ آیت وَّاٰخَرِیْنَ مِنْھُمْ سے ظاہر ہے۔ (ایک غلطی کا ازالہ صفحہ ۹ تا ۱۲)

اِس نکتہ کو یاد رکھو کہ مَیں رسول اور نبی نہیں ہوں یعنی باعتبار نئی شریعت اور نئے دعوے اور نئے نام کے۔ اور مَیں رسول اور نبی ہوں یعنی باعتبار ظلّیتِ کاملہ کے مَیں وہ آئینہ ہوں جس میں محمدی شکل اور محمدی نبوت کا کامل انعکاس ہے۔ اگر مَیں کوئی علیحدہ شخص نبوت کا دعویٰ کرنے والا ہوتا تو خدا تعالیٰ میرا نام محمد اور احمد اور مصطفےٰ اور مجتبیٰ نہ رکھتا اور نہ خاتم الانبیاء کی طرح خاتم الاولیاء کا مجھ کو خطاب دیا جاتا بلکہ مَیں کسی علیحدہ نام سے آتا لیکن خدا تعالیٰ نے ہر ایک بات میں وجودِ محمدی میں مجھے داخل کر دیا یہاں تک کہ یہ بھی نہ چاہا کہ یہ کہا جائے کہ میرا کوئی الگ نام ہو یا کوئی الگ قبر ہو کیونکہ ظل اپنے اصل سے الگ ہو ہی نہیں سکتا اور ایسا کیوں کہا گیا۔ اِس میں راز یہ ہے کہ خدا تعالیٰ جانتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اُس نے خاتم الانبیاء ٹھیرایا ہے اور پھر دونوں سلسلوں کا تقابل پورا کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ موسوی مسیح کے مقابل پر محمدی مسیح بھی شانِ نبوت کے ساتھ آوے تا اس نبوتِ عالیہ کی کسرِ شان نہ ہو اِس لئے خدا تعالیٰ نے میرے وجود کو ایک کامل ظلّیت کے ساتھ پیدا کیا اور ظلّی طور پر نبوتِ محمدی اس میں رکھ دی تا ایک معنی سے مجھ پر نبی اللہ کا لفظ صادق آوے اور دوسرے معنوں سے ختمِ نبوت محفوظ رہے۔ (نزول المسیح صفحہ ۳، ۴ حاشیہ)

قرآن نے تو امام حسینؓ کو رتبہ ابنیت کا بھی نہیں دیا بلکہ نام تک مذکور نہیں اُن سے تو زید ہی اچھا رہا جس کا نام قرآن شریف میں موجود ہے۔ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا کہنا قرآن شریف کے نصِ صریح کے برخلاف ہے جیسا کہ آیۃ مَاكَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ سے سمجھا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت امام حسینؓ رجال میں سے تھے عورتوں میں سے تو نہیں تھے۔ حق تو یہ ہے کہ اس آیت نے اس تعلق کو جو امام حسینؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بوجہ پسرِ دختر ہونے کے تھا نہایت ہی ناچیز کر دیا ہے تو پھر اس قدر ان کو آسمان پر چڑھانا کہ وہ جناب پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی افضل ہیں یہ قرآن شریف پر بھی تقدم ہے۔ ہر ایک کو فضیلت وہ دینی چاہیئے کہ قرآن سے ثابت ہے قرآن تو ان کی ابنیت کی بھی نفی کرتا ہے مگر یہاں حضرات شیعہ تمام انبیاء کا انہیں کو شفیع ٹھہراتے ہیں یہ کیسی فضولی ہے۔ یہ قول کس قدر حیا سے دُور ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام امام حسینؓ کے ہی طفیلی ہیں اگر وہ نہ ہوتے تو تمام نبیوں کا نجات پانا مشکل بلکہ غیر ممکن تھا۔ (نزول المسیح صفحہ ۴۵، ۴۶)

قرآن شریف پر شریعت ختم ہو گئی مگر وحی ختم نہیں ہوئی کیونکہ وہ سچے دین کی جان ہے جس دین میں وحیِ الٰہی کا سلسلہ جاری نہیں وہ دین مُردہ ہے اور خدا اس کے ساتھ نہیں۔ (کشتی نوح صفحہ ۲۲ حاشیہ)

یاد رہے کہ ہمارا یہ ایمان ہے کہ آخری کتاب اور آخری شریعت قرآن ہے اور بعد اِس کے قیامت تک ان معنوں سے کوئی نبی نہیں ہے جو صاحبِ شریعت ہو یا بلا واسطہ متابعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وحی پا سکتا ہو بلکہ قیامت تک یہ دروازہ بند ہے اور متابعتِ نبوی سے نعمتِ وحی حاصل کرنے کے لئے قیامت تک دروازے کُھلے ہیں وہ وحی جو اتباع کا نتیجہ ہے کبھی منقطع نہیں ہوگی مگر نبوتِ شریعت والی یا نبوتِ مستقلہ منقطع ہو چکی ہے وَلَاسَبِيْلَ

اِلَيْهَا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَنْ قَالَ اِنِّىْ لَسْتُ مِنْ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَادَّعٰى اَنَّهٗ نَبِىٌّ صَاحِبُ الشَّرِيْعَةِ اَوْ مِنْ دُوْنِ الشَّرِيْعَةِ وَلَيْسَ مِنَ الْاُمَّةِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ رَجُلٍ غَمَرَهُ السَّيْلُ الْمُنْهَمِرُ فَاَلْقَاهُ وَرَآءَهٗ وَلَمْ يُغَادِرْ حَتّٰى مَاتَ اِس کی تفصیل یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے جس جگہ یہ وعدہ فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اُسی جگہ یہ اشارہ بھی فرمادیا ہے کہ آنجناب اپنی روحانیت کی رُو سے اُن صلحاء کے حق میں باپ کے حکم میں ہیں جن کی بذریعہ متابعت تکمیلِ نفوس کی جاتی ہے اور وحیِ الٰہی اور شرف مکالمات کا ان کو بخشا جاتا ہے جیسا کہ وہ جلشانہٗ قرآن شریف میں فرماتا ہے مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مَردوں میں سے کسی کا باپ نہیں ہے مگر وہ رسول اللہ ہے اور خاتم الانبیاء ہے۔ اب ظاہر ہے کہ لٰکِنْ کا لفظ زبانِ عرب میں استدراک کے لئے آتا ہے یعنی تدارکِ مافات کے لئے۔ سو اس آیت کے حصہ میں جو امر فوت شدہ قرار دیا گیا تھا یعنی جس کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے نفی کی گئی تھی وہ جسمانی طور سے کسی مرد کا باپ ہونا تھا سو لٰکِنْ کے لفظ کے ساتھ ایسے فوت شدہ امر کا اس طرح تدارک کیا گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء ٹھہرایا گیا جس کے یہ معنے ہیں کہ آپ کے بعد براہِ راست فیوضِ نبوت منقطع ہو گئے اور اب کمالِ نبوت صرف اُسی شخص کو ملے گا جو اپنے اعمال پر اتباعِ نبوی کی مہر رکھتا ہوگا اور اس طرح پر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بیٹا اور آپ کا وارث ہوگا۔ غرض اس آیت میں ایک طور سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے باپ ہونے کی نفی کی گئی اور دوسرے طور سے باپ ہونے کا اثبات بھی کیا گیا تا وہ اعتراض جس کا ذکر آیت اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ[1] میں ہے دُور کیا جائے ماحصل اِس آیت کا یہ ہوا کہ نبوت گو بغیر شریعت ہو اِس طرح پر تو منقطع ہے کہ کوئی شخص براہِ راست مقامِ نبوت حاصل کر سکے لیکن اس طرح پر ممتنع نہیں کہ وہ نبوت چراغِ اُمتِ محمدیہ سے مکتسب اور مستفاض ہو یعنی ایسا صاحب کمال ایک جہت سے تو اُمتی ہو اور دوسری جہت سے بوجہ اکتساب انوارِ محمدیہ نبوت کے کمالات بھی اپنے اندر رکھتا ہو اور اگر اِس طور سے بھی تکمیلِ نفوس مستعدہ اُمت کی نفی کی جائے تو اس سے نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دونوں طور سے ابتر ٹھہرتے ہیں نہ جسمانی طور پر کوئی فرزند نہ روحانی طور پر کوئی فرزند۔ اور معترض سچا ٹھہرتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ابتر رکھتا ہے۔

اب جبکہ یہ بات طے پا چکی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوتِ مستقلہ جو براہِ راست ملتی ہے اس کا دروازہ قیامت تک بند ہے اور جب تک کوئی اُمتی ہونے کی حقیقت اپنے اندر نہیں رکھتا اور حضرت محمد کی غلامی کی طرف منسوب نہیں تب تک وہ کسی طور سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ظاہر نہیں ہو سکتا۔ (ریویو بر مباحثہ بٹالوی و چکڑالوی صفحہ ۶، ۷)

---

[1] سورۃ الکوثر : ۴

إِنَّا مُسْلِمُوْنَ نُؤْمِنُ بِكِتَابِ اللّٰهِ الْفُرْقَانِ وَنُؤْمِنُ بِاَنَّ سَيِّدَنَا مُحَمَّدًا نَبِيُّهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَ اَنَّهٗ جَاءَ بِخَيْرِ الْاَدْيَانِ وَنُؤْمِنُ بِاَنَّهٗ خَاتَمُ الْاَنْبِيَآءِ لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ اِلَّا الَّذِيْ رُبِّيَ مِنْ فَيْضِهٖ وَاَظْهَرَهٗ وَعْدُهٗ وَلِلّٰهِ مُكَالَمَاتٌ وَمُخَاطَبَاتٌ مَعَ اَوْلِيَآئِهٖ فِيْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ وَاِنَّهُمْ يُعْطَوْنَ صِبْغَةَ الْاَنْبِيَآءِ وَلَيْسُوْا نَبِيِّيْنَ فِي الْحَقِيْقَةِ فَاِنَّ الْقُرْاٰنَ اَكْمَلَ وَطَرَ الشَّرِيْعَةِ وَلَا يُعْطَوْنَ اِلَّا فَهْمَ الْقُرْاٰنِ وَلَا يَزِيْدُوْنَ عَلَيْهِ وَلَا يَنْقُصُوْنَ مِنْهُ وَمَنْ زَادَ اَوْ نَقَصَ فَاُولٰٓئِكَ مِنَ الشَّيَاطِيْنِ الْفَجَرَةِ۔ وَنَعْنِيْ بِخَتْمِ النُّبُوَّةِ خَتْمَ كَمَالَاتِهَا عَلٰى نَبِيِّنَا الَّذِيْ هُوَ اَفْضَلُ رُسُلِ اللّٰهِ وَ اَنْبِيَآئِهٖ وَنَعْتَقِدُ بِاَنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ اِلَّا الَّذِيْ هُوَ مِنْ اُمَّتِهٖ وَمِنْ اَكْمَلِ اَتْبَاعِهِ الَّذِيْ وَجَدَ الْفَيْضَ كُلَّهٗ مِنْ رُوْحَانِيَّتِهٖ وَاَضَاءَ بِضِيَائِهٖ فَهُنَاكَ لَا غَيْرَ وَلَا مَقَامَ الْغَيْرَةِ وَلَيْسَتْ بِنُبُوَّةٍ اُخْرٰى وَلَا مَحَلَّ لِلْغَيْرَةِ بَلْ هُوَ اَحْمَدُ تَجَلّٰى فِيْ سَجَنْجَلٍ اٰخَرَ۔ وَلَا يُغَارُ رَجُلٌ عَلٰى صُوْرَتِهِ الَّتِيْ اَرَاهُ اللّٰهُ فِيْ مِرْاٰةٍ وَاَظْهَرَ۔ فَاِنَّ الْغَيْرَةَ لَا تَهِيْجُ عَلَى التَّلَامِذَةِ وَالْاَبْنَآءِ فَمَنْ كَانَ مِنَ النَّبِيِّ وَفِي النَّبِيِّ فَاِنَّمَا هُوَ هُوَ لِاَنَّهٗ فِيْ اَتَمِّ مَقَامِ الْفَنَاءِ وَمُصَبَّغٌ بِصِبْغَتِهٖ

ترجمہ از مرتب :- ہم مسلمان ہیں اور ہم خدا تعالیٰ کی کتاب فرقانِ مجید پر ایمان لاتے ہیں اور یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا تعالیٰ کے نبی اور اس کے رسول ہیں اور یہ کہ آپؐ بہترین دین لے کر آئے اور اس بات پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ آپؐ خاتم الانبیاء ہیں اور آپؐ کے بعد کوئی نبی نہیں مگر وہی جس کی تربیت آپؐ کے فیضان سے ہوئی ہو اور جس کا ظہور آپ کی پیشگوئی کے مطابق ہؤا اور اللہ تعالیٰ اِس اُمت کے اَولیاء کو اپنے مکالمات اور مخاطبات سے مشرف کرتا ہے اور انہیں انبیاء کے رنگ سے رنگین کیا جاتا ہے لیکن وہ حقیقی طور پر نبی نہیں ہوتے کیونکہ قرآن کریم نے شریعت کی تمام ضروریات کو پورا کر دیا ہے اور ان کو فہمِ قرآن عطا کیا جاتا ہے لیکن وہ نہ تو قرآن کریم میں کسی قسم کا اضافہ کرتے ہیں اور نہ اس میں کوئی کمی کرتے ہیں اور جس شخص نے قرآن کریم میں کوئی اضافہ کیا یا کوئی حصہ کم کیا تو وہ شیطان فاجر ہے۔ اور ختمِ نبوت سے ہم یہ مراد لیتے ہیں کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو اللہ تعالیٰ کے سب رسولوں اور نبیوں سے افضل ہیں تمام کمالاتِ نبوت ختم ہو گئے ہیں اور ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آپؐ کے بعد نبوّت کے مقام پر وہی شخص فائز ہو سکتا ہے جو آپؐ کی اُمت میں سے ہو اور آپؐ کا کامل پیرو ہو۔ اور اس نے تمام کا تمام فیضان آپؐ ہی کی رُوحانیت سے پایا ہو اور آپؐ کے نور سے منور ہؤا ہو۔ اس مقام میں کوئی غیریت نہیں اور نہ ہی یہ غیرت کی جگہ ہے اور یہ کوئی علیحدہ نبوت نہیں اور نہ ہی یہ مقامِ حیرت ہے بلکہ یہ احمدِ مجتبیٰ ہی ہے جو دوسرے آئینہ میں ظاہر ہؤا ہے اور کوئی شخص اپنی تصویر پر جسے اللہ نے آئینہ میں دکھایا ہو غیرت نہیں کھاتا کیونکہ

وَمُرْتَدٍ بِتِلْكَ الرِّدَاءِ وَقَدْ وَجَدَ الْوُجُوْدَ مِنْهُ وَبَلَغَ مِنْهُ كَمَالَ النَّشْوِ وَالنَّمَاءِ وَهٰذَا هُوَ الْحَقُّ الَّذِيْ يَشْهَدُ عَلٰى بَرَكَاتِ نَبِيِّنَا وَيَرَى النَّاسُ حُسْنَهٗ فِيْ حُلَلِ التَّابِعِيْنَ الْفَانِيْنَ فِيْهِ بِكَمَالِ الْمَحَبَّةِ وَالصَّفَاءِ وَمِنَ الْجَهْلِ اَنْ يَّقُوْمَ اَحَدٌ لِلْمِرَاءِ بَلْ هٰذَا هُوَ ثُبُوْتٌ مِّنَ اللّٰهِ لِنَفْيِ كَوْنِهٖ اَبْتَرَ وَلَا حَاجَةَ اِلٰى تَفْصِيْلٍ لِمَنْ تَدَبَّرَ. وَاِنَّهٗ مَا كَانَ اَبَا اَحَدٍ مِّنَ الرِّجَالِ مِنْ حَيْثُ الْجِسْمَانِيَّةِ. وَلٰكِنَّهٗ اَبٌ مِنْ حَيْثُ فَيْضِ الرِّسَالَةِ لِمَنْ كَمَّلَ فِي الرُّوْحَانِيَّةِ وَاِنَّهٗ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ وَعَلَمُ الْمَقْبُوْلِيْنَ. وَلَا يَدْخُلُ الْحَضْرَةَ اَبَدًا اِلَّا الَّذِيْ مَعَهٗ نَقْشُ خَاتَمِهٖ وَاٰثَارُ سُنَّتِهٖ وَلَنْ يُّقْبَلَ عَمَلٌ وَّلَا عِبَادَةٌ اِلَّا بَعْدَ الْاِقْرَارِ بِرِسَالَتِهٖ وَالثَّبَاتِ عَلٰى دِيْنِهٖ وَمِلَّتِهٖ. وَقَدْ هَلَكَ مَنْ تَرَكَهٗ وَمَا تَبِعَهٗ فِيْ جَمِيْعِ سُنَنِهٖ عَلٰى قَدْرِ وُسْعِهٖ وَطَاقَتِهٖ وَلَا شَرِيْعَةَ بَعْدَهٗ وَلَا نَاسِخَ لِكِتَابِهٖ وَوَصِيَّتِهٖ وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَتِهٖ وَلَا قَطْرَ كَمُزْنَتِهٖ وَمَنْ خَرَجَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ مِّنَ الْقُرْاٰنِ فَقَدْ

شاگردوں اور بیٹوں پر غیرت جوش میں نہیں آتی پس جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض پاکر اور آپؐ میں فنا ہوکر آئے وہ درحقیقت وہی ہے کیونکہ وہ کامل فنا کے مقام پر ہوتا ہے اور آپ کے رنگ میں ہی رنگین اور آپ کی ہی چادر اوڑھے ہوتا ہے اور آپ سے ہی اس نے اپنا رُوحانی وجود حاصل کیا ہوتا ہے اور آپ کے فیض سے ہی اس کا وجود کمال کو پہنچا ہوتا ہے اور یہی وہ حق ہے جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکات پر گواہ ہے اور لوگ نبی کریمؐ کا حُسن ان تابعین کے لباس میں دیکھتے ہیں جو اپنے کمال محبت وصفائی کی وجہ سے آپ کے وجود میں فنا ہوگئے اور اس کے خلاف بحث کرنا جہالت ہے کیونکہ یہ تو آپ کے اَبتر نہ ہونے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثبوت ہے اور تدبّر کرنے والوں کے لئے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں اور آپؐ جسمانی طور پر تو مَردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اپنی رسالت کے فیضان کی رُو سے ہر اُس شخص کے باپ ہیں جس نے رُوحانیت میں کمال حاصل کیا۔ اور آپؐ تمام انبیاء کے خاتم اور تمام مقبولوں کے سردار ہیں اور اب خدا تعالیٰ کی درگاہ میں وہی شخص داخل ہوسکتا ہے جس کے پاس آپؐ کی مُہر کا نقش ہو اور آپؐ کی سُنّت پر پوری طرح سے عامل ہو اور اب کوئی عمل اور عبادت آپؐ کی رسالت کے اقرار کے بغیر اور آپؐ کے دین پر ثابت قدم رہنے کے بدوں خدا تعالیٰ کے حضور مقبول نہیں ہوگی اور جو آپؐ سے الگ ہوگیا اور اس نے اپنے مقدور اور طاقت کے مطابق آپؐ کی پیروی نہ کی وہ ہلاک ہوگیا۔ آپؐ کے بعد اب کوئی شریعت نہیں آسکتی اور نہ کوئی آپؐ کی کتاب اور آپؐ کے احکام کو منسوخ کرسکتا ہے اور نہ کوئی آپ کے پاک کلام کو بدل سکتا ہے اور کوئی بارش آپؐ کی موسلا دھار بارش کی مانند نہیں ہوسکتی۔ اور جو شخص قرآن کریم کی پیروی سے ذرہ بھر بھی دُور ہوا وہ ایمان

خَرَجَ مِنَ الْاِیْمَانِ وَلَنْ یُّفْلِحَ اَحَدٌ حَتّٰی یَتَّبِعَ کُلَّ مَا ثَبَتَ مِنْ نَبِیِّنَا الْمُصْطَفٰی وَمَنْ تَرَکَ مِقْدَارَ ذَرَّۃٍ مِنْ وَصَایَاہُ فَقَدْ ھَوٰی وَمَنِ ادَّعَی النُّبُوَّۃَ مِنْ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ وَمَا اعْتَقَدَ بِاَنَّہٗ رُبِّیَ مِنْ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ خَیْرِ الْبَرِیَّۃِ وَبِاَنَّہٗ لَیْسَ ھُوَ شَیْئًا مِنْ دُوْنِ ھٰذِہِ الْاُسْوَۃِ وَاَنَّ الْقُرْاٰنَ خَاتَمُ الشَّرِیْعَۃِ فَقَدْ ھَلَکَ وَاَلْحَقَ نَفْسَہٗ بِالْکَفَرَۃِ الْفَجَرَۃِ وَمَنِ ادَّعَی النُّبُوَّۃَ وَلَمْ یَعْتَقِدْ بِاَنَّہٗ مِنْ اُمَّتِہٖ وَبِاَنَّہٗ اِنَّمَا وَجَدَ کُلَّمَا وَجَدَ مِنْ فَیْضَانِہٖ وَاَنَّہٗ ثَمَرَۃٌ مِنْ بُسْتَانِہٖ وَقَطْرَۃٌ مِنْ تَھْتَانِہٖ وَشَعْشَعٌ مِنْ لَمَعَانِہٖ فَھُوَ مَلْعُوْنٌ وَلَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَیْہِ وَعَلٰی اَنْصَارِہٖ وَاَتْبَاعِہٖ وَاَعْوَانِہٖ لَا نَبِیَّ لَنَا تَحْتَ السَّمَآءِ مِنْ دُوْنِ نَبِیِّنَا الْمُجْتَبٰی وَلَا کِتَابَ لَنَا مِنْ دُوْنِ الْقُرْاٰنِ وَکُلُّ مَنْ خَالَفَہٗ فَقَدْ جَرَّ نَفْسَہٗ اِلَی اللَّظٰی۔ (مواہب الرحمٰن صفحہ ۶۶ تا ۶۹)

خدا تعالیٰ کا یہ دُعا سکھلانا کہ خدایا ایسا کر کہ ہم وہی یہودی نہ بن جائیں جنہوں نے عیسیٰؑ کو قتل کرنا چاہا تھا صاف بتلا رہا ہے کہ اُمّتِ محمدیہ میں بھی ایک عیسیٰ پیدا ہونے والا ہے ورنہ اِس دُعا کی کیا ضرورت تھی۔ اور نیز جبکہ آیات مذکورہ بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں بعض علماءِ مسلمان بالکل علماءِ یہود سے مشابہ ہو جائیں گے اور یہود بن جائیں گے۔ پھر یہ کہنا کہ ان یہودیوں کی اِصلاح کے لئے اسرائیلی عیسیٰ آسمان سے نازل ہوگا بالکل غیر معقول بات ہے کیونکہ اوّل تو باہر سے ایک نبی کے آنے سے مُہرِ ختمِ نبوت ٹوٹتی ہے اور

کے دائرہ سے خارج ہو گیا۔ اور اس وقت تک کوئی شخص ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک وہ ان تمام باتوں کی پیروی نہ کرے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں۔ اور جس نے آپؐ کے وصایا میں سے کوئی چھوٹی سی وصیت بھی ترک کر دی تو وہ گمراہ ہو گیا۔ اور جس نے اس اُمّت میں نبوت کا دعویٰ کیا اور یہ اعتقاد نہ رکھا کہ وہ خیر البشر محمد مصطفیٰؐ کا ہی تربیت یافتہ ہے اور آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کے بغیر ہیچ محض ہے اور یہ کہ قرآن کریم خاتم الشرائع ہے تو وہ ہلاک ہو گیا اور وہ کافروں اور فاجروں میں جا ملا۔ اور جس شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا اور یہ اعتقاد نہ رکھا کہ وہ آپؐ ہی کی اُمّت میں سے ہے اور یہ کہ جو کچھ اس نے پایا ہے وہ آپؐ ہی کے فیضان سے پایا ہے اور یہ کہ وہ آپؐ ہی کے باغ کا ایک پھل اور آپؐ ہی کی موسلا دھار بارش کا ایک قطرہ اور آپؐ ہی کی روشنی کی ایک کرن ہے تو وہ ملعون ہے اور اس پر اور اس کے ساتھیوں پر اور اس کے اتباع اور مددگاروں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔ آسمان کے نیچے محمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہمارا کوئی نبی نہیں اور قرآن کریم کے سوا ہماری کوئی کتاب نہیں اور جس نے بھی اس کی مخالفت کی وہ اپنے آپ کو جہنّم کی طرف کھینچ کر لے گیا۔

(مواہب الرحمٰن صفحہ ۶۶ تا ۶۹)

قرآن شریف صریح طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء ٹھہراتا ہے ماسوا اس کے قرآن شریف کے رُو سے یہ اُمت خیر الامم کہلاتی ہے۔ پس اس کی اس سے زیادہ بے عزتی اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ یہود بننے کیلئے تو یہ اُمت ہو مگر عیسٰی باہر سے آوے۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۱۱)

بلاشبہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رُوحانیت قائم کرنے کے لحاظ سے آدمِ ثانی تھے بلکہ حقیقی آدم وہی تھے جن کے ذریعہ اور طفیل سے تمام انسانی فضائل کمال کو پہنچے اور تمام نیک قوتیں اپنے اپنے کام میں لگ گئیں اور کوئی شاخ فطرتِ انسانی کی بے بار و بر نہ رہی اور ختمِ نبوت آپ پر نہ صرف زمانہ کے تاخر کی وجہ سے ہوا بلکہ اس وجہ سے بھی کہ تمام کمالاتِ نبوت آپ پر ختم ہوگئے۔ (لیکچر سیالکوٹ صفحہ ۶)

تمام نبوتیں اور تمام کتابیں جو پہلے گذر چکیں اُن کی الگ طور پر پیروی کی حاجت نہیں رہی کیونکہ نبوتِ محمدیہ ان سب پر مشتمل اور حاوی ہے اور بجز اس کے سب راہیں بند ہیں۔ تمام سچائیاں جو خدا تک پہنچاتی ہیں اسی کے اندر ہیں۔ نہ اس کے بعد کوئی نئی سچائی آئے گی اور نہ اس سے پہلے کوئی ایسی سچائی تھی جو اس میں موجود نہیں اس لئے اس نبوت پر تمام نبوتوں کا خاتمہ ہے اور ہونا چاہیئے کیونکہ جس چیز کے لئے ایک آغاز ہے اُس کے لئے ایک انجام بھی ہے لیکن یہ نبوتِ محمدیہ اپنی ذاتی فیض رسانی سے قاصر نہیں بلکہ سب نبوتوں سے زیادہ اُس میں فیض ہے۔ اس نبوت کی پیروی خدا تک بہت سہل طریق سے پہنچا دیتی ہے اور اس کی پیروی سے خدا تعالیٰ کی محبت اور اس کے مکالمہ مخاطبہ کا اس سے بڑھ کر انعام مل سکتا ہے جو پہلے ملتا تھا مگر اس کا کامل پیرو صرف نبی نہیں کہلا سکتا کیونکہ نبوتِ کاملہ تامہ محمدیہ کی اس میں ہتک ہے ہاں اُمتی اور نبی دونوں لفظ اجتماعی حالت میں اُس پر صادق آسکتے ہیں کیونکہ اس میں نبوتِ تامہ کاملہ محمدیہ کی ہتک نہیں بلکہ اس نبوت کی چمک اس فیضان سے زیادہ تر ظاہر ہوتی ہے اور جبکہ وہ مکالمہ مخاطبہ اپنی کیفیت اور کمیت کی رُو سے کمال درجہ تک پہنچ جائے اور اس میں کوئی کثافت اور کمی باقی نہ ہو اور کُھلے طور پر امورِ غیبیہ پر مشتمل ہو تو وہی دوسرے لفظوں میں نبوت کے نام سے موسوم ہوتا ہے جس پر تمام نبیوں کا اِتفاق ہے۔ پس یہ ممکن نہ تھا کہ وہ قوم جس کے لئے فرمایا گیا کہ كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ[1] اور جن کے لئے یہ دُعا سکھائی گئی کہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ○ صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ[2] اُن کے تمام افراد اس مرتبہ عالیہ سے محروم رہتے اور کوئی ایک فرد بھی اس مرتبہ کو نہ پاتا اور ایسی صورت میں صرف یہی خرابی نہیں تھی کہ اُمتِ محمدیہ ناقص اور ناتمام رہتی اور سب کے سب اندھوں کی طرح رہتے بلکہ یہ بھی نقص تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قوتِ فیضان پر داغ لگتا تھا اور آپ کی قوتِ قدسیہ ناقص ٹھہرتی تھی اور ساتھ اس کے وہ دُعا جس کا پانچ وقت نماز میں پڑھنا

---

[1] سُورۃ آلِ عمران : ۱۱۱ [2] سُورۃ الفاتحہ : ۶، ۷

تعلیم کیا گیا تھا اس کا سکھلانا بھی عبث ٹھہرتا تھا مگر اس کے دوسری طرف یہ خرابی بھی تھی کہ اگر یہ کمال کسی فردِ اُمت کو براہِ راست بغیر پیروی نورِ نبوتِ محمدیہ کے مل سکتا تو ختمِ نبوت کے معنے باطل ہوتے تھے۔ پس ان دونوں خرابیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے خدا تعالیٰ نے مکالمہ مخاطبہ کاملہ تامہ مطہرہ مقدسہ کا شرف ایسے بعض افراد کو عطا کیا جو فنا فی الرسول کی حالت تک اتم درجہ تک پہنچ گئے اور کوئی حجاب درمیان نہ رہا اور اُمتی ہونے کا مفہوم اور پیروی کے معنے اتم اور اکمل درجہ پر ان میں پائے گئے۔ ایسے طور پر کہ ان کا وجود اپنا وجود نہ رہا بلکہ ان کے محویت کے آئینہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود منعکس ہوگیا اور دوسری طرف اتم اور اکمل طور پر مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ نبیوں کی طرح ان کو نصیب ہوا۔ (رسالہ الوصیت صفحہ ۱۱، ۱۲)

یہ خوب یاد رکھنا چاہیئے کہ نبوتِ تشریعی کا دروازہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بالکل مسدود ہے اور قرآن مجید کے بعد اَور کوئی کتاب نہیں جو نئے احکام سکھائے یا قرآن شریف کا حکم منسوخ کرے یا اس کی پیروی معطل کرے بلکہ اس کا عمل قیامت تک ہے۔ (رسالہ الوصیت صفحہ ۱۱ حاشیہ)

زبانِ عرب میں لٰکِنْ کا لفظ استدراک کے لئے آتا ہے یعنی جو امر حاصل نہیں ہو سکا۔ اس کے حصول کی دوسرے پیرایہ میں خبر دیتا ہے جس کے رُو سے اِس آیت کے یہ معنے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جسمانی نرینہ اَولاد کوئی نہیں تھی مگر رُوحانی طور پر آپ کی اَولاد بہت ہوگی اور آپ نبیوں کے لئے مُہر ٹھہرائے گئے ہیں یعنی آئندہ کوئی نبوت کا کمال بجز آپ کی پیروی کی مُہر کے کسی کو حاصل نہیں ہوگا۔ غرض اِس آیت کے یہ معنے تھے جن کو اُلٹا کر نبوت کے آئندہ فیض سے انکار کر دیا گیا حالانکہ اس انکار میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سراسر مذمت اور منقصت ہے کیونکہ نبی کا کمال یہ ہے کہ وہ دوسرے شخص کو ظلّی طور پر نبوت کے کمالات سے متمتع کر دے اور رُوحانی اُمور میں اس کی پوری پرورش کر کے دکھلا دے۔ اس پرورش کی غرض سے نبی آتے ہیں اور ماں کی طرح حق کے طالبوں کو گود میں لے کر خداشناسی کا دُودھ پلاتے ہیں پس اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ دُودھ نہیں تھا تو نعوذ باللہ آپ کی نبوت ثابت نہیں ہو سکتی مگر خدا تعالیٰ نے تو قرآن شریف میں آپ کا نام سراج منیر رکھا ہے جو دوسروں کو روشن کرتا ہے اور اپنی روشنی کا اثر ڈال کر دوسروں کو اپنی مانند بنا دیتا ہے اور اگر نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں فیضِ رُوحانی نہیں تو پھر دُنیا میں آپ کا مبعوث ہونا ہی عبث ہوا اور دوسری طرف خدا تعالیٰ بھی دھوکہ دینے والا ٹھہرا جس نے دُعا تو یہ سکھلائی کہ تم تمام نبیوں کے کمالات طلب کرو مگر دل میں ہرگز یہ ارادہ نہیں تھا کہ یہ کمالات دیئے جائیں بلکہ یہ ارادہ تھا کہ ہمیشہ کے لئے اندھا رکھا جائے گا۔ (چشمۂ مسیحی صفحہ ۴۲، ۴۳)

اگر تمام کفار رُوئے زمین دُعا کرنے کے لئے ایک طرف کھڑے ہوں اور ایک طرف صرف میں اکیلا اپنے خدا کی جناب میں کسی امر کے لئے رجوع کروں تو خدا میری ہی تائید کرے گا مگر نہ اِس لئے کہ سب سے مَیں ہی بہتر ہوں

بلکہ اِس لئے کہ مَیں اس کے رسول پر دلی صدق سے ایمان لایا ہوں اور جانتا ہوں کہ تمام نبوتیں اس پر ختم ہیں اور اس کی شریعت خاتم شرائع ہے مگر ایک قسم کی نبوت ختم نہیں یعنی وہ نبوت جو اُس کی کامل پیروی سے ملتی ہے اور جو اس کے چراغ میں سے نور لیتی ہے وہ ختم نہیں کیونکہ وہ محمدی نبوت ہے یعنی اس کا ظل ہے اور اسی کے ذریعہ سے ہے اور اسی کا مظہر ہے اور اسی سے فیضیاب ہے۔ خدا اُس شخص کا دشمن ہے جو قرآن شریف کو منسوخ کی طرح قرار دیتا ہے اور محمدی شریعت کے برخلاف چلتا ہے اور اپنی شریعت چلانا چاہتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہیں کرتا بلکہ آپ کچھ بننا چاہتا ہے مگر خدا اس شخص سے پیار کرتا ہے جو اس کی کتاب قرآن شریف کو اپنا دستور العمل قرار دیتا ہے اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو درحقیقت خاتم الانبیاء سمجھتا ہے اور اسی کے فیض کا اپنے تئیں محتاج جانتا ہے پس ایسا شخص خدا تعالیٰ کی جناب میں پیارا ہو جاتا ہے اور خدا کا پیار یہ ہے کہ اُس کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور اُس کو اپنے مکالمہ مخاطبہ سے مشرف کرتا ہے اور اس کی حمایت میں اپنے نشان ظاہر کرتا ہے اور جب اس کی پیروی کمال کو پہنچتی ہے تو ایک ظلی نبوت اس کو عطا کرتا ہے جو نبوتِ محمدیہ کا ظل ہے۔ یہ اِس لئے کہ تا اِسلام ایسے لوگوں کے وجود سے تازہ رہے اور تا اِسلام ہمیشہ مخالفوں پر غالب رہے۔ نادان آدمی جو در اصل دشمنِ دین ہے اِس بات کو نہیں چاہتا کہ اِسلام میں سلسلہ مکالمات مخاطباتِ الٰہیہ کا جاری رہے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اسلام بھی اَور مُردہ مذہبوں کی طرح ایک مُردہ مذہب ہو جائے مگر خدا نہیں چاہتا۔ نبوت اور رسالت کا لفظ خدا تعالیٰ نے اپنی وحی میں میری نسبت صدہا مرتبہ استعمال کیا ہے مگر اس لفظ سے صرف وہ مکالمات مخاطباتِ الٰہیہ مراد ہیں جو بکثرت ہیں اور غیب پر مشتمل ہیں اس سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ ہر ایک شخص اپنی گفتگو میں ایک اِصطلاح اختیار کر سکتا ہے لِکُلٍّ اَنْ یَّصْطَلِحَ سو خدا کی یہ اِصطلاح ہے جو کثرت مکالمات و مخاطبات کا نام اس نے نبوت رکھا ہے یعنی ایسے مکالمات جن میں اکثر غیب کی خبریں دی گئی ہیں اور لعنت ہے اُس شخص پر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض سے علیحدہ ہو کر نبوت کا دعویٰ کرے مگر یہ نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ہے نہ کوئی نئی نبوت اور اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ اِسلام کی حقانیت دُنیا پر ظاہر کی جائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی دکھلائی جائے۔

(چشمہء معرفت صفحہ ۳۲۴، ۳۲۵)

ہم بارہا لکھ چکے ہیں کہ حقیقی اور واقعی طور پر تو یہ امر ہے کہ ہمارے سید و مولیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور آنجناب کے بعد مستقل طور پر کوئی نبوت نہیں اور نہ کوئی شریعت ہے اور اگر کوئی ایسا دعویٰ کرے تو بلاشبہ وہ بے دین اور مردود ہے لیکن خدا تعالیٰ نے اِبتداء سے ارادہ کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالاتِ متعدیہ کے اظہار اور اثبات کے لئے کسی شخص کو آنجناب کی پیروی اور متابعت کی وجہ سے وہ مرتبہ کثرت مکالمات اور مخاطباتِ الٰہیہ بخشے کہ جو اس کے وجود میں عکسی طور پر نبوت کا رنگ پیدا کر دے۔ سو اِس طور سے خدا نے میرا نام نبی رکھا یعنی نبوتِ

محمدیہ میرے آئینۂ نفس میں منعکس ہو گئی اور ظلی طور پر مجھے یہ نام دیا گیا تا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض کا کامل نمونہ ٹھہروں۔ (چشمۂ معرفت صفحہ ۳۲۴ حاشیہ)

نبی کے لفظ سے اس زمانہ کے لئے صرف خدا تعالیٰ کی یہ مراد ہے کہ کوئی شخص کامل طور پر شرفِ مکالمہ اور مخاطبہ الٰہیہ حاصل کرے اور تجدید دین کے لئے مامور ہو یہ نہیں کہ وہ کوئی دوسری چیز لاوے کیونکہ شریعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی پر نبی کے لفظ کا اطلاق بھی جائز نہیں جب تک اس کو اُمتی بھی نہ کہا جائے جس کے یہ معنی ہیں کہ ہر ایک انعام اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے پایا نہ براہِ راست۔

(تجلیاتِ الٰہیہ صفحہ ۹ حاشیہ)

اب بجز محمدی نبوت کے سب نبوتیں بند ہیں شریعت والا نبی کوئی نہیں آسکتا اور بغیر شریعت کے نبی ہو سکتا ہے مگر وہی جو پہلے اُمتی ہو پس اسی بناء پر میں اُمتی بھی ہوں اور نبی بھی۔ اور میری نبوت یعنی مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ایک ظِل ہے اور بجز اس کے میری نبوت کچھ بھی نہیں وہی نبوتِ محمدیہ ہے جو مجھ میں ظاہر ہوئی ہے اور چونکہ میں محض ظِل ہوں اور اُمتی ہوں اس لئے آنجناب کی اس سے کچھ کسرِ شان نہیں اور یہ مکالمہ الٰہیہ جو مجھ سے ہوتا ہے یقینی ہے۔ اگر میں ایک دم کے لئے بھی اس میں شک کروں تو کافر ہو جاؤں اور میری آخرت تباہ ہو جائے وہ کلام جو میرے پر نازل ہوا یقینی اور قطعی ہے اور جیسا کہ آفتاب اور اس کی روشنی کو دیکھ کر کوئی شک نہیں کر سکتا کہ یہ آفتاب اور یہ اس کی روشنی ہے ایسا ہی میں اس کلام میں بھی شک نہیں کر سکتا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے پر نازل ہوتا ہے اور میں اس پر ایسا ہی ایمان لاتا ہوں جیسا کہ خدا کی کتاب پر۔ یہ تو ممکن ہے کہ کلامِ الٰہی کے معنے کرنے میں بعض مواقع میں ایک وقت تک مجھ سے خطا ہو جائے مگر یہ ممکن نہیں کہ میں شک کروں کہ وہ خدا کا کلام نہیں۔ اور چونکہ میرے نزدیک نبی اُسی کو کہتے ہیں جس پر خدا کا کلام یقینی و قطعی بکثرت نازل ہو جو غیب پر مشتمل ہو اِسی لئے خدا نے میرا نام نبی رکھا مگر بغیر شریعت کے۔ شریعت کا حامل قیامت تک قرآن شریف ہے۔ (تجلیاتِ الٰہیہ صفحہ ۲۰)

وَإِنْ قَالَ قَائِلٌ كَيْفَ يَكُونُ نَبِيٌّ مِنْ هٰذِهِ الْأُمَّةِ وَقَدْ خَتَمَ اللّٰهُ عَلَى النُّبُوَّةِ فَالْجَوَابُ أَنَّهُ عَزَّ وَجَلَّ مَا سَمَّى هٰذَا الرَّجُلَ نَبِيًّا إِلَّا لِإِثْبَاتِ كَمَالِ نُبُوَّةِ سَيِّدِنَا خَيْرِ الْبَرِيَّةِ فَإِنَّ ثُبُوتَ كَمَالِ النَّبِيِّ لَا يَتَحَقَّقُ إِلَّا بِثُبُوتِ كَمَالِ الْأُمَّةِ وَمِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ ادِّعَاءٌ مَحْضٌ لَا دَلِيْلَ عَلَيْهِ عِنْدَ أَهْلِ الْفِطْنَةِ وَلَا

ترجمہ از مرتب:۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اس اُمت میں نبی کیسے آسکتا ہے جب کہ اللہ نے نبوت پر مُہر لگا دی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ عزّ وجلّ نے آنے والے موعود کا نام نبی ہمارے آقا خیر البشر کی نبوت کے کمال کو ثابت کرنے کے لئے رکھا ہے کیونکہ آپ کا کمال اُمت کے کمال کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوا کمال کا دعویٰ محض دعویٰ ہی ہے جس پر عقلمندوں کے نزدیک کوئی دلیل نہیں

مَعْنٰی بِخَتْمِ النُّبُوَّةِ عَلٰی فَرْدٍ مِنْ غَیْرِ اَنْ تُخْتَمَ کَمَالَاتُ النُّبُوَّةِ عَلٰی ذٰلِکَ الْفَرْدِ وَمِنَ الْکَمَالَاتِ الْعُظْمٰی کَمَالُ النَّبِیِّ فِی الْاِفَاضَةِ وَھُوَ لَا یَثْبُتُ مِنْ غَیْرِ نَمُوْذَجٍ یُوْجَدُ فِی الْاُمَّةِ ثُمَّ مَعَ ذٰلِکَ ذَکَرْتُ غَیْرَ مَرَّةٍ اَنَّ اللّٰہَ مَا اَرَادَ مِنْ نُبُوَّتِیْ اِلَّا کَثْرَةَ الْمُکَالَمَةِ وَالْمُخَاطَبَةِ وَھُوَ مُسَلَّمٌ عِنْدَ اَکَابِرِ اَھْلِ السُّنَّةِ فَالنِّزَاعُ لَیْسَ اِلَّا نِزَاعًا لَفْظِیًّا فَلَا تَسْتَعْجِلُوْا یَا اَھْلَ الْعَقْلِ وَالْفِطْنَةِ وَلَعْنَةُ اللّٰہِ عَلٰی مَنِ ادَّعٰی خِلَافَ ذٰلِکَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَمَعَھَا لَعْنَةُ النَّاسِ وَالْمَلٰٓئِکَةِ۔ (الاستفتاء صفحہ ۱۶ حاشیہ ضمیمہ حقیقۃ الوحی)

وَالنُّبُوَّةُ قَدِ انْقَطَعَتْ بَعْدَ نَبِیِّنَا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَلَا کِتَابَ بَعْدَ الْفُرْقَانِ الَّذِیْ ھُوَ خَیْرُ الصُّحُفِ السَّابِقَةِ وَلَا شَرِیْعَةَ بَعْدَ الشَّرِیْعَةِ الْمُحَمَّدِیَّةِ بَیْدَ اَنِّیْ سُمِّیْتُ نَبِیًّا عَلٰی لِسَانِ خَیْرِ الْبَرِیَّةِ وَذٰلِکَ اَمْرٌ ظِلِّیٌّ مِنْ بَرَکَاتِ الْمُتَابَعَةِ وَمَا اَرٰی فِیْ نَفْسِیْ خَیْرًا وَوَجَدْتُ کُلَّ مَا وَجَدْتُ مِنْ ھٰذِہِ النَّفْسِ الْمُقَدَّسَةِ وَمَا عَنَی اللّٰہُ مِنْ نُبُوَّتِیْ اِلَّا کَثْرَةَ الْمُکَالَمَةِ وَالْمُخَاطَبَةِ وَلَعْنَةُ اللّٰہِ عَلٰی مَنْ اَرَادَ فَوْقَ ذٰلِکَ اَوْ حَسِبَ نَفْسَہٗ شَیْئًا اَوْ اَخْرَجَ عُنُقَہٗ مِنَ الرِّبْقَةِ النَّبَوِیَّةِ وَاِنَّ رَسُوْلَنَا خَاتَمُ النَّبِیِّیْنَ عَلَیْہِ انْقَطَعَتْ سِلْسِلَةُ الْمُرْسَلِیْنَ فَلَیْسَ حَقُّ اَحَدٍ اَنْ یَدَّعِیَ النُّبُوَّةَ بَعْدَ رَسُوْلِنَا الْمُصْطَفٰی عَلٰی

اور کسی فرد پر نبوت کے ختم ہونے کے معنے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتے کہ اس پر کمالاتِ نبوت ختم ہو گئے ہیں اور بڑے بڑے کمالات میں سے نبی کا بڑا کمال اس کی قوتِ افاضہ ہے جو اُمّت میں پائے جانے والے نمونہ کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتی۔ اس کے ساتھ ہی مَیں نے کئی دفعہ اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک میری نبوت سے مراد صرف کثرتِ مکالمہ مخاطبہ ہے اور یہ بات اکابر اہلِ سُنّت کے نزدیک بھی مسلّم ہے پس نزاع صرف لفظی ہی ہے۔ اے اربابِ عقل و خرد! جلد بازی سے کام نہ لو۔ اگر کوئی شخص اس کے خلاف کچھ بھی دعویٰ کرے تو اس پر خدا تعالیٰ کی لعنت ہے اور اسی طرح خدا تعالیٰ کی لعنت کے ساتھ ہی فرشتوں اور سب لوگوں کی بھی لعنت ہے۔ (الاستفتاء صفحہ ۱۶ حاشیہ)

ترجمہ از مرتب:۔ نبوت ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گئی اور قرآن کریم کے سوا ہماری کوئی کتاب نہیں۔ جو سب سابقہ کتب میں سے بہتر ہے اور شریعتِ محمدیہ کے سوا ہماری کوئی شریعت نہیں۔ ہاں بے شک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے میرا نام نبی رکھا گیا ہے اور یہ آپ کی کامل پیروی کی برکات میں سے ایک ظلّی امر ہے۔ مَیں اپنے نفس میں کوئی خوبی نہیں پاتا اور جو کچھ بھی مَیں نے پایا ہے وہ اس مقدس ذات سے پایا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک میری نبوت سے مراد صرف کثرتِ مکالمہ و مخاطبہ ہے اور جو اس سے زیادہ کا دعویٰ کرے یا اپنے نفس کو کچھ اہمیت دے یا اپنی گردن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوئے سے نکال دے اس پر خدا کی لعنت ہے اور ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النّبیین ہیں اور ان پر رسولوں کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے اور کسی کے لئے یہ جائز نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوتِ مستقلہ کا دعویٰ کرے

الطَّرِيْقَةِ الْمُسْتَقِلَّةِ وَمَا بَقِيَ بَعْدَهُ اِلَّا كَثْرَةُ الْمُكَالَمَةِ وَهُوَ بِشَرْطِ الْاِتِّبَاعِ لَا بِغَيْرِ مُتَابَعَةِ خَيْرِ الْبَرِيَّةِ. وَ وَاللّٰهِ مَا حَصَلَ لِيْ هٰذَا الْمَقَامُ اِلَّا مِنْ اَنْوَارِ اِتِّبَاعِ الْاَشِعَّةِ الْمُصْطَفَوِيَّةِ. وَسُمِّيْتُ نَبِيًّا مِّنَ اللّٰهِ عَلٰى طَرِيْقِ الْمَجَازِ لَا عَلٰى وَجْهِ الْحَقِيْقَةِ. فَلَا تَهِيْجُ هٰهُنَا غَيْرَةُ اللّٰهِ وَلَا غَيْرَةُ رَسُوْلِهٖ فَاِنِّيْ اُرَبّٰى تَحْتَ جَنَاحِ النَّبِيِّ وَقَدَمِيْ هٰذِهٖ تَحْتَ الْاَقْدَامِ النَّبَوِيَّةِ ثُمَّ مَا قُلْتُ مِنْ نَفْسِيْ شَيْئًا بَلِ اتَّبَعْتُ مَا اُوْحِيَ اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ وَمَا اَخَافُ بَعْدَ ذٰلِكَ تَهْدِيْدَ الْخَلِيْقَةِ. وَكُلُّ اَحَدٍ يُسْئَلُ عَنْ عَمَلِهٖ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ خَافِيَةٌ۔ (الاستفتاء صفحہ ۶۴، ۶۵ ضمیمہ حقیقۃ الوحی)

نبی کے معنے صرف یہ ہیں کہ خدا سے بذریعہ وحی خبر پانے والا ہو اور شرفِ مکالمہ اور مخاطبہ الٰہیہ سے مشرف ہو۔ شریعت کا لانا اس کے لئے ضروری نہیں اور نہ یہ ضروری ہے کہ صاحب شریعت رسول کا متبع نہ ہو پس ایک اُمتی کو ایسا نبی قرار دینے سے کوئی محذور لازم نہیں آتا بالخصوص اس حالت میں کہ وہ اُمتی اپنے اس نبی متبوع سے فیض پانے والا ہو بلکہ فساد اس حالت میں لازم آتا ہے کہ اس اُمت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قیامت تک مکالماتِ الٰہیہ سے بے نصیب قرار دیا جائے۔ وہ دین دین نہیں ہے اور نہ وہ نبی نبی ہے جس کی متابعت سے انسان خدا تعالیٰ سے اس قدر نزدیک نہیں ہو سکتا کہ مکالماتِ الٰہیہ سے مشرف ہو سکے۔ (ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۳۸)

کوئی شخص اس جگہ نبی ہونے کے لفظ سے دھوکا نہ کھاوے میں بار بار لکھ چکا ہوں کہ یہ وہ نبوت نہیں ہے جو ایک مستقل نبوت کہلاتی ہے۔ کوئی مستقل نبی اُمتی نہیں کہلا سکتا مگر میں اُمتی ہوں پس یہ صرف خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک اعزازی نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے حاصل ہوا تا حضرت عیسیٰ سے تکمیل مشابہت ہو۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۸۸ حاشیہ)

میں مفصلہ ذیل امور کا مسلمانوں کے سامنے صاف صاف اقرار اس خانۂ خدا مسجد میں کرتا ہوں کہ میں جناب خاتم الانبیاء

اب صرف کثرتِ مکالمہ باقی ہے اور وہ بھی اتباعِ نبویؐ کے ساتھ مشروط ہے اس کے سوا نہیں۔ اور اللہ کی قسم! مجھے یہ مقام محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار کی شعاعوں کی پیروی سے ہی ملا ہے اور اللہ تعالیٰ نے میرا نام مجازی طور پر نبی رکھا ہے نہ کہ حقیقی طور پر۔ پس یہاں اللہ تعالیٰ کی غیرت یا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غیرت کے بھڑکنے کا کوئی مقام نہیں کیونکہ میری تربیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پَروں کے نیچے ہوئی ہے اور میرا قدم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقوشِ قدم کی متابعت میں ہے اور میں نے کوئی بات اپنے پاس سے نہیں کہی بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو میری طرف وحی کی اس کی پیروی کی ہے اور اس کے بعد میں مخلوق کی دھمکیوں سے نہیں ڈرتا اور قیامت کے دن ہر شخص اپنے عمل کے متعلق جواب دِہ ہوگا اور اللہ پر کوئی بات پوشیدہ نہیں۔ (الاستفتاء صفحہ ۶۴، ۶۵)

صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا قائل ہوں اور جو شخص ختم نبوت کا منکر ہو اس کو بے دین اور دائرۂ اسلام سے خارج سمجھتا ہوں۔ ایسا ہی میں ملائکہ اور معجزات اور لیلۃ القدر وغیرہ کا قائل ہوں۔

(تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دوم صفحہ ۴۴)

یہ الزام جو میرے ذمہ لگایا جاتا ہے کہ گویا میں ایسی نبوت کا دعویٰ کرتا ہوں جس سے مجھے اسلام سے کچھ تعلق باقی نہیں رہتا اور جس کے یہ معنی ہیں کہ میں مستقل طور پر اپنے تئیں ایسا نبی سمجھتا ہوں کہ قرآن شریف کی پیروی کی کچھ حاجت نہیں رکھتا اور اپنا علیحدہ کلمہ اور علیحدہ قبلہ بناتا ہوں اور شریعتِ اسلام کو منسوخ کی طرح قرار دیتا ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقتداء اور متابعت سے باہر جاتا ہوں یہ الزام صحیح نہیں ہے بلکہ ایسا دعویٰ نبوت کا میرے نزدیک کفر ہے اور نہ آج سے بلکہ اپنی ہر ایک کتاب میں ہمیشہ میں یہی لکھتا آیا ہوں کہ اس قسم کی نبوت کا مجھے کوئی دعویٰ نہیں اور یہ سراسر میرے پر تہمت ہے اور جس بناء پر میں اپنے تئیں نبی کہلاتا ہوں وہ صرف اس قدر ہے کہ میں خدا تعالیٰ کی ہمکلامی سے مشرف ہوں اور وہ میرے ساتھ بکثرت بولتا اور کلام کرتا ہے اور میری باتوں کا جواب دیتا ہے اور بہت سی غیب کی باتیں میرے پر ظاہر کرتا اور آئندہ زمانوں کے وہ راز میرے پر کھولتا ہے کہ جب تک انسان کو اس کے ساتھ خصوصیت کا قرب نہ ہو دوسرے پر وہ اسرار نہیں کھولتا اور انہیں امور کی کثرت کی وجہ سے اس نے میرا نام نبی رکھا ہے سو میں خدا کے حکم کے موافق نبی ہوں اور اگر میں اس سے انکار کروں تو میرا گناہ ہوگا اور جس حالت میں خدا میرا نام نبی رکھتا ہے تو میں کیونکر اس سے انکار کر سکتا ہوں میں اس پر قائم ہوں اس وقت تک جو اس دنیا سے گذر جاؤں مگر میں ان معنوں سے نبی نہیں ہوں کہ گویا میں اسلام سے اپنے تئیں الگ کرتا ہوں یا اسلام کا کوئی حکم منسوخ کرتا ہوں میری گردن اس جوئے کے نیچے ہے جو قرآن شریف نے پیش کیا اور کسی کو مجال نہیں کہ ایک نقطہ یا ایک شوشہ قرآن شریف کا منسوخ کر سکے۔ سو میں صرف اس وجہ سے نبی کہلاتا ہوں کہ عربی اور عبرانی زبان میں نبی کے یہ معنے ہیں کہ خدا سے الہام پا کر بکثرت پیشگوئی کرنے والا، اور بغیر کثرت کے یہ معنی تحقیق نہیں ہو سکتے جیسا کہ صرف ایک پیسہ سے کوئی مالدار نہیں کہلا سکتا۔ سو خدا نے اپنے کلام کے ذریعہ سے بکثرت مجھے علم غیب عطا کیا ہے اور ہزارہا نشان میرے ہاتھ پر ظاہر کئے ہیں اور کر رہا ہے میں خود ستائی سے نہیں مگر خدا کے فضل اور اس کے وعدہ کی بناء پر کہتا ہوں کہ اگر تمام دنیا ایک طرف ہو اور ایک طرف صرف میں کھڑا کیا جاؤں اور کوئی ایسا امر پیش کیا جائے جس سے خدا کے بندے آزمائے جاتے ہیں تو مجھے اس مقابلہ میں خدا غلبہ دے گا اور ہر ایک پہلو کے مقابلہ میں خدا میرے ساتھ ہوگا اور ہر ایک میدان میں وہ مجھے فتح دے گا پس اس بناء پر خدا نے میرا نام نبی رکھا ہے کہ اس زمانہ میں کثرت مکالمہ مخاطبہ الٰہیہ اور کثرت اطلاع بر علوم غیب صرف مجھے ہی عطا کی گئی ہے اور جس حالت میں عام طور پر لوگوں کو خوابیں بھی آتی ہیں اور بعض کو الہام بھی ہوتا

ہے اور کسی قدر ملونی کے ساتھ علمِ غیب سے بھی اطلاع دی جاتی ہے مگر وہ الہام مقدار میں نہایت قلیل ہوتا ہے اور اخبارِ غیبیہ بھی اس میں نہایت کم ہوتی ہیں اور باوجود کمی کے مشتبہ اور مکدر اور خیالاتِ نفسانی سے آلودہ ہوتے ہیں تو اس صورت میں عقلِ سلیم خود چاہتی ہے کہ جس کی وحی اور علمِ غیب اس کدورت اور نقصان سے پاک ہو اس کو دوسرے معمولی انسانوں کے ساتھ نہ ملایا جائے بلکہ اس کو کسی خاص نام کے ساتھ پکارا جائے تاکہ اس میں اور اس کے غیر میں امتیاز ہو۔ اِس لئے محض مجھے اِمتیازی مرتبہ بخشنے کے لئے خدا نے میرا نام نبی رکھ دیا اور یہ مجھے ایک عزت کا خطاب دیا گیا ہے تاکہ ان میں اور مجھ میں فرق ظاہر ہو جائے۔ اِن معنوں سے مَیں نبی بھی ہوں اور اُمتی بھی تاکہ ہمارے سیّد و آقا کی وہ پیشگوئی پوری ہو کہ آنے والا مسیح اُمتی بھی ہوگا اور نبی بھی ہوگا ورنہ حضرت عیسیٰؑ جن کے دوبارہ آنے کے بارے میں ایک جھوٹی امید اور جھوٹی طمع لوگوں کو دامنگیر ہے وہ اُمتی کیونکر بن سکتے ہیں۔ کیا آسمان سے اُتر کر نئے سرے وہ مسلمان ہوں گے اور کیا اس وقت ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء نہیں رہیں گے۔ (تبلیغِ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد دہم صفحہ ۱۳۲ تا ۱۳۴)

قرآن کے وقت استعدادیں معقولیت کا رنگ پکڑ گئی تھیں اور توریت کے وقت وحشیانہ حالت تھی۔ آدم سے لے کر زمانہ ترقی کرتا گیا تھا اور قرآن کے وقت دائرہ کی طرح پُورا ہو گیا۔ حدیث میں ہے زمانہ مستدیر ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ ضرورتیں نبوت کا انجن ہیں ظلماتی راتیں اُس نور کو کھینچتی ہیں جو دُنیا کو تاریکی سے نجات دے اُس ضرورت کے موافق نبوت کا سلسلہ شروع ہوا اور جب قرآن کے زمانہ تک پہنچا تو مکمل ہو گیا۔ اب سب ضرورتیں پوری ہو گئیں۔ اِس سے لازم آیا کہ آپ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء تھے۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۸۷)

مَیں یہ بات اپنے سچے جوش اور اخلاص سے کہتا ہوں کہ میرا ایمان یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی نشانِ نبوت کو رَسولی وغیرہ الفاظ سے نسبت دینا ایک مومن اور سچے مسلمان کا کام نہیں۔ یہ گستاخی اور شوخی ہے جو کفر کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ ہم کو ایسے معاملات میں زیادہ تفتیش اور چھان بین کی ضرورت نہیں کہ وہ مُہرِ نبوت کیا تھی؟ اور کیسی تھی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق میں اللہ تعالیٰ نے بیشمار نشانات بیّن اور واضح طور پر رکھے تھے اُن میں سے ایک مُہرِ نبوت بھی تھی۔

دراصل بات یہ ہے کہ چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود سے انبیاء علیہم السّلام کو ایسی ہی نسبت ہے جیسی کہ ہلال کو بدر سے ہوتی ہے۔ ہلال کا وجود ایک تاریکی میں ہوتا ہے لیکن جب وہ اپنے کمال کو پہنچ کر بدر بن جاتا ہے تو وہ بدر اپنی پہلی حالت ہلال کا مُثبت اور مصدق ہو جاتا ہے پس یقیناً سمجھو کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ آتے تو پہلے نبی اور ان کی نبوتوں کے پہلو مخفی رہتے۔ (الحکم جلد ۳ نمبر ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۸۹۹ء صفحہ ۷)

ختمِ نبوت کو یُوں سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں تک دلائل اور معرفت طبعی طور پر ختم ہو جاتے ہیں وہ وہی حد ہے جس کو ختمِ نبوت کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ملحدوں کی طرح نکتہ چینی کرنا بے ایمانوں کا کام ہے۔ ہر بات میں بیّنات ہوتے ہیں اور اُن کا سمجھنا معرفتِ کاملہ اور نورِ بصر پر موقوف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے ایمان اور عرفان کی تکمیل ہوئی۔ دوسری قوموں کو روشنی پہنچی کسی اَور قوم کو بیّن اور روشن شریعت نہیں ملی اگر ملتی تو کیا وہ عرب پر اپنا کچھ بھی اثر نہ ڈال سکتی۔ عرب سے وہ آفتاب نکلا کہ اس نے ہر قوم کو روشن کیا اور ہر بستی پر اپنا نور ڈالا۔ یہ قرآن کریم ہی کو فخر حاصل ہے کہ وہ توحید اور نبوت کے مسئلہ میں کُل دُنیا کے مذاہب پر فتحیاب ہو سکتا ہے۔ یہ فخر کا مقام ہے کہ ایسی کتاب مسلمانوں کو ملی ہے۔ جو لوگ حملہ کرتے ہیں اور تعلیم و ہدایتِ اسلام پر معترض ہوتے ہیں وہ بالکل کور باطنی اور بے ایمانی سے بولتے ہیں۔

(الحکم جلد ۳ ملا مورخہ ۱۰ جنوری ۱۸۹۹ء صفحہ ۸)

خاتم النبییّن کے بڑے معنے یہی ہیں کہ نبوت کے امور کو آدم علیہ السلام سے لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کیا۔ یہ موٹے اور ظاہر معنے ہیں۔ دوسرے یہ معنے ہیں کہ کمالاتِ نبوت کا دائرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا۔ یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ قرآن نے ناقص باتوں کا کمال کیا اور نبوت ختم ہو گئی اِس لئے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ[1] کا مصداق اسلام ہو گیا۔ غرض یہ نشاناتِ نبوت ہیں ان کی کیفیت اور کُنہ پر بحث کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اصول صاف اور روشن ہیں اور وہ ثابت شدہ صداقتیں کہلاتی ہیں۔ ان باتوں میں پڑنا مومن کو ضروری نہیں ایمان لانا ضروری ہے اگر کوئی مخالف اعتراض کرے تو ہم اس کو روک سکتے ہیں۔ اگر وہ بند نہ ہو تو ہم اس کو کہہ سکتے ہیں کہ پہلے اپنے جزوی مسائل کا ثبوت دے۔ الغرض مُہرِ نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نشانِ نبوت میں سے ایک نشان ہے جس پر ایمان لانا ہر مسلمان مومن کو ضروری ہے۔ (الحکم جلد ۳ ملا مورخہ ۱۰ جنوری ۱۸۹۹ء صفحہ ۸، ۹)

ہمیں اللہ تعالیٰ نے وہ نبی دیا جو خاتم المؤمنین، خاتم العارفین اور خاتم النبییّن ہے اور اسی طرح پر وہ کتاب اُس پر نازل کی جو جامع الکتب اور خاتم الکتب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو خاتم النبییّن ہیں اور آپ پر نبوت ختم ہو گئی۔ تو یہ نبوت اسی طرح پر ختم نہیں ہوئی جیسے کوئی گلا گھونٹ کر ختم کر دے۔ ایسا ختم قابلِ فخر نہیں ہوتا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ختم ہونے سے یہ مراد ہے کہ طبعی طور پر آپ پر کمالاتِ نبوت ختم ہو گئے یعنی وہ تمام کمالاتِ متفرقہ جو آدم سے لے کر مسیح ابنِ مریم تک نبیوں کو دئے گئے تھے کسی کو کوئی اور کسی کو کوئی۔ وہ سب کے سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع کر دئے گئے اور اس طرح پر طبعاً آپ خاتم النبییّن

---

[1] سورۃ المائدۃ: ۴

ٹھہرے اور ایسا ہی وہ جمیع تعلیمات وصایا اور معارف جو مختلف کتابوں میں چلے آتے ہیں وہ قرآن شریف پر آکر ختم ہو گئے اور قرآن شریف خاتم الکتب ٹھہرا۔

اِس جگہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مجھ پر اور میری جماعت پر جو یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین نہیں مانتے یہ ہم پر اِفترائے عظیم ہے۔ ہم جس قوت یقین، معرفت اور بصیرت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء مانتے اور یقین کرتے ہیں اس کا لاکھواں حصہ بھی دوسرے لوگ نہیں مانتے اور اُن کا ایسا ظرف ہی نہیں ہے۔ وہ اس حقیقت اور راز کو جو خاتم الانبیاء کی ختم نبوت میں ہے، سمجھتے ہی نہیں ہیں انہوں نے صرف باپ دادے سے ایک لفظ سُنا ہوا ہے مگر اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں اور نہیں جانتے کہ ختم نبوت کیا ہوتا ہے اور اس پر ایمان لانے کا مفہوم کیا ہے؟ مگر ہم بصیرت تام سے (جس کو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء یقین کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ نے ہم پر ختم نبوت کی حقیقت کو ایسے طور پر کھول دیا ہے کہ اس عرفان کے شربت سے جو ہمیں پلایا گیا ہے ایک خاص لذّت پاتے ہیں جس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا بجز اُن لوگوں کے جو اس چشمہ سے سیراب ہوں۔

دُنیا کی مثالوں میں سے ہم ختم نبوت کی مثال اِس طرح پر دے سکتے ہیں کہ جیسے چاند ہلال سے شروع ہوتا ہے اور چودھویں تاریخ پر آکر اُس کا کمال ہو جاتا ہے جبکہ اُسے بدر کہا جاتا ہے اسی طرح پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آ کر کمالاتِ نبوت ختم ہو گئے۔ جو لوگ یہ مذہب رکھتے ہیں کہ نبوت زبردستی ختم ہو گئی اور آنحضرتؐ کو یونسؑ بن متّٰی پر بھی ترجیح نہیں دینی چاہیئے انہوں نے اِس حقیقت کو سمجھا ہی نہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل اور کمالات کا کوئی علم ہی اُن کو نہیں ہے باوجود اس کمزوریٔ فہم اور کمیٔ علم کے ہم کو کہتے ہیں کہ ہم ختم نبوت کے منکر ہیں مَیں ایسے مریضوں کو کیا کہوں اور اُن پر کیا افسوس کروں۔ اگر اُن کی یہ حالت نہ ہو گئی ہوتی اور وہ حقیقتِ اسلام سے بکلّی دُور نہ جا پڑے ہوتے تو پھر میرے آنے کی ضرورت کیا تھی؟ ان لوگوں کی ایمانی حالتیں بہت کمزور ہو گئی ہیں اور وہ اِسلام کے مفہوم اور مقصد سے محض ناواقف ہیں ورنہ کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اہلِ حق سے عداوت کرتے جس کا نتیجہ کافر بنا دیتا ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۹ مورخہ ۱۷ر مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کا یہ بھی ایک پہلو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے اِس اُمت میں بڑی بڑی استعدادیں رکھ دی ہیں یہاں تک کہ عُلَمَآءُ اُمَّتِی کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ بھی حدیث میں آیا ہے۔ اگرچہ محدثین کو اس پر جرح ہو مگر ہمارا نورِ قلب اِس حدیث کو صحیح قرار دیتا ہے اور ہم بغیر چون و چرا کے اِس کو تسلیم کرتے ہیں اور بذریعہ کشف بھی کسی نے اِس حدیث کا اِنکار نہیں کیا بلکہ اگر کچھ کیا ہے تو تصدیق ہی کی ہے اِس حدیث کے یہ معنے نہیں کہ میری اُمّت کے علماء ظاہری بنی اسرائیل کے نبیوں جیسے ہیں لیکن علماء کے لفظ سے دھوکہ

نہیں کھانا چاہیئے یہ لوگ الفاظ پر اَڑے ہوئے ہیں اور اُن کے معانی کی تہ تک نہیں پہنچتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ قرآن شریف کی تفسیر میں آگے نہیں چلتے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۰ مورخہ ۲۴ مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

چونکہ آپؐ کو خاتم الانبیاء ٹھہرایا تھا اِس لئے آپؐ کے وجود میں حرکات و سکنات میں بھی اعجاز رکھ دئے تھے آپؐ کی طرزِ زندگی کہ الف۔ بے تک نہیں پڑھا اور قرآن جیسی بے نظیر نعمت لائے اور ایسا عظیم الشان معجزہ اُمت کو دیا۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۰ء صفحہ ۴)

ہمارا ایمان ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کامل شریعت لے کر آئے جو نبوت کے خاتم تھے اِسلئے زمانہ کی استعدادوں اور قابلیتوں نے ختمِ نبوت کر دیا تھا پس حضور علیہ السلام کے بعد ہم کسی دوسری شریعت کے آنے کے قائل ہرگز نہیں۔ ہاں جیسے ہمارے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم مثیلِ موسیٰؑ تھے اسی طرح آپ کے سلسلہ کا خاتم جو خاتم الخلفاء یعنی مسیح موعود ہے ضروری تھا کہ مسیح علیہ السلام کی طرح آتا۔ پس مَیں وہی خاتم الخلفاء اور مسیح موعود ہوں۔ جیسے مسیح کوئی شریعت لے کر نہیں آئے تھے بلکہ شریعتِ موسوی کے احیاء کے لئے آئے تھے مَیں کوئی جدید شریعت لے کر نہیں آیا اور میرا دل ہرگز نہیں مان سکتا کہ قرآن شریف کے بعد اب کوئی اَور شریعت آ سکتی ہے کیونکہ وہ کامل شریعت اور خاتم الکتب ہے اسی طرح خدا تعالیٰ نے مجھے شریعتِ محمدی کے اِحیاء کے لئے اِس صدی میں خاتم الخلفاء کے نام سے مبعوث فرمایا ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۰ مئی ۱۹۰۱ء صفحہ ۲،۱)

کمالِ نبی کا کمالِ اُمت کو چاہتا ہے چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین تھے صلی اللہ علیہ وسلم اِسلئے آنحضرتؐ پر کمالاتِ نبوت ختم ہوئے۔ کمالاتِ نبوت ختم ہونے کے ساتھ ہی ختمِ نبوت ہوا۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۳ مورخہ ۲۴ جون ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۰، ۱۱)

لاکن اینجا برائے اِستدراک آمدہ ست چوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیچکس را پدر نیست پس ہماں اعتراض کہ بر دشمناں کردہ شدہ وگفتہ کہ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ[1] بر آنحضرت ہم لازم می آید گویا کہ خدا تعالیٰ تصدیق معترض میکند برائے ازالہ ایں وہم فرمودہ است وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ یعنی ہیچ ابدال و قطب و اولیاء بجز ختم

ترجمہ از مرتب: اِس جگہ لٰکِنْ کا لفظ اِستدراک کے لئے آیا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے باپ نہیں تو وہی اعتراض جو آپؐ کے دشمنوں پر کیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ تمہارا دشمن اَبتر رہے گا۔ یہ اعتراض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی وارد ہوتا ہے گویا کہ اللہ تعالیٰ اعتراض کرنے والے کی تصدیق کرتا ہے۔ اِس وہم کے ازالہ کے لئے فرمایا ہے وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کہ کوئی ابدال، قطب اور ولی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

[1] سورۃ الکوثر: ۴

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نخواہد شد حکام را ہمیں حالت است کہ اگر بر کاغذ مُہر سرکاری نشود صحیح نمی دانند ہر کسے را
کہ الہام و مکالمہ الٰہی میشود از مُہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم می شود و ازیں معنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمہ را پدر است
در یک معنی نفی نبوۃ میشود و در یک معنی اثبات نبوۃ میشود۔ اگر بگوئیم کہ سلسلہ افادات نبوی منقطع شدہ و اکنوں کسے
را الہام و مکالمہ و مخاطبہ الٰہی نمی شود ہمہ اسلام تباہ میشود سلسلہ ما را ایں مثال ست کہ اگر کسے در آئینہ صورت می بیند
آنچہ در شیشہ نظر می آید چیزے دیگر نیست ہماں است کہ پیش شیشہ است۔ ایں مرداں دریں آیت کریمہ غور نمی کنند و
من خوب می دانم کہ ایں ہمہ عقیدہ میدارند کہ سلسلہ مکالمات الٰہیہ منقطع شدہ است۔ کلام بمعنی وحی است در قرآن ہم ذکر
الہام نیامدہ بلکہ ذکر وحی آمدہ و قطعیت الہام و وحی یک معنی دارد و نمی پندارند کہ اگر ایں سلسلہ منقطع شود باقی از برکات
اسلام چہ می ماند۔ پس ہمیں معنی است کہ گفتم در مثالِ آئینہ و ظل کہ ظل ہمہ نقوشِ اصل در خود دارد و ظلِ نبوت ہمیں طور است
البتہ آں نبوت منقطع است کہ بلا توسل و سلسلہ رسول اللہ آید و ہر کسے کہ ازیں انکار می کند کافر میشود و از دین خارج
میشود اگر دین بدیں طور مُردہ است کدام توقع نجات باید داشت اگر انسان اندریں عالم تکمیل معرفت نکند چہ دلیل دارد
کہ در روزِ آخرۃ خواہد کرد بجز ایں صورت کہ ما پیش میکنیم دیگر صورت نیست مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي

مُہر کے بغیر نہیں ہوگا۔ دنیوی حکام کا یہی دستور ہے کہ اگر کسی کاغذ پر سرکاری مُہر نہ ہو تو وہ اسے صحیح نہیں سمجھتے۔ جس شخص
کو الہام اور مکالمہ الٰہی ہوتا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہر سے ہوتا ہے اور ان معنی کی رُو سے رسول کریم صلی اللہ
علیہ وسلم ہم سب کے باپ ہیں۔ غرض ایک معنی کے لحاظ سے نبوّت کی نفی ہو جاتی ہے اور ایک معنی کے لحاظ سے نبوّت کا
اثبات ہو جاتا ہے۔ اگر ہم کہیں کہ سلسلہ افاداتِ نبوی منقطع ہو گیا ہے اور اب کسی کو الہام اور مکالمہ و مخاطبہ الٰہی نہیں ہوتا تو
اِسلام بالکل تباہ ہو جاتا ہے۔ ہمارے سلسلہ کی یہ مثال ہے کہ اگر کوئی آئینہ میں اپنی صورت دیکھتا ہے تو اسے آئینہ میں
جو صورت نظر آتی ہے وہ کوئی دوسری صورت نہیں ہوتی بلکہ وہی ہے جو آئینہ کے سامنے ہے۔ یہ لوگ اس آیہ کریمہ میں غور نہیں
کرتے اور میں خوب جانتا ہوں کہ یہ سب یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ مکالماتِ الٰہیہ کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے۔ کلام کے معنے وحی کے
ہیں۔ قرآن کریم میں الہام کا ذکر نہیں آیا وحی کا ذکر آیا ہے اور الہام اور وحی کا اِنقطاع ایک ہی معنے رکھتا ہے اور وہ یہ نہیں
خیال کرتے کہ اگر یہ سلسلہ منقطع ہو جائے تو اسلام کی برکات میں سے باقی کیا رہ جاتا ہے پس اس کے وہی معنے ہیں جو میں نے آئینہ
اور ظل کی مثال میں بیان کئے ہیں کہ ظل اپنے اندر اصل کے تمام نقوش رکھتا ہے اور ظلِ نبوت بھی اسی طرح ہے۔ البتہ وہ نبوّت
منقطع ہے جو بلا توسل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہو اور ہر شخص جو اس کا انکار کرے وہ کافر ہو جاتا ہے اور دین سے خارج ہو
جاتا ہے۔ اگر دین اِس طرح مُردہ ہو چکا ہے تو اس کے ذریعہ نجات کی کس طرح توقع رکھی جا سکتی ہے۔ اگر انسان اِس دُنیا میں تکمیلِ
معرفت نہ کرے تو اِس بات پر کیا دلیل ہے کہ وہ آخرت کے روز یہ تکمیل کرے گا۔ بجز اس صورت کے جو ہم پیش کرتے ہیں کوئی اور صورت

الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی[1] از بسیار مقامات قرآن معلوم میشود کہ این اُمّت خیرِ اُمّت است پس کدام خیر ست کہ در اُمّتِ موسوی الہام مکالمہ وغیرہ میشد ہ در این اُمّت نمی شود و کدام مشابہت ایشان را با اُمّتِ موسوی خواہد بود۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تکمیل کنندہ این عالم اند یعنی کمال این عالم بر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ختم شدہ و این معنی ختمِ نبوت است کہ کسے دیگر نبی نمی شود حتّٰی کہ مُہرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بر نبوتِ او نشود چنانکہ مثال آں درین دنیا دیدہ بود کہ ہیچ پروانہ سرکاری تصدیق نمی شود حتّٰی کہ مُہر سرکاری برآں نبود پس ازین آیت معلوم میشود کہ اللہ تعالیٰ بطور جسمانی نفی ابوت میفرماید و بطور رُوحانی اثبات نبوت میکند بہر حال ایمان باید آورد کہ برکات و افادات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جاری است اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ[2] درین آیت معنے محبّت چیست این معنی ہرگز نیست کہ خدا ہر کسے را کہ محبت میکند درین عالم اورا کور میدارد و اگر این دوناں را عقل بودے میدانندے انسان ہماں باشد کہ طالب مغز شود نہ کہ پوست ہمہ ابدال طالب مغز شدہ اند ایمان ہمیں است کہ ایشان میخواہند کہ چشم آنہا بینا شود نہ کہ کور۔ باعث مغضوب شدن اہلِ اسلام چیست ہمیں کہ از زبان میگویند کہ ایمان آوردیم و در دل ہیچ شے نیست و ہمیں معنی این آیت است مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ

نہیں ہے مَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى۔ قرآن کریم کے بہت سے مقامات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُمّت خیرِ اُمّت ہے۔ پس یہ اُمّت خیرِ اُمّت کیسے ہوئی کہ اُمّتِ موسوی میں تو الہام اور مکالمہ کا سلسلہ جاری تھا اور اِس اُمّت میں وہ جاری نہیں اور پھر ان کی مشابہت اُمّتِ موسوی سے کیسے ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اِس عالَم کے تکمیل کنندہ ہیں یعنی اس عالَم کا کمال رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا اور ختمِ نبوت کے معنے یہ ہیں کہ کوئی اَور نبی اس وقت تک نہیں ہوگا حتّٰی کہ اس کی نبوت پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہر نہ ہو۔ چنانچہ اس کی مثال ہم دُنیا میں بھی دیکھتے ہیں کہ کسی سرکاری پروانہ کی اس وقت تک تصدیق نہیں ہوتی جب تک کہ اس پر سرکاری مُہر نہ ہو۔ پس مَا كَانَ مُحَمَّدٌ کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جسمانی اُبوّت کی نفی فرماتا ہے اور رُوحانی طور پر وہ آپ کی نبوت کو ثابت کرتا ہے۔ بہر حال اِس بات پر ایمان لانا چاہیے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے برکات اور افادات جاری ہیں اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ اِس آیت میں محبت کے کیا معنی ہیں؟ اس کے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں کہ جس شخص سے خدا محبت کرے اس عالَم میں وہ اسے اندھا رکھتا ہے۔ اگر ان دون ہمّت لوگوں کو عقل ہوتی تو وہ اِس بات کو ضرور جان لیتے کہ انسان وہی ہوتا ہے جو مغز کا طالب ہو نہ کہ پوست کا۔ تمام ابدال مغز کے طالب تھے اور ہمارا ایمان ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ ان کی آنکھ بینا ہو نہ کہ اندھی اہلِ اسلام کا مغضوب علیہم ہو جانا کیا ہے؟ یہی ہے کہ وہ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اور ان کے دل میں ایمان کا

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل : ۷۳ [2] سورۃ آلِ عمران : ۳۲

قَدْرِہٖ۔ وہمیں نابینائی کہ ذکر کردیم موجب فسق و فجور است و برائے ہمیں بینائی خداوند تعالیٰ ایں سلسلہ را قائم کردہ است کہ باز آں بینائی کہ رفتہ است پیدا شود خدا می خواہد ..... کہ ثابت کند کہ آں نبی صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ست و افادہ آں ہم زندہ است اگر ایں نبود کدام فرق در نصاریٰ و اسلام است آں مُردہ و ایں ہم مُردہ آں قصہ و حکایت است ایں ہم قصہ و حکایت است اندریں صورۃ فیصلہ چگونہ شود خدا تعالیٰ ارادہ فرماید کہ آں برکات سماویہ بنماید و اگر مردے مثل آں (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) نمی آید چگونہ بنماید ایں ہمہ کار خدا است ما بندگانیم و ہیچ اُمید فتح و شکست نداریم او خوب میداند کہ کدام شوریدہ است بہر مصلحتی کہ خواہد خواہد کرد۔

(البدر جلد ۱ ۶/۵ مورخہ ۲۸ نومبر و ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۷)

براہین میں ایسے الہامات موجود ہیں جن میں نبی یا رسول کا لفظ آیا ہے چنانچہ هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی اور جَرِیُّ اللّٰہِ فِیْ حُلَلِ الْاَنْبِیَآءِ وغیرہ۔ ان پر غور نہیں کرتے اور پھر افسوس یہ نہیں سمجھتے کہ ختمِ نبوت کی مُہر مسیح اسرائیلی کے آنے سے ٹوٹتی ہے یا خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے۔ ختمِ نبوت کا انکار وہ لوگ کرتے ہیں جو مسیح اسرائیلی کو آسمان سے اتارتے ہیں اور ہمارے نزدیک تو کوئی دوسرا آیا ہی نہیں نہ نیا نبی نہ پُرانا بلکہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی چادر دوسرے کو پہنائی گئی ہے اور وہ خود ہی آئے ہیں۔

(الحکم جلد ۵ ۴۴ مورخہ ۳۰ نومبر ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

یہ جو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو فرمایا اِنَّآ اَعْطَیْنٰكَ الْكَوْثَرَ[2] یہ اُس وقت کی بات ہے کہ ایک کافر نے کہا کہ آپؐ کی

ذرہ بھی نہیں اور یہی معنے اِس آیت کے ہیں کہ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ اور یہی نابینائی جس کا ہم نے ذکر کیا ہے موجبِ فسق و فجور ہے اور اسی بینائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے اِس سلسلہ کو قائم کیا ہے کہ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ وہ بینائی جو معدوم ہو گئی تھی اُسے دوبارہ پیدا کرے۔ خدا چاہتا ہے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور آپؐ کی قوّتِ افاضہ بھی زندہ ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو نصرانیت اور اسلام میں کیا فرق رہ جاتا۔ وہ بھی مُردہ اور یہ بھی مُردہ۔ وہ بھی قصہ کہانی اور یہ بھی قصہ کہانی۔ اِس صورت میں فیصلہ کس طرح ہو۔ خدا تعالیٰ نے ارادہ فرمایا ہے کہ وہ برکاتِ سماوی کو ظاہر کرے۔ اور اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم جیسا آدمی نہیں آتا تو ان کے برکات کو کیسے دکھائے گا۔ یہ سب کام خدا کا ہے ہم سب اس کے بندے ہیں ہمیں فتح و شکست کی کوئی امید نہیں۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کون شوریدہ سر ہے۔ وہ اپنی مصلحت کی خاطر جو چاہے گا کرے گا۔ (البدر جلد ۱ ۶/۵ مورخہ ۲۸ نومبر و ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۷)

---

[1] سورۃ الانعام: ۹۲ [2] سورۃ الکوثر: ۲

اولاد نہیں ہے معلوم نہیں اُس نے اَبتر کا لفظ بولا تھا جو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ[1] تیرا دشمن ہی بے اولاد رہے گا۔

رُوحانی طور پر جو لوگ آئیں گے وہ آپ ہی کی اولاد سمجھے جائیں گے اور وہ آپ کے علوم و برکات کے وارث ہوں گے اور اس سے حصہ پائیں گے۔ اِس آیت کو مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کے ساتھ ملا کر پڑھو تو حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوحانی اولاد بھی نہیں تھی تو پھر معاذ اللہ آپ اَبتر ٹھہرتے ہیں جو آپ کے اعداء کے لئے ہے اور اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو روحانی اولاد کثیر دی گئی ہے پس اگر ہم یہ اعتقاد نہ رکھیں گے کہ کثرت کے ساتھ آپ کی روحانی اولاد ہوئی ہے تو اس پیشگوئی کے منکر ٹھہریں گے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۹ مورخہ ۲۴ مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۲)

یقیناً یاد رکھو کہ کوئی شخص سچا مسلمان نہیں ہو سکتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا متبع نہیں بن سکتا جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین یقین نہ کرے۔ جب تک ان محدثات سے الگ نہیں ہوتا اور اپنے قول اور فعل سے آپ کو خاتم النبیین نہیں مانتا کچھ نہیں۔ سعدی نے کیا اچھا کہا ہے ؎

بزہد و ورع کوش و صدق و صفا ٭ ولیکن میفزائے بر مصطفےٰ

ہمارا مدعا جس کے لئے خدا تعالیٰ نے ہمارے دل میں جوش ڈالا ہے یہی ہے کہ صرف صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت قائم کی جائے جو ابد الآباد کے لئے خدا (تعالیٰ) نے قائم کی ہے اور تمام جھوٹی نبوتوں کو پاش پاش کر دیا جائے جو ان لوگوں نے اپنی بدعتوں کے ذریعہ قائم کی ہیں۔ ان ساری گدیوں کو دیکھ لو اور عملی طور پر مشاہدہ کرو کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر ہم ایمان لائے ہیں یا وہ۔

یہ ظلم اور شرارت کی بات ہے کہ ختم نبوت سے خدا تعالیٰ کا اِتنا ہی منشاء قرار دیا جائے کہ مُنہ سے ہی خاتم النبیین مانو اور کرتوتیں وہی کرو جو تم پسند کرو اور اپنی ایک الگ شریعت بنا لو۔ بغدادی نماز، معکوس نماز وغیرہ ایجاد کی ہوئی ہیں۔ کیا قرآن شریف یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل میں بھی اس کا کہیں پتہ لگتا ہے اور ایسا ہی "یا شیخ عبد القادر جیلانی شیئاً للہ" کہنا اس کا ثبوت بھی کہیں قرآن شریف سے ملتا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تو شیخ عبد القادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وجود بھی نہ تھا پھر یہ کس نے بتایا تھا۔ شرم کرو کیا شریعت اسلام کی پابندی اور التزام اسی کا نام ہے؟ اب خود ہی فیصلہ کرو کہ کیا ان باتوں کو مان کر اور ایسے عمل رکھ کر تم اس قابل ہو کہ مجھے الزام دو کہ میں نے خاتم النبیین کی مُہر کو توڑا ہے؟ اصل اور سچی بات یہی ہے کہ اگر تم اپنی مساجد میں بدعات کو دخل نہ دیتے اور خاتم النبیین

---

[1] سورۃ الکوثر: ۴

صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی نبوت پر ایمان لاکر آپ کے طرزِ عمل اور نقشِ قدم کو اپنا امام بناکر چلتے تو پھر میرے آنے ہی کی کیا ضرورت ہوتی۔ تمہاری اِن بدعتوں اور نئی نبوتوں نے ہی خدا تعالیٰ کی غیرت کو تحریک دی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر میں ایک شخص کو مبعوث کرے جو ان جھوٹی نبوتوں کے بُت کو توڑ کر نیست و نابود کرے پس اِسی کام کے لئے خدا نے مجھے مامور کر کے بھیجا ہے۔
(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۰ اگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۶۱۵)

خاتم النّبیین کے معنے یہ ہیں کہ آپ کی مُہر کے بغیر کسی کی نبوت تصدیق نہیں ہو سکتی۔ جب مُہر لگ جاتی ہے تو وہ کاغذ سند ہو جاتا ہے اور مصدقہ سمجھا جاتا ہے۔ اِسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہر اور تصدیق جس نبوت پر نہ ہو وہ صحیح نہیں ہے۔
(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۷ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

یہ کہتے ہیں کہ خدا نے میرا نام نبی رکھا یہ بالکل سچی بات ہے۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چشمۂ اِفادات مانتے ہیں۔ ایک چراغ اگر ایسا ہو جس سے کوئی دوسرا روشن نہ ہو وہ قابلِ تعریف نہیں ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم ایسا نور مانتے ہیں کہ آپ سے دوسرے روشنی پاتے ہیں۔

یہ جو خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ یہ بالکل درست ہے۔ خدا تعالیٰ نے آپ کی جسمانی ابوت کی نفی کی لیکن آپ کی رُوحانی ابوت کا اِستثناء کیا ہے۔ اگر یہ مانا جائے جیسا کہ ہمارے مخالف کہتے ہیں کہ آپ کا نہ کوئی جسمانی بیٹا ہے نہ رُوحانی تو پھر اِس طرح پر معاذ اللہ یہ لوگ آپ کو اَبتر ٹھیراتے ہیں مگر ایسا نہیں۔ آپ کی شان تو یہ ہے کہ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ۔ اللہ تعالیٰ نے ختمِ نبوت کی آیت میں فرمایا ہے کہ جسمانی طور پر آپ اَب نہیں مگر رُوحانی سلسلہ آپ کا جاری ہے لٰکِنْ جو مافات کے لئے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ آپ خاتم ہیں آپ کی مُہر سے نبوت کا سلسلہ چلتا ہے۔

ہم خود بخود نہیں بن گئے خدا تعالیٰ نے اپنے وعدوں کے موافق جو بنایا وہ بن گئے یہ اس کا فعل اور فضل ہے يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ خدا نے جو وعدے نبیوں سے کئے تھے ان کا ظہور ہوا ہے۔ براہین (احمدیہ) میں یہ الہام اس وقت سے درج ہے وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا۔ صَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ۔ وَكَانَ اَمْرًا مَّفْعُوْلًا وغیرہ اِس قسم کے بیسیوں الہام ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا ہی ارادہ فرمایا ہوا تھا۔ اس میں ہمارا کچھ تصرف نہیں۔ کیا جس وقت اللہ تعالیٰ نے نبیوں سے یہ وعدے فرمائے (تھے) ہم حاضر تھے۔ جس طرح خدا تعالیٰ مُرسل بھیجتا ہے اسی طرح اسنے یہاں اپنے وعدہ کو پُورا کیا۔
(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۷ مورخہ ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۰، ۱۱)

ختمِ نبوت بھی ایک عجیب علمی سلسلہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ختمِ نبوت کو بھی قائم رکھتا ہے اور اسی کے استفادہ سے ایک سلسلہ جاری کرتا ہے۔ یہ تو ایک علمی بات ہے مگر کہا یہ گیا کہ اِس سلسلہ کو اُلٹ پلٹ کر دوسرے نبی کو لایا جاوے حالانکہ خدا تعالیٰ

کی حکمت اور ارادہ نہیں چاہتا کہ کوئی دوسرا نبی آوے قطع نظر اس کے کہ وہ شریعت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو۔ خواہ شریعت نہ بھی رکھتا ہو تب بھی ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی دوسرا نبی آپؐ کے سوا اور آپؐ کے استفادہ سے الگ ہو کر نہیں آسکتا۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱، اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

جسمانی طور پر جس قدر ترقیات آج تک ہوئی ہیں کیا وہ پہلے زمانوں میں تھیں؟ اسی طرح روحانی ترقیات کا سلسلہ ہے کہ وہ ہوتے ہوتے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا۔ خاتم النبیین کے یہی معنے ہیں۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۴ مورخہ ۲۱، نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳۰)

ختم نبوت پر محی الدین ابن عربی کا یہی مذہب ہے کہ تشریعی نبوت ختم ہو چکی ورنہ ان کے نزدیک مکالمہ الٰہی اور نبوت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس میں علماء کو بہت غلطی لگی ہے۔ خود قرآن میں النّبیّین جس پر ال پڑا ہے موجود ہے۔ اس سے مراد یہی ہے کہ جو نبوت نئی شریعت لانے والی تھی وہ اب ختم ہو گئی ہے ہاں اگر کوئی نئی شریعت کا دعویٰ کرے تو کافر ہے اور اگر سرے سے مکالمہ الٰہی سے انکار کیا جاوے تو پھر اسلام تو ایک مُردہ مذہب ہوگا اور اس میں اور دوسرے مذاہب میں کوئی فرق نہ رہے گا کیونکہ مکالمہ کے بعد اور کوئی ایسی بات نہیں رہتی کہ وہ ہو تو اسے نبی کہا جاوے۔ نبوت کی علامت مکالمہ ہے لیکن اب اہل اسلام نے جو یہ اپنا مذہب قرار دیا ہے کہ اب مکالمہ کا دروازہ بند ہے اس سے تو یہ ظاہر ہے کہ خدا کا بڑا قہر اسی اُمت پر ہے اور اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کی دعا ایک بڑا دھوکہ ہے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۶ مورخہ ۲۷، فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۲)

ختم نبوت کے یہی معنے ہیں کہ نبوت کی ساری خوبیاں اور کمالات تجھ پر ختم ہو گئے اور آئندہ کے لئے کمالات نبوت کا باب بند ہو گیا اور کوئی نبی مستقل طور پر نہ آئے گا۔

نبی عربی اور عبرانی دونوں زبانوں میں مشترک لفظ ہے جس کے معنے ہیں خدا سے خبر پانے والا اور پیشگوئی کرنیوالا جو لوگ براہِ راست خدا سے مکالمہ کرتے اور اس سے خبریں پاتے تھے وہ نبی کہلاتے تھے اور یہ گویا اصطلاح ہو گئی تھی۔ مگر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کو بند کر دیا ہے) اور مُہر لگا دی ہے کہ کوئی نبی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہر کے بغیر نہیں ہو سکتا جب تک آپؐ کی اُمت میں داخل نہ ہو اور آپؐ کے فیض سے مستفیض نہ ہو وہ خدا تعالیٰ سے مکالمہ کا شرف نہیں پا سکتا جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت میں داخل نہ ہو۔ اگر کوئی ایسا ہے کہ وہ بدوں اس اُمت میں داخل ہونے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض پانے کے بغیر کوئی شرفِ مکالمہ الٰہی حاصل کر سکتا ہے تو اسے میرے سامنے پیش کرو۔

یہی ایک آیت زبردست دلیل ہے اس امر پر جو ہم کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ دوبارہ نہیں آئیں گے بلکہ آنے والا اس اُمت میں سے ہوگا۔ کیونکہ وہ نبی ہوں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص نبوت کا فیضان حاصل

کر سکتا ہی نہیں جب تک وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ نہ کرے جو صاف لفظوں میں یہ ہے کہ آپ کی اُمت میں داخل نہ ہو۔ اب خاتم النبیین والی آیت تو صریح روکتی ہے پھر وہ کس طرح آسکتے ہیں۔ یا اُن کو نبوت سے معزول کرو اور اُن کی یہ ہتک اور بے عزتی روا رکھو اور یا یہ کہ پھر ماننا پڑے گا کہ آنے والا اسی اُمت میں سے ہوگا۔

نبی کی اصطلاح مستقل نبی پر بولی جاتی تھی مگر اب خاتم النبیین کے بعد یہ مستقل نبوت رہی ہی نہیں۔ اسی لئے کہا ہے ؎

خارقے از ولی مسموع است • معجزہ آں نبی متبوع است

پس اس بات کو خوب غور سے یاد رکھو کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبوت کا شرف پہلے سے حاصل ہے تو کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ پھر آئیں اور اپنی نبوت کو کھو دیں۔ یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مستقل نبی کو روکتی ہے البتہ یہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کو بڑھانے والا ہے کہ ایک شخص آپ ہی کی اُمت سے آپ ہی کے فیض سے وہ درجہ حاصل کرتا ہے جو ایک وقت مستقل نبی کو حاصل ہو سکتا تھا لیکن اگر وہ خود ہی آئیں تو پھر صاف ظاہر ہے کہ پھر اس خاتم الانبیاء والی آیت کی تکذیب لازم آتی ہے اور خاتم الانبیاء حضرت مسیح ٹھہریں گے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آنا بالکل غیر مستقل ٹھہر جاوے گا کیونکہ آپ پہلے بھی آئے اور ایک عرصہ کے بعد آپ رخصت ہو گئے اور حضرت مسیح آپ سے پہلے بھی رہے اور آخر پر بھی وہی رہے۔ غرض اس عقیدہ کے ماننے سے کہ وہی حضرت مسیح آنے والے ہیں بہت سے مفاسد پیدا ہوتے ہیں اور ختم نبوت کا انکار کرنا پڑتا ہے جو کفر ہے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۵ مورخہ ۱۰ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ کے معنے ہی ان کے نزدیک یہی ہیں کہ الہام کا دروازہ آپ کے بعد ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا اور آپ کے بعد آپ کی اُمت سے یہ برکت کہ کسی کو مکالمات اور مخاطبات ہوں بالکل اُٹھ گئی مگر ہم کہتے ہیں کہ ہر صدی اس امر کی منتظر ہوتی ہے کہ اس اُمت میں سے چند افراد یا کوئی ایک فرد ضرور خدا تعالیٰ کی ہمکلامی سے مشرف ہوں گے جو اسلام پر سے گرد و غبار کو دور کر کے پھر اسلام کے روشن چہرے کو چمکا کر دکھایا کریں۔ ان لوگوں سے اگر پوچھا جاوے کہ تمہارے پاس سچائی کی دلیل ہی کونسی ہے؟ کوئی معجزات یا خارق عادت تمہارے پاس نہیں تو دوسروں کا حوالہ دیں گے خود خالی اور محروم ہیں۔ صحابہؓ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس رہ کر اور آپ کی صحبت کی برکت سے آنحضرت کے ہی رنگ میں رنگین ہو گئے تھے اور ان کے ایمانوں کے واسطے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیشگوئیاں اور معجزات کثرت سے دیکھنے اور ہر وقت مشاہدہ کرنے سے اُن کے ایمانوں کا تزکیہ اور تربیت ہوتی گئی اور آخر کار ترقی کرتے کرتے وہ کمال تمام تک پہنچ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگین ہو گئے مگر ان لوگوں کے ایمانوں کو مضبوط کرنے کے واسطے اگر ان سے پوچھا جاوے تو کیا ہے؟ تیرہ سو برس کا حوالہ دیں گے کہ اس وقت یہ معجزات اور خارق عادت ظاہر ہوا کرتے تھے

پیشگوئیاں بھی تھیں مگر اب کچھ بھی نہیں۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

نبوت جو اللہ تعالیٰ نے اب قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حرام کی ہے اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اب اِس اُمّت کو کوئی خیر و برکت ملے گی ہی نہیں اور نہ اس کو شرفِ مکالمات اور مخاطبات ہوگا بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہر کے سوا کے اب کوئی نبوت نہیں چل سکے گی۔ اِس اُمّت کے لوگوں پر جو نبی کا لفظ نہیں بولا گیا اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ حضرت موسیٰؑ کے بعد تو نبوت ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جیسے عالیجناب اولوالعزم صاحب شریعت کمال آنے والے تھے اسی وجہ سے ان کے واسطے یہ لفظ جاری رکھا گیا مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد چونکہ ہر ایک قسم کی نبوت بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بند ہو چکی تھی اس واسطے ضروری تھا کہ اس کی عظمت کی وجہ سے وہ لفظ نہ بولا جاتا۔ مَاكَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جسمانی طور سے آپ کی اولاد کی نفی کی ہے اور ساتھ ہی روحانی طور سے اثبات بھی کیا ہے کہ روحانی طور سے آپ باپ بھی ہیں اور روحانی نبوت اور فیض کا سلسلہ آپ کے بعد جاری رہے گا اور وہ آپ میں سے ہو کر جاری ہوگا نہ الگ طور سے۔ وہ نبوت چل سکے گی جس پر آپ کی مُہر ہوگی۔ ورنہ اگر نبوت کا دروازہ بالکل بند سمجھا جاوے تو نعوذ باللہ اس سے تو انقطاعِ فیض لازم آتا ہے اور اس میں تو نحوست ہے اور نبی کی ہتکِ شان ہوتی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے اِس اُمّت کو یہ جو کہا کہ کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ[1] یہ جھوٹ تھا نعوذ باللہ۔ اگر یہ معنے کئے جاویں کہ آئندہ کے واسطے نبوت کا دروازہ ہر طرح سے بند ہے تو پھر خیر الامّۃ کی بجائے شرّ الامم ہوئی یہ اُمّت۔ جب اس کو اللہ تعالیٰ سے مکالمات اور مخاطبات کا شرف بھی نصیب نہ ہوا تو یہ تو كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ[2] ہوئی اور بہائم سیرت اسے کہنا چاہیئے نہ یہ کہ خیر الامم۔ اور پھر سورۃ فاتحہ کی دعا بھی لغو ہو جاتی ہے۔ اِس میں جو لکھا ہے کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ[3] تو سمجھنا چاہیئے کہ ان پہلوں کے پلاؤ زردے مانگنے کی دُعا سکھائی ہے! اور ان کی جسمانی لذّات اور انعامات کے وارث ہونے کی خواہش کی گئی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اور اگر یہی معنے ہیں تو باقی رہ بھی کیا گیا جس سے اِسلام کا علو ثابت ہووے۔ اِس طرح تو ماننا پڑے گا کہ نعوذ باللہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قوتِ قدسی کچھ بھی نہ تھی اور آپ حضرت موسیٰؑ سے مرتبے میں گرے ہوئے تھے کہ ان کے بعد تو ان کی اُمّت میں سے سینکڑوں نبی آئے مگر آپ کی اُمّت سے خدا تعالیٰ کو نفرت ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ مکالمہ بھی نہ کیا کیونکہ جس کے ساتھ محبت ہوتی ہے آخر اس سے کلام تو کیا ہی جاتا ہے۔

نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا سلسلہ جاری ہے مگر آپ میں سے ہو کر اور آپ کی مُہر سے۔

---

[1] سورۃ آلِ عمران: ۱۱۱ [2] سورۃ الاعراف: ۱۸۰ [3] سورۃ الفاتحہ: ۶، ۷

اور فیضان کا سلسلہ جاری ہے۔ ہزاروں اِس اُمّت سے مکالمات اور مخاطبات کے شرف سے مشرف ہوئے اور انبیاء کے خصائص اُن میں موجود ہوتے رہے۔ سینکڑوں بڑے بڑے بزرگ گذرے ہیں جنہوں نے ایسے دعوے کئے چنانچہ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہی کی ایک کتاب فتوح الغیب کو ہی دیکھ لو ورنہ اللہ تعالیٰ جو فرماتا ہے کہ مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی[1] اگر خدا تعالیٰ نے خود ہی اِس اُمّت کو اعمٰی بنایا تھا تو عجب ہے خود ہی اسے اعمٰی بنایا اور خود ہی اعمٰی کے واسطے زجر اور توبیخ ہے کہ آخرت میں بھی اعمٰی ہو گی۔ اِس اُمّت بیچاری کے کیا اختیار اس کی مثال تو ایسی ہے کہ ایک شخص کسی کو کہے کہ اگر تُو اِس مکان سے گر جاوے گا تو تجھے قید کر دیا جاوے گا مگر پھر خود ہی اسے دھکا دے دے۔

گویا نبوّت کا سلسلہ بند کر کے فرمایا کہ تجھے مکالمات اور مخاطبات سے بے بہرہ کیا گیا اور تُو بہائم کی طرح زندگی بسر کرنے کے واسطے بنائی گئی اور دوسری طرف کہتا ہے کہ مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی۔ اب بتاؤ کہ اِس تناقض کا کیا جواب ہے؟ ایک طرف تو کہا خیر اُمّت اور دوسری جگہ کہہ دیا کہ تُو اعمٰی ہے آخرت میں بھی اعمٰی ہو گی نعوذ باللہ۔ کیسے غلط عقیدے بنائے گئے ہیں۔

اور اگر کوئی باہر سے اِس کی اصلاح کے واسطے آ گیا تو بھی مشکل۔ اس اُمّت کے نبی کی ہتکِ شان اور قوم کی بھی ناک کٹی ہوئی کہ اس میں گویا کوئی بھی اِس قابل نہیں کہ اصلاح کرنے کے قابل ہو سکے اور کسی کو یہ شرفِ مکالمہ عطا نہیں کیا جا سکتا اور اسی پر بس نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض آتا ہے کہ ایسے بڑے نبی ہو کر ان کی اُمّت ایسی کمزور اور گئی گذری ہے۔ ایسا نہیں۔ بلکہ بات یوں ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد بھی آپؐ کی اُمّت میں نبوّت ہے اور نبی ہیں مگر لفظِ نبی کا بوجہ عظمتِ نبوّت استعمال نہیں کیا جاتا لیکن برکات اور فیوض موجود ہیں۔

(الحکم جلد ۷، ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۸)

اگر غور سے دیکھا جاوے تو ہمارے نبی کریمؐ کو آپ کے بعد کسی دوسرے کے نبی نہ کہلانے سے شوکت ہے اور حضرت موسٰیؑ کے بعد اَور لوگوں کے بھی نبی کہلانے سے اُن کی کسرِ شان۔ کیونکہ حضرت موسٰیؑ بھی ایک نبی تھے اور ان کے بعد ہزاروں اَور نبی بھی آئے تو ان کی نبوّت کی خصوصیت اور عظمت کوئی نہیں ثابت ہوتی برعکس اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک عظمت اور آپؐ کی نبوّت کے لفظ کا پاس اور اَدب کیا گیا ہے کہ آپؐ کے بعد کسی دوسرے کو اِس نام سے کسی طرح بھی شریک نہ کیا گیا۔

اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت میں بھی ہزاروں بزرگ نبوّت کے نُور سے منوّر تھے اور ہزاروں کو

---

[1] بنی اسرائیل: ۷۳

انوارِ نبوت کا حصہ عطا ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہوتا ہے مگر چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام خاتم الانبیاء رکھا گیا تھا اس لئے خدا تعالیٰ نے نہ چاہا کہ دوسرے کو بھی یہ نام دے کر آپؐ کی کسرِ شان کی جاوے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمّت میں سے ہزارہا انسانوں کو نبوت کا درجہ ملا اور نبوت کے آثار اور برکات ان کے اندر موجزن تھے مگر نبی کا نام صرف شانِ نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سدِّ بابِ نبوت کی خاطر اُن کو اس نام سے ظاہراً ملقب نہ کیا گیا مگر دوسری طرف چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فیوض اور رُوحانی برکات کا دروازہ بند بھی نہ کیا گیا تھا اور نبوت کے انوار جاری بھی تھے جیسا کہ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ سے نکلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہر اور اِذن سے اور آپؐ کے نور سے نورِ نبوت جاری بھی ہے اور یہ سلسلہ بند بھی نہیں ہوا۔ یہ بھی ضروری تھا کہ اسے ظاہراً بھی شائع کیا جاوے ....

.... اور اِس طرح سے دونو امور کا لحاظ نہایت حکمت اور کمال لطافت سے رکھ لیا گیا۔ ادھر یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسرِ شان بھی نہ ہو اور ادھر موسوی سلسلہ سے مماثلت بھی پوری ہو جاوے۔ تیرہ سَو برس تک نبوت کے لفظ کا اطلاق تو آپؐ کی نبوت کی عظمت کے پاس سے نہ کیا اور اس کے بعد اب مدت دراز کے گذرنے سے لوگوں کے چونکہ اعتقاد اس امر پر پختہ ہو گئے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی خاتم الانبیاء ہیں اور اب اگر کسی دوسرے کا نام نبی رکھا جاوے تو اس سے آنحضرتؐ کی شان میں کوئی فرق بھی نہیں آتا اِس واسطے اب نبوت کا لفظ مسیح کے لئے ظاہراً بھی بول دیا۔ یہ ٹھیک اسی طرح سے ہے جیسے آپؐ نے پہلے فرمایا تھا کہ قبروں کی زیارت نہ کیا کرو اور پھر فرما دیا کہ اچھا اب کر لیا کرو۔ پہلے منع کرنا بھی حکمت رکھتا تھا کہ لوگوں کے خیالات ابھی تازہ بتازہ بُت پرستی سے ہٹے تھے تا وہ پھر اسی عادت کی طرف عود نہ کریں۔ پھر جب دیکھا کہ اب اُن کے ایمان کمال کو پہنچ گئے ہیں اور کسی قسم کے شرک و بدعت کو ان کے ایمان میں راہ نہیں تو اجازت دے دی۔ بالکل اسی طرح یہ امر ہے۔ پہلے تیرہ سَو برس اُس عظمت کے واسطے نبوت کا لفظ نہ بولا اگرچہ صفتی رنگ میں صفتِ نبوت اور انوارِ نبوت موجود تھے اور حق تھا کہ اُن لوگوں کو نبی کہا جاوے مگر خاتم الانبیاء کی نبوت کی عظمت کے پاس کی وجہ سے وہ نام نہ دیا گیا مگر اب وہ خوف نہ رہا تو آخری زمانہ میں مسیح موعود کے واسطے نبی اللہ کا لفظ فرمایا۔ آپؐ کے جانشینوں اور آپؐ کی اُمّت کے خادموں پر صاف صاف نبی اللہ بولنے کے واسطے دو امور مدِّ نظر رکھنے ضروری تھے اوّل عظمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوم عظمتِ اسلام۔ سو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کے پاس کی وجہ سے ان لوگوں پر تیرہ سَو برس تک نبی کا لفظ نہ بولا گیا تا کہ آپؐ کی ختمِ نبوت کی ہتک نہ ہو کیونکہ اگر آپؐ کے بعد ہی آپؐ کی اُمّت کے خلیفوں اور صلحاء لوگوں پر نبی کا لفظ بولا جانے لگتا جیسے حضرت موسیٰؑ کے بعد لوگوں پر بولا جاتا رہا تو اس میں آپؐ کی ختمِ نبوت کی ہتک تھی اور کوئی عظمت نہ تھی۔ سو خدا تعالیٰ نے ایسا کیا کہ اپنی حکمت اور لطف سے آپؐ کے بعد تیرہ سَو برس تک

اِس لفظ کو آپؐ کی اُمّت پر سے اُٹھا دیا تا آپؐ کی نبوت کی عظمت کا حق ادا ہو جاوے اور پھر چونکہ اسلام کی عظمت چاہتی تھی کہ اِس میں بھی بعض ایسے افراد ہوں جن پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد لفظ نبی اللہ بولا جاوے اور تا پہلے سلسلہ سے اس کی مماثلت پوری ہو۔ آخری زمانہ میں مسیح موعود کے واسطے آپؐ کی زبان سے نبی اللہ کا لفظ نکلوا دیا اور اِس طرح پر نہایت حکمت اور بلاغت سے دو متضاد باتوں کو پورا کیا اور موسوی سلسلہ کی مماثلت بھی قائم رکھی اور عظمت اور نبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی قائم رکھی۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ ؍اپریل ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

خاتم النبیین کی آیت بتلا رہی ہے کہ جسمانی نسل کا انقطاع ہے نہ کہ رُوحانی نسل کا۔ اِس لئے جس ذریعہ سے وہ نبوت کی نفی کرتے ہیں اس سے نبوت کا اثبات ثابت ہے۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چونکہ کمال عظمت خدا تعالیٰ کو منظور تھی اِس لئے لکھ دیا کہ آئندہ نبوت آپؐ کی اتباع کی مُہر سے ہوگی اور اگر یہ معنے ہوں کہ نبوت ختم ہے تو اس سے خدا تعالیٰ کے فیضان کے بُخل کی بُو آتی ہے ہاں یہ معنے ہیں ہر ایک قسم کا کمال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا اور پھر آئندہ آپؐ کی مُہر سے وہ کمال آپؐ کی اُمّت کو ملا کریں گے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۷ ؍اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹۹)

اِس اُمّت میں سابقہ مجددین اور مامورین کا نبی نہ پکارا جانا آنحضرتؐ کی شان اور عظمت کو ثابت کرتا ہے جس کا فخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی ہے موسیٰؑ کو ہرگز نہیں ہے کیونکہ جب موسیٰؑ کے بعد نبی کہلانے والے بار بار آئے اور صدہا ہزار آئے تو اس سے موسیٰؑ کی کسرِ شان ہوئی کہ جو خطاب ان کا تھا وہی اَوروں کو کثرت سے ملا۔ موسیٰؑ کے بارے میں خاتم النبیین کا لفظ اِستعمال نہیں ہوا مگر آنحضرتؐ کے حق میں ہوا اِس لئے خدا نے اِس اُمّت میں یُوں کیا کہ بہت سے ایسے پیدا کئے جن کو شرفِ مکالمہ تو دیا مگر آنحضرتؐ کی شان اور عظمت کے لحاظ سے لفظ نبی کا ان کے حق میں نہ رکھا لیکن اگر اس اُمّت میں کوئی بھی نبی نہ پکارا جاتا تو مماثلتِ موسوی کا پہلو بہت ناقص ٹھہرتا اور من وجہ اُمّتِ موسوی کو ایک فضیلت ہو جاتی اِس لئے یہ خطاب آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خود اپنی زبانِ مبارک سے ایک شخص کو دے دیا جس نے مسیح ابنِ مریم ہو کر دُنیا میں آنا تھا کیونکہ اِس جگہ دو پہلو مدِّ نظر تھے ایک ختمِ نبوت کا، اسے اِس طرح نبھایا کہ جو نبی کے لفظ کی کثرت موسوی سلسلہ میں تھی اُسے اُڑا دیا۔ دوسری مشابہت' اسے اِس طرح پورا کیا کہ ایک کو نبی کا خطاب دے دیا۔ تکمیلِ مشابہت کے لئے اِس لفظ کا ہونا ضروری تھا سو پورا ہو گیا اور جو مصلحت یہاں مدِّ نظر تھی وہ موسوی سلسلہ میں نہیں تھی کیونکہ موسیٰؑ خاتمِ نبوت نہیں تھے۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۷ ؍اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۲)

نبوت کے معنے مکالمہ کے ہیں جو غیب کی خبر دیوے وہ نبی ہے۔ اگر آئندہ نبوت کو باطل قرار دوگے تو پھر یہ اُمّت خیرِ اُمّت نہ رہے گی بلکہ کالانعام ہوگی۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۷ ؍اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۹۹)

خدا جس سے پیار کرتا ہے تو اس سے بلا مکالمہ نہیں رہتا۔ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اتباع سے جب

انسان کو خدا پیار کرنے لگتا ہے تو اس سے کلام بھی کرتا ہے غیب کی خبریں اس پر ظاہر کرتا ہے۔ اسی کا نام نبوت ہے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۳)

نبوت کا لفظ ہمارے الہامات میں دو شرطیں رکھتا ہے اول یہ کہ اس کے ساتھ شریعت نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ بواسطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۴ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲)

ہم اگر نبی کا لفظ اپنے متعلق استعمال کرتے ہیں تو ہم ہمیشہ وہ مفہوم لیتے ہیں جو کہ ختم نبوت کا مخل نہیں ہے اور جب اس کی نفی کرتے ہیں تو وہ معنے مراد ہوتے ہیں جو ختم نبوت کے مخل ہیں۔

(البدر جلد ۲ نمبر ۱۵ مورخہ یکم مئی ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۱۷)

معرفت تام انبیاؤں کو سوائے وحی کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جس غرض کے لئے انسان اسلام قبول کرتا ہے اس کا مغز یہی ہے کہ اس کی اتباع سے وحی ملے۔ اور پھر اگر وحی منقطع ہوئی مانی جاوے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی منقطع ہوئی نہ اس کے اظلال و آثار بھی منقطع ہوئے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۳۲ مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۵۸)

خوب یاد رکھو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں یعنی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نئی شریعت اور نئی کتاب نہ آئے گی۔ نئے احکام نہ آئیں گے۔ یہی کتاب اور یہی احکام رہیں گے۔ جو الفاظ میری کتابوں میں نبی یا رسول کے میری نسبت پائے جاتے ہیں اس میں ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ کوئی نئی شریعت یا نئے احکام سکھائے جاویں بلکہ منشاء یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی ضرورت حقہ کے وقت کسی کو مامور کرتا ہے تو ان معنوں سے کہ مکالمات الٰہیہ کا شرف اس کو دیتا ہے اور غیب کی خبریں اس کو دیتا ہے اس پر نبی کا لفظ بولا جاتا ہے اور وہ مامور نبی کا خطاب پاتا ہے یہ معنے نہیں ہیں کہ نئی شریعت دیتا ہے یا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو نعوذ باللہ منسوخ کرتا ہے بلکہ یہ جو کچھ اُسے ملتا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی سچی اور کامل اتباع سے ملتا ہے اور بغیر اس کے مل سکتا ہی نہیں۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۱ مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو سب انبیاء علیہم السلام سے افضل اور بہتر تھے یہاں تک کہ آپ پر سلسلۂ نبوت اللہ تعالیٰ نے ختم کر دیا یعنی تمام کمالات نبوت آپ پر طبعی طور پر ختم ہوگئے۔

(الحکم جلد ۸ نمبر ۳۲ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۵)

کہتے ہیں کہ یہ دروازہ مکالمات و مخاطبات کا اِس وجہ سے بند ہو گیا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم النّبیّین ہیں اِس لئے آپ کے بعد یہ فیض اور فضل بند ہو گیا مگر ان کی عقل اور علم پر افسوس آتا ہے کہ یہ نادان اِتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ختم نبوت کے ساتھ ہی اگر معرفت اور بصیرت کے دروازے بھی بند ہو گئے تو

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (معاذ اللہ) خاتم النبیین تو کُجا نبی بھی ثابت نہ ہوں گے کیونکہ نبی کی آمد اور بعثت تو اِس غرض کے لئے ہوتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ پر ایک یقین اور بصیرت پیدا ہو اور ایسا ایمان ہو جو لذیذ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے تصرفات اور اس کی قدرتوں اور صفات کی تجلّی کو انسان مشاہدہ کرے اور اس کا ذریعہ یہی اس کے مکالمات ومخاطبات اور خوارق عادات ہیں لیکن جب یہ دروازہ ہی بند ہو گیا تو پھر اس بعثت سے فائدہ کیا ہُوا ؟

مَیں بڑے افسوس سے کہتا ہوں کہ ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہرگز ہرگز قدر نہیں کی اور آپؐ کی شانِ عالی کو بالکل نہیں سمجھا ورنہ اس قسم کے بیہودہ خیالات یہ نہ تراشتے۔ اِس آیت کے اگر یہ معنے جو یہ پیش کرتے ہیں تسلیم کرلئے جاویں تو پھر گویا آپؐ کو نعوذ باللہ اَبتر ماننا ہوگا کیونکہ جسمانی اولاد کی نفی تو قرآن شریف کرتا ہے اور روحانی کی یہ نفی کرتے ہیں تو پھر باقی کیا رہا ؟

اصل بات یہ ہے کہ اِس آیت سے اللہ تعالیٰ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم الشّان کمال اور آپؐ کی قوّتِ قدسیہ کا زبردست اثر بیان کرتا ہے کہ آپؐ کی رُوحانی اولاد اور رُوحانی تاثیرات کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ آئندہ اگر کوئی فیض اور برکت کسی کو مل سکتی ہے تو اسی وقت اور حالت میں مل سکتی ہے جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل اتباع میں کھویا جاوے اور فنافی الرّسول کا درجہ حاصل کرلے بدُوں اس کے نہیں۔ اور اگر اس کے سوا کوئی شخص ادعائے نبوّت کرے تو وہ کذّاب ہوگا۔ اِس لئے نبوّتِ مُستقلہ کا دروازہ بند ہو گیا اور کوئی ایسا نبی جو بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع اور ورزش شریعت اور فنافی الرّسول ہونے کے مستقل نبی صاحب شریعت ہو نہیں آسکتا ہاں فنافی الرّسول اور آپؐ کے اُمتی اور کامل متبعین کے لئے یہ دروازہ بند نہیں کیا گیا اِسی لئے براہین میں یہ الہام درج ہے :

كُلُّ بَرَكَةٍ مِّنْ مُّحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَبَارَكَ مَنْ عَلَّمَ وَتَعَلَّمَ

یعنی یہ مخاطبات اور مکالمات کا شرف جو مجھے دیا گیا ہے یہ محض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا طفیل ہے اور اسی لئے یہ آپؐ ہی سے ظہور میں آرہے ہیں جس قدر تاثیرات اور برکات وانوار ہیں وہ آپؐ ہی کے ہیں۔

(الحکم جلد ۹ ۳۸ مورخہ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۶)

کہتے ہیں ..... کہ دعویٰ نبوّت ہے مَیں کہتا ہوں یہ تو نری لفظی نزاع ہے۔ نبی تو خبر دینے والے کو کہتے ہیں۔ اب جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے مخاطبات اور مکالمات ہوتے ہوں اس کا کیا نام رکھا جاوے گا اور یہ نبوّت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہی طفیل اور اتباع کا نتیجہ ہے مَیں اس کو کفر اور لعنت سمجھتا ہوں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اَب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے استفاضہ کئے بغیر کوئی شخص نبوّت کے چشمہ سے حصّہ لیتا ہے اور مستقل نبوّت کا مدعی ہے۔

(الحکم جلد ۹ ۳۹ مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

یہ ایک مسلّمہ بات ہے کہ کسی چیز کا خاتمہ اس کی علتِ غائی کے اختتام پر ہوتا ہے۔ جیسے کتاب کے جب کُل مطالب بیان ہو جاتے ہیں تو اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے اسی طرح پر رسالت اور نبوت کی علتِ غائی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوئی اور یہی ختمِ نبوت کے معنے ہیں کیونکہ یہ ایک سلسلہ ہے جو چلا آیا ہے اور کامل انسان پر آکر اس کا خاتمہ ہو گیا۔

(ٹریکٹ ملا ۔ حضرت اقدس کی ایک تقریر اور مسئلہ وحدۃ الوجود پر ایک خط (مرتبہ عرفانی) ص۱۴۱)

اِس (خاتم النبیین) کے یہ معنے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی صاحبِ شریعت نہیں آوے گا اور یہ کہ کوئی ایسا نبی آپؐ کے بعد نہیں آسکتا جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مُہر اپنے ساتھ نہ رکھتا ہو..... رئیس المتصوفین حضرت ابنِ عربیؒ کہتے ہیں کہ نبوت کا بند ہو جانا اور اسلام کا مَر جانا ایک ہی بات ہے۔ دیکھو حضرت موسٰیؑ کے زمانہ میں تو عورتوں کو بھی اِلہام ہوتا تھا چنانچہ خود موسٰیؑ کی ماں سے بھی خدا تعالیٰ نے کلام کیا ہے۔ وہ دین ہی کیا ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ اس کے برکات اور فیوض آگے نہیں بلکہ پیچھے رہ گئے ہیں۔ اگر اب بھی خدا اسی طرح سُنتا ہے جس طرح پہلے زمانہ میں سُنتا تھا اور اسی طرح سے دیکھتا ہے جس طرح پہلے دیکھتا تھا تو کیا وجہ ہے کہ جب پہلے زمانہ میں سُننے اور دیکھنے کی طرح صفتِ تکلّم بھی موجود تھی تو اب کیوں مفقود ہو گئی۔ اگر ایسا ہی ہے تو کیا اندیشہ نہیں کہ کسی وقت خدا تعالیٰ کی صفت سُننے اور دیکھنے کی بھی معزول ہو جاوے۔

(الحکم جلد ۱۲ ۳۲ مورخہ ۱۰ رمئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

میرا دعویٰ صرف یہ ہے کہ موجودہ مفاسد کے باعث خدا تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے اور میں اس امر کا اخفاء نہیں کر سکتا کہ مجھے مکالمہ مخاطبہ کا شرف عطا کیا گیا ہے اور خدا تعالیٰ مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے اور کثرت سے ہوتا ہے۔ اِسی کا نام نبوت ہے مگر حقیقی نبوت نہیں۔ نباء ایک عربی لفظ ہے جس کے معنے خبر کے ہیں۔ اب جو شخص کوئی خبر خدا تعالیٰ سے پا کر خلق پر ظاہر کرے گا اس کو عربی میں نبی کہیں گے۔ مَیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے الگ ہو کر کوئی دعویٰ نہیں کرتا یہ تو نزاع لفظی ہے۔ کثرت مکالمہ مخاطبہ کو دوسرے الفاظ میں نبوت کہا جاتا ہے۔ دیکھو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا یہ قول کہ قُوْلُوْا اِنَّهٗ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ وَلَا تَقُوْلُوْا لَا نَبِيَّ بَعْدَهٗ اِس امر کی صراحت کرتا ہے۔ نبوت اگر اسلام میں موقوف ہو چکی ہے تو یقیناً جانو کہ اسلام بھی مَر گیا اور پھر کوئی امتیازی نشان بھی نہیں ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ ۴۱ مورخہ ۱۴ رجولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۲)

﴿۴۴﴾ هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَمَلٰٓئِكَتُهٗ لِیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ۝

خدا اور اس کے فرشتے مومنوں پر درود بھیجتے ہیں تا خدا ان کو ظلمت سے نور کی طرف نکالے۔ (براہین احمدیہ ص۵۴۱)

کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا یعنی خدا کی رحیمیت صرف ایمانداروں سے خاص ہے جس سے کافر کو یعنی بے ایمان اور سرکش کو حصہ نہیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۴۷۷ حاشیہ)

وَھُوَ فَیْضُ صِفَةِ الرَّحِیْمِیَّةِ وَلَا یَنْزِلُ ھٰذَا الْفَیْضُ اِلَّا عَلَی النَّفْسِ الَّتِیْ سَعٰی سَعْیَھَا لِکَسْبِ الْفُیُوْضِ الْمُتَرَقَّبَةِ وَلِذٰلِکَ یَخْتَصُّ بِالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاَطَاعُوْا رَبًّا کَرِیْمًا کَمَا صُرِّحَ فِیْ قَوْلِہٖ تَعَالٰی وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا۔ (اعجاز المسیح صفحہ ۱۳۶، ۱۳۷)

وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا○

انبیاء منجملہ سلسلہ متفاوتہ فطرتِ انسانی کے وہ افرادِ عالیہ ہیں جن کو اس کثرت اور کمال سے نورِ باطنی عطا ہوا ہے کہ گویا وہ نورِ مجسّم ہو گئے ہیں اسی جہت سے قرآن شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نور اور سراجِ منیر رکھا ہے جیسا فرمایا ہے قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ الجزو ۶ وَدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا الجزو ۲۲ یہی حکمت ہے کہ نورِ وحی جس کے لئے نورِ فطرتی کا کامل اور عظیم الشان ہونا شرط ہے صرف انبیاء کو ملا اور انہیں سے مخصوص ہوا۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۱۸۱ حاشیہ)

وَکَذٰلِکَ لَفْظُ الْمَنَارَةِ الَّتِیْ جَاءَ فِی الْحَدِیْثِ فَاِنَّہٗ یَعْنِیْ بِہٖ مَوْضَعَ نُوْرٍ وَقَدْ یُطْلَقُ عَلٰی عَلَمٍ یُهْتَدٰی بِہٖ فَھٰذِہٖ اِشَارَةٌ اِلٰی اَنَّ الْمَسِیْحَ الْاٰتِیْ یُعْرَفُ بِاَنْوَارٍ تَسْبِقُ دَعْوَاہُ فَھِیَ تَکُوْنُ لَہٗ کَعَلَمٍ بِہٖ یَھْتَدُوْنَ وَنَظِیْرُہٗ فِی الْقُرْاٰنِ قَوْلُہٗ تَعَالٰی وَدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا۔
(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۴۵۷، ۴۵۸)

ترجمہ از مرتب:۔ فیضِ رحیمیت اسی شخص پر نازل ہوتا ہے جو فیوضِ مترقبہ کے حصول کے لئے کوشش کرتا ہے اسی لئے یہ ان لوگوں سے خاص ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ربِّ کریم کی اطاعت کی جیسے اللہ تعالیٰ کے اس قول وَکَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا میں تصریح کی گئی ہے۔ (اعجاز المسیح صفحہ ۱۳۶، ۱۳۷)

ترجمہ از مرتب:۔ حدیث میں جو لفظ منارہ آیا ہے اس سے نور کی جگہ مراد ہے اور کبھی اس کا اطلاق اس نشانِ راہ پر ہوتا ہے جس سے راہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔ پس یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آنے والا مسیح اپنے دعویٰ سے پہلے ظاہر ہونے والے انوار کی وجہ سے پہچانا جائے گا اور وہ اس کے لئے ایسی علامات کی مانند ہوں گے جس کے ذریعہ لوگ ہدایت پائیں گے اور اس کی نظیر قرآن مجید میں موجود ہے جیسے فرمایا وَدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۴۵۷، ۴۵۸)

وہ خدا کی طرف بُلانے والا ہے اور وہ ایک روشن چراغ ہے جو اپنی ذات میں روشن اور دوسروں کو روشنی پہنچاتا ہے۔
(تریاق القلوب صفحہ ۶۰)

وہ خدا کی طرف بُلاتا تھا اور شرک سے دُور کرتا تھا اور وہ ایک چراغ تھا زمین پر روشنی پھیلانے والا۔
(نزول المسیح صفحہ ۱۲۴)

ایک گاؤں میں سَو گھر تھے اور صرف ایک گھر میں چراغ جلتا تھا تب جب لوگوں کو معلوم ہؤا تو وہ اپنے اپنے چراغ لے کر آئے اور سب نے اس چراغ سے اپنے چراغ روشن کئے۔ اسی طرح ایک روشنی سے کثرت ہو سکتی ہے۔ اِسی طرف اللہ تعالیٰ اشارہ کرکے فرماتا ہے وَدَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا۔
(یادداشتیں، براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۱۰)

خدا (تعالیٰ) کی طرف سے رُوحانی اصلاح کے لئے مقرر ہونے والے لوگ چراغ کی طرح ہوتے ہیں اِسی واسطے قرآن شریف میں آپؐ کا نام دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا آیا ہے۔ دیکھو کسی اندھیرے مکان میں جہاں سَو پچاس آدمی ہوں اگر ان میں سے ایک کے پاس چراغ روشن ہو تو سب کو اس کی طرف رغبت ہو گی اور چراغ ظلمت کو پاش پاش کرکے اُجالا اور نور کر دے گا۔

اِس جگہ آپؐ کا نام چراغ رکھنے میں ایک اَور باریک حکمت یہ ہے کہ ایک چراغ سے ہزاروں لاکھوں چراغ روشن ہو سکتے ہیں اور اس میں کوئی نقص بھی نہیں آتا۔ چاند سُورج میں یہ بات نہیں۔ اِس سے مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پَیروی اور اطاعت کرنے سے ہزاروں لاکھوں انسان اس مرتبہ پر پہنچیں گے اور آپؐ کا فیض خاص نہیں بلکہ عام اور جاری ہوگا۔ غرض یہ سُنّت اللہ ہے کہ ظلمت کی اِنتہا کے وقت اللہ تعالیٰ اپنی بعض صفات کی وجہ سے کسی انسان کو اپنی طرف سے علم اور معرفت دے کر بھیجتا ہے اور اس کے کلام میں تاثیر اور اس کی توجہ میں جذب رکھ دیتا ہے۔ اس کی دعائیں مقبول ہوتی ہیں مگر وہ ان ہی کو جذب کرتے ہیں اور ان پر ہی اُن کی تاثیرات اثر کرتی ہیں جو اس انتخاب کے لائق ہوتے ہیں دیکھو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام سِرَاجًا مُّنِیْرًا ہے مگر ابوجہل نے کہاں قبول کیا؟
(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۴۱ مورخہ ۱۴ ؍ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۱۱)

۴۹۔ وَلَا تُطِعِ الْکٰفِرِیْنَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَدَعْ اَذٰىهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِیْلًا

کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا یعنی خدا اپنے کاموں کا آپ ہی وکیل ہے کسی دوسرے کو پوچھ پوچھ کر احکام جاری

نہیں کرتا۔ (ست بچن صفحہ ۱۰۳)

۷۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۝

خدا اور اس کے سارے فرشتے اُس نبی کریمؐ پر درُود بھیجتے ہیں۔ اے ایماندارو تم بھی اُس پر درُود بھیجو اور نہایت اخلاص اور محبت سے سلام کرو۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۴۱ حاشیہ)

اللہ اور تمام فرشتے اُس کے اس نبی پر درُود بھیجتے ہیں۔ اے وے لوگو جو ایماندار ہو تم بھی اس پر درُود اور سلام بھیجو۔ (ست بچن صفحہ ۱۰۳)

دُنیا میں کروڑہا ایسے پاک فطرت گذرے ہیں اور آگے بھی ہوں گے لیکن ہم نے سب سے بہتر اور سب سے اعلیٰ اور سب سے خوب تر اس مردِ خدا کو پایا ہے جس کا نام ہے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ان قوموں کے بزرگوں کا ذکر تو جانے دو جن کا حال قرآن شریف میں تفصیل سے بیان نہیں کیا گیا صرف ہم اُن نبیوں کی نسبت اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں جن کا ذکر قرآن شریف میں ہے جیسے حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور دوسرے انبیاء سو ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا میں نہ آتے اور قرآن شریف نازل نہ ہوتا اور وہ برکات ہم بچشمِ خود نہ دیکھتے جو ہم نے دیکھ لئے تو ان تمام گذشتہ انبیاء کا صدق ہم پر مشتبہ رہ جاتا کیونکہ صرف قصّوں سے کوئی حقیقت حاصل نہیں ہوسکتی اور ممکن ہے کہ وہ قصّے صحیح نہ ہوں اور ممکن ہے کہ وہ تمام معجزات جو ان کی طرف منسوب کئے گئے ہیں وہ سب مبالغات ہوں کیونکہ اب ان کا نام ونشان نہیں بلکہ ان گذشتہ کتابوں سے تو خدا کا پتہ ہی نہیں لگتا اور یقیناً سمجھ نہیں سکتے کہ خدا بھی انسان سے ہمکلام ہوتا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے یہ سب قصّے حقیقت کے رنگ میں آگئے اب ہم نہ قال کے طور پر بلکہ حال کے طور پر اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ مکالمہ الٰہیہ کیا چیز ہوتا ہے اور خدا کے نشان کس طرح ظاہر ہوتے ہیں اور کس طرح دعائیں قبول ہو جاتی ہیں اور یہ سب کچھ ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے پایا اور جو کچھ قصّوں کے طور پر غیر قومیں بیان کرتی ہیں وہ سب کچھ ہم نے دیکھ لیا پس ہم نے ایک ایسے نبی کا دامن پکڑا ہے جو خدا نما ہے۔ کسی نے یہ شعر بہت ہی اچھا کہا ہے ؎

محمدِ عربی بادشاہِ ہر دو سرا۔ کرے ہے رُوحِ قدس جس کے دَر کی دربانی

اُسے خدا تو نہیں کہہ سکیں پہ کہتا ہوں۔ کہ اُس کی مرتبہ دانی میں ہے خدا دانی

(چشمہ معرفت حصّہ دوم صفحہ ۲۸۸، ۲۸۹)

ہمارے سید و مولیٰ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی صدق و وفا دیکھئے آپ نے ہر ایک قسم کی بدتحریک کا مقابلہ کیا۔ طرح طرح کے مصائب و تکالیف اٹھائے لیکن پرواہ نہ کی۔ یہی صدق و وفا تھا جس کے باعث اللہ تعالیٰ نے فضل کیا۔ اسی لئے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا اللہ تعالیٰ اور اس کے تمام فرشتے رسول پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو تم درود و سلام بھیجو نبی پر۔ اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسولِ اکرمؐ کے اعمال ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف یا اوصاف کی تحدید کرنے کے لئے کوئی لفظ خاص نہ فرمایا۔ لفظ تو مِل سکتے تھے لیکن خود استعمال نہ کئے۔ یعنی آپ کے اعمالِ صالحہ کی تعریف تحدید سے بیروں تھی۔ اِس قسم کی آیت کسی اَور نبی کی شان میں استعمال نہ کی۔ آپ کی رُوح میں وہ صدق و صفا تھا اور آپ کے اعمال خدا کی نگاہ میں اِس قدر پسندیدہ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لئے یہ حکم دیا کہ آئندہ لوگ شکرگزاری کے طور پر درود بھیجیں۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۵۰/۵۱)

اللہ تعالیٰ کا بے انتہا شکر ہے کہ نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم آیا اور بُت پرستوں سے اس نے نجات دی۔ یہی وہ راز ہے کہ یہ درجہ صرف اور صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن احسانوں کے معاوضہ میں ملا کہ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعاتِ پیش آمدہ کی اگر معرفت ہو اور اِس بات پر پوری اطلاع ہو کہ اس وقت دُنیا کی کیا حالت تھی اور آپؐ نے آکر کیا کیا تو انسان وجد میں آکر اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ کہہ اُٹھتا ہے۔ مَیں سچ سچ کہتا ہوں یہ خیالی اور فرضی بات نہیں ہے قرآن شریف اور دُنیا کی تاریخ اِس امر کی پوری شہادت دیتی ہے کہ نبی کریمؐ نے کیا کیا ورنہ وہ کیا بات تھی جو آپ کے لئے مخصوصاً فرمایا گیا اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا کسی دوسرے نبی کے لئے یہ صدا نہیں آئی۔ پوری کامیابی پوری تعریف کے ساتھ یہی ایک اِنسان دُنیا میں آیا جو محمدؐ کہلایا صلی اللہ علیہ وسلم۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۳)

قبولیتِ دُعا کے تین ہی ذریعے ہیں اوّل اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ دوم يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا سوم موہبتِ الٰہی۔

(ٹریکٹ ۸۰ بعنوان "حضرت اقدس کی ایک تقریر اور مسئلہ وحدۃ الوجود پر ایک خط مرتبہ عرفانی صاحب صفحہ ۲۲")

لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِي الْمَدِيْنَةِ لَنُغْرِيَنَّكَ بِهِمْ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوْنَكَ

فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا۝

جیسے روشنی میں سیاہ دِل چور نہیں ٹھہر سکتا ایسے ہی اِس مقام میں جو تجلیات و انوارِ الٰہی کا مرکز ہو کوئی سیاہ دل خائن بہت مدت نہیں ٹھہر سکتا اِسی لئے قرآن مجید میں فرمایا لَا يُجَاوِرُوْنَكَ فِيْهَآ اِلَّا قَلِيْلًا (نہ پڑوس میں رہیں گے تیرے مگر چند دن) (بدر جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)

۶۲۔ مَلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا۝

یہودیوں کی مقدس کتاب اور اسلام کی مقدس کتاب کی رُو سے یہ عقیدہ متفق علیہ مانا گیا ہے کہ جو شخص ایسا ہو کہ خدا کی کتابوں میں اُس پر ملعون کا لفظ بولا گیا ہو۔ وہ ہمیشہ کے لئے خدا کی رحمت سے محروم اور بے نصیب ہوتا ہے جیسا کہ اِس آیت میں اشارہ ہے مَلْعُوْنِيْنَ ۚ اَيْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا وَقُتِّلُوْا تَقْتِيْلًا یعنی زناکار اور زناکاری کی اشاعت کرنے والے جو مدینہ میں ہیں یہ لعنتی ہیں یعنی ہمیشہ کے لئے خدا کی رحمت سے رَدّ کئے گئے اِس لئے یہ اِس لائق ہیں کہ جہاں ان کو پاؤ قتل کر دو۔ پس اِس آیت میں اِس بات کی طرف یہ عجیب اشارہ ہے کہ لعنتی ہمیشہ کے لئے ہدایت سے محروم ہوتا ہے اور اس کی پیدائش ہی ایسی ہوتی ہے جس پر جھوٹ اور بدکاری کا جوش غالب رہتا ہے اور اِس بناء پر قتل کرنے کا حکم ہوا کیونکہ جو قابلِ علاج نہیں اور مرض متعدی رکھتا ہے اس کا مرنا بہتر ہے۔ (تریاق القلوب صفحہ ۴۹)

۷۰۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى فَبَرَّاَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوْا ۭ وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا۝

خدا نے اس کو ان الزامات سے بَری کیا جو اس پر لگائے گئے تھے اور خدا کے نزدیک وہ وجیہ ہے۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۱۶ حاشیہ)

۷۱۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا۝

زبان کو صدق و صواب پر قائم رکھنے کے لئے تاکید فرمائی اور کہا قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا الجزء ۲۲ یعنی وہ بات مُونہ پر لاؤ جو بالکل راست اور نہایت معقولیت میں ہو اور لغو اور فضول اور جھوٹ کا اُس میں سرِ مُو دخل نہ ہو۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۱۹۳ حاشیہ)

اے وے لوگو جو ایمان لائے ہو خدا سے ڈرو اور وہ باتیں کیا کرو جو سچی اور راست اور حق اور حکمت پر مبنی ہوں۔ (ست بچن صفحہ ۱۰۷)

لغو باتیں مت کیا کرو محل اور موقع کی بات کیا کرو۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۷۲)

جب بات کرو تو حکمت اور معقولیت سے کرو اور لغو گوئی سے بچو۔ (لیکچر لاہور صفحہ ۱۱)

۷۳ إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ..... إِنَّهُ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۝ یعنی ہم نے اپنی امانت کو جس سے مراد عشق محبتِ الٰہی اور مورد ابتلا ہو کر پھر پوری اطاعت کرنا ہے۔ آسمان کے تمام فرشتوں اور زمین کی تمام مخلوقات اور پہاڑوں پر پیش کیا جو بظاہر قوی ہیکل چیزیں تھیں۔ سو ان سب چیزوں نے اس امانت کے اُٹھانے سے انکار کر دیا اور اس کی عظمت کو دیکھ کر ڈر گئیں مگر انسان نے اس کو اُٹھا لیا کیونکہ انسان میں یہ دو خوبیاں تھیں ایک یہ کہ وہ خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے نفس پر ظلم کر سکتا تھا دوسری یہ خوبی کہ وہ خدائے تعالیٰ کی محبت میں اس درجہ تک پہنچ سکتا تھا جو غیر اللہ کو بکلّی فراموش کر دے۔ (توضیح مرام صفحہ ۴۸)

ظلومیت ..... ایک نہایت قابلِ تعریف جوہر انسان میں ہے جو فرشتوں کو بھی نہیں دیا گیا اور اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا یعنی انسان میں ظلومیت اور جہولیت کی صفت تھی اس لئے اُس نے اس امانت کو اُٹھا لیا جس کو وہی شخص اُٹھا سکتا ہے جس میں اپنے نفس کی مخالفت اور اپنے نفس پر سختی کرنے کی صفت ہو۔ غرض یہ صفتِ ظلومیت انسان کے مراتبِ سلوک کا ایک مرکب اور اُس کے مقاماتِ قُرب کے لئے ایک عظیم الشان ذریعہ اس کو عطا کیا گیا ہے جو بوجہ مجاہداتِ شاقہ کے اوائل حال میں نارِ جہنم کی شکل پر تجلّی کرتا ہے لیکن آخر نعما و جنت تک پہنچا دیتا ہے اور درحقیقت قرآن کریم کے دوسرے مقام میں جو یہ آیت ہے وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ۝ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ۝[1] یہ بھی درحقیقت صفتِ محمودہ

---

[1] سورۃ مریم : ۷۲، ۷۳

غلومیت کی طرف ہی اشارہ کرتی ہے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۴۲، ۱۴۳)

غلومیت کی صفت جو مومن میں ہے یہی اس کو خدا تعالیٰ کا پیارا بنا دیتی ہے اور اسی کی برکت سے مومن بڑے بڑے مراحل سلوک کے طے کرتا اور ناقابلِ برداشت تلخیاں اور طرح طرح کے دوزخوں کے جلن اور حرقت اپنے لئے بخوشی خاطر قبول کر لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے جس جگہ انسان کی اعلیٰ درجہ کی مدح بیان کی ہے اور اس کو فرشتوں پر بھی ترجیح دی ہے اس مقام پر اسکی یہی فضیلت پیش کی ہے کہ وہ ظلوم اور جہول ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا یعنی اس امانت کو جو ربوبیّت کا کامل ابتلا ہے جس کو فقط عبودیّت کاملہ اُٹھا سکتی ہے انسان نے اُٹھا لیا کیونکہ وہ ظلوم اور جہول تھا یعنی خدا تعالیٰ کے لئے اپنے نفس پر سختی کر سکتا تھا اور غیر اللہ سے اس قدر دُور ہو سکتا تھا کہ اُس کی صورت علمی سے بھی اُس کا ذہن خالی ہو جاتا تھا۔ واضح ہو کہ ہم سخت غلطی کریں گے اگر اس جگہ ظلوم کے لفظ سے کافر اور سرکش اور مُشرک اور عدل کو چھوڑنے والا مُراد لیں گے کیونکہ یہ ظلوم جہول کا لفظ اس جگہ اللہ جلّ شانہٗ نے انسان کے لئے مقامِ مدح میں استعمال کیا ہے نہ مقامِ ذم میں۔ اور اگر نعوذ باللہ یہ مقامِ ذم میں ہو تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ سب سے بدتر انسان ہی تھا جس نے خدا تعالیٰ کی پاک امانت کو اپنے سر پر اُٹھا لیا اور اُس کے حکم کو مان لیا بلکہ نعوذ باللہ یوں کہنا پڑے گا کہ سب سے زیادہ ظالم اور جاہل انبیاء اور رسول تھے جنہوں نے سب سے پہلے اِس امانت کو اُٹھا لیا حالانکہ اللہ جلّ شانہٗ آپ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو احسنِ تقویم میں پیدا کیا ہے پھر وہ سب سے بدتر کیونکر ہوا اور انبیاء کو سید العادلین قرار دیا ہے پھر وہ ظلوم وجہول دوسرے معنوں کی رُو سے کیونکر کہلاویں ماسوا اس کے ایسا خیال کرنے میں خدا تعالیٰ پر بھی اعتراض لازم آتا ہے کہ اس کی امانت جو وہ دینی چاہتا تھا وہ کوئی خیر اور صلاحیت اور برکت کی چیز نہیں تھی بلکہ شر اور فساد کی چیز تھی کہ شریر اور ظالم نے اس کو قبول کیا اور نیکوں نے اُس کو قبول نہ کیا مگر کیا خدا تعالیٰ کی نسبت یہ ظنّی کرنا جائز ہے کہ جو چیز اُس کے چشمہ سے نکلے اور جس کا نام وہ اپنی امانت رکھے جو پھر اُسی کی طرف رَدّ ہونے کے لائق ہے وہ درحقیقت نعوذ باللہ خراب اور پلید چیز ہو جس کو بجز ایسے ظلوم کے جو درحقیقت سرکش اور نافرمان اور نعمتِ عدل سے نکلی بے نصیب ہے کوئی دوسرا قبول نہ کر سکے۔ افسوس کہ ایسے مکروہ خیالوں والے کچھ بھی خدا تعالیٰ کی عظمت نگہ نہیں رکھتے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ امانت اگر سراسر خیر ہے تو پھر اس کا قبول کر لینا ظلم میں کیوں داخل ہے اور اگر امانت خود شر اور فساد کی چیز ہے تو پھر وہ خدا تعالیٰ کی طرف کیوں منسوب کی جاتی ہے۔ کیا خدا تعالیٰ نعوذ باللہ فساد کا مبداء ہے اور کیا جو چیز اُس کے پاک چشمہ سے نکلتی ہے اس کا نام فساد اور شر رکھنا چاہیئے؟ ظلمت ظلمت کی طرف جاتی ہے اور نور نور کی طرف۔ سو امانت نور تھی اور انسانی ظلوم جہول بھی ان معنوں کر کے جو ہم بیان کر چکے ہیں ایک نور ہے اِس لئے نور نے نور کو قبول کر لیا۔ وہ اعلیٰ درجہ کا نور جو انسان کو دیا گیا یعنی انسانِ کامل کو وہ ملائک میں نہیں تھا، نجوم میں نہیں تھا قمر میں نہیں تھا، آفتاب میں بھی نہیں تھا، وہ زمین کے سمندروں اور دریاؤں میں بھی نہیں تھا۔ وہ لعل اور یاقوت اور

زمرد اور الماس اور موتی میں بھی نہیں تھا۔ غرض وہ کسی چیز ارضی اور سماوی میں نہیں تھا صرف انسان میں تھا یعنی انسانِ کامل میں جس کا اتم اور اکمل اور اعلیٰ اور ارفع فرد ہمارے سید و مولیٰ سید الانبیاء سید الاحیاء محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں سو وہ نور اس انسان کو دیا گیا اور حسبِ مراتب اس کے تمام ہمرنگوں کو بھی یعنی ان لوگوں کو بھی جو کسی قدر وہی رنگ رکھتے ہیں اور امانت سے مراد انسانِ کامل کے وہ تمام قویٰ اور عقل اور علم اور دل اور جان اور حواس اور خوف اور محبت اور عزت اور وجاہت اور جمیع نعماء رُوحانی و جسمانی ہیں جو خدا تعالیٰ انسانِ کامل کو عطا کرتا ہے اور پھر انسانِ کامل برطبق آیت اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا[۱] اس ساری امانت کو جنابِ الٰہی کو واپس دے دیتا ہے یعنی اُس میں فانی ہو کر اس کے راہ میں وقف کر دیتا ہے جیسا کہ ہم مضمون حقیقتِ اسلام میں بیان کر چکے ہیں اور یہ شان اعلیٰ اور اکمل اور اتم طور پر ہمارے سید ہمارے مولیٰ ہمارے ہادی نبی اُمّی صادق مصدوق محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں پائی جاتی تھی جیسا کہ خود خدا تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝[۲] وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ[۳] قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝[۴] فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِیَ لِلّٰهِ[۵] وَ اُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝[۶] یعنی ان کو کہہ دے کہ میری نماز اور میری پرستش میں جدوجہد اور میری قربانیاں اور میرا زندہ رہنا اور میرا مرنا سب خدا کے لئے اور اس کی راہ میں ہے۔ وہی خدا جو تمام عالموں کا ربّ ہے جس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اِس بات کا حکم دیا گیا ہے اور مَیں اوّل المسلمین ہوں یعنی دُنیا کی ابتداء سے اُس کے اخیر تک میرے جیسا اور کوئی کامل انسان نہیں جو ایسا اعلیٰ درجہ کا فنافی اللہ ہو۔ جو خدا تعالیٰ کی ساری امانتیں اُس کو واپس دینے والا ہو۔ اِس آیت میں اُن نادان موحّدوں کا ردّ ہے جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسرے انبیاء پر فضیلتِ کُلّی ثابت نہیں۔ اور ضعیف حدیثوں کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس بات سے منع فرمایا ہے کہ مجھ کو یونس بن متّیٰ سے بھی زیادہ فضیلت دی جائے۔ یہ نادان نہیں سمجھتے کہ اگر وہ حدیث صحیح بھی ہو تب بھی وہ بطور انکسار اور تذلّل ہے جو ہمیشہ ہمارے سید صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی۔ ہر ایک بات کا ایک موقع اور محل ہوتا ہے۔ اگر کوئی صالح اپنے خط میں احقر عباد اللہ لکھے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ شخص درحقیقت تمام دُنیا یہاں تک کہ بُت پرستوں اور تمام فاسقوں سے بدتر ہے اور خود اقرار کرتا ہے کہ وہ احقر عباد اللہ ہے کس قدر نادانی اور شرارتِ نفس

---

[۱] سورۃ النساء: ۵۹ [۲] سورۃ الانعام: ۱۶۳، ۱۶۴ [۳] سورۃ الانعام: ۱۵۴
[۴] سورۃ آلِ عمران: ۳۲ [۵] سورۃ آلِ عمران: ۲۱ [۶] سورۃ المؤمن: ۶۷

ہے۔

غور سے دیکھنا چاہیئے کہ جس حالت میں اللہ جلّ شانہٗ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نام اوّل المسلمین رکھتا ہے اور تمام مطیعوں اور فرمانبرداروں کا سردار ٹھہراتا ہے اور سب سے پہلے امانت کو واپس دینے والا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرار دیتا ہے تو پھر کیا بعد اِس کے کسی قرآن کریم کے ماننے والے کو گنجائش ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ اعلیٰ میں کسی طرح جرح کر سکے۔ خدا تعالیٰ نے آیت موصوفہ بالا میں اسلام کے لئے کئی مراتب رکھ کر سب مدارج سے اعلیٰ درجہ وہی ٹھہرایا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فطرت کو عنایت فرمایا۔ سُبْحَانَ اللّٰهِ مَا اَعْظَمَ شَانَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ۔

موسیٰ و عیسیٰ ہمہ خیلِ تواند جملہ دریں راہ طفیلِ تواند

پھر بقیہ ترجمہ یہ ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ اپنے رسول کو فرماتا ہے کہ اِن کو کہہ دے کہ میری راہ جو ہے وہی راہ سیدھی ہے سو تم اس کی پیروی کرو اور اَور راہوں پر مت چلو کہ وہ تمہیں خدا تعالیٰ سے دُور ڈال دیں گی۔ اِن کو کہہ دے اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو آؤ میرے پیچھے پیچھے چلنا اختیار کرو یعنی میرے طریق پر جو اسلام کی اعلیٰ حقیقت ہے قدم مارو تب خدا تعالیٰ تم سے بھی پیار کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔ اِن کو کہہ دے کہ میری راہ یہ ہے کہ مجھے حکم ہُوا ہے کہ اپنا تمام وجود خدا تعالیٰ کو سونپ دوں اور اپنے تئیں رب العالمین کیلئے خالص کروں یعنی اس میں فنا ہو کر جیسا کہ وہ رب العالمین ہے مَیں خادم العالمین ہوں اور ہمہ تن اُسی کا اور اُسی کی راہ کا ہو جاؤں۔ سو مَیں نے اپنا تمام وجود اور جو کچھ میرا تھا خدا تعالیٰ کا کر دیا ہے اب کچھ بھی میرا نہیں جو کچھ میرا ہے وہ سب اس کا ہے۔

اور یہ وسوسہ کہ ایسے معنے آیت ظلوم و جہول کے کس نے متقدمین سے کئے ہیں اَور کون اہلِ زبان میں سے ظلم کے ایسے معنے بھی کرتا ہے۔ اِس وہم کا جواب یہ ہے کہ ہمیں بعد کلام اللہ کے کسی اَور سند کی ضرورت نہیں۔ کلامِ الٰہی کے بعض مقامات بعض کی شرح ہیں۔ پس جس حالت میں خدا تعالیٰ نے بعض متقیوں کا نام بھی ظالم رکھا ہے اور مراتبِ ثلاثہ تقویٰ سے پہلا مرتبہ تقویٰ کا ظلم کو ہی ٹھہرایا ہے تو اس سے ہم نے قطعی اور یقینی طور پر سمجھ لیا کہ اِس ظلم کے لفظ سے وہ ظلم مراد نہیں ہے جو تقویٰ سے دُور اور کفّار اور مُشرکین اور نافرمانوں کا شغل ہے بلکہ وہ ظلم مراد ہے جو سلوک کے ابتدائی حالات میں متقیوں کے لئے شرطِ متمم ہے یعنی جذباتِ نفسانی پر حملہ کرنا اور بشریّت کی ظلمت کو اپنے نفس سے کم کرنے کے لئے کوشش کرنا جیسا کہ اِس دوسری آیت میں بھی کم کرنے کے معنی ہیں اور وہ یہ ہے وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا اَیْ وَلَمْ تَنْقُصْ دیکھو قاموس اور صحاح اور صراح جو ظلم کے معنے کم کرنے کے بھی لکھے ہیں اور اِس آیت کے یہی معنے کئے ہیں یعنی وَلَمْ تَنْقُصْ۔

ماسوا اِس کے اِس معنے کے کرنے میں یہ عاجز منفرد نہیں۔ بڑے بڑے محقق اور فضلاء نے جو اہلِ زبان تھے یہی معنے کئے ہیں چنانچہ منجملہ ان کے صاحب فتوحاتِ مکیہ ہیں جو اہلِ زبان بھی ہیں وہ اپنی کتاب تفسیر میں جو مصر کے چھاپہ میں چھپ کر شائع ہوئی ہے یہی معنے کرتے ہیں چنانچہ انہوں نے زیرِ تفسیر آیت وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا یہی معنے لکھے ہیں کہ یہ ظلوم وجہول مقامِ مدح میں ہے اور اس سے مطلب یہی ہے کہ انسان مومن احکامِ الٰہی کی بجا آوری میں اپنے نفس پر اس طور سے ظلم کرتا ہے جو نفس کے جذبات اور خواہشوں کا مخالف ہو جاتا ہے اور اس سے اس کے جوشوں کو گھٹاتا ہے اور کم کرتا ہے اور صاحبِ تفسیر حسینی خواجہ محمد پارسا کی تفسیر سے نقل کرتے ہیں کہ آیت کے یہ معنی ہیں کہ انسان نے اس امانت کو اِس لئے اُٹھا لیا کہ وہ ظلوم تھا یعنی اِس بات پر قادر تھا کہ اپنے نفس اور اس کی خواہشوں سے باہر آجائے یعنی جذباتِ نفسانی کو کم بلکہ معدوم کر دیوے اور ہویّتِ مطلقہ میں گم ہو جائے اور انسان جہول تھا اِس لئے کہ اس میں یہ قوت ہے کہ غیر حق سے بکلی غافل اور نادان ہو جائے اور بقول لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ نفی ماسوا کی کر دیوے اور ابنِ جریر بھی جو رئیس المفسّرین ہے اِس آیت کی شرح میں لکھتا ہے کہ ظلوم اور جہول کا لفظ محلِ مدح میں ہے نہ ذم میں۔ غرض اکابر اور محققین جن کی آنکھوں کو خدا تعالیٰ نے نورِ معرفت سے منور کیا تھا وہ اکثر اسی طرف گئے ہیں کہ اِس آیت کے بجز اِس کے اَور کوئی معنے نہیں ہو سکتے کہ انسان نے خدا تعالیٰ کی امانت کو اُٹھا کر ظلوم اور جہول کا خطاب مدح کے طور پر حاصل کیا نہ ذم کے طور پر۔ چنانچہ ابنِ کثیر نے بھی بعض روایات اِس کی تائید میں لکھی ہیں اور اگر ہم اِس تمام آیت پر کہ اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ۭ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ایک نظر غور کی کریں تو یقینی طور پر معلوم ہوگا کہ وہ امانت جو فرشتوں اور زمین اور پہاڑوں اور تمام کو اکب پر عرض کی گئی تھی اور انہوں نے اُٹھانے سے انکار کیا تھا وہ جس وقت اِنسان پر عرض کی گئی تھی تو بلاشبہ سب سے اوّل انبیاء اور رسولوں کی رُوحوں پر عرض کی گئی ہوگی کیونکہ وہ انسانوں کے سردار اور انسانیت کے حقیقی مفہوم کے اوّل المستحقین ہیں پس اگر ظلوم اور جہول کے معنے یہی مراد لئے جائیں جو کافر اور مُشرک اور پکّے نافرمان کو کہتے ہیں تو پھر نعوذ باللہ سب سے پہلے انبیاء کی نسبت اِس نام کا اطلاق ہوگا۔ لہٰذا یہ بات نہایت روشن اور بدیہی ہے کہ ظلوم اور جہول کا لفظ اِس جگہ محلِ مدح میں ہے اور ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کے حکم کو مان لیا جائے اور اس سے مُنہ پھیرنا موجبِ معصیت نہیں ہو سکتا یہ تو عینِ سعادت ہے تو پھر ظلوم اور جہول کے حقیقی معنے جو اَبی اور سرکشی کو مُستلزم ہیں کیونکر اس مقام کے مناسبِ حال ہو سکتے ہیں۔ جو شخص قرآن کریم کی اسالیبِ کلام کو بخوبی جانتا ہے اُس پر یہ پوشیدہ نہیں کہ بعض اَوقات وہ کریم و رحیم جلشانہٗ اپنے خواص عباد کے لئے ایسا لفظ استعمال کر دیتا ہے کہ بظاہر بدنما ہوتا ہے مگر معنًا نہایت محمود اور

تعریفیہ کا کلمہ ہوتا ہے جیسا کہ اللہ جل شانہٗ نے اپنے نبی کریمؐ کے حق میں فرمایا وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰی۔ اب ظاہر ہے کہ ضال کے معنے مشہور اور متعارف جو اہلِ لغت کے مُنہ پر چڑھے ہوئے ہیں گمراہ کے ہیں جس کے اعتبار سے آیت کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ نے (اے رسول اللہ) تجھ کو گمراہ پایا اور ہدایت دی حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی گمراہ نہیں ہوئے اور جو شخص مسلمان ہو کر یہ اعتقاد رکھے کہ کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر میں ضلالت کا عمل کیا تھا تو وہ کافر بے دین اور حدِ شرعی کے لائق ہے بلکہ آیت کے اِس جگہ وہ معنی لینے چاہئیں جو آیت کے سیاق اور سباق سے ملتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ نے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت فرمایا اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى ۝ وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۝ وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى ۝[1] یعنی خدا تعالیٰ نے تجھے یتیم اور بیکس پایا اور اپنے پاس جگہ دی اور تجھ کو ضال (یعنی عاشق وجہ اللہ) پایا پس اپنی طرف کھینچ لایا اور تجھے درویش پایا پس غنی کر دیا۔ اِن معنوں کی صحت پر یہ ذیل کی آیتیں قرینہ ہیں جو ان کے بعد آتی ہیں یعنی یہ کہ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ۝[2] کیونکہ یہ تمام آیتیں لف نشر مرتب کے طور پر ہیں اور پہلی آیتوں میں جو مدعا مخفی ہے دوسری آیتیں اس کی تفصیل اور تصریح کرتی ہیں مثلاً پہلے فرمایا اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَاٰوٰى اس کے مقابل پر یہ فرمایا فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ یعنی یاد کر کہ تُو بھی یتیم تھا اور ہم نے تجھ کو پناہ دی ایسا ہی تُو بھی یتیموں کو پناہ دے۔ پھر بعد اِس آیت کے فرمایا وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى اِس کے مقابل پر یہ فرمایا وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ یعنی یاد کر کہ تُو بھی ہمارے وصال اور جمال کا سائل اور ہمارے حقائق اور معارف کا طالب تھا سو جیسا کہ ہم نے باپ کی جگہ ہو کر تیری جسمانی پرورش کی ایسا ہی ہم نے اُستاد کی جگہ ہو کر تمام دروازے علوم کے تجھ پر کھول دئے اور اپنے لقاء کا شربت سب سے زیادہ عطا فرمایا اور جو تُو نے مانگا سب ہم نے تجھ کو دیا سو تُو بھی مانگنے والوں کو رَدّ مت کر اور ان کو مت جھڑک۔ اور یاد کر کہ تُو عائل تھا اور تیری معیشت کے ظاہری اسباب بکلّی منقطع تھے سو خدا خود تیرا متولی ہوا اور غیروں کی طرف حاجت لے جانے سے تجھے غنی کر دیا۔ نہ تُو والد کا محتاج ہوا نہ والدہ کا نہ استاد کا اور نہ کسی غیر کی طرف حاجت لے جانے کا بلکہ یہ سارے کام تیرے خدا تعالیٰ نے آپ ہی کر دئے اور پیدا ہوتے ہی اُس نے تجھ کو آپ سنبھال لیا سو اُس کا شکر بجا لا اور حاجت مندوں سے تُو بھی ایسا ہی معاملہ کر۔ اب اِن تمام آیات کا مقابلہ کر کے صاف طور پر کُھلتا ہے کہ اِس جگہ ضال کے معنے گمراہ نہیں ہے بلکہ انتہائی درجہ کے تعشق کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ حضرت یعقوبؑ کی نسبت اِسی کے مناسب یہ آیت ہے اِنَّكَ لَفِيْ ضَلٰلِكَ الْقَدِيْمِ[3] سو یہ دونوں لفظ ظلم اور ضلالت اگرچہ

---

[1] سورۃ الضحیٰ: ۷ تا ۹ [2] سورۃ الضحیٰ: ۱۰ تا ۱۲ [3] سورۃ یوسف: ۹۶

ان معنوں پر بھی آتے ہیں کہ کوئی شخص جادۂ اعتدال اور انصاف کو چھوڑ کر اپنے شہوات غضبیہ یا بہیمیہ کا تابع ہو جاوے لیکن قرآن کریم میں عشاق کے حق میں بھی آئے ہیں جو خدا تعالیٰ کے راہ میں عشق کی مستی میں اپنے نفس اور اس کے جذبات کو پیروی کے نیچے کچل دیتے ہیں۔ اسی کے مطابق حافظ شیرازی کا یہ شعر ہے

آسمان بار امانت نتوانست کشید ٭ قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

اس دیوانگی سے حافظ صاحب حالت تعشق اور شدت حرص اطاعت مراد لیتے ہیں۔ غرض ان آیتوں کی حقیقت واقعی یہی ہے جو خدا تعالیٰ نے میرے پر کھولی اور میں ہرگز ایسے معنے نہیں کروں گا جن سے ایک طرف تو یہ لازم آوے کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ پاک امانت نہیں تھی بلکہ کوئی فساد کی بات تھی جو ایک مفسد ظالم نے قبول کر لی اور نیکوں نے اس کو قبول نہ کیا اور دوسری طرف تمام مقدس رسولوں اور نبیوں کو جو اوّل درجہ پر امانت کے محمل ہیں ظالم ٹھہرایا جاوے اور میں بیان کر چکا ہوں کہ دراصل امانت اور اسلام کی حقیقت ایک ہی ہے اور امانت اور اسلام دراصل محمود چیز ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا دیا ہوا اُسی کو واپس دیا جاوے جیسے امانت واپس دی جاتی ہے پس جس نے ایک محمود اور پسندیدہ چیز کو قبول کر لیا اور خدا تعالیٰ کے حکم سے مُنہ نہ پھیرا اور اُس کی مرضی کو اپنی مرضی پر مقدم رکھا وہ لائق مذمت کیوں ٹھہرے۔ اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اِس آیت کے آگے خدا تعالےٰ فرماتا ہے:۔

لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ وَيَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○

یعنی انسان نے جو امانت اللہ کو قبول کر لیا تو اس سے یہ لازم آیا جو منافقین اور منافقات اور مشرکین اور مشرکات جنہوں نے صرف زبان سے قبول کیا اور عملاً اس کے پابند نہیں ہوئے وہ معذب ہوں اور مومنین اور مومنات جنہوں نے امانت کو قبول کر کے عملاً پابندی بھی اختیار کی وہ مورد رحمت الٰہی ہوں۔ یہ آیت بھی صاف اور صریح طور پر بول رہی ہے کہ آیت موصوفہ میں ظلوم وجہول سے مراد مومن ہیں جن کی طبیعتوں اور استعدادوں نے امانت کو قبول کر لیا اور پھر اس پر کاربند ہو گئے کیونکہ صاف ظاہر ہے کہ مشرکوں اور منافقوں نے کامل طور پر قبول نہیں کیا اور حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ میں انسان کے لفظ پر الف لام ہے وہ بھی درحقیقت تخصیص کے لئے ہے جس سے خدا تعالیٰ کا یہ منشاء ثابت ہوتا ہے کہ تمام انسانوں نے اس امانت کو کامل طور پر قبول نہیں کیا صرف مومنوں نے قبول کیا ہے اور منافقوں اور مشرکوں کی فطرتوں میں گو ایک ذرہ استعداد کا موجود تھا مگر بوجہ نقصان استعداد وہ کامل طور پر اِس پیارے لفظ ظلوم اور جہول سے حصہ نہ لے سکے اور جن کو بڑی قوت ملی تھی وہ کامل طور پر اس نعمت کو لے گئے۔ انہوں نے اس امانت کے قبول کرنے کا صرف اپنی زبان سے اقرار نہیں کیا بلکہ اپنے اعمال

اور افعال میں ثابت کر کے دکھلا دیا اور جو امانت لی تھی کمال دیانت کے ساتھ اُس کو واپس دے دیا۔

بالآخر یہ بھی واضح رہے کہ جہول کا لفظ بھی ظلوم کے لفظ کی طرح اِن معنوں میں استعمال کیا گیا ہے جو اتّقاء اور اصطفاء کے مناسب حال ہیں کیونکہ اگر جاہلیت کا حقیقی مفہوم مراد ہو جو علوم اور عقائد صحیحہ سے بیخبری اور ناراستی اور بیہودہ باتوں میں مبتلا ہونا ہے تو یہ تو صریح متقیوں کی صفت کے برخلاف ہے کیونکہ حقیقی تقویٰ کے ساتھ جاہلیت جمع نہیں ہو سکتی حقیقی تقویٰ اپنے ساتھ ایک نور رکھتا ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّکُمْ فُرْقَانًا وَّیُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ[1] وَیَجْعَلْ لَّکُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِہٖ[2] یعنی اے ایمان لانے والو اگر تم متقی ہونے پر ثابت قدم رہو اور اللہ تعالیٰ کے لئے اتّقاء کی صفت میں قیام اور اِستحکام اختیار کرو تو خدا تعالیٰ تم میں اور تمہارے غیروں میں فرق رکھ دے گا۔ وہ فرق یہ ہے کہ تم کو ایک نور دیا جائے گا جس نور کے ساتھ تم اپنی تمام راہوں میں چلو گے یعنی وہ نور تمہارے تمام افعال اور اقوال اور قویٰ اور حواس میں آجائے گا۔ تمہاری عقل میں بھی نور ہوگا اور تمہاری ایک اٹکل کی بات میں بھی نور ہوگا اور تمہاری آنکھوں میں بھی نور ہوگا اور تمہارے کانوں اور تمہاری زبانوں اور تمہارے بیانوں اور تمہاری ہر ایک حرکت اور سکون میں نور ہوگا اور جن راہوں میں تم چلو گے وہ راہیں نورانی ہو جائیں گی۔ غرض جتنی تمہاری راہیں تمہارے قویٰ کی راہیں تمہارے حواس کی راہیں ہیں وہ سب نور سے بھر جائیں گی اور تم سراپا نور میں ہی چلو گے۔

اب اِس آیت سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے کہ تقویٰ سے جاہلیت ہرگز جمع نہیں ہو سکتی ہاں فہم اور ادراک حسبِ مراتب تقویٰ کم و بیش ہو سکتا ہے۔ اِس مقام سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ بڑی اور اعلیٰ درجہ کی کرامت جو اَولیاء اللہ کو دی جاتی ہے جن کو تقویٰ میں کمال ہوتا ہے وہ یہی دی جاتی ہے کہ ان کے تمام حواس اور عقل اور فہم اور قیاس میں نور رکھا جاتا ہے اور اُن کی قوتِ کشفی نور کے پانیوں سے ایسی صفائی حاصل کرلیتی ہے کہ جو دوسروں کو نصیب نہیں ہوتی۔ اُن کے حواس نہایت باریک بین ہو جاتے ہیں اور معارف اور دقائق کے پاک چشمے اُن پر کھولے جاتے ہیں اور فیض سائغ ربانی اُن کے رگ و ریشہ میں خون کی طرح جاری ہو جاتا ہے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۵۷ تا ۱۷۹)

آیت وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ ..... بھی دلالت کر رہی ہے کہ خدا کا حقیقی مطیع انسان ہی ہے جو اپنی اطاعت کو محبت اور عشق تک پہنچاتا ہے اور خدا کی بادشاہت کو ہزار ہا بلاؤں کو سر پر لے کر زمین پر ثابت کرتا ہے پس یہ طاعت جو درد دل سے ملی ہوئی ہے فرشتے اس کو کب بجا لا سکتے ہیں۔ (کشتی نوح صفحہ ۲۷ حاشیہ)

---

[1] سورۃ الانفال: ۳۰ [2] سورۃ الحدید: ۲۹

ہم نے اپنی امانت کو جو امانت کی طرح واپس دینی چاہیئے تمام زمین و آسمان کی مخلوق پر پیش کیا پس سب نے اُس امانت کے اُٹھانے سے اِنکار کر دیا اور اس سے ڈرے کہ امانت کے لینے سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو مگر انسان نے اس امانت کو اپنے سر پر اُٹھالیا کیونکہ وہ ظلوم اور جہول تھا۔ یہ دونوں لفظ انسان کے لئے محل مدح میں ہیں نہ محلِ مذمت میں اور ان کے معنی یہ ہیں کہ انسان کی فطرت میں ایک صفت تھی کہ وہ خدا کے لئے اپنے نفس پر ظلم اور سختی کر سکتا تھا اور ایسا خدا تعالیٰ کی طرف جھک سکتا تھا کہ اپنے نفس کو فراموش کر دے۔ اِس لئے اس نے منظور کیا کہ اپنے تمام وجود کو امانت کی طرح پاوے اور پھر خدا کی راہ میں خرچ کر دے۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصّہ پنجم صفحہ ۷۹)

سُورَةُ سَبَا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۝

۱۱. وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۭ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ۝

يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ اے پہاڑو اور اے پرندو میرے اِس بندہ کے ساتھ وجد اور رِقّت سے میری یاد کرو۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۹۱)

تدابیرِ مشہودہ سے الگ ہو کر جو فعل ہوتا ہے اس میں اعجازی رنگ ہوتا ہے۔ معجزات جن باتوں میں صادر ہوتے ہیں ان میں سے بہت سے افعال ایسے ہوتے ہیں کہ دوسرے لوگ بھی ان میں شریک ہوتے ہیں مگر نبی ان تدابیر اور اسباب سے الگ ہو کر وہی فعل کرتا ہے اِس لئے وہ معجزہ ہوتا ہے اور یہی بات یہاں سلیمانؑ کے قصّہ میں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کیا لوگ قصائد نہ کہتے تھے؟ کہتے تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کلامِ فصیح و بلیغ پیش کیا تو وہ جوڑ توڑ کا نتیجہ نہ تھا بلکہ وحی سے تھا اِس لئے معجزہ تھا کہ درمیان اسبابِ عادیہ نہ تھے۔ آپؐ نے کوئی تعلیم نہ پائی تھی اور بدّوں کوشش کے وہ کلام آپؐ نے پیش کیا۔ غرض اسی طرح پر لوہا نرم کرنے کا معجزہ ہے کہ اس میں اسبابِ عادیہ نہ تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اِس کے اَور معنی بھی ہوں۔ مشکلات صعب سے بھی مراد لوہا ہوتا ہے۔ وہ حضرت سلیمانؑ پر آسان ہو گئیں مگر اصل اعجاز کا کسی حال میں ہم انکار نہیں کرتے ورنہ اگر خدا تعالیٰ کی ان قدرتوں پر ایمان نہ ہو تو پھر خدا کو کیا مانا ہم اس کو خارقِ عادت نہیں

مان سکتے جو قرآن شریف کے بیان کردہ قانونِ قدرت کے خلاف ہو۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۰ مورخہ ۱۰؍ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

۱۴۔ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ۭ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ ۝

بعض عام خام خیال کوتاہ فہم لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ ہر ایک آدمی کو جہنم میں ضرور جانا ہوگا یہ غلط ہے ہاں اِس میں شک نہیں کہ تھوڑے ہیں جو جہنم کی سزا سے بالکل محفوظ ہیں اور یہ تعجب کی بات نہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۳۳ مورخہ ۱۶؍ ستمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۶)

خوش قسمت وہی انسان ہے جو ایسے مردانِ خدا کے پاس رہ کر (جن کو اللہ تعالیٰ اپنے وقت پر بھیجتا ہے) اس غرض اور مقصد کو حاصل کرے جس کے لئے وہ آتے ہیں۔ ایسے لوگ اگرچہ تھوڑے ہوتے ہیں لیکن ہوتے ضرور ہیں۔ وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ۔ اگر تھوڑے نہ ہوتے تو پھر بےقدری ہو جاتی یہی وجہ ہے کہ سونا چاندی لوہے اور ٹین کی طرح عام نہیں ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۴ مورخہ ۳۱؍ جنوری ۱۹۰۱ء صفحہ ۵)

خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ کہ شاکر اور سمجھدار بندے ہمیشہ کم ہوتے ہیں جو کہ حقیقی طور پر قرآن مجید پر چلنے والے ہیں اور خدا تعالیٰ نے ان کو اپنی محبت اور تقویٰ عطا کیا ہے۔ وہ خواہ قلیل ہوں مگر اصل میں وہی سوادِ اعظم ہے۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۶ مورخہ ۱۷؍ فروری ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

اللہ تعالیٰ کثرت اور تعداد کے رُعب میں نہیں آتا قَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ۔ دیکھو حضرت نوحؑ کے وقت کس قدر مخلوق غرقِ آب ہوئی اور ان کے بالمقابل جو لوگ بچ گئے ان کی تعداد کس قدر تھی۔

(بدر جلد ۲ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۶؍ اپریل ۱۹۰۶ء صفحہ ۲)

۱۵۔ فَلَمَّا قَضَيْنَا عَلَيْهِ الْمَوْتَ مَا دَلَّهُمْ عَلٰي مَوْتِهٖٓ اِلَّا دَاۗبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ ۚ فَلَمَّا خَرَّ تَبَيَّنَتِ الْجِنُّ اَنْ لَّوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ

اَلْعَذَابِ الْمُهِيْنِ ۝ مَا لَبِثُوْا فِي

سلیمان کی موت پر دلالت کرنے والا کوئی امر نہ تھا۔ یہ ساری شرارت گویا دابۃ الارض کی تھی کہ اس نے عصا کھا لیا اور وہ گر پڑا۔ خدا تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ سچ ہے۔ یہ قصّے اور داستانیں نہیں ہیں بلکہ یہ حقائق اور معارف ہیں۔ اسلام راستی کا عصا تھا جو اپنے سہارے کھڑا تھا اور اس کے سامنے کوئی آریہ، ہندو، عیسائی دم نہ مار سکتا تھا لیکن جب سے یہ دابۃ الارض پیدا ہوئے اور انہوں نے قرآن کو چھوڑ کر موضوع روایتوں پر اپنا انحصار رکھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف سے اسلام پر حملے ہونے شروع ہوگئے۔ دابۃ الارض کے معنے اصل میں یہ ہیں کہ ایک دیمک ہوتی ہے جس میں کوئی خیر نہیں جو لکڑی اور مٹی وغیرہ کو کھا جاتی ہے۔ اس میں فنا کا مادہ ہے اور اچھی چیز کو فنا کرنا چاہتی ہے اس میں آتشی مادہ ہے۔ اب اس کا مطلب یہ ہے کہ دابۃ الارض اس وقت کے علماء ہیں جو جھوٹے معنے کرتے ہیں اور اسلام پر جھوٹے الزام لگاتے ہیں..... غرض عصائے اسلام جس کے ساتھ اسلام کی شوکت اور رعب تھا اور جس کے ساتھ امن اور سلامتی تھی اس دابۃ الارض نے گرا دیا ہے۔ پس جیسے وہ دابۃ الارض تھا یہ اس سے بدتر ہیں۔ اُس سے تو صرف ملک میں فتنہ پڑا تھا مگر ان سے دین میں فساد پیدا ہوا اور ایک لاکھ سے زائد لوگ مرتد ہوگئے ..... یہ بات بہت درست ہے کہ اسلام اپنی ذات میں کامل، بے عیب اور پاک مذہب ہے لیکن نادان دوست اچھا نہیں ہوتا اس دابۃ الارض نے اسلام کو نادان دوست بن کر جو صدمہ اور نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی بہت ہی مشکل ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۱۸ مورخہ ۱۰ رمئی ۱۹۰۲ء صفحہ ۵)

یہ مسلمان دابۃ الارض ہیں اور اسی لئے اس کے مخالف ہیں جو آسمان سے آتا ہے۔ جو زمینی بات کرتا ہے وہ دابۃ الارض ہے۔ خدا تعالیٰ نے ایسا ہی فرمایا تھا۔ رُوحانی امور کو وہی دریافت کرتے ہیں جن میں مناسبت ہو چونکہ ان میں مناسبت نہ تھی اس لئے انہوں نے عصائے دین کو کھا لیا جیسے سلیمان کے عصا کو کھا لیا تھا۔ اور اس سے آگے قرآن شریف میں لکھا ہے کہ جب جنّوں کو یہ پتہ لگا تو انہوں نے سرکشی اختیار کی۔ اسی طرح پر عیسائی قوم نے جب اسلام کی یہ حالت دیکھی یعنی اس دابۃ الارض نے اس عصائے راستی کو کمزور کر دیا تو ان قوموں کو اس پر وار کرنے کا موقع دے دیا۔ جن وہ ہے جو چھپ کر وار کرے اور پیار کے رنگ میں دشمنی کرتے ہیں وہی پیار جو حوا سے آکر نحاش نے کیا تھا۔ اس پیار کا انجام وہی ہونا چاہیئے جو ابتداء میں ہوا۔ آدم پر اسی سے مصیبت آئی۔ اُس وقت گویا وہ خدا سے بڑھ کر خیر خواہ ہو گیا۔ اسی طرح پر یہ بھی حیاتِ ابدی پیش کرتے ہیں جو شیطان نے کی تھی اس لئے قرآن شریف کے اوّل اور آخر کو اس پر ختم کیا۔ اس میں سِر یہ تھا کہ تا بتایا جاوے کہ ایک آدم آخر میں بھی آنے والا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۷ رجولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

دَآبَّةُ الْاَرْضِ تَاْكُلُ مِنْسَاَتَهٗ قرآن شریف سے یہ بھی ثابت ہے کہ جب تک انسان میں روحانیت پیدا نہ ہو یہ زمین کا کیڑا ہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

۲۹۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۝

ہم ایسے نبی کے وارث ہیں جو رَحْمَةٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ اور كَآفَّةً لِّلنَّاسِ کے لئے رسول ہو کر آیا۔ جس کی کتاب کا خدا محافظ اور جس کے حقائق و معارف سب سے بڑھ کر ہیں پھر ان معارف اور حقائق کو پانے والا کیوں کم ہے؟

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۱)

۳۱۔ قُلْ لَّكُمْ مِّيْعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَاْخِرُوْنَ عَنْهُ سَاعَةً وَّلَا تَسْتَقْدِمُوْنَ۝

تمہارے لئے ٹھیک ایک برس کی میعاد ہے نہ اس سے تم تاخیر کر سکو گے نہ تقدیم۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات صفحہ ۱۸)

یوم سے مراد اس جگہ برس ہے چنانچہ بائبل میں بھی یہ محاورہ پایا جاتا ہے سو پورے برس کے بعد بدر کی لڑائی کا عذاب مکہ والوں پر نازل ہوا جو پہلی لڑائی تھی۔

(ایک عیسائی کے تین سوال اور ان کے جوابات صفحہ ۱۸ حاشیہ)

۴۴۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ۝

قرآن شریف کی اعلیٰ درجے کی تاثیروں کو بھی دیکھئے کہ کس قوت سے اُس نے وحدانیت الٰہی کو اپنے سچے متبعین

کے دلوں میں بھرا ہے اور کس عجیب طور سے اُس کی عالیشان تعلیموں نے صدہا سالوں کی عاداتِ راسخہ اور ملکاتِ ردیہ کا قلع و قمع کر کے اور ایسی رسومِ قدیمہ کو کہ جو طبیعت ثانی کی طرح ہو گئیں تھیں دلوں کے رگ و ریشہ سے اُٹھا کر وحدانیتِ الٰہی کا شربتِ عذب کروڑہا لوگوں کو پلا دیا ہے۔ وہی ہے جس نے اپنا کارِ نمایاں اور نہایت عمدہ اور دیرپا نتائج دکھلا کر اپنی بے نظیر تاثیر کی دو بدو شہادت سے بڑے بڑے معاندوں سے اپنی لاثانی فضیلتوں کا اقرار کرایا یہاں تک کہ سخت بے ایمانوں اور سرکشوں کے دلوں پر بھی اُس کا اِس قدر اثر پڑا کہ جس کو انہوں نے قرآن شریف کی عظمتِ شان کا ایک ثبوت سمجھا اور بے ایمانی پر اصرار کرتے کرتے آخر اس قدر انہیں بھی کہنا پڑا کہ اِنْ ھٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۔ جزو نمبر ۲۲۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۱۹۶ حاشیہ)

۲۳. قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ○

عقل اِس بات پر قطع واجب کرتی ہے کہ آئندہ بھی کسی نوع کا تغیر اور تبدل قرآن شریف میں واقع ہونا ممتنع اور محال ہے اور مسلمانوں کا پھر شرک اختیار کرنا اس جہت سے ممتنعات میں سے ہے کہ خدا تعالیٰ نے اِس بارے میں بھی پیشگوئی کر کے آپ فرما دیا ہے مَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا یُعِیْدُ.... یعنی شرک اور مخلوق پرستی جس قدر دُور ہو چکی ہے پھر وہ نہ اپنی کوئی نئی شاخ نکالے گی اور نہ اسی پہلی حالت پر عود کرے گی۔ سو اس پیشین گوئی کی صداقت بھی اظہر من الشمس ہے کیونکہ باوجود منقضی ہونے زمانہ دراز کے اب تک ان قوموں اور ان ملکوں میں کہ جن سے مخلوق پرستی معدوم کی گئی تھی پھر شرک اور بُت پرستی نے توحید کی جگہ نہیں لی اور آئندہ بھی عقل اس پیشین گوئی کی سچائی پر کامل یقین رکھتی ہے کیونکہ جب اوائل ایام میں کہ مسلمانوں کی تعداد بھی قلیل تھی تعلیمِ توحید میں کچھ تزلزل واقع نہیں ہوا بلکہ روز بروز ترقی ہوتی گئی تو اب کہ جماعت اس موحد قوم کی بیس کروڑ سے بھی کچھ زیادہ ہے کیونکر تزلزل ممکن ہے۔ علاوہ اس کے زمانہ بھی وہ آ گیا ہے کہ مشرکین کی طبیعتیں بباعث متواتر استماع تعلیم فرقانی اور دائمی صحبت اہلِ توحید کے کچھ کچھ توحید کی طرف میل کرتی جاتی ہیں۔ جدھر دیکھو دلائل وحدانیت کے بہادر سپاہیوں کی طرح شرک کے خیالی اور وہمی بُرجوں پر گولہ اندازی کر رہے ہیں اور توحید کے قدرتی جوش نے مشرکوں کے دلوں پر ایک ہلچل ڈال رکھی ہے اور مخلوق پرستی کی عمارت کا بودا ہونا عالی خیال لوگوں پر ظاہر ہوتا جاتا ہے اور وحدانیتِ الٰہی کی پُرزور بند وقیں شرک کے بدنما جھونپڑوں کو اڑاتی جاتی ہیں پس ان تمام آثار سے ظاہر ہے کہ اب اندھیرا شرک کا ان اگلے دنوں کی طرح پھیلنا کہ جب تمام دُنیا نے مصنوع چیزوں کی ٹانگ صانع کی ذات اور صفات میں پھنسا رکھی تھی ممتنع اور محال ہے اور جب کہ فرقانِ مجید کے اصول حقہ کا محرف اور مبدل ہو جانا یا پھر ساتھ اس کے تمام خلقت پر تاریکی شرک اور مخلوق پرستی کا بھی چھا جانا عند العقل محال اور ممتنع ہوا تو نئی شریعت اور

نئے الہام کے نازل ہونے پر بھی امتناع عقل لازم آیا کیونکہ جو امر مُستلزم محال ہو وہ بھی محال ہوتا ہے پس ثابت ہوا کہ آنحضرتؐ حقیقت میں خاتم الرسل ہیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۱۱۰، ۱۱۱ حاشیہ)

ان کو کہہ کہ حق آگیا اور باطل بعد اس کے نہ اپنی کوئی نئی شاخ نکالے گا جس کا رد قرآن میں موجود نہ ہو اور نہ اپنی پہلی حالت پر عود کرے گا۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۲۳ حاشیہ)

۵۳۔ وَّقَالُوْٓا اٰمَنَّا بِهٖ ۚ وَاَنّٰى لَهُمُ التَّنَاوُشُ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ ۚۖ

جو مجھ سے دُور ہو اس کی دُعا کیونکر سُنوں۔ یہ گویا عام قانونِ قدرت کے نظارہ سے ایک سبق دیا ہے۔ یہ نہیں کہ خدا سُن نہیں سکتا۔ وہ تو دل کے مخفی در مخفی ارادوں سے بھی واقف ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوئے مگر یہاں انسان کو قُربِ الٰہی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جیسے دُور کی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ اسی طرح پر جو شخص غفلت اور فسق و فجور میں مُبتلا رہ کر مجھ سے دُور ہوتا جاتا ہے جس قدر وہ دُور ہوتا ہے اسی قدر حجاب اور فاصلہ اس کی دعاؤں کی قبولیت میں ہوتا جاتا ہے۔ (الحکم جلد ۴ ۴۴ مورخہ ۱۰ ر دسمبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۳)

۵۵۔ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِّنْ قَبْلُ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ شَكٍّ مُّرِيْبٍ ۝

فاسق انسان دُنیا کی زندگی میں ہوا و ہوس کا ایک جہنم اپنے اندر رکھتا ہے اور ناکامیوں میں اس جہنم کی سوزشوں کا احساس کرتا ہے۔ پس جبکہ اپنی فانی شہوات سے دُور ڈالا جائے گا اور ہمیشہ کی ناامیدی طاری ہو گی خدائے تعالیٰ ان حسرتوں کو جسمانی آگ کے طور پر اس پر ظاہر کرے گا جیسا کہ فرماتا ہے

وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ

یعنی ان میں اور ان کی خواہشوں کی چیزوں میں جُدائی ڈالی جائے گی اور یہی عذاب کی جڑھ ہو گی ..... اس جگہ یاد رکھنا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ اپنی طرف سے بندہ پر کوئی مُصیبت نہیں ڈالتا بلکہ وہ انسان کے اپنے ہی بُرے کام اس کے آگے رکھ دیتا ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۹۵، ۹۶)

جس چیز سے انسان پیار کرتا ہے اس سے اگر جُدا کیا جائے تو یہی اس کے لئے ایک عذاب ہو جاتا ہے اور جس چیز سے پیار کرے اگر وہ میسر آجائے تو یہی اس کی راحت کا موجب ہو جاتا ہے۔ وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ۔

(یادداشتیں حصہ پنجم براہین احمدیہ صفحہ ۸ نیز پیغام صلح صفحہ ۴۳)

سُورۃ فاطر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔

اَفَمَنۡ زُیِّنَ لَہٗ سُوۡٓءُ عَمَلِہٖ فَرَاٰہُ حَسَنًا ؕ فَاِنَّ اللّٰہَ یُضِلُّ

مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ۫ۖ فَلَا تَذۡہَبۡ نَفۡسُکَ عَلَیۡہِمۡ حَسَرٰتٍ ؕ

اِنَّ اللّٰہَ عَلِیۡمٌۢ بِمَا یَصۡنَعُوۡنَ۔

فَلَا تَذۡہَبۡ نَفۡسُکَ عَلَیۡہِمۡ حَسَرٰتٍ کیا ان لوگوں کے لئے جو حق کو قبول نہیں کرتے تُو حسرتیں کھا کھا کر اپنی جان دے گا۔ سو قوم کی راہ میں جان دینے کا حکیمانہ طریق یہی ہے کہ قوم کی بھلائی کے لئے قانونِ قدرت کی مفید راہوں کے موافق اپنی جان پر سختی اُٹھاویں اور مناسب تدبیروں کے بجا لانے سے اپنی جان اُن پر فدا کر دیں نہ یہ کہ قوم کو سخت بلا یا گمراہی میں دیکھ کر اور خطرناک حالت میں پا کر اپنے سر پر پتھر مار لیں یا دو تین رتی اسٹرکنیا کھا کر اِس جہان سے رخصت ہو جائیں اور پھر گمان کریں کہ ہم نے اپنی اس حرکتِ بیجا سے قوم کو نجات دے دی ہے یہ مَردوں کا کام نہیں ہے زنانہ خصلتیں ہیں اور بے حوصلہ لوگوں کا ہمیشہ سے یہی طریق ہے کہ مصیبت کو قابلِ برداشت نہ پا کر جھٹ پٹ خودکشی کی طرف دوڑتے ہیں۔ ایسی خودکشی کو بعد میں کتنی ہی تاویلیں کی جائیں مگر یہ حرکت بلاشُبہ عقل اور عقلمندوں کا ننگ ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۱۳۵)

مَنۡ کَانَ یُرِیۡدُ الۡعِزَّۃَ فَلِلّٰہِ الۡعِزَّۃُ جَمِیۡعًا ؕ اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ

الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ ۚ وَالَّذِينَ يَمْكُرُونَ السَّيِّئَاتِ لَهُمْ

عَذَابٌ شَدِيدٌ ۖ وَمَكْرُ أُولَٰئِكَ هُوَ يَبُورُ ○

اِلَیْهِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ اُسی رحمٰن کی طرف کلماتِ طیبہ صعود کرتے ہیں۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۵۵ حاشیہ)

ہمارا بھی تو یہی مذہب ہے کہ مقدس لوگوں کو فوت کے بعد ایک نورانی جسم ملتا ہے اور وہی نور جو وہ ساتھ رکھتے ہیں جسم کی طرح اُن کے لئے ہو جاتا ہے سو وہ اس کے ساتھ آسمان کی طرف اُٹھائے جاتے ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے اِلَیْہِ یَصْعَدُ الْکَلِمُ الطَّیِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ یَرْفَعُہٗ یعنی پاک رُوحیں جو نورانی الوجود ہیں خدا تعالیٰ کی طرف صعود کرتی ہیں اور عملِ صالح ان کا رفع کرتا ہے یعنی جس قدر عمل صالح ہو اُسی قدر رُوح کا رفع ہوتا ہے۔

اِس جگہ خدا تعالیٰ نے رُوح کا نام کلمہ رکھا۔ یہ اِس بات کی طرف اشارہ ہے کہ درحقیقت تمام ارواح کلمات اللہ ہی ہیں جو ایک لایدرک بھید کے طور پر جس کی تہ تک انسان کی عقل نہیں پہنچ سکتی رُوحیں بن گئی ہیں اسی بناء پر اس آیت کا مضمون بھی ہے وَکَلِمَتُہٗ اَلْقٰھَآ اِلٰی مَرْیَمَ اور چونکہ یہ سِرّ ربوبیت ہے اِس لئے کسی کی مجال نہیں کہ اس سے بڑھ کر کچھ بول سکے کہ کلمات اللہ ہی بحکم و باذنِ ربّی لباس رُوح کا پہن لیتے ہیں اور ان میں وہ تمام طاقتیں اور قوتیں اور خاصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو رُوحوں میں پائی جاتی ہیں اور پھر چونکہ ارواح طیبہ فنافی اللہ ہونے کی حالت میں اپنے تمام قویٰ چھوڑ دیتی ہیں اور اطاعتِ الٰہی میں فانی ہو جاتی ہیں تو گویا پھر وہ رُوح کی حالت سے باہر آکر کلمۃ اللہ ہی بن جاتی ہیں جیسا کہ ابتداء میں وہ کلمۃ اللہ تھیں سو کلمۃ اللہ کے نام سے ان پاک رُوحوں کو یاد کرنا اُن کے اعلیٰ درجہ کے کمال کی طرف اشارہ ہے سو انہیں نور کا لباس ملتا ہے اور اعمالِ صالحہ کی طاقت سے اُن کا خدائے تعالیٰ کی طرف رفع ہوتا ہے اور ہمارے ظاہر بین علماء اپنے محدود خیالات کی وجہ سے کلماتِ طیبہ سے مراد محض عقائد یا اذکار و اشغال رکھتے ہیں اور اعمالِ صالحہ سے مراد بھی اذکار و خیرات وغیرہ ہیں تو گویا وہ اس تاویل سے علّت اور معلول کو ایک کر دیتے ہیں۔ اگرچہ کلماتِ طیبہ بھی خدا تعالیٰ کی طرف ہی رجوع کرتے ہیں لیکن عارفوں کے لئے یہ بطنی معنے ہیں جن پر قرآن کریم کے دقیق اشارات مشتمل ہیں۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۴۳۹ تا ۴۴۱)

اور پاک کلمے اسی کی طرف چڑھتے ہیں۔

(اربعین نمبر ۲ صفحہ ۲۱)

میں اپنی جماعت کو مخاطب کرکے کہتا ہوں کہ ضرورت ہے اعمالِ صالحہ کی۔ خدا تعالیٰ کے حضور اگر کوئی چیز جا سکتی

ہے تو وہ یہی اعمالِ صالحہ ہیں اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۲۸ مورخہ ۳۱؍جولائی ۱۹۰۱ء صفحہ ۲، ۳)

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ؕ وَاِنۡ تَدۡعُ مُثۡقَلَةٌ اِلٰی حِمۡلِهَا لَا یُحۡمَلۡ مِنۡهُ شَیۡءٌ وَّلَوۡ كَانَ ذَا قُرۡبٰی ؕ اِنَّمَا تُنۡذِرُ الَّذِیۡنَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَیۡبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ وَمَنۡ تَزَكّٰی فَاِنَّمَا یَتَزَكّٰی لِنَفۡسِهٖ ؕ وَاِلَی اللّٰهِ الۡمَصِیۡرُ۝

حدیث بخاری کے صفحہ ۱۷۲ میں ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ زخم کاری سے مجروح ہوئے تو صہیب رضی اللہ عنہ روتے ہوئے ان کے پاس گئے کہ ہائے میرے بھائی۔ ہائے میرے دوست۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا اے صہیب مجھ پر تو روتا ہے کیا تجھے یاد نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میّت پر اس کے اہل کے رونے سے عذاب کیا جاتا ہے۔ پھر جب حضرت عمرؓ وفات پا گئے تو حضرت ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ میں نے یہ سب حال حدیث پیش کرنے کا عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو سُنایا تو انہوں نے کہا کہ خدا عمرؓ پر رحم کرے بخدا کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا بیان نہیں فرمایا کہ مومن پر اس کے اہل کے رونے سے عذاب کیا جاتا ہے اور فرمایا کہ تمہارے لئے قرآن کافی ہے۔ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی۔ یعنی حضرت عائشہ صدیقہؓ نے باوجود محدود علم کے فقط اسلئے قسم کھائی کہ اگر اِس حدیث کے ایسے معنی کئے جائیں کہ خواہ نخواہ ہر ایک میّت اس کے اہل کے رونے سے معذب ہوئی ہے تو یہ حدیث قرآن کے مخالف اور معارض ٹھہرے گی۔ اور جو حدیث قرآن کے مخالف ہو وہ قبول کے لائق نہیں۔

(الحق بحث لدھیانہ صفحہ ۱۰۷ حاشیہ)

بخاری کی کتاب الجنائز صفحہ ۱۷۲ میں صاف لکھا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حدیث اِنَّ الۡمَیِّتَ یُعَذَّبُ بِبَعۡضِ بُكَآءِ اَهۡلِهٖ کو قرآن کریم کی اِس آیت سے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی معارض و مخالف پاکر حدیث کی یہ تاویل کر دی کہ یہ مومنوں کے متعلق نہیں بلکہ کفار کے متعلق ہے جو متعلقین کے جزع فزع پر راضی تھے بلکہ وصیت کر جاتے تھے۔

(ازالہ اوہام حصہ دوم صفحہ ۹۲۶، ۹۲۷)

۲۳۔ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَآءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ إِنَّ اللّٰهَ يُسْمِعُ مَنْ يَّشَآءُ وَمَآ أَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ۔

نور اور حیات سے مُراد رُوح القدس ہے کیونکہ اس سے ظلمت دُور ہوتی ہے اور وہ دلوں کو زندہ کرتا ہے اِسی لئے اس کا نام رُوح القدس ہے یعنی پاک کی رُوح جس کے اندر داخل ہونے سے ایک پاک زندگی حاصل ہوتی ہے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۹۹)

۲۴۔ إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا وَإِنْ مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ۔

اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ کوئی ملک آباد نہیں جس میں پیغمبر اور مصلح نہیں گزرا۔
(سُرمہ چشم آریہ صفحہ ۲۴۳)

کوئی بستی اور کوئی آباد ملک نہیں جس میں پیغمبر نہیں بھیجا گیا۔ (نسیم دعوت صفحہ ۶۱)

میرا یہ مذہب نہیں ہے کہ اسلام کے سوائے باقی سب مذاہب کی بنیاد ہی جھوٹ پر رکھی گئی ہے۔ میرا یہ ایمان ہے کہ وہ خدا جو تمام مخلوق کا خدا ہے وہ سب پر نظر رکھتا ہے اور جیسا وہ سب کی جسمانی ضروریات کو پورا کر رہا ہے ایسا ہی رُوحانی ضروریات کو بھی پورا کرتا ہے۔ یہ سچ نہیں کہ دُنیا کی ابتداء سے اُس نے صرف ایک ہی قوم کو چُن لیا ہے اور دوسروں کی کچھ پرواہ نہیں کی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ کبھی کسی قوم پر وہ وقت آجاتا ہے اور کبھی کسی پر۔ مَیں یہ باتیں کسی کو خوش کرنے کے لئے نہیں کہتا بلکہ خدا تعالیٰ نے مجھ پر ظاہر کیا ہے کہ راجہ رام چندر اور کرشن جی وغیرہ بھی خدا کے راست باز بندے تھے اور اس سے سچا تعلق رکھتے تھے۔ مَیں اس شخص سے بیزار ہوں جو اُن کی نندیا یا توہین کرتا ہے۔ اس کی مثال کنوئیں کے مینڈک کی سی ہے جو سمندر کی وسعت سے ناواقف ہے۔ جہاں تک ان لوگوں کے صحیح سوانح معلوم ہوتے ہیں ان سے پایا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے خدا کی راہ میں بڑے بڑے مجاہدات کئے اور کوشش کی کہ اسی راہ کو پائیں جو خدائے تعالیٰ تک پہنچنے کی حقیقی راہ ہے جو شخص یہ کہتا ہے کہ وہ راست باز نہ تھے وہ قرآن شریف کے خلاف کہتا ہے کیونکہ اس میں فرمایا ہے اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ یعنی کوئی قوم اور اُمّت ایسی نہیں گذری جس میں کوئی نذیر نہ آیا ہو۔ پس اس میں شک نہیں کہ ابتداء میں ان تمام مذاہب کی بنیاد حق اور راستی پر تھی مگر مرورِ زمانہ سے

ان میں طرح طرح کی غلطیاں داخل ہو گئیں یہاں تک کہ اصل حقیقت انہیں غلطیوں کے نیچے چھپ گئی۔

(ریویو آف ریلیجنز جلد ۲ نمبر ۱ صفحہ ۲۵۲)

خدا تعالیٰ نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ کوئی آباد بستی اور ملک نہیں جس میں اس نے کوئی نبی نہ بھیجا ہو جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ یعنی کوئی ایسی اُمت نہیں جس میں خدا کا کوئی نبی نہ آیا ہو مگر ہم اس عقیدہ کو سمجھ نہیں سکتے کہ باوجود خدا کے وسیع بلاد اور اقالیم کے جو سب اُس کی ہدایت کے محتاج ہیں اور سب اُس کے بندے ہیں پھر بھی خدا تعالیٰ کا قدیم سے آریہ ورت سے ہی تعلق رہا اور دوسری قومیں اُس کی براہِ راست ہدایت سے محروم رہی ہیں۔ خدا کا موجودہ قانون بھی ہم اُس کے برخلاف پاتے ہیں وہ ...... دوسرے ممالک میں اب بھی اپنی وحی اور الہام سے اپنے وجود کا پتہ دیتا ہے اپنے بندوں کی نسبت خدا کی طرف سے یہ پکش پات اور طرفداری اُس کی ذات کی طرف منسوب نہیں ہو سکتی۔ جو شخص اُس کی طرف دل اور جان سے رجوع کرے وہ بھی اُس کی طرف رجوع برحمت کرتا ہے۔ خواہ ہندی ہو خواہ عربی وہ کسی کو ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ اُس کی رحمت عام ہے کسی خاص ملک سے محدود نہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ جسمانی طور پر بھی خدا تعالیٰ کی نعمتیں ہر ایک جگہ پائی جاتی ہیں۔ ہر ایک ملک میں پانی موجود ہے جیسا کہ آریہ ورت میں موجود ہے۔ ہر ایک ملک میں اناج موجود ہے جیسا کہ آریہ ورت میں موجود ہے۔ ہر ایک ملک میں وہ نعمتیں موجود ہیں جیسا کہ آریہ ورت میں موجود ہیں تو پھر جبکہ خدا نے جسمانی طور پر اپنے فیضان میں کسی قوم اور ملک سے فرق نہیں کیا تو کیا کوئی سمجھ سکتا ہے کہ رُوحانی طور پر اُس نے فرق کیا ہے۔ اُس کے سب بندے ہیں کیا کالے اور کیا گورے اور کیا ہندی اور کیا عربی۔ پس یہ غیر محدود صفات والا خدا کسی تنگ دائرہ میں محدود نہیں ہو سکتا اور اس کو محدود کرنا تنگ ظرفی اور نادانی ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۹۰، ۲۹۱)

کوئی قوم نہیں جس میں ڈرانے والا نبی نہیں بھیجا گیا۔ یہ اِس لئے کہ تا ہر ایک قوم میں ایک گواہ ہو کہ خدا موجود ہے اور وہ اپنے نبی دُنیا میں بھیجا کرتا ہے۔ (چشمۂ معرفت صفحہ ۸۲)

جیسا کہ خدا ہر ایک ملک کے باشندوں کے لئے ان کے مناسب حال ان کی جسمانی تربیت کرتا آیا ہے ایسا ہی اس نے ہر ایک ملک اور ہر ایک قوم کو رُوحانی تربیت سے بھی فیضیاب کیا ہے جیسا کہ وہ قرآن شریف میں ایک جگہ فرماتا ہے وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ کہ کوئی ایسی قوم نہیں جس میں کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا گیا..... خدا کا فیض عام ہے جو تمام قوموں اور تمام ملکوں اور تمام زمانوں پر محیط ہو رہا ہے۔ یہ اِس لئے ہوا کہ تا کسی قوم کو شکایت کرنے کا موقع نہ ملے اور یہ نہ کہیں کہ خدا نے فلاں قوم پر احسان کیا مگر ہم پر نہ کیا یا فلاں قوم کو اس کی طرف سے کتاب ملی تا وہ اس سے ہدایت پاویں مگر ہم کو نہ ملی یا فلاں زمانہ میں وہ اپنی وحی اور الہام اور معجزات کے ساتھ ظاہر ہوا مگر ہمارے زمانہ میں مخفی رہا۔ پس اس نے عام فیضان دکھلا کر ان تمام اعتراضات کو دفع کر دیا اور اپنے ایسے وسیع اخلاق دکھلائے

کہ کسی قوم کو اپنے جسمانی اور رُوحانی فیضوں سے محروم نہیں رکھا اور نہ کسی زمانہ کو بے نصیب ٹھہرایا۔

(پیغام صلح صفحہ ۵ تا ۷)

کوئی قوم اور امت ایسی نہیں گذری جس میں کوئی نذیر نہ آیا ہو۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۷)

اس سوال کے جواب میں کہ زرتشت نبی تھا یا نہیں فرمایا: ہم تو یہی کہیں گے کہ اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ خدا کے کل رسولوں پر ہمارا ایمان ہے...... اتنے کروڑ مخلوقات پیدا ہوتی رہی اور کروڑہا لوگ مختلف ممالک میں آباد رہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ خدا تعالیٰ نے ان کو یونہی چھوڑ دیا ہو اور کسی نبی کے ذریعہ سے ان پر اتمام حجت نہ کی ہو۔ آخر ان میں رسول آتے ہی رہے ہیں ممکن ہے کہ یہ بھی انہیں میں سے ایک رسول ہوں مگر ان کی تعلیم کا صحیح صحیح پتہ اب نہیں لگ سکتا کیونکہ زمانہ دراز گذر جانے سے تحریف لفظی اور معنوی کے سبب بعض باتیں کچھ کا کچھ بن گئی ہیں۔ حقیقی طور پر محفوظ رہنے کا وعدہ تو صرف قرآن مجید کے لئے ہی ہے۔ مومن کو سوءِ ظن کی نسبت نیک ظن کی طرف جانا چاہیئے۔ قرآن مجید میں وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ لکھا ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ وہ بھی ایک رسول ہوں۔ (الحکم جلد ۱۱ نمبر ۳۹ مورخہ ۳۱ اکتوبر ۱۹۰۷ء صفحہ ۵)

قرآن شریف سے صاف طور سے ثابت ہے کہ ہندوستان میں بھی نبی گذرے ہیں چنانچہ قرآن شریف میں آیا ہے کہ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ اور حضرت کرشنؑ بھی انہیں انبیاء میں سے ایک تھے جو خدا تعالیٰ کی طرف سے مامور ہو کر خلق اللہ کی ہدایت اور توحید قائم کرنے کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک قوم میں نبی آئے ہیں یہ بات الگ ہے کہ ان کے نام ہمیں معلوم نہ ہوں۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۱۸ مورخہ ۶ مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۷)

کوئی قوم اور بستی نہیں جس میں کوئی نبی نہیں گذرا۔ (لیکچر چشمہ معرفت صفحہ ۴)

کوئی ایسی قوم نہیں جس میں کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا گیا۔ (پیغام صلح صفحہ ۶)

ہمارے اصول کی رُو سے وہ (اللہ تعالیٰ) رَبّ العالمین ہے اور اُس نے اناج، ہوا، پانی، روشنی وغیرہ سامان تمام مخلوق کے واسطے بنائے ہیں۔ اسی طرح سے وہ ہر ایک زمانہ میں ہر ایک قوم کی اصلاح کے واسطے وقتاً فوقتاً مصلح بھیجتا رہا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں ہے وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ خدا (تعالیٰ) تمام دُنیا کا خدا ہے کسی خاص قوم سے اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ (الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۶ مورخہ ۲ جون ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

۲۹ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُہٗ كَذٰلِكَ اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ

اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا خدا سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو اہل علم ہیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۱۸)

اللہ جلشانہ سے وہ لوگ ڈرتے ہیں جو اُس کی عظمت اور قدرت اور احسان اور حُسن اور جمال پر علم کامل رکھتے ہیں۔ خشیت اور اسلام درحقیقت اپنے مفہوم کے رُو سے ایک ہی چیز ہے کیونکہ کمال خشیت کا مفہوم اسلام کے مفہوم کو مستلزم ہے پس اِس آیتِ کریمہ کے معنوں کا مآل اور ماحصل یہی ہؤا کہ اسلام کے حصول کا وسیلہ کاملہ یہی علم عظمت ذات وصفاتِ باری ہے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۸۵)

انسان کی خاصیت اکثر اور اغلب طور پر یہی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کی نسبت علم کامل حاصل کرنے سے ہدایت پا لیتا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ہاں جو لوگ شیطانی سرشت رکھتے ہیں وہ اِس قاعدہ سے باہر ہیں۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۱۹ حاشیہ)

علم سے مراد منطق یا فلسفہ نہیں ہے بلکہ حقیقی علم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل سے عطا کرتا ہے۔ یہ علم اللہ تعالیٰ کی معرفت کا ذریعہ ہوتا ہے (اور اس سے) خشیتِ الٰہی پیدا ہوتی ہے جیسا کہ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا اگر علم سے اللہ تعالیٰ کی خشیت میں ترقی نہیں ہوتی تو یاد رکھو کہ وہ علم ترقی معرفت کا ذریعہ نہیں ہے۔ (الحکم جلد ۶ ۲۱ مورخہ ۱۰ جون ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

عالمِ ربانی سے یہ مراد نہیں ہؤا کرتی کہ وہ صرف ونحو یا منطق میں بے مثل ہو بلکہ عالمِ ربانی سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اور اُس کی زبان بیہودہ نہ چلے مگر موجودہ زمانہ اِس قسم کا آگیا ہے کہ مُردہ شو تک بھی اپنے آپ کو علماء کہتے ہیں اور اِس لفظ کو ذات میں داخل کر لیا ہے اِس طرح پر اِس لفظ کی بڑی تحقیر ہوئی ہے اور خدا تعالیٰ کے منشاء اور مقصد کے خلاف اس کا مفہوم لیا گیا ہے ورنہ قرآن شریف میں تو علماء کی یہ صفت بیان کی گئی ہے اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے اللہ تعالیٰ کے وہ بندے ہیں جو علماء ہیں۔ اب یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ جن لوگوں میں یہ صفات خوف وخشیت اور تقویٰ اللہ کی نہ پائی جائیں وہ ہرگز ہرگز اس خطاب سے پکارے جانے کے قابل نہیں ہیں۔

اصل میں علماء عالم کی جمع ہے اور علم اس چیز کو کہتے ہیں جو یقینی اور قطعی ہو اور سچا علم قرآن کریم سے ملتا ہے یہ نہ یونانیوں کے فلسفہ سے ملتا ہے نہ حال کے انگلستانی فلسفہ سے بلکہ یہ سچا ایمانی فلسفہ سے حاصل ہوتا ہے۔ مومن کا کمال اور معراج یہی ہے کہ وہ علماء کے درجہ پر پہنچے اور وہ حق الیقین کا مقام اسے حاصل ہو جو علم کا انتہائی درجہ ہے لیکن جو شخص علومِ حقّہ سے بہرہ ور نہیں ہیں اور معرفت اور بصیرت کی راہیں اُن پر کھلی ہوئی نہیں ہیں وہ خود عالم کہلائیں مگر علم کی خوبیوں اور صفات سے بالکل بے بہرہ ہیں اور وہ روشنی اور نور جو حقیقی علم سے ملتا ہے اُن میں پایا نہیں جاتا بلکہ ایسے لوگ سراسر خسارہ اور نقصان میں ہیں۔ یہ اپنی آخرت دُخان اور تاریکی سے بھر لیتے ہیں...... جن لوگوں کو سچی معرفت اور بصیرت دی جاتی ہے اور وہ علم جس کا نتیجہ خشیت اللہ ہے عطا کیا جاتا ہے وہ وہ لوگ ہیں جن کو حدیث میں انبیاءِ بنی اسرائیل سے تشبیہ دی گئی

ہے۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۰ مورخہ ۲۴ر مارچ ۱۹۰۵ء صفحہ ۵)

یاد رکھو لغزش ہمیشہ ناداں کو آتی ہے۔ شیطان کو جو لغزش آئی وہ علم کی وجہ سے نہیں بلکہ نادانی سے آئی۔ اگر وہ علم میں کمال رکھتا تو لغزش نہ آتی۔ قرآن شریف میں علم کی مذمت نہیں بلکہ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا اور نیم مُلّاں خطرۂ ایمان مشہور مثل ہے۔ پس میرے مخالفوں کو علم نے ہلاک نہیں کیا بلکہ جہالت نے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۵ مورخہ ۱۷ر جولائی ۱۹۰۲ء صفحہ ۲)

علماء کے لفظ سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیئے۔ عالم وہ ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا یعنی بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں ان کے بندوں میں سے وہی عالم ہیں۔ ان میں عبودیت تامہ اور خشیت اللہ اس حد تک پیدا ہوتی ہے کہ وہ خود اللہ تعالیٰ سے ایک علم اور معرفت سیکھتے ہیں اور اس سے فیض پاتے ہیں اور یہ مقام اور درجہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع اور آپ سے پوری محبت سے ملتا ہے یہاں تک کہ انسان بالکل آپ کے رنگ میں رنگین ہو جاتا ہے۔

(الحکم جلد ۹ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۰ر نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۳)

تقویٰ اور خدا ترسی علم سے پیدا ہوتی ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا یعنی اللہ تعالیٰ سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو عالم ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حقیقی علم خشیت اللہ کو پیدا کر دیتا ہے اور خدا تعالیٰ نے علم کو تقویٰ سے وابستہ کیا ہے کہ جو شخص پورے طور پر عالم ہوگا اس میں ضرور خشیت اللہ پیدا ہوگی۔ علم سے مراد میری دانست میں علم القرآن ہے اس سے فلسفہ، سائنس یا اور علوم مروجہ مراد نہیں کیونکہ اُن کے حصول کے لئے تقویٰ اور نیکی کی شرط نہیں بلکہ جیسے ایک فاسق فاجر ان کو سیکھ سکتا ہے ویسے ہی ایک دیندار بھی۔ لیکن علم القرآن بجز متقی اور دیندار کے کسی دوسرے کو دیا ہی نہیں جاتا۔ پس اس جگہ علم سے مراد علم القرآن ہی ہے جس سے تقویٰ اور خشیت پیدا ہوتی ہے۔

(الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ر جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَیْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِیْرُ ۝ (۳۳)

بعض مسلمانوں میں سے ایسے ہیں جن پر نفسانی جذبات غالب ہیں اور بعض درمیانی حالت کے ہیں اور بعض وہ ہیں کہ انتہاء کمالاتِ ایمانیہ تک پہنچ گئے ہیں پھر اگر اللہ تعالیٰ نے برعائت اُس طبقہ مسلمانوں کے جو ضعیف اور بزدل اور ناقص الایمان

ہیں یہ فرمایا کہ کسی جان کے خطرہ کی حالت میں اگر وہ دل میں اپنے ایمان پر قائم رہیں اور زبان سے گو اس ایمان کا اقرار نہ کریں تو ایسے آدمی معذور سمجھے جاویں گے مگر ساتھ اس کے یہ بھی تو فرمایا کہ وہ ایماندار بھی ہیں کہ بہادری سے دین کی راہ میں اپنی جانیں دیتے ہیں اور کسی سے نہیں ڈرتے۔ (جنگِ مقدس صفحہ ۱۹۴ روئیداد ۵ جون ۱۸۹۳ء)

بنی آدم کی فطرتیں مختلف ہیں بعض لوگ ظالم ہیں جن کے نورِ فطرتی کو قویٰ بہیمیہ یا غضبیہ نے دبایا ہوا ہے بعض درمیانی حالت میں ہیں بعض نیکی اور رجوع الی اللہ میں سبقت لے گئے ہیں۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲، ۷ حاشیہ)

ایک وہ گروہ ہے جن پر شیطانی ظلمت غالب ہے اور رُوح القدس کی چمک کم ہے اور دوسری وہ گروہ ہے جو رُوح القدس کی چمک اور شیطانی ظلمت اُن میں مساوی ہیں اور تیسری وہ گروہ ہے جن پر رُوح القدس کی چمک غالب آگئی ہے اور خیر محض ہو گئی ہیں۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۹۷)

قرآن کریم کے اُتارنے سے اللہ جلّ شانہٗ کا یہ مقصد تھا کہ وہ تمام بنی آدم اور تمام زمانوں اور تمام استعدادوں کی اصلاح اور تکمیل اور تربیت کر سکے اور اسلام کی پوری شکل اور پوری عظمت بنی آدم پر ظاہر ہو اور اس کے ظہور کا وقت بھی آپہنچا تھا اسی لئے خدا تعالیٰ نے قرآن مجید کو تمام قوموں اور تمام زمانوں کے لئے جو قیامت تک آنے والے تھے ایک کامل اور جامع قانون کی طرح نازل فرمایا اور ہر یک درجہ کی استعداد کے لئے افادہ اور افاضہ کا دروازہ کھول دیا جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ۚ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ۚ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ یعنی پھر ہم نے اپنی کتاب کا اُن لوگوں کو وارث کیا جو ہمارے بندوں میں سے برگزیدہ ہیں اور وہ تین گروہ ہیں (۱) ایک ان میں سے ظالموں کا گروہ جو اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں یعنی اکراہ اور جبر سے نفسِ امّارہ کو خدا تعالیٰ کی راہ پر چلاتے ہیں اور نفسِ سرکش کی مخالفت اختیار کر کے مجاہداتِ شاقہ میں مشغول ہیں (۲) دوسری میانہ حالت آدمیوں کا گروہ جو بعض خدمتیں خدا تعالیٰ کی راہ میں اپنے نفسِ سرکش سے باکراہ اور جبر لیتے ہیں اور بعض الٰہی کاموں کی بجا آوری میں نفس ان کا بخوشی خاطر تابع ہو جاتا ہے اور ذوق اور محبت اور ارادت سے اُن کاموں کو بجا لاتا ہے غرض وہ لوگ کچھ تو تکلّف اور مجاہدہ سے خدا تعالیٰ کے حکموں پر چلتے ہیں اور کچھ طبعی جوش اور دلی شوق سے بغیر کسی تکلّف کے اپنے ربِّ جلیل کی فرمانبرداری اُن سے صادر ہوتی ہے یعنی ابھی پوری موافقت اللہ جلّ شانہٗ کے ارادوں اور خواہشوں سے اُن کو حاصل نہیں اور نہ نفس کی جنگ اور مخالفت سے بکلّی فراغت بلکہ بعض سلوک کی راہوں میں نفس موافق اور بعض راہوں میں مخالف ہے (۳) تیسری سابق بالخیرات اور اعلیٰ درجہ کے آدمیوں کا گروہ ہے یعنی وہ گروہ جو نفسِ امّارہ پر بکلّی فتحیاب ہو کر نیکیوں میں آگے نکل جانے والے ہیں جن کے نفوس کی سرکشی اور امّارگی بکلّی دُور ہو گئی ہے اور خدا تعالیٰ کے احکام سے اور اس کی شریعت کی تمام راہوں سے اور اس کی تمام قضا و قدر سے اور اس کی تمام مرضی اور مشیت کی باتوں سے وہ طبعاً پیار کرتے ہیں نہ کسی تکلّف اور بناوٹ سے اور کوئی دقیقہ اطاعت اور فرمانبرداری کا اُٹھا نہیں

رکھتے اور اللہ جلّ شانہٗ کی فرمانبرداری ان کی طبیعت کی جزو اور اُن کی جان کی راحت ہو جاتی ہے کہ بغیر اس کے وہ جی ہی نہیں سکتے اور ان کا نفس کمال ذوق اور شوق اور لذّت اور شدّتِ میلان اور خوشی سے بھرے ہوئے اِنشراح کے ساتھ خدا تعالیٰ کی اطاعت بجالاتا ہے اور اس بات کی طرف وہ کسی وقت اور کسی محل اور حکمِ الٰہی یا مشیّتِ الٰہی کی نسبت محتاج نہیں ہوتے کہ اپنے نفس سے باکراہ اور بجبر کام لیں بلکہ اُن کا نفس نفسِ مطمئنہ ہو جاتا ہے اور جو خدا تعالیٰ کا ارادہ وہ ان کا ارادہ اور جو اس کی مرضی وہ ان کی مرضی ہو جاتی ہے اور خدا تعالیٰ کے حکموں اور مشیّتوں سے ایسا پیار کرتے ہیں کہ جیسا خدا تعالیٰ اِن امور سے پیار کرتا ہے اسی وجہ سے وہ خدا تعالیٰ کے امتحانوں کے وقت پیچھے نہیں ہٹتے بلکہ چند قدم آگے رکھ دیتے ہیں۔ پھر بعد اس کے اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے کہ ان تینوں گروہوں پر میرا بڑا فضل ہے یعنی ظالم بھی موردِ فضل اور برگزیدہ اور خدا تعالیٰ کے پیارے بندے ہیں اور ایسا ہی مقتصد بھی اور سابق بالخیرات تو خود ظاہر ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ اِس آیت میں اللہ جلّ شانہٗ نے ظالموں کو بھی اپنے برگزیدہ بندے اور موردِ فضل قرار دے دیا ہے اور اُن کو اپنے ان پیارے اور چُنے ہوئے اور قابلِ تحسین لوگوں میں شمار کر لیا ہے جن سے وہ بہت ہی خوش ہے حالانکہ قرآن کریم اِس مضمون سے بھرا پڑا ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ ظالموں سے پیار نہیں کرتا اور عدل کو چھوڑنے والے کبھی موردِ فضل نہیں ہو سکتے۔ پس اِس دلیل سے بداہت معلوم ہوتا ہے کہ اِس آیت میں ظالموں کے گروہ سے مراد وہ گروہ نہیں ہے جو خدا تعالیٰ کا سرکش اور نافرمان اور مُشرک اور کافر اور طریقِ عدل اور راستی کو چھوڑنے والا اور خدا تعالیٰ کی مخالفت کو اختیار کرنے والا ہے کیونکہ ایسے لوگوں کو تو قرآن کریم مردود اور موردِ غضب ٹھہراتا ہے اور صاف کہتا ہے کہ خدا تعالیٰ ظالموں اور معتدین کو جو طریقِ عدل اور انصاف چھوڑ دیتے ہیں دوست نہیں رکھتا پھر وہ لوگ موردِ فضل کیونکر ٹھہر سکتے ہیں اور کیونکر ان کا نام مصطفٰے اور برگزیدہ اور چُنا ہُوا رکھا جا سکتا ہے۔ سو ان یقینی اور قطعی دلائل سے ہمیں ماننا پڑا کہ اِس جگہ ظالم کا لفظ کسی مذموم معنی کے لئے استعمال نہیں ہُوا بلکہ ایک ایسے محمود اور قابلِ تعریف معنوں کے لئے اِستعمال ہُوا ہے جو درجہ سابق بالخیرات سے حصّہ لینے کے مستحق اور اُس درجہ فاضلہ کے چھوٹے بھائی ہیں اور وہ معنے بجز اس کے اَور کوئی نہیں ہو سکتے کہ ظالم سے مراد اِس قسم کے لوگ رکھے جائیں کہ جو خدا تعالیٰ کے لئے اپنے نفس مخالف پر جبر اور اِکراہ کرتے ہیں اور نفس کے جذبات کم کرنے کے لئے دن رات مجاہداتِ شاقہ میں مشغول ہیں کیونکہ یہ تو لُغت کی رُو سے ثابت ہے کہ ظالم کا لفظ بغیر کسی اَور لحاظ کے فقط کم کرنے کے لئے بھی آیا ہے جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ قرآن کریم میں ایک دوسرے مقام میں فرماتا ہے وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا[1]۔ اَیْ وَلَمْ تَنْقُصْ اور خدا تعالیٰ کی راہ میں نفس کے جذبات کو کم کرنا بلاشبہ اُن معنوں کی رُو سے ایک ظلم ہے ماسوا اس کے ہم ان کتبِ لُغت کو جو صدہا برس قرآن کریم کے

---

[1] سُورۃ الکھف: ۳۴

بعد اپنے زمانہ کے محاورات کے موافق طیار ہوئی ہیں قرآن مجید کا حکم نہیں ٹھہرا سکتے۔ قرآن کریم اپنی لغات کے لئے آپ
متکفل ہے اور اُس کی بعض آیات بعض دوسری آیات کی شرح کرتی ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ اصطفاء کا عزّت بخش لفظ کبھی
دوسرے ظالموں کے حق میں خدا تعالیٰ نے استعمال نہیں کیا بلکہ اُن کو مردود اور مخذول اور موردِ غضب ٹھہرایا ہے مگر اس
جگہ ظالم کو اپنا برگزیدہ قرار دیا اور موردِ فضل ٹھہرایا ہے اور اِس آیت سے صاف ثابت ہو رہا ہے کہ جیسے مقتصد اسلئے
برگزیدہ ہے کہ مقتصد ہے اور سابق بالخیرات اِس لئے برگزیدہ ہے کہ وہ سابق بالخیرات ہے۔ اِسی طرح ظالم بھی اِس لئے
برگزیدہ ہے کہ وہ ظالم ہے۔ پس کیا اب اِس ثبوت میں کچھ کسر رہ گئی کہ اس جگہ ظلم سے مراد وہ ظلم ہے جو خدا تعالیٰ کو
پیارا معلوم ہوتا ہے یعنی خدا تعالیٰ کے لئے اپنے نفس پر اکراہ اور جبر کرنا اور نفس کے جذبات کو اللہ جلّشانہٗ کے راضی کرنیکی
غرض سے کم کر دینا اور گھٹا دینا اور اِس قسم کے ظالموں کا قرآن کریم کے دوسرے مقامات میں توّابین بھی نام ہے جن
سے اللہ جلّ شانہٗ پیار کرتا ہے۔ غرض ایسا خیال کرنا نعوذ باللہ سخت دھوکا ہے کہ ان ظالموں سے جو اِس آیت میں
درج ہیں وہ ظالم مراد لئے جائیں جو خدا تعالیٰ کے سخت نافرمان ہیں اور شرک اور کفر اور فسق کو اختیار کرنے والے اور
اس پر راضی ہو جانے والے اور ہدایت کی راہوں سے بُغض رکھنے والے ہیں بلکہ وہ ظالم مراد ہیں جو باوجود نفس کے
سخت جذبات کے پھر اُفتاں خیزاں خدا تعالیٰ کی طرف دوڑتے ہیں۔ اِس پر ایک اَور قرینہ یہ ہے کہ اللہ جلّ شانہٗ
نے قرآن کریم کے نزول کی علّتِ غائی هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ[1] قرار دی ہے اور قرآن کریم سے رُشد اور ہدایت اور
فیض حاصل کرنے والے بالتخصیص متقیوں کو ہی ٹھہرایا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ ۚ
فِيْهِ ۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۙ[2] پس اِس علّتِ غائی پر نظر ڈال کر یقینی اور قطعی طور پر یہ بات فیصلہ پا جاتی ہے کہ ظالم کا لفظ
اِس آیت میں ایسے شخص کی نسبت ہرگز اطلاق نہیں پاتا کہ جو عمدًا نافرمان اور سرکش اور طریقِ عدل کو چھوڑنے والا اور
شرک اور بے ایمانی کو اختیار کرنے والا ہو کیونکہ ایسا آدمی تو بلاشُبہ دائرۂ اِتّقاء سے خارج ہے اور اِس لائق
ہرگز نہیں ہے کہ اَدنیٰ سے اَدنیٰ قسم متقیوں میں اُس کو داخل کیا جائے مگر آیت ممدوحہ میں ظالم کو متقیوں اور مومنوں
کے گروہ میں نہ صرف داخل ہی کیا ہے بلکہ متقیوں کا سردار اور اُن میں سے برگزیدہ ٹھہرا دیا ہے۔ پس اس سے جیسا کہ ہم
ابھی بیان کر چکے ہیں ثابت ہوا کہ یہ ظالم ان ظالموں میں سے نہیں ہیں جو دائرۂ اِتّقاء سے بکلّی خارج ہیں بلکہ اس سے وہ
لوگ مراد ہیں کہ جو ظلمت معصیت میں مبتلا تو ہیں مگر باایں ہمہ خدا تعالیٰ سے سرکش نہیں ہیں بلکہ اپنے سرکش نفس سے
کُشتی کرتے رہتے ہیں اور تکلّف اور تصنّع سے اور جس طرح بن پڑے حتی الوسع نفس کے جذبات سے رُکنا چاہتے
ہیں مگر کبھی نفس غالب ہو جاتا ہے اور معصیت میں ڈال دیتا ہے اور کبھی وہ غالب آجاتے ہیں اور رو رو کر اُس

---

[1] سورۃ البقرۃ : ۳
[2] سورۃ البقرۃ : ۲، ۳

سیہ دھبے کو دھو ڈالتے ہیں اور یہ صفت جو اُن میں موجود ہوتی ہے دراصل مذموم نہیں ہے بلکہ محمود اور ترقیاتِ غیر متناہیہ کا مرکب اور مجاہداتِ شاقہ کا ذریعہ ہے اور درحقیقت یہی صفت مخالفتِ نفس کی جو دوسرے لفظوں میں ظلومیت کے اسم سے بھی موسوم ہے ایک نہایت قابلِ تعریف جوہر انسان میں ہے جو فرشتوں کو بھی نہیں دیا گیا اور اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا[1] یعنی انسان میں ظلومیت اور جہولیت کی صفت تھی اس لئے اُس نے اس امانت کو اُٹھا لیا جس کو وہی شخص اُٹھا سکتا ہے جس میں اپنے نفس کی مخالفت اور اپنے نفس پر سختی کرنے کی صفت ہو۔ غرض یہ صفتِ ظلومیت انسان کے مراتبِ سلوک کا ایک مرکب اور اس کے مقاماتِ قُرب کے لئے ایک عظیم الشان ذریعہ اس کو عطا کیا گیا ہے جو بوجہ مجاہداتِ شاقہ کے اوائل حال میں نارِ جہنم کی شکل پر تجلّی کرتا ہے لیکن آخر انجام جنّت تک پہنچا دیتا ہے اور درحقیقت قرآن کریم کے دوسرے مقام میں جو یہ آیت ہے وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا ۝ ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا ۝[2] یہ بھی درحقیقت صفتِ محمودہ ظلومیت کی طرف ہی اشارہ کرتی ہے اور ترجمہ آیت یہ ہے کہ تم میں سے کوئی بھی ایسا نفس نہیں جو آگ میں وارد نہ ہو یہ وہ وعدہ ہے جو تیرے رب نے اپنے پر امرِ لازم اور واجب الادا ٹھہرا رکھا ہے۔ پھر ہم اُن آگ میں وارد ہونے کے بعد متقیوں کو نجات دے دیتے ہیں اور ظالموں کو یعنی ان کو جو مشرک اور سرکش ہیں جہنم میں زانو پر گرے ہوئے چھوڑ دیتے ہیں۔ اِس جگہ الظّٰلمین پر جو الف لام آیا ہے وہ فائدہ تخصیص کا دیتا ہے اور اس سے غرض یہ ہے کہ ظالم دو قسم کے ہیں۔

(۱) ایک متقی ظالم جن کی نجات کا وعدہ ہے اور جو خدا تعالیٰ کے پیارے ہیں اور جو آیت فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ میں ناجیوں میں شمار کئے گئے ہیں۔

(۲) دوسرے مشرک اور کافر اور سرکش ظالم جو جہنم میں گرائے جائیں گے اور اس آیت میں بیان فرمایا کہ متقی بھی اُس نار کی مَس سے خالی نہیں ہیں۔ اِس بیان سے مراد یہ ہے کہ متقی اس دُنیا میں جو دار الابتلاء ہے انواع اقسام کے پیرایہ میں بڑی مردانگی سے اُس نار میں اپنے تئیں ڈالتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے لئے اپنی جانوں کو ایک بھڑکتی ہوئی آگ میں گراتے ہیں اور طرح طرح کے آسمانی قضاء و قدر بھی نار کی شکل میں اُن پر وارد ہوتے ہیں وہ ستائے جاتے اور دکھ دیئے جاتے ہیں اور اس قدر بڑے بڑے زلزلے اُن پر آتے ہیں کہ ان کے ماسوا کوئی ان زلازل کی برداشت نہیں کر سکتا اور حدیث صحیح میں ہے کہ تپ بھی جو مومن کو آتا ہے وہ نارِ جہنم میں سے ہے اور مومن بوجہ تپ اور دوسری تکالیف کے نار کا حصہ اِس عالم میں سے لیتا ہے اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ مومن کے لئے

---

[1] سورۃ الاحزاب : ۷۳

[2] سورۃ مریم : ۷۲، ۷۳

اِس دُنیا میں بہشت دوزخ کی صورت میں متمثل ہوتا ہے یعنی خدا تعالیٰ کی راہ میں تکالیفِ شاقہ جہنّم کی صورت میں اس کو نظر آتی ہیں پس وہ بطیب خاطر اُس جہنّم میں وارد ہو جاتا ہے تو معًا اپنے تئیں بہشت میں پاتا ہے۔ اِسی طرح اَور بھی احادیثِ نبویہ بکثرت موجود ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ مومن اسی دُنیا میں نارِ جہنّم کا حصّہ لے لیتا ہے اور کافر جہنّم میں بجبر و اکراہ گرایا جاتا ہے لیکن مومن خدا تعالیٰ کے لئے آپ آگ میں گرتا ہے۔ ایک اَور حدیث اِسی مضمون کی ہے جس میں لکھا ہے کہ ایک حصّہ نار کا ہر یک بشر کے لئے مقدر ہے چاہے تو وہ اِسی دُنیا میں اُس آگ کو اپنے لئے خدا تعالیٰ کی راہ میں قبول کر لیوے اور چاہے تو تنعّم اور غفلت میں عمر گذار دے اور آخرت میں اپنے تنعّم کا حساب دیوے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۲۸ تا ۱۴۶)

چار قسم کے لوگ ہوتے ہیں ایک اوّل کافر جو بے قیدی اور اباحت کی زندگی کو چاہتے ہیں اور تین قسم کے مومن۔ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُقْتَصِدٌ سَابِقٌ بِالْخَیْرَاتِ۔ پہلی قسم کے مومن وہ ہیں جو ظالم ہیں یعنی ان پر کچھ کچھ جذباتِ نفس غالب آجاتے ہیں، دوسرے میانہ رَو اور تیسرے خیر مجسّم۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۱۷ مورخہ ۱۷ رمئی ۱۹۰۵ء صفحہ ۲)

جب انبیاء علیہم السلام مامور ہو کر دُنیا میں آتے ہیں تو لوگ تین ذریعوں سے ہدایت پاتے ہیں یہ اِس لئے کہ تین ہی قسم کے لوگ ہوتے ہیں ظالم، مقتصد، سابق بالخیرات۔

اوّل درجے کے لوگ تو سابق بالخیرات ہوتے ہیں جن کو دلائل اور معجزات کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ وہ ایسے صاف دِل اور سعید ہوتے ہیں کہ مامور کے چہرہ ہی کو دیکھ کر اس کی صداقت کے قائل ہو جاتے ہیں اور اس کے دعوٰی کو ہی سُنکر اس کو برنگِ دلیل سمجھ لیتے ہیں۔ اُن کی عقل ایسی لطیف واقع ہوئی ہوتی ہے کہ وہ انبیاء کی ظاہری صورت اور ان کی باتوں کو سُنکر قبول کر لیتے ہیں۔

دوسرے درجہ کے لوگ مقتصدین کہلاتے ہیں جو ہوتے تو سعید ہیں مگر اُن کو دلائل کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ شہادت سے مانتے ہیں۔

تیسرے درجہ کے لوگ جو ظالمین ہیں ان کی طبیعت اور فطرت کچھ ایسی وضع پر واقع ہوتی ہے کہ وہ بجز مار کھانے اور سختی کے مانتے ہی نہیں۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۱۱ مورخہ ۲۴ رمارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۶)

دُنیا میں ہمیشہ انسانوں کے تین طبقے ہوتے ہیں سابق بالخیرات، مقتصد اور ظالم۔ سابقین کو نشانات اور معجزات کی ضرورت نہیں ہوتی وہ تو قرائن اور حالاتِ موجودہ سے پہچان لیتے ہیں۔ مقتصدین کو کچھ حصّہ روشن دماغی کا ملا ہوا ہوتا ہے اور کچھ تاریکی کا اِس لئے وہ دلائل اور معجزات کے محتاج ہوتے ہیں۔ مگر تیسرا طبقہ جو ظالمین کا ہوتا ہے وہ چونکہ بہت ہی غبی اور پلید ہوتے ہیں بجز مار کھانے کے وہ نہیں مانتے۔ یہ ایک قسم کا جبر ہوتا ہے جو ہر مذہبِ حق میں پایا جاتا ہے کیونکہ ظالمین بجز اس کے سمجھ نہیں سکتے۔ حضرت مسیح کے لئے طیطاوس رُومی کا اِتفاق ہو گیا۔ موسٰیؑ کی قوم جو

پہلے ہی سے مزدوریوں اور فرعون کی سختیوں سے نالاں تھی اُس نے حضرت موسیٰؑ کی دعوت کو قبول کر لینا اپنی نجات کا موجب سمجھا اور پھر بھی اللہ تعالیٰ اُن کی اصلاح کے لئے وقتاً فوقتاً اُن پر عذاب بھیجتا رہا۔ کبھی طاعون کبھی زلزلے مختلف طریق پر انہیں منوایا اور اسی طرح ہوتا رہا ہے۔ غرض یہ ایک سُنّت اللہ ہے کہ ظالمین کو اللہ تعالیٰ اِس طریق پر سمجھاتا ہے کیوں؟ یہ فرقہ زیادہ بھی ہوتا ہے اور تھبی بھی۔ اِس وقت بھی یہ فرقہ زیادہ ہے۔ جو نشانات خدا نے ظاہر کئے ان پر بھی جرح کرتے ہیں۔ کسوف وخسوف کی حدیث کو مجروح قرار دیا ہے۔ لیکھرام کی پیشگوئی پر اعتراض کر دیا۔ ہر نشان جو ظاہر ہوتا ہے اعتراض کر دیتے ہیں مگر خدا تو سب کا مُرشد ہے اِس لئے تیسری صورت اور آخری حُجّت اِختیار کی ہے جو طاعون ہے۔ (الحکم جلد ۶ ۱۲ مورخہ ۳۱۔ مارچ ۱۹۰۲ء صفحہ ۹)

مومن کی جو تقسیم قرآن شریف میں کی گئی ہے اس کے تین ہی درجے اللہ تعالیٰ نے رکھے ہیں ظالم، مقتصد، سابق بالخیرات۔ یہ ان کے مدارج ہیں ورنہ اسلام کے اندر یہ داخل ہیں۔ ظالم وہ ہوتا ہے کہ ابھی اس میں بہت غلطیاں اور کمزوریاں ہیں اور مقتصد وہ ہوتا ہے کہ نفس اور شیطان سے اس کی جنگ ہوتی ہے مگر کبھی یہ غالب آ جاتا ہے اور کبھی مغلوب ہوتا ہے کچھ غلطیاں بھی ہوتی ہیں اور صلاحیت بھی۔ اور سابق بالخیرات وہ ہوتا ہے جو ان دونوں درجوں سے نکل کر مستقل طور پر نیکیاں کرنے میں سبقت لے جاوے اور بالکل صلاحیت ہی ہو۔ نفس اور شیطان کو مغلوب کر چکا ہو۔ قرآن شریف ان سب کو مسلمان ہی کہتا ہے۔ (الحکم جلد ۶ ۴۰ مورخہ ۱۰۔ نومبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۷)

مقتصد سے مراد نفسِ لوامہ والے ہیں اور یہ تکالیف نفسِ لوامہ تک ہی ہوتی ہیں کہ اس میں انسان کے ساتھ کشاکش نفسِ امارہ کی ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ راحت اور آرام کی یہ بات اختیار کر اور لوامہ وہ نہیں کرتا اس وقت انسان مجاہدہ کرتا ہے اور نفسِ امارہ کو زیر کرتا ہے اور اس طرح جنگ ہوتی رہتی ہے حتّٰی کہ امارہ شکست کھا جاتا ہے اور پھر نفسِ مطمئنہ رہ جاتا ہے۔۔۔۔۔ اِس آیت میں ظالم سے مراد نفسِ امارہ والے اور مقتصد سے مراد لوامہ والے اور سابق بالخیرات سے مراد مطمئنہ والے ہیں۔ پوری تبدیلی زندگی میں جب تک نہ آوے تب تک جنگ رہتی ہے اور لوامہ تک یہ جنگ ہے جب یہ ختم ہوئی تو پھر دار النعم میں آ جاتا ہے۔ (البدر جلد ۱ ۷ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۵۱)

ظالم سے مراد وہ لوگ ہیں جو کہ نفسِ امارہ کے تابع ہیں کہ جس راہ پر نفس نے ڈالا اسی راہ پر چل پڑے اور وہ صُمٌّ بُکمٌ کی طرح ہوتے ہیں اور ان کی مثال بہائم کی ہے اِس لئے کسی تدبیر میں نہیں آ سکتے اور یہ کثرت سے ہوتے ہیں۔

(البدر جلد ۲ ۳ مورخہ ۶ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۰)

مومنوں کے تین طبقے ہیں ایک وہ جو ٹھوکر کھانے کے لائق ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو میانہ رَو کسی ٹھوکر سے بچتے اور ڈرتے رہتے ہیں۔ تیسرے وہ جو ہر ایک ٹھوکر سے ایسے بچ کر نکل جاتے ہیں جیسے سانپ اپنی کینچلی (سے)۔ وہ ہر ایک خیر کے لئے دوڑتے اور ہر ایک شر سے بھاگتے ہیں۔۔۔۔۔ قسم اوّل ظَالِمٌ لِّنَفْسِہٖ۔ دوئم مقتصد سوم سابق

بالخیرات۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۷ جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۷)

سب لوگ ایک طبقہ کے نہیں ہوتے۔ خدا تعالیٰ بھی قرآن شریف میں مومنوں کے طبقات بیان کرتا ہے مِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ [۳۲/۱۹] کہ بعض ان میں سے اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہیں اور بعض میانہ رَو اور بعض سبقت کرنے والے۔ (البدر جلد ۳ نمبر ۲۶ مورخہ ۸ جولائی ۱۹۰۴ء صفحہ ۴)

اسلام میں انسان کے تین طبقے رکھے ہیں۔ ظالم لنفسہٖ۔ مقتصد۔ سابق بالخیرات۔ ظالم لنفسہٖ تو وہ ہوتے ہیں جو نفس امارہ کے پنجے میں گرفتار ہوں اور ابتدائی درجہ پر ہوتے ہیں۔ جہاں تک ان سے ممکن ہوتا ہے وہ سعی کرتے ہیں کہ اس حالت سے نجات پائیں۔

مقتصد وہ ہوتے ہیں جن کو میانہ رَو کہتے ہیں۔ ایک درجہ تک وہ نفس امارہ سے نجات پا جاتے ہیں لیکن پھر بھی کبھی کبھی اس کا حملہ ان پر ہوتا ہے اور وہ اس حملہ کے ساتھ ہی نادم بھی ہوتے ہیں پورے طور پر ابھی نجات نہیں پائی ہوتی۔

مگر سابق بالخیرات وہ ہوتے ہیں کہ ان سے نیکیاں ہی سرزد ہوتی ہیں اور وہ سب سے بڑھ جاتے ہیں۔ ان کی حرکات و سکنات طبعی طور پر اس قسم کی ہو جاتی ہیں کہ ان سے افعالِ حسنہ ہی کا صدور ہوتا ہے گویا ان کے نفسِ امارہ پر بالکل موت آجاتی ہے اور وہ مطمئنہ حالات میں ہوتے ہیں۔ ان سے اس طرح پر نیکیاں عمل میں آتی ہیں گویا وہ ایک معمولی امر ہے۔ اس لئے ان کی نظر میں بعض اوقات وہ امر بھی گناہ ہوتا ہے جو اس حد تک دوسرے اس کو نیکی ہی سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی معرفت اور بصیرت بہت بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے جو صوفی کہتے ہیں حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ۔ (الحکم جلد ۹ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۰۵ء صفحہ ۶،۵)

تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو ظالم لنفسہٖ کہلاتے ہیں۔ ان کی حالت ایسی ہوتی ہے کہ خواہش نفس ان پر غالب ہوتی ہے اور وہ گویا پنجۂ نفس میں گرفتار ہوتے ہیں۔ دوم وہ لوگ ہیں جو مقتصد یعنی میانہ رَو کہلاتے ہیں یعنی کبھی نفس ان پر غالب ہو جاتا ہے اور کبھی وہ نفس پر غالب ہو جاتے ہیں اور پہلی حالت سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ لیکن تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو پنجۂ نفس سے بکلّی رہائی پا لیتے ہیں اور وہ سابق بالخیرات کہلاتے ہیں یعنی نیکی کرنے میں سب سے سبقت لے جاتے ہیں اور وہ محض خدا ہی کے لئے ہو جاتے ہیں۔ ان میں علمی اور عملی قوت آجاتی ہے۔ ایسے لوگ خدمتِ دین کے لئے مفید اور کارآمد ہوتے ہیں۔ (الحکم جلد ۱۰ نمبر ۲ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۰۶ء صفحہ ۴)

فطرتاً انسان تین قسم کے ہوتے ہیں ایک فطرتاً ظالم لنفسہٖ دوسرے مقتصد یعنی کچھ نیکی سے بہرہ ور اور کچھ بُرائی سے آلودہ سوم بُرے کاموں سے متنفر اور سابق بالخیرات۔ پس یہ آخری سلسلہ ایسا ہوتا ہے کہ اجتبیٰ اور اصطفیٰ اس کے مراتب پر پہنچتے ہیں اور انبیاء علیہم السلام کا گروہ ایسے پاک سلسلہ میں سے ہوتا ہے اور یہ سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ جاری ہے دُنیا ایسے

لوگوں سے خالی نہیں۔ (از ٹریکٹ رد البعنوان حضرت اقدس کی ایک تقریر اور مسئلہ وحدت الوجود پر ایک خط مرتبہ عرفانی ص۲۳)

پہلی دونوں صفات اَدنیٰ ہیں سابق بالخیرات بننا چاہیئے۔ ایک ہی مقام پر ٹھہر جانا کوئی اچھی صفت نہیں ہے۔ دیکھو ٹھہرا ہُوا پانی آخر گندہ ہو جاتا ہے کیچڑ کی صحبت کی وجہ سے بدبودار اور بدمزہ ہو جاتا ہے چلتا پانی ہمیشہ صاف ستھرا اور مزیدار ہوتا ہے اگرچہ اس میں بھی نیچے کیچڑ ہو مگر کیچڑ اس پر کچھ اثر نہیں کر سکتا۔ یہی حال انسان کا ہے کہ ایک ہی مقام پر ٹھہر نہیں جانا چاہیئے یہ حالت خطرناک ہے ہر وقت قدم آگے ہی رکھنا چاہیئے نیکی میں ترقی کرنی چاہیئے ورنہ خدا تعالیٰ انسان کی مدد نہیں کرتا اور اِس طرح سے انسان بے نور ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ آخرکار بعض اَوقات اِرتداد ہو جاتا ہے۔ اِس طرح سے اِنسان دل کا اندھا ہو جاتا ہے۔ خدا کی نصرت ہمیشہ انہی کے شاملِ حال ہوتی ہے جو ہمیشہ نیکی میں آگے ہی آگے قدم رکھتے ہیں ایک جگہ نہیں ٹھہرتے اور وہی ہیں جن کا انجام بخیر ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۱۲ ۱۶ مورخہ ۲ر مارچ ۱۹۰۸ء صفحہ ۶)

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا۔ ہم نے کتاب کا وارث اپنے بندوں میں سے ان کو بنایا جن کو ہم نے چُن لیا۔ یعنی ان لوگوں کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جیسے ایک مکان کی کُل کھڑکیاں کُھلی ہیں کہ کوئی گوشہ تاریکی کا اس میں نہیں اور روشنی خوب صاف اور کُھلی آ رہی ہے۔ اسی طرح ان کے مکالمہ کا حال ہوتا ہے ..... کہ اجلیٰ اور بہت کثرت سے ہوتا ہے۔ (البدر جلد ۲ ۲ مورخہ ۲۷ر فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۴۴)

دُعا وہ ہوتی ہے جو خدا کے پیارے کرتے ہیں ورنہ یُوں تو خدا تعالیٰ ہندوؤں کی بھی سُنتا ہے اور بعض اُن کی مرادیں پوری ہو جاتی ہیں مگر ان کا نام ابتلاء ہے دُعا نہیں۔ مثلاً اگر خدا سے کوئی روٹی مانگے تو کیا نہ دے گا؟ اس کا وعدہ ہے مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا[1] کُتّے بِلّی بھی تو اکثر پیٹ پالتے ہیں۔ کیڑوں مکوڑوں کو بھی رزق ملتا ہے مگر اِصْطَفَيْنَا کا لفظ خاص موقعوں کے لئے ہے۔ (البدر جلد ۲ ۵ مورخہ ۱۳ر فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۲۸)

خدا تعالیٰ نے بھی اپنے بندوں میں امتیاز رکھا ہے جیسے کہ فرمایا ہے فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ ..... ضروری بات یہ ہے کہ تم لوگ ان باتوں کی طرف متوجہ نہ ہو اور تقویٰ اور طہارت میں ترقی کرو تمہارا معاملہ اور حساب خدا سے الگ ہے اور مخالف لوگوں کا حساب الگ ہے جنہوں نے قسم کھائی ہے کہ کیسی ہی سچی بات کیوں نہ ہو مگر وہ قبول نہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ بھی ان کی نسبت یہی فرماتا ہے کہ یہ لوگ قیامت کو ہی قبول کریں گے۔ ان کی بناوٹ ہی اس قسم کی ہے کہ عمدہ شئے یا بات جو پیش کی جاوے وہ ان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اگر بدبودار بات ہو تو خوش ہوتے ہیں۔ قرآن شریف، احادیث اور عقلی دلائل اور نشان پیش کئے مگر یہ لوگ ان کی پرواہ نہیں کرتے صرف ایک بات کو نشانہ بناتے ہیں۔ پس جب کہ خدا نے نہ چاہا کہ ایک مذہب ہو تو ہم

---

[1] سورۃ ھود: ۷

کیا کر سکتے ہیں مگر جن لوگوں کو خدا نے فہم سلیم عطا کیا ہے ان کو چاہیئے کہ وہ شکر کریں کیونکہ فائدہ اٹھانے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جن کو خدا نے خود پاک کیا۔ (الحکم جلد ۸ نمبر ۳۴، ۳۵ مورخہ ۱۰ و ۱۷ اکتوبر ۱۹۰۴ء صا)

تین قسم کے مومن ہوتے ہیں ایک تو ظالم لنفسہ ہوتے ہیں ان میں گناہ کی آلائش موجود ہوتی ہے بعض میانہ رو اور بعض سراسر نیک ہوتے ہیں۔ اب ہمیں کیا معلوم ہے کہ کون کس درجہ اور مقام پر ہے۔ ہر ایک شخص کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ الگ معاملہ ہے جیسا کہ کوئی اس سے تعلق رکھتا ہے ویسا ہی وہ اس سے معاملہ کرتا ہے۔ جو لوگ کامل الایمان ہیں میں یقین رکھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اسے امتیاز دے گا کیونکہ مومن اور کافر کے درمیان ایک فرقان رکھا جاتا ہے قرآن شریف میں مومن سے وہ مراد نہیں ہے کہ صرف زبان تک ہی اس کی قیل وقال محدود ہو اور صبح وہ ایمان کا کام کرے تو شام کو کفر کا کرے۔ ایک لقمہ وہ تریاق کا کھاتا ہے اور دوسرا زہر کا بھی کھا لیتا ہے ایسے شخص کو وہ فرقان اور امتیاز جو مومن کے لئے مقرر کیا گیا ہے نہیں دیا جاتا۔ (الحکم جلد ۸ ۳۱/۳۲ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۳)

ایماندار تین قسم کے ہیں (۱) اول وہ جو ظالم ہیں یعنی انواع و اقسام کے گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور گناہ کا پلہ ان کا بھاری ہوتا ہے (۲) دوسرے وہ جو میانہ رَو ہیں یعنی کچھ تو گناہ کرتے ہیں اور کچھ نیک اعمال اور دونوں حالتوں میں مساوی ہوتے ہیں (۳) اور تیسرے درجہ کے وہ لوگ ہیں جو عمدہ اخلاق اور عمدہ اعمال میں سبقت لے جاتے ہیں.....
غرض ایمان لانے والوں کے تین درجے ہیں ظالم، مقتصد، سابق بالخیرات۔ ظالم ہونے کی حالت میں انسان اپنی بد اعمالی کی حالت کو محسوس کر لیتا ہے اور مقتصد ہونے کی حالت میں نیکی کے بجالانے کی توفیق پاتا ہے مگر پورے طور پر بجا نہیں لا سکتا اور سابق بالخیرات ہونے کی حالت میں جہاں تک اس کی فطرت کی طاقت ہے پورے طور پر نیکی بجا لاتا ہے اور نیک اعمال کے بجالانے میں آگے سے آگے دوڑتا ہے اور اس درجہ پر انسان کو خدا تعالیٰ کی عظمت اور جلال اور قدرت کا اِس قدر علم ہو جاتا ہے کہ گویا وہ اس کو دیکھتا ہے کیونکہ خدا تعالیٰ خود اس کو اپنے خارق عادت تصرفات کے ساتھ راہ دکھا دیتا ہے۔ رُوح القدس کی تائید جو مومن کے شامل حال ہوتی ہے وہ محض خدا تعالیٰ کا اِنعام ہوتا ہے جو اُن کو ملتا ہے جو سچے دِل سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لاتے ہیں وہ کسی مجاہدہ سے نہیں ملتا محض ایمان سے ملتا ہے اور مُفت ملتا ہے صرف یہ شرط ہے کہ ایسا شخص ایمان میں صادق ہو اور قدم میں استوار اور امتحان کے وقت صابر ہو۔ (لیکچر چشمہ معرفت صفحہ ۵۶ تا ۵۸)

قرآن مجید میں ہے فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌۢ بِالْخَيْرٰتِ۔ ہم تینوں طبقوں کے لوگوں کو مسلمان کہتے ہیں مگر ان کو کیا کہیں جو مومن کو کافر کہیں۔ جو ہمیں کافر کہیں گے ہم انہیں بھی اس وقت تک ان کے ساتھ سمجھیں گے جب تک کہ وہ ان سے الگ ہونے کا اِعلان بذریعہ اشتہار نہ کریں اور ساتھ ہی نام بنام یہ نہ لکھیں کہ ہم ان مکفرین کو بموجب حدیث صحیح کافر سمجھتے ہیں۔ (البدر جلد ۷ نمبر ۱۹-۲۰ مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۲۰)

اسْتِكْبَارًا فِي الْأَرْضِ وَمَكْرَ السَّيِّئِ ۚ وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ ۚ فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا سُنَّتَ الْأَوَّلِينَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَبْدِيلًا ۖ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللَّهِ تَحْوِيلًا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے یہودیوں کو یہ جواب ملا ہے کہ ایلیا نبی کے دوبارہ آنے سے یوحنا نبی یعنی یحییٰ کا آنا مراد تھا تو ایک دیندار آدمی سمجھ سکتا ہے کہ عیسیٰ ابن مریم کا دوبارہ آنا بھی اسی طرز سے ہوگا کیونکہ یہ وہی سُنت اللہ ہے جو پہلے گذر چکی ہے فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ (ایام الصلح صفحہ ۲۷)

اہل اللہ کے دو ہی کام ہوتے ہیں جب کسی بلا کے آثار دیکھتے ہیں تو دُعا کرتے ہیں لیکن جب دیکھتے ہیں کہ قضا و قدر اس طرح پر ہے تو صبر کرتے ہیں جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بچوں کی وفات پر صبر کیا جن میں سے ایک بچہ ابراہیم بھی تھا جبکہ خدا تعالیٰ نے یہ دو تقسیمیں رکھ دی ہیں اور یہ اس کی سُنت ٹھہر چکی ہے اور یہ بھی اس نے فرمایا ہے لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا پھر کس قدر غلطی ہے جو انسان اس کے خلاف چاہے۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۳۶ مورخہ ۱۰؍ اکتوبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱۲)

سارے نشانات عام لوگوں کے خیالات کے موافق کبھی پورے نہیں ہوا کرتے ہیں تو پھر انبیاء کے وقت اختلاف اور انکار کیوں ہو؟ یہودیوں سے پوچھو کہ کیا وہ مانتے ہیں کہ مسیح کے آنے کے وقت سارے نشانات پورے ہو چکے تھے؟ نہیں۔ یاد رکھو قانونِ قدرت اور سُنت اللہ اس معاملہ میں یہی ہے جو میں پیش کرتا ہوں لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا

(الحکم جلد ۷ نمبر ۷ مورخہ ۲۱؍ فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

خدا تعالیٰ اپنی سُنت کو نہیں بدلا کرتا جیسے قرآن شریف میں ہے وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا اور جو انسان ذرا سی بھی نیکی کرتا ہے تو خدا (تعالیٰ) اُسے ضائع نہیں کرتا۔ اسی طرح جو ذرہ بھر بدی کرتا ہے اس پر بھی خدا تعالیٰ مؤاخذہ کرتا ہے۔ پس جب یہ حالت ہے تو گناہ سے بہت بچنا چاہیئے۔ (البدر جلد ۲ نمبر ۱۴ مورخہ ۲۴؍ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۰۸)

خدا تعالیٰ ایک تبدیلی چاہتا ہے اور وہ پاکیزہ تبدیلی ہے جب تک وہ تبدیلی نہ ہو عذاب الٰہی سے رستگاری اور مخلصی نہیں ملتی۔ یہ خدا تعالیٰ کا ایک قانون اور سُنت ہے اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوتی کیونکہ خود اللہ تعالیٰ نے ہی یہ فیصلہ کر دیا ہے وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا سُنت اللہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی پس جو شخص چاہتا ہے کہ آسمان میں اس کے لئے تبدیلی ہو یعنی وہ ان عذابوں اور دُکھوں سے رہائی پائے جو شامتِ اعمال نے اس کیلئے

تیار کئے ہیں اس کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے اندر تبدیلی کرے۔ جب وہ خود تبدیلی کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدہ کے موافق جو اس نے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ[لہ] میں کیا ہے اس کے عذاب اور دُکھ کو بلا دیتا ہے اور دُکھ کو سُکھ سے تبدیل کر دیتا ہے۔ (الحکم جلد ۸ ۳۱ مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۰۴ء صفحہ ۲)

تزکیۂ نفس بجز فضلِ خدا میسر نہیں آسکتا یہ خدا تعالیٰ کا اٹل قانون ہے۔ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا اور اس کا قانون جو جذبِ فضل کے واسطے ہمیشہ سے مقرر ہے وہ یہی ہے کہ اتّباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جاوے۔

(الحکم جلد ۱۲ ۳۳ مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا ۝

اور اگر خدا ان لوگوں سے اِن کے گناہوں کا مؤاخذہ کرتا تو زمین پر ایک بھی زندہ نہ چھوڑتا۔ (براہین احمدیہ ۵۲۲)

خدا اگر لوگوں کے اعمال پر جو اپنے اختیار سے کرتے ہیں اُن کو پکڑتا تو کوئی زمین پر چلنے والا نہ چھوڑتا۔

(جنگِ مقدس صفحہ ۱۴۹ روئیداد یکم جون ۱۸۹۳ء)

[لہ] سُورۃ الرعد: ۱۲

سُورَۃ یٰسٓ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

۲ یٰسٓ

اے سردار (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۰۷)

۳ وَالۡقُرۡاٰنِ الۡحَکِیۡمِ

قرآن حکمت سے پُر ہے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۸۶ حاشیہ در حاشیہ)

فرمایا۔ مَیں نے قرآن کے لفظ میں غور کی تب مجھ پر کھلا کہ اِس مبارک لفظ میں ایک زبردست پیشگوئی ہے وہ یہ ہے کہ یہی قرآن یعنی پڑھنے کے لائق کتاب ہے اور ایک زمانہ میں تو اَور بھی زیادہ یہی پڑھنے کے قابل کتاب ہوگی جبکہ اَور کتابیں بھی پڑھنے میں اس کے ساتھ شریک کی جائیں گی۔ اس وقت اِسلام کی عزّت بچانے کے لئے اور بُطلان کا استیصال کرنے کے لئے یہی ایک کتاب پڑھنے کے قابل ہوگی اور دیگر کتابیں قطعاً چھوڑ دینے کے لائق ہوں گی۔ فرقان کے بھی یہی معنے ہیں یعنی یہی ایک کتاب حق و باطل میں فرق کرنے والی ٹھہرے گی اور کوئی حدیث کی یا اَور کوئی کتاب اِس حیثیت اور پایہ کی نہ ہوگی اِس لئے اَب سب کتابیں چھوڑ دو اور رات دِن کتابِ الٰہی کو پڑھو۔ بڑا بے ایمان ہے وہ شخص جو قرآن کریم کی طرف اِلتفات نہ کرے اور دوسری کتابوں پر ہی رات دن جھکا رہے۔ ہماری جماعت کو چاہیئے کہ قرآن کریم کے شغل اور تدبّر میں جان و دل سے مصروف ہو جائیں اور حدیثوں کے شغل کو ترک کر دیں۔ بڑے تعجب کا مقام ہے کہ قرآن کریم کا وہ اِعتنا اور تدارس نہیں کیا جاتا جو احادیث کا کیا جاتا ہے۔ اِس وقت قرآن کریم کا حربہ ہاتھ میں لو تو تمہاری فتح ہے۔ اس نور کے آگے کوئی ظلمت ٹھہر نہ سکے گی۔ (الحکم جلد ۴ نمبر ۳۹ مورخہ ۱۷؍اکتوبر ۱۹۰۰ء صفحہ ۵)

اِنسانی فطرت کا پُورا اور کامل عکس صرف قرآن شریف ہی ہے۔ اگر قرآن نہ بھی آیا ہوتا جب بھی اس تعلیم کے مطابق انسان سے سوال کیا جاتا کیونکہ یہ ایسی تعلیم ہے جو فطرتوں میں مرکوز اور قانونِ قدرت کے ہر صفحہ میں مشہود ہے۔

(الحکم جلد ۱۲ ۴۲ مورخہ ۱۴ جولائی ۱۹۰۸ء صفحہ ۷)

اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝

تُو خدا کا مُرسل ہے۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۱۰۷ باب چہارم)

لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ ۝

تاکہ تُو ان کو ڈراوے جن کے باپ دادے بے خبر گذر گئے۔ (اربعین نمبر ۳ صفحہ ۷، ضمیمہ تحفہ گولڑویہ صفحہ ۶۱)

تجھ کو ہم نے اِس لئے بھیجا ہے ..... تا تُو لوگوں کو کہ غفلت کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں حق کی طرف توجہ دلاوے اور اُن کو خبردار کرے۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۵۴۳)

تا تُو اُن لوگوں کو ڈراوے جن کے باپ دادوں کو کسی نے نہیں ڈرایا سو وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

(براہین احمدیہ صفحہ ۵۵۵ حاشیہ)

تا تُو ان لوگوں کو ڈراوے جن کے باپ دادے نہیں ڈرائے گئے۔ (اربعین نمبر ۲ صفحہ ۹)

تا تُو اُن کو ڈراوے جن کے باپ دادے نہیں ڈرائے گئے۔ (آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۰۹ حاشیہ)

تا اُن لوگوں کو ڈراوے جن کے باپ دادے ڈرائے نہیں گئے۔ (ازالہ اوہام حصّہ اوّل صفحہ ۱۹۳)

اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَهُمْ ؕ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۝

ہم قرآن کے ساتھ مُردوں کو زندہ کر رہے ہیں۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۴۲۵)

قَالُوْا طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ ؕ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۝

قِيْلَ طَائِرُكُمْ مَّعَكُمْ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ۔

(الھُدٰی (والتبصرۃ لمن یرٰی) ص۵۹)

قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ

مقدس بندوں کے لئے وفات پانا اور بہشت میں داخل ہونا ایک ہی حکم میں ہے کیونکہ بر طبق آیت قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ وہ بلا توقف بہشت میں داخل کئے جاتے ہیں۔ (توضیح مرام صفحہ ۵)

مومن کو فوت ہونے کے بعد بلا توقف بہشت میں جگہ ملتی ہے جیسا کہ ان آیات سے ظاہر ہو رہا ہے۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۳۵۴)

اِس قسم کی آیتیں قرآن شریف میں بکثرت ہیں کہ بمجرد موت کے ہر ایک اِنسان اپنے اعمال کی جزا دیکھ لیتا ہے جیسا کہ خدائے تعالیٰ ایک بہشتی کے بارے میں خبر دیتا ہے اور فرماتا ہے قِیْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ یعنی اس کو کہا گیا کہ تو بہشت میں داخل ہو۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۹۴)

وَاِنَّا لَا نَقُوْلُ اَنَّ اَهْلَ الْجَنَّةِ بَعْدَ انْتِقَالِهِمْ اِلٰى دَارِ الْاٰخِرَةِ يُحْبَسُوْنَ فِيْ مَكَانٍ بَعِيْدٍ مِّنَ الْجَنَّةِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَلَا يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ قَبْلَ الْقِيَامَةِ اِلَّا الشُّهَدَاءُ كَلَّا بَلِ الْاَنْبِيَاءُ عِنْدَنَا اَوَّلُ الدَّاخِلِيْنَ۔ اَيَظُنُّ الْمُؤْمِنُ الَّذِيْ يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اَنَّ النَّبِيِّيْنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ يُبْعَدُوْنَ عَنِ الْجَنَّةِ اِلٰى يَوْمِ الْبَعْثِ وَلَا يَجِدُوْنَ مِنْهَا رَائِحَةً۔ وَاَمَّا الشُّهَدَاءُ يَدْخُلُوْنَهَا

ترجمہ از مرتب:۔ تمہاری نحوست تمہارے ساتھ ہے کیا اگر تم کو یاد دلایا جائے بلکہ تم حد سے نکلنے والے لوگ ہو۔

(الھُدٰی (والتبصرۃ لمن یرٰی) ص۵۹)

ترجمہ از مرتب:۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اہلِ جنت دُنیا سے دار الآخرت کی طرف انتقال کے بعد قیامت تک کے لئے جنت سے ایک دُور کی جگہ میں روک لئے جاتے ہیں اور قیامت سے قبل سوائے شہداء کے کوئی شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا یہ بات ہرگز درست نہیں بلکہ ہمارے عقیدہ کے مطابق انبیاء سب سے پہلے جنت میں داخل ہونے والے ہیں۔ کیا وہ مومن جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہو یہ گمان کر سکتا ہے کہ نبی اور صدیق یوم بعث تک جنت سے دُور رکھے جائیں گے اور اس کی راحت بخش ہوا کو نہیں پائیں گے لیکن شہداء بلا توقف جنت میں داخل ہوں گے اور

مِنْ غَيْرِ مُكْثٍ خَالِدِيْنَ ؟

فَاعْلَمْ يَا اَخِيْ اَنَّ هٰذِهِ الْعَقِيْدَةَ رَدِيَّةٌ فَاسِدَةٌ وَّ مَمْلُوَّةٌ مِّنْ سُوْءِ الْاَدَبِ. اَمَا قَرَأْتَ مَا قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ قَبْرِيْ وَقَالَ اِنَّ قَبْرَ الْمُؤْمِنِ رَوْضَةٌ مِّنْ رَوْضَاتِ الْجَنَّةِ وَقَالَ عَزَّوَجَلَّ فِيْ كِتَابِهِ الْمُحْكَمِ يَاۤ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ۔[1] وَقَالَ فِيْ مَقَامٍ اٰخَرَ قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ۔

(حمامة البشریٰ صفحہ ۵۲، ۵۳)

ہر ایک شخص جو طیب اور طاہر مومنوں میں سے مرے وہ بھی بلا توقف بہشت میں داخل ہو جائے اور یہی بات حق ہے جیسا کہ قرآن شریف کے دوسرے مقامات میں بھی اس کی تشریح ہے منجملہ ان کے ایک وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ یعنی کہا گیا کہ تو بہشت میں داخل ہو جا۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۲۱۳، ۲۱۴)

يٰسٓ:۳۱ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۝

اے حسرت بندوں پر کہ ایسا کوئی نبی نہیں آتا جس سے وہ ٹھٹھا نہ کریں۔ (ازالہ اوہام صفحہ ۲۸۰)

ہمیشہ اس میں رہتے چلے جائیں گے؟

اے میرے بھائی جان لے کہ یہ عقیدہ ردّی اور فاسد ہے اور بے ادبی سے پُر ہے۔ کیا تُو نے رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث نہیں پڑھی کہ جنت میری قبر کے نیچے ہے نیز آپ نے فرمایا کہ مومن کی قبر جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے اور خدائے عزّ وجل نے قرآن کریم میں فرمایا ہے يَاۤ اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ ...... الخ یعنی اے نفسِ مطمئنّہ اپنے رب کی طرف لوٹ آ اس حال میں کہ تُو اسے پسند کرنے والا بھی ہے اور اس کا پسندیدہ بھی۔ پھر تیرا رب تجھے کہتا ہے کہ آ میرے خاص بندوں میں داخل ہو جا اور آ میری جنت میں بھی داخل ہو جا۔ اسی طرح ایک اور جگہ قرآن کریم میں فرماتا ہے اسے کہا گیا کہ تُو بہشت میں داخل ہو جا۔ (حمامۃ البشریٰ صفحہ ۵۲، ۵۳)

---

[1] سورۃ الفجر: ۲۸ تا ۳۱

اے حسرت بندوں پر ایسا کوئی رسول ان کے پاس نہ آیا جس سے انہوں نے ٹھٹھا نہ کیا۔

(آسمانی فیصلہ ٹائیٹل پیج)

کوئی نبی نہیں جس سے ٹھٹھا نہ کیا گیا پس ضرور تھا کہ مسیح موعود سے بھی ٹھٹھا کیا جاتا جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یٰحَسْرَۃً عَلَی الْعِبَادِ مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا کَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ پس خدا کی طرف سے یہ نشانی ہے کہ ہر ایک نبی سے ٹھٹھا کیا جاتا ہے مگر ایسا آدمی جو تمام لوگوں کے رُوبرو آسمان سے اُترے اور فرشتے بھی اسکے ساتھ ہوں اُس سے کون ٹھٹھا کرے گا پس اِس دلیل سے بھی عقلمند سمجھ سکتا ہے کہ مسیح موعود کا آسمان سے اُترنا محض جھوٹا خیال ہے۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۶۵)

اگر مجھ سے ٹھٹھا کیا گیا تو یہ نئی بات نہیں دُنیا میں کوئی رسول نہیں آیا جس سے ٹھٹھا نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یٰحَسْرَۃً عَلَی الْعِبَادِ مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا کَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ یعنی بندوں پر افسوس کہ کوئی رسول ان کے پاس ایسا نہیں آیا جس سے انہوں نے ٹھٹھا نہیں کیا۔ (چشمہ معرفت صفحہ ۳۲۸، ۳۲۹)

کوئی رسول ایسا نہیں آیا جس سے جاہل آدمیوں نے ٹھٹھا نہیں کیا۔ دیکھنا تو یہ چاہیئے کہ کیا ٹھٹھا کرنے میں وہ حق بجانب تھے یا محض شیطنت اور شرارت تھی۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۴۱)

اللہ تعالیٰ نے جو اس میں مَا کے ساتھ حصر کیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جو سچا ہے اس کے ساتھ ہنسی اور ٹھٹھا ضرور کیا جاتا ہے۔ اگر یہ نہ کیا جائے تو خدا کا کلام صادق نہیں ٹھہرتا۔ صادق کی یہ بھی ایک نشانی ٹھہری۔

(الحکم جلد ۵ نمبر ۳۱ مورخہ ۱۷؍اگست ۱۹۰۱ء صفحہ ۶)

معاصرت بھی رتبہ کو گھٹا دیتی ہے اِس لئے حضرت مسیح کہتے ہیں کہ نبی بے عزت نہیں ہوتا مگر اپنے وطن میں۔ اِس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کو اہلِ وطن سے کیا کیا تکلیفیں اور صدمے اُٹھانے پڑے تھے سو یہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ایک سُنّت چلی آتی ہے ہم اِس سے الگ کیونکر ہو سکتے ہیں اِس لئے ہم کو جو کچھ اپنے مخالفوں سے سُننا پڑا یہ اسی سُنّت کے موافق ہے۔ مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا کَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۴۴ مورخہ ۱۰؍دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۱)

مذاق، تمسخر صحتِ نیت میں فرق ڈالتا ہے اور ماموروں کے لئے تو یہ سُنّت چلی آئی ہے کہ لوگ ان پر ہنسی اور ٹھٹھا کرتے ہیں مگر حسرت ہنسی کرنے والوں ہی پر رہ جاتی ہے چنانچہ قرآن شریف میں فرمایا ہے یٰحَسْرَۃً عَلَی الْعِبَادِ مَا یَاْتِیْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا کَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ناواقف اِنسان نہیں جانتا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ وہ ہنسی اور مذاق میں ایک بات کو اُڑانا چاہتا ہے مگر تقویٰ ہے جو اُسے راہِ حق کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۷ مورخہ ۲۱؍فروری ۱۹۰۳ء صفحہ ۳)

گورنمنٹ کا ادنیٰ چپڑاسی وصول لگان کے واسطے آجاوے کوئی اس کا مقابلہ نہیں کرتا اور اگر کرے تو گورنمنٹ کا باغی ٹھہرتا ہے اور سزا پاتا ہے مگر خدا کی گورنمنٹ کی لوگ پرواہ نہیں کرتے۔ خدا تعالیٰ سے آنے والے لاریب غربت کے لباس میں ہوتے ہیں۔ لوگ ان کو حقارت اور تمسخر سے دیکھتے ہیں ہنسی ٹھٹھا کرتے ہیں مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ سچا ہے وہ جھوٹ نہیں کہتا کہ آدم سے لے کر اخیر تک جتنے بھی نبی آئے ان تمام سے ہنسی ٹھٹھا کیا گیا ہے مگر جب وقت گذر جاتا ہے پھر لگتے ہیں تعریفیں کرنے..... اسی منہاج پر مجھے بھی تمام پنجاب اور ہندوستان کے علماء نے کافر، دجّال، فاسق، فاجر وغیرہ کے خطاب دیئے ہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۳ مورخہ ۲۲ رمئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

اِن لوگوں نے کوئی ہمیں ہی یہ گالیاں نہیں دیں بلکہ یہ معاملہ تمام انبیاء کے ساتھ اسی طرح چلا آیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی کذّاب، ساحر، مجنون، مفتری وغیرہ الفاظ سے یاد کیا گیا تھا اور انجیل کھول کر دیکھو کہ حضرت عیسیٰؑ سے بھی ایسا ہی برتاؤ کیا گیا۔ حضرت موسیٰؑ کو بھی گالیاں دی گئی تھیں۔ اصل میں تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ والی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ کوئی بھی ایسا سچا نبی نہیں آیا کہ آتے ہی اس کی عزت کی گئی ہو۔ ہم کیونکر سنّت اللہ سے باہر ہو سکتے ہیں۔

(الحکم جلد ۱۲ نمبر ۳۴ مورخہ ۱۸ رمئی ۱۹۰۸ء صفحہ ۴)

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ○ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ○

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ

بعض نیم ملا میرے پر اعتراض کر کے کہتے ہیں کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ خوشخبری دے رکھی ہے کہ تم میں تیس دجال آئیں گے اور ہر ایک اُن میں سے نبوت کا دعویٰ کرے گا۔ اس کا جواب یہی ہے کہ اے نادانو۔ بدنصیبو۔ کیا تمہاری قسمت میں تیس دجال ہی لکھے ہوئے تھے۔ چودھویں صدی کا نصف بھی گذرنے پر ہے اور خلافت کے چاند نے اپنے کمال کی چودہ منزلیں پوری کر لیں جس کی طرف آیت وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ بھی اشارہ کرتی ہے اور دُنیا ختم ہونے لگی مگر تم لوگوں کے دجال ابھی ختم ہونے میں نہیں آتے شاید تمہاری موت تک تمہارے ساتھ رہیں گے۔ (اربعین

بر مباحثہ بٹالوی و چکڑالوی صفحہ ۷ حاشیہ)

نواب صدیق حسن خان نے لکھا ہے کہ نزولِ مسیح میں کوئی شخص چودھویں صدی سے آگے نہیں بڑھتا یعنی جس قدر مکاشفات اور اخبار ہیں وہ تمام چودھویں صدی تک کی خبر دیتی ہیں ۔ ترقی قمر بھی ۱۴ تک ہی معلوم ہوتی ہے جیسے قرآن شریف میں ہے قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ۔

(البدر جلد ۱ نمبر ۶،۵ مورخہ ۲۸ نومبر و ۵ دسمبر ۱۹۰۲ء صفحہ ۴۹)

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَاۤ ...

سُورج کو یہ طاقت نہیں کہ چاند کی جگہ پہنچ جائے اور نہ رات دن پر سبقت کر سکتی ہے۔ کوئی ستارہ اپنے فلکِ مقرری سے آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ (براہین احمدیہ صفحہ ۲۳۸ حاشیہ در حاشیہ)

آج کل کے علم ہیئت کے محققین جو یورپ کے فلاسفر ہیں جس طرز سے آسمانوں کے وجود کی نسبت خیال رکھتے ہیں درحقیقت وہ خیال قرآن کریم کے مخالف نہیں کیونکہ قرآن کریم نے اگرچہ آسمانوں کو نرا پول تو نہیں ٹھہرایا لیکن اُس سماوی مادہ کو جو پول کے اندر بھرا ہوا ہے صلب اور کثیف اور متعسرالخرق مادہ بھی قرار نہیں دیا بلکہ ہوا یا پانی کی طرح نرم اور لطیف مادہ قرار دیا جس میں ستارے تیرتے ہیں۔ اِسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ جل شانہ فرماتا ہے كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۔ ہاں یونانیوں نے آسمانوں کو اجسامِ کثیفہ تسلیم کیا ہوا ہے اور پیاز کے چھلکوں کی طرح تہ بتہ ان کو مانا ہے اور آخری تہ کا آسمان جو تمام تہوں پر محیط ہو رہا ہے جمیع مخلوقات کا اِنتہا قرار دیا ہے جس کو وہ فلک الافلاک اور محدد بھی کہتے ہیں جو اُن کے زعم میں معہ تمام آسمانوں کے جن کا نام مدبرا اور جوزہرا اور مائل ہے مشرق سے مغرب کی طرف گردش کرتا ہے اور باقی آسمان مغرب سے مشرق کی طرف گھومتے ہیں اور ان کے گمان میں فلک محدد معمورہ عالم کا منتہا ہے جس کے پیچھے خلا ملا نہیں۔ گویا خدا تعالیٰ نے اپنے ممالکِ مقبوضہ کی ایک دیوار کھینچی ہوئی ہے جس کا ماورا کچھ بھی نہیں۔ نہ خلا نہ ملا۔

یونانیوں کی اس رائے پر جس قدر اعتراض وارد ہوتے ہیں پوشیدہ نہیں۔ نہ صرف قیاسی طور پر بلکہ تجربہ بھی ان کا مکذب ہے جس حالت میں آجکل کے آلات دُور بین نہایت دُور کے ستاروں کا بھی پتہ لگاتے جاتے ہیں اور چاند اور سُورج کو ایسا دکھا دیتے ہیں کہ گویا وہ پانچ چار کوس پر ہیں تو پھر تعجب کا مقام ہے کہ باوجودیکہ آسمان یونانیوں کے زعم میں ایک کثیف جوہر ہے اور ایسا کثیف جو قابلِ خرق والتیام نہیں اور اس قدر بڑا کہ گویا چاند اور سُورج کو اُس کی ضخامت کے ساتھ کچھ بھی نسبت نہیں پھر بھی وہ اِن دُور بین آلات سے نظر نہیں آ سکا۔ اگر دُور کے آسمان نظر نہیں آتے تھے تو سماء الدُّنیا جو سب سے قریب ہے ضرور نظر آ جانا چاہیئے تھا پس کچھ شک نہیں کہ جو یونانیوں نے عالَمِ بالا کی تصویر دکھائی ہے وہ صحیح نہیں اور اِس قدر اعتراض اس پر پیدا ہوتے ہیں کہ جن سے مخلصی حاصل کرنا ممکن ہی نہیں لیکن قرآن کریم نے جو سمٰوٰت کی حقیقت بیان کی ہے وہ نہایت صحیح اور درست ہے جس کے ماننے کے

بغیر انسان کو کچھ بن نہیں پڑتا اور اُس کی مخالفت میں جو کچھ بیان کیا جائے وہ سراسر ناواقفی یا تعصب پر مبنی ہوگا۔ قرآن کریم نہ آسمانوں کو یونانی حکماء کی طرح طبقاتِ کثیفہ ٹھہراتا ہے اور نہ بعض نادانوں کے خیال کے موافق نرا پول جس میں کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ شق اوّل کی معقولی طور پر غلطی ظاہر ہے جس کی نسبت ہم ابھی بیان کر چکے ہیں اور شق دوم یعنی یہ کہ آسمان کچھ بھی وجود مادی نہیں رکھتا نرا پول ہے استقراء کی رُو سے سراسر غلط ثابت ہوتا ہے کیونکہ اگر ہم اُس فضا کی نسبت جو چمکتے ہوئے ستاروں تک ہمیں نظر آتا ہے بذریعہ اپنے تجارب استقرائیہ کے تحقیقات کرنا چاہیں تو صاف ثابت ہوتا ہے کہ سنّت اللہ یا قانونِ قدرت یہی ہے کہ خدا تعالیٰ نے کسی فضا کو محض خالی نہیں رکھا چنانچہ جو شخص غبارہ میں بیٹھ کر ہوا کے طبقات کو چیرتا چلا جاتا ہے وہ شہادت دے سکتا ہے کہ جس قدر وہ اُوپر کو چڑھا اُس نے کسی حصّہ فضا کو خالی نہیں پایا پس یہ استقراء ہمیں اس بات کے سمجھنے کے لئے بہت مدد دے سکتا ہے کہ اگرچہ یونانیوں کی طرح آسمان کی حالت ناجائز ہے مگر یہ بھی تو درست نہیں ہے کہ آسمانوں سے مراد صرف ایک خالی فضا اور پول ہے جس میں کوئی مخلوق مادہ نہیں ہم جہاں تک ہمارے تجارب رؤیت رسائی رکھتے ہیں کوئی مجرد پول مشاہدہ نہیں کرتے پھر کیونکر خلاف اپنی مستمر استقراء کے حکم کر سکتے ہیں کہ ان مملو فضاؤں سے آگے چل کر ایسے فضاء بھی ہیں جو بالکل خالی ہیں۔ کیا برخلاف ثابت شدہ استقراء کے اس وہم کا کچھ بھی ثبوت ہے۔ ایک ذرا بھی نہیں۔ پھر کیونکر ایک بے بنیاد وہم کو قبول کیا جائے اور مان لیا جائے۔ ہم کیونکر ایک قطعی ثبوت کو بغیر کسی مخالف اور غالب ثبوت کے چھوڑ سکتے ہیں اور علاوہ اس کے اللہ جلّ شانہٗ کی اس میں کسرِ شان بھی ہے گویا وہ عام اور کامل خالقیت سے عاجز تھا تبھی تو تھوڑا سا بنا کر باقی بے انتہا فضا چھوڑ دی اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس استقرائی ثبوت کے انکار میں کہ کوئی فضا کسی جوہرِ لطیف سے خالی نہیں کون سی یقینی اور قطعی دلیل ایسے شخصوں کے ہاتھ میں ہے جو مجرد پول کے قائل ہیں یا قائل ہوں۔ اگر کوئی شخص ایسا ہی اعتقاد اور رائے رکھتا ہے کہ چند مادی گردوں کے بعد تمام پول ہی پڑا ہے جو بے انتہا ہے تو وہ ہماری اس حجتِ استقرائی سے صاف اور صریح طور پر ملزم ٹھہر جاتا ہے ظاہر ہے کہ استقراء وہ استدلال اور حجت کی قسم ہے جو اکثر دنیا کے ثبوتوں کو اُسی سے مدد ملی ہے مثلاً ہمارا یہ قول کہ انسان کی دو آنکھیں ہوتی ہیں اور ایک زبان اور دو کان اور وہ عورتوں کی پیشاب گاہ کی راہ سے پیدا ہوتا ہے اور پہلے بچہ پھر جوان اور پھر بڈھا ہوتا ہے اور آخر کسی قدر عمر پا کر مر جاتا ہے۔ اور ایسا ہی ہمارا یہ قول کہ انسان سوتا بھی ہے اور کھاتا بھی اور آنکھوں سے دیکھتا اور ناک سے سُونگھتا اور کانوں کے ذریعہ سے سُنتا اور پیروں سے چلتا اور ہاتھوں سے کام کرتا اور دو کانوں میں اس کا سر ہے اور ایسا ہی اور صدہا باتیں اور ہر یک نوع نباتات اور جمادات اور حیوانات کی نسبت جو ہم نے طرح طرح کے خواص دریافت کئے ہیں ان سب کا ذریعہ بجز استقراء کے اور کیا ہے۔

پھر اگر استقراء میں کسی کو کلام ہو تو یہ تمام علوم درہم برہم ہو جائیں گے اور اگر یہ غلطیاں اُن کے دلوں میں پیدا

ہو کہ آسمانوں کا اگر کچھ وجود ہے تو کیوں نظر نہیں آتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر ایک وجود کا مرئی ہونا شرط نہیں جو وجود نہایت لطافت اور بساطت میں پڑا ہے وہ کیونکر نظر آجائے اور کیونکر کوئی دُور بین اُس کو دریافت کر سکے۔ غرض سماوی وجود کو خدا تعالیٰ نے نہایت لطیف قرار دیا ہے چنانچہ اسی کی تصریح میں یہ آیت اشارہ کر رہی ہے کہ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ یعنی ہر یک ستارہ اپنے اپنے آسمان میں جو اس کا مبلغ دَور ہے تیر رہا ہے اور درحقیقت خدا تعالیٰ نے یونانیوں کی محدد کی طرح اپنے عرش کو قرار نہیں دیا اور نہ اس کو محدود قرار دیا ہاں اُس کو اعلیٰ سے اعلیٰ ایک طبقہ قرار دیا ہے جس سے باعتبار اُس کی کیفیت اور کمیت کے اَور کوئی اعلیٰ طبقہ نہیں ہے اور یہ امر ایک مخلوق اور موجود کے لئے ممتنع اور محال نہیں ہو سکتا بلکہ نہایت قرین قیاس ہے کہ جو طبقہ عرش اللہ کہلاتا ہے وہ اپنی وسعتوں میں خدائے غیر محدود کے مناسب حال اور غیر محدود ہو۔

اور اگر یہ اعتراض پیش ہو کہ قرآن کریم میں یہ بھی لکھا ہے کہ کسی وقت آسمان پھٹ جائیں گے اور اُن میں شگاف ہو جائیں گے۔ اگر وہ لطیف مادہ ہے تو اس کے پھٹنے کے کیا معنے ہیں تو اس کا یہ جواب ہے کہ اکثر قرآن کریم میں سماء سے مراد كُلُّ مَا فِي السَّمَاءِ کو لیا ہے جس میں آفتاب اور ماہتاب اور تمام ستارے داخل ہیں ماسوا اس کے ہر یک جرم لطیف ہو یا کثیف قابلِ خرق ہے بلکہ لطیف تو بہت زیادہ خرق کو قبول کرتا ہے پھر کیا تعجب ہے کہ آسمانوں کے مادہ میں بحکم ربِّ قدیر و حکیم ایک قسم کا خرق پیدا ہو جائے۔ وَذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ۔ بالآخر یہ بات بھی یاد رکھنے کے لائق ہے کہ قرآن کریم کے ہر یک لفظ کو حقیقت پر حمل کرنا بھی بڑی غلطی ہے اور اللہ جلّ شانہٗ کا یہ پاک کلام بوجہ اعلیٰ درجہ کی بلاغت کے استعاراتِ لطیفہ سے بھرا ہوا ہے۔ سو ہمیں اس فکر میں پڑنا کہ انشقاق اور انفجار آسمانوں کا کیونکر ہوگا درحقیقت ان الفاظ کے وسیع مفہوم میں ایک دخل بیجا ہے صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام الفاظ اور اس قسم کے اَور بھی عالمِ مادی کے فنا کی طرف اشارہ ہے الٰہی کلام کا مدعا یہ ہے کہ اس عالم کون کے بعد فساد بھی لازم پڑا ہوا ہے۔ ہر یک جو بنایا گیا توڑا جائے گا اور ہر یک ترکیب پاش پاش ہو جائے گی اور ہر یک جسم متفرق اور ذرہ ذرہ ہو جائے گا اور ہر یک جسم اور جسمانی پر عالم فنا طاری ہوگی۔ اور قرآن کریم کے بہت سے مقامات سے ثابت ہوتا ہے کہ انشقاق اور انفجار کے الفاظ جو آسمان کی نسبت وارد ہیں ان سے ایسے معنے مراد نہیں ہیں جو کسی جسم صلب اور کثیف کے حق میں مراد لئے جاتے ہیں۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۴۸ تا ۱۵۱ حاشیہ در حاشیہ)

آفتاب چاند کو پکڑ نہیں سکتا اور نہ رات جو مظہرِ ماہتاب ہے دن پر جو مظہرِ آفتاب ہے کچھ تسلط کر سکتی ہے یعنی کوئی ان میں سے اپنی حدودِ مقررہ سے باہر نہیں جاتا۔ اگر ان پر در پردہ کوئی مدبّر نہ ہو تو یہ تمام سلسلہ درہم برہم ہو جائے یہ دلیل ہیئت پر غور کرنے والوں کے لئے نہایت فائدہ بخش ہے کیونکہ اجرام فلکی کے اتنے بڑے عظیم الشان اور بے شمار گولے ہیں جن کے تھوڑے سے بگاڑ سے تمام دنیا تباہ ہو سکتی ہے۔ یہ کیسی قدرتِ حق ہے کہ وہ آپس میں نہ ٹکراتے

ہیں نہ بال بھر رفتار بدلتے اور نہ اتنی مدت تک کام دینے سے کچھ گھسے اور نہ ان کی کلوں پُرزوں میں کچھ فرق آیا۔اگر سر پر کوئی محافظ نہیں تو کیونکر اتنا بڑا کارخانہ بے شمار برسوں سے خود بخود چل رہا ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۵۶)

ایک اور نکتہ قابلِ یادداشت ہے اور وہ یہ کہ تیسری قسم کے لوگ بھی جن کا خدا تعالیٰ سے کامل تعلق ہوتا ہے اور کامل اور مصفّٰی الہام پاتے ہیں قبولِ فیوضِ الٰہیہ میں برابر نہیں ہوتے اور اُن سب کا دائرۂ استعداد و فطرت باہم برابر نہیں ہوتا بلکہ کسی کا دائرہ استعداد فطرت کم درجہ پر وسعت رکھتا ہے اور کسی کا زیادہ وسیع ہوتا ہے اور کسی کا بہت زیادہ اور کسی کا اِس قدر جو خیال و گمان سے برتر ہے اور کسی کا خدا تعالیٰ سے رابطۂ محبت قوی ہوتا ہے اور کسی کا اقوٰی اور کسی کا اِس قدر کہ دُنیا اُس کو شناخت نہیں کر سکتی اور کوئی عقل اس کے انتہاء تک نہیں پہنچ سکتی اور وہ اپنے محبوبِ ازلی کی محبت میں اِس قدر محو ہوتے ہیں کہ کوئی رگ و ریشہ اُن کی ہستی اور وجود کا باقی نہیں رہتا اور یہ تمام مراتب کے لوگ بموجب آیت كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُوْنَ اپنے دائرۂ استعداد فطرت سے زیادہ ترقی نہیں کر سکتے اور کوئی ان میں سے اپنے دائرہ فطرت سے بڑھ کر کوئی نور حاصل نہیں کر سکتا اور نہ کوئی رُوحانی تصویر آفتابِ نورانی کی اپنی فطرت کے دائرہ سے بڑھ کر اپنے اندر لے سکتا ہے اور خدا تعالیٰ ہر ایک کی استعداد فطرت کے موافق اپنا چہرہ اس کو دکھا دیتا ہے اور فطرتوں کی کمی بیشی کی وجہ سے وہ چہرہ کہیں چھوٹا ہو جاتا ہے اور کہیں بڑا جیسے مثلاً ایک بڑا چہرہ ایک آرسی کے شیشہ میں نہایت چھوٹا معلوم ہوتا ہے مگر وہی چہرہ ایک بڑے شیشہ میں بڑا دکھائی دیتا ہے مگر شیشہ خواہ چھوٹا ہو خواہ بڑا چہرہ کے تمام اعضاء اور نقوش دکھا دیتا ہے صرف یہ فرق ہے کہ چھوٹا شیشہ پورا مقدار چہرہ کا دکھلا نہیں سکتا۔سو جس طرح چھوٹے اور بڑے شیشہ میں یہ کمی بیشی پائی جاتی ہے اسی طرح خدا تعالیٰ کی ذات اگرچہ قدیم اور غیر متبدّل ہے مگر انسانی استعداد کے لحاظ سے اس میں تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۲۵، ۲۶)

۱ ﴿ فَلَا يَسْتَطِيعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَآ اِلٰٓى اَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ ﴾

وہ آیات جن میں لکھا ہے کہ فوت شدہ لوگ پھر دُنیا میں نہیں آتے ازاں جملہ یہ آیت ہے وَحَرَامٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۔۔۔۔۔اس آیت کے یہ معنی ہیں کہ جن لوگوں پر واقعی موت وارد ہو جاتی ہے اور درحقیقت فوت ہو جاتے ہیں پھر وہ زندہ کرکے دُنیا میں بھیجے نہیں جاتے۔

(ازالہ اوہام حصّہ دوم صفحہ ۶۴۲ حاشیہ در حاشیہ صفحہ الف)

---

۱ سورۃ الانبیاء ۹۶

آیت وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَاِذَا ھُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّھِمْ یَنْسِلُوْنَ○

ماضی مضارع کے معنوں پر بھی آجاتی ہے بلکہ ایسے مقامات میں جبکہ آنے والا واقعہ متکلم کی نگاہ میں یقینی الوقوع ہو مضارع کو ماضی کے صیغہ پر لاتے ہیں تا اُس امر کا یقینی الوقوع ہونا ظاہر ہو اور قرآن شریف میں اس کی بہت نظیریں ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَاِذَا ھُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّھِمْ یَنْسِلُوْنَ۔

(ضمیمہ براہین احمدیہ حصہ پنجم صفحہ ۶)

آیت سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ○

سلام تو وہ ہے جو خدا (تعالیٰ) کی طرف سے ہو۔ خدا (تعالیٰ) کا سلام وہ ہے جس نے ابراہیمؑ کو آگ سے سلامت رکھا جس کو خدا کی طرف سے سلام نہ ہو بندے اس پر ہزار سلام کریں اس کے واسطے کسی کام نہیں آسکتے۔ قرآن شریف میں آیا ہے سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِیْمٍ۔ (بدر جلد ۶ نمبر ۳۱ مورخہ یکم اگست ۱۹۰۷ء صفحہ ۶)

خدائے رحیم کی طرف سے سلامتی ہے۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۷)

تجھے سلامتی ہے یہ ربِّ رحیم نے فرمایا۔ (حقیقۃ المہدی صفحہ ۱۲)

تم سب پر اس خدا کا سلام جو رحیم ہے۔ (حقیقۃ الوحی باب چہارم صفحہ ۹۱)

آیت وَامْتَازُوا الْیَوْمَ اَیُّھَا الْمُجْرِمُوْنَ○

اے مجرمو آج تم الگ ہو جاؤ۔ (حقیقۃ الوحی صفحہ ۷۳، ۱۰۲ و تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۷)

آیت وَمَنْ نُّعَمِّرْہُ نُنَکِّسْہُ فِی الْخَلْقِ اَفَلَا یَعْقِلُوْنَ○

جس کو ہم زیادہ عمر دیتے ہیں تو اس کی پیدائش کو اُلٹا دیتے ہیں یعنی انسانیت کی طاقتیں اور قوتیں اس سے دُور ہو جاتی ہیں۔ حواس میں اس کے فرق آجاتا ہے عقل اس کی زائل ہو جاتی ہے۔ اب اگر مسیح ابن مریم کی نسبت فرض کیا جائے کہ اب تک جسم خاکی کے ساتھ زندہ ہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ ایک مدت دراز سے اُن کی انسانیت کے قویٰ میں بکلّی فرق آگیا ہوگا اور یہ حالت خود موت کو چاہتی ہے اور یقینی طور پر ماننا پڑتا ہے کہ مدت سے وہ مر گئے ہوں گے۔

(ازالہ اوہام صفحہ ۶۱۰)

آیت وَمَنْ نُّعَمِّرْہُ نُنَکِّسْہُ فِی الْخَلْقِ سے حضرت عیسٰیؑ کی موت ثابت ہوتی ہے کیونکہ جبکہ بموجب تصریح

اس آیت کے ایک شخص جو نوّے یا سو برس تک پہنچ گیا ہو اس کی پیدائش اس قدر اُلٹا دی جاتی ہے کہ تمام حواس ظاہریّہ و باطنیہ قریب الفقدان یا مفقود ہو جاتے ہیں تو پھر وہ جو دو ہزار برس سے اب تک جیتا ہے اُس کے حواس کا کیا حال ہوگا اور ایسی حالت میں وہ اگر زندہ بھی ہؤا تو کونسی خدمت دے گا۔ اِس آیت میں کوئی استثناء موجود نہیں ہے اور ہمیں نہیں چاہیئے کہ بغیر خدا تعالیٰ کے بیان کے آپ ہی ایک استثناء فرض کر لیں۔ ہاں اگر نصِ صریح سے ثابت ہو کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام باوجود جسمانی حیات کے جسمانی تحلیلوں اور تنزّل حالات اور فقدانِ قویٰ سے منزّہ ہیں تو وہ نص پیش کریں۔

(ایام الصلح صفحہ ۱۴۱)

وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا یعنی تم پر دو ہی حالتیں وارد ہوتی ہیں یہاں تک کہ صاحبِ علم ہونے کے بعد محض نادان ہو جاتے ہیں۔ اب اگر خلاف اِس نصِ صریح کے کسی کی نسبت یہ دعویٰ کیا جائے کہ باوجود اس کے کہ عمر طبعی سے صدہا حصّے زیادہ اس پر زمانہ گذر گیا مگر وہ نہ مرا اور نہ اَرذل عمر تک پہنچا اور نہ ایک ذرّہ امتدادِ زمانہ نے اس پر اثر کیا تو ظاہر ہے کہ ان تمام امور کا اس شخص کے ذمّہ ثبوت ہوگا جو ایسا دعویٰ کرتا ہے یا ایسا عقیدہ رکھتا ہے کیونکہ قرآن کریم نے تو کسی جگہ انسانوں کے لئے یہ ظاہر نہیں فرمایا کہ بعض انسان ایسے بھی ہیں جو معمولی انسانی عمر سے صدہا درجہ زیادہ زندگی بسر کرتے ہیں اور زمانہ ان پر اثر کر کے ان کو اَرذلِ عمر تک نہیں پہنچاتا اور نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ کا مصداق نہیں ٹھہراتا۔ پس جبکہ یہ عقیدہ ہمارے آقا و مولیٰ کی عام تعلیم سے صریح مخالف ہے تو صاف ظاہر ہے کہ جو شخص اس کا مدعی ہو ثبوت اسی کے ذمّہ ہے۔ غرض حسبِ تعلیم قرآنی عمر طبعی کے اندر اندر مر جانا اور زمانہ کے اثر سے عمر کے مختلف حصّوں میں گوناگوں تغیرات کا لاحق ہونا یہاں تک کہ بشرطِ زندگی اَرذل عمر تک پہنچنا یہ ایک فطرتی اور اصلی امر ہے جو انسان کی فطرت کو لگا ہؤا ہے جس کے بیان میں قرآن بھرا ہؤا ہے۔

(الحق (بحث دہلی) صفحہ ۳۰،۳۱)

یٰسٓ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝

قصیدہ و شعر گوئی تو کوئی فضیلت اور بزرگی اور حقانیت و علمیت کا معیار و مدار نہیں۔ تُک بندی اور قافیہ سازی ایک ملکہ ہے جو فسّاق اور فجّار اور بیدینوں کو بھی دیا جاتا ہے بلکہ ایک طرح کا نقص ہے اِسی لئے اللہ تبارک و تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے بچایا۔ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ اگر کچھ فضیلت اور حقیقت کی بات ہوتی تو اوّل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی جاتی۔ (تبلیغِ رسالت (مجموعہ اشتہارات) حصّہ سوم صفحہ ۵ حاشیہ)

یٰسٓ

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ○ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۚ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ○ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُ ۨ ○ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ○ اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ۚ بَلٰى ۗ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ○

کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو ایک قطرہ پانی سے پیدا کیا ہے جو رحم میں ڈالا گیا تھا پھر وہ ایک جھگڑنے والا آدمی بن گیا۔ ہمارے لئے باتیں بنانے لگا اور اپنی پیدائش بھول گیا اور کہنے لگا کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ جب ہڈیاں بھی سلامت نہیں رہیں گی تو پھر انسان نئے سرے سے زندہ ہوگا۔ ایسی قدرت والا کون ہے جو اس کو زندہ کریگا ان کو کہہ وہی زندہ کرے گا جس نے پہلے اس کو پیدا کیا تھا اور وہ ہر ایک قسم سے اور ہر ایک راہ سے زندہ کرنا جانتا ہے ..... سو ان آیات میں اللہ جلّ شانہٗ نے فرما دیا ہے کہ خدا کے آگے کوئی چیز اَنہونی نہیں جس نے ایک قطرۂ حقیر سے انسان کو پیدا کیا۔ کیا وہ دوسری مرتبہ پیدا کرنے سے عاجز ہے۔ (اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۹۳)

قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ ..... وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ انسان کہتا ہے کہ ایسی ہڈیوں کو کون نئے سرے زندہ کریگا جو سڑ گل گئی ہوں۔ ان کو کہہ دے وہی زندہ کرے گا جس نے پہلی دفعہ پیدا کیا تھا اور وہ ہر یک طور سے پیدا کرنا جانتا ہے۔ (ست بچن صفحہ ۱۰۹)

ہم نے یہ کبھی نہیں کہا کہ خدا خلقِ اسباب نہیں کرتا مگر بعض اسباب ایسے ہوتے ہیں کہ نظر آتے ہیں اور بعض اسباب نظر نہیں آتے۔ غرض یہ ہے کہ خدا کے افعال گوناگوں ہیں۔ خدائے تعالیٰ کی قدرت کبھی درماندہ نہیں ہوتی اور وہ نہیں تھکتا وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ۔ (رپورٹ جلسہ سالانہ ۱۸۹۷ء صفحہ ۹۰)

اپنے ذاتی تجربہ سے دیکھا گیا ہے کہ ایک شیریں طعام یا کسی قسم کا میوہ یا شربت غیب سے نظر کے سامنے آگیا

ہے اور وہ ایک غیبی ہاتھ سے مُنہ میں پڑتا جاتا ہے اور زبان کی قوتِ ذائقہ اس کے لذیذ طعم سے لذت اُٹھاتی جاتی ہے اور دوسرے لوگوں سے باتوں کا سلسلہ بھی جاری ہے اور حواسِ ظاہری بخوبی اپنا اپنا کام دے رہے ہیں اور یہ شربت یا میوہ بھی کھایا جا رہا ہے اور اس کی لذت اور حلاوت بھی ایسی ہی کُھلے کُھلے طور پر معلوم ہوتی ہے بلکہ وہ لذت اُس لذت سے نہایت اَلطف ہوتی ہے اور یہ ہرگز نہیں کہ وہ وہم ہوتا ہے یا صرف بے بُنیاد تخیلات ہوتے ہیں بلکہ واقعی طور پر وہ خدا جس کی شان بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ہے ایک قسم کے خلق کا تماشہ دکھا دیتا ہے پس جبکہ اس قسم کے خلق اور پیدائش کا دُنیا میں ہی نمونہ دکھائی دیتا ہے اور ہر ایک زمانہ کے عارف اس کے بارے میں گواہی دیتے چلے آئے ہیں تو پھر وہ تمثلی خلق اور پیدائش جو آخرت میں ہوگی اور میزان اعمال نظر آئے گی اور پُل صراط نظر آئے گا اور ایسا ہی بہت سے اُور امور روحانی تشکّل کے ساتھ نظر آئیں گے اس سے کیوں عقلمند تعجب کرے۔ کیا جس نے یہ سلسلہ تمثلی خلق اور پیدائش کا دُنیا میں ہی عارفوں کو دکھا دیا ہو اس کی قدرت سے یہ بعید ہے کہ وہ آخرت میں بھی دکھاوے بلکہ ان تمثلات کو عالمِ آخرت سے نہایت مناسبت ہے کیونکہ جس حالت میں اس عالم میں جو کمال انقطاع کا تجلّی گاہ نہیں ہے یہ تمثلی پیدائش تزکیہ یافتہ لوگوں پر ظاہر ہو جاتی ہے تو پھر عالمِ آخرت میں (جو) اکمل اور اتم انقطاع کا مقام ہو کیوں نظر نہ آوے۔

(الحکم جلد ۷ نمبر ۲۲ مورخہ ۱۷ جون ۱۹۰۳ء صفحہ ۱)

اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ الخ کیا وہ جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا اِس بات پر قادر نہیں کہ ان تمام چیزوں کی مانند اَور چیزیں بھی پیدا کرے۔ بیشک قادر ہے اور وہ خلّاق علیم ہے یعنی خالقیت میں وہ کامل ہے اور ہر ایک طور سے پیدا کرنا جانتا ہے۔ (جنگِ مقدس صفحہ ۱۹ روئیداد ۲۳ مئی ۱۸۹۳ء)

اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

اگر یہ اعتراض پیش ہو کہ قرآن کریم میں جو خدا تعالیٰ نے کئی بار فرمایا ہے کہ ہم نے چھ دن میں زمین و آسمان کو پیدا کیا تو یہ امر ضعف پر دلالت کرتا ہے کیونکہ مشا اُس کے ارادہ کے ساتھ ہی سب کچھ ہو جانا لازم ہے جیسا کہ وہ آپ ہی فرماتا ہے اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ یعنی جب خدا تعالیٰ ایک چیز کے ہونے کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کا امر ایسی قوت اور طاقت اور قدرت اپنے اندر رکھتا ہے کہ وہ اُس چیز جو اس کے علم میں ایک علمی وجود رکھتا ہے فقط یہ کہتا ہے کہ ہو تو وہ ہو جاتی ہے۔

اِس وہم کا جواب یہ ہے کہ قدرت اور طاقت کا مفہوم اِس بات کو مُستلزم نہیں کہ وہ چیز خواہ نخواہ بِلا توقف ہو جائے اور نہ ارادہ کے مفہوم میں ضروری طور پر یہ بات داخل ہے کہ جس چیز کا ارادہ کیا گیا ہے وہ اُسی وقت ہو جائے بلکہ اُسی حالت میں ایک قدرت اور ایک ارادہ کو کامل قدرت اور کامل ارادہ کہا جائے گا جبکہ وہ ایک فاعل کے اصل منشاء کے موافق

جلد یا دیر کے ساتھ جیسا کہ منشاء ہو ظہور میں آوے مثلاً چلنے میں کامل قدرت اس شخص کی نہیں کہہ سکتے کہ جلد جلد چل سکتا ہے اور آہستہ آہستہ چلنے سے وہ عاجز ہے بلکہ اُس شخص کو کامل القدرت کہیں گے کہ جو دونوں طور جلد اور دیر میں قدرت رکھتا ہو۔ یا مثلاً ایک شخص ہمیشہ اپنے ہاتھ کو لمبا رکھتا ہے اور اکٹھا کرنے کی طاقت نہیں یا کھڑا رہتا ہے اور بیٹھنے کی طاقت نہیں تو ان سب صورتوں میں ہم اس کو قوی قرار نہیں دیں گے بلکہ بیمار اور معلول کہیں گے۔ غرض قدرت اُسی وقت کامل طور پر متحقق ہو سکتی ہے کہ جبکہ دونوں شق سُرعت اور بطوء پر قدرت ہو اگر ایک شق پر قدرت ہو تو وہ قدرت نہیں بلکہ عجز اور ناتوانی ہے تعجب کہ ہمارے مخالف خدا تعالیٰ کے قانونِ قدرت کو بھی نہیں دیکھتے کہ دُنیا میں اپنے قضاء و قدر کو جلد بھی نازل کرتا ہے اور دیر سے بھی۔ ہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ صفاتِ قہریّہ اکثر جلدی کے رنگ میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور صفاتِ لطیفہ دیر اور توقف کے پیرایہ میں مثلاً انسان نو مہینے پیٹ میں رہ کر اپنے کمال وجود کو پہنچتا ہے اور مَرنے کے لئے کچھ بھی دیر کی ضرورت نہیں مثلاً انسان اپنے مَرنے کے وقت صرف ایک ہی ہیضہ کا دست یا تھوڑا سا پانی قے کے طور پر نکال کر راہیٔ مُلکِ بقا ہو جاتا ہے اور وہ بدن جس کی سالہائے دراز میں ظاہری اور باطنی تکمیل ہوئی تھی ایک ہی دَم میں اُس کو چھوڑ کر رخصت ہو جاتا ہے ..... یہ بات کھول کر یاد دلانا ضروری ہے کہ ارادہ کاملہ بھی قدرتِ کاملہ کی طرح دونوں شقوں سُرعت اور بطوء کو چاہتا ہے مثلاً ہم جیسا یہ ارادہ کر سکتے ہیں کہ ابھی یہ بات ہو جائے ایسا ہی یہ بھی ارادہ کر سکتے ہیں کہ دس برس کے بعد ہو۔ مثلاً ریل اور تار اور صدہا کلیں جو اَب نکل رہی ہیں بیشک ابتداء سے خدا تعالیٰ کے ارادہ اور علم میں تھیں لیکن ہزارہا برس تک ان کا ظہور نہ ہوا اور وہ ارادہ تو ابتداء ہی سے تھا مگر مخفی چلا آیا اور اپنے وقت پر ظاہر ہوا اور جب وقت آیا تو خدا تعالیٰ نے ایک قوم کو ان فکروں اور سوچوں میں لگا دیا اور ان کی مدد کی یہاں تک کہ وہ اپنی تدبیروں میں کامیاب ہو گئے۔

(آئینہ کمالاتِ اسلام صفحہ ۱۶۰ تا ۱۷۱ حاشیہ در حاشیہ)

حکم اس کا اس سے زیادہ نہیں کہ جب کسی چیز کے ہونے کا ارادہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہو پس ساتھ ہی وہ ہو جاتی ہے۔

(جنگِ مقدس صفحہ ۱۹)

اس کے حکم کی یہ شان ہے کہ جب کسی چیز کے ہونے کا ارادہ کرتا ہے تو صرف یہی کہتا ہے کہ ہو پس وہ چیز پیدا ہو جاتی ہے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۹۳)

جب ایک کام کو چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو جا تو فی الفور وہ کام ہو جاتا ہے۔ (کشتی نوح صفحہ ۳۵)

خدا کا حکم اِس طرح پر ہوتا ہے کہ جب وہ کسی چیز کو کہتا ہے کہ ہو تو وہ ہو جاتی ہے۔ اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ فی الفور بلا توقف ہو جاتی ہے کیونکہ آیت میں فی الفور کا لفظ نہیں ہے بلکہ آیت اطلاق پر دلالت کرتی ہے جس سے یہ مطلب ہے کہ چاہے تو خدا تعالیٰ اس امر کو جلدی سے کر دے اور چاہے تو اس میں دیر ڈال دے جیسا کہ خدا تعالیٰ

کے قانونِ قدرت میں بھی یہی مشہود و محسوس ہے کہ بعض امور جلدی سے ہو جاتے ہیں اور بعض دیر سے ظہور میں آتے ہیں۔ (چشمۂ معرفت صفحہ ۲۱۳، ۲۱۴)

جب وہ ایک بات کو چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ ہو پس وہ بات ہو جاتی ہے۔ (تذکرۃ الشہادتین صفحہ ۴)

اور جب خدا کسی چیز کو چاہتا ہے کہ ہو جائے تو اُسے کہتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ (خطبہ الہامیہ صفحہ ۲۰۸)

انسان ایسی ایسی مصیبتوں اور مشکلات میں گرفتار ہوتا ہے کہ ٹکریں مارتا پھرتا ہے اور ایسا سرگرداں ہوتا ہے کہ کچھ پتہ نہیں لگتا۔ ہزاروں آرزوئیں اور تمنائیں ایسی ہوتی ہیں کہ پوری ہونے میں نہیں آتیں۔ کیا خدا تعالیٰ کے ارادے بھی اس قسم کے ہوتے ہیں کہ پورے نہ ہوں۔ اس کی شان تو یہ ہے اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۸ صفحہ ۷ مورخہ ۱۰ راگست ۱۹۰۲ء)

ہمارا حکم تو اتنے میں ہی نافذ ہو جاتا ہے کہ جب ہم ایک چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو ہم اس چیز کو کہتے ہیں ہو جا تو وہ چیز ہو جاتی ہے۔ (تبلیغ رسالت (مجموعہ اشتہارات) جلد ۸ صفحہ ۱۰۲)

رُوح کی لذت اُس وقت ملتی ہے جب انسان گداز ہو کر پانی کی طرح بہنا شروع ہوتا ہے اور خوف و خشیت سے بہہ نکلتا ہے۔ اس مقام پر وہ کلمہ بنتا ہے اور اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ کا مفہوم اُس میں کام کرنے لگتا ہے۔ (الحکم جلد ۵ نمبر ۱۰ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۰۱ء صفحہ اوّل)

جس شخص کا یہ ایمان نہ ہو کہ اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ میں سچ کہتا ہوں کہ اس نے خدا تعالیٰ کو نہیں پہچانا۔ (الحکم جلد ۶ نمبر ۸ مورخہ ۲۸ فروری ۱۹۰۲ء صفحہ ۳)

خدا تعالیٰ پر کوئی امر مشکل نہیں بلکہ اس کی تو شان ہے اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔

(الحکم جلد ۶ نمبر ۲۹ مورخہ ۱۷ راگست ۱۹۰۲ء صفحہ ۸)

جو چیز علل اور اسباب سے پیدا ہوتی ہے وہ خلق ہے اور جو محض کُن سے ہو وہ امر ہے چنانچہ فرمایا ہے اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ عالمِ امر میں کبھی توقف نہیں ہوتا۔ خلق سلسلۂ علل و معلول کا محتاج ہے جیسے انسان کے بچہ پیدا ہونے کے لئے نطفہ ہو پھر دوسرے مراتبِ طبعی اور طبابت کے قواعد کے نیچے ہوتا ہے مگر امر میں یہ نہیں ہوتا ہے۔ (الحکم جلد ۷ نمبر ۱۳ مورخہ ۱۷ اپریل ۱۹۰۳ء صفحہ ۱۲)

۸۴ فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ۝

پس وہ ذات پاک ہے جس کے ہاتھ میں ہر ایک چیز کی بادشاہی ہے اور اسی کی طرف تم پھیرے جاؤ گے۔

(جنگِ مقدس صفحہ ۱۹)

پس وہ ذات پاک ہے جس کی ہر ایک چیز پر بادشاہی ہے اور تم سب اسی کی طرف رجوع کرو گے۔

(اسلامی اصول کی فلاسفی صفحہ ۹۳)

جو کچھ ہے خدا تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے جو چاہے کرتا ہے بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۔

(بدر جلد ۶ نمبر ۱۷ مورخہ ۲۵ اپریل ۱۹۰۷ء صفحہ ۸)